

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (المحل: 44)

تفسیر القرآن

حافظ عبدالسلام بن محمد

www.KitaboSunnat.com

جلد دوم

سُورَةُ يُونُسَ تَا سُورَةُ الْحَجَّةِ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربعہ

معدت البریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

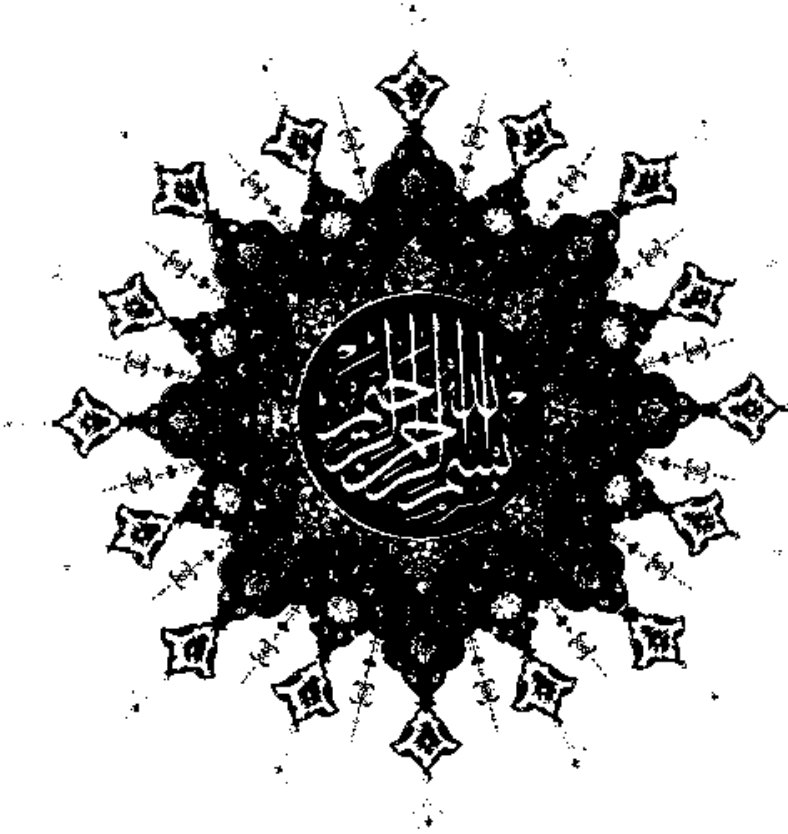
ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com



www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق
محق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب

تفسیر القرآن الکریم

جلد دوم

سُورَةُ يُونُسَ تا سُورَةُ الْحَجِّ

تفسیر

فضیلہ الاشاذ حافظ عبد السلام بن محمد



ناشر

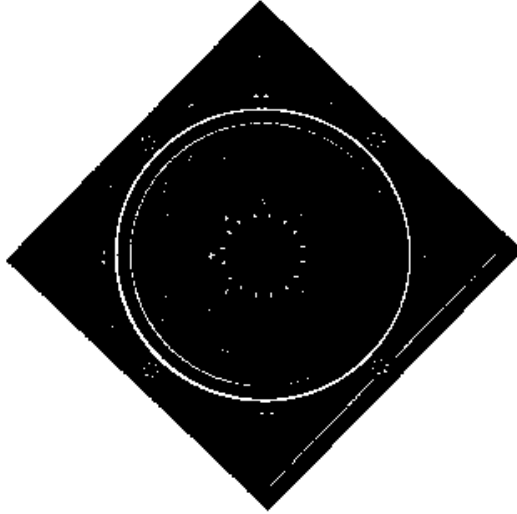
دارالارافات

﴿ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ يُبَيِّنُ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ﴾

اودھم نے تیری طرف یہ بصیحت اتاری تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (النحل: 44)

تفسیر القرآن الکریم

فضیلۃ الاساذ حافظ عبدالسلام بن محمد



جلد دوم

سورة یونس تا سورة الحج





































4، پتہ: روہی، 37، قادیان، پاکستان
042-37230549 | 042-37242314
042-37242314 | 042-37242314

دارالعلوم



فہرست

3		سورۃ یونس	
72		سورۃ صود	
77		پارہ نمبر 12	
156		سورۃ یوسف	
204		پارہ نمبر 13	
243		سورۃ الرعد	
281		سورۃ ابراہیم	
318		سورۃ الحجر	
318		پارہ نمبر 14	
354		سورۃ النحل	
442		پارہ نمبر 15	
442		سورۃ بنی اسرائیل	
519		سورۃ الکہف	
559		پارہ نمبر 16	
579		سورۃ مریم	

631			سورۃ ط		16
703			پارہ نمبر 17		17
703			سورۃ الانبیاء		18
785			سورۃ الحج		19



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾

الزَّٰتِ تِلْكَ اٰیَةُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ ﴿۱﴾ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحٰیْنَا اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ
اَنْذِرَ النَّاسَ وَبَشِّرَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ لَهُمْ قَدَمٌ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ
اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الزّٰ۔ یہ کمال حکمت والی کتاب کی آیات ہیں ﴿۱﴾ کیا لوگوں کے لیے ایک عجیب بات ہوگئی کہ ہم نے ان میں سے ایک آدمی کی طرف وحی بھیجی کہ لوگوں کو ڈرا اور جو لوگ ایمان لائے انھیں بشارت دے کہ ان کے لیے ان کے رب کے ہاں سچا مرتبہ ہے۔ کافروں نے کہا بے شک یہ تو کھلا جادوگر ہے ﴿۲﴾

آیت 1 ﴿۱﴾ الزّٰ: یہ حروف مقطعات ہیں، تشریح کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی پہلی آیت۔

﴿۲﴾ تِلْكَ اٰیَةُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ: ”تِلْكَ“ اسم اشارہ ہے، مشارالیه ”الآیات“ مقرر ہے۔ مراد قرآن مجید کی تمام آیات ہیں جن میں ہماری یہ سورت بھی شامل ہے، یعنی یہ عظیم الشان آیات کتاب حکیم کی آیات ہیں۔ ”الْحَكِیْمِ“ (کمال حکمت والی) کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ دانائی اور حکمت سے بھری ہوئی ہے، اس کی کوئی بات نہ خطا ہے، نہ عقل کے خلاف اور نہ کمتر درجہ کی، بلکہ ہر بات ہی کمال عقل و دانش پر مبنی ہے اور ایک معنی یہ ہے کہ یہ کتاب انتہائی محکم اور مضبوط ہے، اس کی آیات میں کوئی باہمی اختلاف نہیں، نہ ہی اس کے حلال و حرام اور حدود و احکام کبھی منسوخ ہوں گے، یعنی حکیم بمعنی محکم ہے۔

آیت 2 ﴿۱﴾ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا.....: یعنی آخر اس میں تعجب اور حیرت کی کون سی بات ہے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے اور فلاح و سعادت کی راہ دکھانے کے لیے خود انہی میں سے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا گیا؟ تعجب کی بات تو تب ہوتی کہ ان کا پروردگار ان کی ہدایت کا کوئی سامان نہ کرتا، یا ان میں کسی جن یا فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیتا، کیونکہ فرشتہ یا جن انسانوں کے لیے نمونہ عمل بن ہی نہیں سکتا۔ مزید دیکھیے سورہ توبہ (۱۲۸) اور آل عمران (۱۶۴) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ اَنْ لَهُمْ قَدَمٌ صِدْقٍ.....: ”قَدَمٌ“ کا معنی تو ظاہر ہے، دوسروں سے آگے وہی نکلتا ہے جس کا قدم دوز میں سب سے آگے نکل جائے، اس لیے ”قَدَمٌ“ کا معنی پیش قدمی بھی کرتے ہیں۔ درجے اور مرتبے کی بلندی بھی آگے نکلنے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ ”صِدْقٍ“ (سچ) مبالغہ کے لیے مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، یعنی اتنا سچا کہ سراپا سچ ہے، جیسے ”زَيْدٌ عَدْلٌ“ ”اَبُو زَيْدٌ عَادِلٌ“ گویا زید سراپا عدل ہے۔ صدق قول میں بھی ہوتا ہے اور فعل میں بھی۔ ”قَدَمٌ“ (موصوف) اپنی صفت ”صِدْقٍ“ کی طرف مضاف ہے، جیسا کہ ”مَسْجِدُ الْجَمَاعِ“ معنی یہ ہوا کہ ایمان والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں حقیقی پیش قدمی اور سچا مرتبہ ہے، کفار اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھے ہی نہیں بلکہ شرک و کفر میں ایسے اندھے ہوئے کہ وہ شخص جس کی چالیس سالہ زندگی کے صدق و امانت کے وہ خود شاہد تھے اس پر ایمان لانے کے بجائے ضد اور عناد سے اسے جادوگر کہہ

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔ ہر کام کی تدبیر دیا، ایسے اندھوں اور بہروں کو رب تعالیٰ کے ہاں حقیقی پیش قدمی اور سچا مرتبہ کیسے حاصل ہو سکتا تھا۔ سو وہ آگے بڑھنے کے بجائے جہنم میں گرنے کے لیے پیچھے رہ گئے۔ چونکہ ان کا آپ کو جادوگر قرار دینا بالکل ہی بودی بات تھی، اس لیے اس کا جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی۔

③ رسول اللہ ﷺ کو جادوگر قرار دینے سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ان کے دماغ یہ مان گئے تھے کہ آپ ﷺ عام آدمی نہیں۔ مگر ان کی بدبختی دیکھیے کہ وہ جادوگروں کی غلیظ اور خبیث زندگی اور بد عادات سے خوب واقف ہونے کے باوجود سب سے زیادہ امین، راست باز، پاک دامن اور صاحب عقل و دانش انسان کو محض ہٹ دھرمی کی بنا پر جادوگر کہہ رہے ہیں۔

ت 3 ① إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي..... نبوت کے اثبات کے بعد توحید و قیامت کے دلائل شروع ہوتے ہیں۔ توحید کی پہلی اور اظہر من الشمس دلیل جو قرآن بار بار بیان کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا آسمان و زمین اور ہر چیز کا خالق و مالک، رب اور مدبر ہونا ہے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۲، ۲۱) یہ بات مکہ کے مشرک بھی مانتے تھے۔ دیکھیے سورہ مومنون (۸۹، ۸۳) جب رب وہی ہے تو عبادت کسی اور کی کیوں کی جائے۔ اس آیت میں اور دوسرے بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور دوسری صفات کو اس کے واحد معبود برحق ہونے کی دلیل بتایا ہے۔

② فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ: اس آیت میں دہریہ کا بھی رد ہے جو رب تعالیٰ کے وجود ہی کے منکر ہیں، جب معمولی سے معمولی چیز بنانے والے کے بغیر نہیں بنتی تو سمجھ لو کہ اتنی بڑی کائنات اور اس کا عظیم الشان نظام، جس میں کوئی حادثہ یا تصادم نہیں، اسے بنانے والا تمہارا رب ہی ہے۔ چھ دنوں سے مراد یا تو وہ دن ہیں جن میں سے ایک دن ہمارے ہزار سال کے برابر ہے، فرمایا: ﴿وَإِنْ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾ [الحج: ۴۷] ”اور بے شک ایک دن تیرے رب کے ہاں ہزار سال کے برابر ہے، اس گنتی سے جو تم شمار کرتے ہو۔“ یا ہمارے چھ دنوں کے برابر مدت مراد ہے، کیونکہ یہ دن رات تو سورج کی پیدائش کے بعد وجود میں آئے۔ (واللہ اعلم)

اس سے اللہ تعالیٰ کی حکمت تدریج بھی ظاہر ہو رہی ہے، کیونکہ وہ چاہتا تو سب کچھ ایک لمحے میں ”سُحْنٌ“ کہہ کر پیدا فرما لیتا، مگر اس کی حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ زمین و آسمان کو مرحلہ وار پیدا فرمائے۔ اس میں ہمارے لیے بھی ہر کام آرام و اطمینان کے ساتھ کرنے کا سبق ہے۔ کائنات کی اکثر اشیاء پر فور کریں تو وہ چھ مرحلوں سے گزر کر مکمل ہوتی ہیں، مثلاً انسان کی پیدائش کے لیے دیکھیے سورہ مومنون (۱۴، ۱۳)۔

③ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ..... پھر عرش پر بلند ہوا اور وہاں رہ کر اسے کائنات کی تدبیر کا مرکز بنایا۔ نیز دیکھیے سورہ اعراف (۵۳) ”يُدَبِّرُ الْأُمْرَ“ سے معلوم ہوا کہ پیدا کرنے کے بعد اس کا سارا اختیار اور تدبیر و انتظام بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ مشرکین نے اختیار کچھ اور ہستیوں کے پاس سمجھ لیا، بھلا پیدا کرنے کے بعد اپنی ملکیت و اختیار کسی دوسرے کو کون دیتا ہے، پھر یہ کیسے ہو

الْأَمْرَ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ۗ ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۵﴾

کرتا ہے۔ کوئی سفارش کرنے والا نہیں مگر اس کی اجازت کے بعد، وہی اللہ تمہارا رب ہے، سو اس کی عبادت کرو۔ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ﴿۵﴾

سکتا ہے کہ وہ ملکیت و اختیار بے بس مخلوق کو دے دے جو اپنا آپ نہیں سنبھال سکتی، حقیقت یہی ہے کہ مشرک سے بڑھ کر بے عقل کوئی نہیں ہو سکتا۔ دیکھیے سورہ روم (۲۸)۔

﴿۴﴾ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ : کفار اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کا خیال تھا اور ہے کہ کچھ ہستیاں ایسی ہیں جو مالک تو نہیں، مگر وہ اللہ تعالیٰ سے جو چاہیں کروا سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ان کی محبت کے ہاتھوں یا ان کی نبی قوت سے مجبور ہو کر ان کی بات اور سفارش ماننا پڑتی ہے۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے بجائے ان سے التجائیں کرتے اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی صاف نفی فرمادی۔ ہاں، خود اللہ تعالیٰ کسی کو عزت بخشنے کے لیے اسے سفارش کی اجازت دے دے تو وہ سفارش کر سکے گا، مگر صرف اس کے لیے جس کے حق میں اجازت ملے گی۔ اس میں اس کا اپنا اختیار کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ مضمون کہ اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی شخص اس کی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں کر سکے گا قرآن مجید کی متعدد آیات میں بیان ہوا ہے، مثلاً دیکھیے سورہ بقرہ (۲۵۵)، طہ (۱۰۹)، سبأ (۲۳) اور نجم (۲۲) بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ نے سرے سے شفاعت ہی کی نفی کی ہے، جیسے فرمایا: ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ﴾ [المائدہ: ۴۸] ”پس انھیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہیں دے گی۔“ اور فرمایا: ﴿وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةً﴾ [البقرہ: ۴۸، ۱۲۳] ”اور کسی جان سے کوئی سفارش قبول نہ کی جائے گی۔“ وہاں یا تو کفار کا ذکر ہے کہ ان کی سفارش فائدہ نہیں دے گی، یا اجازت کے بغیر سفارش مراد ہے، ورنہ امت کے گناہ گاروں کے حق میں شفاعت تو صحیح احادیث سے ثابت ہے اور یہ بھی کہ آپ ﷺ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ ”إِلَّا بِإِذْنِهِ“ والی آیات سے بھی یہ شفاعت ثابت ہو رہی ہے، مگر یہ شفاعت اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بعد ہی ہوگی۔

﴿۵﴾ فَاعْبُدُوهُ : عبادت کا معنی ”پوجا کرنا“ بھی ہے اور پوری زندگی ”عبد“ یعنی اس کا فرماں بردار غلام (بندہ) بن کر گزارنے کو بھی عبادت کہا جاتا ہے اور حاجت روائی کے لیے کسی نبی قوت کے پکارنے کو بھی عبادت کہا جاتا ہے۔ قرآن نے ہر قسم کی عبادت کو اللہ کے ساتھ خاص کیا ہے، پس ”فَاعْبُدُوهُ“ کے معنی ہیں اسی کی پوجا کرو، اسی کو مشکلات دور کرنے کے لیے پکارو اور پوری زندگی اسی کی بندگی (غلامی) میں بسر کرو۔ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اگر تم کسی اور کی بندگی اختیار کرو گے تو گویا اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شریک ٹھہراؤ گے۔

﴿۶﴾ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ : یہ اصل میں ”تَذَكَّرُونَ“ تھا، یہاں فکر کے بجائے ذکر کی دعوت دی ہے۔ ذکر یاد کرنے کو کہتے ہیں، نصیحت کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مقصد ہے کہ اللہ واحد ہی کو عبادت کے لائق سمجھنے کے لیے لمبی چوڑی فکر اور سوچ کی ضرورت نہیں، جو کچھ تمہارے گرد و پیش ہے اور جو کچھ تمہارے ذہن میں موجود ہے اسی کو یاد کرو، نصیحت کے لیے وہی کافی ہے۔

إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا وَعَدَّ اللَّهُ حَقًّا إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٥﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابِ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٥﴾

اسی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے، اللہ کا وعدہ ہے سچا۔ بے شک وہی پیدائش شروع کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا، تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، انھیں انصاف کے ساتھ جزا دے اور جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے نہایت گرم پانی سے پینا ہے اور دردناک عذاب ہے، اس کے بدلے جو وہ کفر کیا کرتے تھے ﴿۵﴾ وہی ہے جس نے سورج کو تیز روشنی اور چاند کو نور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ (سب کچھ) نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ۔ وہ آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے جو جانتے ہیں ﴿۵﴾

ت 4 . إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا اس میں قیامت، یعنی سب لوگوں کے دوبارہ زندہ ہو کر اللہ کے حضور پیش ہونے کا بیان ہے۔ یہ اللہ کا پکا سچا وعدہ ہے، کیونکہ دنیا میں نیک و بد کی جزا و سزا نہ ضروری ہے نہ ممکن، نہ یہاں اس کے لیے مطلوب فرصت میسر ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ہر حال میں اپنے سچے وعدے کو پورا کرتے ہوئے تمہیں دوبارہ زندہ کر کے ایمان والوں کو انصاف کے ساتھ جزا دے گا اور کافروں کو ان کے کفر کا بدلہ دے گا۔ اگر کوئی اسے ناممکن سمجھے تو سوچ لے کہ جو ذات تمہیں شروع میں پیدا کرتی ہے، یعنی عدم سے وجود میں لاتی ہے، کیا اس کے لیے یہ مشکل ہے کہ تمہارے مر جانے کے بعد تمہیں دوبارہ زندگی دے۔ مزید دیکھیے سورہ روم (۲۷) ”حَمِيمٍ“ وہ پانی جو گرمی کی انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔ دیکھیے سورہ رحمن (۴۳) اور سورہ محمد (۱۵)۔

ت 5 . ﴿١﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً ”ضِيَاءً“ ”ضَاءٌ يَضُوءُ ضَوْءًا وَ ضِيَاءٌ“ سے ہے اور ”ضِيَاءًا“ کی طرح مصدر ہے، بعض کہتے ہیں یہ ”ضَوْءٌ“ کی جمع ہے، جیسا کہ ”سَوَاطُ“ کی جمع ”سَبَاطُ“۔ یعنی سورج کو ”ذاتِ ضِيَاءٍ“ تیز روشنی والا اور چاند کو ”ذَا نُورٍ“ نور والا بنایا، پھر ”ذات“ اور ”ذَا“ کو حذف کر کے مبالغہ کے لیے سورج کو سراپا ضیاء اور چاند کو سراپا نور قرار دیا۔ ضیاء اور نور میں وہی فرق ہے جو سورج کی تیز اور گرم روشنی اور چاند کی پرسکون روشنی میں ہوتا ہے۔ انسان اور کائنات کی حرکت و سکون کے لیے دن اور رات کی طرح سورج اور چاند بھی ضروری ہیں۔

﴿٢﴾ وَقَدَرَهُ مَنَازِلَ یعنی چاند کی منزلیں مقرر فرمائیں کہ ہر روز گھٹتا اور بڑھتا ہے، اگرچہ سورج کی بھی منزلیں مقرر ہیں،

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ ①
 إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ
 آيَاتِنَا غُفْلُونَ ② أُولَٰئِكَ مَا لَهُمْ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ③

بے شک رات اور دن کے بدلنے میں اور ان چیزوں (میں) جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کی ہیں، یقیناً ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو ڈرتے ہیں ① بے شک وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے اور اس پر مطمئن ہو گئے اور وہ لوگ جو ہماری آیات سے غافل ہیں ② یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے، اس کے بدلے جو وہ کمایا کرتے تھے ③

جس کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے، مگر چاند کا انھیں منزلوں میں روزانہ شکل بدل کر آنا، پھر ایک یا دو دن چھپ کر سننے سرے سے طلوع ہونا، تاریخ اور ماہ و سال کی تعیین کے لیے زیادہ آسان اور قابل عمل ہے۔ اس لیے شریعت کے تمام احکام مثلاً حج، روزہ اور کفارہ وغیرہ بھی اسی سے متعلق ہیں۔ دیکھیے ﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلَةِ﴾ [البقرہ: ۱۸۹] کی تفسیر۔

③ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ بے فائدہ اور بے مقصد پیدا نہیں فرمایا۔ یہ تفصیل علم و فہم رکھنے والوں کے لیے ہے، کیونکہ بے علم اور بے سمجھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کے بیان سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

آیت 6: إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سورج روزانہ نئی جگہ سے طلوع اور نئی جگہ غروب ہوتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت رب المشارق (بہت سے مشرقوں کا رب) ہے۔ اسی سے دن رات کا چھوٹا بڑا ہونا، موسموں کا بدلنا، ٹھیک وقت پر شمسی سال کے لحاظ سے سال کے بعد وہی موسم دوبارہ آ جانا اور زمین و آسمان میں موجود اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ بے شمار چیزوں میں یقیناً اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کی توحید کی بے شمار نشانیاں ہیں، مگر ان کے لیے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے اور برے انجام سے بچتے ہیں۔ ان نشانیوں کی تفصیل چاہو تو ہر قدم پر اور ہر لمحہ تمھارے سامنے ہیں، مگر جو منہ ہی موڑ لے اس کا کیا علاج؟ دیکھیے سورہ یوسف (۱۰۵) موٹی موٹی نشانیوں کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۶۳)۔

آیت 8.7: ① إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا آخرت کے ذکر کے بعد دو آیتوں میں اس کے منکرین اور پھر اس پر ایمان والوں کا ذکر فرمایا، آخرت کے منکروں کی چار صفات بیان فرمائی ہیں، پہلی صفت ”لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا“ ”زخاء“ کا لفظ طمع اور خوف دونوں معنوں میں آتا ہے، اس لیے ”لَا يَرْجُونَ“ کا مطلب ہے کہ وہ اللہ سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے، یا اس سے نہیں ڈرتے، نہ ہی آخرت میں ہونے والے شر و نشر پر ان کا ایمان ہے۔ دوسری یہ کہ وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے اور اس پر وہی خوش ہوتا ہے جو پورے کا پورا جسمانی لذات و خواہشات کا اسیر ہو جائے۔ تیسری یہ کہ وہ اس پر مطمئن ہو گئے، مطمئن وہی ہوتا ہے جو اسے اپنی آخری پناہ سمجھ لے، سعادت مند لوگوں کو تو اللہ کے ذکر سے اطمینان ہوتا ہے، کیونکہ ان کی

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِآيَاتِهِمْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمْ

الْأَنْهَارُ فِي جَنَّتِ النَّعِيمِ ①

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے ان کی رہنمائی کرے گا، ان کے نیچے سے نعمت کے باغوں میں نہریں بہتی ہوں گی ①

آخری پناہ گاہ وہی ہے، حیات دنیا کے فانی ہونے کی وجہ سے وہ کبھی اس پر مطمئن نہیں ہوتے۔

② وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غٰفِلُونَ: چونکہ یہ کہ وہ آسمان و زمین میں موجود بے شمار نشانیوں سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے، نہ ان پر کچھ غور و فکر کرتے ہیں۔ اگر ان آیات سے مراد آیات قرآنی ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ ہمارے احکام سے غفلت برتتے ہیں، نہ ان پر غور کرتے ہیں اور نہ انھیں بجالاتے ہیں۔ (ابن کثیر) ٹھکانا ان کا ان کے اعمال بد کی وجہ سے آگ ہے۔

بیت 9 ① يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِآيَاتِهِمْ: یعنی ایمان اور عمل صالح والوں کو ان کے ایمان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دنیا میں صراطِ مستقیم کی ہدایت، یعنی سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے، یا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ایمان لانے کی وجہ سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی رہنمائی ہوگی، حتیٰ کہ وہ (پل) صراط سے گزر کر سیدھے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ ان دونوں معنوں میں باء سمیعیہ کے لیے ہے، یہ باء استعانت کے لیے بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ سورہ حدید (۱۲)، (۱۳) میں فرمایا کہ ایمان والے مردوں اور عورتوں کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑ رہا ہوگا، جب کہ منافق مرد اور عورتیں ان سے درخواست کریں گے کہ ہمیں بھی اپنے نور سے فائدہ اٹھا کر ساتھ چلنے کا موقع دو۔ گویا مومن اپنے نور ایمان کی مدد سے چلتے ہوئے جنت میں پہنچ جائیں گے، جب کہ منافق اندھیرے میں رہ جائیں گے۔

② تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ: جنت کی نہروں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ محمد (۱۵)۔

③ فِي جَنَّتِ النَّعِيمِ: ان نعمتوں کی تفصیل بیان میں نہیں آسکتی، فرمایا: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مِمَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ﴾

[السجدة: ۱۷] ”پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے۔“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿يَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا أَعْيُنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ

وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ﴾ [مسلم، الحنة و صفة نعيمها، باب صفة الحنة: ۲۸۲۴/۴، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] ”اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں، میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی

بشر کے دل پر اس کا خیال ہی گزرا۔“

دَعْوُهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۗ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠﴾

ان کی دعا ان میں یہ ہوگی ”پاک ہے تو اے اللہ!“ اور ان کی آپس کی دعا ان (باغات) میں سلام ہوگی اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہوگا کہ سب تعریف اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے ﴿۱۰﴾

بیت 10 ﴿۱۰﴾ دَعْوُهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ یعنی وہ جنت کی نعمتیں اور عجائب دیکھ کر بے اختیار کہیں گے: ”اے اللہ! تو پاک ہے“ بلکہ جس طرح دنیا میں خود بخود سانس جاری رہتا ہے اہل جنت کے دل و زبان پر ہر وقت خود بخود اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہمید جاری رہے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ أَهْلَ الْحَنَّةِ يَأْكُلُونَ فِيهَا وَيَشْرَبُونَ وَلَا يَتَفَلَّحُونَ وَلَا يَبُولُونَ وَلَا يَتَعَوَّطُونَ وَلَا يَمْتَحِطُونَ، قَالُوا فَمَا بَالُ الطَّعَامِ؟ قَالَ جُشَاءٌ وَرَشْحٌ كَرَّ شَحِ الطَّعَامِ يُلْهَمُونَ التَّسْبِيحَ وَالتَّحْمِيدَ كَمَا يُلْهَمُونَ النَّفْسَ» [مسلم، الحنة و صفة نعيمها، باب في صفات الحنة وأهلها.....: ۲۸۳۵، عن جابر بن عبد الله رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا] ”جنتی جنت میں کھائیں گے اور پئیں گے، وہ نہ تھوکیں گے، نہ پیشاب کریں گے، نہ پاخانہ کریں گے اور نہ ناک صاف کریں گے۔“ صحابہ نے پوچھا: ”جو کھانا وہ کھائیں گے وہ کہاں جائے گا؟“ تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ”بس ڈکار آئے گا اور پینا آئے گا جس سے منہ (کستوری) کی خوشبو آئے گی (اور ان کا کھانا تحلیل ہو جائے گا)۔ (ان کے دلوں میں اور ان کی زبانوں پر) تسبیح اور حمد خود بخود بے اختیار جاری ہوگی جس طرح سانس خود بخود جاری ہوتا ہے۔“ ”تَحِيَّتُهُمْ“ باب تفعلیل کا مصدر، زندگی کی دعا دینا کہ اللہ تمہیں زندگی بخشے، یعنی وہ ایک دوسرے سے ملیں گے تو ایک دوسرے کو زندہ رہنے کی دعا سلام کے الفاظ سے دیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ ابراہیم (۲۳)، سورہ مریم (۶۰-۶۲) اور سورہ واقعہ (۲۵، ۲۶) میں بیان فرمایا ہے۔

﴿۱۰﴾ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ: اور ان کی دعا اور گفتگو کا اختتام رب العالمین کی حمد کے ساتھ ہوگا، دنیا میں بھی ان کی گفتگو اور دعا کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کے ساتھ ہوا کرتا تھا، جنت میں بھی اسی طرح جاری رہے گا۔ جبریل بن مطعم رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص یہ الفاظ کہے: «سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ» کسی ذکر کی مجلس میں تو یہ مہر کی طرح ہوں گے جو آخر میں لگائی جاتی ہے اور جو انہیں کسی لغو کی مجلس میں کہے تو اس کے لیے کفارہ ہوں گے۔“ [مسندك حاكم: ۱/ ۵۲۷، ح: ۱۹۷۰۔ السلسلة الصحيحة: ۱/ ۱۲۰] عبد اللہ بن عمر و اور امین مسعود رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمُ کی روایت کے الفاظ ہیں کہ کفارہ مجلس یہ ہے کہ بندہ یوں کہے: «سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ وَحَدِّكَ لَا شَرِيكَ لَكَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ» [صحيح الجامع: ۴۴۸۷]

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللَّهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقْفَى إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۱﴾ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنَابِنَا أَوْ قَاعِدًا

اور اگر اللہ لوگوں کو برائی جلدی دے انھیں بہت جلدی بھلائی دینے کی طرح تو یقیناً ان کی طرف ان کی مدت پوری کر دی جائے۔ تو ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، چھوڑ دیتے ہیں، وہ اپنی سرکشی ہی میں حیران پھرتے ہیں ﴿۱۱﴾ اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پہلو پر، یا بیٹھا ہوا، یا کھڑا ہوا ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم

آیت ۱۱ وَلَوْ يُعَجِّلُ اللَّهُ.....: ”تَعْجِيلٌ“ تفعیل سے ہے، اس کا معنی وقت سے پہلے طلب کرنا اور ”اسْتِعْجَالٌ“ کا معنی بھی جلدی طلب کرنا ہے، مگر یہاں یہ دونوں جلدی طلب کے معنی میں نہیں بلکہ جلدی دینے کے معنی میں ہیں اور حروف میں اضافہ معنی میں اضافے کے لیے ہے۔ اس آیت کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ کفار جلدی چاہتے تھے کہ لاؤ عذاب جس سے ہمیں ڈراتے ہو، فرمایا: ﴿وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ﴾ [الحج: ۴۷] ”اور وہ تجھ سے عذاب جلدی مانگتے ہیں۔“ حتیٰ کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! اگر اسلام واقعی حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسایا یا کوئی عذاب الیم بھیج دے۔ دیکھیے سورۃ انفال (۳۲) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم جس طرح انھیں خیر بہت جلدی عطا کر دیتے ہیں اسی طرح (ان کے مطالبے پر) عذاب بھی جلدی بھیج دیتے تو یہ کبھی کے ہلاک ہو چکے ہوتے، مگر ہم انھیں مہلت دے کر پورا موقع دیتے ہیں کہ واپس پلٹ آئیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، انسان جب اپنے لیے یا دوسروں کے لیے بھلائی کی دعا کرتا ہے تو اسے جلد قبول فرماتا ہے، لیکن جب غصے یا رنج میں آکر اپنے منہ سے اپنے یا اپنے بچوں یا دوسروں کے لیے بدعما کے کلمات نکالتا ہے تو وہ انھیں قبول نہیں فرماتا، بلکہ ڈھیل اور مہلت دیتا ہے کہ شاید وہ اپنی اصلاح کریں اور اگر وہ یہ بھی جلدی قبول کر لے تو لوگ جلد ہی ہلاک ہو جائیں۔ اس صورت میں ”استعجال“ میں طلب کا معنی موجود ہے، ”تعییل“ میں نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَدْعُوا عَلَيَّ أَنْفُسِكُمْ وَلَا تَدْعُوا عَلَيَّ أَوْلَادِكُمْ وَلَا تَدْعُوا عَلَيَّ خَدَمِكُمْ وَلَا تَدْعُوا عَلَيَّ أَمْوَالِكُمْ، لَا تَوَافِقُوا مِنَ اللَّهِ سَاعَةً نِيْلَ عَطَاءٍ فَيَسْتَجِيبَ لَكُمْ» [ابوداؤد، الترمذی، باب النهي عن أن يدعو.....: ۱۵۳۲، عن جابر بن عبد الله رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا وَصَحَّحَهُ الْأَلْبَانِيُّ] ”اپنے آپ پر بددعا نہ کرو اور اپنی اولاد پر بددعا نہ کرو اور اپنے خادموں پر بددعا نہ کرو اور اپنے مالوں پر بددعا نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی ایسے وقت میں دعا کر بیٹھو جس میں (ماگی ہوئی چیز) دے دی جاتی ہے اور وہ تمہاری بددعا قبول کر لے۔“ آخر میں فرمایا کہ آخرت کے دن پر ایمان نہ لانے والوں کو ہم ان کے کفر و شرک اور ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں۔ پہلی تفسیر ان الفاظ کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

آیت ۱۲ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ.....: یہاں ”الْإِنْسَانُ“ سے مراد اکثر انسان ہیں، جن میں کفار و مشرکین بھی شامل ہیں، کیونکہ انھی کا ذکر پہلے اور بعد میں چل رہا ہے اور وہ بھی مصیبت کے وقت اللہ کو پکارتے ہیں، پھر مقصد پورا ہو جانے کے بعد سرے سے اسے بھول جاتے ہیں، بعض مومنوں کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی انسان اس قدر عاجز و ناتواں ہے کہ

أَوْ قَابِلًا ۖ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ صُورَهُ مَرَّكَانٌ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ خَيْرٍ مِّمَّا كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴﴾ وَ لَقَدْ أَهَلَكْنَا الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۖ وَ جَاءَهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ وَ مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۖ كَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۵﴾

اس سے اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو چل دیتا ہے جیسے اس نے ہمیں کسی تکلیف کی طرف، جو اسے پہنچی ہو، پکارا ہی نہیں۔ اسی طرح حد سے بڑھنے والوں کے لیے مزین بنا دیا گیا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۴﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تم سے پہلے بہت سے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے، جب انھوں نے ظلم کیا اور ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آئے اور وہ ہرگز ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے۔ اسی طرح ہم مجرم لوگوں کو جزا دیا کرتے ہیں ﴿۱۵﴾

جو ہی کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو لپٹتے، بیٹھتے اور کھڑے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے، لیکن اس کی بے وفائی کا یہ عالم ہے کہ جو ہی تکلیف دور ہوتی ہے اسی پہلے غرور میں بدست ہو جاتا ہے اور اپنی مصیبت اور تکلیف سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔ انسان کی اس عادت کا کئی آیات میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ دیکھیے لم اسجدہ (۵۱)، زمر (۳۹) اور ہود (۱۰، ۱۱)۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں انھی لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جن کا دعا کا طریقہ یہ ہے، البتہ وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور اپنی توفیق خاص سے نوازا ہے وہ ان میں شامل نہیں، کیونکہ وہ سختی اور نرمی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو پکارتے اور اسے یاد رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ وَ لَيْسَ ذَلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَصَابَتَهُ سَرَاءٌ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَ إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَاءٌ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ» [مسلم، الزهد، باب المؤمن أمره كله خير: ۲۹۹۹، عن صہیب رضی اللہ عنہ] ”مومن کا معاملہ عجیب ہے، کیونکہ اس کا ہر کام ہی خیر ہے اور یہ چیز (کمال) مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے کوئی خوشی حاصل ہو تو شکر کرتا ہے، پس وہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے، سو وہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔“ ”مُسْرِفِينَ“ (حد سے بڑھنے والوں) کو یہ نعمت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس آیت میں مذکور لوگوں کی طرح ان کے لیے ان کے اعمال بد ہی خوش نما بنا دیے گئے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان کے لیے ان کے اعمال کس نے خوش نما بنائے ہیں، آیت میں اس کا ذکر نہیں، کیونکہ وہ کئی چیزیں ہو سکتی ہیں: ① شیطان، فرمایا: ﴿وَ زُيِّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ﴾ [النمل: ۲۴] ”اور شیطان نے ان کے لیے ان کے عمل خوش نما بنا دیے۔“ ② نفس، فرمایا: ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ﴾ [یوسف: ۵۳] ”بے شک نفس تو برائی کا بہت حکم دینے والا ہے۔“

ہمارے لیے اس میں سبق یہ ہے کہ ہمیں مصیبت دور ہونے پر بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر اور دعا میں کمی نہیں کرنی چاہیے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَسْتَجِيبَ اللَّهُ لَهُ عِنْدَ الشَّدَائِدِ وَالْكَرْبِ فَلْيُكْثِرِ الدُّعَاءَ فِي الرِّخَاءِ» [ترمذی، کتاب الدعوات، باب أن دعوة المسلم مستجابة: ۳۳۸۲، و حسنة الألبانی] ”جسے پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ سختیوں اور مصیبتوں میں اس کی دعا قبول فرمائے تو وہ خوش حالی میں کثرت سے دعا کیا کرے۔“

بیت 12 : وَ لَقَدْ أَهَلَكْنَا الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ قرن سے مراد ایک عہد کے لوگ ہیں، یہاں مراد ایسی اقوام ہیں

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلِيفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿۱۴﴾ وَإِذَا نُمِّلُ عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا إِنَّتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدِّلُهُ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تَلْقَائِي نَفْسِي إِنْ أَتَيْتُ إِلَّا مَا يُؤْتَى إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۵﴾

پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین میں جانشین بنا دیا، تاکہ ہم دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو ﴿۱۴﴾ اور جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کوئی قرآن اس کے سوا لے آ، یا اسے بدل دے۔ کہہ دے میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں، میں پیروی نہیں کرتا، مگر اسی کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، بے شک میں اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۱۵﴾

جنہوں نے اپنے اپنے دور میں عروج حاصل کیا، پھر ظلم کی وجہ سے ملیا میٹ کر دی گئیں، یا عروج سے زوال میں جا گریں۔ یہ دونوں صورتیں ہی ہلاکت ہیں۔ اوپر بتایا کہ ان کی بددعا اور طلب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب نہ اترنے میں سراسر اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، پھر ان کا حال یہ ہے کہ تکلیف نازل ہونے پر آہ و زاری کرنے لگتے ہیں، اب انہیں ڈرایا جا رہا ہے کہ تمہاری بد اعمالیوں کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب ٹل جائے تو تمہیں بے فکر نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ایک نہ ایک دن ان بد اعمالیوں کی سزا تو مل کر ہی رہے گی۔ تمہیں چاہیے کہ پہلی مجرم قوموں کے حالات پر غور کرو کہ آخر ان کا انجام کیا ہوا۔

آیت ۱۴ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلِيفَ یعنی ان کے بعد تمہیں زمین میں ان کے جانشین بنایا، اگر تم بھی ان کی طرح ظلم و سرکشی پر کمر بستہ رہو گے تو تمہاری تباہی بھی یقینی ہے۔ یہ خطاب ان تمام لوگوں کو ہے جن کی طرف رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔

آیت ۱۵ ﴿۱﴾ وَإِذَا نُمِّلُ عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ اس سے پچھلی آیات میں مشرکین کو مخاطب کیا تھا، یہاں ان کا ذکر غائب کے سینے سے کیا ہے، اسے التفات کہتے ہیں اور یہاں اس سے مقصود مشرکین کی تحقیر اور ان پر ناراضگی کا اظہار ہے کہ یہ بے عقل لوگ خطاب کے قابل ہی نہیں ہیں۔ مشرکین کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور شرک کی تردید کا ذکر اور آخرت پر یقین کی بات سننا کسی طرح گوارا نہ تھا۔ وہ آیات الہیٰ سن کر مطالبہ کرتے کہ اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لائیں، جس میں ہمارے لیے یہ تکلیف دہ باتیں نہ ہوں، بلکہ کچھ ہماری پسندیدہ باتیں بھی ہوں، اللہ کے سوا بھی کسی داتا، دستگیر، مشکل کشا، بگڑی بنانے والے کے اختیارات مذکور ہوں، اگر پورا قرآن اور نہیں لاسکتے تو اس میں ہماری خاطر داری کے لیے کچھ اپنے پاس ہی سے تبدیلیاں کر دیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ ان سے کہہ دیں کہ پورا قرآن اور لانا تو بہت دور کی بات ہے میں تو اس میں اپنی طرف سے ایک شوشہ بھی نہیں بدل سکتا۔ میرا کام نہ قرآن تصنیف کرنا ہے، نہ اس میں ترمیم، تبدیلی یا اضافہ کرنا۔ میرا کام صرف یہ

قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُمْ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمَرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۗ
 أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۶﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُغْلِبُ

المَجْرُمُونَ ﴿۱۶﴾

کہہ دے اگر اللہ چاہتا تو میں اسے تم پر نہ پڑھتا اور نہ وہ تمہیں اس کی خبر دیتا، پس بے شک میں تم میں اس سے پہلے ایک عمر رہ چکا ہوں، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟ ﴿۱۶﴾ پھر اس سے زیادہ کون ظالم ہے جو اللہ پر کوئی جھوٹ باندھے، یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ مجرم لوگ فلاح نہیں پاتے ﴿۱۶﴾

ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئے وہ پہنچا دوں، اگر میں ایسی کسی حرکت کا ارتکاب کروں گا تو میں اپنے رب کے عذاب سے ڈرتا ہوں جو بہت بڑے دن میں واقع ہونے والا ہے۔

﴿۱۶﴾ بعض مفسرین نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ مشرکین رسول اللہ ﷺ پر تہمت لگاتے تھے کہ قرآن انھوں نے خود ہی تصنیف کیا ہے، اب اپنی اس بات کا ثبوت حاصل کرنے کے لیے وہ آپ سے کوئی اور قرآن لانے کا یا اس میں اپنے پاس سے تبدیلی کا مطالبہ کرتے تھے کہ اگر آپ یہ مطالبہ مان لیں گے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ قرآن خود انھی کا تصنیف کردہ ہے، پھر ہمیں آپ کو جھٹلانے اور مذاق اڑانے کا موقع مل جائے گا۔ کفار کی مراد پہلی تفسیر اور اس تفسیر میں مذکور دونوں باتیں ہی ہو سکتی ہیں اور ہیں۔

آیت ۱۶ : قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُمْ : "تَلَوْتُ" "نَلَا يَتَلَوْنَ نَلَاوَةً" (ن) سے واحد متکلم ماضی معلوم کا صیغہ ہے۔ "مَا تَلَوْتُمْ" میں اسے نہ پڑھتا۔ "أَدْرَى" یہ "ذَرَى يَذْرَى" (ض) (جاننا، معلوم کرنا) سے باب افعال "أَذْرَى يَذْرَى" کا ماضی معلوم واحد غائب کا صیغہ ہے۔ "وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ" اور نہ وہ تمہیں اس کی خبر دیتا، یا تمہیں یہ معلوم کرواتا۔ مطلب یہ ہے کہ میں نبوت سے پہلے ایک عمر، یعنی چالیس برس تم میں رہا، اس ساری مدت میں تم سب جانتے ہو کہ نہ مجھے پڑھنا آتا تھا نہ لکھنا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَلَوْنَ مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخْطَطِ بِبَيْمِينِكَ إِذَا الْأَرْزَابُ الْمُنْبِطُونَ﴾ [العنکبوت: ۴۸] "اور اس سے پہلے تو نہ کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اسے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا، اس وقت باطل والے ضرور شک کرتے۔" اور دیکھیے سورہ شوریٰ (۵۲، ۵۳) اور تم سب کا میرے صدق اور امانت پر بھی اتفاق ہے۔ دیکھیے سورہ انعام (۲۳) تو کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ قرآن جس کی سب سے چھوٹی سورت کی مثل پیش کرنے سے اللہ کے سوا پوری کائنات عاجز ہے، وہ میں نے کیسے تصنیف کر لیا اور تم اعتبار کیوں نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ وہ اسے مجھ پر نازل کرتا، نہ میں اسے پڑھ کر تمہیں سنانا اور نہ وہ اس کی خبر تمہیں دیتا۔ اب کوئی اور قرآن میں کہاں سے لاؤں، یا اس میں اپنے پاس سے تبدیلی کیسے کروں؟ یہ بات میرے امکان اور میرے بس میں ہی نہیں۔

آیت ۱۷ : فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ : یعنی اگر یہ قرآن میں نے خود تصنیف کر لیا ہے، جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو میں نے

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ ۗ قُلْ أَتَدْعُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۗ سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰى عَنَّا يُشْرِكُونَ ﴿۱۸﴾

اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں ﴿۱۸﴾

اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا، جس سے بڑا کوئی گناہ نہیں، مگر اس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا اوپر کے دلائل سے ثابت ہو چکا ہے، اس کے بعد بھی اگر تم نے اس کی آیات کو جھٹلایا تو تم سے بڑا ظالم اور گناہ گار کوئی نہیں اور ایسے گناہ گار اور مجرم کبھی فلاح نہیں پاسکتے۔

آیت 18 ﴿۱۸﴾ وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ : مکہ کے مشرک اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کرتے تھے اور کچھ اور ہستیوں کو بھی غائبانہ پکارتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم انھیں اللہ تعالیٰ نہیں مانتے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ سے ہمارے کام کروا دیتے ہیں (دیکھیے زمر: ۳) اللہ تعالیٰ ان کی سفارش رد نہیں کرتا، حالانکہ وہ نہ انھیں کوئی فائدہ پہنچا سکتے تھے نہ نقصان (دیکھیے مائدہ: ۷۶۔ فرقان: ۳) بلکہ ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ کوئی ہمیں پکار رہا ہے یا ہماری پوجا کر رہا ہے۔ یہی حال ہمارے زمانے کے ان لوگوں کا ہے جو پیروں فقیروں کو حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہیں اور مردہ اولیاء اللہ کی قبروں کو سجدہ کرتے، ان کا طواف کرتے، ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور ان کے سامنے عاجزی سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ انھیں سمجھانے کے لیے جب کوئی بات کی جاتی ہے تو وہ یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم ان بزرگوں کو یہ سمجھ کر تو سجدہ نہیں کرتے اور نہ ان سے مرادیں مانگتے ہیں کہ یہ خود اللہ تعالیٰ ہیں، بلکہ انھیں صرف اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا سفارشی سمجھتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ان کا اتنا زور ہے اور ان کی محبت میں وہ ایسا مجبور ہے کہ وہ ان کی کوئی سفارش رد نہیں کر سکتا۔ اسی چیز کا جواب اگلے جملے میں دیا جا رہا ہے۔

﴿۱۹﴾ قُلْ أَتَدْعُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ : یعنی اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کی ہر بات اور ہر چیز کو جانتا ہے، بلکہ وہی انھیں پیدا کرنے والا اور ہر لمحہ پالنے والا ہے، تو وہ کیسے بے خبر ہو سکتا ہے۔ اگر معاذ اللہ، تمہارے یہ بت یا زندہ و مردہ معبود اس کے شریک یا سفارشی ہوتے تو وہ انھیں بھی ضرور جانتا ہوتا، جب وہ ان میں سے کسی کے بھی شریک یا سفارشی ہونے سے انکار کر رہا ہے تو معلوم ہوا کہ ان کا کوئی وجود یا حقیقت نہیں، اب تمہارے ان کو شریک یا سفارشی اور نفع و نقصان پہنچانے والے ماننے پر اصرار کا مطلب یہی ہے کہ اللہ کو تو آسمان و زمین میں کوئی ایسی ہستی معلوم نہیں ہے مگر تم اسے وہ چیز بتا رہے ہو جو اس کے علم ہی میں نہیں۔ معلوم ہوا تمہارا یہ کہنا اور اس کی بنیاد پر کیے جانے والے تمہارے سب افعال بالکل بے ہودہ اور لغو ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان مشرکوں کے شرک سے ہر طرح سے پاک اور بے حد بلند ہے، وہ نہ کسی مددگار کا محتاج ہے نہ کسی سفارشی کے ہاتھوں مجبور۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۗ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ
فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۹﴾ وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْعَيْبُ لِلَّهِ
فَاتَنْظَرُوا ۗ إِنِّي نَعَمُ مِنَ الْمُنْتَظَرِينَ ﴿۲۰﴾

۲۰

اور نہیں تھے لوگ مگر ایک ہی امت، پھر وہ جدا جدا ہو گئے اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو حیرے رب کی طرف سے پہلے
طے ہو چکی تو ان کے درمیان اس بات کے بارے میں ضرور فیصلہ کر دیا جاتا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں ﴿۱۹﴾
اور وہ کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی؟ سو کہہ دے غیب تو صرف اللہ کے
پاس ہے، پس انتظار کرو، بے شک میں (بھی) تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں ﴿۲۰﴾

آیت ۱۹ ﴿۱۹﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا : اس زمانے کے محد فلسفیوں اور تاریخ سازوں کے برعکس
قرآن بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ انسانیت کی ابتدا کفر یا شرک سے نہیں بلکہ خالص توحید سے ہوئی۔ ابتدا میں تمام انسان ایک
ہی دین، یعنی اسلام رکھتے تھے اور ایک ہی ان کی ملت تھی، لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے اس دین سے انحراف کیا اور اپنی
خواہشات کے پیچھے لگ کر آپس میں اختلاف کر کے اپنی اپنی مرضی کے دین اور قانون گزریے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۱۳)۔

آیت ۲۰ ﴿۲۰﴾ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ فیصلہ نہ کر لیا ہوتا کہ دنیا میں لوگوں کو مہلت دی جائے گی، تاکہ
وہ اپنی عقل و فہم سے کام لے کر جس راستے کو چاہیں اختیار کریں اور جس راستے کو چاہیں چھوڑ دیں اور قیامت ہی کے دن
انہیں ان کے اچھے یا برے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا تو کبھی کا اللہ تعالیٰ حقیقت کو بے نقاب کر کے ان لوگوں کو پکڑ چکا ہوتا جو
ایمان کا راستہ چھوڑ کر کفر و شرک کے راستے پر چل رہے ہیں۔ (ابن کثیر، قرطبی)

آیت ۲۰ ﴿۲۰﴾ وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ : مثلاً یہ مکہ کے سب پہاڑ سونے کے کر دیتا، ہمارے باپ دادا
کو زندہ کر کے ہمارے سامنے لا کھڑا کرتا، یا کوئی فرشتہ اتار دیتا جو ہمارے ساتھ بازاروں اور گلی کو چوں میں چل پھر کر اعلان
کرتا کہ واقعی محمد (ﷺ) کو اللہ ہی نے اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل (۹۳ تا ۹۰) میں ان کی معجزوں کی کئی
فرمائشیں ذکر ہوئی ہیں۔

آیت ۲۰ ﴿۲۰﴾ فَقُلْ إِنَّمَا الْعَيْبُ لِلَّهِ یعنی اللہ کے سوا کوئی غیب کی بات نہیں جانتا، لہذا مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس قسم کی کوئی نشانی
اتارے گا کہ نہیں اور اگر اتارے گا تو کب اتارے گا۔ نشانی اتارنا یا نہ اتارنا اس کی مرضی پر موقوف ہے، اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ
نشانی اتارے گا تب تم ایمان لاؤ گے تو بیٹھے انتظار کرتے رہو، میں بھی دیکھوں گا تمہارا یہ مطالبہ پورا ہوتا ہے یا نہیں۔ (مگر
تمہارے جیسے لوگوں کے متعلق تجربہ یہی ہے کہ وہ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے، بلکہ ایمان نہ لانے کا بہانہ بنانے کے لیے
معجزے کو بھی جھٹلا دیتے ہیں۔ دیکھیے انعام: ۷، ۱۱۱۔ بنی اسرائیل: ۵۹)۔

وَإِذَا آذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا وَإِذَا آذَيْنَاهُمُ مَكْرًا فِي آيَاتِنَا قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿۲۱﴾ هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَرَبَ بِكُمْ يَرِيحٌ كَلْبِيَّةٌ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ؕ لَئِنِ أَلْبَيْتُنَا مِنْ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۲۲﴾

اور جب ہم لوگوں کو کوئی رحمت چکھاتے ہیں، کسی تکلیف کے بعد، جو انھیں پہنچی ہو، تو اچانک ان کے لیے ہماری آیات کے بارے میں کوئی نہ کوئی چال ہوتی ہے۔ کہہ دے اللہ چال میں زیادہ تیز ہے بے شک ہمارے بھیجے ہوئے لکھ رہے ہیں جو تم چال چلتے ہو ﴿۲۱﴾ وہی ہے جو تمہیں خشکی اور سمندر میں چلاتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انھیں لے کر عمدہ ہوا کے ساتھ چل پڑتی ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتے ہیں تو ان (کشتیوں) پر سخت تیز ہوا آجاتی ہے اور ان پر ہر جگہ سے موج آجاتی ہے اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ ان کو گھیر لیا گیا ہے، تو اللہ کو اس طرح پکارتے ہیں کہ ہر عبادت کو اس کے لیے خالص کرنے والے ہوتے ہیں، یقیناً اگر تو نے ہمیں اس سے نجات دے دی تو ہم ضرور ہی شکر کرنے والوں سے ہوں گے ﴿۲۲﴾

آیت 21 ﴿۱﴾ إِذَا أَنَّهُمْ مَكْرًا فِي آيَاتِنَا: یعنی جب ہم لوگوں کو بیماری کے بعد شفا، قحط کے بعد خوش حالی، جنگ کے بعد امن یا انھیں پہنچنے والی کسی بھی تکلیف کے بعد اپنی کسی رحمت کی لذت چکھاتے ہیں تو ہمارے شکر گزار ہو کر ہماری توحید اور ہمارے رسول کی رسالت ماننے کے بجائے اسے جھٹلانے اور اس کا مذاق اڑانے کی کوئی نہ کوئی چال اختیار کرتے ہیں۔ ”مکر“ کا معنی خفیہ تدبیر ہے، جو شر کے لیے ہو، یہ لفظ کبھی خیر کے لیے بھی استعمال ہو جاتا ہے، یا مقابلے میں بول لیا جاتا ہے۔ کفار کی اس عادت کی مثال فرعون کا پے در پے معجزے دیکھ کر انھیں جادو کہہ کر ایمان لانے سے انکار ہے۔ دیکھیے سورہ اعراف (۱۳۰ تا ۱۳۶) انسان کی اس عادت کا تذکرہ سورہ زمر (۸)، ہود (۱۰) اور اعراف (۹۵) میں بھی کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا: اللہ کی چال سے مراد وہ سزا ہے جو وہ مشرکین کو ان کی مکاریوں اور چال بازیوں پر دیتا ہے اور وہ ہے اس کا انھیں ان کی باغیانہ روش پر چھوٹ دینا اور انھیں اپنے رزق اور نعمتوں سے نوازتے رہنا، تاکہ وہ جی بھر کر اپنا نامہ اعمال سیاہ کرتے رہیں۔

﴿۳﴾ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ: یعنی جب تمہارا نامہ اعمال خوب سیاہ ہو جائے گا تو اچانک موت کا پیغام آجائے گا اور تم اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے دھر لیے جاؤ گے۔ شاہ عبدالقادر بریلویؒ لکھتے ہیں: ”دستی کے وقت آدمی کی نظر اسباب سے اٹھ کر اللہ پر رہتی ہے، جب کام بن گیا تو لگا اسباب پر نگاہ رکھنے۔ سو ڈرتا نہیں کہ اللہ پھر کوئی سبب کھڑا کر دے اسی تکلیف کا، سب اسباب اس کے ہاتھ میں (ہر وقت) تیار ہیں، ایک اسی کی صورت آگے اور فرمائی۔“ (موضح)

آیت 22 ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ: اس آیت میں بھی پہلے مشرکین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وہی ہے

فَلَمَّا أَجْتَهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغَيْتُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ مَقَاتِعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۳﴾

پھر جب اس نے انہیں نجات دے دی اچانک وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمہاری سرکشی تمہاری جانوں ہی پر ہے، دنیا کی زندگی کے فائدے کے لیے، پھر ہماری ہی طرف تمہارا لوٹ کر آنا ہے، تو ہم تمہیں بتائیں گے جو کچھ تم کیا کرتے تھے ﴿۲۳﴾

جو تمہیں خشکی اور سمندر میں چلاتا ہے۔ آگے چل کر ان کا ذکر غائب کے ساتھ کیا کہ وہ کشتیاں انہیں لے کر چل پڑتی ہیں۔ مخاطب کو غائب کے الفاظ سے ذکر کرنا التفات کہلاتا ہے۔ یہ التفات بھی ناراضگی کے اظہار کے لیے ہے کہ یہ لوگ اپنی بد عہدی کی وجہ سے خطاب کے قابل نہیں، اس لیے ان کا غائب کے صیغے سے ذکر فرمایا کہ جب وہ کشتیاں موافق اور طیب ہوا کے ساتھ ان کی خواہش کے مطابق چل رہی ہوتی ہیں تو اچانک تند و تیز آندھی آ جاتی ہے اور انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ گھیرے میں آ چکے ہیں، اب اگر اللہ تعالیٰ نہ بچائے تو بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

﴿۲۳﴾ دَعَا اللَّهُ لِمَنْ خَلَصِنَا لَهُ الَّذِينَ: تو یہ مشرک لوگ (جو خطاب کے قابل ہی نہیں ہیں) اپنی پوری عبادت اور اطاعت ایک اللہ کے لیے خالص کر کے صرف اسی کو پکارتے ہیں اور اپنے تمام معبودوں اور بتوں کو بھول جاتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے آہ و زاری کرتے ہیں۔ (ابن کثیر)

﴿۲۴﴾ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ: یہ تو اللہ تعالیٰ نے مشرکین عرب کا حال بیان فرمایا ہے، مگر ہمارے زمانے کے بعض نام کے مسلمانوں کا حال ان سے بھی بدتر ہے، ان پر جب کوئی بڑی مصیبت آتی ہے، مثلاً دریا میں ڈوبنے یا آگ میں جلنے لگتے ہیں تو بھی شرک سے توبہ نہیں کرتے اور وہی ”یا خواجہ خضر“ ”یا علی مدد“ کا نعرہ لگاتے ہیں، مرتے اور ڈوبتے وقت بھی اللہ کو نہیں پکارتے۔ [لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ]

آیت 23 ﴿۲۳﴾ فَلَمَّا أَجْتَهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ..... یعنی طوفان سے بچ نکلنے پر پھر وہی ناحق سرکشی اور ظلم شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ مشرکین کے اس رویے کا ذکر فرمایا ہے۔ دیکھیے سورہ عنکبوت (۶۵، ۶۶) اور لقمان (۳۲) ہاں، کوئی سعادت مند ہو تو اپنے عہد پر قائم رہتا ہے گمراہی سے گریز کرتا ہے، جیسا کہ سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن چار مردوں اور دو عورتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہ جہاں پائے جائیں قتل کر دیے جائیں۔ ان میں سے ایک عمرہ بن ابو جہل بھی تھے۔ عمرہ نے یہ سنا تو سمندر کے راستے راہ فرار اختیار کی، لیکن جب سفر شروع ہوا تو کشتی والوں کو تند و تیز ہوائے آلیا۔ (لوگ اپنے اپنے خداؤں کو پکارنے لگے) کشتی والوں نے کہا: «أَخْلَصُوا فَإِنَّ إِلَهَكُمْ لَا يُغْنِي عَنْكُمْ شَيْئًا هَهُنَا، فَقَالَ عِكْرِمَةُ وَاللَّهِ لَئِنْ لَمْ يُنَجِّنِي مِنَ الْبَحْرِ إِلَّا الْإِحْلَاصُ لَا يُنَجِّنِي فِي الْبَرِّ غَيْرَهُ، اللَّهُمَّ إِنَّ لَكَ عَلَيَّ عَهْدًا إِنْ أَنْتَ عَافَيْتَنِي مِمَّا أَنَا فِيهِ أَنْ آتِي مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى أَضَعَ يَدِي فِي

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ
النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّى إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَدِرُونَ
عَلَيْهَا دَأَبُهَا أَمْرًا قَلِيلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَبِ بِالْأَمْسِ كَذَلِكَ نَقُصُّ

الْآيَةُ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿١٣﴾

دنیا کی زندگی کی مثال تو بس اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا تو اس کے ساتھ زمین سے اگنے والی چیزیں خوب مل جل گئیں، جس سے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمین نے اپنی آرائش حاصل کر لی اور خوب مزین ہو گئی اور اس کے رہنے والوں نے یقین کر لیا کہ وہ اس پر قادر ہیں تو رات یا دن کو اس پر ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اسے کٹی ہوئی کر دیا، جیسے وہ کل تھی ہی نہیں۔ اسی طرح ہم ان لوگوں کے لیے آیات کھول کر بیان کرتے ہیں جو خوب سوچتے ہیں ﴿۱۳﴾

فَلَا جِدْنَهُ عَفْوًَا كَرِيمًا فَجَاءَ فَمَا سَلِمَ ﴿﴾ [نسائی، تحریم الدم، باب الحکم فی المرتد: ۴۰۷۲، وصححه الألبانی] ”خالص اللہ کو پکارو، کیونکہ اس وقت یہاں تمہارے (خود ساختہ) معبود تمہارے کچھ کام نہیں آئیں گے۔“ نکرہ نے (دل میں) کہا: ”اللہ کی قسم! اگر سمندر میں نجات صرف اللہ تعالیٰ کی ذات دے سکتی ہے تو پھر خشکی میں بھی اس کے سوا کوئی نجات نہیں دے سکتا، اے اللہ! اگر تو نے مجھے اس طوفان سے نجات دے دی تو میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ میں محمد (ﷺ) کے پاس جا کر اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دوں گا، کیونکہ میں انہیں بہت درگزر کرنے والا، مہربان پاتا ہوں۔“ چنانچہ وہ آئے اور مسلمان ہو گئے۔“

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغِيكُمُ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ.....﴾: یعنی اس سرکشی کا وبال تمہاری اپنی ہی جانوں پر ہے، اس سے تم کسی اور کو نقصان نہیں پہنچا سکو گے، دنیوی زندگی کا تھوڑا سا فائدہ اٹھا لو، آخر تمہیں ہمارے پاس ہی آنا ہے، پھر ہم تمہیں بتلائیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو، یعنی پھر ہم تمہیں ایسی سزا دیں گے جس سے تمہیں بتا چل جائے گا کہ تم کتنا بھاری ظلم کرتے رہے ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿مَا مِنْ ذَنْبٍ أَجْدَرُ أَنْ يُعَجِّلَ اللَّهُ تَعَالَىٰ لِصَاحِبِهِ الْعُقُوبَةَ فِي الدُّنْيَا مَعَ مَا يَدَّخِرُ لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِثْلُ الْبَغْيِ وَقَطِيعَةِ الرَّحِمِ﴾ [ابوداؤد، الأدب، باب فی النهی عن البغی: ۴۹۰۲، عن أبي بکرہ ؓ] ”کوئی گناہ اس لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی سزا دنیا میں بھی جلدی دے اور اس کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی اس کی سزا باقی رکھے سوائے ظلم و زیادتی اور قطع رحمی کے۔“

آیۃ 24 ﴿إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا.....﴾: بھجلی آیت میں ذکر تھا کہ تم یہاں جتنی بھی سرکشی کر لو یا لذتوں میں مست ہو کر ہماری آیات کو جھٹلاؤ، یہ دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا سامان ہے اور بہت جلد فنا ہو جانے والا ہے۔ اس آیت میں اس کی مثال بیان فرمائی کہ آسمان سے پانی برسنے سے زمین میں سے لوگوں کے اور ان کے چوپاؤں کے کھانے اور لذت حاصل کرنے

وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۲۵﴾

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے تک پہنچا دیتا ہے ﴿۲۵﴾

کے لیے مختلف فصلیں، کھیتیاں، چارا اور پھل پیدا ہوئے، پھر خوب پھلے پھولے، زمین سب گئی، مالک کھنے لگے کہ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کی اور اس سے غلہ، میوے اور سبزیاں حاصل کرنے کی پوری قدرت حاصل ہے۔

﴿۲﴾ اَتْمَهَا اَمْزَنًا لَّيْلًا اَوْ نَهَارًا : ”اَمْزَنًا“ سے مراد اس کے فنا کا حکم ہے، خواہ وہ پک کر زرد ہو گئی ہو اور کاٹ لی گئی ہو، یا پھر کسی دشمن نے کچی ہی برباد کر دی ہو، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی آفت سیلاب، پالے، آگ یا طوفان کی شکل میں آپڑی کہ پکنے سے پہلے کچی ہی اس طرح کٹ کر ناپید ہو گئی ہو یا کبھی یہاں رہی ہی نہیں۔ ”مَحْصِيْدًا“ بمعنی ”مَحْصُوْدًا“ یعنی کٹی ہوئی۔

﴿۳﴾ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بِالْاَنْفُسِ : ”لَمْ تَكُنْ“ ”غَيْبِي نَفْسِي“ (ع) کسی جگہ رہنا۔ یہی حال انسانی زندگی کا ہے، روح پانی کی طرح آسمان سے اترتی ہے اور بدن اس سے مل کر خوب پھلتا پھولتا ہے، جب جوانی پر آتا ہے تو علم و ہنر سیکھتا ہے اور امید ہو جاتی ہے کہ چند روز جی کر مزے اڑائیں گے، گھر والوں کو یقین ہوتا ہے کہ اب کما کر لائے گا کہ یکا یک موت آجاتی ہے اور تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیتی ہے اور ایسے معلوم ہوتا ہے ”كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بِالْاَنْفُسِ“ (جیسے وہ کل تھا ہی نہیں)، کچھ مدت بعد وہ ذہنوں سے بھی محو ہو جاتا ہے اور اگر وہ اپنی عمر پوری بھی کر لے تو جس طرح پکی ہوئی کھیتی کاٹ لی جاتی ہے یا خود بخود ہی چوراہن کر بکھر جاتی ہے، اسی طرح بڑھاپے کے بعد یہ بھی فنا کی نذر ہو جاتا ہے۔ سورہ حدید (۲۰) اور قلم (۱۷ تا ۲۳) میں بھی دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اسی طرح بیان فرمایا ہے۔ اسی لیے ایک لمبی حدیث میں آیا ہے: ﴿يُؤْتِي بِاَنْعَمِ اَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ اَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُصْبَعُ فِي النَّارِ صَبْغَةً ثُمَّ يُقَالُ هَلْ رَأَيْتَ خَيْرًا قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ نَعِيمٌ قَطُّ؟ فَيَقُولُ لَا وَاللَّهِ! يَا رَبِّ! وَيُؤْتِي بِاَشَدِّ النَّاسِ بُؤْسًا فِي الدُّنْيَا مِنْ اَهْلِ الْحَنَّةِ فَيُقَالُ لَهُ يَا ابْنَ اٰدَمَ! هَلْ رَأَيْتَ بُؤْسًا قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ شِدَّةٌ قَطُّ؟ فَيَقُولُ لَا وَاللَّهِ! يَا رَبِّ! مَا مَرَّ بِي بُؤْسٌ قَطُّ وَلَا رَأَيْتُ شِدَّةً قَطُّ﴾ [صفات المنافقين، باب صبغ اَنْعَمِ اَهْلِ الدُّنْيَا فِي النَّارِ: ۲۸۰۷، عن اَنْسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ] ”قیامت کے دن اس شخص کو جو اہل جہنم میں سے دنیا میں سب سے زیادہ خوش حال تھا، لایا جائے گا، اسے آگ میں ایک غوطہ دے کر نکالا جائے گا، پھر اس سے پوچھا جائے گا: ”کیا تم نے کبھی کوئی خوشحالی دیکھی، کیا تیرے پاس آسودگی آئی؟“ وہ جواب دے گا: ”نہیں اللہ کی قسم! اے میرے رب!“ پھر اہل جنت میں سے اس شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ بد حال تھا، اسے جنت میں ایک غوطہ دے کر نکالا جائے گا، پھر اس سے پوچھا جائے گا: ”کیا تم نے دنیا میں کوئی بد حال دیکھی، یا کوئی سختی پہنچی؟“ وہ جواب دے گا: ”نہیں اللہ کی قسم! اے میرے رب! مجھے کوئی سختی نہیں پہنچی اور میں نے کوئی بد حالی نہیں دیکھی۔“

﴿۴﴾ يَتَذَكَّرُونَ : تاکہ ان پر غور کریں اور ان سے سبق حاصل کریں۔

آیت 25 وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى دَارِ السَّلَامِ : اوپر کی آیت میں دنیا اور اس کے بہت جلد زوال کا ذکر کر کے لوگوں کو اس کی طرف مائل ہونے سے نفرت دلائی، اب اس آیت میں جنت کی ترغیب دی اور جنت کا نام ”دار السلام“ رکھا۔ دیکھیے سورہ انعام

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَ زِيَادَةٌ ۗ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ ۗ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
الْجَنَّةِ ۗ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۶﴾

جن لوگوں نے نیکی کی انھی کے لیے نہایت اچھا بدلہ اور کچھ زیادہ ہے اور ان کے چہروں کو نہ کوئی سیاہی ڈھانپے گی اور نہ کوئی ذلت، یہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۶﴾

(۱۲۷ تا ۱۲۵) یعنی جو ہر قسم کے آفات و آلام سے پاک ہے اور اس میں سلامتی ہی سلامتی ہے، فرشتے ہر طرف سے اس میں سلام کریں گے اور اہل جنت بھی ایک دوسرے کو سلام کا تحیہ پیش کریں گے، فرمایا: ﴿تَحِيَّاتُهُمْ فِي سَلَامٍ﴾ [یونس: ۱۰] ”اور ان کی آپس کی دعا ان (بانات) میں سلام ہوگی۔“ رب رحیم کی طرف سے بھی سلام کی نعمت سے سرفراز ہوں گے، فرمایا: ﴿سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِيمٍ﴾ [یونس: ۵۸] ”سلام ہو، اس رب کی طرف سے کہا جائے گا جو بے حد مہربان ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے جنت کی دعوت رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے دی ہے، چنانچہ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبریل اور میکائیل نے آپس میں میرے لیے ایک مثال بیان کی کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک محل بنایا، پھر اس میں ایک شان دار دعوت کا اہتمام کیا اور لوگوں کو بلانے کے لیے ایک بلانے والا بھیجا، پس جس شخص نے اس بلانے والے کے کہنے کو قبول کیا وہ تو محل میں بھی داخل ہوگا اور کھانا بھی کھائے گا اور جو بلانے والے کے کہنے کو قبول نہیں کرے گا وہ نہ تو محل میں داخل ہوگا اور نہ کھانا کھائے گا، پھر انھوں نے کہا، اس کے لیے اس کی وضاحت کرو، تاکہ یہ سمجھ جائے! تو ایک نے کہا کہ وہ محل جنت ہے اور اس کی طرف بلانے والے محمد ﷺ ہیں، تو جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی، تو اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور محمد ﷺ لوگوں کے (اچھے برے کے) درمیان فرق (کرنے والے) ہیں۔ [بخاری، الاعتصام بالکتاب والسنة، باب الاعتداء بسنن رسول اللہ ﷺ: ۷۲۸۱]

آیت 26 : لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَ زِيَادَةٌ : احسان کی تفسیر حدیث جبریل میں ہے، فرمایا: ﴿أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ﴾ [بخاری، الإيمان، باب سؤال جبریل النبی ﷺ: ۵۰] ”اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اسے دیکھ رہے ہو، سوا اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو یقیناً وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔“ مقصد یہ کہ خلوص کے ساتھ اللہ کی بندگی کرنے والوں کو جنت کے ساتھ ایک عظیم زائد چیز بھی عطا ہوگی۔ ”زیادۃ“ میں تکبیر تعظیم کے لیے ہے۔

جنت کی دعوت دینے کے بعد اس کی سعادتوں کا ذکر فرمایا۔ اس آیت کریمہ میں ”الْحُسْنَىٰ“ جو ”أَحْسَنُ“ کی مؤنث ہے، اس کا معنی سب سے اچھا بدلہ ہے اور فرمایا ایک عظیم زائد چیز بھی ہے۔ ”زیادۃ“ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، اس ”زیادۃ“ سے مراد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ یہی مفہوم سورۃ نساء (۱۷۳)، نور (۲۸) اور سورۃ ق (۲۵) میں بیان ہوا ہے۔ متعدد صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی یہی تفسیر فرمائی ہے، چنانچہ صحیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَ زِيَادَةٌ﴾ اور فرمایا: ”جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے تو اس وقت ایک منادی کرنے والا

وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءَ سَيِّئَاتِهِمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۵
 كَانُوا أَغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطْعًا مِّنَ الْإِثْمِ مُظْلِمًا ۝ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝۱۶

اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں، کسی بھی برائی کا بدلہ اس جیسا ہوگا اور انھیں بڑی ذلت ڈھانپے گی، انھیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا، گویا ان کے چہروں پر رات کے بہت سے کلمے اوڑھادیے گئے ہیں، جبکہ وہ اندھیری ہے۔ یہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ۝۱۵

پکارے گا: ”اے جنت والو! اللہ نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا، وہ چاہتا ہے کہ اسے بھی پورا کر دیا جائے۔“ وہ کہیں گے: ”وہ کون سا وعدہ ہے؟ کیا اس نے ہمارے میزان (نیک اعمال کے تول) بھاری نہیں کر دیے؟ کیا اس نے ہمارے چہرے روشن نہیں کر دیے، ہمیں جنت میں داخل اور آگ سے محفوظ نہیں کر دیا؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: «فِيكَشَفَ لَهُمُ الْحِجَابَ فَيَنْظُرُونَ إِلَيْهِ، قَالَ: «فَوَاللَّهِ! مَا أُعْطَاهُمْ شَيْئًا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلَيْهِ وَلَا أَقْرَبَ بِأَعْيُنِهِمْ» [مسند احمد: ۴/۳۲۳، ح: ۱۸۹۶۵۔ مسلم، الإيمان، باب إثبات رؤية المؤمنين.....: ۱۸۱] ”اس وقت ان کے لیے پردہ ہٹا دیا جائے گا اور وہ اپنے پروردگار کا دیدار کریں گے۔“ پھر فرمایا: ”اللہ کی قسم! انھیں اب تک ایسی کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی ہوگی جو انھیں اس دیدار سے زیادہ محبوب ہو اور اس میں ان کی آنکھوں کے لیے اس سے زیادہ ٹھنڈک ہو۔“ اس آیت کی تفسیر ایک دوسری آیت اور اس کی تفسیر سے بھی ہو سکتی ہے۔ دیکھیے سورہ توبہ (۷۲)۔

آیت ۲۷ ۝ وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ ۝ اور محسنین (نیکی کرنے والوں) کا بیان تھا، اب ان لوگوں کی حالت بیان کی جو سیئات (برائیوں) کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ”سَيِّئَاتِهِمْ“ میں توہین تکبر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”کسی بھی برائی“ کیا ہے۔ گزشتہ آیت میں ذکر ہے کہ نیکی کا بدلہ اس سے بہت اچھا، یعنی جنت اور مزید دیدار الہی کی صورت میں ملے گا، اب بتایا کہ برائی خواہ کوئی ہو اس کا بدلہ صرف اس کے برابر ملے گا، زیادہ یا کئی گنا نہیں ملے گا۔ انھیں بہت بڑی ذلت گھیرے ہوئے ہوگی، یعنی ”ذِلَّةٌ“ میں توہین و تعظیم کے لیے ہے۔

۝ مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِن عَاصِمٍ : حقیقت میں تو دنیا ہو یا آخرت، کہیں بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بچانے والا نہیں، مگر انسان دنیا میں بہت سے سہارے تلاش کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کے ذریعے سے میں نے اپنی مراد حاصل کر لی ہے، مگر آخرت میں اس قسم کے سب اسباب ختم ہو جائیں گے اور ہر ایک کو یہ یقین ہو جائے گا کہ اب اللہ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں، جیسا کہ سورہ قیامہ میں فرمایا: ﴿يَقُولُ الْإِنْسَانُ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ يَوْمَ ذَا الْحَرِّ إِذَا لِلْأَسْفَلِ سُقَاتٌ﴾ [القیامہ: ۱۰ تا ۱۲] ”اور انسان اس دن کہے گا کہ بھانگے کی جگہ کہاں ہے؟ ہرگز نہیں، پناہ کی جگہ کوئی نہیں، اس دن تیرے رب ہی کی طرف جا ٹھہرتا ہے۔“

۝ كَانُوا أَغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطْعًا مِّنَ الْإِثْمِ مُظْلِمًا ، ”عَشِي يَعْشِي“ (ع) ڈھانپنا۔ ”أَعْشَى يَعْشِي“ (افعال) کسی پر کوئی چیز ڈال دینا جو اسے ڈھانپ لے۔ ان کے چہروں کی حد سے بڑھی ہوئی سیاہی کو تشبیہ دی ہے کہ گویا اندھیری رات کے

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاءُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ

وَقَالَ شُرَكَاءُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِلَّا نَا تَعْبُدُونَ ﴿۲۸﴾

اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے جنہوں نے شریک بنائے تھے، کہیں گے اپنی جگہ ٹھہرے رہو، تم اور تمہارے شریک بھی، پھر ہم ان کے درمیان علیحدگی کر دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے ﴿۲۸﴾

اندھیروں کے کئی ٹکڑے ملا کر ان کے چہروں پر ڈال دیے گئے ہوں، جنہوں نے ان کو ڈھانپ رکھا ہو۔ مجرموں کے چہروں کی سیاہی کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر کیا ہے، مثلاً دیکھیے سورہ آل عمران (۱۰۶، ۱۰۷)، قیامہ (۲۵ تا ۲۲) اور محس (۲۸ تا ۲۸) ”مُظْلِمًا“ یہ ”اٹیل“ سے حال ہے۔

آیت 28 ﴿۱﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا: اس آیت میں بھی کفار کی ایک رسوائی بیان کی گئی ہے کہ جس دن ہم شروع سے آخر تک کے تمام جن وانس، مسلم و کافر اور نیک و بد کو اکٹھا کریں گے (دیکھیے کہف: ۳۷۔ مریم: ۹۳، ۹۴) اس دن شرک کرنے والوں اور جنہیں وہ شریک بناتے رہے ان سب کو بھی اکٹھا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی عظمت و رفعت کے اظہار کے لیے اپنا ذکر جمع کے صیغے سے کیا ہے کہ ”ہم“ جمع کریں گے۔ درنہ اللہ تعالیٰ کے واحد، احد ہونے میں کیا شک ہے، پورا قرآن ہی یہ سبھانے کے لیے نازل ہوا کہ وہ ذات پاک وحدہ لا شریک لہ ہے۔

﴿۲﴾ ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا.....: پھر ہم شرک کرنے والوں سے کہیں گے کہ تم اور جنہیں تم نے شریک بنایا تھا اپنی جگہ ٹھہرے رہو، تاکہ تمہارے لیے تمہارے شرک اور شرکاء کی حقیقت واضح ہو جائے۔

﴿۳﴾ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ: ان کے درمیان علیحدگی کرنے سے مراد ایک تو یہ ہے کہ مسلم و کافر الگ الگ کر دیے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَمَّا تَرَاوِ الْيَوْمَ آيَاتُ الْمَعْرُوفُونَ﴾ [نہس: ۵۹] ”اور الگ ہو جاؤ آج اے مجرمو!“ اور دیکھیے سورہ روم (۱۶ تا ۱۳)، (۳۳) اور ایک مطلب یہ ہے کہ شرک کرنے والوں کو اور ان کے قرار دیے گئے شرکاء کو اپنی اپنی جگہ ٹھہرنے کا حکم دے کر ان کی گفتگو کروائی جائے گی۔ شرک ان سے کہیں گے کہ ہم دنیا میں تمہاری عبادت کرتے رہے، مشکل کے وقت پکارتے رہے، اپنے نفع نقصان کا مالک سمجھتے رہے، قیامت کے دن تمہاری پناہ میں آ کر عذاب سے بچانے کی درخواست کرتے رہے۔

﴿۴﴾ وَقَالَ شُرَكَاءُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِلَّا نَا تَعْبُدُونَ: وہ شرکاء کہیں گے کہ تم ہماری عبادت تو نہیں کیا کرتے تھے، معلوم نہیں کس کی عبادت کرتے رہے ہو؟ دنیا میں جن لوگوں کی پرستش کی گئی ان میں سے کچھ وہ تھے جو اپنی پرستش کروانا چاہتے تھے، جیسے فرعون، ابلیس وغیرہ اور کچھ وہ تھے جو یہ نہیں چاہتے تھے، بلکہ اللہ کا شریک کسی کو بھی بنانے سے منع کرتے تھے، جیسے انبیاء و صالحین۔ اب جب اللہ تعالیٰ سب کو جمع کرے گا، تو وہ سب لوگ جن کی عبادت اور پرستش کی گئی اپنے پرستش کرنے والوں سے صاف لاتعلقی ہو جائیں گے، جو اپنی پرستش کروانا چاہتے تھے وہ بھی، جیسا کہ سورہ بقرہ (۱۶۵ تا ۱۶۷) میں مذکور ہے اور وہ

فَلَقَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ إِن كُنتَا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغْفِيلِينَ ﴿٢٥﴾

سوالد ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان کافی گواہ ہے کہ بے شک ہم تمہاری عبادت سے یقیناً بے خبر تھے ﴿۲۵﴾

بھی جو غیر اللہ کی پرستش سے منع کرتے تھے، جیسا کہ صبح علیہ السلام اور دوسرے انبیاء و صلحاء۔ ان سب کی اپنی عبادت کرنے والوں سے اور پوجنے پکارنے والوں سے صاف بری اور لاطلق ہونے کی کئی وجہیں ہوں گی، جن میں سے پہلی وجہ تو یہ ہوگی کہ یہ مشرک تو اللہ کے سوا کسی اور کو بھی عالم الغیب، ان کے حالات سے واقف اور ان کی فریاد سننے والا سمجھتے رہے اور یہ سمجھ کر دن رات یا علی یا حسن یا حسین یا دیگر یا داتا یا شکر گنج وغیرہ پکارتے رہے، جب کہ ان حضرات کو کچھ خبر ہی نہ تھی کہ کوئی ہمیں پکار رہا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ لَآ يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنِ دُعَائِهِمْ غَفْلُونَ ﴿۲۵﴾ وَإِنَّا حُشِرْنَا النَّاسَ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كُفْرِينَ ﴿۲۶﴾﴾ [الأحقاف: ۲۵، ۲۶] اور اس سے بڑھ کر کوئی گمراہ ہے جو اللہ کے سوا انہیں پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک اس کی دعا قبول نہیں کریں گے اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔ اور جب سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت سے منکر ہوں گے۔“

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا بھی کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے، جب کہ قرآن اتر ہی یہ بتانے کے لیے ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، مثلاً دیکھیے سورہ یونس (۱۰۶، ۱۰۷)، زمر (۳۸)، مومنون (۸۶، ۸۷)، جن (۲۱) اور بہت سی دیگر آیات۔ اس لیے تمام شرکاء کہیں گے کہ ہمارا اختیار ہی کچھ نہ تھا، معلوم نہیں تم کسے پکارتے تھے، بہر حال ہمیں تو نہیں پکارتے تھے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مشرک لوگ حقیقت میں صرف اپنے وہم و گمان کے بنائے ہوئے مشکل کشاؤں کی پرستش کرتے رہے، جب کہ وہ سب لوگ جن کو یہ پکارتے رہے، ایک بھی نہ اللہ کا شریک تھا نہ کسی اختیار کا مالک۔ اب اپنے گمان کی پوجا کر کے ان کے نام لگانے پر ان کو غصہ آئے گا۔ دیکھیے سورہ یونس (۶۶) چوتھی وجہ یہ ہوگی کہ ان ظالموں کے شرک کی وجہ سے ان انبیاء اور صالحین کی قیامت کے دن اللہ کے دربار میں پیشی پڑ جائے گی اور ان سے باز پرس ہوگی اور وہ اپنی صفائی اور لامعلومی کا عذر پیش کریں گے، تو ان کے شرک کی وجہ سے، سوال کی وجہ سے جو ان کے دل پر گزرے گی اور پیشی پڑنے پر جو فکر مندی ہوگی ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ اس کی وجہ سے وہ ان سے کس قدر بے زار اور ان کے کتنے زبردست دشمن ہوں گے۔ دیکھیے سورہ مائدہ (۱۱۶ تا ۱۱۸) رہے وہ بادشاہ اور پیر اور شیطان جو اپنی پرستش کروانا چاہتے تھے اور ان کو شرک پر لگانے والے تھے، وہ خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہوں گے، وہ ان کے قابو کہاں آئیں گے، حتیٰ کہ شیطان بھی کہے گا کہ میں نے تم پر کوئی فوج بھیجی تھی؟ محض تمہیں دعوت دی تھی، تم نہ ماننے، اب نہ میں کسی طرح تمہاری مدد کر سکتا ہوں نہ تم میری۔ دیکھیے سورہ ابراہیم (۲۱، ۲۲)۔

⑤ اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ شرک صرف پتھر کے بتوں یا قبروں کو پکارنے ہی کا نام نہیں بلکہ ان شخصیتوں کو پکارنا ہے جن کے وہ بت ہیں یا قبریں ہیں، ورنہ بت بنانے کی ضرورت کیا تھی، کسی بھی پتھر کو پوج لیتے، بت اور قبر کی نیاز اور سجدے کا صاف مطلب ان شخصیتوں کی پرستش ہے جن کے وہ بت یا قبریں ہیں۔ دیکھیے سورہ نوح کی آیت (۲۳) کی تفسیر۔

فَلَقَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا.....: یہ الفاظ قسم کے معنی میں بھی آتے ہیں۔ ”إِن كُنتَا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغْفِيلِينَ“ میں

هَذَا كَيْفَ تَبْلُغُوا كُلَّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ وَرُدُّوْا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ وَصَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۳۰﴾ قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدْبِرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۳۱﴾

اس موقع پر ہر شخص جانچ لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور وہ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے جو ان کا حقیقی مالک ہے اور ان سے گم ہو جائے گا جو وہ جھوٹ باندا کرتے تھے ﴿۳۰﴾ کہہ دے کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یا کون ہے جو کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے؟ اور کون زندہ کو مردہ سے نکالتا اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور کون ہے جو ہر کام کی تدبیر کرتا ہے؟ تو ضرور کہیں گے ”اللہ“ تو کہہ پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟ ﴿۳۱﴾

”إِن كُفَّكَ“ دراصل ”إِنَّا كُنَّا“ تھا، ”غَافِلِينَ“ پر لام کا آنا اس بات کی دلیل ہے، اس لیے اس ”إِن كُفَّكَ“ کا معنی ”إِنَّا كُنَّا“ کیا ہے، یعنی یہاں ”إِن“ کا ایک نون اور جمع مشکل کی ضمیر ”نَا“ دونوں مقدر ہیں۔

آیت 30 ﴿۳۰﴾ ”هَذَا كَيْفَ“ اس وقت، اس جگہ ”دونوں معنی میں آتا ہے، اس لیے ترجمہ ”اس موقع پر“ کیا ہے، تاکہ دونوں معنی شامل ہو جائیں۔ ”تَبْلُغُوا“ آزمائش کرنا، جانچ لینا۔ جانچنے پر کھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اس چیز کا پوری طرح علم ہو جاتا ہے، یعنی اپنے آگے بھیجے ہوئے اعمال کی پوری حقیقت ہر شخص کے سامنے پوری طرح کھل جائے گی اور اپنے اصل مالک کے پاس پہنچنے کے بعد نہ ان کے اپنے گھڑے ہوئے اور بنائے ہوئے مشکل کشا کہیں نظر آئیں گے، نہ کوئی زبردستی سفارش کے ساتھ چھڑا لینے والا کہیں ڈھونڈنے سے ملے گا۔ سب لغو اور جھوٹی باتیں ہوا ہو جائیں گی۔

آیت 31 ﴿۳۱﴾ قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ.....: بت پرستوں کی حماقتوں اور ان کا انجام بیان کرنے کے بعد اب یہاں سے بت پرستی کی تردید میں دلائل کا بیان شروع ہوا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہاں چار چیزیں شرک کی تردید اور توحید الہی کی دلیل کے طور پر پیش فرمائی ہیں، اول یہ کہ آسمان و زمین سے رزق کون دیتا ہے؟ آسمان سے بارش برسانے والا اور زمین سے تمہارے کھانے اور ضرورت کی ہر چیز پیدا کر کے تمہیں روزی دینے والا کون ہے؟ دوم انسان کے حواس جن میں سب سے زیادہ باشرف سمع و بصر ہیں، جو انسان کے علم کا ذریعہ بنتے ہیں، یہ دونوں کس کے قبضہ میں ہیں کہ اگر چاہے تو چھین کر اندھا اور بہرا کر دے؟ سوم موت و حیات کا اختیار کس کے پاس ہے، کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ مثلاً نطفہ اور جان دار، انڈا اور پرندے، بیج اور لہلہاتے کھیت اور درخت، مومن اور کافر میں سے ایک کو دوسرے سے کون نکالتا ہے۔ چہارم پوری کائنات کے ہر معاملہ کی تدبیر کون کرتا ہے کہ اس میں نہ کوئی خرابی ہے نہ حادثہ؟ تدبیر میں پہلی تمام چیزیں بھی آجاتی ہیں، جو باقی رہ گئی تھیں تدبیر کی صراحت کے بعد وہ سب بھی شامل ہو گئیں۔ یہ خاص کے بعد عام کا ذکر ہے۔

قَدْ لَكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ الْحَقُّ ۖ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۗ فَأَنَّى تُصْرَفُونَ ﴿۳۲﴾

سو وہ اللہ ہی تمہارا سچا رب ہے، پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے؟ پھر کہاں پھیرے جاتے ہو؟ ﴿۳۲﴾

﴿۳۲﴾ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ.....: یہ ”سین“ تاکید کے لیے ہے، قرآن مجید اور کلام عرب میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، یعنی یہ شرک بھی ضرور کہیں گے کہ وہ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ فرمایا تم ان سے کہو کہ پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے وقت کے کافر بھی اس بات کے قائل تھے کہ کوئی اللہ کے برابر نہیں اور کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر بتوں یا بزرگوں کو اس کی جناب میں اپنا وکیل اور وسیلہ سمجھ کر مانتے تھے، اس سے کافر ہو گئے۔ سواب بھی جو کوئی کسی مخلوق کے لیے عالم میں تصرف ثابت کرے اور اپنا وکیل ہی سمجھ کر اس کو مانے اس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے، گو اللہ کے برابر نہ سمجھے اور اس کے مقابلہ کی طاقت اس کو ثابت نہ کرے۔

آیت 32 ﴿۳۲﴾ قَدْ لَكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ الْحَقُّ: ”الْحَقُّ“ ثابت شدہ، سچا، یعنی تمہارے رزق، موت و حیات، تمہارے جسم کا مالک و خالق اور پوری کائنات کی تدبیر کرنے والا جب تم بھی اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہو تو جان لو کہ پھر تمہارا سچا، ثابت شدہ اور حق رب تو یہی اللہ ہے۔ اب خواہ کوئی بھی چیز ہو وہ یا تو حق ہوگی یا باطل، دونوں نہیں ہو سکتیں کہ حق بھی ہو باطل بھی، تو جب اللہ کا رب اور مالک ہونا حق ہے اور صرف اسی کا صاحب اختیار ہونا حق ہے تو پھر کسی اور کا صاحب اختیار ہونا یا اللہ تعالیٰ سے بات منوانے کی قوت رکھنے والا ہونا باطل نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے باوجود تمہارا دل کیسے مانتا ہے کہ حق کو چھوڑ کر گمراہی اور توحید کو چھوڑ کر شرک کی راہ اختیار کرتے ہو۔ سو چلو! راہ حق سے کیسے ہٹائے جا رہے ہو؟

﴿۳۲﴾ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ.....: اس سے معلوم ہوا کہ حق ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے، یہ بات کہ جو جہاں لگا ہوا ہے لگا رہنے دو، سب ٹھیک ہیں، یا مسلمانوں میں خیر القرون کے بعد بننے والے چاروں سنی فرقے، خفی ہوں یا شافعی، مالکی ہوں یا حنبلی سب حق ہیں، اس آیت کے خلاف ہے۔ ان تمام مذاہب کی ہر بات ایک ہی وقت میں حق کیسے ہو سکتی ہے؟ ان کے اختلافی مسائل میں حق مسئلہ اگر ہو تو صرف ایک ہوگا، دوسرے خطا ہوں گے۔ مجتہد کو اگرچہ خطا کے باوجود اس کی نیک نیتی اور محنت کا ایک اجر مل جائے گا مگر اس کی خطا کو حق ہرگز نہیں کہہ سکتے، مثلاً ایک فرقے کی یہ بات کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور دوسرے کی یہ بات کہ صرف انگور یا کھجور کی بنائی ہوئی شراب حرام ہے، باقی نشہ آور چیزیں سب حلال ہیں، دونوں حق کیسے ہو سکتی ہیں؟ ایک کی یہ بات کہ اجرت پر لا کر کسی عورت سے زنا کرے تو اس پر حد ہے اور دوسرے کی یہ بات کہ اجرت پر لائی ہوئی عورت سے زنا کرنے پر حد نہیں، دونوں کیسے درست ہو سکتی ہیں؟ ایک مسلک کا یہ کہنا کہ ماں بہن سے نکاح کی حرمت کے علم کے باوجود نکاح کر کے زنا کر لے تو حد نہیں اور دوسرے کا یہ کہنا کہ یہ حرکت تو ارتداد ہے جس کی حد قتل ہے، دونوں باتیں کیسے درست ہو سکتی ہیں؟ پھر بہت سے ائمہ کا کہنا کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے اور اعمال ایمان کا جز ہیں اور ہمارے اور انبیاء و ملائکہ و صحابہ کے ایمان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس کے مقابلے میں بعض حضرات کا یہ کہنا کہ ایمان صرف دل سے

كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۳﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَبْدُوا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ يُعِيدُهُ فَإِنِّي

تُؤَفِّكُونَ ﴿۳۴﴾

اسی طرح تیرے رب کی بات ان لوگوں پر سچی ہوگئی جنہوں نے نافرمانی کی کہ بے شک وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۳۳﴾ کہہ دے کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو پیدائش کی ابتدا کرتا ہو، پھر اسے دوبارہ بناتا ہو؟ کہہ دے اللہ ہی پیدائش کی ابتدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ بناتا ہے، تو تم کہاں بہکائے جاتے ہو؟ ﴿۳۴﴾

تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے، اعمال خواہ نماز روزہ ہی ہوں، ایمان کا جز نہیں اور چونکہ تصدیق اور اقرار ہم نے بھی کیا ہے، جبریل علیہ السلام اور ابوبکر رضی اللہ عنہما نے بھی کیا ہے، سو ایمان میں ہمارے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کہ کسی کا کم ہو یا کسی کا زیادہ، سب کا برابر ہے۔ آپ خود ہی بتائیں اتنے تضاد کے باوجود دونوں حق کس طرح ہو گئے؟ خلاصہ یہ کہ ہر دو متضاد چیزوں میں اگر ایک حق ہے تو یقیناً دوسری ضلال اور گمراہی ہوگی۔

آیت 33 كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ : یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کا رب ہونا ثابت ہوا، یا جس طرح یہ ثابت ہوا کہ حق کے بعد گمراہی کے سوا کچھ نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ جو لوگ فسق اختیار کریں، یعنی جان بوجھ کر ضد اور سرکشی اختیار کریں وہ ایمان نہیں لایا کرتے۔ شاہ عبدالقادر رزق لکھتے ہیں: ”یعنی چونکہ اللہ کے علم میں تھا کہ یہ لوگ سرکش اور نافرمان ہوں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں ایمان لکھا ہی نہیں۔“ (موضح)

آیت 34 قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَبْدُوا الْخَلْقَ : ”تُؤَفِّكُونَ“ ”إِنَّا“ کا معنی ہے کسی کو کسی چیز سے پھیر دینا، ہٹا دینا۔ اس لیے جھوٹ اور بہتان کو بھی ”إِنَّا“ کہتے ہیں، کیونکہ اس میں بھی سننے والے کو اصل بات سے پھیر دیا جاتا ہے۔ یعنی آپ ان سے پوچھیں کیا تمہارا کوئی شریک ایسا ہے جو خلق کی ابتدا کرتا ہو، پھر اسے دوبارہ بنائے؟ جیسا کہ اللہ نے انسان کو مٹی سے، پھر نطفہ، پھر علقہ، غرض تمام منازل سے گزار کر پیدا کیا، اسی طرح ساری مخلوق کی ابتدا اس نے کی اور دوبارہ بھی وہی بنائے گا۔ وہ جواب میں خاموشی اختیار کریں گے، اگر کوئی ایسا شریک ہے تو اس کا نام لو۔ اب نہ وہ ایسے شریک کا نام لے سکتے ہیں، کیونکہ خود مان چکے ہیں کہ خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور نہ وہ یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ ہمارے شرکاء میں سے کوئی ایسا نہیں، کیونکہ اس سے ان کے شرکاء کی حقیقت کھلتی اور ان کی بے بسی ظاہر ہوتی ہے، اس لیے وہ جواب ہی نہیں دیں گے۔ سو اگر وہ جواب نہ دیں تو آپ خود فرمائیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے جو پہلے پیدا کرتا ہے دوبارہ بھی وہی اٹھائے گا۔ پھر اس کے باوجود تم کیسے گوارا کرتے ہو کہ سیدھے راستے، یعنی توحید کو چھوڑ کر صاف گمراہی، یعنی شرک کی طرف پھیر دیے جاؤ جو سراسر اکل (جھوٹ) ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ قُلْ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ أَفَنْ يَهْدِيَ إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُثَبِّعَ أَمَنْ لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ ۚ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿۳۵﴾

کہہ دے کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرے؟ کہہ اللہ حق کے لیے رہنمائی کرتا ہے۔ تو کیا جو حق کی طرف رہنمائی کرے وہ زیادہ حق دار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، یا وہ جو خود اس کے سوا راستہ نہیں پاتا کہ اسے راستہ بتایا جائے؟ تو تمہیں کیا ہے، تم کیسے فیصلہ کرتے ہو؟ ﴿۳۵﴾

آیت 35 ﴿۱﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ : ”یہدیی“ ہدایت دیتا ہے۔ ”لَا يَهْدِي“ اہل میں ”لَا يَهْدِي“ تھا، تاہم کو دال سے بدل کر دال میں ادغام کر دیا، جس کا معنی ہے ہدایت نہیں پاتا، یعنی آپ ان سے پوچھیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کر کے ان کی حق کی طرف رہنمائی کا انتظام بھی فرمایا، رسول بھیجے، کتابیں اتاریں، شریعت مقرر فرمائی، کائنات کا نہایت دقیق و مستحکم نظام مقرر کیا کہ اس کے مقرر کردہ راستے سے کوئی چیز ایک ذرہ ادھر ادھر نہیں ہوتی۔ انسان کو پیدا ہوتے ہی پستان چوسنا سکھایا، فرمایا: ﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ﴾ [البلد: ۱۶] ”اور ہم نے اسے دو واضح راستے دکھا دیے۔“ بلخ کو تیرنا، پرندوں کو اڑانا، درندوں کو شکار کرنا، چرندوں کو چرنا، بلبل کو پھول کی طرف رغبت، پروانے کو جلنا، ماں کو محبت کی طرف اور موذی اشیاء کو دشمنی کی طرف راہ نمائی کون کر رہا ہے؟ اسی طرح زمین، آسمان، سورج، چاند، سیاروں، کبکشاؤں، سمندروں اور بادلوں کا راستہ کہاں سے متعین ہو رہا ہے؟ غرض ہر چیز محض اللہ کی ہدایت کے مطابق چل رہی ہے، کسی داتا یا دیگر کا اس میں کوئی دخل ہے تو پیش کرو۔ بتاؤ تمہارا وہ شریک کون سا ہے جس نے حق کی طرف ہدایت کا کام کیا ہو، یا کائنات کے راہ راست پر چلنے کے نظام میں اس کا کوئی دخل ہو۔ اب خود ہی بتاؤ کہ وہ ذات پاک جو حق کی طرف ہدایت دیتی ہے، شرعی طور پر بھی اور کوئی طور پر بھی، اس کا اتباع کیا جانا چاہیے، یا وہ شرکاء جو اللہ تعالیٰ کی ”کوئی“ ہدایت کے بغیر خود اپنا راستہ معلوم نہیں کر سکتے، جنہیں کھانا، پینا، جلنا، دیکھنا سب کچھ اللہ تعالیٰ نے سکھایا، وہ خود کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ رازی نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اکثر اپنی توحید کے اثبات کے لیے خلق کے ساتھ ہدایت کو بھی ذکر فرمایا ہے، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کا قول: ﴿الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ﴾ [الشعراء: ۷۸] ”وہ جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہ مجھے راستہ دکھاتا ہے۔“ اور موسیٰ علیہ السلام کا قول: ﴿رَبَّنَا الَّذِي اَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ﴾ [طہ: ۵۰] ”ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی، پھر راستہ دکھلایا۔“ اور ہمارے نبی مکرم ﷺ کو بھی اسی کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ فَسُوَّىٰ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ﴾ [الأعلى: ۱ تا ۳] ”اپنے رب کے نام کی تسبیح کر جو سب سے بلند ہے۔ وہ جس نے پیدا کیا، پھر درست بنایا۔ اور وہ جس نے اندازہ ٹھہرایا، پھر راستہ دکھلایا۔“

﴿۲﴾ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ : یہ دو جملے ہیں ڈانٹنے کے لیے اور حق کی طرف توجہ دلانے کے لیے، دو طرح سے سوال کیا، ایک یہ کہ تمہیں کیا ہو گیا؟ دوسرا یہ کہ تم کیسے فیصلہ کرتے ہو؟

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿۳۶﴾

اور ان کے اکثر پیروی نہیں کرتے مگر ایک گمان کی، بے شک گمان حق کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتا۔ بے شک اللہ خوب جاننے والا ہے جو وہ کر رہے ہیں ﴿۳۶﴾

آیت 36 ﴿۳۶﴾ وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا.....: ظن کا لفظ اگرچہ بعض اوقات یقین پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقَاوَاتِ رَبِّهِمْ﴾ [البقرة: ۱۷۶] ”وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ بے شک وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں۔“ بعض اوقات غالب گمان کے معنی میں بھی آتا ہے، جو صحیح گمان ہو، اگرچہ اس میں خطا کا بھی نہایت کمزور سا احتمال ہو۔

جہاں یہ معانی مراد ہوں وہاں اس کا قرینہ اور دلیل بھی موجود ہوتی ہے۔ اس معنی میں ظن پر دنیا کے تمام معاملات چل رہے ہیں، جب تک کسی دلیل سے اس کا غلط ہونا ثابت نہ ہو اس پر عمل واجب ہوتا ہے۔ خطا، ٹیلی فون، پیغام کے ذریعے سے پہنچنے والی تمام خبریں غلطی ہوتی ہیں، کیونکہ ان میں غلطی یا جعل سازی کا کمزور سا احتمال موجود ہوتا ہے، مگر سب لوگ ان پر عمل کرتے،

ان کے ذریعے کاروبار کرتے ہیں اور شرعی احکام پر بھی عمل کرتے ہیں، خطا کے احتمال کی پروا نہیں کرتے۔ خبر واحد یا حدیث کو بعض لوگ جو غلطی کہتے ہیں وہ اسی معنی میں ہے، اگرچہ نئی نئی بات درست نہیں کہ احادیث رسول ﷺ غلطی ہیں، بلکہ صحیح احادیث رسول ﷺ قطعی اور یقینی ہیں، خصوصاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تمام احادیث اور دوسری کتب کی سنداً صحیح احادیث سب یقینی اور قطعی ہیں اور ان پر عمل واجب ہے۔ البتہ عام طور پر ظن کا جو معنی مراد لیا جاتا ہے وہ ہے ایسا وہم و گمان اور خیال جس کی کوئی بنیاد نہ ہو۔ قرآن و حدیث میں یہ لفظ اکثر اسی مذموم معنی کے لیے استعمال ہوا ہے اور ایسے استعمال کے موقع پر اس کی مذمت کا قرینہ بھی موجود ہوتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّا كُفْرًا وَالظَّنُّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ»

[بخاری، النکاح، باب لا یخطب علی خطیہ اخیہ.....: ۵۱۴۳] ”(ظن) گمان سے بچو، کیونکہ ظن (گمان) سب سے جھوٹی بات ہے۔“ اس ظن سے وہ بے بنیاد بات مراد ہے جو محض کسی کی تقلید یا وہم و خیال پر مبنی ہو اور اس کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل موجود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ مشرکین کے متعلق فرمایا کہ یہ لوگ محض ظن، یعنی بے بنیاد وہم و خیال کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، جس کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ دلیل، جیسا کہ لات، عزیٰ اور منات کے پجاریوں کے متعلق فرمایا: ﴿إِن يَتَّبِعُونَ

إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ﴾ [النجم: ۲۳] ”یہ لوگ صرف گمان کے اور ان چیزوں کے پیچھے چل رہے ہیں جو ان کے دل چاہتے ہیں۔“ اور فرشتوں کا نام عورتوں والا رکھنے والے مشرکوں کے متعلق فرمایا، جو فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے:

﴿وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ [النجم: ۲۸] ”حالانکہ انھیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور بے شک گمان حق کے مقابلے میں کسی کام نہیں آتا۔“ یہاں بھی ظن کا یہی معنی ہے، کیونکہ یہ حق کے مقابلے میں آیا ہے اور صاف واضح ہے کہ اللہ کا شریک بنانے والے علم سے بالکل کورے اور کسی بھی عقلی یا نقلی دلیل سے بالکل خالی ہاتھ ہیں اور ایسے وہم و گمان حق کے مقابلے میں کسی کام نہیں آتے۔ اسی

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ
وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۷﴾ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ
مِثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۸﴾

اور یہ قرآن ہرگز ایسا نہیں کہ اللہ کے غیر سے گھڑ لیا جائے اور لیکن اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور رب العالمین کی طرف سے کتاب کی تفصیل ہے، جس میں کوئی شک نہیں ﴿۳۷﴾ یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے گھڑ لیا ہے؟ کہہ دے تو تم اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے بلا سکو بلا لو، اگر تم سچے ہو ﴿۳۸﴾

مفہوم کی تائید کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۶۶) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو بھی جو لوگ پکارتے ہیں حقیقت میں کوئی ایسا شریک ہے ہی نہیں جسے وہ پکارتے ہوں، بلکہ محض اپنے دماغ کے بنائے ہوئے خیالی خاکوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

﴿۳۷﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے اکثر محض گمان کی پیروی کرتے ہیں، جب کہ حقیقت میں تمام مشرکین محض گمان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، تو مفسرین نے اسے دو طرح سے حل کیا ہے، ایک تو یہ کہ اکثر سے مراد وہ سب کے سب ہیں اور ایسا کلام عرب میں اکثر ہوتا ہے کہ اکثر بول کر سب مراد لیے جاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان کے اکثر کا تو یہی حال ہے کہ وہ نہ کچھ جانتے ہیں نہ عقل رکھتے ہیں، مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ ہی کے واحد معبود ہونے کو جانتے ہیں، مگر ضد اور عناد کی وجہ سے نبی ﷺ پر ایمان نہیں لاتے اور شرک پر اڑے ہوئے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [البقرة: ۲۲۰] ”پس اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ، جب کہ تم جانتے ہو (کہ اس کا کوئی شریک نہیں)۔“

﴿۳۸﴾ إِلَّا ظَنًّا: ظن کو نکرہ رکھا ہے کہ ان کے اکثر ایک نہ ایک گمان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، کسی کا کسی کے متعلق کچھ گمان ہے، کسی کا کسی دوسرے کے متعلق اور ہی گمان ہے۔ اپنے شرکاء کی تعین اور ان کے اختیارات کے تعین پر بھی ان کا اتفاق نہیں، ہر ایک کا اپنا ایک الگ ہی گمان ہے۔

﴿۳۹﴾ إِنْ اللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانا ہے کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ یقیناً اسے خوب جانتا ہے، وہ خود ہی ان سے نمٹ لے گا۔

آیت 38.37 وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ : اللہ تعالیٰ کی توحید ثابت کرنے اور شرک کی تردید کرنے کے بعد قرآن

مجید کی حقانیت کا بیان فرمایا کہ یہ ہرگز ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور اپنے پاس سے بنالائے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ایسے شخص پر نازل فرمایا جو نہ لکھتا جانتا تھا نہ پڑھتا، تصنیف تو بہت دور کی بات ہے۔ تم بھی اہل زبان ہو، بڑے بڑے شاعر وادیب اور فصاحت و بلاغت رکھنے والے مصنف ہو، اگر یقین نہ ہو کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور تمہیں اصرار ہو کہ یہ

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعَلَمِهِ ۗ وَلَئِن آتَيْتَهُمْ تَأْوِيلَهُ ۗ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ
فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ﴿٣٩﴾

بلکہ انھوں نے اس چیز کو جھٹلا دیا جس کے علم کا انھوں نے احاطہ نہیں کیا، حالانکہ اس کی اصل حقیقت ابھی ان کے پاس نہیں آئی تھی۔ اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے۔ سو دیکھ ظالموں کا انجام کیسا ہوا ﴿۳۹﴾

انسانی کلام ہے تو تم تمام جن و انس ایک دوسرے کی مدد کر کے اس جیسی کتاب تصنیف کر کے دکھا دو۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۸۸) پھر یہ نہ کر سکتے تو اللہ تعالیٰ نے دس سورتوں کا چیلنج کیا۔ دیکھیے سورہ ہود (۱۳) جب یہ بھی نہ کر سکتے تو یہاں سورہ یونس کی میں اس کی مثل ایک سورت لانے کا چیلنج کیا، پھر مدینہ میں یہی چیلنج سورہ بقرہ (۲۳) میں دوبارہ دوہرایا۔ قارئین یہ سب مقامات ملاحظہ فرمائیں، آج تک کوئی مشرک کافر سورہ الکوثر کے برابر تین آیتوں کی سورت بھی نہیں لاسکا، جسے کسی اہل زبان یا صاحب عقل نے تسلیم کیا ہو۔ ”وَلٰكِن تَصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ“ اللہ تعالیٰ نے قرآن کا وصف بیان فرمایا کہ یہ پہلی تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور رب العالمین کی طرف سے انسان کے لیے تمام ضروری عقائد و اعمال کی تفصیل پر مشتمل کتاب ہے۔

آیت 39 ﴿٣٩﴾ بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعَلَمِهِ : یعنی یہ لوگ جو قرآن کو جھٹلا رہے ہیں اور اس پر ایمان نہیں لارہے، ان کے جھٹلانے کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے نہ اسے پوری طرح جانا اور نہ اس کے مطالب و مضامین سمجھنے کی کوشش کی، ان کی بنیاد جہالت، ہٹ دھرمی اور باپ دادا کی اندھی تقلید پر ہے، انھوں نے محض یہ دیکھ کر کہ قرآن ان کے موروثی عقائد و خیالات کی تردید کرتا ہے، جھٹ سے اس کا انکار کر دیا، ورنہ قرآن کا ایسے خفاقی کے بیان پر مشتمل ہونا جو ان کے فہم سے بالاتر ہیں اور جن کی تک یہ نہیں پہنچ سکتے کسی طرح بھی جھٹلانے کی وجہ نہیں بن سکتا۔ قصور ان کے فہم کا ہے قرآن کا نہیں۔ (روح المعانی، کبیر) یہی حال ان حضرات کا بھی ہے جو محض اپنے بزرگوں اور اماموں کی تقلید کے چکر میں پھنس کر صحیح حدیث سے انکار کر دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ ان صحیح احادیث پر غور کرتے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کرتے تو کبھی صحیح حدیث کو رد نہیں کر سکتے تھے۔

﴿٣٩﴾ وَلَئِن آتَيْتَهُمْ تَأْوِيلَهُ : یعنی ان کے قرآن کو جھٹلانے کی اگر کوئی بنیاد ہے تو وہ یہ کہ وہ اس کی تاویل و تفسیر سمجھنے سے قاصر ہیں اور قرآن جن غیبی چیزوں پر مشتمل ہے ان کا وقوع ان کی آنکھوں کے سامنے نہیں ہے، ورنہ اگر وہ غور و فکر کرتے اور جن امور کی پیش گوئی قرآن مجید میں کی گئی ہے ان کے واقع ہونے کا انتظار کرتے تو ان کا انکار از خود ہی زائل ہو جاتا۔ (روح المعانی) ”وَلَئِن آتَيْتَهُمْ تَأْوِيلَهُ“ کے متعلق شاہ عبدالقادر راضی فرماتے ہیں: ”یعنی جو وعدہ ہے اس قرآن میں وہ ابھی ظاہر نہیں ہوا۔“ (موضح)

﴿٣٩﴾ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ : یعنی وہ ظالم سب کے سب برباد ہو گئے، فرمایا: ﴿فَنظُرًا أَخَذْنَا بِذُنُوبِهِمْ فَمِنْهُمْ مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَّنْ أَخَذْنَا الصَّيْحَةَ ۗ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ أَغْرَقْنَا وَمَا كَانَ

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُؤْمِنُ بِهِ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَا يُؤْمِنُ بِهِ ۗ وَ رَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿۴۰﴾ وَإِنْ تَعْلَمُونَ ﴿۴۱﴾

اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے اور تیرا رب فساد کرنے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے ﴿۴۰﴾ اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل، تم اس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم کر رہے ہو ﴿۴۱﴾

اللَّهُ لِيُظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۴۰﴾ [العنكبوت : ۴۰] ”تو ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑ لیا، پھر ان میں سے کوئی وہ تھا جس پر ہم نے پتھراؤ والی ہوا بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے چیخ نے پکڑ لیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے اور لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔“ اسی طرح اب یہ بھی اپنی تباہی و بربادی کا سامان کر رہے ہیں۔

آیت 40 ﴿۴۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُؤْمِنُ بِهِ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَا يُؤْمِنُ بِهِ : یعنی ان کفار میں دو طرح کے لوگ ہیں، بعض ایسے ہیں جنہیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس جیسی معجز تصنیف کر لینا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے، مگر وہ ہٹ دھرمی سے اسے جھٹلائے جا رہے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو بالکل عقل کے اندھے اور سمجھ کے کورے ہیں، انہیں اس قرآن کے کلام الہی ہونے کا واقعی یقین نہیں ہے۔ اس آیت کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس (قرآن) پر ایمان لے آئیں گے اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ کفر پر قائم رہیں گے۔ یہ مطلب بھی درست ہے۔

﴿۴۱﴾ وَ رَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ : جو خواہ مخواہ تعصب اور ہٹ دھرمی سے قرآن کے برحق ہونے سے انکار کیے جا رہے ہیں، حالانکہ وہ اپنے دل میں اس کے برحق ہونے کا یقین رکھتے ہیں، یا تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون ان میں سے کفر پر اڑا رہے گا اور کون اس کفر سے باز آ جائے گا۔ گویا مفسدین کا معنی ہے مسلمان نہ ہونے والے۔

آیت 41 ﴿۴۱﴾ وَإِنْ تَعْلَمُونَ : یعنی اگر وہ حجت پوری ہونے کے بعد بھی جھٹلانے پر اصرار کریں تو انہیں صاف کہہ دیں کہ مجھ پر قرآن اور اللہ کے احکام پہنچانے کا جو فریضہ عائد کیا گیا تھا، میں نے اسے کسی کمی یا زیادتی کے بغیر ادا کر دیا ہے، اگر تم اس پر ایمان لانے سے انکار کرو تو تم اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہو گے، مجھ پر اس کا کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ اس مفہوم کی چند مزید آیات کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۳۹)، آل عمران (۲۰)، شوریٰ (۱۵) اور سورہ الکافرون مکمل۔

و مِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۖ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ﴿۳۷﴾ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ ۖ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْىَ وَ لَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ﴿۳۸﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَ لَكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۳۹﴾

اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا تو بہروں کو سنائے گا، اگرچہ وہ نہ سمجھتے ہوں ﴿۳۷﴾ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تیری طرف دیکھتے ہیں، تو کیا تو اندھوں کو راستہ دکھائے گا، اگرچہ وہ بصیرت نہ رکھتے ہوں ﴿۳۸﴾ بے شک اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا اور لیکن لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں ﴿۳۹﴾

آیت 43.42 وَ مِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ: پچھلی آیت (۴۰) کی ایک تفسیر کے مطابق کفار کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو قرآن کے حق ہونے پر یقین رکھتے ہیں، مگر ضد اور عناد کی وجہ سے اسے جھٹلا رہے ہیں اور ایک وہ جو عقل کے اندھے ہیں، جنہیں قرآن کے حق ہونے کا یقین ہی نہیں۔ دوسری تفسیر کے مطابق کچھ وہ کفار ہیں جو آئندہ ایمان لے آئیں گے، کچھ وہ جن کی قسمت میں یہ نعمت نہیں ہے۔ اس آیت میں کفار کی اس دوسری قسم کا ذکر ہے جن کی قسمت میں ایمان نہیں اور جنہوں نے ہر حال میں کفر پر اڑے رہنا ہے۔ فرمایا کہ ان میں سے کچھ لوگ آپ کی بات اور قرآن کی قراءت پر کان لگاتے ہیں مگر فائدہ نہیں اٹھا سکتے، کیونکہ حق سننے سے ان کے کان بہرے ہیں، پھر بہرے بھی اگر عقل رکھتے ہیں تو بات سمجھ جاتے ہیں مگر جو بہرے بھی ہوں اور عقل سے بھی خالی ہوں، آپ اپنی بات ان تک کیسے پہنچا سکتے ہیں۔ ”الصُّمَّ“ جمع ہے ”أَصْمٌ“ کی، یعنی بہرے۔ اسی طرح کچھ لوگ آپ کی طرف دیکھتے ہیں، اگر کوئی عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جیسا سعادت مند ہو تو چہرہ دیکھ کر ہی پہچان لیتا ہے کہ یہ جموٹے شخص کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ [ترمذی: ۲۴۸۵۔ ابن ماجہ: ۱۳۳۴] مگر جو جان بوجھ کر اندھا بن جائے اور دل کا بھی اندھا ہو، کیا آپ اسے راہ راست پر لاسکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ”أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْىَ وَ لَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ“ میں ”الْعُمْىَ“ ”أَعْمى“ کی جمع ہے، مراد آنکھوں کا اندھا ہونا اور ”لَا يُبْصِرُونَ“ میں مراد بصارت نہیں بلکہ بصیرت کا نہ ہونا ہے، تاکہ تکرار لازم نہ آئے۔ ایسے لوگوں کو اندھے و بہرے کے علاوہ مردہ بھی کہا گیا ہے، فرمایا: ﴿إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى﴾ [النمل: ۸۰] ”بے شک تو مردوں کو نہیں سنا سکتا۔“ مقصد نبی ﷺ کو تسلیم دینا ہے کہ ایسے لوگوں کے ایمان نہ لانے سے آپ پریشان خاطر یا دل برداشتہ نہ ہوں۔

آیت 44 : إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا: یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو دوسرے انسانوں کی طرح پورے حواس دیے ہیں، پھر یہ ضد اور ہٹ دھرمی سے ایمان نہ لائیں تو ان کا اپنا قصور ہے، اللہ کی طرف سے ان پر کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ مزید دیکھیے سورہ عنکبوت (۴۰)۔

وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَسُوا إِلَّا سَاعَةً مِنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ
كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اللَّهُ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿٤٥﴾

اور جس دن وہ انھیں اکٹھا کرے گا، گویا وہ نہیں ٹھہرے مگر دن کی ایک گھڑی، آپس میں جان پہچان کرتے رہے۔
بے شک وہ لوگ خسارے میں رہے جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور وہ راہ پانے والے نہ ہوئے ﴿٤٥﴾

آیت 45 ﴿٤٥﴾ وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَسُوا ”سَاعَةً“ ایک گھڑی، عرب نہایت کم مدت کے لیے یہ لفظ بولتے
ہیں۔ قیامت بھی چونکہ ایک لمحے میں قائم ہو جائے گی، اس لیے اس پر بھی ”السَّاعَةُ“ کا لفظ بولا جاتا ہے، یعنی اس دن کو
یاد کرو جب اللہ تعالیٰ ان حق سے اندھے اور بہرے لوگوں کو حساب کے لیے اکٹھا کرے گا تو انھیں دنیا میں گزری ہوئی
راحت و لذت والی لمبی مدت اور طویل ماہ و سال ایک گھڑی محسوس ہوں گے اور انھیں وہ سب لذتیں بھول جائیں گی، جیسا کہ
سورۃ احقاف (۳۵) اور سورۃ روم (۵۵) میں ہے کہ مجرم قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک ساعت (لمحے) کے سوا دنیا میں
نہیں رہے۔

﴿٤٥﴾ سَاعَةً مِنَ النَّهَارِ : دن کی گھڑی چونکہ رات کی بہ نسبت زیادہ یاد رہتی ہے، اس لیے ”مِنَ النَّهَارِ“ فرمایا۔
﴿٤٦﴾ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ : اس کی دو تفسیریں ہیں، ایک تو یہ کہ دنیا میں ان کی وہ گھڑی بھی ایک دوسرے کی جان پہچان کرتے
گزر گئی اور دوسری یہ کہ قیامت کے دن وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے اور آپس میں ایک دوسرے کو گمراہ کرنے پر ملامت اور
گلے شکوے کریں گے۔

﴿٤٧﴾ قرآن مجید کی بعض آیات میں ہے کہ وہ کہیں گے کہ ہم تو محض ایک دن یا دن کا کچھ حصہ دنیا میں رہے ہیں، جیسا کہ سورۃ
مومنون (۱۱۳، ۱۱۴) میں ہے، یا یہ کہ ہم ایک سہ پہر یا دو پہر وہاں رہے ہیں۔ دیکھیے سورۃ نازعات (۴۶) یا یہ کہ ہم تو صرف
دس راتیں وہاں رہے ہیں۔ دیکھیے سورۃ طہ (۱۰۳) اب ایک گھڑی رہنے اور ان آیات میں کیا تطبیق ہوگی، جواب یہ ہے کہ
مجرموں کے درجات اور احوال مختلف ہونے کی وجہ سے ان کے اندازے بھی مختلف ہوں گے۔ اسی طرح قیامت کا دن پچاس
ہزار سال کی انتہائی لمبی مدت کا دن ہے (دیکھیے معارج: ۴) جس میں مجرموں پر مختلف احوال گزریں گے، اس میں ہونے والی
ان کی باہمی بحثوں کا نتیجہ وہ کبھی کچھ نکالیں گے اور کبھی کچھ نکالیں گے۔ یہ بھی ان کی بد حالی کا ایک اظہار ہے، جیسا کہ فرمایا:
﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْجَعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلِ﴾ [سبا: ۳۱] ”اور کاش! تو دیکھے
جب یہ ظالم اپنے رب کے پاس کھڑے کیے ہوئے ہوں گے، ان میں سے ایک دوسرے کی بات رد کر رہا ہوگا۔“

﴿٤٨﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا : اللہ کی ملاقات جھٹلانے کا مطلب قیامت اور حساب کتاب کا انکار ہے اور خسارہ یہ کہ دنیا
میں بھی حیوانوں کی سی بے اصولی زندگی بسر کی اور آخرت میں بھی جہنم کا اندھن بنے۔

وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ اَوْ نَتَّوَفِيَنَّكَ فَاَلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ؕ فَاِذَا جَاءَ رَسُوْلُهُمْ فَخِصٰى بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يَظْلُمُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور اگر کبھی ہم تجھے اس کا کچھ حصہ واقعی دکھلا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، یا تجھے اٹھا ہی لیں تو ہماری ہی طرف ان کا لوٹ کر آنا ہے، پھر اللہ اس پر اچھی طرح گواہ ہے جو وہ کر رہے ہیں ﴿۴۶﴾ اور ہر امت کے لیے ایک پیغام پہنچانے والا ہے، تو جب ان کا پیغام پہنچانے والا آتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور وہ ظلم نہیں کیے جاتے ﴿۴۷﴾

آیت 46 ﴿۱﴾ وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ : یعنی اسلام کے غلبے اور مخالفین کی ذلت و خواری، یعنی قتل و قید اور شکست کے جو وعدے ہم ان کفار سے وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں، اگر ہم ان میں سے بعض آپ کی زندگی ہی میں پورے کر کے آپ کو دکھلا دیں، یا ان میں سے بعض کے پورا کرنے سے پہلے ہی آپ کو اٹھالیں، دونوں حالتوں میں انہیں ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس پر اچھی طرح گواہ ہے جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں۔ وہاں وہ ان کا انجام آپ کو دکھا دے گا۔ ”شاہد“ کا معنی گواہ اور ”شہید“ میں مبالغہ ہے۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کچھ وعدے آپ کی زندگی میں پورے کر دکھائے، مثلاً اہل مکہ پر قحط، بھوک اور خوف کا مسلط ہونا۔ دیکھیے نحل (۱۱۲) اس قحط کی وجہ سے ان کا ہڈیاں تک کھا جانا اور زمین و آسمان کے درمیان انہیں ہر طرف دھواں نظر آنا۔ دیکھیے دخان (۱۰، ۱۱) حتیٰ کہ اس وقت کفار کے سردار ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ سے آ کر یوں بارش کی دعا کی درخواست کی: «اَيُّ مُحَمَّدٍ اِنَّ قَوْمَكَ قَدْ هَلَكَوْا، فَاذْعُ اللّٰهُ اَنْ يَّكْشِفَ عَنْهُمْ، فَاذْعَا» [بخاری، التفسیر، باب: اِثْمَ تَوَلَّوْا.....] : [۴۸۲۴] ”اے محمد! بے شک تیری قوم کے لوگ ہلاک ہو گئے، پس آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ان سے (اس مصیبت کو) دور کر دے تو آپ نے دعا کی۔“ پھر بدر، احد، خندق، حدیبیہ اور آخر میں فتح مکہ دخیبر اور پورے جزیرہ عرب کا آپ کی زندگی میں حلقہ بگوش اسلام ہونا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو آپ کی زندگی میں دکھا دیا اور کچھ وعدے آپ ﷺ کی وفات کے بعد خلفاء کے زمانے میں پورے ہوئے۔ بہر حال آپ کے سچا ہونے میں کوئی شک نہ رہا۔ موضح القرآن میں ہے: ”غلبہ اسلام کچھ آپ ﷺ کے روبرو ہوا اور باقی آپ کے خلیفوں سے۔“ شاید ”اَوْ نَتَّوَفِيَنَّكَ“ میں دوسرے دور کی طرف اشارہ ہے۔

آیت 47 ﴿۱﴾ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ : اس کی دو تفسیریں ہیں، ایک وہ جو اس آیت کا مفہوم ہے: ﴿وَمَا كُنَّا مَعَدِّیْنَ بَيْنَ يَدَيْكَ﴾ [بنی اسرائیل: ۱۵] ”اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔“ یعنی دنیا میں ہر قوم کی طرف کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجا جاتا ہے، پھر اس کی نافرمانی اور فرماں برداری کو مد نظر رکھ کر جزا و سزا کا

و يَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۸﴾ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿۳۹﴾

اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو ﴿۳۸﴾ کہہ دے میں اپنی ذات کے لیے نہ کسی نقصان کا مالک ہوں اور نہ کسی نفع کا، مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کے لیے ایک وقت ہے، جب ان کا وقت آپہنچتا ہے تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں ﴿۳۹﴾

فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ بے گناہ کو سزا نہیں ہوتی اور نہ حجت تمام کیے بغیر ان کا مواخذہ کیا جاتا ہے۔ شاہ عبد القادر بریلویؒ لکھتے ہیں: ”عمل بد آگے سے ہوتے ہیں لیکن رسول پہنچ کر سزا ملتی ہے۔“ (موضح) پہلی امتوں میں چونکہ دنیا کے لوگوں کا ایک دوسرے سے رابطہ نہ تھا، اس لیے ہر امت کے لیے الگ الگ رسول مبعوث ہوئے۔ نبی کریم ﷺ کی آمد کے وقت دنیا کے تمام ممالک کے درمیان روابط پیدا ہو چکے تھے اور آئندہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ تمام دنیا ایک آبادی کی طرح بن جانے والی ہے، اس لیے خاتم الرسل ﷺ کو تمام دنیا کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا۔ اب آپ پر ایمان لانا یا نہ لانا قیامت کے دن جنت یا دوزخ میں جانے کا سبب ہوگا۔ دوسرا مفہوم آیت کا یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر امت کے سامنے اس کا رسول بطور شاہد پیش ہوگا کہ میں نے اس امت کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا، پھر وہ سب لوگ بھی جنہوں نے دوسروں تک پیغام حق پہنچایا بطور گواہ پیش ہوں گے، پھر ان کی شہادت کی روشنی میں انصاف کے ساتھ فیصلہ ہوگا۔ یہی بات ان آیات میں کہی گئی ہے: ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ [النساء: ۴۱] ”پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھے ان لوگوں پر گواہ لائیں گے۔“ اور فرمایا: ﴿وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتَابُ وَجِئَتْ بِالسَّاعَةِ وَالسَّهَادَةُ أَقْبَضَتْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ [الزمر: ۶۹] ”اور زمین اپنے رب کے نور کے ساتھ روشن ہو جائے گی اور لکھا ہوا (سامنے) رکھا جائے گا اور نبی اور گواہ لائے جائیں گے اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

آیت 48 وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ.....: جب مخلوق کو دوبارہ زندہ کرنے اور ان کا محاسبہ کرنے کے خلاف کفار کے پاس کوئی دلیل نہ رہ جاتی تو ان کا آخری تیر یہ تھا کہ لاؤ وہ قیامت، وہ عذاب لاتے کیوں نہیں، یہ وعدہ جو تم کرتے ہو کب پورا ہوگا؟ اس کا جواب تو واضح ہے کہ جب معلوم ہو کہ امتحان ہونا یقینی ہے، پھر آدمی محض اس لیے تیاری نہ کرے یا اس کا انکار کرے کہ اس کی تاریخ بتاؤ، ڈیٹ شیٹ کیا ہے، تو ایسے آدمی کی بے عقلی میں کیا شبہ ہے۔ مگر ان کے اصرار پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو یہ جواب دینے کے لیے کہا جو اگلی آیت میں ہے۔

آیت 49 ﴿۱﴾ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ: یعنی یہ تعین میرے اختیار میں نہیں، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَنْتُمْ عَدَابُهُ بِيَأْتَا أَوْ نَهَارًا مَاذَا يَسْتَعِجِلُونَ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ﴿۵۰﴾

کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر تم پر اس کا عذاب رات کو، یا دن کو آجائے تو مجرم اس میں سے کون سی چیز جلدی طلب کریں گے ﴿۵۰﴾

کے ہاتھ میں ہے۔ ہر امت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وقت مقرر ہے، جب وہ آجائے گا پھر ایک لمحے کا آگے بڑھنا نہیں ہوگا۔ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَآ أَمْلِكُ لِنَفْسِي..... یعنی تمہاری موت کا وقت یا عذاب آنے کا وقت سب اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت اور مرضی پر موقوف ہے، جب چاہے گا تم پر عذاب بھیجے گا اور جب تک نہیں چاہے گا نہیں بھیجے گا۔ رہا تمہارا مجھ سے اصرار تو میں تمہیں کیا بتاؤں، میں تو خود اپنی ذات کے لیے نہ کسی نقصان کا مالک ہوں اور نہ کسی نفع کا، مگر جو اللہ چاہے، میرے اختیار میں ہوتا تو تم پر کبھی کا عذاب آچکا ہوتا۔ دیکھیے سورہ انعام (۵۷، ۵۸) قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ان لوگوں کو سخت تمبیہ ہے جو مصیبتوں اور مشکل کی گھڑیوں میں، جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں ٹال سکتا، نبی ﷺ کو پکارتے ہیں اور آپ ﷺ سے مدد طلب کرتے ہیں، یا نبی ﷺ سے ایسی چیزیں چاہتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی پورا نہیں کر سکتا۔ یہ مقام صرف رب العالمین کا ہے جس نے تمام انبیاء، صالحین اور مخلوقات کو پیدا فرمایا، وہی انہیں روزی اور زندگی بخشتا ہے اور جب چاہتا ہے اس دنیا سے اٹھا لیتا ہے، پھر کسی نبی یا فرشتے یا کسی نیک سے نیک بندے سے کسی ایسی چیز کی درخواست کیونکر کی جاسکتی ہے جس پر اسے قدرت ہی حاصل نہیں؟ اس آیت میں نصیحت کا خاص پہلو یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کے بارے میں جو تمام بنی آدم کے سردار اور تمام انبیاء سے افضل ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے کسی نقصان یا نفع کا مالک نہ ہونے کی صراحت فرمادی ہے تو کوئی ولی یا امام یا پیر اپنے یا کسی دوسرے کے نفع نقصان کا مالک کیونکر ہو سکتا ہے؟ سخت تعجب کا مقام ہے کہ پھر بھی کچھ لوگ، جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں، مردوں کی قبروں پر جھکتے اور ان سے ایسی ایسی مرادیں طلب کرتے ہیں جنہیں پورا کرنے کی قدرت اللہ کے سوا کوئی نہیں رکھتا۔ یہ صریحاً شرک اور کلمہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے اور اس سے بڑھ کر افسوس ان کے علماء و مشائخ پر ہے جو انہیں اس کام سے منع نہیں کرتے۔ یہ وہی جاہلیت ہے جو نبی ﷺ سے پہلے عربوں میں پائی جاتی تھی، بلکہ اس کا معاملہ اس جاہلیت سے بھی زیادہ سخت ہے، کیونکہ عرب مشرکین نفع نقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھتے تھے اور بتوں کو صرف اپنا سفارشی خیال کرتے تھے، مگر یہ لوگ تو قبروں والوں کو نفع نقصان کا مالک سمجھتے ہیں اور کبھی ان کو علیحدہ اور کبھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ پکارتے ہیں۔ اس امت میں کتنے ہی لوگ ہیں جنہیں شیطان مردود نے اس ذریعے سے کفر کی راہ پر ڈال دیا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہوئے اس پر آگے سے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں کہ ﴿أَنْتُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا﴾ [الکہف: ۱۰۴] ”وہ بڑا نیک کام کر رہے ہیں۔“ [فَإِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ] اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت فرمائے۔ آمین! (مختصر از شوکانی)

آیت 50 قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَنْتُمْ عَدَابُهُ.....: ”اَرَأَيْتُمْ“ کا لفظی معنی تو یہی ہے کہ ”کیا تم نے دیکھا“ مگر اہل عرب اس سے مراد ”اَحْبِرُونِي“ لیتے ہیں، یعنی اگر تم نے دیکھا ہے تو بتاؤ۔ ”بَيَاتًا“ یعنی رات کو، گھر کو ”بَيْتٌ“ اسی لیے کہتے ہیں کہ

أَلَمْ إِذَا مَا وَقَعَ أَمْنُكُمْ بِهِ الْآنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَسْتَبِئُونَكَ أَحَقُّ هُوَ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۵۳﴾

۵۳

کیا پھر جوں ہی وہ (عذاب) آپڑے گا تو اس پر ایمان لاؤ گے؟ کیا اب! حالانکہ یقیناً تم اسی کو جلدی طلب کیا کرتے تھے ﴿۵۱﴾ پھر ان لوگوں سے جنہوں نے ظلم کیا، کہا جائے گا چکھو بھنگی کا عذاب، تمہیں بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر اسی کا جو تم کمایا کرتے تھے ﴿۵۲﴾ اور وہ تمھ سے پوچھتے ہیں کیا یہ سچ ہے؟ تو کہہ ہاں! مجھے اپنے رب کی قسم! یقیناً یہ ضرور سچ ہے اور تم ہرگز عاجز کرنے والے نہیں ہو ﴿۵۳﴾

آدی وہاں رات گزارتا ہے۔ یہ ان کے سوال ”فَتَقَىٰ هَذَا الْوَعْدَ“ کا دوسرا جواب ہے، یعنی اگر بالفرض عذاب رات سوتے ہوئے یا دن کی مصروفیت میں یک لخت آ گیا تو وہ کون سی مٹھی اور خوش گوار چیز ہے کہ مجرم جلد از جلد اس کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ تو نہایت تلخ اور ناقابل برداشت چیز ہے، اس کے آنے کے بعد ایمان لانا فائدہ مند نہیں ہو سکے گا اور آخرت میں دائمی عذاب سامنے ہے، پس جب حالت یہ ہے تو اس کے آنے کی کیوں جلدی مچا رہے ہیں۔

آیت 51 أَلَمْ إِذَا مَا وَقَعَ أَمْنُكُمْ بِهِ یعنی کیا جوں ہی وہ عذاب آ گیا تو فوراً ایمان لے آؤ گے؟ ہاں، بے شک اس وقت ایمان لے آؤ گے مگر عذاب آنے پر ایمان کب قبول ہوگا۔ دیکھیے سورہ مومن (۸۳، ۸۵)، یونس (۹۰، ۹۱) اور نساء (۱۸) اس لیے تمہارا پہلے ایمان لانے کے بجائے پہلے عذاب کی جلدی مچانا بے کار ہے۔

آیت 52 ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا یہ بات عذاب آنے پر انہیں مزید ڈانٹنے اور ذلیل کرنے کے لیے کہی جائے گی۔

آیت 51 ﴿۱﴾ وَيَسْتَسْتَبِئُونَكَ أَحَقُّ هُوَ : ”نَبَأٌ“ بہت بڑی اہمیت والی خبر کو کہتے ہیں۔ (راغب) ”يَسْتَسْتَبِئُونَ“ ”نَبَأٌ“ کے باب استفعال سے طلب کے لیے ہے۔ جب کفار کو ان کے سوال ”فَتَقَىٰ هَذَا الْوَعْدَ“ کا مذکورہ جواب دیا گیا تو انھوں نے اسی سلسلہ میں آپ ﷺ سے دوبارہ سوال کیا ”أَحَقُّ هُوَ“ کیا یہ سچ ہی ہے، یا محض ہمیں ڈرایا جا رہا ہے؟ چونکہ کفار اپنے قیامت کے انکار اور قرآن کے اس کے قیام پر واضح دلائل کی وجہ سے سخت قلق اور پریشانی کا شکار تھے کہ اسے مانیں یا نہ مانیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یقین دلانے کے لیے تاکید کے کئی الفاظ جمع کر کے فرمایا ”قُلْ“ آپ ان سے کہہ دیجیے: ﴿إِنِّي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ﴾ ”اِنِّی“ کا معنی ”نعم“ یعنی ہاں ہے، مگر یہ ہمیشہ قسم کے ساتھ آتا ہے، پھر ”إِن“ تاکید کا ہے، پھر لام تاکید ہے کہ ہاں، مجھے اپنے رب کی قسم ہے! یقیناً یہ ضرور حق ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، قرآن مجید میں اس جیسی صرف دو اور آیتیں ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے آخرت کے مکروں کو قسم کھا کر کہنے کا حکم دیا، پہلی آیت: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۗ كُلُّ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَكُمُ﴾ [سبا: ۳] دوسری آیت: ﴿رَعِمَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ أَنَّ

وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهِ ۗ وَأَسْرُوا التَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا
 الْعَذَابَ ۗ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۵۴﴾ إِلَّا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ
 إِلَّا إِنَّ وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا ۗ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۵۵﴾

اور اگر ہر شخص کے لیے جس نے ظلم کیا ہے، وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو وہ اسے ضرور فدیے میں دے دے اور وہ پشیمانی کو چھپائیں گے، جب عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے ﴿۵۴﴾ سن لو! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔ سن لو! بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۵۵﴾

لَنْ يُبْعَثُوا قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ﴿ [الناس: ۱۷]

﴿۵۴﴾ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ: ”ہاں“ کی وجہ سے نفی کی تاکید کے لیے ترجمہ ”ہرگز“ کیا گیا ہے، یعنی نہ تم ہمارے عذاب سے بھاگ کر کہیں جا سکتے ہو کہ ہمیں پکڑنے سے عاجز کر دو اور نہ کسی طرح اسے روک سکتے ہو۔

آیت 54 ﴿۵۴﴾ وَأَسْرُوا التَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ: یعنی جس عذاب کا وہ ساری عمر مذاق اڑاتے رہے جب وہ ان کی توقع کے بالکل خلاف یا یک سامنے آجائے گا تو ان کی عجیب کیفیت ہوگی، ایک طرف وہ سخت شرمندہ ہوں گے اور ان کے ضمیر انہیں کوس رہے ہوں گے، لیکن دوسری طرف وہ اپنی شرمندگی کو اپنے ساتھیوں اور ماننے والوں سے چھپانا بھی چاہیں گے کہ کہیں وہ ملامت نہ کریں، اس لیے دل ہی دل میں شرمندہ ہوں گے اور بظاہر مطمئن بننے کی کوشش کریں گے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ ”أَسْرُو“ اضمداد میں سے ہے، اس کا معنی چھپانا بھی ہے اور ظاہر کرنا بھی۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ عذاب دیکھیں گے تو ندامت کا اظہار کریں گے۔

﴿۵۵﴾ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ: یعنی یہ عذاب ان کے اعمال ہی کا نتیجہ ہوگا، اس لیے وہ عین انصاف ہوگا اور ان پر کسی طرح ظلم نہیں ہوگا۔

آیت 55 ﴿۵۵﴾ إِلَّا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ.....: ”الَّا“ حرف تنبیہ ہے، یعنی آگاہ ہو جاؤ! خبردار ہو جاؤ! سن لو! پچھلی آیت میں ذکر تھا کہ ہر شخص جس نے ظلم کیا ہے، اگر آسمان و زمین میں موجود سب کچھ اس کی ملکیت ہو تو اس دن جان چھڑانے کے لیے ضرور ہی بطور فدیہ دے دے گا۔ ”لَوْ“ (اگر) ناممکن چیز کے لیے ہوتا ہے، اس لیے یہاں فرمایا کہ کان کھول کر سن لو کہ آسمان و زمین کی ہر چیز کا مالک تو اللہ تعالیٰ ہے، وہ ظالم فدیہ لائے گا کہاں سے۔ دوبارہ ”الَّا“ (سن لو) کہہ کر فرمایا کہ یقیناً قیامت قائم ہونے کا اللہ تعالیٰ کا وعدہ بالکل برحق ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ”أَكْثَرُهُمْ“ کے ساتھ اہل ایمان کو منکرین قیامت سے مشتقی فرمایا، اس اشارے کے ساتھ کہ وہ تعداد میں دوسروں سے کم ہیں۔ زمین و آسمان کی ملکیت میں کسی دوسرے کا حصہ کتنا ہے، دیکھیے سورہ سبا (۲۲) اور فاطر (۱۳)۔

هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٥٦﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٧﴾

وہی زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿٥٦﴾ اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے عظیم نصیحت اور اس کے لیے سراسر شفا جو سینوں میں ہے اور ایمان والوں کے لیے سراسر ہدایت اور رحمت آئی ہے ﴿٥٧﴾

آیت 56 هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ.....: یعنی زمین و آسمان کی ملکیت ہی نہیں، زندگی بخشتا اور موت دینا بھی اسی کے اختیار میں ہے اور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر اسی کے پاس جانا ہے۔

آیت 57 يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ.....: یہاں سے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے قرآن مجید کی برکات اور خوبیاں بیان فرمائی ہیں۔ چنانچہ بنیادی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے تمہارے پاس آئی ہے، اب دنیا کی کسی اور کتاب کو یہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کی چار صفات بیان فرمائیں، پہلی یہ کہ یہ ”مَوْعِظَةٌ“ ہے، تنوین تعظیم کی وجہ سے ”عظیم نصیحت“ ترجمہ کیا ہے۔ ظلیل نے فرمایا کہ اس کا معنی نیکی کی نصیحت ہے جس سے دل نرم ہو جائے۔ (مفردات) راغب نے خود اس کا معنی کیا ہے کہ کسی کام سے منع کرنا، جس کے ساتھ ڈرانا بھی شامل ہو، گویا یہ کتاب موعظت نرمی و سختی ہر طرح سے سمجھا کر انسان کی اصلاح کرتی ہے۔ دوسری صفت ہے ”وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ“ یعنی یہ کتاب دلوں میں جو کفر و نفاق، حسد و ریا اور برے اخلاق کی بیماریاں پائی جاتی ہیں ان کے لیے سراسر تدریسی کا باعث ہے۔ بعض لوگوں نے ان آیات سے یہ بات اخذ کی ہے کہ قرآن مجید جسمانی بیماریوں کا بھی علاج ہے، جیسا کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کے سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے سے سانپ کا ڈسا ہوا تندرست ہو گیا اور انہوں نے اس پر تمیں بکریاں لیں۔ [بخاری، الإحارۃ، باب ما يعطى فمي الرقبة على احياء العرب.....: ۲۲۷۶] اور خارجد بن صلت رضی اللہ عنہما کے چچا نے بیڑیوں میں جکڑے ہوئے پاگل آدمی کو سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تو وہ تندرست ہو گیا اور ان لوگوں نے انہیں ایک سو بکریاں دیں۔ [ابوداؤد، الطب، باب كيف الرقى: ۳۸۹۶ و صحیحہ الالبانی] اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ سورہ فاتحہ اور دوسری آیات پڑھ کر دم کرنے سے اللہ تعالیٰ چاہے تو شفا ہوتی ہے اور صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ کافروں پر دم کریں تو انہیں بھی ہوتی ہے، مگر ان آیات کا یہ مطلب نہیں بلکہ ان سے مراد روحانی بیماریاں کفر و شرک، نفاق اور حسد و بغض وغیرہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۗ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا﴾ [بنی اسرائیل: ۸۲] ”اور ہم قرآن میں سے تھوڑا تھوڑا نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے سراسر شفا اور رحمت ہے اور وہ ظالموں کو خسارے کے سوا کسی چیز میں زیادہ نہیں کرتا۔“ اور فرمایا: ”اور رہے وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے تو اس (سورت) نے ان کو ان کی گندگی کے ساتھ اور گندگی میں زیادہ کر دیا اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ کافر تھے۔“ [التوبة: ۱۲۵] اور فرمایا: ”کہہ دے یہ (قرآن) ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے

قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ قَبْدُكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۵۸﴾

کہہ دے (یہ) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت ہی سے ہے، سو اسی کے ساتھ پھر لازم ہے کہ وہ خوش ہوں۔ یہ اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں ﴿۵۸﴾

ہدایت اور شفا ہے اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور یہ ان کے حق میں اندھا ہونے کا باعث ہے۔ [ختم السحرة: ۴۴] یعنی کفار کو اس سے سینے کی بیماریوں سے شفا نہیں ہوتی۔ تیسری صفت ”هُدًى“ نری اور مہربانی کے ساتھ راستہ بتانا۔ (مفردات) چوتھی صفت ”رَحْمَةً“ ہے، اس کا معنی ہر شخص سمجھتا ہے۔ یہاں چاروں صفات ”مَوْعِظَةٌ، شِفَاءٌ، هُدًى، رَحْمَةً“ مبالغہ کے لیے مصدر کے لفظ کے ساتھ آئی ہیں، مراد ان سے اسم فاعل کا مفہوم ہے، جیسے کہتے ہیں ”زَيْدٌ عَدْلٌ“ زید انصاف ہے۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اتنا عادل ہے کہ گویا سراسر عدل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص تو سراپا حسن ہے، مراد بہت حسن والا ہوتا ہے، یعنی یہ کتاب اس قدر نصیحت، شفا، ہدایت اور رحمت والی ہے، گویا یہ اہل ایمان کے لیے سراسر نصیحت، شفا، ہدایت اور رحمت ہے۔

آیت 58 ﴿۱﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ: اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے مراد قرآن مجید، دین حق، خاتم النبیین پیغمبر، جنت اور تمام اخروی نعمتیں ہیں۔ حرف باء ”بِفَضْلِ اللَّهِ“ اور ”بِرَحْمَتِهِ“ دونوں پر آیا ہے، مطلب یہ کہ آخرت کی ہر نعمت مستقل طور پر اپنی اپنی جگہ اس لائق ہے کہ اہل ایمان اس پر خوش ہوں۔

﴿۲﴾ قَبْدُكَ: اس فاء سے محذوف شرط کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کوئی چیز حقیقی خوشی کے قابل ہے اور اگر تمہیں خوش ہونا ہے تو پھر یہ چیز ہے جس پر خوش ہونا چاہیے۔ ”قَبْدُكَ“ پہلے لانے سے حصر بھی پیدا ہو گیا کہ صرف یہی اصل خوشی کی چیز ہے، باقی تمام چیزیں فانی ہیں اور سراسر دھوکا۔

﴿۳﴾ فَلْيَفْرَحُوا: مفردات القرآن میں ہے کہ ”فَرَحٌ“ کا معنی ہے کسی جلدی مل جانے والی لذت سے سینے کا کھل جانا، خوش ہو جانا۔ یہ لفظ اکثر بدنی لذتوں سے حاصل ہونے والی خوشی پر بولا جاتا ہے، اس لیے فرمایا: ﴿وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ﴾ [الحديد: ۲۳] ”اور نہ اس پر پھول جاؤ جو اس نے تمہیں دیا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ [الرعد: ۲۶] ”اور وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے۔“ اور فرمایا: ﴿حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً﴾ [الأنعام: ۴۴] ”یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں کے ساتھ خوش ہو گئے جو انہیں دی گئی تھیں ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا۔“ اور فرمایا: ﴿إِذْ قَالَ لَكُمُ قَوْمُكَ لَا تَفْرَحُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ﴾ [القصص: ۷۶] ”جب اس (قارون) کو اس کی قوم نے کہا، مت پھول، بے شک اللہ پھولنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔“ ”فَرَحٌ“ کی اجازت صرف اللہ کے اس فرمان میں دی گئی ہے: ﴿قَبْدُكَ فَلْيَفْرَحُوا﴾ یعنی زیر تفسیر آیت میں [مفردات القرآن للراغب] معلوم ہوا فرح دل کی خوشی کا نام ہے، اب بعض لوگوں نے اس آیت سے میلاد کے جلوس کے لیے دلیل نکالی ہے کہ نبی کریم ﷺ اللہ کا فضل ہیں، لہذا ان کے یوم ولادت پر خوشی منانی

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ فَمِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ فَبَجَعَلْتُمْ قُنُوءَ حَرَامًا وَحَلَالَ اللَّهِ أَدْنَىٰ لَكُمْ

أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفَتَّرُونَ ﴿۵۹﴾

کہہ کیا تم نے دیکھا جو اللہ نے تمہارے لیے رزق اتارا، پھر تم نے اس میں سے کچھ حرام اور کچھ حلال بنا لیا۔ کہہ کیا اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے، یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو ﴿۵۹﴾

چاہیے، اس لیے یہ یوم عید ہے اور تیسری بلکہ سب سے بڑی عید ہے۔ ہمارے یہ بھائی اگر ایک دو باتیں مد نظر رکھیں تو کبھی آیت کے مفہوم میں اتنی تحریف کر کے بدعت کے لیے دلیل نہ گھڑیں۔ ایک تو یہ کہ ”فَرَحٌ“ کا معنی خوشی منانا تو کسی لغت میں نہیں، اس کا معنی تو خوش ہونا ہے، یہ دل کی خوشی کی کیفیت کا نام ہے نہ کہ جلوس نکال کر عید منانے کا۔ دوسرا یہ کہ یہ خوشی تو ہر وقت چومیں گھنٹے، پورا سال اور ساری عمر مومن کے دل میں رہتی ہے اور اس کے سینے کو ٹھنڈا رکھتی ہے، آپ کو یہ کس نے کہا کہ یہ سال میں صرف ایک دن کے لیے ہے، ایک شاعر نے اپنی خوشی کا اظہار کس خوبصورتی سے کیا ہے۔

نہ بہ نظم شاعر خوش غزل، نہ بہ نثر ناثر بے بدل بغلامی شہ عزوجل و بہ عاشقی نبی خوشم

”میں نہ کسی بہترین غزل گو شاعر کے شعروں پر خوش ہوں اور نہ کسی بے مثال نثر لکھنے والے کی نثر پر، بلکہ میں تو صرف اللہ بادشاہ عزوجل کا غلام ہونے پر اور نبی ﷺ سے محبت رکھنے پر خوش ہوں۔“ اللہ تعالیٰ یہ خوشی ہمیشہ ہمارے نصیب میں رکھے۔ آمین!

﴿۵۹﴾ هُوَ عَزِيزٌ وَمَا يَجْحَدُونَ : یعنی یہ دنیا کے ساز و سامان سے کہیں بہتر ہے جو جمع کرتے ہیں، کیونکہ وہ مال و دولت اور جاہ و شرف دنیا میں کبھی کام آتا ہے، کبھی نہیں۔ اگر کام آتا بھی ہے تو چند دن کے لیے، پھر وہ چیز جو چھن جانے والی ہے اس پر خوشی کیسی؟ حسن، قوت، جوانی، مال و دولت، عز و جاہ کیا ہی دل بھانے والی چیزیں ہیں، مگر کیا کیا جائے کہ ان میں سے باقی رہنے والی ایک بھی نہیں، فرمایا: ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ﴾ [الحج: ۹۶] ”جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔“ فانی کو باقی سے کیا نسبت؟

آیت 59 ﴿۱﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ فَمِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ مشرکین اور یہود نے اپنے پاس سے کئی حلال چیزوں کو حرام اور حرام کو حلال کر رکھا تھا، ان سے سوال ہے کہ بتاؤ تم نے یہ حلال و حرام کس کے کہنے پر قرار دیے ہیں؟ تفصیل پیچھے گزر چکی ہے، مثلاً مشرکین کے متعلق دیکھیے سورہ مائدہ (۱۰۳)، انعام (۱۱۸ تا ۱۲۱ اور ۱۳۶ تا ۱۴۰) اور یہود کے متعلق دیکھیے سورہ آل عمران (۹۳) اور ان کے فوائد۔

﴿۲﴾ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفَتَّرُونَ : اس سے معلوم ہوا کہ اپنی خواہشوں سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دینا افتراء علی اللہ، یعنی اللہ پر بہتان باندھنا ہے۔ (ابن کثیر) قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ان مقلد حضرات کے لیے سخت تنبیہ ہے جو فتویٰ صادر فرمانے کی کرسی پر براہمان ہو جاتے ہیں اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز ہونے کے فتوے صادر کرتے ہیں، حالانکہ وہ قرآن و حدیث

وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ
 وَلَٰكِن كَثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٥٠﴾ وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا
 تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۗ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ

اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، قیامت کے دن میں؟ بے شک اللہ تو لوگوں پر بڑے فضل والا ہے اور لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے ﴿۵۰﴾ اور تو نہ کسی حال میں ہوتا ہے اور نہ اس کی طرف سے (آنے والے) قرآن میں سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تم کوئی عمل کرتے ہو، مگر ہم تم پر شاہد ہوتے ہیں، جب تم اس میں

کا علم نہیں رکھتے، ان کے علم کی رسائی صرف یہاں تک ہوتی ہے کہ امت کے کسی ایک شخص نے جو بات کہہ دی ہے اسے نقل کر دیتے ہیں، گویا انھوں نے اس شخص کو شارع (اللہ اور اس کے رسول) کی حیثیت دے رکھی ہے، کتاب و سنت کے جس حکم پر اس نے عمل کیا اس پر یہ بھی عمل کریں گے اور جو چیز اسے نہیں پہنچی یا پہنچی مگر وہ اسے ٹھیک طرح سمجھ نہ سکا یا سمجھا مگر اپنے اجتہاد و ترجیح میں غلطی کر بیٹھا، وہ ان کی نظر میں منسوخ ہے اور اس کا حکم ختم ہے، حالانکہ جس کی یہ لوگ تقلید کر رہے ہیں وہ بھی شریعت اور اس کے احکام کا اسی طرح پابند تھا جس طرح خود یہ لوگ۔ اس نے اجتہاد سے کام لیا اور جس رائے پر پہنچا اسے بیان کر دیا۔ اگر اس نے غلطی نہیں کی تو اسے دوہرا اجر ملے گا اور اگر غلطی کی تو اکہرا اجر پائے گا۔ وہ شخص تو اپنی جگہ معذور ہے، مگر یہ حضرات کسی طرح بھی معذور قرار نہیں دیے جاسکتے جنھوں نے اس کی آراء کو ایک مستقل شریعت اور قابل عمل دلیل بنالیا۔ اہل علم کے نزدیک کسی جہتد کی تقلید کرتے ہوئے اس کے اجتہاد پر عمل کرنا صحیح نہیں۔ (شوکانی)

آیت 60

﴿٥٠﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ : یعنی ان سے کیا سلوک کیا جائے گا؟ (فتح الرحمن) کیا ان کا گمان یہ ہے کہ ان کے بلا دلیل اپنے پاس سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے کر اللہ پر بہتان باندھنے پر ان کی کوئی پکڑ نہ ہوگی اور انھیں یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟

﴿٥١﴾ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ : ”فضل“ کی تئوین تعظیم کے لیے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر بہت بڑے فضل والا ہے کہ پیدا کر کے عقل اور ہر نعمت بخشی، پھر انھیں مہلت دی، نافرمانیوں کے باوجود ان کے رزق میں کمی نہ کی، مگر وہ اس کی نرمی اور استدرار (مہلت دینے) کو دیکھ کر گناہوں پر اور دلیر ہو جاتے ہیں اور اس کے دیے ہوئے رزق میں سے جسے چاہتے ہیں حلال اور جسے چاہتے ہیں حرام قرار دے لیتے ہیں۔ اس قسم کی ناشکر گزاری میں مشرکین بھی مبتلا تھے اور اہل کتاب بھی کہ انھوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزوں کو دین بنا رکھا تھا۔ (ابن کثیر)

آیت 61

﴿٥١﴾ وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ : اس آیت کے شروع میں دو صیغے ”تَكُونُ“ اور ”تَتْلُوا“ واحد مذکر حاضر کے ہیں جن کا معنی ”تو“ ہے اور دو صیغے ”تَعْمَلُونَ“ اور ”تُفِيضُونَ“ جمع مذکر حاضر کے ہیں جن کا معنی ”تم“ ہے۔ مفسرین نے

مِنْ مَثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ﴿٦١﴾

مشغول ہوتے ہو اور تیرے رب سے کوئی ذرہ برابر (چیز) نہ زمین میں غائب ہوتی ہے اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز ہے اور نہ بڑی مگر ایک واضح کتاب میں موجود ہے ﴿٦١﴾

اس کی تفسیر دو طرح سے کی ہے، ایک تو یہ کہ پہلے دونوں الفاظ کے مخاطب نبی کریم ﷺ ہیں اور بعد والے دونوں الفاظ کے مخاطب تمام لوگ ہیں۔ متن میں آیت کا ترجمہ لفظوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ پہلے دونوں الفاظ میں خطاب اگرچہ نبی ﷺ سے ہے، مگر اس میں بھی تمام لوگ شامل ہیں، اس لیے بعد والے صیغے جمع لائے گئے ہیں، مراد ہر مخاطب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ﴾ [الطلاق: ۱] ”اے نبی! جب تم (لوگ) عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو۔“ اس میں ابتدا میں نبی ﷺ کو مخاطب کر کے تمام امت کو شامل کر لیا ہے۔ یعنی لوگوں میں سے کوئی بھی کسی حال میں ہو، قرآن پڑھ رہا ہو یا کوئی اور عمل کر رہا ہو اللہ تعالیٰ اس پر شاہد ہوتا ہے۔ یہ تفسیر بھی صحیح ہے۔

② ”شأن“ کا معنی حال ہے، مگر ایسا حال جو اہمیت رکھتا ہو، جیسے فرمایا: ﴿مَلَأَ يَوْمَهُمُ هَوًى شَأْنًا﴾ [الرحمن: ۲۹] ”ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے۔“ یہ لفظ معمولی اور حقیر کام پر نہیں بولا جاتا۔

③ وَمَا تَسْأَلُوهُنَّ: ”وہ“ کی ضمیر کے متعلق مفسرین نے بہت سے احتمال ذکر فرمائے ہیں کہ یہ کس کی طرف لوثی ہے، وہ سب درست ہیں، مگر میری دانست میں ان میں سب سے آسان اور واضح وہ ہے جو ترجمہ سے ظاہر ہو رہا ہے، یعنی یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوثی ہے، کیونکہ قرآن اسی کی طرف سے آیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف ضمیر لوثانے کے لیے اس کا پہلے ذکر ہونا ضروری نہیں، کیونکہ وہ ہر وقت ہر ذہن میں موجود ہے۔

④ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ.....: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے لیے تسل کا پیغام ہے کہ آپ کی بندگی کی ہر ہر ادا اور عمل ہمارے سامنے ہے اور مخالفین کے لیے وعید ہے کہ تم جو عمل کرتے ہو، تمہارے اس کام میں مشغول ہوتے ہی ہم بھی گواہ ہوتے ہیں، نہ ہم اس سے بے خبر ہیں، نہ تم اس کی سزا سے بچ سکو گے۔

⑤ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ.....: یہ بعض جاہل فلسفیوں کی اس بات کی تردید ہے کہ اللہ تعالیٰ کلیات کو جانتا ہے جزئیات کو نہیں جانتا، بڑی بڑی باتیں اس کے علم میں آتی ہیں، چھوٹی باتیں نہیں۔ ”ذَرَّةٌ“ سب سے چھوٹی چیز کو بھی کہتے ہیں اور روشن دان وغیرہ سے آنے والی روشنی کے اندر بکھرے ہوئے باریک ذروں کو بھی۔ فرمایا کہ زمین ہو یا آسمان اس میں نہ ایک ذرہ برابر چیز اس سے غائب ہے، نہ اس سے بھی چھوٹی یا بڑی کوئی چیز، بلکہ وہ سب کتاب مبین میں ہیں۔ کتاب مبین کا

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۳۳﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۳۴﴾

سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۳۳﴾ وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے ﴿۳۴﴾

معنی لوح محفوظ بھی کرتے ہیں اور اللہ جبارک و تعالیٰ کا علم بھی۔ اسی آیت کی ہم معنی سورہ انعام کی آیات (۶۰، ۵۹) ہیں۔

آیت 62 **أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ** : ”أَلَا“ حرف تمہیہ کہلاتا ہے، یعنی خوب سن لو، آگاہ ہو جاؤ، بہت اہم بات ہونے والی ہے۔ حافظ ابن حزم اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ لکھا ہے ”الْأَخْلَافُ وَ السَّبِيْرُ“ جس میں اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ بیان فرمایا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں: ”میں نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیا میں جو شخص کوئی بھی محنت کرتا ہے اس کے پیش نظر خوشی کا حصول اور خوف (و غم) سے بچنا ہوتا ہے۔“ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خوشی کے حصول اور خوف و غم سے بچنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی ولایت اور دوستی کا حصول۔ چنانچہ فرمایا: ”سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ یعنی آخرت میں یا دنیا اور آخرت دونوں میں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ خوف (ڈر) آنے والی چیز کا ہوتا ہے اور غم گزری ہوئی مصیبت کا۔ اللہ تعالیٰ کے اولیاء (دوستوں) کو مستقبل کا کوئی خوف نہیں، کیونکہ آخرت میں وہ ہر خوف سے آزاد ہوں گے۔ وہاں انہیں نہ کسی مصیبت کے آنے یا نعمت کے چھن جانے کا خوف ہوگا، نہ کسی گزشتہ چیز کا غم۔ اس کے برعکس چونکہ اللہ کے دشمنوں کا نہ آخرت پر ایمان ہے نہ اس کی نعمتوں میں ان کا کوئی حصہ، فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَانُوا يَكْفُرُونَ﴾ [ہود: ۱۶] ”یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور برباد ہو گیا جو کچھ انھوں نے اس دنیا میں کیا اور بے کار ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔“ اس لیے ان کا ایک ایک لمحہ خوف میں گزرتا ہے، جو نعمت انہیں حاصل ہے اس کے چھن جانے کا خوف اور جو حاصل نہیں اس کے حاصل نہ ہو سکنے کا غم، پھر موت کا خوف، پھر بعد میں کیا ہوگا، کچھ خبر ہی نہیں، غرض خوف ہی خوف۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال و اولاد کو بھی حیات دنیا میں انہیں عذاب دینے کا ذریعہ بتایا۔ اللہ کے اولیاء کو آخرت میں کوئی غم نہیں ہوگا، کیونکہ ان پر دنیا میں گزری ہوئی ہر تکلیف جنت کی ایک ڈبکی سے کافور ہو جائے گی، پھر غم کیسا؟ دنیا میں آنے والی مصیبتیں دنیا میں بھی ان کے لیے کفار کی طرح غم کا باعث نہیں بنتیں، کیونکہ ایک تو انہیں ہر مصیبت پر اجر کی امید ہوتی ہے، دوسرے تقدیر پر ان کا ایمان انہیں کفار جیسے غم سے بچاتا ہے کہ اللہ کی تقدیر میں لکھی ہوئی کوئی مصیبت ہماری کسی تدبیر سے نہ ٹل سکتی تھی، نہ ٹل سکتی ہے، پھر غم سے کیا حاصل، فرمایا: ﴿لَيْكِلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ﴾ [الحديد: ۲۳] ”تا کہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر بھول جاؤ جو وہ تمہیں عطا کرے۔“

آیت 63 **الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ**: کچھ لوگوں نے اولیاء اللہ کچھ انوکھی قسم کے مافوق الفطرت آدمیوں کو سمجھ رکھا ہے، جن سے عجیب و غریب کرامتیں اور شعبدے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق پھر یہ بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا ہے کہ دیکھا جائے ان کا عقیدہ کیا ہے؟ وہ موصد ہیں یا مشرک، وہ نماز بھی پڑھتے ہیں یا نہیں، پاک دامن اور طلال و حرام کا خیال

لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ ۗ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ هُوَ

انہی کے لیے دنیا کی زندگی میں خوشخبری ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ کی باتوں کے لیے کوئی تبدیلی نہیں، رکھنے والے بھی ہیں یا نہیں۔ حالانکہ اس قسم کی چیزیں اور شعبے تو شیطانوں اور ان کے چیلوں مثلاً ہندو جوگیوں سے بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ مسمریزم اور پیناٹزم کے ماہرین بھی لوگوں کو بے وقوف بناتے رہتے ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی ہوں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء، یعنی دوستوں کی پہچان خود بتائی کہ ”الَّذِينَ آمَنُوا“ یعنی وہ لوگ جنہوں نے قرآن و سنت کے مطابق اپنے اعتقاد کو درست کر لیا۔ ”وَكَانُوا يُسَبِّحُونَ“ اور ہمیشہ گناہوں سے بچتے رہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری کرتے رہے۔ لفظ ”سَبَّحَ“ تقویٰ کے استمرار اور بیٹکتی پر دلالت کر رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر انسان جو عقیدہ و عمل درست کر لے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کر لے وہ اللہ کا ولی ہے۔ لیکن لوگ جنگوں اور پہاڑوں کے عافیت خانوں میں یا خانقاہوں کے حجروں میں ولیوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں، مگر اللہ کے راستے میں جان و مال قربان کرنے والوں سے بڑھ کر اللہ کا ولی (دوست) کون ہو سکتا ہے۔ ولی وہ نہیں جسے سرخاب کا پر لگا ہوا ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ خود اپنے فرمان کے مطابق تمام اہل ایمان کا ولی ہے، فرمایا: ﴿اللّٰهُ وَرِی الدِّیْنِ اٰمَنُوۡا﴾ [البقرة: ۲۵۷] ”اللہ ان لوگوں کا ولی (دوست) ہے جو ایمان لائے۔“ اور دیکھیے سورۃ مائدہ (۵۵) اور یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ جن کا ولی ہے وہ اللہ کے ولی ہیں، کیونکہ دوستی دونوں طرف سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے ولیوں ہی کا ولی ہے، دشمنوں کا ولی ہرگز نہیں۔ پھر دوستی اور دشمنی کے درمیان کوئی مرتبہ نہیں، کوئی بھی شخص یا اللہ کا دوست ہو گا یا دشمن، اب آپ خود سوچ لیں کہ آپ اللہ کے دوست ہیں یا دشمن۔ اللہ کے یہ دوست ہر طبقے میں موجود ہیں، علماء، تاجر، صنعت کار، مزدور، کاشت کار، غرض ضروری نہیں کہ پیر یا مولوی ہی ولی ہو، بلکہ ہر طبقے میں ایمان اور تقویٰ والے لوگ اللہ کے ولی ہیں۔ البتہ ایسا شخص جو غیب کی باتیں بتاتا ہو، یا کائنات میں قدرت و اختیار رکھنے کی ڈیگ مارتا ہو، یا لوگ اس کے سامنے اس کی یہ شان بیان کرتے ہوں اور وہ چپ رہ کر ان کی تائید کرتا ہو، وہ رحمان کا ولی ہرگز نہیں، وہ تو شیطان کا ولی ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ اولیاء کے درجے یقیناً مختلف ہیں، اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ جیسی خلت، ولایت اور دوستی دوسرے رسولوں کو بھی حاصل نہیں ہو سکی، عام آدمی کو کیسے مل سکتی ہے، پھر انبیاء میں بھی درجے ہیں، فرمایا: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ [البقرة: ۲۵۳] ”یہ رسول، ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔“ اسی طرح اہل ایمان کے ایمان و تقویٰ کے فرق کے مطابق ان کی ولایت میں بھی فرق ہوگا، ہاں کوئی بھی مخلص مومن اللہ کی ولایت سے یکسر محروم نہیں اور یہ دوستی اپنے درجے کے مطابق قیامت کے دن کسی نہ کسی وقت ضرور کام آئے گی۔ پھر کافر بھی خواہش کریں گے کہ کاش! ہم کسی درجے کے بھی مسلمان ہوتے، فرمایا: ﴿رُبَّمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْكَانُوا مُسْلِمِينَ﴾ [النحصر: ۲] ”کسی وقت چاہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کاش! وہ مسلمان ہوتے۔“ یعنی جن کے دل میں ذرہ برابر یا اس سے بھی کم ایمان ہوگا وہ جہنم سے نکل کر جنت میں جائیں گے تو کفار چاہیں گے کاش! دنیا میں ہم بھی مسلم بن جاتے، خواہ کسی درجے کے، تاکہ ہمیشہ کے لیے تو جہنم میں نہ رہتے۔

آیت 64 ﴿لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا.....﴾ ”لَهُمُ“ پہلے آنے کی وجہ سے حصر کا معنی پیدا ہو گیا، یعنی دنیا کی

الفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۳۷﴾

یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۳۷﴾

زندگی میں خاص خوش خبری انھی کے لیے ہے۔ اس میں کئی چیزیں شامل ہیں: ﴿۱﴾ پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَمَنْ عَمِلْ صَالِحًا قَدْ كُنِيَ أَزْوَاجًا ثَلَاثًا أَوْ أَنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهَا حَيًّا وَرَاضِيًّا لَهَا﴾ [النحل: ۹۷] ”جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی۔“ ﴿۲﴾ تقدیر پر ایمان کی وجہ سے کفار جیسی بے صبری اور خوف و غم سے محفوظ رہنا، جیسا کہ اوپر گزرا ہے اور فرمایا: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا﴾ [المعارج: ۱۹ تا ۲۲] ”بلاشبہ انسان تھردلا بنا یا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔ اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت روکنے والا ہے۔ سوائے نماز ادا کرنے والوں کے۔“ پھر ان نمازیوں کی چند صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ﴾ [المعارج: ۳۵] ”یہی لوگ جنتوں میں عزت دیے جانے والے ہیں۔“ ﴿۳﴾ اچھے خواب، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا: ﴿لَمْ يَبْقَ مِنَ النَّبُوءَةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ، قَالُوا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ﴾ [بخاری، التعمیر، باب المبشرات: ۶۹۹۰] ”نبوت میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی مگر مبشرات (بشارت والی چیزیں)۔“ لوگوں نے پوچھا: ”مبشرات کیا ہیں؟“ فرمایا: ”اچھے خواب۔“ ﴿۴﴾ وہ بشارت بھی اس میں شامل ہو سکتی ہے جو دنیا کے آخری وقت میں فرشتے اسے موت کے وقت دیتے ہیں۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں: ﴿الْمُؤْمِنُ إِذَا حَضَرَهُ الْمَوْتُ بُشِّرَ بِرِضْوَانِ اللَّهِ وَكَرَامَتِهِ فَلَيْسَ شَيْءٌ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا أَمَامَهُ فَأَحَبَّ لِقَاءَ اللَّهِ وَأَحَبَّ اللَّهُ لِقَاءَهُ﴾ [بخاری، الرقاق، باب من أحب لقاء الله.....: ۶۵۰۷] ”مومن کے پاس جب موت حاضر ہوتی ہے تو اسے اللہ کی رضا اور اس کی طرف سے عزت عطا ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے۔ اس وقت مومن کو کوئی چیز اس سے زیادہ عزیز نہیں ہوتی جو اس کے آگے (جنت اور اللہ کی رضا کی صورت میں) ہوتی ہے، تو وہ اللہ کی ملاقات محبوب رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کو پسند کرتا ہے (جبکہ کافر کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے)۔“ ﴿۵﴾ لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے محبت ہونا اور لوگوں کا اس کی تعریف اور مدح و ثنا کرنا، اگرچہ وہ عبادت اس لیے نہیں کرتا بلکہ محض اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے، مگر اللہ نیک لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے محبت رکھ دیتا ہے۔ دیکھیے سورہ مریم (۹۶) ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا: ”یہ بتائیں کہ آدمی خیر کا کوئی عمل کرتا ہے اور لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں؟“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ﴾ [مسلم، البر والصلة، باب إذا أتى على الصالح.....: ۲۶۴۲] ”یہ مومن کو جلد ملنے والی خوش خبری ہے۔“ ﴿۶﴾ دعاؤں کی قبولیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللَّهِ مَنْ لَوْ أَسْمَعَ عَلَى اللَّهِ لَأَبْرَهُ﴾ ”اللہ تعالیٰ کے کچھ

ایسے بندے ہیں کہ اگر اللہ پر قسم ڈال دیں تو وہ اسے پورا کر دے۔“ [بخاری، الصلح، باب الصلح في الدية: ۲۷۰۳]

وَلَا يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۗ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۵۰﴾ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَنْ فِي الْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ ۗ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ

اور تجھے ان کی بات غمگین نہ کرے، بے شک عزت سب اللہ کے لیے ہے، وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۵۰﴾ سن لو! بے شک اللہ ہی کے لیے ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور جو لوگ اللہ کے غیر کو پکارتے ہیں وہ کسی بھی قسم کے شریکوں کی پیروی نہیں کر رہے۔ وہ پیروی نہیں کرتے مگر گمان کی اور وہ اس کے

﴿۵۰﴾ وَفِي الْأَخْرَجَةِ: اس سے وہ تمام بشارتیں مراد ہیں جو مومنوں کو آخرت میں دی گئی ہیں۔ دیکھیے سورہ زمر (۲۰) اور شوریٰ (۲۳، ۲۴) اور بہت ہی بڑی نعمتیں، مثلاً موت کا ذبح کر دیا جانا، ہمیشہ جنت میں رہنا، اللہ تعالیٰ کا ان سے راضی ہونا اور اللہ تعالیٰ کا دیدار۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ نعمتیں عطا فرمائے۔ (آمین) یہ تمام چیزیں قرآن مجید اور صحیح احادیث میں موجود ہیں۔

﴿۵۱﴾ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ: لہذا اس کے وہ وعدے پورے ہو کر رہیں گے جو اس نے اہل ایمان سے کر رکھے ہیں۔

﴿۵۲﴾ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ: ”هُوَ“ ضمیر فصل کہلاتی ہے۔ اس کے تین فائدے ہوتے ہیں، ایک تاکید، دوسرا حصر اور تیسرا موصوف صفت اور مبتدا و خبر میں فرق۔ محلاً اس کا اعراب کچھ نہیں ہوتا، اس لیے ترجمہ ہے ”یہی بہت بڑی کامیابی ہے“ اس کے سوا اول تو کوئی کامیابی وجود ہی نہیں رکھتی، اگر مان بھی لی جائے تو وہ بے حیثیت ہے، اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

آیت 65 ﴿۱﴾ وَلَا يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ.....: اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کی دنیا اور آخرت کی سعادت بیان کرنے کے بعد اپنے رسول ﷺ کو تسلی دی کہ دشمنوں کی باتوں، مثلاً جادوگر، دیوانہ اور کذاب وغیرہ کہنے سے آپ کو جو تکلیف پہنچی ہے اس سے آپ غم زدہ نہ ہوں۔ غم اگرچہ ایک طبعی چیز ہے مگر آپ نہ بد دل ہوں نہ مایوس، کیونکہ عزت یعنی غلبہ، اقتدار اور فتح تو سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہی جسے چاہے غالب اور جسے چاہے مغلوب کرتا ہے، لہذا آپ کو ان کافروں کی دھمکیوں، ان کے کفر و شرک اور طعن و تشنیع سے رنجیدہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اللہ کے رسول ہیں، آخر کار غلبہ اور اقتدار آپ کو اور آپ کے پیش کردہ دین ہی کو حاصل ہوگا۔ نیز دیکھیے سورہ مجادلہ (۲۱) اور منافقون (۸)۔

﴿۲﴾ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ: وہ ان کی فضول باتیں سن رہا ہے اور آپ کے ساتھ ان کا سلوک بھی خوب جانتا ہے، وہ جلد ہی آپ کے مخالفین سے پٹ لے گا۔

آیت 66 ﴿۱﴾ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ: ”أَلَا“ سے خبردار کیا کہ بات پر غور کرو۔ ”مَنْ“ کا لفظ عام طور پر ذوی العقول یعنی انسان، جن اور فرشتوں پر بولا جاتا ہے۔ اس جملے سے دو باتیں نہایت واضح ہیں، ایک تو یہ کہ جب آسمان و زمین کا ہر شخص انسان ہو یا جن یا فرشتہ، وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، تو یہ کفار و مشرکین بھی، جو آپ کی مخالفت کر رہے ہیں، اسی کی ملکیت ہوئے، وہی ان کے معاملات جس طرح چاہتا ہے چلاتا ہے، لہذا آپ کو ان کی ایذا رسانی اور طعن و تشنیع سے رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ آپ کو کوئی ایسی تکلیف نہیں پہنچا سکتے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت

وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿۱۰﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿۱۱﴾

سوا کچھ نہیں کہ انگلیں دوڑاتے ہیں ﴿۱۰﴾ وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی، تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشن۔ بے شک اسی میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں ﴿۱۱﴾

نہ دی ہو اور اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت نہ ہو۔ دوسری یہ کہ جب یہ تینوں افضل مخلوقات اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہیں تو باقی چیزیں، پتھر، بت، دریا، درخت، جانور اور قبریں تو بدرجہ اولیٰ اس کی ملکیت ہیں۔ تو کتنی بے عقلی کی بات ہے کہ مالک کو چھوڑ کر مملوک کی پرستش کی جائے، اس لیے اس کے ساتھ ہی شرک کی تردید فرمائی۔ (شوکانی، ابن کثیر)

﴿۱۲﴾ وَمَا يَتَّبِعُهُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ ۗ أَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَاتٌ أَنْ يَسْمَعُوا وَأَنْ يَسُبُّوا رَبَّهُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا وَأَصْلَحُوا ۗ وَكُلَّمَا نَزَّلْنَا آيَةً مِنْهُ تَوَلَّىٰ ۗ وَكَانَ يُعْتَدِي الْبُلْدَانَ لِتُدْعِيَ الْأُمَّةَ الْغَافِلَةَ ۗ بَلْ كَانُوا مُسْتَعْتَبِينَ ۗ وَكُلَّمَا نَزَّلْنَا آيَةً مِنْهُ تَوَلَّىٰ ۗ وَكَانُوا يُعْتَدِي الْبُلْدَانَ لِتُدْعِيَ الْأُمَّةَ الْغَافِلَةَ ۗ بَلْ كَانُوا مُسْتَعْتَبِينَ ۗ وَكُلَّمَا نَزَّلْنَا آيَةً مِنْهُ تَوَلَّىٰ ۗ وَكَانُوا يُعْتَدِي الْبُلْدَانَ لِتُدْعِيَ الْأُمَّةَ الْغَافِلَةَ ۗ بَلْ كَانُوا مُسْتَعْتَبِينَ ۗ

اللہ کا شریک ہے۔ مملوک مالک کا شریک کیسے ہو سکتا ہے؟ رہا یہ سوال کہ پھر اتنے بے شمار لوگوں نے جو شریک بنا رکھے ہیں یہ کیسے بن گئے؟ فرمایا، اللہ کے سوا جس کسی کی بھی کوئی پوجا کرتا ہے، اسے مشکل کشا یا حاجت روا سمجھتا یا اسے پکارتا ہے، ان میں سے کسی شریک کا بھی حقیقت میں کوئی وجود نہیں، وہ محض ان مشرکوں کے وہم اور خیال کے تراشے ہوئے خاکے ہیں اور حقیقت میں تمام مشرک خواہ بت پرست ہوں، قبر پرست یا کسی بھی چیز کو پوجنے والے، وہ محض اپنے خیال ہی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور اسی کی پوجا کر رہے ہیں۔ البتہ اپنے وہم وگمان کے تراشے ہوئے خاکے کا انھوں نے کوئی نہ کوئی نام رکھ چھوڑا ہے، کوئی لات، کوئی عزی، کوئی نموت، کوئی مشکل کشا، کوئی دھنگیر، کوئی داتا۔ دیکھیے سورہٴ نجم (۲۸۲۳)۔

﴿۱۳﴾ وَمَا يَتَّبِعُهُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ ۗ أَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَاتٌ أَنْ يَسْمَعُوا وَأَنْ يَسُبُّوا رَبَّهُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا وَأَصْلَحُوا ۗ وَكُلَّمَا نَزَّلْنَا آيَةً مِنْهُ تَوَلَّىٰ ۗ وَكَانُوا يُعْتَدِي الْبُلْدَانَ لِتُدْعِيَ الْأُمَّةَ الْغَافِلَةَ ۗ بَلْ كَانُوا مُسْتَعْتَبِينَ ۗ

پکارتے ہیں، آخر وہ کیا چیز ہے جسے وہ پکارتے ہیں؟ کیونکہ کسی شریک کا تو وجود ہی نہیں، پھر خود ہی اس سوال کا جواب دیا کہ وہ محض اپنے وہم وگمان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

﴿۱۴﴾ إِنَّ يَدْعُونَ إِلَّا الظَّنَّ: یہ لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اور نہ دلیل کو دیکھتے ہیں، اگر عقل سے کام لیتے اور دلیل پر غور کرتے تو انھیں صاف معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ ہی حق اور اکیلا معبود ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ ان کے پاس وہم وگمان اور انکل بچو کے سوا کچھ بھی نہیں۔

آیت 67 ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ: اپنی قدرت، احسان اور وحدانیت کی ایک اور دلیل بیان فرمائی۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہٴ قصص (۱۷ تا ۳۷) ”مُبْصِرًا“ کا لفظی معنی ہے دیکھنے والا، یہ باب لازم استعمال ہوتا ہے۔ یعنی دن روشن ہوتا ہے تو ہر چیز نظر آنے لگتی ہے، رات اندھیری ہوتی ہے تو سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ: یعنی ان میں صرف یہی حکمت نہیں جو ذکر فرمائی ہے، بلکہ رات اور دن کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ ۗ هُوَ الْعَزِيْزُ ۗ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ اِنْ عِنْدَكُمْ
مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ۗ اَنْقُولُوْنَ عَلٰى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

انہوں نے کہا اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے۔ وہ پاک ہے، وہی بے پروا ہے، اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں، کیا تم اللہ پر وہ کہتے ہو جو نہیں جانتے؟ ﴿۶۸﴾ قدرت کاملہ کے اور بھی بہت سے دلائل ہیں۔ ”کلیت“ بہت سی نشانیاں اور دلائل۔

آیت 68 ﴿۱﴾ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا: یہاں ان کے ایک اور غلط عقیدے اور باطل خیال کی تردید کی ہے۔ مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، یہود و عزیڑیہ کو اور نصاریٰ مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے، ان کے اس عقیدے کی بنیاد بھی چونکہ محض ظن و تخمین پر تھی، اس لیے یہاں ”اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ“ کے تحت اس کی بھی تردید فرمادی۔

﴿۲﴾ سُبْحٰنَهُ ۗ هُوَ الْعَزِيْزُ: یہ ان کے شرک کو رد کرنے اور صرف اکیلے اللہ کے غنی ہونے کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کسی کا محتاج نہیں کہ اسے بیٹے یا بیٹی کی ضرورت ہو، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، آسمان و زمین کی ہر چیز اس کی ملکیت ہے، جبکہ بیٹا ملکیت نہیں بلکہ جانشین ہوتا ہے، پھر اولاد کا حاصل کرنا شہوت و لذت کو چاہتا ہے جو دونوں چیزیں بیوی کا محتاج بناتی ہیں، جبکہ اللہ کسی کا محتاج نہیں، وہ اکیلے ذات ہی تو غنی اور ہر ایک سے بے پروا ہے۔ ”هُوَ الْعَزِيْزُ“ میں ”هُوَ“ کے بعد ”الْعَزِيْزُ“ پر الف لام کا معنی ہی یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی غنی، کوئی بے پروا ہے ہی نہیں، سب محتاج ہیں۔ اولاد وہی حاصل کرتا ہے جو فانی ہو، تا کہ اس کے فنا ہونے کے بعد اولاد اس کی قائم مقام ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی ذات ازلی اور ابدی ہے، شہوت و لذت اور فقر و احتیاج سے پاک اور بالا ہے، لہذا اس کی طرف اولاد کی نسبت سرے سے محال ہے۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۱۱۱)، کہف (۵، ۴) اور مریم (۹۰، ۳۸۸)۔

﴿۳﴾ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا: ان کے عقیدے کو دلیل سے رد کرنے کے بعد مزید رد اور انکار کے لیے فرمایا کہ ان کے پاس اس کی قطعاً کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ بات جس کے ساتھ اس کی دلیل نہ ہو توجہ کے قابل نہیں ہوتی۔ (شوکانی)

﴿۴﴾ اَنْقُولُوْنَ عَلٰى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: یہ نہایت مبالغہ کے ساتھ ان کے گمان کی تردید ہے، یعنی تم وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں، کیا تم سب سے عظیم اور ہر چیز کی مالک ہستی اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو جس کی نہ تمہارے پاس کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی علم۔ محض جہل کی بنیاد پر بہتان باندھ رہے ہو۔ آلوسی نے فرمایا: ”اس آیت میں دلیل ہے کہ ہر وہ بات جس کی دلیل نہ ہو علم نہیں بلکہ جہل ہے، جب کہ عقیدے کے لیے قطعی یقینی علم ضروری ہے اور یہ کہ تقلید کا ہدایت سے کوئی تعلق نہیں۔“ قرآن مجید نے کئی جگہ اہل باطل سے دلیل کا مطالبہ کیا ہے، فرمایا: ﴿فُلْ هَاتُوْا بُرْهٰنَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [البقرہ:

قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُنْفِئُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾ وَآتِلْ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَتَّقُونَ إِنْ كَانَ كِبَرٌ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذَكِّرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجِئْكُمْ بِأَمْرٍ وَأَنْتُمْ شُرَكَاءُكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنظِرُون ﴿٧١﴾

کہہ دے بے شک جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے ﴿٦٩﴾ دنیا میں تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر ہماری ہی طرف ان کا لوٹنا ہے، پھر ہم انہیں بہت سخت عذاب چکھائیں گے، اس کی وجہ سے جو وہ کفر کرتے تھے ﴿٧٠﴾ اور ان پر نوح کی خبر پڑھ، جب اس نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اگر میرا کھڑا ہونا اور اللہ کی آیات کے ساتھ میرا فیصلہ کرنا تم پر بھاری گزرا ہے تو میں نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا ہے، سو تم اپنا معاملہ اپنے شرکاء کے ساتھ مل کر پکا کر لو، پھر تمہارا معاملہ تم پر کسی طرح مخفی نہ رہے، پھر میرے ساتھ کرگزر دو اور مجھے مہلت نہ دو ﴿٧١﴾

[۱۱۱] ”کہہ دے لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔“ مزید دیکھیے سورہ انبیاء (۲۳)، نمل (۶۳) اور قصص (۷۵)۔

آیت 69 قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ.....: افترا کا معنی ہی جھوٹ گھڑنا ہے۔ ”الْكَذِبَ“ کا لفظ تاکید کے لیے ہے، یعنی جو لوگ جھوٹ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہیں وہ تو کسی طور بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ (شوکانی)

آیت 70 مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ.....: بس زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اللہ پر بہتان باندھ کر دنیا کا تھوڑا سا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ تنوین تقلیل کے لیے ہے، کیونکہ ساری دنیا بھی حاصل کر لیں تو وہ ختم ہونے والی ہے، لہذا نہایت کم اور بے وقعت ہے، پھر انہیں واپس تو ہمارے ہی پاس آنا ہے۔ ”إِلَيْنَا“ پہلے لانے سے حصر پیدا ہوا، جس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں اور نہیں جا سکتے، پھر ہم انہیں ان کی کفریات کی بہت سخت سزا چکھائیں گے۔

آیت 71 ﴿٦٩﴾ وَآتِلْ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ.....: نبوت پر کفار کے شبہات اور ان کے مدلل جوابات بیان کرنے کے بعد یہاں کئی انبیاء کا ذکر فرمایا، خصوصاً تین انبیاء کے قصے کچھ تفصیل سے بیان فرمائے۔ اس میں کئی حکمتیں ہیں: ﴿٦٩﴾ انداز بیان بدلنے اور نئی بات شروع کرنے سے سننے والوں میں اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی اور آدمی خوش دلی اور رغبت سے بات سنتا رہتا ہے۔ ایک ہی قسم کی بات خواہ کتنی علمی ہو، لمبی ہو جائے تو رغبت کم ہو جاتی ہے۔ ﴿٧٠﴾ تاکہ رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے پیروکاروں کو ان واقعات کے سننے سے تسلی ہو اور وہ کفار کی ایذا رسانی سے ملول نہ ہوں، بلکہ ان انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو اپنے لیے اسوہ اور نمونہ بنائیں۔ ﴿٧١﴾ کفار کو بھی تنبیہ ہوتا کہ وہ دنیا میں سب سے پہلے اور پھر سب سے آخر میں غرق ہونے والی قوموں کے انجام پر غور کریں اور اس قسم کی گستاخیوں سے باز آجائیں۔ ﴿٧٢﴾ پھر ان تاریخی قصوں کو کسی قسم کی کمی بیشی کے

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْنَاكُمْ مِنْ آجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَ أَمَرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ

السُّلَيْبِينَ ﴿٥١﴾

پھر اگر تم منہ موڑ لو تو میں نے تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگی، میری مزدوری نہیں ہے مگر اللہ پر اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماؤں برادرؤں سے ہو جاؤں ﴿۵۱﴾

بغیر ایک امی نبی کا بیان کرنا خود اس کے صدق نبوت کی دلیل بھی ہے۔

﴿۵۱﴾ نوح علیہ السلام اولوالعزم رسولوں میں سے ایک ہیں۔ قرآن میں ان کا ذکر تینتالیس (۳۳) جگہ آیا ہے، ان کی قوم بت پرست تھی اور رسول اللہ ﷺ کے اولین مخاطب اہل عرب بھی بت پرست تھے، ان کے بتوں کے نام بھی تقریباً ملتے جلتے تھے۔ نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر سورہ اعراف، ہود، مومنون اور نوح میں زیادہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے، یہاں مختصر ذکر ہے اور ان کی زندگی کا یہ پہلو زیادہ نمایاں کیا ہے کہ طویل مدت تک اپنی قوم میں رہنے اور ان کے ایمان نہ لانے کے باوجود ان کا اللہ تعالیٰ پر اتنا بھروسہ تھا کہ انھوں نے اپنی قوم کو چیلنج کیا کہ تم سب مل کر مجھے جو نقصان پہنچا سکتے ہو پہنچا لو۔

﴿۵۱﴾ ”فَأَجْبِعُونَا“ باب افعال سے امر ہے، ”أَجْمَعْتُ عَلَى الْأَمْرِ“ یعنی میں نے فلاں کام کا پکا ارادہ کر لیا۔ ”وَشُرَّكَاءَهُمْ“ مفعول معہ ہے اور واو بمعنی ”مع“ ہے۔ ”عُمَّتٌ“ پوشیدگی کے معنی میں ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: ”عَمَّ عَلَى فَلَانٍ الْأَمْرُ“ ”فلاں شخص پر معاملہ مخفی اور پوشیدہ رہا۔“ یعنی نوح علیہ السلام نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ پوری قوم کی اور ان کے جہالت سے بنائے ہوئے خداؤں کی ذرہ برابر وقعت نہیں سمجھتے اور ان کا اپنے رب پر اتنا توکل ہے کہ وہ ان کی کسی سازش سے نہیں ڈرتے، سب کو صاف چیلنج کیا کہ اگر میرا تم میں رہنا اور نصیحت کرنا تم پر بھاری ہے اور تم سمجھانے سے سمجھنے پر کسی طرح تیار نہیں تو اپنے بتوں کے ساتھ مل کر، جنھیں تم جہالت اور بے شرمی سے اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے ہو، میرے خلاف جو سازش میرے قتل یا ایذا کی کر سکتے ہو کر لو۔

﴿۵۱﴾ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَفْؤُكُمْ..... یعنی میرے مار ڈالنے کا جو منصوبہ تیار کرو اس پر اچھی طرح غور کر لو تا کہ اس کا کوئی پہلو تم پر ڈھکا چھپا نہ رہے، پھر میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو اور مجھے مہلت مت دو۔

﴿۵۱﴾ ان آیات سے نوح علیہ السلام کی انتہا درجے کی شجاعت، اللہ تعالیٰ پر کمال توکل، مخلوق سے کلی استغناء اور فریضہ رسالت کی نہایت طویل مدت تک بغیر وقفے یا اکتاہٹ یا تھکاوٹ کے مسلسل ادا یگی اور اس کے دوران آنے والی ہر تکلیف، طعن اور استہزاء کو کمال صبر سے برداشت کرنا ظاہر ہو رہا ہے۔ تبھی ہمارے رسول ﷺ کو بھی حکم ہوا کہ ان اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کرو۔ ہمیں تو ان پر پیش آنے والے حالات کے تصور ہی سے پسینا آ جاتا ہے اور بدن کانپ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی دعوت کے کام کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

﴿۵۱﴾ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْنَاكُمْ مِنْ آجْرٍ..... یعنی اگر تم میری دعوت ٹھکرانے پر اصرار کرو تو میرا کچھ نقصان نہیں، کیونکہ میں

فَكَذَّبُوهُ فَتَبَعْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلِيفَةً وَأَعْرَفْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا
فَأَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٧٣﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءَهُمْ
بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِهَا كَذَّبُوا بِهَا مِنْ قَبْلُ كَذَلِكَ نَنْظُرُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٧٤﴾

پس انھوں نے اسے جھٹلا دیا تو ہم نے اسے نجات دی اور ان کو بھی جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں اور انھیں جانچیں
بنایا اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ سو دیکھو ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جنھیں ڈرایا
گیا تھا ﴿۷۳﴾ پھر اس کے بعد ہم نے کئی پیغمبر ان کی قوم کی طرف بھیجے تو وہ ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے۔ سو
وہ ہرگز ایسے نہ تھے کہ اس پر ایمان لاتے جسے اس سے پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حد سے گزرنے والوں کے
دلوں پر مہر کر دیتے ہیں ﴿۷۴﴾

نے تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگی۔ تمہارے نہ ماننے یا بے رخی کرنے سے میرے ثواب اور مزدوری میں کمی نہیں ہوگی، وہ
میرے اللہ کے ذمے ہے، جو مجھے کبھی تمہارا محتاج نہیں ہونے دے گا۔ دیکھیے سورہ طہ (۱۳۲) میری طرف سے تمہیں ایمان
لانے کی دعوت بھی تمہارے ہی قائدے کے لیے ہے اور مجھے حکم ہے کہ مسلمان (حکم ماننے والوں) سے ہو جاؤں۔ معلوم ہوا
کہ تمام انبیاء کا دین اسلام ہی تھا اور وہ سب مسلم تھے۔

آیت 73 ﴿٧٣﴾ فَكَذَّبُوهُ فَتَبَعْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلِيفَةً

﴿٧٣﴾ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلِيفَةً: یعنی ان کے بعد دنیا میں وہی بسنے والے رہ گئے۔ دیکھیے سورہ صافات (۷۷) اس لیے نوح علیہ السلام کو
آدم ثانی کہا جاتا ہے۔

﴿٧٣﴾ فَأَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُتَكَبِّرِينَ: یہاں ”فَأَنْظُرْ“ کا معنی ہے غور و فکر کر اور عبرت حاصل کر کہ وہ کیسے تباہ و برباد کر
دیے گئے۔ اس میں آپ ﷺ کو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہل ایمان کو تسلی ہے اور ان لوگوں کے لیے مقام عبرت ہے جو آج بھی
آپ ﷺ کی تکذیب کر رہے ہیں۔

آیت 74 ﴿٧٤﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ

﴿٧٤﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ: یہاں نوح علیہ السلام کے بعد جن پیغمبروں کے مبعوث ہونے کی طرف
اشارہ فرمایا ہے ان میں ہود، صالح، ابراہیم، لوط اور شعیب رضی اللہ عنہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن کا تذکرہ اگلی سورت ہود میں
آ رہا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات پر بھی مرقوم ہے اور ”إِلَىٰ قَوْمِهِمْ“ کے الفاظ سے اشارہ فرمادیا ہے کہ نوح علیہ السلام اور ان
کے بعد جتنے پیغمبر ہوئے ہیں ان میں سے کسی کی رسالت بنی نوع انسان کے لیے عام نہیں تھی بلکہ خاص خاص اقوام کی طرف
مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ البتہ نوح علیہ السلام کی بعثت میں اختلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ وہ بھی خاص طور پر اپنی قوم ہی کی طرف
مبعوث تھے۔ (ہمارے استاذ مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق صحیح یہی ہے کہ طوفان سے روئے زمین کے تمام لوگ
غرق نہیں ہوئے بلکہ خاص علاقہ تباہ و برباد ہوا ہے) یہ درجہ رسول اللہ ﷺ ہی کو حاصل ہے کہ ان کی رسالت تمام اقوام عالم

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمُ مُوسَىٰ وَهَارُونَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ بِآيَاتِنَا فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا
 مُّجْرِمِينَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۷۶﴾

پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف اپنی نشانیاں دے کر بھیجا تو انھوں نے بہت تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے ﴿۷۵﴾ تو جب ان کے پاس ہمارے ہاں سے حق آیا تو کہنے لگے بے شک یہ تو کھلا جادو ہے ﴿۷۶﴾

کے لیے عام ہے اور قیامت تک اسی طرح باقی رہے گی۔ دیکھیے سورہ سبا (۲۸)۔

﴿۷۵﴾ فَجَاءَهُمُ بِالْبَيِّنَاتِ: یعنی ایسے دلائل و معجزات لے کر آئے جو اس بات پر دلالت کرتے تھے کہ واقعی یہ اللہ کے رسول ہیں۔ ہمارے رسول ﷺ کا معجزہ قرآن سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مؤثر تھا، جس کی وجہ سے آپ کی امت بھی سب سے زیادہ ہوئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ عنکبوت (۵۰، ۵۱) کے فوائد۔

﴿۷۶﴾ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ: لیکن یہ امتیں رسولوں کی دعوت پر ایمان نہیں لائیں، اس کا سبب یہ ہوا کہ جب اللہ کے رسول شروع میں ان کے پاس آئے تو انھوں نے اپنی سرکشی اور تکبر کی وجہ سے ایمان لانے سے انکار کر دیا اور یہ انکار ان کے لیے مستقل حجاب بن گیا اور وہ یہی سوچتے رہے کہ جسے ہم جھٹلا چکے اب اس پر ایمان کیسے لائیں۔ نتیجتاً وہ ایمان کی نعمت سے محروم رہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ”كَذَّبُوا“ کا قائل قوم نوح کو بنایا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ان رسولوں کی قومیں بھی ایسی نہ تھیں جو اس چیز پر ایمان لائیں جسے قوم نوح اور پہلے کے لوگ اس سے قبل جھٹلا چکے تھے، بلکہ ان کے دلوں پر قوم نوح کی طرح مہر لگ گئی۔ پہلا معنی زیادہ مناسب ہے، اگرچہ یہ بھی درست ہے۔

﴿۷۷﴾ كَذَلِكَ نَنْظُرُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْمُتَعِدِّينَ: یعنی ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ آخر کار یہ سزا دیتا ہے کہ انھیں کبھی راہ ہدایت پانے کی توفیق نہیں ہوتی اور یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کا ان کے دلوں پر مہر لگانے کا۔ آئندہ بھی جو یہ روش اختیار کرے گا اسے یہی سزا ملے گی۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۷)، انعام (۱۰۹، ۱۱۰) اور انفال (۲۳)۔

آیت 75 ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمُ مُوسَىٰ وَهَارُونَ: یہ دوسرا قصہ موسیٰ و ہارون علیہ السلام کی قوم کا ہے جو غرق ہونے میں نوح علیہ السلام کی قوم کی مثال ہیں اور رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ قریش آپ کو جادوگر کہہ رہے ہیں (یہ کوئی نئی بات نہیں، جو شخص یا قوم بھی دلیل سے لاجواب ہو جائے وہ اسے جادو کہہ کر جان چھڑاتے ہیں) مگر ان میں سے بعض تو ان جادوگروں کی طرح ایمان لے آئیں گے اور جو اپنے کفر پر اڑے رہے وہ فرعون اور اس کی قوم کی طرح تباہ و برباد ہوں گے۔ ”آیات“ سے مراد وہ نوح (۹) معجزے ہیں جو سورہ بنی اسرائیل (۱۰۱) میں ذکر ہوئے ہیں۔

آیت 76 فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ: ”ہماری طرف سے حق“ اس حق کی عظمت کے بیان کے لیے ہے جو موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے۔ اس واضح حق کی تردید جب وہ کسی طرح نہ کر سکے تو اسے جادو کہہ دیا۔

قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ أَسِحْرٌ هَذَا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ ﴿٤٤﴾ قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَلْفِتْنَا عَنَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَتَكُونُ لَكُمُ الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ وَمَا نَحْنُ لَكُمُ بِمُؤْمِنِينَ ﴿٤٥﴾

موسیٰ نے کہا کیا تم حق کے بارے میں (یہ) کہتے ہو، جب وہ تمہارے پاس آیا، کیا جادو ہے یہ؟ حالانکہ جادو گر کامیاب نہیں ہوتے ﴿٤٤﴾ انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اس سرزمین میں تم دونوں ہی کو بڑائی مل جائے؟ اور ہم تم دونوں کو ہرگز ماننے والے نہیں ﴿٤٥﴾

آیت 77 قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ.....: مفسرین نے فرمایا کفار کے جواب میں درحقیقت یہ تین جملے ہیں، پہلا ”أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ“ یعنی یہ بات کہ ”یہ جادو ہے“ کیا تم حق کے بارے میں کہہ رہے ہو، جب کہ حق تمہارے سامنے ہے؟ دوسرا ”أَسِحْرٌ هَذَا“ کیا یہ جادو ہے؟ یہ سوال انکار کے لیے ہے، جیسے کوئی پھول کو پتھر کہے تو اسے کہا جائے، کیا یہ پتھر ہے؟ تیسرا یہ کہ جادو گر تو کامیاب نہیں ہوتے، جبکہ تم دیکھ رہے ہو کہ میں دلیل و برہان کی رو سے کامیاب ہوں، تو پھر یہ جادو کیسے ہو سکتا ہے۔ اس میں آئندہ جادو گروں کے ساتھ مقابلہ میں اپنی کامیابی اور جادو گروں کی ناکامی کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے۔

آیت 78 قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَلْفِتْنَا.....: فرعون اور اس کے ساتھی اپنے شرکیہ عقائد کی وجہ سے مذہبی برتری بھی جتانے رہتے تھے اور سرزمین مصر کی حکومت پر قبضے کی وجہ سے تمام وسائل کے مالک بن کر سیاسی طور پر بھی سب سے بڑے بنے ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے یہ دو الزام دھر دیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح کی ہر تحریک، پرانی ہو یا نئی، وقت کے تمام فرعون اس پر یہی الزام رکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا مقصد اصلاح نہیں، بلکہ ہماری مذہبی سیادت اور سیاسی برتری کو ختم کرنا اور اپنی حکومت قائم کرنا ہے، جیسا کہ نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے بھی کہا تھا کہ یہ شخص محض تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے، فرمایا: ﴿يُرِيدُ أَنْ يَمْكُمَ عَلَيْكُمْ﴾ [المؤمنون: ۲۴] ”یہ چاہتا ہے کہ تم پر برتری حاصل کر لے۔“ حالانکہ انبیاء اور مصلحین محض اصلاح کے لیے آتے ہیں، اگر حکمران اسلام قبول کر لیں اور خود ہی اصلاح کا فریضہ سرانجام دیں تو ان کی حکومت سے تعرض نہیں کیا جاتا۔ مثلاً اس دور میں محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے ابن سعود کے ذریعے سے توحید و سنت کی دعوت کو پھیلا یا، خود حکومت طلب نہیں کی، نہ ان کی اولاد میں سے کسی نے یہ خواہش یا کوشش کی۔ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے وقت کے حاکموں کو جہاد پر ابھار کر اور ان کا ساتھ دے کر تاریخوں کو مار بھگایا، خود کوئی عہدہ نہ طلب کیا نہ قبول کیا۔ اس لیے ہر قل نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اگر چاہتے ہو کہ تمہاری حکومت قائم رہے تو اسلام قبول کر لو، مگر وہ بد نصیب نکلے اور ہر قل بھی ان کی بادشاہت کے طمع میں ایمان سے محروم رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان ہونے والے قبائل کے سرداروں کو اور مختلف علاقوں کے مسلمان

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سِحْرِ عَلِيمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُوسَى ااَلْقُوا مَا اَنْتُمْ مُلْقُونَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّا اَلْقَوْا قَالَ مُوسَى مَا جِئْتُمْ بِهٖۤ اِلَّا السِّحْرُ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَيُحَقِّقُ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ ۗ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿۸۲﴾ فَمَا اٰمَنَ لِمُوسَى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَٲِيْهِمْ اَنْ يَقْتُلَهُمْ ۗ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۗ وَاِنَّهٗ لَبِنَ السُّرْفِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور فرعون نے کہا میرے پاس ہر ماہر فن جادوگر لے کر آؤ ﴿۷۹﴾ تو جب جادوگر آگئے تو موسیٰ نے ان سے کہا پھینکو جو کچھ تم پھینکنے والے ہو ﴿۸۰﴾ تو جب انھوں نے پھینکا، موسیٰ نے کہا تم جو کچھ لائے ہو یہ تو جادو ہے، یقیناً اللہ اسے جلدی باطل کر دے گا۔ بے شک اللہ مفسدوں کا کام درست نہیں کرتا ﴿۸۱﴾ اور اللہ حق کو اپنی باتوں کے ساتھ سچا کر دیتا ہے، خواہ مجرم برا ہی جائیں ﴿۸۲﴾ تو موسیٰ پر اس کی قوم کے چند لڑکوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا، (وہ بھی) فرعون اور ان کے سرداروں کے خوف کے باوجود کہ وہ انھیں آزمائش میں ڈال دے گا اور بے شک فرعون یقیناً زمین میں سرکش ہے اور بے شک وہ یقیناً حد سے گزرنے والوں سے ہے ﴿۸۳﴾

ہونے والے بادشاہوں، مثلاً شامہ بن اثال بنی نضد وغیرہ کو ان کے عہدوں پر قائم رکھا۔ آخر میں فرعون کے ساتھیوں نے نہایت ڈھٹائی سے کہا کہ ہم تم دونوں کو ہرگز ماننے والے نہیں۔

آیت 79-82 ① وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي یہ قصہ تفصیل سے سورہ اعراف میں گزر چکا ہے اور سورہ طٰ اور شعراء میں بھی آ رہا ہے۔

② مَا جِئْتُمْ بِهٖۤ اِلَّا السِّحْرُ : یعنی جادو تو وہ ہے جو تم لائے ہو، نہ کہ وہ جو میں پیش کر رہا ہوں۔ ”عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ“ جادوگروں کو مفسد قرار دیا ہے جو ایک مشرک ظالم اور خدائی کے دعوے دار کی حمایت محض دنیا کے لالچ میں کر رہے تھے۔

③ وَيُحَقِّقُ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ : اپنے کلمات (اپنی باتوں) کے ساتھ، یعنی ان وعدوں کے مطابق جو اس نے حق کو غالب کرنے کے متعلق کیے ہیں، حق کو سچا کر دیتا ہے۔ یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ چاہے تو اپنے کلمہ ”سُحْرُنْ“ کے ساتھ، یعنی اپنے کسی حکم کے ساتھ ظاہری اسباب کے بغیر بھی حق کو سچا کر دیتا ہے، یا اپنے کلمات کی برکت سے حق کو سچا کر دیتا ہے۔

آیت 83 فَمَا اٰمَنَ لِمُوسَى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ : اسے واضح معجزات دیکھنے اور جادوگروں کی شکست اور ان کے ایمان لانے کے باوجود موسیٰ علیہ السلام پر اس کی قوم کے چند لڑکوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ یہاں ”اس کی قوم“ سے کس کی قوم

وَ قَالَ مُوسَىٰ يَقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم فرماں بردار ہو ﴿۸۴﴾

مراد ہے؟ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی اپنی قوم بنی اسرائیل کے چند لڑکے لڑکیوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا، وہ بھی فرعون اور اپنے یعنی بنی اسرائیل کے سرداروں کے خوف کے ہوتے ہوئے جو فرعون کے ایجنٹ تھے کہ وہ انہیں ایمان سے بنانے کے لیے آزمائشوں اور مصیبتوں میں ڈالیں گے۔ اس تفسیر کا نتیجہ تو یہی ہے کہ فرعون کی قوم میں سے جا دو گروں کے سوا اور بنی اسرائیل میں سے چند لڑکوں کے سوا ایک شخص بھی ایمان نہ لایا۔ فرعون کی پوری قوم اور بنی اسرائیل کے تمام بڑی عمر کے لوگ ایمان سے محروم اور فرعون کے دین پر رہے۔ ابن جریر اور ان کے ہم خیال حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کیفیت ابتدائی دور کی ہے، بعد میں تو قارون کے سوا سب بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے۔ ”مَلَا یُھْمُہُمْ“ (ان کے سرداروں) میں ”ھُمْ“ ضمیر جمع یا تو فرعون کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ مصری لوگ فرعون کے لیے بطور تعظیم جمع کی ضمیر استعمال کرتے تھے، یا اس سے مراد بنی اسرائیل کے سردار ہیں، یعنی بنی اسرائیل میں سے جو نوجوان ایمان لائے انہیں ایک طرف فرعون کا ڈر تھا اور دوسری طرف خود اپنے سرداروں کا۔ لیکن حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے اس مطلب کی سخت تردید کی ہے، ان کی ترجیح میں ”ذُرِّیَّةٌ مِّنْ قَوْمِہٖ“ میں ”ہ“ ضمیر فرعون کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ بنی اسرائیل تو پہلے سے موسیٰ علیہ السلام کی آمد کے منتظر تھے اور ان کے تشریف لانے پر سب کے سب ایمان لے آئے اور اس کی تائید اگلی آیت بھی کر رہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کے تمام بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے، البتہ فرعون کی قوم قبطیوں میں سے چند نوجوان ہی ایسے نکلے جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور آیت کا ترجمہ یوں ہو گا: ”پھر موسیٰ پر اس (فرعون) کی قوم قبطیوں میں سے صرف چند نوجوان ہی ایمان لائے اور وہ فرعون اور اپنے سرداروں سے ڈرے کہ کہیں وہ فرعون انہیں آزمائش میں نہ ڈالے۔“ یہ ترجمہ زیادہ واضح ہے اور علمائے تحقیق نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ (ابن کثیر، روح المعانی) اگر غور کیا جائے تو بنی اسرائیل کا موسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے بھی اپنی تمام خرابیوں کے باوجود مسلمان ہونا اور پیغمبروں کی اولاد ہونے پر فخر کرنا معلوم ہے، ورنہ اگر وہ فرعون کا دین قبول کر لیتے اور آزادی کا مطالبہ نہ کرتے تو فرعون کو ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کا ایک قبیلے کو قتل کرنے کا واقعہ بھی اپنی قوم کے آدمی کی حمایت ہی کی وجہ سے پیش آیا۔ اس وقت بھی موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو اپنی جماعت اور قبطیوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور بنی اسرائیل بھی موسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہی سمجھتے تھے، تب ہی اس اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لیے پکارا، حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت تک نبوت عطا نہیں ہوئی تھی۔ اب اگر خدا نخواستہ اہل کشمیر ہندو ہو جائیں یا فلسطینی یہودی ہو جائیں تو ہندوؤں اور یہودیوں کو ان پر ظلم و جبر کی کیا ضرورت ہے، مگر عقیدے اور عمل کی بے شمار خرابیوں کے باوجود ان کا مسلمان ہونا اور اس پر استقامت کفار کو کسی صورت برداشت نہیں۔

۸۴ وَ قَالَ مُوسَىٰ يَقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور سچائی ثابت ہونے پر بھی فرعون

فَقَالُوا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۸۵﴾ وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِّنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۸۶﴾

تو انھوں نے کہا ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا، اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے لیے آزمائش نہ بنا ﴿۸۵﴾ اور اپنی رحمت کے ساتھ ہمیں کافر لوگوں سے نجات دے ﴿۸۶﴾

کے ظلم میں کمی نہ آئی، بلکہ وہ اور بڑھ گیا۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے شکوہ کیا کہ آپ کے آنے سے پہلے بھی اور آپ کے آنے پر بھی ہمیں ایذا ہی دی گئی تو موسیٰ علیہ السلام نے انھیں صبر اور توکل کی تلقین فرمائی۔ دیکھیے سورہ اعراف (۱۲۸، ۱۲۹) زیر تفسیر آیت میں اللہ پر توکل کو ایمان اور اسلام کا لازمی نتیجہ قرار دیا گیا، جیسا کہ دوسری آیات میں ایمان اور توکل یا عبادت اور توکل کو ایک ساتھ بیان فرمایا ہے۔ دیکھیے سورہ ہود (۱۲۳)، ملک (۲۹) اور فاتحہ (۴)۔

آیت 85، 86 ﴿۱﴾ فَقَالُوا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا انھوں نے پیغمبر کی نصیحت کو نہ صرف قبول کیا بلکہ زبان سے اقرار بھی کیا کہ ہم صرف اللہ ہی پر توکل کرتے ہیں، وہی ہمارا سہارا ہے اور اس کے ساتھ دو دعائیں کہیں اور یہ دونوں دعائیں ظالم حکمرانوں کے ظلم سے بچنے کے لیے اکسیر ہیں۔ پہلی دعایہ کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا۔ ”فِتْنَةً“ کا لفظ مصدر ہے جو ”فَتَنَ“ فعل معروف کا مصدر بمعنی اسم فاعل ہوگا، یعنی ”فَاتَبَتَيْنَ“ فتنے اور آزمائش میں ڈالنے والے۔ اسی طرح یہ ”فُتِنَ“ فعل مجہول کا مصدر بمعنی اسم مفعول بھی ہو سکتا ہے، یعنی ”مَفْتُونَيْنَ“ فتنے میں ڈالے ہوئے۔ پہلی صورت میں معنی ہوگا کہ یا اللہ! تو ہمیں ان ظالموں کو فتنے میں ڈالنے والے، یعنی کفر کے فتنے میں ڈالنے کا باعث نہ بنا کہ اگر یہ ہم پر مسلط رہے اور ہم مسلسل ان کے ظلم کا نشانہ ہی بنے رہے تو یہ اپنے سچے ہونے اور حق پر ہونے کے فتنے میں پڑ جائیں گے اور کفر میں مزید پختہ ہو جائیں گے اور سمجھیں گے کہ اگر مسلمان سچے اور حق پر ہوتے تو ان کا رب ضرور ان کی مدد کرتا، جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے۔

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دل جوئی نہیں طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

اور ”فِتْنَةً“ کو مصدر مجہول ماننے کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ہمیں ان ظالموں کے لیے (مفتون) فتنے میں پڑ جانے والے نہ بنا کہ ان کے ظلم و تشدد کی وجہ سے ہمارا کوئی شخص فتنہ ارتداد میں پڑ کر ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دوسری دعایہ کی کہ پروردگار! تو ہمیں صرف ان کے لیے فتنے کا باعث بننے ہی سے نہ بچا، بلکہ اپنی رحمت کے ساتھ ان کافروں سے ہمیں نجات اور آزادی بھی دلا۔ اس دعا سے معلوم ہوا کہ اللہ کے بندوں کو ایمان اور آخرت کی کتنی فکر تھی کہ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی شخص کے کفر میں مبتلا رہنے کا باعث بنیں اور نہ یہ چاہتے تھے کہ کسی کے ظلم کی وجہ سے خود فتنے میں پڑ کر اپنا ایمان ضائع کر بیٹھیں۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّأَ لِقَوْمِكَ بِصْرَ بَيْتُونَا وَاجْعَلُوا لِيَوْمِكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھروں کو ٹھکانا مقرر کر لو اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ بنا لو اور نماز قائم کرو، اور ایمان والوں کو خوش خبری دے دے ﴿۸۷﴾

آیت 87 ۱ **وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّأَ**..... ہماری امت کی خصوصیت ہے کہ اس کے لیے پوری زمین مسجد بنا دی گئی ہے۔ مسلمان کو جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے نماز پڑھ سکتا ہے۔ پہلی امتوں میں یہ سہولت نہ تھی، بلکہ عبادت کے لیے مقررہ مقامات ہی میں نماز پڑھنا ضروری تھا، خواہ آپ اسے مسجد کہہ لیں یا کینسہ۔ فرعون کو بنی اسرائیل کا جمع ہونا کسی طرح برداشت نہ تھا، خصوصاً جو مقام فرعون کی ربوبیت کے انکار کا اور اکیلے اللہ کی ربوبیت اور عبادت کا نشان ہو اور ایک اللہ کے پرستار بنی اسرائیل روزانہ کئی مرتبہ وہاں جمع ہوتے ہوں۔ اس لیے ان آیات سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ فرعون نے ان کے عبادت خانوں میں جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ مصر میں کچھ گھروں کو اپنی نماز کی جگہ مقرر کر لو اور اپنے گھر قبلہ رخ بنا لو۔ اس سے کسی حد تک اجتماع کا موقع بھی ملتا رہے گا، باہمی ملاقات سے محبت بھی بڑھتی رہے گی اور نماز باجماعت بھی ہوتی رہے گی اور ایک دوسرے کے حالات سے آگاہی بھی۔ ایسی صورت میں بنی اسرائیل سے مسجدوں میں جانے کی پابندی اضطرار کی بنا پر ختم کر دی گئی، البتہ نماز پھر بھی ہر جگہ پڑھنے کی اجازت نہیں ملی، بلکہ اپنے گھر قبلہ رخ بنا کر ان میں چھپ کر نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام گھر قبلہ رخ بنانے کا حکم ہوا مگر نماز کے لیے چند گھر مخصوص تھے، جن کا صرف مسلمانوں کو علم تھا، اگر کسی گھر کا راز فاش ہو جاتا تو دوسرا کوئی گھر مقرر کر لیا جاتا اور تمام گھروں کے قبلہ رخ ہونے کی وجہ سے کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ دلیل اس کی ایک تو یہ ہے کہ فرمایا: ﴿أَنْ تَبَوَّأَ لِقَوْمِكَ بِصْرَ بَيْتُونَا﴾ یعنی پوری قوم کے لیے چند گھروں کو ٹھکانا مقرر کر لو۔ دوسری یہ کہ حکم تھا: ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾ اور اقامت صلوٰۃ صفوں کی درستگی کے بغیر نہیں ہوتی جو جماعت کی صورت ہی میں بنتی ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿سَوْوَا صُفُوفِكُمْ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوفِ مِنْ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ﴾ [بخاری، الأذان، باب إقامة الصف من تمام الصلاة: ۷۲۳، عن انس رضی اللہ عنہ] ”اپنی صفیں برابر کرو، کیونکہ صفیں برابر کرنا اقامت صلوٰۃ کا حصہ ہے۔“ تیسری یہ کہ بنی اسرائیل کو بھی ہماری امت کی طرح جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم تھا (جب کوئی عذر نہ ہو) فرمایا: ﴿وَأَنْ تَبَوَّأَ لِقَوْمِكَ بِصْرَ بَيْتُونَا﴾ [البقرہ: ۴۳] ”اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔“

۲ **وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ**: ایسے مشکل حالات میں بھی بنی اسرائیل کو نماز کی معافی نہیں ملی، بلکہ اسے خاص طور پر قائم کرنے کا حکم ہوا، کیونکہ صبر اور نماز ہی مشکل کے وقت اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، فرمایا: ﴿وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾

وَقَالَ مُوسَى رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَآئِكَ زِينَةً وَآمَوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَى آمَوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتَّىٰ يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۸۸﴾

اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے رب! بے شک تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں بہت سی زینت اور اموال عطا کیے ہیں، اے ہمارے رب! تاکہ وہ تیرے راستے سے گمراہ کریں، اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں پر سخت گرہ لگا دے، پس وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں ﴿۸۸﴾

[البقرة: ۴۵] ”اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔“ اور نماز ہی روزانہ کئی مرتبہ بندے کا تعلق اپنے رب سے جوڑتی اور اس سے ہم کلام ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ زکوٰۃ مال ہونے کی صورت میں سال میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے، روزے بھی سال میں کچھ دن فرض ہیں، حج استطاعت کی صورت میں عمر بھر میں ایک دفعہ فرض ہے، یہ نماز ہی ہے کہ آدمی کو جب بھی کوئی مشکل پیش آئے تو وہ اس کے ذریعے سے اپنے رب سے تار جوڑ سکتا ہے اور اس کے ساتھ آدمی کو پانچ دفعہ تو ضرور ہی اپنے مالک کے حضور پیش ہو کر فریاد کرنے کا موقع ملتا ہے۔

﴿۲﴾ وَيَسِّرِ الْمُؤْمِنِينَ: یعنی اہل ایمان کو خوش خبری دو، اس خوش خبری کا ذکر سورہ اعراف (۱۲۹) میں ہے کہ تمہارے دشمنوں کی ہلاکت اور تمہاری آزادی کے دن قریب ہی ہیں۔

﴿۱﴾ وَقَالَ مُوسَى رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ.....: پے در پے معجزات دیکھنے اور مختلف عذابوں کے نزول پر ایمان لانے اور آزادی دینے کے وعدوں کے باوجود جب فرعون اور اس کے ساتھی کفر اور ظلم سے کسی صورت باز نہ آئے تو موسیٰ علیہ السلام نے تنگ آکر ان کے حق میں بددعا کی۔

﴿۲﴾ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيلِكَ: ”لِيُضِلُّوْا“ میں لام عاقبت اور انجام کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت و اموال عطا فرمائے، جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ تیرا شکر ادا کرنے کے بجائے اس دولت کے بل بوتے پر لوگوں کو تیری راہ سے گمراہ کرنے لگے۔ یہ معنی سہو یہ اور ظلیل نے بیان کیا ہے۔ بعض مفسرین نے ”لِيُضِلُّوْا“ کے لام کو تعلیل کا بھی بتایا ہے، جس کا معنی ”تاکہ“ ہے، یعنی تو نے انہیں دنیا کا مال و دولت اور اس کی زینت اس لیے دی ہے کہ تو اس کے ذریعے سے انہیں فتنے اور آزمائش میں ڈالے اور یہ مال و دولت تو نے انہیں دی ہی اس لیے ہے کہ یہ فتنے میں پڑ کر خود بھی گمراہ ہوں اور شیطان کی طرح دوسرے لوگوں کو بھی تیری راہ سے گمراہ کرتے پھریں۔ یہ معنی ابن جریر طبری نے کیا ہے اور دلیل میں سورہ جن کی یہ آیت پیش کی ہے: ﴿لَا سَفِيْنَةٌ مَّآءٍ غَدَاةًۭاۙ لَّا تَنْفَعُهُمْ فِيْهَا﴾ [الحن: ۱۶، ۱۷] ”تو ہم انہیں ضرور بہت وافر پانی پلاتے۔ تاکہ ہم اس میں ان کی آزمائش کریں۔“

قَالَ قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقْبِمَا وَلَا تَتَّبِعَنَّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۸۹﴾

فرمایا بلاشبہ تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی، پس دونوں ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے راستے پر ہرگز نہ چلو جو نہیں جانتے ﴿۸۹﴾

﴿۸۹﴾ رَبَّنَا اظْمِسْ عَلَيَّ اَمْوَالِيهِمْ..... پروردگار! ان کا ظلم اب حد سے بڑھ گیا ہے، اس لیے تیرے حضور درخواست ہے کہ تو ان کے مالوں کو منادے، جن کے زور پر یہ تیری راہ سے گمراہ کرتے ہیں اور ایمان لانے کے وعدوں کی انھوں نے اتنی بار خلاف ورزی کی ہے کہ ان کی سزا یہی ہے کہ تو انھیں ایمان کی توفیق سے محروم کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی گرہ لگا کہ یہ عذاب الیم دیکھنے تک ایمان نہ لائیں، جس کے دیکھنے کے بعد ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر نے یہ بددعا اللہ تعالیٰ کے کسی اشارے کے بعد کی ہے کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کی قسمت میں ایمان نہیں، جیسا کہ نوح علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے صاف بتا دیا کہ آپ کی قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ان کے بعد مزید کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا (دیکھیے ہود: ۳۶) تو انھوں نے ان کے خلاف وہ زبردست بددعا کی جو سورہ نوح میں مذکور ہے۔ یا جب آل فرعون نے تمام معجزات دیکھ کر کہا کہ تو ہمارے پاس خواہ کوئی بھی نشانی لے آئے ہم ہرگز تم دونوں پر ایمان نہیں لائیں گے (دیکھیے اعراف: ۱۳۲) تو موسیٰ اور ہارون علیہ السلام نے ان کے ایمان سے مایوس ہو کر یہ بددعا کی۔

آیت ۸۹ ﴿۱﴾ قَالَ قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا: یعنی یقیناً تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی۔ معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہارون علیہ السلام بھی اس دعا میں شریک تھے۔ بعض اہل علم کے اقوال ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے، مگر یہ بات قرآن مجید سے یا حدیث سے مجھے نہیں ملی۔

﴿۲﴾ فَاسْتَقْبِمَا: اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ دعوت پر ثابت قدم رہو، بے شک تمہاری دعا قبول ہے، مگر قبولیت ظاہر ہونے میں دیر ہو سکتی ہے، اس لیے دیر کی وجہ سے دعوت میں کوتاہی نہ کرنا۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے کہ قبولیت کا اثر کب ظاہر ہوگا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ اب اپنی اس بددعا پر قائم رہنا، ایسا نہ ہو کہ میرا عذاب آنے پر ان کی سفارش کرنے لگو۔ یہ ایسے ہی ہے جس طرح نوح علیہ السلام نے بددعا کی تو اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ سارے کافر غرق ہوں گے، مگر اب مجھ سے ان ظالموں کے (حق میں) بات نہ کرنا۔ (دیکھیے ہود: ۳۷) اللہ تعالیٰ کو نوح اور موسیٰ علیہ السلام کی بددعا کے باوجود ان کے دل کی نرمی کا علم تھا، اس لیے انھیں پہلے ہی اپنی بددعا پر ثابت رہنے کی تاکید فرمادی۔ مگر نوح علیہ السلام پھر بھی بیٹے کے لیے سفارش کر بیٹھے اور انھیں اللہ تعالیٰ کا عتاب سننا پڑا، جس پر انھوں نے معافی مانگی۔ (دیکھیے سورہ ہود: ۴۵ تا ۴۷)۔

﴿۳﴾ وَلَا تَتَّبِعَنَّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ: یعنی ان لوگوں کا راستہ اختیار نہ کرنا جو دعوت کے کام میں حوصلہ چھوڑ بیٹھتے ہیں، یادعا کرتے ہی چاہتے ہیں کہ ان کا مطلب پورا ہو جائے اور اگر فوراً پورا نہ ہو تو شکایت کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے بہت دعائیں کیں مگر پروردگار نے قبول ہی نہیں کیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يُسْتَحَابُّ لِأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يَفْعَلْ، يَقُولُ دَعْوَتُ

وَجُوزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَاتَّبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدُوًّا ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْعُرْقُوقُ قَالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آمَنْتُ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَ أَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٩٠﴾
 آلن وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٩١﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا تو فرعون اور اس کے لشکروں نے سرکشی اور زیادتی کرتے ہوئے ان کا پیچھا کیا، یہاں تک کہ جب اسے ڈوبنے نے پالیا تو اس نے کہا میں ایمان لے آیا کہ حق یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرماں برداروں سے ہوں ﴿۹۰﴾ کیا اب؟ حالانکہ بے شک تو نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں سے تھا ﴿۹۱﴾

قَلَّمَ يُنْتَحَبُ لِي ﴿ [بخاری، الدعوات، باب يستجاب للعبد ما لم يعجل : ۶۳۹۰ - مسلم : ۲۷۳۵، عن أبي هريرة رضي الله عنه] ”تم میں سے کسی شخص کی دعا قبول ہوتی رہتی ہے جب تک وہ جلدی نہیں کرتا، یہ نہیں کہتا کہ میں نے دعا کی مگر میری دعا قبول نہیں کی گئی۔“

آیت 90، 91 ﴿ ۱ ﴾ وَجُوزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ: یعنی بنی اسرائیل کا سمندر پار کرنا انسانی اسباب کے ساتھ نہ تھا، بلکہ انسان کے اختیار سے باہر خاص ہمارے پار کرانے سے تھا۔ بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے، فرعون کے تعاقب، موسیٰ علیہ السلام کے لاشی مارنے سے سمندر کے پھینے اور پانی کے ٹمجد ہو کر راستے دینے کی تفصیل سورہ شعراء (۶۸: ۵۲) اور دخان (۳۱: ۲۳) میں آئے گی۔
 ﴿ ۲ ﴾ فَاتَّبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدُوًّا: فرعون اور اس کے لشکروں نے ان کا پیچھا انھیں ستانے، ان پر زیادتی کرنے اور انھیں دوبارہ غلام بنانے کے لیے کیا، یعنی ان کی نیت صلح یا اصلاح کی نہ تھی۔ ”بَغْيًا“ اور ”عَدُوًّا“ حال بمعنی اسم فاعل یا مصدر برائے مفعول نہ ہیں۔ ہمارے استاذ مولانا عبدہ رحمۃ اللہ علیہ نے قرطبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”بَغْيًا“ وہ زیادتی ہے جو قول سے ہو اور ”عَدُوًّا“ وہ جو فعل سے ہو اور طحاوی نے لکھا ہے: ”بَغْيًا“ فُلَانٌ عَلٰی فُلَانٍ بَغْيًا“ جب کوئی کسی پر دست درازی اور ظلم کرے اور ”عَدَا عَلَيْهِ عَدُوًّا“ جب اس سے اس کا حق چھین لے۔ موسیٰ علیہ السلام کو حکم تھا کہ سمندر سے پار ہو کر اسے اسی حالت میں رہنے دو۔ (دیکھیے دخان: ۲۳) چنانچہ جب بنی اسرائیل کا آخری آدمی بھی نکل گیا اور فرعون کا پورا لشکر ان کے پیچھے مع فرعون سمندر میں داخل ہو گیا تو سمندر کا پانی برابر ہو گیا۔

﴿ ۳ ﴾ حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْعُرْقُوقُ: غرق یعنی ڈوبنے نے اسے پالیا، گویا غرق اللہ کا سپاہی تھا جس نے اسے آپکڑا اور واقعی اللہ کے لشکروں اور سپاہیوں کا شمار نہیں۔ تو فرعون نے تین دفعہ مسلمان ہونے کا اقرار کیا: ﴿ ۱ ﴾ ”آمَنْتُ“ ﴿ ۲ ﴾ ”أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آمَنْتُ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ“ ﴿ ۳ ﴾ ”وَ أَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ“ یہ سارا معاملہ غیب کا ہے، ڈوبتے وقت اس نے کیا کہا؟ اللہ تعالیٰ یا اس کے فرشتوں کے سوا وہاں کون تھا؟ سو یہ ساری بات اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے بتائی، جو آپ کی نبوت کی زبردست دلیل ہے۔

﴿ ۴ ﴾ آلن وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ: کیا اب؟ یہ اللہ کی طرف سے ڈانٹ تھی اور بتانا تھا کہ عذاب نازل ہو جانے کے بعد

قَالِيَوْمَ نُنَجِّكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلَقَكَ آيَةً ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغٰفِلُونَ ﴿۹۲﴾

پس آج ہم تجھے تیرے (خالی) بدن کے ساتھ بچالیں گے، تاکہ تو ان کے لیے عظیم نشانی بنے جو تیرے بعد ہوں اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے یقیناً غافل ہیں ﴿۹۲﴾

توبہ کرنے اور ایمان لانے سے کوئی فائدہ نہیں، فرمایا: ﴿فَلَنَرِيكَ يَوْمَئِذٍ مُّسْتَضْمِرًا لِّمَا كَانُوا يَاسْتَا﴾ [المؤمن: ۸۵] ”پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔“ اور دیکھیے سورہ یونس (۵۱) اور نساء (۱۸) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُعْرَفْ﴾ [ترمذی، الدعوات، باب إن الله يقبل توبة العبد ما لم يعرفه.....: ۳۵۲۷، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما] ”بے شک اللہ بندے کی توبہ قبول کرتا ہے، جب تک اس کا غرہ (جان نکلنے کی حالت) نہ ہو۔“ ﴿۵﴾ فرعون کی سرکشی پر اللہ کے فرشتوں کو بھی اس قدر غصہ تھا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا: ﴿قَالَ لِيْ جِبْرِيلُ لَوْ رَأَيْتَنِيْ وَأَنَا آخِذٌ مِنْ حَالِ الْبَحْرِ فَأَدُسُّهُ فِيْ فَمِ فِرْعَوْنَ مَخَافَةَ أَنْ تُذْرِكَ الرَّحْمَةُ﴾ [السلسلة الصحيحة: ۲۶/۵، ج: ۲۰۱۵۔ مسند طرابلسی: ۲۶۱۸۔ ترمذی: ۳۱۰۸] ”مجھ سے جبریل علیہ السلام نے کہا، کاش! آپ مجھے دیکھتے کہ میں سمندر کا سیاہ کچھڑا اٹھا کر فرعون کے منہ میں ٹھونس رہا تھا، اس خوف سے کہ کہیں اس کو رحمت نہ آپیجے۔“

﴿۶﴾ یہ واقعہ دس محرم (عاشوراء) کو پیش آیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہودی عاشوراء کے دن کا روزہ رکھتے تھے، آپ نے فرمایا: ﴿مَا هَذَا؟ قَالُوا هَذَا يَوْمٌ صَالِحٌ، هَذَا يَوْمٌ نَحَى اللَّهُ نَبِيَّ إِسْرَائِيلَ مِنْ عَدُوِّهِمْ، فَصَامَهُ مُوسَى قَالَ فَأَنَا أَحَقُّ بِمُوسَى مِنْكُمْ، فَصَامَهُ وَأَمَرَ بِصِيَامِهِ﴾ [بخاری، الصوم، باب صوم يوم عاشوراء: ۲۰۰۴] ”یہ کیا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”یہ ایک صالح دن ہے، اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن سے نجات دلائی تھی تو موسیٰ علیہ السلام نے اس دن کا روزہ رکھا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”پھر میں تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام پر حق رکھنے والا ہوں۔“ چنانچہ آپ نے اس (دن) کا روزہ رکھا اور اس کا روزہ رکھنے کا حکم دیا۔“ صحیح بخاری ہی کی دوسری روایت میں ہے: ﴿هَذَا يَوْمٌ ظَهَرَ فِيهِ مُوسَى عَلَى فِرْعَوْنَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَصْحَابِهِ أَنْتُمْ أَحَقُّ بِمُوسَى مِنْهُمْ فَصُومُوا﴾ [بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ﴾: ۴۶۸۰] ”اس دن موسیٰ علیہ السلام فرعون پر غالب آئے تھے، تو نبی ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: ”تم ان (یہود) سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام پر حق رکھتے ہو، پس روزہ رکھو۔“

آیت 92 ﴿۱﴾ قَالِيَوْمَ نُنَجِّكَ بِبَدَنِكَ.....: ”نُنَجِّي“ ”نَجَّاهُ يَنْجُو“ سے باب تفعیل ہے۔ ”نَجَّاهُ اللَّهُ“ اللہ تعالیٰ نے اسے بچالیا۔ ”النَّجْوَةُ“ یا ”النَّجَا“ اونچی جگہ یا ٹیلے کو بھی کہتے ہیں۔ ”نَجَّاهُ“ کا معنی اس صورت میں یہ ہوگا کہ اس نے اسے اونچی جگہ پھینک دیا، یعنی آج ہم تمہارے بے جان لاشے کو سمندر سے بچالیں گے، یا اونچی جگہ پھینک دیں گے، تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے ایک عظیم نشانی بنے۔ ”آیة“ میں توین تعظیم کے لیے ہے، یعنی فرعون اور اس کی ساری فوج کے غرق

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صَدَقٍ وَرَزَقْنَهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ ۖ فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۹۳﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو ٹھکانا دیا، باعزت ٹھکانا، اور انھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا، پھر انھوں نے آپس میں اختلاف نہیں کیا، یہاں تک کہ ان کے پاس علم آ گیا، بے شک تیرا رب ان کے درمیان قیامت کے دن اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے ﴿۹۳﴾

ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرعون کی لاش سمندر کے کنارے پر باہر نکال بھیجی، تاکہ وہ بعد والوں کے لیے عظیم نشانی بنے اور بنی اسرائیل کے کمزور عقیدے والوں کو بھی خدا کی دعویٰ کی حقیقت اور انجام آنکھوں سے دیکھنے کا موقع مل جائے اور فرعون اور اس کا سمندر میں غرق ہونے کا واقعہ بعد میں ہر اس شخص کے لیے قدرت کی عظیم نشانی بن جائے جو اس کو سنے یا پڑھے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ فرعون کی لاش مصر کے عجائب گھر میں اب تک محفوظ ہے مگر اس کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ اسی فرعون کی لاش ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس کی لاش محفوظ نہ بھی رہے تو تاریخ اور قرآن میں اس واقعہ کا ذکر ہی بعد والوں کے لیے بطور عبرت اور نشانی کافی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب سبت کو بندر بنانے کے متعلق فرمایا: ﴿فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّلْمُتَابِعِينَ يَذِّبْنَهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ﴾ [البقرہ: ۶۶] ”تو ہم نے اسے (یعنی اس واقعہ کو) ان لوگوں کے لیے جو اس کے سامنے تھے اور جو اس کے پیچھے تھے ایک عبرت اور ایک نصیحت بنا دیا۔“ حالانکہ ان میں سے کسی شخص شدہ بندر کی کوئی مٹی کہیں موجود نہیں۔ الغرض! یہ اس فرعون کی لاش نہ ہو تب بھی بعد والوں کے لیے اس واقعہ کے نشان عظیم ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

② ہمارے شیخ محمد عبدالرحمن لکھتے ہیں: ”آج تک جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر اس مقام کی نشان دہی کی جاتی ہے، جہاں فرعون کی لاش سمندر میں تیرتی ہوئی پائی گئی۔ اس زمانے میں اس مقام کو جبل فرعون یا حمامہ فرعون کہا جاتا ہے۔ اس کی جائے وقوع ابوزیمہ (جہاں تانبے وغیرہ کا کانیں ہیں) سے چند میل اوپر شمال کی جانب ہے، آج قاہرہ کے عجائب گھر میں جن فرعونوں کی لاشیں موجود ہیں ان میں سے ایک فرعون کی لاش کو اسی فرعون کی لاش بتایا جاتا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں جب فرعونوں کی لاشیں دریافت ہوئی تھیں تو اس فرعون کی لاش پر نمک کی ایک تہجمی ہوئی پائی گئی تھی جو سمندر کے کھاری پانی میں اس کی غرقابی کی کھلی علامت تھی۔“

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”جیسا وہ بے وقوف ایمان لایا بے فائدہ ویسا ہی اللہ نے مرنے کے بعد اس کا بدن دریا سے نکال کر نیلے پر ڈال دیا، تاکہ بنی اسرائیل دیکھ کر شکر کریں اور عبرت پکڑیں۔ اس کو بدن بچنے سے کیا فائدہ؟“ (موضح)

③ وَإِنَّ كَيْدَ مَنْ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَفُتُونٌ: یعنی ان پر غور نہیں کرتے اور ان سے سبق حاصل نہیں کرتے، اگر غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کی بساط کیا ہے؟

ت 93 ① وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صَدَقٍ.....: ”مُبَوَّأ“ (ٹھکانا) کی ”صَدَق“ کی طرف اضافت کا مطلب

فَإِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِينَ يُفَرِّعُونَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ ۖ لَقَدْ جَاءَكَ
الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿۱۰﴾

پھر اگر تو اس کے بارے میں کسی شک میں ہے جو ہم نے تیری طرف نازل کیا ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں، بلاشبہ یقیناً تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے حق آیا ہے، سو تو ہرگز شک کرنے والوں سے نہ ہو ﴿۱۰﴾

اس کی تعریف ہے، یعنی بہترین باعزت ٹھکانا۔ اہل عرب جس چیز کی تعریف کرنا چاہیں اسے ”صدق“ کی طرف مضاف کر دیتے ہیں، جیسے کہتے ہیں: ”رَجُلٌ صَدِيقٌ“ ”سچ کا آدمی۔“ فرمایا: ﴿أَنْ لَهْوَ قَدَمٌ صَدِيقٌ﴾ [یونس: ۲] اور فرمایا: ﴿وَقُلْ رَبِّ أَنْزَلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ﴾ [بنی اسرائیل: ۸۰] یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو نہایت باعزت ٹھکانا، حکومت اور وافر صاف ستھری چیزیں کھانے کے لیے عطا فرمائیں۔ ان بنی اسرائیل سے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی مراد لینا تو مشکل ہے، کیونکہ وہ تو موسیٰ علیہ السلام کے حکم پر جہاد کے لیے نکلنے سے صاف انکار کی پاداش میں چالیس سال صحرائے سینا ہی میں جھپکتے رہے تھے، البتہ ان کے بعد یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں نئی نسل نے فلسطین اور شام اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق فتح کیے، وعدہ یہ تھا: ﴿يَقْوَاهُ إِذْ خَلُّوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ [المائدہ: ۲۱] ”اے میری قوم! اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔“ پھر مصر پر بھی بنی اسرائیل کی حکومت قائم ہو گئی، جیسا کہ فرمایا: ﴿كَذَلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ [الشعراء: ۵۹] ”ایسے ہی ہوا اور ہم نے ان کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔“ پھر بنی اسرائیل پر حکومت اور غلامی کے کئی دور آئے، کبھی داؤد اور سلیمان علیہما السلام جیسے عظیم الشان حکمران آئے اور کبھی بخت نصر اور دوسرے کفار کے ہاتھوں ان کی پامالی ہوئی اور اس پامالی کا سبب ہمیشہ ان کا اختلاف بنا، جس کا باعث ان کی لاعلمی نہ تھا بلکہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے وہ احبار و رہبان کو رب بنا کر مختلف سیاسی اور دینی فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ احادیث میں ان کے بہتر (۷۲) فرقوں کا ذکر ہے، ان میں صحیح کون تھا اور غلط کون! یہ فیصلہ اب قیامت کے دن رب تعالیٰ ہی فرمائیں گے۔

﴿فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ﴾ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اللہ کی کتاب تورات کی صاف پیش گوئی کے مطابق بنی اسرائیل کا اتفاق تھا کہ خاتم النبیین محمد ﷺ آنے والے ہیں، کسی کا بھی اختلاف نہ تھا اور کوئی اس سے لاعلم نہ تھا، بلکہ سب آپ کے آنے کے منتظر تھے اور آپ کے آنے کی دعا کرتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَكَانُوا مِنْ قَبْلِ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ [البقرة: ۸۹] ”حالانکہ وہ اس سے پہلے ان لوگوں پر فتح طلب کیا کرتے تھے جنہوں نے کفر کیا۔“ مگر جب آپ تشریف لے آئے تو آپ کو پہچان لینے کے بعد محض ضد اور حسد کی وجہ سے ان کا اتفاق اختلاف میں بدل گیا۔ کسی نے کہا، وہ ہیں ہی نہیں جن کے آنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ کسی نے کہا یہ ہمارے نہیں بلکہ صرف امیوں کے رسول ہیں۔ بعض خوش نصیبوں نے ایمان قبول بھی کر لیا، بہر حال علم کے بعد اختلاف کا فیصلہ اب رب تعالیٰ ہی فرمائیں گے۔

﴿فَإِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ﴾..... اس سورت کا اصل موضوع رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا ثبوت اور مخالفین

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونُوا مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۹۵﴾ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۹۶﴾

اور نہ کبھی ان لوگوں سے ہونا جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا، ورنہ تو خسارہ اٹھانے والوں سے ہو جائے گا ﴿۹۵﴾
بے شک وہ لوگ جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی، وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۹۶﴾

کے شبہات کی تردید ہے۔ یہاں سورت کے آخر میں پھر اصل موضوع کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ مشرکین عرب چونکہ ان پڑھ اور آسانی کتابوں کے علم سے بے بہرہ تھے، اس لیے ان کو توجہ دلائی کہ اگر تمہیں کوئی شک ہے، خود علم نہیں ہے تو ان علمائے یہود سے دریافت کر لو جو تورات وغیرہ کا آسانی علم رکھتے ہیں۔ ان میں سے جو منصف مزاج اور اللہ سے ڈرنے والے ہیں وہ اقرار کریں گے کہ قرآن واقعی آسانی کتاب اور محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں، کیونکہ ان کی کتابوں میں جگہ جگہ آپ ﷺ کی بشارتیں موجود ہیں اور آپ کی علامات بیان کی گئی ہیں۔ الغرض! یہ خطاب تو آپ ﷺ سے ہے مگر مقصود مشرکین عرب کو توجہ دلانا ہے، ورنہ آپ کو اپنی رسالت پر شک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات بھی مد نظر رہنی چاہیے کہ بعض اوقات ایک بات بطور فرض و تقدیر کی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ فی الواقع ایسا ہے، یعنی اگر فرض کریں آپ کو کوئی شک ہے تو اہل کتاب سے پوچھ لیں، ان کی کتابوں میں آپ کا واضح ذکر خیر موجود ہے، پھر شک کیسا؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ جب عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو؟ تو وہ اپنے تفصیلی بیان میں یہ بھی کہیں گے: ﴿إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوا أُمَّتِي﴾ [المائدہ: ۱۱۶] یعنی فرض کریں کہ میں نے یہ بات کہی تھی تو یا اللہ! تجھ سے تو اوجھل نہیں رہ سکتی۔ مطلب صاف ہے کہ میں نے یہ بات ہرگز نہیں کہی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو نہ شک تھا نہ آپ کو کسی اہل کتاب سے پوچھنے کی ضرورت تھی۔ ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ یہاں ”كَلِمَاتُ رَبِّكَ“ میں ہر انسان کو براہ راست خطاب ہے، کیونکہ یہ کتاب ہر ایک کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے۔

آیت 95 وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونُوا مِنَ الْخَاسِرِينَ : یہاں بھی آپ ﷺ کو خطاب کر کے امت ہی کو سمجھایا جا رہا ہے۔

آیت 96 إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ : اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حد تک ارادہ و اختیار دیا ہے، جس کے مطابق وہ نیکی یا بدی میں سے جس پر چاہے عمل کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کو وہ سب کچھ معلوم ہے جو شروع سے اب تک واقع ہوا، اسی طرح وہ آئندہ ہونے والی ہر بات کا بھی پورا علم رکھتا ہے اور اس کی رو سے اسے پہلے ہی معلوم ہے کہ اپنے ارادہ و اختیار کو استعمال کرتے ہوئے کون حق کو قبول کرے گا اور کون کفر کی راہ اختیار کرے گا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے اس ازلی علم کو ”كَلِمَاتُ رَبِّكَ“ کہا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کفر میں اور اللہ کی نافرمانی میں اس قدر غرق ہو جاتے ہیں کہ ان کی حق قبول کرنے کی استعداد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ کسی صورت ایمان نہیں لاتے، بلکہ وہ کفر ہی پر مریں گے اور ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انہیں ایمان لانے کی توفیق نہیں ہوگی۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۱۶)، لیس (۷) اور زمر (۱۹)۔

وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّى يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۹۷﴾ فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ أَمَدَتْ
فَقَعَهَا إِيَّانَهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَلَأْنَا أَمْنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۹۸﴾

خواہ ان کے پاس ہر نشانی آجائے، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں ﴿۹۷﴾ سو کوئی ایسی ہستی کیوں نہ ہوئی جو ایمان لائی ہو، پھر اس کے ایمان نے اسے نفع دیا ہو، یونس کی قوم کے سوا، جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے ذلت کا عذاب دنیا کی زندگی میں ہٹا دیا اور انھیں ایک وقت تک سامان دیا ﴿۹۸﴾

آیت ۹۷ : وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ : یعنی کوئی بھی نشانی یا معجزہ آجائے، وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ عذاب الیم دیکھ لیں، مگر اس وقت انھیں ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکے گا، جیسا کہ فرعون اور اس کی قوم کو کچھ فائدہ نہیں ہوا اور اسی طرح دوسرے پیغمبروں کی امتوں کے کفار کو اللہ کا عذاب دیکھنے پر ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دیکھیے سورہ مومن (۸۵) اس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ اگر اس وقت ان کو چھوڑ دیا جائے تو وہ دوبارہ کفر کی روش پر چل نکلیں گے۔ دیکھیے سورہ انعام (۲۷، ۲۸)۔

آیت ۹۸ : ﴿۱﴾ فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ أَمَدَتْ فَقَعَهَا إِيَّانَهَا : یعنی کوئی ایسی ہستی کیوں نہ ہوئی جو رسول کے عذاب سے ڈرانے پر ڈر جاتی اور عذاب آنے سے پہلے ایمان لے آتی، پھر اس کا ایمان اسے نفع دیتا، مگر ایسی کوئی ہستی بھی نہ ہوئی، سب اس وقت ہی ایمان لائے جب ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ گیا، سوائے یونس علیہ السلام کی قوم کے کہ یونس علیہ السلام کے کئی سال دعوت دینے کے باوجود جب وہ ایمان نہ لائے تو یونس علیہ السلام نے ان پر عذاب کے لیے بددعا کی اور انھیں آگاہ کر دیا کہ تم پر عذاب آنے ہی والا ہے اور خود وہاں سے ناراض ہو کر نکل گئے۔ دیکھیے سورہ انبیاء (۸۷) اور صافات (۱۳۰) قوم جانتی تھی کہ یونس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، ان کے نکل جانے سے وہ مزید ڈر گئے، اس لیے عذاب آنے سے پہلے ہی پوری ہستی نے نہایت عاجزی کے ساتھ کفر سے توبہ کی اور یونس علیہ السلام پر ایمان لے آئے، اب یہ ایمان چونکہ بروقت تھا، عذاب دیکھنے سے پہلے تھا، اس لیے اس ایمان نے انھیں یہ نفع دیا کہ ان سے عذاب ہٹا لیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کی طبعی عمر تک دنیا کی زندگی سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا۔ سورہ صافات کی آخری آیات میں بھی ان کے ایمان لانے اور اس کے نافع ہونے کا ذکر ہے۔

﴿۲﴾ یہ کفار قریش اور اہل کتاب کو تنبیہ ہے کہ تمہیں یونس علیہ السلام کی قوم سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور عذاب سے پہلے ایمان لے آنا چاہیے، نہ کہ آل فرعون اور دوسری برباد ہونے والی قوموں کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔

﴿۳﴾ تفسیر قاسمی میں ہے کہ یہ بات کہ عذاب کے بادل پہنچ گئے تھے، اندھیرا چھا گیا تھا، پھر انھوں نے توبہ کی، قرآن و حدیث میں کہیں مذکور نہیں اور نہ ہی عذاب آنے کے بعد ملتا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مِنَ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا ۖ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا
مُؤْمِنِينَ ﴿۹۹﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُوْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ
لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۰۰﴾

اور اگر تیرا رب چاہتا تو یقیناً جو لوگ زمین میں ہیں سب کے سب اکٹھے ایمان لے آتے۔ تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا، یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں؟ ﴿۹۹﴾ اور کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ ایمان لائے مگر اللہ کے اذن سے اور وہ گندگی ان لوگوں پر ڈالتا ہے جو نہیں سمجھتے ﴿۱۰۰﴾

آیت 99 ﴿۱﴾ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ..... یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو فرشتوں کی طرح جنوں اور انسانوں کی فطرت بھی ایسی بنا دیتا کہ وہ کفر و نافرمانی کر ہی نہ سکتے، یا ان سب کے دل ایمان و طاعت کی طرف پھیر دیتا، لیکن اس طرح چونکہ جنوں اور انسانوں کو علیحدہ قسم کی حیثیت سے پیدا کرنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ (دیکھیے ہود: ۱۱۸، ۱۱۹۔ فاطر: ۸) اس لیے اس نے اپنی مرضی سے ان کی فطرت میں یہ چیز رکھی ہے کہ وہ عقل سے کام لے کر چاہیں تو ایمان و طاعت کا راستہ اختیار کریں یا چاہیں تو کفر و نافرمانی کا۔

﴿۲﴾ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ: یعنی ایمان دل کا معاملہ ہے، اس پر کسی کو مجبور کیا جا سکتا ہی نہیں اور مجبور کرنا جائز بھی نہیں، فرمایا: ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ [البقرہ: ۲۵۶] ”دین میں کوئی زبردستی نہیں۔“ اگر آپ کسی کو زبردستی مسلمان بنا بھی لیں تو دل کی کیا ضمانت ہے کہ اس میں بھی ایمان آچکا ہے۔ نبی ﷺ کی ازراہ شفقت یہ زبردستی خواہش تھی کہ اللہ کے سب بندے ایمان لے آئیں، اس لیے اس آیت میں آپ ﷺ کو یہ کہہ کر تسلی دی گئی کہ یہ چونکہ ہونے والی بات نہیں، اس لیے آپ کیوں اپنے آپ کو رنج و کرب میں مبتلا کرتے ہیں؟

آیت 100 ﴿۱﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُوْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ: یعنی جس طرح تکوینی طور پر دنیا کی کوئی نعمت کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، یعنی دنیا کی نعمتوں میں بھی اگرچہ آدمی کی محنت کا دخل ہے، مگر اللہ کے اذن کے بغیر کوئی محنت نہ ہو سکتی ہے اور نہ نتیجہ نیر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح کسی شخص کو ایمان کی نعمت حاصل ہونے یا نہ ہونے کا انحصار بھی اللہ کے اذن پر ہے۔ کوئی شخص اس نعمت کو نہ خود پا سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو عطا کر سکتا ہے، اس لیے اگر نبی چاہے بھی کہ تمام لوگوں کو مومن بنا دے تو نہیں بنا سکتا۔ نبی ﷺ کے چچا ابوطالب، نوح علیہ السلام کا بیٹا اور نوح اور لوط علیہم السلام کی بیویاں اس کی مثال ہیں، اسی طرح بت گر آزر کا بیٹا ابراہیم، فرعون کی بیوی آسیہ، ابو جہل کا بیٹا مکرمہ اللہ کے اپنی مرضی سے ایمان کی نعمت عطا کرنے کی مثالیں ہیں۔

﴿۲﴾ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ: یعنی اگرچہ ایمان کی توفیق دینے یا نہ دینے کا کلی اختیار اللہ تعالیٰ ہی کو ہے،

قُلْ اَنْظُرُوا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالذُّمُّ عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾
 فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ قُلْ فَاَنْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نَجِ الْمُوْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

کہہ تم دیکھو آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ موجود ہے۔ اور نشانیاں اور ڈرانے والی چیزیں ان لوگوں کے کام نہیں آتیں جو ایمان نہیں لاتے ﴿۱۰۱﴾ تو یہ لوگ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں سوائے ان لوگوں کے سے ایام کے جو ان سے پہلے گزر چکے۔ کہہ دے پس انتظار کرو، یقیناً میں (بھی) تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں ﴿۱۰۲﴾ پھر ہم اپنے رسولوں کو نجات دیتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جو ایمان لائے، اسی طرح ہم پر حق ہے کہ ہم مومنوں کو نجات بخشیں ﴿۱۰۳﴾

مگر اس کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس نعمت سے انہی لوگوں کو محروم رکھتا ہے اور انہی کو کفر و شرک کی نجاست میں پڑے رہنے کے لیے چھوڑتا ہے جو اس کی عطا کردہ عقل سے کام نہیں لیتے اور جس راستے پر اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھتے ہیں اسی پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہنا پسند کرتے ہیں۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۶، ۲۷)۔

آیت 101 ﴿۱﴾ قُلْ اَنْظُرُوا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : یعنی ایمان لانے کے لیے زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی توحید کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَكَآيِنٌ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [یوسف: ۱۰۵] "اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے گزرتے ہیں اور وہ ان سے بے دھیان ہوتے ہیں۔" اور فرمایا: ﴿وَفِى الْاَنْحٰصِ اٰيٰتٌ لِّمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الذاریات: ۲۰] "اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے کئی نشانیاں ہیں۔"

﴿۲﴾ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالذُّمُّ عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُوْنَ : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، یعنی وہ لوگ جن کی قسمت ہی میں نہیں کہ وہ ایمان لائیں گے، انہیں نہ نشانوں سے کچھ فائدہ ہوتا ہے نہ ڈرانے والی چیزوں یا ڈرانے والے پیغمبروں اور داعی حضرات سے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ جو لوگ طے کر لیتے ہیں کہ چاہے کچھ ہو جائے ہم ہرگز اپنے باپ دادا کا راستہ چھوڑ کر ایمان نہیں لائیں گے، انہیں نشانوں اور ڈرانے والے پیغمبروں سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ "الذُّمُّ" "نذیر" کی جمع ہے، ڈرانے والے مجھڑے ہوں یا آیات یا پیغمبر۔

آیت 102, 103 ﴿۱﴾ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ : یعنی کیا یہ مشرکین چاہتے ہیں کہ ان پر گزشتہ قوموں کی طرح عذاب آجائے؟ فرمایا، ٹھیک ہے تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرنے والوں میں شامل ہوں، مگر یاد رکھو کہ پھر عذاب آنے پر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اور ایمان والوں کو ہر حال میں عذاب سے بچا لیتا ہے اور یہ اللہ پر حق ہے کہ وہ مومنوں کو ضرور ہی بچا لیتا ہے۔ بطور مثال دیکھیے سورہ خم اسجدہ (۱۸) میں قوم عاد و ثمود کے عذاب میں سے ایمان اور تقویٰ والوں کو بچا لینے کا ذکر۔ اس سے معلوم ہوا کہ جتنا بڑا عذاب بھی آجائے اہل خیر کا وجود زمین میں ہمیشہ رہتا ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ
وَلَكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ ۖ وَآمُرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۰۴﴾ وَأَنْ أَقِمَّ
وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۖ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ
وَلَا يَضُرُّكَ ۖ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا تِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۰۶﴾

کہہ دے اے لوگو! اگر تم میرے دین کے بارے میں کسی شک میں ہو تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو اور لیکن میں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں قبض کرتا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان والوں سے ہو جاؤں ﴿۱۰۴﴾ اور یہ کہ تو اپنا چہرہ یکسو ہو کر اسی دین کی طرف سیدھا رکھ اور مشرکوں سے ہرگز نہ ہو ﴿۱۰۵﴾ اور اللہ کو چھوڑ کر اس چیز کو مت پکار جو نہ تجھے نفع دے اور نہ تجھے نقصان پہنچائے، پھر اگر تو نے ایسا کیا تو یقیناً تو اس وقت ظالموں سے ہوگا ﴿۱۰۶﴾

آیت 104 قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي.....: شک کا معنی یہ ہے کہ ذہن میں کسی چیز کے حق ہونے یا ناحق ہونے کا برابر امکان ہو، اگر اس کی ذہنی کیفیت کو ترازو میں تولتا جائے تو وہ اسے نہ حق کہہ سکے نہ باطل۔ اب دنیا کے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا ”اِن“ اگر تمہیں میرے دین کے بارے میں کوئی بھی شک ہے۔ ”اگر“ کا لفظ بتاتا ہے کہ شک کی گنجائش تو نہیں لیکن فرض کرو کہ تمہیں اس میں کوئی شک ہے تو میرا اعلان سن لو کہ میں ایک اللہ کے سوا تمہارے معبودوں میں سے کسی کی عبادت نہیں کرتا۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اللہ کی عبادت سے پہلے تمام باطل معبودوں کا انکار کیا گیا ہے، جیسے ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ﴾ میں ہے، پھر صرف ایک اللہ کی عبادت کا اعلان کیا گیا اور ساتھ ہی اس کی دلیل ذکر فرمادی: ﴿الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ﴾ ”وہ جو تمہاری روح قبض کرتا ہے۔“ مزید دیکھیے سورہ زمر (۲۲) کوئی اور معبود یہ کام کرتا ہو تو سامنے لاؤ۔ ساتھ ہی اس میں دھکی بھی ہے کہ اگر تم شرک پر قائم رہے تو اس اللہ کو کیا جواب دو گے جو تمہاری روح قبض کرتا ہے اور بہ حال میں تمہیں اسی کے پاس جانا ہے، پھر وہ تم سے نمٹ لے گا اور مجھے تو یہی حکم ہے کہ میں مومن بن کر رہوں اور اپنی پیشانی اس کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکاؤں، لہذا میری اور تمہاری راہ ایک دوسرے سے سراسر مختلف ہے۔

آیت 105 وَأَنْ أَقِمَّ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا.....: ”حَنِيفًا“ ”یکسو، ایک طرف ہو جانے والا“ یعنی تمام باطل معبودوں کو چھوڑ کر ایک اللہ ہی کا ہو جانے والا۔ حنیف بن کر مشرکین میں سے ہرگز نہ ہونے کی تاکید کا مطلب یہ ہے کہ عرب کے مشرک دین ابراہیم کے پیروکار ہونے کا دعویٰ رکھے کی وجہ سے اپنے آپ کو حنیف کہتے، پھر شرک بھی کیے جاتے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، حنیف بن مگر مشرکین میں سے ہرگز نہ ہو اور ایک معنی یہ ہے کہ کسی طرح بھی مشرکین کے ساتھ شامل نہ ہو، نہ شرک جلی میں اور نہ شرک خفی میں۔ ریا کو شرک خفی کہا جاتا ہے۔

آیت 106 ﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ﴾: اس میں اللہ تعالیٰ کے سوا زمین و آسمان کی ہر زندہ

وَإِنْ يَسْسِكِ اللَّهُ يَضِرَّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۚ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ
يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۗ وَهُوَ الْعَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۷۰﴾

اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کر لے تو کوئی اس کے فضل کو ہٹانے والا نہیں، وہ اسے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے پہنچا دیتا ہے اور وہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۷۰﴾

یا مردہ ہستی اور ہر جان دار یا بے جان چیز آگئی۔ یہ مطلب نہیں کہ پہلے تو کسی بزرگ یا نبی کی قبر کے بارے میں یہ غلط عقیدہ قائم کر لیا جائے کہ وہ نفع نقصان پہنچا سکتی ہے، پھر اسے سجدے کیے جائیں اور اس سے مرادیں طلب کی جائیں اور کہا جائے کہ ہم نفع نقصان کا اختیار رکھنے والوں ہی کو پکار رہے ہیں۔ اس آیت کی اس طرح تاویل کرنا اللہ کی کتاب سے کھیلنا اور اس کا مذاق اڑانا ہے۔ اس آیت کا صاف مطلب مشرکین کو سمجھانا ہے کہ ہر قسم کے نفع نقصان کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ (نفع القدر) اس سے اگلی آیت میں اس کی صراحت بھی آ رہی ہے۔ یہاں اگرچہ نبی ﷺ کو غیر اللہ کے پکارنے سے منع کیا گیا ہے، مگر وہ حقیقت پوری امت کو اس سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اس شخص کو منع کرنا جس نے نہ وہ کام کیا ہونہ کبھی کرنا ہو، اس کا مطلب دوسروں کو منع کرنے میں مبالغہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ أَوْحَىٰ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لِيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ [الزمر: ۶۵] ”اور بلاشبہ یقیناً تیری طرف وحی کی گئی اور ان لوگوں کی طرف بھی جو تجھ سے پہلے تھے کہ بلاشبہ اگر تو نے شریک ٹھہرایا تو یقیناً تیرا عمل ضرور ضائع ہو جائے گا اور تو ضرور بالضرور خسارہ اٹھانے والوں سے ہو جائے گا۔“

﴿۷۱﴾ وَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا مِنِ الظَّالِمِينَ: کیونکہ شرک کے برابر کوئی ظلم نہیں، جیسے فرمایا: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ [لقمان: ۱۳] ”بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔“ ظلم کا مطلب ہے: ”وَضَعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَحَلِّهِ“ کہ کسی چیز کو بے موقع اور غلط جگہ استعمال کرنا۔ تو عبادت جو صرف خالق کا حق ہے کسی مخلوق کو دینے سے بڑا ظلم اور بے انصافی کیا ہو سکتی ہے۔ یہاں ”اگر تو نے ایسا کیا“ سے مراد ہے کہ اگر تو نے اس کو پکارا جو نہ تجھے نفع دے نہ نقصان تو ظالموں میں سے ہو گا۔ یہ مضمون قرآن مجید کی کئی آیات میں بیان ہوا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی نہ کسی نفع کا مالک ہے نہ نقصان کا۔ دیکھیے سورہ نمل (۶۲)، مادہ (۷۶) اور سبأ (۲۲) اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

بیت 107 وَإِنْ يَسْسِكِ اللَّهُ يَضِرَّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ: عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کے پیچھے (سوار) تھا، آپ نے فرمایا: ((يَا غُلَامُ! إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ أَحْفَظُ اللَّهُ يَحْفَظُكَ، أَحْفَظُ اللَّهُ تَجِدُهُ تُجَاهَكَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللَّهَ، وَإِذَا اسْتَعْنَيْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللَّهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۗ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَخُذَ اللَّهُ ۗ وَهُوَ خَيْرُ الْحَكِيمِينَ ﴿۱۰۹﴾

۱۰۸

کہہ دے اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے، تو جو سیدھے راستے پر آیا تو وہ اپنی جان ہی کے لیے راستے پر آتا ہے اور جو گمراہ ہو وہ اسی پر گمراہ ہوتا ہے اور میں تم پر ہرگز کوئی نگران نہیں ہوں ﴿۱۰۸﴾ اور اس کی پیروی کر جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے اور صبر کر، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کرے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿۱۰۹﴾

عَلَىٰ أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ ۚ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ لَكَ، وَإِنْ اجْتَمَعُوا عَلَيَّ أَنْ يَضْرُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضْرُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ ۚ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَخَفَّتِ الصُّحُفُ ﴿ [ترمذی، صفة القيامة، باب : ۲۵۱۶ - مسند احمد : ۲۹۳/۱، ج : ۲، ۲۶۷۳، و صحیحہ الأئمة] ” اے لڑکے! میں تمہیں چند باتیں سکھاتا ہوں، تو اللہ کا دھیان رکھو وہ تیرا دھیان رکھے گا، تو اللہ کا دھیان رکھو تو اسے اپنے سامنے پائے گا اور جب تو مانگے تو اللہ سے مانگ اور جب مدد مانگے تو اللہ سے مدد مانگ اور جان لے کہ بے شک اگر سارے لوگ جمع ہو جائیں کہ تجھے کسی چیز کا فائدہ پہنچائیں تو اس چیز کے سوا نہیں پہنچا سکیں گے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے لکھ دی ہے اور اگر وہ سب جمع ہو جائیں کہ تجھے کسی چیز کا نقصان پہنچائیں تو اس کے سوا تجھے نقصان نہیں پہنچا سکیں گے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر لکھ دی ہے، قلم اٹھا لے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے۔“ بعض اہل علم نے فرمایا کہ قرآن مجید کی تین آیات پر اگر کوئی محکم یقین کر لے تو ان شاء اللہ مخلوق سے مستغنی ہو جائے گا، ایک تو یہ آیت، دوسری: ﴿ مَا يَفْتَحُ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۗ وَمَا يُمْسِكُ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ [فاطر : ۲] ” جو کچھ اللہ لوگوں کے لیے کسی بھی رحمت میں سے کھول دے تو اس کے بعد کوئی بند کرنے والا نہیں اور جو اللہ بند کر دے اسے اس کے بعد کوئی کھولنے والا نہیں اور وہی سب پر غالب کمال حکمت والا ہے۔“ اور تیسری: ﴿ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ﴾ [ہود : ۶] ” اور زمین میں کوئی چلنے والا (جان دار) نہیں، مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے اور وہی اس کے ٹھہرنے کی جگہ اور اس کے سونے جانے کی جگہ کو جانتا ہے۔“ بیہقی نے شعب الایمان میں عامر بن قیس کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن کی تین آیتوں نے مجھے سارے جہان سے بے نیاز کر دیا، پھر اوپر والی تین آیات ذکر فرمائیں۔ اس اثر کی سند تو کمزور ہے مگر آیات کے مضمون کے لحاظ سے اصل بات بلاشک و شبہ درست ہے۔

آیت 108 وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ : یعنی میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں کہ اگر تم سیدھی راہ پر نہ آؤ تو مجھ سے باز پرس ہو۔

آیت 109 وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ : یعنی آپ کی طرف جو وحی کی جاتی ہے اس کی پیروی کریں، خود بھی عمل کریں اور

تمام لوگوں کو اس کی دعوت بھی دیں، پھر اس کے نتیجے میں آنے والی بے پناہ مشکلات اور آزمائشوں پر صبر کریں، یہاں تک کہ

الرّت كِتَبٌ اُحْكِمَتْ اٰيَتُهُ ثُمَّ فُضِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الرّ۔ ایک کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں، پھر انھیں کھول کر بیان کیا گیا ایک کمال حکمت والے کی طرف سے جو پوری خبر رکھنے والا ہے ①

اللہ تعالیٰ آپ کے اور آپ کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ فرمادے کہ دنیا میں غالب ہو کر کسے رہنا ہے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے اور وہ فیصلہ اس نے قرآن میں کئی جگہ ذکر فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي أَوْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ [الصف: ۹] ”وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے ہر دین پر غالب کر دے، خواہ مشرک برامائیں۔“ اور فرمایا: ﴿وَلَا تَهْتَفُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَلَا تَأْتُمُّوا الْأَعْمَلُونَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ [آل عمران: ۱۳۹] ”اور نہ کمزور بنو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب ہو اگر تم مومن ہو۔“ اب اگر مسلمان مغلوب ہیں تو ان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شرط ”اگر تم مومن ہو“ پر غور کریں اور صحیح مومن بنیں، تا کہ خیر الحاکمین کا فیصلہ ان کے حق میں ہو۔

سورۃ ہود

آیت 1 ① الرّ: دیکھیے سورۃ بقرہ کی پہلی آیت۔ اس سورت میں توحید کی دعوت، انبیاء کی اس دعوت کے دوران میں عزیمت اور ان پر گزرنے والے حالات و واقعات، انھیں جھٹلانے والوں کا بدترین انجام اور ان پر آنے والے عذابوں کے تذکرے اور اہل ایمان کی نجات اور ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر ہے۔ چونکہ اس میں انذار (ڈرانے) کا پہلو غالب ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ پر اس کا بہت اثر ہوا، چنانچہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ﴿يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَدْ شَبَّتْ، قَالَ شَيْبَتِي هُوَ ذَا الْوَأَقَعَةُ وَالْمُرْسَلَاتُ وَ عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ﴾ وَ ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ [ترمذی، الضعيف، باب ومن سورة الواقعة: ۳۲۹۷۔ السلسلة الصحيحة: ۹۵۵] ”یا رسول اللہ! آپ بوڑھے ہو گئے۔“ فرمایا: ”مجھے ہود، واقعہ، مرسلات، عم یتساءلون اور کور نے بوڑھا کر دیا۔“

② كِتَبٌ اُحْكِمَتْ اٰيَتُهُ: یہاں قرآن کریم کی چار صفات بیان ہوئی ہیں، پہلی یہ کہ یہ قرآن (پڑھا جانے والا مجموعہ) کتاب (لکھا ہوا مجموعہ) بھی ہے، دوسری یہ کہ اس کی آیات محکم یعنی خوب پختہ، مضبوط اور اہل نازل کی گئی ہیں، جن میں کوئی عیب یا کمی نہیں اور نہ وہ (مجموعی اعتبار سے) منسوخ ہیں، نہ منسوخ ہوں گی اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی کتاب لائی جاسکتی ہے، خواہ ساری مخلوق جمع ہو جائے، ایسی محکم آیات والی کتاب صرف یہ ہے۔

③ ثُمَّ فُضِّلَتْ: تیسری یہ کہ اس کی آیات ایسی واضح ہیں اور کھول کر بیان کی گئی ہیں کہ کسی آیت کے مفہوم میں ابہام یا پیچیدگی نہیں ہے، پھر ساری کتاب مختلف سورتوں اور آیتوں میں تقسیم ہے۔ ہر آیت جدا جدا ہے، اپنی جگہ مستقل، ایک بے حد خوبصورت

الَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۗ اِنِّىْ لَكُمْ مِنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ ﴿۱﴾

یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں تمہارے لیے اس کی طرف سے ایک ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں ﴿۱﴾

ہار کی طرح جو رنگا رنگ مضامین توحید، آخرت، نبوت، قصص کے موتیوں سے پرویا ہوا ہے اور وہ نہایت مناسب فاصلے، ترتیب اور حسن سے اپنی اپنی جگہ جگمگا رہے ہیں، پھر نزول میں بھی آیات اور سورتیں ضرورت کے مطابق الگ الگ نازل کی گئی ہیں۔ ”فُصِّلَتْ“ میں یہ سب باتیں آ جاتی ہیں۔

﴿۱﴾ مِنْ لَدُنْ حَكِيْمٍ حَكِيْمٍ: چوتھی یہ کہ یہ کسی انسان، فرشتے، جن یا کسی بھی مخلوق کی تصنیف نہیں، بلکہ اس ذات پاک کا کلام ہے جو حکیم ہے۔ حکیم کا ایک معنی پختہ و محکم بنانے والا ہے، جس کی بنائی ہوئی ہر چیز نہایت محکم، پختہ اور مضبوط ہے، فرمایا: ﴿صُنِعَ اللّٰهُ الَّذِىْ اَنْتُمْ كُلٌّ شَيْءٌ﴾ [النمل: ۸۸] ”اس اللہ کی کاری گری سے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔“ یعنی پہاڑ اور ان کا قیامت کو بادلوں کی طرح چلانا اس اللہ کی کاری گری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔ جب اس کی مخلوق کا یہ حال ہے تو اس کے کلام کے محکم ہونے کی کوئی حد ہوگی؟ حکیم کا دوسرا معنی حکمت، یعنی دانائی والا ہے، یعنی اس کی تمام آیات کمال حکمت اور دانائی سے پُر ہیں، خیر یعنی ان کو اتارنے والا ہر چیز سے پوری طرح باخبر ہے۔

بیت 2 ﴿۱﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ: یعنی یہ قرآن اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بلکہ ہر رسول کو اللہ تعالیٰ نے اسی لیے بھیجا، فرمایا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِىْ اِلَيْهِ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ [الانبیاء: ۲۵] ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔“ سورہ نحل (۳۶) میں بھی ہر رسول کے بھیجنے کا مقصد ایک اللہ کی عبادت کا حکم اور طاغوت سے اجتناب کی تاکید بیان فرمایا ہے۔

﴿۲﴾ اِنِّىْ لَكُمْ مِنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ: چنانچہ آپ ﷺ نے سب سے پہلے اپنے گھر والوں ام المؤمنین خدیجہ، زید، علی اور اپنے خاص دوست ابو بکر رضی اللہ عنہم کے سامنے اللہ کا حکم پیش کیا، وہ ایمان لے آئے، پھر جب یہ آیت اتری: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ [الشعراء: ۲۱۴] ”اور اپنے سب سے قریب رشتہ داروں کو ڈرا“ تو آپ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کے قبائل کو آواز دے کر جمع کیا اور ان تک اللہ کا پیغام پہنچایا۔ [بخاری: ۷۷۰] پھر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے تحت: ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا اِلَّا كَاٰفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا﴾ [س: ۲۸] تمام دنیا کے لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے اور اس کے ثواب کی خوش خبری کا پیغام پہنچانے کا کام شروع کیا۔ چنانچہ دوسرے ملکوں سے پہلے جزیرہ عرب کے لوگوں تک نرمی اور محبت کے ساتھ اور پھر جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے سے یہ پیغام پہنچایا اور ان سب کو اسلام کے جھنڈے تلے جمع کیا، پھر تمام دنیا کے بادشاہوں کو خطوط لکھے، جن میں بشارت بھی تھی اور نذارت بھی۔ چنانچہ روم کے فرماں روا ہرقل کو خوش خبری دی کہ تم مسلمان ہو جاؤ تو سلامت بھی رہو گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں دو ہراجر دے گا اور ڈرایا بھی کہ اگر تم نے اسلام سے منہ موڑا تو تمہاری رعایا کے کفر کا

وَأَنْ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُغْفِرْ لَكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَ يُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ ۗ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ ﴿۳﴾

اور یہ کہ اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ تمہیں ایک معین مدت تک اچھا ساز و سامان دے گا اور ہر زیادہ عمل والے کو اس کا زیادہ ثواب دے گا اور اگر تم پھر گئے تو یقیناً میں تم پر ایک بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۳﴾

بوجھ بھی تمہاری گردن پر ہوگا۔ [بخاری : ۷] دوسرے تمام حکمرانوں تک بھی یہ پیغام پہنچایا، پھر آپ کے خلفاء نے مشرق سے مغرب تک یہ پیغام پہنچادیا۔

آیت 3 ﴿۱﴾ وَأَنْ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ: پچھلی آیت میں ”الَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں استغفار اور توبہ سے مراد غیر اللہ کی عبادت سے استغفار اور توبہ ہے، یعنی تم اللہ کے ساتھ جو بھی شرک اور اس کی نافرمانیاں کر چکے ہو ان کی معافی اور بخشش مانگو، مگر اس استغفار کا فائدہ تب ہے کہ ان گناہوں سے واپس پلٹ آؤ اور آئندہ کے لیے نہ کرنے کا خلوص دل سے عزم کرو، پھر اگر انسانی کمزوری سے کوئی گناہ ہو جائے تو پھر معافی مانگو اور ساتھ ہی آئندہ کے لیے خلوص دل سے پھر توبہ کرو اور یہ سلسلہ ساری زندگی ہر لغزش پر، خواہ کتنی بار بھی ہو جائے جاری رکھو۔ نہ گناہ کے بعد معافی مانگنے میں دیر کرو اور نہ معافی مانگنے کے ساتھ توبہ میں۔ تب استغفار اور توبہ کا فائدہ ہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۱۷، ۱۸)۔

﴿۲﴾ يُغْفِرْ لَكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى: اس میں استغفار اور توبہ کا کمال فائدہ بیان فرمایا ہے۔ یہ دنیا جسے اللہ تعالیٰ نے متاعِ غرور بتایا ہے، اسے اللہ تعالیٰ استغفار اور توبہ کرنے والے مومن کے لیے موت تک متاعِ حسن بنا دے گا۔ وہ دنیا کی نعمتوں سے سرفراز ہو کر بھی متاعِ غرور کے بجائے متاعِ حسن سے فائدہ اٹھائے گا۔ وہ استغفار اور توبہ کے ساتھ اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں بسر کرے گا، تو اس کی نفسانی لذتیں بھی اس کے لیے ثواب بن جائیں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما سے فرمایا: «وَلَسْتُ تُنْفِقُ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللَّهِ إِلَّا أُجِرْتُ بِهَا» (وَفِي رِوَايَةِ الْبُخَارِيِّ: فَإِنَّهَا صَدَقَةٌ) حَتَّى اللَّفْظَةَ تَجْعَلُهَا فِي فِي أَمْرَاتِكَ» [مسلم، الوصية، باب الوصية بالنلت: ۱۶۲۸۔ بخاری: ۲۷۴۲] ”تم جو بھی خرچ کرو گے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہو گے، اس پر تمہیں اجر دیا جائے گا (بخاری کے الفاظ ہیں کہ وہی صدقہ بن جائے گا) یہاں تک کہ وہ لقمہ بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے۔“ ایسے مومن کو دنیا میں حیاتِ طیبہ عطا ہوتی ہے (خواہ بظاہر وہ مصیبت میں گرفتار ہو) اور آخرت کا بہترین اجر عطا ہوگا۔ دیکھیے سورہ نحل (۹۷) عمل صالح اور استغفار کی بے شمار برکات اور فوائد ہیں، چند فوائد کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۵۲، ۶۱، ۹۰)۔

﴿۳﴾ وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ: ”فضل“ کا معنی زائد ہے، یعنی جو اطاعت اور نیک اعمال میں جتنا زیادہ ہوگا اسے اللہ تعالیٰ دنیا یا آخرت یا دونوں میں زیادہ اجر دے گا۔ اللہ کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، اس کا قاعدہ ہے کہ جو کوئی برائی کرتا ہے اس

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۰﴾ أَلَا إِنَّهُمْ يَشْتُونَ صُدُورَهُمْ لَيَسْتَخْفُوا

اللہ ہی کی طرف تمہارا لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۰﴾ سن لو! بلاشبہ وہ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں، تاکہ

کے لیے ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے اور جو نیکی کرتا ہے اس کے لیے کم از کم دس (۱۰) نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ کا کوئی حساب نہیں، فرمایا: ﴿وَاللَّهُ يَظُنُّكَ مِنْ يَشَاءَ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [النور: ۳۸] ”اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔“ ایک مطلب یہ بھی ہے کہ صدقہ عموماً اپنی ضرورت سے زائد چیز ہی کا کیا جاتا ہے، تو ہر شخص جو اپنی ضرورت سے زائد چیز اللہ کی راہ میں خرچ کر دے، تو اللہ تعالیٰ اسے ہرگز کمی نہیں ہونے دے گا، بلکہ اس کی زائد چیز ضرور اسے دے گا، پھر جو اپنی ضرورت کے باوجود صدقہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس پر کس قدر فضل فرمائے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ﴾ [مسلم، کتاب البر والصلة، باب استحباب العفو والتواضع: ۲۵۸۸، عن أبي هريرة ؓ] ”کوئی صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا۔“

﴿۱۰﴾ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يُؤْتِيهِمْ غَيْرِي: بہت بڑے دن کے عذاب سے، یعنی میں تم پر دنیا کے عذاب کے علاوہ آخرت کے دن کے عذاب سے بھی ڈرتا ہوں، جو بہت بڑا، یعنی پچاس ہزار سال کا دن ہے اور جس کے بعد پھر کفار کے لیے ہمیشہ کا عذاب ہے۔

آیت 4 إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ: ”إِلَى اللَّهِ“ کے پہلے آنے سے حصر پیدا ہو گیا، یعنی اگر تمہیں آخرت کے عذاب کا اس لیے خوف نہیں کہ تم اس دن کے منکر ہو تو یاد رکھو کہ اللہ کے سوا تم کہیں جا ہی نہیں سکتے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔ جب اس نے پہلی دفعہ تمہیں پیدا کیا تو دوبارہ اپنے پاس حاضر کیوں نہیں کر سکتا۔

آیت 5 أَلَا إِنَّهُمْ يَشْتُونَ صُدُورَهُمْ: ”يَشْتُونَ“ ”نَسِيْتُ نَفْسِي“ (ض) سے فعل مضارع جمع مذکر غائب ہے۔ اس کا معنی ہے دوہرا کرنا، موڑنا۔ دوسرے عدد کو تالی اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ واحد کو دو بنا دیتا ہے۔ ”لَيَسْتَخْفُوا مِنْهُ“ ”إِخْتَفَى يَخْتَفِي“ کا معنی چھپنا اور استعجال کی سین اور تاء کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہو گیا۔ اسی طرح ”يَسْتَفْشُونَ“ میں بھی سین اور تاء کے اضافے نے معنی میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے متعلق شرکین کے جہل اور لاعلمی کی انتہا بیان ہوئی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کا حال بیان فرمایا: ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَفْشِرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَنَعْتُمْ وَلَا أَبْصَارَكُمْ وَلَا جُلُودَكُمْ وَلَكِنْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ أَنْتُمْ أَنْتُمْ أَنْتُمْ أَنْتُمْ أَنْتُمْ﴾ [ختم السحرة: ۲۲] ”اور تم اس سے پردہ نہیں کرتے تھے کہ تمہارے خلاف تمہارے کان گواہی دیں گے اور نہ تمہاری آنکھیں اور نہ تمہارے چہرے اور لیکن تم نے گمان کیا کہ بے شک اللہ بہت سے کام جو تم کرتے ہو، نہیں جانتا۔“ گویا ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ سے چھپ کر بھی کچھ کام ہو سکتے ہیں جن کا اسے پتا نہ چلے۔ عبد اللہ بن مسعود ؓ نے بیان فرمایا: ﴿اجْتَمَعَ عِنْدَ النَّبِيِّ تَقْفِيَانِ وَ قُرَيْشِي، أَوْ قُرَيْشِيَانِ وَ تَقْفِي، كَثِيرَةٌ شَحْمٌ بَطُونُهُمْ قَلِيلَةٌ فَفَهُ قُلُوبُهُمْ، فَقَالَ أَحَدُهُمْ أَتَرُونَ أَنَّ اللَّهَ يَسْمَعُ مَا

مِنْهُ ۚ إِلَّا حِينَ يَسْتَعْشُونَ نِيَابَهُمْ لِأَيِّكُمْ مَا يُسْرُونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۗ إِنَّكَ عَلِيمٌ بِذَاتِ

الضُّدُورِ ⑤

اس سے اچھی طرح چھپے رہیں، سن لو! جب وہ اپنے کپڑے اچھی طرح پیٹ لیتے ہیں وہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ بے شک وہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے ⑤

نَقُولُ؟ قَالَ الْآخَرُ: يَسْمَعُ إِذْ جَهَرْنَا وَلَا يَسْمَعُ إِذْ أَحْفَيْنَا، وَقَالَ الْآخَرُ: إِذْ كَانَ يَسْمَعُ إِذَا جَهَرْنَا فَإِنَّهُ يَسْمَعُ إِذَا أَحْفَيْنَا، فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى: ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَنَعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ﴾ [بخاری، التوحید، باب قول اللہ عزوجل: ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُونَ﴾: ۱۷۵۲۱] ”کعبہ کے پاس دو قریشی اور ایک ثقفی یا دو ثقفی اور ایک قریشی جمع ہوئے، جن کے پیٹوں کی چربی بہت تھی اور دلوں کی سمجھ بہت کم تھی، تو ان میں سے ایک نے کہا: ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اللہ تعالیٰ اسے سن رہا ہے؟“ دوسرے نے کہا: ”اگر ہم بلند آواز سے بات کریں تو سنتا ہے، اگر آہستہ کریں تو نہیں۔“ تو اگلے نے کہا: ”اگر وہ اس وقت سنتا ہے جب ہم بلند آواز سے بولتے ہیں تو یقیناً وہ اس وقت بھی سنتا ہے جب ہم آہستہ بات کرتے ہیں۔“ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَنَعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ﴾ [سُورَةُ السَّجْدَةِ: ۱۷۲] اس سے معلوم ہوا کہ کئی جاہل مشرکین یہ بھی سمجھتے تھے کہ آہستہ بات کریں تو اللہ تعالیٰ کو پتا نہیں چلتا۔

تو معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے، البتہ جب بھی اللہ کی ناراضگی والا کوئی کام کرتے تو خوب چھپ کر تاکہ اللہ تعالیٰ سے چھپے رہیں، اسے پتا نہ چل جائے، کبھی کپڑوں اور دیواروں کے پردے کے پیچھے، کبھی سینہ دوہرا کر کے حاصل ہونے والی پوشیدگی کے ذریعے سے، مثلاً ملاوٹ کرنے کے لیے، دھوکا دینے کے لیے یا کوئی اور شنیع فعل کرنے کے لیے سینہ دوہرا کر کے اپنے خیال میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے چھپا لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یاد رکھو! خوب اچھی طرح کپڑے پیٹ کر بھی تم جو کچھ کرتے ہو اسے بھی وہ جانتا ہے، بلکہ اس سے بھی کہیں آگے جو کچھ سینوں کے حصار میں محفوظ دل کے اندر باتیں ہیں وہ انہیں بھی خوب جانتا ہے، اس لیے تمہارے یہ خیال اور یہ حرکات لغو اور باطل ہیں، ان کا تمہیں کچھ فائدہ نہیں۔

ایک تفسیر یہ ہے کہ اوپر جو فرمایا تھا: ﴿وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يُؤْتِيهِمْ﴾ (اور اگر تم پھر جاؤ تو یقیناً میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں) وہاں ظاہری اور جسمانی طور پر منہ پھیرنا مراد تھا اور یہاں دل سے اعراض مراد ہے، کیونکہ سینے سے مراد دل ہوتا ہے، جیسا کہ ”عَلَيْكُمْ بِذَاتِ الضُّدُورِ“ سے بھی ظاہر ہے۔ ”يَسْتَعِشُونَ ضُدُورَهُمْ“ گویا سینے کو موڑنا محاورہ ہے، مراد دل کو موڑنا، اعراض کرنا، غلط سوچنا، بے اصل شبہات سے اپنے دل کو تسلی دینا، عقائد حقہ سے اعراض کرنا وغیرہ ہے، کیونکہ یہاں صدور سے مراد علوم صدر ہیں۔ (فتح الرحمن از شاہ ولی اللہ) مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي

اور زمین میں کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے اور وہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ اور اس کے سینوں میں جو کفر و عناد رکھتے ہیں اسے چھپا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ان کے چھپے ہوئے رازوں کی اطلاع نہ ہونے پائے۔ (شوکانی) یہ دونوں حوالے ہمارے استاذ مرحوم نے اشرف الحواشی میں نقل کیے ہیں۔ صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اور ہی مطلب منقول ہے کہ ایک صاحب نے ان سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ”کچھ لوگ اس سے حیا کرتے تھے کہ قضائے حاجت کے وقت اپنی شرم گاہوں کو آسمان کے سامنے ننگا کریں اور اپنی بیویوں سے جماع کریں تو شرم گاہوں کو آسمان کے سامنے ظاہر کریں، تو یہ آیت ان کے بارے میں اتری۔“ [بخاری، التفسیر، باب: ﴿أَلَا إِنَّهُمْ بِشُكْرٍ مُسْتَوْدَعُونَ﴾ : ۴۶۸۱، ۴۶۸۲]

اس شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو غلبہٴ حیا کی وجہ سے قضائے حاجت اور ہم بستری کے وقت ننگا ہونے سے پرہیز کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اس لیے وہ ایسے موقعوں پر شرم گاہ کو چھپانے کے لیے اپنے سینے کو دہرا کر لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رات کے اندھیرے میں جب وہ بستروں میں اپنے آپ کو ڈھانپ لیتے ہیں تو اس وقت بھی وہ ان کو دیکھتا اور ان کی چھپی اور علانیہ باتوں کو جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شرم و حیا کا جذبہ اپنی جگہ بہت اچھا ہے، لیکن اس میں اتنا غلو اور زیادتی بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ جس ذات کی خاطر وہ ایسا کرتے ہیں اس سے تو وہ پھر بھی چھپ نہیں سکتے تو پھر اس طرح کے تکلف کا کیا فائدہ؟ اگرچہ یہ تفسیر جبر الامر سے حدیث کی صحیح ترین کتاب صحیح بخاری میں آئی ہے اور بلاشبہ درست ہے، مگر اکثر مفسرین نے فرمایا کہ آیات کے سیاق کے مطابق یہ آیت کفار کے رویے ہی سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ پہلے اور بعد میں مسلسل انہی کا ذکر ہو رہا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیت ان مسلمانوں پر بھی صادق آتی ہے جو حیا کے جذبے سے ایسا کرتے تھے۔ اصول تفسیر میں اہل علم نے یہ بات واضح فرمائی ہے کہ صحابہ و تابعین کسی آیت کے متعلق جہاں بھی وہ منطبق ہوتی اور صادق آتی ہو کہہ دیتے ہیں ”نَزَلَتْ فِي كَذَا“ کہ یہ آیت فلاں چیز کے بارے میں اتری، اس لیے ایک ہی آیت کے کئی شان نزول صحابہ و تابعین سے مروی ہوتے ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں ہوتا بلکہ سبھی مراد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ عین ممکن ہے کہ آیت کے نزول کے وقت یا اس کے قریب ان میں سے کوئی ایک واقعہ یا چند واقعات ہی ظہور پذیر ہوئے ہوں اور دوسرے واقعات انطباق کی وجہ سے شان نزول قرار دے دیے گئے ہوں۔

آیت 6 ① **وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ.....: ”دَابَّةٌ“** ”دَبَّ يَدْبُ دَبًّا“ سے اسم فاعل ہے، جس کا معنی آہستہ چلنا ہے۔ ہر جان دار خواہ مذکر ہو یا مؤنث، عاقل ہو یا غیر عاقل، سب پر ”دَابَّةٌ“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِنْ مَاءٍ فَمِنْهُمْ مَنْ يَنْشِي عَلَى بَطْنِهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْشِي عَلَى رِجْلَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْشِي عَلَى أَرْبَعٍ﴾ [النور: ۱۵]

کتابِ قُبُورِ ①

سونے جانے کی جگہ کو جانتا ہے، سب کچھ ایک واضح کتاب میں درج ہے ①

چلتا ہے اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو وہ پاؤں پر چلتا ہے اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو چار پر چلتا ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے پیٹ پر یاد دیا چار ناگوں پر چلنے والے تمام جانداروں کو ”ذآبِیۃ“ فرمایا۔

② کچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت اور احاطے کا بیان تھا کہ انسان کے ظاہر اور پوشیدہ احوال ہی نہیں، وہ تو دلوں کے خیالات تک سے واقف ہے۔ اس آیت میں اسی پر دلیل پیش کی ہے کہ ہر جان دار کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سے روزی پہنچ رہی ہے، پھر اگر اللہ تعالیٰ کا علم وسیع نہ ہوتا تو روزی کا یہ بندوبست کیسے ممکن تھا؟ مگر اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ رزق اللہ کے ذمے ہے تو انسان اس کی کمائی اور تلاش کے لیے محنت نہ کرے، بلکہ رزق کے تمام خزانے اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، مگر انسان کو محنت کا حکم ہے اور اسے وہ اسباب اختیار کرنا لازم ہے جن سے رزق حاصل ہوتا ہے، لیکن اس محنت اور ان اسباب پر بھروسا جائز نہیں، تمام اسباب مہیا کرنے کے بعد بھی بھروسا اور توکل صرف اللہ پر لازم ہے، کیونکہ وہ نہ چاہے تو تمام اسباب کے باوجود بندہ رزق سے محروم رہتا ہے اور اگر وہ چاہے تو بندہ کوئی سبب بھی مہیا نہ کر سکے تو وہ اسباب کے بغیر بھی روزی دے سکتا ہے۔ مگر حکم یہی ہے کہ رزق کی تلاش میں نکلو۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَوَكَّلُونَ عَلَى اللَّهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرُزِقْتُمْ كَمَا تُرْزَقُ الطَّيْرُ تَعْدُو حِمَاصًا وَتَرُوحُ بَطَانًا» [ترمذی، الزهد، باب فی التوکل علی اللہ: ۲۳۴۴] ”اگر تم اللہ پر توکل (بھروسا) کرو جیسا اس پر توکل کا حق ہے تو یقیناً تمہیں اسی طرح رزق دیا جائے جیسے پرندوں کو دیا جاتا ہے، وہ صبح نکلتے ہیں تو خالی پیٹ ہوتے ہیں، شام کو آتے ہیں تو ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔“ اس حدیث میں صبح نکلنا کسب ہے اور یہ فکر نہ کرنا کہ کل کو کیا کھائیں گے، توکل ہے۔ بہر حال اسباب اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِعْقَلْنَا وَتَوَكَّلْ» [ترمذی، صفة القيامة، باب حدیث اعقلها و توکل ۲۵۱۷، عن انس رضی اللہ عنہ] ”اوتنی کا گھٹنا باندھ اور توکل کر۔“ ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ رُوحَ الْقُدْسِ نَفْسٌ فِي رُوحِي أَنْ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ أَحْلَهَا وَتَسْتَوْعِبَ رِزْقَهَا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَحْمِلُوا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّ أَحَدُكُمْ اسْتِيطَاءَ الرِّزْقِ أَنْ يَطْلُبَهُ بِمَعْصِيَةِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَا يُنَالُ مَا عِنْدَهُ إِلَّا بِطَاعَتِهِ» [صحیح الجامع: ۲۰۸۵] ”بے شک روح القدس (جبریل علیہ السلام) نے میرے دل میں وحی کی کہ کوئی جان اس وقت تک فوت نہیں ہوگی جب تک اپنی مقررہ مدت پوری نہ کر لے اور اپنا پورا رزق حاصل نہ کر لے۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور (رزق کی) تلاش میں اچھا طریقہ اختیار کرو اور رزق ملنے میں دیر ہو جانا تم میں سے کسی کو اس بات پر آمادہ نہ کروے کہ وہ اسے اللہ کی نافرمانی کے ذریعے تلاش کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ (نعمت اور جنت) ہے وہ اس کی اطاعت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔“ یہ ذہن بھی غلط ہے کہ تلاش اور کوشش کے بغیر رزق نہیں ملتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم

بہت سی مخلوق وہ ہے جسے اسباب اختیار کیے بغیر رزق مل رہا ہے۔ دیکھیے سورہ عنکبوت (۶۰)۔

③ وَيَعْلَمُ فَسْتَقْرَهُهَا وَمُسَوِّدَهَا: یہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم ہی کا مزید بیان ہے۔ ”مُسْتَقَرٌّ“ اور ”مُسَوِّدٌ“ کی تفسیر اگرچہ لوگوں نے مختلف بیان کی ہے، مگر الفاظ کے پیش نظر واضح مطلب یہی نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ تمام جگہیں بھی جانتا ہے جہاں انسان نے کچھ مدت کے لیے ٹھہرنا ہے، خواہ باپ کی پشت ہو یا ماں کا رحم، یا زمین کا کوئی حصہ جہاں اس نے زندگی میں ٹھہرنا ہے اور اللہ تعالیٰ وہ جگہیں بھی جانتا ہے جن کے سپرد انسان نے مرنے کے بعد ہونا ہے، خواہ وہ زمین میں کھودی ہوئی جگہ ہو یا کسی جانور کا پیٹ یا جو جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے قیامت تک اس کے سپرد ہونے کے لیے لکھی ہے اور وہ سب کچھ اس کے لیے قہر ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو موت اور قبر دینے کا ذکر فرمایا ہے: ﴿ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ﴾ [عس: ۶۱] ”پھر اسے موت دی، پھر اسے قبر میں رکھوایا۔“ پھر قیامت کو زندہ ہو کر اسے دوزخ کے سپرد ہونا ہے یا جنت کے، یہ سب اس کے لیے ”مُسَوِّدٌ“ (سوئے جانے کی جگہ) ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جان دار کی زندگی کے ہر حال کو بھی جانتا ہے اور موت کے بعد کے تمام حالات کو بھی۔ ”کِتَابٌ فُيْنِينٌ“ سے مراد لوح محفوظ ہے۔

آیت 7 ① وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ: اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ کے کمال علم کو ثابت فرمایا اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمال کا بیان ہے۔ آسمان و زمین کی چھ دنوں میں پیدائش کے متعلق دیکھیے سورہ اعراف (۵۳) اور طہ السجدہ (۱۲۹)۔

② وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ: اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ آسمان و زمین پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا، پھر سب سے پہلے کیا پیدا کیا؟ اس کے متعلق مختلف روایات آئی ہیں۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اہل یمن کے کچھ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس امر (کائنات) کی ابتدا کے متعلق پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿سَكَّانَ اللَّهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ قَبْلَهُ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَكَتَبَ فِيهَا الذِّكْرَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ [بحاری، التوحید، باب: ﴿وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ﴾: ۷۴۱۸] ”اللہ تعالیٰ تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور ذکر (لوح محفوظ) میں ہر چیز لکھ دی۔“ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿كَتَبَ اللَّهُ مَقَادِيرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ قَالَ وَعَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ﴾ [مسلم، القدر، باب حجاج آدم و موسیٰ صلی اللہ علیہما وسلم: ۲۶۵۳] ”اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیریں آسمان و زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیں اور اس کا عرش پانی پر تھا۔“

سنن ترمذی (۳۱۰۹) اور ابن ماجہ (۱۸۲) کی روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا گیا: ”خلق کی پیدائش سے پہلے ہمارا پروردگار کہاں تھا؟“ اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿كَانَ فِي عَمَاءٍ مَا تَحْتَهُ هَوَاءٌ وَمَا فَوْقَهُ هَوَاءٌ﴾

أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَلَئِنْ قُلْتُمْ إِنَّكُمْ مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ قُبُورٍ ⑥

میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔ اور یقیناً اگر تو کہے کہ بے شک تم موت کے بعد اٹھائے جانے والے ہو تو وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ضرور ہی کہیں گے یہ تو کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں ⑥

”عمماء“ کا معنی نہایہ میں لکھا ہے، بادل، پلاسا بادل یا نامعلوم چیز، جس کی حقیقت سے ہم ناواقف گویا اعلیٰ ہیں۔ حدیث کا ترجمہ ہے: ”اللہ تعالیٰ ایک عماء (نامعلوم چیز) میں تھا، اس کا اوپر خالی تھا اور اس کے نیچے بھی خلا تھا۔“ مگر شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ اور ان سے پہلے رازی اور دوسرے اہل علم رحمۃ اللہ علیہم نے اسے ضعیف کہا ہے، جبکہ استدلال خصوصاً عقیدے میں اور اتنے اہم مسئلہ میں صحیح حدیث ہی سے ہو سکتا ہے۔ صحیح حدیث جس سے اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہے، یہ ہے کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: «إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللَّهُ تَعَالَى الْقَلَمَ فَقَالَ لَهُ اكْتُبْ فَقَالَ رَبِّ وَمَاذَا أَكْتُبُ؟ قَالَ أَكْتُبُ مَقَادِيرَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ» [ابوداؤد، السنن، باب فی القلم: ۴۷۰۰۔ ترمذی: ۳۳۱۹]

”بے شک اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جو پیدا کیا قلم تھا تو اسے فرمایا: ”لکھ۔“ اس نے کہا: ”اے میرے رب! میں کیا لکھوں؟“ فرمایا: ”ہر چیز کی تقدیریں لکھ، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔“ یہ حدیث صحیح ہے، شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ ہمارے شیخ محمد عبدہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہی (بات) صحیح ہے، البتہ شیخ محمد عبدہ رحمۃ اللہ علیہ نے قلم کی پیدائش اور تقدیر کا لکھا جانا پانی اور عرش کے بعد لکھا ہے۔ شاید ان کا استدلال اس آیت: ﴿وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ﴾ سے ہو۔ (واللہ اعلم) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی قلم سے پہلے عرش اور پانی کے پیدا کیے جانے کا ذکر کیا ہے اور اس کے کچھ دلائل ذکر کیے ہیں۔ دیکھیے فتح الباری میں ”يَكْتُبُ بَدءِ الْخَلْقِ“ کا پہلا باب۔ ایک روایت میں ہے کہ سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا، مگر وہ روایت ضعیف ہے۔ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ”المنار المنيف“ میں لکھا ہے کہ عقل کے متعلق تمام احادیث باطل ہیں۔

② لَيَبْلُوَنَّكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا: اللہ تعالیٰ کو جس طرح گزشتہ اور موجودہ ہر بات کا علم ہے، اسے یہ بھی معلوم ہے کہ آئندہ کیا ہوگا، مگر آئندہ ہونے والی چیز کے متعلق یہ علم کہ وہ واقع ہو چکی ہے، اس کے واقع ہونے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ آزمانے کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق جو کچھ آئندہ ہونا ہے وہ وجود میں آکر سب کے سامنے آجائے اور نتیجہ دوسروں کے سامنے بھی ظاہر ہو جائے۔ قرآن مجید میں ”لَيَعْلَمَنَّ“ اور ”لَيَبْلُوَنَّكُمْ“ وغیرہ الفاظ جہاں بھی آئے ہیں ان سے مراد یہی ہے۔

③ أَحْسَنُ عَمَلًا: یعنی آزمائش یہی نہیں کہ عمل میں برا کون ہے اور اچھا کون، بلکہ اللہ تعالیٰ ایسا قدر دان ہے کہ عمل میں اچھائی کے درجات کو بھی ملحوظ رکھتا ہے کہ زیادہ اچھا کون ہے، جیسے فرمایا: ﴿هُوَ دَرَجَاتٍ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ بِصِيْرِهِمْ بَصِيْرٌ﴾ [آل عمران: ۱۶۳] ”وہ لوگ (اللہ کی رضا چاہنے والے) اللہ کے ہاں کئی درجوں والے ہیں اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔“ بلکہ برے عمل میں بھی سب کو ایک جیسا نہیں رکھا، منافقین آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہیں، جبکہ

وَلَيْنَ أَخْرَجْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ أَلَّا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ نَصْرُهُمْ مِنْ أَهْلِهَا ۗ وَإِن كَانَ لَكُنُوزٌ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَفْهِمُونَ ۗ وَلَيْنَ آذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ ۗ إِنَّهُ لَكَفُورٌ ۙ ①

اور بلاشبہ اگر ہم ان سے عذاب کو ایک گنی مدت تک مؤخر کر دیں تو یقیناً ضرور کہیں گے اسے کیا چیز روک رہی ہے؟ سن لو! جس دن وہ ان پر آئے گا تو ان سے ہٹایا جانے والا نہیں اور انھیں وہ چیز گھیر لے گی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ① اور یقیناً اگر ہم انسان کو اپنی طرف سے کوئی رحمت چکھائیں، پھر اسے اس سے چھین لیں تو بے شک وہ یقیناً نہایت ناامید، بے حد ناشکرا ہوتا ہے ④

ابو طالب صرف آگ کے جوتے پہنے ہوئے ہے۔ رہی یہ بات کہ کیسے بنا چلے گا کہ میں اچھا عمل کر رہا ہوں تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کے بتانے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اس لیے اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ اچھے عمل کے لیے دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، دوسری یہ کہ کتاب و سنت کے مطابق ہو، کیونکہ اس میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا ہے۔ ④ وَلَيْنَ قُلْتِ إِنَّكَ مَبْعُوثَةٌ..... اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور خلق (پیدا کرنے) جیسی صفات کو بالاول ذکر کرنے کے بعد بھی اگر آپ ان شرکوں سے کہیں کہ اتنی زبردست قوتوں والے رب نے تمہیں موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت، زمین و آسمان اور خود ان کو پیدا کرنے اور عرش عظیم کا مالک ہونے کو جاننے اور ماننے کے باوجود دوبارہ زندہ کرنے کی بات کرنے پر عقل و دانش سے مکمل عاری ہو کر کہہ دیں گے کہ یہ تو کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں، یعنی دوبارہ زندہ ہونے کی کچھ حقیقت نہیں، جو لوگ اسے مان بیٹھے ہیں ان پر جادو ہو گیا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ پھر تم اس جادو کی زد میں آنے سے کیسے بچ گئے؟

آیت 8 وَلَيْنَ أَخْرَجْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ.....: "أُمَّةً" کے بہت سے معانی ہیں، مثلاً جماعت، امام، طریقہ، مدت اور راستہ وغیرہ، یہاں مدت مراد ہے اور "مَّعْدُودَةٍ" کا معنی تھوڑی سی ہے، کیونکہ زیادہ چیز کی تسخیر نہیں ہوا کرتی اور جو چیز گنی جا سکے وہ آخر ختم ہو جاتی ہے۔ دنیا کے عذاب بدر، احد، خندق، فتح مکہ، قتل، قید، غلامی اور پھر مرنے کے بعد جہنم کے عذاب آنے میں گنتی ہی کے دن ہیں، مگر آجانے کے بعد پھر وہ عذاب ہٹایا نہیں جاسکے گا اور وہی عذاب جسے وہ مذاق کیا کرتے تھے انھیں چاروں طرف سے گھیر لے گا۔

آیت 9 وَلَيْنَ آذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً.....: یعنی انسان میں یہ کمزوری ہے کہ کوئی رحمت صرف چیکھنے کے بعد، یعنی تھوڑی سی نعمت صرف کچھ دیر کے لیے ملنے کے بعد چھن جائے تو اللہ تعالیٰ کی ساری نعمتیں اس طرح بھولتا ہے کہ آئندہ کے لیے اس کی تمام نعمتوں سے نہایت ناامید ہو جاتا ہے اور گزشتہ اور موجودہ کوئی نعمت اسے یاد ہی نہیں رہتی۔ یہی اس کی ناشکری اور نعمت کا انکار ہے۔ شوکانی نے فرمایا کہ "آذَقْنَا" کے لفظ سے ادنیٰ سے ادنیٰ نعمت تھوڑی سی مدت کے لیے ملنا واضح ہو رہا ہے۔

وَلَيْنِ اَذَقْتُهُ نَعْمَاءً بَعْدَ ضَرَاءٍ مَسْتَه لِيَقُولَنْ ذَهَبَ السَّيِّئَاتِ عَنِّي ؕ اِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝۱۰
 اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۱ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ
 بَعْضٌ مَّا يُؤْتٰىكَ وَّ ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَقُوْلُوْا لَوْ لَا اَنْزَلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا اَوْ جَاءَ
 نَعْمًا مَّلَكٌ ؕ اِنَّمَا اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاَللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝۱۲

اور بے شک اگر ہم اسے کوئی نعمت چکھائیں کسی تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی ہو تو یقیناً ضرور کہے گا سب تکلیفیں مجھ سے دور ہو گئیں۔ بلاشبہ وہ یقیناً بہت پھولنے والا، بہت فخر کرنے والا ہے ۱۰ مگر وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کیے، یہ لوگ ہیں جن کے لیے بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر ہے ۱۱ پھر شاید تو اس کا کچھ حصہ چھوڑ دینے والا ہے جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے تیرا سینہ تنگ ہونے والا ہے کہ وہ کہیں گے اس پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتارا گیا، یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا؟ تو تو صرف ڈرانے والا ہے اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے ۱۲

آیت 10 وَلَيْنِ اَذَقْتُهُ نَعْمَاءً بَعْدَ ضَرَاءٍ : ”نَعْمَاءً“ ایسی نعمت جس کا اثر صاحبِ نعمت پر ظاہر ہو۔ اسی طرح ”ضَرَاءً“ ایسی مصیبت جس کا برا اثر انسان پر ظاہر ہو۔ (طحاوی) ”اِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ“ یعنی بہت پھولنے اور اترانے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب تمام مصیبتیں اور سختیاں دور ہو گئیں۔

آیت 11 اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ : یعنی صابر مومن کا یہ حال نہیں، وہ نہ راحت میں پھولتا ہے اور نہ مصیبت میں رب کی نعمتوں کو بھولتا ہے۔ یہی بات سورہ معارج (۱۹ تا ۳۵) میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ مصیب ﷺ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، اِنْ أَمْرَهُ كُنْهٌ لَهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَلِكَ لِأَخِيْدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، اِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءٌ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَ اِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءٌ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ» [مسلم، الزهد، باب المؤمن أمره كله خير : ۲۹۹۹] ”مومن کا معاملہ عجیب ہے، کیونکہ اس کا ہر کام ہی خیر ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے کوئی خوشی پہنچتی ہے تو شکر کرتا ہے، سو وہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف اور مصیبت پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے، سو وہ بھی اس کے لیے خیر ہوتی ہے۔“

آیت 12 ۱ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضٌ مَّا يُؤْتٰىكَ اِيَّاكَ : کفار ہر وقت کوئی نہ کوئی معجزہ لانے کی فرمائش کرتے رہتے تھے کہ آپ پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ چلیے آپ احد پہاڑ ہی سونے کا بنا دیجیے، یا کوئی فرشتہ ہی ساتھ لے آئیے۔ ان کی عجیب و غریب فرمائشوں کا ذکر سورہ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) اور سورہ فرقان (۷، ۸) میں کچھ تفصیل کے ساتھ ہے۔ ان آیات میں آپ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کے شبہات، مطالبات اور طعن و تفتیح سے تنگ آکر آپ پریشان اور غم زدہ نہ ہو جائیں، بلکہ شرک کی مذمت کے لیے اور توحید کے اثبات کے لیے جو بھی وحی آئے آپ کسی بھی کی بیشمی کے بغیر ان تک پہنچاتے رہیں۔ یہ نہ ہو کہ وحی کا وہ حصہ حذف کر دیں جس میں بتوں کی عیب جوئی اور شرک کی مذمت ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرِيْتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَعْظَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَاَلَمْ يَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ فَاَعْلَمُوْا اَنّٰمَ اَنْزَلَ یَعْلَمِ اللّٰهُ وَ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

یادہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے گھڑ لیا ہے۔ کہہ دے پھر اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو ﴿۱۳﴾ پس اگر وہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ یہ صرف اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم حکم ماننے والے ہو؟ ﴿۱۴﴾

﴿۱۲﴾ اَلَمْ اَنْتَ نَذِيْرٌ : یعنی آپ کو اللہ تعالیٰ نے محض عذاب سے ڈرانے کے لیے بھیجا ہے، لہذا کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا کیے بغیر آپ اس فریضہ کو سرانجام دیتے رہیں۔

﴿۱۳﴾ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ وَكِيْلٌ : یعنی ان کے مطالبات کو پورا کرنا یا نہ کرنا اللہ کا کام ہے، ہر چیز اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ اگر چاہے گا تو آپ کو ایک خزانہ کیا روئے زمین کے تمام خزانے دے دے گا اور ایک فرشتہ کیا آپ پر سیکڑوں فرشتے اتار دے گا۔ بہر حال جیسی اس کی مصلحت اور حکمت ہوگی ویسا ہی کرے گا، آپ کو ان چیزوں سے کیا غرض؟ ہر چیز کا نگران وہ خود ہے۔ آپ تو اللہ تعالیٰ کا جو حکم آئے بے دھڑک ان کو سناتے رہیں۔

آیت 13 اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ ... یعنی اگر تمہیں اس قرآن کے اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے میں شک و شبہ ہے تو تم سب جمع ہو کر اس چیلنج کا جواب دینے کی کوشش کرو۔ واضح رہے کہ قرآن میں متعدد مرتبہ اہل عرب کو چیلنج کیا گیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل (۸۸) اور سورہ طور (۳۳) میں پورے قرآن کی مثل لانے کا چیلنج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہاں سورہ ہود میں دس سورتوں کا چیلنج کیا گیا ہے، پھر سورہ یونس اور بقرہ میں ایک سورت کا۔ لیکن اہل عرب پورا قرآن یا دس سورتیں تو کیا ایک سورت بھی بنا کر پیش نہ کر سکے۔ یہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ (ابن کثیر) یاد رہے کہ قرآن مجید کا معجز ہونا، یعنی اس جیسی ایک سورت کی تصنیف بھی ناممکن ہونے کی وجہ قرآن مجید کی بے شمار خوبیاں ہیں، جو مخلوق کی بساط سے باہر ہیں۔ مسلم علماء نے اس پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں، جن کا عنوان ہی ”عجاز القرآن“ (از باقلانی، صالح بن عبد العزیز وغیرہ) یا اس سے ملتا جلتا ہے۔ ان خوبیوں میں اس کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ اس کے انداز بیان کا اللہ کی شان کے مطابق جلال و جمال، اس کی کسی پیش گوئی یا خبر کا غلط نہ ہونا، اس کی آیات کا ایک دوسرے سے نکرانے سے پاک ہونا اور اس کی جامعیت وغیرہ بھی شامل ہیں۔

آیت 14 فَاَلَمْ يَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ فَاَعْلَمُوْا : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اے مسلمانو! اگر وہ کفار تمہارا یہ چیلنج قبول نہ کریں تو یقین کر لو کہ یہ صرف اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم حکم ماننے والے ہو؟ یعنی اپنی کتاب کی حقانیت اس قدر واضح اور روشن ہونے پر تمہارے ایمان و یقین اور اس پر عمل میں اضافہ ہونا لازم ہے، تو

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزَيَّنَّهَا نُوفٍ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۗ وَحِطَّ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَ بَطُلًا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾

جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کا ارادہ رکھتا ہو ہم انھیں ان کے اعمال کا بدلہ اسی (دنیا) میں پورا دے دیں گے اور اس (دنیا) میں ان سے کمی نہ کی جائے گی ﴿۱۵﴾ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور برباد ہو گیا جو کچھ انھوں نے اس میں کیا اور بے کار ہے جو کچھ وہ کرتے رہے تھے ﴿۱۶﴾

کیا تم ایسا کرو گے؟ یا ایمان لانے کے باوجود حکم ماننے میں کوتاہی کرتے رہو گے؟ دوسرا معنی یہ ہے کہ بھجلی آیت میں مشرکین کو جو فرمایا تھا: ﴿وَادْعُوا فَنَ اسْتَظَعْتُمْ قِن ذُونِ اللّٰهِ﴾ کہ اللہ کے سوا جسے بلا سکتے ہو بلا لو، اس کے بعد اب فرمایا، اگر وہ تمام لوگ جنہیں تم اس کام کے لیے بلاؤ گے، مثلاً عرب کے بڑے بڑے فصحاء، بلغاء، شعراء، خطباء اور تمہارے تمام داتا اور دیگر، اگر ان میں سے کوئی بھی تمہاری بات قبول نہ کرے اور ”إِنَّا أَغْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ“ جیسی تین آیات بھی نہ بنا سکیں تو پھر تمہیں لازم ہے کہ ایک تو اس بات پر یقین کر لو کہ یہ کتاب اللہ کے علم سے نازل کی گئی ہے، اس کی مثل لانا مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ دوسرا اس بات پر یقین کر لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ تو اے جماعت کفار! پھر کیا تم اسلام قبول کرو گے یا اب بھی ضد اور عناد ہی پر اڑے رہو گے؟

آیت 16-15 مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزَيَّنَّهَا..... یہ دو آیات کفار اور مشرکین کے بارے میں ہیں، کیونکہ دوسری آیت میں ہے: ﴿لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ﴾ ”ان کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں۔“ مطلب یہ ہے کہ جو کفار یہاں دنیا طلبی کے لیے صدقہ و خیرات وغیرہ اور نیک عمل کرتے ہیں، جن کا تعلق رفاہ عامہ سے ہے، انھیں ان کاموں کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پورا دے دیا جاتا ہے، لیکن یہ بدلہ ملنا اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَذْحُورًا﴾ [بنی اسرائیل: ۱۸] ”جو شخص اس جلدی والی (دنیا) کا ارادہ رکھتا ہو ہم اس کو اس میں جلدی دے دیں گے جو چاہیں گے، جس کے لیے چاہیں گے، پھر ہم نے اس کے لیے جہنم بنا رکھی ہے، اس میں داخل ہو گا، مذمت کیا ہوا، دھنکارا ہوا۔“ اسی معنی کی ایک اور آیت سورہ شوریٰ (۲۰) میں بھی ہے۔ کفار کو دنیا میں کسی نیکی کا فائدہ آخرت میں عذاب کم ہونے کی صورت میں تو ہو سکتا ہے، لیکن ان کا آگ سے نکلنا کسی صورت ممکن نہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی حمایت اور آپ ﷺ کی سفارش کی وجہ سے ابوطالب کے عذاب میں تخفیف ہوگی، مگر وہ آگ سے نکل نہیں سکے گا۔ اسی طرح آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر میں زیادتی اور کمی کی وجہ سے جہنم میں کفار کے عذاب میں کمی بیشی ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الذَّرِّ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾

أَفْسَنَ كَانَ عَلَى بَيْتِنَا مِنْ رَبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهِ كُتِبَ مُوسَى إِمَامًا

تو کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہو اور اس کی طرف سے ایک گواہ اس کی تائید کر رہا ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی جو امام اور رحمت تھی، یہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور گرد وہوں میں سے جو

[النساء: ۱۴۵] ”بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔“ نیکی کی کمی بیشی کی وجہ سے جنت کے درجات اور ہدیٰ کی کمی بیشی کی وجہ سے جہنم کے درجات میں فرق ہوگا۔ البتہ کفار کی کوئی نیکی انھیں جہنم سے نہیں نکال سکے گی، کیونکہ آخرت میں نیک عمل کی قبولیت کے لیے ایمان شرط ہے۔ دیکھیے سورہ حجر کی دوسری آیت کی تفسیر۔

علمائے تفسیر نے ان دو آیتوں کو عام بھی مانا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں منافق اور ریا کار بھی شامل ہیں کہ ان کے عمل بھی آخرت میں اکارت جائیں گے۔ چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «رَجُلٌ اسْتَشْهَدَ فَأَتَيْتْ بِه فَعَرَفَتْهُ نِعْمَتَهُ فَعَرَفَهَا، قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا، قَالَ قَاتَلْتُ فِيكَ حَتَّى اسْتَشْهَدْتُ قَالَ كَذَبْتَ وَلَكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَن يُقَالَ جَرِيءٌ فَقَدْ قِيلَ ثُمَّ أُمِرَ بِه فَسُحِبَ عَلَيَّ وَجْهَهُ حَتَّى أُلْقِيَ فِي النَّارِ» [مسلم، الإمارة، باب من قاتل للرباء، ۱۹۰۵: ۱۰۰] ”قیامت کے دن ایک شہید کو لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا، وہ انھیں پہچان لے گا، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”تو نے ان کے لیے کیا کیا؟“ وہ کہے گا: ”یا اللہ! میں نے لڑتے لڑتے تیری راہ میں جان دے دی۔“ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ”تو نے جھوٹ کہا، تو نے محض اس لیے جنگ کی تھی کہ لوگ تجھے بہادر کہیں، چنانچہ تجھے یہ داد مل گئی۔“ پھر حکم ہو گا اور اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔“ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریا کار قاری اور ریا کار دولت مند کے متعلق بھی یہی بیان فرمایا۔ واضح رہے کہ اگر اس آیت کو عام رکھا جائے تو ”كَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ“ (ان کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں) کی تاویل کی جائے گی کہ کفار اور منافقین کے لیے تو دائمی جہنم ہے، مگر مسلمان گناہ گار سزا کے بعد جہنم سے نکل بھی آئیں گے اور بعض کو اللہ تعالیٰ معاف بھی کر دے گا، اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے۔

آیت 17 ① أَفْسَنَ كَانَ عَلَى بَيْتِنَا مِنْ رَبِّهِ : ”يَتْلُوهُ“ ”تَلَا يَتْلُو“ کا معنی ہے پیچھے آنا، مراد اس کی تائید کرنا ہے۔ اس آیت کی مفسرین نے کئی تفسیریں کی ہیں، ان میں سے دو تفسیریں زیادہ درست معلوم ہوتی ہیں۔ سب سے واضح اور درست تفسیر تو یہ ہے کہ کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ”بَيْتِنَا“ (واضح دلیل) پر ہے، اس شخص سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبع مومن ہیں۔ ”بَيْتِنَا“ سے مراد نبوت کی نشانیاں اور دلائل ہیں اور ”يَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِنْهُ“ (اس کی طرف سے ایک گواہ اس کی تائید کر رہا ہو) میں ”شَاهِدٌ“ سے مراد قرآن مجید ہے جو آپ کے صدق کا شاہد ہے اور اس سے پہلے موسیٰ عليه السلام کی کتاب سے مراد تورات ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شہادت دے رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا یہ رسول اور اس کے پیروکار جو اپنے رب کی طرف سے دلیل پر ہیں، ان لوگوں کی طرح ہو سکتے ہیں جن کے پاس نہ رب تعالیٰ کی طرف سے کوئی دلیل ہے، نہ کوئی شاہد اور نہ کوئی اور پہلی آسمانی کتاب جو ان کی تائید کرے۔ یہ مطلب سب سے درست اس لیے کہا گیا ہے

وَرَحْمَةً ۗ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۗ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ قَالُوا مَا مِثْلُهُ ۗ فَلَا تَكُ فِي هِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۚ وَلَٰكِن أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٤﴾

اس کا انکار کرے تو آگ ہی اس کے وعدے کی جگہ ہے۔ سو تو اس کے بارے میں کسی شک میں نہ رہ، یقیناً یہی تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ﴿١٤﴾

کہ اسی سورہ ہود میں تقریباً ہر نبی نے یہ کہا کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک ”یٰسینتو“ پر ہوں۔ دیکھیے نوح علیہ السلام نے فرمایا: ﴿يَقُولُ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنْتُ عَلَىٰ يَسِينَةٍ مِّنْ عَمْرِي وَأَشْفِي رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهِ فَعَنِيتْ عَلَيْكُمْ ۚ أَخْلَسْتُكُمْ هَا وَ أَنْتُمْ لَهَا كَاهُونَ﴾ [ہود: ۲۸] ”اے میری قوم! کیا تم نے دیکھا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک (بینہ) واضح دلیل پر (قائم) ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے بڑی رحمت عطا فرمائی ہو، پھر وہ تم پر مغلی رکھی گئی ہو، تو کیا ہم زبردستی اسے تم پر چکا دیں گے، جب کہ تم اسے ناپسند کرنے والے ہو۔“ صراحہ علیہ السلام نے کہا: ﴿يَقُولُ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنْتُ عَلَىٰ يَسِينَةٍ مِّنْ رَبِّي﴾ [ہود: ۶۳] شعیب علیہ السلام نے کہا: ﴿يَقُولُ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنْتُ عَلَىٰ يَسِينَةٍ مِّنْ رَبِّي﴾ [ہود: ۸۸] غرض ہر پیغمبر یہ کہتا رہا کہ میں اپنے رب کی طرف سے ”یٰسینتو“ پر ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر پیغمبر کو اس کی نبوت کی واضح نشانی دے کر بھیجتے تھے اور قرآن مجید کا معجزہ، جس کی ایک سورت کی مثال پیش نہ کی جا سکتی، وہ اللہ کی طرف سے آپ کا شاہد ہے۔ اسی طرح تورات بھی آپ کے حق ہونے کی شاہد ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”یٰسینتو“ سے مراد عقل سلیم اور وہ فطرت سلیمہ ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے اور وہ عہد ”الکنت“ ہے جس کا ہر شخص اپنے آپ پر شاہد بنایا گیا ہے اور وہ ہے توحید الہی اور اپنے رب کی پہچان، فرمایا: ﴿الْكَتُّ بِرَبِّكُمْ﴾ [الأعراف: ۱۷۲] ”کیا میں واقعی تمہارا رب نہیں ہوں؟“ اور آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿كُلُّ مَوْلُودٍ يُوَلَّدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجْسِسَانِهِ﴾ [بخاری، الحنابل، باب ما قبل فی اولاد المشركين: ۱۳۸۵] ”ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی۔“ یعنی کیا وہ لوگ جو فطرت سلیمہ پر قائم ہیں، عقل سلیم سے کام لیتے ہیں اور اس کے ساتھ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک گواہ بھی آچکا ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ یا قرآن اور اس سے پہلے تورات بھی اس کی شہادت دے رہی ہے، جو رہنما بھی تھی اور رحمت بھی، تو کیا یہ لوگ ان کی طرح ہیں جن کے پاس نہ رب کی طرف سے کوئی ”یٰسینتو“ ہے، نہ کوئی اس کی طرف سے شاہد اور نہ گزشتہ کسی آسمانی کتاب کی شہادت۔ ہرگز نہیں، ایک مومن دوسرا کافر، دونوں ایک جیسے کبھی نہیں ہو سکتے۔

﴿١٤﴾ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ: یعنی یہ ”یٰسینتو“ پر قائم لوگ اس رسول پر ایمان لاتے ہیں۔

﴿١٥﴾ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ قَالُوا مَا مِثْلُهُ ۗ: اور جو اس کے ساتھ کفر کرے، خواہ وہ کسی گروہ عیسائی، یہودی، ہندو یا بدھ وغیرہ سے تعلق رکھتا ہو، اس کا ٹھکانا آگ ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَا يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِّنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ يَهُودِيٍّ وَلَا نَصْرَانِيٍّ ثُمَّ يَمُوتُ ۖ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَّا كَانَ مِنَ أَصْحَابِ النَّارِ﴾ [مسلم، الإيمان، باب وجوب الإيمان برسالة نبينا محمد ﷺ: ۱۵۳] عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۗ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ

هُؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَّبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿۱۸﴾

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر کوئی جھوٹ باندھے؟ یہ لوگ اپنے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے گواہ کہیں گے یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا۔ سن لو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے ﴿۱۸﴾

”قسم اس کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! میرے بارے میں اس امت (دعوت) میں سے کوئی یہودی یا نصرانی سن لے پھر وہ فوت ہو اور اس پر ایمان نہ لایا ہو جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے، تو وہ اصحاب النار سے ہو گا۔“ مشرکین اور نام کے مسلمان، جو دل سے آپ کی رسالت کو نہیں مانتے، وہ بھی انہی میں شامل ہیں۔ مزید دیکھیے سورہ بقرہ (۶۲) اور نساء (۱۵۰-۱۵۲)۔

﴿۱۸﴾ فَلَا تَأْكُلْ فِي فِرْيَةِ فَنَّهُ: بظاہر خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے، مگر مراد ہر عاقل ہے۔

﴿۱۹﴾ وَلَكِنْ أَكُنَّ الْقَائِلِينَ لَا يُؤْمِنُونَ: اکثریت کا یہ حال قرآن میں متعدد بار بیان ہوا ہے، مثلاً دیکھیے سورہ یوسف (۱۰۳)، انعام (۱۱۶) اور سبأ (۲۰) دین جمہوریت اور دین اسلام کو ایک قرار دینے والے غور فرمائیں۔

آیت 18 ﴿۱۸﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا: یعنی اپنی جان پر ظلم کرنے والے بہت ہیں، مگر اس سے بڑھ کر کوئی نہیں جو جھوٹ گھڑ کر اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دے، مثلاً مخلوق کو خالق کی صفات رکھنے والا قرار دے، بتوں، ولیوں اور دیوتاؤں کو اللہ کے حضور بلا اجازت سفارش کی جرأت رکھنے والے سمجھے، فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے اور مسیح علیہ السلام یا کسی اور کو اللہ کی اولاد یا اس کا حصہ یا کلوا قرار دے۔ موضح میں ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھنا کئی طرح سے ہے، مثلاً علم میں غلط نقل کرنا۔ (آل عمران: ۷۸) نبوت یا وحی کا جھوٹا دعویٰ کرنا۔ (انعام: ۹۳) خواب بنا لینا، ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ مِنْ أَفْرَى الْفِرْيِ أَنْ يُرَىٰ عَيْنَيْهِ مَا لَمْ تَرَ﴾ [بخاری، التعمیر، باب من كذب في حلمه: ۷۰۹۳] ”سب سے بڑے جھوٹوں میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اپنی آنکھوں کو وہ چیز دکھائے جو انہوں نے نہیں دیکھی (یعنی جھوٹا خواب بیان کرے)۔“ درایت یا عقل کو دین کے معاملات میں درمیان لے آنا۔ (قصص: ۵۰)

﴿۱۹﴾ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ: اللہ تعالیٰ ایسے مفتزی اور جھوٹے کفار و مشرکین اور منافقین کو قیامت کے دن سب کے سامنے رسوا کرے گا اور گواہ بھی سب کے سامنے ان کے رب تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے کی شہادت دیں گے۔ البتہ مؤمن گناہ گاروں کا معاملہ اس سے مختلف ہو گا۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُدْنِي الْمُؤْمِنِينَ فَيَضَعُ عَلَيْهِمْ كَنَفَهُ وَيَسْتَرُهُمْ فَيَقُولُ أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟ أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟ فَيَقُولُ نَعَمْ أَيُّ رَبِّ، حَتَّىٰ قَرَّرَهُ بِذُنُوبِهِ وَرَأَىٰ فِي نَفْسِهِ أَنَّهُ هَلَكَ، قَالَ سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا، وَأَنَا أَعْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ، فَيُعْطِي كِتَابَ حَسَنَاتِهِ، وَأَمَّا الْكَافِرُ وَالْمُنَافِقُونَ فَيَقُولُ الْأَشْهَادُ: ﴿هُؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَّبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ﴾ [ہود: ۱۸] [بخاری، المظالم، باب قول الله تعالى: ﴿أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ﴾: ۲۴۴۶]

الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا ۗ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿۱۹﴾ أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ ۗ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءٍ ۗ يُضَعِفُ لَهُمْ الْعَذَابُ ۗ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿۲۰﴾

جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کبھی تلاش کرتے ہیں اور آخرت کے ساتھ کفر کرنے والے بھی وہی ہیں ﴿۱۹﴾ یہ لوگ کبھی زمین میں عاجز کرنے والے نہیں اور نہ کبھی ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی مددگار ہیں، ان کے لیے عذاب دگنا کیا جائے گا۔ وہ نہ سننے کی طاقت رکھتے تھے اور نہ دیکھا کرتے تھے ﴿۲۰﴾

”اللہ تعالیٰ مومن کو قریب کرے گا اور اس پر اپنا دامن ڈال کر پردے میں کرے گا، پھر کہے گا کہ تو فلاں گناہ بیچتا ہے؟ کیا فلاں گناہ بیچتا ہے؟ وہ کہے گا، ہاں اے رب! یہاں تک کہ جب اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کر والے گا اور وہ اپنے دل میں سمجھ لے گا کہ وہ ہلاک ہو گیا تو (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا، میں نے دنیا میں تجھ پر ان گناہوں پر پردہ ڈالا اور آج میں تجھے وہ بخشا ہوں، تو اسے اس کی نیکیوں کی کتاب دے دی جائے گی۔ رہا کافر اور منافق، تو گواہ کہیں گے: ﴿هُوَ الَّذِي كَفَرَ عَلَىٰ رَبِّنَا﴾ الْآلِفَةُ اللَّهُ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿﴾ ”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا۔ سن لو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔“

﴿۱۹﴾ وَيَقُولُ الْإِنشَاءُ هُوَ الَّذِي كَفَرَ... : گواہوں سے مراد ان کے پیغمبر یا وہ فرشتے جو عمل لکھتے ہیں اور علماء جنہوں نے اللہ کے احکام کی تبلیغ کی۔ یہ سب گواہ کفار کے متعلق اعلان کریں گے کہ یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار سے جھوٹی باتیں منسوب کرتے تھے۔

آیت 19 الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ..... : یعنی اللہ کی سیدھی راہ (اسلام) میں کبھی اور عیب ڈھونڈ کر لوگوں کو اس میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ ”ہم“ کی ضمیر دو بار لانے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کا انکار کرنے میں یہ لوگ اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ گویا آخرت کے اصل منکر یہی ہیں۔ ”يَبْغُونَهَا عِوَجًا“ میں لام محذوف ہے، یعنی ”يَبْغُونَ لَهَا عِوَجًا“ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهَا عِوَجًا﴾ [الکہف: ۱] یا ”يَبْغُونَهَا عِوَجًا“ میں ”فِي“ محذوف ہے، یعنی ”يَبْغُونَ فِيهَا عِوَجًا“ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن زمین کے متعلق فرمایا: ﴿لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا﴾ [طہ: ۱۰۷]

آیت 20 أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ..... : یعنی یہ لوگ کبھی بھی اللہ کو عاجز کر کے اس کی گرفت سے بھاگ نہیں سکتے۔ وہ جب پکڑنا چاہے گا، اس زمین پر بھی پکڑ لے گا اور آخرت کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ پھر اللہ کے سوا کبھی کوئی ان کا مددگار نہیں ہوگا جو انہیں اللہ کے عذاب اور پکڑ سے چھڑا سکے۔

﴿۲﴾ يُضَعِفُ لَهُمُ الْعَذَابُ : ایک اپنے گمراہ ہونے کا عذاب، دوسرا لوگوں کو اللہ کی راہ سے روک کر گمراہ کرنے کا عذاب۔ دیکھیے سورہ اعراف (۳۷، ۳۸) اور عنکبوت (۱۳، ۱۴)۔

﴿۳﴾ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ : یعنی کان اور آنکھیں رکھنے کے باوجود حق سننے یا دیکھتے نہیں تھے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمْ الْآخِسُونَ ﴿۲۲﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَ اخْتَبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرِ وَالسَّبْعِ مَثَلًا أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۲۴﴾

یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا اور ان سے گم ہو گیا جو کچھ وہ جھوٹ گھڑا کرتے تھے ﴿۲۱﴾ کوئی شک نہیں کہ وہ آخرت میں، وہی سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۲۲﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور اپنے رب کی طرف عاجزی کی وہی جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۳﴾ دونوں گروہوں کی مثال اندھے اور بہرے اور دیکھنے والے اور سننے والے کی طرح ہے، کیا یہ دونوں مثال میں برابر ہیں، تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ﴿۲۴﴾

دیکھیے سورہ اعراف (۱۷۹) اور ایک معنی یہ ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ سے اتنا بغض تھا کہ وہ آپ کی بات سن سکتے تھے نہ وہ آپ کو دیکھنا گوارا کرتے تھے۔

آیت 21-22 وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ..... : یعنی جھوٹے دعوے سب گم ہو گئے، اللہ کی گرفت آنے پر دنیا میں کوئی داتا، کوئی دغیر ان کی مدد کو نہیں پہنچا اور اس میں شک نہیں کہ آخرت میں بھی یہی سب سے زیادہ خسارے والے ہوں گے، کیونکہ جن کو یہ سمجھ کر پکارتے تھے کہ وہ ہمیں بچائیں گے انہیں اپنی بڑی ہوگی۔ وہ سب ان سے غائب ہو جائیں گے، اگر سامنے ہوئے بھی تو ان سے بری ہونے کا اعلان کریں گے، بلکہ ان کے دشمن بن جائیں گے۔ دیکھیے سورہ احقاف (۶، ۵)۔

آیت 23 إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ..... : ”اخْتَبَتُوا“ ”اخْتَبَات“ کا معنی ہے جھلنا، عاجزی کرنا، مطمئن ہونا۔ جمل اللہ نے فرمایا: ”اخْتَبَتْ لَهُ“ کا معنی ہے ”تَشْتَعُ وَ خَضَعُ لَهُ“ وہ اس کے سامنے عاجز ہو گیا اور ”اخْتَبَتْ إِلَيْهِ“ کا معنی ہے ”اطْمَأَنَّ إِلَيْهِ“ کہ وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ سب سے بڑے ظالموں، یعنی اللہ پر جھوٹ باندھنے والے کفار و مشرکین کے بعد اب اہل ایمان کا تذکرہ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالحہ کیے اور اپنے رب کے سامنے عاجز اور اس کی تقدیر اور فیصلے پر مطمئن ہو گئے وہ جنت کے مالک ہوں گے۔ ”اخبات“ والوں کی کچھ صفات سورہ حج (۵۴، ۳۵، ۳۴) میں آئی ہیں۔

آیت 24 مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرِ وَالسَّبْعِ..... : مثال سے کسی چیز کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور اس کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مومن دیکھنے اور سننے والا ہوتا ہے اور کافر اندھا اور بہرا ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد اور خلاف ہیں۔ کیا تم سمجھتے نہیں کہ سیدھے راستے پر اندھا بہرا شخص کیسے چل سکتا ہے، جو نہ خود راستہ دیکھے، نہ

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۲۵﴾ أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۗ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمِ الْيَوْمِ ﴿۲۶﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، بے شک میں تمہارے لیے صاف صاف ڈرانے والا ہوں ﴿۲۵﴾ کہ تم اللہ کے سوا (کسی کی) عبادت نہ کرو۔ بے شک میں تم پر ایک دردناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۲۶﴾

بتانے سے سنے۔ اسی لیے کفار کہیں گے: ﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ [الملک : ۱۰] ”اگر ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی آگ والوں میں نہ ہوتے۔“

آیت 25 ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ: جن حالات میں نبی ﷺ مکہ میں توحید کی دعوت پیش کر رہے تھے، وہ چونکہ ویسے ہی حالات تھے جو آپ ﷺ سے پہلے دوسرے انبیاء ﷺ کو پیش آچکے تھے، اس لیے حسب موقع یہاں سے گزشتہ انبیاء کا ذکر کیا جا رہا ہے اور باقی سورت تقریباً اسی تذکرے سے بھری ہوئی ہے، تاکہ ایک طرف رسول اللہ ﷺ کی ہمت بندھے، آپ کو اور مسلمانوں کو تسلی ہو کہ انجام کار اللہ کے رسولوں اور اہل حق کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یقیناً مدد ہوتی ہے اور دوسری طرف پہلی قوموں کے اعتراضات اور ان کے انبیاء کے جوابات آپ کے لیے نمونہ بنیں اور آپ کی قوم کو پہلے کفار کے انجام سے ڈرایا جائے۔

﴿۲﴾ آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، وہ اور ان کی اولاد سب موحد اور دین حق پر تھے، پھر شیطان کے بہکانے سے بزرگوں کی پوجا بت پرستی کی صورت میں شروع ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین پر سب سے پہلے رسول نوح علیہ السلام بھیجے گئے، جیسا کہ حدیث شفاعت میں ہے اور بت پرستی کے آغاز کی تفصیل سورہ نوح میں آئے گی۔ نوح علیہ السلام کا ذکر قرآن میں ۴۳ بار آیا ہے۔

﴿۳﴾ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ: نوح علیہ السلام نے صرف ڈرانے کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ان کی قوم نے سب دعات کا اظہار ہی نہیں کیا کہ انہیں خوش خبری دی جاتی۔

آیت 26 ﴿۲۶﴾ أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ.....: یہی ہر رسول کی دعوت تھی اور یہی سب کی بعثت کا مقصد تھا، فرمایا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ [الانبیاء : ۲۰] ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔“ میں تم پر دردناک عذاب سے ڈرتا ہوں“ کے بجائے فرمایا: ”دردناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔“ یہ زیادہ ڈرانے کے لیے فرمایا کہ وہ عذاب اتنا دردناک ہے کہ جس دن وہ آئے گا وہ دن ہی سراسر الم والا، یعنی نہایت دردناک ہوگا۔ یہی بات اس سورت کی آیت (۳) میں رسول اللہ ﷺ نے فرمائی۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا تَرِكُ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا تَرِكُ أَتْبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا بِادِي الرَّأْيِ وَمَا تَرَى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ﴿۲۷﴾

تو اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے کہا جنہوں نے کفر کیا تھا، ہم تجھے نہیں دیکھتے مگر اپنے جیسا ایک بشر اور ہم تجھے نہیں دیکھتے کہ ان لوگوں کے سوا کسی نے تیری پیروی کی ہو جو ہمارے سب سے ذلیل ہیں، سٹی رائے کے ساتھ اور ہم تمہارے لیے اپنے آپ پر کوئی برتری نہیں دیکھتے، بلکہ ہم تمہیں جھوٹے گمان کرتے ہیں ﴿۲۷﴾

آیت 27 ﴿۱﴾ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ: آلوسی نے فرمایا: "الْمَلَأُ" کا لفظ اسم جمع ہے، جیسا کہ "زَهْطُ" (گردہ) ہے۔ اس لفظ سے اس کا واحد کوئی نہیں آتا۔ "مَلَأَ يَمْلَأُ" کا معنی بھرنا ہے، یعنی ایک رائے پر متفق لوگوں کی جماعت، جس کے رعب و جلال اور ظاہری شکل و صورت سے آنکھیں بھر رہی ہوں۔ (راغب)

﴿۲﴾ مَا تَرِكُ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا: نوح علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کی امتوں کے کافروں کی طرح مکہ کے کافر بھی ہمارے نبی ﷺ کے بارے میں یہی بات کہا کرتے تھے کہ جو شخص ہماری طرح کا بشر ہو، جو کھانا پیتا، بازاروں میں چلتا پھرتا، سوتا جاگتا، بیویاں اور بال بچے رکھتا ہو، آخر وہ اللہ کا رسول کیسے ہو سکتا ہے۔ (دیکھیے فرقان: ۷) مطلب یہ ہے کہ رسالت اور بشریت میں تضاد ہے اور ان دونوں کا ایک شخص میں جمع ہونا ناممکن ہے، حالانکہ تمام انبیاء میں دونوں اوصاف جمع تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا مِثْلُكُمْ﴾ [یسی اسرائیل: ۹۳] "تو کہہ میرا رب پاک ہے، میں تو ایک بشر کے سوا کچھ نہیں جو رسول ہے۔" اور دیکھیے سورہ فرقان (۲۰) اور مومنون (۳۳، ۳۴) کفار آپ کا بشر ہونا جانتے تھے، کیونکہ آپ انھی میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے انہوں نے آپ کو رسول ماننے سے انکار کر دیا۔ افسوس کہ کچھ جدی پشتی مسلمان باپ دادا سے سن کر آپ کو رسول مانتے ہیں، مگر آپ کے بشر ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ ایک ہی ذہن ہے کہ انسان رسول نہیں ہو سکتا۔

﴿۳﴾ وَمَا تَرِكُ أَتْبَعَكَ: "أَرَادُوا" "أَرَادُوا" کی جمع ہے، یعنی کم تر درجے کے لوگ۔ "بَادِي" "بَدَا يَبْدُو" (ظاہر ہونا) سے اسم فاعل ہو تو معنی ہوگا ظاہر دیکھنے میں اور "بَدَا يَبْدُو" (شروع ہونا) سے ہو تو معنی ہوگا پہلی نظر میں، یعنی اس وجہ سے بھی ہم آپ کی پیروی اختیار نہیں کر سکتے کہ کچھ لوگ جو آپ کے متبع ہو گئے ہیں وہ تو دیکھنے ہی سے نظر آتے ہیں کہ ہمارے رذالے یعنی کم تر درجے کے لوگ ہیں۔ گویا ان کی نظر میں اس شخص کے تابع ہونا، جس کے پیروکار معاشرے میں نچلے درجے کے لوگ ہوں، ان کی شان کے منافی ہے۔ (دیکھیے شعراء: ۱۱۱) یعنی یہی بات مکہ کے کھاتے پیتے لوگ نبی ﷺ کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ان کی پیروی ہماری قوم کے غلام اور نچلے طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔ (دیکھیے انعام: ۵۳۲، ۵۳۳) حالانکہ حق کی تاریخ سے ثابت ہے کہ اس کے ابتدائی پیروکار دنیوی لحاظ سے کمزور لوگ ہی ہوئے ہیں، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہرقل اور ابوسفیان کے سوال و جواب میں مذکور ہے کہ جب ابوسفیان نے بتایا کہ اس کی پیروی ضعیفان نے کی ہے تو ہرقل نے کہا، یہی

قَالَ يَقَوْمِ آرَءَيْتُمْ إِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي وَآسِئْتُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِي فَقُيِّبَتْ عَلَيْكُمْ
أَنْزِلُكُمْ بِهَا وَآنْتُمْ لَهَا كِرْهُونَ ﴿٢٨﴾

اس نے کہا اے میری قوم! کیا تم نے دیکھا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر (قائم) ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے بڑی رحمت عطا فرمائی ہو، پھر وہ تم پر مخفی رکھی گئی ہو، تو کیا ہم اسے تم پر زبردستی چپکا دیں گے، جب کہ تم اسے ناپسند کرنے والے ہو ﴿۲۸﴾

لوگ تمام رسولوں کے پیروی کرنے والے رہے ہیں۔ [بخاری، بدء الوحی، باب کیف كان بدء الوحی ۱۷۰]

﴿۲۸﴾ وَمَا نُرِيكُمْ عَلَيْهَا مِن فَضْلٍ: ”ہم تمہارے لیے اپنے آپ پر کوئی برتری نہیں دیکھتے“ قوم کا یہ خطاب نوح علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں سے ہے کہ کسی بھی چیز میں تم ہم سے بڑھ کر نہیں ہو۔

﴿۲۹﴾ بَلْ نُنَظِّقُكُمْ كَلِمَاتٍ: یعنی اس بات میں کہ تم کہتے ہو نوح علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں۔

آیت 28 ﴿۱﴾ قَالَ يَقَوْمِ آرَءَيْتُمْ إِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي ...: نوح علیہ السلام نے ان کے تمام اعتراضات کا جامع جواب دیا، ایک تو یہ کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اپنی رسالت کے مضبوط دلائل اور پختہ یقین موجود ہے، یعنی ”وَآسِئْتُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِي“ دوسرا یہ کہ یہ نبوت کسی کی محنت کا نتیجہ یا کسی کے آبا و اجداد کی جائداد نہیں، یہ تو محض اللہ تعالیٰ کی اپنے پاس سے خاص عنایت ہے، اس کی تقسیم تمہارے ہاتھ میں نہیں۔ یہ اللہ جسے چاہے دیتا ہے، خواہ وہ غریب ہو یا امیر، جیسا کہ مکہ والوں نے ہمارے نبی کریم ﷺ پر اعتراض کیا تھا: ﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمَةٍ﴾ [الزحرف: ۳۱] ”اور انہوں نے کہا کہ یہ قرآن ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟“ اللہ تعالیٰ نے ان کا جواب دیا: ﴿أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ [الزحرف: ۳۲] ”کیا وہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے خود ان کے درمیان ان کی معیشت دنیا کی زندگی میں تقسیم کی۔“

﴿۳۰﴾ فَقُيِّبَتْ عَلَيْكُمْ: اس کا مادہ ”عَمِيَ“ ہے، اندھا ہونا، یعنی یہ بتاؤ کہ اگر تمہیں اس دلیل اور رحمت سے اندھا رکھا گیا ہو اور تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے وہ تم پر ایسی مخفی رہی ہو کہ تم دیکھ ہی نہ سکتے ہو تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟

﴿۳۱﴾ أَنْزِلُكُمْ بِهَا وَآنْتُمْ لَهَا كِرْهُونَ: یعنی کیا ہم زبردستی تمہیں اس دلیل کا قائل کر لیں اور اس رحمت کے سائے میں دھکے سے داخل کر لیں، جب کہ تم اس سے نفرت کرتے ہو اور دور بھاگتے ہو۔ ”أَنْزِلُكُمْ بِهَا وَآنْتُمْ لَهَا كِرْهُونَ“ میں ایک لفظ کے اندر تین ضمیروں کو ایسے طریقے سے جمع کیا ہے کہ لفظ انتہائی خوبصورت اور واضح ہو گیا ہے۔

وَيَقُومُوا لَكُمْ عَلَيْهِ مَا لَا إِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّهُمْ
 لَمُلْقُوا إِلَيْهِمْ وَلَكِنِّي أَنزَلْتُكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ﴿٢٩﴾ وَيَقُومُوا مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُهُمْ
 أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣٠﴾

اور اے میری قوم! میں تم سے اس پر کسی مال کا سوال نہیں کرتا، میری مزدوری اللہ کے سوا کسی پر نہیں اور میں ان لوگوں کو دور ہٹانے والا نہیں جو ایمان لائے ہیں، یقیناً وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور لیکن میں تمہیں ایسے لوگ دیکھتا ہوں جو جہالت برتتے ہو ﴿۲۹﴾ اور اے میری قوم! اللہ کے مقابلے میں کون میری مدد کرے گا اگر میں انہیں دور ہٹا دوں؟ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ ﴿۳۰﴾

آیت 29-30 ﴿٢٩﴾ وَيَقُومُوا لَكُمْ عَلَيْهِ مَا لَا اور اے میری قوم! میں اللہ کا یہ پیغام تمہیں پہنچانے پر تم سے کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا، مبادا تم سمجھو کہ نوح نے مال کھینچنے کے لیے نبوت کا بہانہ کھڑا کر لیا۔ میری اجرت تو اللہ کے سوا کسی کے ذمے بھی نہیں اور نہ دنیا کی کسی چیز کا تم سے مطالبہ ہے۔

﴿٣٠﴾ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا: یعنی جس طرح اللہ کی رحمت (اسلام) کے دامن میں آنے سے جب تک تم نفرت اور کراہت کرتے رہو گے، میں تمہیں زبردستی اسلام لانے پر مجبور نہیں کر سکتا، اسی طرح جیسے تم چاہتے ہو کہ جن لوگوں نے میری پیروی اختیار کی ہے، چونکہ وہ نچلے طبقے کے لوگ ہیں، اس لیے میں انہیں دھکے دے کر نکال دوں، یہ کام میں ہرگز نہیں کر سکتا۔ یہ اسی قسم کا مطالبہ تھا جو قریش کے سردار نبی ﷺ سے کرتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرما دیا۔ دیکھیے سورۃ انعام (۵۲)، کہف (۲۸) اور سورۃ عبس۔

﴿٣١﴾ إِنَّهُمْ لَمُلْقُوا إِلَيْهِمْ: یعنی اگر میں ان کو ستاؤں یا اپنی مجلس سے نکال دوں تو وہ اللہ تعالیٰ سے اپنا انصاف چاہیں گے، اس کا میں کیا جواب دوں گا۔ یا یہ کہ وہ لوگ تو اللہ کے ہاں عزت پالیں گے اور اس بارگاہ عالی میں ان کو ایمان و عمل کے باعث مقام و مرتبہ ملے گا، پھر تمہارے ان کو ذلیل سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ ان کے دوسرے اعتراض کا جواب ہے کہ اے نوح! آپ کے قبیح ہمارے رذالے ہیں۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”کافروں نے مسلمانوں کو رذالہ ٹھہرایا اور چاہا کہ ان کو ہانک دو تو ہم تمہارے پاس بیٹھیں اور بات سنیں۔ سو فرمایا کہ دل کی بات اللہ تعالیٰ تحقیق کرے گا جب اسے ملیں گے، میں اگر مسلمانوں کو ہانگوں تو اللہ سے کون چھڑوائے مجھ کو۔ اور رذالہ ٹھہرایا اس پر کہ وہ کب کرتے تھے۔ کب سے بہتر کمائی نہیں، اس واسطے فرمایا کہ تم جاہل ہو۔“ (موضح)

﴿٣٢﴾ وَلَكِنِّي أَنزَلْتُكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ: یعنی تم کسی بات کو بھی صحیح طرح نہیں سمجھتے، تمہاری نظر صرف ظاہر چیزوں پر ہے اور انجام پر غور نہیں کرتے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ظالم شخص سچ تو م کا ہے، اس لیے اسے اپنے پاس نہ بیٹھنے دو؟ اللہ کے نزدیک اسی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ وَلَا أَقُولُ
لِلَّذِينَ تَزُدُّونِي أَغْنِيكُمْ لَنْ يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ ۗ إِنِّي إِذَا

تَبَيَّنَ الظَّالِمِينَ ﴿٣١﴾

اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ بے شک میں ایک فرشتہ ہوں اور نہ میں ان لوگوں کے بارے میں جنہیں تمہاری آنکھیں حقیر سمجھتی ہیں، یہ کہتا ہوں کہ اللہ انہیں ہرگز کوئی بھلائی نہیں دے گا، اللہ اسے زیادہ جاننے والا ہے جو ان کے دلوں میں ہے، یقیناً میں تو اس وقت ظالموں سے ہوں گا ﴿۳۱﴾

کو عزت ہے جو ایمان دار اور پرہیزگار ہے۔ بے ایمان اور بدکار کتنے ہی اونچے خاندان کا ہو اللہ کے نزدیک چوہڑے اور چمار سے بھی بدتر ہے۔

آیت 31 ﴿۱﴾ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ : یہ اس بات کا جواب ہے جو ان لوگوں نے کہی تھی کہ ہمیں تو تم اپنے جیسے ایک انسان نظر آتے ہو اور یہ کہ ہم تم کو کسی بات میں اپنے سے برتر نہیں پاتے۔ اس پر نوح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہاں میں واقعی تم ہی جیسا ایک بشر ہوں، نہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ میں فرشتہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں، یعنی اس قسم کی کوئی فوقیت مجھ میں نہیں ہے۔ میرا جو بھی دعویٰ ہے وہ صرف اتنا ہے کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں اور اس نے مجھے سیدھے راستے کی ہدایت بخشی ہے۔ میرا یہ دعویٰ ناقابل تردید ہے، اس کی تم جس طرح چاہو آزمائش کر لو۔

﴿۲﴾ وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزُدُّونِي أَغْنِيكُمْ : ”تَزُدُّونِي“ اس کا مادہ ”زری“ ہے، ”زَرَيْتُ عَلَيْهِ“ میں نے اس پر عیب لگایا۔ باب افتعال میں جا کر افتعال کی تاء کو وال کے ساتھ بدلنے سے ”إِزْدَرَى إِزْدَرَاءً“ بن گیا، جس کا معنی حقیر جانا ہے۔ (تاموس) یعنی مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ محض تمہیں خوش کرنے کے لیے ان لوگوں کے بارے میں اس قسم کی جاہلانہ بات کہوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ چیزیں (اللہ کے خزانوں کا مالک ہونا، عالم الغیب ہونا، فرشتہ ہونا) نبوت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتیں کہ ان کے بغیر نبوت نہیں مل سکتی اور نہ ان چیزوں کے کسی شخص کے پاس نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر خیر سے خالی ہے اور جو شخص مال دار نہ ہو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خیر بھی حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ ناقوانوں کو عزت دیتا ہے اور عزت والوں کو دم بھر میں ذلیل کر دیتا ہے۔ اس وقت بھی یہ لوگ اپنے رب پر ایمان اور اس کے رسول کی پیروی کی بدولت تم سے زیادہ باعزت اور شریف ہیں۔ (روح المعانی)

﴿۳﴾ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ : اگر ان کے دلوں میں ایمان اور اخلاص ہے تو اللہ کے ہاں ضرور اجر پائیں گے، تم اور میں مل کر بھی انہیں اس اجر سے محروم نہیں کر سکتے۔

قَالُوا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۳۴﴾ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَيْنَاهُ قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَنِي إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تُجْرَمُونَ ﴿۳۵﴾

انہوں نے کہا اے نوح! بے شک تو نے ہم سے جھگڑا کیا، پھر ہم سے بہت جھگڑا کیا، پس لے آہم پر جس جس کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے، اگر تو سچوں سے ہے ﴿۳۳﴾ اس نے کہا وہ تو تم پر اللہ ہی لائے گا، اگر اس نے چاہا اور تم ہرگز عاجز کرنے والے نہیں ﴿۳۴﴾ اور میری نصیحت تمہیں نفع نہ دے گی اگر میں چاہوں کہ تمہیں نصیحت کروں، اگر اللہ یہ ارادہ رکھتا ہو کہ تمہیں گمراہ کرے، وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۳۵﴾ یادہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے گھڑ لیا ہے، کہہ دے اگر میں نے اسے گھڑ لیا ہے تو میرا جرم مجھی پر ہے اور میں اس سے بری ہوں جو تم جرم کرتے ہو ﴿۳۵﴾

﴿۳۵﴾ إِنْ أَذَانُ الظَّالِمِينَ : یعنی اگر میں انہیں خواہ مخواہ ذلیل قرار دوں۔ یہ اشارہ ہے کہ تم انہیں رذالے کہنے میں ظالم ہو، یا یہ کہ اگر میں خزان الہی کو جمع کرنے یا غیب کے جاننے اور فرشتہ ہونے کا دعویٰ کروں تو میں ظالموں میں سے ہوں گا۔

آیت 32 قَالُوا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ : جب وہ نوح علیہ السلام کے دلائل کے سامنے بے بس ہو گئے اور نوح علیہ السلام ایک مدت دراز تک (۹۵۰ سال۔ عنکبوت: ۱۳) دن رات ایک ایک شخص کو اور پوری پوری مجلس کو (دیکھیے سورہ نوح) اللہ کی توحید سمجھاتے رہے، نہ تھکے اور نہ ہمت ہاری تو بجائے اس کے کہ ان کی قوم ایمان لے آتی یا اللہ سے درخواست کرتی کہ اے اللہ! اگر نوح علیہ السلام کی بات سچ ہے تو اس کے لیے ہمارے سینے کھول دے، اللہ تعالیٰ نے اس کا مطالبہ کر دیا۔ یہ اس بات کی مثال ہے کہ شرک انسان کو عقل اور فطرت الہی پر چلنے سے کس حد تک محروم کر دیتا ہے اور اس کی بھی کہ مشرک پرانے زمانے کا ہو یا آخری پیغمبر ﷺ کی امت کا، دونوں ایک ہی طرح عقل سے خالی ہو جاتے ہیں۔ دیکھیے ابو جہل اور مشرکین مکہ کی نبی ﷺ کے سچا ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے دعا جو سورہ انفال (۳۲) میں مذکور ہے۔

آیت 33, 34 نوح علیہ السلام نے جواب میں کسی تلخی کا مظاہرہ نہیں کیا، بلکہ اپنی اور اللہ تعالیٰ کی حیثیت واضح فرمائی کہ عذاب لانا یا نہ لانا میرا کام نہیں، یہ تو اللہ کا اختیار ہے۔ وہ اگر چاہے گا تو تم پر عذاب لے آئے گا، پھر تم اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نکل نہیں سکو گے اور جس طرح کائنات کا ایک ذرہ بھی اللہ کی مرضی کے بغیر حرکت یا سکون میں نہیں آ سکتا، انسان ہدایت اور گمراہی کی ایک حد تک اختیار رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ارادے اور اس کی توفیق کے بغیر پیغمبر کی خیر خواہی اور نصیحت سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

آیت 35 أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَيْنَاهُ قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَنِي إِجْرَامِي : اس آیت کی مفسرین نے الگ الگ تفسیریں کی ہیں۔ بعض نے اسے نوح علیہ السلام کے قصے ہی سے متعلق سمجھے ہوئے اس میں خطاب نوح علیہ السلام سے قرار دیا ہے اور بعض نے اسے نوح علیہ السلام کے قصے کے

وَأُوحِيَ إِلَى نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا
يَفْعَلُونَ ﴿۳۶﴾ وَأَصْنَعِ الْفُلَکَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحِّينَا وَلَا تَخَاطِبُنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ تیری قوم میں سے کوئی ہرگز ایمان نہیں لائے گا مگر جو ایمان
لاچکا، پس تو اس پر غمگین نہ ہو جو وہ کرتے رہے ہیں ﴿۳۶﴾ اور ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا

درمیان جملہ معترضہ قرار دیا ہے اور اسے مشرکین مکہ کا قول قرار دے کر رسول اللہ ﷺ سے خطاب قرار دیا ہے، یعنی کیا (مکہ
کے کافر) کہتے ہیں کہ اس (محمد ﷺ) نے اس (قرآن) کو اپنے دل سے گھڑ لیا ہے۔ (اے محمد!) کہہ دے اگر میں نے اسے
اپنے دل سے گھڑا ہے تو میرے گناہ کا وبال مجھ پر پڑے گا اور تم جو گناہ کرتے ہو میں اس کی ذمہ داری سے بری ہوں۔ علمائے تفسیر
میں سے رازی اور ان کی موافقت میں شوکانی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ یہی اکثر مفسرین کا قول ہے۔ حافظ
ابن کثیر اور صاحب کشاف نے دوسری تفسیر کو راجح قرار دیا ہے، یہی رائے شاہ عبدالقادر بنک کی ہے، امکان دونوں کا ہے۔

آیت 36 وَأُوحِيَ إِلَى نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ : نوح علیہ السلام سے متعلق قرآن مجید کی تمام آیات پر مجموعی نظر ڈالیں تو یہ

بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے بے مثال مبر کے ساتھ مسلسل صدیوں دعوت دینے کے باوجود قوم نے ان کے انکار اور ایذا
رسانی میں کوئی کمی نہ کی، بلکہ ہر نسل اپنی اولاد کو وصیت کر کے مرتی رہی کہ دیکھنا اپنے بتوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نوح علیہ السلام کی
بات مت ماننا۔ (سورہ نوح) اس کے باوجود نوح علیہ السلام پر امید رہ کر نہایت استقامت کے ساتھ انھیں دعوت تو حید دیتے رہے،
مگر جب اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ اطلاع دی کہ اب آئندہ آپ کی قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا تو انھوں نے ان پر عذاب
کے لیے بددعا کی۔ جس کا ذکر سورہ قمر (۱۰) میں ہے، فرمایا: ﴿أَنِّي مَغْلُوبٌ فَأَنْتَبِهْ﴾ ”بے شک میں مغلوب ہوں سو تو بدلہ
لے۔“ اور سورہ نوح میں ان کی دعا کے الفاظ ہیں: ﴿رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ أَعْلَمُ الْغُيُوبِ﴾ ”اے میرے
رب! زمین پر ان کافروں میں سے کوئی رہنے والا نہ چھوڑ۔“ آیت (۲۶) سے آخر سورت تک ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 37 وَأَصْنَعِ الْفُلَکَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحِّينَا : نوح علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے کفار پر عذاب کے وعدے

کے ساتھ نوح علیہ السلام کو دو باتوں کی تاکید فرمائی، پہلی تو یہ کہ پانی کے طوفان سے بچنے کے لیے ہماری آنکھوں کے سامنے اور
ہماری وحی کے مطابق ایک بحری جہاز بناؤ۔ یاد رہے کہ ”الْفُلَکَ“ کا لفظ بڑی کشتی (بحری جہاز) کے لیے استعمال ہوتا ہے اور
واحد جمع اور مذکر مؤنث سبھی کے لیے ایک ہی لفظ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں اور اس کی ہدایت کے مطابق بننے والی کشتی کتنی
شان دار ہوگی، اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں نے اس کی لسانی، چوڑائی اور اونچائی بیان کی ہے، مگر ان تمام باتوں کی
کوئی پختہ دلیل نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب تم نے خود ہی دعا کی ہے کہ یا اللہ! زمین پر رہنے والا ایک کافر بھی باقی نہ
چھوڑ، تو اب عذاب آنے پر ظلم کرنے والوں (مشرکوں) کے بارے میں مجھ سے کوئی بات (سفارش) مت کرنا، کیونکہ ان کے

مُعْرِفُونَ ﴿۱۵﴾

اور مجھ سے ان کے بارے میں بات نہ کرنا جنہوں نے ظلم کیا، یقیناً وہ غرق کیے جانے والے ہیں ﴿۱۵﴾

غرق کیے جانے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

﴿۱۵﴾ يَا عِبْتِنَا وَوَحْيِنَا: معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے آنکھوں کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے اس کی آنکھیں بھی ہیں۔ دوسری جگہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿وَلْيُحْشَرْنَا عَلَىٰ عَيْنَيْ﴾ [ظہ: ۳۹] ”اور تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے کی جائے۔“ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے آنکھیں ہونے سے انکار کرتے ہیں، ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ کی آنکھیں ماننے سے مخلوق کے ساتھ تشبیہ لازم آتی ہے، یعنی وہ ہمارے جیسا بن جاتا ہے، کیونکہ ہماری بھی آنکھیں ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں۔ ان حضرات نے اسی بہانے سے اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات کا انکار کر دیا اور کئی ایک کی تاویل کر دی، مثلاً اللہ تعالیٰ کے چہرے، ہاتھ، پنڈلی، کان اور آنکھ کا، اس کے اترنے، چڑھنے، سننے، بولنے، دیکھنے، خوش ہونے اور ناراض ہونے کا انکار کر دیا، یا اپنے پاس سے کوئی اور مطلب بیان کر دیا، یا کہا کہ ہمیں معلوم ہی نہیں اس کا معنی کیا ہے۔ ان بے چاروں نے غور نہیں کیا کہ جب آپ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے ”عَيْنٌ“ کا لفظ بول رہے ہیں تو اردو میں آنکھ کہنے سے آپ کو کیا پریشانی ہے۔ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ کیا ”ہماری نگرانی میں کشتی بنا۔“ چلیے یہ بھی درست ہے، مگر اس کے لیے آنکھوں کے انکار کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ نگرانی بھی آنکھوں کے ساتھ ہی تھی۔ ”يَا عِبْتِنَا“ کا ترجمہ نگرانی کریں، پھر بھی مشابہت والا اعتراض ختم نہیں ہوتا، کیونکہ انسان نگرانی بھی کرتا ہے، یہ بھی مشابہت ہو گئی۔ ان کو چاہیے تھا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس پر ایمان رکھتے اور اس مشکل کا حل جو اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے اس کو تسلیم کرتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [الشورى: ۱۱] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔“ ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں“ کے باوجود وہ سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی، سچ و بھرا بھی رکھتا ہے، مگر اس کا سننا، دیکھنا، ہنسنا، غصے ہونا، اترنا، چڑھنا، بولنا، اس کے کان، آنکھیں اور پنڈلی سب کچھ ہونے کے باوجود کوئی چیز مخلوق جیسی نہیں۔ اگر ہم اس حد تک چلے جائیں کہ مخلوق پر بولا جانے والا کوئی لفظ اللہ تعالیٰ پر بولا جا ہی نہیں سکتا تو پھر ہم اپنے اللہ تعالیٰ ہی کو گم کر بیٹھیں گے۔ کیونکہ ہم زندہ ہیں، موجود ہیں، علم رکھتے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کے حق میں اس کا انکار کر کے دیکھو تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ موجود ہی نہیں۔ ایسے خبیث عقیدے سے اللہ کی پناہ۔ یقیناً ہم زندہ و موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی زندہ و موجود ہے، مگر ہماری زندگی اور وجود اللہ تعالیٰ کی زندگی اور وجود سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے۔ اس کی زندگی اور وجود اس کی شان کے لائق ہے، جو ازلی، ابدی اور لامحدود ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں اور ہمارا وجود اور زندگی فانی، محدود اور اللہ کے محتاج ہیں۔

یہ لوگ عجیب باتیں کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نہ اوپر ہے نہ نیچے، نہ عرش پر ہے نہ آسمان دنیا پر اترتا ہے اور نہ قیامت کے دن آئے گا، تو پھر وہ کہاں ہے؟ کہتے ہیں یہ پوچھنا ہی منع ہے، وہ نہ مکان میں ہے نہ لامکان میں۔ پھر کبھی کہتے ہیں

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۗ وَكَلَّمَآ مَرْ عَلَيْهِ مَلَاً فَمِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۗ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوا مِنَّا فَاِنَّا
تَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ﴿۳۸﴾

اور وہ کشتی بناتا رہا اور جب کبھی اس کے پاس سے اس کی قوم کے کوئی مرد گزرتے اس سے مذاق کرتے۔ وہ کہتا
اگر تم ہم سے مذاق کرتے ہو تو یقیناً ہم تم سے مذاق کرتے ہیں، جیسے تم مذاق کرتے ہو ﴿۳۸﴾

وہ ہر جگہ ہے، کبھی کہتے ہیں کہیں بھی نہیں۔ اللہ کے بندو! جو کچھ تعارف اللہ تعالیٰ نے اپنا خود کر دیا ہے وہ ہر صورت مانو، مگر یہ
کہو کہ اس کی آنکھیں، کان، چہرہ، اترنا اور چڑھنا وغیرہ سب کچھ ہے مگر مخلوق میں سے کسی کی طرح نہیں، بلکہ وہ اسی طرح ہے
جیسے اس کی شان کے لائق ہیں۔ دراصل یہ لوگ اللہ کی صفات پر ایمان لانے سے اس لیے محروم ہوئے کہ انہوں نے اس کے چہرے،
آنکھوں، ہاتھوں اور سننے و دیکھنے وغیرہ کو اپنے جیسا سمجھا، اس لیے انکار کر دیا۔ اگر وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے اور اس پر ایمان رکھتے
کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق جو الفاظ بولے ہیں، سب حق ہیں، مگر مخلوق میں سے کسی کے مشابہ نہیں تو وہ ایمان سے ہاتھ نہ دھوتے۔

﴿۳۸﴾ وَلَا تُخَاطَبُنِي فِي الدِّينِ ظَلَمْنَا..... : ”الَّذِينَ ظَلَمُوا“ سے مراد مشرک ہیں، کیونکہ مشرک سے بڑی ناانصافی کوئی
نہیں۔ نوح علیہ السلام کی بیوی اور ایک بیٹا مشرک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کے حق میں کسی بھی قسم کی بات کرنے سے منع فرما
دیا، کیونکہ مشرک کی نجات کی کوئی صورت نہیں۔

آیت 38 ﴿۳۸﴾ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ: ماضی کے ایک واقعہ کو مضارع کے صیغے سے بیان فرمایا۔ اس سے ان کا مسلسل کئی دنوں
تک اس بڑی کشتی کو بناتے رہنا ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ ”سکان“ کا صیغہ جو ماضی ہے، مضارع پر آجائے تو اس سے مراد ماضی
میں استمرار ہوتا ہے، اس لیے ترجمہ کیا ہے ”اور وہ کشتی بناتا رہا۔“ بعض اہل علم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مضارع کا لفظ حکایت
حال، یعنی وہ نقشہ سامنے لانے کے لیے استعمال فرمایا، گویا ہم دیکھ رہے ہیں کہ نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے ہیں اور قوم کے لوگ
انہیں مذاق کر رہے ہیں، یہ معنی بھی جید ہے۔

﴿۳۹﴾ وَكَلَّمَآ مَرْ عَلَيْهِ مَلَاً فَمِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ.....: وہ اس پر مذاق کرتے کہ بڑے میاں ترکھان کب سے بن گئے اور اب
اس حد تک دماغ میں خلل آ گیا کہ خشک زمین پر پانی میں غرق ہونے سے بچاؤ کا بندوبست کر رہے ہیں۔ نوح علیہ السلام اس پر ہنستے کہ
یہ لوگ بجائے اس کے کہ ایمان اور اطاعت کے ذریعے سے عذاب الہی سے بچاؤ حاصل کریں، الٹا کفر اور نافرمانی پر اصرار کر کے
اور اللہ کے نشانات کا مذاق اڑا کر عذاب کو دعوت دے رہے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نوح علیہ السلام نے فرمایا ہو کہ جیسے تم ہمارا مذاق
اڑا رہے ہو، وہ وقت بالکل قریب ہے جب تم غوطے کھا رہے ہو گے اور ہم تمہارا مذاق اڑائیں گے، جیسا کہ تم ہمارا مذاق اڑا
رہے ہو۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”یہ (نوح علیہ السلام) ہنستے اس پر کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنستے ہیں۔“ (موضح)

قَسُوفَ تَعْلَمُونَ لَمَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحُولُ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿۳۹﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ
أَمْرُنَا وَقَارَ النَّوُّورُ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ
عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ أَمِنَ وَمَا أَمِنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿۴۰﴾

پس تم جلد ہی جان لو گے کہ وہ کون ہے جس پر ایسا عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر دائمی عذاب اترتا ہے ﴿۳۹﴾ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور نور اہل پڑا تو ہم نے کہا اس میں ہر چیز میں سے دو قسمیں (نر و مادہ) دونوں کو اور اپنے گھر والوں کو سوار کر لے، سوائے اس کے جس پر پہلے بات ہو چکی اور ان کو بھی جو ایمان لے آئے اور اس کے ہمراہ تھوڑے سے لوگوں کے سوا کوئی ایمان نہیں لایا ﴿۴۰﴾

آیت 39 عَذَابٌ مُّقِيمٌ : یعنی آخرت میں جہنم کا عذاب جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔

آیت 40 ﴿۱﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَقَارَ النَّوُّورُ : ”فَارَ يَفُورُ فُورًا“ جوش مار کر نکلنا۔ فوارہ بھی اسی سے ہے۔ ”النَّوُّورُ“ (بروزن تقوول) کا معروف معنی نور ہے جس میں رونیاں پکائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے گھر میں طوفان کا نشان بتا رکھا تھا کہ جب اس نور سے پانی ابلے تب کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ (موضح) اکثر مفسرین نے نور سے یہی عام تصور مراد لیا ہے، لیکن حسب تفسیر ابن عباس (ابن جریر) ”النَّوُّورُ“ سے مراد روئے زمین ہے۔ قاموس میں بھی لکھا ہے: ”وَجَهْ الْأَرْضِ وَكُلُّ مَفْجَرٍ مَاءٍ وَ مَخْفَلٌ مَاءِ الْوَادِي“ ”روئے زمین، پانی پھوٹنے کی جگہ اور وادی کے پانی کے جمع ہونے کی جگہ۔“ اس تفسیر کی رو سے مراد یہ ہے کہ ساری زمین پانی کا چشمہ بن گئی اور پانی اٹھنے لگا، جیسا کہ دوسرے مقام پر ہے: ﴿وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا﴾ [الفر: ۱۶] ”اور ہم نے زمین کو چشموں سے پھاڑ دیا۔“ حتیٰ کہ تور جو آگ کی جگہ ہوتے ہیں، پانی کے فوارے بن گئے۔ ویسے پہلا معنی زیادہ قرین قیاس ہے، کیونکہ علامت ظاہر ہونے کے ساتھ ہی کشتی میں سوار ہونے اور ہر جانور کا جوڑا رکھنے کا زیادہ موقع ہے، لیکن جب ساری زمین سے چشمے پھوٹ نکلیں تو یہ کام مشکل ہے اور تور رونیاں پکانے کے لیے عام معروف بھی ہے۔ امام طبری اور رازی نے بھی اسی معنی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ معروف معنی چھوڑنے کی کوئی دلیل نہیں۔ ام ہشام بنت حارثہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: «كَانَ نَوُّورًا وَ نَوُّورٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاجْتَدَا» [مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة: ۸۷۳] ”ہمارا تور اور رسول اللہ ﷺ کا تور ایک ہی تھا۔“ ”اَمْرُنَا“ سے مراد عذاب کا حکم ہے کہ آسمان سے موسلا دھار پانی برسنے لگا اور زمین سے چشموں کی طرح پانی ابنا شروع ہو گیا، دونوں طبقے مل گئے اور زمین پانی میں غرق ہو گئی۔ دیکھیے سورہ قمر (۱۱، ۱۲)۔

﴿۲﴾ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ.....: ”مِنْ كُلِّ“ میں ”كُلِّ“ کی توین مضاف الیہ محذوف کا عوض ہے: ”أَيُّ مِنْ كُلِّ نَوْعٍ نَحْتَأْتِجُ إِلَيْهِ“ جب عذاب کے آثار شروع ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جانوروں کی ہر قسم میں سے ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کر لو، جن کی نسل باقی رہنا مقدر تھی۔ ”وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ أَمِنَ“ یعنی اپنی

وَقَالَ اِرْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ نَجْرُهَا وَمُرْسُهَا اِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۴۱﴾

اور اس نے کہا اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ کے نام کے ساتھ اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا ہے۔ بے شک میرا رب یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۴۱﴾

یہی جس کا ذکر سورہ تحریم میں ہے اور اس بیٹے جس کا ذکر زیر تفسیر آیات میں آ رہا ہے (جن کے کفر کی وجہ سے ان کا ڈوبنا پہلے طے ہو چکا ہے) ان کے سوا اپنے تمام گھر والوں کو اور ان لوگوں کو جو آپ پر ایمان لائے ہیں، کشتی میں سوار کر لو۔ ﴿۴۱﴾ وَمَا اَمْنٌ مَّعَهَا اِلَّا قَلِيلٌ: یہ وہی تھے جن کو قوم نے اپنے اراذل کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان پر بہت تھوڑے لوگ ہی ایمان لائے۔ ان کی تعداد بہت سے مفسرین (۷۹) یا (۸۰) بیان کرتے ہیں، مثلاً آلوسی وغیرہ، جن میں وہ نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث کا نام لیتے ہیں، کافر بیٹے کا نام کنعان تھا۔ ان چاروں کی بیویاں مسلمان تھیں اور ۷۲ مرد اور عورتیں دوسرے مسلمان تھے۔ بعض نے یہ تعداد چالیس (۴۰) بتائی ہے۔ ہمارے شیخ محمد عبدہ الفلاح فرماتے ہیں: ”قرآن وحدیث میں ان کی تعداد کا کوئی ذکر نہیں۔“ اور ظاہر ہے کہ ان دونوں چیزوں کے علاوہ کوئی معتبر ذریعہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس نہیں ہے۔ [وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِعَدَدِهِمْ]

آیت 41 ﴿۴۱﴾ وَقَالَ اِرْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ نَجْرُهَا وَمُرْسُهَا: ”ارکبوا فیہا“ عام طور پر سوار ہونے کے لیے ”رکب علیہ“ آتا ہے، یہاں ”ارکبوا علیہا“ کی جگہ ”ارکبوا فیہا“ اس لیے فرمایا کہ کشتی میں کمرے کی طرح داخل ہو کر بیٹھا جاتا ہے، جب کہ گھوڑے وغیرہ کے اوپر سوار ہوتے ہیں۔ (ابن عاشور) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کشتی صرف تنگے نہیں تھے جن کے اوپر وہ سوار ہوئے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں تیار ہونے والی وہ کشتی بہترین کمروں، آرام دہ سیٹوں اور کئی منزلوں والی تھی، جن میں وہ سوار ہوئے۔ ”مَجْرَى“ ”مَجْرَى“ ”مَجْرَى“ (ض) سے مصدر میسی ہے، یعنی چلنا۔ بعض قراء نے اس میں امالہ کیا ہے، یعنی الف کو یاء کی طرف اور فتح کو کسرہ کی طرف مائل کر کے پڑھتے ہیں۔ ”مُرْسَى“ یہ باب افعال ”اُرْسَى مُرْسَى“ (ر س و) سے مصدر میسی ہے، یعنی اس کا ٹھہرنا۔ کشتی میں سوار ہوتے وقت نوح علیہ السلام نے یہ دعا پڑھی، اس لیے کشتی میں سوار ہوتے وقت یہ دعا قرآن مجید سے ثابت ہے۔ سورہ مومنوں میں وہ دعا بھی مذکور ہے جو کشتی پر سوار ہو کر آرام سے بیٹھ جانے پر پڑھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا: ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي تَجِدَانَا مِنَ الْقَوَمِ الظَّالِمِينَ﴾ اور ﴿سَبَّ اَنْتَ لِنَبِيِّ نُنَزَّلَا مُبْرَكًا وَاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزَلِينَ﴾ [المؤمنون: ۲۸، ۲۹] سورہ زخرف میں کشتی ہو یا کوئی بھی سواری، اس پر سوار ہوتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی ہے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِي سَخَّرْنَا هٰذَا وَاَمَّا كُنَّا اِلٰذْ مُقَرَّنِينَ ۗ وَاِذَا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ﴾ [الزخرف: ۱۳، ۱۴] ”پاک ہے وہ جس نے اسے ہمارے تابع کر دیا، حالانکہ ہم اسے قابو میں لانے والے نہ تھے اور بے شک ہم اپنے رب ہی کی طرف ضرور لوٹ کر جانے والے ہیں۔“ صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ سے اونٹ پر سوار ہو کر یہ دعا پڑھنے کی حدیث موجود ہے، اس میں مزید الفاظ بھی ہیں۔ [دیکھیے مسلم، الحج، باب استحباب الذکر إذا ركب دابة

وَهُى تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۖ وَ نَادَى نُوْحٌ اٰتِنٰهُ وَ كَانَ فِي مَعَزِلٍ يُبَيِّنٰى
اُرْكَبُ مَعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٦﴾ قَالَ سَاوِيْ اِلٰى جَبَلٍ يَّعَصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۗ قَالَ
لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۗ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿٣٧﴾

اور وہ انہیں لے کر پہاڑوں جیسی موج میں چلی جاتی تھی، اور نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور وہ ایک علیحدہ جگہ
میں تھا، اے میرے چھوٹے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ (شامل) نہ ہو ﴿۳۶﴾ اس نے کہا میں
عنقریب کسی پہاڑ کی طرف پناہ لے لوں گا، جو مجھے پانی سے بچالے گا۔ کہا آج اللہ کے فیصلے سے کوئی بچانے والا
نہیں مگر جس پر وہ رحم کرے اور دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی تو وہ غرق کیے گئے لوگوں میں سے ہو گیا ﴿۳۷﴾

متوجہ: ۱۳۴۲: ۱ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما |

﴿۱﴾ اِنْ كَرِهِيَ لِقَافُورٌ رَّحِمًا ۖ : مطلب یہ ہے کہ ہم سب جو کشتی میں سوار ہو کر عذاب سے بچنے ہیں، اس لیے نہیں بچے کہ ہم
گناہوں سے یکسر پاک ہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا رب غفور و رحیم ہے۔ ایمان لانے کی وجہ سے اس نے ہماری
لغزشوں سے درگزر فرما کر ہمیں یہ عزت بخشی ہے۔

آیت 42 ﴿۱﴾ وَ هِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ : پہاڑوں جیسی موجوں سے طوفان کے پانی کی وسعت، اس کی
ظہانی اور جوش و غضب کے اندازے کے ساتھ کشتی کے مضبوط اور مستحکم ہونے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ نَادَى نُوْحٌ اٰتِنٰهُ... : باپ کی شفقت دیکھیے کتنے پیار سے ”بیٹے“ (اے میرے چھوٹے سے بیٹے یا اے میرے
پیارے بیٹے) کہہ کر کشتی میں سوار ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔

﴿۳﴾ وَ لَا تَكُنْ مَعَ الْكٰفِرِيْنَ : اس سے معلوم ہوا کہ اس بیٹے کی بربادی کا باعث کافروں کی مجلس اور ان کے ساتھ رہنا تھا،
اگر وہ نوح علیہ السلام کی صحبت میں رہتا تو کفار کے ہتھے نہ چڑھتا۔ اتنے بڑے سیلاب کے وقت بھی وہ غرق ہو گیا مگر اس نے نوح علیہ السلام
کے پاس آنا گوارا نہیں کیا۔ شیخ سعدی لکھتے ہیں۔

پھر نوح بابتوں بہ نشست خاندان نبوتش گم شدہ

”نوح علیہ السلام کا بیٹا بروں کے ساتھ بیٹھا تو اس سے نبوت کا خاندان ہی گم ہو گیا (وہ خاندان نبوت کا فرد ہی نہ رہا)۔“

آیت 42 ﴿۱﴾ قَالَ سَاوِيْ اِلٰى جَبَلٍ يَّعَصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ : معلوم ہوا کہ مشرک کی نظر اسباب تک ہی رہتی ہے اور
مشکل سے مشکل وقت میں بھی اسباب کے پیدا کرنے والے کی طرف نہیں جاتی۔ ”مجھے پہاڑ پانی سے بچالے گا“ کم عقل ایک
بے اختیار پہاڑ کو بچانے والا سمجھ رہا ہے۔

﴿۲﴾ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ : اس کا جو ترجمہ لکھا گیا ہے اس میں کچھ الفاظ محذوف شامل کیے

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَسْأَأِ أَقْلِبِي وَغِيضَ الْمَاءِ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى

الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۳۱﴾

اور کہا گیا اے زمین! تو اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان! تو تھم جا اور پانی نیچے اتار دیا گیا اور کام تمام کر دیا گیا اور وہ جودی پر جا ٹھہری اور کہا گیا ظالم لوگوں کے لیے دوری ہو ﴿۳۱﴾

جائیں تو مطلب درست ہوتا ہے، یعنی ”آج اللہ کے فیصلے سے کوئی بچانے والا نہیں مگر جس پر وہ رحم کرے (وہی بچے گا)۔“ بعض حضرات نے فرمایا کہ فاعل کا وزن بعض اوقات نسبت کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسا کہ ”لایٰ“، ”لین“ (دودھ) والا اور ”نایم“ (تمر) کھجور) والا، اسی طرح یہاں ”عاصمہ“ نسبت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی آج بچاؤ رکھنے والا کوئی نہیں، مگر جس پر وہ (اللہ) رحم کرے۔ ہمارے استاذ شیخ محمد عبدہ بنک لکھتے ہیں: ”یا دوسرا ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ آج اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے، مگر جو رحم کرنے والا ہے (یعنی خود اللہ تعالیٰ)۔“ آیت میں یہ ایک وجہ ہے جو محققین نے ذکر کی ہے اور یہی اقویٰ (زیادہ مضبوط) ہے، کیونکہ فاعل کا صیغہ زیادہ تر صفت کے لیے آتا ہے، نسبت کے لیے کم استعمال ہوتا ہے۔ (روح المعانی)

﴿۳۱﴾ وَحَالٍ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ : نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کی بات جاری تھی کہ پانی کی موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملا، جو غرق کیے جا چکے تھے۔ اس سے ایک تو اس موج کی غیرت ایمانی ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ موجد باپ کے سامنے مشرک بیٹے کی بک بک کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی، دوسرا یہ کہ آخرت میں آدمی انھی کا ساتھی ہو گا جن کا وہ دنیا میں ساتھی تھا۔ ”فَغَرِقُوا“ (پس وہ غرق ہو گیا) اور ”فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ“ (پس وہ غرق کیے گئے لوگوں میں سے ہو گیا) دونوں میں یہی فرق ہے، اس لیے اپنے بچوں کو جس قدر ہو سکے بری صحبت سے محفوظ رکھنا چاہیے۔

آیت 44 ﴿۴۴﴾ وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ : ”بَلْعٌ يَبْلَعُ“ (ف) نکلنے کو کہتے ہیں اور انسان یا کوئی بھی جانور عموماً پورا لقمہ اکٹھا ہی نگلتا ہے۔ یہ لفظ استعمال کرنے میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ زمین نے پانی آہستہ آہستہ نہیں بلکہ ایک ہی دفعہ لقمے کی طرح اپنے اندر نگل لیا تھا۔ ادھر آسمان کو حکم ہوا کہ تھم جا، چنانچہ بارش رک گئی۔ سارا پانی زمین کے نیچے اتار دیا گیا اور تمام مشرکوں کو نیست و نابود کرنے کا کام، جس کے لیے طوفان آیا تھا، پورا ہو گیا۔

﴿۴۲﴾ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ : جودی پہاڑ عراق اور ترکی کے درمیانی علاقے میں (جسے کردستان کہتے ہیں) موصل کی جانب واقع ہے۔ تورات میں نوح علیہ السلام کی کشتی ٹھہرنے کی جگہ ”ارارات“ بتائی گئی ہے، جو ارمینیا کے پہاڑی سلسلے کا نام ہے اور آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ چند سال ہوئے مغربی سیاحوں نے اس پہاڑ پر ایک بڑی کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختے بھی دریافت کیے ہیں، اگرچہ ان کے متعلق قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آیا یہ نوح علیہ السلام کی کشتی ہی کے تختے ہیں یا کسی اور کشتی کے۔ واضح رہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم دجلہ اور فرات کی وادی ہی میں آباد تھی، جو بعد میں عراق کے نام سے مشہور ہوئی۔

و نَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنْتَ أَحْكَمُ
 الْحَكِيمِينَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يُنوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ
 لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعِظُكَ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۴۶﴾

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا، پس کہا اے میرے رب! بے شک میرا بیٹا میرے گھر والوں سے ہے اور بے شک
 تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ﴿۴۵﴾ فرمایا اے نوح! بے شک وہ تیرے
 گھر والوں سے نہیں، بے شک یہ ایسا کام ہے جو اچھا نہیں، پس مجھ سے اس بات کا سوال نہ کر جس کا تجھے کچھ علم
 نہیں۔ بے شک میں تجھے اس سے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے ہو جائے ﴿۴۶﴾

﴿۴۵﴾ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ: ”بُعْدًا“ کا لفظ دوری، ہلاکت اور لعنت کے معنی میں آتا ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ سب
 ظالم ہلاک کر دیے گئے۔ بائبل (پیدائش: ۱۸: ۲۴) کے بیان پر عام خیال یہی ہے کہ یہ طوفان روئے زمین میں آیا تھا، مگر بعض
 علماء کا کہنا ہے کہ طوفان اسی علاقے میں آیا تھا جہاں نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھی۔ گو قرآن و حدیث میں اس کی کوئی تصریح نہیں
 ہے، لیکن یہ عین ممکن ہے کہ طوفان کے زمانے میں دنیا میں دجلہ و فرات کی وادی کے علاوہ کسی اور جگہ آبادی ہی نہ ہو۔

آیت 45 ﴿۴۵﴾ وَ نَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنْتَ أَحْكَمُ الْحَكِيمِينَ
 کے بارے میں دعا کی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ نوح علیہ السلام کے اہل کو بچانے کا تھا، اس وعدے کے حوالے سے درخواست کی۔ وہ اہل
 سے نسبی اور رشتہ داری کے گھر والے سمجھ بیٹھے، جب کہ کافر اور مومن کے درمیان دوستی کا رشتہ باقی نہیں رہتا۔ ایمان لانے کے
 بعد سب مومن دوست اور سب کافر دشمن بن جاتے ہیں۔ دیکھیے سورہ محمد (۴) بہر حال نوح علیہ السلام نے ادب ملحوظ رکھا اور صریح
 الفاظ میں بیٹے کو بچانے کی بات نہیں کی۔

آیت 46 ﴿۴۶﴾ قَالَ يُنوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ: فرمایا اے نوح! یہ تیرے اہل میں سے نہیں، بلکہ ”إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ
 الْقَوْلُ“ کے تحت کفر کی وجہ سے تمہارا اہل ہونے کے شرف سے محروم ہے اور ان لوگوں میں شامل ہو گیا ہے جن کے غرق کیے
 جانے کا پہلے فیصلہ ہو چکا ہے۔
 www.KitaboSunnat.com

﴿۴۶﴾ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ: عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ”اس کے عمل اچھے نہیں ہیں۔“ یہ معنی اس صورت میں درست
 ہو سکتا ہے کہ ”عَمَلٌ“ مصدر کو مبالغہ کے لیے اسم فاعل (غامل) کے معنی میں مانا جائے، جیسے: ”زَيْدٌ عَدُوٌّ“ کو ”زَيْدٌ
 عَادِيٌّ“ کے معنی میں لیا جاتا ہے، یعنی یہ غیر صالح عمل کرنے والا ہے۔ مگر امام المفسرین طبری رحمہ اللہ کے مطابق ”إِنَّهُ“ کی ضمیر
 نوح علیہ السلام کی دعا کی طرف جاتی ہے کہ آپ نے اپنے مشرک بیٹے کے حق میں جو سفارش کی ہے، یہ کام اچھا نہیں ہے۔

﴿۴۷﴾ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ: یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوال تو اسی چیز کا ہوتا ہے جس کا علم نہ ہو، جس چیز کا

قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُنَّ

فِي الْخُسُوفِ ۴۷

اس نے کہا اے میرے رب! بے شک میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے اس بات کا سوال کروں جس کا مجھے کچھ علم نہیں اور اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور مجھ پر رحم نہ کیا تو میں خسارہ پانے والوں سے ہو جاؤں گا ۴۷

علم ہو اس کے سوال کی تو ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اس کے دو جواب ہیں، دراصل عربی میں سوال کا لفظ مانگنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور پوچھنے کے بارے میں بھی۔ سو پہلا جواب یہ ہے کہ صرف وہی چیز مانگنی چاہیے جس کے متعلق اچھی طرح معلوم ہو کہ جس سے مانگ رہے ہیں وہ یہ چیز مانگنے پر ناراض نہیں ہوگا۔ جس کے متعلق یہ علم نہ ہو بلکہ اس کے ناراض ہونے کا بھی خطرہ ہو، وہ ہرگز نہیں مانگنی چاہیے۔ اب نوح علیہ السلام کے سامنے اللہ تعالیٰ کے وہ فرمان موجود تھے: ﴿وَلَا تَخَاطِبْنِي فِي الدِّينِ ظَلَمْتُمْ﴾ اور ﴿وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ﴾ پھر بھی انھیں اس کا علم نہیں ہو سکا کہ اس درخواست پر اللہ تعالیٰ کس قدر ناراض ہوں گے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی درخواست کا جواب تو ”إِنَّكَ لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ“ کہہ کر دے دیا تھا، اب اس سے آگے امکان تھا کہ نوح علیہ السلام بیٹے کے نجات نہ پانے اور کفر پر مستحکم رہنے کے متعلق سوال کرتے کہ اس میں کیا حکمت ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی اس سے روک دیا کہ میری حکمتوں تک تمہارے علم کی رسائی نہیں ہو سکتی، اس لیے مجھ سے ایسی بات مت پوچھنا۔ (الوسيط للططاوي) یعنی پوچھنی بھی وہی بات چاہیے جس کے متعلق علم ہو کہ جس سے پوچھ رہے ہیں وہ اس سوال پر ناراض نہیں ہوگا۔ شاہ عبدالقادر رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ لکھتے ہیں: ”آدمی پوچھتا وہی ہے جو معلوم نہ ہو، لیکن مرضی معلوم ہونی چاہیے۔ یہ کام ہے جاہل کا کہ اگلے کی مرضی نہ دیکھے پوچھنے کی، پھر پوچھے۔“ (موضح)

۴۷ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ: مطلب یہ ہے کہ اس حقیقت کو جاننے کے بعد اگر ایسا سوال کرو گے تو جاہل بن کر رہ جاؤ گے۔ (روح المعاني)

آیت 47 قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ.....: نوح علیہ السلام شاید پوری محبت کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ بیٹنا چاہے کافر ہو، گھر والوں میں شامل ہے اور اس کے لیے دعا کی جا سکتی ہے، لیکن جوں ہی اللہ تعالیٰ نے انھیں ستیہ کی کہ ایک کافر بنے کونسی قرابت کی بنا پر اپنا اہل سمجھنا صحیح نہیں ہے تو وہ فوراً متنبہ ہوئے اور اللہ کے حضور اپنی غلطی پر معافی مانگی۔ شاہ عبدالقادر رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ لکھتے ہیں: ”نوح علیہ السلام نے توبہ کی، لیکن یہ نہ کہا کہ پھر ایسا نہ کروں گا کہ اس میں دعویٰ نکلتا ہے، بندے کو کیا مقدر ہے! اسی کی پناہ مانگے کہ مجھ سے پھر یہ نہ ہو۔“ (موضح)

قِيلَ يٰ نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَ بَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ اٰمِمْ قَبْلِكَ وَ اُمَّمٌ سَنَتَعْتَهُمْ ثُمَّ
يَسْتَهْمُوْنَ مِنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾ تِلْكَ مِنْ اَنْبِآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْنَا اِلَيْكَ ؕ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا اَنْتَ

کہا گیا اے نوح! اتر جا ہماری طرف سے عظیم سلامتی اور بہت سی برکتوں کے ساتھ، تجھ پر اور ان جماعتوں پر جو ان لوگوں سے ہوں گی جو تیرے ساتھ ہیں۔ اور کئی جماعتیں ہیں جنہیں ہم عنقریب ساز و سامان دیں گے، پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا ﴿۴۸﴾ یہ غیب کی خبروں سے ہے جنہیں ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، اس سے

آیت 48 ﴿۱﴾ قِيلَ يٰ نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَ بَرَكَاتٍ عَلَيْكَ: یعنی ہماری طرف سے اپنے آپ پر اور اپنے ساتھ والے لوگوں پر سلامتی اور بے شمار برکتیں لے کر کشتی سے زمین پر اترو۔

﴿۲﴾ وَعَلَىٰ اٰمِمْ قَبْلِكَ: یعنی ان تمام مومنوں پر جو قیامت تک تمہاری اور تمہارے ساتھ والوں کی نسل سے پیدا ہوں گے، لیکن ان ساتھ والوں سے نسل صرف نوح علیہ السلام کے بیٹوں کی چلی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبٰقِيْنَ﴾ [الصافات: ۷۷] ”اور ہم نے اس کی اولاد ہی کو باقی رہنے والے بنا دیا۔“

﴿۳﴾ وَاُمَّمٌ سَنَتَعْتَهُمْ ثُمَّ يَسْتَهْمُوْنَ: حق تعالیٰ نے تسلی فرمادی کہ اس کے بعد ساری نوع انسانیت پر ہلاکت نہیں آئے گی، ہاں بعض فرقے ہلاک ہوں گے۔ (موضح) ہلاک ہونے والے فرقوں سے مراد وہ تمام کافر ہیں جو نوح علیہ السلام کی نسل سے پیدا ہوئے یا قیامت تک پیدا ہوں گے۔

آیت 49 ﴿۱﴾ تِلْكَ مِنْ اَنْبِآءِ الْغَيْبِ ...: اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ شروع ہی سے سب کچھ نہیں جانتے تھے، نہ آپ غیب دان تھے، ورنہ وحی کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بعض لوگ ان تمام آیات کی تاویل کرتے ہیں جن میں ہے کہ اے نبی! یہ غیب کی خبریں ہیں، ہم آپ کو سنار ہے ہیں، آپ نہ اس وقت وہاں تھے نہ آپ کو یہ باتیں معلوم تھیں، یہ ہم نے آپ کو وحی کے ذریعے بتائی ہیں۔ جو لوگ نبی ﷺ کو بھی عالم الغیب کہتے ہیں وہ اس قسم کی آیات ”یہ غیب کی خبریں ہیں، اس سے پہلے آپ ان کو نہیں جانتے تھے“ کی تحریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ خطاب دراصل امت کے لوگوں کو ہے کہ اے امت محمد کے لوگو! تم یہ باتیں نہیں جانتے تھے، مگر ہماری اس زیر تفسیر آیت نے ان لوگوں کی اس تحریف کو واضح طور پر باطل ثابت کر دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”یہ غیب کی خبروں سے ہے جنہیں ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ تو انہیں جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔“ معلوم ہوا کہ ان تمام آیات سے بھی یہی مراد ہے کہ صرف قوم ہی نہیں خود رسول اللہ ﷺ بھی غیب دان نہیں تھے۔ اگر غیب دان مانیں تو بار بار وحی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کا سارا واقعہ ان کے غیب دان ہونے کی نفی کرتا ہے، ورنہ اگر انہیں پہلے ہی سب کچھ معلوم تھا تو ساڑھے نو سو سال کی محنت، اس دوران میں قوم کی بدتمیزیوں پر صبر، پھر وحی کے مطابق کشتی بنانا، پھر بیٹے کے حق میں دعا کرنا، اللہ تعالیٰ کا ناراض ہونا اور نوح علیہ السلام کا معافی مانگنا سب کچھ

وَلَا تَوَكَّلْ مِنْ قَبْلِ هَذَا قَاصِدًا إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٥٩﴾

پہلے نہ تو انہیں جانتا تھا اور نہ تیری قوم، پس صبر کر، بے شک اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے ﴿۵۹﴾

افسانہ ٹھہرتا ہے۔ اسی طرح اگر ابراہیم علیہ السلام کو معلوم تھا کہ آگ مجھے نہیں جائے گی، اسماعیل علیہ السلام ذبح نہیں ہوں گے، یاسارہ علیہا السلام کا کچھ نہیں بگڑے گا تو پھر ان کی جان و مال اور اولاد و آبرو اللہ کی راہ میں قربان کر دینے کی بات بے معنی ٹھہرتی ہے۔ بدر کی رات رسول اللہ ﷺ کی آہ و زاری اور انکے یعنی عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کے موقع پر پریشانی کا کچھ مطلب نہیں بنتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔ رسولوں کو اتنی بات ہی معلوم ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے سے انہیں بتائی جاتی ہے۔

﴿۵۹﴾ قَاصِدًا إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ: ”عاقبۃ“ ایک حالت کے بعد آنے والی حالت، اس پر الف لام آئے تو عموماً اچھا انجام مراد ہوتا ہے، یعنی جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا انجام بخیر رہا اور ان کے تمام مخالفین ہلاک کر دیے گئے، اسی طرح آپ ﷺ کا انجام بھی دنیا و آخرت دونوں میں بہتر رہے گا اور آپ کے مخالفین دنیا میں بھی ذلیل و برباد ہوں گے اور آخرت میں بھی انہیں دوزخ کی آگ نصیب ہوگی۔ مسلمانوں کی تعداد کا کم ہونا اور مدت دراز تک اسلام کی دعوت کا کامیاب نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ دعوت ناکام ہے، بلکہ مسلسل صبر اور دعوت کے نتیجے میں آخری کامیابی اہل اسلام ہی کو ملے گی، خواہ کچھ نسلیں گزرنے کے بعد ملے۔ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے لاتعداد لشکر ہیں، مثلاً آگ، ہوا، پانی، پہاڑ اور بے شمار مخلوق۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو بھی اشارہ کر دے تو کافروں کا نام و نشان باقی نہیں رہ سکتا۔ کافر یہ نہ سمجھیں کہ مسلمان ہمیشہ مغلوب و مقہور ہی رہیں گے، بلکہ مسلمان اگر صبر و استقامت سے کام لیں اور اپنی ہر مصیبت اور بے بسی کو صرف اللہ کریم کے سامنے پیش کرتے رہیں، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے کہا: ﴿إِنِّي مَغْلُوبٌ فَأَنْتَجِرُ﴾ | القمر: ۱۰ | ”بے شک میں مغلوب ہوں سو تو بدلہ لے۔“ تو خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو، جیسا کہ نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سال کی دعوت کا حاصل بہت ہی کم آدمی بارہ (۱۲) یا چالیس (۴۰) یا اسی (۸۰) آدمی نکلے، مگر نوح علیہ السلام اور اہل ایمان کی محنت ناکام نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی قوت کے ساتھ دنیا کو تہ و بالا کر کے ان قلیل لوگوں کو ایسی کامیابی عطا فرمائی کہ ان کے دشمنوں کا نام و نشان مٹ گیا اور یہ پوری زمین کے مالک بن گئے۔ بنی اسرائیل، موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ پڑھ لیجیے۔ رسول اللہ ﷺ کے تین سو تیرہ بے سرو سامان ساتھیوں کی ایک ہزار مسلح کفار کے مقابلے میں غیب سے فرشتے بھیج کر ایسی مدد کی کہ وہ دن فیصلہ کن دن بن گیا کہ آئندہ کے غالب ہو کر رہنا ہے۔ غرض اللہ کا فیصلہ ہے کہ اچھا انجام متقین ہی کا ہے۔ (الوسیط)

﴿۵۹﴾ اس آیت میں ”تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْعِغَابِ“ سے ”وَلَا تَوَكَّلْ مِنْ قَبْلِ هَذَا“ تک رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت پر احسان کا ذکر ہے، ”قاصدین“ میں نصیحت ہے اور ”إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ“ میں تسلی اور خوش خبری ہے۔

﴿۶۰﴾ اس واقعہ سے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا حق ہونا بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے آدمی ہونے کے باوجود نوح علیہ السلام کا واقعہ پورا پورا صحیح شاد یا جو وحی الہی کے بغیر ممکن نہ تھا۔

وَ إِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۖ قَالَ يَقَوْمِ اٰعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ غَيْرَةٌ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا

مُفْتَرُونَ ﴿۵﴾

اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا)۔ اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تم تو محض جھوٹ باندھنے والے ہو ﴿۵﴾

﴿۵﴾ یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اپنی پوری کوشش کے باوجود اگر کسی صالح آدمی کا بیٹا صالح نہ بن سکے تو باپ اس میں بے قصور ہے۔ نوح علیہ السلام جیسا مہربان اور کامل مرہب بھی اگر بیٹے کو راہ راست پر نہ لاسکا تو ہماری تمہاری کیا حیثیت ہے؟ اب اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیت پر صبر و رضا کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ (قرطبی)

﴿۶﴾ قرآن مجید واقعات بیان کرتے وقت ان میں سے انھی حصوں کو نمایاں کرتا ہے جن سے کوئی نصیحت اور فائدہ حاصل ہو رہا ہو۔ ان کے وہ حصے جو اس مقصد سے خاص تعلق نہیں رکھتے انہیں چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً نوح علیہ السلام کی وہ کشتی کتنی مدت میں بنی، اس کا طول و عرض کیا تھا، اس میں سوار ہونے والے جانور کیسے جمع کیے گئے، اس میں کتنے کمرے تھے، کشتی کتنے دن پانی میں رہی، ’جودی‘ پر کشتی سے اترنے کے بعد نوح علیہ السلام نے کہاں اقامت اختیار فرمائی اور طوفان کتنے دن زمین پر برپا رہا۔ رہے وہ قصے کہانیاں جو عام مشہور ہیں، وہ اکثر اسرائیلیات ہیں، جن کی شرع یا عقل سے تائید نہیں ہوتی۔

﴿۷﴾ ایک مسئلہ جس پر بہت سے علماء نے بحث کی ہے، یہ بھی ہے کہ طوفان ساری زمین پر آیا تھا یا کچھ حصے پر؟ تفسیر المنار کے مصنف نے اپنے استاد شیخ محمد عبدہ مصری کا فتویٰ نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم اور احادیث کے ظاہر الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ طوفان نوح علیہ السلام کی پوری قوم پر آیا تھا اور ان کے علاوہ اس وقت پوری زمین پر کوئی اور آباد نہ تھا، اس لیے یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طوفان پوری زمین پر آیا تھا، کیونکہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ پوری زمین قوم نوح سے بھری ہوئی تھی۔ یہ تاریخی مسائل قرآن کے مقاصد میں سے نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صریح الفاظ میں کوئی وضاحت نہیں فرمائی۔ اس لیے ہم کہتے ہیں قرآن کے ظاہر کا تقاضا یہی ہے جو اوپر بیان ہوا، اب اگر کسی علمی تحقیق سے اس کے خلاف کوئی بات ثابت ہو جائے تو اس سے قرآن و حدیث کی کسی قطعی و صریح بات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ (الوسیط)

آیت 50 ﴿۱﴾ وَ إِلَىٰ عَادٍ اَخَاهُمْ هُودًا ۖ قَالَ يَقَوْمِ ”هُودًا“ عطف بیان ہے ”اَخَاهُمْ“ سے۔ تشریح کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۶۵) اے مشرکوں! اے کافروں! کے بجائے ”يَقَوْمِ“ (اے میری قوم!) سے مخاطب کرنے سے ان کے ساتھ اپنا تعلق اور خیر خواہی ظاہر کرنا مقصود ہے۔

﴿۲﴾ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا الْمُفْتَرُونَ: ”مُفْتَرُونَ“ ”فَرَى“ سے باب افتعال (اِفْتَرَا) کا اسم فاعل جمع مذکر کا صیغہ ہے۔ افترا یعنی جان بوجھ کر ایسا جھوٹ بولنا جس کے متعلق بولنے والے کو بھی معلوم ہو کہ یہ صاف جھوٹ ہے، یعنی اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی ہے ہی نہیں، تمہارا کسی غیر کو معبود بنانا محض افترا ہے۔

يَقُومُوا عَلَيْهِ اجْرًا ۗ اِنْ اَجْرِي اِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۗ اَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۵۱﴾ وَيَقُومُوا
 اسْتِغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيُرِزُّكُمْ قُوَّةً اِلَى قُوَّتِكُمْ
 وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

اے میری قوم! میں تم سے اس پر کسی مزدوری کا سوال نہیں کرتا، میری مزدوری اس کے سوا کسی پر نہیں جس نے مجھے
 پیدا کیا ہے۔ تو کیا تم نہیں سمجھتے؟ ﴿۵۱﴾ اور اے میری قوم! اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ، وہ تم
 پر بادل بھیجے گا، جو خوب برسنے والا ہوگا اور تمہیں تمہاری قوت کے ساتھ اور قوت زیادہ دے گا اور مجرم بننے ہوئے
 منہ نہ موڑو ﴿۵۲﴾

آیت 51 ﴿۵۱﴾ يَقُومُوا عَلَيْهِ اجْرًا.....: ”فَطَرَنِي“ کا اصل معنی پھاڑنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ﴾ [الانفطار: ۱] ”اور جب آسمان پھٹ جائے گا۔“ ”فَطَرَنِي“ سے مراد مجھے کسی گزشتہ نمونے کے بغیر پیدا فرمایا۔
 ﴿۵۱﴾ اَفَلَا تَعْقِلُونَ: تو کیا تم سمجھتے نہیں کہ جو شخص سچے دل سے دعوت و تبلیغ اور نصیحت کی مشقت اٹھا رہا ہے اور جسے صرف
 اپنے رب سے اجر لینا ہے، وہ تم سے کوئی اجر تم یا دنیاوی فائدہ کیوں چاہے گا؟

آیت 52 ﴿۵۲﴾ وَيَقُومُوا اسْتِغْفِرُوا رَبَّكُمْ.....: ”السَّمَاءُ“ آسمان کے علاوہ ہر بلند چیز کو بھی ”سَّمَاءُ“ کہہ لیتے ہیں۔
 کیونکہ ”سَّمَاءُ يَسْمُو“ کا معنی بلند ہونا ہے، یہاں ”السَّمَاءُ“ سے مراد بادل یا بارش ہے۔ ”مِدْرَارًا“ یہ ”خَرَّ“ سے مبالغے کا
 صیغہ ہے، جس کا معنی دودھ کا بہنا اور زیادہ ہونا ہے، پھر بہت برسنے والی بارش کے لیے بطور استعارہ استعمال ہونے لگا۔ ”خَرَّتْ
 السَّمَاءُ بِالْمَطَرِ ذُرًّا، وَ تَلَدَّتْ ذُرًّا“ جب آسمان سے بارش بہت برے۔ ان آیات سے اور دوسرے مقامات مثلاً الاحقاف (۲۴)
 سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فخر و غرور اور اپنے رسول ہو جانے کو جھٹلانے کی وجہ سے کافی عرصہ تک ان سے بارش روک لی گئی،
 جس کے نتیجے میں قحط کی وجہ سے ہر طرف دھول اڑنے لگی اور باوجود زبردست جسمانی ذلیل و ذول اور قوت کے سب لوگوں میں
 کمزوری نمایاں ہونے لگی تو ہو جانے نے انہیں سمجھایا کہ سب سے پہلے تو تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو شرک اور اس کی نافرمانی
 کی ہے، اس کی معافی مانگو۔ بہت سے مفسرین نے یہاں ”اسْتِغْفِرُوا رَبَّكُمْ“ سے شرک چھوڑ کر ایک اللہ پر ایمان لانا مراد لیا ہے۔
 ”ثُمَّ تُوبُوا اِلَيْهِ“ پھر اس کی طرف پلٹ آؤ، یعنی آئندہ اس کی ہر نافرمانی ترک کرنے اور ہر حکم بجالانے کا پختہ عزم کرو، تو
 اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تم پر ایسا بادل بھیجے گا جو خوب برسنے والا ہوگا اور تمہاری قوت کی کمی دور کر کے پہلے سے بھی زیادہ
 قوت عطا فرمائے گا۔ معلوم ہوا کہ استغفار اور توبہ سے قحط دور ہوتا ہے اور جسمانی، ذہنی اور مالی ہر قسم کی قوت میں اضافہ ہوتا
 ہے۔ مزید فوائد کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۳) اور سورہ نوح (۱۰-۱۲)۔

﴿۵۲﴾ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ: یعنی میری اطاعت سے منہ نہ موڑو، ورنہ تم مجرم قرار پاؤ گے۔

قَالُوا يَهُودُ مَا جِئْنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿۵۳﴾
 إِنَّ نَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ ۗ قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدْ قَوْمًا بَرِيًّا ۖ إِنَّمَا
 نَشْرِكُونَ ۗ مِنْ دُونِهِ فَكَيْدُؤُنِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُونَ ﴿۵۴﴾

انہوں نے کہا اے ہود! تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لے کر نہیں آیا اور ہم اپنے معبودوں کو تیرے کہنے سے ہرگز
 چھوڑنے والے نہیں اور نہ کسی طرح تجھ پر ایمان لانے والے ہیں ﴿۵۳﴾ ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ ہمارے معبودوں
 میں سے کسی نے تجھے کوئی آفت پہنچا دی ہے۔ اس نے کہا میں تو اللہ کو گواہ بنانا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اس سے
 بری ہوں جو تم شریک بناتے ہو ﴿۵۴﴾ اس کے سوا۔ سو تم سب میرے خلاف تدبیر کر لو، پھر مجھے مہلت نہ دو ﴿۵۵﴾

۳ یہاں تک ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا اور اس مختصر سی تقریر میں تین دفعہ انہیں ”اے میری قوم“ کہہ کر
 پکارا، تاکہ شاید قرابت کے واسطے ہی سے ان کے دلوں تک رسائی حاصل کر سکیں۔ کیونکہ ہود علیہ السلام اسی قبیلے کے فرد ہو کر انہی کی
 بدخواہی نہیں کر سکتے تھے۔

۳۳ ﴿۱﴾ قَالُوا يَهُودُ مَا جِئْنَا بِبَيِّنَةٍ.....: یہ بات یقینی ہے کہ ہر پیغمبر اللہ کی طرف سے ایسے واضح دلائل اور یقینی
 آیات اور نشانیاں لے کر آتا ہے کہ سننے اور دیکھنے والوں کو اس کے نبی ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا، مگر یہ سب کچھ انہی کے
 لیے کارآمد ہوتا ہے جو دل کے کانوں اور آنکھوں سے سنتے اور دیکھتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص یا قوم ضد اور عناد کی وجہ سے یہ
 طے کر لے کہ ہم نے ماننا ہی نہیں تو انہیں لاکھ دلیل سامنے ہونے کے باوجود ایک بھی نظر نہیں آتی اور ان کی حالت وہ ہو جاتی
 ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ (۶، ۷) میں بیان فرمائی ہے۔

۲ یہاں چار جملوں میں ہود علیہ السلام کی قوم نے سخت ترین لفظوں میں انہیں جھٹلا کر ان پر ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا۔
 پہلے جملے میں ان پر نبوت کی ایک بھی دلیل پیش نہ کرنے کا بہتان لگایا۔ دوسرے اور تیسرے جملے میں ”ما“ نافیہ کی تاکید باء
 کے ساتھ کر کے کچھ بھی ہو جائے اپنے معبودوں کو چھوڑنے اور ہود علیہ السلام پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔

۵۴-۵۵ ﴿۱﴾ إِنَّ نَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ: یہ چوتھی بات ہے جو انہوں نے ہود علیہ السلام کو جھٹلانے کے
 ساتھ مزید توہین اور مذاق کے لیے کہی۔ ”عَرَا يَعْرُو“ اور ”اعْتَرَا يَعْتَرِي“ پیش آنا، پہنچنا، ہا، کے ساتھ متعدی ہو کر پہنچانا
 کے معنی میں ہو گیا، یعنی ہمارے کسی ایک آدھ معبود نے تجھے کوئی آفت پہنچا دی ہے جو ایسی بیکی بیکی باتیں کر رہا ہے، اگر سب
 کی مار پڑ جاتی تو معلوم نہیں تیرا کیا بنتا۔ افسوس! یہی کسی بزرگ کی مار کا تصور آج مسلمانوں میں بھی آ گیا ہے، حالانکہ
 مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے سوا کوئی زندہ یا مردہ ہستی کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکتی ہے نہ بنا سکتی ہے۔

۲ ﴿۲﴾ قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ.....: یعنی میرا تمہارے ان بتوں سے اور اللہ کے سوا کسی معبود سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ میں ہر آن

إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ ۚ مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ۗ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۵۶﴾

بے شک میں نے اللہ پر بھروسا کیا، جو میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے۔ کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں مگر وہ اس کی پیشانی کے بالوں کو پکڑے ہوئے ہے۔ بے شک میرا رب سیدھے راستے پر ہے ﴿۵۶﴾
ان کا انکار اور ان سے اظہار براءت کرتا ہوں۔

﴿۵۶﴾ فَكَيْذُوبِي بَيْنَعَاتِهِمْ لَا تَنْظُرُون: یعنی یہ جو تم کہتے ہو کہ تم پر ہمارے کسی معبود کی مار پڑ گئی ہے تو ایک آدھ کے بجائے اگر تم اور تمہارے یہ سب معبود مل کر بھی میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو بگاڑ لیں اور مجھے ذرا مہلت نہ دیں، ورنہ جان لو کہ تم بھی جھوٹے اور تمہارے یہ معبود بھی غلط۔

ہود علیہ السلام کا یہ کلام ان کی قوم کی دوسری فضول باتوں کے علاوہ اس بات کا بھی جواب ہے کہ تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل، یعنی معجزہ نہیں لایا۔ معجزہ اور نشانی کیا چیز ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر معجزہ کی روح وہ پہنچتا ہوتا ہے جو صاحب معجزہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ مثلاً صالح علیہ السلام کی اونٹنی، ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ ان کے لیے آگ کا گلزار بن جانا، مگر یہ معجزہ بھی کیا کم ہے کہ اکیلا شخص پوری قوم کو لکار رہا ہے کہ میں تم سب کو اور تمہارے خداؤں کو کچھ نہیں سمجھتا۔ تم سب مل کر میرا جو بگاڑ سکتے ہو بگاڑ لو اور اس قوم کو لکار رہا ہے جو نہایت سخت گیر اور رحم سے نا آشنا تھے، جن کے بارے میں آتا ہے: ﴿وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ﴾ [الشعراء: ۱۲۰] ”اور جب تم پکڑتے ہو تو بہت بے رحم ہو کر پکڑتے ہو۔“ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اتنی قوت والے تھے کہ ان کے بعد ویسی قوم پیدا ہی نہیں کی گئی، فرمایا: ﴿الَّذِينَ لَمْ يَخْلُقْ وَمِثْلَهُمَ فِي الْآلَاءِ﴾ [الفجر: ۸] ”وہ کہ ان جیسا کوئی شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا۔“ جب طوفان سے ہلاک ہوئے تو: ﴿كَأَنَّهُمْ أَحْجَارٌ تَنْخُلُ خَلْوِيَّةٌ﴾ [الحاقة: ۷] ”گو یا وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے تھے۔“ صرف ایک شخص پوری قوم کو لکار رہا ہے، جو اس کے خون کی پیاسی ہے، جس کے معبودوں کو اور پوری قوم کو اس نے جاہل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ سب مل کر میرے خلاف جو کچھ کر سکتے ہو کر لو اور پوری قوم باتیں تو بناتی ہے، مگر اس کا کچھ بگاڑ نہ سکی، یہ کھلا معجزہ نہیں تو کیا ہے؟

آیت 56 ﴿۱﴾ إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ: یہ جرات ہود علیہ السلام میں کیسے پیدا ہوئی؟ وہ خود فرماتے ہیں کہ میرا بھروسا اللہ پر ہے، جو میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے۔

﴿۲﴾ مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا: ”ناصیۃ“ پیشانی کے بالوں کو کہتے ہیں، اگر کسی کو یہاں سے اچھی طرح پکڑ لیا جائے تو وہ تل نہیں سکتا، بلکہ پوری طرح پکڑنے والے کی گرفت میں ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَنْ نَسْفَعَهَا بِالنَّاصِيَةِ﴾ [العلق: ۱۵] ”تو ہم ضرور اسے پیشانی کے بالوں کے ساتھ گھسیٹیں گے۔“ مجرموں کے متعلق فرمایا کہ وہ اپنی علامت کے ساتھ پہچانے جائیں گے: ﴿فَيُؤَخِّدُهُمْ بِالنَّوْاصِيَةِ وَالْأَقْدَامِ﴾ [الرحمن: ۴۱] ”پھر (ان کو) پیشانی کے بالوں اور قدموں

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ
شَيْئًا ۗ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ﴿۵۷﴾

پھر اگر تم پھر جاؤ تو بلاشبہ میں تمہیں وہ پیغام پہنچا چکا جسے دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے۔ اور میرا رب تمہارے سوا کسی اور قوم کو تمہاری جگہ لے آئے گا اور تم اس کا کچھ نقصان نہ کرو گے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر اچھی طرح نگہبان ہے ﴿۵۷﴾

سے پکڑا جائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرعی عقیدے اور شرعی احکام میں تمہیں اختیار دیا ہے کہ مانو گے تو انعام پاؤ گے، نہ مانو گے تو مارے جاؤ گے۔ اس پر تم اڑ گئے اور اپنے آپ کو ہر طرح مرضی کا مالک سمجھ لیا۔ سب سے پہلے تو شرعی احکام پر عمل میں اختیار دینے والے مالک کی غداری کر کے اس کی مخلوق کو اس کے شریک بنا بیٹھے، پھر اس کے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی، اس کے رسول کو جھٹلایا۔ یہ نہ سوچا کہ تھوڑا سا اختیار رکھنے کے باوجود صرف تم ہی نہیں بلکہ پوری مخلوق مکمل طور پر اس کی گرفت میں ہے اور اس کی پیشانی کے بال اس نے پکڑ رکھے ہیں، وہ اس کی مرضی کے بغیر ہل بھی نہیں سکتے۔ اب تم جس طرح شرعی احکام میں اپنا اختیار غلط استعمال کرتے ہوئے اڑ کر کہتے ہو، ہم اللہ کو نہیں مانتے، ہمارا داتا فلاں اور دنگلیر فلاں ہے، ہم رسول کو نہیں مانتے، ہمارا سائیں مرشد فلاں ہے، اگر واقعی تم ایسے ہی آزاد ہو تو ان احکام پر بھی اڑ کر دکھاؤ جن میں وہ ”سُكُنْ“ کہتا ہے تو وہ فوراً واقع ہو جاتے ہیں۔ جب بیمار ہوتے ہو تو یہ کہہ کر دکھاؤ کہ کوئی ہمیں بیمار نہیں کر سکتا، کوئی ہمیں بوڑھا نہیں کر سکتا، کوئی ہمارے بال سفید نہیں کر سکتا۔ اگر تم اور تمہارے خدا ایسے ہی زبردست ہیں تو اللہ کے حکم سے دل کی حرکت رکنے پر اسے چالو کر کے دکھاؤ۔ اسی طرح موت کے وقت بھی اڑ جاؤ کہ جاؤ ہم نہیں مرتے۔ یا تمہارے شریک کہیں ہم اپنے بندے کو مرنے نہیں دیں گے۔ معلوم ہوا کہ تم اس تھوڑے سے اختیار کے باوجود مکمل طور پر میرے رب کے مکمل قبضے میں ہو، پھر جب خود اس نے مجھے بھیجا ہے اور وہ میرا پشت پناہ ہے اور اسی پر میرا بھروسا ہے، تو مجھے تمہارا کیا ڈر ہے، جاؤ جو مرضی کرو۔

﴿۵۷﴾ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ: اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ ”جو سیدھی راہ پر چلے وہ اس سے ملے۔“ (موضح) سورہ نحل میں فرمایا: ﴿وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَبَيْنَهَا جَابِرٌ﴾ [النحل: ۹] ”اور سیدھا راستہ اللہ ہی پر (جا پہنچتا ہے) اور ان میں سے کچھ (راستے) نيزھے ہیں۔“ دوسرا یہ کہ اگرچہ ہر جاغدار پر اس کا قبضہ ہے اور وہ اس کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہے کر سکتا ہے، مگر وہ صراط مستقیم پر ہے، کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ (ابن کثیر)

﴿۵۷﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ”تَوَلَّوْا“ اصل میں ”تَوَلَّوْا“ تھا، لغت عرب میں کسی فعل کے شروع میں اگر دو ”تاء“ ہوں تو عموماً ایک کو حذف کر دیتے ہیں۔ یعنی رسولوں کے بھیجے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ مجھ تک اللہ کا پیغام نہیں پہنچا، اس لیے میں معذور ہوں، اب اگر تم نہ مانو تو بے شک نہ مانو، مگر میرا فریضہ پورا ہو گیا اور تمہارا عذر ختم ہو گیا۔ اب اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ کہ ”وہ پیغام پہنچائے بغیر عذاب نہیں دیتا“ تمہارے لیے بہانہ نہیں بن سکتا۔

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا ۖ وَنَجَّيْنَاهُمْ مِّنْ عَذَابِ

عَلِيْظٍ ۝۵۸

اور جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ہمراہ ایمان لائے تھے، اپنی طرف سے عظیم رحمت کے ساتھ نجات دی اور انھیں ایک بہت سخت عذاب سے بچالیا ۝۵۸

تمہارے نہ ماننے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ تمہیں ختم کر کے تمہاری جگہ اور لوگ لے آئے گا اور تم اس کا کچھ نقصان نہ کر سکو گے۔ آگے اس کی مرضی ہے کہ تمہاری جگہ اچھے لوگ لائے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِنْ تَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم﴾ [محمد: ۳۸] ”اور اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ تمہارے سوا اور لوگ لے آئے گا، پھر وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔“ اور یہ بھی اس کی مرضی ہے کہ چاہے تو مزید برے لوگ لے آئے، جیسا کہ بنی اسرائیل نے جب ارض مقدس میں فساد شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں سزا دینے کے لیے ان سے بھی برے بندے ان پر مسلط کر دیے۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۷۵)۔

② اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ: یعنی جس طرح بعض جاہل فلسفی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کیا اور اس کے قوانین بنا دیے، اب وہ ان قوانین کے مطابق خود بخود چل رہی ہے، یہ بات بالکل غلط ہے۔ میرے رب نے کائنات کو پیدا کیا، پھر ”رب“ کا معنی ہی یہ ہے کہ تربیت اور پرورش بھی وہی کر رہا ہے۔ پھر حفیظ بھی وہی ہے۔ ہر چیز اس کی نگرانی میں چل رہی ہے۔ اس سے ان مشرکوں اور جاہل صوفیوں کا بھی رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کر کے اس کا انتظام قلوب، غوثوں اور اس قسم کے خود ساختہ ناموں والے ولیوں اور بزرگوں کے حوالے کر دیا ہے، جو اس کو چلا رہے ہیں اور اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اب فارغ ہے، اختیار اس نے اپنے پیاروں کو دے دیے ہیں۔ اللہ اکبر! پہلی امتوں کے مشرکوں اور ہماری امت کے مشرکوں میں کس قدر مشابہت اور یک رنگی پائی جاتی ہے۔

آیت 58 وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا ہمارے حکم سے مراد عذاب کا حکم ہے، اس کی تفصیل سورہ احقاف، سورہ حاقہ، سورہ قمر اور دوسری سورتوں میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر شدید ہوا کی تیز و تند اور سرکش آندھی بھیجی، جو ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلی اور اس نے کفار میں سے ایک بھی تنفس کو باقی نہ چھوڑا۔ دیکھیے سورہ حاقہ (۸۳۶) یہ تو دنیا کا عذاب تھا، آخرت میں ان کے لیے اس سے بھی سخت عذاب ”عَذَابٌ عَلِيْظٌ“ تیار ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ہود علیہ السلام اور ان کے ہمراہ ایمان لانے والوں کو ان دونوں عذابوں سے بچالیا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی خوف ناک آندھی جب چلتی ہے تو وہ مومن و کافر ہر ایک پر گزرتی ہے تو ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھی کس طرح بچ گئے؟ اسی طرح ثمود پر آنے والی صیحر (جینج) سے کافروں کے کان اور دل تو پھٹ گئے مگر صالح علیہ السلام اور ایمان والوں کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ ہم نے انھیں اپنی عظیم رحمت کے ساتھ بچالیا۔ ”بِرَحْمَةٍ“

وَتِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ جَعَلُوا بآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿٥٩﴾
وَأَتَّبَعُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا إِنْ عَادَا كَفَرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا بُعْدًا

لَعَادِ قَوْمِ هُودٍ ﴿٦٠﴾

اور یہ عاد تھے جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر زبردست جاہر، سخت عناد والے کے حکم کی پیروی کی ﴿٥٩﴾ اور ان کے پیچھے اس دنیا میں لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ سن لو! بے شک عاد نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سن لو! عاد کے لیے ہلاکت ہے، جو ہود کی قوم تھی ﴿٦٠﴾

میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، پھر جو رحمت اللہ کی طرف سے ہو اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا ہے۔ وہ آندھی اور جحج اللہ کے امر سے کفار پر آئی تھیں، ان کے ساتھ رہنے والے مسلمانوں پر اثر انداز ہونے کا انھیں حکم ہی نہ تھا۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت کے واسطے میں محفوظ تھے۔ ابابیل پرندوں کی کنگریوں سے ابرہہ اور اس کا لشکر کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو گیا، مگر مکہ والوں کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ دراصل یہ حکم اس قادر مطلق کا تھا، اگر کسی دنیا والے کا ہوتا تو کافر و مومن دونوں پس جاتے، متنبی نے کہا ہے۔

تَسْوَدُ الشَّمْسُ مِمَّا بِيضَ أَوْجُهِنَا وَمَا تَسْوَدُ بِيضَ الْعَيْنِ وَاللِّمَمِ
وَكَانَ خَالَهُمَا فِي الْحُكْمِ وَاحِدَةً لَوْ اخْتَكَمْنَا مِنَ الدُّنْيَا إِلَى حُكْمِ

”دھوپ ہمارے چہروں کی سفیدی کو سیاہ کر دیتی ہے، جب کہ آنکھ کی سفیدی اور بالوں کی سفیدی کو سیاہ نہیں کرتی۔ حالانکہ اگر ہم دنیا کے کسی منصف کے پاس جائیں تو فیصلے میں دونوں کا حال ایک ہی ہے۔“

بیماری کے بعد شفا بھی رحمت ہے مگر بیماری آنے ہی نہ دینا یہ اس سے بھی عظیم رحمت ہے۔

آیت 59 ﴿٥٩﴾ وَتِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ جَعَلُوا بآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ اور یہ تھے عاد، اس سے مراد ان کے علاقے بھی ہو سکتے ہیں اور وہ قوم بھی جن کا واقعہ بیان ہوا۔

﴿٥٩﴾ جَعَلُوا بآيَاتِ رَبِّهِمْ: ”جَعَلُوا“ کا معنی ہے دلیل سے ثابت شدہ بات کا انکار کر دینا۔ آیات سے مراد کائنات میں رب تعالیٰ کی توحید کی بے شمار نشانیاں، ہود علیہ السلام پر نازل ہونے والی آیات اور ان کا تنہا پوری قوم کے سامنے بے خوف ہو کر ڈٹ جانا وغیرہ ہیں۔ غرض اس بد نصیب قوم نے واضح نشانات، معجزات اور آیات سمجھ میں آ جانے کے باوجود انھیں ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

﴿٥٩﴾ عَصَوْا رُسُلَهُ: انھوں نے اگرچہ ہود علیہ السلام ہی کی نافرمانی کی، لیکن چونکہ ایک پیغمبر کی نافرمانی تمام پیغمبروں کی نافرمانی ہے، اس لیے فرمایا: ”انھوں نے اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی۔“ (شوکانی)

﴿٥٩﴾ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ: ”عَنِيدٍ“ سخت عناد والا، ہر وہ شخص جو حق قبول نہ کرے اور اس کے ساتھ شدت کے ساتھ اس کی مخالفت بھی کرے، مراد قوم کے سردار ہیں۔

آیت 60 ﴿٦٠﴾ وَأَتَّبَعُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: لعنت کا معنی ناراض ہو کر دفع دور کر دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت سے مراد آخرت میں عذاب اور دنیا میں اپنی رحمت اور توفیق سے محروم کر دینا ہے اور انسان کی طرف سے لعنت کا

وَإِلَىٰ شَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِن إِلَهِ غَيْرُهُ هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوا لَهُ ثُمَّ تَوْبُوا إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴿٦١﴾

اور شموذ کی طرف ان کے بھائی صالح کو (بھیجا)، اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور تمہیں اس میں آباد کیا، سو اس سے بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب ہے، قبول کرنے والا ہے ﴿٦١﴾

مطلب اس کے لیے یہ بددعا کرنا ہے۔ (راغب) یعنی دنیا میں آنے والا ہر پیغمبر اور مومن ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کرتا رہے گا اور آخرت میں وہ سب کے سامنے رسوا اور جملائے عذاب ہوں گے۔

﴿٦٢﴾ الْآلِ إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ : ”آل“ کے ساتھ خبردار اس لیے کیا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ ان بے چاروں پر زیادتی ہوئی۔ فرمایا، سن لو! یہ لوگ تمام جرائم سے بڑے جرم رب تعالیٰ کے کفر کے مرتکب تھے۔ پھر دوبارہ فرمایا، سن لو! عاد کے لیے ہر قسم کی خیر اور اللہ کی رحمت سے دوری ہے، جو ہود علیہ السلام کی قوم تھے۔ یاد رہے کہ ”کفر“ کے بعد عام طور پر باء آتی ہے، مثلاً ”كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ“ جس کا مطلب رب کی نعمتوں کی ناشکری اور انکار ہوتا ہے۔ باء کے بغیر ”كَفَرُوا رَبَّهُمْ“ کا مطلب یہ ہے کہ قوم عاد نے سرے ہی سے اپنے رب کا انکار کر دیا، جیسے دہریے رب تعالیٰ کو نہیں مانتے۔ ”كَفَرُوا رَبَّهُمْ“ ”كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ“ سے بھی بڑا جرم ہے۔ بعض مفسرین کے مطابق ”كَفَرُوا رَبَّهُمْ“ میں یہ بھی ممکن ہے کہ ”كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ“ میں سے تخفیف کے لیے باء حذف کر دی گئی ہو اور دونوں کا معنی ایک ہی ہو۔

آیت 61 ﴿٦١﴾ وَإِلَىٰ شَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا : قوم شموذ مقام حجر (حاء کے کسرہ کے ساتھ) میں رہتے تھے۔ یہ جگہ حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ تک پھیلی ہوئی ہے۔ آج کل یہ علاقہ مدینہ اور تبوک کے درمیان ہے، جہاں ابھی تک ان لوگوں کے پہاڑوں کے اندر تراش کر بنائے ہوئے مکانات، جن میں وہ رہتے تھے، موجود ہیں اور یہ علاقہ مدائن صالح کہلاتا ہے۔ صالح علیہ السلام کا قبیلہ عرب قبیلہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ تبوک (شام) کی طرف جاتے ہوئے یہاں سے گزرے تھے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ (وادی) حجر میں تھے تو فرمایا: ﴿لَا تَدْخُلُوا عَلَيَّ هَؤُلَاءِ الْقَوْمِ الْمُعَذَّبِينَ أَصْحَابِ الْحِجْرِ إِلَّا أَنْ تَكُونُوا بَأْسِكِينَ ، فَإِنْ لَّمْ تَكُونُوا بَأْسِكِينَ فَلَا تَدْخُلُوا عَلَيْهِمْ أَنْ يُصِيبَكُمْ مَا أَصَابَهُمْ﴾ ”ان عذاب دیے ہوئے لوگوں یعنی اصحاب حجر پر مت داخل ہو، مگر ایسی حالت میں کہ تم رونے والے ہو، اگر تمہیں رونانہ آئے تو ان پر داخل نہ ہونا، کہیں تمہیں بھی اس جیسا عذاب نہ آ پینے جو ان کو پہنچا تھا۔“ | مسند احمد : ۵۸۶۲، ح : ۵۲۲۴، و صحیحہ شعب الاریطوط و الالبانی | قوم شموذ کا قصہ سورہ اعراف، شعراء، نحل اور قمر وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔ ”اَخَاهُمْ صَالِحًا“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسی قبیلے کے فرد تھے، اس لیے ان کے خیر خواہ، ان کے مزاجوں کو سمجھنے والے اور ان میں مدت تک رہنے والے تھے۔

﴿٦٢﴾ قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ : ان کی دعوت بھی وہی دعوت توحید تھی جو تمام انبیاء کی دعوت تھی۔

قَالُوا يَصْلِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا أَتَنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّا لَفِي شَكِّ
بَيْنَا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴿۱۶﴾

انہوں نے کہا اے صالح! یقیناً تو ہم میں وہ تھا جس پر اس سے پہلے امیدیں رکھی گئی تھیں، کیا تو ہمیں منع کرتا ہے کہ ہم ان کی عبادت کریں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں اور بے شک ہم اس بات کے بارے میں جس کی طرف تو ہمیں دعوت دیتا ہے، یقیناً ایک بے چہین رکھنے والے شک میں ہیں ﴿۱۶﴾

﴿۱۶﴾ هُوَ أَتَىٰكُمْ مِنَ الْأَرْضِ.....: "إِنشَاءً" کا معنی نئی چیز بنانا ہے۔ "اسْتَعْمَرَكُمْ" "عَمَرَ يَعْمُرُ" کسی جگہ کو آباد کرنا، سورہ روم میں فرمایا: ﴿وَعَمَرُوا هَذَا أَكْثَرًا مِنَّا عَمَرُوا هَذَا﴾ [الروم: ۹] "اور انہوں نے اسے آباد کیا اس سے زیادہ جو انہوں نے اسے آباد کیا۔" "أَعْمَرَ يُعْمِرُ" باب افعال کسی شخص کو کسی جگہ میں آباد کرنا۔ "اسْتَعْمَرَ" میں حروف زائد ہیں، یعنی کسی کو کسی جگہ میں خوب آباد کرنا۔ صالح علیہ السلام ان الفاظ کے ساتھ انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور صرف اسی کے معبود ہونے کی دلیل دے رہے ہیں کہ اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا، زمین کو بھی اسی نے بنایا، تمہاری ضرورت کی ہر چیز زمین سے اسی نے پیدا کی، اپنی زمین پر اس نے تمہیں خوب آباد کیا، پہاڑوں کو تراشنے کی صلاحیت اور عقل عطا فرمائی، نہایت ترقی یافتہ زراعت اور اس کے اسباب، زرخیز زمین اور چشمے عطا فرمائے۔ دیکھیے سورہ شعراء (۱۳۱ تا ۱۵۰) اب تک اس کی جو ناشکری اور اس کے ساتھ شرک کر چکے ہو اس کی معافی مانگ کر اس پر ایمان لے آؤ اور آئندہ کے لیے اس کے ساتھ کفر و شرک سے توبہ کرو۔ ساتھ ہی ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دروازہ کھلا ہونے کی امید دلانے کے لیے رب تعالیٰ کی دو صفات بیان کیں کہ وہ "قَدِيرٌ" بھی ہے اور "مُجِيبٌ" بھی۔ کوئی اسے پکارے تو اسے کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔ آہستہ پکارے یا بلند آواز سے، اکیلا پکارے یا مجلس میں، میرا رب قریب بھی ہے اور قبول کرنے والا بھی۔ جب اس کے سوا یہ اوصاف کسی میں بھی نہیں تو کسی اور کی عبادت کیوں؟

بیت 62 ﴿۱۶﴾ قَالُوا يَصْلِحُ قَدْ كُنْتَ.....: یعنی ہم تو تمہاری ذہانت اور عقل مندی سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کیے بیٹھے تھے۔ کیوں نہ کرتے، نبی نبوت ملنے سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کی زیر نگرانی نہایت امین، صادق، عقیف، باوقار، حلیم اور تمام اوصاف حسنہ سے متصف ہوتا ہے۔ مگر جو ہی اس شخص نے جس کے اوصاف حسنہ کے نزدیک مانے ہوئے تھے، ان کی خواہش نفس اور جاہلی عقائد و رواج کے خلاف بات کی تو ان کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا اور وہی دانا شخص ان کے نزدیک عقل و فکر سے خالی ٹھہرا اور ان کے پاس کفر و شرک کے درست ہونے کی اور صالح علیہ السلام سے امیدیں ٹوٹنے کی دلیل کیا تھی؟ صرف یہ کہ ہمارے آباؤ اجداد جن کی عبادت کرتے تھے، یہ ان کی عبادت سے منع کرتا ہے۔ تمام گمراہ اقوام کی دلیل یہی تقلید رہی ہے، کیونکہ یہ بلا نہ کسی کی بات سننے دیتی ہے، خواہ کتنی صحیح ہو اور نہ خود سوچنے سمجھنے کی طرف آنے دیتی ہے۔ دیکھیے سورہ ملک (۱۰)۔

﴿۱۷﴾ وَإِنَّا لَفِي شَكِّ بَيْنَا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ: "شک" ذہن کی وہ کیفیت ہے جس میں آدمی دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز

قَالَ يَقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ بَيْتَةِٰ مِنْ رَبِّي وَأَنْتُمْ مِنْهُ رَحِمَةً فَمَنْ يَتَصَّرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُمْ ۗ فَمَا تَزِيدُونَ نَفْسِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ﴿۶۳﴾ وَيَقَوْمِ هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ فذُرُوهَا تَأْكُلُ

اس نے کہا اے میری قوم! کیا تم نے دیکھا اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی جناب سے عظیم رحمت عطا کی ہو تو کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں میری مدد کرے گا، اگر میں اس کی نافرمانی کروں، پھر خسارہ پہنچانے کے سوا تم مجھے کیا زیادہ دو گے؟ ﴿۶۳﴾ اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی ہے، تمہارے

کو ترجیح نہ دے سکے۔ ”مُؤْنِسٌ“ ”أَرَأَبٌ يُرِيْبُ إِزَابَةَ“ (رَبِّبٌ سے باب افعال) بے چین کر دینا، بے قرار رکھنا۔ ”مُؤْنِسٌ“ بے چین رکھنے والا۔ یہاں انھوں نے اپنی حقیقی حالت بیان کی ہے۔ صالح ﷺ کی دلیل اور حجت پر یعنی دعوت نے ان کے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی تھی اور اگرچہ انھوں نے اسے نہیں مانا مگر اس دعوت نے انہیں اپنے بارے میں ایک بے چین رکھنے والے شک میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر تقلید آباء کی شامت نہ ہوتی تو وہ لوگ چند لمحوں میں ہر طرح کے شک اور بے چینی سے نکل کر ایمان و یقین کی ٹھنڈک اور اطمینان سے سرفراز ہو چکے ہوتے۔ مگر دیکھیے کتنی بڑی حماقت تھی کہ شرک پر نہ تو مطمئن تھے اور نہ ان کے پاس اس کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل ہی تھی، مگر پھر بھی آبائی تقلید کی وجہ سے شرک کو چھوڑ کر توحید کی راہ اختیار کرنے کو تیار نہ تھے۔

آیت 63 ① قَالَ يَقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُمْ : اس کی تفسیر ان آیات سے پہلے ہو دینا، کے قصے میں دیکھیے۔
”مِنْهُ رَحِمَةً“ سے مراد نبوت ہے۔

② إِنْ عَصَيْتُمْ: یعنی اگر میں تم تک اس کا پیغام پہنچانے میں کوتاہی کروں تو اس کی گرفت سے مجھے کون چھڑائے گا؟
③ غَيْرَ تَخْسِيرٍ: یعنی اگر میں توحید کی راہ چھوڑ کر شرک کی راہ اختیار کر لوں تو یہی نہیں کہ تم مجھے اللہ کی پکڑ سے نہ بچا سکو گے، بلکہ تمہاری وجہ سے میرا جرم اور بھی بڑھ جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس بات پر مجھے دوہری سزا دے گا کہ میں نے تمہارے کہنے پر جان بوجھ کر شرک کا راستہ اختیار کیا۔ ”تَخْسِرٌ يَخْسِرُ خُسْرًا“ (ع) خسارہ اٹھانا اور ”تَخْسِرٌ يُخْسِرُ تَخْسِيرًا“ (تفصیل) خسارہ پہنچانا۔

آیت 64-65 ① وَيَقَوْمِ هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ: اس اونٹنی کی نسبت اللہ کی طرف اس کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، ورنہ ہر اونٹنی اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔ قرآن مجید میں اس کے اوصاف یہ آئے ہیں کہ قوم شمود کے معجزہ طلب کرنے پر صالح ﷺ کو یہ اونٹنی ملی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے ان کے کنوئیں کا پانی پینے کی باری مقرر کی گئی کہ ایک دن صرف وہ پیے گی اور ایک دن دوسرے تمام لوگوں کے جانور پانی پئیں گے۔ اپنی باری کے دن لوگ جتنا پانی چاہیں نکال کر رکھ لیں، مگر اونٹنی کی باری کے دن صرف وہی پیے گی۔ دیکھیے سورہ شعراء (۱۵۳-۱۵۶) وہ جہاں چاہے چرے، کوئی شخص اسے اپنے کھیت سے یا کسی بھی جگہ سے چرنے سے نہیں روکے گا اور یہ کہ اگر کسی نے اسے کوئی نقصان پہنچایا تو انھیں قریب ہی عذاب عظیم آ پکڑے

فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمْسُوها بِسُوءٍ فَيَأْخُذْكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ ﴿۱۷﴾ فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتُّعُوا
فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ذَلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْدُوبٍ ﴿۱۸﴾

لئے عظیم نشانی، پس اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ، ورنہ تمہیں ایک قریب عذاب پکڑ لے گا ﴿۱۷﴾ تو انھوں نے اس کی ٹانگیں کاٹ دیں، تو اس نے کہا اپنے گھروں میں تین دن خوب فائدہ اٹھاؤ، یہ وعدہ ہے جس میں کوئی جھوٹ نہیں بولا گیا ﴿۱۸﴾

گا۔ (آیت زرتفسیر) یہاں ”عَذَابٌ قَرِيبٌ“ ہے جبکہ سورہ شعراء (۱۵۶) میں ”عَذَابٌ يَوْمٍ عَظِيمٍ“ ہے۔

﴿۱۷﴾ لَكُمُ آيَةٌ: اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اونٹنی ایک معجزہ تھی۔ ایک پورا دن اس کے پینے کے لیے باری مقرر کرنا بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ عام اونٹنی نہ تھی، مگر وہ کیسے وجود میں آئی؟ قرآن وحدیث میں اس کا ذکر مجھے نہیں ملا۔ بہت سی تفاسیر کے مطالعے کے بعد کم از کم میری تسلی تو شیخ عبدالرحمن بن ناصر بن سعدي رحمہ اللہ کی تفسیر ”تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان“ کے کلام سے ہوئی، جو انھوں نے سورہ اعراف میں قوم ثمود کی اونٹنی کے متعلق فرمایا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ”جان لو کہ اکثر مفسرین یہ قصہ ذکر کرتے ہیں کہ وہ اونٹنی ایک نہایت سخت اور چکنی چٹان سے نکلی، جس طرح کی اونٹنی نکالنے کا انھوں نے صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ حاملہ ہو اور وہ ان کی آنکھوں کے سامنے حاملہ اونٹنی کی صورت میں نکلی۔ اسے حاملہ اونٹنیوں کی طرح ولادت کا درد ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا ایک بچہ بھی پیدا ہوا۔ جس وقت انھوں نے اونٹنی کو کاٹا تو وہ پہاڑ پر چڑھ گیا اور تین دفعہ اونٹ کی طرح بلبلایا، چنانچہ پہاڑ پھٹا اور وہ اس میں غائب ہو گیا اور یہ کہ صالح علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تمہیں جو تین دن ملے ہیں ان میں سے پہلے دن تمہارے چہرے زرد، دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن سیاہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ انھوں نے فرمایا تھا۔“ شیخ سعدي رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہ تمام باتیں اسرائیلیات سے ہیں، جنہیں اللہ کی کتاب کی تفسیر میں نقل کرنا مناسب نہیں اور قرآن مجید میں کوئی ایسی چیز نہیں جو ان باتوں میں سے کسی ایک پر کسی طرح دلالت کرتی ہو، بلکہ اگر یہ باتیں صحیح ہوتیں تو اللہ تعالیٰ انھیں ضرور ذکر فرماتا، کیونکہ ان میں ایسی عجیب باتیں، عبرتیں اور نشانیاں ہیں جن کا ذکر ساتھ ہی ہونا تھا۔ اب اگر یہ ایسے لوگوں کی طرف سے آئیں جن پر اعتماد ہو ہی نہیں سکتا تو کیسے قبول ہو سکتی ہیں؟ بلکہ ان میں سے بعض تو قرآن مجید کی تصریحات ہی سے درست معلوم نہیں ہوتی ہیں، مثلاً صالح علیہ السلام نے اونٹنی کی ٹانگیں کاٹنے پر ان سے فرمایا: ﴿تَمَتُّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ﴾ تمتع خوب فائدہ اور لذت اٹھانے کو کہتے ہیں۔ وہ لوگ صالح علیہ السلام کو اور عذاب آنے کو جھٹلا رہے تھے بلکہ بار بار عذاب لانے کا مطالبہ کر رہے تھے، اگر ان کے چہرے ہی زرد، سرخ اور سیاہ ہو گئے ہوں تو انھیں تین دن خوب فائدہ اور لذت اٹھانے کی مہلت کیا خاک ملی۔ یہ قرآن کے صاف خلاف نہیں تو کیا ہے؟ ہدایت کے لیے تو قرآن کافی ہے، ہاں، اگر کوئی بات رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو، تو وہ کتاب اللہ سے نہیں ٹکرائے گی، وہ سر آنکھوں پر اور اسے ماننے کا قرآن نے حکم دیا ہے: ﴿وَمَا أَلْسِنَةُ الرِّسُولِ فُحْشٌ وَلَا وَمَا لَهُمْ عَنْهُ قَائِلَةٌ﴾ [الحشر: ۷] ”اور رسول تمہیں جو کچھ

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا لَنَجِّنَا طِيلًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَمِن خِزْيِ يَوْمِئِذٍ
 إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿۳۱﴾ وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْعَةَ فَصَبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ
 جُثَيْنًا ﴿۳۲﴾ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۚ آلَا إِنَّ شِمُودَ كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بَعْدَ لَثُودٍ ﴿۳۳﴾
 وَ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى قَالُوا سَلَامًا ۚ قَالَ سَلَامٌ فَمَا لَبِثَ أَن جَاءَ

پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی طرف سے عظیم
 رحمت کے ساتھ بچالیا اور اس دن کی رسوائی سے بھی۔ بے شک تیرا رب ہی بے حد قوت والا، سب پر غالب ہے ﴿۳۱﴾
 اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انھیں چیخ نے پکڑ لیا، تو انھوں نے اپنے گھروں میں اس حال میں صبح کی کہ گرے پڑے
 تھے ﴿۳۲﴾ جیسے وہ ان میں رہے ہی نہ تھے۔ سن لو ابے شک شمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سن لو انمود کے لیے ہلاکت ہے ﴿۳۳﴾
 اور بلاشبہ یقیناً ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے، انھوں نے سلام کہا، اس نے کہا سلام ہو،
 دے تو وہ لے لو اور جس سے تمہیں روک دے تو رک جاؤ۔ اور پہلے گزر چکا ہے کہ قرآن کی تفسیر اسرائیلیات سے جائز نہیں،
 خواہ ان سے وہ بات نقل کرنا جائز بھی ہو، جس کا جھوٹا ہونا یقینی نہ ہو، مگر اللہ تعالیٰ کی کتاب کے معانی یقینی ہیں، ان کی تفسیر
 ایسی باتوں سے کرنا جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تُصَدِّقُوا أَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تَكْتُمُوا لَهُمْ» (بخاری،
 التفسیر، باب: «مَنْ حَقَّقُوا أَمْرًا بِاللَّهِ...»: ۱۶۸۵) ”نہ انھیں سچا سمجھا جائے نہ جھوٹا۔“ ایسا کام ہے جس سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔“

تمتع کے بارے میں ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

تَمَتَّعَ مِنْ شَمِيمٍ عَرَارٍ نَحِيدٍ فَمَا بَعْدَ الْعَشِيَّةِ مِنْ عَرَارٍ

”نجد کی ”عرار“ نامی بوٹی کی خوشبو سے خوب فائدہ اٹھا لو، کیونکہ آج سہ پہر کے بعد پھر ”عرار“ نہیں ملے گی۔“

(کیونکہ شاعر وہاں سے کوچ کر رہا تھا)

آیت 66: 68 ان آیات کی تفسیر سورہ اعراف کی آیات (۷۹۳-۷۷۷) میں اور سورہ ہود کے اس سے پچھلے رکوٰع کے آخر
 میں ملاحظہ فرمائیں۔ ”كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا“ ”غَنِيَ يَغْنَى“ (ع) ”فِي مَكَانٍ كَذَا“ جب کوئی شخص لمبی مدت کسی جگہ
 میں یوں رہے کہ وہ اس کے سوا کسی بھی جگہ سے غنی ہو۔ ”مَغْنَى“ مصدر بھی ہے، مکان بھی، یعنی رہنا اور رہنے کی جگہ۔
 (مفردات راغب)

آیت 69 ۱) وَ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى : ”رُسُلُنَا“ ہمارے بھیجے ہوئے سے مراد فرشتے ہیں جو انسانی
 شکل میں ابراہیم علیہ السلام کے پاس بیٹے اور پوتے اسحاق اور یعقوب کی خوش خبری لے کر آئے تھے۔ ان کی تعداد بعض نے تین
 بیان کی، جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل، بعض نے نو (۹) اور بعض نے تیرہ (۱۳)، مگر قرآن و سنت سے ان کی تعداد کا ذکر ہمیں

بِعَجَلٍ حَيْنِيذٍ ﴿٥٠﴾

پھر دیر نہیں کی کہ ایک بھنا ہوا کچھڑا لے آیا ﴿۵۰﴾

نہیں ملا۔ سورہ حجر (۳۹، ۵۰) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے غفور و رحیم ہونے اور اپنے عذاب کے عذاب الیم ہونے کی خبر دینے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد ابراہیم اور لوط علیہم السلام کے یہ واقعات ذکر فرمائے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کی ایک ہی جماعت ایک کے لیے خوش خبری اور دوسری قوم کے لیے عذاب لے کر آئی تھی۔ چنانچہ ان کے آنے سے اللہ تعالیٰ کی دونوں صفات کا اظہار ہوا تھا۔ یہاں ان فرشتوں کے آنے کو ابراہیم علیہ السلام کے لیے خوش خبری لانے والے فرمایا ہے، کیونکہ اگر ابراہیم علیہ السلام کے لیے بیٹے اور پوتے کی خبر خوش خبری ہے تو لوط علیہ السلام کی ملعون قوم کی بربادی کی خبر بھی ابراہیم اور لوط علیہم السلام دونوں کے لیے خوش خبری ہے، البتہ قوم لوط کے لیے بری خبر ہے۔

﴿۲﴾ قَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ : پہلا ”سَلَامًا“ منصوب ہے، یہ جملہ فعلیہ ہے: ”نُسَلِّمُ سَلَامًا“ ”ہم سلام کہتے ہیں۔“ دوسرا ”سَلَامٌ“ مرفوع ہے، یعنی ”سَلَامٌ عَلَيْنَا“ ”تم پر سلام ہو۔“ معلوم ہوا کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کیا جس میں کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے سلام کہنے کا حکم ہے۔ دیکھیے سورہ نور (۲۴) بلکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے: ﴿السَّلَامُ قَبْلَ السُّؤَالِ فَمَنْ بَدَأَكُمْ بِالسُّؤَالِ قَبْلَ السَّلَامِ فَلَا تُجِيبُوهُ﴾ | السلسلة الصحيحة: ۵۵۸۱، ج: ۱، ص: ۸۱۶ | ”سلام سوال سے پہلے ہے، جو تم سے سلام سے پہلے سوال کرے، اسے جواب مت دو۔“ اور ایک روایت میں فرمایا: ﴿مَنْ بَدَأَ بِالْكَلَامِ قَبْلَ السَّلَامِ فَلَا تُجِيبُوهُ﴾ | صحيح الجامع: ۶۱۲۲ | ”جو سلام سے پہلے بات کرے اسے جواب مت دو۔“ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے بہتر جواب دیا جو سورہ نساء (۸۲) میں ہے، کیونکہ جملہ فعلیہ کچھ وقت کے لیے ہوتا ہے جب کہ جملہ اسمیہ میں استمرار یعنی ہمیشگی پائی جاتی ہے، یعنی تم پر ہمیشہ سلامتی ہو۔ ”سَلَامًا“ کے جواب میں ”سَلَامٌ“ بہتر جواب ہے۔

﴿۳﴾ فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَيْنِيذٍ : اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ فرشتے انسانی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ حدیث میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ معروف حدیث جبریل علیہ السلام میں فرشتے کا ایک اعرابی کی شکل میں آنا بخاری و مسلم میں موجود ہے۔ [بخاری: ۴۷۷۷ - مسلم: ۲۸] دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ابراہیم علیہ السلام اولوالعزم پیغمبر ہو کر بھی مہمانوں کو پہچان نہ سکے، ورنہ وہ کھانے کا اہتمام نہ کرتے، کیونکہ فرشتے نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ علم غیب صرف اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ جب ابراہیم علیہ السلام علم غیب نہیں رکھتے تھے تو پھر ان لوگوں کی کیا اوقات ہے جو نہ نبی ہیں اور نہ ان کے اصلی حالات اللہ کے سوا کوئی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی کیا حیثیت ہے؟ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ابراہیم علیہ السلام بے حد مہمان نواز تھے۔ یہ وصف ہر نبی خصوصاً ابراہیم علیہ السلام اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت پایا جاتا تھا۔ ہماری ماں خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی وحی کے موقع پر آپ کے اوصاف میں اس وصف کا خصوصی ذکر فرمایا: ﴿وَتَقْرَى الضَّمِيرَ﴾ [بخاری: ۳] ”آپ مہمان کی مہمان

فَلَمَّا رَأَىٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكَرَهُمْ وَ أَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۖ قَالُوا لَا تَحْضُرْنَا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ ۗ ﴿٧٠﴾

تو جب ان کے ہاتھوں کو دیکھا کہ اس کی طرف نہیں پہنچتے تو انھیں اوپر اچھا جانا اور ان سے ایک قسم کا خوف محسوس کیا، انھوں نے کہا نہ ڈرا بے شک ہم لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں ﴿۷۰﴾

نوازی کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کا یہ حال تھا کہ نافع بن عتبہ بیان کرتے ہیں: « كَانَ ابْنُ عُمَرَ لَا يَأْكُلُ حَتَّىٰ يُؤْتِي بِمَسْكِينٍ يَأْكُلُ مَعَهُ » «عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک کوئی مسکین ان کے ساتھ کھانے کے لیے نہ لایا جاتا۔» [بخاری، الأطعمة، باب المؤمن يأكل في معي واحد: ۵۳۹۳] پھر نبی کریم ﷺ اور ان کے والد ماجد ابراہیم رضی اللہ عنہ کی فیاضی کا کیا حال ہوگا۔ چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ مہمان نوازی میں دیر نہیں کرنی چاہیے، نہ ان سے اس بارے میں پوچھ گچھ کرنی چاہیے۔ سورۃ ذاریات میں ہے کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ چپکے سے گھر گئے اور کھانا لے آئے۔ وقت کی مناسبت سے جو حاضر ہو پیش کر دیا جائے، مہمان کی خواہش ہے تو کھالے، ورنہ اس کی مرضی۔

پانچویں یہ کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ پر دنیوی لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ کا فضل تھا، ورنہ بھنا ہوا پھنڑا تھوڑی دیر میں لا کر پیش کر دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ چھٹی یہ کہ وہ احادیث جن میں گائے کے گوشت کو بیماری کہا گیا ہے، بظاہر اچھی سند کی بھی ہوں تو شاذ ہیں، کیونکہ قرآن میں گائے کے گوشت کو بطور انعام ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی قربانی اور مختلف موقعوں پر ذبح کرنا قرآن مجید اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ یا اس کا رسول ﷺ، بیماری والی چیز کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟

ساتویں یہ کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ، ہمارے نبی کریم ﷺ اور تمام انبیاء بشر تھے اور کھانا کھاتے تھے۔ وہ نہ اللہ تعالیٰ یا اس کا کوئی جزو تھے اور نہ فرشتے، بلکہ وہ انسان تھے، کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔ (دیکھیے فرقان: ۲۰) اور ان کی بیویاں تھیں اور اولادیں بھی۔ (دیکھیے رعد: ۲۸) جب کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے ان سب سے پاک ہیں۔ آٹھویں یہ کہ صوفیاء جو جان دار یا اس سے نکلنے والی چیزیں اپنے خود ساختہ وظیفوں اور چلوں کے دوران میں یا ہمیشہ کے لیے کھانا ترک کر دیتے ہیں وہ ملت ابراہیمی کے نہیں بلکہ ہندو مذہب کے پیروکار ہیں۔

سیت 70 ﴿٧٠﴾ فَلَمَّا رَأَىٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكَرَهُمْ ابراہیم رضی اللہ عنہ نے صرف کھانا پیش ہی نہیں کیا بلکہ انھیں کھانے کے لیے اصرار بھی کیا: ﴿قَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ﴾ [الذاریات: ۲۷] ”فرمایا کیا تم کھاتے نہیں ہو؟“ پھر بھی جب انھوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تو دل میں ایک قسم کا خوف محسوس کیا۔ ”خِيفَةً“ کی توہین کی وجہ سے ”ایک قسم کا خوف“ ترجمہ کیا گیا ہے۔ خوف کی وجہ یہ تھی کہ ان کے علاقے میں اگر کوئی اجنبی آتا اور وہ مہمانی میں پیش کیا ہوا کھانا قبول نہ کرتا تو اس کے متعلق سمجھا جاتا کہ وہ کسی برے ارادے سے آیا ہے، یا یہ بھی ہو سکتا ہے اور شاید یہی زیادہ موقع کے مناسب ہے کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی نے ان کے کھانا تناول نہ کرنے کی وجہ سے ان کے فرشتے ہونے کو بھانپ لیا ہو اور وہ اس بنا پر ڈر

وَأَمْرًا تُدْأَىٰ قَائِمَةً فَذُحِكْتَ فَبَشَّرْنَا بِإِسْحَاقَ ۚ وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ ﴿٤١﴾ قَالَتْ يُونُكَيُّ
ءَالِدٌ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَذَا بَعْلِي شَيْخًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ ﴿٤٢﴾

اور اس کی بیوی کھڑی تھی، سوئس پڑی تو ہم نے اسے اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوش خبری دی ﴿٤١﴾ اس نے کہا ہائے میری بربادی! کیا میں جنوں گی، جب کہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرا خاوند ہے بوڑھا، یقیناً یہ تو ایک عجیب چیز ہے ﴿٤٢﴾

گئے ہوں کہ یہ ان کی ہستی پر عذاب کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ (شوکانی) فرشتوں نے ان کے خوف کو بھانپ لیا، بلکہ سورہ ہجر (۵۲) میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے صاف کہہ دیا: ﴿إِنَّا مَنَّكُمُ وَجَلُونَ﴾ ”ہم تو تم سے خوف زدہ ہیں۔“ ﴿٤١﴾ قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أَزْسَلْنَا إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ: فرشتوں نے کہا، آپ مت ڈریں، ہمیں (آپ کی ہستی پر نہیں بلکہ) لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس سے انبیائے کرام علیہم السلام کے عالم الغیب ہونے کی اور ان کے کائنات پر اختیار رکھنے کی صاف نشی ہو رہی ہے۔

آیت 71 ﴿٤١﴾ وَأَمْرًا تُدْأَىٰ قَائِمَةً فَذُحِكْتَ: ان کی بیوی سارہ علیہا السلام مہمانوں کی خدمت کے لیے پردے کے پیچھے ساتھ ہی کھڑی تھی اور خوف زدہ تھی۔ جب اس نے یہ بات سنی تو ہنس پڑی، یا تو اس لیے کہ ہم انہیں ڈاکو سمجھے تھے یہ تو فرشتے نکلے، یا اس خوشی میں کہ ہم تو خوف زدہ تھے کہ اس طرح فرشتوں کی آمد خطرے سے خالی نہیں ہوتی (دیکھیے ہجر: ۸) مگر یہ تو ہم پر عذاب کے بجائے ہمارے عزیز پیغمبر لوط علیہ السلام کی نافرمان قوم پر عذاب کی خوش خبری لے کر آئے ہیں اور دشمن کی ہلاکت کی خبر سے یقیناً خوشی ہوتی ہے۔

﴿٤٢﴾ فَبَشَّرْنَا بِإِسْحَاقَ.....: سارہ علیہا السلام کے لیے ایک خوشی کی خبر وہ تھی جو اوپر گزری، جس پر وہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔ فرشتوں نے انہیں مزید وہ خوش خبریاں دیں، ایک بیٹا عطا ہونے کی، پھر اس بیٹے سے پوتا یعقوب عطا ہونے کی اور ان کے دشمن میں یہ خوش خبری تھی کہ تم دونوں میاں بیوی ابھی اتنی عمر اور پاؤ گے کہ بیٹا ملے گا، وہ جوان ہوگا، پھر اس کی شادی ہوگی اور اسے یعقوب عطا ہوگا، گویا مسلسل چار خوش خبریاں۔ یہ چاروں خوش خبریاں فرشتوں نے دی تھیں، مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اسے یہ خوش خبریاں دیں، کیونکہ فرشتوں کا کام تو صرف پہنچانا تھا، اصل خوش خبری تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی جو کسی صورت غلط نہیں ہو سکتی۔

آیت 72 ﴿٤١﴾ قَالَتْ يُونُكَيُّ: امام طبری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ”يَا وَيْلَتَا“ کا کلمہ عرب کسی چیز پر تعجب اور اسے انوکھا سمجھنے کے وقت بولتے ہیں، چنانچہ تعجب کے وقت کہتے ہیں: ”وَيْلٌ أُنْبِيَهُ مَا أَرَحِلُهُ“ ”اس کی ماں ہلاک ہو، وہ کس قدر مرد ہے۔“ باقی الف کے متعلق طبری کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ الف ”ندبہ“ کا ہے اور تاء کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ”وَيْلٌ“ کے بعد والا الف ندبہ اتنا واضح اور لہا نہیں ہو سکتا جتنا درمیان میں تاء کے اضافے سے ہو سکتا ہے۔

قَالُوا اتَّعَجِبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحِمَتُ اللَّهِ وَ بَرَكَتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّكَ حَبِيدٌ مَحِيدٌ ﴿۴۵﴾

انھوں نے کہا کیا تو اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہے؟ اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے گھر والو! بے شک وہ بے حد تعریف کیا گیا، بڑی شان والا ہے ﴿۴۵﴾

﴿۴۵﴾ اَللّٰهُوَ اَنَا عَجُوْزٌ ... : پہلی خوش خبری کا رد عمل وہ ہنسی تھی جو سارہ رضی اللہ عنہا کے چہرے پر نمودار ہوئی، اب ایک ایسی چیز کی خوش خبری ملی جو ساری زندگی کی آرزو کا خلاصہ تھی اور اس وقت ملی جب دنیاوی اسباب کے لحاظ سے اس کی امید ہی نہ تھی تو سارہ رضی اللہ عنہا کی ہنسی حیرت اور دہشت میں بدل گئی۔ کہا کیا ایسا ہوگا کہ میرے ہاں بچہ ہوگا؟ جب کہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا خاندان بھی بڑھا ہے، یقیناً یہ تو ایک عجیب چیز ہے۔ یہ خوش خبری فرشتوں نے ابراہیم رضی اللہ عنہ کو بھی دی تھی، جیسا کہ سورہ ذاریات میں ہے: ﴿وَبَشِّرُوْهُ بِغُلَامٍ عَلِيْمٍ﴾ [الذاریات: ۲۸] ”اور انھوں نے اسے (ابراہیم رضی اللہ عنہ) کو ایک بہت علم والے لڑکے کی خوش خبری دی۔“ مگر یہاں خصوصاً ان کی بیوی کو خوش خبری دینے اور ان سے گفتگو کا ذکر کیا ہے، کیونکہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کے ہاں تو باہرہ رضی اللہ عنہ سے اسماعیل پیدا ہو چکے تھے، لیکن سارہ رضی اللہ عنہا ابھی تک بے اولاد تھیں۔ قدیم مفسرین اور اسرائیلی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی عمر سو سال اور سارہ رضی اللہ عنہا کی عمر نوے سال تھی، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کی عمر کے تعین کا کوئی با اعتماد ذریعہ ہمارے پاس نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بیان سارہ رضی اللہ عنہا کا ”عَجُوْزٌ“ ہونا اور ان کے خاندان کا ”شَيْخًا“ ہونا ہی ”لَشَيْءٍ مَّحْيِيْبٍ“ سمجھنے کے لیے کافی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ ضرور ان کی عمر بھی بیان فرما دیتا۔

﴿۴۶﴾ یہ آیت دلیل ہے کہ ذبیح اسماعیل رضی اللہ عنہ تھے، کیونکہ اسحاق رضی اللہ عنہ کی خوش خبری کے ساتھ ہی یعقوب پوتے کی خوش خبری بھی تھی، ان کے ذبح کے حکم کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (قرطبی)

آیت 73 ﴿۴۷﴾ قَالُوا اتَّعَجِبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ : یعنی وہ تو ماں باپ کے بغیر بھی پیدا کر سکتا ہے، پھر بوزھی عورت کو بچہ عطا کرنا اسے کیا مشکل ہے۔ جب اللہ کے امر کے سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں تو تعجب کیسا۔ پھر اس گھر میں شروع سے اللہ کی رحمت و برکت کے جو معجزے ظاہر ہوتے رہے ہیں، مثلاً آگ کا گلزار ہونا، اسماعیل رضی اللہ عنہ کا ذبح سے محفوظ رہنا، مصر کے اس ظالم جبار سے سارہ رضی اللہ عنہا کی عصمت کا محفوظ رہنا وغیرہ، ان کے بعد تو اللہ کے حکم سے کسی بھی ناممکن کام کے ہو جانے پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

﴿۴۸﴾ رَحِمَتُ اللَّهِ وَ بَرَكَتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ : ”أَهْلَ الْبَيْتِ“ سے پہلے حرف ندا ”یا“ مقدر ہے، اس لیے یہ منصوب ہے، یعنی ”اے گھر والو!“ پہلے ”سَلَامًا“ کہا تھا، اب ”رَحِمَتُ اللَّهِ وَ بَرَكَتُهُ عَلَيْكُمْ“ کے ساتھ وہ مکمل ہو گیا، اس سے زائد الفاظ ثابت نہیں ہیں۔ اس وقت فرشتوں کی مخاطب صرف اکیلی سارہ رضی اللہ عنہا تھیں، ان کے لیے فرشتوں نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان میں سے دو الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں، ایک تو یہ کہ اکیلی عورت کو ”عَلَيْكُمْ“ جمع مذکر حاضر کے لفظ سے خطاب کیا ہے، حالانکہ وہ مؤنث تھیں۔ دوسرا انھیں ”أَهْلَ الْبَيْتِ“ کہہ کر خطاب کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ آدمی کے اہل بیت (گھر

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَى يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ ۗ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ ﴿۷۴﴾ يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا ۖ إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرٌ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ لَبِهِمُ عَذَابٌ غَيْرُ مُرْدُوْدٍ ﴿۷۵﴾ وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِئِءًا بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هَذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ﴿۷۶﴾

پھر جب ابراہیم سے گھبراہٹ دور ہوئی اور اس کے پاس خوش خبری آگئی تو وہ ہم سے لوط کی قوم کے بارے میں جھگڑنے لگا ﴿۷۴﴾ بے شک ابراہیم تو نہایت بردبار، بہت آہ و زاری کرنے والا، رجوع کرنے والا ہے ﴿۷۴﴾ اے ابراہیم! اسے رہنے دے، بے شک حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کا حکم آچکا اور یقیناً یہ لوگ! ان پر وہ عذاب آنے والا ہے جو بتایا جانے والا نہیں ﴿۷۵﴾ اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے، وہ ان کی وجہ سے مغموم ہوا اور ان سے دل تنگ ہوا اور اس نے کہا یہ بہت سخت دن ہے ﴿۷۶﴾

والے) اس کی بیوی ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ سلام اور رحمت و برکت کہتے وقت عورتوں کو بھی مذکر کے صیغے سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ یہ آیت فیصلہ کن ہے کہ سورہ احزاب کی آیت: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ | الاحزاب: ۳۳ | ”اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے لگدگی دور کر دے اے گھر والو! اور تمہیں پاک کر دے خوب پاک کرنا۔“ اس آیت میں اہل بیت کا ذکر کرتے ہوئے پہلے بھی اور بعد میں بھی نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کا ذکر ہے، تو یہاں اس آیت میں بھی ”عَنْكُمْ“ اور ”أَهْلَ الْبَيْتِ“ اور ”يُطَهِّرَكُمْ“ تینوں میں رسول اللہ ﷺ کی بیویاں مراد ہیں۔ اس کی نفی کرنے والے ایک واضح اور ثابت شدہ حقیقت کی نفی کر رہے ہیں، جس کی وجہ نبی ﷺ کی محبوب ازواج مطہرات سے بغض و عناد کے سوا کچھ نہیں اور جو نبی ﷺ کے پیاروں سے بغض رکھے وہ نبی ﷺ کی محبت سے کیسے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

آیت 74 فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ ابراہیم علیہ السلام کی قوم لوط سے متعلق بحث فرشتوں سے ہوئی تھی، جیسا کہ سورہ عنکبوت (۳۲) میں صراحت ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے ساتھ جھگڑا فرمایا، کیونکہ فرشتے تو جو کچھ کر رہے تھے اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے کر رہے تھے۔ ”يُجَادِلُنَا“ مضارع کا صیغہ حکایت حال یعنی اس وقت کی منظر کشی کے لیے استعمال فرمایا ہے۔

آیت 75 إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ : اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی بحث و تکرار کا برانہ مانا، بلکہ نہایت پیار سے ان کا ذکر فرمایا۔

آیت 75 يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا : یہ فرشتوں کی بات ہے جو بالآخر انھوں نے ابراہیم علیہ السلام سے کہی کہ اب بحث و تکرار کا کچھ فائدہ نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آ جانے کے بعد عذاب نلنے کی کوئی صورت نہیں۔

آیت 77 ۱ وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِئِءًا بِهِمْ : یہاں سے لوط علیہ السلام کا قصہ شروع ہوتا ہے جو کئی سورتوں میں

وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ ۖ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْبُدُونَ السِّيَّاتِ ۗ قَالَ يَقَوْمِ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ فِي ضَيْغِي ۗ أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ زَكِيٌّ ۙ ﴿٧٨﴾

اور اس کی قوم (کے لوگ) اس کی طرف بے اختیار دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئے اور وہ پہلے سے برے کام کیا کرتے تھے۔ اس نے کہا اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں ہیں، یہ تمہارے لیے بہت پاکیزہ ہیں، تو اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں میں مجھے رسوا نہ کرو، کیا تم میں ایک بھی بھلا آدمی نہیں؟ ﴿٧٨﴾

مختلف انداز سے ذکر ہوا ہے، مثلاً سورۃ اعراف، حجر، شعراء، نمل، عنکبوت، صافات، ذاریات اور قمر۔ ان سورتوں میں بھی تفسیر دیکھی ہیں۔ لوط علیہ السلام کے آگ سے صحیح سلامت باہر نکل آنے پر ان پر ایمان لے آئے تھے اور انہوں نے ان کے ساتھ ہی شام کی طرف ہجرت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت سے سرفراز فرمایا اور وادی اردن میں ”سدوم“ نامی بستی اور اس کے گرد و نواح کے لیے مبعوث فرمایا۔ یہ قوم شرک و کفر کے ساتھ ساتھ ایسے فعل بد کی مرتکب تھی جس کا ارتکاب ان سے پہلے دنیا بھر میں کسی نے نہیں کیا تھا۔ یہ لوگ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ بد فعلی کے عادی تھے۔ اپنی مجلسوں میں کھلم کھلا برائی کرتا اور ڈاکے مارنا ان کا عام رویہ تھا۔ دیکھیے سورۃ عنکبوت (۲۹) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ اعراف (۸۰ تا ۸۳) کی تفسیر۔

﴿٧٨﴾ **يَوْمَئِذٍ يَهْمُكَ** ”سَاءَهُ يَسْؤُهُ“ سے ماضی مجہول ہے، غمگین کرنا، برا لگنا۔ یہاں ”يَوْمَئِذٍ“ کا نائب فاعل لوط علیہ السلام کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہے اور فاعل محذوف ہے، گویا عبارت یوں ہے کہ ”سَاءَهُ مَجِيئُهُمْ“ یعنی ان کے آنے نے اسے مغموم کر دیا۔ فعل مجہول کا معنی ہوگا، وہ ان کی وجہ سے مغموم ہوا۔ ”وَضَاقَ يَهْمُهُ ذُرْعًا“ ”ذُرْعٌ“ اور ”ذِرَاعٌ“ بازو یا جانور کی اگلی ٹانگوں کو کہتے ہیں، اونٹ یا کسی بھی جان دار پر اگر بوجھ نہ ہو تو وہ کھلا قدم اٹھاتا ہے اور اگر اس کی استعداد سے زیادہ بوجھ ہو تو وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھاتا ہے اور وہ بھی بالکل تنگ سا، اس لیے ”ضَاقَ ذُرْعًا“ سے مراد دل تنگ ہونا لیا جاتا ہے۔ لوط علیہ السلام کے ان کے آنے کی وجہ سے مغموم ہونے کی وجہ مہمان نوازی میں نکل نہ تھا، نبی سے بڑھ کر کون فراخ دل اور سخی ہو سکتا ہے، بلکہ انہیں اپنی قوم کی عادت بد کا علم تھا۔ ظاہر ہے فرشتے انسانی شکل میں آئے ہوں تو وہ کس قدر خوبصورت ہوں گے۔ لوط علیہ السلام کو معلوم نہ تھا کہ یہ فرشتے ہیں، کیونکہ غیب تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور لوط علیہ السلام کو یہ بات بتائی نہیں گئی تھی، اس لیے ان کے دل پر جو لڑی، اللہ تعالیٰ نے اس کا کمال نقشہ کھینچا ہے۔ پہلے غم ہوا، پھر اپنی بے بسی پر تنگ دل ہوئے، پھر جس طرح کوئی شخص کوئی لفظ کہہ کر دل کو کچھ نہ کچھ تسلی دیتا ہے، یہ کہا کہ یہ دن تو بہت سخت ہے۔ | التحریر والنویہ |

آیت 78 ﴿٧٨﴾ **وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ** : ”هْرَعٌ“ (ف) کا معنی کسی کو تیزی سے دھکیلنا ہے۔ فعل مجہول کا مطلب یہ ہے کہ جب اس خبیث قوم کو لوط علیہ السلام کے گھر ایسے حسینوں کے آنے کی خبر ملی تو وہ ان کی طرف تیزی سے اس طرح بے اختیار دوڑتے ہوئے آئے جیسے کوئی انہیں پیچھے سے دھکیل رہا ہے۔

قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكُمْ مِنْ حَقٍّ وَ إِنَّكُمْ لَتَعْلَمُونَ مَا تُرِيدُونَ ﴿۴۹﴾

انہوں نے کہا بلاشبہ یقیناً تو جانتا ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حق نہیں اور بلاشبہ یقیناً تو جانتا ہے ہم کیا چاہتے ہیں ﴿۴۹﴾

﴿۴۹﴾ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ : فعل مضارع پر ”سَكَّانٌ“ آئے تو استمرار اور بیٹگی کا معنی دیتا ہے، الا یہ کہ اس کے خلاف کوئی دلیل ہو۔ اس لیے زخشری نے اس کا معنی کیا ہے: ”وَمِنْ قَبْلُ ذَلِكَ الْوَقْتِ كَانُوا يَعْمَلُونَ الْفَوَاحِشَ وَيُكْفِرُونَ بِهَا فَصَرَوْا بِهَا وَمَرُّوا عَلَيْهَا“ ”اس سے پہلے وہ یہ برے کام کثرت سے کرتے تھے، حتیٰ کہ یہ ان کی عادت بن چکی تھی۔“ یعنی کوئی آدمی شروع شروع میں ایسا غلیظ فعل کرنے سے کچھ جھجکتا ہے مگر یہ لوگ بے اختیار تیزی سے اس لیے آئے کہ کثرت سے اس فعل بد کے ارتکاب نے ان کی حیا اور جھک بالکل ختم کر دی تھی۔

﴿۵۰﴾ قَالَ يَقَوْمِ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي.....: جب وہ گھس آئے اور شدت سے مہمانوں کو اپنے حوالے کرنے کا مطالبہ کرنے لگے تو لوط علیہ السلام نے مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے اپنی تواضع کی انتہا کر دی، کہا یہ میری بیٹیاں ہیں، یہ تمہارے لیے بہت پاکیزہ ہیں، اللہ سے ڈرو! مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں ایک بھی بھلا آدمی نہیں؟ یہاں مفسرین نے بیٹیاں پیش کرنے کی مختلف توجیہیں کی ہیں۔ اشرف الحواشی میں ہے کہ ”بَنَاتِي“ (بیٹیوں) سے مراد ان لوگوں کی اپنی عورتیں ہیں، کیونکہ نبی اپنی قوم کے لیے بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے اور قوم کی ساری عورتیں نبی کی بیٹیاں ہوتی ہیں، جیسا کہ نبی ﷺ کے متعلق ارشاد ہے: ﴿الَّذِينَ أُولَىٰ بِالنَّبِيِّ هُم مِّنْهُ وَمَنْ أُولَىٰ بِهِمْ فَأُولَٰئِكَ يَتْلُونَ صُورَةَ مَا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنْ يَقْرَأُوا عَلَيْهِمْ مَا كَتَبْنَا وَعَلَّمْنَا﴾ [الأحزاب: ۶] ”یہ نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھنے والا ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔“ یہی تفسیر راجح ہے، گو بعض نے لوط علیہ السلام کی اپنی بیٹیاں بھی مراد لی ہیں کہ ان سے شادی کر لو۔ (کسانی الموضح) اس تفسیر کے راجح ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ لوط علیہ السلام کی بیٹیاں معروف قول کے مطابق صرف دو تھیں، اگر کم و بیش بھی ہوں تو پوری قوم سے تو ان کی شادی نہیں ہو سکتی، اس لیے بیٹیوں سے مراد قوم کی بیٹیاں یعنی ان کی بیویاں ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مراد اپنی ہی بیٹیاں تھیں، مگر نہ انہیں ان کے حوالے کرنا مقصود تھا نہ ان کی ان سے شادی کرنا، بلکہ محض انہیں شرمندہ کر کے اپنے مہمانوں کی عزت بچانا مقصود تھا، کیونکہ وہ بھی جانتے تھے اور قوم بھی کہ اپنی بیٹیاں کوئی کسی کے حوالے نہیں کرتا۔ یہ صرف اپنی عاجزی کے اظہار اور انہیں شرمندہ کرنے کے لیے ہے، جیسا کہ سلیمان علیہ السلام نے فیصلہ کیا تھا کہ لاؤ بچے کے دو ٹکڑے کر کے دونوں دعویدار عورتوں کو ایک ایک حصہ دے دیتے ہیں، حالانکہ ان کی مراد ہرگز یہ نہ تھی کہ واقعی بچے کو درمیان سے کاٹ دیا جائے، بلکہ وہ حقیقت اگلوانا چاہتے تھے۔ آیت کے ظاہر الفاظ سے یہ معنی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

﴿۵۱﴾ ”هَؤُلَاءِ أَطَهَرُ لَكُمْ“ کا مطلب یہ نہیں کہ مردوں سے یہ فعل بھی کچھ طہارت رکھتا ہے، مگر عورتیں زیادہ ظاہر ہیں، بلکہ یہاں یہ بہت پاکیزہ کے معنوں میں ہے۔

﴿۷۹﴾ قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكُمْ.....: یعنی ہمارا تمہاری بیٹیوں میں کوئی حق نہیں (گویا آنے والے مہمان

قَالَ لَوْ اَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةٌ اَوْ اَوْىٰ اِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾

اس نے کہا کاش! میرے پاس تمہارے مقابلہ کی کچھ طاقت ہوتی، یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لیتا ﴿۸۰﴾

مردوں سے بد فعلی ان کا پورا حق ہے، یا یہ مطلب ہے کہ ہمیں عورتوں یا بیویوں سے کوئی دلچسپی نہیں، ہم جو چاہتے ہیں وہ تجھے معلوم ہی ہے کہ ہم کس بد فعلی کے عادی ہیں، اس لیے تم ہماری راہ میں رکاوٹ نہ بنو۔ ان کے اس جواب سے ان کی خیانت کا پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے اور صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کیوں ان کو اس عذاب کا مستحق سمجھا گیا جو ان کے علاوہ کسی قوم پر نازل نہیں کیا گیا۔

آیت 80 قَالَ لَوْ اَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةٌ.....: لوط علیہ السلام اس قوم میں ایک طرح سے اجنبی تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اہل سدوم کی

اصلاح کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے اس تمنا کا اظہار کیا کہ کاش! مجھ میں تمہارے مقابلے کی قوت ہوتی، یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لیتا، یعنی میرا خاندان یہاں ہوتا تو میں تم سے نمٹ لیتا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: ﴿يَرْحَمُ اللَّهُ لَوْ طَا لَقَدْ كَانَ يَأْوِي اِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيْدٍ﴾ [بخاری، احادیث الانبياء، باب قوله عز وجل: ﴿و﴾

نہم عن ضيف ابراهيم: ﴿۳۳۷۲﴾ "اللہ تعالیٰ لوط پر رحم کرے، یقیناً وہ بہت مضبوط سہارے کی پناہ رکھتے تھے۔" یعنی وہ اللہ

تعالیٰ کا سہارا رکھتے تھے جو سب سے مضبوط ہے اور اس وقت ان کے پاس فرشتوں کی شکل میں بھی مضبوط سہارا موجود تھا،

اگرچہ انہیں معلوم نہ تھا۔ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ نے "الفضل فی الملئ" میں کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان میں لوط علیہ السلام

کی شان میں کمی کی کوئی بات نہیں، کیونکہ اسباب کا مہیا کرنا یا ان کی خواہش کرنا اللہ تعالیٰ پر توکل کے خلاف نہیں ہے۔ لوط علیہ السلام

یقیناً اللہ تعالیٰ کو اپنا سہارا سمجھتے تھے مگر اس وقت وہ سہانگی مہیا ہونے کی صورت میں فوری طور پر اس خبیث قوم کا راستہ قوت

بازو کے ساتھ روکنے کے خواہش مند تھے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے کئی لوگوں اور قبیلوں سے کہا کہ کون میری مدد کرتا اور

مجھے جگہ دیتا ہے کہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچاؤں۔ آخر کار انصار مدینہ نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور اپنی جان و مال اور

اولاد کی طرح آپ کی حفاظت اور آپ کا دفاع کیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا اَنْصَارَ اللَّهِ كَمَا

قَالَ عِيْسَىٰ ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ اَنْصَارِي اِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللَّهِ﴾ [الصف: ۱۴]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کے مددگار بن جاؤ، جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا اللہ کی طرف میرے

مددگار کون ہیں؟ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں۔" اس لیے دنیاوی اسباب مہیا ہونے کی کوشش و خواہش جائز بلکہ

مستحب ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿فَمَا بَعَثَ اللَّهُ بَعْدَهُ مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا فِي تَرْوِةٍ مِنْ

قَوْمِي﴾ [السلسلة الصحيحة: ۱۵۲۴، ح: ۱۶۱۷] "پھر لوط علیہ السلام کے بعد اللہ نے جو نبی بھی بھیجا وہ اس کی قوم کے کثیر

لوگوں میں سے بھیجا۔"

كَأَلْوِ الْيَلُوطِ إِنْ أَرْسَلُ رَبِّكَ لَنْ يَصِلُوا إِلَيْكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ الْبَيْلِ وَلَا يَكْتُمِبُ
مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا أَمْرًا تَكُ إِتَاةٌ مُصِيبُهَا مَا أَصَابَهُمْ ۗ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۗ أَلَيْسَ الصُّبْحُ

بِقَرِيبٍ ﴿۸۱﴾

انہوں نے کہا اے لوط! بے شک ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ ہرگز تجھ تک نہیں پہنچ پائیں گے، سواپنے گھر والوں کو رات کے کسی حصے میں لے کر چل نکل اور تم میں سے کوئی چھپے مڑ کر نہ دیکھے مگر تیری بیوی۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس پر وہی مصیبت آنے والی ہے جو ان پر آئے گی۔ بے شک ان کے وعدے کا وقت صبح ہے، کیا صبح واقعی قریب نہیں ﴿۸۱﴾

آیت 81 ﴿۱﴾ كَأَلْوِ الْيَلُوطِ إِنْ أَرْسَلُ رَبِّكَ : قوم کے بد معاش جب باز نہ آئے بلکہ دیواریں پھلانگ کر یا دروازہ توڑ کر اندر آ گئے تو فرشتے نے پر مارا، جس سے سب اندھے ہو کر بھاگ اٹھے۔ سورہ قمر میں اس کی طرف اشارہ ہے، فرمایا: ﴿وَلَقَدْ رَاوَدُوهُ عَنْ ضَيْفِهِ فَطَسَنَّا أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا عَذَابِنَا وَنُذِرُ﴾ [القمر: ۳۷] ”اور بلاشبہ یقیناً انہوں نے اسے اس کے مہمانوں سے برکانے کی کوشش کی تو ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں، پس چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔“ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب فرشتوں نے دیکھا کہ لوط علیہ السلام بالکل عاجز آ گئے ہیں اور اپنی قوم کے بدکاروں کو نہ روک سکتے کی وجہ سے سخت رنجیدہ ہیں تو انہوں نے ظاہر کر دیا کہ ہم آپ کے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ اس کا ایک مظاہرہ وہ تھا جو انہوں نے ان بدکاروں کی آنکھیں مٹا کر کیا، مزید تسلی یہ دی کہ یہ لوگ کبھی آپ کی گرد کو بھی نہیں پاسکتے۔

﴿۲﴾ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ الْبَيْلِ : یعنی رات کے کسی حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے۔ صرف گھر والوں کو لے کر نکلنے کا حکم اس لیے دیا کہ کوئی اور شخص ان کے سوا مسلمان ہی نہیں ہوا تھا۔ دیکھیے سورہ ذاریات (۳۵، ۳۶)۔

﴿۳﴾ إِلَّا أَمْرًا تَكُ : اس کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ ”فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ“ سے استثناء ہے، یعنی اپنی بیوی کے سوا دوسرے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ۔ دوسری یہ کہ تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے، مگر تمہاری بیوی مڑ کر دیکھے گی اور اپنے کفر اور قوم کی ہمدردی کی وجہ سے ان پر عذاب دیکھ کر آہ و پکار کرے گی تو اسے بھی وہی عذاب آپہنچے گا جو ان کو پہنچا۔ پہلا معنی زیادہ قریب ہے۔ (واللہ اعلم) قدرتی بات ہے کہ انسان کو اپنے دشمن کی جلد از جلد بربادی کی خواہش ہوتی ہے، فرشتوں نے بتایا کہ ان پر عذاب صبح کے وقت آئے گا۔ لوط علیہ السلام کے مزید جلدی کے مطالبے پر انہوں نے کہا: ﴿أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ﴾ ”کیا صبح واقعی قریب نہیں ہے؟“ صبح کا وقت شاید اس لیے مقرر کیا گیا ہو کہ وہ آرام کا وقت ہوتا ہے اور لوگ کچھ کچھ جاگ رہے ہوتے ہیں۔ آرام کے وقت عذاب زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے اور ایسے وقت میں عذاب دیکھنے والوں کے لیے باعث عبرت بھی ہوتا ہے۔ (آلوسی)

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَلَيْهِمْ سَافِلَهَا وَ آمَطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ ۚ مَنصُودٍ ﴿۸۲﴾
 وَقَدْ نُسُوهُ عِنْد رَبِّكَ ۗ وَ مَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ ﴿۸۳﴾ وَ إِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ
 يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّن دُونِهِ ۗ وَلَا تَتَّقُوا الْبِكْيَالَ وَ الْبِيزَانَ إِنِّي أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ
 وَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ﴿۸۴﴾

پھر جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس کے اوپر والے حصے کو اس کا نیچا کر دیا اور ان پر تہ بہ تہ کھنگر کے پتھر برسائے ﴿۸۲﴾ جو تیرے رب کے ہاں سے نشان لگائے ہوئے تھے اور وہ ان ظالموں سے ہرگز کچھ دور نہیں ﴿۸۳﴾ اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا)۔ اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ماپ اور تول کم نہ کرو، بے شک میں تمہیں اچھی حالت میں دیکھتا ہوں اور بے شک میں تم پر ایک گھیر لینے والے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۸۴﴾

”الْبَيْتُ الضَّمِيرُ بِقَرْنَيْهِ“ پر شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ فتح ہوا صبح کے وقت، شاید وہی اشارہ ہو۔“ (موضع)

آیت 82 ﴿۱﴾ فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا.....: یعنی جب ہمارے عذاب کا حکم آیا تو ہم نے اس بستی کے اوپر کا حصہ اس کا نیچے کا حصہ کر دیا، یعنی پوری بستی الٹ دی۔ یہ عذاب ان کے فعل شنج سے مناسبت رکھتا تھا کہ انہوں نے بھی فطرت کو بدل کر عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کو اپنی شہوت رانی کا ذریعہ بنا لیا۔

﴿۲﴾ سِجِّيلٍ: سنگ دگل (پتھر اور مٹی کے ملے ہوئے ڈھیلے) یا سنگ گھل (مٹی کے پتھر یعنی پختہ اینٹوں کے روڑے یا کھنگر) مزید عذاب کے طور پر بستی الٹنے کے بعد اس پر اینٹوں اور پتھروں کی ایسی مسلسل بارش برساتی کہ ان کی جہیں لگ گئیں۔

آیت 83 ﴿۱﴾ نُسُوهُ عِنْدَ رَبِّكَ: ”نشان لگے ہوئے“ یعنی ان میں سے ہر پتھر پر کوئی علامت بنائی گئی تھی کہ اس سے کس کو ہلاک کرنا ہے۔ (ابن کثیر)

﴿۲﴾ وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ: اس کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ جو لوگ بھی ظلم کی روش پر چلیں گے (مثلاً مغربی اقوام اور ان کے پرستار جو دھڑلے سے اس فعل بد کا ارتکاب اور اس کی اشاعت کر رہے ہیں) ان پر بھی یہ عذاب آنا کچھ دور نہیں، یا الف لام عہد کا ہو تو ان ظالموں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے کافروں) پر بھی نزول عذاب بعید از قیاس نہیں۔ اگر قوم لوط پر عذاب آ سکتا ہے تو ان پر بھی آ سکتا ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اٹنی ہوئی بستیاں ان مکہ کے ظالموں سے کچھ دور نہیں، بلکہ ملک شام کو جاتے ہوئے دائمی آباد راستے میں ہیں، جن کی بے مثال بربادی یہ لوگ صبح و شام آتے جاتے دیکھتے ہیں۔ مزید دیکھیے سورہ حجر (۷۶) اور صافات (۱۳۷، ۱۳۸) کے حواشی۔

آیت 84 ﴿۱﴾ وَ إِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَقَوْمِ.....: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۹۳ تا ۹۵) اور

و يَقَوْمُ أَوْفُوا الْبَيْتَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْتُوا
 فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿۸۵﴾ بِقِيَّتِ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ؕ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ
 بِحَفِيظٍ ﴿۸۶﴾

اور اے میری قوم! ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد
 کرتے ہوئے دنگا نہ مچاؤ ﴿۸۵﴾ اللہ کا باقی بچا ہوا تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم مومن ہو اور میں ہرگز تم پر کوئی تمہبان
 نہیں ہوں ﴿۸۶﴾

سورہ شعراء (۱۶۷-۱۹۰) کیال اور کیل سے مراد کسی مقرر پیمانے کے برتن مثلاً صاع (ٹوپہ وغیرہ) میں ڈال کر نلے وغیرہ کو
 ماپنا اور میزان اور وزن کا معنی ترازو وغیرہ سے تو لانا ہے۔

﴿۸۵﴾ لَئِنِ آذَنُكُمْ بِخَيْرٍ: یعنی تم اچھے خاصے خوش حال ہو، پھر اس قسم کی بے ایمانی اور فریب کاری کی کیا ضرورت ہے۔

﴿۸۶﴾ عَذَابٌ يَوْمَ يُحْيِيظُ: یعنی آخرت کا عذاب یاد دہانی میں اس دن کا عذاب جس کے گھیرے سے کوئی نکل نہ سکے گا۔

آیت 85 ﴿۸۵﴾ وَيَقَوْمُ أَوْفُوا الْبَيْتَانَ بِالْقِسْطِ: پہلے فرمایا کہ ماپ اور تول میں کمی نہ کرو، اب اس کی مزید
 تاکید فرمائی کہ ماپ اور تول پورا کرو، نہ دیتے وقت کم دو، نہ لیتے وقت زیادہ لو۔ مزید دیکھیے سورہ مطفقین (۳۲۱)۔

﴿۸۶﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ: پہلے ماپ تول کا خاص طور پر ذکر فرمایا، اب لینے دینے کے ہر طریقے کو ان الفاظ کے
 ذریعے سے شامل کر لیا، مثلاً کسی بھی طرح کے میٹروں کے ذریعے، یا گنتے کے ذریعے، غرض کسی بھی طرح لوگوں کو ان کی چیز
 کم مت دو، نہ زیادہ لو۔

﴿۸۷﴾ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ: ”عَتَى يَعْنَى“ بردن ”رَضَى يَرْضَى“ حد سے بڑھ کر فساد کرنا، مثلاً ان کی عادت
 تھی کہ اگر کم ماپ تول کے خلاف کوئی شخص احتجاج کرنا تو سب مل کر اس پر حملہ آور ہو جاتے۔ اسی طرح موقع ملتا تو ڈاکے
 مارتے اور لوگوں سے چیزیں چھین لیتے۔ خلاصہ یہ کہ شعیب علیہ السلام نے انہیں ہر قسم کے فساد سے منع فرمایا۔

آیت 86 ﴿۸۶﴾ بِقِيَّتِ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ.....: یعنی بے ایمانی سے جمع کردہ مال سے اتنی بچت اور منافع ہر طرح سے بہتر
 ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق حاصل ہو۔ ”إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ“ (بشرطیکہ تم مومن ہو) کیونکہ کافر کے نیک اعمال بھی قیامت
 کے دن اس کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ دیکھیے سورہ کہف (۱۰۵)۔

﴿۸۷﴾ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ: یعنی میں تم پر نگران تو نہیں ہوں جو ہر وقت تمہارے ناپ تول کو دیکھتا رہوں اور نہ یہ میرے بس
 میں ہے۔ ہر ایک کے ایک ایک لمحہ پر نظر تو صرف رب تعالیٰ کی ہے، میرا کام تو تمہیں سمجھا دینا اور اللہ کے عذاب سے ڈرا دینا
 ہے، ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔

قَالُوا يُشْعِبُ أَسْلُوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ تَتْرَكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ تَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ يَقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ عِزِّي

انہوں نے کہا اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے، یا یہ کہ ہم اپنے مالوں میں کریں جو چاہیں، یقیناً تو تو نہایت بردبار، بڑا سمجھ دار ہے ﴿۸۷﴾ اس نے کہا اے میری قوم! کیا تم نے دیکھا اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے ہاں سے

آیت 87 ﴿۸۷﴾ قَالُوا يُشْعِبُ أَسْلُوتُكَ.....: یعنی کیا تو اپنی نماز کا دائرہ عمل اس قدر وسیع سمجھتا ہے کہ دوسروں کے مذہبی اور مالی معاملات میں بھی دخل دینے لگا ہے۔ ہماری مرضی ہے جس کی چاہیں پوجا اور جس کی چاہیں بندگی کریں اور یہ مال جو ہمارے اپنے ہیں، ان میں جس طرح چاہیں تصرف کریں، جائز و ناجائز جیسے چاہیں کمائیں، کوئی ہمیں کیوں ٹو کے! یہ وہی سیکولر سوچ ہے جو آج کل بھی چل رہی ہے کہ نماز اور دین ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے۔ مملکت اور دنیا کے معاملات میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے ہم پابند نہیں۔ بے شک دین سود سے روکتا ہے مگر ساری دنیا کی معیشت اس پر چل رہی ہے، دین کا اس میں کیا دخل؟ پھر کوئی شرک کرے، کفر کرے یا موحد ہو، اللہ تعالیٰ کو مانے یا نہ مانے، کسی کو اس سے کیا غرض۔ بس مملکت کے جو قانون خود لوگوں نے اکثریت سے بنائے ہیں، ان کی پابندی لازم ہے، باقی کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی بغاوت ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی دعا نہ ہوتی کہ یا اللہ! میری امت (دعوت و اجابت) کو عام عذاب سے ہلاک نہ کرنا تو کب کا عذاب آچکا ہوتا۔

﴿۸۸﴾ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ: اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ تم تو خاندان میں بڑے بردبار اور نہایت سمجھ دار سمجھے جاتے ہو، تمہیں کیا ہو گیا کہ ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگے ہو۔ دوسرا یہ کہ دراصل وہ انہیں ٹھنڈے اور مذاق سے یہ کہہ رہے تھے، مقصد ان کا انہیں نہایت بے حوصلہ اور نادان کہنا تھا۔ صاحب کشف نے اس کی مثال دی کہ جیسے کوئی شخص کسی سخت بخیل آدمی کو کہے کہ تمہاری سخاوت کا کیا کہنا، اگر تمہیں حاتم طائی دیکھے تو وہ بھی تمہارے آگے سر جھکا دے۔ ایک معنی یہ ہے کہ بس تو ہی ایک عقل مند اور نیک چلن رہ گیا ہے؟ باقی ہم اور ہمارے باپ دادا جاہل اور احمق ہی رہے؟ یہ بھی استہزا اور تمسخر کی ایک صورت تھی۔ (ابن کثیر) شاہ عبدالقادر رشتہ لکھتے ہیں: ”جاہلوں کا دستور ہے کہ نیکوں کے کام آپ نہ کر سکیں تو انہی کو لگیں چڑانے، یہی خصلت ہے کفر کی۔“ (موضح)

آیت 88 ﴿۸۸﴾ قَالَ يَقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ عِزِّي.....: ”بَيِّنَةٍ“ وہ دلیل جس کے ساتھ حق اور باطل واضح اور الگ الگ ہو جائے۔ ”رِزْقًا حَسَنًا“ یہ لفظ تین چیزوں کے لیے آیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نبوت، حلال روزی اور صاف ستھری پاکیزہ زندگی۔ یہاں ”أَرَأَيْتُمْ“ کا جواب محذوف ہے، یعنی اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح

وَذَرَفْنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۖ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَكُمُ عَنْهُ ۗ إِنَّ أُرِيدُ إِلَّا
الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۗ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۗ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿۸۷﴾

اچھا رزق عطا کیا ہو۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تمہاری بجائے میں (خود) اس کا ارتکاب کروں جس سے تمہیں منع کرتا ہوں، میں تو اصلاح کے سوا کچھ نہیں چاہتا، جتنی کرسکوں اور میری توفیق اللہ کے سوا کسی سے نہیں، میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ﴿۸۷﴾

دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھے رزق حسن دیا ہو تو کیا میں اسے چھوڑ کر تمہاری طرح حرام کھانے لگوں اور تمہیں نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا چھوڑ دوں؟ ”رِزْقًا حَسَنًا“ سے معلوم ہو رہا ہے کہ شعیب رضی اللہ عنہ عطاءے نبوت کے ساتھ ساتھ حلال روزی کے ذریعے سے اتنے خاصے مال دار آدمی تھے۔

﴿۸۷﴾ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ : یعنی میں جو تمہیں اللہ کے ساتھ شرک سے اور ماپ تول میں کمی سے منع کر رہا ہوں، اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ تمہیں تو اس سے باز رہنے کی تلقین کروں اور خود اس کا ارتکاب کرتا رہوں، بلکہ میں تم سے جو بات بھی کہتا ہوں، پہلے خود اس پر عمل کرتا ہوں۔ تمام انبیاء رضی اللہ عنہم کا اور سلف صالحین کا بھی یہی شیوہ رہا ہے۔ اس کے برعکس کرنے والوں کا انجام حدیث میں یوں ہے، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يُخَاءُ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقَى فِي النَّارِ فَتَنْدَلِقُ أَقْتَابُهُ فِي النَّارِ، فَيَذُورُ كَمَا يَذُورُ الْحِمَارُ بِرَحَاهُ فَيَحْتَمِعُ أَهْلُ النَّارِ عَلَيْهِ فَيَقُولُونَ يَا فُلَانُ! مَا شَأْنُكَ؟ أَلَيْسَ كُنْتَ تَأْمُرُ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَانَا عَنِ الْمُنْكَرِ؟ قَالَ كُنْتُ أَمُرُكُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَلَا آتِيهِ، وَأَنْهَأَكُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَآتِيهِ» [بخاری، بدء الخلق، باب صفة النار و أنها مخلوقة: ۳۲۶۷] ”ایک آدمی کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ اس کی انتڑیاں تیزی سے باہر نکل پڑیں گی تو وہ اس طرح گھومے گا جیسے گدھا اپنی چکی کے گرد گھومتا ہے، تو جہنمی اس پر اکٹھے ہو جائیں گے اور کہیں گے، اے فلاں! تیرا کیا معاملہ ہے؟ کیا تو ہمیں نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور ہمیں برائی سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا، میں تمہیں نیکی کا حکم دیتا تھا اور خود وہ نیکی نہیں کرتا تھا اور تمہیں برائی سے منع کرتا تھا اور خود اس کا ارتکاب کرتا تھا۔“

﴿۸۸﴾ إِنَّ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ : تاکہ تمہارا دنیا و آخرت میں بھلا ہو۔ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”یہ خصلت ہے اللہ کے نیک لوگوں کی کہ چڑانے سے برانہ مانا اور اپنے مقدر بھر سمجھاتے رہے۔“

﴿۸۹﴾ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ : یعنی آج میں تمہیں جو نصیحت کر رہا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں، اس کو جاری رکھنے اور اس کی کامیابی کا دار و مدار اللہ ہی پر ہے۔

وَيَقَوْمٌ لَا يَجْرِمُكُمْ شِقَاقِي أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ
 قَوْمَ صَالِحٍ ۚ وَمَا قَوْمٌ لَوْطٍ بِتِلْكَ يُعِينِدُ ۙ ۝۸۹ وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي
 رَحِيمٌ وَدُودٌ ۙ ۝۹۰ قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفَقَهُ كَثِيرًا مِمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكُمْ فِينَا ذُعُوبًا
 وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ ۚ وَمَا أَنتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ۙ ۝۹۱

اور اے میری قوم! میری مخالفت تمہیں اس کا مستحق ہرگز نہ بنادے کہ تمہیں اس جیسی مصیبت آچنچے جو نوح کی قوم، یا
 ہود کی قوم، یا صالح کی قوم کو پہنچی اور لوط کی قوم (بھی) ہرگز تم سے کچھ دور نہیں ہے ۝۸۹ اور اپنے رب سے بخشش مانگو،
 پھر اس کی طرف پلٹ آؤ، بے شک میرا رب نہایت رحم والا، بہت محبت والا ہے ۝۹۰ انہوں نے کہا اے شعیب! ہم
 اس میں سے بہت سی باتیں نہیں سمجھتے جو تو کہتا ہے اور بے شک ہم تو تجھے اپنے درمیان بہت کمزور دیکھتے ہیں اور اگر
 تیری برادری نہ ہوتی تو ہم ضرور تجھے سنگسار کر دیتے اور تو ہم پر ہرگز کسی طرح غالب نہیں ۝۹۱

آیت 89 ﴿۱﴾ وَيَقَوْمٌ لَا يَجْرِمُكُمْ شِقَاقِي: ”شِقَاقٍ شِقٌّ“ سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے، بمعنی جانب، یعنی دونوں
 ایک دوسرے کے مخالف سمت میں آنے سامنے ہو جائیں، یعنی صاف مخالفت اور مقابلے پر اتر آنا۔ ”لَا يَجْرِمُكُمْ“ تمہیں آمادہ
 نہ کر دے، تمہیں ابھار نہ دے، تمہیں اس بات کا مجرم نہ بنادے، تمہارے لیے اس کا باعث نہ بن جائے، یہ تمام معانی ہو سکتے ہیں۔
 ﴿۲﴾ وَمَا قَوْمٌ لَوْطٍ بِتِلْكَ يُعِينِدُ: یعنی اگر تمہیں قوم نوح کے فرق ہونے، قوم ہود کے آندھی کے ساتھ ہلاک ہونے اور قوم
 صالح کے چیخ اور زلزلے سے نیست و نابود ہونے سے عبرت نہیں ہوئی، کیونکہ ان کا علاقہ یا زمانہ تم سے دور تھا، تو لوط علیہ السلام کی
 قوم تو تم سے کچھ دور نہیں، نہ اسے زیادہ وقت گزرا ہے اور نہ ان کا علاقہ تمہارے علاقے سے کچھ دور ہے۔ واضح رہے کہ
 جغرافیائی اعتبار سے بھی مدین کا علاقہ اس زمین سے متصل واقع تھا جہاں لوط علیہ السلام کی قوم بسیتی تھی۔

آیت 90 ﴿۱﴾ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ: یعنی میرا رب اپنے بندوں پر نہایت رحم کرنے والا، بہت محبت کرنے والا ہے، اسی
 لیے اس نے تمہیں پہلے خبردار کرنے کا انتظام فرمایا کہ تم آندھ کے لیے باز آ جاؤ اور پچھلے کی معافی مانگو اور اپنے اعمال کے
 انجام بد سے بچ جاؤ۔

آیت 91 ﴿۱﴾ قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفَقَهُ: ”قَفَهُ نَفَقَهُ“ (ع) منکلم کی بات کا مطلب سمجھنا۔ یہ بات انہوں نے استہزا
 اور تحقیر، یعنی شعیب علیہ السلام اور ان کے کلام کو بے وقعت قرار دینے کے لیے کہی، یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے کرتے ان کے ذہن
 اس قدر مسخ ہو چکے تھے کہ شعیب علیہ السلام کی سیدھی باتیں بھی واقعتاً ان کے ذہن میں نہیں آتی تھیں، حالانکہ شعیب علیہ السلام نہ کسی
 غیر زبان میں گفتگو کرتے تھے اور نہ ان کا انداز بیان ہی پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا، بلکہ شعیب علیہ السلام کی گفتگو سے صاف پتا چل رہا
 ہے کہ وہ کتنے بڑے فصیح اللسان خطیب تھے۔ مفسر ابوالسعود کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات کہ ”ہم تیری بات کا

قَالَ يَقَوْمِ ارْهَطِيْ اَعْرُ عَلَيْكُمْ فِىنَ اللّٰهِ ۙ وَاَتَّخِذْ سُوۡءَ وِرَآءِكُمْ ظَهْرِيۡا ۙ اِنَّ رِيفِيۡ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
 مُحِيۡطٌ ﴿۹۲﴾ وَيَقَوْمِ اشْكُوۡا عَلٰى مَكَاتَتِكُمْ اِنِّىۡۤ اَعْلَمُ ۙ سُوۡفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ لَمَنْ يَّاتِيۡهِ عَذَابٌ يُخْزِيۡهِ
 وَ مَنۢ هُوَ كَاذِبٌ ۙ وَاِرْتَقِبُوۡا اِنِّىۡۤ اَمَعَكُمْ رَقِيۡبٌ ﴿۹۳﴾

اس نے کہا اے میری قوم! کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ غالب ہے اور اسے تم نے اپنی پیٹھ پیچھے پھینکا ہوا بنا رکھا ہے، بے شک میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو، اس کا احاطہ کرنے والا ہے ﴿۹۲﴾ اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ عمل کرو، بے شک میں (بھی) عمل کرنے والا ہوں۔ تم جلد ہی جان لو گے کہ کون ہے جس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے گا اور کون ہے جو جھوٹا ہے، اور انتظار کرو، بے شک میں (بھی) تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں ﴿۹۳﴾

مطلب ہی نہیں سمجھتے، اس وقت کہی جب وہ بہترین اور بلیغ ترین طریقے سے شعیب ؑ سے حق اور اس کے ایسے واضح دلائل سن چکے جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اب اس سے آگے ان کے پاس کوئی بات باقی ہی نہ تھی جو وہ کہہ سکتے، تو جس طرح کوئی بندہ لاجواب ہو کر بدزبانی، گالی گلوچ اور دھمکیوں پر اتر آتا ہے، یہی کام انھوں نے کیا۔

﴿۹۲﴾ وَاِنَّا لَنَرٰكَ فَيِنَّا ضَعِيۡفًا : یعنی نہ تیرے پاس فوج ہے، نہ حکومت اور نہ زکوٰۃ۔

﴿۹۳﴾ وَاِنَّا لَنَرٰكَ لَرَهۡطًا لِّرَجَمٰتِكَ : جو ہمارے دین پر ہیں، لیکن تیری پشت پناہی کر رہے ہیں۔

﴿۹۴﴾ وَمَا اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيۡزٍ : ”عزیز“ معزز، محبوب اور قوی، یعنی تو ہم پر کسی طرح بھی عزیز نہیں ہے، نہ ہم تمہاری کچھ عزت سمجھتے ہیں، نہ ہمیں تجھ سے کوئی محبت ہے اور نہ تو ہم سے طاقت میں بڑھ کر ہے۔ غرض تجھے سنگسار کرنا ہمیں کچھ بھی مشکل نہیں، اگر تیرے قبیلے کے لوگ جو ہمارے ہی دین پر ہیں، تیری پشت پر نہ ہوتے تو ہم ضرور تجھے سنگسار کر دیتے۔ جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئیں بالکل وہی صورت حال نبی ؐ کو مکہ معظمہ میں درپیش تھی۔ قریش آپ ؐ کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اور ہر ممکن طریقے سے آپ کی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے، لیکن چونکہ بنو ہاشم آپ کی پشت پر تھے اور خاص طور پر آپ کے چچا ابوطالب آپ کی پوری طرح حفاظت کر رہے تھے، اس لیے قریش کو آپ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

آیت 92 ﴿۹۲﴾ قَالَ يَقَوْمِ ارْهَطِيْ اَعْرُ عَلَيْكُمْ ”ظہر“ کی طرف منسوب ہے نسبت کی وجہ سے ظاہر پر کسرہ آ گیا ہے۔ یہاں سے شعیب ؑ کا لہجہ کچھ سختی میں بدل جاتا ہے، فرماتے ہیں، کیا میری برادری تمہارے نزدیک اللہ سے بھی زیادہ معزز اور قوی ہے، جس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اس ہر شے کے مالک کو تو تم نے ایسے سمجھ رکھا ہے جیسے کوئی بے وقعت چیز پیٹھ پیچھے پھینک دی گئی ہوتی ہے۔ مقصد یہ کہ اللہ کے بھیجے ہوئے کی پروانہ کرنا اور اصل اللہ تعالیٰ کی بے دستی اور بے قدری کرنا ہے۔

﴿۹۳﴾ اِنَّ رِيفِيۡ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيۡطٌ : وہ تمہارے تمام اعمال (جن میں ان کے اقوال، ارادے، سازشیں اور وہ سب کچھ شامل ہے جو وہ شعیب ؑ کے خلاف کر رہے تھے) سے پوری طرح واقف ہے، کوئی چیز اس کے احاطے سے باہر نہیں۔

آیت 93 ﴿۹۳﴾ وَيَقَوْمِ اشْكُوۡا عَلٰى مَكَاتَتِكُمْ : اس آیت میں لہجہ بھجلی آیت سے بھی سخت ہے، کیونکہ شعیب ؑ ان کے

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَ أَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جُثَيِّينَ ﴿۱۳۴﴾ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۚ أَلَا بُعْدًا لِّلْمُتَدِينِ ﴿۱۳۵﴾ كَمَا بَعَدَتْ ثَمُودُ ﴿۱۳۶﴾

اور جب ہمارا حکم آیا ہم نے شعیب کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ہمراہ ایمان لائے تھے، اپنی خاص رحمت سے بچالیا اور ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا تھا، چیخ نے پکڑ لیا، تو انہوں نے اپنے گھروں میں اس حال میں صبح کی کہ گھرے پڑے تھے ﴿۱۳۴﴾ جیسے وہ ان میں نہیں رہے تھے۔ سن لو! مدین کے لیے ہلاکت ہے، جیسے ثمود ہلاک ہوئے ﴿۱۳۵﴾

اللہ تعالیٰ کی سطوت و عزت سے بے بس انسانوں کی عزت و سطوت زیادہ سمجھنے اور ان کے ایمان لانے سے ناامید ہونے پر انہیں اللہ کے عذاب کی دھمکی دے رہے ہیں کہ تم اپنی جگہ عمل کرو، میں بھی اپنے رب کے بتائے ہوئے طریقے پر دعوت کا کام جاری رکھوں گا۔ نتیجہ بہت جلد سامنے آ جائے گا۔ ان دونوں آیات میں کفار کی ان تمام باتوں کا جواب موجود ہے جو کھجلی آیت میں ذکر ہوئی ہیں کہ تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہیں، ہم تجھے اپنے میں کمزور دیکھتے ہیں، صرف اپنی برادری کی وجہ سے تو سنگسار ہونے سے بچا ہوا ہے، ورنہ ہمارے ہاں تیری نہ کوئی عزت ہے نہ طاقت۔ فرمایا بہت جلد ان تمام باتوں کا فیصلہ ہو جائے گا۔ کس کی قوت زیادہ ہے، کون سنگسار ہوتا ہے، کون سچا ہے اور کون جھوٹا، فیصلہ ہو چکا، اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ یہ فیصلہ کس طرح عمل میں آتا ہے۔ سو تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔

آیت ۹۵، ۹۴ ﴿۱﴾ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا : یہ اللہ تعالیٰ کے ہر قوم پر آنے والے عذاب کی عجیب صفت ہے کہ اس نے اہل ایمان کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا، نہ آندھی نے، نہ چیخ نے اور نہ زلزلے نے۔ صرف کفار اور ظالم مشرک ہی اس سے برباد ہوئے۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۵۷) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ اللہ کے حکم سے آنے والے اس عذاب کو سورہ اعراف (۹۱) اور عنکبوت (۳۷) میں ”الرَّجْفَةُ“ یعنی زلزلہ فرمایا، یہاں ”الصَّيْحَةُ“ یعنی چیخ فرمایا اور سورہ شعراء (۱۸۹) میں ”عَذَابٌ يُؤْوِرُ الظَّلَمَةَ“ سنا سنا کر کے دن والا عذاب فرمایا۔ اس لیے زیادہ واضح بات یہی نظر آتی ہے کہ پہلے ”الصَّيْحَةُ“ چنگھاڑ یا سخت چیخ بلند ہوئی، جب وہ حد سے گزری تو شدید زلزلہ آ گیا جس نے پہاڑوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا اور اس آواز سے کفار کے دل اور جگر پھٹ گئے اور جو جہاں تھا وہیں پڑا رہ گیا۔ زلزلے نے باقی کسر پوری کر دی اور تمام کفار کا نام و نشان اس طرح مٹا جیسے وہ یہاں کبھی رہے ہی نہ تھے۔ آج بھی مدین کے علاقے میں سیکڑوں میل تک جو پہاڑ پائے جاتے ہیں، ان پر زلزلے کے آثار واضح ہیں۔ تمام پہاڑ اس طرح پھٹے ہوئے ہیں جیسے کسی زبردست زلزلے نے انہیں کھیل کھیل کر دیا ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ تمام عذاب ان پر آئے مگر آیات کے سیاق میں ہر مقام کے مطابق جو عذاب تھا اس کا ذکر ہوا۔ سورہ اعراف (۸۸) میں کفار کا قول ذکر ہوا تھا: ﴿لَنُخْرِجَنَّكَ يَشُعَيْبُ

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿۹۶﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَ مَلَآئِهِ فَاتَّبَعُوا أَمْرًا

فِرْعَوْنَ ۗ وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ ﴿۹۷﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور واضح دلیل دے کر بھیجا ﴿۹۶﴾ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف۔ تو انھوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی اور فرعون کا حکم ہرگز کسی طرح درست نہ تھا ﴿۹۷﴾

وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَوْمِ يَثْرَبَ ﴿۹۸﴾ ”اے شعیب! ہم تجھے اور تجھ پر ایمان لانے والوں کو اپنی ہستی سے نکال دیں گے۔“ وہاں ”الزَّجَفَةَ“ کا ذکر ہے کہ یہ ہے وہ ہستی جہاں سے تم نبی کو نکالنا چاہتے تھے۔ یہاں سورہ ہود میں جب انھوں نے پیغمبر کی گستاخی کی تو اس کی مناسبت سے چیخ کا ذکر فرمایا اور سورہ شعراء میں ان کا مطالبہ تھا کہ ہم پر آسمان کا ٹکڑا گرا دے تو وہاں سائبان والے عذاب کا ذکر فرمایا۔

﴿۹۸﴾ أَلَا بَعْدَ الْمَدْيَنَ كَمَا بَعَدَتْ ثَمُودُ : یعنی قوم شعیب پر ویسی ہی ہلاکت مسلط ہوئی جیسی ثمود پر ہوئی، ان کے علاقے بھی ایک دوسرے کے قریب تھے اور کفر و سرکشی میں بھی دونوں تو میں ایک جیسی تھیں اور دونوں عرب تھے۔

آیت 96 ﴿۹۶﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِينٍ : اللہ تعالیٰ نے موسیٰ ﷺ کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف اپنی جو آیات اور ”سُلْطٰنٍ مُّبِينٍ“ (واضح دلیل) دے کر بھیجا تھا، ان سے کیا مراد ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ موسیٰ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے نو آیات بیانات دی تھیں (دیکھیے بنی اسرائیل: ۱۰۱) جو دوماً ثوماً ظاہر ہوئیں: ﴿۱﴾ عصائے موسیٰ ﴿۲﴾ ید بیضا ﴿۳﴾ سنین (قطب سالیان) ﴿۴﴾ نقص من الثمرات ﴿۵﴾ طوفان ﴿۶﴾ جراد ﴿۷﴾ قمل ﴿۸﴾ غفادع ﴿۹﴾ دم، انھی کو ”سُلْطٰنٍ مُّبِينٍ“ کہا گیا ہے۔ واو ہمیشہ مغایرت کے لیے نہیں ہوتی، جیسا کہ سورہ عصر میں فرمایا: ﴿۱۰﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۱۱﴾ اس میں ہر بعد والی چیز اپنے سے پہلے والی تمام چیزوں میں داخل اور اس کا حصہ ہے۔ ایک جواب یہ ہے کہ ”سُلْطٰنٍ مُّبِينٍ“ سے مراد عصائے موسیٰ اور ید بیضا ہیں، جو سب سے پہلے موسیٰ ﷺ نے فرعون کے سامنے اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر پیش کیے۔ ان کی خصوصیت کے پیش نظر انھیں علیحدہ بھی ذکر فرمایا، حالانکہ یہ آیات میں داخل تھے اور ایک جواب یہ کہ ”سُلْطٰنٍ مُّبِينٍ“ سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ پیغام ہے جو موسیٰ اور ہارون ﷺ فرعون کے پاس لے کر گئے اور وہ عقلی اور فطری دلائل ہیں جو لامی پھینکنے سے پہلے موسیٰ ﷺ نے فرعون سے بحث کے دوران پیش فرمائے اور وہ ان دلائل سے لا جواب ہو کر قید کی دھمکی دینے لگا اور مجزے کا مطالبہ کرنے لگا۔ دیکھیے سورہ طہ (۲۷ تا ۵۵) اور شعراء (۱۵ تا ۲۹) یہ تینوں تفسیریں صحیح ہیں۔ بعض حضرات نے ”بِآيَاتِنَا“ سے مراد نو معجزے اور ”سُلْطٰنٍ مُّبِينٍ“ سے مراد تورات بیان کی ہے، مگر تورات تو فرعون کے غرق ہونے کے بعد نازل ہوئی، اس لیے یہ تفسیر صحیح نہیں۔

آیت 97 ﴿۹۷﴾ ﴿۱﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَ مَلَآئِهِ : یہاں فرعون کے ساتھ اس کے سرداروں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہی اس کے احکام کو نافذ کرنے والے تھے۔ بقول ربمشری ان کی جہالت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ فرعون کے احکام کے پیچھے لگے

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ ﴿۹۸﴾ وَاتَّبِعُوا فِي هَذِهِ

لَعْنَةً وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ ﴿۹۹﴾

وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے ہوگا، پس انھیں پینے کے لیے آگ پر لے آئے گا اور وہ پینے کی بری جگہ ہے، جس پر پینے کے لیے آیا جائے ﴿۹۸﴾ اور ان کے پیچھے اس (دنیا) میں لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ برا عطیہ ہے جو کسی کو دیا جائے ﴿۹۹﴾

رہے، حالانکہ وہ احکام عقل کے صریح خلاف تھے، مثلاً اپنے جیسے ایک انسان کے رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ مان لینا جس میں ہر انسانی کمزوری پائی جاتی ہے اور حد سے بڑھ کر ظلم و ستم، مثلاً معصوم بچوں کو قتل کرنے وغیرہ کے حکم پر عمل کرنا، مگر فرعون نے انھیں اس قدر ہلکا اور ذلیل کیا ہوا تھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود فرعون ہی کے پیچھے لگے رہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے میں انھیں اپنا فسق (نافرمانی) چھوڑنا پڑتا تھا، فرمایا: ﴿فَاسْتَحَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ﴾ [الرعرع: ۵۴] ”غرض اس نے اپنی قوم کو ہلکا (اور بے وزن) کر دیا تو انھوں نے اس کی اطاعت کر لی، یقیناً وہ نافرمان لوگ تھے۔“

﴿۹۸﴾ وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ: ”رَشِيدٌ“ (ن، ف) سے ”رَشِيدٌ“ وہ شخص جس کی رائے درست اور سوچ اچھی ہو، یہاں فرعون کے حکم کو فرمایا کہ وہ ہرگز کسی طرح درست نہ تھا، بلکہ واضح طور پر گمراہی پر مبنی تھا۔ اتنی تاکید نفی کی باء اور ”بِرَشِيدٍ“ کی تئوین سے حاصل ہو رہی ہے۔

آیت 98 ﴿۹۸﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.....: ”قَدِمَ يَقْدُمُ“ (ع) آنا اور ”قَدِمَ يَقْدُمُ“ (ن) آگے ہونا ”فَأَوْرَدَهُمُ“ ”وَرَدٌ“ (واو کے کسرہ کے ساتھ) وہ پانی جسے پینے کے لیے لوگ اور جانور آتے ہوں، یعنی گھاٹ۔ ”أَوْرَدَ“ باب افعال سے ماضی معلوم ہے، یعنی جس طرح دنیا میں وہ اپنے لوگوں کا پیشوا تھا، اسی طرح آخرت میں بھی ان کا پیشوا ہوگا اور پینے کے لیے انھیں لے کر پانی کے گھاٹ پر جانے کے بجائے خود آگے ہو کر سب کو آگ میں لے جائے گا۔ یہی حال ان تمام لوگوں کا ہوگا جو کسی قوم کی رہنمائی کفر اور معصیت کی طرف کرتے ہیں کہ وہ انھی کی قیادت میں چل کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ ”يَقْدُمُ“ مضارع ہے، آگے ہوگا، اس کے بعد مضارع ”يُورِدُهُمْ“ (انھیں آگ پر لے آئے گا) کے بجائے ”فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ“ (وہ انھیں آگ پر لے گیا) ماضی کا لفظ یقین کے لیے استعمال فرمایا۔

﴿۹۹﴾ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ: پینے کی جگہ تو لوگ پیاس بھانے کے لیے جاتے ہیں، مگر وہاں پانی کے بجائے آگ سے ان کی مہمان داری کی جائے گی۔ (والعیاذ باللہ)

آیت 99 ﴿۹۹﴾ وَاتَّبِعُوا فِي هَذِهِ لَعْنَةً.....: یعنی آگ کے علاوہ انھیں یہ سزا بھی دی گئی کہ رہتی دنیا تک لوگ ان پر پھنکار بھیجتے رہیں گے اور قیامت کے دن ان پر جو پھنکار پڑے گی اس کا حال تو معلوم ہی ہے۔ ان آیات میں فرعون کو صریح دوزخی

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْقُرٰى نَقَّضَهَا عَلَيْكَ مِنْهَا قَائِمٌ وَ حَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ
 ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَمَا اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اَلنَّارُ
 جَاءَ اَقْرَبًا رَّبِّكَ ﴿۱۰۱﴾ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتٰبٍ ﴿۱۰۲﴾

یہ ان بستیوں کی چند خبریں ہیں جو ہم تجھے بیان کرتے ہیں، ان میں سے کچھ کھڑی ہیں اور کچھ کٹ چکی ہیں ﴿۱۰۰﴾ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا، پھر ان کے وہ معبود ان کے کچھ کام نہ آئے جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے، جب تیرے رب کا حکم آگیا اور انھوں نے ہلاک کرنے کے سوا انھیں کچھ زیادہ نہ دیا ﴿۱۰۱﴾

تایا گیا ہے، مگر بعض لوگوں نے اسلام کو مٹانے کے لیے تصوف کے پردے میں وحدت الوجود کا عقیدہ ایجاد کیا اور کہا کہ ہر چیز ہی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، سو فرعون ”اَنَا رَبُّكُمْ الْاَعْلٰی“ کہنے میں غلط نہ تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک حسین بن منصور حلاج، جسے عام طور پر منصور کہتے ہیں، کامل ولی تھا، کیونکہ وہ کہتا تھا کہ میں خدا ہوں۔ وہ اصل حقیقت کو پا گیا تھا اور صاف کہتا تھا کہ ”اَنَا الْحَقُّ“ مگر اس وقت اسلام کے محافظ غلیظہ وقت نے اس کفریہ عقیدے کے ثابت ہونے پر اسے سولی پر چڑھا دیا۔ ان وجودی لحدوں کے کہنے کے مطابق وہ سولی پر چڑھ گیا، مگر حق کہنے سے باز نہ آیا۔ ایسے کفریہ الفاظ اور عقیدے پر اللہ کی پھینکار جس کے نتیجے میں خالق و مخلوق کا فرق ختم، جنت و دوزخ کا فرق ختم اور شریعت کا ہر حکم ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جب کہا جائے کہ فرعون اپنی سرکشی کی پاداش میں سمندر میں غرق کر دیا گیا تو وہ کہتے ہیں کہ فرعون دراصل بحرِ قحید میں غرق تھا۔ غرض اس طرح کی صریح کفری باتیں جو صاف قرآن کے خلاف ہیں، کہتے ہیں، مگر مسلمانوں میں شامل رہنے اور انھیں گمراہ کرنے کے لیے اسلام کا لبادہ اوڑھے رکھتے ہیں، حالانکہ یہ عقیدہ اس اسلام کے صریح مخالف ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے آیا اور قرآن و حدیث کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس عقیدے کی رو سے نیکی و بدی، شرک و توحید، نکاح و زنا، غرض ہر اطاعت اور نافرمانی کا فرق ہی مٹ جاتا ہے اور انبیاء و رسل اور کتب الہیہ سب بے کار ٹھہرتے ہیں۔ [نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْعَقِيْدَةِ الْمَلْعُوْنَةِ] قرآن مجید میں صراحت ہے کہ آل فرعون کو مرتے ہی آگ نے گھیر لیا اور قیامت کو وہ سخت ترین عذاب میں داخل ہوں گے۔ دیکھیے سورۃ مومن (۲۶، ۲۵)۔

﴿۱۰۰﴾ ”الزُّفُوْدُ“ کا معنی عطیہ، ”الْمَرْفُوْدُ“ جو انھیں دیا گیا، یعنی دنیا اور آخرت میں لعنت کا عطیہ۔ لعنت کو عطیہ اور انعام بطور مذاق فرمایا ہے، جیسے فرمایا: ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْنٍ﴾ [آل عمران: ۲۱] ”سو انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دے۔“

آیت 100 ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْقُرٰى : ”صن“ تعبیض کے لیے ہے، یعنی گزشتہ بستیوں کی یہ چند خبریں ہیں جو ہم آپ کو بیان کر رہے ہیں۔ اس سورت میں انبیاء کے حالات زمانے کی ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، یعنی نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، شعیب اور موسیٰ علیہم السلام۔ ”قَائِمٌ“ کھڑی (کھیتی)، ”حَصِيْدٌ“ وہ کھیتی جو کاٹی جا چکی ہو، یعنی ان بستیوں میں سے بعض کے نشانات اب بھی قائم ہیں، مثلاً صالح علیہ السلام کی قوم کے پہاڑوں میں تراشے ہوئے مکانات اور بعض کے نام و نشان تک مٹ چکے ہیں، جیسے کئی ہوئی کھیتی کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔

آیت 101 ﴿۱۰۱﴾ ﴿وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ : یعنی ہم نے جو ان پر عذاب بھیجا اس میں ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ انھوں نے

وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۖ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ﴿۱۰۲﴾ إِنَّ
 فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمَن خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ۖ ذَلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذَلِكَ
 يَوْمٌ مَّشْهُودٌ ﴿۱۰۳﴾

اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے، جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، اس حال میں کہ وہ ظلم کرنے والی ہوتی ہیں، بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک، بہت سخت ہے ﴿۱۰۲﴾ بے شک اس میں اس شخص کے لیے یقیناً ایک نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرے، یہ وہ دن ہے جس کے لیے (سب) لوگ جمع کیے جانے والے ہیں اور یہ وہ دن ہے جس میں حاضری ہوگی ﴿۱۰۳﴾

خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اپنی جانوں پر ان کا سب سے بڑا ظلم اللہ کے ساتھ شرک اور پھر رسولوں کو جھٹلانا تھا، جس کی انھیں سزا ملی۔ ﴿۱۰۲﴾ فَمَا آخَذَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي پھر اللہ کا عذاب آنے پر ان کے معبود، حاجت روا، مشکل کشا، گنج بخش اور دیگر ان کے کسی کام نہ آسکے، بلکہ وہ ان کے لیے ہلاک کیے جانے میں اور عذاب میں اضافے ہی کا سبب بنے، کیونکہ انھی کی وجہ سے ان پر تباہی اور بربادی آئی۔ ”تَتَّيَّبُ“ فعل ”تَبَّ“ (وہ ہلاک ہوا) سے باب تفعیل ہے، ہلاک کرنا۔

آیة 102 : وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ : ”أَخَذَ“ کا معنی اچانک جلدی سے پکڑ لینا، جیسا کہ کہتے ہیں: ”فُلَانٌ أَخَذَهُ الْمَوْتُ“ فلاں کو موت نے آدبوچا۔ یعنی جس طرح گزشتہ سات انبیاء علیہم السلام کی اقوام پر ظلم کی وجہ سے پکڑ آئی، کسی بھی ظالم بستی (والوں) پر تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَيَمْلِكُ لِلظَّالِمِ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۖ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾﴾ [بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ﴾ ۶۶۸۶۔ مسلم: ۲۵۸۳] اللہ تعالیٰ ظالم کو ذلیل دیتا ہے، لیکن آخر کار جب اسے پکڑتا ہے تو ایسا پکڑتا ہے کہ وہ اس سے چھوٹ کر کہیں جا نہیں سکتا۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ یہ آیت ہر زمانے میں ہر ظالم کو شامل ہے۔ سلف میں سے کسی نے کہا ہے: ”کفر کے ساتھ سلطنت قائم رہ سکتی ہے مگر ظلم کے ساتھ نہیں۔“

آیة 103 : ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمَن خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ﴾: یعنی ان آیات و واقعات سے وہی عبرت حاصل کرے گا جس کا آخرت پر ایمان ہے، مگر جس کا آخرت پر ایمان نہیں وہ ان تمام واقعات کی کوئی نہ کوئی سائنسی توجیہ کرے گا کہ زمین و آسمان کے تغیرات کی وجہ سے ایسا ہوا، ظلم یا عدل سے اس کا کیا تعلق؟

﴿ذَلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ﴾: یعنی وہ قیامت کا دن ایسا ہے جس کے لیے تمام لوگ جمع کیے ہوئے ہوں گے۔ زمخشری نے فرمایا کہ فعل مجہول ”يُجْمَعُ لَهُ“ (جمع کیے جائیں گے) کے بجائے اسم مفعول ”مَجْمُوعٌ لَهُ“ (جمع کیے ہوئے ہوں گے)

وَمَا نُؤْتِرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مُّعَدُّودٍ ﴿۱۰۴﴾ يَوْمَ يَأْتُ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۖ فَمِنْهُمْ سُقِيَ وَسَعِيدٌ ﴿۱۰۵﴾

اور ہم اسے مؤخر نہیں کر رہے، مگر ایک گننے ہوئے وقت کے لیے ﴿۱۰۴﴾ جس دن وہ (وقت) آئے گا، کوئی شخص اس کی اجازت کے سوا بات نہیں کرے گا، پھر ان میں سے کوئی بد بخت ہوگا اور کوئی خوش قسمت ﴿۱۰۵﴾ اس لیے استعمال فرمایا کہ ہم میں دوام اور پختگی پائی جاتی ہے جب کہ فعل میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

﴿۱۰۴﴾ وَذَلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ: یعنی اس میں سب لوگ حاضر کیے ہوئے ہوں گے، کوئی چھپ سکے گا نہ ادھر ادھر ہو سکے گا۔ ایک معنی یہ ہے کہ اس دن ہر نیکی یا بدی کی شہادت موجود ہوگی اور پیش بھی کی جائے گی۔ یہ بھی مراد ہے کہ اس دن پہلے، پچھلے انسان اور جن سب حاضر ہوں گے، فرشتے بھی اور خود ذات الہی بھی فیصلے کے لیے تشریف لائیں گے، فرمایا: ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالنَّارُكُ صَفًا صَفًا﴾ [الفجر: ۲۲] ”اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے۔“

آیت 104 ﴿وَمَا نُؤْتِرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مُّعَدُّودٍ﴾: ”مُعَدُّودٌ“ کا معنی ہے گنا ہوا۔ گنی ہوئی چیز آخر ختم ہو جاتی ہے، یعنی قیامت کی مہلت گنتی کے چند دن ہیں، جیسے روزوں کے متعلق فرمایا: ﴿أَيُّهَا مَنَعَدُوذَاتِ﴾ [البقرة: ۱۸۴] ”گنے ہوئے چند دنوں میں۔“ اور وہ گنتی صرف اللہ کے علم میں ہے، قیامت نہ اس سے پہلے آسکتی ہے، نہ اس سے مؤخر ہو سکتی ہے۔

آیت 104 ﴿يَوْمَ يَأْتُ﴾: یہاں چند آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس دن کا کچھ نقشہ بیان فرمایا ہے۔ ”يَأْتُ“ اصل میں ”يَأْتِي“ ہی ہے۔ زحمری نے لکھا ”يَوْمَ يَأْتُ“ کی طرح ”لَا أُذِرُ“ بھی کہہ دیتے ہیں۔ سیبویہ اور غلیل نے یہ بیان فرمایا ہے کہ یاء کو حذف کر کے اس کی جگہ کسرہ پر اکتفا کرنا بذیل کی لغت میں بہت ہے (یعنی دوسری لغات میں بھی ہے مگر کم ہے)۔ ”يَأْتُ“ کا فاعل وہی ہے جو اوپر گزرا ”يَوْمَ تَجْمَعُ دَلَّةُ النَّاسِ“۔ ”يَوْمُ“ کا لفظ عربی میں وقت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ”التحریر والتنوير لابن عاشور“ یعنی جس دن وہ وقت آئے گا، یا جس وقت وہ دن آئے گا۔ زحمری نے ایک معنی یہ لکھا ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ آئے گا، یعنی ”يَأْتُ“ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالنَّارُكُ صَفًا صَفًا﴾ [الفجر: ۲۲] ”اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے۔“

﴿۱۰۵﴾ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ: یہاں سے نصرانیوں کی اور بعض مسلمانوں کی اس سفارش کا رد ہو گیا جو ان کے خیال میں کچھ ہستیوں کے اختیار میں ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ہونے یا بڑے زبردست ہونے کی وجہ سے جسے چاہیں گے چھڑا لیں گے، حالانکہ وہاں اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کو بات کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوگی۔ دیکھیے سورہ نبا (۳۸)۔

﴿۱۰۵﴾ فَمِنْهُمْ سُقِيَ وَسَعِيدٌ: ”سُقِيَ“ بروزن ”فَعِيلٌ“ مبالغہ کے لیے ہے۔ قاموس میں ہے ”السَّقَاءُ“ کو کبھی ”السَّقَاءُ“ بھی کہا جاتا ہے، سخی، سخی۔ ”سُقِيَ يَسْقِي“ (ع) یہ ”رَضِي يَرْضِي“ کی طرح ہے، یعنی ناقص وادی ہے۔ زحمری نے فرمایا: ”الَّذِي وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ بِإِسَاءَتِهِ“ یعنی وہ بد بخت جس کے لیے اس کی بد عملی کی وجہ سے آگ واجب ہو گئی۔ ”سَعِيدٌ“ وہ

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُّوا فِي النَّارِ لَهْمٌ فِيهَا زَفِيرٌ وَ شَهِيْقٌ ۝ خُلِدِيْنَ فِيهَا مَا دَامَتِ
السَّمَوْتُ وَ الْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ سَعَدُوا

تو وہ جو بد بخت ہوئے سو وہ آگ میں ہوں گے، ان کے لیے اس میں گدھے کی طرح آواز کھینچنا اور نکالنا ہے ۝
ہمیشہ اس میں رہنے والے، جب تک سارے آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جو تیرا رب چاہے۔ بے شک تیرا رب کر
گزرنے والا ہے جو چاہتا ہے ۝ اور وہ گئے وہ جو خوش قسمت بنائے گئے تو وہ جنت میں ہوں گے، ہمیشہ اس میں
خوش قسمت جس کے لیے اس کے نیک اعمال کی وجہ سے جنت واجب ہوگی۔

آیت 106 ﴿ فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُّوا : ”زَفِيرٌ“ اور ”شَهِيْقٌ“ دونوں گدھے کی آوازیں ہیں۔ ”زَفِيرٌ“ اس کے شروع
کی آواز اور ”شَهِيْقٌ“ اس کے آخر کی آواز، یعنی نہایت بری چیخنے چلانے کی آوازیں نکالیں گے۔

آیت 107، 108 ﴿ ۱ خُلِدِيْنَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوْتُ وَ الْأَرْضُ : ”جب تک سارے آسمان و زمین قائم ہیں“ مراد
ہمیشہ کا عذاب ہے، کیونکہ جب کسی چیز کی بیگلی ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے تو عرب ”مَا دَامَتِ السَّمَوْتُ وَ الْأَرْضُ“ کا محاورہ
استعمال کرتے ہیں، ورنہ تطبیق نہیں، یعنی یہ معنی نہیں کہ جب تک آسمان و زمین قائم رہیں گے عذاب رہے گا پھر نہیں۔ ہاں آسمان و
زمین سے مراد آخرت کے آسمان و زمین ہوں تو محاورے کے بغیر ہی بیگلی مراد ہے، کیونکہ دنیا کے زمین و آسمان تو اس دن
بدل دیے جائیں گے، فرمایا: ﴿ يَوْمَ تَبْدُلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَ السَّمَوْتُ وَ بَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [ابراہیم: ۴۸]
”جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل دی جائے گی اور سب آسمان بھی اور لوگ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، جو اکیلا ہے، بڑا
زبردست ہے۔“ آخرت کے آسمان و زمین میں جنت واقع ہوگی اور وہ ہمیشہ رہنے والی ہے۔ لہذا وہ زمین و آسمان بھی دائمی
ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کا قول ذکر فرمایا: ﴿ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْزَنَا الْأَرْضَ خَسَفْنَا
مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ﴾ [الزمر: ۷۴] ”اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا
اور ہمیں اس زمین کا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں جگہ بنالیں۔“ تو مطلب یہ ہوگا کہ جہنمی جہنم میں اور جنتی جنت
میں ہمیشہ رہیں گے۔ (ابن کثیر)

﴿ ۲ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ : یہ لفظ ”شَقِيْقٌ“ اور ”سَعِيْدٌ“ دونوں کے تذکرے میں آئے ہیں، یعنی بد بخت آگ میں ہمیشہ رہیں گے
جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے۔ اسی طرح سعادت مندوں کے متعلق بھی فرمایا کہ وہ ہمیشہ جنت میں
رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے۔ دونوں آیتوں میں ”مگر جو تیرا رب چاہے“ کا تعلق الہی توحید
سے ہے۔ پہلی آیت میں مطلب یہ ہوگا کہ مومن موعود گناہ گار جب اپنی سزا بھگت لیں گے تو انہیں جہنم سے نکال لیا جائے گا،
جیسا کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ﴿ يَدْخُلُ أَهْلُ الْحَنَّةِ الْجَنَّةَ وَأَهْلُ النَّارِ النَّارَ ثُمَّ يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى
أَخْرَجُوا مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ، فَيَخْرَجُونَ مِنْهَا قَدِ اسْوَدُّوا فَيَلْقَوْنَ فِي

فِي الْجَنَّةِ خُلْدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوْتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ عَطَاءٌ

عَزَّ وَجَلَّ ۝۸۰

رہنے والے، جب تک سارے آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جو تیرا رب چاہے۔ ایسا علیہ جو قطع کیا جائے والا نہیں ۝۸۰

نَهْرُ الْحَيَاةِ أَوْ الْحَيَاةِ، شَكَّ مَالِكٌ فَيَبْتُؤُونَ كَمَا تَبَّتْ الْجَبَّةُ فِي حَانِبِ السَّيْلِ، أَلَمْ تَرَ أَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ مُلْتَوِيَةً؟» [بخاری، ایمان، باب تفاضل أهل الإيمان في الأعمال: ۲۲ - مسلم: ۱۸۴۰] "اہل جنت، جنت میں اور اہل نار آگ میں داخل ہو جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "جس شخص کے دل میں ایک رائی کے دانے کے برابر ایمان ہے اسے اس سے نکال لو!" تو وہ اس سے اس حال میں نکالے جائیں گے کہ سیاہ ہو چکے ہوں گے، پھر انھیں "نَهْرُ الْحَيَاةِ" (بارش کے پانی کی نہر) یا "نَهْرُ الْحَيَاةِ" (زندگی کی نہر) میں ڈال دیا جائے گا (امام مالک کو شک ہے) تو وہ اس طرح آگ آئیں گے جیسے بوٹیوں کا بیج سیلاب کی جانب میں آگ آتا ہے۔ تم نے نہیں دیکھا کہ وہ زرد لپٹا ہوا آگتا ہے؟"

اس مفہوم کی بہت سی احادیث آئی ہیں کہ سزا پا کر یا شفاعت سے یا محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے گناہ گار مسلمان آخر کار جہنم سے نکل کر جنت میں چلے جائیں گے، اس پر اہل سنت کا اتفاق ہے۔ گو بعض نے اس سے دوزخ کے بالآخر فنا ہونے پر استدلال کیا ہے اور اس سلسلے میں ایک ضعیف حدیث اور کچھ غریب اقوال بھی نقل کیے ہیں، مگر یہ مطلب قرآن کی دوسری آیات کے خلاف ہے، جن میں جہنمیوں کے متعلق "خُلْدِينَ" اور "أَبَدًا" کے الفاظ مذکور ہیں اور ان احادیث کے بھی صریح خلاف ہے، جن میں ہے: «يُخَاءُ بِالْمَوْتِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَكَانَةٌ سَكَبَشْ أَمْلَحَ حَتَّى يُجْعَلَ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، ثُمَّ يُذْنَعُ، ثُمَّ يُنَادِي مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! لَا مَوْتَ، يَا أَهْلَ النَّارِ! لَا مَوْتَ، فَيَرْدَادُ أَهْلَ الْجَنَّةِ فَرَحًا إِلَى فَرَاحِهِمْ، وَيُرْدَادُ أَهْلَ النَّارِ حُزْنًا إِلَى حُزْنِهِمْ» [مسلم، الجنة و نعيمها، باب النار يدخلها الجبارون: ۲۸۴۹، ۲۸۵۰، ۲۸۵۱ - بخاری:

۶۵۴۸] "موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں جنت اور جہنم کے درمیان لا کر ذبح کر دیا جائے گا اور اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ اے اہل جنت! (اب) موت نہیں اور اے اہل نار! اب موت نہیں! تو جنتیوں کی خوشیوں کے ساتھ مزید خوشی کا اور جہنمیوں کے غم کے ساتھ مزید غم کا اضافہ ہو جائے گا۔" اور مسلم کی ایک روایت (۲۸۵۰، ۲۸۵۱) میں ہے: «كُلُّ عَابِدٍ فِيمَا هُوَ فِيهِ» کہ ہر ایک جس جگہ میں ہے اس میں ہمیشہ رہے گا۔ ایسی بہت سی صحیح احادیث موجود ہیں، اس لیے جہنم کے بالآخر فنا ہونے کی کوئی واضح اور پختہ دلیل موجود نہیں۔

۝۸۰ إِنَّ رَبَّكَ فَخَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ: یہ ان لوگوں پر رد ہے جو ہر عمل کی تاثیر ذاتی سمجھتے ہیں، جیسا کہ زہر کھانے کا لازمی نتیجہ موت ہے، چنانچہ معزز لہ اور خارجیوں کا کہنا ہے کہ جو مسلمان کبائر کا مرتکب ہو اور توبہ نہ کی ہو، وہ بھی ابدی جہنمی ہے۔ ایک دفعہ جو آگ میں چلا گیا وہ وہاں سے کبھی نہیں نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اہل شقاوت (جو جہنم میں جائیں گے، جن میں کافر اور گناہ گار مسلمان دونوں شامل ہیں) کے متعلق فرمایا کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، مگر جو تیرا رب چاہے۔ کیونکہ بلاشبہ تیرا رب جو

فَلَا تَكُ فِي مَرْيَبَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَؤُلَاءِ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاءَهُمْ مِنْ قَبْلُ وَإِنَّا

پس تو اس کے بارے میں جس کی یہ لوگ عبادت کرتے ہیں، کسی شک میں نہ رہ، یہ لوگ عبادت نہیں کرتے مگر جیسے چاہے کر گزرنے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی بھی چیز کی تاثیر اللہ کے حکم ہی سے ہوتی ہے، وہ چاہے تو آگ جلاتی ہے، پانی غرق کرتا ہے، زہر موت کا باعث بنتا ہے، اگر وہ اس کے برعکس چاہے تو نہ آگ جلاتی ہے، نہ پانی غرق کرتا ہے، نہ زہر کھانا موت کا باعث ہوتا ہے، حالانکہ یہ ان کی اپنی تاثیر کے خلاف ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اہل کبار مسلمانوں کو جہنم سے نکال لے گا، وہ جو چاہے کر گزرنے والا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔

④ وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا : اس دوسری آیت میں اہل سعادت (اہل جنت) کے متعلق بھی ”مگر جو تیرا رب چاہے“ کے الفاظ فرمائے ہیں۔ یہاں بھی ان سے مراد گناہ گار مسلمان ہی ہیں، یعنی جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے، تاہم کچھ لوگ اللہ کی مشیت کے تحت جہنم سے نکال کر جنت میں لائے جائیں گے۔ گویا وہ ہمیشہ جنت میں نہ رہے مگر جنت میں داخل ہونے کے بعد چونکہ کوئی بھی اس سے نہیں نکلے گا، اس لیے آخر میں فرمایا: ﴿عَطَاءٌ غَيْرٌ مِّمَّا يُغْنُونِ﴾ یعنی جنت ایسا عطیہ ہے جو قطع کیا جانے والا نہیں۔ (روح المعانی)

⑤ شاہ عبدالقادر رازیؒ اپنے فوائد میں لکھتے ہیں کہ اس کے یعنی آیت: ﴿مَا ذَا صَمَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ﴾ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ رہیں گے آگ میں جتنی دیر رہ چکے ہیں آسمان وزمین دنیا میں، مگر جتنا اور چاہے تیرا رب، وہ اسی کو معلوم ہے۔ دوسرے یہ کہ رہیں گے آگ میں جب تک رہے آسمان وزمین اس (آخری) جہان کا، یعنی ہمیشہ مگر جو چاہے رب تو موقوف کر دے، لیکن وہ چاہ چکا کہ موقوف نہ ہو۔ اس کہنے میں فرق نکلا اللہ کے ہمیشہ رہنے میں اور بندے کے کہ بندے کے ہمیشہ رہنے پر ساتھ یہ بات لگی ہے کہ اللہ چاہے تو فنا کر دے۔“ (موضح) گویا شاہ صاحب نے اس مشہور اعتراض کا بھی جواب دے دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بھی ہمیشہ رہنے والی ہے، جنتی اور جہنمی بھی ہمیشہ جنت اور جہنم میں رہنے والے ہوئے تو دونوں ایک دوسرے کی مثل ابدی ہو گئے، جب کہ فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشوری: ۱۱] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔“ جواب یہ ہے کہ بندے کا جہنم یا جنت میں ہمیشہ رہنا اور ابدی ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا ابدی ہونا کسی کی مشیت پر موقوف نہیں۔ وہ خود ہی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہ ازلی بھی ہے اور ابدی بھی۔

آیت 109 ① فَلَا تَكُ فِي مَرْيَبَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَؤُلَاءِ : یعنی ان کے معبودوں کے باطل ہونے یا نفع نقصان کا مالک نہ ہونے میں کسی قسم کا شک نہ کر۔ ”مِمَّا يَعْبُدُ هَؤُلَاءِ“ (جن کی یہ لوگ عبادت کرتے ہیں) میں ”یہ لوگ“ سے مراد مشرکین قریش ہیں۔ ابن عاشور نے لکھا ہے کہ میں نے قرآن کی اس اصطلاح کی جستجو کی تو تقریباً گیارہ مقامات میں ایسا ہی پایا۔ یہ بات میرے دل میں اللہ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اور میں نے آیت: ﴿وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ [النساء: ۴۱] کی تفسیر میں اس کی وضاحت کی ہے۔ [التحریر و التنبیہ] یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ کو اس قسم کا کوئی شک کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

لَوْ كَانُوا يَفْقَهُوا كَلِمَاتٍ مِّنْهُ لَآتَيْنَهُم مِّنْ لَّدُنَّا كَلِمَاتٍ

ان سے پہلے ان کے باپ دادا عبادت کرتے تھے اور بے شک ہم یقیناً انھیں ان کا حصہ پورا پورا دینے والے ہیں، جس میں کوئی کمی نہ کی گئی ہوگی ﴿۱۱﴾

تھا جس سے اللہ تعالیٰ منع فرما رہا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا: ﴿اقِمِ الصَّلَاةَ﴾ [ہود: ۱۱۴] ”نماز قائم کر۔“ اسی طرح فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ﴾ [الأحزاب: ۱] ”اے نبی! اللہ سے ڈر اور کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کر۔“ تو کیا نبی ﷺ پہلے نماز قائم نہیں کرتے تھے؟ یا کیا آپ اس سے پہلے اللہ سے نہیں ڈرتے تھے؟ اور کیا آپ کفار و منافقین کی اطاعت کیا کرتے تھے؟ نہیں، ہرگز نہیں، اس قسم کے احکام جن پر نبی ﷺ اور مخلص اہل ایمان پہلے ہی کار بند ہوں، نازل کرنے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ نبی ﷺ اور پہلے سے عمل کرنے والے ہمیشہ ان پر کار بند رہیں اور استقامت اختیار کریں اور دوسرے تمام انسان بھی نبی ﷺ کے واسطے سے اپنے آپ کو مخاطب سمجھ کر ان احکام پر عمل کریں کہ جب نبی کو یہ حکم ہے تو ہماری کیا اوقات ہے کہ ہم اس پر عمل نہ کریں۔

﴿مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُمْ مِنْ قَبْلُ: ”آبَاؤُهُمْ“ سے مراد عاد و ثمود ہیں، کیونکہ عدنانی عربوں کی ماں بنو جرہم سے تھی جو اسماعیل علیہ السلام کی بیوی تھی۔ بنو جرہم ثمود سے تھے اور قریش کی ماں بنو خزاعہ سے تھی، جو قحطی کی بیوی تھی اور عرب میں بت پرستی عمرو بن لُحی نے شروع کی تھی جو خزاعی تھا۔ (ابن عاشور) یعنی ان کی غیر اللہ کی پرستش کی بنیاد سوائے باپ دادا کی اندھی تقلید کے اور کچھ نہیں ہے۔ (ابن کثیر) آبا و اجداد کی غیر اللہ کی عبادت کیا تھی؟ یہی کہ وہ اپنے بزرگوں یا ان کے بتوں یا قبروں کو مصیبت کے وقت پکارتے تھے، انھیں اللہ کا بیٹا یا جزیاعین قرار دیتے تھے۔ اسی طرح عبادت میں ان کے نام کی نذر و نیاز ماننا، اللہ کے حصے کے ساتھ جانوروں اور کھیتوں میں ان کا حصہ رکھنا، ان کو اللہ کی صفات، مثلاً علم غیب کا مالک، دور سے فریاد سننے اور مدد کرنے والا سمجھنا سبھی شامل ہیں۔ ہر زمانے کے مشرک ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں: ﴿بَلْ قَالُوا امْشِلْ مَا قَالِ الْآوَلُونَ﴾ [المؤمنون: ۸۱] ”بلکہ انھوں نے کہا جیسے پہلوں نے کہا تھا“ اور ان کے پاس تقلید آباء کے سوا کوئی دلیل نہیں ہوتی اور ان پر وہی محاورہ صادق آتا ہے کہ ”مِمَّا أَشْبَهَ اللَّيْلَةَ بِالْبَارِحَةِ“ ”آج کی رات کل کی رات کے کس قدر مشابہ ہے۔“

﴿وَإِنَّا لَكَاؤُومٌ لِّمَن قَدَرْنَا مَحَلَّهُمُ﴾ [ہود: ۱۱] ”اور ہم ان کے حصہ پورا پورا دینے سے مراد ایک تو یہ ہے کہ کسی شخص کا تقدیر میں دنیا کا جو رزق اور آسائش لکھی گئی ہیں، وہ مسلمان ہو یا کافر ہر ایک کو ملیں گی، کافروں کو بھی ان کا حصہ پورا ملے گا۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۲۰) دوسری یہ کہ ان کی نیکیاں جو انھوں نے دنیا میں کی ہیں ان کا پورا بدلہ ہم انھیں دنیا ہی میں دے دیں گے۔ دیکھیے سورہ احقاف (۲۰) اور تیسری یہ کہ ہم ان کی غیر اللہ کی عبادت اور شرک کا پورا پورا بدلہ دنیا میں نہیں بلکہ قیامت کے دن ضرور دینے والے ہیں۔ یہاں یہ آخری معنی زیادہ مناسب ہے، کیونکہ ان لوگوں کو نبی ﷺ کی برکت سے پہلی قوموں کی طرح دنیا میں آسمانی عذاب نہیں دیا گیا، جس سے ان کا نام و نشان مٹ جاتا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ ۗ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقَضِيَ بَيْنَهُمْ ۗ

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، پھر اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو تیرے رب کی طرف سے پہلے یہ ذکر ہوا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس جائیں، آیات اور سلطان مبین پیش کریں اور جیسا کہ سورہ طہ میں ذکر ہے، اس سے مطالبہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو عذاب دینا چھوڑ دے اور انہیں آزادی دے کر میرے ساتھ بھیج دے۔ اگرچہ اس کے ساتھ تو حید و رسالت کی دعوت بھی تھی، مگر وہ مسلمان ہی نہیں ہوا کہ اس کے لیے مفصل احکام نازل ہوتے۔ اس وقت تمام احکام زبانی تھے، تورات نازل نہیں ہوئی تھی، اس لیے ساتھ ہی اس کا انجام ذکر کر دیا: ﴿يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْدَهُمُ النَّارَ﴾ [ہود: ۹۸] یعنی وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے چلا ہوا انہیں جہنم میں لے جائے گا۔

موسیٰ علیہ السلام کی دوسری بعثت بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ چنانچہ آزادی حاصل ہونے اور سمندر سے بحیریت نکل جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے طور پر چالیس راتوں کا اعکاف کر دیا اور اس کے بعد انہیں تورات عطا فرمائی۔ اب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون یا اس کے سردار نہیں تھے، ان کے ساتھ بنی اسرائیل تھے یا فرعون کی قوم میں سے مصر سے آنے والے چند نوجوان۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ﴾ کہ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (تورات) عطا فرمائی، مگر موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں اور اس کے بعد اس میں اختلاف کیا گیا۔ کسی نے تسلیم کیا، کسی نے انکار کر دیا، یا کسی نے کچھ احکام مان لیے کچھ نہیں، حتیٰ کہ بنی اسرائیل کی غالب اکثریت نے موسیٰ علیہ السلام کے حکم پر ارض مقدس (شام) کے حصول کے لیے جہاد پر نکلنے سے بھی صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ جا تو اور تیرا رب لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ دیکھیے سورہ مائدہ (۲۴) پھر موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان پر بہت سے دور آئے، کبھی غالب رہے، مثلاً یوشع بن نون علیہ السلام کا دور، داؤد و سلیمان علیہما السلام کا دور، کبھی مغلوب رہے، پھر آہستہ آہستہ انہوں نے اللہ کی کتاب میں ایسا اختلاف کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق بہتر (۷۲) گروہوں میں بٹ گئے۔ انہوں نے اپنی خواہشات کے مطابق کتاب اللہ کے معانی میں تحریف کی، غلط تاویلیں کیں، معانی بدلے، پھر الفاظ میں بھی تحریف کر دی، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَحْزَنُونَ الْكَلِمَةَ عَنِ مَوَاضِعِهِ﴾ [المائدہ: ۱۳] ”وہ کلام کو اس کی جگہوں سے پھیر دیتے ہیں۔“ پھر اپنے احباب و رجبان (علماء و درویش) کو اللہ تعالیٰ کی کرسی پر بٹھا دیا۔ ان کی فقہ اور ان کے اقوال و فتاویٰ کو یہ درجہ دیا کہ وہ حرام کو حلال کہتے تو حلال سمجھ لیتے، حلال کو حرام کہہ دیتے تو حرام سمجھ لیتے، فرمایا: ﴿إِن تَخَذُوا آخْبَارَهُمْ وَرُحُبًا بَيْنَهُمْ أَرْبَابًا لِّقُنُ ذُنُوبِ اللَّهِ وَالنَّبِيِّينَ ابْنِ هَمَاهِيهِ﴾ [التوبة: ۳۱] ”انہوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کے سوارب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔“ ان کے دنیا پرست علماء اللہ کی کتاب لوگوں کو سناتے ہوئے زبانوں کو ایسا بیچ دیتے کہ لوگ سمجھیں یہ اللہ ہی کی کتاب بنا رہے ہیں، حالانکہ وہ اللہ کی کتاب نہ ہوتی، پھر صاف دعویٰ کر دیتے کہ یہ اللہ کی طرف سے شرع کا حکم ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہ ہوتا،

وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ قُرْبٍ ۝۱۱

سے پہلے ہو چکی تو ان کے درمیان ضرور فیصلہ کر دیا جاتا اور بے شک یہ لوگ یقیناً اس کے بارے میں ایک بے چین رکھنے والے شک میں ہیں ۝۱۱

فرمایا: ﴿وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلُونِ السُّبْحَانَ بِالْكِتَابِ بِتَحْسِبُوا مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنَ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ [آل عمران: ۷۸] اور بے شک ان میں سے یقیناً کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب (پڑھنے) کے ساتھ اپنی زبانیں مروڑتے ہیں، تاکہ تم اسے کتاب میں سے سمجھو، حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں اور اللہ پر جھوٹ کہتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ پھر کچھ ایسے بد نصیب تھے جو اپنے ہاتھوں سے فتوے لکھ کر کہتے یہ اللہ کا حکم ہے، حالانکہ وہ سب کچھ انہوں نے اپنی کسی دنیوی خواہش کو پورا کرنے کے لیے لکھا ہوتا، اللہ کا حکم ہرگز نہ ہوتا اور جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھ دیتے، فرمایا: ﴿فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيُشْتَرَوْا بِهِ تَمَتًّا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبُوا﴾ [البقرة: ۷۹] ”پس ان لوگوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے، تاکہ اس کے ساتھ تھوڑی قیمت حاصل کریں۔ پس ان کے لیے بڑی ہلاکت اس کی وجہ سے ہے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ان کے لیے بڑی ہلاکت اس کی وجہ سے ہے جو وہ کہتے ہیں۔“

ہاں کچھ لوگ صراطِ مستقیم پر قائم رہے۔ یہ وہ تھے جو موسیٰ علیہ السلام کی کتاب اور سنت پر کسی تبدیلی یا تحریف کے بغیر قائم رہے۔ یہ نجات پانے والے تھے، مگر ان کے بہت سے لوگ اللہ کے احکام کے نافرمان ہو گئے اور اوپر مذکور ہیرا پھیریاں کرنے والے بن گئے، یا ایسی ہیرا پھیریاں کرنے والوں کے پیروکار بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ﴾ [المائدة: ۶۶] ”ان میں سے ایک جماعت درمیانے راستے والی ہے اور ان میں سے بہت سے لوگ، برا ہے جو کر رہے ہیں۔“ اس وقت یہ سارا نقشہ آنکھوں سے دیکھنا چاہیں تو ہماری امت مسلمہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

۲ اور اہل سعادت اور اہل شقاوت کا حال بیان کرنے کے بعد آخر میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ اگر آج یہ لوگ آپ پر نازل شدہ کتاب قرآن کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں تو آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس سے پہلے تو رات کے ساتھ بھی لوگ یہی معاملہ کر چکے ہیں۔

۳ ﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے جہاد کا حکم نہ تھا، اس لیے رسول کی نافرمانی پر آسمان سے عذاب اتر آتا تھا۔ فرعون کے غرق ہونے کے بعد جہاد کا حکم ہوا، اب یا تو کفار کو مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب دیا جائے گا، جیسے فرمایا: ﴿قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ﴾ [التوبة: ۱۴] ”ان سے لڑو، اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔“ چنانچہ

وَإِنْ كَلَّا لَنَا لَيُوقِفِيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ إِذْ لَهُ بِمَا يَعْمَلُونَ حَبِيرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور بے شک ان سب کو جب (وقت آئے گا) تو یقیناً تیرا رب انھیں ان کے اعمال ضرور پورے پورے دے گا، بے شک وہ اس سے جو وہ کر رہے ہیں، پوری طرح باخبر ہے ﴿۱۱۱﴾

یوحنا بن نون، طاہوت، داؤد اور سلیمان علیہم السلام وغیرہم کے جہاد اس بات کی دلیل ہیں۔ اگر مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب نہ ہو تو پھر آخرت کو ہوگا۔ اگر یہ بات سٹے نہ ہو چکی ہوتی تو ان پر پہلی قوموں کی طرح عذاب آچکا ہوتا۔ ہاں محدود پیمانے پر اللہ تعالیٰ کی سزا کا تازیانہ اب بھی برس سکتا ہے، جیسا کہ ”اصحاب سبت“ پر برسا اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ہماری امت میں بھی ایسے واقعات پیش آئیں گے۔ شاہ عبدالقادر ؒ لکھتے ہیں: ”اگر یہ بات نہ ہوتی کہ دنیا میں سچ اور جھوٹ صاف نہ ہو۔“ (موضح)

﴿۱۱۱﴾ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكِّ فِتْنَةٍ مُّرِيْبٍ : بعض مفسرین نے اس کی تفسیر کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم تورات کے بارے میں ایک بے چین رکھنے والے شک میں مبتلا ہے، نہ اسے اس کے سچا ہونے کا یقین ہے نہ جھوٹا ہونے کا اور حق کا انکار کرنے والوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ ان کا دل اسے سچا مانتا ہے، مگر دنیاوی خواہشات اسے ماننے کی اجازت نہیں دیتیں، اسی تذبذب میں کفر ہی پر دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ بعض نے یہ تفسیر کی کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے ایمان نہ لانے والے قرآن کے متعلق بے چین رکھنے والے شک میں مبتلا ہیں۔ مگر پہلی تفسیر زیادہ درست معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ذکر موسیٰ علیہ السلام، تورات اور ان کی قوم کا ہو رہا ہے۔ (واللہ اعلم)

آیت 111 ﴿۱۱۱﴾ وَإِنْ كَلَّا لَنَا لَيُوقِفِيَنَّهُمْ ”كَلَّا“ میں توین عوض کی ہے، یعنی اس کا مضاف الیہ محذوف ہے۔ اصل میں تھا ”كَلَّهُمْ“ یا ”كَلُّهُنَّ“ (یہ سب لوگ) ”لَنَا“ کا معنی ”جب“ ہے، یہ حرف شرط ہے جس کی شرط محذوف ہے۔ ”لَيُوقِفِيَنَّهُمْ“ اس کی جزا ہے۔ وہ محذوف شرط ”لَنَا“ کے معنی کے مطابق نکالی جائے گی، یعنی ”لَمَّا جَاءَ أَجْلُهُمْ“ یعنی بے شک یہ سب لوگ (جب ان کا وقت آئے گا) تو یقیناً انھیں ان کا رب ان کے اعمال کا ضرور پورا پورا بدلہ دے گا۔ چونکہ وہ لوگ قیامت کے منکر تھے، اس لیے اس جملے میں کئی طرح سے تاکید آئی ہے۔ ”إِنْ“، لام تاکید اور نون ثقلید۔ ”لَنَا“ کا مابعد حذف کرنے سے بھی ایک بیت پیدا ہو رہی ہے، کیونکہ خود لفظ ”لَنَا“ میں وقت کا مفہوم شامل ہے، یعنی جب وہ وقت آئے گا۔ ”(إِنْ كَلَّا لَنَا“ کی یہ سب سے واضح اور آسان توجیہ ہے) دیکھیے تفسیر اشعراوی۔ تفسیر نسفی میں ہے: ”قَالَ صَاحِبُ الْإِنْبَازِ ”لَمَّا“ فِيهِ مَعْنَى الظَّرْفِ وَقَدْ دَخَلَ فِي الْكَلَامِ اِخْتِصَارٌ كَمَا أَنَّهُ قِيلَ ”وَإِنْ كَلَّا لَمَّا بُعِثُوا لَيُوقِفِيَنَّهُمْ رَبُّكَ“ مطلب وہی ہے جو اوپر گزرا، البتہ انھوں نے ”لَمَّا جَاءَ أَجْلُهُمْ“ کے بجائے ”لَمَّا بُعِثُوا“ محذوف نکالا ہے۔

﴿۱۱۲﴾ إِذْ لَهُ بِمَا يَعْمَلُونَ حَبِيرٌ : اس میں اعمال کی جزا پوری پوری دینے کی وجہ بیان کی ہے کہ وہ ان کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے، اس لیے عمل نیک ہو یا بد اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

فَلْتَقِفْ كَمَا أُفْرِتُ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۱۱۱﴾

پس تو خوب ثابت قدم رہ، جیسے تجھے حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی جنہوں نے تیرے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو، بے شک وہ جو کچھ تم کرتے ہو، اسے خوب دیکھنے والا ہے ﴿۱۱۱﴾

آیت 112 ﴿۱﴾ فَلْتَقِفْ كَمَا أُفْرِتُ وَعَنْ تَابَ مَعَكَ: ”فَلْتَقِفْ“ میں سین اور تاء کا اضافہ یا تو طلب کے لیے ہے، معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح سیدھا اور قائم رہنے کی درخواست کرنا رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا ہے اور یہ اضافہ مبالغے اور تاکید کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ قرطبی نے فرمایا، استقامت دائیں یا بائیں طرف جائے بغیر ایک طرف کو سیدھے چلتے چلے جانا ہے۔ یہ معنی یہاں زیادہ مناسب ہے۔ پہلا معنی بھی درست ہے اور اس پر عمل کرتے ہوئے ہی ہم ہر رکعت میں صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دعا کرتے ہیں۔ استقامت کا معنی باطل کے دونوں کناروں افراط اور تفریط (زیادتی اور کمی) سے بچ کر ان کے عین درمیان سیدھا رہنا ہے۔ یہ نہایت مشکل کام ہے۔ پہلے تو ہر وقت اس کا خیال رکھنا ہی مشکل ہے کہ عین صحیح راستہ کیا ہے؟ پھر اس پر قائم رہنا اس سے بھی مشکل ہے۔ رازی نے اسے ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ دھوپ اور چھاؤں کے درمیان ایک جگہ ہے۔ اس کا معلوم کرنا اور ہر وقت اس کا خیال رکھنا کس قدر مشکل ہوگا۔ اس لیے اہل علم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا تھا: ﴿شَيْئِي هُوَ﴾ [ترمذی: ۳۲۹۷] ”مجھے سورہ ہود نے بوڑھا کر دیا۔“ اس کا سبب انبیاء، پیغمبر کی قوموں پر عذاب کے واقعات کے بجائے یہ حکم ہے: ﴿فَلْتَقِفْ كَمَا أُفْرِتُ﴾

﴿۲﴾ ”فَلْتَقِفْ كَمَا أُفْرِتُ“ سے معلوم ہوا کہ سیدھا راستہ جس پر خوب ثابت رہنے کا حکم ہے، صرف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی طرف وحی فرمایا۔ یہاں استقامت کا حکم نبی ﷺ اور ان تمام لوگوں کو ہے جو کفر سے توبہ کر کے آپ کے ساتھ اہل ایمان میں داخل ہوئے، مگر سب کو کس چیز پر استقامت کا حکم ہے، صرف اس پر جسے ”کَمَا أُفْرِتُ“ کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یعنی صرف اس پر جس کا حکم نبی ﷺ کو دیا گیا ہے، کیونکہ اللہ کی طرف سے امر صرف نبی ﷺ کو ہوا ہے، آپ کے سوا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لے کر امت کے آخری شخص تک ایک بھی شخص ایسا نہیں جو مامور من اللہ ہو اور جسے وحی کے ذریعے سے حکم ملتا ہو۔ آپ ﷺ کے سوا ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کی رائے اللہ کا حکم یا دین ہو، جس پر امت کو قائم رہنے کا حکم ہو۔ اس سے تمام تقلیدی گروہوں کا استقامت سے ہٹ جانا ثابت ہوا۔ نجات چاہتے ہیں تو تمام لوگوں کی رائے، قیاس اور تقلیدی گروہ بندی چھوڑ کر صرف کتاب و سنت کو لازم پکڑنا ہوگا۔

﴿۳﴾ استقامت (اللہ کے حکم پر پوری طرح قائم رہنا) ایک نہایت جامع لفظ ہے، جس میں پوری شریعت آ جاتی ہے۔ عقائد میں اللہ کی صفات پر اس طرح ایمان جس طرح اس نے حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نہ کسی صفت کا انکار کرنا (تقطیل)، نہ اسے مخلوق کی صفات جیسا سمجھنا (تشبیہ) بلکہ جیسا اللہ کی شان کے لائق ہے۔ اعمال میں نہ کسی حکم پر عمل چھوڑنا (نافرمانی) اور نہ آپ ﷺ سے آگے بڑھنا یا آپ سے الگ راستہ نکالنا (رہبانیت اور بدعت)۔ اخلاق میں، مثلاً نہ بخل کرنا نہ بے جا خرچ کرنا۔ غرض ہر چیز میں عین نبی ﷺ کا صحیح راستہ معلوم کر کے اس پر قدم بہ قدم چلنا استقامت ہے۔ سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ

وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَمَا تَمْسِكُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءٍ

اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہونا جنہوں نے ظلم کیا، ورنہ تمہیں آگ آ لپیٹے گی اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی کہتے ہیں کہ میں نے کہا، یا رسول اللہ! آپ مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات بتلائیں کہ آپ کے بعد مجھے کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے؟ فرمایا: «قُلْ آمَنْتُ بِاللَّهِ ثُمَّ اسْتَقِيمْ» [مسلم، الإيمان، باب جامع أوصاف الإسلام: ۳۸] "کہو میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر خوب ثابت قدم رہ۔" استقامت کے اجر اور فضیلت کے لیے دیکھیے سورہ خم السجدہ (۳۰) اور اتحاف (۱۳)۔

④ وَلَا تَطَّعُونَا: "طغی یطغی طغیاناً" حد سے بڑھنا، یعنی شریعت کی اطاعت کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جو حدیں مقرر کر دی ہیں اپنے آپ کو انھی کے اندر رکھو، ان سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرو۔ زندگی کے کسی معاملے میں بھی ان سے تجاوز حرام ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تین آدمی نبی ﷺ کی بیویوں کے گھروں کی طرف آئے۔ وہ نبی ﷺ کی عبادت کے بارے میں پوچھ رہے تھے، جب انہیں بتایا گیا تو گویا انہوں نے اسے کم سمجھا اور کہنے لگے: «وَأَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَدْ عُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ، قَالَ أَخَذَهُمْ أَمَا أَنَا فَإِنِّي أَصْلِي اللَّيْلَ أَبَدًا، وَ قَالَ آخِرُ أَنَا أَصُومُ الدَّهْرَ وَلَا أَفْطِرُ، وَقَالَ آخِرُ أَنَا أُعْتَرِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا، فَجَاءَ إِلَيْهِمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَتُمُّ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَ كَذَا؟ أَمَا وَاللَّهِ! إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَتَقَاكُمْ لَهُ لِكَيْيَ أَصُومُ وَأَفْطِرُ، وَأَصْلِي وَأَرْقُدُ، وَ أَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنِّي فَلَيْسَ مِنِّي» [بخاری، النکاح، باب الترغيب في النکاح: ۵۰۶۳] "ہماری رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت؟ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے پہلے پچھلے گناہ معاف کر دیے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا: "میں تو ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا۔" دوسرے نے کہا: "میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔" تیسرے نے کہا: "میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا۔" جب رسول اللہ ﷺ آئے تو آپ نے فرمایا: "تم لوگوں نے اس اس طرح کہا ہے؟ یاد رکھو، اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ کی خشیت رکھنے والا اور تم سب سے زیادہ اس سے ڈرنے والا ہوں، لیکن میں تو روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا اور نماز پڑھتا ہوں اور سو بھی جاتا ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو جو شخص میری سنت (میرے طریقے) سے بے رغبتی کرے وہ مجھ سے نہیں۔" رہے روزانہ ایک ہزار رکعتیں پڑھنے والے، چالیس سال تک عشاء اور فجر ایک وضو سے پڑھنے والے، بارہ سال بھوکے جنگل میں عبادت کرنے والے حضرات، تو یا تو صاف ان پر جھوٹ باندھا گیا ہے، کیونکہ یہ انسان کے بس کی بات ہی نہیں، یا پھر وہ اسی طفیانی کا شکار تھے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ (نعوذ باللہ)

⑤ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ: یعنی استقامت اختیار کر دیا طفیانی، اللہ تعالیٰ تمہارا عمل سب دیکھ رہا ہے۔

آیت 113 ① وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا: "رَكَبَ" (ن، ع، ف) مائل ہونا۔ ② "الَّذِينَ ظَلَمُوا" اور "الظَّالِمِينَ"

میں فرق ہے۔ "الَّذِينَ ظَلَمُوا" وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا، خواہ کبھی کبھار کیا ہو اور "الظَّالِمِينَ" ظلم کرنے والے، جن کی روش ہی یہ ہے۔ جب پہلی قسم کے لوگوں کی طرف مائل ہونے سے منع فرمایا تو دوسری قسم کی طرف مائل ہونے کا آپ خود

ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ﴿۳۳﴾

دوست نہیں ہوں گے، پھر تمہیں مدد نہ دی جائے گی ﴿۳۳﴾

اندازہ کر لیں۔ ﴿۳۱﴾ جب ان کی طرف مائل ہونا منع ہے جنہوں نے ظلم کیا تو خود کسی پر ظلم کرنا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کس قدر قبیح ہوگا۔ حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ((يَا عِبَادِي! إِنِّي حَرَمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي وَ جَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا، فَلَا تَظَالُمُوا)) [مسلم، البر والصلة، باب تحريم الظلم: ۲۵۷۷، عن أبي ذر رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] ”اے میرے بندو! میں نے کسی پر ظلم کرنا خود اپنے آپ پر حرام کر رکھا ہے اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام کر دیا، سو تم ایک دوسرے پر ظلم مت کرو۔“ اور نبی ﷺ نے فرمایا: ((اتَّقُوا الظُّلْمَ فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [مسلم، البر والصلة، باب تحريم الظلم: ۲۵۷۸، عن جابر بن عبد الله رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] ”ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن کئی اندھیرے ہوگا۔“ ﴿۳۲﴾ ظلم میں شرک اور دوسرے تمام ظلم شامل ہیں، یعنی جو لوگ ظلم کی طرف مائل ہوں ان سے کوئی دوستی اور محبت نہ رکھو، چاہے وہ کافر ہوں یا نام کے مسلمان۔ (شوکانی) ﴿۳۳﴾ ان کی طرف مائل ہونے میں ان کے ساتھ محبت، ان کے ساتھ مجلس آرائی، ان کے پاس بیٹھنا، انھیں ملنے کے لیے جانا، ان کے ظلم پر چپ رہنا، ان کے کاموں پر خوش ہونا، ان جیسا بننا، ان کا فیضان اختیار کرنا، ان کا ذکر عزت اور تعظیم کے ساتھ کرنا، سب کچھ شامل ہے۔ ”رُكُونٌ“ (مائل ہونے) کا کم از کم مرتبہ پاس رہ کر چپ رہنا اور آخری مرتبہ ظلم پر ان کی حوصلہ افزائی اور مدد ہے۔

﴿۳۲﴾ فَتَسْكُرُوا النَّارَ : ”لَا تَتْرُكُونَهَا“ نبی کے جواب میں فاء نے ”تَمَسَّ“ مضارع کو نصب دیا ہے۔ اس آیت سے عالم حکمرانوں، سرداروں اور چودھریوں سے ربط و تعلق کی ممانعت نکلتی ہے۔ ہاں ان کے شر سے بچنے کے لیے یا مصلحت عامہ یا دعوت دین یا دینی ضرورت کے تقاضے کے پیش نظر ان سے میل جول رکھے تو اس کی اجازت ہے، بشرطیکہ دل میں ان کے ظلم کی وجہ سے نفرت رکھے، جیسا کہ سورہ آل عمران (۲۸) اور بعض احادیث میں آیا ہے۔ غرض ظلم کرنے والوں سے دلی محبت یا میلان کسی صورت جائز نہیں، البتہ مجبوری کی وجہ سے ان کے پاس جانا، نصیحت کرنا، ان کے ظلم پر مجبوراً خاموش رہنا یا دین کی مصلحت اور حق کی دعوت و تاکید کے لیے ربط و تعلق رکھنا الگ بات ہے۔

﴿۳۳﴾ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ: اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ حاکم اگر ظالم اور بدکار ہو تو اس کی اطاعت اسی وقت ہے جب وہ ظلم یا شریعت کی نافرمانی کا حکم نہ دے۔ اگر وہ شریعت کے خلاف حکم دے تو اس کی اطاعت جائز نہیں، الا یہ کہ اس کے ضرر سے بچنے کے لیے بظاہر اطاعت کا اظہار کرے اور دل میں برا سمجھے، جیسا کہ اوپر سورہ آل عمران کے حوالے سے گزرا۔ حاکم کی اطاعت اس وقت فرض ہے: ﴿۱﴾ جب وہ مسلمان ہو۔ دیکھیے سورہ نساء (۵۹)۔ ﴿۲﴾ مسلمانوں میں اقامتِ صلوة جاری رکھے۔ دیکھیے مسلم (۱۸۵۵)۔ ﴿۳﴾ اس سے کھلم کھلا کفر کا ظہور نہ ہو۔ دیکھیے بخاری (۷۰۵۶)۔ ﴿۴﴾ اور وہ اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ دے۔ دیکھیے بخاری (۱۳۳۱)۔ ”وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ“ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ظالم حکمرانوں کی حمایت اور ان کی طرف میلان کا نتیجہ آخرت کے عذاب کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی ولایت (دوستی و حمایت) اور اس کی نصرت (مدد) سے محرومی بھی ہے۔ آج یہ حقیقت ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

وَ أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَ زُلْفَا مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذَلِكَ

ذِكْرِي لِلذَّاكِرِينَ ۝

اور دن کے دونوں کناروں میں نماز قائم کر اور رات کی کچھ گھنٹوں میں بھی، بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ یہ یاد کرنے والوں کے لیے یاد دہانی ہے ﴿۱۳۴﴾

آیت 114 ﴿۱﴾ اس آیت اور اس کے بعد والی آیات میں استقامت کا اور طغیانی اور ظالموں کی طرف میلان سے اجتناب کا طریقہ بتایا ہے، وہ ہے اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق جو نماز سے حاصل ہوتا ہے اور صبر کرنا اور برائی اور فساد فی الارض سے منع کرتے رہنا۔ ﴿۲﴾ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ: اقامت کا معنی سیدھا کرنا، مراد نماز کو اس کے اوقات پر سنت کے مطابق پورے ارکان اور خشوع و اخلاص کے ساتھ ادا کرنا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مالک بن حویرث رضی اللہ عنہما سے فرمایا: «صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» [بخاری، الأذان، باب الأذان للمسافرين إذا كانوا...: ۶۳۱] ”نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے دیکھا ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں۔“ قرطبی نے فرمایا کہ مفسرین میں سے کسی کا اختلاف نہیں کہ یہاں اس سے مراد فرض نماز ہے۔

﴿۳﴾ ایمان کے بعد سب سے زیادہ زور اقامتِ صلاۃ پر دیا گیا ہے اور اسے کفر و ایمان کے درمیان فرق قرار دیا گیا ہے، کیونکہ روزانہ پانچ دفعہ مسجد میں جا کر اللہ کے سامنے حاضری میں ارکانِ اسلام کا کچھ نہ کچھ حصہ آ جاتا ہے۔ کلمہ اسلام تشہد میں موجود ہے، پوری نماز کے دوران میں کھانے پینے سے بلکہ دنیا کے ہر کام سے پرہیز روزے کا عکس ہے، اپنے کاروبار کو چھوڑ کر آنا اس شخص کے بس کی بات نہیں جو زکوٰۃ نہ دے سکتا ہو اور قبلے کی طرف رخ کی یاد دلاتا ہے۔

﴿۴﴾ طَرَفِي النَّهَارِ: دن کے دو کنارے۔ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک نہار (دن) ہوتا ہے، اس میں تین نمازیں آ جاتی ہیں۔ زوال سے پہلے والے کنارے میں فجر اور زوال کے بعد والے میں ظہر اور عصر۔ ”زُلْفَا“ ”زُلْفَاةُ“ کی جمع ہے، جیسے ”عُرْفَاةُ“ کی جمع ”عُرْفَاتُ“ ہے، اس سے مراد دن کے آخری حصے کے قریب کے اوقات ہیں، کیونکہ ”إِزْلَافَاتُ“ کا معنی قرب ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَزَلَقْتِ الْجَنَّةَ لِلنَّارِ حِينَ﴾ [الشعراء: ۹۰] ”اور جنت متقی لوگوں کے لیے قریب لائی جائے گی۔“ اور فرمایا: ﴿مَا تَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى﴾ [الزمر: ۳] ”ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔“ اس سے مراد مغرب اور عشاء ہیں، کیونکہ وہ دن کے قریب ہوتی ہیں۔ اس طرح اس آیت میں پانچوں نمازیں آ جاتی ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر ان آیات کا نزول معراج کے بعد ہوا ہو تو اجمالی طور پر ان میں پانچوں نمازیں آ جاتی ہیں، البتہ چونکہ یہ سورت مکی ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ آیات معراج میں پانچ نمازیں فرض ہونے سے پہلے نازل ہوئی ہوں اور ان آیات سے دن کے دونوں کنارے سورج نکلنے سے پہلے (فجر) اور غروب ہونے سے پہلے (عصر) کی نماز ہی فرض ہو اور رات کی گھنٹوں سے مراد تہجد ہو جو پہلے آپ ﷺ پر اور تمام امت پر فرض تھی، پھر اس کی فرضیت منسوخ ہو گئی، البتہ اس کی تاکید اور فضیلت باقی رہی۔ اصل یہ ہے کہ تفصیلی طور پر نماز پانچ گانہ کے اوقات کی تعیین اور تفصیل حدیث ہی سے

وَأَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۱۵﴾

اور صبر کر کہ بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ﴿۱۱۵﴾

ملتی ہے اور قرآن مجید پر عمل حدیث کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ مکرین حدیث میں سے پہلے کچھ لوگ قرآن میں تین نمازیں مانتے تھے، پھر دو پر آگئے، بعد والے ایک پر آگئے اور پرویز نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے لے کر اب تک متواتر احادیث اور متواتر عمل کے ساتھ آنے والے نماز کے طریقے کا سرے ہی سے انکار کر دیا اور حقیقت یہی ہے کہ صرف قرآن سے نہ نماز کے مکمل اوقات معلوم ہو سکتے ہیں، نہ اس کے ارکان، نہ ارکان کی ترتیب، نہ رکعات کی تعداد اور نہ شروع یا ختم کرنے کا طریقہ، غرض حدیث ترک کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن پر عمل سے جان چھوٹ جائے اور یہی ان بد نصیب لوگوں کی دلی خواہش ہے جو ان شاء اللہ کبھی پوری نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت دے۔

﴿۱۱۵﴾ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ: پچھلے جملے میں اللہ کے حکم پر استقامت میں اور ظالموں کی طرف میلان سے محفوظ رہنے میں مدد کرنے والی سب سے مضبوط چیز بتائی تھی کہ فلاں فلاں وقت میں نماز قائم کرو، اب اس کی وجہ بتائی۔ عموماً ”إِنَّ“ تعقل یعنی وجہ بتانے کے لیے آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نیکی گناہ کو مٹا دیتی ہے۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَأَتَّبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمَحُّهَا» [مسند احمد: ۱۵۳/۵، ح: ۲۱۴۱۲۔ ترمذی: ۱۹۸۷۔ صحیح الجامع: ۹۷، وحسنہ الألبانی] ”برائی کے بعد ساتھ ہی نیکی کر تو یہ اسے مٹا دے گی۔“ نماز بھی ایک ایسی ہی نیکی ہے جس سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے کسی اجنبی عورت کا بوسہ لیا، پھر (ازراہ ندامت) نبی ﷺ کے پاس آ کر سوال کرنے لگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ تو اس آدمی نے کہا: ”یا رسول اللہ! یہ صرف میرے لیے ہے؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لِيُجْمِعَ أُمَّتِي كُلَّهُمْ» ”یہ میری ساری امت کے لیے ہے۔“ [بخاری، مواقيت الصلوة، باب الصلاة كفارة: ۵۲۶]

شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو تین طرح: ﴿۱﴾ جو نیکیاں کرے اس کی برائیاں معاف ہوں۔ ﴿۲﴾ اور جو نیکیاں پڑے اس سے جو برائی کی چھوٹے۔ ﴿۳﴾ اور جس ملک میں نیکیوں کا رواج ہو وہاں ہدایت آئے اور گمراہی مٹے، لیکن تینوں جگہ وزن غالب چاہیے، جتنا میل اتنا صابن۔“ (موضح) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: «أُرَأَيْتُمْ لَوْ أَنَّ نَهْرًا بِبَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسًا، مَا تَقُولُ ذَلِكَ يُبْقِي مِنْ دَرَبِهِ؟ قَالُوا لَا يُبْقِي مِنْ دَرَبِهِ شَيْعًا، قَالَ فَذَلِكَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ يَمْحُو اللَّهُ بِهِ الْخَطَايَا» [بخاری، مواقيت الصلوة، باب الصلوات الخمس كفارة: ۵۲۸] ”اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ دفعہ غسل کرے تو تمہارا کیا کہنا ہے کہ یہ اس کی میل میں سے کچھ باقی چھوڑے گا؟“ انھوں نے کہا: ”وہ اس کی میل میں سے کچھ باقی نہیں چھوڑے گا۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہی پانچوں نمازوں کی مثال ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ خطاؤں کو مٹا دیتا ہے۔“

﴿۱۱۵﴾ وَأَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ..... نماز کے ساتھ دوسری چیز جو استقامت علی الحق میں اور ظلم کی طرف میلان سے

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا
 قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۗ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿۱۱۶﴾

پھر ان امتوں میں سے جو تم سے پہلے تھیں، کچھ بچی بچھی بھلائی والے لوگ کیوں نہ ہوئے، جو زمین میں فساد سے منع کرتے، سوائے تھوڑے سے لوگوں کے جنہیں ہم نے ان میں سے نجات دی اور وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا، وہ ان چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جن میں انہیں عیش و آرام دیا گیا تھا اور وہ مجرم تھے ﴿۱۱۶﴾

روکنے میں بے حد مددگار ہے وہ صبر ہے، فرمایا: ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ [البقرة: ۱۷۷] ”اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔“ مفردات راغب میں ہے: ”صبر کا معنی کسی کو تنگی میں روک کر رکھنا ہے، کہا جاتا ہے: ”صَبَرْتُ الذَّابَّةَ“ میں نے جانور کو چارے کے بغیر باندھ رکھا“ اور ”صَبَرْتُ فَلَانًا“ میں نے اس کا ایسا پیچھا کیا جس سے وہ کسی طرح نکل نہ سکے۔“ صبر نفس کو اس چیز پر روک کر اور باندھ کر رکھتا ہے جس کا تقاضا عقل اور شرع کرتی ہیں، یا اس چیز سے باندھ کر اور روک کر رکھتا ہے جس سے روکنے کا عقل اور شرع تقاضا کرتی ہیں۔“ اہل علم عموماً صبر کی تین قسمیں بتاتے ہیں: ① اپنے آپ کو نیکی پر باندھ کر اور ہمیشہ کے لیے اس کا پابند بنا کر رکھنا۔ ② اپنے آپ کو ہمیشہ اللہ کی نافرمانی سے روک کر رکھنا۔ ③ مصیبت پر جوع فزع کے بجائے اللہ کی تقدیر پر راضی رہنے کا پابند بنانا۔ استقامت کے لیے صبر کی ضرورت واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زیر تفسیر آیت کی طرح قرآن میں بہت سی جگہوں پر صبر کا ذکر فرمایا، حتیٰ کہ فرمایا: ﴿إِنَّمَا يُوفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: ۱۰] ”صرف صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا۔“

آیت 116 فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ.....: ”لَوْ لَا“ کے دو معانی ہیں، پہلا یہ کہ ”اگر یہ نہ ہوتا“ مثلاً ”لَوْ لَا عَلِيٌّ لَهْلَكَ عُمُرٌ“ ”اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتے۔“ دوسرا معنی ”ہلّا“ یعنی ”ایسا کیوں نہ ہوا“ یہ ترغیب کے لیے ہوتا ہے، یعنی ایسا ہونا چاہیے تھا، یہاں یہی معنی مراد ہے۔ ”قُرُونٌ“ ایک نسل کے لوگ۔ یہ لفظ عموماً ایک صدی پر بولا جاتا ہے۔ ”أُولُوا بَقِيَّةٍ“ اچھی عادات و خصائل اور عقل والے لوگ۔ اصل میں ”بَقِيَّةٍ“ ان نفیس اور منتخب چیزوں کو کہا جاتا ہے جنہیں انسان اپنے فائدے کے لیے بچا بچا کر باقی رکھتا ہے، جیسے کہتے ہیں: ”بَقِيَّةُ السَّلْفِ“ یعنی پہلے لوگوں میں سے بہترین آدمی۔

پہلی تمام قوموں کے واقعات کے بعد اب خلاصہ بیان ہو رہا ہے کہ تم سے پہلے ان لوگوں میں ایسے اصحاب خیر کیوں نہ ہوئے جو اہل شر اور اہل فساد کو فساد فی الارض سے روکتے، یعنی ایسے لوگوں کی موجودگی نہایت ضروری تھی۔ پھر فرمایا، ایسے لوگ تھے تو سہی مگر نہایت تھوڑے، جن کی کچھ پیش نہ چلی، چنانچہ جب دوسروں پر عذاب آیا تو ان قلیل لوگوں کو ہم نے عذاب سے بچالیا۔ اس میں مسلمانوں کو بھی تشبیہ ہے کہ جب تک ان میں ایسے اصحاب خیر موجود رہیں گے جو نیکی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور ایسے اصحاب خیر بالکل تھوڑے اور بے اثر نہیں ہوں گے تو اس وقت تک عذاب نہیں آئے گا۔ پھر پہلوں کی

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ ۖ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ﴿۱۱۷﴾ وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ
النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ﴿۱۱۸﴾ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ ۗ وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ

اور تیرا رب ایسا نہ تھا کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے، اس حال میں کہ اس کے رہنے والے اصلاح کرنے والے ہوں ﴿۱۱۷﴾ اور اگر تیرا رب چاہتا تو یقیناً سب لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا اور وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے ﴿۱۱۸﴾ مگر جس پر تیرا ہلاکت کا سبب بیان فرمایا کہ وہ ان نعمتوں اور خوش حالیوں میں پڑ کر اپنی خسیں خواہشات کے پیچھے ایسے لگے کہ وہ عذاب کے قابل مجرم بن گئے۔

آیت 117 وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ... یعنی اگر وہ لوگ مجرم ہونے کے بجائے مصلح ہوتے، پھر انھیں عذاب کے ساتھ ہلاک کیا جاتا تو یہ صاف ظلم تھا اور اللہ تعالیٰ کبھی ایسا ظلم نہیں کرتا کہ کسی بستی والے لوگ فساد نہ کریں بلکہ اصلاح کریں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہوں اور پھر بھی اللہ تعالیٰ ان پر عذاب بھیج دے، کیونکہ یہ ظلم ہو گا اور اللہ تعالیٰ کسی صورت بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ بعض اہل علم نے ظلم سے مراد شرک لے کر یہ معنی کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں کسی بستی کو صرف شرک کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتا، جب کہ اس کے رہنے والے زمین میں فساد نہ کرتے ہوں، بلکہ آپس کے تعلقات میں اصلاح رکھتے ہوں۔ ہلاک اسی وقت کرتا ہے جب وہ حد سے بڑھ کر زمین میں فساد پھیلانے لگیں، مگر پہلا معنی زیادہ درست ہے۔

آیت 118, 119 ﴿۱﴾ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً ۗ لَئِن لَّمْ يَظْهَرِ عَلَيْكَ إِتْيَانُهُمْ بِأَسْمَاءٍ يُسَمُّونَكَ بِهَا لَآتَىٰكَ مِنْهُمْ كُفْرًا ۚ وَكَانَ اللَّهُ مُبْهِمًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا ﴿۲﴾

لوگ مسلمان ہو جائیں، ایک بھی کافر نہ رہے (دیکھیے شعراء: ۳۰) اور یہ بات تیرے رب پر کچھ مشکل بھی نہیں، جب اس نے جن و انس کے سوا باقی پوری مخلوق کو اپنی اطاعت کا پابند بنا رکھا ہے تو وہ جن و انس کو بھی ایک ہی امت بنا سکتا تھا کہ کوئی کفر کر ہی نہ سکتا، فرمایا: ﴿۱﴾ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآتَىٰكَ مِنْهُمْ كُفْرًا ۚ وَكَانَ اللَّهُ مُبْهِمًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا ﴿۲﴾

[یونس: ۹۹] مگر تیرے رب کی حکمت کا تقاضا کچھ اور تھا، اس لیے اس نے کسی کو ایمان پر مجبور نہیں کیا، سچ و بصر دے کر اور راستہ بتا کر اختیار دے دیا کہ حق و باطل میں سے جو چاہا ہوا اختیار کرو۔ اس لیے یہ سب لوگ کبھی ایمان پر متفق نہیں ہو سکتے، بلکہ ان میں ہمیشہ اختلاف رہے گا، کوئی مومن ہے کوئی کافر، کوئی فرماں بردار کوئی نافرمان، فرمایا: ﴿۱﴾ وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ ﴿۲﴾ اور اس نے انھیں اسی (آزمائش کے) لیے پیدا فرمایا ہے۔“ مادہ میں ہے: ﴿۱﴾ وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ﴿۲﴾ [الماندة: ۴۸] اور لیکن تاکہ وہ تمہیں اس میں آزمائے جو اس نے تمہیں دیا ہے۔“ اور یہ بات اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی طے کر دی ہے کہ میں جہنم کو اس آزمائش میں ناکام ہونے والے جن و انس سے بھروں گا اور اس بات کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں کہ آزمائش میں کامیاب ہونے والوں کو اپنی جنت سے نوازوں گا۔

و تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۱۸﴾ وَ كَلَّا نَقْصُ
عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَ جَاءَكَ فِي هَذِهِ الْحَقُّ وَ قُوْعَطَّةٌ
وَ ذِكْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۹﴾

رب رحم کرے اور اس نے انہیں اسی لیے پیدا کیا اور تیرے رب کی بات پوری ہو گئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں
سب سے ضرور ہی بھروں گا ﴿۱۱۸﴾ اور ہم رسولوں کی خبروں میں سے ہر وہ چیز تجھ سے بیان کرتے ہیں جس کے ساتھ ہم
تیرے دل کو ثابت رکھتے ہیں اور تیرے پاس ان میں حق اور مومنوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی آئی ہے ﴿۱۱۹﴾

﴿۱۱۸﴾ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ﴿۱﴾ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ ۚ معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں خطبہ دینے
کے لیے کھڑے ہوئے تو فرمایا: «أَلَا إِنَّ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ افْتَرَقُوا عَلَى ثِنْتَيْنِ وَ سَبْعِينَ مِثْلَةً، وَإِنَّ هَذِهِ
الْمِثْلَةَ سَتَفْتَرِقُنَّ عَلَى ثَلَاثٍ وَ سَبْعِينَ، ثِنْتَانِ وَ سَبْعُونَ فِي النَّارِ وَ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَ هِيَ الْجَمَاعَةُ» زَادَ ابْنُ
يَحْيَى وَ عَمَرُو فِي حَدِيثِهِمَا: «وَ إِنَّهُ سَيَخْرُجُ فِي أُمَّتِي أَقْوَامٌ تَحَارَى بِهِمْ تِلْكَ الْأَهْوَاءُ كَمَا يَتَحَارَى
الْكَلْبُ لِصَاحِبِهِ، وَقَالَ عَمَرُو: الْكَلْبُ بِصَاحِبِهِ لَا يَنْقَى مِنْهُ عَرَقٌ وَلَا مَفْصِلٌ إِلَّا دَخَلَهُ» [أبو داود، السنة، باب
شرح السنة: ۴۵۹۷- السلسلة الصحيحة: ۴۰۴۱، ح ۲۰۴] یاد رکھو! تم سے پہلے اہل کتاب بہتر (۷۲) ملتوں میں جدا جدا
ہو گئے اور یہ ملت بہتر (۷۳) میں جدا جدا ہو جائے گی۔ بہتر (۷۲) آگ میں اور ایک جنت میں ہوگا اور وہ "الجماعة" ہے۔
ابن یحییٰ اور عمرو نے اپنی روایتوں میں مزید کہا: "میری امت میں ایسی قومیں نکلیں گی جن میں یہ خواہشات و بدعات اس طرح
رگ رگ میں جاری ہو جائیں گی جیسے باؤ لے پن کی بیماری، اس بیماری کے مریض کے رگ دریشے میں جاری ہو جاتی ہے۔"
﴿۱۱۹﴾ اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ کسی امت کا اتفاق اور اجتماع رحمت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لوگ ہمیشہ مختلف
رہیں گے مگر جس پر تیرا رب رحم کرے اور صاف ظاہر ہے کہ امت مسلمہ صرف اسی چیز پر جمع ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے
نازل ہوئی اور وہ کتاب و سنت ہے۔ یہی طریق مستقیم ہے اور اسی پر چلنے والے "الجماعة" ہیں، باقی سب فرقے بعد میں اس
سیدھے راستے سے ہٹنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

﴿۱۲۰﴾ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عام لوگوں میں مشہور روایت "اِخْتِلَافٌ أُمَّتِي رَحْمَةٌ" یعنی میری امت کا اختلاف
رحمت ہے، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صاف جھوٹ ہے۔ حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے موضوع ثابت کرتے ہوئے ایک دلچسپ بات
یہ بھی لکھی کہ اگر اسے صحیح مانا جائے تو پھر امت کا اتفاق رحمت ہوگا، کیونکہ اختلاف رحمت ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں
پر اپنے رحم کا ذکر کیا ہے جو اختلاف کرنے والے نہیں ہوں گے۔ اس لیے سب فرقے چھوڑ کر کتاب و سنت کو مضبوطی سے تھام
لینا ہی راہ نجات ہے۔

وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اَعْمَلُوا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عَابِدُونَ ۙ وَانْتَظِرُوا ۙ اِنَّا مُنْتَظِرُونَ ﴿۱۳۱﴾
 وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۗ وَ مَا
 رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَنَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۳۲﴾

۱۳۱

اور ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے، کہہ دے تم اپنی جگہ عمل کرو، یقیناً ہم (بھی) عمل کرنے والے ہیں ﴿۱۳۱﴾ اور انتظار کرو، یقیناً ہم (بھی) انتظار کرنے والے ہیں ﴿۱۳۲﴾ اور اللہ ہی کے پاس آسمانوں اور زمین کا غیب ہے اور سب کے سب کام اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ سو اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ کرو اور تیرا رب اس سے ہرگز غافل نہیں جو تم کرتے ہو ﴿۱۳۲﴾

آیت 122 وَانْتَظِرُوا اِنَّا مُنْتَظِرُونَ: یعنی تم بھی اللہ کے حکم کی راہ دیکھتے رہو ہم بھی راہ دیکھ رہے ہیں، یا تم ہمارے انجام کی راہ دیکھتے رہو، ہم تمہارے انجام کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

آیت 122 وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهُ: سب کو اسی کے پاس جانا ہے، پھر وہی ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔



الرَّٰهَ تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الرّٰہ۔ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں ①

یہ سورت کئی ہے، مکہ میں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے مسلمانوں پر جس طرح اپنے ہی عزیزوں اور رشتہ داروں نے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے، آپ اس سے نہایت غم زدہ رہتے تھے۔ بعض اوقات اللہ کے حکم سے انھیں یہ بھی فرماتے کہ تم اگر میری بات نہیں مانتے تو تمہاری مرضی مگر اس قرابت کا تو خیال رکھو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے، فرمایا: ﴿لَقُلْ لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ [الشوریٰ: ۲۳] ”کہہ دے میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا مگر رشتہ داری کی وجہ سے دوستی۔“ ایسے ہی کسی موقع پر سورۃ یوسف نازل ہوئی جس میں آپ ﷺ کے لیے تسلی کا بے حد سامان موجود ہے کہ دشمن خواہ جس حد تک چلا جائے، اپنے بھائی اور عزیز حسد میں انصاف اور انسانیت کی تمام حدیں پار کر جائیں، پھر بھی ہوتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، اس لیے آپ بے فکر رہیں۔ اس سورت میں کمال درجے کا غم، پھر اسی درجے یا اس سے بڑھ کر خوشی، انتہائی درجے کی بے بسی اور پھر کمال درجے کا اقتدار۔ نایابا کر دینے والی جدائی اور آنکھیں روشن کر دینے والی ملاقات کی خوش خبری، انتہائی درجے کی ہوس اور دعوت گناہ اور اس کے مقابلے میں حد درجے کی پاک دامنی، بے انتہا ظلم اور کمال درجے کی معافی، غرض عجیب و غریب واقعات اور مضامین ہیں جو غمگین بھی کرتے ہیں اور خوش بھی۔ اہل علم فرماتے ہیں اور تجربے سے بھی ثابت ہے کہ اس سورت کو اس کے معانی کا خیال کر کے پڑھنے والا غمگین اور ناامید شخص بھی خوش ہو جاتا ہے اور اللہ کی رحمت کی امید کا چراغ اس کے دل میں روشن ہو جاتا ہے۔ امیر المؤمنین عمر بن خطاب اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما کثرتاً کی نماز میں سورۃ یوسف کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن شداد کہتے ہیں، میں نے عمر رضی اللہ عنہ کی بچپنوں کے ساتھ رونے کی آواز سنی جب کہ میں صفوں کے آخر میں تھا، وہ یہ آیت پڑھ رہے تھے: ﴿إِنَّمَا أَسْأَلُكَ يَا بَنِيَّ وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ﴾ [یوسف: ۸۶] ”(یعقوب رضی اللہ عنہ نے کہا) میں تو اپنی ظاہر ہونے والی بے قراری اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں۔“ [بخاری، قبل الحدیث: ۷۱۶]

اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کے لیے دل کی تسلی کا بہت سا سامان موجود ہے کہ جس طرح کنویں میں پھینکنے والے بھائی یوسف رضی اللہ عنہ کے تقویٰ اور صبر کے نتیجے میں اللہ غالب کے نظر نہ آنے والے اسباب کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک دن ان کے سامنے جھک کر معافی کے خواستگار ہوئے، آپ ﷺ کے یہ اعزہ واقارب بھی اسی طرح ایک دن آپ کے سامنے عاجزی سے کھڑے ہوں گے اور صاف لفظوں میں آپ کی برتری تسلیم کریں گے، فرمایا: ﴿قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ أَشْرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَاطِئِينَ﴾ [یوسف: ۹۱] ”انھوں نے (یوسف رضی اللہ عنہ سے) کہا، اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً اللہ نے تجھے ہم پر فوقیت بخشی ہے اور بلاشبہ ہم واقعی خطا کار تھے۔“

الرَّٰهَ تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ: ”الرّٰہ“ کے لیے دیکھیے سورۃ بقرہ کی پہلی آیت۔ ”الْمُبِينِ“ ”أَبَانَ يُبِينُ“ باب

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۱﴾

بے شک ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے، تاکہ تم سمجھو ﴿۱﴾

افعال سے اسم فاعل ہے، لازم بھی آتا ہے، جیسے: ﴿إِنَّمَا أَنْزَلْنَاهُ لَكُمْ عَذْوًا مُبِينًا﴾ [البقرة: ۱۶۸] ”بے شک وہ تمہارا کھلا (واضح) دشمن ہے۔“ متعدی بھی، یعنی بیان کرنے والا، واضح کرنے والا۔ ”الکِتَابُ الْمُبِينُ“ یعنی جس کا انداز بیان واضح اور ہر ایک کی سمجھ میں آنے والا ہے، یا جس کا اللہ کا کلام ہونا بالکل عیاں اور ہر شک و شبہ سے بالا ہے۔

آیت 2 ﴿۱﴾ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا: ”انزلنا“ میں ”و“ ضمیر ”الکِتَابِ“ کی طرف جارہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتاب صرف اہل عرب کے لیے ہے، دوسروں کے لیے نازل نہیں کی گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے جو کتاب اتاری جائے گی وہ کسی ایک ہی انسانی زبان میں ہوگی اور فطری طریقہ یہ ہے کہ یا تو اس کتاب کی زبان سیکھی جائے یا اس کا دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے، چنانچہ یہی طریقہ قرآن کے بارے میں ملحوظ رکھا گیا۔ اس لیے عربوں سے، جو اس کے اولین مخاطب ہیں، کہا جا رہا ہے کہ ہم نے یہ کتاب تمہاری اپنی زبان میں نازل کی ہے، کسی اور زبان میں نہیں اتاری کہ تم اسے ٹھیک طرح سے سمجھ نہ سکتے کا عذر پیش کر سکو۔ یہ کتاب عربی قرآن ہے، قرآن کا معنی پڑھنا ہے، بمعنی اسم مفعول، یعنی یہ ایسی کتاب ہے جو اتنی پڑھی جانے والی ہے کہ سراسر اس کا وجود ہی پڑھا جانا ہے۔ اس میں عقل والوں کے لیے عبرت کا بڑا سامان ہے۔

﴿۱﴾ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ اس لیے کہ لغت عرب تمام زبانوں سے زیادہ فصیح، سب سے واضح اور وسیع ہے، انسانی نفس میں آنے والے احساسات و جذبات اور مضامین و معانی کو سب سے زیادہ اور بہتر ادا کرنے والی ہے، اس لیے یہ تمام کتابوں سے اشرف (زیادہ بلندی اور شرف رکھنے والی) کتاب ہے۔ یہ کتاب تمام زبانوں سے زیادہ باشرف زبان میں، تمام رسولوں سے زیادہ شرف رکھنے والے رسول پر، تمام فرشتوں سے زیادہ شرف رکھنے والے فرشتے کی سفارت کے ذریعے سے اتری اور زمین کے تمام قطعوں اور علاقوں سے زیادہ باشرف علاقے مکہ میں، سال کے سب سے باشرف مہینے رمضان اور اس کے سب سے باشرف وقت لیلۃ القدر میں اتری۔ سو اس کا باشرف ہونا اور سب کتابوں سے اشرف ہونا ہر لحاظ سے کامل ہے۔“ مختصر سی تفصیل اس کی یہ ہے کہ کئی زبانوں کے حروف تہجی پچاس (۵۰) سے لے کر اسی (۸۰) تک ہیں، جب کہ عربی زبان کے حروف تہجی کل اسی (۲۹) ہیں، جنہیں سیکھنا آسان ہے۔ سیکھنے میں نہایت آسان ہونے کے باوجود اپنا مقصد اور دل کی بات ادا کرنے کے لیے اس زبان کی وسعت دنیا کی ہر زبان سے زیادہ ہے، مثلاً اکثر زبانوں میں فعل کے صیغوں میں فاعل مذکر یا مؤنث کے لیے الگ الگ الفاظ نہیں ہیں، مثلاً وہ گیا، وہ گئی، دونوں کے لیے فارسی میں ”رفت“ اور انگریزی میں ”went“ ہے۔ ان زبانوں میں مذکر و مؤنث کی وضاحت کے لیے الگ الفاظ لانا پڑیں گے، نہ ہی ان زبانوں میں تشبیہ اور جمع کی وضاحت فعل کے لفظ سے ہوتی ہے، اس کے لیے بھی الگ

عَنْ نَقْضٍ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ ۖ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ ﴿۳﴾

ہم تجھے سب سے اچھا بیان سناتے ہیں، اس واسطے سے کہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن وحی کیا ہے اور بے شک تو اس سے پہلے یقیناً بے خبروں سے تھا ﴿۳﴾

الفاظ کی ضرورت ہے۔ غرض عربی زبان کی خوبیاں ایک مستقل مضمون ہے جس پر اہل علم کی کتابیں موجود ہیں۔

عرب قوم پہاڑوں اور صحراؤں میں رہنے اور ہر وقت تقریباً حالت سفر میں رہنے کی وجہ سے نہایت جفاکش اور خوددار قوم تھی اور وہ ہمیشہ غیروں کی غلامی سے آزاد رہی تھی، اگرچہ ان میں بے شمار خرابیاں اور گمراہیاں موجود تھیں، مثلاً بت پرستی، شرک، ظلم و ستم، باہمی لڑائی، چوری، ڈاکے، جوا، شراب نوشی اور زنا وغیرہ، ان میں عام تھے، اس کے باوجود وہ بہت سی خوبیوں کی حامل بھی تھی، مثلاً غیرت، قبائلی زندگی کی وجہ سے حمیت اور دفاع کا جذبہ، کسی صورت غلامی قبول نہ کرنا، ایٹائے عہد، سخاوت، صدق، ان پڑھ ہونے کی وجہ سے کمال درجے کا حافظ۔ غرض وہ قوم بہت سی خوبیوں کی بھی حامل تھی، اپنی زبان کی خوبی، وسعت اور حسن ادا کی وجہ سے اپنے آپ کو عرب (اپنے مطلب کا واضح اظہار کرنے والے) اور دوسری تمام اقوام کو غم (گولے) قرار دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار مصلحتوں کے ساتھ ساتھ ان خوبیوں کی بنا پر بھی تمام اقوام عالم تک اپنا دین پہنچانے کے لیے عربوں کا انتخاب فرمایا، کیونکہ آخری نبی کا قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ قرآن مجید اپنی دوسری بے شمار خوبیوں کے ساتھ ادائے مطلب کے حسن میں بھی لا جواب تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے عربی زبان میں اتارا اور چیلنج کر دیا کہ اس جیسی کتاب لاؤ، پھر دس سورتیں لانے کا اور آخر میں صرف تین آیات کی چھوٹی سی سورت کی مثال پیش کرنے کا چیلنج کیا، جس کا جواب آج تک نہ عرب دے سکے، نہ عجم اور نہ قیامت تک دے سکیں گے۔

آیت 3 ﴿۱﴾ عَنْ نَقْضٍ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ: ”الْقَصَصِ“ ”قَعَصٌ يَقْضُ“ کا مصدر ہے، قصہ کی جمع نہیں۔ (دیکھیے جواب اہل العلم، ص: ۲۰ تا ۲۱) قصہ کی جمع قصص قاف کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ فرمایا: ﴿عَنْ نَقْضٍ﴾ ”ہم بیان کرتے ہیں“ اللہ تعالیٰ جہاں اپنے لیے جمع کا صیغہ لاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام ایک الگ صفت کا تقاضا کرتا ہے، مثلاً بیان کرنا صفت کلام کا تقاضا کرتا ہے، زمین و آسمان بنانا صفت خلق کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی ہے ہی نہیں جس میں تمام صفات کمال موجود ہوں اور وہ اپنے آپ کو ”ہم“ کہنے کا صحیح حق رکھتا ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنی اس حیثیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے لیے ”ہم“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور جہاں وہ واحد کا لفظ استعمال کریں، مثلاً: ﴿إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا﴾ اظہار کے لیے ہوتا ہے، کیونکہ اسی کی ذات واحد، احد، لا شریک لہ ہے۔ اس سورت میں چونکہ اللہ کے اپنی مرضی کے ہر کام پر غالب ہونے کا اظہار کرنے والی بہت سی صفات مذکور ہیں، اس لیے ”عَنْ“ (ہم) سے بات شروع کی ہے۔

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ
لِي سَاجِدِينَ ﴿۱۲﴾

جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ! بے شک میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے،
میں نے انھیں دیکھا کہ مجھے سجدہ کرنے والے ہیں ﴿۱۲﴾

﴿۱۲﴾ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ: یعنی یہ قرآن وحی کرنے کے ذریعے سے ہم تجھے سب سے اچھا بیان سناتے ہیں۔ اس
کا یہ معنی نہیں کہ سورہ یوسف قرآن کی تمام سورتوں سے احسن ہے، بلکہ قرآن سارا ہی احسن القصص، یعنی تمام بیانوں سے بہتر
بیان ہے، جس میں یہ سورت بھی شامل ہے۔

﴿۱۳﴾ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ: یہ ”ان“ دراصل ”أَنْتَ“ تھا، تخفیف کے لیے کاف کو حذف کر دیا اور ”ان“ کو ”ان“ کر دیا۔
اس کی دلیل ”لِمَنِ الْغَيْبِينَ“ پر آنے والا لام ہے اور یہ عربی کا مسلمہ قاعدہ ہے، اسی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔ ”ان“ اور لام
کے ساتھ تاکید اس لیے کی ہے کہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ آپ یہ سب کچھ پہلے ہی جانتے تھے، جیسا کہ ہمارے کئی نادان بھائی
کہتے ہیں، بلکہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا﴾
[ہود: ۴۹] ”یہ غیب کی خبروں سے ہے جنہیں ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ تو انھیں جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔“
﴿۱۴﴾ لِمَنِ الْغَيْبِينَ: یعنی آپ کو اس سے پہلے اس کی کچھ خبر نہ تھی، آپ انہی تھے، نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ ایسے شخص پر
ایسی بے مثال کتاب کا نزول کہ بڑے بڑے باخبر لوگ اس انہی کے شاگرد بن جائیں اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے اور
آپ کے رسول برحق ہونے کی دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ عالم الغیب نہ تھے، جتنی وحی ہوتی وہ معلوم ہو جاتا، باقی خبر
عالم الغیب کے پاس رہتی، جو کسی کے بتائے بغیر سب کچھ جاننے والا ہے، عالم الغیب کہتے ہی ایسی ہستی کو ہیں اور وہ صرف اللہ
تبارک و تعالیٰ ہے۔

آیت 4 ﴿۱۱﴾ إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ: یوسف علیہ السلام کے باپ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام تھے اور یہ چاروں نبی تھے،
اس لیے نبی کریم ﷺ نے یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا: «أَلْكَرِيمُ ابْنُ الْكَرِيمِ ابْنُ الْكَرِيمِ ابْنُ الْكَرِيمِ يُوسُفُ بْنُ
يَعْقُوبَ بْنِ إِسْحَاقَ بْنِ إِبْرَاهِيمَ» [بخاری، التفسیر، باب قولہ: ﴿يُوسُفُ بْنُ يَعْقُوبَ بْنِ إِسْحَاقَ بْنِ إِبْرَاهِيمَ﴾، عن ابن عمر رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا
”کریم بن کریم بن کریم بن کریم، یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام۔“

﴿۱۲﴾ يَا أَبَتِ: یہ اصل میں ”یا ابا“ تھا ”اے میرے باپ!“ یا، حذف کر کے اس کی جگہ تائے تائین لائی گئی اور باء کا سرہ اس
کی طرف منتقل کر دیا۔ یہ اظہار محبت کا ایک طریقہ ہے، جیسے اردو میں ”ابا“ کو ”ابو“ کہہ دیتے ہیں۔

قَالَ يَبْنَئِي لَا تَقْضُ رُعْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۗ إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ

اس نے کہا اے میرے چھوٹے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا، ورنہ وہ تیرے لیے تدبیر کریں گے،

آیت 5 ① قَالَ يَبْنَئِي لَا تَقْضُ یعنی اس کی تعبیر ظاہر ہے، سنتے ہی سمجھ لیں گے۔ گیارہ بھائی تھے اور ایک باپ

اور ایک ماں، یہ سب ان کی طرف محتاج ہوں گے، پھر شیطان ان کے دل میں حسد ڈالے گا۔ (موضح) اس وقت ان کی عمر کیا تھی، اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں فرمائی۔ معاملہ میں ہے کہ بارہ سال تھی، کچھ لوگ بائبل کے حوالے سے سترہ سال بیان کرتے ہیں، مگر تعین کی کوئی پختہ دلیل نہیں۔ اگر کوئی اسرائیلی روایت ہو بھی تو اسے نہ ہم سچا کہہ سکتے ہیں نہ جھوٹا۔ ویسے سترہ سالہ جوان جو صحرا میں پلا ہو، اس کے متعلق بھڑیے کے کھا جانے کا خدشہ کم ہی پیدا ہوتا ہے۔ ہاں یہ ظاہر ہے کہ اس وقت وہ بچے تھے، مگر سمجھ بوجھ رکھتے تھے: "يَبْنَئِي وَيَلْعَبُ" (چرے، کھائے پیے اور کھیلے) اور "هَذَا غُلْمٌ" (یہ لڑکا ہے) اور "أَوْ نَتَخَذُ ذَاكَ" (یا ہم اسے بیٹا بنا لیں گے) سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اگر عمر بتانے کی ضرورت ہوتی تو اللہ تعالیٰ ضرور بیان فرما دیتا۔ "یوسف" عربی زبان کا نام نہیں کہ اس کا اشتقاق عربی میں سے تلاش کیا جائے، بلکہ عبرانی یا اس زبان کا نام ہے جو یعقوب عليه السلام استعمال کرتے تھے۔ اس خواب کی تعبیر کافی عرصہ بعد جا کر پوری ہوئی، بعض چالیس برس بتاتے ہیں، بعض کم و بیش، مگر بچپن سے جوانی کا عرصہ جو عزیز مصر کے گھر گزارا، پھر قید خانے کے سات یا نو سال، پھر خوش حالی کے سات سال، جس کے بعد قحط شروع ہوا اور بھائی مجبور ہو کر آئے اکیس بائیس سال سے کم عرصہ کسی صورت نہیں بنتا، زیادہ ہو تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خواب کی تعبیر ظاہر ہونے میں لمبی مدت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

② يَبْنَئِي: "بْنَئِي" کی تصغیر ہے، محبت اور شفقت سے فرمایا، اے میرے چھوٹے سے بیٹے، یا اے میرے پیارے بیٹے۔

③ یعقوب عليه السلام نے یوسف عليه السلام کو اپنا خواب بھائیوں کے سامنے بیان کرنے سے منع فرمایا، کیونکہ تعبیر ظاہر تھی اور یعقوب عليه السلام نے مختصراً بیان بھی فرمادی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں چنے گا اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے گا۔ قدرتی طور پر جس شخص کو نعمت ملتی ہے اس پر حسد ہوتا ہے اور شیطان بھی انسان کی اس کمزوری، یعنی حسد کو استعمال کر کے بھائیوں کے درمیان اور دوستوں کے درمیان دشمنی پیدا کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْتِرُ بَيْنَهُمْ﴾ [بنی اسرائیل: ۵۳] "بے شک شیطان ان (میرے بندوں) کے درمیان جھگڑا ڈالتا ہے۔" اور یہ اس کے نزدیک سب سے زیادہ قرب کا ذریعہ ہوتا ہے، جیسا کہ ایک لمبی حدیث میں ہے کہ شیطان اپنے لشکر لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے بھیجتا ہے: ﴿ثُمَّ يَجِيءُ أَحَدَهُمْ فَيَقُولُ مَا تَرَكْتَهُ حَتَّىٰ فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أُمَّرَأَتِهِ﴾ [مسلم، صفات المسافقين، باب تحريش الشيطان : ۶۷/۲۸۱۳] "پھر ان میں سے ایک شیطان آکر (اپنی کارکردگی بیان کرتے ہوئے) کہتا ہے: "میں نے اس آدمی کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی نہیں ڈال دی۔" اس لیے بھائیوں کو خواب کا علم ہونے پر یوسف عليه السلام کو ان کی کسی خفیہ تدبیر سے ڈرایا، ساتھ ہی "إِنَّ" کے ساتھ اس کی وجہ بیان فرمائی کہ بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور یہی بات یوسف عليه السلام

عَدُوٌّ قَبِيْنٌ ﴿۵﴾

کوئی بری تدبیر۔ بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے ﴿۵﴾

نے اپنے والدین اور بھائیوں کے مصر آنے کے موقع پر کہی تھی ﴿مِنْ بَعْدِي اَنْ تَزَرَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ﴾ [یوسف : ۱۰۰] ”اس کے بعد کہ شیطان نے میرے درمیان اور میرے بھائیوں کے درمیان جھگڑا ڈال دیا تھا۔“ قرآن کے بیان کا تقاضا یہی ہے کہ یوسف علیہ السلام نے والد ماجد کے کہنے کے مطابق وہ خواب بیان نہیں کیا، کیونکہ بھائیوں نے قتل کے مشورے کے وقت بھی خواب کا ذکر نہیں کیا اور یوسف علیہ السلام کے کمال اطاعت کا تقاضا بھی یہی ہے، مگر اسرائیلی روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو وہ خواب سنا دیا تھا اور اس پر کئی کہانیوں کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس سے اسرائیلی روایات کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

﴿۴﴾ یہاں یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یعقوب نبی کا فرمان وحی پر مبنی تھا۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کا بھی فرمان ہے: ﴿اَسْتَعِيْبُوْا عَلٰى اِنْحَاٰجِ الْحَوَاجِ بِالْكِتْمَانِ فَاِنَّ كُلَّ ذِيْ نِعْمَةٍ مَّحْسُوْدٌ﴾ [السلسلة الصحيحة : ۴۳۶/۳، ج : ۱۴۵۳] ”اپنی حاجتوں کو کامیاب کرنے میں چھپانے سے مدد لو، کیونکہ ہر نعمت والا محسود ہوتا ہے۔“ یعنی اس پر حسد کیا جاتا ہے۔ اس خواب میں بھی اتمام نعمت کی خوش خبری تھی، اسے کامیاب بنانے کے لیے اسے چھپانے کا حکم دیا۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ [الضحیٰ : ۱۱] ”اور لیکن اپنے رب کی نعمت، پس (اسے) بیان کر۔“ اس حکم کو اور یعقوب علیہ السلام کے منع کرنے کے حکم کو کیسے جمع کریں گے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام پر ابھی نعمت مکمل ہونا باقی تھی، جب کہ رسول اللہ ﷺ پر نعمت پوری ہو چکی تھی۔ ہمارے لیے بھی دونوں چیزوں میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے، تا کہ نعمت مکمل ہونے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ دوسرا جواب جو کتب تفسیر میں ہے، وہ یہ ہے کہ یہ آیت دلیل ہے کہ بعض اوقات نعمت کا اظہار نہ کرنا بلکہ اسے چھپانا جائز ہے، جیسا کہ اوپر سلسلہ صحیح کے حوالے سے حدیث گزر چکی ہے، چنانچہ جب نعمت کے ظاہر کرنے سے اپنے خلاف حسد وغیرہ کی بنا پر سازش یا نقصان کا خطرہ ہو تو اسے چھپائے اور اگر یہ خطرہ نہ ہو تو رب تعالیٰ کی نعمت بیان کرے۔

﴿۵﴾ اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ہوتا ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَمْ يَبْقَ مِنَ النَّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ، فَالْوَاوَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ الرَّوْيَا الصَّالِحَةُ﴾ [بخاری، التعمیر، باب المبشرات : ۶۹۹۰] ”نبوت میں سے مبشرات کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔“ لوگوں نے پوچھا: ”مبشرات (خوش خبریاں) کیا ہیں؟“ فرمایا: ”اچھے خواب۔“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿الرَّوْيَا الْحَسَنَةُ مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ حُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَ اَرْبَعِيْنَ حُزْءًا مِنَ النَّبُوَّةِ﴾ [بخاری، التعمیر، باب رؤيا الصالحين : ۶۹۸۳، عن انس رضی اللہ عنہ] ”صالح آدمی کا اچھا خواب نبوت کے چھیا لیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔“ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں خواب دیکھا کرتا جو (پریشانی پیدا کر کے) مجھے بیمار کر دیتے، یہاں تک کہ میں نے ابوقادہ رضی اللہ عنہ سے سنا کہ میں بھی خواب دیکھا کرتا جو مجھے بیمار کر دیتے، یہاں تک کہ میں نے

وَ كَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْآحَادِيثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَ عَلَى
آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَى أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَ إِسْحَاقَ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ

حِكْمَةٌ ①

اور اسی طرح تیرا رب تجھے چنے گا اور تجھے باتوں کی اصل حقیقت سمجھنے میں سے کچھ سکھائے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور
آل یعقوب پر پوری کرے گا، جیسے اس نے اس سے پہلے وہ تیرے دونوں باپ دادا ابراہیم اور اسحاق پر پوری
کی۔ بے شک تیرا رب سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ①

رسول اللہ ﷺ سے سنا: «الرُّؤْيَا الْحَسَنَةُ مِنَ اللَّهِ، فَإِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ مَا يُحِبُّ فَلَا يُحَدِّثُ بِهِ إِلَّا مَنْ يُحِبُّ، وَإِذَا رَأَى
مَا يَكْرَهُ فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللَّهِ مِنْ شَرِّهَا، وَمِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ وَلْيَتَفَلَّ ثَلَاثًا وَلَا يُحَدِّثْ بِهَا أَحَدًا فَإِنَّهَا لَنْ تَضُرَّهُ»
[بخاری، التعمیر، باب إذا رأى ما يكره... ۷۰۴۴:۰] ”اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، تو جب تم میں سے کوئی شخص ایسا
خواب دیکھے جو اسے پسند ہو تو وہ اس کے سوا سے بیان نہ کرے جو محبت رکھتا ہو اور جب ایسا خواب دیکھے جو اسے ناپسند ہو تو اس
کے شر سے اور شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے اور تین دفعہ (بائیں طرف) تھوک دے اور وہ کسی کو بیان نہ کرے، تو وہ خواب
اسے ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔“ ایک روایت میں یہ بھی ہے: «وَلْيَتَحَوَّلْ عَنْ حَبْنِهِ الَّذِي كَانَ عَلَيْهِ» کہ وہ اپنی
کروٹ بدل لے۔ [مسلم، الرؤیا، باب فی کون الرؤیا من اللہ...: ۲۲۶۲] اور یہ کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس عمل کو ہر قسم
کے ضرر سے سلامتی کا سبب بنا دے، جیسا کہ صدقہ و خیرات مصیبتیں دور کرنے کے سبب بن جاتے ہیں۔

② یعقوب علیہ السلام کے اپنے دوسرے بیٹوں کے متعلق خیال کے اظہار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی
خاص اس موضوع پر کتاب میں ہے کہ قرآن، لغت اور واقعات کی دلالت یہی ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔ نہ ہی قرآن یا حدیث
میں ان کی نبوت کی طرف کوئی اشارہ موجود ہے۔ (سید طنطاوی) البتہ بعد میں ان کی اولاد (اسباط) سے کئی انبیاء و رسل گزرے۔

آیت 6 ① وَ كَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ : ”يَجْتَبِي“ ”جَتَبِي“ (جس) کے باب افتعال ”اجْتَبَا“ کا فعل مضارع
ہے، جس کا معنی جمع کرنا، کسی خوبی کی بنا پر چن لینا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کے ”اجْتَبَا“ (چن
لینے) سے مراد اسے اپنے ایسے فیض کے ساتھ خاص کر لینا ہے جس سے اس کو اپنی کسی کوشش کے بغیر مختلف قسم کی نعمتیں حاصل
ہو جائیں، یہ چیز انبیاء کو حاصل ہوتی ہے یا انھیں جو ان کے قریب ہوں، مثلاً صدیقین، شہداء۔ (مفردات) بے شک اعلیٰ درجے کا
اجتباء انبیاء، صدیقین اور شہداء کو حاصل ہوتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے چننے کے بھی کئی درجے ہیں، جیسا کہ آپ اپنے متعلق سوچیں
کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کس طرح چنا کہ پھر یا نباتات یا جانوروں کے بجائے انسان بنایا، پھر کافر نہیں بلکہ مسلمان بنایا، پھر
کبیرہ گناہوں سے بچایا، پھر مشرک کلمہ گو کے بجائے موحد اور بدعتی کے بجائے تابع سنت بنایا، اگر علم کتاب کی نعمت بھی حاصل

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٍ لِّلسَّالِئِينَ ④

بلاشبہ یقیناً یوسف اور اس کے بھائیوں میں سوال کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں تھیں ④

ہے تو آپ ان لوگوں میں جا ملے جن کے متعلق فرمایا: ﴿ثُمَّ أَوْزَنَّا الْكَتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ [فاطر: ۳۲] ”پھر اس کتاب کے وارث ہم نے وہ لوگ بنائے جنہیں ہم نے چن لیا۔“ اگر دعوت الی اللہ کی توفیق مل گئی تو مزید فیض مل گیا۔ غرض اصطفاء اور اجنباء کے کئی درجے ہیں اور جتنا حاصل جائے اس پر اللہ کا بے حد شکر ادا کرنا چاہیے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ﴾ [الأعراف: ۴۳] ”(جنتی کہیں گے) اور ہم کبھی نہ تھے کہ ہدایت پاتے اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی۔“ یا اللہ! تو اپنے فضل سے ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما جو جنت میں داخل ہو کر ان الفاظ میں تیرا شکر ادا کریں گے۔ (آمین)

② اس آیت میں ”وَكَذَلِكَ“ (اور اسی طرح) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھے یہ خواب دکھلایا، اور کسی کو اس طرح کا خواب نہیں دکھلایا، اسی طرح تیرا رب تجھے پننے گا اور تجھے..... چننے سے مراد اعلیٰ درجے کا چننا ہے، جیسا کہ اوپر امام راضی سے نقل ہوا، یعنی نبوت و صدیقیت سے نوازے گا اور گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کے سجدہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اعلیٰ مقام پر پہنچا کر تمہیں اپنے عہد کے سب بندوں پر فوقیت بخشے گا۔

③ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ: ”الْحَادِيثُ“ ”حَدِيثُ“ کی جمع ہے جس کا معنی بات ہے۔ ”تَأْوِيلُ“ کا معنی بات کا صحیح مطلب سمجھنا اور اس کی تک پہنچنا ہے، کیونکہ ”تَأْوِيلُ“ ”أَوَّلُ“ سے مشتق ہے، جس کا معنی لوٹنا ہے اور تاویل کا معنی کسی چیز کو اس کے اصل مقصد کی طرف لوٹانا ہے، یعنی جو اس سے مراد ہے۔ یہاں ”تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ“ سے مراد بات سمجھنے کی تیز بصیرت اور کمال فہم کے ساتھ خوابوں کی تعبیر بھی ہے۔

④ وَيُؤْتِيكَ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يٰعْقُوبَ..... تم پر اپنی نعمت تمام کرے گا جیسے اس سے پہلے تمہارے (دو باپوں) دادا اور پردادا پر پوری کی، یعنی تمہیں نبوت و رسالت اور حکومت عطا فرمائے گا۔ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”(أَبُو يٰعْقُوبَ) یعنی تیرے دونوں باپوں پر (ابراہیم اور اسحاق علیہ السلام) کا نام لیا، اپنا نہ لیا عاجزی سے۔“ (موضح) آل یعقوب پر نعمت تمام کرنے کا مطلب وہ تمام نعمتیں ہیں جو بنی اسرائیل پر ہوئیں اور جن کا ذکر تفصیل سے قرآن مجید میں موجود ہے۔

⑤ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ: کہ اس کے بندوں میں سے کون سرفرازی کے لائق ہے۔

آیت 7 ① لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ..... یہاں سے یوسف علیہ السلام کے قصے کی تفصیل شروع ہوتی ہے۔ ”آيَةُ“ ”آيَةٌ“ کی جمع ہے۔ یہاں آیات سے مراد وہ عبرتیں، نصیحتیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانیاں ہیں جو اس واقعہ میں ذکر ہوئی ہیں، چونکہ وہ بہت سی ہیں اور بہت سے لوگوں سے متعلق ہیں، مثلاً ایک طرف بھائیوں کی نفرت، حسد، بدگمانی، اس زمانے کے لوگوں کے حالات، آزاد لوگوں کو غلام بنا لینا، ان کا انداز حکومت، ان کے قوانین، شیطان کا بہکانا، انہوں کے ظلم، بیادوں سے

جدائی، بے وطنی، غلامی کے صدمے، حسن کی وجہ سے آنے والی آزمائشیں، عزیز کی بیوی کے عشق کی شورش اور طفیلی اور یوسف علیہ السلام کی عفت کا امتحان، پھر قید خانے کی آزمائش ہے، دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اس کا اپنے کام پر غالب ہونے کا مظاہرہ ہے، یوسف علیہ السلام کا تمام دشمنوں، حاسدوں اور مخالفوں کی خواہش کے برعکس اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ کمالات علم و حکمت، اخلاص نیت، حسن عمل اور صبر و تقویٰ کی بدولت جیل اور غلامی سے نکل کر قرب شاہی اور حکومت کے وسیع اختیارات کا حصول ہے۔ جابر و ظالم بھائیوں کی ان کے سامنے بے بسی اور ان سے صدمے کے سوال پر مجبور ہونا ہے۔ پھر اس سارے عرصے میں یوسف علیہ السلام کا ہر زیادتی کرنے والے سے انتقام کے بجائے حسن سلوک، بے مثال صبر اور عفو و درگزر رہے اور آخر میں یوسف علیہ السلام کے خواب گیارہ ستاروں اور سورج و چاند کے ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی تعبیر کا ظہور ہے اور اس تمام عظمت و رفعت کے باوجود یوسف علیہ السلام کا آخرت کی فکر میں اللہ تعالیٰ سے اسلام پر موت اور صالحین کے ساتھ ملانے کی دعا ہے۔ غرض ایک ایک بات اپنے اندر بہت سی نشانیاں اور عبرتیں رکھتی ہے۔

﴿لِلنَّاسِ آيَاتٍ﴾ : یہ سوال کرنے والے کون تھے، اشرف المخلوقات میں ہے: ”منقول ہے کہ قریش نے یہود کے اشارے پر امتحان کی غرض سے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کا وطن شام تھا تو بنی اسرائیل مصر میں کیسے آباد ہو گئے، حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام کے دور میں فرعون سے نجات حاصل کی؟ اس پر یہ سورت اتری اور فرمایا کہ سوال کرنے والوں کے لیے اس قصہ میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ انہوں نے ایک بھائی پر حسد کیا تو آخر کار اسی کے محتاج ہوئے، اسی طرح یہود حسد کر رہے ہیں اور قریش نے آپ ﷺ کو نکالا تو آخر کار آپ ہی کا عروج ہوا۔ (موضح) مگر یہ روایات اسرائیلی ہیں (اور مکہ میں یہود تھے بھی نہیں، نہ اہل مکہ کا ان سے خاص رابطہ تھا) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایسی کسی روایت کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس کے بالمقابل دوسری ایک دو روایات بحوالہ ابن جریر بیان کی ہیں کہ صحابہ کے سوال پر یہ سورت نازل ہوئی۔ (مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول یہ روایت بھی منقطع ہے، کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرنے والے راوی عمرو بن قیس نے انہیں پایا ہی نہیں۔ دیکھیے الاستیعاب فی بیان الاسباب) بہر حال اگر اسرائیلی روایات کو معتبر مان لیا جائے تو نشانوں سے مراد آپ ﷺ کی نبوت کی نشانیاں ہیں اور پوچھنے والوں سے مراد یہودی یا کفار مکہ ہیں اور اگر ان کا اعتبار نہ کیا جائے تو آیات سے مراد وہ عبرتیں ہیں جو یوسف علیہ السلام کے قصے میں پائی جاتی ہیں اور پوچھنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی آیات کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ صاحب معالم نے ان عبرتوں کو خوب تفصیل سے لکھا ہے۔ ”ابن عساکر نے لکھا ہے کہ اہل عرب کی بلاغت کا یہ ایک اسلوب ہے کہ وہ متوجہ کرنے کے لیے سائل کا ذکر کرتے ہیں۔ مراد اس بات کو سننے کا شوق دلانا ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَجَعَلْ فِيهَا رِجَالًا مُّسَبِّحِينَ رَبَّهُمْ وَكَانَ أَسْفُلُهَا عَذَابًا أَلِيمًا﴾ [سورة الحجر: ۱۷] ”اور اس نے اس میں اس کے اوپر سے گڑے ہوئے پہاڑ بنائے اور اس میں بہت برکت رکھی اور اس میں اس کی عذائیں اندازے کے ساتھ رکھیں، چار دن میں، اس حال میں کہ سوال کرنے والوں کے لیے برابر (جواب) ہے۔“ اور جیسا کہ رسول نے کہا۔

سَلْبِيْ اِنْ جَهِلْتِ النَّاسَ عَنَّا وَ عَنْهُمْ فَلَيْسَ سَوَاءً غَالِبٌ وَّ جَهْلُوْا

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

إِذْ قَالُوا لِيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ آبَيْنَا مِنَّا وَهَنَّا عُصَبَةٌ ۗ إِنَّ آبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۸﴾

جب انھوں نے کہا یقیناً یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کے ہاں ہم سے زیادہ پیارے ہیں، حالانکہ ہم ایک قوی جماعت ہیں۔ بے شک ہمارا باپ یقیناً کھلی غلطی میں ہے ﴿۸﴾

”اے مخاطبہ! اگر تجھے معلوم نہیں تو لوگوں سے ہمارے اور ان کے متعلق سوال کر لے، کیونکہ جاننے والا اور نہ جاننے والا برابر نہیں ہوتے۔“

اور ایف بن زبان نے کہا ہے ۔

فَلَمَّا التَّفَيْنَا بَيْنَ السَّيْفِ بَيْنَنَا لِسَائِلَةٍ عَنَّا حَفِيٍّ سَوَّأَلَهَا

”تو جب ہم آپس میں مقابل ہوئے تو تلوار نے ہمارے درمیان واضح فیصلہ کر دیا، اس سوال کرنے والی کے لیے جس کا سوال بہت اصرار کے ساتھ تھا۔“

عرب شاعر عموماً سوال کرنے والی عورتوں کا ذکر کرتے ہیں، یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے یہ انداز بدل کر سوال کرنے والیوں کے بجائے مردوں کو سوال کرنے والے قرار دے کر جواب دیا۔ (التحریر والتنوير)

آیت 8 ① إِذْ قَالُوا لِيُوسُفُ وَأَخُوهُ : یعنی انھوں نے آپس میں کہا۔ دراصل انھوں نے اپنے ظلم کے جواز کے لیے یوسف علیہ السلام کا یہ جرم تجویز کیا، ورنہ اگر یہ جرم تھا تو والد کا تھا جو انھوں نے والد کو بھی معاف نہیں کیا، اس کا ذکر آگے آرہا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید میں کہیں اشارہ بھی نہیں کہ اس میں یعقوب علیہ السلام کی کوئی غلطی تھی، اگر یہ غلطی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یعقوب علیہ السلام کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتا، کیونکہ وہ نبی تھے۔ بعض مفسرین نے بھی یہ لکھ دیا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ باپ کو بیٹوں کے درمیان محبت میں بھی برابری رکھنی چاہیے، حالانکہ نہ ان حضرات نے خیال فرمایا، نہ برادران یوسف نے کہ والدین کے بعض اولاد کی طرف میلان کے کیا مراتب و اسباب ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمیشہ چھوٹے بچے والدین کی شفقت اور محبت زیادہ حاصل کرتے ہیں، جو یوسف علیہ السلام کے بڑے بھائیوں میں سے ہر ایک اپنی اس عمر میں حاصل کر چکا تھا، پھر اولاد کی طبیعت کی سرکشی اور اطاعت ماں باپ کی محبت کھینچنے میں فرق کا باعث بن جاتی ہے۔ اسی طرح بیمار بچے اور پردیس میں رہنے والے بچے کی طرف والدین کی توجہ زیادہ ہوتی ہے، جیسا کہ اُس قدیم عرب نے کہا تھا جس سے پوچھا گیا کہ تمہیں اپنے بیٹوں میں سب سے پیارا کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا: ”چھوٹا، یہاں تک کہ بڑا ہو، غائب یہاں تک کہ آجائے اور بیمار یہاں تک کہ تندرست ہو جائے۔“ (شعراوی) اس لیے شریعت نے اولاد کے درمیان عطیے میں برابری اور بیویوں کے درمیان عدل کا حکم دیا ہے، دلی میلان اور محبت نہ بندے کے اختیار میں ہے اور نہ اس کے کم و بیش ہونے میں ماں باپ کا کوئی جرم ہے، نہ اولاد کا۔ یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی کا جرم بھی یہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چھوٹے بھائی کا نام بتایا نہ بڑوں کا، کیونکہ یہ بات قرآن کے مقصود سے خاص تعلق نہیں رکھتی۔ اب اگر ہم اہل کتاب سے سن کر چھوٹے کا نام

اَقْتُلُوا يُوسُفَ اَوْ اَطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّغْلُ لَكُمْ وَجْهَ اِيْنِكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْ بَعْدِهٖ قَوْمًا

طَلِحِيْنَ ④

یوسف کو قتل کر دو، یا اسے کسی زمین میں پھینک دو، تمہارے باپ کا چہرہ تمہارے لیے اکیلا رہ جائے گا اور اس کے بعد تم نیک لوگ بن جانا ④

بنیامین لکھیں یا بڑوں کا نام لکھیں تو جس بات کو ہم رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق سچا یا جھوٹا نہیں کہہ سکتے، اس کا علم سے کیا تعلق ہے اور اس کا اعتبار ہی کیا ہے؟ علم یقین کا نام ہے، شک کا نہیں۔

② وَخَنَ عُسْبَةً: یہ جملہ حالیہ ہے۔ لفظ ”عُسْبَةٌ“ ایک قوی جماعت پر بولا جاتا ہے، جو عموماً دس سے لے کر چالیس پر مشتمل ہوں۔ یہ ”عُصْبٌ“ سے مشتق ہے جو معنی ”شَدُّ“ (باندھنا) ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو قوت اور سہارا دیتا ہے، یعنی ہم تمام کام سنبھالنے والے اور وقت پر کام آنے والے ہیں، جب کہ یوسف اور اس کا بھائی کم عمر ہونے کی وجہ سے والد کے کسی کام نہیں آسکتے اور ہم ایک قوی جتھا ہیں جو اس بدوی ماحول میں وقت پر کام آسکتے ہیں۔

③ اِنْ اَبَانَا لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: یہاں انھوں نے باپ کو بھی نہیں بخشا۔ ”ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ“ سے مراد رائے کی غلطی ہے جو دنیوی معاملات میں ہوتی ہے، یہاں ضلالت سے مراد دینی ضلالت یا عام گمراہی نہیں ہے، ایسا کہتے تو یہ لوگ کافر ہو جاتے۔ (قرطبی) بعض اوقات کسی خاص کام میں غلطی پر بھی یہ لفظ آ جاتا ہے، جیسا کہ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہونے کی وجہ بتائی، فرمایا: ﴿ اَنْ تَضَلَّ اِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدَاهُمَا الْاٰخَرٰى ﴾ [البقرة: ۲۸۲] ”(اس لیے) کہ دونوں میں سے ایک بھول جائے تو ان میں سے ایک دوسری کو یاد دلا دے۔“ دراصل وہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ آئندہ کیے جانے والے سلوک میں اپنے آپ کو بے قصور باور کروا کر ساری غلطی والد کے ذمے ڈالنا چاہتے تھے، جنھوں نے اولاد کی محبت میں فرق کیا تھا۔

آیت ۹ ① اَقْتُلُوا يُوسُفَ اَوْ اَطْرَحُوْهُ اَرْضًا: دیکھیے حسد انسان کو کہاں تک پہنچا دیتا ہے کہ آدمی صغیرہ گناہ کو کبیرہ اور کبیرہ کو صغیرہ سمجھنے لگتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کا باپ کی نظر میں زیادہ محبوب ہونا بھائیوں کی نظر میں اتنا بڑا جرم بن گیا کہ اس کی وجہ سے قتل ناحق جو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے، ان کی نگاہ میں معمولی بن گیا۔ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے قصے میں بھی حسد نے ایک بے گناہ کا قتل قاتل کی نگاہ میں جائز بلکہ خوش نما بنا دیا۔ دوسری تجویز بھی کم خطر ناک نہ تھی۔ ”طَرَحُ“ کا معنی ہے دور پھینک دینا۔ ”اَرْضًا“ نکرہ ہے، یعنی اسے کسی نامعلوم زمین میں پھینک دو، تاکہ وہیں مر جائے۔ اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کے متعلق فرمایا: ﴿ وَاُولٰٓئِكَ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلٰةَ لَعَدَّ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا ﴾ [الحشر: ۳] ”اور اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ان (بنو نضیر) پر جلاوطن ہونا لکھ دیا تھا تو وہ یقیناً انھیں دنیا میں سزا دیتا۔“ معلوم ہوا کہ جلاوطنی اور وہ بھی نامعلوم سرزمین میں، کم عذاب نہیں ہے۔

② يَّغْلُ لَكُمْ: ”يَّغْلُ“ اصل میں ”يَّخْلُو“ تھا۔ ”اَقْتُلُوا“ (امر) کے جواب میں مجزوم ہونے کی وجہ سے اس کی واؤ اور ”تَكُوْنُوْنَ“ کا نون گر گئے، یعنی یوسف کے قتل یا غائب کر دینے سے تمہارے والد صاحب کی توجہ صرف تمہارے لیے رہے

قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَالْقَوْكَ فِي غَيْبَتِ الْجَبِّ يَلْقَاهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ

كُنْتُمْ فَعِلِينَ ⑩

ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا یوسف کو قتل نہ کرو اور اسے کسی اندھے کنویں کی گہرائی میں پھینک دو، کوئی راہ چلا قافلہ اسے اٹھالے گا، اگر تم کرنے ہی والے ہو ⑩

جائے گی۔ ”وَجَدَهُ“ کا معنی چہرہ ہے اور چہرے کے ساتھ ہی توجہ ہوتی ہے۔ والد کی محبت میں شریک غالب کا کائنات نکلنے کی دیر ہے، وہ تمہارے ہی ہو جائیں گے۔ حسد نے انہیں ایسا اندھا کیا کہ یہ بھی نہ سوچا کہ اس بوڑھی جان پر کیا گزرے گی، انہیں یوسف علیہ السلام کی عداوت میں نہ باپ پر گزرنے والی حالت کا کوئی خیال آیا نہ یوسف پر رحم آیا۔

⑩ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ : اتنے بڑے جرم پر ملامت کرنے والے ضمیر کو انہوں نے یہ تسلی دے کر خاموش کرنے کی کوشش کی کہ یوسف کا قصہ تمام کر کے تم نیک لوگ بن جانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی سنگ دلی کے باوجود انہیں اپنے مجرم ہونے کا احساس تھا۔ یہ شیطان کا بندے کو گناہ میں مبتلا کرنے کے لیے بہت بڑا ہتھیار ہے کہ گناہ کر لو، بعد میں توبہ کر لینا، لیکن شیطان کے اس وار سے بچنا نہایت ضروری ہے، کیا خبر کہ اس کے بعد توبہ کا موقع ہی نہ ملے، پہلے ہی موت آ جائے، جس کا وقت کسی کو بتایا ہی نہیں گیا، تاکہ ہر شخص موت کے کسی بھی وقت آ جانے کے خیال سے گناہ سے باز رہے، فرمایا: ﴿وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ [آل عمران : ۱۰۲] ”اور تم ہرگز نہ مرو، مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔“ پھر اس کی بھی کیا خبر کہ وقت ملنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے اس کی طرف سے توبہ کی توفیق ہی نہ ملے۔ فرمایا: ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ﴾ [الانفال : ۲۴] ”اور جان لو کہ بے شک اللہ بندے اور اس کے دل کے درمیان رکاوٹ بن جاتا ہے۔“

ایک معنی ”وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ“ کا یہ بھی کیا گیا ہے کہ یوسف کے بعد تم درست معاملے والے لوگ بن جانا، یعنی والد کو راضی کر لینا اور آپس میں شیر و شکر ہو جانا۔ یہ معنی ہو تو بھی وہ دھوکے ہی میں مبتلا تھے۔ اپنے لخت جگر کو غائب کرنے والوں سے ظاہری صلح ہو بھی جائے تو ہر وقت غم سے بھرا ہوا دل پہلی حالت میں کیسے آسکتا ہے۔

آیت 10 قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ.....: ”غَيْبَتِ“ کا معنی اخت میں ہے: ”غَيْبَانَةٌ كُلُّ شَيْءٍ مَا سَتَرَكَ مِنْهُ“ یعنی ہر چیز کی غیابت وہ ہے جو تمہیں اس سے پردے میں کر لے، یعنی اسے تم سے چھپالے۔ اس لیے قبر کو بھی ”غَيْبَانَةٌ“ کہتے ہیں۔ ”الْجَبِّ“ کا معنی کنواں، بہت پانی اور گہرائی والا کنواں یا مٹی کا کھودا ہوا کنواں جس میں پتھروں اور اینٹوں کی دیوار نہ بنائی گئی ہو، ”السَّيَّارَةِ“ قافلہ۔ (قاموس) ان بھائیوں میں سے ایک نے جو فطرتاً دوسروں سے بہتر اور رحم دل تھا، جب انہیں حد سے گزرتے دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ یہ کسی طرح نکلنے والے نہیں، انہیں ایسا مشورہ دیا جسے وہ بھی قبول کر سکیں اور اسے یوسف کا طرف دار بھی قرار نہ دیں۔ وہ یہ تھا کہ یوسف کو قتل نہ کرو، قتل تو بہت ہی بڑا جرم ہے۔ (مفسرین فرماتے ہیں کہ یوسف کا نام اس نے ان کے دل میں نرمی، شفقت اور رحم ابھارنے کے لیے لیا، تاکہ وہ کچھ سوچیں کہ ہم کسے قتل کرنے

قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَى يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ ﴿۱۱﴾ أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتُكِبْ
وَ يَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ ﴿۱۲﴾

انہوں نے کہا اے ہمارے باپ! تجھے کیا ہے کہ تو یوسف کے بارے میں ہم پر اعتبار نہیں کرتا، حالانکہ بے شک ہم یقیناً اس کے خیر خواہ ہیں ﴿۱۱﴾ اسے کل ہمارے ساتھ بھیج کہ چرے چگے اور کھیلے کودے اور بے شک ہم ضرور اس کی حفاظت کرنے والے ہیں ﴿۱۲﴾

جا رہے ہیں، یوسف کو؟ جو ہمارا بھائی ہے) اگر ضرور ہی کچھ کرنا ہے تو اسے کسی اندھے کنویں کی گہرائی میں پھینک دو۔ اس سے تمہارا مقصد بھی پورا ہو جائے گا کہ کوئی قافلہ اسے اٹھا کر لے جائے گا، تم اپنے مقصد یعنی والد کی نگاہوں سے دور کرنے میں بھی کامیاب ہو جاؤ گے اور ایک معصوم جان کے قتل سے بھی بچ جاؤ گے۔ ”قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ“ مطلب یہ کہ اگر قتل کا مشورہ دینے والے بھائی تھے تو یہ بھی ایک بھائی ہی تھا۔ یہ بات کس بھائی نے کہی تھی، قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہیں، کیونکہ ہدایت کے مقصد کے لیے اس کی ضرورت نہ تھی اور پہلی کتابوں کے سچ یا جھوٹ کا کچھ پتا نہیں کہ ان پر بھروسہ کر کے کوئی نام بتایا جائے۔

آیت 12:11 قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا: اب یہ مرحلہ درپیش تھا کہ یوسف علیہ السلام کو ساتھ کیسے لے جائیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے کی کوشش کر چکے تھے، مگر والد نے اجازت نہیں دی تھی اور یہ کہ والد کو پہلے بھی ان کے متعلق اعتبار نہ تھا کہ وہ یوسف کے خیر خواہ ہیں، یا انھیں کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے۔ اس مرتبہ دس کے دس بھائیوں نے منت، خوشامد اور دھونس دھاندلی کا ہر حربہ استعمال کر کے یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے کی اجازت طلب کی۔ سب سے پہلے تو نہایت ادب اور منت کے ساتھ بات کی، ابتدا دیکھیے ”يَا أَبَانَا“ ”اے ہمارے باپ!“ اس سے قریب تر رشتہ کون سا ہوگا جو درمیان میں لا کر درخواست کی جائے اور دل نرم نہ ہو، پھر ساتھ ہی دھونس دیکھیے ”آپ کو کیا ہے کہ یوسف کے بارے میں ہم پر اعتماد ہی نہیں کرتے“ (گویا سارا قصور ابا جی کا ہے) ”حالانکہ بے شک ہم یقیناً اس کے خیر خواہ ہیں۔“ ”إِنَّا“ کے ”إِنَّ“ اور ”لَنَاصِحُونَ“ کے لام کے ساتھ خیر خواہی کا یقین دلانا ملاحظہ فرمائیں، اہل عرب کے ہاں اس میں قسم کا مفہوم شامل ہوتا ہے۔ پھر یوسف کی مزید خیر خواہی کا ذکر ہوتا ہے کہ کبھی باہر جنگل میں جا کر اسے سیر و تفریح کا موقع ہی نہیں ملا۔ کل آپ اسے ہمارے ساتھ بھیجیں، جنگل کے پھل وغیرہ کھائے پیے گا، کھیلے کودے گا، خوش دل ہوگا۔ رہا جنگل اور صحرا میں وحشی جانوروں وغیرہ کا خطرہ تو اس کی فکر نہ کیجیے۔ ”بے شک“ ہم اس کی ”یقیناً“ حفاظت کرنے والے ہیں۔ یہ وہی قسم کے مفہوم والے الفاظ ہیں جو انہوں نے اپنی خیر خواہی کا یقین دلاتے ہوئے کہے تھے کہ ”وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ“ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا پیشہ جنگل میں بکریاں وغیرہ چراننا تھا۔

قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ وَ أَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُونَ ﴿١٣﴾
 قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذًا لَخٰسِرُونَ ﴿١٤﴾ فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَ اجْتَمَعُوا
 أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غِيَابِ الْجُبِّ ، وَ اَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَهُمْ بِأَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٥﴾

اس نے کہا بے شک میں، یقیناً مجھے یہ بات غمگین کرتی ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور میں ڈرتا ہوں کہ اسے کوئی بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے غافل ہو ﴿۱۳﴾ انہوں نے کہا واقعی اگر اسے بھیڑیا کھا جائے، حالانکہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں تو بلاشبہ ہم اس وقت یقیناً خسارہ اٹھانے والے ہوں گے ﴿۱۴﴾ پھر جب وہ اسے لے گئے اور انہوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنویں کی گہرائی میں ڈال دیں اور ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تو ضرور ہی انہیں ان کے اس کام کی خبر دے گا، اس حال میں کہ وہ سوچتے نہ ہوں گے ﴿۱۵﴾

آیت 13 ﴿١٣﴾ قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي : یعقوب علیہ السلام نے نہ بھیجنے کے لیے دو عذر پیش کیے، ایک تو نہایت تاکید کے الفاظ "اِنَّ" اور "لام تاکید" کے ساتھ کہا کہ مجھے تمہارا اسے اپنے ساتھ لے جانا غمگین کرتا ہے۔ (حالانکہ یہی بات تو ان کے غم کے باعث تھی) دوسرا یہ کہ مجھے خوف ہے کہ اسے کوئی بھیڑیا کھا جائے گا۔ ساتھ ہی ان کے جذبات ٹھنڈے رکھنے کے لیے یہ کہنے کے بجائے کہ "اور تم بیٹھے رہو گے" یہ کہا کہ "تم اس سے غافل ہو گے۔" گویا تم میرے غم اور خوف دونوں کا سامان کر رہے ہو۔ ﴿۲﴾ ان کو بھیڑیے کا بہانہ کرنا تھا وہی ان کے دل میں خوف آیا۔ (موضح) یا یعقوب علیہ السلام کے منہ سے یہ بات نکلتا تھی کہ انہوں نے اسی کا بہانہ بنا لیا۔

آیت 14 ﴿١٤﴾ قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ : یعنی پھر ہماری قوت کس دن کام آئے گی، ہم دس مضبوط جوان ہیں۔ ﴿۲﴾ اب یعقوب علیہ السلام ان کے اصرار کے سامنے بے بس ہو گئے، کیونکہ اللہ کی تقدیر ہو کر بنتی تھی، جس کے واقع ہو کر رہنے میں کوئی احتیاط کام نہیں آسکتی، پھر یوسف علیہ السلام کو خواب میں دکھائے جانے والے کمال و عروج کی منزل کے راستے پر بھی روانہ ہونا تھا اور اس راستے میں نہایت کھٹن گھٹائیوں سے گزرے بغیر چارہ ہی نہیں اور نہ ان بلند مقامات پر پہنچنے والوں کے لیے راستے میں کوئی قائلین یا کھٹشائیں سمجھی ہوتی ہے۔

آیت 15 ﴿١٥﴾ فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَ اجْتَمَعُوا أَنْ : "اجتمعوا" باب انفعال ہے، کسی کام کا مصمم عزم کر لینا، یعنی آخر وہ باپ کے کسی عذر کی پروا نہ کرتے ہوئے ان کے خاموش ہونے پر اسے اپنے ساتھ لے ہی گئے۔ اب یہاں قرآن کریم کا کمال اعجاز دیکھیے، فرمایا: "پھر جب وہ اسے لے گئے اور طے کر لیا کہ اسے کسی اندھے کنویں کی گہرائی میں پھینک دیں" تو پھر کیا ہوا؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے ذکر ہی نہیں فرمایا، تاکہ سننے والے خود ہی سمجھ لیں کہ قتل تک کا منصوبہ بنانے والے ان دس شیر جوانوں نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ کنویں میں پھینکنے کے وقت اور اس سے پہلے کیا سلوک کیا ہو گا۔ قرآن اشارہ کرتا ہے، پھر سمجھنے والے پر

وَجَاءُوا آبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ﴿١٦﴾

اور وہ اپنے باپ کے پاس اندھیرا پڑے روتے ہوئے آئے ﴿۱۶﴾

چھوڑ دیتا ہے اور کچھ اس لیے بھی کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کا سلوک تصور میں تو آسکتا ہے، اسے الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل ہے، یا پھر بات اتنی لمبی ہو جائے گی جو قرآن کا طریقہ نہیں۔ مفسر آلوسی نے فرمایا: ”انھیں کنویں میں پھینکنے کی کیفیت اور اس وقت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے جو کچھ کہا اور جو کچھ انھوں نے اس سے کہا، اس کے متعلق کتب تفسیر میں بہت سی روایات ہیں جنھیں سن کر پتھر بھی پانی ہو جاتا ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جس کی سند پر اعتماد ہو سکتا ہو۔“ کیونکہ ان مفسرین میں سے کوئی چشم دید بیان کرنے والا ہے ہی نہیں اور وہ عالم الغیب جو سب کچھ دیکھ رہا تھا اس نے یہ بات ہمارے خود سوچنے کے لیے بلا تفصیل چھوڑ دی ہے۔

﴿۱۶﴾ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ..... یعنی اس مشکل وقت میں یوسف علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعے تسلی دی گئی کہ ایک ایسا وقت ہر صورت آئے گا جب تم ان بھائیوں کو ان کا یہ کام بناؤ گے، جب کہ طویل مدت اور آج اور اس وقت کے حالات کے فرق کی وجہ سے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم اسی بھائی سے پورا غلہ دینے اور صدقہ کرنے کی درخواست کر رہے ہیں جسے ہم کنویں میں پھینک کر اس سے فارغ ہو چکے تھے۔ یہاں ”لَتَسْتَبْتَهُمْ بِالْغَيْبِ هَذَا“ (تو ضرور ہی انھیں ان کے اس کام کی خبر دے گا) میں ”ان کے اس کام“ کے الفاظ میں بھی ان کے یوسف علیہ السلام کے ساتھ سلوک کی لمبی و لخراش داستان دو تین لفظوں میں ہمیں ہوئی نظر آ رہی ہے۔

﴿۱۷﴾ کچھ لوگ یعقوب علیہ السلام کے ان الفاظ سے کہ ”میں ڈرتا ہوں کہ اسے بھیڑا کھا جائے گا“ ان کے لیے علم غیب ثابت کرتے ہیں، مگر چند میل کے فاصلے پر کنویں میں یوسف علیہ السلام پر گزرنے والی حالت، ان کی غلامی، عفت کی آزمائش، قید خانے کے سال، بادشاہ کے خواب کا قید سے نکلنے کا ذریعہ بننا، خوش حالی اور قحط کے سال، قید سے نکل کر قرب شاہی اور وزارت خزانہ کا حصول، یہ سب کچھ یعقوب علیہ السلام کو کیوں معلوم نہ ہو سکا؟ آکھیں غم سے سفید کیوں ہو گئیں؟ کیا علم غیب یہی ہوتا ہے؟ ہاں، پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ جتنی بات وحی کے ذریعے سے بتاتا ہے وہ انھیں معلوم ہو جاتی ہے، جیسے بشارت دینے والے کے مصر سے قیص لے کر چلنے کے ساتھ ہی انھیں یوسف علیہ السلام کی خوشبو آنے لگی اور قیص آنکھوں پر ڈالنے سے بینائی واپس آ گئی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔ یہ نہ یوسف علیہ السلام کے بس کی بات تھی اور نہ ان کے والد ماجد یعقوب علیہ السلام کے بس کی۔ اللہ تعالیٰ جتنی بات بتادے وہ معلوم، باقی کی خبر نہیں، ایسا شخص عالم الغیب نہیں ہوتا، ورنہ غیب کی کنی باتیں ہمیں بھی رسول کے بتانے سے معلوم ہیں، تو کیا ہم بھی عالم الغیب ہو گئے؟ نہیں، آسمان و زمین میں عالم الغیب صرف اکیلا اللہ تعالیٰ ہے، جیسے فرمایا: ﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [النمل: ۶۵] ”کہہ دے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے غیب نہیں جانتا۔“

﴿۱۸﴾ وَجَاءُوا آبَاهُمْ عِشَاءً: اتنا برا ظلم کرنے کے بعد انھیں دن کی روشنی میں باپ کے پاس جانے کی ہمت

قَالُوا يَا بَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ﴿۱۷﴾ وَجَاءَ وَعَلَى قَيْبِهِ يَدَمٌ كَذِبٌ ۖ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ

کہا اے ہمارے باپ! بے شک ہم دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے چلے گئے اور ہم نے یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تو اسے کوئی بھیڑیا کھا گیا اور تو ہرگز ہمارا اعتبار کرنے والا نہیں، خواہ ہم سچے ہوں ﴿۱۷﴾ اور وہ اس کی قمیص پر ایک جھوٹا خون لگا لائے۔ اس نے کہا بلکہ تمہارے لیے تمہارے دلوں نے ایک کام مزین بنا دیا ہے، سو نہیں ہوئی، کیونکہ دن کے وقت چہرے کے اثرات، جسم کا اضطراب اور زبان کا لڑکھانا ہی سب کچھ ظاہر کر دیتا ہے۔ اس لیے وہ عشاء کے وقت باپ کے پاس آئے۔ اکثر جرائم کے وقوع اور انھیں چھپانے کا ذریعہ رات کا اندھیرا ہی بنتا ہے، اس لیے ہم سب کو حکم ہوا کہ کہو: ﴿وَمِنْ شَرِّ مَا سَأَلَ إِذَا وَقَبٌ﴾ [الفلق: ۳] ”اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے (پناہ مانگتا ہوں)۔“

﴿يَبْكُونَ﴾: ”روتے ہوئے“ معلوم ہوا ہر رونے والا سچا نہیں ہوتا۔ میں نے ایک عالم کا قول پڑھا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے رونے کے بعد سے ہمارا اعتبار رونے والوں سے اٹھ گیا ہے، اللہ جانے کون سچا رو رہا ہے اور کون جھوٹا۔ حسین علیہ السلام کی بہن زینب علیہا السلام نے کوفے والوں کو روتے پینتے ہوئے دیکھ کر پوچھا کہ یہ کیوں رو رہے ہیں؟ انھیں بتایا گیا کہ یہ لوگ حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی شہادت پر رو رہے ہیں تو وہ بے ساختہ کہنے لگیں کہ یہ لوگ ہم پر رو رہے ہیں تو ہمیں قتل کرنے والے کون ہیں؟ (یعنی کیا وہ کوفہ سے باہر کی کوئی مخلوق تھی؟ یہی تو قتل کرنے والے تھے)۔

آیت 17 قَالُوا يَا بَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ.....: ”اِسْتَبِقُ“ باب افتعال کا مصدر ہے، آگے نکلنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ، وہ پیدل دوڑ میں آگے نکلنے کا ہو یا گھوڑوں پر (اِسْتَبِقُ النَحِيلُ) یا نشانہ بازی میں (اِسْتَبِقُ الرَّمِي) یعنی ہم دوڑ کے مقابلے میں دوڑ نکل گئے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تو یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔ ”الذِّئْبُ“ کا الف لام تخصیص کے لیے نہیں، جنس کے لیے ہے، یعنی کوئی بھیڑیا اسے کھا گیا۔ ساتھ ہی اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے والد پر چڑھائی کر دی کہ آپ تو ہم سے اس قدر بدظن ہیں کہ کسی صورت ہم پر اعتبار کرنے والے ہی نہیں، خواہ ہم بالکل سچے ہوں۔ مگر سننے والا یہ تو ضرور سوچتا ہے کہ بھیڑیا انھیں ہڈیوں سمیت کھا گیا اور ایک ذرہ بھی باقی نہیں چھوڑا جو ساتھ لے آئے، خصوصاً اس لیے کہ نہ وہ ان کا کچھ بچا کھچا جسم واپس لائے نہ یہ کہا کہ ہم نے اسے دفن کر دیا۔

آیت 18 ﴿۱﴾ وَجَاءَ وَعَلَى قَيْبِهِ يَدَمٌ كَذِبٌ.....: یہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کی ایک اور چال تھی کہ وہ یوسف علیہ السلام کی قمیص پر ایسا خون لگا کر لائے جو ”گڈب“ تھا، جس کا معنی جھوٹ ہے، یا یہ بمعنی ”مَكْذُوبٌ“ ہے، جیسے ”مَخْلُوقٌ“ بمعنی ”مَخْلُوقٌ“ یعنی جھوٹا بنایا ہوا، یا مصدر مبالغے کے لیے ہے کہ وہ خون سراسر جھوٹ تھا، یوسف علیہ السلام کا ہرگز نہ تھا، بلکہ وہ بھیڑ بکری یا جنگل سے شکار کیا ہوا کوئی جانور ذبح کر کے اس کا خون لگا کر لے آئے تھے۔ والد ساری حقیقت سمجھ گئے، کیونکہ ان کی

أَنْفُسَكُمْ أَمْرًا قَصِيرًا جَمِيلًا ۝ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿۱۸﴾

(میرا کام) اچھا صبر ہے اور اللہ ہی ہے جس سے اس پر مدد مانگی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو ﴿۱۸﴾

گھڑی ہوئی کہانی خود ہی اپنی حقیقت بتا رہی تھی اور فرمایا: ”بل“ (بلکہ) یعنی جو کچھ تم کہہ رہے ہو سب جھوٹ ہے، بھڑیے نے یوسف کو ہرگز نہیں کھایا، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ تمہارے دلوں نے تمہارے لیے کوئی بات خوشنما بنا دی جو تم کر گزرے ہو۔ اب وہ چونکہ کئی چیزیں ہو سکتی تھیں، اس لیے کسی کی تعین نہیں فرمائی اور وہ یوسف کو کہیں پھینک آنا، اسے کسی جگہ لے جا کر بیچ آنا، اسے کہیں چھپا دینا وغیرہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مرنے کا یقین ہو جائے تو صبر آ جاتا ہے مگر جب خبر ہی نہ ہو کہ بیٹا اس وقت کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ تو یہ بہت ہی بڑی آزمائش اور ہر وقت دل میں سلگتی رہنے والی چنگاری ہوا کرتی ہے۔ ادھر خواب کے مطابق ابھی یوسف علیہ السلام پر اتمام نعمت ہونا تھا اور ”تَأْوِيلَ الْأَحَادِيثِ“ کی تعلیم بھی باقی تھی۔ سو کس طرح مان لیتے کہ اسے بھڑیا کھا گیا۔

② اہل علم نے لکھا ہے کہ اس سورت میں یوسف علیہ السلام کی قیص کا تین دفعہ ذکر ہے اور ہر دفعہ اس کا انوکھا ہی اثر ہے۔ ایک تو یہ خون آلود قیص تھی جس کے نتیجے میں یعقوب علیہ السلام کی بیٹائی ختم ہو گئی، دوسرا یوسف علیہ السلام کو تہمت دست درازی سے ان کی قیص دیکھ کر بری قرار دیا گیا اور تیسرا یوسف علیہ السلام کی قیص کی خوشبو آنا اور یعقوب علیہ السلام پر اسے ڈالنے سے ان کی بیٹائی کا واپس آنا۔ سبحان اللہ! اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کمال نشانیاں ہیں۔

③ تفسیر ”التحریر و التنبیر“ کے مصنف ابن عاشور لکھتے ہیں: ”اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے قیص کو خون آلود کرنے کی جعل سازی میں اور اسے چیر پھاڑ کر ایسی قیص کی صورت میں پیش کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہوگی جس کے پہننے والے کو بھڑیے نے کھا لیا ہو۔ خصوصاً اس لیے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ سمجھ دار تھے کہ اتنی سی بات بھی ان میں سے کسی کے ذہن میں نہ آئی ہو، جب کہ وہ دس جوان تھے۔ سو بعض اہل تفسیر نے جو لکھا ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میں نے آج کی طرح کا کوئی بھیڑیا نہیں دیکھا جو اس بھڑیے سے زیادہ حلیم (بردار) ہو کہ میرے بیٹے کو کھا گیا اور اس کی قیص نہیں پھاڑی، تو یہ قصہ گوئی کی ایک ظرافت ہے۔“ اگر قیص کے سالم رہنے کی بات قرآن وحدیث یا کسی صحیح ذریعے سے آئی ہوتی تو میرے خیال کے مطابق ابن عاشور علیہ السلام نے واضح الفاظ میں اسے قصہ گو حضرات کی کارستانی قرار نہ دیتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسا ہونا ممکن نہیں، بالکل ممکن ہے اور جرم یقیناً اپنے نشان چھوڑ جاتا ہے مگر بات ثابت تو ہونی چاہیے۔ یہاں ان کے جھوٹے ہونے کے اور دلائل ہی میں کچھ کمی نہ تھی کہ ہم قیص کا سالم رہنا کسی صحیح ذریعہ خبر کے بغیر ہی تسلیم کر لیں۔

④ قَصِيرٌ جَمِيلٌ: جملہ فعلیہ ”أَصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا“ (یعنی اب میں صبر جمیل اختیار کروں گا) کے بجائے جملہ اسمیہ ارشاد فرمایا: ”قَصِيرٌ جَمِيلٌ“ کیونکہ اس میں دوام ہوتا ہے۔ گویا اس میں مبتدا یا خبر محمد زوف ہے، یعنی ”فَأَمْرِي صَبْرٌ جَمِيلٌ“ یا ”قَصِيرٌ جَمِيلٌ“ یعنی اب میرا کام صبر جمیل ہے۔ کسی بھی چیز کا جمال یہ ہے کہ وہ اپنے جیسی دوسری چیزوں سے بہتر اور

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَنْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَى دَلْوَهُ قَالَ يُبْشِرِي هَذَا غُلْمٌ وَاسْرُوءُ
بِضَاعَهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۱۹﴾

اور ایک راہ چلتا قافلہ آیا تو انھوں نے اپنے پانی لانے والے کو بھیجا، سو اس نے اپنا ڈول لٹکایا۔ کہا اودہ! خوشخبری ہو!
یہ ایک لڑکا ہے۔ اور انھوں نے اسے سامان تجارت بنا کر چھپا لیا اور اللہ خوب جاننے والا ہے جو وہ کر رہے تھے ﴿۱۹﴾

خوبصورت ہو۔ چنانچہ صبر بھی دو طرح کا ہوتا ہے، ایک صبر جمیل، جس میں حسن ہو اور دوسرا غیر جمیل جو حسن سے خالی ہو۔ پہلا وہ
جس کے ساتھ بزغ فروغ اور واویلا وغیرہ نہ ہو بلکہ اللہ کی تقدیر پر صبر کیا جائے۔ دوسرا وہ جو یہ سب کچھ کرنے کے بعد ہو اور جو
ہر ایک کو آخر کرنا ہی پڑتا ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک عورت کے پاس سے گزرے جو اپنے
ایک بچے پر رو رہی تھی۔ (عبدالصمد کی روایت میں ہے کہ وہ ایک قبر کے پاس رو رہی تھی) تو آپ نے اس سے کہا: «إِنِّي اللَّهُ
وَاصْبِرِي، فَقَالَتْ وَمَا تَبَالِي بِمُصِيبَتِي؟ فَلَمَّا ذَهَبَ، قِيلَ لَهَا إِنَّهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَخَذَهَا
مِثْلَ الْمَوْتِ، فَأُتِيَ نَابَهُ، فَلَمْ تَجِدْ عَلَى يَابِهِ نَوَائِبِينَ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ! لَمْ أُعْرِفْكَ، فَقَالَ إِنَّمَا الصَّبِيرُ عِنْدَ
أَوَّلِ ضَدْمَةٍ» [مسلم، الحناظر، باب الصبر على المشقة عند الضدمة الأولى: ۹۲۶/۱۵] "اللہ سے ڈر اور صبر کرو۔" اس نے کہا:
"آپ کو میری مصیبت کی کیا پروا ہے؟" جب آپ چلے گئے تو اسے بتایا گیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ تھے، تو اس کی حالت تو
موت جیسی ہو گئی۔ وہ آپ کے دروازے پر آئی تو اس نے آپ کے دروازے پر کوئی دربان نہیں دیکھے۔ کہنے لگی: "یا رسول
اللہ! میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔" آپ نے فرمایا: "اصل صبر تو صرف پہلی چوٹ کے وقت ہوتا ہے۔"

﴿۱۹﴾ وَاللَّهُ السَّمِيعُ عَلَى مَا تَصِفُونَ : یہاں "السَّمِيعُ" خبر پر الف لام کی وجہ سے حصر کا معنی پیدا ہو گیا، یعنی صرف اللہ
ہے یا اللہ ہی ہے جس سے مدد مانگی جاتی ہے اور اللہ سے مدد مانگنے کا طریقہ بھی اس نے خود ہی سکھایا، جس پر یعقوب علیہ السلام نے
عمل کیا، فرمایا: ﴿وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ [البقرة: ۱۵۰] "اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو۔"

﴿۲۰﴾ ہمارے جو بھائی کہتے ہیں کہ فلاں حضرت صاحب کی نظر لوح محفوظ پر ہے اور فلاں صاحب کے دل کا آئینہ انھیں کل عالم
کی خبر دیتا ہے، وہ غور فرمائیں کہ چند میل کے فاصلے پر کنویں میں اللہ کے نبی یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کی خبر نہ ہو سکی۔ نہ
یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے دل میں کھٹکا تک ہوا کہ والد ماجد سے تو کوئی چیز چھپی رہتی نہیں، ہمارا مگر کیسے کامیاب ہوگا؟ تو ان
کے حضرت صاحبان لوح محفوظ تک کیسے پہنچ گئے؟ یہاں ایک سوال ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے اس وقت یوسف علیہ السلام کو تلاش
کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ جواب یہ ہے کہ وجہ یہ تھی کہ ان کی تلاش بھی انھی بھائیوں ہی نے کرنا تھی، وہ خود تو عمر رسیدہ
ہونے کی وجہ سے کمزور تھے۔ چنانچہ جب موقع مناسب جانا انھی بھائیوں کو حکم دیا کہ جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش
کرو، فرمایا: ﴿فَتَحَسَّنُوا مِنْ يَوْسُفَ وَأَخِيهِ﴾ [يوسف: ۸۷] "یوسف اور اس کے بھائی کو سراغ لگاؤ۔"

﴿۲۱﴾ وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ.....: یہ قافلہ مصر کی طرف جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوسف علیہ السلام پر یہ احسان ہوا

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۖ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿۲۰﴾

اور انھوں نے اسے تھوڑی قیمت، چند گئے ہوئے درہموں میں بیچ دیا اور وہ اس میں رغبت نہ رکھنے والوں سے تھے ﴿۲۰﴾ کہ قافلے والوں کی توجہ کنویں سے پانی لانے کی طرف ہو گئی اور یوسف علیہ السلام کو باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ یہاں بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ ذول والے نے ذول لٹکایا تو یوسف علیہ السلام اس کے ساتھ لٹک گئے اور اوپر آ گئے۔

﴿۲۰﴾ وَأَسْرَوْهُ بِضَاعَةً: ”بضاعة“ کا معنی سامان تجارت ہے، یعنی قافلے والوں پر لازم تھا کہ وہ اردگرد اعلان کرتے، یا یوسف علیہ السلام کے بتانے کے مطابق انھیں ان کے والد کے پاس پہنچا دیتے، مگر وہ ظالم بے دین تھے۔ انھوں نے زبردستی غلام بنا کر سامان تجارت کے طور پر چھپا لیا کہ مصر جا کر فروخت کریں گے، حالانکہ کسی آزاد کو غلام بنانا یا اسے فروخت کرنا حرام ہے۔ اس سارے سلسلہ کلام میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ صاف ظاہر ہے کہ یوسف علیہ السلام کے نکلنے پر اہل قافلہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے سامان تجارت کے طور پر انھیں چھپا لیا، کسی کو خبر تک نہیں ہونے دی۔

﴿۲۱﴾ ان آیات میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے کہ بھائیوں کا یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکنا آخر ان کی عظمت و رفعت کا ذریعہ بن گیا۔ آپ بھی اپنے خاندان کے لوگوں کے ظلم و ستم سے بدلہ نہ ہوں۔ یہ سب بھی آخر کار برادران یوسف کی طرح آپ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

آیت 20 وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ.....: ”بخس“ کا معنی اصل قیمت سے کم قیمت ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ﴾ [الأعراف: ۸۵] ”اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔“ یعنی قافلے والوں نے اسے تھوڑی قیمت، چند گئے ہوئے درہموں میں بیچ دیا، کیونکہ زیادہ درہم ہوتے تو وہ گننے کے بجائے تول لیے جاتے تھے۔ ”اور وہ اس میں رغبت نہ رکھنے والوں میں سے تھے“ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ قانونی طور پر حقیقی غلام کو نہیں بیچ رہے تھے، اس لیے جو کچھ مل گیا اسے انھوں نے غنیمت سمجھا۔ بے رغبت ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ جلد اس سے خلاصی حاصل کرنا چاہتے تھے، کیونکہ ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی ایسا شخص نہ آ جائے جو انھیں اس جرم میں پکڑ لے کہ وہ اس کے آزاد بیٹے کو غلام بنا کر پکڑ لائے ہیں، تو ہر وقت چھپا کر رکھنا اور یوسف علیہ السلام کو کسی سے اپنی حقیقت بیان کرنے کا موقع ہی نہ دینا ان کے لیے مصیبت تھا۔ اس سے ان لوگوں کی داستان گوئی کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی جو یوسف علیہ السلام کے خریداروں کے ہجوم کا اور سوت کی اٹی لانے والی عورت کا اور آخر کار سونے میں تول کر فروخت کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔ ویسے بھی ”شَرَى بِشْرَى“ بیچنے اور ”اِشْتَرَى بِشْرَى“ خریدنے کے معنوں میں آتا ہے، الا یہ کہ کوئی خاص قرینہ اس کے خلاف ہو، کیونکہ اصل یہی ہے کہ ”فَعَلَ“ کسی حدت (کام) کے لیے آتا ہے اور ”اِفْتَعَلَ“ اس کی مطابقت (اس کام کا اثر قبول کرنے) کے لیے ہوتا ہے، جیسے ”بَاعَ“ اس نے بیچا اور ”اِبتاعَ“ اس نے خریدا۔ ”زَهَنَ“ اس نے گروی دیا اور ”اِزْتَهَنَ“ اس نے گروی لیا۔ ”سَكَّرَى“ اس نے کرایہ پر دیا اور ”اِسْتَكَّرَى“ اس نے کرایہ پر لیا۔ اس کے خلاف اول تو آتا ہی نہیں، آئے تو کوئی قرینہ موجود ہوتا ہے۔ جو لوگ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا آ کر قافلے

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ
وَلَدًا ۗ وَكَذَٰلِكَ مَكَانًا لِّيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ ۗ وَلِئَعْلَمَ لِمَنِ تَأْوِيلُ الْأَحَادِيثِ ۗ وَاللَّهُ غَالِبٌ
عَلَىٰ أَمْرِهِ ۗ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۱﴾

اور جس شخص نے اسے مصر سے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا اس کی رہائش باعزت رکھ، ہو سکتا ہے کہ ہمیں فائدہ دے، یا ہم اسے بیٹا بنا لیں۔ اور اسی طرح ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ دی اور تاکہ ہم اسے باتوں کی اصل حقیقت میں سے کچھ سکھائیں اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۲۱﴾

والوں کے ہاتھوں فروخت کرنا ذکر کرتے ہیں ان کی بات کا قرآن کی کسی آیت میں ذکر چھوڑ کر اشارہ بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی اسرائیلی روایت ہے تو اس کا اعتبار نہیں اور وہ قرآن کے بیان کے بھی خلاف ہے۔

آیت 21 ﴿۱﴾ وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ: قرآن نے اس شخص کے نام اور عبدے کا کہیں ذکر نہیں کیا، البتہ آگے چل کر مصر کی عورتوں نے ”عزیز“ کے لقب سے اس کا ذکر کیا ہے اور یہی لقب بعد میں یوسف علیہ السلام کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مصر کے بادشاہ کا کوئی وزیر یا بہت بڑے عہدے پر فائز شخص تھا۔ اس کی بیوی کا نام بھی قرآن نے کہیں ذکر نہیں کیا، کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہ تھا، بلکہ یہ پردہ پوشی کے بھی خلاف تھا۔ اس لیے جو لوگ اس خاتون کا نام ”زلیخا“ (زنا کے فتنہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ) یا ”راعیل“ بتاتے ہیں، ان کے پاس محض اسرائیلی روایات ہیں، کوئی پختہ دلیل نہیں اور ان کا یہ عمل ستر کے بھی خلاف ہے۔

﴿۲﴾ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا: عزیز مصر نے اپنی بیوی کو یوسف علیہ السلام کی رہائش باعزت رکھنے اور ہر ضرورت میں سہارا رکھنے کی تاکید کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہمارا اور اس کا تعلق مالک اور غلام والا ہونے کے بجائے گھر کے ایک معزز رکن کا ہونا چاہیے، پختہ نہایت ذہین اور اچھی عادات والا ہے، امید ہے ہمیں فائدہ دے گا۔ عزیز مصر مملکت کے کسی بھی شخص سے کام کروا سکتا تھا اور مطلوبہ فائدہ حاصل کر سکتا تھا، مگر ماتحت نوکر جس طرح فائدہ پہنچاتے ہیں اور نہایت عزت و محبت سے پالے ہوئے اپنے گھر کے ایک فرد سے جس خیر خواہی اور فائدے کی امید ہوتی ہے، دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

﴿۳﴾ أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا: اس سے ظاہر ہے کہ ان کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ماں باپ، بہن بھائی یا بیٹا بیٹی منہ کے کبھ دینے سے نہیں بنتے۔ دیکھیے سورہ احزاب (۵، ۴) اور مجادلہ (۲) ورنہ عزیز کی بیوی کا سگا بیٹا ہوتا تو وہ اس سے وہ معاملہ کبھی نہ کرتی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اکثر گھروں میں اللہ کی اس نافرمانی کے ایسے ہی نتائج رونما ہوتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت تاکید کے ساتھ اس سے منع فرمایا ہے۔

﴿۴﴾ وَكَذَٰلِكَ مَكَانًا لِّيُوسُفَ: اس کی دو تفسیریں ہیں، ایک یہ کہ اس طرح یعنی عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کروا کر اور مصر

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۱﴾

اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے بڑا حکم اور بڑا علم عطا کیا اور ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں ﴿۲۱﴾

کے اتنے عظیم مقام والے گھر میں باعزت رہائش دے کر ہم نے یوسف علیہ السلام کو سرزمین مصر میں جگہ دی (تاکہ وہ باعزت زندگی بسر کرے) تاکہ ایک حکمران کے گھر میں رہ کر سرداروں کی مجلسیں دیکھے اور حکمرانی اور سیاست کے اسرار و رموز دیکھے، جو صحرا میں رہنے سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور آخر میں ان کی وجہ سے بنی اسرائیل مصر میں آ کر آباد ہوں۔ دوسری یہ کہ جیسے ہم نے اس سے پہلے یوسف کو بھائیوں کے شر سے بچایا اور کنوئیں سے نکلوایا، اسی طرح ہم نے اسے سرزمین مصر میں جگہ بخشی۔

﴿۲۱﴾ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ: ”غَلَبَ“ کا لفظ وہاں بولا جاتا ہے جہاں کوئی مقابلے میں ہو۔ دیکھیے یوسف علیہ السلام کے بھائی کیا چاہتے تھے اور کنوئیں میں پھینکنے کے بعد اپنے خیال میں وہ کس قدر کامیاب ہو چکے تھے، مگر اللہ اپنے کام پر غالب ہے۔ وہ جو کرنا چاہے کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ کنوئیں سے نکال کر حکومت تک پہنچانا اور پھینکنے والوں کو سائل بنا کر اس کے سامنے لا کھڑا کرنا اس کے ادنیٰ اشارے کا کام ہے۔ ہمارے رسول ﷺ کے شاعر نے بدر کے موقع پر کیا خوب کہا تھا۔

جَاءَتْ سَجِينَةُ كَيْفَ تُغَالِبُ رَبِّهَا
وَلْيُغْلِبَنَّ الْمُغَالِبُ الْغَالِبِ

”قریش اس لیے آئے تھے کہ اپنے رب کے ساتھ غالب آنے کا مقابلہ کریں گے اور قسم ہے کہ اس زبردست غالب کا مقابلہ کرنے والا ہر صورت مغلوب ہو کر رہے گا۔“ (قریش کو تحقید اس لیے کہتے تھے کہ وہ حجاجوں کی ضیافت گرم کھانے سے کرتے تھے)۔

﴿۲۲﴾ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ: اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے کہ ہر قسم کا اختیار اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اس لیے وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی ظلم و ستم کی کمی نہیں کرتے، مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہے، بخلاف تھوڑے لوگوں کے، جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے غالب رہنے پر اور اس کی تقدیر پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ نہ خوشی میں پھولتے ہیں نہ مصیبت میں حد سے زیادہ غم میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ کسی صورت اللہ کے حکم سے سر پھیرتے ہیں۔

آیت 22 ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا: ”أَشُدَّهُ“ بعض اہل علم کے مطابق مفرد ہے جو جمع کے وزن پر آیا ہے۔ بعض نے فرمایا جمع ہے، مگر اس کے لفظ میں سے اس کا واحد نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا ”شِدَّةٌ“ کی جمع ہے، جس طرح ”بِعَمَّةٌ“ کی جمع ”أَعَمَّمٌ“ ہے، یعنی اپنی پوری قوموں اور جوانی کو پہنچ گئے۔ اسی ”بَلَغَ“ کے لفظ ہی سے بلوغت کی اصطلاح اخذ کی گئی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جس کے آتے ہی انسان پر نیکی اور بدی لکھنے والا وہ قلم مقرر ہو جاتا ہے جو بچپن میں اس پر مقرر نہیں تھا۔ اب وہ اپنے جیسے انسان کی پیدائش کا ذریعہ بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں جو لوگ اس وقت یوسف علیہ السلام کی عمر کی تعیین بچپن یا تمس یا چالیس سال بیان کرتے ہیں ان کے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟ بہر حال جس قسم کی خوش حالی اور ناز و نعمت میں یوسف علیہ السلام کی پرورش ہو رہی تھی، اس میں یہ عمر طوفان بن کر آتی ہے، مگر ان پر اللہ کا فضل تھا جس کی وجہ سے رعونت،

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْت لَكَ قَالَ مَعَاذِ

اور اس عورت نے، جس کے گھر میں وہ تھا، اسے اس کے نفس سے پھسلا یا اور دروازے اچھی طرح بند کر لیے اور

شہوت اور حسن و عشق کی آفات کے بجائے اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم اور علم عطا فرمایا۔ ”حکم“ اور ”حکمت“ تقریباً ہم معنی ہیں، اس کا مطلب ہے ایک دوسرے کے مخالف اور ٹکرانے والے دو معاملات حق اور باطل میں سے حق کا فیصلہ کرنے کی اہلیت۔ یہ اہلیت عطا ہونے کے بعد آدمی صحیح اور غلط کے درمیان فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں علم عطا فرمایا، یعنی نیکی و بدی کی پہچان اور وہ باتیں جاننے اور ان پر عمل کی استعداد جو عام لوگ نہیں جانتے، جس میں خواب کی تعبیر اور وہ علم بھی شامل ہے جس کا اظہار انہوں نے وزارت کی پیش کش پر خزانے کا شعبہ طلب کرنے پر کیا تھا: ﴿اِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْهَا﴾ [یوسف: ۵۵] ”بے شک میں پوری طرح حفاظت کرنے والا، خوب جاننے والا ہوں۔“

② وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ: انسان خوش حال ہو یا خستہ حال، اگر وہ نیکی اور اچھائی پر قائم رہے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسے ہی جزا دیتے ہیں، مثلاً کوئی بھی تنگ دست جو اللہ کا شکوہ کرنے اور اپنی حالت پر ناراض رہنے کے بجائے اس کی تقدیر پر شاکر ہو کر صبر کرے، اس پر خوش رہے اور غلط سمت میں قدم نہ اٹھائے تو اسے اللہ تعالیٰ ایسے ہی بدلہ دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نوازش صرف یوسف علیہ السلام ہی پر نہیں تھی بلکہ احسان پر کاربند رہنے والے ہر شخص کو ایسے ہی جزا ملتی ہے۔

آیت 23 ① وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا: ”راوَد“ باب مفاعله سے ہے، نرمی اور ملائمت سے بار بار مطالبہ کرنا، پھسلانا، فریب سے غلط کام پر آمادہ کرنا۔ یہاں باب مفاعله مشارکت کے لیے نہیں بلکہ مبالغہ کے لیے ہے، یعنی بار بار اور ہر طریقے سے پھسلا یا۔ کیونکہ ایک ہی گھر میں رہ کر خدمت کرنے والے غلام سے ہزار انداز سے اور بار بار اپنے شوق کا اظہار ہو سکتا ہے، مثلاً غلام کھانا لایا ہے تو حکم ہو، دور کیوں بیٹھے ہو؟ ادھر میرے ساتھ آ کر بیٹھو وغیرہ۔ ”بیت“ ”بات“ ”بیت“ (رات گزارنا) سے ہے، اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں آدمی رات رہتا ہو، پھر گھر کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اب بھی اس کا اصل استعمال اینٹ پتھر کے مکان یا اون، پشم اور کپڑے وغیرہ کے خیمے پر ہوتا ہے۔ صحن سمیت پورے گھر کو عموماً ”ذاز“ کہتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام جب تک بچے تھے، عزیز کی بیوی کی نظر بچے پر شفقت و محبت والی تھی، اب جب جوانی آئی تو وہ نگاہ نہ رہی۔ یہی اصل بیٹے اور متبغی کا فرق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بے مثال حسن سے نوازا تھا۔ حدیث معراج میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوسف علیہ السلام سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَإِذَا هُوَ قَدْ أُعْطِيَ شَطْرَ الْحُسَيْنِ﴾ [مسلم، الإیمان، باب الإسراء..... ۱۶۶۲] ”انہیں حسن کا شطر عطا کیا گیا تھا۔“ شطر کا معنی نصف بھی ہے اور ایک حصہ بھی۔ (قاموس) یعنی یوسف علیہ السلام کو حسن کا خاصا بڑا حصہ عطا ہوا تھا۔ عزیز کی بیوی کے غلط راستے پر چل نکلنے کا ایک باعث ترمذی (۲۱۶۵) میں موجود اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی نافرمانی بھی تھی کہ کوئی عورت کسی غیر محرم مرد کے ساتھ اکیلی نہ ہو، ورنہ ان کے ساتھ تیسرا شیطان ہوگا (جو دونوں کو ایک دوسرے کی نگاہ میں خوبصورت بنا کر دکھائے گا)۔ یہاں یوسف علیہ السلام تو ویسے ہی شیطان سے محفوظ تھے،

اللَّهُ إِنَّكَ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّكَ لَا يُغْلِبُ الظَّالِمُونَ ﴿۳۱﴾

کہنے لگی جلدی آ۔ اس نے کہا اللہ کی پناہ، بے شک وہ میرا مالک ہے، اس نے میرا ٹھکانا اچھا بنایا۔ بلاشبہ حقیقت یہ ہے کہ ظالم فلاح نہیں پاتے ﴿۳۱﴾

اگرچہ غلام ہونے کی وجہ سے پردہ لازم نہ تھا، مگر ایک ہی گھر اور کمرے میں سال ہا سال کی خلوت عزیز مصر کی بیوی کو لے ڈوبی۔ افسوس! مسلمان اب بھی اس کی پروا نہیں کرتے، حالانکہ آپ ﷺ نے خاوند کے بھائی کے ساتھ خلوت سے بھی منع کیا، فرمایا: ((الْحَمُوُ الْمَوْتُ)) [بخاری، النکاح، باب لا یخلون رجل... ۵۲۳۲] "خاوند کا بھائی تو موت ہے۔"

﴿۳۱﴾ اللہ تعالیٰ نے اس عورت کا نام نہیں لیا جس کے گھر میں یوسف علیہ السلام تھے۔ حق یہی ہے کہ ہم بھی نہ لیں، خصوصاً جب ہمیں اس کا نام کسی صحیح ذریعے سے معلوم ہی نہ ہو اور نام لینے میں کسی گناہ کا خصوصاً عورت کی پردہ دری ہو رہی ہو۔ اس لیے بار بار زینحاً کہنے والے قرآن سے سبق سیکھیں اور اپنے اس رویے کو ترک کریں۔

﴿۳۱﴾ عَنْ نَفْسِهِ: قرآن مجید کے بیان کی پاکیزگی ملاحظہ فرمائیے، پوری بات سمجھ میں آ رہی ہے اور کوئی ناشائستہ لفظ بھی استعمال نہیں ہوا۔

﴿۴﴾ وَغَلَقَتِ الْبَابَ.....: "غَلَقَ" باب تفعیل میں سے ہونے کی وجہ سے ترجمہ "دروازے اچھی طرح بند کر لیے" کیا ہے۔ "هَيْئَتُكَ لَكَ" اسم فعل ہے جس کا معنی ہے "آ، جلدی کر۔" "لَكَ" خطاب کی صراحت کے لیے ہے، جیسے کہتے ہیں: "شُكْرًا لَكَ، سَفِيًّا لَكَ" اہل علم فرماتے ہیں کہ اس وقت یوسف علیہ السلام کو گناہ پر آمادہ کرنے والی ہر چیز موجود تھی اور روکنے والی دنیا کی کوئی چیز نہ تھی۔ یوسف علیہ السلام کی صحت، جوانی، قوت، خلوت، فریق ثانی کا حسن، پیش کش، اس پر اصرار، غرض ہر چیز ہی بربک دینے والی تھی، جب کہ انسان کو روکنے والی چیز اس کی اپنی جسمانی یا جنسی کمزوری ہو سکتی ہے، یا فریق ثانی کے حسن کی کمی، یا اس کی طرف سے انکار یا مزاحمت کا امکان یا راز فاش ہونے کا خطرہ یا اپنے خاندان، قوم اور لوگوں میں رسوائی کا خوف، ان میں سے کوئی چیز ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔ اٹھتی جوانی تھی، بے مثال حسن تھا، دروازے بند تھے، دوسری طرف سے پیش کش بلکہ درخواست اور اس پر اصرار تھا، اپنے وطن سے دور تھے کہ قبیلے یا قوم میں رسوائی کا ڈر ہو۔ یہاں کتنے ہی لوگ باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں تو اپنوں سے دور ہونے کی وجہ سے بہک جاتے ہیں، پھر دروازے خوب بند تھے، راز فاش ہونے کی کوئی صورت ہی نہ تھی اور جب مالک خود کہہ رہی ہو تو سزا کا کیا خوف؟

﴿۵﴾ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ: یوسف علیہ السلام کے سامنے جب بچنے کی کوئی راہ نہ رہی تو انھوں نے اس ذات پاک کی پناہ مانگی جس کی پناہ ملنے کے بعد کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ "مَعَاذٌ" مصدر سیمی ہے، معنی ہے "أَعُوذُ بِاللَّهِ مَعَاذًا مِمَّا تُرِيدُونَ" یعنی تم جو چاہتی ہو میں اس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ مجھے اپنی پناہ میں لے کر اس سے بچالے۔

﴿۶﴾ إِنَّكَ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ: اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور مفسرین میں سے ہر ایک نے اپنے ذوق کے مطابق کسی ایک معنی کو ترجیح دی ہے۔ ایک تو یہ کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، بے شک وہ اللہ میرا مالک ہے، اس نے میرا ٹھکانا اچھا بنایا، اس

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ ۗ كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ الشُّؤْمَ

اور بلاشبہ یقیناً وہ اس کے ساتھ ارادہ کر چکی تھی اور وہ بھی اس عورت کے ساتھ ارادہ کر لیتا اگر یہ نہ ہوتا کہ اس نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی۔ اسی طرح ہوا، تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں۔ بے شک کی نافرمانی کر کے میں ظالموں میں شامل نہیں ہو سکتا۔ دوسرا معنی ہے کہ میں اس کام سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، تم اس عزیز مصر کی بیوی ہو جو میرا مالک ہے، میں اس کا غلام ہوں، اس نے میرے لیے رہنے کا ایسا اچھا انتظام کیا ہے، میں اپنے مالک کی خیانت کیسے کر سکتا ہوں، یہ تو سراسر ظلم ہے۔ پہلے معنی میں عزیز کی بیوی کو اللہ سے ڈرایا اور اس کے احسان یاد دلائے ہیں، دوسرے معنی میں اسے خاوند کی شرم دلائی ہے، شاید اس طرح ہی وہ باز آ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں معنی درست ہیں، دونوں بیک وقت مراد بھی ہو سکتے ہیں، مگر دوسرا معنی زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کی تقدیر پر شاکر ہو کر اپنے آپ کو عزیز مصر کا غلام سمجھتے تھے اور ہر طرح اس کی خدمت اور اطاعت کرتے تھے۔ اس لیے وہ اپنے مالک اور مربی کے احسان کا بدلہ اس پر ظلم کے ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے اور لفظ ”رب“ غلام کے مالک کے لیے یوسف علیہ السلام کی زبانی اسی سورت میں کئی جگہ آیا ہے، فرمایا: ﴿قَالَ اِرْجِعْ اِلَىٰ رَبِّكَ فَسَلِّهُ﴾ [یوسف: ۵۰] اور فرمایا: ﴿اَمَّا اَحَدُكُمْ فَيَسْتَعِیْنُ رَبَّهٖ خَشْرًا﴾ [یوسف: ۴۱] اور فرمایا: ﴿اِذْ كُرِنِي عِنْدَ رَبِّكَ فَكَانَسُنَا الشَّيْطٰنُ ذِكْرًا رَبِّهٖ﴾ [یوسف: ۴۲]

① اِنَّهٗ لَا يُغْلِبُ الظَّالِمِيْنَ : یعنی زنا ظلم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے۔ زنا اپنے آپ پر ظلم ہے، اس عورت پر ظلم ہے، اس کے خاوند پر ظلم ہے، اپنے خاندان اور اس کے خاوند کے خاندان دونوں پر ظلم ہے کہ کسی خاندان کا بچہ دوسرے خاندان کا بچہ شمار ہوگا، نسب برباد ہوگا۔ زنا پوری انسانیت پر ظلم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرُبُوا الزَّوْجٰتِ اِنَّهٗ كَانَ فَاْحِشَةً مَّوْسَاۗءَ سَبِيْلًا﴾ [بنی اسرائیل: ۲۲] اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ ہمیشہ سے بڑی بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔ یعنی زنا بے حیائی ہونے کے ساتھ ایک برا راستہ ہے جو آج تمہیں دوسرے کی عزت برباد کرنے کے لیے لے گیا ہے تو کل کسی کو تمہارے گھر بھی لے آئے گا، مثلاً شریعت نے جب آپ کو چوری سے روکا ہے تو اس نے صرف آپ کو نہیں روکا بلکہ کروڑوں، اربوں کو آپ کی چوری کرنے سے روکا ہے۔ اگر آپ باز نہ آئے تو دوسرے کیوں باز آئیں گے؟ مسلمانوں کے نسب کے محفوظ رہنے اور ان کے معاشرے کی پاکیزگی پر کفار کو بے حد حسد ہے۔ وہ اس شرف سے محروم ہوجانے کے بعد اب ہم میں بھی بے حیائی پھیلنا کر ہمیں اس شرف سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کا طرز عمل اس معاملے میں ہمارے لیے بہترین چراغِ راہ ہے۔

آیت 24 : ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا﴾ : عزیز کی بیوی کا یوسف علیہ السلام کے ساتھ ارادہ بدی تو ”لام“ اور ”قَدْ“ سے (جو دونوں تحقیق کے لیے بمعنی قسم آتے ہیں) بلکہ سارے واقعہ ہی سے ظاہر ہے، البتہ یوسف علیہ السلام نے ارادہ کیا یا نہیں، اس میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ جس طرح روزہ دار کو ٹھنڈا پانی دیکھ کر اس کی رغبت ہوتی ہے مگر وہ

وَالْفُحْشَاءُ ۗ إِنَّكَ مِنَ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ﴿۲۳﴾

وہ ہمارے خالص کیے ہوئے بندوں سے تھا ﴿۲۳﴾

روزے کی وجہ سے اس پر قابو پا لیتا ہے اور یہ ایک طبعی چیز ہے۔ اس قسم کا خیال یوسف علیہ السلام کے دل میں آ گیا ہو تو کچھ بعید نہیں مگر ”بُرْهَانَ رَبِّهِ“ دیکھنے کی برکت سے یوسف علیہ السلام نے اسے جھٹک دیا۔ مگر دوسری تفسیر جس پر زیادہ اطمینان ہوتا ہے، وہ یہی ہے جو ترجمے سے ظاہر ہے اور قرآن مجید میں ”لَوْلَا“ شرط کی جڑ اس سے پہلے آنے کی مثال بھی موجود ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے متعلق فرمایا: ﴿إِنْ كَادَتْ لَتُبْدِي بِهِ لَوْلَا أَنْ رَبَّنَا عَلَىٰ قُلُوبِنَا﴾ (القصص: ۱۰) ”بے شک وہ قریب تھی کہ اسے ظاہر کر ہی دیتی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے اس کے دل پر بند باندھ دیا تھا۔“ اگر یوسف علیہ السلام ارادہ کر چکے ہوتے اور برہان رب کے ذریعے سے ان کو بتایا جاتا تو آیت کے الفاظ یہ نہ ہوتے: ﴿كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ﴾ ”اسی طرح ہوا، تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں“ بلکہ یہ ہوتے: ”كَذَلِكَ لِنَصْرِفَهُ عَنِ السُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ“ کہ اسی طرح ہوا، تاکہ ہم اسے برائی اور بے حیائی سے ہٹا دیں۔ پھر اس واقعہ سے تعلق رکھنے والے ہر شخص نے جس طرح یوسف علیہ السلام کی بے گناہی کی شہادت دی اس کا تقاضا بھی یہی ہے، مثلاً ① خود اللہ تعالیٰ: ﴿كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ﴾ ② یوسف علیہ السلام: ﴿هِيَ رَاوَدْتَنِي﴾ ③ شاہد ”قیص کا معائنہ“ ④ عزیز مصر: ﴿إِنَّكَ كُنْتَ مِنَ الضَّالِّينَ﴾ ⑤ شاہ مصر: ﴿إِذْ رَاوَدْتُنَّ يُوسُفَ﴾ ⑥ زمان مصر: ﴿مَا عَلِمْنَا عَلَيْكَ مِنْ سُوءٍ﴾ ⑦ اور خود عزیز کی بیوی: ﴿وَإِنَّكَ لَمِنَ الصَّادِقِينَ﴾ ⑧ خود یوسف علیہ السلام نے بعد میں فرمایا: ﴿وَالْأَلَا تَصْرِفَ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَضْبُ إِلَيْهِنَّ﴾ کہ اگر تو مجھ سے ان کے فریب کو نہ ہٹائے گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا، یہ صریح دلیل ہے کہ وہ مائل نہیں ہوئے تھے۔ سب کی شہادتیں ہمارے سامنے ہیں۔ رہے وہ مفسرین جو یوسف علیہ السلام کو بلا دلیل گناہ کے عین کنارے پر پہنچا کر پیچھے ہٹاتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کو خود جواب دہ ہوں گے اور جو مفسرین ان بند دروازوں میں ہونے والی گفتگو بھی بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں وہ شاید وہاں چھپ کر سنتے رہے ہوں گے، یا ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی وحی آئی ہوگی، کیونکہ قرآن وحدیث اور عقل وفطرت میں سے تو کوئی چیز ان مکالموں کی تائید نہیں کرتی۔

② لَوْلَا أَنْ ذَا بُرْهَانَ رَبِّهِ: وہ رب کی دلیل کیا تھی؟ اس کی تعیین میں رسول اللہ ﷺ سے صحت کے ساتھ کوئی چیز ثابت نہیں ہے، البتہ مفسرین نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں جو محض اقوال ہیں۔ ہمارے استاذ مولانا محمد عبدہ مٹھرا فرماتے ہیں: ”ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کے اخلاق کی بلندی اس کی اجازت نہ دیتی ہو کہ زنا جیسے برے کام پر آمادہ ہوں اور اسی کو یہاں ”بُرْهَانَ رَبِّهِ“ سے تعبیر فرمایا ہو۔“

③ إِنَّكَ مِنَ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ: ”الْمُخْلَصِينَ“ لام کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اخلاص والے، نیک بخت بندے مراد ہوں گے اور ”الْمُخْلَصِينَ“ لام کے فتح کے ساتھ ہو تو معنی ہوگا وہ جنہیں چن لیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَیْبَصَةٌ مِنْ دُبُرٍ وَ الْفِیَا سَیِّدَهَا لَدَا الْبَابِ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ
 آرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۵﴾

اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور اس عورت نے اس کی قمیص پیچھے سے پھاڑ دی اور دونوں نے اس کے
 خاند کو دروازے کے پاس پایا، اس عورت نے کہا کیا جزا ہے اس کی جس نے تیری گھر والی کے ساتھ برائی کا ارادہ
 کیا، سوائے اس کے کہ اسے قید کیا جائے، یا دردناک سزا ہو ﴿۲۵﴾

یہاں لام کے فتنہ کے ساتھ ہے، یعنی وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے چنے جانے کا شرف حاصل ہوا۔ مخلص بندہ ہونا ان
 دونوں باتوں کی علت ہے کہ یوسف علیہ السلام نے برائی کا ارادہ بھی نہیں کیا اور یہ کہ ہم نے برائی و بے حیائی کو ان سے ہٹا کر رکھا، کیوں؟
 اس لیے کہ وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھے، جن کے متعلق شیطان نے خود اعتراف کیا تھا کہ میں انہیں گمراہ نہیں
 کر سکوں گا، اس نے کہا تھا: ﴿الْأَعْيَادُ لَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ﴾ [النحر : ۴۰] ”مگر ان میں سے تیرے وہ بندے جو خالص
 کیے ہوئے ہیں۔“ اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی طہارت چار بار بیان کی ہے: ﴿لِنُصْرِفَ عَنْهُ الشُّوْءَ﴾
 ﴿۲﴾ ”وَالْفَحْشَاءَ“ ﴿۳﴾ ”إِنَّكَ مِنْ عِبَادِنَا“ ﴿۴﴾ ”الْمُخْلِصِينَ“

آیت 25 **وَاسْتَبَقَا الْبَابَ**..... علماء نے لکھا ہے کہ اس جملے کا تعلق ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِه.....“ کے ساتھ ہے اور ”كَذَلِكَ
 لِنُصْرِفَ.....“ درمیان میں جملہ معترضہ ہے جو یوسف علیہ السلام کی پاک بازی کو ثابت کرنے کے لیے لایا گیا ہے اور آیت کا
 مفہوم یہ ہے کہ عورت نے زنا کا عزم کیا، مگر یوسف علیہ السلام نے انکار کیا، چنانچہ اسی کشمکش میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی
 کوشش میں وہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے، آگے یوسف علیہ السلام اور پیچھے عزیز کی بیوی۔ یوسف علیہ السلام اس لیے کہ جلدی سے
 دروازہ کھول کر بھاگ جائیں اور عزیز کی بیوی دوڑی کہ پہلے پہنچ کر انہیں دروازہ کھول کر بھاگنے نہ دے۔ یہاں قابل توجہ
 بات یہ ہے کہ وہ دروازے جو عزیز کی بیوی نے بہت اچھی طرح بند کیے جب یوسف علیہ السلام گناہ سے بچنے کے لیے بند دروازوں
 کی پروا نہ کرتے ہوئے بھاگے تو اللہ تعالیٰ نے کھولنے میں بھی مدد فرمادی۔ اسی مقصد کے لیے اس نے پیچھے سے قمیص پکڑی کہ
 روک لے مگر قمیص پھاڑ کر بھی روکنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ یوسف دروازے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے، ساتھ ہی وہ بھی نکلی
 تو اچانک دونوں نے اس کے خاند کو سامنے پایا۔ اب وہ سارا ”عشق حقیقی“ جس کی داستان ہمارے قصہ گو مزے لے لے کر
 بیان کرتے ہیں اور اسے ایک رسول خدا کا عشق صادق ہونے کی وجہ سے معرفت الہی کی ایک منزل قرار دیتے ہیں، ایک لمحہ
 میں بہتان کے سانچے میں ڈھل گیا۔ کہنے لگی، اس شخص کی کیا جزا ہے جس نے تیری گھر والی کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا،
 سوائے اس کے کہ قید کیا جائے یا دردناک سزا ہو؟ سبحان اللہ! خاند کو بھڑکانے کے لیے، جو غلام کو ورغلانے والی تھی وہ خاند کی
 عفت تاب گھر والی بن گئی، دعویٰ کرنے والی بھی خود ہی بن گئی اور دعویٰ یہ نہیں کہ اس نے کوئی چھیڑ چھاڑی یا دست درازی کی

قَالَ هِيَ رَاوَدْتَنِي عَنْ نَفْسِي وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ۗ إِن كَانَ قَبِيضُهُ قُدًّا مِنْ قَبَلٍ
فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَ إِن كَانَ قَبِيضُهُ قُدًّا مِنْ دُبُرٍ فُكِّدَتْ وَ هُوَ مِنَ

اس (یوسف) نے کہا اسی نے مجھے میرے نفس سے پھسلا یا ہے اور اس عورت کے گھر والوں سے ایک گواہ نے گواہی
دی اگر اس کی قمیص آگے سے پھاڑی گئی ہو تو عورت نے سچ کہا اور یہ جھوٹوں سے ہے ﴿۲۶﴾ اور اگر اس کی قمیص پیچھے

ہے، بلکہ صرف یہ کہ برائی کا ارادہ کیا ہے، اب کسی کے سینے کے اندر جا کر کون تحقیق کرے کہ ارادہ تھا بھی یا نہیں اور تھا تو کیا
تھا؟ پھر اس الزام کے ثبوت کے لیے کوئی گواہ یا قرینہ پیش نہیں کیا، اس کے باوجود خود ہی سزا سنانے والی حج بن گئی کہ اس کے
لیے ان دو سزاؤں میں سے ایک کے سوا ہو ہی کیا سکتی ہے؟

آیت 26: 28 ﴿۱﴾ قَالَ هِيَ رَاوَدْتَنِي عَنْ نَفْسِي: یوسف علیہ السلام اب تک خاموش تھے اور انھوں نے خاموش ہی رہنا تھا، کیونکہ
اللہ کے بندوں کی صفت پر پردہ پوشی ہے، مگر تہمت کے بعد خاموش رہنے کا مطلب اس الزام کو قبول کرنا تھا، اس لیے یوسف علیہ السلام
نے اپنی صفائی پیش کرنا ضروری سمجھا، فرمایا اسی نے مجھے میرے نفس سے پھسلا یا ہے۔

﴿۲﴾ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا : عزیز مصر اور گھر کے خصوصی افراد دونوں کی بات سن کر پس و پیش میں پڑ گئے کہ کسے سچا
کہیں اور کسے جھوٹا؟ کیونکہ وقوع کے وقت کوئی شخص پاس موجود ہی نہ تھا۔ ایسے وقت میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ
موقع دیکھ کر قرائن سے فیصلہ کیا جائے، اسے قرینے کی شہادت بھی کہتے ہیں۔ دیکھا گیا تو عورت کے جسم یا لباس پر دست درازی
کا کوئی نشان نہ تھا۔ ہاں، یہ بات سب کو معلوم ہو چکی تھی کہ یوسف کی قمیص پھٹی ہے۔ عزیز مصر کی بیوی کے گھر والوں میں سے
ایک سمجھ دار آدمی نے فیصلہ کیا (یہاں شہادت کا لفظ قرینے پر فیصلہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے) کہ قمیص کو دیکھ کر فیصلہ کر لو۔
ظاہر ہے کہ اس آدمی نے ابھی تک قمیص دیکھی نہ تھی، ورنہ وہ یہ نہ کہتا کہ قمیص دیکھو کہ دھڑ سے پھٹی ہے، بلکہ اس نے ایک مسلمہ
قاعدے کے طور پر یہ فیصلہ دیا۔ جب عزیز مصر نے قمیص دیکھی کہ پیچھے سے پھٹی ہے تو ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور پھر
صرف اپنی بیوی ہی نہیں سب عورتوں کے متعلق کہہ دیا کہ یقیناً یہ تمہارے فریب میں سے ایک فریب ہے، یقیناً تم عورتوں کا
فریب بہت بڑا ہے۔ یہ شاہد کون تھا؟ مستدرک حاکم اور بعض دوسری کتب میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ ان چار
بچوں میں سے ایک تھا جنہوں نے گود میں کلام کیا۔ اس حدیث کو بہت سے اصحاب نے صحیح یا حسن کہا ہے، مگر بہت سے
اصحاب نے ضعیف بھی کہا ہے۔ جن میں سے شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ سرفہرست ہیں۔ دیکھیے: "سلسلة الأحادیث
الضعيفة (۲/ ۲۷۱، ح: ۸۸۰)" پوری بحث وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی "الجباب الکافی" میں اسے
ضعیف کہا ہے۔ میری دانست میں یہی بات درست ہے کہ وہ ایک سمجھ دار آدمی تھا، کیونکہ ﴿۱﴾ خود ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ثقہ
راویوں کے ساتھ تفسیر طبری میں ہے کہ وہ شاہد داڑھی والا مرد تھا۔ اگر ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس رسول اللہ ﷺ کا فرمان موجود

الضّٰدِقِیْنَ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّا رَا قَبِيصَهُ قَدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ اِنْ كَيْدُكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۹﴾

سے پھاڑی گئی ہو تو عورت نے جھوٹ کہا اور یہ سچوں سے ہے ﴿۱۸﴾ تو جب اس نے اس کی قمیص دیکھی کہ پیچھے سے پھاڑی گئی ہے تو اس نے کہا یقیناً یہ تم عورتوں کے فریب سے ہے، بے شک تم عورتوں کا فریب بہت بڑا ہے ﴿۱۹﴾

ہوتا تو وہ کبھی اس کے خلاف نہ فرماتے، جب کہ ان کا یہ قول صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔ ﴿۲۰﴾ اگر دودھ پیتے بچے نے گواہی دی تھی تو یہ معجزہ خود اکیلا ہی یوسف علیہ السلام کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کافی تھا، اس بچے کو عزیز مصر کی بیوی کا رشتہ دار بتائے جانے کی اور قمیص آگے یا پیچھے سے پھینے ہونے کی پڑتال کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ہمارے بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ اگرچہ اس بچے کا بول اٹھنا ہی بہت بڑا تھا، جس نے کام کرنا سیکھا ہی نہیں، مگر قرآن نے اس پر اکتفا نہیں کیا، کیونکہ قرآن بنیادی طور پر دلیل یا تحقیق اور جستجو کو معیار ماننا یا منوانا چاہتا ہے۔ وہ نری نقدیس پر نہیں، تحقیق پر بنیاد رکھتا ہے۔ چنانچہ بچے نے دلیل اور مشاہدہ کو فیصلے کی بنیاد قرار دیا اور کہا: ”(قمیص) دیکھ لو.....“ اگر یہ بات درست مانی جائے تو پھر مریم علیہا السلام کی پاک بازی کے ثبوت کے لیے بچے کے معجزہ کلام کے سوا تحقیق کی کیا بنیاد تھی؟ اور صحیح بخاری میں مذکور جرجج پر جس بچے کا باپ ہونے کا الزام لگا تھا، وہاں صرف اس بچے کے بولنے کے سوا تحقیق کی بنیاد کیا تھی؟ دونوں جگہ بچے کا بولنا ہی کافی دلیل تھا۔

﴿۲۱﴾ یہاں بعض لوگ عورتوں کی مذمت کے طور پر عجیب صغریٰ کبریٰ ملاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عورتوں کا مکر و فریب شیطان کے مکر و فریب سے بھی بڑا ہے، دلیل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے کید (مکر) کو عظیم قرار دیا، جب کہ شیطان کے کید کے متعلق فرمایا: ﴿اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا﴾ [النساء: ۷۶] ”بے شک شیطان کی چال (کید) ہمیشہ نہایت کمزور رہی ہے۔“ حالانکہ یہاں سورہ یوسف میں یہ عزیز مصر کا قول نقل ہوا ہے اور اس نے بھی اپنی بیوی کا جرم ہلکا کرنے کے لیے تمام عورتوں کو اس میں لپیٹ لیا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے نقل کر کے اس پر رد نہیں فرمایا، مگر یہ قرآن کا طریقہ نہیں کہ بات سننے والے کی سمجھ میں آ رہی ہو کہ کون کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے تو اس کا رد ضروری کرے۔ پھر دیکھیے حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کا کید (مکر) مردوں کے مقابلے میں عظیم ہے، جب کہ شیطان کا (مکر) اللہ تعالیٰ اور اس کی راہ میں لڑنے والوں کے مقابلے میں ضعیف ہے۔ یہاں قوت و ضعف کے فریق ہی الگ الگ ہیں۔ البتہ رسول اللہ ﷺ سے عورتوں کے فتنے سے ہوشیار رہنے کی تاکید صحیح احادیث سے ثابت ہے، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿ مَا تَرَكَتُ بَعْدِي فِتْنَةٌ اَضْرَعُ عَلَى الرَّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ ﴾ [بخاری، السکاح، باب ما یفتی من شؤم المرأة.....: ۵۰۹۶]

”میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے بڑا کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔“ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک لمبی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلِ وَدِيْنٍ اَذْهَبَ لِبَلِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدَاكُنَّ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ ! ﴾ [بخاری، الزکوة، باب الزکاة علی الافراب: ۱۴۶۲] ”میں نے عقل اور دین کی ناقص شخصیات میں

يُوسُفُ أَعْرَضَ عَنْ هَذَا سَ ۖ وَاسْتَغْفِرِي لِذَنبِكِ ۖ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ ﴿۲۹﴾ وَقَالَ
نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِي
ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳۰﴾

یوسف! اس معاملے سے درگزر کر اور (اے عورت!) تو اپنے گناہ کی معافی مانگ، یقیناً تو ہی خطا کاروں سے تھی ﴿۲۹﴾ اور شہر میں کچھ عورتوں نے کہا عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اس کے نفس سے پھسلاتی ہے، بلاشبہ وہ محبت کی رو سے اس کے دل کے اندر داخل ہو چکا ہے۔ بے شک ہم تو اسے صریح غلطی پر دیکھتی ہیں ﴿۳۰﴾

سے کسی کو تمھاری کسی ایک سے زیادہ ہوشیار آدمی کی عقل کو لے جانے والا نہیں دیکھا، اے عورت کی جماعت! ”اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایرانیوں کے اپنے بادشاہ کی بیٹی کو بادشاہ مقرر کرنے پر فرمایا: «لَنْ يُغْلِبَ قَوْمٌ وَلَوْ أُمَرُوهُمْ امْرَأَةً» [بخاری، المغازی، باب کتاب النبی ﷺ الی کسری و قیصر: ۵۴۲۵] ”وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جنھوں نے اپنا امر (سلطنت) کسی عورت کے حوالے کر دیا۔“

آیت 29 ﴿۲۹﴾ يُوسُفُ أَعْرَضَ عَنْ هَذَا عزیز مصر نے حقیقت حال جان لینے کے بعد یوسف رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یوسف! اس معاملے سے درگزر کرو (تاکہ بات نہ پھیلے، بلاشبہ تمھاری سچائی اور پاک بازاری ثابت ہو گئی ہے)۔ ادھر اپنی بیوی سے کہا کہ تو اپنے گناہ کے لیے استغفار کر، معافی مانگ، یقیناً تو ہی خطا کاروں سے تھی۔ ”مُخْطِئٌ“ اور ”مُخَاطِئٌ“ کا یہی فرق ہے، پہلا وہ شخص ہے جس سے بھول کر خطا ہو جائے نہ کہ دانستہ طور پر اور ”مُخَاطِئٌ“ وہ ہے جو جان بوجھ کر غلط کام کرے، جیسے فرمایا: ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِئِينَ﴾ [القصص: ۸] ”بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر خطا کار تھے۔“

﴿۲﴾ بظاہر یہ عزیز مصر کا علم و تحمل ہے، مگر درحقیقت اس سے اس کا بے غیرت اور دیوث ہونا ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اسے معمول کی ایک بات قرار دے کر معاملہ نمٹا دیا۔ نہ بیوی کو کوئی سزا دی اور نہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کا کوئی اہتمام ضروری سمجھا۔ اس سے اس وقت کے مصر کے اونچے طبقے کی اخلاقی حالت معلوم ہوتی ہے جو اب مسلمانوں کے طبقہ اشراف کو بھی اپنی پیٹ میں لے چکی ہے۔ (الامام شاہ اللہ)

﴿۳۰﴾ وَاسْتَغْفِرِي لِذَنبِكِ : اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے لوگوں میں خواہ نیک ہوں یا بد، گناہ اور نیکی کی پہچان پائی جاتی ہے اور ایسی ہستی پر بھی کسی نہ کسی حد تک ایمان پایا جاتا ہے جس کی نافرمانی کے بعد اس سے بخشش مانگنی چاہیے۔

آیت 30 ﴿۳۰﴾ وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ : ”نِسْوَةٌ، نِسَاءٌ“ اور ”نِسْوَانٌ“ سب ”امْرَأَةٌ“ کی جمع ہیں، مگر ”امْرَأَةٌ“ لفظ سے نہیں۔ (تاموس) ”نِسْوَةٌ“ کے ”امْرَأَةٌ“ کی جمع حقیقی نہ ہونے کی وجہ ہی سے فعل ”فَالَتْ نِسْوَةٌ“ کے بجائے ”قَالَ نِسْوَةٌ“ آیا ہے، کیونکہ غیر حقیقی جمع ہونے کی صورت میں ایسا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہر جگہ ”نِسَاءٌ“ آیا ہے، صرف

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكًا وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ

تو جب اس عورت نے ان کے فریب کے بارے میں سنا تو ان کی طرف پیغام بھیجا اور ان کے لیے ایک تکیہ دار مجلس تیار کی اور ان میں سے ہر ایک کو ایک چھری دے دی اور کہا ان کے سامنے نکل۔ پھر جب انھوں نے اسے دیکھا تو

اس آیت یا اسی سورت کی آیت (۵۰) میں کل دو مرتبہ ”نِسْوَةٌ“ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ”نِسْوَةٌ“ جمع قلت کا وزن ہے، جو تین سے دس تک استعمال ہوتا ہے، بخلاف ”نِسَاءٌ“ وغیرہ کے کہ وہ کثرت کے لیے بھی آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عزیز کی بیوی نے چند ایک خاص عورتوں ہی کو اس مجلس کی دعوت دی تھی۔ ”شَفَعْنَا“ شغاف دل کے پردے کو کہتے ہیں، یعنی دل کے پردے کے اندر داخل ہو گیا ہے۔ بعض نے شغاف کا معنی ”سویاء القلب“ (دل کا مرکز) بھی کیا ہے۔ ”تُرَاوِدُ فَتْنَهَا“ (اپنے غلام کو پھسلاتی ہے) ان عورتوں نے ماضی کا صیغہ ”رَاوَدَتْ“ (اس نے پھلایا ہے) کے بجائے مضارع کا صیغہ استعمال کیا کہ وہ اب بھی اس سے باز نہیں آتی، بلکہ پھسلاتی رہتی ہے۔

آیت 31 فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ..... اس آیت کی تفسیر اکثر بلکہ تقریباً سبھی مفسرین نے یہ کی ہے اور اس کے لیے جس تاویل کی ضرورت پڑی وہ بھی کرتے گئے ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب شہر میں اس واقعہ کی شہرت ہوئی تو عورتوں نے طعن و تشنیع اور ملامت کے تیر برسانا شروع کر دیے کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے غلام کو پھسلا رہی ہے اور اس کی اتنی دیوانی ہو گئی ہے جو اس کی حیثیت کے خلاف ہے۔ جب عزیز کی بیوی نے ان کی ملامت کو سنا۔ (قرآن میں لفظ ہے کہ جب اس نے ان کے مکر کو سنا۔ مکر کا سیدھا سامعنی ”فریب، سازش، خفیہ تدبیر“ ہوتا ہے، مگر ہمارے مفسرین نے اسے درست کرنے کے لیے کہا کہ وہ ظاہر تو ملامت کر رہی تھیں مگر حقیقت میں وہ یوسف کا حسن دیکھنا چاہتی تھیں، ان کے مکر سے مراد یہ ہے) خیر جب اس نے ان کی ملامت کو سنا تو اس نے ان کی ملامت کے جواب میں اپنے نفل کا جواز پیش کرنے اور اپنے بے اختیار ہو جانے کے سبب کا مشاہدہ کروانے کے لیے چند خاص عورتوں کو دعوت دی اور ان کے لیے یہ مجلس آراستہ کی۔ اب جب مجلس جو بن پر تھی، چھریوں سے گوشت اور پھل کاٹنے جا رہے تھے، تو یوسف علیہ السلام سے کہا، ان کے سامنے آؤ۔ جب انھوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو ان کے حسن کو دیکھ کر ایسی بے خود ہوئیں کہ انھیں خیال ہی نہ رہا کہ ہم پھل کاٹ رہی ہیں یا اپنے ہاتھ، وہ انھیں دیکھتی ہی رہ گئیں اور چھریاں ان کے ہاتھوں پر چل گئیں، جس سے انھوں نے اپنے ہاتھ بری طرح کاٹ لیے (قَطَّعْنَ) باب تفصیل مبالغہ کے لیے ہے) اور محویت میں انھیں درد کا احساس ہی نہیں ہوا اور کہنے لگیں، اللہ کی پناہ یہ کوئی آدمی نہیں، یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔ (یعنی حسن میں فرشتہ قرار دیا جس طرح بد صورتی میں شیطان کہا جاتا ہے) عزیز کی بیوی نے کہا کہ پھر یہی ہے وہ جس کے متعلق تم نے مجھے ملامت کی۔ ... عام تفاسیر کا خلاصہ یہ ہے، مگر اصل صورت واقعہ کچھ اور معلوم ہوتی ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام بچے تھے، جب وہ ان کے گھر میں غلام کی حیثیت سے آئے تھے۔ غلام کا خدمت کے لیے اپنے آقا سے تعلق رکھنے والے تمام گھروں میں لین دین یا پیغام وغیرہ پہنچانے کے لیے عام آنا جانا ہوتا ہے۔ کئی سال بعد

سَيِّئًا وَقَالَتِ اخْرِجْ عَلَيَّهِنَّ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ

اسے بہت بڑا پایا اور انھوں نے اپنے ہاتھ بری طرح کاٹ ڈالے اور کہا اللہ کی پناہ! یہ کوئی آدمی نہیں ہے،

جب وہ پورے جوان ہوئے تو یہ واقعہ پیش آیا۔ اب آیا یہ ممکن ہے کہ اتنے سالوں تک عزیز مصر کی بیوی کی اتنی قریب ترین سہیلیوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا ہی نہ ہو اور عزیز کی بیوی نے انھیں دکھانے کا اہتمام اب ہی کیا ہو؟ میں نے بیسیوں تفسیریں پڑھیں، بڑے بڑے باریک بین اہل علم جن کے علم و فضل کا یہ عاجز دل سے نہایت معترف ہے اور انھی کا خوش چھین ہے، وہ اس سوال کے پاس سے ناموشی سے گزر گئے ہیں اور حسن یوسف سے بے خودی ہی کو ہاتھ کٹنے کا باعث قرار دیتے چلے گئے ہیں۔ البتہ چند ایک نے اس کی طرف توجہ کی ہے، انھوں نے اس کا جواب یہ تراشا ہے کہ عزیز مصر کی بیوی ہمیشہ یوسف علیہ السلام کو برقع پہنا کر رکھتی تھی، تاہذا انہیں دیکھ نہ لے۔ مجھے تعجب ہوا کہ بعض مفسرین نے حسن یوسف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب وہ مصر کی گلیوں میں چلتے تھے تو ان کے چہرے کے حسن اور نور کا عکس دیواروں پر پڑتا تھا۔ اب کہاں برقع اور کہاں دیواروں پر چہرے کے عکس؟ نور کا عکس پڑنا۔ ”ضدّ انّ مُفْتَرٍ فَاَنْ اُنّٰی تَفَرَّقُ“ سیدھی سی بات ہے کہ یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کے گھر ہی لیے جگہ دی تھی کہ وہ مشورے کی مجلسوں میں خدمت کرنے والے غلام یا عزیز مصر کے بیٹے کی حیثیت سے شریک ہو کر موزمکت سیکھیں، فرمایا: ﴿وَلَتَعْلَمَنَّ مِنْ تَاوِيلِ الْاَكَاوِيْتِ﴾ [یوسف: ۲۱] اور تاکہ ہم اسے باتوں کی اصل حقیقت میں سے کچھ سکھائیں۔ اس معاشرے میں مردوں اور عورتوں کا بے پردہ مل کر بیٹھنا معمول کی بات تھی، جس طرح آج کل مسلمانوں کی پارٹیٹ اور دوسرے اداروں اور گھروں کا حال ہو گیا ہے، غیر مسلموں کا حال تو قابل بیان ہی نہیں۔ ایسے حالات میں اتنے سال تک ان خواتین کو کوشش کے باوجود یوسف علیہ السلام کے دیکھنے کا موقع نہ ملنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اصل بات جو صاف نظر آرہی ہے، یہ تھی کہ جب ان چند عورتوں تک اندر کی یہ خبر کسی طرح پہنچی تو انھوں نے عزیز کی بیوی پر طعن و ملامت کی کہ اس کی نادانی دیکھو کہ اپنے غلام پر فریفت ہو چکی ہے اور اب تک کی مسلسل کوشش اور پھسلانے کے باوجود حصول مقصد میں ناکام ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے حسن کا اور کسی کو اپنا دیوانہ بنانے کی چالوں میں مہارت کا دعویٰ بھی کیا کہ ہمارے پاس وہ مکر ہیں کہ کوئی بھی ہمارے مکر و فریب سے بچ کر نہیں جاسکتا، ایک غلام کی کیا مجال ہے۔ ﴿لَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ﴾ تو جب عزیز مصر کی بیوی نے ان کے مکر و فریب اور چالوں کا دعویٰ سنا تو انھیں دعوت دی کہ تم بھی اپنا ہنر آزما دیکھو، اگر وہ کسی ایک کو بھی دل دے بیٹھا تو میرے لیے بھی وجہ جواز بن جائے گی۔ باقاعدہ ان کی چال کی تفصیل سن کر ہر عورت کو دعوت لے لو ازمات کے ساتھ خصوصاً ایک ایک چھری بھی دی۔ اب یوسف علیہ السلام عزیز کی بیوی کے کہنے پر شہر کی منتخب حسیناؤں کے سامنے آئے تو ان میں سے ہر ایک نے انھیں اپنے حسن اور ناز و انداز سے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ جب کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی تو انھوں نے بے بس عاشقوں کا آخری حربہ آزمایا کہ اگر تم نے ہمارا دل توڑا تو ہم ہی کر لیں گی۔ یہ ایسا مرحلہ ہرنا ہے کہ آدمی رحم کے جذبے کے ہاتھوں پھنس جاتا ہے۔ کئی لڑکیاں اسی طرح برباد ہوئیں اور

مَا هَذَا بَشَرًا ۖ اِنْ هَذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾

یہ نہیں ہے مگر کوئی نہایت معزز فرشتہ ﴿۳۱﴾

کئی لڑکے بھی۔ ضروری نہیں کہ سب عورتوں نے ایسا کیا ہو، بہر حال ان میں سے کچھ نے اپنے ہاتھ بری طرح زخمی کر کے اپنی خودکشی کی دھمکی دی۔ حسن و جمال کے ساتھ عفت و حیا کے اس پیکر نے اس کی بھی پروا نہ کی تو وہ بولیں، اللہ کی پناہ! اس شخص کے سینے میں آدمی کا دل نہیں، یہ تو ایک معزز فرشتہ ہے، جو عشق و حسن کے فتنوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا، جسے عشق کے معاملات سے کوئی واسطہ ہی نہیں، اس پر ہماری خودکشی کا بھی کیا اثر؟ ایک فارسی شاعر نے کہا ہے۔

عاشق نہ شدی محنت الفت نہ کشیدی کس پیش تو از قصہ ہجران چہ کشاید

”نہ تو عاشق ہوا، نہ تو نے عشق کی مصیبت اٹھائی۔ تیرے سامنے کوئی جدائی کا قصہ کھول کر کیا سنائے۔“ یہ حقیقت ہے کہ فرشتوں سے تشبیہ پاک بازی میں دی جاتی ہے، حسن میں نہیں، جس طرح ایک اردو شاعر نے ڈیک ماری ہے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اس کی کئی دلیلیں آئندہ آیات میں آ رہی ہیں، میں ان کا ترتیب وار ذکر کرتا ہوں: ﴿۱﴾ یوسف علیہ السلام نے دعا کی: ﴿رَبِّ السَّجُنِ احْبَبْ اِلَيَّ وَمَا يَدْعُوْنِي اِلَيْهِ﴾ [یوسف: ۳۳] ”اے میرے رب! مجھے قید خانہ اس سے زیادہ محبوب ہے جس کی طرف یہ سب مجھے دعوت دے رہی ہیں۔“ معلوم ہوا وہ عورتیں یوسف علیہ السلام کو دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ دعوت گناہ دینے کے لیے آئی تھیں۔ ﴿۲﴾ یوسف علیہ السلام نے مزید دعا کی: ﴿وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ اَصْبُ الْيَتِيْمِمْ وَ اَلْنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ﴾ [یوسف: ۳۳] ”اور اگر تو مجھ سے ان کے (مکر) فریب کو نہ بنائے گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں سے ہو جاؤں گا۔“

معلوم ہوا وہ سب عورتیں یوسف علیہ السلام کو اپنے مکر و فریب میں پھنسانے کے لیے آئی تھیں نہ کہ صرف جمال یوسف کے دیدار کے لیے۔ ﴿۳﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاَنْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ غَضَبَهُ كَيْدَهُنَّ﴾ [یوسف: ۳۴] ”تو اس کے رب نے اس کی دعا قبول فرمائی، اس نے اس (یوسف) سے ان (عورتوں) کا فریب ہٹا دیا۔“ اللہ تعالیٰ نے بھی اس دعوت کی کارروائی کو ان سب عورتوں کا مکر و فریب قرار دیا ہے۔ ﴿۴﴾ یوسف علیہ السلام نے جب بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتائی اور بادشاہ نے انھیں بلوایا تو یوسف علیہ السلام نے اس کے قاصد سے کہا کہ اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو: ﴿مَا بَالُ السُّوْمَةِ التَّقِ قَطُّفَعْنَ اَيُّدِيَهُنَّ ۗ اِنْ رَبِّي يَكْفِيهِنَّ عَلَيْهِمْ﴾ [یوسف: ۵۰] ”ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، یقیناً میرا رب ان کے فریب کو خوب جاننے والا ہے۔“ یہ آیت خصوصاً قابل غور ہے، جو لوگ کہتے ہیں کہ جہاں بھی عورتوں کے مکر کا ذکر ہے مراد صرف عزیز مصر کی بیوی ہے، دوسری عورتیں چونکہ اس کی ساتھی تھیں، اس لیے ان کا ذکر ساتھ آ گیا۔ اب اس آیت پر غور کریں، عزیز کی بیوی نے تو ہاتھ کاٹے ہی نہیں تھے، وہ تو دوسری ہی عورتوں نے کاٹے تھے، یوسف علیہ السلام ان کے ہاتھ کاٹنے کو ان کا مکر و فریب قرار دے رہے ہیں۔ ﴿۵﴾ بادشاہ نے ان تمام عورتوں کو بلا کر پوچھا: ﴿مَا خَطْبُكُنَّ

إِذْ رَاوَدَتْهُنَّ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ ﴿۱۰۱﴾ [یوسف : ۱۰۱] ”تمہارا کیا معاملہ تھا جب تم نے یوسف کو اس کے نفس سے پھسلا یا؟“ معلوم ہوا کہ بادشاہ نے بھی ان کے ہاتھ کانٹنے کو یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال سے بے خود ہو کر ہاتھ کانٹنے کے بجائے اسے ان کی سوچی سمجھی پھسلا نے کی سازش قرار دیا۔

اگر کوئی صاحب فرمائیں کہ یہ تفسیر تم نے اپنے پاس سے کی ہے، تو جواب یہ ہے کہ جہاں قرآن و حدیث کی تفسیر کی کوئی نص صریح نہ ہو وہاں قرآن مجید کے عجائبات و نکات قیامت تک ظاہر ہوتے رہیں گے۔ ویسے مجھ سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے یہی تفسیر کی ہے، مولانا امین احسن اصلاحی نے (ان کے تفسیر میں منج کے تفرد سے قطع نظر) یہی تفسیر کی ہے اور تفسیر مواہب الرحمن کے مصنف علامہ امیر علی علیہ السلام نے دوسری تفسیروں کے ساتھ یہ تفسیر بھی لکھی ہے، ان کے الفاظ ہیں: ”اور شاید کہ (عزیز کی بیوی نے) ان عورتوں سے اپنی مراد کے لیے استعانت چاہی ہو، اس طرح کہ آنحضرت (یوسف علیہ السلام) نے کہا تھا: ﴿مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّكَ رَبِّي أَحْسَنَ مَشْوَايَ﴾ یعنی اپنی پرورش کرنے والے عزیز مصر کی جو رو سے لحاظ مہربانی ہونے کے یہ کام نہ کریں تو یہ عورتیں ظالم ہوں، پھر ان کی تکوین کے بعد کام آسان ہو۔ چنانچہ بعض مفسرین نے قصہ روایت کیا کہ ان عورتوں میں ہر ایک نے زینحہ کی جیلہ گری و اشارہ سے آنحضرت (یوسف علیہ السلام) سے تخلیہ میں یہ خواہش ظاہر کی اور ہر طرح کی زینت و کمر اور لجاجت و حیلہ کا خاتمہ کر دیا تھا اور کلام مابعد میں اس کی طرف اشارہ بھی نکلتا ہے۔ چنانچہ جب یہ صورت معاملہ نظر آئی تو یوسف علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے، یعنی وہی مجھے منظور ہے ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اَلْبَسُوْا لِيْۤاِبْرٰهِيْمَ رِيْثَۃَ اٰتِيْنِ﴾ اس کام سے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں۔“ آیت کی یہ تفسیر اور بھی کئی مفسرین نے کی ہوگی مگر مجھے قدیم مفسرین میں سے جن بزرگوں سے یہ تفسیر ملی ہے وہ ہیں سلطان العلماء، شیخ الاسلام عزالدین ابن عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ، چنانچہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جس مرض میں رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے اس مرض کا واقعہ ہے کہ نماز کا وقت ہو گیا، اذان ہوئی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”ابوبکر سے کہو وہ نماز پڑھائیں۔“ آپ ﷺ سے کہا گیا: ”ابوبکر غمگین آدمی ہیں، جب آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو لوگوں کو نماز نہیں پڑھائیں گے۔“ آپ نے دوبارہ یہی حکم دیا تو انھوں نے دوبارہ یہی کہا، آپ ﷺ نے تیسری دفعہ یہی حکم دیا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿اِنَّكُمْ صَوَّأَجِبُ يُوسُفَ مُرُوْا اٰتِيْنَا بِمَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ﴾ [بخاری، الأذان، باب حد المبرص ان يشهد الجماعة : ۶۶۴] ”تم یوسف کے ساتھ والیاں ہو، ابوبکر سے کہو نماز پڑھائے۔“ صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری روایت (۶۷۹) میں ہے کہ پہلی دو دفعہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات کہی تھی، تیسری بار ان کے کہنے کے مطابق دفعہ چوتھوں نے کہی تھی۔

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ”اِنَّكُمْ صَوَّأَجِبُ يُوسُفَ“ کی شرح عام مفسرین کے مطابق کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے: ”وَ وَقَعَ فِيْ اَمَالِي ابْنِ عَبْدِ السَّلَامِ اَنَّ النِّسْوَةَ اَتَيْنَ امْرَاةَ الْعَزِيْزِ يَطْلُوْنَ تَعْنِيْنَهَا وَ مَقْصُوْدُهُنَّ فِي الْبَاطِنِ اَنْ يَدْعُوْنَ يُوسُفَ اِلَى اَنْفُسِهِنَّ“ ”كَذَا قَالَ وَ لَيْسَ فِيْ سِيْنَابِ الْاَيَّةِ مَا يُسَاعِدُ مَا قَالَ“ [فتح الباری ۲/ ۱۵۳، ح : ۶۶۵] ”ابن عبدالسلام کی امالی میں آیا ہے کہ وہ عورتیں عزیز کی بیوی کے پاس آئیں، وہ ظاہر تو

قَالَتْ فَذَلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَنِي فِيهِ ۗ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ۗ وَ لَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا أَمَرُهُ لَيَسْجَنَنَّ وَ لَيَكُونَا مِنَ الضَّعِيفِينَ ﴿۳۲﴾

اس عورت نے کہا تو وہ یہی ہے جس کے بارے میں تم نے مجھے ملامت کی تھی اور بلاشبہ یقیناً میں نے اسے اس کے نفس سے پھلایا، مگر یہ صاف بچ گیا اور واقعی اگر اس نے وہ نہ کیا جو میں اسے حکم دیتی ہوں تو اسے ضرور ہی قید کیا جائے گا اور یہ ضرور ہی ذلیل ہونے والوں سے ہوگا ﴿۳۲﴾

اس پر طعن و ملامت اور سختی کر رہی تھیں، حالانکہ ان کا مقصود باطن میں یہ تھا کہ وہ یوسف کو اپنی اپنی طرف دعوت دیں۔ حافظ ابن حجر زبک فرماتے ہیں کہ ابن عبد السلام نے ایسے فرمایا، حالانکہ سیاق میں کوئی ایسی چیز نہیں جو ان کی تائید کرتی ہو۔ ظاہر ہے کہ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر زبک کو سلطان العلماء کی بات سے اتفاق نہیں، کیونکہ ان کے خیال میں سیاق ان کی موافقت نہیں کرتا، مگر اس بندہ عاجز نے سیاق قرآن میں سے پانچ دلیلیں اسی تفسیر کے صحیح ہونے کی بیان کی ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان "صَوَّابِحِبُّ يُوْسُفَ" بھی اس کی تائید کر رہا ہے۔ (واللہ اعلم وعلمہ اتم)

آیت 32 ﴿۱﴾ قَالَتْ فَذَلِكُنَّ الَّذِي..... "ذَلِكُنَّ" میں اسم اشارہ "ذَا" ہی ہے، جس کے ساتھ مخاطب کی ضمیر یہ دیکھ کر لگائی جاتی ہے کہ مخاطب مرد ہے یا عورت، ایک ہے یا دو یا زیادہ، مثلاً آپ ایک شخص سے مخاطب ہیں اور اسے کسی آدمی کی طرف اشارہ کر کے کچھ بتانا چاہتے ہیں تو کہیں گے: "ذَلِكَ الرَّجُلُ الْمَذْكُورُ" یہ وہ مذکور آدمی ہے۔ اگر کسی عورت سے بات کر رہے ہوں گے تو کہیں گے: "ذَلِكَ الرَّجُلُ الْمَذْكُورُ" یہ وہ مذکور آدمی ہے۔ اگر آپ یہی بات کہنا چاہتے ہوں اور آپ کے مخاطب دو ہوں تو کہیں گے: "ذَلِكُمَا الرَّجُلُ الْمَذْكُورُ" یہ وہ مذکور آدمی ہے۔ جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے قید کے دو ساتھیوں سے فرمایا: ﴿ذَلِكُمَا مِمَّا عَلَّمْتَنِي رَبِّي﴾ [یوسف: ۳۷] "یہ وہ چیز ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائی۔" یہ معنی نہیں کہ یہ دو چیزیں۔ زیر تفسیر آیت میں عزیز کی بیوی کی مخاطب کئی عورتیں تھیں، اس لیے اس نے کہا: ﴿فَذَلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَنِي فِيهِ﴾ اب "ذَلِكُنَّ" کا معنی یہ سب عورتیں نہیں بلکہ اس کا معنی ہے یہ ہے وہ شخص۔ صرف مخاطب جمع مؤنث ہونے کی وجہ سے "ذَلِكُنَّ" آیا ہے۔ اگر مخاطب بہت سے آدمی ہوتے تو اسی مفہوم کے لیے "ذَلِكُمْ" آتا، جیسے فرمایا: ﴿ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ [البقرة: ۵۴] "یہ چیز تمہارے لیے بہتر ہے۔"

﴿۲﴾ "فَاسْتَعْصَمَ" سین اور تاء کے اضافے سے طلب کا معنی بھی حاصل ہوتا ہے اور مبالغے کا بھی۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے، اس لیے ترجمہ کیا ہے "وہ صاف بچ گیا" یا کہہ لیں "بالکل بچ گیا۔" "لَيَسْجَنَنَّ" میں نون تاکید ثقیلہ ہے، اس لیے ترجمہ کیا ہے "اسے ضرور ہی قید کیا جائے گا۔" "وَلَيَكُونَا" یہ نون تاکید خفیفہ ہے، جسے عام طور پر لکھا جاتا ہے "وَلَيَكُونُنُ" مگر عربی رسم الخط وقف کے مطابق ہوتا ہے، چونکہ نون خفیفہ وقف میں الف ہو جاتا ہے، مثلاً یہی لفظ اگر اس پر وقف کریں تو اسے

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ
إِلَيْهِنَّ ۖ وَ أَكُنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۳۳﴾

اس نے کہا اے میرے رب! مجھے قید خانہ اس سے زیادہ محبوب ہے جس کی طرف یہ سب مجھے دعوت دے رہی ہیں اور اگر تو مجھ سے ان کے فریب کو نہ ہٹائے گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں سے ہو جاؤں گا ﴿۳۳﴾

”لَيْكُونَنَّ“ نہیں پڑھا جائے گا بلکہ ”لَيْكُونَا“ الف کے ساتھ پڑھا جائے، اس لیے اس نون کو الف کی شکل میں لکھا جاتا ہے، جیسا کہ ”خَبِيرًا“ اور ”بَصِيرًا“ وغیرہ میں نون توین ”خَبِيرَيْنَ، بَصِيرَيْنَ“ کے بجائے الف کی شکل میں ہے کہ وقف نہ ہو تو نون پڑھو، وقف ہو تو الف پڑھو۔ سورہ علق میں ”لَتَنفَعَنَّا“ میں بھی نون تاکید خفیفہ ہے جو الف کی شکل میں لکھا گیا ہے۔
③ بعض مفسرین نے ”لَيْسَجَنَنَّ“ میں نون تاکید ثقیلہ یعنی تشدید کے ساتھ اور ”لَيْكُونَا“ میں خفیفہ یعنی جزم کے ساتھ ہونے کی توجیہ فرمائی ہے کہ ثقیلہ میں تاکید زیادہ ہوتی ہے، تو عزیز کی بیوی کے خیال میں اس کے لیے یوسف علیہ السلام کو قید کر دانا تو یقینی تھا، مگر ان کے ذلیل ہونے کا پورا یقین اسے بھی نہ تھا، بھلا ایسے کریم بن کریم بن کریم بن کریم کو ذلیل کیا جا سکتا ہے؟ اس لیے اس نے لفظ نرم کر دیا۔

آیت 33 ﴿۳۳﴾ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ یوسف علیہ السلام کے لیے یہ سخت امتحان کا وقت تھا، ان کے سامنے ایک طرف

معصیت، یعنی اللہ کی نافرمانی ہے جس کے نتیجے میں ان کی ہر طرح ناز برداری ہوتی۔ دوسری طرف مصیبت ہے جو قید کی صورت میں ہے اور عزیز مصر کی بیوی قسم کھا کر (لام تاکید اور نون تاکید قسم کا فائدہ دیتے ہیں) اپنی حکم عدولی کی صورت میں قید کروانے کا عزم ظاہر کر رہی ہے۔ اس امتحان میں اللہ کے خاص بندے کبھی معصیت الہی کو ترجیح نہیں دیتے، بلکہ مصیبت قبول کر کے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿سَبْعَةٌ يُظَاهِرُهُمُ اللَّهُ فِي ظُلْمِهِ يَوْمَ لَا ظُلْمَ إِلَّا ظُلْمُهُ: الْإِمَامُ الْعَادِلُ، وَ شَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ رَبِّهِ، وَ رَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ، وَ رَجُلَانِ تَحَابَّتَا فِي اللَّهِ اجْتَمَعَا عَلَى ذَلِكَ وَ تَفَرَّقَا عَلَيْهِ، وَ رَجُلٌ طَلَبَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَ جَمَالَ فَقَالَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ، وَ رَجُلٌ تَصَدَّقَ أَخْفَى حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالَهُ مَا تُنْفِقُ بَيْتَهُ، وَ رَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ﴾ [بخاری، الأذان، باب من جلس في المسجد ينتظر الصلاة.....: ۶۶۰۔ مسلم: ۱۰۳۱] سات آدمی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن اس (کے عرش) کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا:

① عادل حکمران۔ ② وہ نوجوان جس نے اللہ کی عبادت میں نشوونما پائی۔ ③ وہ آدمی جس کا دل مسجدوں سے اٹکا ہوا ہے۔

④ وہ دو آدمی جنہوں نے اللہ ہی کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کی، اسی پر جمع ہوئے اور ای محبت پر جدا ہوئے۔ ⑤ وہ آدمی

جسے کسی اثر و رسوخ اور حسن و جمال والی عورت نے اپنی طرف بلایا مگر اس نے کہا: میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ ⑥ وہ آدمی

فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۗ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۳۴﴾ ثُمَّ بَدَأَ لَهُمْ مِنْ

بَعْدِ مَا رَأَوْا الْآيَاتِ لَيْسَجُنَّةً حَتَّىٰ حِينٍ ﴿۳۵﴾

تو اس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی، پس اس سے ان (عورتوں) کا فریب ہٹا دیا۔ بے شک وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۳۴﴾ پھر اس کے بعد کہ وہ کئی نشانیاں دیکھ چکے، ان کے سامنے یہ بات آئی کہ اسے ایک وقت تک ضرور ہی قید کر دیں ﴿۳۵﴾

جس نے صدقہ کیا اور اس قدر چھپا کر دیا کہ اس کے ہاتھ ہاتھ کو خبر نہ ہوئی کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا دیا۔ ﴿۳۴﴾ وہ آدمی جس نے تہائی میں اللہ کو یاد کیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہ پڑے۔ "یا اللہ! تو اپنے فضل سے ہمیں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل فرما۔ (آمین)

﴿۳۵﴾ "يَذُوعُوْنِي" اور "كَيْدَهُنَّ" (جمع مؤنث کے صیغوں) سے پوری مجلس دعوت گناہ دینے کے لیے آراستہ کرنا ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ بالتفصیل اوپر گزرنا۔ "أَصْبُ" "صَبًا يَصْبُو" سے ہے جس کا معنی مائل ہونا ہے۔ اصل میں "أَصْبُو" تھا، "الْأَصْرَفُ" کا جواب ہونے کی وجہ سے واؤ گر گئی۔ اس آیت سے دو نہایت اہم سبق ملتے ہیں، ایک یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ مدد نہ کرے اور اس کی دیکھیری نہ ہو تو کوئی شخص بھی اپنے آپ کو گناہ سے، خصوصاً عورتوں کے فتنے سے نہیں بچا سکتا، دوسرا یہ کہ جب کوئی شخص اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا تو وہ اور جاہل برابر ہیں۔ یہ ہے یوسف علیہ السلام کی پیغمبرانہ شان، اپنی طہارت اور پاک دامنی کا قطعاً دعویٰ نہیں کیا، بلکہ اپنے آپ کو حالات کا مقابلہ کرنے سے عاجز قرار دیتے ہوئے یہی فرمایا کہ عفت و پاک دامنی پر ثابت قدم رکھنا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ اگر توفیق نہ دے گا تو میں نفس اور شیطان کے فریب میں آ کر گناہ کی طرف مائل ہو جاؤں گا۔

آیت 34 : فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ اس کے پروردگار نے اس کی دعا قبول کر کے ان سب عورتوں کا مکر و فریب اس سے ہٹا دیا، چنانچہ اس کے بعد کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ کسی عورت نے انہیں پھسلانے کی کوشش کی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ جمال یوٹی پر ہیبت نبوت کی زرہ ڈال دی گئی، جیسا کہ ہمارے نبی ﷺ کو ایسی دعوت دینے کی کسی عورت کو کبھی جرأت ہی نہیں ہوئی، حالانکہ ان کے حسن و جمال کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔

آیت 35 : ثُمَّ بَدَأَ لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوْا الْآيَاتِ لَيْسَجُنَّةً حَتَّىٰ حِينٍ جب شہر میں ان واقعات کا چرچا ہوا اور عزیز منصر کی بیوی کی محبت میں دیوانگی اور یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی پر استقامت کی شہرت پھیلی تو اہل حل و عقد اس نتیجے پر پہنچے کہ یوسف علیہ السلام کو ہر صورت کچھ وقت کے لیے قید کر دیں، تاکہ ایک گھر میں رہنے کی وجہ سے میل ملاقات ختم ہو جائے اور آہستہ آہستہ اس واقعہ کی شہرت بھی ختم ہو جائے۔ اس فیصلے سے عزیز منصر پر اس کی بیوی اور دوسری عورتوں کا تسلط اور اس کی بے غیرتی اور دیوانگی بھی صاف ظاہر ہوتی

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيْنٌ ۗ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرِنِّي أَخَصِرُ خَيْرًا ۗ وَ قَالَ الْآخَرُ إِنِّي
أَرِنِّي أَحْسِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْرًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۗ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۗ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ

الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۹﴾

اور قید خانے میں اس کے ساتھ دو جوان داخل ہوئے، دونوں سے ایک نے کہا بے شک میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ کچھ شراب پھوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا بے شک میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر کچھ روٹی اٹھائے ہوئے ہوں، جس سے پرندے کھا رہے ہیں، ہمیں اس کی تعبیر بتا۔ بے شک ہم تجھے احسان کرنے والوں سے دیکھتے ہیں ﴿۱۹﴾

ہے کہ اس نے یوسف علیہ السلام کو قید میں ڈال دیا مگر عورتوں سے پوچھا تک نہیں کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ اس سے اس وقت کے معاشرے کی اخلاقی حالت معلوم ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے میں پہلے مغرب کے کفار کا یہ حال تھا اب مسلم ممالک کی اشرفیہ کا یہی رنگ ہے۔ (الا ماشاء اللہ) اور تمام کفار اور ان کے ایجنٹ سب مسلمانوں کو ایسا ہی بے غیرت بنانا چاہتے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ انھوں نے قید میں ڈالنے کے لیے ان کے کچھ جرائم تجویز کیے، جس طرح حکومتیں فرضی دفعات جرم لگا دیتی ہیں اور انھوں نے عزیز مصر کی بیوی کے الزام (عزیز کے اہل کے ساتھ برائی کے ارادہ) کی حقیقت جاننے کے باوجود اسی کو یوسف علیہ السلام کا جرم قرار دے دیا، یا ویسے ہی خاموشی سے انھیں قید میں ڈال دیا، جس کا لازمی نتیجہ اصل حقیقت نہ جاننے والوں کے لیے یہی تاثر تھا کہ آخر اس معاملے میں یوسف علیہ السلام کا کوئی قصور تو ہوگا جس کی وجہ سے انھیں جیل میں ڈالا گیا۔ یوسف علیہ السلام کو اپنے متعلق اس تاثر سے شدید قلق تھا، اس لیے آگے آپ دیکھیں گے کہ بادشاہ کے اپنے پاس بلائے کے پیغام کے باوجود یوسف علیہ السلام اس وقت تک قید خانے سے نہیں نکلے جب تک تمام متعلقہ عورتوں کو بادشاہ کے پاس حاضر کروا کے ان کی زبانی اپنی بے گناہی کی تصدیق نہیں کروائی۔ ایک مفسر نے لکھا ہے کہ اب اگر حکومت کسی دائمی یا خطیب کو حق بیان کرنے کے جرم میں قید کر دے اور پھر اللہ کی مدد سے کوئی حاکم اسے جیل سے نکالنے کا حکم دے تو اسے جیل میں اڑ کر نہیں بیٹھنا چاہیے، کیونکہ اس پر کوئی ایسا الزام نہیں جو اس کی بدنامی کا باعث ہو۔ وہی حق کی دعوت و تبلیغ تو وہ کوئی جرم نہیں بلکہ اس کا فرض ہے جو اس نے بعد میں بھی ادا کرتے رہنا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود بھی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے احسان، تقویٰ، صبر، وفا، خدمت، پاک بازی، عبادت الہی اور دوسری بے شمار خوبیوں کی وجہ سے عزیز مصر کے دل میں ان کی محبت یقیناً موجود تھی جس کی وجہ سے اس نے قید پر اکتفا کیا، ورنہ وہ کسی حیلے سے انھیں غائب بھی کروا سکتا تھا، جیسا بھائیوں نے کیا تھا اور قتل بھی کروا سکتا تھا، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا پہلا منصوبہ تھا، مگر ایک تو یوسف علیہ السلام کا تقویٰ اور صبر تھا اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا جو سب پر غالب ہے۔ جس کی وجہ سے قید ہی کا فیصلہ ہوا جس میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی حکمتیں تھیں۔

آیت 36 . وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيْنٌ "فَتَيْنِ" کی مشابہت ہے، دونوں جوان، یہ لفظ عام طور پر غلام یا خادم پر

قَالَ لَا يَا بُنَيَّ كَمَا طَعَّمُ تُرْمَرُ قَبْلَهُ إِلَّا نَبَاتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَلِكُمْ مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿۱۵﴾

اس نے کہا تمہارے پاس وہ کھانا نہیں آئے گا جو تمہیں دیا جاتا ہے، مگر میں تمہیں اس کی تعبیر اس سے پہلے بتا دوں گا کہ وہ تمہارے پاس آئے۔ یہ اس میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا۔ بے شک میں نے اس قوم کا دین چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت کے ساتھ بھی کفر کرنے والے ہیں ﴿۱۵﴾

بھی بول لیا جاتا ہے۔ یہ دونوں بادشاہ کے خاص خادم تھے، بہت جلد دونوں یوسف علیہ السلام کے حسن اخلاق سے متاثر اور ان سے مانوس ہو گئے۔ یوسف علیہ السلام کے ہر ایک کی بے لوث خدمت کرنے نے ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ یہ بندہ ہر ایک کی خیر خواہی اور خدمت کسی بھی معاوضے کی امید یا کسی طمع کے بغیر کرتا ہے، اسی کا نام احسان ہے اور ایسا کرنے والا احسن ہوتا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل نے قارون سے کہا تھا: ﴿وَأَحْسِنَ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾ [الفصص: ۷۷] ”اور احسان کر جیسے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے۔“ اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی نیکی اور ہمدردی کی وجہ سے ایسا شخص خود بخود ہی ہر ایک کی نگاہ میں آجاتا ہے کہ یہ نیک اور اچھا آدمی ہے۔ ہمارے نبی ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما میں یہ صفت بطور خاص پائی جاتی تھی، جیسا کہ نبی ﷺ کی صفات مثلاً دوسروں کا بوجھ اٹھانا، مہمان نوازی کرنا، مصیبت میں لوگوں کی مدد کرنا، لوگوں کے لیے ذریعہ معاش تلاش اور مہیا کرنا، سچ کہنا وغیرہ کی تصدیق ہماری ماں خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صفات کی تصدیق ابن دغنے نے کی۔

[بخاری، الوحي، كيف بدء الوحي: ۳، و مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ: ۳۹۰۰] یہ لوگ صرف نماز روزے ہی کے نیک نہ تھے، بلکہ اس کے ساتھ لوگوں کے خیر خواہ بھی تھے، یہی بندوں کے ساتھ احسان ہے۔ اب ان دونوں نے خواب دیکھا تو پوری جیل میں ان کی نگاہ صرف یوسف علیہ السلام پر پڑی اور انہوں نے تعبیر کے لیے انہی کو منتخب کرنے کی وجہ بھی صاف لفظوں میں بیان کر دی: ﴿يَسْتَأْتِيكُم بِتَأْوِيلِهِ ۚ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ یعنی آپ ہمیں اس کی تعبیر بتائیں، کیونکہ بے شک ہم آپ کو احسان کرنے والوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ خواب کی تعبیر بہت اچھی کرتے ہیں، شاید اس سے پہلے بھی یوسف علیہ السلام نے کچھ تعبیریں کی ہوں جو درست نکلی ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ علم خاص طور پر دیا تھا۔ احسان کے یہ دونوں معنی بندوں پر احسان کے ہیں، ایک احسان اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی ہوتا ہے جس کا ذکر حدیث جبریل میں ہے، فرمایا: ﴿أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ سَكَاتَكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ﴾ [بخاری، الإيمان، باب سؤال جبريل النبي ﷺ: ۵۰] ”تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، سو اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھتا ہے۔“ ہو سکتا ہے ان قیدیوں نے یوسف علیہ السلام کی نماز، عبادت اور ذکر الہی میں اللہ سے تعلق کو دیکھ کر ان کے محسن اور نیک ہونے کا یقین کر لیا ہو کہ ان کی عبادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص واقعی اس طرح توجہ اور محویت سے عبادت کر رہا ہے، گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔

آیت 37 ﴿۱﴾ قَالَ لَا يَا بُنَيَّ كَمَا طَعَّمُ یوسف علیہ السلام اس سے پہلے بھی اللہ کے دین اور توحید پر قائم تھے، قید میں

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي ابْرِهِيمَ وَاسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا اَنْ نُشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی ہے، ہمارے لیے ممکن ہی نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، یہ ہم پر اور لوگوں پر اللہ کے فضل سے ہے اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ﴿۳۸﴾

اللہ تعالیٰ نے یہ حکمت رکھی کہ دنیا کے معاملات سے فراغت اور خلوت نصیب ہوئی، ذکر و فکر کا موقع زیادہ ملا، کفار کے تعلق سے دل خالی ہوا تو سید علم نبوت کے نور سے اور زیادہ روشن ہو گیا۔ اب ان دونوں کو یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھنے کی ضرورت پڑی تو یوسف علیہ السلام نے ضروری سمجھا کہ پہلے انھیں توحید اور آخرت پر ایمان کی دعوت دیں، بعد میں خواب کی تعبیر بتائیں، اس لیے ان سے بات کا کچھ وقت لے لیا، مگر ساتھ ہی ان کی تسلی کر دی تاکہ وہ گھبرانہ جائیں، کہا کہ کھانا جو تمہیں دیا جاتا ہے، اس کے آنے سے پہلے پہلے میں تمہیں ہر حال میں تعبیر بتا دوں گا۔ کھانا آنے سے پہلے پہلے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کا وقت قریب ہی تھا۔

﴿۳۸﴾ ذٰلِكُمْ اَمْثَلُ عِلْمِي سَرِيٍّ..... : ”ذٰلِكُمْ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیں آیت (۳۲) یعنی خواب کی تعبیر ان علوم میں سے ایک علم ہے جو اللہ نے مجھے سکھائے ہیں، مثلاً شریعت، حکمت، معیشت، امانت وغیرہ۔ مطلب یہ کہ میں تعبیر اندازے اور انکل سے نہیں بلکہ حقیقی علم کے ساتھ کروں گا۔ مصر کے کاہن اور درباری مشیر علم تعبیر میں مہارت رکھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو یہ علم خاص طور پر عطا فرمایا، تاکہ وقت آنے پر ظاہر ہو کہ اللہ تعالیٰ کے نبی کو عطا کردہ علم میں اور دوسرے کسی بھی بڑے سے بڑے عالم کے علم میں کیا فرق ہوتا ہے، گویا یہ یوسف علیہ السلام کو عطا کردہ ایک معجزہ بھی تھا۔ یہاں یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا تھا کہ یہ علوم جن میں سے علم تعبیر بھی ہے، آپ کو کیسے حاصل ہوئے؟ اس کے جواب میں یوسف علیہ السلام نے اس پورے معاشرے میں سے اپنے پر اس نعمت کے اسباب بیان فرمائے، پھر ان کو نہایت حکیمانہ طریقے سے دعوت توحید دی۔ چنانچہ پہلی بات یہ فرمائی کہ یہ علوم مجھے میرے رب تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں، (”إِنِّي تَوَكَّلْتُ“ میں ”إِنِّي“ سبب بیان کرنے کے لیے ہے) اس لیے کہ میں نے ان لوگوں کی ملت اور ان کے دین کو ان میں رہنے اور جوان ہونے کے باوجود چھوڑے رکھا، کبھی اختیار ہی نہیں کیا، جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی وہ منکر ہیں، کیونکہ ایسے لوگ ان علوم کے لائق ہی نہیں ہوتے۔

آیت 38 ﴿۳۸﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي..... : پھر انھیں اپنا اور اپنے آباء کا تعارف کروایا، کیونکہ داعی کی شخصیت بھی دعوت قبول کرنے میں مددگار ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا کہ میں نے اپنے آباء ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کی ملت اور ان کے دین کی پیروی کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم کسی صورت اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک کریں، خواہ وہ آدمی ہو یا فرشتہ، جن ہو یا بھوت پری، بت ہو یا قبر، پتھر ہو یا درخت، چاند سورج ہوں یا ستارے، غرض کسی کو بھی ہم ہرگز اللہ کا شریک نہیں بنا سکتے۔ ”مَا كَانَ لَنَا“ میں نفی کی ”كَانَ“ کے ساتھ تاکید کا یہی معنی ہے۔ نیک آباء کی پیروی سعادت ہے،

يُصَاحِبِي السَّبْحِ ۚ أَرْبَابٌ مُتَّفَقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَنِيْتُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۗ إِنْ الْحُكْمُ إِلَّا

اے قید خانے کے دو ساتھیو! کیا الگ الگ رب بہتر ہیں یا اللہ، جو اکیلا ہے، نہایت زبردست ہے؟ ﴿٣٩﴾ تم اس کے سوا عبادت نہیں کرتے مگر چند ناموں کی، جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے بارے

جب کہ گمراہ آباء کی تقلید ضلالت ہے، جیسا کہ ان قیدیوں کو فرمایا: ﴿إِلَّا أَسْمَاءٌ سَنِيْتُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ﴾ یعنی اللہ کے سوا جس کی بھی تم عبادت کرتے ہو وہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء نے رکھ لیے ہیں، ایسے آباء کی پیروی گمراہی ہے۔ ﴿ذَلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا.....﴾: یعنی توحید کی یہ سمجھ عطا کرنا ہم پر اللہ کے بے شمار احسانوں میں سے ایک احسان ہے۔ ”وَعَلَى النَّاسِ“ اور لوگوں پر بھی احسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذریعے سے ان کو توحید سمجھانے کا انتظام فرمایا، لیکن اکثر لوگ اس نعمت کی قدر نہیں کرتے۔

آیت 39 ﴿يُصَاحِبِي السَّبْحِ﴾: ”صاحِبِي“ اصل میں ”صَاحِبِيْنِ“ تھا جو ”صَاحِبٌ“ (ساتھی) کی شنیہ ہے۔ ”السَّبْحِ“ کی طرف مضاف کیا تو نون شنیہ گر گیا اور یاء کو کسرہ دے کر آگے ملا دیا گیا، یہ یاء متکلم کی نہیں، اس لیے معنی ہے ”اے قید خانے کے دو ساتھیو!“ یہ الفاظ اکٹھے رہنے کی وجہ سے انس کا بھی اظہار کر رہے ہیں، کیونکہ کوئی قریب ہوتا ہے تو انس ہی سے ہوتا ہے جو دعوت کے لیے ضروری ہے، مگر درحقیقت ایک دوسرے سے الگ الگ ہونے کا بھی کہ ہم تم قید خانے میں اکٹھے رہنے والے ساتھی ہیں، اس کے باوجود اصل ساتھی نہیں، کیونکہ وہ تعلق صرف ایمان والوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

﴿أَرْبَابٌ مُتَّفَقُونَ خَيْرٌ.....﴾: مصر کے لوگوں کا دین اکثر زمانوں میں شرک یعنی متعدد معبودوں کی عبادت ہی رہا ہے، جیسا کہ تاریخ سے اور مصر کے آثار قدیمہ سے ظاہر ہوتا ہے اور اگر وہ بقول شخصے ایک رب کو مانتے بھی تھے تو دوسری تمام مشرک اقوام کی طرح اس کے تحت مختلف کاموں کا اختیار رکھنے والے کئی ارباب کی عبادت بھی کرتے تھے، کیونکہ ان کے ذہن اس شاہی نظام اور اس کے تحت جاگیر داری نظام سے آگے نہیں سوچ سکتے تھے جو ان پر مسلط تھا، جیسا کہ یونانیوں کے ہاں ہر کام کی الگ دیوی تھی۔ عراق والے بادشاہ کے ساتھ ساتھ سورج، چاند، ستاروں اور بتوں کی پرستش بھی کرتے تھے، جن سے ابراہیم علیہ السلام کو سابقہ پڑا، اس لیے یوسف علیہ السلام نے سب سے پہلے قید کے ساتھیوں کی عقل کو جھنجھوڑتے ہوئے یہی سوال کیا کہ بتاؤ کہ یہ الگ الگ رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو اکیلا ہے اور سب پر غالب اور زبردست ہے، کوئی اس کے آگے دم نہیں مار سکتا، نہ کوئی اس کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکتا ہے؟ مزید دیکھیے سورہ زمر (۲۹)، انبیاء (۲۲) اور بنی اسرائیل (۴۲) ظاہر ہے کہ عقل اگر درست ہو تو اکیلے، زبردست اور غالب رب ہی کو بہتر قرار دے گی۔

آیت 40 ﴿مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءٌ.....﴾: ان کے ذہن میں ایک رب اور کئی ارباب کے موازنے کی سوچ ابھارنے کے بعد اب صاف لفظوں میں کئی ارباب کا باطل ہونا بیان فرمایا کہ تم جن معبودوں کی عبادت کرتے ہو حقیقت میں وہ کہیں موجود ہی نہیں ہیں، محض فرضی اور خیالی چیزیں ہیں، جن کے نام تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لیے ہیں۔ حکم تو

لِلّٰهِ ۚ اَمْرًا لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ۗ ذٰلِكَ الَّذِيْنَ الْقِيَمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۰﴾
 يُصَاحِبِي السَّجْنِ اَمَّا اَحَدُكُمْ فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا ۗ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصَلِّبُ فَتَاكُلُ الطَّيْرُ
 مِنْ رَاسِهِ ۗ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِي فِيْهِ تَسْتَفْتِيْنَ ﴿۵۱﴾ وَاَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا
 اذْكَرْتَنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۗ فَانْسَسَهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَيْثَ فِي السَّجْنِ يَضَعُ سِنِّيْنَ ﴿۵۲﴾

کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت مت کرو، یہی سیدھا دین ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۵۰﴾ اے قید خانے کے دو ساتھیو! تم میں سے جو ایک ہے سو وہ اپنے مالک کو شراب پلانے کا اور جو دوسرا ہے سو اسے سولی دی جائے گی، پس پرندے اس کے سر میں سے کھائیں گے۔ اس کام کا فیصلہ کر دیا گیا جس کے بارے میں تم پوچھ رہے ہو ﴿۵۱﴾ اور اس نے اس سے کہا جس کے متعلق اس نے سمجھا تھا کہ وہ دونوں میں سے رہا ہونے والا ہے کہ اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا۔ تو شیطان نے اسے اس کے مالک سے ذکر کرنا بھلا دیا تو وہ کئی سال قید خانے میں رہا ﴿۵۲﴾

اللہ کے سوا کسی کا ہے ہی نہیں، نہ قدری حکم نہ شرعی، یعنی نہ کائنات کے نظام میں اس کے سوا کسی کا کوئی حکم چلا ہے، مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ سورج کو چلنے کا حکم دے اور یہ اسے روک دے، یا وہ کسی کو مارنا چاہے اور یہ اسے مرنے نہ دے اور نہ شریعت اور عبادت میں اس کے سوا کسی کو اپنا حکم چلانے کی اجازت ہے، اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت مت کرو، یہی سیدھا اور محکم و مضبوط دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، اس لیے وہ شرک کے گورکھ دھندے میں پڑے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کی یہ تقریر طرہ ابراہیم، یعنی اسلام کی بہترین مختصر ترجمانی ہے۔

آیت 41 ﴿۱﴾ يُصَاحِبِي السَّجْنِ: تعبیر بیان کرتے وقت یوسف علیہ السلام کے حسن ادا کو ملاحظہ فرمائیں، ایک تو دونوں میں سے ایک کو متعین کر کے نہیں فرمایا کہ تیرے خواب کا یہ نتیجہ ہے اور تیرے خواب کا یہ، حالانکہ جواب سے ظاہر تھا کہ ساتی نے عہدے پر بحال ہوتا ہے اور دوسرے نے سولی چڑھنا ہے، بلکہ فرمایا تم میں سے ایک کی تعبیر یہ ہے اور ایک کی یہ۔ پھر اس بات کو بھی سامنے رکھیے کہ پہلے وہ تعبیر بتائی جو خوش خبری والی تھی، دوسری بعد میں بتائی۔ مقصد یہ تھا کہ دل ٹکنی میں جتنی بھی دیر ہو سکے گی جائے اور خوشی کی خبر جتنی جلد ہو سکے پہنچائی جائے۔

﴿۲﴾ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِي فِيْهِ تَسْتَفْتِيْنَ: یعنی یہ فیصلہ ہو چکا جو اب ٹل نہیں سکتا ہے۔ یہاں لفظ ”قُضِيَ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلی آیت میں جو لفظ ”ظَنَّ“ آ رہا ہے وہ یہاں یقین کے معنی میں ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ خواب کی تعبیر اجتہادی ظن تھا، لہذا یہ ظن اصلی معنی میں ہے۔ (ابن کثیر، روح المعانی) موضع میں ہے: ”ظَنَّ“ فرمایا، معلوم ہوا کہ تعبیر خواب یقین نہیں انکل ہے، مگر پیغمبر انکل کرے تو بے شک ہے، یعنی انکل نہیں ہے۔“

آیت 42 ﴿۱﴾ وَاَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلْنَ سَبْعَ عِجَافٍ وَ سَبْعَ سُنبُلَاتٍ حُمْرٍ
وَأُخْرَى بَيْسَتٍ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُءْيَايَ إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُونَ ﴿۳۱﴾

اور بادشاہ نے کہا بے شک میں سات موٹی گائیں دیکھتا ہوں، جنھیں سات دبلی کھاری ہیں اور سات سبز خوشے اور کچھ
دوسرے خشک (دیکھتا ہوں)، اے سردارو! مجھے میرے خواب کے بارے بتاؤ، اگر تم خواب کی تعبیر کیا کرتے ہو ﴿۳۱﴾

ہے، کس قدر تکلیف دہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جیسے صابر شخص نے اس آدمی سے کہا جس کے متعلق انھوں نے سمجھا تھا کہ وہ رہا
ہونے والا ہے کہ اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا کہ کس طرح ایک شخص بلا جرم قید میں بند ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت
سے نکلنے کے لیے دنیا کے جو اسباب اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں انھیں اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں، جیسا کہ: ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى
النِّيرِ وَالتَّقْوَى﴾ [المائدة: ۲] (نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو) سے ظاہر ہے اور جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:
﴿مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ﴾ [آل عمران: ۵۲] ”اللہ کی طرف میرے مددگار کون ہیں؟“ اور رسول اللہ ﷺ نے طائف سے
واپسی پر مطعم بن عدی کی طرف پیغام بھیجا، پھر اس کی پناہ میں مکہ میں داخل ہوئے، بلکہ مسلمان کو دنیا کا ہر جائز سبب اختیار کرنا
چاہیے، فرمایا: ﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ﴾ [الأنفال: ۶۰] یعنی ان کفار کے لیے جس قدر تمھاری استطاعت ہے
تیاری رکھو، البتہ بھروسا اس کے بعد بھی اللہ ہی پر ہوگا۔

② شیطان نے اس ساقی کو اپنے مالک یعنی بادشاہ کے پاس یہ ذکر کرنا بھلا دیا، سو یوسف علیہ السلام کئی سال قید میں رہے۔ شیطان
کی آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد سے دشمنی کا تو قرآن شاہد ہے: ﴿إِنَّ لَكُمْ عِدًّا وَهُمِينًا﴾ [البقرة: ۱۶۸] ”بے شک وہ تمھارا
کھلا دشمن ہے۔“ اور قرآن نے صراحت کی ہے کہ ساقی کو بھلانا شیطان کا کام تھا، اس کے باوجود بعض اہل علم نے ساقی کو
بادشاہ کے پاس اپنا ذکر کرنے کے لیے کہنا یوسف علیہ السلام کی عزیمت اور شان بیغیبری کے خلاف قرار دیا ہے اور اتنے سال جیل
میں رہنے کا باعث یہ قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ یوسف علیہ السلام کا دل اسباب پر نہ ٹھہرے۔ اس سلسلے میں یہ حضرات
وہ روایت بھی پیش کرتے ہیں جو ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر یوسف علیہ السلام وہ
بات نہ کہتے جو انھوں نے کہی تو اتنی لمبی مدت قید میں نہ رہتے، کیونکہ انھوں نے غیر اللہ کے ہاں سے مصیبت دور کروانا
چاہی۔“ حافظ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”یہ روایت نہایت ضعیف ہے، کیونکہ اس کا راوی سفیان بن کعب ضعیف ہے اور (اس کا
شیخ) ابراہیم بن یزید (الجوزی) اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔“

③ ﴿فَلَيْسَ فِي السِّجْنِ بِضَعْفٍ سِتْرِينَ﴾: ”بضع“ کا لفظ تین سے لے کر نو تک کے لیے آتا ہے۔ قرآن و سنت میں اس مدت
کی تعبیر کہیں نہیں آئی۔ تابعین میں سے کسی نے سات سال کہا، کسی نے کم و بیش، مگر اب ان سے کون پوچھے کہ آپ کو کس نے
یہ مدت بتائی، اگر نبی امراہل سے آئی ہے تو اس پر تو اعتبار ممکن نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ہم نہ اسے سچا
کہہ سکتے ہیں نہ جھوٹا۔ سواصل یہی ہے کہ وہ مدت دس سال سے کم تھی اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی تھی۔

﴿۳۱﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى مصر کے بادشاہ کا یہ خواب اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں یوسف علیہ السلام کی قید سے

قَالُوا أَصْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ﴿۳۴﴾ وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا
وَإِذْ كَرَّ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنْتَكُمُ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿۳۵﴾

انہوں نے کہا یہ خوابوں کی پریشان باتیں ہیں اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر بالکل جاننے والے نہیں ﴿۳۴﴾ اور ان دونوں میں سے جو رہا ہوا تھا اور اسے ایک مدت کے بعد یاد آیا، اس نے کہا میں تمہیں اس کی تعبیر بتاتا ہوں، سو مجھے بھیجو ﴿۳۵﴾

عزت و تکریم کے ساتھ رہائی کا سبب تھا، اس خواب نے شاہ مصر کو نہایت خوف زدہ اور پریشان کر دیا، چنانچہ اس نے اپنے علم تعبیر کے تمام ماہروں اور سب سرداروں کو جمع کر کے خواب سنایا اور تعبیر کی فرمائش کی۔

﴿۲﴾ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْئُونِي فِي رُؤْيَايَ : اس سے معلوم ہوا کہ خواب کی تعبیر بھی فتویٰ کا حکم رکھتی ہے، جس طرح فتویٰ علم کے بغیر جائز نہیں، خواب کی تعبیر کا بھی اگر فی الواقع علم ہو تو بتانی چاہیے، ورنہ علم کے بغیر تعبیر کرنے والے اس حدیث کے مصداق ہوں گے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَلَكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتَّىٰ إِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوسًا جُهَالًا، فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا» [بخاری، العلم، باب كيف يقبض العلم: ۱۰۰] ”اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح قبض نہیں کرے گا کہ اسے علماء کے سینے سے نکال لے، بلکہ علم کو علماء کے فوت کر لینے کے ساتھ قبض کرے گا، یہاں تک کہ جب وہ کسی عالم کو باقی نہیں چھوڑے گا تو لوگ جاہل سردار بنالیں گے، پھر ان سے سوال کیے جائیں گے تو وہ علم کے بغیر فتویٰ دیں گے، سو خود گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو گمراہ کریں گے۔“ اس حدیث سے تک بندی اور انکل بچو سے تعبیر بتانے والے اپنا انجام سوچ لیں۔

﴿۳﴾ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کو اپنے درباریوں سے امید نہ تھی کہ وہ اس خواب کی تعبیر کر سکیں گے، اسی لیے کہا: ”اگر تم خواب کی تعبیر کیا کرتے ہو۔“

آیت 44 قَالُوا أَصْغَاثُ أَحْلَامٍ : ”أَصْغَاثُ“ ”صِغْفُ“ کی جمع ہے، آپ گھاس کا ایک مٹھا اکھاڑیں، اس میں ملا جلا جو کچھ ہاتھ میں آئے اسے ”صِغْفُ“ کہتے ہیں، یعنی یہ خوابوں کی ملی جلی پریشان باتیں ہیں، کوئی مرتب یا واضح خواب نہیں اور ایسے خوابوں کی تعبیر ہم نہیں جانتے۔ علم تعبیر میں مہارت کے دعوؤں کو قائم رکھنے کے لیے انہوں نے خواب ہی کو پریشان خیالوں کا مجموعہ قرار دے دیا، جیسا کہ کہادت ہے ”ناچ نہ جانے آنگن میڑھا۔“

آیت 45 وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَإِذْ كَرَّ بَعْدَ أُمَّةٍ وَأَذْكَرُ : ”أَذْكَرُ“ ”ذَكَرُ يَذْكُرُ“ (ن) سے باب افتعال ہے، اصل میں ”أَذْكَرُ“ تھا، پھر افتعال کی تاہ کو دال اور اس کے ساتھ ہی ذال کو بھی دال میں بدل کر ”أَذْكَرُ“ کر دیا، بمعنی یاد کیا۔ ”أُمَّةٍ“ کے کئی معانی ہیں جن میں سے ایک معنی مدت بھی ہے، تنوین تعظیم کے لیے ہے، یعنی اس وقت ساتی کو جس نے یوسف علیہ السلام کی تعبیر کے بعد قید سے رہائی پائی تھی اور یوسف علیہ السلام کے کہنے کے باوجود سرے سے ان کی بات بھول چکا تھا، اتنی لمبی مدت کے بعد یوسف علیہ السلام اور ان کی علم تعبیر میں مہارت یاد آئی اور اس نے کہا میں تمہیں اس کی تعبیر بتاتا ہوں، آپ مجھے بھیجیں، چنانچہ

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سَوَانٍ يَا كَاهِنَ سَبْعِ عَجَافٍ وَ سَبْعِ
سُئْبَلَتِ خُضْرٍ وَ أَخْرَ يُوسُفُ لَا لَعَلَّ أَرْجِعَ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۳۷﴾

یوسف! اے نہایت سچے! ہمیں سات موٹی گائیوں کی تعبیر بتا، جنہیں سات دبلی کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشوں اور
دوسرے خشک خوشوں کی بھی، تاکہ میں لوگوں کے پاس واپس جاؤں، تاکہ وہ جان لیں ﴿۳۷﴾

اسے اجازت مل گئی اور وہ یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا۔

② اس ساقی کے رویے سے سرکاری و درباری کارندوں کے کردار پر بھی بڑی روشنی پڑتی ہے کہ وہ ہمیشہ کریڈٹ کے چکر میں
رہتے ہیں۔ (الامشاء اللہ) اس کا یہ کہنا حقیقت سے کس قدر دور تھا کہ میں تمہیں تعبیر بتاتا ہوں، اس کا حق تھا کہ اپنے محسن کا
ذکر کرتا، انہیں عزت سے بلواتا اور بادشاہ سے درخواست کرتا کہ ان سے تعبیر پوچھیں، مگر وہ اس چکر ہی سے نہیں نکلا کہ ”میں
تمہیں بتاتا ہوں۔“ کتنے ہی سرکاری افسر اور سرمایہ دار ہیں جو دوسروں کی علمی محنت کو اپنے نام لگا کر ڈگریاں حاصل کرتے یا
اپنی علمی شان کا سکہ جھاتے ہیں، مگر یہ سب بے چارے اسی مرض کے مریض ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بعض اہل کتاب کا بتایا ہے:
﴿وَيُعِينُونَ أَنْ يُخْتَدُوا بِإِنْسَانٍ يُفَعَّلُونَ فَلَا تَحْسَبَنَّ لَهُمْ بِمَفَارِقَةٍ مِنَ الْعَذَابِ تَوَلَّوْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ [آل عمران: ۱۸۸]
”اور وہ پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف ان (کاموں) پر کی جائے جو انہوں نے نہیں کیے، پس تو انہیں عذاب سے بچ نکلنے
میں کامیاب ہرگز خیال نہ کر اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

آیت 46

① يُّوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ: ”يُّوسُفُ“ سے پہلے حرف ندا ”يَا“ وغیرہ محذوف ہے، جس کی وجہ سے یہ
مبنی علی الضم ہے۔ ”الصِّدِّيقُ“ ”صَدِّيقُ“ کے اسم فاعل میں مبالغہ ہے جو ہر حال میں اپنے قول، فعل اور حال کا سچا ہو، جس
کی عادت ہی ہر حال میں سچ ہو، اس کا قول سچ ہو اور اس کا فعل اور حال بھی اس کے مطابق ہو۔ صدیقیت کے کئی درجے ہیں،
مومن بھی صدیق ہے، مقابلہ کافر (دیکھیے حدید: ۱۹) اور ابوبکر بھی صدیق ہیں اور امت میں اس درجے کا کوئی صدیق نہیں۔
ابراہیم اور ادریس علیہ السلام کے بارے میں سورہ مریم (۵۶، ۵۷) میں ”صِدِّيقًا نَبِيًّا“ آتا ہے، یوسف علیہ السلام بھی صدیق ہیں۔ ساقی
کو ان کا صدیق ہونا تعبیر سے پہلے بھی مشاہدے سے ثابت ہو چکا تھا، اسی لیے انہوں نے کہا: ﴿إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾
[یوسف: ۳۶] پھر تعبیر کے بعد عین اسی طرح واقع ہونے سے ان کے صدیق ہونے کی مزید تصدیق ہو گئی۔

② یہاں ساقی کا رویہ دیکھیں کہ اس کی طرف سے بھول جانے کی معذرت کا کوئی ذکر نہیں اور یوسف علیہ السلام کے سینے کی وسعت
دیکھیں، پوچھا ہی نہیں کہ تمہیں اتنی دیر یوسف صدیق یاد نہ آیا، اب کیا لینے آئے ہو۔ غرض کے بندوں اور محسنین کا یہی فرق ہے۔

③ ساقی نے خواب دیکھنے والے کا ذکر نہیں کیا، البتہ خواب عین انہی الفاظ میں بیان کیا جو بادشاہ کے تھے، کیونکہ ایک لفظ کے
فرق سے بھی مطلب کچھ اور بن جاتا ہے۔ قرآن میں دونوں جگہ خشک گائیوں کے موٹی گائیوں کو کھانے کا ذکر تو ہے مگر خشک
خوشوں کے سبز خوشوں پر لپٹنے کا ذکر مفسرین نے کہاں سے لیا ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ساقی نے درخواست کی کہ آپ

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَابًّا ۖ فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَحْصِنُونَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ يُعَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْرِضُونَ ﴿۴۹﴾

اس نے کہا تم سات سال پے در پے کاشت کرو گے تو جو کاٹو اسے اس کے خوشے میں رہنے دو، مگر تھوڑا سا وہ جو تم کھا لو ﴿۴۷﴾ پھر اس کے بعد بہت سخت سات برس آئیں گے، جو کھا جائیں گے جو کچھ تم نے ان کے لیے پہلے رکھا ہوگا مگر تھوڑا سا وہ جو تم محفوظ رکھو گے ﴿۴۸﴾ پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں پر بارش ہوگی اور وہ اس میں نچوڑیں گے ﴿۴۹﴾

ہمیں اس خواب کے بارے میں فتویٰ دیں (تعبیر بتائیں) لوگ منتظر ہیں، تاکہ میں جا کر انھیں بتاؤں اور وہ بھی جان لیں۔

آیت 47 ﴿۴۷﴾ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَابًّا.....: ”دَابًّا“ ”تَزْرَعُونَ“ کی ضمیر سے حال ہے، یعنی ”ذَاتَيْنِ“ مسلسل پے در پے محنت سے کاشت کرنے والے۔ یوسف علیہ السلام نے تعبیر کے ساتھ ہی حل بھی بتایا۔ یہاں ”تَزْرَعُونَ“ بمعنی ”زَرَعُوا“ ہے، یعنی ”سات سال مسلسل محنت سے کاشت کرو“ کیونکہ آگے آرہا ہے کہ جو کچھ کاٹو اسے سٹوں میں رہنے دو۔ زیادہ تاکید کرنی ہو تو امر کو مضارع کی صورت میں لاتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ﴾ [البقرة: ۸۳] ”اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے۔“ آج سے ہزاروں سال پہلے یوسف علیہ السلام نے گندم کو گھن، سسری اور کیزے وغیرہ سے محفوظ رکھنے کا بہترین طریقہ بتایا، جدید ترین محققین بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

﴿۴۸﴾ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ: یعنی خوشوں سے صرف اتنی گندم صاف کرو جو کھانی ہے اور وہ بھی کم از کم، تاکہ زیادہ سے زیادہ محفوظ رہ سکے اور ان سات سالوں میں آدمیوں کے علاوہ گھس بھی جانوروں کے کام آسکے۔ کم کھانے کی تاکید پر طب اور شرع دونوں متفق ہیں۔ اس کی حد ہمارے رسول کریم ﷺ نے تو چند لقمے بیان فرمائی، فرمایا: ﴿فَإِنْ كَانَ لَا مَحَالَةَ فَذَلَّتْ لَطْعَامِيهِ وَتَلَّتْ لِشَرَابِهِ وَتَلَّتْ لِنَفْسِهِ﴾ [ترمذی، الزهد، باب ما جاء في كراهية كثرة الأكل: ۲۳۸۰، و صححه الألبانی] ”اگر ضرور ہی زیادہ کھانا ہو تو پیٹ کا ایک حصہ کھانے، ایک پینے اور ایک سانس کے لیے رکھو۔“

آیت 48 ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ.....: ”تَحْصِنُونَ“ ”حِصْنٌ“ قلعے کو کہتے ہیں، مراد حفاظت سے رکھنا ہے، یعنی خوش حالی کے سات سالوں کا ذخیرہ تم لوگ قحط کے سات سالوں میں چٹ کر جاؤ گے، مگر وہ تھوڑا سا جو تم آئندہ سال کے بچ کے لیے بڑی محنت سے بچا کر محفوظ رکھو گے۔

آیت 49 ﴿۴۹﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ.....: ”يُعَاثُ“ ”عَيْثُ“ سے بھی ہو سکتا ہے اور ”عَوْتُ“ سے بھی۔ ”عَيْثُ“ سے ہو تو بارش برسائے جائیں گے اور ”عَوْتُ“ سے ہو تو مدد کیے جائیں گے۔ ”يَعْرِضُونَ“ ”نچوڑیں گے“ یعنی اس سال

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۗ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ اِلَىٰ رَبِّكَ فَسْأَلُهُ مَا بَالُ
النِّسْوَةِ الَّتِي قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۗ اِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿۵۰﴾

اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ، تو جب قاصد اس کے پاس آیا تو اس نے کہا اپنے مالک کے پاس واپس جا، پھر اس سے پوچھ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، یقیناً میرا رب ان کے فریب کو خوب جاننے والا ہے ﴿۵۰﴾

وہ بھل جن سے رس نکلتا ہے، مثلاً انگور، لیموں وغیرہ اور وہ بیج جن سے تیل نکلتا ہے، مثلاً زیتون، سرسوں وغیرہ کثرت سے پیدا ہوں گے اور جانور بھی اچھا چارا ملنے کی وجہ سے خوب دودھ دیں گے۔ اس بنا پر بعض نے ”يَحْمِلُونَ“ کے معنی ”يَحْمِلُونَ“ (دودھ دوہیں گے) کہے ہیں۔ یہ بات کہ قحط کے سات سالوں کے بعد ایک خوش حالی کا سال آئے گا، خواب سے زائد بتائی، یا توحی الہی کے ذریعے سے، یا خشک سالوں کی کئی سات ہونے سے استدلال فرمایا کہ وہ سات تہی رہتے ہیں جب ان کے بعد کم از کم ایک خوش حالی کا سال ہو اور اس سے بھی کہ اللہ کی رحمت کا تقاضا بھی شدت کے بعد آسانی کا ہے۔

﴿۵۰﴾ اس سے معلوم ہوا کہ کبھی کافر کا خواب بھی سچا ہوتا ہے، اگر بادشاہ کا کافر ہونا ثابت ہو۔ اس سے پہلے دونوں قیدی جو مشرک تھے، ان کے خواب بھی سچے نکلے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ”كِتَابُ التَّعْبِيرِ“ میں اس سے یہ استدلال فرمایا ہے: ”بَابُ رُؤْيَا أَهْلِ السُّحُورِ وَالْفَسَادِ وَالشِّرْكِ“ ”قیدیوں اور اہل شرک وفساد کے خواب کا بیان۔“

آیت 50 ﴿۱﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ : یعنی جب ساتی نے جا کر تعبیر بتائی تو بادشاہ نے کہا: ”اسے میرے پاس لاؤ۔“ اس سے علم کی تفصیلت معلوم ہوتی ہے کہ حسن بے مثال قید اور مصیبت کا باعث بنا اور علم رہائی کا۔ دنیا میں جب یہ حال ہے تو آخرت میں علم نافع کی برکتوں کا آپ خود اندازہ فرمائیں۔

﴿۲﴾ قَالَ ارْجِعْ اِلَىٰ رَبِّكَ : یوسف علیہ السلام نے قید سے نکل کر قاصد کے ساتھ جانے کے بجائے مطالبہ کیا کہ واپس جاؤ اور بادشاہ سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، یقیناً میرا رب ان کے فریب کو خوب جاننے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کا خیال تھا کہ شاید بادشاہ کو میرے قید میں بھیجے جانے یا عورتوں کے فریب کے معاملے کا علم ہی نہ ہو، دوسرے وزیروں نے از خود ہی یہ سب کچھ کیا ہو، یا اگر علم ہو تو جس طرح بدنام کر کے قید کیا گیا اسی کے مطابق علم ہو۔ اسی طرح عام لوگوں میں بھی ممکن ہے کچھ لوگ ان کا قصور سمجھتے ہوں، اس لیے انہوں نے جب تک تحقیق کے ساتھ تہمت سے ہر طرح صفائی نہ ہو، قید سے نکلنے سے انکار کر دیا۔ ہمارے رسول کریم ﷺ نے یوسف علیہ السلام کے صبر کی تعریف فرمائی، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَوْ لَبِثْتُ فِي السَّجْنِ مَا لَبِثْتُ يُوْسُفُ ثُمَّ اَتَانِي الدَّاعِي لِأَجْبَتِهِ﴾ [بخاری، التعبير، باب رؤيا أهل السحور والفساد والشرك: 6992] ”اگر میں اتنی مدت قید خانے میں رہتا جتنی مدت یوسف علیہ السلام رہے، پھر میرے پاس بلانے والا آتا تو میں ضرور اس کی دعوت قبول کرتا۔“

قَالَ مَا خَطْبُكَ إِذْ رَاوَدْتَن يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ النَّ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۵۱﴾ ذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي

اس نے کہا تمہارا کیا معاملہ تھا جب تم نے یوسف کو اس کے نفس سے پھسلا یا؟ انہوں نے کہا اللہ کی پناہ! ہم نے اس پر کوئی برائی معلوم نہیں کی۔ عزیز کی بیوی نے کہا اب حق خوب ظاہر ہو گیا، میں نے ہی اسے اس کے نفس سے پھسلا یا تھا اور بلاشبہ وہ یقیناً چوں سے ہے ﴿۵۱﴾ یہ اس لیے کہ وہ جان لے کہ میں نے عدم موجودگی میں اس کی

﴿۵۱﴾ یوسف علیہ السلام نے جو مطالبہ کیا کہ ”بادشاہ سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، میرا رب ان کے فریب کو خوب جاننے والا ہے“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اپنے ہاتھ کاٹنے والی عورتوں کا یہ فعل (عزیز کی بیوی ہاتھ کاٹنے والیوں میں شامل نہیں تھی) یوسف علیہ السلام کے حسن سے بے خود ہو کر بے اختیاری میں نہیں ہوا، بلکہ یہ باقاعدہ ان کی سازش اور فریب تھا، جیسا کہ میں نے اس سے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔

آیت 51 قَالَ مَا خَطْبُكَ إِذْ رَاوَدْتَن : بادشاہ نے ان تمام خواتین کو طلب کر لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں وہ معاملے کی پوری تحقیق کر چکا تھا اور یوسف کی بے گناہی اور عورتوں کے فریب سے آگاہ ہو چکا تھا، اس لیے اس نے یہ نہیں کہا کہ تمہارا قصور تھا یا یوسف کا، بلکہ ان سے پہلا سوال ہی یہ کیا کہ جب تم نے یوسف علیہ السلام کو اس کے نفس سے پھسلا یا تھا، تمہارے اس معاملے کی حقیقت کیا تھی؟ یعنی آخر اس کا کیا جرم تھا جس کی وجہ سے اسے اتنی دیر قید خانے میں رکھا گیا؟ وہ سب بیک زبان بولیں: ”اللہ کی پناہ! ہم نے اس پر کوئی برائی معلوم نہیں کی۔“ ہاتھ کاٹنے والیوں نے جب یوسف علیہ السلام کو کسی بھی قسم کی برائی سے پاک قرار دیا تو ہاتھ نہ کاٹنے والی عزیز مصر کی بیوی کو بھی بولنا پڑا، اس نے کہا، اب تو حق بالکل ظاہر ہو گیا، میں نے ہی اسے اس کے نفس سے پھسلا یا تھا اور یقیناً وہ چوں سے ہے۔

آیت 52 ذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ : عزیز مصر کی بیوی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں یہ اعتراف اس لیے کر رہی ہوں کہ اس کو (میرے خاندان کو) معلوم ہو جائے کہ اس کی عدم موجودگی میں میں نے فی الواقع اس کی خیانت نہیں کی اور نہ بڑی برائی واقع ہوئی ہے، ہاں، میں نے اس جو ان کو پھسلا یا تھا، مگر اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس لیے میں اعتراف کر رہی ہوں، تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ میں نے بڑی خیانت کا ارتکاب نہیں کیا اور اللہ خیانت کرنے والوں کی چال کو کامیاب نہیں کرتا۔ ہاں، میں اپنے آپ کو بالکل بری بھی نہیں کہتی، کیونکہ نفس برائی کی خواہش کرتا اور اس پر ابھارتا ہے، سوائے اس کے جس پر میرا رب رحم کرے اور اسے بچالے، بے شک میرا رب غفور و رحیم ہے۔ جس پر میرا رب رحم کرے، مراد یوسف علیہ السلام ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”یہی قول زیادہ مشہور اور قصے کے سیاق اور کلام کے معنی و مفہوم کے زیادہ لائق اور مناسب ہے۔“ ماوردی نے اپنی تفسیر میں یہی بیان کیا ہے اور غلامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسی کی تائید کی ہے اور اس پر ایک

کَيْدَ الْخَائِنِينَ ﴿۵۶﴾

خیانت نہیں کی اور یہ کہ اللہ خیانت کرنے والوں کی چال کو کامیاب نہیں کرتا ﴿۵۶﴾

مستقل کتاب لکھی ہے۔

بعض اہل علم نے فرمایا کہ یہ قول عزیز کی بیوی ہی کا ہے مگر ”لِيُعَلِّمَهُ“ سے مراد یہ ہے کہ یوسف کو معلوم ہو جائے، جب کہ وہ قید خانے میں ہے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی، نہ اسے کسی طرح مجرم بنایا ہے، بلکہ اپنی کوتاہی کا ہی اعتراف کیا ہے۔ یہ معنی ایک لحاظ سے زیادہ قریب ہے کہ عزیز کا اس سارے سلسلہ کلام میں ذکر ہی نہیں۔ البتہ قریب ترین شخص جس کا ذکر اس نے کیا وہ یوسف عليه السلام ہیں: ﴿أَنَا زَاوِيَةٌ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۶﴾ ذٰلِكَ لِيُعَلِّمَهُ ﴿۵۷﴾ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ کلام ﴿ذٰلِكَ لِيُعَلِّمَهُ اِنِّي لَمَرَاۤءٌ خٰنَةٌ﴾ یوسف عليه السلام کا کلام ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے صرف یہی قول بیان کیا ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب ان عورتوں نے یوسف عليه السلام کے ہر برائی سے پاک ہونے کی شہادت دی اور عزیز کی بیوی نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کیا تو یوسف عليه السلام نے فرمایا کہ میں اس معاملے کی تحقیق تک قید خانے سے اس لیے نہیں نکلتا کہ عزیز مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی، ساتھ ہی تواضع کے طور پر فرمایا کہ میں اپنے آپ کو بالکل گناہ سے پاک نہیں کہتا، کیونکہ نفس تو یقیناً برائی پر ابھارتا ہے مگر جس پر میرا رب رحم کرے۔ ابن کثیر رحمته فرماتے ہیں: ”پہلا قول (یعنی) ”الَّذِي خَصَّصَ الْحَقُّ“ سے ”خَفُوْا زَجْرَهُمْ“ تک یہ سارا کلام عزیز کی بیوی کا ہے) ہی زیادہ قوی اور ظاہر ہے، کیونکہ (ان خواتین اور) عزیز کی بیوی کی ساری گفتگو بادشاہ کی مجلس میں ہوئی ہے اور اس وقت یوسف عليه السلام وہاں موجود نہیں تھے، بلکہ بادشاہ نے اس کے بعد انھیں بلوایا ہے۔“

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے اعتراف کیا تو ایک شخص نے قید خانے میں جا کر یوسف عليه السلام کو یہ بات بتائی تو انھوں نے فرمایا: ﴿ذٰلِكَ لِيُعَلِّمَهُ اِنِّي لَمَرَاۤءٌ خٰنَةٌ.....﴾ مگر یہ بات ہمارے پاس نہ قرآن مجید میں ہے، نہ حدیث رسول ﷺ میں اور اگر ان دونوں کے علاوہ اس خبر کا کوئی اور ذریعہ ہے تو اس کے سچ جھوٹ معلوم ہونے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔

رہی یہ بات کہ عزیز کی بیوی رب تعالیٰ اور اس کی صفات غفور و رحیم ہونے کا ذکر کیسے کر سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یوسف عليه السلام کے زمانے کا بادشاہ مصر کے فرعونوں سے پہلے کا ہے اور ساری سورت میں بادشاہ یا اس کے وزراء میں سے کسی کے کفر کی تصریح کہیں نہیں، ہاں عوام میں شرک موجود تھا، جیسا کہ جیل کے خواب دیکھنے والے تھے۔ عزیز مصر نے بھی اپنی بیوی کو گناہ سے استغفار کرنے کی تلقین کی تھی اور ایک مشرک جبار بادشاہ یوسف عليه السلام جیسے شخص کا کبھی اتنا اکرام و اعزاز نہیں کر سکتا، جس کا حکم کھلا کہنا ہو کہ میں نے اس قوم کی ملت کو ترک کر رکھا ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتی۔ ورنہ موسیٰ عليه السلام میں حسن ظاہر کے استثناء کے ساتھ یوسف عليه السلام کے کمالات سے کچھ زیادہ ہی کمالات ہوں گے، مگر اسی مصر کے ایک بادشاہ (فرعون) نے انھیں اور ان کی قوم کو مسلسل عذاب میں رکھا، حتیٰ کہ فرعون کو سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ [وَاللّٰهُ اَعْلَمُ وَجَلْمُنْ اُنْمُ]

وَمَا أَبْزَيْ نَفْسِي ۖ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ۗ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۵۳﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ انْتُونِي بِهِ ۖ اسْتَخْلَصَهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿۵۴﴾

اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، بے شک نفس تو برائی کا بہت حکم دینے والا ہے مگر جس پر میرا رب رحم کرے۔ بے شک میرا رب بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۵۳﴾ اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ کہ میں اسے اپنے لیے خاص الخاص کر لوں، پھر جب اس نے اس سے بات کی تو کہا بلاشبہ تو آج ہمارے ہاں صاحب اقتدار، امانت دار ہے ﴿۵۴﴾

آیت 53 ﴿۵۳﴾ وَمَا أَبْزَيْ نَفْسِي..... : یہ عزیز مصر کی بیوی کے کلام کا آخری حصہ ہے۔ گویا عزیز مصر کی بیوی یہ کہنا چاہتی ہے کہ میں نے پیٹھ پیچھے اپنے خاوند کی کوئی بڑی خیانت نہیں کی، بے شک میں نے یوسف کو پھسلانا چاہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکی، ہاں میں اپنے آپ کو پاک باز قرار نہیں دیتی، مجھ سے جتنی غلطی ہوئی اس کا اقرار و اعتراف کرتی ہوں، نفس کی شرارتوں سے تو وہی محفوظ رہ سکتا ہے جس پر اللہ کی خاص رحمت ہو (مراد یوسف علیہ السلام ہیں)۔

﴿۵۴﴾ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز مصر کی بیوی اللہ تعالیٰ کو اور اس کی صفات غفور و رحیم کو مانتی تھی اور نیکی اور گناہ کو بھی سمجھتی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کا قول نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ تو کافرہ تھی۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو اس کے کفر کی کوئی دلیل ہمارے سامنے نہیں اور اگر ہو بھی تو مکہ کے کافر اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے، زنا اور دوسرے قبائح کو گناہ سمجھتے تھے، پھر بھی مشرک تھے۔ آج کل بے شمار کلمہ گو آپ کو ایسے مل جائیں گے جو اللہ کو مانتے، اس سے استغفار کرتے اور گناہ کو گناہ سمجھتے ہیں، مگر پھر بھی سر تا پا شرک میں مبتلا ہیں۔

آیت 54 ﴿۵۴﴾ اسْتَخْلَصَهُ لِنَفْسِي : یہاں سے یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوتا ہے، جب غلامی و قید ختم ہوئی اور آزادی اور حکومت و سلطنت عطا ہوئی۔ ”اسْتَخْلَصَهُ“ یہاں بادشاہ ”اسْتَخْلَصَهُ“ بھی کہہ سکتا تھا، جیسا کہ ﴿إِنَّكَ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ﴾ [یوسف : ۲۴] میں باب افعال استعمال ہوا ہے۔ ”اسْتَخْلَصَهُ“ میں سین اور تاء مبالغہ کے لیے ہیں کہ ”میں اس کو زیادہ سے زیادہ اپنے لیے خاص کر لوں۔“ بادشاہ نے جب یوسف علیہ السلام سے اپنے خواب کی صحیح تعبیر سنی، پھر بلانے کے باوجود کئی سال بے گناہ قید رہ کر بھی اپنی بے گناہی ثابت ہونے سے پہلے قید خانے سے نکلنے سے انکار دیکھا، پھر تمام متعلقہ خواتین حتیٰ کہ عزیز کی بیوی سے ان کی پاک دامنی اور بے گناہی کی تصدیق سنی تو ان کی شخصیت کا اتنا مشتاق ہوا کہ اس نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لاؤ، میں اسے اپنے لیے خاص کر لوں گا۔ پھر جب یوسف علیہ السلام نے نفس نفیس اس سے گفتگو کی تو بادشاہ نے ان کے علم کی وسعت، اخلاق کی خوبی اور دوسرے اوصاف حسد کا عین یقین ہونے کے بعد کہا کہ آج سے تم ہمارے ہاں

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۗ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْمُ ﴿۵۵﴾

اس نے کہا مجھے اس زمین کے خزانوں پر مقرر کر دے، بے شک میں پوری طرح حفاظت کرنے والا، خوب جاننے والا ہوں ﴿۵۵﴾

مکین و امین، یعنی صاحب اقتدار اور امانت دار ہو۔ ”مکین“ اس ”مکانة“ (مرتبے) والے کو کہتے ہیں جو صرف ایک یا چند ایک کے سوا کسی کو حاصل نہ ہو۔ قرآن مجید میں اس کا استعمال دیکھیے، جب وحی کے سلسلے میں جبریل علیہ السلام کا ذکر آیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّكَ لَلْقَوْلِ رَسُولٌ كَرِيمٌ ﴿۱﴾ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٌ ﴿۲﴾ مُطَاعٌ ثُمَّ آمِينَ ﴿۳﴾﴾ [التکویر: ۱۹] تا [۲۱] ”بے شک یہ یقیناً ایک ایسے پیغام پہنچانے والے کا قول ہے جو بہت معزز ہے۔ بڑی قوت والا ہے، عرش والے کے ہاں بہت مرتبے والا ہے۔ وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، امانت دار ہے۔“ اور آپ جانتے ہیں کہ فرشتوں میں جبریل علیہ السلام کو کیا مرتبہ حاصل ہے کہ بنی آدم کے تمام انبیاء و رسل کی طرف اللہ کی جانب سے انھیں رسول چنا گیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی بہت بڑی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا، فرمایا: ﴿لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ﴾ [الحج: ۱۸] ”بلاشبہ یقیناً اس نے اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں۔“ ان سے بڑھ کر اللہ کا قرب رکھنے والا کوئی فرشتہ ہمیں معلوم نہیں۔ ”آمین“ یعنی اپنی ذات، مملکت کے معاملات و اسرار اور سب لوگوں کے جان و مال اور ان کے درمیان عدل و انصاف میں تم ہمارے ہاں مکمل قابل اعتماد ہو، تمھاری امانت پر ہمیں پورا بھروسہ ہے۔

آیت 55 ﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ﴾ میں الف لام عہد کا ہے ”اس زمین“ یعنی مجھے سرزمین مصر کے خزانوں پر مقرر کر دیجیے، کیونکہ میں ان کی پوری طرح حفاظت کر سکتا ہوں اور اس کام کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ”خزائین“ ”خزانة“ کی جمع ہے، اس سے مراد یا تو ان گوداموں کا نظام ہے جو خوش حالی کے سالوں کے لیے تعمیر کیے جائیں گے اور غلہ سنبھالیں گے اور قحط کے سالوں میں ان سے غلہ تقسیم کیا جائے گا، کیونکہ اس کے لیے بہت بڑی منصوبہ بندی، محنت و امانت اور حساب کتاب میں مہارت کی ضرورت ہے، یا مراد سلطنت کے تمام ذرائع آمدنی و پیداوار ہیں۔ قرآن میں ”خزائن“ کا لفظ عموماً اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَاللَّهُ خَزَائِنُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ [المنافقون: ۷] ”حالانکہ آسمانوں کے اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں۔“ اور دیکھیے سورہ انعام (۵۰)، بنی اسرائیل (۱۰۰)، ص (۹)، طور (۳۷) اور حجر (۲۱) اور یہی معنی یہاں صحیح ہے، کیونکہ خوش حالی کے سالوں میں گوداموں کی تعمیر، پھر سات سال تک پورے ملک کے لوگوں سے ضرورت سے زائد گندم خریدنا، حکومت کی آمدنی کے تمام ذرائع پر مکمل اختیار کے بغیر ممکن نہ تھا، تاکہ ملک بھی چلا رہے اور جس کی خریداری کے لیے رقم بھی مہیا ہو سکے اور گودام بھی تعمیر ہو سکیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ بادشاہ کی نگاہ میں ان کی قدر و منزلت بڑھ گئی ہے اور وہ انھیں ہر طرح کے اختیارات سونپنے کو تیار ہے تو اپنی اہلیت پر اعتماد کرتے ہوئے یہ پیش کش مناسب سمجھی کہ سلطنت کے تمام ذرائع آمدنی و پیداوار میرے حوالے کر دیے جائیں، بلکہ آئندہ آیات (۱۰۱، ۱۰۰) سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار مصر میں یوسف علیہ السلام ہی تخت نشین ہو گئے تھے، یا کم از کم عملاً حکومت انھی کی

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَّبِعُوا وَأَمْنًا حَيْثُ يَشَاءُ ۖ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ
عَمَّا وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۱﴾ وَلَا جُزْءَ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۵۲﴾

اور اسی طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کو اقتدار عطا فرمایا، اس میں سے جہاں چاہتا جگہ پکڑتا تھا۔ ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں پہنچا دیتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے ﴿۵۱﴾ اور یقیناً آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے کہیں بہتر ہے جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے ﴿۵۲﴾

تھی اور یہ پیش کش اس لیے بھی تھی کہ یوسف ﷺ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، اس ملک کے تمام اختیارات پر قبضہ ان کے لیے اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ توحید کی اشاعت اور شرک کا استیصال کر سکیں۔

﴿۵۱﴾ یہاں ایک سوال اٹھایا جاتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے خود عہدہ مانگا جب کہ رسول اللہ ﷺ نے عہدہ مانگنے یا اس کی حرص رکھنے والے کے متعلق فرمایا: «لَا تَسْتَعْمِلُ عَلَيَّ عَمَلِنَا مِنْ أَرَادَهُ» [بخاری، الإجارة، باب استئجار الرجل الصالح ... : ۱۲۶۶۱] ”ہم ایسے شخص کو ہرگز عہدہ نہیں دیں گے جو اس کا ارادہ رکھے۔“ اس کے کئی جواب ہیں جن میں سے سب سے صحیح اور مضبوط جواب یہ ہے کہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کو عہدے پر تو فائز کر ہی دیا تھا: ﴿إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ﴾ [یوسف : ۲۵۴] ”بلاشبہ تو آج ہمارے ہاں صاحب اقتدار، امانت دار ہے۔“ جس طرح آج کل پہلے وزیر چن لیے جاتے ہیں اور پھر وہ اپنے لیے شعبے کا انتخاب خود کرتے ہیں، اسی طرح جب بادشاہ نے انھیں اپنے ہاں پوری طرح صاحب اقتدار اور امانت دار قرار دے دیا تو یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ اس منصب کے تقاضے نرانے پر مکمل اختیار کے بغیر پورے ہو ہی نہیں سکتے، سو ان کے لیے یہ اختیار طلب کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ خلاصہ یہ کہ انھوں نے عہدہ ہرگز نہیں مانگا، بلکہ انھیں جب عہدے سے نوازا گیا تو انھوں نے اس کی عملی صورت پیش فرمائی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر کسی کو اصرار ہو کہ انھوں نے عہدہ مانگا ہے تو ٹھیک ہے جو شخص یوسف علیہ السلام جیسے مقام پر فائز ہو وہ بے شک عہدہ مانگ لے، جو ان جیسے اوصاف رکھتا ہو، انسان کی سب سے مزید وقوت (جنس) سمیت تمام بہیمانہ قوتوں مثلاً غصے، خیانت اور ظلم وغیرہ پر ان کی طرح قابو رکھتا ہو اور نبوت سے بھی سرفراز ہو، کیونکہ ایسی صورت میں نہ اس عہدے کی ذمہ داری کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے نہ خیانت کا۔ دوسرا شخص رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل کرے اور آرام سے رہے، خود اپنے آپ کو اس آزمائش میں نہ ڈالے جس کا انجام رسول اللہ ﷺ نے ہمیں واضح طور پر بتا دیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا مِنْ أَمِيرٍ عَشْرَةَ إِلَّا يُؤْتَى بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَغْلُوبًا لَا يَفْكَهُ إِلَّا الْعَدْلُ أَوْ يُؤْبَقُهُ الْحَوْرُ» [مسند أحمد : ۴۳۱/۲، ح : ۹۵۸۶۔ سلسلۃ الأحادیث الصحیحة : ۲۳۷/۶، ح : ۲۶۶۱] ”کوئی بھی دس آدمیوں کا امیر ہو اسے طوق پہنا کر لایا جائے گا، عدل کے سوا کوئی چیز اسے نہیں چھڑائے گی، یا ظلم اسے ہلاک کر دے گا۔“

آیت 57.56 ﴿۱﴾ وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ: اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو سلطنت مصر

وَجَاءَ إِخْوَتَهُ يُوسُفَ قَدْ خَلَوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ ﴿۵۸﴾

اور یوسف کے بھائی آئے، پھر اس کے پاس داخل ہوئے تو اس نے انھیں پہچان لیا اور وہ اسے نہ پہچاننے والے تھے ﴿۵۸﴾

میں ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے اور وہ ایک کافر بادشاہ کے وزیر و ملازم نہیں تھے، ہو سکتا ہے کہ بادشاہ نے از خود ہی زمام حکومت ان کے سپرد کر دی ہو۔ ایک مشرک بادشاہ اور ایک نبی کا اتنا قرب ممکن ہی نہیں، اگر بادشاہ کو کافر فرض کیا جائے تو ممکن ہی نہیں کہ انسانوں میں سے اللہ کا سب سے بڑا دشمن (کافر بادشاہ) اللہ کے اس وقت کے سب سے بڑے دوست (نبی) سے اتنی دلی محبت رکھ کر نباہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فیصلہ فرمایا ہے: ﴿إِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا اٰبَدِيًّا ۗ اَللّٰهُ يٰۤاٰمِنُوْنَ﴾ [البقرہ: ۱۶۶] ”بے شک کافر لوگ ہمیشہ سے تمہارے کھلے دشمن ہیں۔“ سورہ کافرون پر نظر ڈال لیں اور سورہ مجادلہ کی آخری آیت پر بھی۔ سورہ محنتہ کی آیت (۴) میں یوسف علیہ السلام کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام نے تو مسلم و کافر کے درمیان واضح ابدی بغض و عداوت کی صراحت فرمادی ہے۔ کافر بادشاہ اور نبی کے درمیان عداوت و محبت کا منظر دیکھنا ہو تو موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کو دیکھ لیں، حالانکہ موسیٰ علیہ السلام نے اس گھر میں بیٹے کی حیثیت سے پرورش پائی تھی۔ بادشاہ تو دور کی بات ہے کافر سرداران قوم ایک لمحہ انبیاء اور مسلمانوں کو برداشت نہیں کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں۔ سوائے ایسے مسلمانوں کے جو ان کے ہر عمل کی مدد کریں، یا کم از کم خاموش رہیں۔ اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام سے اس کی توقع وہی شخص کر سکتا ہے جو یوسف علیہ السلام کا خواتین مصر کے مطالبے کے مقابلے میں سال ہا سال کی قید گوارا کرنا اور بادشاہ کے بلانے کے باوجود تحقیق کے بغیر قید خانے سے نکلنے سے انکار نہ جانتا ہو۔

﴿يَتَّبِعُوْنَهَا حَيْثُ يَشَآءُ...﴾ لفظ ”يَتَّبِعُوْنَ“ سے یوسف علیہ السلام کو مصر میں حاصل ہونے والا اختیار و اقتدار کھنسنے کے لیے اس آیت کو ملاحظہ فرمائیں جس میں ذکر ہے کہ جنتی جنت میں داخلے کے بعد کیا کہیں گے: ﴿وَقَالُوْا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَّقَنَا وَعْدًا وَّاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَسْتَبِيْهُمِنْ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ﴾ [البقرہ: ۷۵] ”اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہمیں اس زمین کا وارث بنا دیا کہ ہم (اس) جنت میں سے جہاں چاہیں جگہ بنا لیں۔“ جنت جیسا اختیار نہ ہی مگر اس سے اس لفظ کی وسعت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ عزیز مصر کی بیوی سے یوسف علیہ السلام کا نکاح ہو گیا تھا، مگر محدثین کے نزدیک یہ روایات قابل اعتبار نہیں۔

﴿وَلَا تُضِيْعُ اَجْرُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ وَلَا جَزَا الْاٰخِرَةَ..... یعنی دنیا و آخرت دونوں میں انھیں اپنے نیک اعمال کا بدلہ ملتا ہے، اس آیت کے سلسلے میں شاہ عبد القادر بنی لکھتے ہیں: ”یہ جواب ہوا ان کے سوالوں کا کہ اولاد ابراہیم اس طرح شام سے مصر آئی اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو گھر سے دور پھینکا، تاکہ ذلیل ہو، اللہ نے زیادہ عزت دی اور ملک پر زیادہ اختیار دیا ویسا ہی ہمارے نبی ﷺ کے ساتھ ہوا۔“ (موضح)

ت 58 ﴿۱﴾ وَجَاءَ إِخْوَتَهُ يُوسُفَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے خوش حال کے سالوں کا، ان میں یوسف علیہ السلام کے حسن انتظام کا اور اس سے متعلق سب باتوں کا ذکر چھوڑ دیا، کیونکہ اصل مقصود یہ تھا کہ انبیاء کو اپنوں کے ہاتھوں کیا کچھ اٹھانا پڑتا ہے اور

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِآخِ لَكُمْ قِنَ اَبِيكُمْ اَلَا تَتَرُونَ اَنِي اَوْ فِي الْكَيْلِ
 وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ﴿۵۹﴾ فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿۶۰﴾

اور جب اس نے انھیں ان کے سامان کے ساتھ تیار کر دیا تو کہا میرے پاس اپنے اس بھائی کو لے کر آنا جو تمہارے
 باپ سے ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں ماپ پورا دیتا ہوں اور میں بہترین مہمان نواز ہوں ﴿۵۹﴾ پھر اگر تم اسے
 میرے پاس نہ لائے تو تمہارے لیے میرے پاس نہ کوئی ماپ ہوگا اور نہ میرے قریب آنا ﴿۶۰﴾

آخر کار کس طرح ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت اور حسن انجام کا اہتمام ہوتا ہے۔ درمیان میں گزرنے والے عرصے کا
 اندازہ خود بخود ہو رہا ہے، اس لیے اب خوش حالی کے سالوں کے ختم ہونے کے بعد قحط کے دوران بھائیوں کی آمد کی بات
 شروع فرمائی۔ جس سے بات خود بخود سمجھ میں آرہی ہے کہ قحط کی وسعت مصر سے نکل کر اردگرد کے ممالک فلسطین و شام وغیرہ
 تک پہنچ گئی تھی اور مصر کے سوا کہیں سے غلہ نہیں ملتا تھا، اس لیے یہ بھائی غلہ خریدنے کے لیے مصر آئے تھے۔

﴿۶۰﴾ فَذَلَّلُوا عَلَيْهِ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کتنی احتیاط سے غلہ تقسیم کر رہے تھے کہ وہ غلہ لینے کے لیے آنے
 والوں سے خود ملتے اور قیمت وصول کرنے کے باوجود ایک اونٹنی کی کس سے زیادہ غلہ نہیں جانے دیتے تھے۔ چھوٹے بھائی کو چھوڑ
 کرب کے آنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ دس اونٹوں کا غلہ مل جائے گا اور شاید یہ بھی ہو کہ راستے میں دشمن سے محفوظ رہ سکیں۔

﴿۶۱﴾ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ: ”فَعَرَفَهُمْ“ جملہ فعلیہ ہے جس میں تجدد و حدوث ہوتا ہے، یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنی
 یادداشت اور ذکاوت سے دیکھتے ہی انھیں پہچان لیا اور دوسرا جملہ اسمیہ ہے جس میں دوام ہوتا ہے کہ بھائی واپسی تک ان سے
 ناواقف رہے، کیونکہ بہت مدت گزر گئی تھی، چھوٹی عمر میں ان سے الگ ہوئے تھے۔ دوسرے یہ چیز تو ان کے وہم و گمان میں
 بھی نہ تھی کہ جس بھائی کو وہ کنویں میں ڈال گئے تھے وہ آج مصر کا مختار مطلق ہوگا۔

آیت 59-60 ﴿۶۰﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ: ”جہاز“ وہ سامان جس کی مسافر کو ضرورت ہوتی ہے۔ یوسف علیہ السلام
 نے کہا: ﴿۵۹﴾ ائْتُونِي بِآخِ لَكُمْ ﴿۵۹﴾ یہ نہیں کہا ”بأخيتكم“ کہ اپنے بھائی کو جو تمہارے باپ سے ہے لے کر آنا، بلکہ ”بأخ لکم“
 کہا، یعنی ”آخ“ کو نکرہ رکھا، تاکہ بھائیوں کے سامنے یہی ظاہر ہو کہ عزیز مصر اس بھائی کو نہیں جانتا۔ یہ سب سے چھوٹے اور
 یوسف علیہ السلام کے سگے بھائی تھے۔ ان کا نام بنیامین مشہور ہے، جس کی کوئی پختہ دلیل نہیں، جیسا کہ عزیز مصر کا نام ”فوطیہار“، اس
 کی بیوی کے نام ”زلیخا“ یا ”رامیل“، بادشاہ کا نام ”ریان بن ولید“ اور یوسف علیہ السلام کے دوسرے بھائیوں کے ناموں کی دلیل
 اسرائیلی روایات کے سوا کچھ نہیں، جن پر اعتبار ممکن نہیں۔ یوسف علیہ السلام کی اس فرمائش سے معلوم ہوتا ہے کہ خود بھائیوں نے
 یوسف علیہ السلام کو اپنے خاندان کا تعارف کرواتے ہوئے اس بھائی کا ذکر کیا۔

﴿۶۰﴾ اَلَا تَرُونَ: چھوٹے بھائی کو بلوانے کے لیے یوسف علیہ السلام نے اپنی تجارتی ایمان داری ”اَوْ فِي الْكَيْلِ“ اور بہترین
 مہمان نوازی کا ذکر بھی کیا اور اگلی آیت میں دھمکی بھی دی کہ اس بھائی کو ساتھ نہ لائے تو نہ غلہ ملے گا اور نہ مجھ سے ملاقات کی

قَالُوا سُرَّوْدٌ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿۶۱﴾ وَقَالَ لِفَتْنَيْنِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۶۲﴾ فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا آخَانًا نَّكَتَلُ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿۶۳﴾

انھوں نے کہا ہم اس کے باپ کو اس کے بارے میں ضرور آمادہ کریں گے اور بے شک ہم ضرور کرنے والے ہیں ﴿۶۱﴾ اور اس نے اپنے جوانوں سے کہا ان کا مال ان کے کجاووں میں رکھ دو، تاکہ وہ اسے پہچان لیں جب اپنے گھر والوں کی طرف واپس جائیں، شاید وہ پھر آجائیں ﴿۶۲﴾ تو جب وہ اپنے باپ کی طرف لوٹے تو انھوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہم سے ماپ روک لیا گیا ہے، سو تو ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج کہ ہم (غلے کا) ماپ لائیں اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں ﴿۶۳﴾

امید رکھنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے غلہ لینے کے لیے آنے والے تمام لوگوں کے لیے مہمان نوازی کا، ان کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا بہترین انتظام کر رکھا تھا اور بھائی تو پھر بھائی تھے۔

آیت 61 ﴿۶۱﴾ قَالُوا سُرَّوْدٌ عَنْهُ..... یعنی ہم اس کے باپ کو ہر طرح سے آمادہ کریں گے۔ ”سین“ مستقبل کا معنی دینے کے علاوہ تاکید کے لیے بھی آتا ہے، اس لیے ترجمہ ”ضرور“ کیا گیا ہے۔ ”وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ“ میں یہ کام کرنے کا وعدہ تین طرح کی تاکید سے کیا ہے، ”إِن“، لام تاکید اور جملہ اسمیہ سے۔

آیت 62 ﴿۶۲﴾ وَقَالَ لِفَتْنَيْنِهِ.....: ”فِتْنَانٌ“ ”فَتْنَىٰ“ کی جمع ہے، دیکھیے (آیت ۳۶) ”رِحَالٌ“ ”رَحْلٌ“ کی جمع ہے، وہ کجاوہ جو اونٹ پر سوار ہونے کے لیے رکھا جاتا ہے اور اس سامان کو بھی کہہ لیتے ہیں جو اونٹ پر رکھا جائے، اس لیے اونٹ کو ”رَاحِلَةٌ“ کہہ لیتے ہیں۔ ”بِضَاعَةٌ“ وہ رقم یا سامان جس کے ساتھ کوئی چیز خریدی جائے، یعنی اپنے جوانوں کو وہ رقم یا ساز و سامان جو وہ غلہ خریدنے کے لیے قیمت کے طور پر لائے تھے، ان کو بتائے بغیر بطور احسان ان کی بور یوں میں رکھ دینے کا حکم دے دیا اور اس لیے بھی کہ بھائیوں کی حالت دیکھ کر گھر کی تنگ دستی کا اندازہ ہو گیا، جس کا ذکر تیسری دفعہ آنے پر انھوں نے خود کیا۔ دیکھیے آیت (۸۸) ”لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا“ شاید وہ ان درہموں وغیرہ کو ان کی ساخت یا مہر یا تھیلیوں سے پہچان لیں اور اس احسان اور رقم کی موجودگی کی وجہ سے دوبارہ آجائیں۔

آیت 63 ﴿۶۳﴾ ﴿۱﴾ فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ..... : قحط میں سب سے پہلی فکر جان پہچانے کی تھی اور نظر آ رہا تھا کہ یہ غلہ کتنی ویر چلے گا، اس لیے واپس جاتے ہی ابھی سامان نہیں کھولا اور سب سے پہلے یہ بات کہ کہ ابا جان آئندہ ہمیں غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے، اس کے بعد سارا قصہ سنایا اور بتایا اب غلہ ملنے کی صورت ہے کہ آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیں تو ہمیں غلہ مل جائے گا۔

قَالَ هَلْ أَمْنَكُم عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمْنَتُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِن قَبْلُ ۖ فَاللَّهُ خَبِيرٌ حَفِظًا ۖ
 وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ﴿۶۴﴾ ۚ وَلَنَأَفْتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ۚ قَالُوا
 يَا أَبَانَا مَا نَبغِي ۚ هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا وَنَزِدَادُ كَيْلٍ
 بَعِيرٍ ۚ ذَلِكَ كَيْلٌ لِّسَيِّدٍ ﴿۶۵﴾

اس نے کہا میں اس پر اس کے سوا تمہارا کیا اعتبار کروں جس طرح میں نے اس کے بھائی پر اس سے پہلے تمہارا
 اعتبار کیا، سوائے اللہ بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ﴿۶۴﴾ اور جب
 انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اپنے مال کو پایا کہ ان کی طرف واپس کر دیا گیا ہے، کہا اے ہمارے باپ! ہم کیا چاہتے
 ہیں، یہ ہمارا مال ہماری طرف واپس کر دیا گیا ہے اور ہم گھر والوں کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت
 کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ ماپ زیادہ لائیں گے، یہ بہت تھوڑا ماپ ہے ﴿۶۵﴾

﴿۶۴﴾ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ : اس میں بھی تین تاکیدیں ہیں، یعنی یوسف کی طرح اس کے بارے میں فکر نہ کیجیے، ہمیں پورا احساس
 ہے، اس لیے ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے۔

آیت 64 ﴿۶۴﴾ قَالَ هَلْ أَمْنَكُم عَلَيْهِ.....: فرمایا، تم جب یوسف علیہ السلام کو لے گئے تھے تب بھی تم نے یہی کہا تھا کہ
 ”إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“ پھر تم نے اس کی اچھی حفاظت کی کہ آج تک اس بے چارے کی کوئی خیر خبر نہیں، تو کیا اس کے متعلق بھی
 تمہاری حفاظت کا ایسا ہی اعتماد کروں، جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے متعلق تم پر اعتبار کیا تھا۔

﴿۶۵﴾ فَاللَّهُ خَبِيرٌ حَفِظًا.....: یعنی میں اسے بحالت مجبوری غلہ کی ضرورت کے پیش نظر تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں، سو میں اسے
 تمہاری حفاظت میں نہیں بلکہ اللہ کی حفاظت میں دیتا ہوں، وہ ارحم الراحمین ہی اپنی مہربانی سے اس کی حفاظت فرمائے گا۔ ابن کثیر
 کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے ساتھ بھیجتے وقت صرف یہ کہا تھا: ﴿وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾
 [یوسف: ۱۶۳] (اور میں ڈرتا ہوں کہ اسے کوئی بھیڑیا کھا جائے) اب جو اس کے بھائی کو ”فَاللَّهُ خَبِيرٌ حَفِظًا“ وَهُوَ
 أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ“ کہتے ہوئے اللہ کی حفاظت میں دیا تو نہ صرف یوسف کا بھائی بلکہ یوسف علیہ السلام بھی مل گئے۔

آیت 65 ﴿۶۵﴾ وَلَنَأَفْتَحُوا مَتَاعَهُمْ.....: جب انہوں نے اپنا سامان کھولا اور دیکھا کہ جو کچھ وہ بطور قیمت لے کر گئے
 تھے پورا ہی انہیں واپس دے دیا گیا ہے، تو انہیں اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ بھیجنے کے لیے مزید اصرار کرنے اور اطمینان دلانے
 کا موقع مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا، ابا جان! ہمیں اور کیا چاہیے، ہمارا مال ہمیں واپس مل گیا، اب قیمت موجود ہے، جھوٹا
 بھائی ساتھ جائے تو ہم سارے اہل خانہ کے لیے غلہ لے آئیں گے، ایک اونٹ زائد بھی مل جائے گا، در نہ گیارہ کہاں ایک بھی
 نہیں ملے گا، ایسی صورت میں ہم بھائی کو کیوں نقصان پہنچائیں گے۔

قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّى تُؤْتُونِ مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ ۗ فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿۶۶﴾ وَقَالَ لِيَبَنِي لَا تَدْخُلُوا مِنِّي

اس نے کہا میں اسے تمہارے ساتھ ہرگز نہ بھیجوں گا، یہاں تک کہ تم مجھے اللہ کا پختہ عہد دو گے کہ تم ہر صورت اسے میرے پاس لاؤ گے، مگر یہ کہ تمہیں گھیر لیا جائے ﴿۶۶﴾ پھر جب انہوں نے اسے اپنا پختہ عہد دے دیا تو اس نے کہا اللہ اس پر جو ہم کہہ رہے ہیں، ضامن ہے۔ اور اس نے کہا اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا اور الگ

﴿۶۷﴾ ذٰلِكَ كَيْلٌ لِّبَنِي ۗ اس کے دو معنی کرتے ہیں، ایک تو یہ کہ یہ دس اونٹ غلہ جو ہم لائے ہیں کب تک چلے گا، یہ تو بہت تھوڑا ہے، اس لیے ہمیں ہر صورت دوبارہ جانا پڑے گا اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس طرح ہمارے لیے ایک اونٹ بھر غلہ مزید لانا بالکل آسان ہوگا۔

آیت 66 قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ: ”وکیل“ بروزن ”فَعِيلٌ“ بمعنی مفعول ہے، یعنی ”مَوْثِقًا لِّلَّهِ“ جس کے سپرد اپنا کام کر دیا جائے۔ یعقوب علیہ السلام نے ایک طرف بیٹوں سے پختہ عہد، یعنی قسمیں لے لیں اور ظاہری اسباب سے پورا وثوق حاصل کر لیا اور دوسری طرف معاملہ اللہ کے سپرد کر کے بھروسہ اس پر رکھا کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اسے پورا کرنا اسی کے اختیار میں ہے اور جو جان بوجھ کر بد عہدی یا خیانت کرے گا وہ خود اسے سزا دے گا، اللہ پر توکل کا صحیح مطلب بھی یہی ہے۔

آیت 67 ﴿۱﴾ وَقَالَ لِيَبَنِي لَا تَدْخُلُوا مِنِّي...: نہ تو آیت کے الفاظ میں اس چیز کی وضاحت ہے اور نہ کسی صحیح حدیث ہی سے اس کا پتا چلتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو یہ حکم کیوں دیا کہ وہ ایک دروازے سے نہیں بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہوں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صحرا کے پروردہ تو مند گیارہ نو جوان ایک ہی دروازے سے اکٹھے گزریں گے تو ان کی پڑتال زیادہ ہوگی۔ انہیں رہزنوں کا گروہ بھی سمجھا جاسکتا ہے، اگر شک یا حسد کی بنا پر گرفتار ہوئے تو یوسف علیہ السلام تک ایک بھی نہیں پہنچ سکے گا، پھر گرفتار شدگان کی رہائی کی جدوجہد اجنبی وطن میں کون کرے گا، غرض کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ مگر اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو اپنے صحت مند، قوی، جوان اور خوب صورت بیٹوں کے اکٹھے داخل ہونے پر نظر بد لگنے کا خطرہ تھا۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”یہ نوک (نظر بد) سے بچنے کا طریقہ بتایا اور توکل اللہ پر کیا، نوک لگنی غلط نہیں اور نظر بد سے بچاؤ کرنا درست ہے۔“ (موضح) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْعَيْنُ حَقٌّ وَلَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابَقَ الْقَدَرَ سَبَقْتَهُ الْعَيْنُ وَإِذَا اسْتُغْبِلْتُمْ فَأَغْسِلُوا» [مسلم، السلام، باب الطب والمرض والرقي: ۲۱۸۸] ”نظر لگنا ثابت شدہ بات ہے اور اگر کوئی چیز تقدیر سے آگے نکل سکتی تو نظر اس سے آگے نکل جاتی اور جب تم سے غسل کے لیے کہا جائے تو غسل کرو۔“

نبی ﷺ کے زمانے میں بہت سے لوگوں کو نظر بد سے نقصان کا پہنچنا ثابت ہے۔ دراصل نظر لگانے والے کی آنکھ سے کوئی ایسی تاثیر رکھنے والی شعاع نکلتی ہے جو نشانہ بننے والے کو نقصان پہنچاتی ہے، جیسا کہ اب لیزر (شعاع) سے پتھر بھی توڑ

بَابٌ وَاحِدٌ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ ۚ وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۗ إِنَّ

الگ دروازوں سے داخل ہونا اور میں تم سے اللہ کی طرف سے (آنے والی) کوئی چیز نہیں ہٹا سکتا، حکم اللہ کے سوا دیا جاتا ہے۔ یہ حسد کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے اور اپنے پیاروں کو بھی لگ جاتی ہے، کسی کی آنکھ میں یہ تاثیر زیادہ ہوتی ہے کسی میں کم۔ بچوں پر یہ زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے ایک ہدایت تو یہ دی ہے کہ کوئی چیز اچھی لگے تو اس کے لیے برکت کی دعا کرے، مثلاً: «تَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ، اللَّهُمَّ بَارِكْ فِيهِ» یا اپنی زبان میں کہہ دے ”یا اللہ! اس میں برکت فرما۔“ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ کوئی اپنے خوب صورت باغ وغیرہ میں داخل ہو تو یہ کہے: ﴿مَا شَاءَ اللَّهُ﴾ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ﴿﴾ [الکہف: ۳۹] اس آیت سے یہی الفاظ اپنی ہر بیماری چیز پر پڑھنے کی ترغیب بھی ملتی ہے، اس سے وہ چیز نظر بد سے محفوظ رہے گی۔ اگر نظر لگ جائے تو رسول اللہ ﷺ سے اسے دور کرنے کے دو طریقے ثابت ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اگر معلوم ہو جائے کہ کس کی نظر لگی ہے تو اس سے غسل کروا کر وہ پانی نظر کے مریض پر ڈالا جائے، جیسا کہ اوپر صحیح مسلم کی حدیث میں گزرا، یا کم از کم اس کا چہرہ، دونوں ہاتھ، دونوں کہنیاں، دونوں گھٹنے، پیروں کی انگلیاں اور تہ بند کے اندر کا حصہ کسی برتن میں دھو کر وہ پانی مریض پر ڈالا جائے (تو وہ تندرست ہو جائے گا)۔ [الموطأ، العین، باب الرضوء، من العین: ۲] دوسرا طریقہ تو حید پر بنی دم ہے۔ عوف بن مالک راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا بَأْسَ بِالرُّقِيِّ مَا لَمْ يَكُنْ فِيهِ شِرْكٌ» [مسلم، السلام، باب لا بأس بالرقي.....: ۲۲۰۰] ”دموں میں کوئی حرج نہیں جب تک کہ وہ شرک نہ ہوں۔“ مشرک صوفیوں اور گدی نشینوں کے بجائے خود ہی مسنون دم کر لیا کریں، یہاں چند مسنون دم ضرورت اور فائدے کے لیے نقل کیے جاتے ہیں: ① عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو پناہ دلواتے (دم کرتے) اور فرماتے: ”تم دونوں کا باپ (ابراہیم علیہ السلام) اسماعیل اور اسحاق (علیہم السلام) کو ان کلمات کے ساتھ پناہ دلواتا (دم کرتا) تھا: «أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ وَمِنْ كُلِّ غَيْبٍ لَآمَةٍ» [بخاری، أحاديث الأنبياء، باب: ۳۳۷۱] ”میں پناہ طلب کرتا ہوں اللہ کے کامل کلمات کے ساتھ ہر شیطان اور زہریلے جانور سے اور ہر اس آنکھ سے جو نظر لگانے والی ہے۔“ ابو داؤد (۳۷۳۷) اور ترمذی (۲۰۶۰) میں شروع کے لفظ یہ ہیں: «أُعِيذُكُمْ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّةِ» یعنی میں تم دونوں کو دم کرتا ہوں۔ اگر ایک کو دم کرے تو ”أُعِيذُكَ“ کہہ لے۔ ② ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نبی ﷺ کے پاس آئے، کہا: ”اے محمد! آپ بیمار ہو گئے ہیں؟“ کہا: ”ہاں!“ تو انھوں نے کہا: «بِسْمِ اللَّهِ أُرْفِقُكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْدِيكَ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنٍ حَاسِدٍ، اللَّهُ يَشْفِيكَ بِسْمِ اللَّهِ أُرْفِقُكَ» [مسلم، باب الطب والمرض والرقي: ۲۱۸۶] ”میں اللہ ہی کے نام کے ساتھ تجھے دم کرتا ہوں ہر اس چیز سے جو تجھے تکلیف دے رہی ہے اور ہر حسد کرنے والے نفس یا آنکھ کے شر سے، اللہ تجھے شفا دے۔ اللہ ہی کے نام سے میں تجھے دم کرتا ہوں۔“ مسند احمد (۳۲۳/۵، ج: ۲۲۸۲۶) میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ہے کہ آپ ﷺ کو بخار تھا، پچھلے پہر جبریل علیہ السلام نے دم کیا، شام کو آپ بہترین

الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿۱۷﴾

کسی کا نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی پر پس لازم ہے کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں ﴿۱۷﴾

حالت میں ہو گئے۔ ﴿۱۷﴾ آسمان سے اترنے والی تمام کتابوں میں سے سورہ فاتحہ سب سے عظیم سورت ہے۔ صحیح بخاری میں ہے، ایک قبیلے کے سردار کو (جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قافلے کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا تھا) سانپ نے ڈس لیا۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے سورہ فاتحہ پڑھ کر اسے دم کیا، وہ بالکل ٹھیک ہو گیا تو صحابہ نے ان سے طے کی ہوئی تیس بکریاں وصول کیں۔ [بخاری، الإحارۃ، باب ما يعطى في الرقبة على أحياء العرب: ۲۲۷۶] ابوداؤد میں ہے کہ خارجہ بن حلت کے چچا رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر مسلمان ہو گئے، واپسی پر ان کا گزر ایک قوم پر ہوا، جہاں ایک پاگل لوہے کی زنجیر کے ساتھ بندھا ہوا تھا، انہوں نے ان سے دم کی درخواست کی تو انہوں نے صرف سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا۔ صبح و شام تین دن سورہ فاتحہ پڑھ کر جمع شدہ تھوک اس پر پھینکتے رہے تو وہ تندرست ہو گیا اور ایسا گویا اسے رسیوں سے کھول دیا گیا ہو، تو انہوں نے ان کو سو بکریاں دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كُلُّ فَلَعَمْرِي مَنْ أَكَلَ بَرْقِيَّةً بَاطِلٍ لَقَدْ أَكَلَتْ بَرْقِيَّةً حَقًّا» [ابوداؤد، الطب، باب كيف الرقى: ۳۹۰۱] ”کھا لو، میری عمر کی قسم! لوگ تو باطل دم کے ساتھ کھاتے ہیں، تم نے حق دم کے ساتھ کھایا ہے۔“ اس لیے ہر بیماری، نظر ہو یا کوئی اور سورہ فاتحہ جیسا عظیم دم موجود ہونے کی صورت میں اگر کوئی مشرکوں بدعتیوں کے پاس جائے تو اس پر افسوس ہے۔ ﴿۱۷﴾ سورہ فلق اور سورہ ناس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «يَا عُقْبَةُ! تَعَوَّذْ بِهَمَا فَمَا تَعَوَّذَ مُتَعَوِّذٌ بِمِثْلِهِمَا» [ابوداؤد، الوتر، باب في المعوذتين: ۱۶۶۳] ”اے عقبہ! ان دونوں کے ساتھ پناہ پکڑ، کیونکہ کسی پناہ پکڑنے والے نے ان جیسی سورتوں کے ساتھ پناہ نہیں پکڑی۔“ کتب احادیث میں اور بھی دم موجود ہیں جو حصن المسلم اور اربعہ واذکار کی دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔

﴿۱۷﴾ وَمَا أَغْنِي عَنْكَ اور میں اللہ کی طرف سے آنے والی کوئی چیز تم سے ہٹا نہیں سکتا، بلکہ اس نے جو کچھ تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ ہو کر رہے گا، مگر چونکہ آدمی کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو خرابی سے بچنے کی تدبیر کرے، اگرچہ اصل بھروسہ تدبیر پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت پر ہونا چاہیے، کیونکہ اسباب بھی تب ہی کام آتے ہیں جب اللہ تعالیٰ چاہے۔ سو تدبیر کرنا بھی دراصل اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگنے کا نام ہے۔ ”الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا“ تدبیر ہے اور ”میں اللہ سے آنے والی کوئی چیز تم سے ہٹا نہیں سکتا“ تقدیر پر ایمان ہے، جس کا نتیجہ اسی پر توکل ہے۔

﴿۱۸﴾ إِنْ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ : یہاں حکم سے مراد کوئی اور قدری حکم ہے جس پر یہ کائنات چل رہی ہے، اس میں بندے کا کچھ اختیار نہیں۔ ”عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ“ یعنی میری طرح تم پر اور سب لوگوں پر بھی لازم ہے کہ صرف اسی پر بھروسہ کریں، اپنی تدبیر پر غور نہ کریں، اگرچہ شرعی حکم بھی اللہ ہی کا ماننا لازم ہے مگر اس میں اللہ تعالیٰ نے امتحان کے لیے بندے کو کچھ اختیار دیا ہے جس پر باز پرس ہوگی۔

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةٌ فِي نَفْسٍ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۖ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۸﴾
 وَ لَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَى إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۹﴾

اور جب وہ داخل ہوئے جہاں سے ان کے باپ نے انہیں حکم دیا تھا، وہ ان سے اللہ کی طرف سے آنے والی کسی چیز کو ہٹا نہ سکتا تھا مگر یعقوب کے دل میں ایک خواہش تھی جو اس نے پوری کر لی اور بلاشبہ وہ یقیناً بڑے علم والا تھا، اس وجہ سے کہ ہم نے اسے سکھایا تھا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۱۸﴾ اور جب وہ یوسف کے پاس داخل ہوئے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی، کہا بلاشبہ میں ہی تیرا بھائی ہوں، سو تو اس پر غم نہ کر جو وہ کرتے رہے ہیں ﴿۱۹﴾

﴿۱۸﴾ پہلی دفعہ یعقوب علیہ السلام نے انہیں مختلف دروازوں سے داخل ہونے کا حکم نہیں دیا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس وقت قحط کی وجہ سے تمام بھائیوں کی صحت اچھی نہیں ہوگی، اب وہ بہترین صحت کے ساتھ تھے اور مزید یہ کہ وہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے جا رہے تھے جو یوسف علیہ السلام کے بعد یعقوب علیہ السلام کو سب سے زیادہ پیارے اور یوسف علیہ السلام کی ماں کے بطن سے تھے۔

آیت 68 ﴿۱﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا.....: ”حَاجَةٌ“ ”خواہش“ کیونکہ انسان اس کا محتاج ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ: یعنی اکثر لوگ اس سزا الہی (تقدیر) کی حقیقت کو نہیں جانتے اور اپنی تدبیر پر نازاں رہتے ہیں، یا پھر اللہ پر بھروسہ کرنے کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ سرے سے کوئی تدبیر اختیار ہی نہ کی جائے، جیسا کہ اکثر صوفیوں کا حال یا دعویٰ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یعقوب علیہ السلام نے تدبیر اور توکل کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی تو وہ دراصل ہماری اس تعلیم کا نتیجہ تھا جو ہم نے اسے دی تھی، یعنی بذریعہ وحی۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”تقدیر پھر بھی ان پر آگئی، دفع نہ ہوئی، سو جن کو علم ہے ان کو تقدیر کا یقین اور اسباب کا بچاؤ دونوں ہو سکتے ہیں اور بے علم سے ایک ہو تو دوسرا نہ ہو۔“ (موضح)

آیت 68 ﴿۱﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ.....: اس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی حسن تدبیر سے دوسرے

بھائیوں کو اس طرح ٹھہرایا کہ چھوٹا بھائی اکیلا رہ گیا تو اسے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ مفسرین نے عام طور پر لکھا ہے کہ بھائیوں کو دو، دو کر کے ایک ایک جگہ ٹھہرایا، مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں پانچ پانچ کر کے ایک ایک جگہ ٹھہرا دیا ہو یا کوئی اور ترتیب بنائی ہو۔ (واللہ اعلم) کیونکہ دو، دو والی ترتیب قرآن وحدیث میں نہیں آئی۔

﴿۲﴾ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ.....: ظاہر ہے کہ جب یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کے ساتھ علیحدہ ہوئے اور اسے بتایا کہ میں تمہارا سگا بھائی ہوں تو اس نے اپنے سوتیلے بھائیوں کی بدسلوکی کے قصے بیان کیے ہوں گے اور یقیناً یوسف علیہ السلام کے فراق میں اپنا اور

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ جَعَلَ السَّقَايَةَ فِي رِجْلِ أَحِيَهٗ ثُمَّ أَدْنَىٰ مُؤَدِّنَ أَيَّتْهَا الْعِيْرُ
إِنكُمْ لَسْرِقُونَ ﴿٤٠﴾ قَالُوا وَاقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقَدُونَ ﴿٤١﴾

پھر جب اس نے انھیں ان کے سامان کے ساتھ تیار کر دیا تو پینے کا برتن اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھ دیا، پھر ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا اے قافلے والو! بلاشبہ تم یقیناً چور ہو ﴿۴۰﴾ انھوں نے کہا، جب کہ وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے، تم کیا چیز تم پاتے ہو؟ ﴿۴۱﴾

والد کا حال بھی بیان کیا ہوگا۔ اس پر یوسف علیہ السلام نے انھیں تسلی دی کہ اب تم اپنے بھائی کے پاس پہنچ گئے ہو، لہذا ان بھائیوں کی بدسلوکی کا رنج نہ کرو، اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارے تمام غم غلط ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیں راحت و عزت عطا فرمائے۔

آیت 70-71 فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ : ان آیات کی تفسیر میں اکثر لوگوں کو ٹھوکر لگی ہے جس کی وجہ سے وہ یوسف علیہ السلام کے ذمے لگاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھنے کے لیے اس کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا، پھر اس کے سامان میں پیمانہ رکھ کر سب بھائیوں کے متعلق ان کے چور ہونے کا اعلان کروایا، پھر خود ہی سلاشی لی اور آخر میں بھائی کے سامان سے پیمانہ نکال کر اسے چور قرار دے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اس پر جو اعتراض آتا ہے کہ یہ ایک نبی کی شان کے لائق نہیں، اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿كَذٰلِكَ كَتَبْنَا لِیُوسُفَ﴾ [یوسف : ۷۶] ”اس طرح ہم نے یوسف کے لیے یہ تدبیر کی“ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے کیا، اس لیے یہ جائز تھا اور یہ کہ جائز مقصد کے لیے حیلہ کرنا (خواہ ناجائز ہو) جائز ہے۔ حالانکہ اگر غور سے آیات کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں یوسف علیہ السلام کے کسی حیلے یا سازش کا کوئی دخل ہی نہیں، یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تدبیر تھی جس کا پہلے یوسف علیہ السلام کو بھی علم نہیں تھا۔ واقعہ کی اصل صورت یہ ہے کہ پہلی دفعہ جب بھائی آئے تو یوسف علیہ السلام نے ان پر احسان کیا اور اپنے جوانوں سے کہہ کر ان کی رقم ان کی بور یوں میں ان کے علم کے بغیر رکھوا دی، جس کا علم انھیں گھر جا کر ہوا۔ اب ان کا سگا بھائی آیا تو انھوں نے اس کی خاص مدد کے لیے خاموشی سے کسی کو بھی بتائے بغیر اس کے سامان میں وہ پیمانہ خود ہی رکھ دیا کہ اس میں وہ مشقت نہ تھی جو دس بھائیوں کا سارا سامان واپس رکھنے میں تھی اور بھائیوں کے علم میں آنے سے حسد کا بھی خطرہ تھا، اس لیے اس چیز سے صرف وہ آگاہ تھے، دوسرا کوئی بھی آگاہ نہ تھا، قافلہ روانہ ہونے سے پہلے گودام کے محافظوں میں سے کسی کو پیمانے کی ضرورت پڑی، جب وہ نہ ملا تو حلاش شروع ہوئی، غور و فکر کیا گیا، کون چور ہو سکتا ہے، یہاں کون کون آیا ہے؟

ان بھائیوں کے سوا وہاں کوئی آیا ہی نہ تھا، اس لیے ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا کہ قافلے والو! تم چور ہو۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ چنانچہ ان کی آئندہ ساری گفتگو اس اعلان کرنے والے اور اس کے ساتھی گودام کے محافظوں سے ہوئی، جس میں انھوں نے خود ہی چور کی سزا بھی بتا دی جو ان کے ہاں رائج تھی، پھر ان محافظوں میں سے ایک

قَالُوا نَفَقْدُ صُوعًا الْمَلِكِ وَ لِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَ أَنَا بِهِ رَعِيمٌ ﴿۷۶﴾ قَالُوا تَاللّٰهِ
لَقَدْ عَلِمْتُمْ فَا جِئْتَنَا نِفْسِدَ فِي الْأَمْرِضِ وَ مَا كُنَّا سُرِقِينَ ﴿۷۷﴾ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُكَ إِن كُنْتُمْ
كَذِبِينَ ﴿۷۸﴾

انہوں نے کہا ہم بادشاہ کا پیانہ گم پاتے ہیں اور جو اسے لے آئے اس کے لیے ایک اونٹ کا بوجھ (غلہ) ہوگا اور میں اس کا ضامن ہوں ﴿۷۶﴾ انہوں نے کہا اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً تم جان چکے ہو کہ ہم اس لیے نہیں آئے کہ اس ملک میں فساد کریں اور نہ ہم کبھی چور تھے ﴿۷۷﴾ انہوں نے کہا پھر اس کی کیا جزا ہے، اگر تم جھوٹے ہوئے؟ ﴿۷۸﴾

نے ملاشی لی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تدبیر ہوئی کہ اس نے اتفاق سے پہلے دوسرے بھائیوں کے سامان کی پڑتال کی، پھر یوسف علیہ السلام کے بھائی کے سامان سے وہ پیانہ نکال لیا اور بھائیوں ہی کی بتائی ہوئی سزا کے مطابق اس بھائی کو روک لیا۔ یوسف علیہ السلام اس معاملے سے بالکل بے خبر تھے مگر جب بات یہاں تک پہنچی اور یوسف علیہ السلام کو اطلاع ملی تو انہوں نے اسے اللہ کی طرف سے تدبیر سمجھ کر خاموشی اختیار فرمائی، بھائی کے سامان سے مدعا برآمد ہونے کے بعد وہ اس کی صفائی دے بھی نہیں سکتے تھے، ورنہ الزام آتا کہ ایک ثابت شدہ مجرم کی طرف داری اور اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، جب کہ یوسف علیہ السلام جیسا شخص تہمت کا نشانہ بننے کے لیے بھی تیار نہ ہوتا۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کا دو انصاری صحابیوں کو بلا کر اپنے پاس کھڑی ہوئی خاتون کے متعلق بتانا کہ یہ صفیہ (میری بیوی) ہے، اس کی دلیل ہے۔ البتہ اپنی زبان سے اس بھائی کو چور بھی نہیں کہا۔ ان کی طبیعت کی پاکیزگی اور صدق کا اندازہ ان کی اس بات سے لگائیے کہ جب بھائیوں نے کہا کہ اس کے والد بہت بوڑھے بزرگ ہیں، آپ اسے جانے دیں اور ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ رکھ لیں تو یوسف علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم تو چور ہی کو پکڑیں گے بلکہ فرمایا کہ ہم تو اسی کو پکڑیں گے جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے۔ یہ تفسیر آیات کے بالکل مطابق صاف اور سادہ ہے اور اس میں یوسف علیہ السلام پر کوئی اعتراض نہیں آتا، جس کا جواب دینے کی ضرورت ہو۔

آیت 72 ﴿۱﴾ صُوعًا الْمَلِكِ: غلہ ماپنے کے آلے کو "صاع" یا "صواع" کہتے ہیں، اسی کو آیت (۷۰) میں "السِّقَايَةِ" (پینے کا برتن) کہا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غلے کی ناپائی کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت کا احساس دلانے کے لیے شاہی پیالہ گندم کے پیمانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اکثر مفسرین نے اسے چاندی کا لکھا ہے، بعض کہتے ہیں کہ سونے کا تھا، جس پر جواہر لگے تھے، لیکن صحیح اتنی بات ہی ہے کہ وہ کوئی قیمتی پیانہ تھا۔

﴿۲﴾ وَ لِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ: یعنی جو شخص تفتیش سے پہلے خود بخود وہ پیانہ لے آئے اسے ایک اونٹ غلہ انعام ملے گا۔

قَالُوا جَزَاؤُهُ مَنْ ذُو جِدٍ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ ۗ كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿۷۵﴾ قَبَدًا
بِأَوْعِيَّتِهِمْ قَبْلَ وَعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وَعَاءِ أَخِيهِ ۗ كَذَلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۗ مَا
كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۗ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَن نَّشَاءُ ۗ وَفَوْقَ
كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلَيْهِ ﴿۷۶﴾ قَالُوا إِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرِقَ أَخٌ لَّهُ مِنْ قَبْلُ ۗ فَأَسْرَهَا يُّوسُفَ فِي

انہوں نے کہا اس کی جزا وہ شخص ہے جس کے کجاوے میں وہ پایا جائے، سو وہ شخص ہی اس کی جزا ہے۔ اسی طرح ہم ظالموں کو جزا دیتے ہیں ﴿۷۵﴾ تو اس نے اس کے بھائی کے تھیلے سے پہلے ان کے تھیلوں سے ابتدا کی، پھر اسے اس کے بھائی کے تھیلے سے نکال لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی، ممکن نہ تھا کہ بادشاہ کے قانون میں وہ اپنے بھائی کو رکھ لیتا مگر یہ کہ اللہ چاہے، ہم جسے چاہتے ہیں درجوں میں بلند کر دیتے ہیں اور ہر علم والے سے اوپر ایک سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۷۶﴾ انہوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو بے شک اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی۔ تو یوسف نے اسے اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اسے ان کے لیے ظاہر نہیں کیا، کہا تم مرتبے میں

آیت 75 ﴿۷۵﴾ مَنْ ذُو جِدٍ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے ہاں چور کی سزا یہ تھی کہ وہ

مصدقہ چیز کے مالک کا ہمیشہ یا کچھ مدت کے لیے غلام یا قیدی بن جاتا۔ آیت میں مدت کی وضاحت نہیں ہے۔

آیت 76 ﴿۷۶﴾ قَبَدًا بِأَوْعِيَّتِهِمْ: یعنی بیانے کی گم شدگی کا اعلان کرنے والے نے (اللہ کی تدبیر کے مطابق)

اتفاق سے پہلے دوسرے بھائیوں کی بوریوں کی تلاشی لی اور آخر میں اس (یوسف) کے بھائی کے سامان کی تلاشی لی تو اس میں سے بیانہ نظر آ گیا جو اس تلاشی لینے والے نے نکال لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یوسف کے لیے یہ تدبیر ہم نے کی، بادشاہ مصر کے قانون کی رو سے وہ کسی طرح اپنے بھائی کو نہیں رکھ سکتے تھے، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ خود بھائیوں کے ہاں راج قانون کے مطابق جو انہوں نے خود بتایا، ان کے لیے بھائی کو یوسف علیہ السلام کے پاس چھوڑے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔

﴿۷۶﴾ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَن نَّشَاءُ: یعنی ہم جسے چاہتے ہیں علم عطا فرما کر اس کے درجے بلند کرتے ہیں، جیسے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں یوسف علیہ السلام کے درجے بلند کیے۔

﴿۷۷﴾ وَكُلُّوْا كُلَّ ذِي عِلْمٍ عَلَيْنَا: یعنی ہر جاننے والے سے بڑھ کر جاننے والا ہے۔ اس لیے کوئی شخص اس غرور میں مبتلا نہ ہو کہ مجھ سے بڑا عالم کوئی نہیں، اللہ تعالیٰ کو موسیٰ علیہ السلام کے منہ سے بے ساختہ نکلنے والا یہ لفظ بھی پسند نہ آیا، فرمایا، کیوں نہیں ہمارا بندہ خضر تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ غرض ہر عالم سے بڑا عالم موجود ہے، یہاں تک کہ تمام جاننے والوں کے اوپر وہ ذات پاک ہے جو حاضر و غائب ہر چیز کو پوری طرح جاننے والی ہے اور اس سے کوئی بات مخفی نہیں۔

آیت 77 ﴿۷۷﴾ فَقَدْ سَرِقَ أَخٌ لَّهُ مِنْ قَبْلُ: ان کا یہ اشارہ یوسف علیہ السلام کی طرف تھا، پہلے کہہ چکے تھے: ﴿مَا كُنَّا سَارِقِينَ﴾

کہ ہم کبھی چور نہیں تھے، لیکن اب جو دیکھا کہ چھوٹے بھائی کے پاس سے چوری کا مال نکل آیا ہے تو اپنی خفت مٹانے اور اپنی

نَفْسِهِ وَ لَمْ يُبَيِّدْهَا لَهُمْ ؕ قَالَ اَنْتُمْ شَرُّ نَفْسًا ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ﴿۱۰﴾ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ
اِنَّ لَكَ اَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَةً ؕ اِنَّا نُرِيكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۱﴾

زیادہ برے ہو اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو تم بیان کرتے ہو ﴿۱۰﴾ انہوں نے کہا اے عزیز! بے شک اس کا ایک بڑا
بوڑھا باپ ہے، سو تو ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ رکھ لے، بے شک ہم تجھے احسان کرنے والوں سے دیکھتے ہیں ﴿۱۱﴾

پاک بازی ظاہر کرنے کے لیے فوراً اپنے آپ کو اس بھائی سے الگ کر لیا اور اس کے جرم کو بہانہ بنا کر اس کے بھائی پر بھی
چوری کی جھوٹی تہمت لگا دی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے گم ہو جانے کے بعد اس بھائی کے ساتھ یہ بھائی کیا
سلوک کرتے رہے ہوں گے؟

یہاں مفسرین نے اسرائیلی روایات سے بچپن میں یوسف علیہ السلام کی چوری کے کچھ واقعات لکھے ہیں، جن کا قرآن و حدیث
میں کوئی ذکر نہیں اور جن سے یوسف علیہ السلام بالکل پاک ہیں، پھر یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے کہنے پر یوسف علیہ السلام کی چوری کے
واقعات کی تلاش تو تب کی جائے جب برادران یوسف نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، باپ کے پاس جھوٹ بولنے سے لے کر
یہاں اپنے تمام بھائیوں کی قسم دے کر کہ ہم میں سے کبھی کوئی چور نہیں رہا، فوراً ہی مدت سے گم شدہ بھائی پر بھی چوری کا بہتان
لگا دیا اور ہمارے بعض مفسرین کو فکر ہے کہ ان بھائیوں کے جھوٹ کو بیچ ثابت کرنے کے لیے یوسف علیہ السلام کی کوئی نہ کوئی چوری
ضرور ڈھونڈ نکالی جائے۔ [إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ]

﴿۲﴾ فَأَسْرَهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَ لَمْ يُبَيِّدْهَا لَهُمْ ؕ : کیونکہ اگر ظاہر کرتے تو وہ سمجھ لیتے کہ یہی یوسف ہے اور ابھی یہ راز کھولنے
کا وقت نہ آیا تھا۔ اتنے اونچے مقام پر ہونے کے باوجود اتنی تلخ تہمت کو دل میں چھپا کر صبر کرنا یوسف علیہ السلام کی کا
حوصلہ ہے۔

﴿۳﴾ قَالَ اَنْتُمْ شَرُّ نَفْسًا: یعنی یوسف نے چوری کی ہو یا نہ کی ہو مگر تمہارے چور ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کیونکہ تم نے
اسے باپ سے چرا کر کنوئیں میں پھینک دیا۔ مزید یہ غضب ڈھا رہے ہو کہ الٹا اپنے آپ کو پاک باز اور یوسف کو چور
بتاتے ہو؟

﴿۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ: یعنی تم جو یوسف پر چوری کا الزام لگا رہے ہو اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، تم جھوٹ
بول کر لوگوں کو دھوکا دے سکتے ہو مگر اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔

تیت 78 قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ اِنَّ لَكَ اَبًا اس کا باپ بہت بوڑھا ہے، وہ اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکے گا، پہلے
بھی آپ نے ہم پر بہت سے احسان کیے ہیں، بس اب اتنا احسان اور کر دیں کہ ہم میں سے کسی ایک کو اس کے بجائے رکھ
لیں، امید ہے کہ آپ ہمیں اپنے کرم سے مایوس نہیں کریں گے۔

قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَكَ إِذًا إِذْ نَظَلُّونَ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا اسْتَيْسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ۖ قَالَ كَبِيرُهُمْ أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكُمْ مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّظْتُمْ فِي يُوسُفَ ۖ فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ حَتَّى يَأْذَنَ لِي أَبِي أَوْ يَحْكُمَ اللَّهُ لِي ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿۸۰﴾

اس نے کہا اللہ کی پناہ کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے، یقیناً ہم تو اس وقت عالم ہوں گے ﴿۷۹﴾ پھر جب وہ اس سے بالکل ناامید ہو گئے تو مشورہ کرتے ہوئے الگ جا بیٹھے، ان کے بڑے نے کہا کیا تم نے نہیں جانا کہ تمہارا باپ تم سے اللہ کا عہد لے چکا ہے اور اس سے پہلے تم نے یوسف کے بارے میں جو کوتاہی کی، اب میں اس زمین سے ہرگز نہ ہلوں گا یہاں تک کہ میرا باپ مجھے اجازت دے، یا اللہ میرے لیے فیصلہ کر دے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿۸۰﴾

ت 79 قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ : یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو پاس رکھنا بھی چاہتے تھے اور چور بھی نہیں کہنا چاہتے تھے، ان کی کمال ذہانت اور کمال صدق دیکھیے کہ دونوں معنوں پر مشتمل الفاظ میں بھائی کو ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا۔ فرمایا کہ ہم اس بات سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ اس شخص کے سوا کسی اور کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے، اس صورت میں تو یقیناً ہم ظالم ہوں گے اور ہم ظلم نہیں کر سکتے۔

ت 80 ﴿۱﴾ فَلَمَّا اسْتَيْسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا: ”اسْتَيْسُوا“ یہاں ”يَسُوا“ (ناامید ہو گئے) کے معنی ہی میں ہے۔ باب استفعال مبالغہ کے لیے ہے، یعنی بالکل ناامید ہو گئے، جیسا کہ ”عَجِبَ“ اور ”اسْتَعْجَبَ“، ”سَجَرَ“ اور ”اسْتَسْحَرَ“ میں سین اور تاء محض مبالغہ کے لیے ہیں، معنی ایک ہی ہے۔ اس سے پہلے (آیت ۳۲) ”اسْتَعْصَمَ“ میں بھی یہی نکتہ ہے۔ ”خَلَصُوا“ یعنی کوئی اور ان میں موجود نہ تھا، اکیلے ہو کر مشورہ کرنے لگے۔ ”نَجِيًّا“ ”فَعِيلٌ“ کے وزن پر ہے، مشورہ، سرگوشی کرنے والے وغیرہ، یہ وزن واحد، تشبیہ، جمع اور مذکر مؤنث سب کے لیے اسی طرح آتا ہے، اس لیے ”خَلَصُوا“ کے ساتھ واحد ہی آیا ہے۔

﴿۲﴾ قَالَ كَبِيرُهُمْ أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ أَبَاكُمْ : ان کے بڑے نے کہا (مراد عمر میں بڑا ہے یا جو علم و فہم میں ان کا بڑا اور امیر تھا) کیا تمہیں معلوم نہیں کہ والد نے تم سے قسموں کے ساتھ پختہ عہد لیا تھا کہ بھائی کو اپنے ساتھ ضرور واپس لانا اور اس سے پہلے یوسف کے بارے میں جو کوتاہی تم نے کی، اب میں والد کے سامنے کیسے جاؤں گا، اپنے متعلق تو میں نے طے کر لیا ہے کہ میں اس سرزمین سے ہرگز جدا نہیں ہوں گا جب تک میرے والد مجھے واپسی کی اجازت نہ دیں، یا اللہ میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرے کہ بھائی کی رہائی کی کوئی صورت نکل آئے یا میری موت آجائے۔

اِذْجِعُوا إِلَىٰ آبَائِكُمْ فَقُولُوا يَا أَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمْنَا وَ مَا كُنَّا
 لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ ﴿۸۱﴾ وَسَأَلَ الْقُرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿۸۲﴾
 قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَبِيلٌ ۗ عَسَىٰ اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا
 إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۸۳﴾

اپنے باپ کی طرف واپس جاؤ، پس کہو اے ہمارے باپ! بے شک تیرے بیٹے نے چوری کر لی اور ہم نے شہادت
 نہیں دی مگر اس کے مطابق جو ہم نے جانا اور ہم غیب کی حفاظت کرنے والے نہ تھے ﴿۸۱﴾ اور اس ہستی سے پوچھ لے
 جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے بھی جس میں ہم آئے ہیں اور بلاشبہ ہم یقیناً سچے ہیں ﴿۸۲﴾ اس نے کہا بلکہ تمہارے
 لیے تمہارے دلوں نے ایک کام مزین کر دیا ہے، سو (میرا کام) اچھا صبر ہے، امید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے
 پاس لے آئے گا، یقیناً وہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۸۳﴾

آیت 81 ﴿۱﴾ اِذْجِعُوا إِلَىٰ آبَائِكُمْ : البتہ تم واپس جا کر والد کو بتاؤ کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے، اگر تم بھی
 واپس نہ گئے تو والد اور زیادہ پریشان ہوں گے کہ شاید تمام بیٹے ہی گرفتار ہو گئے، یا ان کا کیا بنا، اس لیے واپس جا کر انہیں
 حقیقت حال سے آگاہ کرو۔

﴿۲﴾ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمْنَا : اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ ہم نے بھائی کے چور ہونے کی شہادت اپنے علم
 ہی کے مطابق دی ہے، کیونکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس کے سامان سے پیانا نہ نکلتا، ہوا دیکھا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم نے عزیز مصر کو
 جو مسئلہ بتایا کہ چور کی یہ سزا ہے تو وہ ہم نے اپنے علم ہی کے مطابق بتایا کہ ہمارے باپ دادا کی شریعت کے مطابق اس کا یہ حکم ہے۔
 ﴿۳﴾ وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ : یعنی جب ہم نے آپ کو قسم کھا کر عہد دیا تھا، ہمیں غیب کا علم تو نہیں تھا کہ بھائی مصر میں
 جا کر چوری کرے گا، ورنہ ہم اسے اپنے ساتھ کیوں لے جاتے، یا آپ کو یہ پختہ عہد کیوں دیتے کہ اسے اپنے ساتھ
 ضرور واپس لائیں گے۔

آیت 82 ﴿۱﴾ وَسَأَلَ الْقُرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا : اس میں انھوں نے اپنی صفائی کے لیے تین چیزیں بتائیں : ﴿۱﴾ اس ہستی
 (والوں) سے پوچھ لیں جس میں ہم تھے۔ ﴿۲﴾ اس قافلے (والوں) سے بھی جس کے ساتھ ہم آئے ہیں۔ ﴿۳﴾ اور (قسم ہے
 کہ) بے شک ہم یقیناً سچے ہیں۔ اپنی صفائی میں اتنی شہادتیں پیش کرنے کا باعث یہ تھا کہ انھیں معلوم تھا کہ والد ہماری بات
 پر اعتبار نہیں کریں گے۔

آیت 82 ﴿۱﴾ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ : جب بڑے بھائی کی تجویز کے مطابق باقی بھائیوں نے کنعان پہنچ کر اپنے والد
 یعقوب علیہ السلام سے یہ سب کچھ بیان کیا تو انھوں نے کہا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اصل بات یہ نہیں بلکہ تمہارے دلوں نے تمہارے

وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسْفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَأَبْيَضَّتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ﴿۸۴﴾

اور وہ ان سے واپس پھرا اور اس نے کہا ہائے میرا غم یوسف پر! اور اس کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں، پس وہ غم سے بھرا ہوا تھا ﴿۸۴﴾

لیے ایک کام مزین کر دیا ہے، اب میرا کام صبر جمیل ہے۔ وہی لفظ منہ سے نکلا جو یوسف کو بھڑیے کے کھائے جانے کی خبر سن کر نکلا تھا۔ اللہ اپنے بندوں خصوصاً رسولوں کو کتنا بڑا حوصلہ دیتا ہے کہ جگر ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی خبر سن کر بھی نہ شکوہ نہ شکایت، نہ جزع فزع نہ دادیلا۔ پہلے ایک بیٹے کی خبر پر بھی صبر جمیل، اب مزید دو بیٹوں کی خبر پر بھی وہی صبر جمیل۔ پہلے بھی اللہ ہی سے مدد مانگی: ﴿وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ﴾ [یوسف: ۱۸] اب بھی اسی کے سہارے پر دل میں امید کا چراغ روشن رکھا: ﴿عَسَىٰ اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا﴾ امید ہے کہ اللہ ان تینوں کو میرے پاس لے آئے گا، یقیناً وہی علیم و حکیم ہے، وہ سب کچھ جانتا بھی ہے اور اس کی حکمتوں کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

② اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے کی کچی بات کا بھی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ رہی یہ بات کہ یعقوب علیہ السلام کس طرح ان سب کی ملاقات کی امید ظاہر فرما رہے ہیں، تو ایک تو یہ کہ وہ اللہ کے نبی تھے اور دوسرے یہ کہ انھیں یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر سامنے آنے کا بھی یقین تھا، مگر پیارے بیٹے کی جدائی پھر لخت جگر کے حال سے بے خبری اور تعبیر کے ظہور کا وقت نامعلوم ہونے اور اب مزید دو بیٹوں کی گم شدگی کے پیہم صدمات اور انھیں دل ہی دل میں پی جانے کی کوشش نے یعقوب علیہ السلام کی طبیعت پر بہت ہی زیادہ اثر ڈالا۔

تہ 84 ﴿۱﴾ وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسْفَىٰ : ”یا اسفٰی“ اصل میں یائے متکلم کے ساتھ ”یا اسفٰی“ تھا، تخفیف اور اظہار غم کے لیے یاء کو الف سے بدل دیا ہے۔ ﴿وَأَبْيَضَّتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحُزْنِ﴾ ”غم سے اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں“ یعنی آنسوؤں کے متواتر بہنے سے آنکھوں کی سیاہی پر سفیدی چھا گئی اور بینائی خراب ہو گئی۔ ”کَظِيمٌ“ بمعنی ”مَكْظُومٌ“ ہے جو غم سے بھرا ہوا ہو، لیکن لوگوں سے چھپائے اور اظہار نہ کرے۔ اسی سے ہے: ﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾ [آل عمران: ۱۳۴] یعنی غصے کو روک لینے والے۔ ”كُظِمَ فَلَاقَ السَّفَاءَ“ یعنی فلاں نے بھرے ہوئے مشکیزے کا منہ بند کر دیا۔ یعنی یعقوب علیہ السلام نے جب بیٹوں کی بات سن لی اور انھیں جواب دے دیا تو ان پر غموں کا سیلاب اٹھ آیا اور دل کے تمام زخم تازہ ہو گئے، چنانچہ انھوں نے بیٹوں کو چھوڑا اور مجلس سے چلے گئے اور کہنے لگے: ”ہائے میرا یوسف کا غم“ اور ان کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں، مگر غم سے بھرے ہوئے ہونے کے باوجود اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ رہ گیا دل کا غم اور مصیبت میں رونا اور آنسو بہانا تو یہ جائز ہے اور انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ابراہیم فوت ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا: ﴿إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ وَلَا نَقُولُ إِلَّا مَا يُرْضَىٰ رَبَّنَا وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمَ! إِنَّا لَمَحْزُونُونَ﴾ [بخاری، الحناظر، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم إنا بك لمحزونون: ۱۳۰۳۔

قَالُوا تَاللّٰهِ تَفْتُوْا تَذَكَّرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ
اِنَّمَا اَشْكُوْا بَنِيَّ وَ حُزْنِيَّ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

انہوں نے کہا اللہ کی قسم! تو ہمیشہ یوسف کو یاد کرتا رہے گا، یہاں تک کہ گھل کر مرنے کے قریب ہو جائے، یا ہلاک ہونے والوں سے ہو جائے ﴿۸۵﴾ اس نے کہا میں تو اپنی ظاہر ہو جانے والی بے قراری اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۸۶﴾

مسلم: ۲۳۱۵۰ ”بے شک آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل غمگین ہے اور ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہتے جو ہمارے رب کو پسند ہو اور بے شک ہم تیری جدائی سے اے ابراہیم! یقیناً غم زدہ ہیں۔“ ہاں مصیبت کے وقت نوحہ کرنا، گریبان پھاڑنا اور منہ پر طمانچہ مارنا سخت ممنوع ہے۔

﴿۸۶﴾ اگرچہ خبر دوسرے دو بیٹوں کی آئی تھی مگر یعقوب علیہ السلام کے منہ سے یوسف پر غم کی شدت کے الفاظ نکلے، اس کی وجہ یہ تھی کہ زخم کے اوپر جب زخم لگے تو پہلا زخم زیادہ تکلیف دیتا ہے۔ ”وَلٰكِنْ نَّكَّأُ الْجُرْحَ بِالْجُرْحِ اَوْ جَعُ“ لیکن زخم کا نئے زخم سے پھل جانا زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔“

آیت 85 قَالُوا تَاللّٰهِ تَفْتُوْا..... : تا، قسم کے لیے ہوتی ہے، لفظ ”اللہ“ پر آتی ہے اور عموماً ایسے موقع پر قسم کے لیے آتی ہے جس میں کوئی تعجب ہو۔ ”فَتَبَيَّنْتُ يَضْمًا“ ہٹ جانا، بھول جانا۔ اس سے پہلے عموماً ”مَا“ آتا ہے اور معنی ہمیشہ رہنا، نہ بھولنا ہوتا ہے، یہاں بھی اصل ”مَا نَفْتُوْا“ تھا، ”مَا“ کو معلوم ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا ہے، یعنی تو ہمیشہ یوسف کو یاد کرتا رہے گا، اسے نہیں بھولے گا، اسے یاد کرنے سے باز نہیں آئے گا۔ بیٹوں اور پوتوں کو، باپ کی حالت زار دیکھ کر رحم آتا تھا، جب ان کا غم اس حد تک پہنچ گیا تو انہوں نے باپ سے کہا کہ اللہ کی قسم! آپ یوسف کو اسی طرح ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے حتیٰ کہ گھل گھل کر مرنے کے قریب ہو جائیں گے، یا ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ گویا وہ انھیں صبر کی تلقین اور اس قدر غم پر ملامت کر رہے تھے۔

آیت 85 ﴿۱﴾ اِنَّمَا اَشْكُوْا بَنِيَّ..... : ”بٹ بٹ“ کا لفظی معنی پھیلانا ہے، فرمایا: ﴿وَبَكَ وَهْتًا رِجَالًا كَثِيْرًا وَنِسَاءً﴾ النساء: ۱ ”اور ان دونوں میں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔“ ”بٹ الرِّيحِ التُّرَابَ“ ”ہوانے مٹی اڑائی۔“ آدمی پر جب مصائب آئیں تو ان سے پیدا ہونے والے جس غم کو وہ چھپا سکے وہ حزن کہلاتا ہے اور جو چھپا نہ سکے ”بٹ“ کہلاتا ہے۔ اس آیت پر شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”یعنی تم کیا مجھے صبر سکھاؤ گے، بے صبر وہ ہے جو خلق کے آگے شکایت کرے خالق کی، میں تو اسی سے کہتا ہوں جس نے درد دیا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھ پر آزمائش ہے، دیکھوں کس حد کو پہنچ کر بس ہو۔“ (موضح)

يُنْفِقْ أَذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوْسُفَ وَ آخِيهِ وَ لَا تَأْيِسُوا مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَأْسُ
مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُونَ ﴿۵۷﴾

اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں ﴿۵۷﴾

حقیقت یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے غم کا جو حال اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے وہ پڑھ اور سن کر ہی دل سخت غم زدہ ہو جاتا ہے، پھر خود ان کا کیا حال ہوگا۔ عبد اللہ بن شداد کہتے ہیں کہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کے روتے ہوئے دھاڑیں مارنے کی آواز سنی، حالانکہ میں صفوں کے آخر میں تھا، وہ یہ پڑھ رہے تھے: ﴿ اِنَّمَا اَشْكُو بَرِّيٓ وَ حَزْنِيٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [بخاری، الاذان، باب اذا بكى الإمام فى الصلاة، قیل ح: ۱۷۱۶]

﴿۲﴾ وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ : یعنی یوسف زندہ ہیں اور ایک دن ایسا آئے گا کہ میرے اور تمہارے سجدہ کرنے کا خواب جو انہوں نے دیکھا تھا، سچا ہوگا، مجھے اس کا پورا یقین ہے اور اللہ تعالیٰ میری یہ امید برلائے گا۔ اتنی مدت گزرنے اور اتنے غم کے باوجود جس میں یوسف علیہ السلام کی زندگی کی امید باقی رہنا بھی ممکن نظر نہیں آتا، ان کی ملاقات کی امید رکھنا یعقوب علیہ السلام کے کمال ایمان کا نتیجہ ہے۔

آیت ۸۷ ﴿۱﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَتَحَسَّسُوْا.....: ”ببین“ ”اہل“ کی جمع ہے، یا، کی طرف مضاف ہوا تو نون گر گیا، یا، کو یائے متکلم میں ادغام کر کے آخر میں نصب دے دی۔ ”تَحَسَّسَ“ کا معنی ہے کسی چیز کو بار بار دیکھنا اور صبر کے ساتھ بذریعہ حواس تلاش کرنا۔ (الوسیط) ”رَوْحِ اللّٰهِ“ ”رُوح“ کا اصل معنی سانس لینا ہے، کہا جاتا ہے ”أَرْاحَ الْإِنْسَانِ“ ”انسان نے سانس لیا۔“ (مفردات) مراد اللہ کی طرف سے کشادگی و رحمت ہے، گلا گھٹ جانے اور سانس بند ہونے کے بعد سانس آنے میں جو راحت و لذت ہے وہ اللہ کی رحمت کا ایک نمونہ ہے، یعنی جاؤ اور اس بھائی کے ساتھ مل کر جو وہاں رہ گیا ہے، یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش کی پوری کوشش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔

﴿۲﴾ اِلَّا الْقَوْمَ الْكٰفِرُونَ : جو اس کی قدرت کا صحیح علم نہیں رکھتے، اس کے برعکس مومن کو خواہ کیسے ہی حوصلہ شکن اور مایوس کن حالات پیش آئیں وہ کبھی اپنے مالک کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوسی کافر کی صفت ہے، مومن کی نہیں۔ یہ نہیں کہ مایوس ہو جانے والا کافر اور مرتد ہو جاتا ہے، بلکہ جس طرح جھوٹ منافق کی ایک صفت ہے، مومن کی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكٰذِبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِآيٰتِ اللّٰهِ ﴾ [المحلل: ۱۰۵]

”جھوٹ تو وہی لوگ باندھتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے۔“ مگر جھوٹ سے انسان کا کفر اس کفر سے کم تر ہے جو اسے ایمان سے خارج کر کے مرتد بنا دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی رحمت سے مایوسی کافر کی ایک صفت ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسْنَا وَ أَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ
قَاؤِفٍ لَنَا الْكَيْلُ وَ تَصَدَّقَ عَلَيْنَا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿۸۸﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا
فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَ أَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ بَهِلُونَ ﴿۸۹﴾

پھر جب وہ اس کے پاس داخل ہوئے تو انھوں نے کہا اے عزیز! ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو تکلیف پہنچی ہے اور ہم حقیر سی پونجی لے کر آئے ہیں، سو ہمارے لیے ماپ پورا دے دے اور ہم پر صدقہ کر، یقیناً اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے ﴿۸۸﴾ اس نے کہا کیا تم نے جانا کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا، جب تم نادان تھے؟ ﴿۸۹﴾

آیت 88 فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ.....: ”مُزْجَاةٌ“ ”أَزْجَى يُزْجَى إِزْجَاءً“ (ناقص وادی) دفع کرنا، ہٹانا، دھکیلنا، یعنی (غلے کے لیے) ایسی قیمت جسے کوئی خوشی سے قبول نہیں کرتا۔ باپ کے حکم پر تیاری کر کے بیٹے تیسری مرتبہ مصر کے لیے روانہ ہو گئے اور عزیز مصر سے ملے، جس نے ان کے بھائی کو روک رکھا تھا۔ اسے ادب کے ساتھ لقب سے مخاطب کر کے اپنی اور اپنے گھر والوں کی خستہ حالی اور بے چارگی بیان کی کہ ہم پر اور ہمارے گھر والوں پر قحط، خشک سالی، بیڑوں کی جدائی سے والد کی حالت اور کئی مصیبتوں کی وجہ سے سخت تکلیف آ پڑی ہے اور غلے کے لیے ہم صحیح قیمت کا بندوبست نہیں کر سکے، محض اتنی سی پونجی لے کر آئے ہیں جو خوشی سے کوئی قبول نہیں کرتا اور وہ نہ اس قابل ہے کہ آپ اس کے بدلے ہمیں غلہ دیں، اس لیے آپ ہم پر احسان کریں کہ اس قیمت کا جتنا غلہ بنتا ہے وہ پورا دے کر اس سے زیادہ دے دیں، یا قیمت سے چشم پوشی کر کے ایک ایک اونٹ غلہ پورا ہی دے دیں، تو یہ آپ کا ہم پر صدقہ ہوگا۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”قحط میں اسباب گھر کا بک گیا، اب کی بار اون اور پنیر اور ایسی چیزیں لائے تھے اناج خریدنے کو، یہ حال سن کر یوسف علیہ السلام کو رحم آیا، اپنے تئیں (اپنے آپ کو) ظاہر کیا اور سارے گھر کو بلوایا۔“ (موضح)

آیت 89 ﴿۱﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَ أَخِيهِ: بھائیوں کی بے بسی و درماندگی دیکھ کر اور صدقہ کے سوال پر یوسف علیہ السلام کا دل بھرا آیا اور معاملے کو مزید طول دینے کی تاب نہ رہی اور وہ وقت آ گیا جس کے متعلق کنوئیں میں اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی تھی کہ یہ لوگ جو کچھ اب کر رہے ہیں ایک وقت ضرور آئے گا جب تم انھیں اس کی خبر دو گے اور یہ سوچتے بھی نہ ہوں گے۔ چنانچہ کچھ ناراضگی کا اظہار اور زیادہ تر ان کی غلطی کا عذر خود ہی کرتے ہوئے فرمایا، کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا، جب تم نادان تھے؟

﴿۲﴾ إِذْ أَنْتُمْ بَهِلُونَ: یعنی جو کچھ تم نے کیا اس کی وجہ تمہاری نادانی اور بے وقوفی تھی۔ یوسف علیہ السلام بھائیوں کو ان کی حرکت یاد دلاتے ہوئے کہہ سکتے تھے: ”وَ أَنْتُمْ ظَالِمُونَ“ کہ جب تم ظلم کر رہے تھے، مگر اس خیال سے کہ وہ شرمندہ نہ ہوں خود ہی

قَالُوا إِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَذَا أَخِي قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ مَنَّ يَسْتَقِي وَيَصْبِرُ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۹۰﴾ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ أَشْرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَطِئِينَ ﴿۹۱﴾

انہوں نے کہا کیا یقیناً واقعی تو ہی یوسف ہے؟ کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، یقیناً اللہ نے ہم پر احسان فرمایا ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ﴿۹۰﴾ انہوں نے کہا اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً اللہ نے تجھے ہم پر فوقیت دی ہے اور بلاشبہ ہم واقعی خطا کار تھے ﴿۹۱﴾

ان کے لیے معذرت کا پہلو نکال دیا۔ یہ انتہائی مروت کا مقام ہے جس کی توقع ایک نبی ہی سے ہو سکتی ہے۔

آیت ۹۰ ﴿۱﴾ قَالُوا إِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ : بھائیوں کو یہ سن کر دھچکا لگا کہ برسوں پرانی بات جو ہمارے سوا کوئی نہیں جانتا، اس اجنبی سرزمین میں جاننے والا یہ کون نکل آیا؟ پھر ان کے نقوش پر غور کرتے ہوئے فوراً نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ تو ہمارا وہی ستم رسیدہ بھائی یوسف ہے، پھر حیرت، تعجب اور دہشت کے طے جملے جذبات کے ساتھ اس بات کا سوال کیا جسے تاکید کے تین طریقوں سے یقینی بھی قرار دیا ”کیا یقیناً واقعی تو ہی یوسف ہے۔“ ”اِنَّ“، لام تاکید اور ”اِنَّكَ“ کے بعد پھر ”اَنْتَ“ کے ساتھ تاکید، اتنے یقین کے باوجود سوال ہے جس میں کچھ شک بھی ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَذَا أَخِي : فرمایا ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ ان دو لفظوں میں یوسف نے وہ ساری داستان دو لفظوں میں دہرا دی جو ان بھائیوں کے ہاتھوں ان پر گزری تھی، جو پوری طرح بیان میں آ بھی نہیں سکتی تھی اور یوسف علیہ السلام کے غمو و درگزر کے مطابق نہ اس کا موقع تھا۔

﴿۳﴾ قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا : کہ مصیبت سے نجات دے کر دونوں کو ملا دیا اور اس بلند مرتبہ مقام پر پہنچا دیا جسے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔

﴿۴﴾ إِنَّهُ مَنَّ يَسْتَقِي وَيَصْبِرُ : یعنی حرام کام اور نافرمانی سے بچتا رہے اور اللہ کے احکام کی پابندی اور پیش آنے والی مصیبتوں اور اللہ کی تقدیر پر صبر کرے۔

﴿۵﴾ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”جس پر تکلیف پڑے اور وہ شرع سے باہر نہ ہو اور گھبرائے نہیں تو آخر بلا (تکلیف) سے زیادہ عطا ہے۔“ (موضح)

آیت ۹۱ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ أَشْرَكَ اللَّهُ : بھائیوں کے سامنے اپنے ظلم و ستم کا وہ سارا منظر آ گیا جو ان کے ہاتھوں ہوا تھا تو انہوں نے قسم کھا کر اعتراف کیا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے آپ کو صبر، تقویٰ اور دوسری صفات حسنہ کی وجہ سے ہم پر برتری اور فوقیت عطا فرمائی ہے۔ ”وَإِنْ كُنَّا“ اصل میں ”إِنَّا كُنَّا“ تھا، جس کی دلیل ”خَاطِئِينَ“ پر آنے والا لام ہے۔ ”اِنَّ“ اور لام کے ساتھ تاکید بھی قسم ہی کی ایک صورت ہے کہ یقیناً ہم آپ پر ظلم کر کے جانتے بوجھتے ہوئے غلط اور گناہ کا کام کرنے

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَعْفُرُ اللهُ لَكُمْ ۗ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّحِيْمِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِذْهُبُوا بِقِيْصِيْ
هٰذَا فَالْقَوْهُ عَلَىٰ وَجْهِ اَبْنِيْ يَاتٍ بَصِيْرًا ۗ وَ اَنْوِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

اس نے کہا آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمہیں بخشے اور وہ رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ﴿۱۷﴾
میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، وہ مینا ہو جائے گا اور اپنے گھر والوں کو، سب کو
میرے پاس لے آؤ ﴿۱۸﴾

والے تھے۔ ”مُحَاطِبِيْنَ“ اور ”مُحَطِبِيْنَ“ کے فرق کے لیے دیکھیے آیت (۲۹) کی تفسیر۔ بھائیوں کے اعتراف گناہ کے بعد
یوسف ﷺ کی سینے کی وسعت اور حوصلہ مندی دیکھیے، ابھی انھوں نے صرف گناہ کا اعتراف اور عذر ہی کیا ہے، معافی مانگنے کی
نوبت آنے سے پہلے ہی بول اٹھے: ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ کہ آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔

آیت 92 ﴿قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾: ”تثريب“ کے معنی ملامت، ڈانٹ ڈپٹ، گناہ یاد دلانا سبھی آتے ہیں۔
فرمایا تمہیں ہرگز کوئی ملامت نہیں کرتا، نہ ڈانٹ ڈپٹ، نہ تمہیں کوئی یہ زیادتی یاد دلائے گا۔ ”الْيَوْمَ“ کا معنی صرف آج کا
دن نہیں بلکہ مطلق زمانے کے لیے ہے، یعنی اب آئندہ تم پر کوئی ملامت نہیں۔

۲) یہ ہے شان نبوت، اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو ایسے قصور واروں پر قابو پالینے کے بعد انہیں ہرگز معاف نہ کرتا۔ یہی سلوک
نبی ﷺ نے فتح مکہ کے بعد وہاں کے رہنے والوں سے فرمایا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ (فتح مکہ کے دن) قریش کے
سرदारوں اور بڑے بڑے لوگوں نے کعبہ میں پناہ لی، رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، بیت اللہ کا طواف کیا اور ان (۳۶۰)
بتوں کے پاس سے گزرتے ہوئے انھیں کمان کے کنارے کے ساتھ ٹھوکا مارتے گئے اور یہ فرماتے گئے: ﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ
الْبَاطِلُ ۗ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوًّا﴾ [نبی اسرائیل: ۸۱] جب فارغ ہوئے اور نماز پڑھ لی تو آکر دروازے کی چوکھٹ کے
دونوں کناروں کو پکڑا، پھر فرمایا: ”اے معشر قریش! (بولو) کیا کہتے ہو؟“ انھوں نے کہا: ”ہم کہتے ہیں (آپ) رحیم و کریم بھیجے
اور پچھا زاد (بھائی) ہیں۔“ آپ نے پھر ان کے سامنے اپنی بات دہرائی، انھوں نے وہی جواب دیا، تو آپ نے فرمایا: ”پھر میں
وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے کہا تھا: ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَعْفُرُ اللهُ لَكُمْ ۗ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّحِيْمِيْنَ﴾ چنانچہ
وہ سب نکل آئے اور آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی۔ [سنن الکبریٰ للنسائی: ۳۸۲، ۳۸۲/۶، ۳۸۲، ۳۸۲/۸] یہ ہے اصل
صلہ رحمی، عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ الْوَالِصِلُ بِالْمُكَافِي ۗ وَلٰكِنَّ الْوَالِصِلُ
الَّذِيْ اِذَا قُطِعَتْ رَحْمَتُهُ وَصَلَّتْهَا﴾ [بخاری، الأدب، باب لیس الواصل بالمکافی: ۵۹۹۱] ”صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو
صلہ رحمی کے مقابلے میں صلہ رحمی کرتا ہے، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کی رشتہ داری قطع کی جائے تو وہ اسے ملائے۔“
﴿يَعْفُرُ اللهُ لَكُمْ﴾ : یوسف ﷺ نے نہ صرف انہیں معاف فرما دیا بلکہ ان کی درخواست کے بغیر ان کے لیے اللہ تعالیٰ
سے مغفرت و رحم کی دعا بھی کر دی۔

آیت 93 اِذْهُبُوا بِقِيْصِيْ : بھائیوں کو معاف کر دینے کے بعد گھر کے حالات کا تذکرہ ہوا، والد کے نابینا ہونے

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ أَبُوهُمَ إِنِّي لَأَجِدُ رِيْحَ يُوسُفَ لَوْ لَأَن تَقْعُدُوْنَ ﴿۹۴﴾

اور جب قافلہ جدا ہوا، ان کے باپ نے کہا بے شک میں تو یوسف کی خوشبو پارہا ہوں، اگر یہ نہ ہو کہ تم مجھے بہکا ہوا کہو گے ﴿۹۴﴾

کی خبر پر ان کے علاج کے لیے اپنی قمیص بھیجی اور اپنے سارے گھر والوں کو اپنے پاس مصر میں لانے کا حکم دیا۔ یہ قمیص بھی عجیب تھی، کبھی یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے کے کھا جانے کے ثبوت پر پیش کی گئی اور والد کو نابینا کر گئی اور کبھی یوسف علیہ السلام پر ارادہ زنا کی تہمت لگی تو یہ ان کی صفائی بن گئی، اب اللہ کا حکم ہوا تو یعقوب علیہ السلام کی بیٹائی واپس ملنے کا ذریعہ بن گئی۔ یہ سب میرے مالک کی قدرت و مشیت ہے: ﴿فَسُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْمٰیہٗ مَا لَکُمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّ اِنَّہٗ لَیَرْجِعُوْنَ﴾ [یس: ۸۲] ”سو پاک ہے وہ کہ اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی کامل بادشاہی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔“ شاہ عبدالقادر رکنی لکھتے ہیں: ”یعنی ہر مرض کی اللہ کے ہاں دوا ہے، ایک شخص کے فراق میں یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں ضائع ہو گئیں، اس کے بدن کی چیز ملنے سے درست ہو گئیں، یہ یوسف علیہ السلام کی کرامت تھی۔“ (موضح) اور خوشی کی شدت سے بیٹائی میں قوت پیدا ہو جانا طبعی طور پر ثابت ہے۔ (رازی) مگر طبعی طور پر اس کی کوئی مثال ہمارے سامنے نہیں کہ خوشی سے نابینا بیٹا ہو جائے، اس لیے اسے معجزہ ہی کہا جائے گا۔

سیت 94 ﴿۱﴾ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ اس سے انبیاء کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کا اندازہ ہوتا ہے اور اس حقیقت کا بھی کہ خود ان کے پاس کتنا علم ہوتا ہے۔ یہی قمیص تھی، اسی راستے سے آئی تھی، چند میل دور کنویں میں پڑے ہوئے لخت جگر کا علم نہ ہو۔ کا، نہ اس کی خوشبو آئی اور جب اللہ تعالیٰ نے بتایا تو قافلے کے نکلنے ہی یوسف علیہ السلام کی خوشبو آنا شروع ہو گئی۔ یہ واقعہ ان بے شمار دلائل میں سے ایک واضح دلیل ہے کہ انبیاء عالم الغیب نہیں ہوتے، ہاں جتنی بات انھیں وحی کے ذریعے سے بتائی جاتی ہے وہ انھیں معلوم ہو جاتی ہے اور یہی عام آدمی اور نبی کا فرق ہے کہ نبی کو وحی الہی ہوتی ہے، دوسرے اس نعمت سے محروم ہیں۔ اس بات کو شیخ سعدی نے کمال خوبی کے ساتھ ”گلستان“ میں نظم کیا ہے۔

کے پر سید ازاں گم کردہ فرزند کہ اے روشن گہر پیر خردمند
زمرش بونے پیرا بن شمیدی چرا درچاہ کفناش ندیدی
بلغت احوال ما برقی جہان است دے پیدا و دیگر دم نہان ست
گہے برطارم اعلیٰ نشینم گہے برپشت پائے خود نہ بنینم

”یعنی کسی نے اس فرزند کو گم کر دینے والے سے پوچھا کہ اے روشن نسب والے عقل مند بزرگ! تو نے مصر سے اس کی قمیص کی خوشبو پالی، تو نے اسے کنعان کے کنویں میں کیوں نہ دیکھا، اس نے کہا ہمارے (انبیاء کے) احوال کو نہ دیکھنے والی بجلی کی طرح ہیں، ایک دم ظاہر ہوتے اور دوسرے لمحے پوشیدہ ہو جاتے ہیں، کبھی ہم اعلیٰ و بلند مقام پر بیٹھے ہوتے ہیں، کبھی ہم اپنے

قَالُوا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِي ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّا اَنَّ جَاءَ الْبَشِيْرَ اَلْقَاهُ عَلٰى وُجْهِهِ فَازْتَدَدَ
بَصِيْرًا ؕ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ؕ اِنِّيْ اَمْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوا يَا اَبَانَا اَسْتَغْفِرُكَ
دُؤْبَابًا اِنَّا كُنَّا خٰطِيْنَ ﴿۹۷﴾

انھوں نے کہا اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً تو اپنی پرانی بھول ہی میں ہے ﴿۹۵﴾ پھر جیسے ہی خوش خبری دینے والا آیا اس نے اسے اس کے چہرے پر ڈالا تو وہ پھر بیٹا ہو گیا۔ کہنے لگا کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ بے شک میں اللہ کی طرف سے جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۹۶﴾ انھوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی بخشش کی دعا کر، یقیناً ہم خطا کار تھے ﴿۹۷﴾

پاؤں کی پشت پر (لگی چیز) نہیں دیکھتے۔“ آخری شعر کے پہلے مصرع میں رسول اللہ ﷺ کے معراج کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے میں جبریل علیہ السلام کے نماز کے دوران میں آ کر بتانے کی طرف کہ آپ ﷺ کے جوتے پر نجاست لگی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے جوتے نماز ہی میں اتار دیے۔

﴿۹۵﴾ لَوْلَا اَنْ تَفْقِدُوْنَ: یعنی اگر یہ نہ ہو کہ تم کہو گے کہ بڑھاپے اور یوسف کی محبت کی وجہ سے میری عقل میں خلل پڑ گیا ہے۔

آیت 95 قَالُوا تَاللّٰهِ اِنَّكَ.....: یعقوب علیہ السلام کے پاس اس وقت بیٹوں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا، پوتوں نے بھی باپوں والا رویہ اختیار کیا۔ اب ان الفاظ کو ان کی طرف سے بابا کے لیے تسلی کہا جائے یا ملامت؟ واللہ! ان کا حق نہ تھا کہ دادا کو جو اللہ کے پیغمبر بھی تھے، یہ لفظ کہتے۔ ہاں ان کی طرف سے ایک عذر ہو سکتا ہے کہ بادیہ کے معاشرے میں باہمی بے تکلفی حتیٰ کہ والدین اور اولاد کے درمیان بھی بے تکلفی نے ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلوا دیے ہوں اور وہ اپنے خیال میں تسلی دے رہے ہوں کہ بابا! پرانی بات بھول بھی جاؤ، مگر جو اتنے سال بھلایا نہیں جا سکا اب ایسی باتوں سے کیسے بھلایا جا سکے گا۔

آیت 96 ﴿۹۶﴾ فَلَمَّا اَنَّ جَاءَ الْبَشِيْرَ اور ”فَلَمَّا بَحَا الْبَشِيْرُ“ کے ترجمے کے فرق کی تفصیل کے لیے دیکھیے اسی مترجم قرآن کے عرض مترجم میں سے فائدہ (۸) خوش خبری لانے والے نے آتے ہی چہرے پر قمیص ڈالی اور یوسف علیہ السلام کے زندہ ہونے کی خوش خبری دی تو اسی وقت آنکھیں دوبارہ روشن ہو گئیں۔

﴿۹۷﴾ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: یوسف علیہ السلام کی قمیص سے آنکھیں روشن ہونے اور ان کے زندہ ہونے کی خوش خبری آنے پر فرمایا کہ میں نے تمہیں کہا نہ تھا: ﴿اِنِّيْ اَمْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی مجھے وحی الہی سے وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جو تم نہیں جانتے۔ مراد اپنے بچوں کو ملامت کرنا نہ تھا بلکہ تربیت کرنا تھا، تاکہ وہ نبوت کے مقام کو سمجھیں اور نبی کی بات کو محبت کے غلو پر یا عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے خرابی عقل پر محمول نہ کریں، مثلاً یہ یقین کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہے، اللہ تعالیٰ اسے ضرور ملائے گا، یا یہ بات کہ مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے۔

آیت 97 قَالُوا يَا اَبَانَا اَسْتَغْفِرُكَ دُؤْبَابًا.....: یہ کہنے والے بیٹے بھی تھے اور پوتے بھی، انھوں نے صاف لفظوں میں اپنے

قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْعَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۹۸﴾ فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَى
إِلَيْهِ أَبُو يُونُثُ وَ قَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِن شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ ﴿۹۹﴾

اس نے کہا میں عنقریب تمہارے لیے اپنے رب سے بخشش کی دعا کروں گا۔ بے شک وہی بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۹۸﴾ پھر جب وہ یوسف کے پاس داخل ہوئے تو اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو جاؤ، امن والے، اگر اللہ نے چاہا ﴿۹۹﴾

دانستہ اور عمداً خطا وار ہونے کا اقرار کر کے درخواست کی کہ آپ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کریں، کیونکہ آپ معاف کر بھی دیں اگر اس نے نہ بخشا تو ہمارا کہاں ٹھکانا ہے۔

آیت 98 قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي: یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی طرح درخواست کے بغیر فوراً استغفار کے بجائے صرف وعدہ کیا کہ میں تمہارے لیے استغفار کروں گا جو یقیناً انھوں نے پورا کیا ہوگا۔ اہل علم نے اس کی کئی وجہیں بیان فرمائی ہیں، ایک تو یہ کہ بھائی کا حق بھائی پر اتنا نہیں ہوتا جتنا باپ کا بیٹے پر ہوتا ہے، اس لیے والد کو ناراضگی زیادہ تھی۔ دوسری یہ کہ بے شک یوسف علیہ السلام پر بے پناہ آزمائشیں آئیں مگر غم اور صدمے کا اثر والد پر زیادہ تھا۔ تیسری یہ کہ والد معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یوسف نے انھیں معاف کیا ہے یا نہیں، کیونکہ مظلوم کے معاف کرنے کے بعد ہی ظالم کے لیے استغفار ہو سکتا ہے۔ بعض مفسرین نے بعض تابعین و صحابہ کے اقوال نقل فرمائے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے ان سے کچھلی رات دعا کرنے کا وعدہ کیا تھا، کیونکہ وہ قبولیت کا وقت ہے، مگر انھوں نے یہ بات قرآن مجید یا رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے بیان نہیں کی جب کہ ہزاروں سال پہلے کی بات کا کوئی پختہ ذریعہ ان دونوں کے علاوہ ہے ہی نہیں۔ مفسر ابن جریر اور ابن کثیر رحمہما نے ایک روایت رسول اللہ ﷺ سے نقل کی ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے ان سے جمعہ کی رات کو استغفار کا وعدہ کیا تھا، مگر اس کی سند میں تین خرابیاں ہیں، ایک ابن جریج کا اسے لفظ ”عَنْ“ سے روایت کرنا، جب کہ وہ مدلس ہیں، دوسری ولید بن مسلم قرشی حدیث مرفوعہ بیان کرنے کی غلطی کر جاتے ہیں اور تدریس تسویہ کرتے ہیں، تیسری سلیمان بن عبد الرحمان میں حافظے کی بنا پر کلام ہے۔ قرآن مجید بھولنے والی حدیث بھی اسی سند کے ساتھ ہے۔ (سامی بن محمد بن عبد الرحمان محقق وحشی تفسیر ابن کثیر)

آیت 98 فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ: یعنی یعقوب علیہ السلام کنعان سے سارے اہل خانہ سمیت روانہ ہو کر مصر پہنچے۔ آیت کے الفاظ ”مصر میں داخل ہو جاؤ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے شہر سے باہر نکل کر عمائدین حکومت اور عوام سے مل کر اپنے والدین اور افراد خانہ کا شان و شوکت سے استقبال کیا، والدین کو خصوصاً دوسرے خیموں سے جو استقبال کے لیے لگائے گئے تھے، الگ اپنے خیمے میں رکھا اور فرمایا، اب آپ لوگ مصر میں داخل ہو جائیں۔ آپ ان شاء اللہ یہاں نہایت امن سے رہیں گے۔ قحط، غربت، دشمن، غرض کسی چیز کی فکر مت کریں۔ بعض نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے یہ الفاظ مصر میں داخل ہونے کے بعد کہے۔ ”أَبُو يُونُثُ“ سے مراد ماں باپ ہیں، کئی مفسرین نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی والدہ کا چھوٹے بھائی کی ولادت کے

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ يَا أَبْتِ هَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۖ قَدْ جَعَلْنَا رَبِّيَ حَقًّا ۖ وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السَّبْحِ وَجَاءَ بِكَمَّ قَيْنِ

اور اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر اونچا بٹھایا اور وہ اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے اور اس نے کہا اے میرے باپ! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے، بے شک میرے رب نے اسے سچا کر دیا اور بے شک اس نے مجھ پر وقت انتقال ہو گیا تھا، یہ ماں یوسف علیہ السلام کی خالہ تھیں جن سے یعقوب علیہ السلام نے بعد میں نکاح کیا تھا۔ دلیل اس کی اسرائیلی روایات کے سوا کچھ نہیں، جن کی صحت کا یقین نہیں۔ البتہ بعض نے لکھا ہے کہ ان کی والدہ زندہ تھیں اور وہی یعقوب علیہ السلام کے ساتھ مصر پہنچی تھیں۔ (معالم) ابن جریر رحمہ اللہ نے اس دوسرے قول کو ترجیح دی ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی تائید کی ہے اور سب سے بڑھ کر قرآن مجید کے الفاظ کا ظاہر معنی یہی ہے۔ یہاں ان مفسرین کی بات پر افسوس ہوتا ہے جو قرآن مجید کی صراحت کے بعد آزر کو باپ کے بجائے چچا اور یوسف علیہ السلام کی والدہ کو ان کی خالہ بتانے پر اصرار کرتے ہیں۔ صرف ان کتابوں میں پڑھ کر جن کی بات کو سچا سمجھنے سے نبی ﷺ نے منع فرما دیا ہے، اگرچہ جھوٹا کہنے سے بھی منع کیا ہے، مگر ایسی ناقابل یقین بات کے ساتھ قرآن کی بات کو توڑنے مروڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

آیت 100 ① وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ مصر پہنچ کر جب مجلس آراستہ ہوئی تو یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو اپنے تخت پر اونچا بٹھانے کا حکم دیا اور دوسرے تمام اہل مجلس کرسیوں یا قالینوں پر نیچے بیٹھے تھے۔ جب یوسف علیہ السلام مجلس میں آئے تو ساری مجلس نے جن میں ان کے والدین بھی شامل تھے، ان کی تعظیم کے لیے سجدہ کیا۔ بعض حضرات اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ سب لوگ جھک کر تعظیم بجالائے، مگر ”خَرُّوا“ کا لفظ اس مطلب کا ساتھ نہیں دیتا، کیونکہ ”وَخَرُّوا لَهَا سُجَّدًا“ کا معنی ہے ”اور وہ اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے۔“ حقیقت یہ ہے کہ پہلی امتوں میں تعظیم کے لیے سجدہ جائز تھا، جس میں مبعود کو اللہ کے کسی اختیار میں شریک نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہاں عبادت کا سجدہ ہمیشہ غیر اللہ کے لیے حرام رہا ہے اور وہ ایسا سجدہ ہے کہ کسی کو نبی علم اور قوت و اقتدار اور نفع نقصان کا مالک سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ کے ساتھ شرک ہے، اس مقصد کے لیے قیام اور سینے پر ہاتھ باندھنا بھی شرک ہے۔ ایک سجدہ جبراً کروایا جاتا ہے، وہ نہ عبادت ہے نہ تعظیم، وہ مجبوری ہے۔ پہلی امتوں میں تعظیم کے لیے سجدہ جائز تھا، جیسا کہ فرشتوں کا آدم علیہ السلام کو سجدہ اور بردران یوسف اور ان کے والدین کا یوسف علیہ السلام کو سجدہ تھا۔ یہ رواج عیسائی علیہ السلام کی امت تک جاری رہا۔ ہماری امت میں شرک کے ذرائع کے سدباب کے لیے تعظیمی سجدہ بھی قیامت تک کے لیے حرام کر دیا گیا اور قیام بھی، ہاں آگے بڑھ کر استقبال کرنا مسنون ہے اور وہ اس عجمی رسم میں شامل نہیں جس میں کسی کے آنے پر سب لوگ اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں، اس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ سجدہ تعظیمی سے بھی صاف الفاظ میں منع فرمایا، چنانچہ عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما جب شام سے آئے تو انھوں نے نبی ﷺ کو سجدہ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا هَذَا يَا مُعَاذُ؟ قَالَ أَتَيْتُ الشَّامَ فَوَافَقْتُهُمْ يَسْجُدُونَ

الْبُدُو مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَعَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي ۖ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لَنَا بِشَاءٍ ۖ إِنَّكَ
هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۱۵۸﴾

احسان کیا جب مجھے قید خانے سے نکالا اور تمہیں صحرا سے لے آیا، اس کے بعد کہ شیطان نے میرے درمیان اور میرے بھائیوں کے درمیان جھگڑا ڈال دیا۔ بے شک میرا رب جو چاہے اس کی باریک تدبیر کرنے والا ہے، بلاشبہ وہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۵۸﴾

لَأَسْأَلَنَّهُمْ وَبَطَارِقِهِمْ فَوَدِدْتُ فِي نَفْسِي أَنْ نَفْعَلَ ذَلِكَ بِكَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَلَا تَفْعَلُوا، فَإِنِّي لَوُ كُنْتُ أَمِيرًا أَحَدًا أَنْ يَسْحَدَ لِغَيْرِ اللَّهِ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْحَدَ لِزَوْجِهَا» [ابن ماجہ، النکاح، باب حق الزوج علی المرأة: ۱۸۵۲۔ ابن حبان: ۴۱۷۱، وقال الألبانی حسن صحیح] ”معاذ! یہ کیا ہے؟“ کہا: ”میں شام گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے پادریوں اور سرداروں کو سجدہ کرتے ہیں، تو میں نے اپنے دل میں چاہا کہ ہم آپ کے ساتھ ایسا ہی کریں۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم ایسا مت کرو، کیونکہ اگر میں کسی کو حکم دینے والا ہوتا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔“ سورہ طہ السجدہ (۳۷) میں بھی اللہ کے سوا سجدہ منع کر دیا گیا ہے۔ شاہ عبدالقادر ڀٹنہ فرماتے ہیں: ”پہلے وقت میں سجدہ تعظیمی تھا، فرشتوں نے آدم ﷺ کو سجدہ کیا ہے، اس وقت اللہ نے وہ رواج موقوف کیا، فرمایا: ﴿وَإِنَّ الْمَسْجِدَ لِلَّهِ﴾ [الحج: ۱۸] اس وقت پہلے رواج پر چلنا دیا ہے کہ کوئی اپنی بہن سے نکاح کرے کہ آدم ﷺ کے وقت ہوا ہے۔“ (موضح)

﴿۲﴾ وَقَالَ يَا بَيْتَ هَذَا تَأْوِيلُ زَيْبَايَ مِنْ قَبْلِ.....: یوسف ﷺ نے یاد دلایا کہ یہ اس خواب کی تعبیر ہے جو کئی سال پہلے میں نے دیکھا تھا، میرے رب نے اسے سچا کر دیا، مجھ پریشان خواب نہیں رہنے دیا۔ خواب اور اس ملاقات کے درمیان کی مدت کسی نے چالیس سال بتائی، کسی نے اسی (۸۰) سال، ابن اسحاق نے اٹھارہ سال بتائی اور کہا کہ اہل کتاب کا خیال ہے کہ وہ چالیس سال یا اس کے لگ بھگ تھی۔ ”التحریر و التئیر“ میں ابن عاشور ڀٹنہ نے بائیس سال لکھی ہے۔ اصل حقیقت اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، مگر چالیس اور اسی (۸۰) سال والی بات قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی اور وحی الہی کے فیصلے کے بغیر تعیین کرنا اندرے میں حیر چلانا ہے۔

﴿۳﴾ وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجْتَنِي مِنَ السِّجْنِ: اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ خواب اور اس کی تعبیر کے درمیان کئی سال کا وقفہ ہو سکتا ہے، کنویں میں پھینکے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا احسان بذریعہ وحی حوصلہ دلانا تھا، پھر کنویں سے نکلوانا، پھر باعزت جگہ دینا، علم و حکمت عطا کرنا، غرض اللہ تعالیٰ نے یوسف ﷺ پر بے شمار احسانات کیے تھے، مگر انھوں نے اللہ کے احسان کا تذکرہ قید خانے سے نکالنے سے شروع کیا، کیونکہ اس سے پہلے ساتھ آزمائشیں بھی تھیں اور ان کے تذکرے سے بھائیوں کی شرمندگی بھی ممکن تھی۔ یہ انبیاء ہی کا حوصلہ ہے کہ یوسف ﷺ نے بھائیوں کی کسی زیادتی کا ذکر نہیں کیا، بلکہ ان

رَبِّ قَدْ أَتَيْتَنِي مِنَ الْمَلِكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ

اے میرے رب! بے شک تو نے مجھے حکومت سے حصہ دیا اور باتوں کی اصل حقیقت میں سے کچھ سکھایا، آسمانوں

کے سارے برے سلوک کو شیطان کی کارستانی قرار دے کر انہیں شرمندگی سے بچانے کی کوشش کی۔ شاہ عبد القادر زکریا نے فرمایا: ”جو اللہ کے احسان تھے سو ذکر فرمائے اور جو تکلیف تھی دخل شیطان سے، اس کو منہ پر نہ لائے، مجمل سنا دیا۔“ (موضح)

﴿وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ بدو، بادیہ نشینی حضر یعنی شہر میں رہنے کے بالمقابل ہے۔ ”بَدْوٌ“ ”بَدَا يَبْدُو“ کا مصدر ہے،

یعنی ظاہر ہونا، کیونکہ بادیہ نشینوں کے گھر ہر ایک کو نظر آتے ہیں۔ مصر کے مقابلے میں کنعان کی حیثیت بدو کی تھی۔ یوسف علیہ السلام نے اپنے خاندان کے شہر میں آنے کو بھی اپنے آپ پر احسان کہا، کیونکہ شہر کے لوگ اکثر سلیقہ شعار، میل جول کی وجہ سے نرم

طبیعت اور حصول علم کے مواقع کی وجہ سے علم سے آراستہ ہوتے ہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿مَنْ سَكَنَ

الْبَادِيَةَ جَفَا﴾ (ترمذی، الفتن، باب من أتى أبواب السلطان الفتن: ۲۲۵۶۔ نسائی: ۴۳۱۴۔ أبو داؤد: ۲۸۵۹۔ أحمد:

۳۵۷/۱، ح: ۳۳۶۱ و صححه الألبانی عن ابن عباس رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا) ”جو بادیہ میں رہائش رکھے وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔“ اور تمام

انبیاء شہروں اور بستیوں ہی میں سے بھیجے گئے، جیسا کہ آگے آیت (۱۰۹) میں آ رہا ہے، بلکہ رسول ایسی بستی میں بھیجے گئے جو

دوسری بستیوں کے مرکز تھے۔ (دیکھیے تفصیل: ۵۹) ”لَطِيفٌ“ ایسی چیز جو حواس کی گرفت میں نہ آسکے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت

لطیف اس لحاظ سے ہے کہ وہ باریک سے باریک چیز کی خبر رکھنے والا ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ اس کی تدبیر نہایت باریک

ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی اور اس لحاظ سے اس کا معنی لطف و کرم کرنے والا بھی ہے کہ وہ ایسے باریک طریقے سے مہربانی فرماتا

ہے کہ نظر ہی نہیں آتا کہ یہ کیسے ہوگی۔ (مفردات)

﴿إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾: یعنی یہ جو کچھ ہوا اسی کے کمال علم و حکمت کا کرشمہ ہے۔

آیت 101 ﴿رَبِّ قَدْ أَتَيْتَنِي مِنَ الْمَلِكِ﴾ پچھلی آیت میں یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کیا ہے،

یہاں سے وہ اللہ تعالیٰ کو اس کی صفت ربوبیت کے ساتھ مخاطب کر کے اور مزید نعمتوں کا ذکر کر کے اس چیز کی دعا کرتے ہیں

جو ان تمام نعمتوں سے بڑی ہے اور اتنی نعمتوں کے باوجود یوسف علیہ السلام سب سے زیادہ اسی کے متعلق فکر مند ہیں اور فی الواقع

اصل فکر اسی کی ہونا لازم ہے۔ عرض کیا اے ہر لمحے میری نگہداشت کر کے، میری ہر ضرورت پوری کر کے مجھے پالنے والے! تو

نے مجھے حکومت میں سے حصہ بھی دیا (”مِنْ“) بمعنی بعض ہے، کیونکہ وہ وزیر خزانہ تھے اور اگر کوئی بادشاہ ہے تو اس کے پاس

بھی بادشاہی کا ایک حصہ ہی ہے، کل بادشاہی تو ایک ہی ہستی کی ہے۔ ”شَاْرَكَ الَّذِي يَبْدُوهُ الْمَلِكُ“ (اور مجھے باتوں کی اصل

حقیقت سمجھنے میں سے کچھ سکھایا (یہاں بھی ”مِنْ“ بعض کے معنی میں ہے، کیونکہ ہر بات کی اصل حقیقت تو ایک ہی ہستی ہی

جاتی ہے۔ ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“، یہاں ”تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ“ میں خوابوں کی تعبیر، مقدمات کے فیصلے، وحی الہی کا

علم سب شامل ہیں، دنیا و آخرت میں میرا رومہ دگار صرف تو ہے، میری آخری درخواست یہ ہے کہ جب تو مجھے فوت کرے تو

أَنْتَ وَبَنِي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ﴿۱۵﴾

اور زمین کو پیدا کرنے والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا بار و مددگار ہے، مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے ﴿۱۵﴾

میں اس وقت تیرا فرماں بردار ہوں، کیونکہ ہمیشہ کی زندگی کا سارا دار و مدار اسی پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنَّحْوِ أَيُّمٍ» [بخاری، الرقاق، باب الأعمال بالحوالیم.....: ۶۴۹۳] "اعمال کا دار و مدار ان کے خاتموں ہی پر ہے۔" اس میں ہمارے لیے سبق ہے کہ آدمی دنیا کے جتنے بھی اونچے مرتبے پر پہنچ جائے اسے ہر وقت فکر آخرت ہی کی لازم ہے، کیونکہ وہ باقی ہے اور دنیا کا ہر منصب فانی ہے۔

﴿وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ﴾: صالحین میں عام صالحین کے ساتھ اعلیٰ درجے کے صالح، یعنی انبیاء بھی داخل ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نوحی علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ﴾ [آل عمران: ۳۹] "اور وہ سردار اور اپنے آپ پر بہت ضبط رکھنے والا اور نبی ہوگا، صالحین (نیک لوگوں) میں سے۔" عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: «مَا مِنْ نَبِيٍّ يَمْرُضُ إِلَّا خَبَّرَ بَيْنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَكَانَ فِي شُكْوَاهُ الَّذِي قَبِضَ فِيهِ أُخَذَتْهُ بَحْثَةً شَدِيدَةً، فَسَمِعَتْهُ يَقُولُ: ﴿مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾ فَعَلِمْتُ أَنَّهُ خَيْرٌ» [بخاری، التفسیر، باب ﴿فأولئك مع الذين.....﴾: ۴۵۸۶] "کوئی نبی (مرض الموت) میں بیمار نہیں ہوتا حتیٰ کہ اسے دنیا اور آخرت کے درمیان اختیار دیا جاتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ جس بیماری میں فوت ہوئے، آپ کو گلے کی سخت تکلیف ہوگئی تو میں نے آپ سے سنا، آپ کہہ رہے تھے: ﴿مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾ [النساء: ۶۹] "میں ان کا ساتھ چاہتا ہوں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالح لوگوں میں سے" تو میں سمجھ گئی کہ اب آپ کو اختیار دیا گیا ہے۔" معلوم ہوا قیامت کے دن صالحین کے ساتھ شامل ہونے کی خواہش اور دعا صرف یوسف علیہ السلام ہی نے نہیں بلکہ ساری اولاد آدم کے سردار نے بھی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بے پایاں فضل و کرم سے ہمیں بھی یہ نعمت عطا فرمائے۔ (آمین)

﴿تَوَفَّنِي مُسْلِمًا﴾ سے بعض لوگوں نے دلیل پکڑی ہے کہ یوسف علیہ السلام نے موت کی دعا کی، اس لیے موت کی دعا جائز ہے، حالانکہ یہ مطلب درست نہیں۔ کسی بھی امر یا نبی کے ساتھ کوئی قید مثلاً حال یا صفت وغیرہ ہو تو وہ قید مقصود ہوتی ہے، مثلاً «لَا تَشْرَبُ قَائِمًا» کے یہ معنی نہیں کہ مت پیو، بلکہ معنی یہ ہے کہ کھڑے ہو کر مت پیو اور "كُلِّ بِبَيْتِكَ وَكُلِّ مِمَّا يَلِيكَ" میں یہ حکم نہیں کہ کھانا کھاؤ، بلکہ یہ ہے کہ کھاؤ تو دائیں ہاتھ سے اور ادھر ادھر سے نہیں بلکہ اپنے سامنے سے کھاؤ۔ اسی طرح "تَوَفَّنِي مُسْلِمًا" کا معنی ہے کہ مجھے جب بھی فوت کرے مسلم (فرماں بردار) ہونے کی حالت میں فوت کرنا۔ اسی طرح "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" میں نماز اور قربانی کا حکم نہیں، وہ دوسری بہت سی آیات میں موجود ہے، بلکہ مراد ہے کہ نماز پڑھو تو

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ اِلَيْكَ ۗ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْعَلُوْا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ يَنْكُرُوْنَ ﴿۱۰﴾

یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں، جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو ان کے پاس نہ تھا جب انھوں نے اپنے کام کا پختہ ارادہ کیا اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے ﴿۱۰﴾

صرف اپنے رب کے لیے اور اسی طرح قربانی بھی اسی کے لیے کرو، اس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو۔

④ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی شخص موت کی تمنا کسی تکلیف کی وجہ سے ہرگز نہ کرے، جو اس پر آئے، اگر اسے ضرور ہی یہ تمنا کرنی ہے تو یوں کہے: «اللَّهُمَّ اُحْيِنِيْ مَا كَانَتْ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ وَ تَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتْ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيِ» [بخاری، المرض، باب تسمى المرض الموت: ۵۶۷۱- مسلم: ۲۶۸۰] ”اے اللہ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندہ رہنا میرے لیے بہتر ہے اور مجھے اس وقت فوت کر لے جب موت میرے لیے بہتر ہو۔“ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی تکلیف یا بیماری کی وجہ سے موت کی دعا کرنا منع ہے، البتہ جب دین میں فتنے کا خوف ہو تو یہ دعا کر سکتا ہے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے محمد! جب تو نماز پڑھے تو یوں کہا کر: «اللَّهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَ تَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَ حُبَّ الْمَسَاكِيْنِ وَ اِذَا اُرَدْتُ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِيْ اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ» [ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ ص: ۳۲۲۳، و صحیحہ الالبانی] ”اے اللہ! میں تجھ سے نیکیاں کرنے اور برائیوں کو چھوڑنے کا اور مساکین کی محبت کا سوال کرتا ہوں اور جب تو اپنے بندوں کے متعلق کسی فتنے (آزمائش) کا ارادہ کرے تو مجھے اس فتنے میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے پاس فوت کر لے۔“ اور جیسا کہ مریم رضی اللہ عنہا نے کہا: ﴿يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسِيًّا مِّنْ سَيِّئَاتِيْ﴾ [مریم: ۲۳] ”اے کاش! میں اس سے پہلے مر جاتی اور بھولی بھلائی ہوتی۔“ حافظ ابن کثیر نے یہاں علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اپنی امارت کے آخر وقت میں جب دیکھا کہ معاملات ان کے حق میں جمع نہیں ہو رہے اور معاملہ زیادہ سخت ہوتا جاتا ہے تو کہا: ”اللَّهُمَّ خُذْنِيْ اِلَيْكَ فَقَدْ سَبَّحْتُهُمْ وَ سَبَّحْتُوْنِيْ“ ”اے اللہ! مجھے اپنے پاس لے جا، کیونکہ میں ان سے آگیا ہوں اور یہ لوگ مجھ سے اتنا گئے ہیں۔“ اور امام بخاری پر جب آزمائشیں آئیں اور امیر خراسان کے ساتھ ان کا معاملہ بگڑا تو انھوں نے دعا کی: ”اللَّهُمَّ تَوَفَّنِيْ اِلَيْكَ“ ”اے اللہ! مجھے اپنے پاس لے جا۔“ ان تاریخی روایات کی سند حافظ ابن کثیر نے ذکر نہیں فرمائی۔ (واللہ اعلم)

⑤ یہاں یوسف رضی اللہ عنہ کا قصہ فتم ہوا۔ یہ واحد قصہ ہے جو قرآن مجید میں اکٹھا ایک ہی مقام پر بیان کیا گیا ہے، مگر لطف یہ ہے کہ اس میں سے ہر وہ تفصیل ترک کر دی گئی ہے جس کی اس موقع پر ہدایت کے مقصد کے لیے ضرورت نہیں تھی۔ اب آگے اس قصے سے حاصل ہونے والے چند اسباق ذکر ہوں گے۔

آیت 102 ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ اِلَيْكَ﴾: یعنی غیب کی یہ خبریں اپنی صحیح تفصیلات کے ساتھ ہم نے آپ کو

وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسْتَأْذِنُ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ﴿۱۰۴﴾

اور اکثر لوگ، خواہ تو حرص کرے، ہرگز ایمان لانے والے نہیں ہیں ﴿۱۰۳﴾ حالانکہ تو ان سے اس پر کوئی مزدوری نہیں مانگتا۔ یہ تو جہانوں کے لیے ایک نصیحت کے سوا کچھ نہیں ﴿۱۰۴﴾

وحی کے ذریعے سے بتائیں، ہماری وحی کے بغیر آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتی تھیں۔ اس سے مقصود کفار کو کہہ کر متنبہ کرنا تھا کہ محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں، اگر سچے پیغمبر نہ ہوتے تو ہزاروں برس پہلے کے یہ واقعات کیسے معلوم کر سکتے تھے اور تمہیں کیسے سنا سکتے تھے۔ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا كُنْتُ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْعَلُوا أَمْوَالَهُمْ یعنی اگر ہم آپ کو نہ بتاتے تو آپ کو کچھ خبر نہ تھی، کیونکہ آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے۔ قرآن مجید نے ”وَمَا كُنْتُ“ کے ساتھ یہ بات کئی جگہ دہرائی ہے اور اپنا احسان جتلا یا ہے کہ آپ کو گزشتہ واقعات کا کچھ علم نہ تھا، نہ آپ وہاں موجود تھے جب یہ سب کچھ ہوا، یہ ہم ہی ہیں جنہوں نے وحی کے ذریعے سے آپ کو یہ واقعات بتائے۔ اس لیے اہل مکہ اور دوسرے کفار کو آپ کی نبوت میں ہرگز شک نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں ان مسلمانوں کے لیے بھی سبق ہے جو کہتے ہیں کہ ہمارے نبی ﷺ کو ہر بات کا پہلے ہی علم تھا، اگر ایسا ہی تھا تو وحی کی کیا ضرورت تھی۔ قرآن مجید کی ”وَمَا كُنْتُ“ والی تمام آیات آپ کے علم غیب کی نفی کرتی ہیں۔ ”وَمَا كُنْتُ“ کے مقامات کی سیر کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورۃ آل عمران (۳۳)، ہود (۳۹)، یوسف (۱۰۴)، قصص (۳۳، ۳۵، ۳۶، ۸۶)، عنکبوت (۲۸) اور شوریٰ (۵۲)۔

﴿۱۰۳﴾ اس آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کا قصہ اہل کتاب سے جن تفصیلات کے ساتھ منقول ہے وہ تمام کی تمام صحیح نہیں، کیونکہ اگر صحیح ہوتیں تو ان کی کوئی بات قرآن مجید کے خلاف نہ ہوتی جو ان کی کتابوں پر نگران اور ان کے صحیح مضامین کا محافظ ہے۔ دیکھیے سورۃ مائدہ (۲۸) اس لیے صحیح و غلط کے گڈ ٹڈ ہو جانے کی وجہ سے ان کی معلومات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

تہ 103 وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ : سورۃ یوسف کے نزول کے بعد، جو آپ کی نبوت کی واضح دلیل تھی، جب آپ کی یہ خواہش اور توقع پوری نہ ہوئی کہ اسے سننے والے ایمان لے آئیں گے تو اس پر آپ کا غم زدہ ہونا فطری بات تھی، اللہ تعالیٰ نے اس پر تسلی دی کہ آپ کی خواہش کے باوجود اکثر لوگ شیطان کے غلبے اور اپنی نفسانی خواہشات، حرص، حسد وغیرہ کی وجہ سے ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اس کی حکمتیں پوری طرح وہی جانتا ہے۔ اس سے جمہوریت، یعنی اکثریت کے نمائندوں کو قانون سازی کا حق دینے کی حیثیت بھی خوب واضح ہوتی ہے، خصوصاً جب وہ صاف اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف قانون بناتے اور چلاتے ہوں۔

تہ 104 ﴿۱﴾ وَمَا تَسْتَأْذِنُ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ : یعنی ان کے ایمان نہ لانے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ آپ ان سے اس تبلیغ پر اجرت مانگ کر ان پر بوجھ بن رہے ہوں، سو یہ بات ہے ہی نہیں۔

﴿۲﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ : اور یہ بھی نہیں کہ یہ نہ مانیں گے تو دین کا کچھ بگاڑ لیں گے، یہ قرآن اور اسلام صرف انہی

وَكَائِنٌ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے گزرتے ہیں اور وہ ان سے بے دھیان ہوتے ہیں ﴿۱۰۵﴾

کے لیے تو نہیں، یہ تو سارے جہانوں کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اور بندے لے آئے گا جو اس کا علم اٹھالیں گے، باقی رہ گئے یہ لوگ تو اگر مانیں گے تو اپنے آپ کو فائدہ پہنچائیں گے اور نہ مانیں گے تو اپنا نقصان کریں گے، آپ ان کے رویے سے ہر گز رنجیدہ نہ ہوں۔

آیت 105 وَكَائِنٌ مِّنْ آيَةٍ.....: ”کائین“ کاف تشبیہ اور ”ائین“ کا مرکب ہے، معنی اس کا ہے کتنی ہی، مطلب یہ ہوتا

ہے کہ اس کے بعد ذکر ہونے والی چیز اتنی زیادہ ہے کہ اس کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ”آیۃ“ نشانی سے مراد ایسی عجیب چیز ہے جو توجہ کو اپنی طرف کھینچ لے، اس طرح کہ وہ بھولنے نہ پائے، جیسے کہتے ہیں: ”فَلَا نَآيَةٌ فِی الدُّنْيَا“ یعنی فلاں شخص ذہانت میں آیت ہے، یعنی اتنا ذہین ہے کہ بندہ حیران رہ جاتا ہے۔ توحید کی کچھ آیات تزیلیہ ہیں جو نبی ﷺ پر اتریں اور بے شمار کونیہ ہیں جو کائنات کے ذرے ذرے میں بکھری پڑی ہیں۔ ”یَمُرُّوْنَ“ گزرنے سے مراد صرف یہی نہیں کہ چلتے ہوئے گزرتے ہیں، کیونکہ آسمان کی نشانیوں پر گزر کیسے ہو سکتا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ کتنی ہی بے شمار عجیب و غریب چیزیں ہیں جو روزانہ ان کی نگاہوں کے سامنے آتی ہیں، مگر یہ ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ موٹی سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس دعوے کے مقابلے میں کہ ”میں نے ہر چیز پیدا کی ہے، کوئی اور ہے جس نے ایک مکھی یا اس کا پر بھی پیدا کیا ہے تو سامنے لاؤ“ جب کوئی بھی سر نہیں اٹھاتا اور تمہیں بھی یہ مانے بغیر چارہ نہیں تو اس کائنات میں اختیارات کا مالک یا اللہ تعالیٰ سے زبردستی منوالینے والا کوئی دوسرا کیوں بنا لیتے ہو؟ اور ہر چیز کے خالق و مالک کو چھوڑ کر اس کی مخلوق کو کس دلیل سے مشکل کشا سمجھتے اور پکارتے ہو۔ وہ نشانیاں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت جگہ ذکر کی ہیں۔ مثال کے طور پر دو تین مقامات ذکر کیے جاتے ہیں: ﴿وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ ﴿وَ فِی اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تَنْصُرُوْنَ﴾ [المداریات: ۲۰، ۲۱] ”اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے کئی نشانیاں ہیں اور تمہارے نفسوں میں بھی، تو کیا تم نہیں دیکھتے۔“ اور دیکھیے سورہ بقرہ (۱۶۳ تا ۱۶۷) کائنات میں پھیلی ہوئی ان بے شمار نشانیوں میں سے کافی نشانیاں ان آیات میں بھی آگئی ہیں، بلکہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہر اختیار ہونے کو بھی کمال طرز سے بیان فرمایا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ روم (۱۷ تا ۲۸) تھوڑی سی زحمت فرما کر ان مقامات کا مطالعہ کر لیجیے۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر پوری طرح غور کرنے والا شخص یقیناً توحید، آخرت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت تک پہنچ جائے گا، ورنہ کم از کم کائنات کی چیزوں پر غور کرنے سے کسی نہ کسی مفید نتیجے یا ایجاد تک ضرور پہنچ جائے گا جو کم از کم دنیا میں اسے اور دوسرے انسانوں کو فائدہ پہنچائے گی۔ جیسا کہ دیکھی کی بھاپ سے ڈھکنا اٹھنے پر غور نے بھاپ کی قوت کو دریافت کر کے ریل اور کتنی ایجادات کیں۔ بجلی، گیس، لیزر، ایم پی سب اللہ کی آیات کونیہ پر غور ہی کا نتیجہ ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ اپنی نشانیوں پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے، اگر کوئی توحید تک نہ پہنچ سکے تو بحث اس کی بھی ضائع نہیں کرتا، کافر کو بھی اس کی سوچ اور فکر کے

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ﴿۱۸﴾

اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں ﴿۱۸﴾

تجے میں کوئی نہ کوئی انعام دنیوی ہی سہی، ضرور دے دیتا ہے، مگر اصل کامیاب وہ ہے کہ یہ غور و فکر اسے اپنے خالق و مالک کی پہچان، اس اکیلے کی عبادت اور اس کے رسول پر ایمان تک پہنچا دے۔

ت 106 وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ..... اللہ پر ایمان کے دعوے کے ساتھ شرک کرنے والوں کی پہلی مثال کفار

قریش ہیں جو آسمان و زمین کو پیدا کرنے والے، خود ان مشرکین کو پیدا کرنے والے اور ہر چیز کی مکمل ملکیت رکھنے والے اللہ تعالیٰ کو جانتے اور مانتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَيْن سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ﴾ [الزحرف: ۸۷] "اور یقیناً اگر تو ان سے

پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔" اور فرمایا: ﴿وَلَيْن سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ﴾ [لقمان: ۲۵] "اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور ہی کہیں گے

کہ اللہ نے۔" اس کے علاوہ دیکھیے سورہ مومنون (۸۳ تا ۸۹) اور یونس (۳۱ تا ۳۵) اور ساتھ ہی کچھ ہستیوں کو اللہ کے ہاں اپنے سفارش، اللہ کے قریب کرنے والے اور اپنے کام نکلوانے والے سمجھتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَيَعْبُدُونَ

بِإِنْدَادٍ اللَّهِ مَا لَا يَنْصُرُهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ﴾ [یونس: ۱۸] "اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارش ہیں۔" اور فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ اشْتَدُّوا مِنْ دُونِهِ أُولَئِكَ مَا يَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَنَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى﴾ [الزمر: ۳] "اور

وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا اور حمایتی بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں، اچھی طرح قریب کرنا۔" ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مشرکین کہتے تھے: ﴿لَيْسَ لَكَ إِلَّا شَرِيكَ لَكَ﴾

تو رسول اللہ ﷺ فرماتے: ﴿وَيَلْبِسُ قَلْبَهُ﴾ "تمھاری بربادی ہو، اس سے آگے مت کہنا" (مگر وہ کہتے) ﴿إِلَّا شَرِيكَكَ هُوَ لَكَ نَمْلِكَ وَمَا مَلَكَ، يَقُولُونَ هَذَا وَهُمْ يُطُوفُونَ بِالْبَيْتِ﴾ [مسلم، الحج، باب التلبية وصفتها ووقتها: ۱۱۸۵]

"مگر ایک شریک جو تیرا ہی ہے، تو ہی اس کا مالک ہے، وہ مالک نہیں۔" وہ یہ الفاظ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے کہتے تھے۔ مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بنیادیں قرار دیتے تھے، اس طرح بھی وہ اللہ پر ایمان کے دعوے کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرتے تھے۔

جیسا کہ فرمایا: ﴿وَجَعَلُوا لِلدِّينِ هُمُ عَبْدُ الرَّحْمَنِ إِنَّا قَادِمُ الشَّهَادَةِ وَخَلَقَهُمْ مِنْ تَلْبَتِ شَهَادَتِهِمْ وَيُسْتَلُونَ﴾ [الزحرف: ۱۹] "اور انھوں نے فرشتوں کو، وہ جو رحمن کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے؟ ان کی گواہی ضرور لکھی جائے گی اور وہ پوچھے جائیں گے۔" مشرکین کہہ اللہ پر ایمان کے ساتھ ہی بزرگوں کے بتوں کی

بھی پوجا کرتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَفَرَأَيْتُمْ اللَّهَ وَالْعَزَىٰ ۗ وَمَنْوَةَ الثَّالِثَةِ الْاُخْرَىٰ ۗ اَلَكُمُ الذِّكْرُ وَلَهُ الْاُنثَىٰ ۗ بَلْآئِكَ اِذَا قَسَمْتَ لِصِغِيرَىٰ ۗ اِنْ هِيَ اِلَّا اَسْمَاءُ﴾ [النجم: ۱۹ تا ۲۳] "پھر کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور تیسری ایک

اور (دیوی) منات کو۔ کیا تمہارے لیے لڑکے ہیں اور اس کے لیے لڑکیاں؟ یہ تو اس وقت ناصانی کی تقسیم ہے۔ یہ (بت) چند ناموں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔“ انھوں نے عین کعبہ کے اندر ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی صورتیں رکھی ہوئی تھیں۔ [بخاری، الحج، باب من کتبه فی نواحي الكعبة: ۱۶۰۱] اہل کتاب بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان کے دعوے دار تھے، اس کے باوجود عزیر اور مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے۔ کبھی کہتے تھے، اللہ تعالیٰ خود ہی مسیح کی شکل میں آ گیا، اصل میں دونوں ایک ہیں:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ [المائدة: ۷۲] کبھی تین کو ایک کہتے، کبھی اللہ کو تین کا تیسرا کہتے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَلَاثَةٌ﴾ [المائدة: ۷۳] اپنے احبار و رہبان کو اللہ کے سوا حلال و حرام کرنے کا اختیار رکھنے والے رب سمجھتے:

﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ﴾ [التوبة: ۳۱] ان کی قبروں پر مسجدیں بنا کر ان کی پرستش کرتے، فرمان رسول ہے: ﴿لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَآءِهِمْ مَسَاجِدَ﴾ [بخاری، المغازی، باب مرض النبي ﷺ ووفاته: ۴۴۴۳، ۴۴۴۴] ”اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر کہ انھوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔“

انہوں نے عرصہ دراز سے اکثر کلمہ اسلام پڑھنے والوں کا بھی یہی حال ہو گیا ہے، ان میں سے بہت سے لوگ اللہ پر ایمان کے دعوے کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود محمد ﷺ کی صورت میں زمین پر اتر آیا ہے۔ بعض اپنے پیر کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے آنے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ بعض اپنے بزرگوں کی عبادت کرتے کرتے ان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ہی ہو جانے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ بے شمار بڑے بڑے نام والے عالموں، پیروں اور ان کے معتقدین نے ہندوؤں کی طرح ہر چیز کو اللہ تعالیٰ قرار دے کر اس کا نام وحدت الوجود رکھ دیا ہے اور اس صریح کفر و شرک کو معرفت کا نام دے رکھا ہے، حالانکہ اس عقیدے سے اسلام کا ہر حکم ہی ختم ہو جاتا ہے اور یہی وہ الحاد اور صریح کفر ہے جس پر اسلام کا نقاب ڈال کر یہ لوگ زبردستی مسلمان بلکہ اسلام کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔ عام مسلمانوں میں سے کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو زندہ یا مردہ بزرگوں کو حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہیں، مصیبت میں ان کو پکارتے ہیں، ان سے اولاد اور عزت و مال کے لیے فریاد کرتے ہیں، ان کے نام کے وظیفے کرتے اور نیازیں دیتے ہیں، ان کی پختہ قبریں بنا کر ان کا طواف اور انہیں سجدے کرتے ہیں۔ غرض کہ جو کچھ مکہ کے مشرک اپنے بتوں کے ساتھ کرتے تھے یہ جھوٹے مسلمان اپنے داتاؤں، حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں کے ساتھ کرتے ہیں اور دعویٰ اللہ تعالیٰ پر ایمان کا کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت دے اور ہم سب کو شرک سے بچائے اور توحید پر قائم رکھے۔ (آمین)

ایمان لانے کے باوجود شرک کرنے کی کچھ اور صورتیں بھی ہیں جن سے بچنا لازم ہے، مثلاً غیر اللہ کی قسم کھانا، ریا کاری یعنی دکھلاوا کرنا، بیماری سے بچنے کے لیے دھاگے، کڑے، منگے وغیرہ لٹکانا، بدشگونی لینا، کانوں، یعنی آئندہ کی خبریں بتانے والوں کے پاس جانا، ان سب کاموں کو صحیح احادیث میں شرک قرار دیا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے توحید کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابیں، مثلاً تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید وغیرہ ملاحظہ فرمائیں۔

أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللَّهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَ هُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا آنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۰۸﴾

تو کیا وہ بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر اللہ کے عذاب میں سے کوئی ڈھانک لینے والی آفت آپڑے، یا ان پر قیامت اچانک آجائے اور وہ سوچتے بھی نہ ہوں ﴿۱۰۷﴾ کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں شریک بنانے والوں سے نہیں ہوں ﴿۱۰۸﴾

آیت 107 ﴿۱۰۷﴾ أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ : "عَشِيًّا يَغْشَىٰ غَشِيًّا وَ غَشِيَانًا" ہر جانب سے گھیر لینا، ڈھانک لینا، جیسے فرمایا: ﴿وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَوَاجٌ كَالظُّلُمِ﴾ [لقمان: ۳۶] "اور جب انہیں سائبانوں جیسی عظیم موج ڈھانک لیتی ہے۔" غاشیہ وہ حادثہ جو چاروں طرف سے گھیر لے۔ عرب ایسے حوادث کو مؤنث ہی استعمال کرتے ہیں، مثلاً "الظَّامَةُ، الصَّاحَةُ، الدَّاهِيَةُ، الْمُصِيبَةُ، الْكَارِثَةُ، الْحَادِثَةُ، الْوَاقِعَةُ، الْحَاقَّةُ" اس آیت میں مشرکین کے لیے سخت وعید ہے کہ کچھ بعید نہیں کہ کسی بھی وقت ان پر ہر طرف سے گھیرنے والا عذاب آجائے، مثلاً زلزلہ، طاعون، سیلاب اور طوفان وغیرہ۔

﴿۱۰۷﴾ "بَغْتَةً" (ف) سے مصدر بمعنی اسم فاعل حال ہے (بَاغِتْنَا) اچانک۔

آیت 108 ﴿۱۰۸﴾ قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ : لفظ "سَبِيلٌ" مؤنث بھی آتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے اور مذکر بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوا سَبِيلًا﴾ [الأعراف: ۱۴۶] معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے پیروکاروں کا راستہ اکیلے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت ہے، یعنی صرف اللہ کی عبادت اور اسی کے احکام کی اطاعت جو بذریعہ وحی رسول اللہ ﷺ پر اترے، اگر کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کی دعوت دے، یا رسول اللہ ﷺ پر اللہ کی طرف سے اترنے والے احکام و مسائل کے بجائے کسی اور کی پیروی، مثلاً کسی امام یا پیر وغیرہ کی تقلید کی دعوت دے تو وہ نہ اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر چل رہا ہے، کیونکہ جس چیز کی طرف وہ بلا رہا ہے وہ اللہ کی طرف سے اتری ہی نہیں، وہ محض انسانی رائے یا خیال ہے۔

﴿۱۰۸﴾ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي : "بَصَارَةٌ" آنکھوں کا دیکھنا اور "بَصِيرَةٌ" دل سے اچھی طرح سمجھنا، یعنی میں اور میرے پیروکار خوب سمجھ کر اللہ کے راستے پر قائم ہیں۔ "وَسُبْحَانَ اللَّهِ" کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور خطا سے پاک ہے۔ اس اکیلے کی عبادت ہی حق ہے اور اس اکیلے کی وحی پر چلنا ہی حق ہے اور جو اس راہ کو چھوڑتا ہے وہ ایسی ہستیوں کی عبادت اور اطاعت کی وجہ سے مشرک ہے جو عیب اور خطا سے پاک نہیں ہیں۔ اس لیے میں کبھی ایسے مشرکوں میں شامل نہیں ہو سکتا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَ لَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ

اتَّقَوْا ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۰۹﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجے مگر کچھ مرد، جن کی طرف ہم ان بستیوں والوں میں سے وحی کیا کرتے تھے، تو کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے اور یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو متقی بنے۔ تو کیا تم نہیں سمجھتے ﴿۱۰۹﴾

آیت 109 ﴿۱﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ : اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو آپ ﷺ کو انسان ہونے کی وجہ سے

نبی ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اترے۔ (دیکھیے فرقان: ۲۱) یہ رسول تو ہماری طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ (دیکھیے فرقان: ۷) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے آپ سے پہلے تمام رسول ”رجال“ (مرد) ہی بھیجے۔ دوسرے مردوں سے ان کا فرق یہ تھا کہ ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے جس سے دوسرے لوگ محروم تھے۔

﴿۲﴾ إِلَّا رِجَالًا: اس میں ان لوگوں کا بھی رد ہے جو کہتے ہیں کہ کچھ عورتیں بھی پیغمبر ہوئی ہیں، مثلاً حوا، آسیہ، سارہ، ام موسیٰ اور مریمؑ۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ ان عورتوں کو فرشتوں کے ذریعے سے وحی یا بشارت تو ضرور ملی ہے مگر اس سے ان کا معروف معنی میں نبی ہونا لازم نہیں آتا۔ نبی وہ ہے جس پر شرع کے احکام اتریں اور اس قسم کی وحی کسی عورت پر نہیں اتری، یہ شرف رجال (مردوں) ہی کو حاصل رہا ہے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے صراحت فرمادی تھی کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، مگر اس آیت میں ان عورتوں کے جھوٹے دعوے کا پیشگی مزید رد ہے جنہوں نے آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا تھا، مثلاً سجاح نامی عورت۔ چنانچہ فرمایا کہ آپ سے پہلے ہم نے مردوں کو رسول بنا کر بھیجا، عورتوں کا اس میں کچھ دخل نہیں، کیونکہ رسول نے مردوں کو بھی دعوت دینا ہوتی ہے، الجھنا بھی پڑتا ہے، جنگ بھی ہوتی ہے اور یہ کام عورت کے بس کے نہیں ہیں۔

﴿۳﴾ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى: اکثر اہل علم اس سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نبی ہمیشہ شہر اور بستیوں کے رہنے والوں میں سے آئے ہیں، بادیہ یا صحرائیوں سے نہیں آئے، کیونکہ بادیہ نشین قدرتی طور پر غیر سنجیدہ اور سخت طبع ہوتے ہیں۔ مگر ابن عاشورؒ نے فرمایا: ”یہ حصر اضافی ہے حقیقی نہیں۔“ یعنی جو بات تم کہہ رہے ہو کہ آسمان سے فرشتہ اترنا چاہیے، یہ بات درست نہیں، تمام پیغمبر انسان ہی تھے اور زمین کی بستیوں ہی کے رہنے والے تھے، آسمان سے نہیں اترے تھے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ یعقوبؑ بدو میں رہتے تھے اور پیغمبر تھے، جیسا کہ یوسفؑ نے فرمایا: ﴿وَجَاءَهُمْ مِنَ الْبَدْوِ﴾ [یوسف: ۱۰۰] یا پھر یہ کہا جائے کہ یعقوبؑ بھی ہستی ہی میں رہتے تھے، مگر ترقی یافتہ اور تمدن شہر مصر کے مقابلے میں اس ہستی کنعان کی حیثیت بھی بدو اور صحرا کی تھی، جیسا کہ پیچھے گزرا۔

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَشَاءُ ۗ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۱۰﴾

یہاں تک کہ جب رسول بالکل ناامید ہو گئے اور انھوں نے گمان کیا کہ ان سے یقیناً جھوٹ کہا گیا تھا تو ان کے پاس ہماری مدد آگئی، پھر جسے ہم چاہتے تھے وہ بچا لیا گیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا ﴿۱۱۰﴾

﴿۱﴾ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ : کفار آخرت کو تو مانتے نہیں تھے، اس لیے انھیں سمجھانے کے لیے دنیا میں گزرنے والے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے شام کو جاتے ہوئے پہاڑوں کو کھود کر بنائے ہوئے قوم ثمود کے مکانات اور قوم لوط کی بستیوں کی جگہ والا خرابہ اور پھر مصر کے اہرام نہیں دیکھے کہ انھیں عبرت ہوتی۔

﴿۵﴾ وَلَئِذَا الْأَجْرَ قَدْ حُدِرَ : اگرچہ پچھلے کلام کا تقاضا تھا کہ کہا جاتا کہ ان کفار سے آخرت میں ہونے والا معاملہ اس سے بھی کہیں برا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس پر ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے ان کا ذکر ہی چھوڑ کر متقی لوگوں کا انجام ذکر فرمایا، جس سے ان کا انجام خود بخود ظاہر ہو رہا ہے، اسے بلاغت کی اصطلاح میں احتباك کہتے ہیں۔

آیت 110 ﴿۱﴾ حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ ”اسْتَيْسَسَ“ ”يَسَسُ“ میں مبالغہ ہے، یعنی بالکل مایوس ہو گئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ”حَتَّىٰ“ (یہاں تک) کا تعلق پیچھے کس سے ہے، جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق گزشتہ آیت ﴿۱۰﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوْحِي إِلَيْهِمْ ﴿۱۰﴾ سے ہے، یعنی ہم نے تجھ سے پہلے فرشتے یا جن نہیں بلکہ آدمی بھیجے، وہ مدتوں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے رہے مگر ان کی قومیں ان پر ایمان نہیں لائیں، یہاں تک کہ جب رسول ان کے ایمان لانے سے بالکل ناامید ہو گئے۔ ”ظَنُّوْا“، ”ظَنَ“ کے معنی دوسرا، گمان اور یقین تینوں آتے ہیں، یعنی انھوں نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا۔ ”ظَنُّوْا“ کے فاعل کے متعلق تین قول ہیں، ایک یہ کہ کفار ہیں، یعنی ان کی قوم کے کفار نے یقین کر لیا کہ رسولوں نے ہم سے جو کہا تھا کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو تم پر عذاب آجائے گا، یہ بات ہم سے جھوٹ ہی کہی گئی تھی، کوئی عذاب وغیرہ نہیں آئے گا۔ اس وقت ان رسولوں کے پاس ہماری مدد آگئی اور مجرموں سے ہمارا عذاب ہٹایا نہیں جاتا۔ یہ معنی ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ دوسرا یہ کہ ”ظَنُّوْا“ کے فاعل اہل ایمان ہیں، یعنی رسول کفار کے ایمان لانے سے ناامید ہو گئے اور مومنوں کو بھی دوسرا پیدا ہونے لگا کہ شاید کفار پر عذاب آنے کی بات ان سے جھوٹ ہی کہی گئی تھی۔ یہ معنی بھی درست ہے، کیونکہ دوسرا پیدا ہونا ایمان کے منافی نہیں، شیطان کا کام ہی لوگوں کے سینے میں دوسرے ڈالنا ہے، مگر اس پر مواخذہ نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ تَحَاوَزَ لِي عَنِ أُمَّتِي مَا وَسَّوَسَتْ بِهِ صُدُورُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَكَلِّمْ﴾ [بخاری، العنق، باب الخطأ والنسيان في العتاقة.....: ۲۵۲۸۔ مسلم: ۱۲۷۷] ”اللہ تعالیٰ نے میری امت کی ان باتوں سے درگزر فرمایا ہے جن کا دوسرا ان کے سینے ڈالیں، جب تک وہ انھیں منہ سے نہ نکالیں یا ان پر عمل نہ کریں۔“

لَقَدْ كَانَ فِي قَصصِهِمْ عِبْرَةً لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصَدِيقَ
الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ ۗ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۱۱﴾

بلاشبہ یقیناً ان کے بیان میں عقلوں والوں کے لیے ہمیشہ سے ایک عبرت ہے، یہ ہرگز ایسی بات نہیں جو گھڑی جائے اور لیکن اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۱۱۱﴾

تیسرا وہ جو شاہ عبدالقادر عیسیٰ نے فرمایا: ”یعنی وعدہ عذاب کو دیر لگی یہاں تک کہ رسول لگے ناامید ہونے کہ شاید ہماری زندگی میں نہ آیا پیچھے آوے اور ان کے اصحاب خیال کرنے لگے کہ شاید وعدہ خلاف تھا۔ اتنے خیال سے آدمی کا فر نہیں ہوتا، مگر جانتا ہے کہ یہ خیال بد ہے۔“ (موضح) اگر ”ظن“ سے مراد وسوسہ ہو تو ”ظنوا“ سے مراد رسول بھی بعید نہیں، کَذَا قَالَ ابْنُ نَبِيئَةَ (روح المعانی) کیونکہ لمبی آزمائشوں اور مصیبتوں میں خیال آہی جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَفَرِحْتُمْ بِأَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزَلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرَ اللَّهُ أَالآنَ نَصُرَ اللَّهُ قَرِيبٌ﴾ [البقرة: ۲۱۴] ”یا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک تم پر ان لوگوں جیسی حالت نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے، انھیں تنگی اور تکلیف پہنچی اور وہ سخت ہلائے گئے، یہاں تک کہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، کہہ اٹھے اللہ کی مدد کب ہوگی؟ سن لو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔“ اس آیت کی روشنی میں یہ معنی بھی قرین عقل ہے۔ مراد اس آیت سے رسولوں پر آنے والی آزمائشوں کی مدت کی لمبائی اور ان کے صبر کے پیمانے کے لبریز ہونے کے قریب تک پہنچ جانے پر اللہ کی مدد کا آنا ہے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔ ﴿جَاءَهُمْ نَصْرًا﴾: یعنی پیغمبروں کو ہماری مدد پہنچ گئی۔

﴿وَلَا يَرُدُّ بَأْسًا عَنِ الْقَوْمِ النَّاظِرِينَ﴾: لہذا اب اگر عذاب آنے میں دیر ہو رہی ہے تو دھوکا نہ کھاؤ کہ یہ محض ڈراوا ہی ہے۔

آیت 111 لَقَدْ كَانَ فِي قَصصِهِمْ : یعنی رسولوں اور گزشتہ قوموں خصوصاً یوسف علیہ السلام اور ان سے متعلق تمام لوگوں مثلاً والد، بھائی، قافلے والے، عزیز مصر، اس کی بیوی، زنان مصر، قید کے ساتھی اور شاہ مصر ان سب کے بیان میں عقل مندوں کے لیے بڑی عبرت ہے، یہ کوئی گھڑی ہوئی کہانیاں نہیں، بلکہ پہلی آسمانی کتابوں کی صحیح باتوں کی تصدیق، ان کی کمی بیشی کو کھول کر بیان کرنے والی، ان کے صحیح مضامین کی محافظ اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔



سورۃ رعد ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾

الَّتِزَّتْ تِلْكَ اٰیٰتِ الْكِتٰبِ وَالَّذِیْ اُنزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ① اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَّرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الَّتِزَّتْ۔ یہ کامل کتاب کی آیات ہیں اور جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے اور لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ① اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے، جنہیں تم دیکھتے ہو، پھر وہ

آیت 1 ① الَّتِزَّتْ: یہ حروف مقطعات ہیں، ان کی تفصیل سورہ بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ شعر اوی بٹٹ نے یہاں ایک فائدہ ذکر فرمایا ہے کہ قرآن مجید سارا وصل پر مبنی ہے، یعنی ہر لفظ دوسرے سے ملا ہوا ہے، سوائے اس مقام کے جہاں وقف کرنا ہو، جیسا کہ آیت کا آخر وغیرہ، مثلاً اسی سورت کو لے لیں: ﴿تِلْكَ اٰیٰتِ الْكِتٰبِ﴾ اس میں ہر لفظ پر اعراب پڑھیں گے، مگر حروف مقطعات ”الَّتِزَّتْ“ کو ملا کر نہیں پڑھیں گے، بلکہ چاروں حروف کو الگ الگ پڑھیں گے، کیونکہ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کو ایسے ہی پڑھایا، پھر آپ نے ایسے ہی پڑھا اور ہم تک تو اترے ایسے ہی پہنچا۔

② تِلْكَ اٰیٰتِ الْكِتٰبِ: کوئی لفظ جب مطلق بولا جائے تو اس سے کامل فرد مراد ہوتا ہے، مثلاً کہتے ہیں: ”فُلَانِ الرَّحْلُ“ یعنی فلاں شخص مرد ہے، مطلب واقعی سچ سچ کامل مرد ہے، تجمل، بزدل، جھوٹا یا لولا لنگڑا نہیں۔ اسی طرح دین و عقائد میں ”الْكِتٰبُ“ سے مراد کامل کتاب قرآن مجید لیا جاتا ہے۔ نحو میں سیبویہ کی کتاب کو ”الْكِتٰبُ“ اور شہروں میں سے ”مَدِیْنَةُ النَّبِیِّ ﷺ“ کو ”الْمَدِیْنَةُ“ کہا جاتا ہے۔

③ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ: یعنی آپ کی طرف جو کچھ نازل کیا گیا وہی عین حق ہے، مگر اکثر لوگ غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے۔ اس میں انسانوں کی اکثریت کی رائے کے پرستاروں کے لیے سبق ہے اور ان لوگوں کی تعریف بھی ہے جو ایمان سے بہرہ ور ہیں، وہ قلیل بھی ہو سکتے ہیں کثیر بھی، مگر اکثریت انھی کی ہے جو ایمان کی سعادت سے محروم ہیں۔

آیت 2 ① اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ: لفظ ”اللّٰهُ“ اس پاک ہستی کا ذاتی نام ہے جس نے سب کچھ بنایا اور اسے چلا رہا ہے۔ اس ایک لفظ میں اس کی ساری صفات آجاتی ہیں۔ ایمان اس ہستی کی توحید، اس کے رسولوں کی تصدیق اور اس کے سامنے قیامت کو پیش ہونے کے عقیدے کا نام ہے۔ یہاں سے اللہ تعالیٰ نے انسان کے سامنے آسمان و زمین میں اپنی قدرت کی کچھ نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے، تاکہ وہ توحید و رسالت اور قیامت پر ایمان لے آئے۔ سب سے پہلے آسمان کا ذکر فرمایا، سورہ نازعات (۲۷) میں فرمایا: ”کیا تمہیں (پہلی بار یا دوبارہ) پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کو؟“ اپنے وجود اور آسمان کے وجود کا مقابلہ کر کے تو دیکھو، اور فرمایا: ﴿لَخَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ﴾ [المؤمن: ۵۷] ”یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام) ہے۔“

وَسَحَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَضِّلُ الْآيَاتِ

لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ ﴿۱﴾

عرش پر بلند ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ہر ایک ایک مقرر وقت کے لیے چل رہا ہے، وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے، کھول کھول کر آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کر لو ﴿۱﴾

﴿۱﴾ بِغَيْرِ عَمَلٍ تَرَوْنَهَا: ”عَمَلٍ“ اسم جمع ہے، جمع نہیں، اس کا مفرد ”عَمُوْدٌ“ یا ”عِمَادٌ“ ہے۔ (شعراوی) اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس قدر وسیع اور عظیم آسمانوں کو کسی بھی قسم کے ستونوں کے بغیر بلند کر دیا، تم خود انہیں دیکھ رہے ہو کہ ان کے نیچے کوئی ستون نہیں، جب کہ تم چھوٹی سے چھوٹی چھت بھی دیواروں یا ستونوں کے بغیر نہیں بنا سکتے۔ محض اپنی قدرت اور بے پناہ قوت کے ساتھ اتنا اونچا بنانے کے بعد وہیں تھام کر رکھنا اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَيُنسِكُ التَّمَاةَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ [الحج: ۶۵] ”اور وہ آسمان کو تھام کر رکھتا ہے، اس سے کہ زمین پر گر پڑے مگر اس کے اذن سے۔“ مزید دیکھیے سورۃ فاطر (۴۱) اس صورت میں ”تَرَوْنَهَا“ (تم انہیں دیکھتے ہو) میں ضمیر کا مرجع لفظ ”السلوٰت“ ہوگا اور ”تَرَوْنَهَا“ الگ یا جملہ ہوگا کہ تم خود آسمانوں کو اس حالت میں دیکھ رہے ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ”تَرَوْنَهَا“ کو ”عَمَلٍ“ کی صفت قرار دیا جائے، پھر ترجمہ یہ ہوگا کہ اس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر بلند فرمایا جنہیں تم دیکھتے ہو، گویا ستون ہیں مگر تمہیں نظر نہیں آتے، نہ کہیں نگاہ کے لیے رکاوٹ بنتے ہیں۔ آیت دونوں معنوں کا امکان رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے دونوں ممکن ہیں، اس لیے ترجمہ میں بھی دونوں معنوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ علمائے تفسیر میں سے کسی نے پہلے معنی کو ترجیح دی اور کسی نے دوسرے کو۔ امام المفسرین طبری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، حق یہ ہے کہ ہم بھی اسی طرح کہیں جیسے اللہ نے فرمایا۔ (خلاصہ) یعنی پورے علم کے بغیر ایک معنی کو ترجیح نہ دیں۔ (واللہ اعلم) (یہاں طبری کے فیصلے کی پوری عبارت نہایت بڑ لطف ہے) کیا معلوم کہ کسی وقت تجزیے سے ثابت ہو جائے کہ فضا میں نظر نہ آنے والی کوئی چیز موجود ہے جس پر آسمان قائم ہیں۔

﴿۲﴾ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا سات جگہ آتا ہے، سورۃ اعراف (۵۴)، یونس (۳)، رعد (۲)، طہ (۵)، فرقان (۵۹)، مجدہ (۳) اور حدید (۴) اللہ تعالیٰ کے تعلق سے عرش کا ذکر ایکس (۲۱) مرتبہ اور ملکہ سبا کے تعلق سے چار (۴) مرتبہ آیا ہے۔ مستوی علی العرش کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ اعراف (۵۴) اور سورۃ حاقہ (۱۷)۔

﴿۳﴾ وَسَحَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ: یہاں سے اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنی چند نہایت واضح نعمتیں ذکر فرمائیں۔ تفسیر کا معنی ہے کسی کو اپنے تابع اور قابو میں کر لینا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو اپنے تابع اور پوری طرح پابند کر رکھا ہے، اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جس طرح جس کام پر لگا دیا ہے وہ اس سے بال برابر ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ جو مدت مقرر کی ہے اس کے عین مطابق مقرر وقت پر چل رہے ہیں، یعنی قیامت تک یا اپنے دورے کے مقرر وقت کے مطابق، نہ ان کی رفتار بدلتی

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا وَمِنْ كُلِّ الشَّجَرِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغِشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۰﴾

اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلا یا اور اس میں پہاڑ اور ندیاں بنائیں اور اس میں تمام پھلوں میں سے ایک ایک جوڑا دو، دو قسم کا بنایا، وہ رات کو دن پر اوڑھا دیتا ہے، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں ﴿۱۰﴾

ہے نہ طلوع وغیرہ کے نظام میں فرق آتا ہے۔ سورج اپنا دورہ سال میں پورا کرتا ہے، چاند ایک ماہ میں۔ کسی بھی سیارے یا سورج اور چاند کا آپس میں نہ کوئی ٹکراؤ ہے نہ حادثہ۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی زبردست قدرت و حکمت کی کتنی بڑی نشانی ہے۔

﴿۱۰﴾ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ: کسی کام کی تدبیر کا معنی اسے اس کے سب سے اچھے، مضبوط اور مکمل طریقے پر چلانا ہے۔ مختصر سے عطا کردہ اختیار سے تم جو تدبیریں کرتے ہو ان کا نتیجہ بھی دیکھ لو، کوئی پوری ہوتی ہے کوئی نہیں اور کوئی کسی حادثے کی نذر ہو جاتی ہے اور اس عزیز و حکیم کی تدبیر امور کو دیکھو۔

﴿۱۱﴾ يُفَضِّلُ الْآيَاتِ: اس میں کائنات میں موجود نشانیاں بھی شامل ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسولوں پر نازل شدہ آیات بھی کھول کر بیان کرنا ہے کہ دونوں کس قدر واضح ہیں، جن کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

﴿۱۲﴾ لَعَلَّكُمْ يَلْقَاءُ رَبَّكُمْ تَوَقُّونَ: یعنی ان تمام آیات کی تفصیل کا مقصد تمہیں یہ یقین دلانا ہے کہ ایسی عظیم مخلوقات کو پیدا کرنے اور ان کی تدبیر کرنے والے پروردگار کے لیے تمہیں دوبارہ پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں اور ہر حال میں تمہیں اس کے سامنے پیش ہونا ہے۔

بیت 3 ﴿۱﴾ وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ.....: ”مَدَّ“ کا معنی پھیلانا ہے۔ ”رَوَاسِيَ“ ”زَوَاسِيَ“ کی جمع ہے، ”زَسَا يَرُسُو“ کا معنی زمین میں گڑا ہوا ہونا ہے، لفظی معنی زمین میں گڑے ہوئے، مراد پہاڑ ہیں۔ پہلے اوپر کے جہان کا تذکرہ فرمایا، پھر زمین، آسمان، سورج، چاند وغیرہ کا، اب نیچے کے جہان میں اللہ تعالیٰ کی چند قدرتوں کا ذکر ہے کہ زمین ایک کرہ ہونے کے باوجود اتنی وسیع بنائی کہ طول و عرض میں آدمی کی نگاہ اس کی انتہا کو نہیں پاتی، انسان اور حیوان کسی تکلیف کے بغیر اس پر چلتے پھرتے ہیں، انسان عظیم الشان عمارتیں بناتے ہیں۔ زمین کا توازن قائم رکھنے کے لیے اور ہر وقت زلزلے کی کیفیت سے محفوظ رکھنے کے لیے اس میں بہت نیچے تک گڑے ہوئے اور بہت اوپر تک اٹھے ہوئے پہاڑ بنا دیے اور تمہاری زندگی کی بھانڈے کے لیے دریا اور ندی نالے بنا دیے۔ ندی نالوں کا ذکر پہاڑوں کے ساتھ فرمایا، کیونکہ دریا عموماً پہاڑوں ہی سے نکلتے ہیں۔

﴿۲﴾ وَمِنْ كُلِّ الشَّجَرِ: اس جملے میں ایک ایسی حقیقت بیان فرمائی ہے جس کا پوری طرح انکشاف کچھ مدت پہلے ہی ہوا ہے۔ پہلے لوگوں کو صرف چند درختوں کے جوڑا یعنی نر اور مادہ ہونے ہی کا علم تھا جن کے نر درخت الگ اور مادہ الگ ہوتے ہیں، مثلاً کھجور اور پیپٹا وغیرہ۔ پھر ثابت ہوا کہ ہر درخت ہی کا پھل نر اور مادہ پھولوں کا بوری ملنے سے وجود میں آتا ہے،

و فِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُتَجَوِّزٌ وَ جَلَّتْ مِنْ أَعْنَابٍ وَ زُرْعٌ وَ نَخِيلٌ صِنَوَانٌ وَ غَيْرُ
صِنَوَانٍ يُنْفِي بِسَاءٍ وَاحِدٍ وَ نُفَّضٌ بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ إِنَّ فِي ذَلِكَ
لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٤﴾

اور زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے مختلف ٹکڑے ہیں اور انگوروں کے باغ اور کھیتی اور گھوڑے کے درخت کئی
توں والے اور ایک تنے والے، جنہیں ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اور ہم ان میں سے بعض کو پھل میں
بعض پر فوقیت دیتے ہیں۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں ﴿٤﴾

یعنی ہر پھل میں جوڑا موجود ہے، پھر نرم مادہ دونوں پھول بعض اوقات ایک ہی پودے میں موجود ہوتے ہیں، بلکہ بعض اوقات
ایک درخت کے ایک ہی پھول میں نرم مادہ دونوں حصے پائے جاتے ہیں۔ کئی عظیم قدرتوں کا مالک ہے وہ جس کی صرف ایک
تخلیق کی ایک حقیقت جو خود اس نے سیکڑوں برس پہلے بیان فرمادی تھی، اب کہیں انسان اسے کسی حد تک پاسکے ہیں۔ عموماً
قدیم مفسرین نے اس کا معنی ہر پھل میں سے دو قسمیں کیا ہے، مثلاً بیٹھا اور کھٹا، گرم اور سرد، چھوٹا اور بڑا، سیاہ اور سفید وغیرہ،
یہ معنی بھی درست ہے۔

﴿٤﴾ يُغْشِي الْأَيْلَ التَّهَارُ: یہ اس کی قدرت کا اور اپنے بندوں پر رحمت کے ایک اور نمونے کا بیان ہے۔ ”غَشِيَ يَغْشِي“ (غ)
کا معنی ڈھانپنا ہے۔ ”يُغْشِي“ باب افعال ”أَغْشَى يَغْشِي“ سے ہے، معنی ہے کسی چیز کو دوسری چیز کے لیے ڈھانپنے والی بنا
دینا۔ رات کو دن پر اڑھا دیتا ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے، اگلی بات خود سمجھ میں آرہی ہے، اس لیے حذف کر دی، یعنی دن کو
رات پر اڑھا دیتا ہے تو روشنی ہو جاتی ہے، دونوں ایک دوسرے کی جگہ آتے رہتے ہیں۔ دونوں کے فوائد کی تفصیل کے لیے
دیکھیے سورہ قصص (۷۳ تا ۷۷)۔

﴿٤﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ : یعنی جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں ان کے لیے ان چیزوں میں بہت سے دلائل ہیں کہ وہ اللہ کے
مکان و زمان کی ہر حرکت و سکون اور ہر تبدیلی مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں ہے، وہ انسان کو بھی دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ موح
میں ہے: ”رنگارنگ چیزیں بنانا نشان ہے کہ اپنی خوشی سے بنایا، اگر ہر چیز خاصیت سے ہوتی تو ایک ہی ہوتی۔“ رازی رحمہ
لکھتے ہیں کہ قرآن میں جہاں عالم سظلی، یعنی زمین کے دلائل کا ذکر ہے اس کے آخر میں: ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ
يَتَفَكَّرُونَ﴾ یا اس کا ہم معنی جملہ لایا گیا ہے، جس سے اشارہ ہے کہ ان چیزوں پر غور و فکر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ اختلاف
طبی اسباب کے تحت نہیں (یعنی خود بخود ایسا نہیں ہو رہا بلکہ ایک کرنے والا سب کچھ کر رہا ہے)۔

﴿٤﴾ وَ فِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُتَجَوِّزٌ : ”قِطْعٌ“ ”قِطْعَةٌ“ کی جمع ہے، بمعنی ٹکڑے۔ ”مُتَجَوِّزٌ“ ”جَوَّازٌ“
(مساگی) سے باب تفاعل کا اسم فاعل ہے، یعنی ساری زمین ایک جیسی نہیں، کوئی ٹکڑا زرخیز زمین کا ہے کوئی شور کا، کوئی نرم
زمین ہے کوئی پتھر ملی اور یہ سب قطعے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں، اب اسی زمین میں کسی علاقے میں کوئی کھیتی اور پھل

وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ء إِذَا كُنَّا ثُرْبًا ء إِنَّا نَفَىٰ خَلْقٍ جَدِيدٍ ء أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ء وَ أُولَٰئِكَ الْأَعْلَىٰ فِي أَعْنَاقِهِمْ ء وَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ء هُمْ

فِيهَا خَلِيدُونَ ۝

اور اگر تو تعجب کرے تو ان کا یہ کہنا بہت عجیب ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم یقیناً ایک نئی
پیدائش میں ہوں گے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا اور یہی ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں
گے اور یہی آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ۝

پیدا ہوتا ہے کسی میں کوئی، اور اسی میں انگوروں (اور دوسرے پھلوں) کے باغات ہیں (قرآن کا اختصار دیکھیے کہ صرف
انگوروں کا ذکر کر کے باقی باغات سننے والے کی سمجھ پر چھوڑ دیے) اور کھیتی ہے (اس میں ہر کھیتی آگئی) اور کھجوروں کے درخت
دو قسم کے ہیں (”صِنَوَانٌ“ ”صِنُو“ کی جمع ہے، تشبیہ بھی یہی ہے، اس کا اصل معنی مثل ہے، جیسے فرمایا: ”عَمُّ الرَّجُلِ صِنُو
أَبِيهِ“ یعنی آدمی کا چچا اس کے باپ کی مثل ہے۔ کھجور کا تانچے سے ایک ہو اور اوپر اس تانچے سے کئی تانچے نکلیں تو وہ ”صِنَوَانٌ“
ہے اور اگر یہ ایک ہی تانچہ ہے تو یہ ”عَمُّ صِنَوَانٌ“ ہے) اس قسم کے دوسرے درخت اس سے خود سمجھ لیں۔ سب ایک ہی پانی
سے سیراب کیے جاتے ہیں، پھر اسی زمین اور اسی پانی سے کوئی پھل کڑوا پیدا ہو رہا ہے کوئی میٹھا، کوئی بد مزہ کوئی مزیدار اور کوئی
اس سے بھی بڑھ کر لذت والا۔ پھر دیکھیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ اللَّهَ عَزَّوَجَلَّ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قُبْضَةٍ قَبْضَتِهَا مِنْ
جَمِيعِ الْأَرْضِ فَحَاءَ بَنُو آدَمَ عَلَى قَدَرِ الْأَرْضِ حَاءَ مِنْهُمْ الْأَبْيَضُ وَالْأَحْمَرُ وَالْأَسْوَدُ وَبَيْنَ ذَلِكَ الْخَبِيثُ
وَالطَّيِّبُ وَالسَّهْلُ وَالْحَزْنُ وَبَيْنَ ذَلِكَ» [مسند احمد: ۴، ۵، ۱: ۱۹۶، ۱۹۷۔ ترمذی: ۲۹۵۵۔ ابوداؤد: ۴۶۹۳،
وصحیحہ الالبانی] ”آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے لیے پوری روئے زمین سے اللہ تعالیٰ نے ایک مٹھی لی (جس میں سفید، سیاہ،
سرخ ہر رنگ اور نرم، سخت، شور، زرخیز ہر قسم کی مٹی آگئی) اور آدم کی اولاد اسی کے مطابق کوئی سرخ، کوئی سفید، کوئی سیاہ، کوئی
اس کے درمیان، کوئی نرم کوئی سخت اور کوئی خبیث کوئی طیب پیدا ہوتی ہے۔“ ایک ہی زمین، ایک ہی پانی، ایک ہی باپ اور
اسی کے نطفے سے بے شمار رنگا رنگ انسان پیدا ہوئے۔

www.KitaboSunnat.com

۝ ۲ ۝ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ : معلوم ہوا کوئی کمال کارگر اور پوری قدرت والا مادر ہے جس کے کرنے سے یہ
سب کچھ ہو رہا ہے، قرآن نے ان دلائل کا ذکر مختلف مقامات پر کیا ہے۔ عقل سے کام لینے والوں کے لیے اس میں بے شمار
نشانیوں ہیں اور جو عقل سے کام نہیں لیتے ان کے لیے کوئی نشانی نہیں۔

آیت 5 ۝ ۱ ۝ وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ : ”عَجَبٌ“ میں تنوین تقظیم و تہویل کے لیے ہے، اسی لیے اہل علم
نے ترکیب میں اسے نکرہ ہونے کے باوجود مبتدا بنانا جائز رکھا ہے، گویا یہ نکرہ موصوفہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ اتنی

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثَلُ وَإِنَّ رَبَّكَ

لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلَى ظُلْمِهِمْ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ①

اور وہ تجھ سے بھلائی سے پہلے برائی کو جلدی طلب کرتے ہیں، حالانکہ ان سے پہلے کئی عبرت ناک سزائیں گزر چکی ہیں اور بے شک تیرا رب یقیناً لوگوں کے لیے ان کے ظلم کے باوجود بڑی بخشش والا ہے اور بلاشبہ تیرا رب یقیناً بہت سخت سزا والا ہے ①

نشانیوں دیکھ کر بھی ان کے ایمان نہ لانے پر تعجب کریں تو بہت ہی عجیب بات ان کا دوبارہ نئے سرے سے پیدا ہونے کو ناممکن قرار دینا ہے، حالانکہ جو شخص معمولی علم اور معمولی عقل رکھتا ہے آسانی سمجھ سکتا ہے کہ اتنی قدرتوں کے مالک اور پہلی دفعہ انہیں پیدا کرنے والے کے لیے انہیں دوبارہ نئے سرے سے پیدا کرنا کیوں مشکل ہے۔

② **أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ**: یعنی جب انہوں نے آخرت سے انکار کیا تو گویا اللہ کی قدرت سے انکار کیا اور یہ کہا کہ اللہ اتنا عاجز اور بے بس ہے کہ انہیں دوبارہ پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ [العباد باللہ]

③ **وَأُولَئِكَ الْأَغْلَالُ.....: "الْأَغْلَالُ" "غُلٌّ"** کی جمع ہے، لوہے کا کڑا یا زنجیر جو مجرم کے گلے میں ڈال کر اسے باندھا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کے ساتھ ہی ہاتھ بھی گردن کے ساتھ باندھ دیتے ہیں، یہ قید کی سخت ترین صورت ہے۔ یعنی ان کی گردنوں میں وہی آہائی کفر و شرک کے طوق پڑے ہوئے ہیں جو انہیں کفر سے بٹنے نہیں دیتے اور انجام ان کا یہ ہے کہ یہ آگ والے ہیں، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں۔ بعض مفسرین نے "أُولَئِكَ الْأَغْلَالُ" کو بھی آخرت کے انجام میں شامل کیا ہے کہ جہنم میں ان کی گردنوں میں لوہے کے طوق (کڑے) ہوں گے، جن میں پڑی ہوئی زنجیروں سے بندھے ہوں گے۔ آیت کے الفاظ سے تو زیادہ ظاہر معنی یہی معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: **إِذَا الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلْسِلُ يُسْحَبُونَ فِي الْحَيَاةِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُجْرُونَ** [المومن: ۷۱، ۷۲] "جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، گھسیٹے جا رہے ہوں گے۔ کھولتے پانی میں، پھر وہ آگ میں جھونکے جائیں گے۔"

آیت 6 ① **وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ.....: "السَّيِّئَةُ"** سے مراد بری حالت مثلاً عذاب اور "الْحَسَنَةُ" سے مراد اچھی حالت مثلاً عافیت اور خوش حالی ہے۔ "الْمَثَلُ" کی واحد "مَثَلَةٌ" بروزن "سَمْرَةٌ" ہے، معنی ہے سخت سزا اور رسوا کن عذاب جو انسان پر اترے اور اسے دوسروں کے لیے برے کاموں سے باز رکھنے کے لیے مثال اور عبرت بن جائے۔ "اسْتَعْجَلُوا" کسی چیز کا وقت آنے سے پہلے اسے لانے کا مطالبہ کرنا، یعنی ان کی سرکشی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ جھٹلانے اور مذاق اڑانے کے لیے تندرستی اور عافیت کے بجائے پہلے عذاب لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مشرکین کے اس قسم کے مطالبوں کا قرآن میں کئی جگہ ذکر ہے، مثلاً سورہ انفال (۳۲)، سورہ عنکبوت (۵۳، ۵۴) اور سورہ نمل (۴۶) ان آیات کا ترجمہ و تفسیر پڑھ لیں۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝٦١

اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی؟ تو تو صرف ایک ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کے لیے ایک راستہ بتانے والا ہے ﴿٦١﴾

﴿٦٢﴾ وَقَدْ خَلَّتْ مِنْ قَبْلِهِمُ النَّاسُ: جن میں ان کے لیے عبرت کا کافی سامان موجود ہے۔ موح میں ہے کہ پہلے ہو چکیں ہیں کہاوتیں، یعنی ایسے عذاب آئے ہیں کہ ان کی کہاوتیں چلی ہیں۔

﴿٦٣﴾ وَإِنْ رَبُّكَ لَذُو مَغْفِرٍ لِّلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ: ”مَغْفِرٌ“ پر توین تعظیم کے لیے ہے، یعنی اللہ اتنی بڑی مغفرت والا ہے کہ لوگوں کے ظلم پر گرفت کرے تو زمین پر کوئی جان دار باقی نہ رہے، فرمایا: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِم مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ وَلَٰكِن يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ [السلح: ٦١] ”اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے پکڑے تو اس کے اوپر کوئی چلنے والا نہ چھوڑے اور لیکن وہ انہیں ایک مقرر وقت تک ڈھیل دیتا ہے، پھر جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی نہ چھپے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں۔“ اور دیکھیے سورہ فاطر کی آخری آیت۔ وہ مہلت ہی دیے جاتا ہے کہ شاید باز آجائیں، تو بہ کر لیں اور اس کا عذاب بھی نہایت سخت ہے۔ معلوم ہوا کہ سلامتی اور امن کی راہ امید اور خوف میں اعتدال ہے، انسان اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید بھی رکھے اور اس کے عذاب سے ڈرتا بھی رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے غضو و درگزر کی امید نہ ہو تو کسی شخص کی زندگی خوش گوار نہ ہو اور اگر اس کے عذاب کا ڈرنہ ہو تو ہر شخص بے کھٹکے گناہ کرتا رہے۔

بیت 7 ﴿٦٤﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی ایک اور کینگی کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ کفار تمام انبیاء کی آیات (معجزوں) سے بڑی آیت (بڑا معجزہ یعنی قرآن مجید) دیکھنے کے باوجود کہہ رہے ہیں کہ اس پر کوئی آیت (معجزہ) نازل کیوں نہیں ہوئی۔ ان کے مطالبوں کی مثال دیکھنی ہو تو دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (٩٠ تا ٩٣) آیت یعنی نشانی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک تنزیلی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترنے والے احکام و آیات اور دوسری نکوینی یعنی جن کا مقابلہ کرنے سے ساری کائنات عاجز ہو۔ قرآن میں دونوں خوبیاں ہیں، اس میں ہدایت کی آیات بھی ہیں اور ساری دنیا کو پہلے پوری کتاب، پھر اس جیسی دس سورتیں اور پھر صرف ایک سورت جیسی سورت لانے کا چیلنج قیامت تک کے لیے ہے، جس کا جواب کافر آج تک نہیں دے سکے، کفار کی حسرت دیکھو پھر بھی کہہ رہے ہیں کہ اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتری۔

﴿٦٥﴾ إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ: نبی کریم ﷺ مبشر بھی تھے اور منذر بھی، مگر یہاں آپ کی صفت صرف منذر بیان فرمائی، کیونکہ ذکر کفار کا ہے۔ ”مُنذِرٌ“ اور ”هَادٍ“ پر توین تعظیم کی ہے، یعنی اللہ پر ایمان نہ لانے والوں کے لیے دنیا و آخرت کے عذاب سے ڈرانے والے کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر قوم کے لیے ایک عظیم رہنما ہوتا ہے۔ آپ کا کام کرشمے دکھانا نہیں بلکہ آپ کی ذمہ داری لوگوں کو کفر کے برے انجام سے ڈرانا ہے، اس لیے آپ کرشمے دکھانے والے نہیں بلکہ صرف

اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثَىٰ وَمَا تَغِيصُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۗ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ

بِمِقْدَارٍ ۝

اللہ جانتا ہے جو ہر مادہ اٹھائے ہوئے ہے اور جو کچھ رحم کم کرتے ہیں اور جو زیادہ کرتے ہیں اور ہر چیز اس کے ہاں ایک اندازے سے ہے ۝

ایک عظیم ہادی، یعنی ڈرانے اور آگاہ کرنے والے ہیں۔ ”إِنَّمَا“ کے ساتھ یہ حصر اضافی ہے، یعنی معجزہ دکھانے والے کے بجائے منذر ہیں، یہ نہیں کہ آپ منذر کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں (پھر قوموں کو رہنما کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ عظیم رہنما بھی ہیں، لہذا ان کے بے جا مطالبے سے پریشان نہ ہوں۔ مستدرک حاکم (۱۲۹/۳، ج: ۴۶۳۶) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت ﴿إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ کے ضمن میں فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ منذر ہیں اور میں ہادی ہوں۔“ مگر یہ روایت صحیح نہیں ہے، پھر خلافت بلا فصل پر اس سے استدلال بھی غلط ہے، جیسا کہ ظاہر ہے، حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہی اللہ کی طرف سے منذر ہیں اور وہی ہادی ہیں، پھر وہ لوگ جنہوں نے آپ ﷺ کے علم اور دین یعنی خالص کتاب و سنت کو (نہ کہ لوگوں کی رائے اور قیاس کو) دعوت و جہاد کے ذریعے آگے پہنچایا، پہنچا رہے ہیں اور پہنچاتے رہیں گے، مثلاً خلفائے اربعہ، صحابہ کرام، مجاہدین اسلام، محدثین اور عادل قاضی اور خلفاء (اللہ سب پر راضی ہو) سب آپ کے خلف صدق ہیں۔

آیت 8 ① اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثَىٰ : ”تَغِيصُ“ ”عَاصِصٌ يَغِيصُ“ سے ہے اور یہ ”نَقْصٌ يَنْقُصُ“ کا ہم معنی ہے۔ لازم اور متعدی دونوں معنوں میں آتا ہے، یعنی کم ہونا، کم کرنا۔ اسی طرح ”تَزْدَادُ“ باب افتعال ”زَادَ يَزِيدُ“ کی طرح ہے، معنی ہے زیادہ ہونا اور زیادہ کرنا۔ یعنی حمل قرار پانے سے لے کر بچہ پیدا ہونے تک ہر چیز کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے اور ارحام (بچہ دانیوں) کا یہ علم اللہ تعالیٰ کی خاص صفات میں سے ہے، یعنی اس بات کا علم کہ مذکر ہے یا مؤنث، خوب صورت ہے یا بد صورت، بد بخت ہے یا نیک بخت، لمبی عمر والا ہے یا کم عمر۔ مزید دیکھیے سورہ نحم (۳۲)، زمر (۶) اور مومنون (۱۳۳)۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿مَفَاتِحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ : ﴿إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ وَيُنزِلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ قَدْ أَتَتْكَ سُبُغَاتٌ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾﴾ ”غیب کی کنجیاں پانچ ہیں (جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا)۔“ (پھر سورہ لقمان کی آخری آیت میں مذکور چیزیں بیان فرمائیں)۔ [بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ﴾ : ﴿۶۲۷﴾ مزید وضاحت کے لیے سورہ لقمان کی آخری آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ المرآساؤنڈ کی حقیقت بھی وہیں ملاحظہ فرمائیں۔

② وَمَا تَغِيصُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ: اور جو رحم کم کرتے ہیں یا زیادہ کرتے ہیں، یعنی بچہ ضائع ہو جاتا ہے یا نامکمل پیدا ہوتا ہے یا عدت و ولادت میں اضافہ یا کمی ہوتی ہے کہ بعض کے ہاں چھ یا نو ماہ بعد، بعض کے ہاں دس ماہ یا اس سے بھی زیادہ مدت کے بعد بچہ پیدا ہوتا ہے۔

عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرِ الْمُتَعَالِ ① سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسَرَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ
وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِأَيْتِلٍ وَسَارِبٌ بِالتَّهَارِ ②

وہ غیب اور حاضر کو جاننے والا، بہت بڑا، نہایت بلند ہے ① برابر ہے تم میں سے جو بات چھپا کر کرے اور جو اسے بلند آواز سے کرے اور وہ جو رات کو بالکل چھپا ہوا ہے اور (جو) دن کو ظاہر پھرنے والا ہے ②

① وَعَلَىٰ هُنَّ وَعِنْدَهُ بِبِقَدَارٍ : اللہ تعالیٰ کو ازل سے ابد تک ہر چیز کا علم ہے، اس نے ہر چیز کے متعلق پہلے ہی سب کچھ طے کر کے لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے اور یہی تقدیر ہے۔ اس پر ایمان نہ ہو تو آدمی مسلمان نہیں ہوتا، فرمایا: ﴿لَا كَلِمَٰةٌ هُنَّ إِلَّا كَلِمَةٌ هَادِيَةٌ أَوْ كَلِمَةٌ هُنَّ إِلَّا كَلِمَةٌ سَارِبَةٌ﴾ [النمر: ۴۹] ”بے شک ہم نے جو بھی چیز ہے، ہم نے اسے ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے۔“ یعنی وہی جانتا ہے کہ کون سی چیز کتنی ہوگی اور کیسے ہوگی، اس اندازے میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

② 9 عِلْمُ الْغَيْبِ: ”الْكَبِيرُ“ میں بھی مبالغہ ہے اور ”الْمُتَعَالِ“ (جو اصل میں ”عَلَا يُعْلَوُ“ کے باب تفاعل سے ”مُتَعَالَوُ“ تھا) میں حروف زیادہ ہونے سے معنی میں مبالغہ مراد ہے۔ ”مُتَعَالَوُ“ کی ”وَاوُ“ کو ”يَاءُ“ سے بدلا تو ”مُتَعَالِي“ ہوا، پھر ”يَاءُ“ کو آیات کے آخری الفاظ (جنہیں اصطلاح میں فاصلہ، فواصل کہتے ہیں) کی موافقت اور تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت اور اس کی کبریائی اور بلندی کا بے حد و حساب ہونا بیان ہوا ہے، جو درحقیقت کچھ بات ہی کی تاکید ہے۔ ”الْغَيْبِ“ مصدر ہے، بمعنی اسم فاعل، یعنی غائب جو حواس اور بدیہ عقل سے غائب ہو۔ ”الشَّهَادَةِ“ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، یعنی جو شاہد و حاضر ہے۔ اسم فاعل کو مصدر کی صورت میں لانے سے مبالغہ مقصود ہے، جیسے ”زَيْدٌ عَادِلٌ“ کے بجائے ”زَيْدٌ عَادِلٌ“ کہتے ہیں۔

③ 10 سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسَرَ الْقَوْلَ: یہ اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت کی ایک اور تاکید ہے، یعنی تمہارا کوئی آدمی چھپا کر بات کرے یا بلند آواز سے اللہ کے نزدیک دونوں برابر ہیں، وہ دونوں کو یکساں سنتا ہے، جبکہ تم اور ساری مخلوق کچھ بات کو تو سن ہی نہیں سکتے، البتہ بلند آواز سے کی ہوئی ایک شخص کی بات تم سن اور سمجھ سکتے ہو، مگر جب چار چھ آدمی اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیں تو کسی کے پلے کچھ نہیں پڑے گا، اب اللہ تعالیٰ کے علم کا اندازہ کر لو کہ اس کے ہاں یہ سب برابر ہیں، وہ ایک ہی وقت میں سب کی سنتا اور سمجھتا اور سب کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔

④ ”مُسْتَخْفٍ“ ”خَفِيَ يَخْفَى“ (چھپنا) کے باب استفعال سے اسم فاعل برائے مبالغہ ہے، بالکل چھپنے والا۔ ”بِأَيْتِلٍ“ رات کو، کیونکہ رات کی تاریکی چھپنے میں مزید مدد دیتی ہے۔ ”سَارِبٌ“ یعنی ظاہر، ”سَرَبَ فِي الْأَرْضِ أَي دَخَلَ فِي طَرِيقِهِ“ وہ اپنے راستے میں گیا، یعنی گھر کے کسی کمرے یا کونے کے بجائے راستے یا گلی بازار میں پھرنے والا اور وہ بھی دن کو ہر ایک کے سامنے ہوتا ہے۔ دن کا ذکر خصوصاً اس لیے کیا کہ وہ ہر چیز کو خوب ظاہر کر دیتا ہے۔ اس لیے بعض اہل علم نے ”سَارِبٌ“ کا معنی گلیوں میں پھرنے والا، یعنی بالکل ظاہر کیا ہے۔ یعنی یہ سب اس کے علم میں برابر ہیں۔

لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَكَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُعْزِذُ مَا يَقْتُمُ حَتَّىٰ يُعْزِرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۗ وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا فَلَا مَرَدَ لَهُ ۗ وَ مَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَالٍ ﴿۱۱﴾

اس کے لیے اس کے آگے اور اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے کئی پہرے دار ہیں، جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ بے شک اللہ نہیں بدلتا جو کسی قوم میں ہے، یہاں تک کہ وہ اسے بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے اور جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کر لے تو اسے ہٹانے کی کوئی صورت نہیں اور اس کے علاوہ ان کا کوئی مددگار نہیں ﴿۱۱﴾

آیت ۱۱ ﴿۱۱﴾ لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ: ”مُعَقِّبَاتٌ“ (باری باری ایک دوسرے کے بعد آنے والے) یہ ملائکہ کی صفت ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی نگرانی و حفاظت کا جو انتظام کر رکھا ہے اس کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے ہر انسان پر کتنے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، کیونکہ دو فرشتے تو نیک و بد عمل لکھنے والے دائیں اور بائیں ہیں۔ (س: ۱۷، ۱۸) حفاظت کرنے والوں کی تعداد یہاں بیان نہیں فرمائی جو چاروں طرف سے انسان کی ہر آفت و مصیبت سے حفاظت کرتے ہیں، سوائے اس مصیبت کے جو اللہ نے اس کے لیے لکھی ہے۔ فرشتوں کی ایک اور قسم کے متعلق عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وَكَّلَ بِهِ قَرْنَيْنِ مِنَ الْحَيِّ، قَالُوا وَإِيَّاكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ وَإِيَّايَ إِلَّا أَنَّ اللَّهَ أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَأَسْلَمَ فَلَا يَأْمُرُنِي إِلَّا بِخَيْرٍ » [مسلم، صفات المنافقين، باب تحريض الشيطان، ۲۸۱۴] ”تم میں سے جو بھی شخص ہے اس کے ساتھ اس کا ایک قرین (ساتھ رہنے والا) جنوں سے مقرر کیا گیا ہے اور ایک قرین فرشتوں سے۔“ لوگوں نے پوچھا: ”یا رسول اللہ! آپ کے ساتھ بھی (جن مقرر ہے)؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”(ہاں) میرے ساتھ بھی، مگر اللہ نے اس کے مقابلے میں میری مدد فرمائی ہے تو وہ تابع ہو گیا ہے، سو وہ مجھے خیر کے سوا کوئی حکم نہیں دیتا۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ باری والے فرشتے صبح اور عصر کے وقت تبدیل ہوتے ہیں، ان وقتوں میں آنے اور جانے والوں کی ملاقات ان دونوں نمازوں میں ہوتی ہے۔ [بخاری، مواہب اللغات، باب فضل صلاة العصر: ۵۵۵۔ مسلم: ۶۳۲] اس حقیقت کے اظہار کا مقصد یہ ہے کہ انسان ہر آن اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہتا ہے اور اس کی کوئی حرکت اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں۔

﴿۱۲﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يُعْزِذُ مَا يَقْتُمُ یعنی جب تک نیکی کے بجائے برائی اور اطاعت کے بجائے نافرمانی نہ کرنے لگیں، البتہ جب وہ ایسا کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ ان سے اپنی نعمت چھین لیتا ہے اور ان پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کی مثال کے ساتھ سورہ انفال (۵۳، ۵۴) میں بیان فرمائی۔ مزید مثال کے لیے دیکھیے سورہ نحل (۱۱۲) اور سبأ (۳۱۵)

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَ طَمَعًا وَيُنزِلُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْبَلَدُكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ ۚ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ وَ هُمْ

وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے، ڈرانے اور امید دلانے کے لیے اور بھاری بادل پیدا کرتا ہے ﴿۱۲﴾ اور (بادل کی) گرج اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کے خوف سے۔ اور وہ کڑکنے والی بجلیاں بھیجتا ہے، پھر انھیں

۱۷) واضح رہے کہ یہاں قوموں کی تباہی کا قانون بیان کیا گیا ہے، افراد کا نہیں۔ کسی قوم کی اچھی یا بری حالت کا تعین اسی لحاظ سے کیا جائے گا کہ آیا اس میں اچھے لوگوں کا غلبہ ہے یا برے لوگوں کا؟ رہے افراد تو ضروری نہیں کہ ایک شخص گناہ کرے تبھی اس پر عذاب نازل ہو، بلکہ ایک بے گناہ شخص دوسروں کے گناہ کی لپیٹ میں آسکتا ہے، جیسا کہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے پوچھا: «يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَتَهْلِكُ وَفِينَا الصَّالِحُونَ، قَالَ نَعَمْ إِذَا كَثُرَ الْخَبِيثُ» [بخاری، أحاديث الأنبياء، باب قصة يأجوج ومأجوج: ۳۳۶۶] ”اے اللہ کے رسول! کیا نیک لوگوں کے ہم میں موجود ہونے کے باوجود ہم ہلاک ہو جائیں گے؟“ فرمایا: ”ہاں! جب خباث (گناہ) زیادہ ہو جائے۔“

﴿۱۳﴾ وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا..... ہم چاہے کتنی سائنسی تدبیریں اور حفاظت کا بندوبست کر لیں، یا کسی پیر، بزرگ، بت یا جن یا فرشتے کی پناہ پکڑ لیں، اللہ تعالیٰ کے ارادے کے مقابلے میں کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔

آیت ۱۲ هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ الْبَرْقَ..... اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ایسے نشان بیان فرمائے ہیں جو بیک وقت امید اور ڈر کے حامل ہیں، جو رحمت کا پیش خیمہ بھی بن سکتے ہیں اور موجب زحمت بھی۔ مثلاً جب بجلی چمکتی ہے تو امید بندھتی ہے کہ بارش ہوگی مگر ڈر بھی لگتا ہے کہ کہیں تباہی کا موجب نہ بن جائے، بادل دیکھ کر رحمت کی بارش کی امید بندھ جاتی ہے مگر ساتھ ہی یہ فکر بھی دامن گیر رہتی ہے کہ کہیں سیلاب نہ آجائے۔ پس انسان کو چاہیے کہ اللہ کی رحمت کا امید وار رہے اور اس کے عذاب سے بھی ڈرتا رہے۔

آیت ۱۳ ﴿۱﴾ وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ.....: ”الرَّعْدُ“ یعنی بادل کی گرج، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت، جلال اور عظمت کے بیان کے لیے بادل کی گرج، گرنے والی بجلیوں اور ان کی کڑک کا ذکر فرمایا۔ یہ اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر کی اور ہر عیب سے پاک اور ہر کمال اور ہر خوبی کا مالک ہے اور فرشتے بھی اس کے خوف کی وجہ سے تسبیح و تحمید کرتے ہیں، بلکہ کائنات کی ہر چیز کا یہی وظیفہ ہے، فرمایا: ﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ [ہی اسرائیل: ۴۹] ”اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔“ قرآن مجید میں کئی چیزوں کا صاحب احساس ہونا اور بولنا مذکور ہے، جنہیں ہم بے زبان سمجھتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں چیونٹی کی بات اور سلیمان علیہ السلام کا اسے سمجھنا، اسی طرح ہدہد سے ان کی گفتگو سورہ نمل میں مذکور ہے۔ سورہ بقرہ میں پتھروں کا اللہ کے

يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ ۗ وَهُوَ شَدِيدُ الْحَالِ ﴿۳۹﴾

ڈال دیتا ہے جس پر چاہتا ہے، جب کہ وہ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں اور وہ بہت سخت قوت والا ہے ﴿۳۹﴾
خوف سے گرنا، پھٹ جانا اور ان سے پانی بہ نکلنا مذکور ہے۔ جہنم اور جنت کی گفتگو قرآن وحدیث میں آئی ہے اور اب تو سائنس نے نباتات میں شعور و احساس تجربے سے ثابت کیا ہے۔ کفار کے مرنے پر آسمان وزمین کا نہرنا سورہ دخان (۲۹) میں ہے۔ پرندوں اور پہاڑوں کا داؤد علیہ السلام کے ساتھ مل کر صبح وشام تسبیح کا ذکر کرنا سورہ ص (۱۸، ۱۹) میں ہے۔ ”الرُّعْدُ“ کے متعلق چند احادیث معروف ہیں۔ ایک لمبی روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: ”الرُّعْدُ“ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جو بادل پر مقرر ہے، اس کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا ہے، جس کے ساتھ وہ بادل کو ہانکتا ہے اور جو آواز اس سے سنائی دیتی ہے وہ اس کے بادل کو ہانکنے کی آواز ہے، جب وہ اسے ہانکتا ہے یہاں تک کہ وہ اس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اسے حکم دیتا ہے۔“ یہ حدیث ترمذی (۳۱۱۷)، مسند احمد (۲۷۴۲)، ح: ۲۳۸۷ اور سنن کبریٰ للنسائی (۳۳۶/۶، ح: ۹۰۷۲) وغیرہ میں ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے سلسلہ صحیح (۳۹۱/۳، ح: ۱۸۷۲) میں ذکر فرمایا ہے اور لمبی بحث کے بعد فرمایا ہے کہ میرے نزدیک یہ حدیث کم از کم حسن ضرور ہے۔ البتہ مسند احمد کی تحریج میں شعیب ارتووط نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس لمبی حدیث کو حسن کہا ہے، مگر اس کے اس رعد والے حصے کو منکر کہا ہے۔ (واللہ اعلم)

اگر کوئی کہے کہ سائنس تو اسے بادل کے ٹکڑوں کی رگڑ کا نتیجہ قرار دیتی ہے تو اسے کہیں کہ یہ بات حدیث کے خلاف نہیں، وہ رگڑ بھی تو کسی کے حکم سے بادلوں کے چلنے کے نتیجے ہی میں پیدا ہوتی ہے۔ کائنات کی کوئی بھی چیز خود بخود نہیں چل رہی۔ قبیلہ بنو غفار کے ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يُنْشِئُ السَّحَابَ فَيَنْطَلِقُ أَحْسَنَ النُّطْقِ وَيُضْحِكُ أَحْسَنَ الضَّحْكِ﴾ [السلسلة الصحيحة: ۲/۵۰۹، ح: ۱۶۶۵] ”اللہ تعالیٰ بادل کو پیدا کرتا ہے تو وہ بولتا ہے، بہترین بولتا اور ہنستا ہے، بہترین ہنستا۔“ شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح میں اسے مسند احمد اور کئی کتب حدیث کے حوالے سے ذکر کر کے اس کی سند کو صحیح کہا اور شعیب ارتووط نے بھی مسند احمد (۹۲، ۹۱/۳۹، ح: ۲۳۶۸۲) میں اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ گرج اور چمک بادل ہی کی گفتگو اور اسی کا ہنسا ہے۔ رہی یہ بات کہ ”رعد“ فرشتے کی آواز ہے یا بادل کی گفتگو، تو حقیقت یہ ہے کہ دونوں باتیں ہی درست ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں۔

﴿وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ.....: مفروات راغب میں ہے کہ ”صاعقة“ تین معنوں میں آتا ہے: ① موت، جیسے: ﴿فَصَوِّقْ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ﴾ [الزمر: ۶۸] ② عذاب، جیسے: ﴿أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثُودٌ﴾ [حجۃ السجدة: ۱۳] ③ آگ، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ﴾ [الرعد: ۱۳] کیونکہ صاعقة کا معنی فضا میں پیدا ہونے والی نہایت سخت آواز (بجلی کی کڑک) ہے، پھر اس کے نتیجے میں مذکورہ تین چیزوں میں سے کوئی بھی چیز واقع ہو سکتی

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كِبَاسِطٍ
كَفَيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ﴿۱۳﴾

برحق پکارنا صرف اسی کے لیے ہے اور جن کو وہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان کی دعا کچھ بھی قبول نہیں کرتے، مگر اس شخص کی طرح جو اپنی دونوں ہتھیلیاں پانی کی طرف پھیلائے والا ہے، تاکہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے، حالانکہ وہ اس تک ہرگز پہنچنے والا نہیں اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر سراسر بے سود ﴿۱۳﴾

ہے، گویا حقیقت میں صاعقہ ایک ہی چیز ہے، باقی اس کے اثرات ہیں۔ صاعقہ کے ساتھ نکلنے والی بجلی کی چمک نہایت تیز ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کڑکنے والی بجلیوں کو بھیجتا ہے، پھر جن پر چاہتا ہے بجلی گرا دیتا ہے، جبکہ وہ بے فکر ہو کر اللہ تعالیٰ کے متعلق جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔

﴿۱۳﴾ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ: یعنی اتنی نشانیاں دیکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، کبھی اس کے کمال علم و قدرت اور اسی لیے معبود ہونے کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ دوبارہ زندہ کیسے کرے گا اور کبھی اس کے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں اور کبھی اس کے عذاب کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔

﴿۱۴﴾ وَهُوَ شَدِيدُ الْعِقَابِ: امام راغب نے ”الْإِحْطَالِ“ کا مادہ ”مَحَلَّ“ بتایا ہے اور ”شَدِيدُ الْعِقَابِ“ کا معنی کیا ہے: ”شَدِيدُ الْإِخْذِ بِالْعُقُوبَةِ“ یعنی وہ سخت سزا میں پکڑنے والا ہے۔ امام راغب ہی نے بعض اہل علم کا قول لکھا ہے کہ اس کا مادہ ”حَوْلٌ“ ہے، بمعنی ”قُوَّةٌ“ یعنی وہ بہت سخت قوت والا ہے۔ اس صورت میں میم زائد ہے۔

آیت 14 ﴿۱۳﴾ لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ: یہاں موصوف اپنی صفت کی طرف مضاف ہے، یعنی سچا اور برحق پکارنا صرف اسی کو پکارنا ہے، دوسرے کسی کو بھی پکارنا باطل ہے۔ کیونکہ دور و نزدیک سے ہر ایک کی پکار سنا بھی وہی ہے، ہر ایک کے احوال سے واقف بھی وہی ہے اور ہر ایک کی حاجت پوری کرنے کی قدرت بھی صرف وہی رکھتا ہے، کسی اور میں ان صفات میں سے کوئی صفت بھی نہیں۔

﴿۱۴﴾ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ.....: ”يَدْعُونَ“ کی ضمیر مشرکین کے لیے ہے، یعنی اللہ کے سوا کسی کو بھی پکارنے والے کی مثال اس شخص کی ہی ہے جو دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے تاکہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے، اب پانی نہ اس کی بات سنا ہے، نہ سمجھتا ہے اور نہ یہ طاقت رکھتا ہے کہ خود بخود اس کے منہ تک پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر ان خود ساختہ خداؤں کی بے بضاعتی اور بے بسی بڑی تفصیل سے بیان فرمائی۔ دیکھیے سورہ اعراف (۱۹۱ تا ۱۹۸)، سبا (۲۲)، فاطر (۱۳)، احقاف (۵) اور حج (۷۳) قارئین سے درخواست ہے کہ وہ یہ مقامات نکال کر ترجمہ ضرور پڑھیں، ان شاء اللہ توحید کی شندک دل میں محسوس کریں گے۔

وَاللّٰهُ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظَلَمَهُمُ بِالْعُدُوِّ وَالْاَصَالِ ۝۱۵

اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ ہی کو سجدہ کر رہا ہے، خوشی اور ناخوشی سے اور ان کے سائے بھی پہلے اور پچھلے پہر ۱۵

۱۵ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِي ضَلٰلٍ: یعنی کافروں کا غیر اللہ کو پکارنا سراسر بے سود ہے، جس سے کچھ حاصل نہیں۔ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”کافر جن کو پکارتے ہیں بعض محض خیال ہیں، بعض جن اور بعض ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں کچھ خواص ہیں، لیکن وہ اپنے خواص کی مالک نہیں، پھر ان کے پکارنے سے کیا حاصل۔ جیسے آگ یا پانی اور شاید ستارے بھی اسی قسم میں ہوں، یہ اس کی مثال فرمائی۔“ (موضح) اس کی مختصر سی تفصیل سمجھ لیں کہ فرشتے ہر وقت ہمارے ساتھ ہیں، سنتے بھی ہیں، طاقت بھی رکھتے ہیں مگر وہ اللہ کے اذن کے بغیر کچھ بھی نہ کر سکتے ہیں اور نہ کرتے ہیں۔ تو انہیں پکارنا ایسے ہی ہے جیسے پانی کو اشارے سے یا زبان سے کہا جائے کہ وہ منہ میں آجائے، حالانکہ اس میں یہ قدرت ہی نہیں اور بالفرض ہو بھی تو وہ یہ اختیار نہیں رکھتا۔

آیت 15 ۱ وَاللّٰهُ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ.....: سجدے کا معنی ہے جسم کے سب سے اونچے اور باعزت حصے کو کسی کے سامنے نیچے سے نیچے لے جا کر اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی کا اظہار کرنا۔ تو کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سامنے اسی طرح اپنی عاجزی اور بے بسی کا اظہار کر رہی ہے۔ اس میں مسلمان اور کافر کا کوئی فرق نہیں، ہاں انسان کو تھوڑا سا اختیار جنت یا جہنم کے راستے پر چلنے کا دیا ہے، اس کے علاوہ اللہ کے سامنے نہ چاہتے ہوئے بھی ہر طرح سجدہ ریز ہے اور اللہ تعالیٰ کے اختیار کے مقابلے میں اپنے آپ پر اس کا اختیار ایک فی صد کیا ایک فی ہزار بھی نہیں، اگر کسی کو شک ہے تو ذرا اپنا سانس روک کر دکھائے، بھوک پیاس روک لے، پیشاب یا پاخانہ روک لے، بیماری آئے تو ڈٹ جائے کہ میں بیمار نہیں ہوتا، بڑھاپے کو آنے سے اور بالوں کو سفید ہونے سے روک دے، حرکت قلب بند ہو جائے تو اسے چلا کر دکھائے، گردے نفل ہو جائیں تو چالو کر کے دکھائے، ایک ٹانگ اٹھا سکتا ہے دوسری بھی اٹھا کر دکھائے، موت کے فرشتے کے سامنے اکڑ جائے، غرض ہر عاقل و غیر عاقل اور ان کے سائے خوشی و ناخوشی سے اللہ ہی کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ پھر ایسے بے بس سے فریاد کرنا، کسی کو داتا، کسی کو دنگیر، کسی کو غریب نواز، کسی کو مشکل کشا کہنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ یہاں سورۃ حج کی آیت (۱۸) کا ترجمہ و تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۲ وَالظَّالِمُ بِالْعُدُوِّ وَالْاَصَالِ: یعنی ان کے سایوں کا گھٹنا اور بڑھنا بھی اسی کے ارادہ و مشیت سے ہے۔ پہلے اور پچھلے پہر کا ذکر اس لیے کیا کہ ان وقتوں میں زمین پر ہر چیز کا سایہ نمایاں ہوتا ہے اور عبادت کے لحاظ سے یہ دونوں عمدہ وقت ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”اور پر چھائیاں صبح و شام کے وقت زمین پر پسر (پھیل) جاتی ہیں، یہی ان کا سجدہ ہے۔“ (موضح)

قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ قُلِ اللَّهُ ۗ قُلْ أَفَاتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَبْلُغُونَ
لأنفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۗ أَمْ هَلْ تُسْتَوَىٰ الظُّلُمَاتُ
وَالنُّورُ ۗ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۗ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ
شَيْءٍ ۗ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ
السَّيْلُ رَبْدًا زَبَدًا ۗ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حَلِيقَةٍ أَوْ مَنَاعٍ زَبَدٌ مِثْلَهُ ۗ

کہہ آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ کہہ دے اللہ۔ کہہ پھر کیا تم نے اس کے سوا کچھ کارساز بنا رکھے ہیں جو اپنی
جانوں کے لیے نہ کسی نفع کے مالک ہیں اور نہ نقصان کے؟ کہہ دے کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتے ہیں؟ یا کیا
اندھیرے اور روشنی برابر ہوتے ہیں؟ یا انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک بنا لیے ہیں جنھوں نے اس کے پیدا کرنے
کی طرح پیدا کیا ہے، تو پیدائش ان پر گنڈھ ہوگئی ہے؟ کہہ دے اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ایک ہے، نہایت
زبردست ہے ﴿۱۶﴾ اس نے آسمان سے کچھ پانی اتارا تو کئی نالے اپنی اپنی وسعت کے مطابق بہ نکلے، پھر اس ریلے نے
ابھرا ہوا جھاگ اٹھالیا۔ اور جن چیزوں کو کوئی زیور یا سامان بنانے کی غرض سے آگ پر تپاتے ہیں ان سے بھی اسی

آیت 16 ﴿۱۶﴾ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ یعنی اگر ایسا ہوتا کہ دنیا میں کچھ چیزیں تو اللہ نے پیدا کی ہوتیں اور
کچھ دوسروں نے، یا بعض کی پرورش اور روزی کا سامان کرنے والا رب اللہ تعالیٰ ہوتا اور بعض کا کوئی دوسرا، یا کسی نفع نقصان
کا مالک اللہ تعالیٰ ہوتا اور کسی کا مالک دوسرا، تب تو ان مشرکوں کے شرک کی کوئی بنیاد ہو سکتی تھی کہ یہ بھی خالق ہونے کی وجہ
سے مستحق عبادت ہیں، مگر جب یہ خود مانتے ہیں کہ زمین و آسمان کی ہر چیز پیدا کرنے والا اللہ اور صرف اللہ ہے تو کوئی وجہ نہیں
کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک قرار دیں۔

﴿۲﴾ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ یہ مشرک اور موحد کی مثال ہے، کیونکہ موحد دیکھنے والی آنکھ، سوچنے والا دل رکھتا
ہے، جبکہ مشرک بصارت اور بصیرت دونوں سے خالی سراسر اندھا ہے۔ موحد نور توحید سے روشن ہوتا ہے، جبکہ مشرک ایک نہیں ہزاروں
اندھیروں میں ہے۔ نور کو واحد اور ظلمات کو جمع لائے، کیونکہ ہدایت اور سیدھا راستہ ایک اور گمراہی کے راستے بے شمار ہیں۔
﴿۳﴾ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ : وہی ہے جو ایک ہے، سب پر غالب ہے، کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

آیت 17 ﴿۱۷﴾ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ”اودیۃ“ (نالے) وادی کی جمع ہے جو اصل میں پانی بہنے کی جگہ کو کہتے
ہیں۔ دو پہاڑوں کے درمیان خالی جگہ کو بھی کہہ لیتے ہیں، کبھی راستے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ پہاڑوں میں
عموماً راستے پہاڑی نالوں کے کناروں کے ساتھ چلتے ہیں۔ ”زبدًا“ وہ کوزا کرکٹ اور جھاگ جو پانی کی تیز رفتاری کے

كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۗ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۗ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۗ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿۱۵﴾

طرح کا جھاگ (ابھرتا) ہے۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے، پھر جو جھاگ ہے سو بے کار چلا جاتا ہے اور رہی وہ چیز جو لوگوں کو نفع دیتی ہے، سو زمین میں رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ مثالیں بیان کرتا ہے ﴿۱۵﴾

باعث اس کی سطح پر ابھرتا ہے، یا بانڈی کے اوپر ابھرتا ہے۔ ”زَلِيلِيًّا“ ”زَنَا يَزُبُّ زُبُوًّا“ (ن) سے اسم فاعل ہے، بمعنی بڑھنے والا، ابھرنے والا۔ ”جَلِيلِيًّا“ سونے چاندی وغیرہ کا زیور جس سے انسان زینت حاصل کرتا ہے۔ ”جُفَاءً“ نالہ یا بانڈی جو شمس و خاشاک یا جھاگ وغیرہ کناروں پر پھینک دیتے ہیں، اسے ”جُفَاءً“ کہتے ہیں۔

شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ دو مثالیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کی بیان فرمائی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ باطل بعض اوقات حق کے اوپر غالب آجائے، مگر آخر کار اللہ تعالیٰ اسے مٹا دیتا ہے اور بے قدر و قیمت بنا دیتا ہے، حسن انجام حق اور اہل حق ہی کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ جھاگ اور خس و خاشاک بے شک پانی کو ڈھانپ لیتے ہیں، مگر آخر کار پانی انھیں کناروں پر پھینک کر بے کار کر دیتا ہے اور خالص پانی سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح سونا چاندی اور دوسری دھاتوں کو پگھلایا جائے تو ان کا میل کچیل بھی اوپر آ جاتا ہے مگر آخر کار کچھ اتار کر پھینک دیا جاتا ہے اور کچھ جل جاتا ہے۔ غرض، سارا میل کچیل بے کار جاتا ہے اور لوگوں کے لیے نفع مند دھات خالص حالت میں باقی رہ جاتی ہے، جیسے سونا اور چاندی، جس سے وہ زیور بناتے ہیں، یا لوہا، تانبہ اور پتیل وغیرہ جس سے برتن، اسلحہ اور دوسرا سامان بنتا ہے۔ استاد محمد عبدالرحمن رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ان دونوں مثالوں میں حق (قرآن) کو پانی سے تشبیہ دی ہے اور نالوں سے مراد انسانوں کے دل ہیں جو اپنے اپنے طرف و استعداد کے مطابق حق سے فیض حاصل کرتے ہیں، یا حق وہ زیور ہے جس سے نفوس انسانی آراستہ ہوتے ہیں اور لوگ معاش و معاد میں اس سے انواع و اقسام کے منافع اور فوائد حاصل کرتے ہیں۔ باطل کی مثال جھاگ کی سی ہے جو حق سے کشمکش کے موقع پر وقتی طور پر ابھرتا ہے مگر آخر کار مٹ جاتا ہے۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَثَلُ مَا بَغْتَنِي اللَّهُ مِنَ الْهُدَى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيرِ أَصَابَ أَرْضًا، فَكَانَ مِنْهَا نَبْهَةٌ، قَبَلَتْ الْمَاءَ، فَأَنْبَتِ الْكَلًّا وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ وَكَانَتْ مِنْهَا أَحَادِبٌ أُمْسَكَتِ الْمَاءَ، فَفَقَعَ اللَّهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوا وَسَقَوْا وَزَرَعُوا، وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةٌ أُخْرَى، إِنَّمَا هِيَ قَيْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلًّا فَذَلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقَهُ فِي دِينِ اللَّهِ وَنَفَعَهُ مَا بَغْتَنِي اللَّهُ بِهِ فَعَلِمَ وَعَلِمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللَّهِ الَّذِي أُرْسِلَتْ بِهِ» [بخاری، العلم، باب فضل من علم و علم و ۷۹] ”اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم اور ہدایت دے کر بھیجا ہے اس کی مثال بہت زیادہ بارش کی ہے جو ایک زمین پر برسی۔ اس زمین کا ایک حصہ بہت عمدہ (زرخیز) تھا، اس نے پانی قبول کیا (جذب کر لیا)، پھر بہت سی گھاس اور چارہ لگایا اور اس کے کچھ حصے سخت زمین کے گڑھے تھے جنہوں نے پانی روک لیا تو اللہ

لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ
جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ ۗ وَمَأْوَهُمُ جَهَنَّمُ ۗ وَ يَبْسُ

الْمِهَادُ ۝۱۸

جن لوگوں نے اپنے رب کی بات قبول کر لی انھی کے لیے بھلائی ہے اور جنہوں نے اس کی بات قبول نہ کی اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا اور ہو تو وہ ضرور اسے فدیہ میں دے دیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے برا حساب ہے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا بچھونا ہے ۝۱۸

نے اس کے ساتھ لوگوں کو نفع پہنچایا، چنانچہ انہوں نے پیا اور پلایا اور کھتی باڑی کی اور اس کے بعض حصے چیل میدان تھے جو نہ پانی روکتے تھے اور نہ گھاس اگاتے تھے، تو یہ اس شخص کی مثال ہے جس نے اللہ کے دین کی سمجھ حاصل کی اور اسے اس (علم و ہدایت) نے نفع دیا جسے دے کر مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا اور اس شخص کی مثال جس نے اس کی طرف نہ سر اٹھایا اور نہ اللہ کی وہ ہدایت قبول کی جو دے کر مجھے بھیجا گیا (ان تینوں میں سے آخری مثال کافر کی ہے)۔“

② كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ: یعنی بات سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے جیسے یہاں دو مثالیں بیان فرمائیں، ایک صحرائی اور پہاڑی لوگوں کو پیش آنے والی (نالوں کی) اور ایک شہری لوگوں کو پیش آنے والی (دھاتوں کی)۔ اسی طرح سورہ بقرہ کے شروع میں منافقین کی دو مثالیں اور سورہ نور (۳۹، ۴۰) میں کافروں کی دو مثالیں بیان فرمائیں۔ غرض قرآن و حدیث میں بہت سی مثالیں دے کر سمجھایا گیا ہے۔

آیت 18 ① لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا: ”الْحُسْنَىٰ“ ”الْأَحْسَنُ“ کی مؤنث ہے، بمعنی سب سے اچھی، جیسے ”حَسَنٌ“ اور ”أَحْسَنٌ“ ہے، اسی طرح ”حَسَنَةٌ“ اور ”حُسْنَىٰ“ ہے، اس کا موصوف محذوف ہے، یعنی ”الْحَزَاءُ الْحُسْنَىٰ“ کہ رب کی بات قبول کرنے والوں کے لیے سب سے اچھی جزا، یعنی جنت ہے۔ ”وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ“ مبتدا ہے اور ”لَوْ أَنَّ لَهُمْ“ پورا جملہ شرطیہ اس کی خبر ہے، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حق سے عناد رکھتے ہیں قیامت کے دن ان جو پر مصیبت آئے گی وہ اس سے رہائی کے لیے اس قدر مال و دولت کی بھی پروا نہیں کریں گے اور فدیہ میں دینے کو تیار ہو جائیں گے۔

② أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ: یہ اس کے مقابلے میں ہے جو فرمایا تھا کہ اپنے رب کی بات قبول کرنے والوں کے لیے بھلائی (بہترین بدلہ) ہے، یعنی یہ دعوت قبول نہ کرنے والوں کا بہت برا حساب ہوگا، انہیں کسی قسم کی معافی نہیں دی جائے گی اور ان کے ایک ایک گناہ پر بری طرح محاسبہ ہوگا۔ یہی مناقشہ فی الحساب ہے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ حَوَّسِبَ عَذِبَ، قَالَتْ غَابِئَةُ فَقُلْتُ أَوْ لَيْسَ يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى: ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا﴾ [الانشقاق: ۸] قَالَتْ، فَقَالَ إِنَّمَا ذَلِكَ الْغَرَضُ، وَلَكِنْ مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ يَهْلِكُ» [بخاری، العلم، باب من سمع شيئاً

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْلَىٰ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿١٩﴾
 الَّذِينَ يُؤْفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ ۖ وَلَا يَنْقُضُونَ الْعَيْثَاقَ ﴿٢٠﴾

پھر کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ تیرے رب کی جانب سے تیری طرف اتارا گیا وہی حق ہے، اس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہے؟ نصیحت تو عقلوں والے ہی قبول کرتے ہیں ﴿۱۹﴾ جو اللہ کا عہد پورا کرتے ہیں اور پختہ عہد کو نہیں توڑتے ﴿۲۰﴾

فراجع : ۱۰۳] ”جس کا حساب کیا گیا اسے عذاب دیا جائے گا۔“ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس پر میں نے عرض کیا: ”اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا: ﴿كَوْفٌ يُحَاسِبُ حَسَابًا يَسِيرًا﴾ یعنی جسے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا گیا اس کا حساب آسان ہوگا (مطلب یہ ہے کہ یہاں حساب کے باوجود عذاب نہیں ہوگا تو اس کا مطلب کیا ہے)؟“ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ صرف پیش کیا جانا ہے اور لیکن جس سے مناقشہ ہوا (یعنی ایک ایک چیز کی پڑتال ہوئی) وہ ہلاک ہو جائے گا۔“

﴿وَبَشِّرِ الصَّادِقِينَ﴾: مہد اور مہاد اصل میں بچے کے لیے تیار کردہ جگہ کو کہتے ہیں، گود ہو یا بچھونا، اسی طرح ہر اچھی طرح آرام کے لیے بنائی ہوئی جگہ کو مہاد کہتے ہیں۔ آپ سوچیں کہ بچے کو آرام کے لیے آگ پر لٹا دیا جائے تو اس کا کیا حال ہوگا؟ اسی طرح اللہ کی دعوت قبول نہ کرنے والے کی آرام گاہ جہنم ہوگی۔ [نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْهَا]

آیت 19: أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْلَىٰ ۗ.....: یہاں یہ کہنے کے بجائے کہ کیا وہ شخص جو جانتا ہے اس شخص کی طرح ہے جو نہیں جانتا، یوں فرمایا کہ اس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہے؟ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اللہ کی طرف سے آنے والی نشانیاں آنکھوں سے نظر آ رہی ہیں، جو ان کا علم اور یقین نہیں رکھتا درحقیقت وہ اندھا ہے اور اس کا یہ اندھا پن قیامت کو اچھی طرح ظاہر ہو جائے گا۔ دیکھیے سورہ طہ (۱۲۳ تا ۱۲۶) یہ مومن اور کافر کی مثال ہے۔ ”أُولُو الْأَلْبَابِ“ کی جمع ہے، بمعنی والے۔ ”الْأَلْبَابِ“ ”ثَبَّ“ کی جمع ہے، ہر چیز میں سے جو خالص ہو، خالص عقل جو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہو۔ (مفردات) اس لیے ترجمہ ”عقل والوں“ کے بجائے ”عقلوں والے“ کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ نصیحت صرف خالص اور پاکیزہ عقل والے حاصل کرتے ہیں، اٹلے دماغ والے نہیں۔

آیت 20: الَّذِينَ يُؤْفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ.....: ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عقلوں والوں کی چند صفات بیان فرمائیں۔ ان میں سب سے پہلی صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے عہد تو حید کو پورا کرنا ہے، جیسا کہ سورہ اعراف (۱۷۲) میں ہے۔ ”وَلَا يَنْقُضُونَ الْعَيْثَاقَ“ سے ہر اس عہد کو توڑنے سے اجتناب کرنا مراد ہے جسے پورا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ پہلے خاص اپنے عہد کے بعد اب عام عہد کا ذکر فرمایا۔ ان منافقین کی طرح نہیں جن میں سے کوئی جب عہد کرتا ہے تو اس کی

وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾
وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً

اور وہ جو اس چیز کو ملاتے ہیں جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ اسے ملایا جائے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب کا خوف رکھتے ہیں ﴿۲۱﴾ اور وہ جنہوں نے اپنے رب کا چہرہ طلب کرنے کے لیے صبر کیا اور نماز قائم کی اور

خلاف ورزی کرتا ہے، جب جھگڑتا ہے تو بدکامی پر اتر آتا ہے، جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب اسے کوئی امانت سونپی جاتی ہے تو خیانت کرتا ہے۔

آیت 21 ﴿۱﴾ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ: یعنی صلہ رحمی کرتے ہیں، رشتوں کو نزدیک کے ہوں یا دور کے، ان کے مراتب کے مطابق ملاتے ہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ اللہ عزوجل، رسول کریم ﷺ، عام مسلمانوں، ہمسایوں، رشتہ داروں، دوستوں، قبیلوں، بیواؤں، الغرض ہر ایک کا حق پہچانتے اور ادا کرتے ہیں۔

﴿۲﴾ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ.....: اس کے عائد کردہ فرائض کو بجالاتے اور اس کے منع کردہ گناہوں سے بچتے ہیں۔ راغب نے کہا: ”خشیت ایسا خوف ہے جس کے ساتھ تعظیم ملی ہوئی ہو، اکثر اس کا باعث علم ہوتا ہے۔“ جیسے فرمایا: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ [فاطر: ۲۸] ”اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں۔“ خوف سے مراد کوئی بھی ڈر ہے، بعض نے کہا، دونوں (خشیت اور خوف) ہم معنی ہیں، فرق اٹنسی ہے، کلی نہیں۔ (آلوسی)

﴿۳﴾ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ: لہذا وہ اس وقت سے پہلے ہی اپنا محاسبہ کرتے رہتے ہیں۔ ”سُوءَ الْحِسَابِ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ رعد کی آیت (۱۸) کی تفسیر۔

آیت 22 ﴿۱﴾ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ: یعنی ہر اس مقام پر جہاں صبر قابل تعریف ہے وہ محض اللہ کے چہرے کی خاطر صبر کرتے ہیں، تاکہ وہ راضی ہو جائے۔ نہ ریا (دکھاوے) کے لیے، نہ نسمعہ (شہرت) کے لیے کہ لوگ کہیں واہ کیا صابر شخص ہے۔ صبر کا معنی روکنا، باندھنا ہے۔ اپنے آپ کو اللہ کے احکام کی پابندی پر قائم رکھنا ”صَبْرٌ عَلَى الطَّاعَةِ“ ہے، اس کی نافرمانی سے روکنا ”صَبْرٌ عَنِ الْمَعْصِيَةِ“ ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی مصیبت، مثلاً بیماری، فاقہ، خوف یا اموات وغیرہ پر اپنے آپ کو جزع فزع سے روکنا اور اسے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی تقدیر سمجھ کر کسی شکوہ و شکایت کے بغیر برداشت کرنا ”صَبْرٌ عَلَى الْمُصِيبَةِ“ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر صبر کی یہ تمام صورتیں ”أُولُو الْأَلْبَابِ“ کی صفت ہیں۔

﴿۲﴾ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ: اس کی تفسیر کے لیے سورہ بقرہ کی آیت (۳) ملاحظہ فرمائیں۔

﴿۳﴾ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً: فرض زکوٰۃ علانیہ دینا افضل ہے، تاکہ کفر کی تہمت سے بچے، نقل صدقہ دوسروں کو ترغیب دلانے کے لیے علانیہ ہو اور ریا سے پاک ہو تو بہت ہی اچھا ہے، مگر علانیہ صدقے میں ریا کا امکان ہے، اس لیے پوشیدہ صدقے کا جواب ہی نہیں ہے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۱۷) قیامت کے دن عرش کا سایہ پانے والوں میں سے ایک وہ بھی

وَيَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَئِكَ لَهُمْ عَقَبَى الدَّارِ ﴿۷۶﴾

ہم نے انھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کیا اور برائی کو نیکی کے ساتھ ہٹاتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے اس گھر کا اچھا انجام ہے ﴿۷۶﴾

ہے جو دائیں ہاتھ سے صدقہ کرے تو بائیں کو خبر بھی نہ ہو۔ [بخاری، الأذان، باب من جلس في المسجد.....: ۶۶۰]

﴿۷۶﴾ وَيَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ: ”ذَرَاءُ يَذُرُهُ ذَرِيَّةٌ“ (ف) ہٹانا، دفع کرنا، دور کرنا، یعنی ”أُولُو الْأَلْبَابِ“ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ برائی کو نیکی کے ساتھ ہٹاتے ہیں، یعنی برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ وَإِذْ قَعَرَ بِالنَّبِيِّ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ﴾ وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا ذُو حِظٍّ عَظِيمٍ ﴿﴾ [ختم السجدة: ۳۴، ۳۵] ”اور نہ نیکی برابر ہوتی ہے اور نہ برائی۔ (برائی کو) اس (طریقے) سے ہٹا جو سب سے اچھا ہے، تو اچانک وہ شخص کہ تیرے درمیان اور اس کے درمیان دشمنی ہے، ایسا ہوگا جیسے وہ دلی دوست ہے۔ اور یہ چیز نہیں دی جاتی مگر اٹھی کو جو صبر کریں اور یہ نہیں دی جاتی مگر اسی کو جو بہت بڑے نصیب والا ہے۔“ یہ طریقہ ذاتی عداوتوں اور زیادتیوں کے جواب کا ہے کہ زیادتی کے جواب میں صبر کرے اور معاف کر دے۔ رہا اللہ کے دین پر زیادتی اور اللہ کے احکام کے مقابلے میں سرکشی اور عناد کا جواب بہترین طریقے سے دینا تو اس کی صورت دوسری ہے۔ وہاں برائی کو نیکی کے ساتھ ہٹانے کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی کافر یا اللہ کا باغی دین پر زیادتی کر رہا ہو تو آپ اسے برداشت کریں اور صبر کریں، بلکہ اس برائی کو بہترین طریقے سے ہٹانا نہ اسے آزاد چھوڑنا ہے نہ معاف کرنا، بلکہ یہاں اسے ہٹانے کا بہترین طریقہ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا اور اس کا حکم دیا کہ جو شخص تم میں سے کوئی منکر (برائی) دیکھے اسے ہاتھ سے روک دے، اگر اس کام کی قوت نہیں تو زبان سے روکے اور اگر اتنی قوت نہیں تو (کم از کم) اسے دل میں برا سمجھے۔ [مسلم، الإیمان، باب بیان کون النبی...: ۹۹] یہاں سب سے اچھا طریقہ (بِالنَّبِيِّ هِيَ أَحْسَنُ) جہاد فی سبیل اللہ ہے اور اس کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ یک لخت ہی جانی دشمن دلی دوست بن جاتے ہیں۔ دیکھیے ثامہ بن اثمال، ہندہ، عکرمہ بن ابی جہل، خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اور عرب کے وہ سردار جو کسی صورت ایمان قبول کرنے والے نظر نہ آتے تھے، جہاد کی نیکی کی برکت سے رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار دوست بن گئے۔ ”برائی کو نیکی کے ساتھ ہٹاتے ہیں“ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ نیک عمل کر کے برے عمل کو مٹا دیتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ [ہود: ۱۱۴] ”بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔“ اور ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِذَا عَمِلْتَ سَيِّئَةً فَأَتَبِعَهَا حَسَنَةً تَمَحُّهَا﴾ [احمد: ۱۶۹/۵، ح: ۲۱۵۴۳، صحیح] ”جب تم کوئی برائی کرو تو اس کے بعد کوئی نیکی کرو، وہ اسے مٹا دے گی۔“ اور فرمایا: ﴿وَ إِذَا عَمِلْتَ سَيِّئَةً فَاغْمَلْ بِحَسَنَةٍ تَمْحُهَا حَسَنَةُ الْبَسْرِ وَالْبَسْرُ بِالْعَلَانِيَةِ بِالْعَلَانِيَةِ﴾ [سلسلة الأحاديث الصحيحة: ۳/ ۴۶۲، ح: ۱۴۷۵] ”جب تم کوئی برائی کرو تو اس کے ساتھ ہی نیکی کر لو، وہ اسے مٹا دے گی، پوشیدہ برائی کو پوشیدہ نیکی کے ساتھ اور علانیہ برائی کو علانیہ نیکی کے ساتھ مٹاؤ۔“

جَلَّتْ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّتِهِمْ وَالْمَلَائِكَةُ
يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

بیٹوں کے باغات، جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان کے باپ دادوں اور ان کی بیویوں اور ان کی اولادوں میں سے جو نیک ہوئے اور فرشتے ہر دروازے میں سے ان پر داخل ہوں گے ﴿۲۳﴾ سلام ہو تم پر اس کے بدلے جو تم نے صبر کیا۔ سو اچھا ہے اس گھر کا انجام ﴿۲۴﴾

﴿۲۳﴾ اُولَئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ: "عُقْبَى" کی طرح مصدر ہے، وہ چیز جو کسی چیز کے پیچھے آئے، عام طور پر یہ لفظ اچھے انجام کے معنی میں آتا ہے۔ "الدَّارِ" میں الف لام عید کا ہے، یہ گھر یعنی دنیا، یعنی ان صفات والوں کے لیے دنیا کے گھر کے بعد کا انجام بہت اچھا ہے۔

آیت 23 ﴿۲۳﴾ جَلَّتْ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا.....: یہ "عُقْبَى الدَّارِ" سے بدل اکل ہے، یعنی وہ اچھا انجام ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے اور جنت میں داخل ہونے کے لائق ان کے باپ دادا، بیویاں اور اولادیں بھی ان کے ساتھ جنت عدن میں داخل ہوں گی۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "عدن" جنت میں ایک مقام ہے، اس صورت میں ترجمہ ہوگا "عدن کے باغات" اور اس صورت میں یہ "عُقْبَى الدَّارِ" سے بدل البعض ہوگا۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت پر فرمایا، یعنی انہیں اور ان کے پیاروں کو جنت میں اکٹھا کر دیا جائے گا، خواہ باپ ہوں یا گھر والے یا اولاد جو مومن ہونے کی وجہ سے جنت میں داخلے کے لائق ہوں گے، تاکہ ان کی آنکھیں ان کے ساتھ ٹھنڈی ہوں، یہاں تک کہ نیچے درجے والے کو اونچے درجے والے کی طرف بلند کر دیا جائے گا، بغیر اس کے کہ اونچے درجے والے کا درجہ کم کیا جائے، محض اللہ تعالیٰ کے امتنان اور احسان کی وجہ سے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عِبَادَتِهِمْ فَنُفِئُوا فِيهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ (الطور: ۲۶) "اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد کسی بھی درجے کے ایمان کے ساتھ ان کے پیچھے چلی، ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان سے ان کے عمل میں کچھ کمی نہ کریں گے۔"

﴿۲۴﴾ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ.....: جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آکر انہیں مبارک باد اور خوش خبریاں دیں گے۔

آیت 24 ﴿۲۴﴾ سَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ: "سَلَّمَ" کا مطلب ہے کہ اب تم ہر مصیبت، رنج و غم اور پریشانی سے محفوظ ہو گئے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مناسبت سے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿هَلْ تَدْرُونَ أَوَّلَ مَنْ يَدْخُلُ الْحَنَّةَ مِنْ خَلْقِ اللَّهِ؟ قَالُوا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ أَوَّلُ مَنْ يَدْخُلُ الْحَنَّةَ مِنْ خَلْقِ اللَّهِ الْفُقَرَاءُ وَالْمُهَاجِرُونَ الَّذِينَ تُسَدُّ بِهِمُ الشُّعُورُ وَيَتَّقَى بِهِمُ الْمَكَارَهُ، وَيَمُوتُ أَحَدُهُمْ وَحَاجَتُهُ فِي صَدْرِهِ، لَا يَسْتَطِيعُ لَهَا فِضَاءً، فَيَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ مَلَائِكَتِهِ اتَّوَهُمُ فَحَبَّوهُمْ

وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُؤْصَلَ
وَيُقْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

اور وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو اسے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اس چیز کو کاٹ دیتے ہیں جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ اسے ملایا جائے اور زمین میں فساد کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور انھی کے لیے اس گھر کی خرابی ہے ﴿۲۵﴾

فَتَقُولُ الْمَلَائِكَةُ لَنَحْنُ سَكَّانٌ سَمَاوِكَ وَ حَيْرَتِكَ مِنْ خَلْقِكَ، أَفَتَأْمُرُنَا أَنْ نَأْتِيَ حَوْلَاءَ فَنُسَلِّمَ عَلَيْهِمْ؟ قَالَ
إِنَّهُمْ كَانُوا عِبَادًا يَعْبُدُونِي، لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا، وَتُسَدُّ بِهِمُ النَّغُورُ وَ يَتَّقَى بِهِمُ الْمَكَارَهُ، وَ يَمُوتُ أَحَدُهُمْ
وَ حَاجَتُهُ فِي صَدْرِهِ، لَا يَسْتَطِيعُ لَهَا فِضَاءً، قَالَ فَتَأْتِيهِمُ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ ذَلِكَ، فَيَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ :
﴿سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ ﴿۱﴾ مسند احمد : ۱/۶۸، ح : ۶۵۷۸ - ابن حبان : ۷۴۲۱ - قال
شعب الأرنؤط و إسناده جيد ["کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کی مخلوق میں سے جنت میں سب سے پہلے کون لوگ جائیں گے؟"
لوگوں نے کہا: "اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔" فرمایا: "اللہ کی مخلوق میں سے جنت میں سب سے پہلے فقراء اور
مہاجرین داخل ہوں گے، جن کے ذریعے سے سرحدیں محفوظ کی جاتی تھیں اور ناپسندیدہ حالات سے بچا جاتا تھا اور ان میں
سے کوئی فوت ہوتا تو اس کی دلی خواہش اس کے سینے ہی میں باقی ہوتی تھی، وہ اسے پورا نہیں کر سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ اپنے
فرشتوں میں سے جنہیں چاہے گا حکم دے گا کہ ان کے پاس جاؤ اور انہیں سلام کرو۔ فرشتے کہیں گے: "ہم تیرے آسمان کے رہنے
والے اور تیری مخلوق میں سے تیرے پنے ہوئے ہیں، کیا تو ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم ان کے پاس جائیں اور انہیں سلام پیش
کریں۔" اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "یہ میرے بندے تھے، میری بندگی کرتے تھے، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتے تھے،
ان کے ساتھ سرحدیں محفوظ رکھی جاتی تھیں اور ان کے ذریعے سے ناپسندیدہ حالات سے بچا جاتا تھا، ان میں سے کوئی فوت
ہوتا تو اس حال میں کہ اس کی دلی خواہش اس کے سینے ہی میں ہوتی، وہ اسے پورا نہیں کر سکتا تھا۔" آپ ﷺ نے فرمایا:
"چنانچہ فرشتے اس وقت ان کے پاس آئیں گے اور ہر دروازے سے ان کے پاس داخل ہوں گے (اور کہیں گے): "سلام ہو
تم پر اس کے بدلے جو تم نے صبر کیا، سوا چھا ہے اس گھر کا انجام۔"

﴿۲﴾ بِمَا صَبَرْتُمْ : معلوم ہوا ایمان قبول کرنے کے بعد ہر حکم بجالانے پر ہمیشگی، ہر برائی سے اجتناب، اللہ کی ہر تقدیر پر
قناعت کرتے ہوئے ہر مصیبت و راحت میں اللہ تعالیٰ پر خوش رہنا، غرض دین کی ہر بات پر استقامت کی بنیاد صبر ہی ہے اور
اس کی جزا کا بھی کوئی حساب نہیں، فرمایا: ﴿إِنَّمَا يُؤْتِي الضَّيِّقُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر : ۱۰] "صرف صبر کرنے
والوں ہی کو ان کا اجر بغیر حساب دیا جائے گا۔"

آیت 25 وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ : قرآن مجید نے اپنے اسلوب کے مطابق کہ وہ ایمان کے ساتھ کفر، نیکی کے ساتھ

اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَ يَقْدِرُ وَ قَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

۲۶

اللہ رزق فراخ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے اور وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے، حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں تھوڑے سے سامان کے سوا کچھ نہیں ﴿۲۶﴾

بدی، جنت کے ساتھ جہنم کا ذکر کرتا ہے، عہد وفا کرنے والوں کی صفات اور ان کے اچھے انجام کے بعد عہد توڑنے والوں کی صفات بد اور ان کا برا انجام ذکر فرمایا ہے۔

آیت 26 ① **اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ**: بہت سے لوگوں کی گمراہی کا سبب یہ شبہ بن جاتا ہے کہ اللہ کے نافرمان دنیا میں خوش حال کیوں ہیں؟ اس کا جواب دیا، یعنی دنیا میں رزق کی فراوانی یا تنگی کوئی معیار نہیں ہے، جس کے لحاظ سے کسی شخص کے اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ یا غیر پسندیدہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے، بسا اوقات وہ کافر کو خوب سامان عیش دیتا ہے اور مومن پر تنگ دستی وارد کرتا ہے، تاکہ دونوں کی آزمائش کی جائے، مومن اپنے صبر و شکر کی وجہ سے آخرت میں بلند درجات پاتا ہے اور کافر ناکام رہتا ہے، اس لیے آخرت میں اس کا ٹھکانا برا ہوتا ہے، لہذا گمراہ لوگوں کی بد اعمالیوں کے باوجود ان کے عیش و عشرت سے کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ یہ محض مہلت ہے جو کافر کو دنیا میں دی جاتی ہے۔ (روح المعانی)

② **وَقَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا**: ”مَتَاعٌ“ کی توین تغلیل و تخفیر کے لیے ہے، یعنی معمولی، تھوڑا سا بے قدر و قیمت سامان، یعنی کفار دنیا کی زندگی کی آسائشوں پر پھول رہے ہیں، حالانکہ یہ آخرت کے مقابلے میں محض معمولی اور بے حقیقت تھوڑی دیر کا سامان ہے۔ مستورد بن شداد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَاللَّهِ! مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ هَذِهِ - وَأَشَارَ بِيَحْيَىٰ بِالسَّبَابَةِ - فِي الْيَمِّ، فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ بِمِ تَرْجِعُ» [مسلم، الحجة وصفة نعيمها، باب فناء الدنيا، ...: ۲۸۵۸] ”اللہ کی قسم! دنیا آخرت کے مقابلے میں اس مثال کے سوا کچھ نہیں کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی یہ انگلی۔“ اور راوی یحییٰ نے شہادت کی انگلی کے ساتھ اشارہ کیا ”سند میں ڈالے، پھر دیکھے کہ وہ کیا چیز لے کر واپس آتی ہے۔“ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: «نَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى حَصِيرٍ فَقَامَ وَقَدْ أَرْفَى حَبِيْبِهِ. فَقُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! لِمَ اتَّخَذْنَا لَكَ وَطَاءً، فَقَالَ مَا لِي وَ لِلدُّنْيَا، مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا كَمَا كَبَّ اسْتَنْظَلْتُ تَحْتَ شَجَرَةٍ، ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكْتُهَا» [ترمذی، الزهد، باب حديث ما الدنيا الا كراكب استنظل: ۲۳۷۷]

”نبی ﷺ ایک چٹائی پر سوئے، اٹھے تو چٹائی نے آپ کے پہلو پر اپنے نشان لگا دیے تھے۔ ہم نے عرض کی: ”یا رسول اللہ! اگر ہم آپ کے لیے (بستر وغیرہ) بنا دیں تو؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میرا اور دنیا کا کیا تعلق! میں تو دنیا میں محض اس سواری کی طرح ہوں جس نے ایک درخت کے سائے میں آرام کیا، پھر اسے چھوڑ کر آگے چل دیا۔“

و يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ لَا أَنْزَلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنْ اللَّهُ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ
وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنْابَ ۗ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ
تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿۲۸﴾

اور جن لوگوں نے کفر کیا کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی۔ کہہ دے
بے شک اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف سے راستہ دیتا ہے جو رجوع کرے ﴿۲۸﴾ وہ جو ایمان لائے اور
ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہیں۔ سن لو! اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں ﴿۲۸﴾

آیت 27 ﴿۱﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا..... : ایسی نشانی کیوں نہیں اتاری جسے دیکھ کر ہم اسے اللہ کا رسول مان لینے پر مجبور
ہو جاتے، مثلاً دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) میں ان کی فرمائشیں۔

﴿۲﴾ قُلْ إِنْ اللَّهُ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ..... : یعنی نشانی کے اترنے سے کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ تمہارے اب تک ایمان نہ لانے کی
وجہ یہ نہیں ہے کہ تم نے کوئی نشانی نہیں دیکھی، نشانیاں تو بے حد و حساب موجود ہیں، مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کمال
حکمت والا ہے اور اپنی رحمت کا خود مالک ہے، جسے چاہے اپنی حکمت کی بنا پر اپنی رحمت و ہدایت سے محروم، یعنی گمراہ رکھے اور
جسے چاہے اپنی رحمت و ہدایت سے نواز دے۔ دوسری بات یہ کہ تم اللہ کے راستے کی طرف آتے ہی نہیں، اگر تمہاری سیدھے
راستے کی طرف آنے کی خواہش اور جستجو ہوتی تو تم صرف قرآن کی نشانی کو دیکھ کر راجح کو پالیتے، کیونکہ یہ کتاب واضح دلائل
سے لبریز ہے۔ اب اگر تم اپنی خواہشات اور شیطان ہی کے پیچھے چلتے جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے راستے کی طرف لوٹ کر آنے کی
رغبت ہی نہ رکھو تو تمہیں اللہ کے راستے پر چلنا کیسے نصیب ہو، وہ تو اپنی طرف آنے کے راستے پر چلنے کی توفیق انھی کو دیتا ہے
جو اس کی طرف رجوع رکھیں اور لوٹ کر آنا چاہیں۔

آیت 28 الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ..... : یہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والوں کی صفت ہے، ذکر کا معنی
نصیحت بھی ہے اور یاد کرنا بھی۔ اس لحاظ سے آیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ انھی کو اپنی طرف ہدایت دیتا
ہے جو ایمان لاتے ہیں اور ان کے دل کو وحی الہی سے ملنے والی نصیحت سے پوری تسلی ہو جاتی ہے، اس کے سوا انھیں کہیں سے
تسلی نہیں ہوتی، کوئی دوسرا اپنے خیال میں کسی اچھی بات کیوں نہ کہے انھیں اس پر یقین نہیں ہوتا، کیونکہ وہ بھی ان جیسا انسان
ہے، اس کی بات درست بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی، اس لیے اس پر انھیں اطمینان نہیں ہوتا، صرف اللہ کی بات ایسی ہے جو غلط
نہیں ہوتی، اس لیے اسی پر ان کے دل کو یقین و اطمینان ہوتا ہے۔ ”ذکر اللہ“ یعنی اللہ کی نصیحت صرف رسول پر نازل ہوئی،
قرآن کی صورت میں بھی اور حدیث کی صورت میں بھی، پھر اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود اٹھایا، فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ
نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ [الحجر: ۹] ”بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَى لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ ﴿۲۹﴾ كَذَلِكَ أَرْسَلْنَا فِي أُمَّةٍ

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے خوشحالی اور اچھا ٹھکانا ہے ﴿۲۹﴾ اسی طرح ہم نے تجھے

حفاظت کرنے والے ہیں۔“ کافر اس نعمت سے محروم ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہدایت کی نعمت صرف اسی کو ملتی ہے جو اس کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرے، ایمان لائے اور وحی الہی سے اسے پوری تسلی حاصل ہو جائے۔ کوئی شخص اگر ایمان کا دعویٰ کرے مگر اسے قرآن و حدیث کے بجائے تسلی کسی اور کی بات سے ہوتی ہو تو وہ بد نصیب بھی ہدایت الہی سے محروم ہے۔

”ذکر اللہ“ کا دوسرا معنی یاد الہی ہے۔ مولانا محمد عبدہ زینت لکھتے ہیں: ”یہ ایمان کے خالص اور پختہ ہونے کی علامت ہے کہ ذہن خواہ کتنی ہی فکروں میں الجھا ہوا ہو لیکن جوں ہی نماز شروع کرے یا اللہ کو یاد کرے تو تمام فکر بھول جائیں اور انسان حقیقی اطمینان قلب سے بہرہ ور ہو جائے۔“ یہاں اگرچہ دونوں معنوں کی گنجائش ہے مگر پہلا معنی زیادہ مناسب ہے، کیونکہ کافر نشانی مانگ رہے ہیں جبکہ سب سے بڑی نشانی قرآن موجود ہے۔ اہل ایمان کو اسی سے اطمینان ہو جاتا ہے، جبکہ کافر بد نصیب شک ہی میں مارا جاتا ہے اور مزید مغزے مانگتا رہتا ہے۔

آیت 29 طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ : ”طُوبَىٰ“ اصل میں ”طَابَ يَطِيبُ“ (اچھا اور عمدہ ہونا) سے ”طَيِّبُنِي“ تھا، مصدر برونان ”بُشِّرُنِي“ بمعنی خوشی، مبارک باد۔ ”مَآبٍ“ ”أَبَ يُوْأَبُ أَوْأَبًا“ کا معنی ہے لوٹنا اور ”مَآبٍ“ کا معنی لوٹ کر جانے کی جگہ، ٹھکانا یعنی ایمان اور عمل صالح کی برکت سے عمدہ ترین زندگی حاصل ہوتی ہے اور آخری ٹھکانا بھی بہترین ملے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَنْ عَمِلْ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّاهُ حَيٰوةً طَيِّبَةًۦٓ وَنَجْعَلِيَنَّاهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [النحل: ۹۷] ”جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی اور یقیناً ہم انھیں ان کا اجر ضرور بدلے میں دیں گے، ان بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کیا کرتے تھے۔“ مسند احمد کی ایک حدیث میں جو عقبہ بن عبد السلمی سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے جنت کے ایک درخت کا نام بھی طوبی بتایا ہے۔ [مسند احمد: ۱۸۳/۴، ج: ۱، ۱۷۶۶۰، وقال شعب الأرنؤوط إسناده قابل للتحسين]

آیت 29 ﴿۱﴾ كَذَلِكَ أَرْسَلْنَا فِي أُمَّةٍ : امت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک وہ لوگ جن کی طرف رسول بھیجا جائے، وہ مسلمان ہوں یا کافر، جیسے قوم ثمود کا ہر مسلم و کافر صالح ﷺ کی امت تھا اور عاد کا ہر فرد ہود ﷺ کی امت میں سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی آمد کے بعد قیامت تک ہر مسلم و کافر، یہودی، نصرانی، ہندو اور دہریہ، غرض ہر شخص آپ ﷺ کی امت میں سے ہے، اسے امت دعوت کہا جاتا ہے، پھر جو لوگ رسول کی دعوت کو قبول کر لیں وہ امت اجابت کہلاتے ہیں، اس آیت میں امت دعوت مراد ہے۔

﴿۲﴾ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَّةٌ : یعنی نہ آپ پہلے رسول ہیں نہ آپ کی امت دعوت کوئی پہلی امت ہے۔ اس سے مقصود آپ کی امت کو پہلی جھلانے والی امتوں کے انجام بد سے ڈرانا ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَّمٌ لَسْتُلُوا عَلَيْهِمُ الذِّمَّةَ أَوْ حِينًا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ يَا رَحْمَنُ
 قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابٌ ﴿۳﴾

ایسی امت میں بھیجا جس سے پہلے کئی امتیں گزر چکیں، تاکہ تو انہیں وہ وحی پڑھ کر سناے جو ہم نے تیری طرف بھیجی ہے، اس حال میں کہ وہ اس بے حد مہربان سے کفر کر رہے ہیں۔ کہہ دے وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے ﴿۳﴾

﴿۳﴾ لَسْتُلُوا عَلَيْهِمُ الذِّمَّةَ أَوْ حِينًا إِلَيْكَ: یعنی آپ کو بھیجے کا مقصد یہ ہے کہ آپ انہیں وہ آیات و احکام پڑھ کر سنایں جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیے۔ ”عَلَيْهِمْ“ سے اولین مراد قریش مکہ ہیں اور پھر بعد میں قیامت تک آنے والے تمام لوگ بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳﴾ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَنَأْيُحْفُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۴﴾ [الجمعة: ۳۰۲]

”وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، حالانکہ بلاشبہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔ اور ان میں سے کچھ اور لوگوں میں بھی (آپ کو بھیجا) جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔“ ”جو ابھی تک ان سے نہیں ملے“ سے مراد قیامت تک کے لوگ ہیں۔

﴿۴﴾ وَهُمْ يَكْفُرُونَ يَا رَحْمَنُ: یعنی اللہ نے اپنی رحمت سے ان لوگوں پر کرم فرمایا کہ آپ کو ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا، مگر ان کی ناشکری کا حال یہ ہے کہ اس کا حق پہچاننے سے منکر ہو گئے ہیں۔ کفار مکہ اللہ کے خالق ہونے کا تو اقرار کرتے تھے، مگر اس کے ”رحمان“ ہونے کے منکر تھے، بلکہ جب اللہ تعالیٰ کے رحمان ہونے اور اسے اس نام سے پکارنے کی دعوت دی جاتی تو اس سے چڑتے اور کہتے: ﴿وَمَا الرَّحْمَنُ إِلَّا تَسْجُدُ لِنَا تَأْمُرُنَا وَرَأَدُهُمْ نِقْمًا﴾ [الفرقان: ۶۰] ”رحمان کیا چیز ہے؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کے لیے تو ہمیں حکم دیتا ہے اور یہ بات انہیں بدکنے میں بڑھا دیتی ہے۔“ نیز حدیبیہ کے صلح نامہ پر جب نبی ﷺ نے ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ لکھوانا چاہا تو کفار کے نمائندے سمیل بن عمرو نے کہا: ”اللہ کی قسم! میں رحمان کو نہیں جانتا کہ وہ کون ہے، آپ ”بِاسْمِكَ اللَّهُمَّ“ لکھو ایے۔“ [بخاری، الشروط، باب الشروط في الجهاد، ۲۷۳۱، ۲۷۳۲]

”الرَّحْمَنُ“ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے اور اسم اللہ کے بعد سب سے محترم نام ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ أَحَبَّ أَسْمَائِكُمْ إِلَى اللَّهِ عَبْدُ اللَّهِ وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ﴾ [مسلم، الآداب، باب النهي عن التكبي باني الفاسم، ۲۱۳۲] ”اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے پیارے نام عبد اللہ اور عبد الرحمان ہیں۔“

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كَلِمَةٌ بِهِ الْمَوْتَىٰ بَلْ لَئِنَّ اللَّهَ الْأَمْرُ جَبِيحًا أَفَلَمْ يَأْتِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهْدَى النَّاسَ جَمِيعًا وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُمْ بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ ﴿۳۱﴾

۳۱-

اور واقعی اگر کوئی ایسا قرآن ہوتا جس کے ذریعے پہاڑ چلائے جاتے، یا اس کے ذریعے زمین قطع کی جاتی، یا اس کے ذریعے مردوں سے کلام کیا جاتا۔ بلکہ کام سارے کا سارا اللہ کے اختیار میں ہے، تو کیا جو لوگ ایمان لائے ہیں مایوس نہیں ہو گئے کہ اگر اللہ چاہے تو یقیناً سب کے سب لوگوں کو ہدایت دے دے، اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ہمیشہ اس حال میں رہیں گے کہ انہیں اس کی وجہ سے جو انہوں نے کیا، کوئی نہ کوئی سخت مصیبت پہنچتی رہے گی، یا ان کے گھر کے قریب اترتی رہے گی، یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آجائے۔ بے شک اللہ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ﴿۳۱﴾

ت 31 ﴿۱﴾ وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ : ”قُرْآنًا“ نکرہ ہے، کوئی قرآن، یعنی پڑھی جانے والی کوئی کتاب۔ ”لَوْ“ شرطیہ ہے، اس کا جواب محذوف ہے، جو آیت کے سیاق و سباق سے خود بخود معلوم ہو رہا ہے اور قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر موجود بھی ہے۔ تفاسیر میں دو جواب مذکور ہیں اور دونوں درست ہیں، ایک تو یہ کہ اگر واقعی کوئی ایسا قرآن ہوتا جس کے ذریعے سے پہاڑ چلائے جاتے، یا اس کے ذریعے سے زمین قطع کی جاتی، یا اس کے ذریعے سے مردوں سے کلام کیا جاتا تو پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے، کیونکہ یہ ضد اور عناد کی وجہ سے انکار کر رہے ہیں۔ ان تین چیزوں کا خصوصاً ذکر اس لیے کیا کہ قرآن مجید کے معجزے کے بعد، جس کے چیلنج کے مقابلے میں سب لاجواب ہو چکے تھے، اب وہ لوگ خصوصاً انہی تین چیزوں کے دکھانے کا مطالبہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب لاجواب ہونے کے باوجود یہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہیں لائے تو اگر کوئی ایسا قرآن بھی آجائے جس سے ان کے مطالبے پورے ہوں، پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے، کیونکہ تمام کام تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور یہ لوگ جب عناد کی وجہ سے اس قرآن پر ایمان نہ لا کر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا نشانہ بن چکے ہیں، جو سب معجزوں سے بڑا معجزہ ہے، تو اپنے مطلوبہ معجزے دیکھ لینے کے بعد بھی اللہ کی ناراضگی کی وجہ سے ان کو ایمان لانے کی توفیق کیسے ملے گی اور کہاں سے ملے گی۔ جب کوئی جان بوجھ کر آنکھیں ہی بند کر لے تو کوئی اسے کس طرح دکھا سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَوْ أَنزَلْنَا نَزْلًا لَّهُمُ النَّسِیْکَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَفَرْنَا عَلَیْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ فَبَلَا مَا كَانُوا لَیُّوْمًا وَلَا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَلَٰكِن أَكْثَرُهُمْ یَجْہَلُونَ﴾ [الانعام: ۱۱۱] ”اور اگر واقعی ہم ان کی طرف فرشتے اتار دیتے اور ان سے مردے گفتگو کرتے اور ہم ہر چیز ان کے پاس سامنے لایا کرتے تو بھی وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لے آتے مگر یہ کہ اللہ چاہے اور لیکن ان کے اکثر جہالت برتتے ہیں۔“ اس آیت سے ”لَوْ“ کا جواب صراحت کے ساتھ معلوم ہو رہا ہے۔

وَلَقَدْ اسْتَهْزَيْ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَاَمَلَيْتَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ اخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ
كَانَ عِقَابٍ ۝

اور بلاشبہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو میں نے ان لوگوں کو مہلت دی جنہوں نے کفر کیا، پھر میں نے انہیں پکڑ لیا تو میرا عذاب کیسا تھا ۝

دوسرا جواب اس ”کو“ کا یہ ہے کہ ان صفات کا حامل اگر کوئی قرآن ہوتا تو وہ یہی قرآن تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ [الحشر: ۲۱] ”اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو یقیناً تو اسے اللہ کے ڈر سے پست ہونے والا، ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا دیکھتا۔“ اس میں اس قرآن کی عظمت کا بیان ہے کہ تم جو مطالبے کر رہے ہو قرآن کے لیے ان میں سے کوئی بھی پورا کرنا مشکل نہیں، مگر سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ایسا کرنا اس کی حکمت کے خلاف ہے، کیونکہ اس کے بعد ایمان نہ لانے کی صورت میں تمہیں عذاب سے ملیا میٹ کر دیا جاتا، جیسا کہ پہلی امتوں کے ساتھ ہوا۔

② أَفَلَمْ يَأْتِنِ الَّذِينَ آمَنُوا: مفسرین نے ”أَفَلَمْ يَأْتِنِ“ کے دو معنی لکھے ہیں، ایک معنی ہے کہ ”أَفَلَمْ يَعْلَمُ“ کہ کیا وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں انہیں معلوم نہیں ہوا کہ جن نشانیوں کا یہ لوگ مطالبہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دکھانے پر قادر ہے، کیونکہ اسے ہر چیز کا اختیار ہے، مگر اس توقع پر ان نشانیوں کا دکھانا بے سود ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ لوگ اتنے سرکش اور ضدی ہیں کہ یہ نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے اور ”أَفَلَمْ يَأْتِنِ“ کا دوسرا معنی یہ ہے کہ کیا ابھی مسلمان ان کے ایمان لانے سے مایوس نہیں ہوئے، حالانکہ وہ جانتے ہیں.....

③ أَنْ لَّوِ يَشَاءُ اللَّهُ لَهْدَى النَّاسَ جَمِيعًا: یعنی ہدایت تو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے جو ان نشانات کے دکھائے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ (شوکانی)

④ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا.....: یعنی یہ کفار مکہ نشانیوں کو دیکھ کر مان لینے والے نہیں ہیں۔ یہ مانیں گے تو اس طرح کہ ان کے کرتوتوں کی سزا میں آئے دن کوئی نہ کوئی آفت ان پر نازل ہوتی رہے، جیسے قتل، قید، قحط یا بیماری وغیرہ۔ چنانچہ شاہ عبد القادر برہنہ لکھتے ہیں: ”لیکن کافر مسلمان یوں ہوں گے کہ ان پر آفت پڑتی رہے گی، ان پر پڑے یا ہمسائے پر، جب تک سارے عرب ایمان میں آجائیں۔ وہ آفت یہی تھی جہاد مسلمانوں کے ہاتھ سے۔“ (موضح)

⑤ أَوْ تَحُلَّ قَلْبُ نِيَّافٍ مِّن دَارِهِمْ: یعنی وہ آفت ان کے آس پاس والوں پر اترے گی اور وہ ان کا حال دیکھ کر عبرت حاصل کریں گے۔

⑥ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغْلِبُ الْبِيعَادَ: چنانچہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا، قریش میں سے بعض لوگ مارے گئے اور بعض قید ہوئے، یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ پورا ہوا، یعنی مکہ فتح ہوا۔

وَلَقَدْ اسْتَهْزَيْ بِرُسُلٍ.....: ”عِقَاب“ اصل میں ”عِقَابِي“ تھا۔ آیات کی موافقت کے لیے یا، حذف کر کے

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۖ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ ۗ قُلْ سَتُؤْمَرُونَ
تَتَّبِعُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ مَنْ بَظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ ۗ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرَهُمْ
وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝۳۳

تو کیا وہ جو ہر جان پر اس کا نگران ہے جو اس نے کیا (کوئی دوسرا اس کے برابر ہو سکتا ہے؟) اور انھوں نے اللہ کے کچھ شریک بنا لیے۔ کہہ دے ان کے نام لو، یا کیا تم اسے اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ زمین میں نہیں جانتا، یا ظاہری بات سے (کہہ رہے ہو؟) بلکہ ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا، ان کا مکر خوشنما بنا دیا گیا اور وہ سیدھے راستے سے روک دیے گئے اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ۝۳۳

کسرہ رہنے دیا گیا۔ ”أَمَلَيْتُ“ باب افعال (ناقص واوی) بمعنی مہلت دینا، اس سے مقصود نبی ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ آپ ان کافروں کے ٹھٹھا مذاق کرنے اور ناجائز اور ناممکن مطالبات کرنے سے بد دل نہ ہوں، پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے تھے تو ہرگز رنے والا ان سے ٹھٹھا کرتا۔ [ہود: ۳۸] شعیب علیہ السلام سے ان کی قوم نے کہا: ”ہم پر آسمان کا کوئی نکلوا گرا دو۔“ [الشعراء: ۱۸۷] ہود علیہ السلام کی قوم نے کہا: ”ہم یقیناً تجھے بے وقوفی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔“ [الأعراف: ۶۶] فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو ”مُحَيِّتٌ“ (حقیق) کہا اور زبان کی لکنت کا طعنہ دیا۔ [الأعراف: ۵۲] فرمایا، اس کے باوجود میں نے کفار کو مہلت دی، تاکہ ان کا عذر ختم ہو جائے، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا تو آپ بھی ان کی حرکتوں سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَيَمْلِكُ لِلظَّالِمِ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَهُ لَمَّ يُلْقِيَهُ﴾ ”اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، یہاں تک کہ جب اسے پکڑتا ہے تو اسے چھوڑتا نہیں۔“ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَكَذَلِكَ أَخَذْنَا مِنَ النَّارِ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخَذًا أَلِيمَةً شَدِيدًا﴾ [ہود: ۱۰۲] ”اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے، جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، اس حال میں کہ وہ ظلم کرنے والی ہوتی ہیں، بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک، بہت سخت ہے۔“ [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿وَكَذَلِكَ أَخَذْنَا مِنَ النَّارِ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ﴾، ۶۸۶: ۵، عن أبي موسىٰ رضی اللہ عنہ۔ مسلم: ۲۵۸۳]

تہ 33 ① أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ: یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کے ثبوت اور شرک کے رد کا بیان فرمایا ہے۔ ”قَائِمٌ“ سے مراد یہاں نگران اور محافظ ہے۔ ”أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ“ مبتدا ہے، اس کی خبر محذوف ہے اور وہ ہے ”كَمْ مِّنْ لَّيْسَ كَذَلِكَ“ اور یہ حذف شدہ خبر کام کے پہلے اور پچھلے حصے سے خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے۔ یعنی کیا وہ معبود برحق جو ہر جان کا ہر لمحہ اور ہر حالت کا نگران اور محافظ ہے اور اس کے ہر عمل سے، نیک ہو یا بد، پوری طرح واقف ہے، وہ تمہارے ان جھوٹے معبودوں کی طرح ہے جو سرے سے اس وصف سے محروم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس وصف کے لیے دیکھیے سورۃ انعام (۵۹)، ہود (۶) اور آیت الکرسی وغیرہ۔

② وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَتُؤْمَرُونَ: اس سے پہلے جملے میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ضمیر ”هُوَ“ کے ساتھ تھا، یہاں ضمیر کے

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ لَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَقُّ وَمَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ﴿۳۰﴾

ان کے لیے ایک عذاب دنیا کی زندگی میں ہے اور یقیناً آخرت کا عذاب زیادہ سخت ہے اور انھیں اللہ سے کوئی بھی بچانے والا نہیں ﴿۳۰﴾

بجائے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ان کے شرک کی قباحت ظاہر کی کہ کتنے ظالم ہیں کہ انھوں نے ”اللہ“ کے شریک بنا لیے، جس کا کوئی شریک ہو ہی نہیں سکتا۔ فرمایا ان شریک بنانے والوں سے کہو ذرا ان شریکوں کے نام تو بتاؤ، انھیں سامنے تو لاؤ۔ اگر تم بالفرض نام لے بھی دو، تو ایسی ہستیوں کا نام لو گے جو محض خیالی ہیں، حقیقت میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں، وہ خود اپنے وجود اور بقا میں دوسروں کی محتاج ہیں، نہ اپنے نفع نقصان کا اختیار رکھتی ہیں نہ کسی دوسرے کا، ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتیں۔ پھر ان کا نام اللہ کے شریک کے طور پر لینا کس قدر نادانی اور جہالت کی بات ہے۔

﴿۳۱﴾ أَمْ تُشْرِكُونَ مَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ : یا تم اسے اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ زمین میں نہیں جانتا، حالانکہ اسے زمین کے چپے چپے کی خبر ہے، تو اگر ان شرکاء کا کہیں وجود ہوتا تو وہ انھیں ضرور جانتا۔ اس تفسیر کی رو سے ”لَا يَعْلَمُ“ میں ”هُوَ“ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”لَا يَعْلَمُ“ میں ضمیر ”مَا“ کے لیے ہو اور مطلب یہ ہو کہ کیا اللہ تعالیٰ کو ان بے جان بتوں کے معبود ہونے کی خبر دیتے ہو جن کو ذرا بھی علم نہیں ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں، اس سے مقصود تو زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کی نفی کرنا ہے، لہذا ”فِي الْأَرْضِ“ کی قید محض اس لیے لگائی ہے کہ کفار یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کے یہ شریک زمین میں ہیں۔ (روح، ابن کثیر)

﴿۳۲﴾ أَمْ يَرَوْنَ مِنَ الْقَوْلِ : یا ظاہری بات ہے، جو تم صرف منہ سے کہہ رہے ہو، دل سے تمہیں بھی یقین نہیں کہ کوئی اللہ کا شریک ہے، کیونکہ اگر غور و فکر کرو تو انسانی فطرت بھی اللہ کا کوئی شریک ہونا تسلیم نہیں کرتی۔

﴿۳۳﴾ بَلْ ذُنُوبَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرَهُمْ : مکر سے مراد کفر اور اس کے لیے باطل دلیلیں گھڑنا اور لوگوں کو دھوکا دے کر مشرک بنانا ہے۔ ”خوش نما بنا دیا گیا“ خوش نما بنانے والی کئی چیزیں ہیں، اس لیے فعل مجہول استعمال کیا گیا، مثلاً: ﴿۳۱﴾ ان کے اعمال بد کی نحوست ﴿۳۱﴾ نفسانی خواہشات ﴿۳۲﴾ شیطان ﴿۳۳﴾ ان کے فسق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں پر لگنے والی مہر، غرض بہت سی چیزیں ان کے کفر کو خوش نما بنانے کا باعث بنیں۔

﴿۳۴﴾ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ : ”مِن هَاهُو“ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں ہدایت نہیں لکھی۔ اب ایسے لوگ سیدھی راہ پر کیسے آ سکتے ہیں۔

آیت 34 لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا : یعنی دنیا ہی میں بعض اوقات آسمانی آفات، بیماریوں، فاقوں اور مختلف مصیبتوں کے ذریعے سے عذاب ہوگا اور بعض اوقات مجاہدین اسلام کے ہاتھوں قید، قتل یا ذلیل ہوں گے اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت ہے۔ اس کی ایک جھلک یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « نَارُكُمْ هَذِهِ النَّبِيُّ يُوقِدُ ابْنُ آدَمَ جُزْءًا مِنْ

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعدَ الْمُتَّقُونَ ۖ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ أُكْلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا ۖ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا ۖ وَعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِينَ اتَّبَعَتْهُمْ أَلْكَتَبَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَنْ يُنَكِّرُ بَعْضُهُمْ أَمْرًا أَمَرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ ۖ إِلَيْهِ أَدْعُوا وَإِلَيْهِ مآبٌ ﴿۳۶﴾

اس جنت کی صفت جس کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس کے نیچے سے نہریں بہ رہی ہیں، اس کا پھل ہمیشہ رہنے والا ہے اور اس کا سایہ بھی۔ یہ ان لوگوں کا انجام ہے جو متقی بنے اور کافروں کا انجام آگ ہے ﴿۳۵﴾ اور وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس پر خوش ہوتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا ہے اور کچھ گروہ وہ ہیں جو اس کے بعض کا انکار کرتے ہیں۔ کہہ دے مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤں۔ میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے ﴿۳۶﴾

سَبْعِينَ جُرُءًا مِنْ حَرِّ جَهَنَّمَ كُلُّهَا مِثْلُ حَرِّهَا» [مسلم، الحنة و صفة نعیمها، باب جہنم أعادنا الله منها : ۲۸۴۳، عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ] ”تمھاری یہ آگ جو ابن آدم جلاتا ہے، جہنم کی گرمی کے ستر (۷۰) حصوں میں سے ایک حصہ ہے..... سب کی گرمی اس کی مثل ہے۔“ اور آخرت کے عذاب کے بہت زیادہ سخت ہونے کا سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ مزید دیکھیے سورہ فجر (۲۶، ۲۵) اور سورہ فرقان (۱۱ تا ۱۵)۔

آیت 35 مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي : ”مَثَلُ“ کا معنی یہاں صفت یا حال ہے، اہل جہنم کے ذکر کے بعد متقی لوگوں کو ملنے والی جنت کا حال اور اس کی صفت بیان فرمائی کہ اس کے درختوں اور مکانوں کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، اس کا پھل دائمی ہے، یہ نہیں کہ کبھی ہو اور کبھی نہ ہو، اسی طرح اس کا سایہ بھی دائمی ہے، اس کے پھل نہ ختم ہوں گے، نہ کسی جنتی کو ان سے کوئی رکاوٹ ہوگی۔ (دیکھیے واقعہ: ۳۳) جنت کی نہروں کی صفت کے لیے سورہ محمد (۱۵) اور سائے کی حالت کے لیے سورہ دہر (۱۳)، نساء (۵۷) اور طہ (۱۱۸، ۱۱۹) ملاحظہ فرمائیں۔ مزید تفصیل کے لیے اس مقام پر تفسیر ابن کثیر اور کتب احادیث میں جنت اور جہنم کے احوال کے ابواب ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 36 ﴿۳۶﴾ وَالَّذِينَ اتَّبَعَتْهُمْ أَلْكَتَبَ : ”الْكَتَبَ“ سے مراد یا تو پہلی کتابیں ہیں، یعنی تورات و انجیل، مطلب یہ ہوگا کہ پہلی کتب میں چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے رسول ہونے کے بہت سے شواہد اور بشارتیں موجود ہیں، اس لیے جن لوگوں کو وہ کتابیں دی گئی ہیں وہ آپ کی طرف اترنے والی آیات پر خوش ہوتے ہیں۔ دیکھیے سورہ عنکبوت (۴۷) اور آل عمران (۱۱۳) کیونکہ وہ آپ کو پہچان کر ایمان لا چکے ہیں، ہاں ان کے کئی گروہ قرآن کی بعض چیزوں کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان کی ان باتوں کا رد کرتا ہے جو انھوں نے اپنے پاس سے داخل کر لی تھیں، یا ان میں تبدیلی اور تحریف کر دی تھی، مثلاً یہود

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۖ وَلَئِنِ اثْبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ
مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾

اور اسی طرح ہم نے اسے عربی فرمان بنا کر اتارا ہے اور یقیناً اگر تو نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس کے بعد جو تیرے پاس علم آچکا تو اللہ کے مقابلے میں نہ تیرا کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا ﴿۳۷﴾

کا عزیز علیہ السلام اور نصاریٰ کا مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دینا اور وہ باتیں ظاہر کرنا ہے جو وہ چھپاتے تھے، مثلاً رجم کی حد، سود کی حرمت، نبی ﷺ کی صفات وغیرہ، لہذا وہ پہچاننے کے باوجود عناد کی وجہ سے ان باتوں کا انکار کرتے اور اپنے کفر پر اڑے ہوئے تھے۔ دیکھیے سورہ توبہ (۳۰، ۳۱) یا پھر ”الکُتُب“ سے مراد قرآن مجید ہے اور ”جن لوگوں کو یہ کتاب دی“ سے مراد مسلمان ہیں کہ وہ آپ پر اترنے والی آیات پر دل سے خوش ہوتے ہیں اور ”الْأَخْرَابِ“ سے مراد عرب کے وہ جاہل اور ضدی لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کی بعض باتیں اپنی مرضی کے خلاف ہونے کی وجہ سے نہ مانیں اور مسلمان نہ ہوئے۔ یہ لوگ خوش ہونے کے بجائے ناراض اور سخ پاہوتے ہیں۔

﴿۳۷﴾ قُلْ إِنَّمَا أَمْرُهُ أَنْ عَبَّدَ اللَّهُ..... : تو جو شخص نہیں ماننا وہ گویا اللہ تعالیٰ اور اس کی عبادت سے انکار کرتا ہے۔

﴿۳۸﴾ وَإِلَيْهِ مآبٍ: ”مآب“ یہ ”آب یؤوب“ (ان، اجوف واوی) سے مصدر میسی ہے، اصل ”مآبِی“ تھا، یعنی میرا لوٹنا، ”یاء“ حذف کر کے کسرہ اس پر دلالت کے لیے باقی رکھا ہے۔

آیت 37 ﴿۳۷﴾ وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا : یعنی جس طرح پہلے انبیاء کی طرف کتابیں اتریں اسی طرح ہم نے آپ پر یہ قرآن اتارا اور جس طرح ہر نبی پر اس کی قوم کی زبان میں وحی اور کتاب نازل کی اسی طرح عربوں پر بھی انہی کی زبان میں کتاب اتاری، کسی دوسری زبان میں نہیں، تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم تو یہ زبان جانتے ہی نہیں۔ ”أَنْزَلْنَاهُ“ (ہم نے اسے اتارا) سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید اور وحی الہی اوپر کی جانب سے آئی ہیں۔ اس سے ان لوگوں کا صاف رد ہو گیا جو اللہ تعالیٰ کے لیے اوپر کی جانب ہونے یا عرش پر ہونے کو تسلیم نہیں کرتے، بلکہ کبھی کہتے ہیں کہ وہ لامکان ہے، یعنی کہیں بھی نہیں اور کبھی کہتے ہیں وہ ہر جگہ ہے، حالانکہ قرآن نے کئی جگہ صراحت فرمادی ہے کہ وہ اوپر کی جانب ہے اور عرش پر ہے، فرمایا: ﴿قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ﴾ [البقرة: ۱۷۷] ”یقیناً ہم تیرے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ﴾ [الأعراف: ۵۴] ”پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔“ اور دیگر متعدد آیات۔ پھر آپ کے مخاطب اگرچہ قیامت تک کے تمام جن و انس ہیں، تاہم سب سے اول مخاطب عرب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کی رہنمائی کے لیے ان کا اور ان کی زبان کا انتخاب ان کی فطری خوبیوں اور ان کی زبان کی جامعیت، فصاحت و بلاغت، حسن ادا، آسان ہونے اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے فرمایا اور اسے اہل عرب پر احسان قرار دیا: ﴿وَإِنَّكَ لِنَدَّرُكَ﴾ [القلم: ۴۴] ”اور بے شک وہ تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے نصیحت (یا شہرت کا

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُرْسَلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً ۖ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے کئی رسول تجھ سے پہلے بھیجے اور ان کے لیے بیویاں اور بچے بنائے اور کسی رسول کے لیے ممکن

باعث ہے اور عنقریب تم سے پوچھا جائے گا۔“ پھر اس قرآن نے عربی زبان کو ایسا محفوظ کیا کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود عربی زبان اصل صورت میں موجود ہے، جبکہ دوسری تمام زبانیں کچھ عرصہ بعد بدل جاتی ہیں، حتیٰ کہ پہلے لفظ بالکل ہی متروک ہو جاتے ہیں، جیسا کہ انگریزی وغیرہ کا حال ہے۔ خود عربی کو دیکھ لیجئے کہ قرآن کی وجہ سے فصیح عربی محفوظ ہے، مگر عام لوگوں کی عربی بھی مختلف علاقوں اور مختلف ادوار کے لحاظ سے اتنی مختلف ہے کہ ایک علاقے کا عرب دوسرے علاقے کی عامی زبان نہیں سمجھتا۔ البتہ اصل عربی کو قرآن نے صدیوں سے اصل صورت میں باندھ رکھا ہے، وہ دنیا بھر میں ایک ہی ہے۔

② وَلَٰكِن اَتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ.....: یہ خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ سے ہے لیکن مراد ہر وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب اور اس کے غصے سے ڈرنے والا ہے اور اس میں وعید ہے ان علماء کے لیے جو جانتے بوجھتے سنت کی راہ چھوڑ کر بدعت و ضلالت اور قرآن و حدیث چھوڑ کر اقوالی رجال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ (امین کثیر)

آیت 38 ① وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُرْسَلًا مِّن قَبْلِكَ.....: نبی کریم ﷺ کی نبوت پر مشرکین یہ بھی اعتراض کرتے کہ یہ

عجیب پیغمبر ہیں کہ دوسرے انسانوں کی طرح نکاح کرتے ہیں، ان کی اولاد بھی ہے، حالانکہ پیغمبر کو ان باتوں سے کیا واسطہ؟! بلکہ انھیں اس پر بھی اعتراض تھا کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ (دیکھیے فرقان: ۷) اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب ہے کہ نبوت عورتوں سے نکاح کے منافی نہیں، آپ سے پہلے جتنے بھی اللہ کے پیغمبر ہو گزرے ہیں وہ سب بشر ہی تھے اور ان میں اکثریت ان پیغمبروں کی ہے جو بیوی بچے رکھتے تھے۔ وہ سب کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔ (دیکھیے فرقان: ۲۰) تمہیں ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام کی اولاد ہونے پر فخر ہے تو کیا تم ان کی شادی کے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہو؟! اسی طرح بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کو دیکھ لو۔ سلیمان علیہ السلام کی بیویوں اور لونڈیوں کی تعداد کی طرف دھیان کرو! غرض تمہارا یہ اعتراض سرے سے ہے ہی لغو۔ ہمارے زمانے میں بھی کئی لوگ انھی لوگوں کو اللہ والے، ولی اور بزرگ سمجھتے ہیں جو نہ شادی کریں، نہ کمائی، راہب بن کر دین کی دعوت اور جہاد کے بجائے گوش نشینی اور خود محنت کر کے کھانے کے بجائے دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کریں، حالانکہ اسلام میں یہ کام حرام ہیں۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«جَاءَ ثَلَاثَةٌ رَهْطٍ إِلَى بَيْتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُونَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا أُخْبِرُوا سَكَتَهُمْ فَقَالُوا فَقَالُوا وَأَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غَفَرَ اللَّهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ، فَقَالَ أَحَدُهُمْ أَمَا أَنَا فَأَنَا أَصْلَى اللَّيْلِ أَبْدًا، وَقَالَ آخَرُ أَنَا أَصُومُ الدَّهْرَ وَلَا أَفْطِرُ، وَقَالَ آخَرُ أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبْدًا، فَجَاءَ إِلَيْهِمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَنْتُمْ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَا وَاللَّهِ! إِنِّي لَا أُخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَأَتَّقَاكُمْ لَهُ، لَكِنِّي أَصُومُ وَأَفْطِرُ، وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ،

يَأْتِي بآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ لِكُلِّ آجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۹﴾ يَنْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ ۖ وَعِنْدَهُ

نہ تھا کہ وہ کوئی نشانی لے آتا، مگر اللہ کے اذن سے۔ ہر وقت کے لیے ایک کتاب ہے ﴿۳۹﴾ اللہ مٹا دیتا ہے جو چاہتا

فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي ﴿بخاری، النکاح، باب الترغيب في النکاح: ۵۰۶۳۔ مسلم: ۱۴۰۱﴾ ”تین آدمی نبی ﷺ کی بیویوں کے گھروں کی طرف آئے، وہ نبی ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ جب انھیں بتایا گیا تو گویا انھوں نے اسے کم سمجھا، کہنے لگے: ”ہماری نبی ﷺ سے کیا نسبت؟ آپ ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے پہلے اور پچھلے سب گناہ معاف فرما دیے ہیں۔“ چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا: ”میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا۔“ دوسرے نے کہا: ”میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، کبھی روزے کے بغیر نہیں رہوں گا۔“ تیسرے نے کہا: ”میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا، کبھی نکاح نہیں کروں گا۔“ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے (انھیں بلوایا) اور فرمایا: ”تم لوگوں نے یہ یہ باتیں کی ہیں، یاد رکھو! اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ کی خشیت والا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ کے تقویٰ والا ہوں، لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا اور نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو جو میرے طریقے سے بے رغبتی کرے گا وہ مجھ سے نہیں۔“

﴿۳۹﴾ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ: مخالفین کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر یہ (محمد ﷺ) واقعی اللہ کے چپے پیغمبر ہیں تو ہماری طلب کے مطابق معجزے اور نشانیاں کیوں نہیں لاتے۔ ان کے جواب میں فرمایا کہ پہلے پیغمبر جتنے معجزے لائے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکم سے لائے ہیں، اب اگر اللہ کا حکم ہوگا تو وہ اپنے اس پیغمبر سے بھی معجزے ظاہر کر دے گا، ورنہ پیغمبر میں از خود یہ ہمت کہاں ہے کہ اپنی مرضی سے جو معجزہ چاہے ظاہر کر دے۔ یہی حال اولیاء کی کرامتوں کا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کرامت دکھانے پر قادر نہیں ہوتے۔ یہاں آیت سے مراد قرآن کی آیت بھی ہو سکتی ہے جس میں ان کی مرضی کے مطابق کوئی حکم نازل ہو جائے۔ (ابن کثیر)

﴿۳۹﴾ لِكُلِّ آجَلٍ كِتَابٌ: یعنی ہر وقت کے لیے ایک لکھا ہوا فیصلہ ہے جو اس وقت ہو کر رہے گا۔

آیت 39: يَنْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ: بظاہر یہ آیت اس حدیث کے خلاف ہے: «حَفَّتِ الْقَلَمُ بِمَا أَنْتَ لَاقٍ» (بخاری، النکاح، باب ما یکره من النبل والنخاء: ۵۰۷۶) ”جس چیز یا حال کو تم ملنے والے ہو قلم اس کے ساتھ خشک ہو چکا ہے۔“ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فیصلہ ہو چکا وہ اب مٹنے والا نہیں، اس سوال کے حل کے لیے اس آیت کی تفسیر اہل علم نے دو طرح سے کی ہے، ایک تو یہ کہ جس طرح معجزہ اور کرامت اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے، کسی دوسرے کا اس میں کچھ دخل نہیں، اسی طرح کسی حکم کو باقی رکھنا یا اسے منسوخ کر دینا بھی اسی کے اختیار میں ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ کون سا حکم کب تک باقی رکھنا ہے اور کون سا حکم منسوخ کرنا ہے اور کب کرنا ہے۔ گویا یہ یہود پر رد ہے جو نسخ کے قائل نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ میں بھی ان پر رد فرمایا: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِمَّا أَوْ

أَهْرُ الْكِتَابِ ﴿۱۹﴾

ہے اور ثابت رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے ﴿۱۹﴾

ہیں اور یہ سب باقی رکھنا یا منسوخ کرنا (محو و اثبات) ام الکتاب میں درج ہے، جو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت (۱۰۶) کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ جب تک چاہتا ہے ایک رسول کے احکام پر عمل قائم رکھتا ہے، پھر جس وقت چاہتا ہے بعد میں آنے والے رسول کے احکام پر عمل فرض کر دیتا ہے اور پہلے پر عمل ختم کر دیتا ہے۔ ”يُنْعَمُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُطِيعُ“ میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی بندے کے نامہ اعمال میں کوئی بھی نیک یا بد عمل اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو باقی رکھتا ہے، چاہتا ہے تو مٹا دیتا ہے اور یہ نہیں کہ پہلے اسے علم نہیں تھا کہ میں نے کیا ثابت رکھنا ہے اور کیا مٹانا ہے، بلکہ اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ تقدیر کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، اسے قضائے مبرم کہتے ہیں اور یہ وہی ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما فرمایا: «حَفَّتِ الْقَلَمُ بِمَا أَنْتَ لَاقِي» (بعماری، النکاح، باب ما بكرة من التبتل والحصاء: ۵۰۷۶) ”تم جس چیز یا حال کو ملنے والے ہو اس کے ساتھ قلم خشک ہو چکا ہے۔“ اور ایک تقدیر وہ ہے جس میں تبدیلی ہوتی ہے، اسے تقدیر معلق کہتے ہیں اور وہ بھی اللہ کے علم میں ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر بریلوی لکھتے ہیں: ”دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے، بعض اسباب ظاہر ہیں اور بعض چھپے ہیں۔ اسباب کی تاثیر کا ایک اندازہ مقرر ہے، جب اللہ چاہے ان کی تاثیر اندازے سے کم یا زیادہ کر دے اور جب چاہے ویسی ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مرتا ہے اور گولی سے بچتا ہے اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں ہے، وہ ہرگز نہیں بدلتا۔ اندازے کو تقدیر کہتے ہیں، یہ دو تقدیریں ہوئیں، ایک بدلتی ہے (تقدیر تاثیر اسباب) اور ایک نہیں بدلتی (یعنی علم الہی)۔“ (موضح)

شیخ ناصر الدین البانی نے سلسلہ الاحادیث الضعیفہ (۵۳۴۸) میں فرمایا: ”قرطبی نے بھی اپنی تفسیر ”الجامع (۳۳۲/۵)“ میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں: ”اور عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے (قضا) میں تبدیلی نہیں ہوتی اور یہ محو و اثبات بھی ان چیزوں میں شامل ہے جن کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ قضا میں سے کچھ چیزیں وہ ہیں جو لازماً ہو کر رہتی ہیں، یہ وہ ہیں جو ثابت (مبرم) ہیں اور کچھ وہ ہیں جن میں بعض اسباب سے تبدیلی ہو جاتی ہے، یہ محو (مٹائی ہوئی) ہیں۔ (واللہ اعلم) غزنوی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میرے نزدیک یہ ہے کہ لوح محفوظ میں جو کچھ ہے وہ غیب سے نکل چکا ہے، کیونکہ بعض فرشتے بھی اس سے واقف ہیں، اس لیے وہ تبدیل ہو سکتا ہے، کیونکہ مخلوق کا اللہ تعالیٰ کے پورے علم سے واقف ہونا محال ہے اور اس کے علم میں اشیاء کی جو تقدیر اور طے شدہ بات ہے وہ کبھی نہیں بدلتی۔“ (سلسلہ ضعیفہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ غزنوی سے مراد عالی بن ابراہیم بن اسماعیل ہیں جن کا لقب ”تاج الشریعہ“ ہے، یہ ایک حنفی فقیہ مفسر ہیں، ان کی کتاب تفسیر الشفیر ہے جو بہت عمدہ ہے، جیسا کہ کئی علماء نے فرمایا ہے، ۵۸۲ھ میں فوت ہوئے۔ الاعلام) خلاصہ یہ کہ اس ”محو و اثبات“ کا اس ”بدا“ کے غلط عقیدے سے کوئی تعلق نہیں جو بعض گمراہ لوگوں نے اختیار کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے

وَإِنْ مَا نُرِيكَ بَعْضَ الَّذِي نَعُدُّهُمْ أَوْ تَتَوَقَّيْنَاكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ وَ عَلَيْنَا
الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ أَوْ لَمْ يَرَوْا أَنَا تَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۗ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقَّبَ

اور اگر کبھی ہم واقعی تجھے اس کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، یا واقعی تجھے اٹھالیں تو تیرے ذمے صرف پہنچا دینا ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے ﴿۴۰﴾ اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کی طرف آتے ہیں، اسے اس کے کناروں سے کم کرتے آتے ہیں اور اللہ فیصلہ فرماتا ہے، اس کے فیصلے پر کوئی نظر ثانی

کے تم کوئی کام کرو، پھر اس کا غلط ہونا تمہیں معلوم ہو تو اسے بدل دو۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا حرام ہے، کیونکہ وہ پہلے ہی جانتا ہے کہ کیا درست ہے اور کیا غلط ہے۔

اس تفصیل سے اللہ کے فیصلے کے بدل نہ سکنے کے عقیدے اور ان تمام احادیث و اقوال صحابہ کے متعلق اشکال ختم ہو جاتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات تقدیر بدل سکتی ہے، خصوصاً دعا سے، مثلاً رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «لَا يَرُدُّ الْقَضَاءُ إِلَّا الدَّعَاءُ وَلَا يَرِيْدُ فِي الْعُسْرِ إِلَّا الْبُرُّ» (ترمذی، القدر، باب ما جاء لا يرد القدر إلا الدعاء: ۲۱۳۹۔ سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۱۰۳۸، ج: ۱۵۹) "تقدیر کو دعا کے سوا کوئی چیز نہیں مٹاتی اور عمر کو نیکی کے سوا کوئی چیز زیادہ نہیں کرتی۔" اسی طرح بعض صحابہ کی دعائیں کہ یا اللہ! اگر تو نے مجھے شقی لکھا ہے تو اسے بدل کر سعید لکھ دے۔

آیت 40 وَإِنْ مَا نُرِيكَ : "مَا" شرط کے معنی کی تاکید کے لیے ہے جو "إِنْ" کا مفہوم ہے۔ اس لیے ترجمہ کیا ہے "اور اگر کبھی ہم واقعی تجھے دکھا دیں۔" یہاں "نُرِيكَ" کا معنی آنکھوں سے دکھانا ہے، دل سے یا گمان اور خیال سے نہیں۔ شرط میں مذکور "نُرِيكَ" اور "أَوْ تَتَوَقَّيْنَاكَ" دونوں کا جواب محذوف ہے، یعنی ضروری نہیں کہ دنیا میں انھیں دی جانے والی سزا ہم آپ کی زندگی ہی میں آپ کو دکھا کر دیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی وفات کے بعد ان کی سزا کا وقت آئے، اگر ہم آپ کو آنکھوں سے ان کی کچھ ذموی سزا دکھا دیں تو یہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کے سینوں اور آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہو گا اور اگر پہلے فوت کر لیں تب بھی آپ فکر نہ کریں، کیونکہ آپ کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ ربان کے اعمال پر محاسبہ اور مواخذہ تو وہ ہمارے ذمے ہے۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ کچھ وعدے تو آپ کی زندگی میں پورے ہوں گے اور کچھ آپ کی وفات کے بعد۔ باغبان پودے لگاتا ہے، کچھ اس کی زندگی میں پھل دے دیتے ہیں اور کچھ کئی سالوں کے بعد آنے والی نسل کو پھل دیتے ہیں، لہذا آپ کو اس کے لیے جلدی نہیں کرنی چاہیے اور انھیں بے فکر اور غافل نہیں رہنا چاہیے۔

آیت 41 ﴿۴۱﴾ أَوْ لَمْ يَرَوْا أَنَا تَأْتِي الْأَرْضَ : یہ کفار کے لیے وعید اور مسلمانوں کے لیے خوش خبری ہے، یعنی کیا ان کفار نے نہیں دیکھا کہ ہم ان کی زمین کو اس کے کناروں سے کم کرتے چلے آ رہے ہیں، ان کے شہر اور علاقے یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے قبضے میں آتے جا رہے ہیں، ایک وقت آ رہا ہے کہ انھیں زمین کے مرکز ام القریٰ یعنی مکہ سے بھی بے دخل ہونا

لِحُكْمِهِ وَهُوَ سَرِيحُ الْحِسَابِ ﴿۳۱﴾

کرنے والا نہیں اور وہ جلد حساب لینے والا ہے ﴿۳۱﴾

پڑے گا۔ چونکہ مکہ میں مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا، اس لیے بعض مفسرین نے اس سورت کو مدنی قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی پیش قدمی کو اپنی پیش قدمی قرار دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی کا دین آگے بڑھ رہا تھا اور مسلمانوں کا آگے بڑھنا صرف اللہ ہی کی مدد سے تھا، ورنہ وہ کفار کی متحدہ قوتوں کے سامنے اکیلے اپنی طاقت سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے مسلمانوں کی پیش قدمی کو ”اَکَانَاتِي“ (اپنے آنے) کے الفاظ کے ساتھ بیان کرنے میں اللہ تعالیٰ کی ہیبت و جلال کا جو اظہار ہو رہا ہے وہ اللہ کے کلام ہی کی خصوصیت ہے، جیسے فرمایا: ﴿فَأَيُّ لَللّٰهِ بُنْيَانُهُمْ فِىنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْتِهِمْ وَأَنْتَهُمُ الْعَدَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ﴾ [النحل: ۲۶] ”یعنی ان کفار سے پہلے لوگوں نے سازشیں کیں، تو اللہ ان کی عمارت کو بنیادوں سے آیا، پس ان پر ان کے اوپر سے چھت گر پڑی اور ان پر وہاں سے عذاب آیا کہ وہ سوچتے نہ تھے۔“ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار رسول اللہ ﷺ نے صفا اور مروہ پر کھڑے ہو کر ان الفاظ میں کیا: ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَحْدَهُ لَا يَشْفَعُ عِنْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَخَذَهُ﴾ [مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ: ۱۲۱۸]

”اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور اکیلے ہی نے تمام جماعتوں کو شکست دی۔“ کفار پر تعجب ہے کہ یہ دیکھ کر بھی کہ دن بدن اسلام کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے اور کفر و شرک مٹ رہا ہے، یہ لوگ اسلام نہیں لاتے۔ اللہ تعالیٰ کی بشارت کے مطابق پھر وہ وقت آیا کہ مشرق اور مغرب کے آخر تک اسلام کا علم لہرانے لگا اور رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ہر صورت وہ وقت آنے والا ہے جو مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، فرماتے تھے: ﴿لَا يَبْقَى عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتٌ مَدْرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَذْخَلَهُ اللَّهُ كَلِمَةَ الْإِسْلَامِ بَعْرَ عَزِيْزٍ لَوْ ذَلَّ ذَلِيلٌ أَمَا يُعْزُهُمُ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ أَهْلِهَا لَوْ يُدَلُّهُمْ فَيَدِينُونَ لَهَا﴾ [احمد: ۴۸۶، ح: ۲۳۸۷۶ وصححه الألبانی]

”زمین کی پشت پر اینٹوں یا بالوں کا بنا ہوا کوئی گھر (یا خیمہ) باقی نہیں رہے گا، مگر اللہ تعالیٰ اس میں کلمہ اسلام کو داخل کر دے گا، عزت والے کو عزت بخش کر اور ذلیل کو ذلت دے کر، یا تو انھیں عزت دے گا اور انھیں یہ کلمہ پڑھنے والوں میں داخل کر دے گا، یا انھیں ذلیل کرے گا اور وہ اس کے حکوم بن جائیں گے۔“ مزید دیکھیے سورہ انبیاء (۴۳)۔

﴿۲﴾ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ: کیونکہ اس کے فیصلے پر نظر ثانی کر کے اسے وہی بدل سکتا ہے جو اس پر غالب ہو، جب کہ ایسی کسی ہستی کا کہیں وجود ہی نہیں۔

﴿۳﴾ وَهُوَ سَرِيحُ الْحِسَابِ: یعنی اس کے حساب لینے کا وقت نہایت تیزی کے ساتھ آ رہا ہے، حتیٰ کہ اس کے آنے پر مجرم تسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہم دنیا میں صرف ایک گھڑی رہے ہیں۔ (روم: ۵۵) دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسے حساب لینے میں

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ وَسَيَعْلَمُ
الْكُفْرَ لِمَنْ عُقِبِيَ الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفَىٰ بِإِلَهِهِ شَهِيدًا
بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ لَا مَن عِنْدَهُ عِلْمَ الْكِتَابِ ﴿۴۳﴾

اور بلاشبہ ان لوگوں نے تدبیریں کیں جو ان سے پہلے تھے، سو اصل تدبیر تو سب اللہ ہی کی ہے، وہ جانتا ہے جو کچھ ہر شخص کر رہا ہے اور عنقریب کفار جان لیں گے کہ اس گھر کا اچھا انجام کس کے لیے ہے ﴿۴۲﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، کہتے ہیں تو کسی طرح رسول نہیں ہے۔ کہہ دے میرے درمیان اور تمہارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے اور وہ شخص بھی جس کے پاس کتاب کا علم ہے ﴿۴۳﴾

ذرہ برابر دیر نہیں لگتی بلکہ قیامت کے دن پل بھر میں سارا حساب سامنے آ جائے گا۔

آیت 42: وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ : یعنی ان سے پہلے کفار نے بھی اپنے رسولوں کو ستانے اور اسلام کو نچا دکھانے کی بہت تدبیریں کیں، یہ کوئی نئی بات آپ ہی کو پیش نہیں آ رہی، پھر کوئی تدبیر اللہ کی مشیت کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتی، کیونکہ اختیار ہر چیز کا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ سو اگر ان کی کوئی تدبیر کامیاب ہوئی تو وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی کا تقاضا تھا، لہذا آپ پریشان نہ ہوں۔ ان کافروں کو بھی بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس دنیا کے گھر کا اچھا انجام کس کے حق میں ہوتا ہے۔

آیت 42: ﴿۱﴾ لَسْتَ مُرْسَلًا: ”مُرْسَلًا“ کی تنوین کی وجہ سے ترجمہ ”کسی طرح رسول“ کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمَ الْكِتَابِ: یعنی یہود و نصاریٰ کے علماء جیسے عبد اللہ بن سلام، سلمان فارسی، تمیم داری رضی اللہ عنہم اور ان میں سے دوسرے ایمان لانے والے۔ اہل کتاب کے علماء کی طرف رجوع کا حکم اس لیے دیا کہ مشرکین رسول اللہ ﷺ کے معاملے میں عموماً انہی کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان کے علماء آپ ﷺ کی صفات اور آپ کے متعلق بشارتوں سے آپ کے سچا رسول ہونے کو خوب سمجھتے تھے، جیسے فرمایا: ﴿يَعْرِفُونَ كَمَا يَفْرُقُونَ أَيْتَانَهُمْ﴾ [البقرة: ۱۴۶] ”وہ آپ کو پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔“ مزید دیکھیے سورہ اعراف (۱۵۷) اور شعراء (۱۹۷)۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾

الرَّسْمِ كَتَبَ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴿۱﴾ اللَّهُ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْكَٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الز۔ ایک کتاب ہے جسے ہم نے تیری طرف نازل کیا ہے، تاکہ تو لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لائے، ان کے رب کے نون سے، اس کے راستے کی طرف جو سب پر غالب، بے حد تعریف والا ہے ﴿۱﴾ اس اللہ کے (راستے کی طرف) کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور کافروں کے لیے سخت عذاب کے باعث بڑی ہلاکت ہے ﴿۱﴾

آیت 2.1 ﴿۱﴾ الز: حروف مقطعات کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی پہلی آیت۔

﴿۲﴾ كَتَبَ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ: ”کِتَبَ“ کو ”الز“ کی خبر بنائیں تو معنی ہوگا کہ ”الز“ ایک کتاب ہے، یعنی وہ حروف مجہی جن سے تمہارا کلام وجود میں آتا ہے، انہی سے یہ کتاب وجود میں آئی ہے، اگر مقابلے کی ہمت ہے تو آؤ انہی حروف سے تم صرف ایک صورت ہی بنا دو۔ ایک صورت یہ ہے کہ اسے مبتدا محذوف ”هَذَا“ کی خبر بنالیں، پھر معنی ہوگا، یہ ایک کتاب ہے۔ ”نازل کیا“ کے لفظ سے اس کا بلندی سے اترنا اور اللہ تعالیٰ کا بلندی پر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ معلوم ہوا اللہ تعالیٰ کو نہ لامکان کہہ سکتے ہیں اور نہ ہر جگہ میں کہہ سکتے ہیں، بلکہ وہ بلند ہے، عرش پر ہے۔ ”ہم نے اسے آپ کی طرف نازل کیا“ سے اس کی عظمت ظاہر ہو رہی ہے۔

﴿۱﴾ لِتُخْرِجَ النَّاسَ: یعنی یہ کتاب آپ پر نازل کی، تاکہ آپ اس کے ذریعے سے لوگوں کو گمراہی سے نکالیں۔ معلوم ہوا کہ مکرین حدیث جو کتاب یعنی قرآن ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور رسول کو محض ڈاکیا قرار دیتے ہیں ان کی بات درست نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب نازل فرما کر اس میں بار بار رسول کے اتباع اور اطاعت کا حکم دیا ہے، مثلاً دیکھیے آل عمران (۳۱، ۳۲)۔

﴿۱﴾ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ: یعنی کفر کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی کی طرف۔ ”إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ“ یہ ”إِلَى النُّورِ“ ہی سے بدل ہے اور اسی کی وضاحت ہے، یعنی وہ نور کیا ہے، اس عزیز و حمید کا راستہ ہے جس کا نام نامی اللہ ہے، وہ جو زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب کا اکیلا مالک ہے۔ لفظ ”الظُّلُمَاتِ“ کو جمع اور ”النُّورِ“ کو واحد لانے سے صاف ظاہر ہے کہ نور یعنی راہ ہدایت صرف ایک ہے یعنی اسلام، جبکہ تاریکیاں اور گمراہیاں بے شمار ہیں جو سب کی سب کفر کی مختلف صورتیں ہیں۔

﴿۱﴾ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ: اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ کوئی مبلغ، چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، لوگوں کو اگر اسلام کی سیدھی راہ کی طرف لاسکتا ہے تو اللہ ہی کی دی ہوئی توفیق سے لاسکتا ہے۔ ابوطالب، آزر، ابن نوح اور نوح و لوط علیہم السلام کی بیویاں اس کی

الَّذِينَ يَسْتَجِبُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا
أُولَئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ⑤ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ
اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ⑥ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ⑦

وہ جو دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں بہت زیادہ محبوب رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی
ڈھونڈتے ہیں، یہ لوگ بہت دور کی گمراہی میں ہیں ⑤ اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں،
تاکہ وہ ان کے لیے کھول کر بیان کرے، پھر اللہ گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور
وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ⑥

واضح مثالیں ہیں کہ رب کا اذن نہ ہونے کی وجہ سے کفر کے اندھیروں سے نہیں نکل سکے۔

⑥ وَوَيْلٌ لِّلْكَافِرِينَ: "وین" پر تین تخطیم کی ہے، معنی ہے بڑی ہلاکت، یعنی دنیا میں بھی ان کے لیے بربادی ہی بربادی
ہے۔ (دیکھیے توبہ: ۵۵۔ طہ: ۱۲۳ تا ۱۲۷) اور قیامت کے دن تو ان کی اس سے بھی بڑھ کر شامت آنے والی ہے۔ دنیا میں
کفار کے لیے "وین" کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ خودکشی کی شرح آپ سب سے زیادہ کفار میں پائیں گے، خصوصاً جو
ان میں زیادہ تر ترقی یافتہ ہیں، مثلاً جاپان وغیرہ۔

آیت 3 ① الَّذِينَ يَسْتَجِبُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ: سین اور تا، کے اضافے سے معنی میں اضافہ
ہو گیا، یعنی اللہ تعالیٰ کو تو آخرت کے مقابلے میں دنیا کو محبوب رکھنا ہی پسند نہیں جبکہ یہ کفار آخرت کے مقابلے میں دنیا کو بہت
زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دنیا کی چیزوں سے محبت اس وقت بربادی کا باعث ہے جب وہ اللہ کی محبت کے مقابلے
میں غالب ہو، ورنہ دنیا سے فائدہ مومن کے لیے بھی جائز ہے، بلکہ اللہ کی محبت کے تحت اور اس کے احکام کے تحت اپنے
بیوی بچوں، دوستوں اور مال وغیرہ سے محبت فطری چیز ہے اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے اجرماتا ہے۔ اس کے برعکس رہبانیت
اس فطرت سے جنگ ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

② وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ.....: یعنی اللہ کی راہ جو بالکل سیدھی اور بے عیب ہے، کافر اس میں عیب نکالنے کی کوشش
کرتے ہیں اور اسے ٹیزھی بتاتے ہیں، تاکہ لوگوں کو اس کے اختیار کرنے سے باز رکھ سکیں۔ (ابن کثیر)

آیت 4 ① لِيُبَيِّنَ لَهُمْ: تاکہ وہ ان کے لیے کھول کر بیان کرے اور وہ اچھی طرح سمجھ سکیں اور ان پر حجت قائم ہو سکے۔
رسول اللہ ﷺ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے گئے وہ اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے، وہ پیغمبر اس قوم کا ایک فرد ہوتا تھا اور وہ انہی کی
زبان بولتا تھا، آپ ﷺ کی بعثت گو عام ہے اور قیامت تک کے تمام جن و انس کے لیے ہے، لیکن آپ کی قوم، جس میں
آپ ﷺ پیدا ہوئے اور جو آپ ﷺ کی اولین مخاطب تھی، عربی زبان بولتی تھی، اس لیے طبعی ترتیب کے مطابق آپ نے ان

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُمْ بِآيَاتِنَا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَلِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ⑤

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال اور انہیں اللہ کے دن یاد دلا، بلاشبہ اس میں ہر ایسے شخص کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو بہت صبر کرنے والا، بہت شکر کرنے والا ہے ⑤

کو اللہ کا پیغام عربی زبان میں پہنچایا، مقصد یہ تھا کہ پہلے یہ قوم اس پیغام کو سمجھے اور پھر اسے دوسروں تک پہنچانے اور سمجھانے کا ذریعہ بنے۔ اگر قرآن تمام زبانوں میں نازل کیا جاتا تو تنازع، اختلاف اور تحریف احکام کے دروازے کھل جاتے اور دعوت اسلام کے لیے کسی مقام پر بھی مرکزیت قائم نہ ہو سکتی۔ عربی زبان میں نازل ہونے کے بعد دوسری اقوام کا عربی سیکھنا (جو تمام زبانوں سے آسان ہے) یا اس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو جانا تمام اقوام کی ہدایت کے لیے کافی ہے، جیسا کہ الحمد للہ ہو رہا ہے۔

② فَيُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ..... یعنی گو ہر پیغمبر اپنی دعوت اسی زبان میں پیش کرتا ہے جسے ساری قوم سمجھتی ہے، تاہم ہدایت و ضلالت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہی میں پڑا رہنے دیتا ہے۔ آج بھی بہت سی عجمی قومیں اسلام کی حامی اور مددگار نظر آتی ہیں اور عرب ممالک باوجود عربی زبان کی خدمت و اشاعت کے اسلام سے منحرف اور دور ہو رہے ہیں۔ (الا ماشاء اللہ)

آیت 5 ① وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا..... اللہ تعالیٰ نے شروع سورت میں ہمارے نبی ﷺ کی طرف نازل کردہ کتاب کا ذکر فرمایا اور اس کا مقصد بتایا کہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالیں۔ اب پہلے انبیاء کی اپنی اقوام کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لانے کی کوششوں اور ان کی اقوام کے سلوک کا ذکر فرمایا۔ سب سے پہلے موسیٰ ﷺ کا، پھر دوسری اقوام اور ان کے رسولوں کا ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ ﷺ کو کچھ آیات کو نبی عطا فرمائیں، یعنی کائنات کے معمول کے خلاف معجزے، جن کے مقابلے سے دشمن عاجز تھا۔ جن میں سے چند کا تعلق فرعون اور اس کی قوم سے تھا، مثلاً عصائے موسیٰ، ید بیضاء (طہ: ۱۷ تا ۲۲)، قحط سالی، پھلوں کی کمی، طوفان، نڈیاں، جوئیں، مینڈک اور خون۔ (اعراف: ۱۳۳) یہ سب معجزے نبوت کی دلیل کے طور پر دیے گئے، کیونکہ مخاطب فرعون بے حد ضدی، سرکش، خدائی کا دعوے دار اور نہایت بے رحم تھا۔ جب کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو نبوت کی دلیل کے طور پر صرف ایک معجزہ ”قرآن“ عطا ہوا، باقی تمام معجزات برکت اور اہل ایمان کا ایمان بڑھانے کے لیے تھے۔ موسیٰ ﷺ کے کئی معجزوں کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا، مثلاً سمندر کا پھٹنا، فرعون سے نجات، بادلوں کا سایہ، من و سلوئی کا اترنا، بارہ چشمے پھوٹنا، پہاڑ اکھیر کر عبد لیا جانا، گائے کا گوشت لگنے سے مردے کا زندہ ہونا وغیرہ اور کچھ وحی الہی کی آیات تھیں جنہیں ”تزیلی آیات“ کہتے ہیں۔ موسیٰ ﷺ پر سب سے پہلی وحی تورات سے بہت پہلے مدین سے واپسی پر

وَ إِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجَاكُمْ مِنْ اِلِ فِرْعَوْنَ
يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَ يُدْبِحُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۱

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب اس نے تمہیں فرعون کی آل سے نجات دی، جو تمہیں برا عذاب دیتے تھے اور تمہارے بیٹے بری طرح ذبح کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی ①

اتری، پھر اسی طرح کسی کتابی صورت کے بغیر سالہا سال اترتی رہی۔ فرعون اسی وحی کے احکام کی نافرمانی کی وجہ سے غرق ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو طور پر بلا کر تورات عطا فرمائی۔ غرض موسیٰ علیہ السلام کو تو آیات کے علاوہ بھی بہت سی آیات عطا فرمائیں، کیونکہ دشمن نہایت سخت تھا اور اپنی قوم خونے غلامی کی وجہ سے بے حد متلون مزاج، کافرانہ عقائد و رسوم سے متاثر اور بار بار مطالبے کرنے والی تھی۔ اور تقریباً سترہ آیات (نشانوں) کا ذکر ہوا ہے، مقصد سب کا یہی تھا کہ وہ فرعون کو اور اپنی قوم کو کفر کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی کی طرف نکالیں۔

② وَذِكْرُهُمْ يَا أَيُّهَا اللَّهُ.....: ”اٰیام“ سے مراد وہ دن ہیں جن میں کوئی نادر واقعہ مصیبت یا نعمت کی صورت میں پیش آیا ہو، جیسے یوم بدر وغیرہ۔ ”اٰیام“ کی اللہ کی طرف اضافت سے ان کی اہمیت بے حد بڑھ گئی۔ اگلی آیت میں چند ”اٰیام“ کا ذکر ہے، مگر ان واقعات سے عبرت صرف انھی کو ہوتی ہے جو بہت صابر اور بہت شاکر ہوں، کیونکہ ہر نیکی کی بنیاد صبر ہے اور شکر بھی اسی کو نصیب ہوتا ہے جو صابر ہو، شکوہ شکایت اور بے صبری کرنے والوں کو شکر کی توفیق کہاں؟

آیت 6: ① وَ اِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا.....: یہاں موسیٰ علیہ السلام چند نعمتیں گنوارے ہیں۔ ”يَسُوْمُوْنَكُمْ“ کے بعد ”وَ يُدْبِحُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ“ میں واو عطف سے معلوم ہوا کہ وہ لڑکوں کو ذبح کرنے اور عورتوں کو زندہ رکھنے کے علاوہ اور بھی کئی بدترین عذاب دیتے تھے، مثلاً بیگار لینا، ذلیل کرنا اور مار پیٹ وغیرہ۔

② وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ: ”بلاؤ“ کا لفظ مصیبت پر بھی آتا ہے اور نعمت پر بھی، فرمایا: ﴿ وَ تَبْلُوْنَهُ بِالْغَنْرِ وَالْحَيْرِ فِتْنَةً ﴾ [الانبیاء: ۳۵] ”اور ہم تمہیں برائی اور بھلائی میں مبتلا کرتے ہیں، آزمانے کے لیے۔“ آل فرعون کے عذاب بلائے مصیبت تھے اور ان سے نجات بلائے نعمت تھی، عذاب بھی آزمائش اور اس سے رہائی کا انعام بھی آزمائش۔ ”ذٰلِكُمْ“ سے اشارہ ”سُوْءَ الْعَذَابِ“ کی طرف ہو تو مصیبت کے ساتھ آزمائش مراد ہے اور ”اِذْ اَنْجَاكُمْ“ یعنی نجات کی طرف ہو تو نعمت کے ساتھ آزمائش مراد ہوگی اور قرآن کا اعجاز ہے کہ آیت کے ایک لفظ میں دونوں چیزیں آگئی ہیں۔

وَ إِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ﴿۷﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ إِنَّ تَكْفُرُوا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَسِيدٌ ﴿۸﴾

اور جب تمہارے رب نے صاف اعلان کر دیا کہ بے شک اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور ہی تمہیں زیادہ دوں گا اور بے شک اگر تم ناشکری کرو گے تو بلاشبہ میرا عذاب یقیناً بہت سخت ہے ﴿۷﴾ اور موسیٰ نے کہا اگر تم اور وہ لوگ جو زمین میں ہیں، سب کے سب کفر کرو تو بے شک اللہ یقیناً بڑا بے پروا، بے حد تعریف والا ہے ﴿۸﴾

تیت 7 ﴿۱﴾ وَ إِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ : ”آذَنٌ يُؤذِنُ“ کا معنی اطلاع دینا، اعلان کرنا ہے۔ باب تفعّل میں جانے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، اس لیے ترجمہ کیا ہے ”صاف اعلان کر دیا۔“

﴿۲﴾ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ : کیونکہ کسی کے بھی احسان کی قدر دانی اور اس کا شکریہ ادا کرنے سے اس کے ساتھ تعلق بڑھتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کا تو کہنا ہی کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَلَا شَخْصٌ أَحَبُّ إِلَيْهِ الْمَذْحَجَةُ مِنَ اللَّهِ، مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ وَعَدَّ اللَّهُ الْخَنَةَ» [مسلم، اللعان: ۱۶۹۹] ”کوئی شخص ایسا نہیں جسے اللہ تعالیٰ سے زیادہ اپنی تعریف پسند ہو، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کیا ہے۔“ جب اللہ تعالیٰ کو زبانی شکر اتنا پسند ہے تو عملاً شکر اور اطاعت پر اس کی نوازش کس قدر ہوگی۔ ﴿۳﴾ وَلَئِن كَفَرْتُمْ : اس کا جواب تو یہ تھا ”لَأُعَذِّبَنَّكُمْ“ کہ اگر تم کفر کرو گے تو میں تمہیں ضرور عذاب دوں گا، مگر اسے حذف کر کے ایسا جملہ استعمال فرمایا جو اس جملے کا مفہوم بھی ادا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کی نہایت شدت کو بھی، یعنی فرمایا: ﴿وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾ اور یہ بھی قرآن کا آغاز ہے۔

تیت 8 ﴿۱﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ إِنَّ تَكْفُرُوا : یعنی اگر تم اور زمین و آسمان کے تمام لوگ ناشکری کرو تو اس ناشکری کا نقصان خود بھی کو پہنچے گا، اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑے گا، اسے نہ تمہارے شکر کی ضرورت ہے اور نہ تمہاری ناشکری کی پروا۔ اس کی ذات ہر تعریف کی حامل ہے، چاہے کوئی اس کی تعریف کرے یا نہ کرے۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما حدیث قدسی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَا عِبَادِي! لَوْ أَنَّ أَوْلَكُمْ وَأَجْرَكُمْ، وَإِنْسَكُمْ وَجَنَّتُمْ، سَكَنُوا عَلَىٰ أُنْقَىٰ قَلْبِ رَجُلٍ وَاجِدٍ مِنْكُمْ، مَا زَادَ ذَلِكَ فِي مُلْكِي شَيْئًا، يَا عِبَادِي! لَوْ أَنَّ أَوْلَكُمْ وَأَجْرَكُمْ، وَإِنْسَكُمْ وَجَنَّتُمْ، سَكَنُوا عَلَىٰ أُنْقَىٰ قَلْبِ رَجُلٍ وَاجِدٍ مِنْكُمْ، مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِنْ مُلْكِي شَيْئًا، يَا عِبَادِي! لَوْ أَنَّ أَوْلَكُمْ وَأَجْرَكُمْ، وَإِنْسَكُمْ وَجَنَّتُمْ، قَامُوا فِي صَعِيدٍ وَاجِدٍ فَسَالُوا نِي، فَأُعْطِيَتْ كُلُّ إِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهُ، مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِنِّي شَيْئًا إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْجِلَ الْبَحْرَ» [مسلم، البر والصلة، باب تحريم الظلم: ۲۵۷۷] ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے میرے بندو! اگر تمہارے پہلے، تمہارے پچھلے اور تمہارے انسان اور تمہارے جن تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والے آدمی کے دل والے ہو جائیں تو یہ چیز میری سلطنت میں کسی شے کا اضافہ نہیں کرے گی اور اے میرے بندو! اگر تمہارے پہلے اور تمہارے پچھلے، تمہارے انسان اور تمہارے جن تم میں سب سے زیادہ فاجر شخص کے دل والے ہو جائیں تو یہ چیز میری

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَ عَادٍ وَ ثَمُودَ وَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ۗ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَ إِنَّا لَنَعْلَمُ شَيْئًا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ ۖ قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ

کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے، نوح کی قوم کی (خبر) اور عاد اور ثمود کی اور ان کی جو ان کے بعد تھے، جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ان کے رسول ان کے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہوں میں لوٹا لیے اور انہوں نے کہا بے شک ہم اسے نہیں مانتے جو تم دے کر بھیجے گئے ہو اور بے شک ہم تو اس چیز کے بارے میں جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو، ایک بے چین رکھنے والے شک میں مبتلا ہیں ① ان کے رسولوں نے کہا کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟

سلطنت میں کسی شے کی کمی نہیں کرے گی اور اسے میرے بندو! اگر تمہارے پہلے، تمہارے پچھلے اور تمہارے انسان اور تمہارے جن ایک میدان میں کھڑے ہو جائیں، پھر مجھ سے مائیں اور میں ہر شخص کو جو اس نے مانگا ہے دے دوں تو یہ چیز اس میں سے جو میرے پاس ہے کچھ کمی نہیں کرے گی، مگر جتنا سوئی جب وہ سمندر میں داخل کی جائے۔“

آیت 9 ① لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ: یعنی اللہ تعالیٰ ہی ان کی تعداد اور تمام حالات سے واقف ہے اور ان کے نسب کو بھی صحیح طور پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

② فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ: یعنی غصے کے مارے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے، جیسا کہ دوسری آیت میں منافقین کے متعلق فرمایا: ﴿وَإِذَا خَلَوْا عَطَوْا عَلَيْكُمْ الْإِنكَا مِلَ مِنَ الْعَيْظِ﴾ [آل عمران: ۱۱۹] اور (یہ منافقین) جب اکیلے ہوتے ہیں تو تم پر غصے سے انگلیوں کی پوریں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔ یا ہنسی اور تعجب کے مارے منہ پر ہاتھ رکھ لیے، یا ہاتھ منہ کی طرف لے جا کر اشارہ کیا کہ بس چپ رہو۔ پہلے معنی کو اکثر مفسرین نے ترجیح دی ہے، ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ہاتھ رسولوں کے منہ پر رکھ دیے کہ وہ خاموش رہیں۔

③ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ.....: ”بمّا أُرْسِلْتُمْ بِهِ“ کے الفاظ سے معلوم ہوا کہ پیغمبروں کی نشانیاں دیکھ کر وہ یہ ضرور جان چکے تھے کہ ان رسولوں کو یہ معجزے دے کر بھیجا گیا ہے، یہ رسول خود یہ معجزے نہیں لے آئے۔ اس لیے اگرچہ انہوں نے توحید کی دعوت ماننے سے انکار کر دیا، مگر اپنے کفر پر بھی ان کا یقین متزلزل ہو گیا اور انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری دعوت کے بارے میں ایک بے چین رکھنے والے شک میں مبتلا ہیں۔

آیت 10 ① قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ.....: رسولوں نے یہاں کوئی منطقی و فلسفی بحث نہیں چھیڑی، بلکہ ان کی فطرت کو جھنجھوڑا کر ہر شخص سمجھتا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز حتیٰ کہ سوئی یا کوئی کھلونا بھی بنانے والے کے بغیر نہیں بنتا۔ رازی نے اس کی ایک مثال دی کہ دو بچوں میں سے ایک بچہ دوسرے کو پیچھے سے سر پر ایک چپٹ لگا کر چھپ جائے تو وہ کبھی یہ نہیں مانے گا

شَكُّ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ ۖ مِنْ ذُنُوبِكُمْ ۖ وَيُخْرِكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۖ تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا ۖ فَأَتُونَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٥﴾

تمہیں اس لیے بلاتا ہے کہ تمہارے لیے تمہارے کچھ گناہ بخش دے اور تمہیں ایک مقرر مدت تک مہلت دے۔ انہوں نے کہا تم نہیں ہو مگر ہمارے جیسے بشر، تم چاہتے ہو کہ ہمیں اس سے روک دو جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے، تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لاؤ ﴿٥﴾

کہ یہ چیت خود بخود لگ گئی ہے، بلکہ اسے یقین ہو گا کہ یہ کسی نے ماری ہے۔ تو کسی بھی کام کے خود بخود ہو جانے کو تو ایک بچے کی فطرت بھی تسلیم نہیں کرتی، تو عاقل و بالغ ہو کر تمہیں اس اللہ کے متعلق شک ہے جس نے اتنے عظیم آسمان و زمین بنائے، جن کے مقابلے میں تمہارا بنانا کچھ بھی مشکل نہیں کہ وہ اللہ ہے بھی یا نہیں؟ اور ایک ہے یا کئی ہیں؟ ”شَكُّ“ کی تینوں تکبیر کے لیے ہے، یعنی کیا اللہ کے بارے میں کوئی بھی شک ہے؟ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی اس کے متعلق کسی قسم کے شک کی تو محجاش ہی نہیں۔

﴿٥﴾ مِنْ ذُنُوبِكُمْ: ”من“ معیض کے لیے ہے، یعنی تاکہ تمہارے بعض یا کچھ گناہ بخش دے۔ مطلب یہ ہے کہ اسلام لانے سے پہلے کے گناہ اسلام لانے سے معاف ہو جائیں گے، آئندہ کے گناہ تمہارے عمل اور توبہ کے مطابق دیکھے جائیں گے۔ کفار کے گناہوں کی معافی کا ذکر ہر جگہ ”من“ (بعض) کے ساتھ آیا ہے، جیسا کہ یہاں اور سورہ نوح اور احقاف میں ہے، البتہ اہل ایمان کی مغفرت کا ذکر ”مِنْ“ کے بغیر ہے، جیسا کہ سورہ صف میں جہاد کا اجر بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ [الصف: ۱۲] ”وہ تمہیں تمہارے گناہ بخش دے گا۔“

﴿٥﴾ وَيُخْرِكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى: یعنی دنیا میں موت کے وقت تک تمہیں عذاب سے محفوظ رکھے۔ (قرطبی)

﴿٤﴾ قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا: یعنی تم ظاہری شکل و صورت میں، کھانے پینے میں اور دوسری انسانی ضروریات کے اعتبار سے ہمارے جیسے بشر ہو، ہم اپنے آپ پر تمہاری برتری کیسے تسلیم کر لیں۔ مقصد تمہارا ہمیں ہمارے آبا و اجداد کے معبودوں کی عبادت سے روکنا ہے۔ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ یہی کفار جو دین اور آخرت کے معاملے میں اپنے آباء کی تقلید کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے توحید سے انکار پر اصرار کر رہے ہیں، اتنا سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ دنیا کے کاموں میں بھی وہ آباء کی تقلید کرتے تو دنیا کے ہر دور میں انہوں نے جو ترقی کی، حتیٰ کہ اب ایٹم بم تک پہنچ گئے، یہ ترقی کبھی نہ ہو سکتی، مگر ان کی ڈھٹائی دیکھو کہ انبیاء کے واضح معجزات دیکھ کر اور ”أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ جیسی لاجواب دلیلیں سن کر کبھی، جنہوں نے انہیں اندر سے ہلا دیا اور وہ اپنے بے چین رکھنے والے شک کا خود اقرار کر رہے ہیں، تقلید پر اڑے ہوئے ہیں اور مزید واضح دلیل کا مطالبہ کر رہے ہیں، مگر دنیوی معاملات میں وہ آباء کی تقلید پر اکتفا کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ هُنَّ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۗ
 وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَعَلَىٰ اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۱﴾
 وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَىٰ اللَّهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا ۗ وَنُضَيِّرَنَّ عَلَىٰ مَا آدٰتِنَا وَمَا آدٰتِنَا
 اللَّهُ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿۱۲﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ أَرْضِنَا
 أَوْ نَعُودَنَّ فِي مِلَّتِنَا ۗ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ ﴿۱۳﴾

ان کے رسولوں نے ان سے کہا ہم نہیں ہیں مگر تمہارے جیسے بشر اور لیکن اللہ احسان کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اور ہمارے لیے کبھی ممکن نہیں کہ تمہارے پاس کوئی دلیل اللہ کے اذن کے سوا لے آئیں اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں ﴿۱۱﴾ اور ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسا نہ کریں، حالانکہ اس نے ہمیں ہمارے راستے دکھا دیے ہیں اور ہم ہر صورت اس پر صبر کریں گے جو تم ہمیں تکلیف پہنچاؤ گے اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ بھروسا کرنے والے بھروسا کریں ﴿۱۲﴾ اور ان لوگوں نے جنھوں نے کفر کیا، اپنے رسولوں سے کہا ہم ہر صورت تمہیں اپنی زمین سے نکال دیں گے، یا لازماً تم ہماری ملت میں واپس آؤ گے، تو ان کے رب نے ان کی طرف وحی کی کہ یقیناً ہم ان ظالموں کو ضرور ہلاک کریں گے ﴿۱۳﴾

آیت 11 ﴿۱۱﴾ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ : معلوم ہوا دلیل دیکھنے سے ایمان نہیں آتا، اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے آتا ہے۔ (موضح)

﴿۱۲﴾ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبوت سراسر وہی، یعنی اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ اس کے لائق افراد کا انتخاب وہ خود کرتا ہے، فرمایا: ﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِيٰ مِنْ فِرْسٰلِهِ مَن يَشَاءُ﴾ [آل عمران: ۱۷۹] ”اور لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔“ نبوت کسی کو محنت اور ریاضت سے حاصل نہیں ہوتی، جیسا کہ بعض گمراہ لوگوں کا خیال ہے، جن میں قادیانی وہال بھی شامل ہے۔

﴿۱۳﴾ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ : یعنی معجزات ہمارے اختیار میں نہیں، وہ اللہ کے حکم کے بغیر ظاہر نہیں ہوتے، اس لیے ہمارا بھروسا اللہ ہی پر ہے اور تمام اہل ایمان کو اسی پر بھروسا لازم ہے۔

آیت 12 ﴿۱۲﴾ وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَىٰ اللَّهِ : یعنی اللہ تعالیٰ نے جب ہمیں ہدایت دے دی تو اس کے بعد ہمارے پاس کیا عذر ہے کہ ہم اس کے بھروسے پر استقامت اختیار نہ کریں۔ رہا تمہارا ہمیں ایذا دینا تو ہم ہر حال میں اس پر صبر کریں گے اور اپنے رب پر بھروسا رکھیں گے، کیونکہ بھروسا رکھنے والوں کو اسی پر بھروسا رکھنا لازم ہے۔

آیت 13 ﴿۱۳﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ أَرْضِنَا : کفار نے اپنی کثرت اور اہل ایمان کی قلت

وَلَسْئَلُكُمْ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ذَٰلِكَ لِئَن يَخَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ ﴿۱۴﴾
وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿۱۵﴾

اور یقیناً ان کے بعد ہم تمہیں اس زمین میں ضرور آباد کریں گے، یہ اس کے لیے ہے جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور میری وعید سے ڈرا ﴿۱۴﴾ اور انہوں نے فیصلہ مانگا اور ہر سرکش، سخت عنادر کھنے والا نامراد ہوا ﴿۱۵﴾

دیکھ کر اپنے رسولوں کو یہ دھمکی دی کہ تمہارے سامنے صرف دو راستے ہیں یا تو ہم تمہیں اپنی زمین سے نکال دیں گے، یا پھر تم اسلام چھوڑ کر واپس آ جاؤ گے، جیسا کہ اس وقت ہند کے کافر مسلمانوں کو قتل یا ارتداد یا نکل جانے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ ﴿۲﴾ اَوْ لَتَعُوذُنَّ فِي مِلَّتِنَا: ”یا تم ہماری ملت میں واپس آؤ گے“ کفار کا یہ کہنا ان کے اپنے گمان کے مطابق تھا، ورنہ یہ مطلب نہیں کہ انبیاء ﷺ نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے اپنی گمراہ قوم کے دین کی پیروی کرتے تھے، بلکہ بات یہ تھی کہ نبوت سے پہلے انبیاء ﷺ ان کے بتوں کے معاملہ میں خاموش رہتے تھے، جس پر انہوں نے بطور خود یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ ان کے مذہب پر ہیں، یا اس ”لَتَعُوذُنَّ“ کا معنی ”لَتَصَيِّرُنَّ“ ہے، یعنی تم ہماری ملت میں آ جاؤ گے۔ (دیکھیے اعراف: ۸۸) یا خطاب ان لوگوں سے ہے جو کفر کو چھوڑ کر پیغمبروں پر ایمان لے آئے تھے۔ (رازی)

آیت 14 وَلَسْئَلُكُمْ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے انہیں حوصلہ دیا کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کریں گے اور اس سرزمین پر تمہیں آباد کریں گے۔ انبیاء کے پیروکاروں کا آخر کار کفار کے علاقوں پر قابض ہونا بھی درحقیقت انبیاء ہی کا غلبہ ہے، جیسا کہ نبی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے ایک مدت بعد شام اور مصر وغیرہ پر قابض ہوئے، فرمایا: ﴿كَذَٰلِكَ وَأَوْزَنُهَا بَيْنِي وَإِسْرَائِيلَ﴾ [النساء: ۵۹] ”ایسے ہی ہوا اور ہم نے ان کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔“ اور مسلمان اگرچہ نبی ﷺ کی زندگی ہی میں جزیرہ عرب پر قابض ہو گئے تھے، جیسا کہ یہود کے متعلق فرمایا: ﴿وَأَوْزَكْنَاهُمْ وَدْيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْصَالَهُمْ تَطَلَّوْهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا﴾ [الأحزاب: ۲۷] ”اور (اے مسلمانو!) تمہیں ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا وارث بنا دیا اور اس زمین کا بھی جس پر تم نے قدم نہیں رکھا تھا اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“ مگر زمین کے مشارق و مغارب کی فتوحات آپ ﷺ کی وفات کے بعد ہوئیں اور یہ بھی درحقیقت نبی ﷺ ہی کی فتوحات تھیں، کیونکہ ان کے دین اور ان کے پیروکاروں کی فتوحات تھیں۔ ”وَعِيدِي“ اصل میں ”وَعِيدِي“ تھا، ”میری وعید“ آیات کے آخری حصوں کی موافقت کے لیے یا حذف کر کے کسرہ باقی رکھا گیا۔

آیت 15 وَاسْتَفْتَحُوا فتح کا معنی قرآن مجید میں ”فتح و نصرت“ بھی آیا ہے اور ”فیصلہ“ بھی۔ ”اسْتَفْتَحُوا“ کا معنی انہوں نے فتح و نصرت مانگی، یا انہوں نے فیصلہ مانگا اور اس کا قائل پیغمبر بھی ہو سکتے ہیں اور کفار بھی۔ اگر معنی فتح و نصرت ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ پیغمبروں نے بے شمار آزمائشیں آنے پر اپنے رب سے فتح و نصرت کی دعا کی جو قبول ہوئی، فرمایا: ﴿حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصُرُ اللَّهُ؟ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ﴾ [البقرة: ۲۱۴] ”یہاں تک کہ رسول اور

مَنْ وَرَأَيْهِ جَهَنَّمَ وَ يُسْقَى مِنْ نَأْيٍ صَدِيدٍ ۝ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ

اس کے پیچھے جہنم ہے اور اسے اس پانی سے پلایا جائے گا جو پیپ ہے ۝ وہ اسے بمشکل گھونٹ گھونٹ پے گا اور قریب جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے تھے کہ اٹھے، اللہ کی مدد کب ہوگی؟ سن لو بے شک! اللہ کی مدد قریب ہے۔ "اگر "اسْتَفْتَحُوا" کا فاعل کفار ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ "کافروں نے اپنے داتاؤں اور دیگروں سے فتح و نصرت کی دعا مانگی مگر وہ ناکام ہوئے۔" اگر فتح کا معنی فیصلہ ہو تو مطلب ہوگا کہ پیغمبروں اور ان پر ایمان لانے والوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، فرمایا: ﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ﴾ [الأعراف: ۸۹] "اے ہمارے رب! تو ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔" نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سرکش و سخت عناد رکھنے والا ناکام و نامراد ہوا۔ یا مطلب یہ ہے کہ کفار نے اللہ تعالیٰ سے فیصلے کی دعا کی، فرمایا: ﴿وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْأَنْعَقَىٰ مِنْ عُنْدِكَ فَاتِّعَظْ عَلَيْنَا حَجَارَةٌ مِنَ السَّمَاءِ أَوْ آتِنَا بِعَذَابٍ آلِينِي﴾ [الأنفال: ۳۲] "اور جب انھوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر صرف یہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا، یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ۔" "اسْتَفْتَحُوا" کے ان چاروں معنوں میں سے جو معنی بھی کریں وہ درست ہے اور قرآن مجید کے مختلف مقامات پر چاروں معانی موجود ہیں۔ قرآن کا اعجاز دیکھیے کہ ایک ہی لفظ ایسا بولا جو چاروں پر صادق آتا ہے۔ غرض دنیا میں نتیجہ یہ نکلا کہ ہر سرکش اور سخت عناد رکھنے والا کافر ناکام اور نامراد ہوا۔ رہا آخرت کا انجام تو وہ آئندہ آیت میں مذکور ہے۔

آیت 16 مَنْ وَرَأَيْهِ جَهَنَّمَ وَ يُسْقَى مِنْ نَأْيٍ صَدِيدٍ ۝ وَرَأَىٰ کے متعدد معانی آئے ہیں: ① پیچھے یا بعد، جیسے فرمایا: ﴿وَمِنْ وَرَأَىٰ اسْحَقَ يَعْقُوبَ﴾ [ہود: ۷۱] "اور اسحاق کے بعد یعقوب کی بشارت دی۔" ② غیر یعنی سوا، جیسے فرمایا: ﴿فَمَنْ ابْتَدَعَ وَرَأَىٰ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعُدُونَ﴾ [المؤمنون: ۷] "پھر جو اس کے سوا تلاش کرے تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔" ③ آگے، جیسا کہ سورہ کہف (۷۹) میں "وَكَانَ وَرَأَىٰ هُمْ قَبْلَكَ" کا معنی "ان کے آگے ایک بادشاہ تھا" کیا گیا ہے۔ یہاں مراد بعد بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کی ناکامی کے بعد اس کے لیے جہنم ہے اور آگے بھی کہ آئندہ جہنم اس کے انتظار میں ہے۔ "صدید" وہ رقیق پانی جو زخم سے نکلتا ہے، مراد اہل جہنم کے جلنے سے ان کے جسموں سے نکلنے والی پیپ، خون اور رطوبت ہے۔ مزید دیکھیے سورہ ص (۵۷، ۵۸)، محمد (۱۵) اور کہف (۲۹) "نَأْيٍ صَدِيدٍ" مبدل منہ اور بدل ہے، یعنی ایسا پانی جو "صدید" ہوگا۔

آیت 16 ① يَتَجَرَّعُهُ: یہ باب تفعّل سے ہے، جس میں تکلف کا معنی ہوتا ہے، یعنی مشکل سے ایک ایک گھونٹ کر کے اسے پیے گا اور وہ اتنا کڑوا، بذائقہ، بدبودار اور گرم ہوگا کہ قریب نہیں کہ گٹھے سے اتار سکے، مگر یہ اس کا عذاب اسے پینے پر مجبور کرے گا اور اندر جا کر وہ ان کی انتڑیاں کاٹ دے گا۔ دیکھیے سورہ محمد (۱۵)۔

② وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ مَّكَّانٍ مَّكَانٍ.....: اور ہر جگہ سے اسے موت آتی دکھائی دے گی، کیونکہ جہنم کی ایک ایک چیز موت کے لیے کافی ہے، مگر وہ کسی صورت مرنے والا نہیں، کیونکہ وہاں موت ہوگی ہی نہیں۔ "مَعِيَّتِ" کی باء سے نفی کی تاکید ہوئی، اس

مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَ مَا هُوَ بِمَيَّتٍ ۚ وَ مِنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ ﴿۱۷﴾ مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ
 أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ۚ لَا يَقْدِرُونَ بِمَا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ
 ذَلِكَ هُوَ الصَّلُّ الْبُعِيدُ ﴿۱۸﴾

نہ ہوگا کہ اسے طلق سے اتارے اور اس کے پاس موت ہر جگہ سے آئے گی، حالانکہ وہ کسی صورت مرنے والا نہیں
 اور اس کے پیچھے ایک بہت سخت عذاب ہے ﴿۱۷﴾ ان لوگوں کی مثال جنھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، ان کے
 اعمال اس راگھ کی طرح ہیں جس پر آندھی والے دن میں ہوا بہت سخت چلی۔ وہ اس میں سے کسی چیز پر قدرت نہ
 پائیں گے جو انھوں نے کمایا، یہی بہت دور کی گمراہی ہے ﴿۱۸﴾

لیے ترجمہ میں ”کسی صورت“ کا اضافہ ہو گیا۔ دیکھیے سورہ فاطر (۳۶) اور سورہ اعلیٰ (۱۳)۔

﴿۱۷﴾ وَ مِنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ : یعنی اس کے بعد اور سخت عذاب ہے۔ اب اس کی مختلف صورتیں تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے،
 جن میں سے بہت سی چیزیں قرآن و حدیث میں مذکور ہیں، البتہ عذاب کے طور پر مسلط ہونے والی بھوک اور زقوم کے کھانے
 کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے، فرمایا: ﴿إِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّومِ طَعَامُ الْأَثِيمِ ۖ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ۖ لَغَلِي الْحَمِيمِ ۖ
 خَذُوهُ قَاعًا مُلْتَوًى إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۖ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ۖ ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ۖ﴾
 [الدخان : ۴۳ تا ۴۹] ”بے شک زقوم کا درخت۔ گناہ گار کا کھانا ہے۔ پچھلے ہوئے تانبے کی طرح، پیٹوں میں کھولتا ہے۔
 گرم پانی کے کھولنے کی طرح۔ اسے پکڑو، پھر اسے بھڑکتی آگ کے درمیان تک دھکیل کر لے جاؤ۔ پھر کھولتے پانی کا کچھ
 عذاب اس کے سر پر اٹھایو۔ پکھ، بے شک تو ہی وہ شخص ہے جو بڑا زبردست، بہت باعزت ہے۔“

جہنم کے سخت عذاب کا اندازہ دنیا میں کسی طرح نہیں ہو سکتا جس کی آگ ہی یہاں کی آگ سے ستر (۷۰) گنا گرم ہے،
 البتہ جہنم کے سب سے کم عذاب کا بیان جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، اس سے سخت عذاب کا کچھ نہ کچھ اندازہ کر لیں، حقیقی
 علم تو ممکن ہی نہیں، نہ وہ بیان میں آ سکتا ہے۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ أَهْلَ
 أَهْلِ النَّارِ عَذَابًا مِنْ لَهْ نَعْلَانٍ وَ شِرَاكَاةٍ مِنْ نَارٍ، يَغْلِي مِنْهُمَا دِمَاعُهُ، كَمَا يَغْلِي الْبُرْجُلُ مَا يَرَىٰ أَنْ أُخْذَا
 أَشَدُّ مِنْهُ عَذَابًا، وَ إِنَّهُ لَأَهْوَنُهُمْ عَذَابًا﴾ [مسلم، الإیمان، باب أهل النار عذابا : ۳۶۴ تا ۲۱۳] ”اہل نار میں سب
 سے ہلکے عذاب والا وہ ہوگا جس کے لیے آگ کے دو جوتے اور دو تسمے ہوں گے، ان دونوں سے اس کا دماغ اس طرح ابل
 رہا ہوگا جیسے ہانڈی ابلتی ہے، وہ نہیں خیال کرے گا کہ اس سے زیادہ بھی کسی کو عذاب ہو رہا ہے، حالانکہ وہ ان سب سے کم
 عذاب والا ہوگا۔“ [نعمودُ باللہ من جمیع عذاب الدُّنیا والآخرة]

آیت 18 مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ کفار دنیا میں جو بھی اچھے کام کرتے ہیں، مثلاً کمزوروں کی مدد اور صدقہ
 وغیرہ، وہ آخرت میں ان کے کسی کام نہیں آئیں گے، کیونکہ ان کا بدلا انھیں دنیا ہی میں دیا جا چکا ہوگا۔ (دیکھیے الاحقاف : ۲۰)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۗ إِنَّ يَتَشَاءُ يَذُوبَكُمْ وَ يَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿۱۹﴾ وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ﴿۲۰﴾ وَ بَرَزُوا لِلَّهِ جَبِينًا فَقَالَ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۗ قَالُوا لَوْ هَدَانَا اللَّهُ لَهَدَيْنَاكُمْ ۗ سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجْرَعْنَا أَمْ سَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيصٍ ﴿۲۱﴾

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور ایک نئی مخلوق لے آئے ﴿۱۹﴾ اور یہ اللہ پر ہرگز کچھ مشکل نہیں ﴿۲۰﴾ اور وہ سب کے سب اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، تو کمزور لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جو بڑے بنے تھے کہ بے شک ہم تمہارے تابع تھے، تو کیا تم ہمیں اللہ کے عذاب سے بچانے میں کچھ بھی کام آنے والے ہو؟ وہ کہیں گے اگر اللہ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم تمہیں ضرور ہدایت کرتے، ہم پر برابر ہے کہ ہم گھبرائیں، یا ہم صبر کریں، ہمارے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ﴿۲۱﴾

”عَاصِفٌ“ ”عَصْفٌ يَعِصِفُ“ سے ہے، بمعنی توڑنا۔ ”كَعَصْفٍ مَأْكُولٍ“ کا معنی ہے ریزہ شدہ بھس، یعنی تیز و تند ہوا جو ہر چیز کو توڑتی جائے۔ اس آیت میں قیامت کے دن کفار کے اعمال کے بے کار ہونے کی مثال دی ہے کہ ایک تند و تیز ہوا والے دن میں کسی راکھ پر بہت سخت ہوا چلے تو اس ہوا میں راکھ کا ایک ذرہ بھی ہاتھ میں آنا مشکل ہے، اسی طرح کفار کے اعمال صالحہ اس دن بے کار ہوں گے، کیونکہ ان کا کوئی عمل اس دن کے لیے تھا ہی نہیں، نہ اس دن پر ان کا ایمان تھا۔ مزید دیکھیے سورہ فرقان (۲۳)، کہف (۱۰۶ تا ۱۰۳) اور آل عمران (۱۱)۔

آیت 20-19 ﴿۱۹﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ: ”أَلَمْ تَرَ“ کا معنی ”أَلَمْ تَعْلَمْ“ ہے، یعنی کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، یعنی اس صحیح اندازے کے مطابق جس کے مطابق اسے ہونا چاہیے تھا اور جو اپنے خالق کی کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی کسی چیز میں کوئی نہ نقص نکال سکتا ہے نہ کوئی ایسی صورت پیش کر سکتا ہے جو اس سے بہتر ہو۔ ہاں وہ خود اس سے بھی بہتر بنانے پر پوری طرح قادر ہے۔

﴿۲۰﴾ وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ: اس کے لیے کوئی چیز مشکل نہیں ہے، وہ چاہے تو ایسے کروڑوں عالم دم بھر میں منا کر سننے پیدا کر دے۔ ”وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ“ کا ایک معنی بعض اہل علم نے یہ بھی کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو تم سب کو دفعتاً ختم کر کے تمہیں دوبارہ نئے سرے سے پیدا کر دے۔ آگے آنے والی آیات جو حشر اور قیامت کے واقعات پر مشتمل ہیں اس معنی کی تائید کرتی ہیں۔

آیت 21 ﴿۲۱﴾ وَ بَرَزُوا لِلَّهِ جَبِينًا: ”تَبَعًا“ یہ ”تَابِعٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”تَحَادِمٌ“ کی جمع ”تَحَدِمٌ“ ہے، یعنی اس دن دنیا میں چھپاؤ کی تمام جگہیں ختم ہو جائیں گی۔ پہاڑوں کی بلندیاں، سمندروں کی گہرائیاں اور سطح زمین کی کُردت ختم ہو کر

وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعَدَ الْحَقُّ وَوَعَدْتَكُمْ فَأَخْلَفْتُمْ
وَمَا كَان لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي ۗ فَلَا تَلْمُزُونِي وَتُلْمُزُوا

اور شیطان کہے گا، جب سارے کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا کہ بے شک اللہ نے تم سے وعدہ کیا، سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو میں نے تم سے خلاف ورزی کی اور میرا تم پر کوئی غلبہ نہ تھا، سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں بلایا

روٹی کی طرح صاف زمین پر ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگی۔ دنیا میں کمزور اور طاقت ور مرید و مرشد، رعایا اور سردار ایک جیسی عاجزی اور بے بسی کے ساتھ اللہ کے سامنے ہوں گے، تو کمزور لوگ اپنے گمراہ کرنے والے بڑوں سے کہیں گے کہ ہم تو تمہارے پیچھے چلنے والے تھے اور اس وجہ سے ہم نے انبیاء کو جھٹلایا اور اللہ سے کفر کیا، اب کیا تم اللہ کے عذاب سے بچانے میں ہمارے کسی کام آ سکتے ہو؟ ”مَنْ شِئِيَ“ کا مطلب یہ ہے کہ سارا عذاب نہیں تو اس میں سے جتنا ہو سکے کم کروادو۔ وہ سارا گناہ اللہ کے ذمے ڈال کر خود بری ہو کر ان کی کسی بھی قسم کی مدد سے معذرت کر لیں گے۔ چنانچہ کہیں گے، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم تمہیں ہدایت دیتے، گویا سارا قصور اللہ تعالیٰ کا ہے جس نے ہمیں ہدایت نہیں دی۔ [الغبناء باللہ] جیسا کہ شیطان نے سجدے سے انکار کر کے اپنے گمراہ ہونے کو اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دیا، فرمایا: ﴿ قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي ﴾ [الأعراف: ۱۶] ”کہا، چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا۔“ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو ہدایت دی تھی، دونوں راستے دکھا دیے تھے، فرمایا: ﴿ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ﴾ [الذہر: ۳] ”بلشبہ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ ناشکر۔“ اب تمہارا اختیار تھا، نہ اس نے تمہیں ہدی پر مجبور کیا نہ سبکی پر اور یہی آزمائش کی حکمت جن و انس کی پیدائش کا باعث تھی۔ خیر اب ایسے عذاب میں پھنس جانے کے بعد جس سے بھاگ نکلنے کی کوئی صورت نہیں، ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں، گھبراہٹ کا اظہار کریں یا صبر کریں۔ دونوں کا کچھ فائدہ ہے نہ یہاں سے چھٹکارے کی کوئی صورت ہے۔ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ظاہر یہ ہے کہ ان کی یہ باہمی قتل و قاتل جہنم میں داخلے کے بعد ہوگی۔ دیکھیے سورہ مومن (۴۷)، سورہ اعراف (۲۸) اور سورہ سبأ (۲۲، ۲۳) بہر حال ان کا یہ جھگڑا میدان حشر اور جہنم دونوں میں بھی ہو سکتا ہے۔

آیت 22 ﴿بُضْرِيخُكُمُ﴾: ”بُضْرَاخُ“ کا معنی چیخنا چلانا ہے جو مصیبت سے بچانے کے لیے بطور فریاد دیتا ہے۔ ”أَصْرَاخُ

بُضْرَاخُ“ باب افعال میں ہمزہ ازالہ ماخذ کے لیے ہے، یعنی اس مصیبت کو جو چیخنے کا باعث ہے دور کرنا، جیسے ”شُكَاغِي فَأَشْكِيْتُهُ“ کہ اس نے مجھ سے شکایت کی تو میں نے اس کی شکایت دور کر دی۔ اسی لیے عام طور پر ”بُضْرَاخُ“ کا معنی فریاد اور ”أَصْرَاخُ“ کا معنی فریادِ رسی کر لیا جاتا ہے۔ ”بُضْرِيخُ“ اصل میں ”بُضْرِيحِيْنُ“ جمع مذکر سالم تھا، یاہ تکلم کی طرف مضاف ہوا تو نون اعرابی گر گیا اور یاہ کے یاہ میں ادغام کے ساتھ ”بُضْرِيخِي“ ہو گیا۔

﴿ وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ ﴾: فیصلے کے بعد جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے اور جہنمی جہنم میں اور ہر

أَنْفُسَكُمْ مَا أَنَا بِبُصْرِيكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِبُصْرِي ۗ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِ مِنْ قَبْلُ ۗ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۳۷﴾

تو تم نے فوراً میرا کہنا مان لیا، اب مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو، نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچنے والا ہوں اور نہ تم میری فریاد کو پہنچنے والے ہو، بے شک میں اس کا انکار کرتا ہوں جو تم نے مجھ سے پہلے شریک بنایا۔ یقیناً جو لوگ ظالم ہیں انھی کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۳۷﴾

طرف سے شیطان پر ملامت کی بوجھاڑ ہوگی تو شیطان اس کے جواب میں کہے گا کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ حق تھا، کیونکہ وہ ان تمام چیزوں کا مالک تھا جن کا وعدہ کیا تھا، مثلاً مرنے کے بعد زندہ کرنا، جنت، جہنم اور دعا کی قبولیت وغیرہ، اس لیے اس نے وہ وعدہ پورا کیا اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا وہ جھوٹا تھا کہ اس طرح کرو گے تو یہ ہو جائے گا، داتا کو پکارو گے تو یہ ہوگا، دنگیر کو پکارو گے تو یہ ہوگا، کیونکہ ان میں سے کوئی کسی چیز کا مالک ہی نہ تھا اور جو آرزوئیں میں نے تمہارے دل میں ابھاری تھیں کہ فلاں کی نیاز دینے سے معشوق قدموں میں آگرتا ہے، فلاں کے نام کا بکرا دینے سے دشمن کا ستیاناس ہو جاتا ہے، ان کا وجود ہی نہ تھا۔ فرمایا: ﴿يَعِدُّهُمْ وَيُؤْتِيهِمْ مِمَّا يَدْعُونَهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا عَرُودًا﴾ [النساء: ۱۲۰] ”وہ انھیں وعدے دیتا ہے اور انھیں آرزوئیں دلاتا ہے اور شیطان انھیں دھوکے کے سوا کچھ وعدہ نہیں دیتا۔“ اس لیے اللہ تعالیٰ کی ہمیں تعلیم یہ ہے کہ تم جب بھی وعدہ کرو تو اس چیز کا کرو جو تم کر سکتے ہو، پھر بھی ساتھ ان شاء اللہ ضرور کہو، کیونکہ تمہارا اختیار اللہ تعالیٰ کے تابع ہے، فرمایا: ﴿وَلَا تَقُولُوا لِنَايَ ۖ إِنِّي فَاعِلٌ ذَلِكَ غَدًا ۖ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ﴾ [الكهف: ۲۳، ۲۴] ”اور کسی چیز کے بارے میں ہرگز نہ کہہ کہ میں کل یہ کام ضرور کرنے والا ہوں، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔“

﴿۳۷﴾ وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ : ”سُلْطَةٌ“ اور ”سُلْطَانٌ“ کا مطلب زبردستی کسی پر غلبہ حاصل کر لینا، مسلط ہو جانا ہے۔ یہ تسلط دو طرح کا ہوتا ہے، ایک حکومت کے ذریعے سے ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ شیطان کی ان پر کوئی حکومت نہ تھی کہ وہ ان پر کوئی فوج چڑھا لیا تھا اور ایک سلطان اور غلبہ صحیح دلیل کا ہوتا ہے، کیونکہ وہ دلیل دل پر قابو پالیتی ہے اور آدمی اس کے مطابق عمل پر مجبور ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ شیطان کے پاس ڈنڈا بھی نہ تھا اور کوئی معقول دلیل بھی نہ تھی، چنانچہ وہ کہے گا میں نے تو بس اتنا کیا تھا کہ تمہیں کچھ کاموں کی دعوت دی، وہ تمہاری کمزوریوں، مثلاً حرص، شہوت، غصے، بزدلی وغیرہ کے عین مطابق تھی اور اس میں تمہاری خواہشات کو ابھارا گیا تھا، تم نے فوراً اسے قبول کر لیا (أَجَبْتُمْ اور اسْتَجَبْتُمْ کے فرق کو ملحوظ رکھیں) اس لیے مجھے ملامت مت کرو، بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو، کیونکہ اپنی مرضی سے گناہ تم نے کیا، میں نے تم پر کوئی زبردستی نہیں کی۔ اب نہ تم میری فریاد سنی کر سکتے ہو نہ میں تمہاری۔ سورہ نحل کی آیت (۱۰۰) میں شیطان کے سلطان کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

﴿۳۸﴾ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِ مِنْ قَبْلُ : اس سے پہلے تم نے جو مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا تھا میں اس کا انکار کرتا ہوں، کیونکہ عبادت تو صرف اللہ کا حق تھا، اسی طرح حکم ماننا تم پر صرف اللہ کا حق تھا اور وہ بھی اس کی عبادت میں شامل تھا، تم

وَأَدْخِلِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا
بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۖ تَحْتَهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ﴿۲۳﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے وہ ایسے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، ان کی آپس کی دعا اس میں سلام ہوگی ﴿۲۳﴾

نہ اس کے بجائے میرا حکم مانا، میری عبادت کی، مجھے اس کا شریک بنایا، اب میں اس سے صاف لاتعلقی کا اظہار کرتا ہوں۔ تم نے میری نہیں بلکہ اپنی خواہش کی پیروی کی اور تم اللہ کے بجائے مجھے نہیں بلکہ اپنے وہم و گمان کے بنائے ہوئے دیگر لوگوں اور داتاؤں کو پکارتے رہے ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ﴾ [النجم: ۲۳] ”یہ لوگ (شرکین) صرف گمان کے اور ان چیزوں کے پیچھے چل رہے ہیں جو ان کے دل چاہتے ہیں۔“

﴿۲۳﴾ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: یہ بطور اعتراف شیطان کی بات کا آخری حصہ بھی ہو سکتا ہے جس سے پہلے وہ چھ باتیں کہہ کر ان سے بری ہو چکا ہے: ① میرا وعدہ جھوٹا تھا۔ ② میرا تم پر کوئی غلبہ نہ تھا۔ ③ تم نے دلیل سے خالی دعوت قبول کی۔ ④ مجھے ملامت کے بجائے اپنے آپ کو ملامت کرو۔ ⑤ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ⑥ تم نے مجھے جو شریک بنایا میں اسے نہیں مانتا۔ ⑦ یہ آخری بات ہے کہ ظالموں (شرکوں) کے لیے عذاب الیم ہے۔ (خلاصہ از شوکانی) اور یہ جملہ اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہو سکتا ہے جو اظہار حقیقت ہے۔

تیت 23 ﴿۲۳﴾ وَأَدْخِلِ الَّذِينَ آمَنُوا.....: اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق یہاں بھی شرکین اور شیطان کے ذکر کے بعد ایمان اور عمل صالح والوں کا انجام ذکر فرمایا کہ وہ جنتوں میں داخل کر دیے گئے۔ مراد یہ ہے کہ کیسے جائیں گے، مگر بات اتنی یقینی ہے کہ اسے ماضی کے لفظ سے بیان کیا کہ سمجھو یہ کام ہو چکا۔ اس سے پہلے شیطان اور شرکین، کمزور اور سرداروں کی گفتگو میں بھی ماضی کا صیغہ یہی حکمت رکھتا ہے۔

﴿۲۲﴾ وَأَدْخِلِ: ”داخل کیے جائیں گے“ داخل کون کرے گا؟ اس کی تین جہتیں ہیں، اصل تو اللہ تعالیٰ ہے جو جنت میں بھیجے گا حکم دے گا، پھر فرشتے ہیں جو اس کے حکم سے انھیں جنت میں لے جائیں گے، تیسرے ان کا ایمان اور عمل صالح ہیں جو اللہ کی رحمت اور ان کے جنت میں جانے کا ذریعہ بنیں گے، اس لیے مجھول کا صیغہ استعمال کیا۔ ”بِإِذْنِ رَبِّهِمْ“ یعنی یہ سب کچھ ان کے رب کی توفیق اور مہربانی سے ہوگا۔

﴿۲۳﴾ تَحْتَهُمْ فِيهَا سَلَامٌ: یعنی آپس میں ملتے دقت وہ ”السلام علیکم“ کہیں گے۔ فرشتے ان سے کہیں گے: ﴿سَلَامٌ عَلَيْكُمْ مِمَّا صَبَرْتُمْ﴾ [الرعد: ۲۴] ”سلام ہو تم پر اس کے بدلے میں جو تم نے صبر کیا۔“ یعنی تم پر سلامتی ہو، پھر رب رحیم انھیں سلام کہے گا: ﴿سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبِّ رَحِيمٍ﴾ [يس: ۵۸] ”سلام ہو۔ اس رب کی طرف سے کہا جائے گا جو بے حد مہربان ہے۔“ اس میں مبارک باد کا مفہوم بھی ہے، سلامتی کی دعا بھی اور اللہ کی طرف سے سلامتی کا عطیہ بھی۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا
 فِي السَّمَاءِ ۗ تُوْتِي أَكْثَرًا كُلَّ حِينٍ بِأَذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ
 لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۵﴾

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے ایک پاکیزہ کلمہ کی مثال کیسے بیان فرمائی (کہ وہ) ایک پاکیزہ درخت کی طرح
 (ہے) جس کی جڑ مضبوط ہے اور جس کی چوٹی آسمان میں ہے ﴿۲۵﴾ وہ اپنا پھل اپنے رب کے حکم سے ہر وقت دیتا
 ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۲۵﴾

آیت 25.24 ① اَلَمْ تَرَ: یہ خطاب اولاً رسول اللہ ﷺ سے ہے اور پھر ہر اس شخص سے ہے جو خطاب کے لائق ہے۔
 استفہام سے مراد پوچھنا نہیں بتانا ہے۔ اسے استفہام تقریری کہتے ہیں۔ ”کیا تو نے نہیں دیکھا؟“ یہاں دیکھنے سے مراد علم اور
 جاننا ہے جو کائنات کو دیکھنے اور اس میں غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے۔ مفسر آلوسی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ”اَلَمْ تَرَ“ کا
 مخاطب بعض اوقات وہ شخص ہوتا ہے جو پہلے سے اس بات سے واقف ہو، ایسی صورت میں مراد تعجب کا اظہار ہوتا ہے اور بعض
 اوقات اس کا مخاطب وہ شخص ہوتا ہے جو اس سے واقف نہ ہو، اس وقت مراد ایک تو اسے بتانا ہوتا ہے اور ایک اس بات پر
 تعجب کا اظہار ہوتا ہے کہ اتنی مشہور بات بھی تمہیں معلوم نہیں، جو سب لوگ دیکھی ہوئی بات کی طرح جانتے ہیں۔ پھر اس
 مخاطب سے بات اس طرح کی جاتی ہے گویا وہ اسے اچھی طرح جانتا ہے۔

② ”مَثَلًا“ یہ ”ضَرَبَ“ کا مفعول بہ ہے، ”كَلِمَةً“ اس سے بدل ہے یا عطف بیان۔ مثل کا لفظ کسی چیز کی وضاحت کے
 لیے اس سے زیادہ واضح چیز کے ساتھ مثال دے کر سمجھانے کے لیے آتا ہے۔

③ ”كَلِمَةً طَيِّبَةً“: اس میں ہر پاکیزہ کلام، مثلاً تسبیح، تقدیس، تحمید اور تہلیل وغیرہ شامل ہے اور ہر پاکیزہ کلام کا خلاصہ ”لا الہ
 الا اللہ“ ہے، کیونکہ ہر پاکیزہ کلام یا عمل کا مدار یہی ہے۔ اس لیے مفسرین نے عموماً اس سے کلمہ اسلام اور اس کے نتیجے میں
 حاصل ہونے والا ہر پاکیزہ قول و عمل مراد لیا ہے۔

④ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ : پاکیزہ اور عمدہ درخت کی چند خوبیاں بیان فرمائیں، پہلی یہ کہ اس کی جڑ مضبوط ہے،
 جس کی وجہ سے اس کا اکھڑنا مشکل ہے اور وہ زمین سے غذا بخوبی حاصل کر لیتا ہے اور ڈٹ کر کھڑا رہتا ہے۔ دوسری یہ کہ اس
 کی چوٹی بہت اونچی ہے، جس کی وجہ سے اسے نقصان پہنچانا مشکل ہے، وہ آلودگی سے محفوظ دھوپ اور صاف ہوا سے بھی اپنی
 پوری خوراک حاصل کرتا ہے۔ مفسر طحاوی نے ”الوسیط“ میں لکھا ہے کہ جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ درخت اپنی غذا کا
 صرف پانچ فیصد زمین سے حاصل کرتے ہیں، باقی فضا سے۔ تیسری یہ کہ وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت اپنا پھل دیتا ہے۔
 اس صفت کی تفسیر میں مفسرین کو مشکل پیش آئی ہے۔ صحیح بخاری (۶۱۲۲، ۶۱۲۳) میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ
 نے کھجور کے درخت کو مومن سے تشبیہ دی ہے کہ اس کے پتے کبھی نہیں گرتے اور وہ ہر وقت اپنا پھل اپنے رب کے حکم سے

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

اور گندی بات کی مثال ایک گندے پودے کی طرح ہے، جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا گیا، اس کے لیے کچھ بھی قرار نہیں ﴿۲۶﴾

دیتا ہے، مگر آپ نے اسے کلمہ طیبہ سے تشبیہ نہیں دی۔ ترمذی (۳۱۱۹) میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہاں کلمہ طیبہ ﴿كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ﴾ سے مراد کھجور ہے، مگر شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے مرفوعاً ضعیف اور موقوفاً صحیح فرمایا ہے۔ بہر حال جو مفسرین اس سے مراد کھجور کا درخت لیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ کھجور کے درخت سے پھل کی ابتدا سے لے کر اس کے گودے، کچی کھجور، نیم پختہ، تازہ کچی ہوئی غرض ہر مرحلے کے پھل کو تقریباً چھ ماہ تک کھایا جاتا ہے، پھر اسے محفوظ کر کے سارا سال کھایا جاتا ہے۔ مفسر طنطاوی نے فرمایا کہ میرے خیال میں ”ثَوَاتِي أَكْلَهَا“ کو صرف پھل میں محدود کرنا ٹھیک نہیں، مراد یہ ہے کہ وہ درخت ہر وقت فائدہ پہنچاتا رہتا ہے، پھل کی صورت میں، سائے کی صورت میں، خوشبو کی صورت میں، عمارتی لکڑی یا ایندھن کی صورت میں، پتوں اور ٹہنیوں اور گوند کی مصنوعات کی صورت میں اور دوا کی صورت میں، اگر کچھ بھی نہ ہو تو ہوا کو آلودگی سے صاف کر کے آکسیجن بنانے کی صورت میں ہر وقت وہ اپنا فائدہ پہنچاتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کھجور کے علاوہ وہ تمام درخت بھی اس میں آجاتے ہیں جن میں یہ تیبوں خوبیاں ہوں۔ اسی طرح کلمہ اسلام دنیا اور آخرت کے ہر مرحلے میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مومن کو مختلف قسم کے بے شمار فوائد پہنچاتا رہتا ہے اور ہر وقت مومن کا کوئی نہ کوئی نیک عمل آسمان کی طرف چڑھتا رہتا ہے۔ چونکہ مثال سے بات خوب سمجھ میں آجاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اسی طرح لوگوں کی نصیحت اور سمجھانے کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے۔

آیت 26 وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ اور خبیث کلمہ (گندی بات) سے مراد کفر و شرک کی بات ہے۔ اس کی مثال اس بے کار پودے کی ہے جسے جڑ سے اکھیڑ پھینک دیا گیا ہو اور وہ اتنا کمزور ہو کہ اس کی جڑ زمین میں قائم ہی نہ رہ سکتی ہو۔ معمولی سا ہوا کا جھونکا ہی اسے اکھیڑ پھینکنے کے لیے کافی ہو۔ اسی طرح کلمہ کفر و دنیا یا آخرت میں ہر طرح بے کار ہے، کسی کام نہیں آئے گا۔ انس رضی اللہ عنہ نے اس سے مراد حظل (تماں، اندرآن) لیا ہے۔ [ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورۃ ابراہیم: ۳۱۱۹] البتہ نبی کریم ﷺ سے انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت مرفوعاً ثابت نہیں۔ [ضعیف سنن الترمذی للالبانی: ۳۱۱۹] طنطاوی نے فرمایا، یہ صرف بطور مثال ایک فرضی پودا ہے جس کا حقیقت میں وجود نہیں، صرف سمجھانے کے لیے اسے بیان کیا گیا ہے۔ تفسیر طبری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول مذکور ہے، مگر اس میں قابوس بن ابی ظبیان ایک راوی ضعیف ہے۔ کیونکہ تماں ہو یا اور کوئی پودا بہر حال اس کے پھر بھی کچھ نہ کچھ غذائی نہ سہی دوائی فائدے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بے کار فرضی پودے والا حال شرک و کفر کا ہے جس کی نہ کوئی دلیل ہوتی ہے نہ دل پر اس کا اثر ہوتا ہے، نہ اس کے ساتھ کوئی عمل قبول ہوتا ہے۔ بودا اتنا ہوتا ہے کہ ذرا سے غور و فکر سے اس کا بے حقیقت ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ کافر کا کوئی عمل نہ آسمان کی طرف چڑھتا ہے نہ اللہ کے ہاں قبول ہوتا ہے۔ یہ تفسیر مناسب حال معلوم ہوتی ہے، کیونکہ کفر و شرک کا حقیقی وجود ہے ہی نہیں، بلکہ یہ صرف وہم و گمان کی بیرونی کا نام

يُحْيِي اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ ۗ وَ يُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۗ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ﴿۲۷﴾

اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے، بختہ بات کے ساتھ خوب قائم رکھتا ہے، دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی اور اللہ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿۲۷﴾

ہے، اس لیے اس کی مثال بھی ایسے ہی پودے سے مناسب ہے جس کا وجود فرضی ہو۔

آیت 27 ﴿يُحْيِي اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ قول ثابت سے مراد کلمہ شہادت اور عقیدہ توحید ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو دنیا میں سخت سے سخت آزمائشوں اور سزاؤں میں بھی اسلام پر قائم رکھتا ہے۔ اصحاب الاخذہ کو دیکھ لیجیے، ان انبیاء و شہداء کو دیکھ لیجیے جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیے گئے، مگر انھوں نے اسلام کا دامن نہیں چھوڑا۔ ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں پھینکے جانے کو دیکھ لیجیے، ہمارے نبی ﷺ اور صحابہ کرام علیہم السلام مثلاً بلال، عمار، یاسر، خباب، سمیہ، ضعیب وغیرہم علیہم السلام پر آنے والی تنگیوں اور تکلیفوں کو دیکھ لیجیے۔ اس آیت میں فرمایا کہ ان لوگوں کا کلمہ شہادت پر قائم رہنا اللہ تعالیٰ کے ثابت رکھنے سے ہے، وہی ان میں اس قدر عزم و ہمت اور استقامت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ سخت سے سخت حالات ہوں یا دنیاوی آسائشوں کی آزمائش ہو، ہر حال میں بختہ بات (کلمہ اسلام) پر خوب قائم رہتے ہیں۔ ”يُحْيِي اللَّهُ“ کا ترجمہ باب تفعل کی وجہ سے ”خوب قائم رکھتا ہے“ کیا ہے۔

﴿وَفِي الْآخِرَةِ﴾ اس سے مراد قبر میں سوال و جواب ہے۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا أَقْبَدَ الْمُؤْمِنُ فِي قَبْرِهِ أَيْ تَمَّ شَهِدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، فَذَلِكَ قَوْلُهُ: ﴿يُحْيِي اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ﴾» [ابراہیم: ۲۷] ”جب مومن کو قبر میں بٹھایا جاتا ہے تو اس کے پاس فرشتے آتے ہیں، پھر وہ شہادت دیتا ہے: ”أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ“ چنانچہ اللہ کے اس فرمان: ﴿يُحْيِي اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ کا یہی مطلب ہے۔“ [بخاری، الحناظر، باب ما جاء في عذاب القبر: ۱۳۶۹]

صحیح بخاری ہی میں اس کے بعد والی روایت میں یہ لفظ ہے کہ یہ آیت عذاب قبر کے بارے میں اتری۔

﴿وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ﴾ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا وُضِعَ فِي قَبْرِهِ وَتَوَلَّى عَنْهُ أَصْحَابُهُ، وَإِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ، أَنَاهُ مَلَكَانِ فَيَقْعِدَانِهِ فَيَقُولَانِ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُولُ أَشْهَدُ أَنَّهُ عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ، فَيَقَالُ لَهُ انْظُرْ إِلَى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ قَدْ أَبْدَلْنَاكَ اللَّهُ بِهِ مَقْعَدًا مِنَ الْحَنَّةِ، فَيَرَاهُمَا جَمِيعًا، أَنَّهُ يَنْسَخُ لَهُ فِي قَبْرِهِ، وَأَمَّا الْكَافِرُ فَيَقَالُ لَهُ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ؟ فَيَقُولُ لَا أُدْرِي، كُنْتُ أَقُولُ مَا يَقُولُهُ النَّاسُ، فَيَقَالُ لَا دَرِيَّتَ وَلَا تَلَيْتَ، وَيُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيدٍ ضَرْبَةً فَيَصْبُحُ صَبْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيهِ غَيْرَ الثَّقَلَيْنِ» [بخاری،

الَّذِينَ بَدَلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۳۸﴾ جَهَنَّمَ يَصَلُّونَهَا
وَيَسُّ الْقَرَارَ ﴿۳۹﴾

کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لا اتارا ﴿۳۸﴾ جہنم میں، وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے ﴿۳۹﴾

الحنافز، باب ما جاء فی عذاب القبر: ۱۳۷۴] ”بندہ جب اپنی قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس چل پڑتے ہیں اور وہ اپنے ساتھیوں کے جوتوں کی آواز سن رہا ہوتا ہے، تو اس کے پاس دو فرشتے آ جاتے ہیں، وہ اسے بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ”تو اس آدمی محمد ﷺ کے متعلق کیا کہتا تھا؟“ اگر وہ مومن ہے تو کہتا ہے: ”میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں“ تو اس سے کہا جاتا ہے کہ آگ میں اپنی جگہ دیکھ، اللہ تعالیٰ نے اسے بدل کر تجھے جنت میں جگہ دے دی ہے۔ چنانچہ وہ ان دونوں کو دیکھتا ہے، تو اس کے لیے اس کی قبر کو وسیع کر دیا جاتا ہے اور منافق اور کافر، اس سے کہا جاتا ہے: ”تو اس آدمی (محمد ﷺ) کے متعلق کیا کہا کرتا تھا؟“ وہ کہتا ہے: ”میں نہیں جانتا، جو کچھ لوگ کہتے تھے میں وہی کہا کرتا تھا۔“ تو اس سے کہا جاتا ہے: ”تو نے کچھ جانا اور نہ جاننے کی کوشش کی۔“ پھر اسے لوہے کے ہتھوڑوں کے ساتھ ایک ضرب ماری جاتی ہے تو وہ ایسا چیختا ہے کہ دو بھاری مخلوقوں (جن وانس) کے سوا سب چیزیں جو اس کے قریب ہوتی ہیں، اس آواز کو سنتی ہیں۔“

قبر کا عذاب حق ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کئی آیات و احادیث سے اسے ثابت فرمایا ہے، دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۲۰)، سورہ انعام (۹۳)، سورہ توبہ (۱۰۱)، سورہ مومن (۳۶، ۳۵) اور زیر تفسیر آیت۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: ﴿اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَالِ﴾ [بخاری، الحنافز، باب التَّوَعُّدِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ: ۱۳۷۷] بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی شخص تشہد سے فارغ ہو تو چار چیزوں سے پناہ مانگے: ﴿اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَفِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ الْمَسِيحِ الدَّجَالِ﴾ اس کے بعد اپنے لیے جو چاہے دعا کرے۔“ [السنن الکبریٰ للسنائی: ۳۸۹/۱، ۳۹۰، ح: ۱۲۳۳، عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہما۔ صحیح] اس لیے بعض ائمہ نے یہ دعا پڑھنا تشہد کے بعد واجب قرار دیا ہے، دوسری دعائیں اس کے بعد پڑھے۔ اتنی واضح آیات و احادیث کے باوجود بہت سے بد نصیب عذاب قبر کے منکر ہیں۔ وہ ان شاء اللہ بہت جلد اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیں گے۔

﴿وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ﴾: اہل ایمان کو ثابت رکھنا، فالملوں کو ہدایت سے محروم رکھنا، اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اگر وہ چاہتا تو اپنی دوسری ساری مخلوق کی طرح جن وانس کو بھی اپنے احکام بجالانے پر مجبور کر دیتا، مگر اس کی مرضی کہ اس نے ان دونوں کو ہدایت یا ضلالت، کفر یا ایمان کا اختیار دیا۔ اب جو جہر جانا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے وہی راستہ آسان کر دیتا ہے۔ دیکھیے سورہ دہر (۳) اور سورہ لیل (۱۰۳)۔

یت 29.28 ﴿الَّذِينَ بَدَلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾ یہ ”بَوَارٌ“ (ن) کا مصدر ہے، معنی ہے ”قَرَطُ

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوا عَنْ سَبِيْلِهِ ۗ قُلْ تَسْتَعْتَبُوْنَ اِنْ مَصِيْرُكُمْ اِلَى النَّارِ ۝

اور انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک بنا لیے، تاکہ اس کے راستے سے گمراہ کریں۔ کہہ دے فائدہ اٹھاؤ، پس بے شک تمہارا لوٹنا آگ کی طرف ہے ۝

الگسناد، یعنی انتہائی بے قدر و قیمت ہونا، پھر ہلاکت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ (راغب)

② انسان کو اپنے وجود کی نعمت سب سے پہلے مفت ملی، اس نے اس کا شکر اپنے خالق کی اطاعت کے بجائے کفر، یعنی ناشکری اور اس کے وجود یا اطاعت و عبادت سے انکار کے ساتھ کیا اور جو شخص جس قدر سرداری اور نعمت سے بہرہ ور تھا اس نے اتنا ہی اپنی قوم کو غلط راستے پر لگا کر جہنم میں پہنچایا۔ اس لحاظ سے آیت عام ہے مگر سیاق و سباق اور مفسرین کے مطابق یہاں مراد کفار قریش ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں پیدا فرما کر اپنے مقدس گھر کا ستولی بنا دیا۔ امن و اطمینان اور دنیا کا ہر پھل اور نعمت مہیا فرمائی، انھوں نے اس کا بدلہ توحید اور اطاعت الہی کے بجائے عین کعبہ میں اور اس کے ارد گرد تین سوساٹھ بت رکھ کر اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اتار کر دیا، فرمایا: ﴿اَوَلَمْ تُكُنْ لَهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُجْبٰى اِلَيْهِ فَتُكْرَمُ مِنْ شَيْءٍ﴾ [النصف: ۵۷] "اور کیا ہم نے انھیں ایک با امن حرم میں جگہ نہیں دی؟ جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھینچ کر لائے جاتے ہیں۔" اور دیکھیے سورہ قریش۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو ان میں مبعوث فرما کر دنیا اور آخرت میں سرداری کی نعمت حاصل کرنے کا موقع دیا، مگر انھوں نے آپ پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت کرنے کے بجائے کفر کو اختیار کیا اور آپ کو ہر ایزادی، حتیٰ کہ آپ کو حرم میں قتل کر دینے کا منصوبہ بنا لیا، جس کے نتیجے میں ان کے بیروکاروں کو دنیا میں جنگوں، خصوصاً بدر وغیرہ اور آخر میں فتح مکہ کی صورت میں رسوائی اور بربادی ملی، شدید قحط اور مکہ میں قافلوں کی آمد رک جانے کی صورت میں آمدنی ختم ہونے سے انھیں بھوک اور خوف نے گھیر لیا اور آخرت میں جہنم میں جانے کی ہلاکت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَةً رَّاٰنِيْهَا رِزْقًا رَّغِيْداً مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعَمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِآسِ النَّجْوٰعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝۱۱۲ وَ لَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُوْلٌ مِنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ [النحل: ۱۱۲، ۱۱۳] "اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی جو امن والی، اطمینان والی تھی، اس کے پاس اس کا رزق کھلا ہر جگہ سے آتا تھا، تو اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا، اس کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس انھی میں سے ایک رسول آیا تو انھوں نے اسے جھٹلا دیا، تو انھیں عذاب نے اس حال میں پکڑ لیا کہ وہ ظالم تھے۔"

③ اَلَمْ تَرَ: اس کے اولین مخاطب اگرچہ نبی کریم ﷺ ہیں مگر ہر وہ شخص اس کا مخاطب ہے جو مخاطب ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس لفظ کے ساتھ انسان خصوصاً کفار قریش کی نعمت کے مقابلے میں ناشکری اور کفر پر تعجب کا اظہار فرمایا ہے۔

بیت 30 وَجَعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا..... "اَنْدَادًا" "بَدًّا" کی جمع ہے۔ راغب نے لکھا ہے: "تَدْيِدُ الشَّيْءُ مُشَارِكُهُ فِى

قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَمِن قَبْلِ
 أَنْ يَأْتِيَهُمْ يَوْمٌ لَا يَبِيعُ فِيهِ وَلَا يَخْلَى ۝۳۱

میرے بندوں سے جو ایمان لائے ہیں، کہہ دے کہ وہ نماز قائم کریں اور اس میں سے جو ہم نے انھیں دیا ہے، پوشیدہ اور ظاہر خرچ کریں، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ کوئی دلی دوستی ۝۳۱

جو ہرہرہ "کہ جو کسی چیز کے اصل میں شریک ہو، جبکہ مثل کا لفظ ہر مشارک پر بولا جاتا ہے، چنانچہ ہر "نذ" مثل ہے مگر ہر مثل "نذ" نہیں۔ (اس لیے اس کا ترجمہ شریک کیا جاتا ہے) یعنی وہ ان کی پوجا کرنے لگے اور دکھ درد میں انھیں پکارنے لگے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کا جرم شرک کا ارتکاب اور لوگوں میں اس کی اشاعت کے ذریعے سے انھیں اسلام سے روکنا اور گمراہ کرنا قرار دیا ہے۔ "تَمَتَّعَ" کچھ وقت تک فائدہ اٹھانے کو کہتے ہیں۔ قرآن میں جہاں بھی یہ لفظ "تَمَتَّعَ" یا "تَشْتَعُوا" (یعنی فائدہ اٹھاؤ) آیا ہے، اس کا مطلب اس کی اجازت دینا نہیں بلکہ اس پر ڈانٹنا اور ڈرانا ہے، یعنی اچھا اگر تم نہیں آتے تو چند روز کے مزے اڑالو، مگر کب تک؟ آخر کار تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا ہے۔

ت 31 ۱ قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا: انسان سارے ہی اللہ کے بندے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کا "عِبَادِي" (میرے بندے) کہنا بہت بڑی عزت افزائی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا﴾ [سنی اسرائیل: ۱۶] "پاک ہے وہ جو راتوں رات اپنے بندے کو لے گیا۔" اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے کہہ دیں جن میں دو وصف ہیں، ایک تو یہ کہ وہ صرف میرے بندے ہیں، کسی غیر کے نہیں، جو اپنے نام عبد اللہ، عبد الرحمن اور ان جیسے رکھتے ہیں، نہ کہ عبد الحسین، عبد النبی، پیراں دتہ، غوث بخش وغیرہ اور جو قولاً و عملاً صرف میری عبادت اور بندگی کرتے ہیں، نہ کہ کسی غیر کی اور دوسرا وصف یہ کہ وہ ایمان لے آئے ہیں۔

۲ یُقِیْمُوا الصَّلَاةَ وَیُنْفِقُوا.....: یہ دونوں فعل لام امر مقدر کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ اقامت کا معنی ہے سیدھا کرنا، یعنی نماز کو درست کر کے پڑھیں، اس میں بیٹنگی، وقت پر ادا کرنا، تمام ارکان کو صحیح ادا کرنا اور خشوع کے ساتھ ادا کرنا سب کچھ آ جاتا ہے۔ نماز میں بندگی کی ہر قسم کا کچھ نہ کچھ حصہ آ جاتا ہے، قبلہ کی طرف رخ حج سے مناسبت رکھتا ہے، قیام، رکوع سجود اور دوزانو ہونا غلامی اور بندگی کے اظہار کی مختلف صورتیں ہیں، نماز کے دوران میں کھانے پینے وغیرہ سے اجتناب روزے سے مناسبت رکھتا ہے، کاروبار چھوڑ کر آنا اس شخص کے لیے ممکن ہی نہیں جو اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرنے پر تیار ہی نہیں اور کئی اور چیزیں ایسی ہیں جو صرف نماز ہی میں ہیں، کسی اور عبادت میں نہیں۔ قرآن مجید میں اکثر نماز اور زکوٰۃ یا خرچ کرنا اکٹھا آیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی ان دونوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

۳ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً: اس میں دو باتوں کی طرف توجہ لازم ہے۔ ایک تو لفظ "مِن" ہے کہ اللہ نے ہمیں جو کچھ دیا ہے جان، مال، اولاد، قوت، علم، عزت، غرض جو شمار ہی نہیں ہو سکتا، وہ سارے کا سارا ہم سے خرچ کرنے کا مطالبہ نہیں کیا،

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۗ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۗ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ۗ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبِينَ ۗ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۗ

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر اس کے ساتھ تمہارے لیے پھولوں میں سے کچھ رزق نکالا اور تمہارے لیے کشتیوں کو سخر کیا، تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور تمہاری خاطر دریاؤں کو سخر کر دیا ﴿۳۲﴾ اور تمہاری خاطر سورج اور چاند کو سخر کر دیا کہ پے در پے چلنے والے ہیں اور تمہاری خاطر رات اور دن کو سخر کر دیا ﴿۳۳﴾

کیونکہ اسے ہماری کمزوری کا علم ہے جو اس نے سورہ محمد کی آیت (۳۶، ۳۷) میں ذکر فرمائی ہے۔ دوسرا لفظ ”رَزَقْنَا“ ہے کہ تم نے جو کچھ خرچ کرنا ہے ہمارے دیے ہوئے میں سے کرنا ہے، اگر یہ سوچو گے تو دل میں بخل نہیں آئے گا اور اگر سب کچھ اپنا سمجھو گے تو مشکل ہی سے خرچ کر سکو گے۔ ”سَخَّرَ“ یعنی پوشیدہ اس لیے کہ وہ ریا سے پاک ہے اور ”عَلَانِيَةً“ یعنی علانیہ اس لیے کہ دوسروں کو رغبت ہو، یا فرض زکوٰۃ ہو تو علانیہ دو، کیونکہ چھپا کر دینے سے زکوٰۃ نہ دینے کی تہمت کا خطرہ ہے۔

﴿۳۲﴾ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ فِيهِ وَلَا خَلِيلٌ: ”خَلِيلٌ“ یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے، بمعنی دلی دوستی، مراد ہے قیامت کا دن کہ جس میں نیک اعمال خریدے جا سکیں گے نہ کسی کی دوستی اور محبت کام آئے گی کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچا سکے۔ شاہ عبدالقادر بریلوی لکھتے ہیں: ”یعنی نیک عمل بکتے نہیں اور کوئی دوستی سے رعایت نہیں کرتا۔“ (موضح) اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿لَا خَلَاءَ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾ [الزحرف: ۶۷] ”سب غلیل (دلی دوست) اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متقی لوگ۔“

آیت 32 ① اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ..... یعنی وہ اللہ جس کی ناشکری پر تم کمر بستہ ہو، جس کی اطاعت اور بندگی سے روگردانی کر رہے ہو اور جس کے ساتھ بلا دلیل شریک بنا رہے ہو، وہ تو وہ ذات ہے..... اس کے بعد ان تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی دس نعمتیں شمار کی گئی ہیں اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں شمار کرنے کی تم میں طاقت ہی نہیں۔

② الْفُلْكَ: واحد جمع ایک ہی طرح ہے، بڑی کشتیاں، بحری جہاز۔

③ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ: ”الْأَنْهَارُ“ ”نہر“ کی جمع ہے، ندی، نالے اور دریا۔ تم ان سے اچھی کھیتیاں سیراب کرتے ہو اور ان میں جہاز اور کشتیاں چلاتے ہو، مچھلیاں پکڑتے ہو، بجلی پیدا کرتے ہو، ان کے کناروں پر پہاڑوں میں راستے بناتے ہیں، غرض بے شمار فائدے اٹھاتے ہو۔

آیت 32 ② دَائِبِينَ: یہ ”دَائِبٌ يَدُؤُا دَائِبًا“ سے اسم فاعل کا تشبیہ ہے، مسلسل چلنا، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے چلنے کے لیے جو

وَأَتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۗ وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا ۗ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ

كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

اور تمہیں ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے۔ بلاشبہ انسان یقیناً بڑا ظالم، بہت ناشکر ہے ﴿۳۴﴾

نظام اور ضابطہ مقرر کر دیا ہے اس پر لگا تار چلے جا رہے ہیں، نہ کبھی تھتے ہیں اور نہ بگڑتے ہیں اور نہ رفتار میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

آیت 34 ﴿۱﴾ وَأَتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ : یعنی یہ سب کچھ اور بہت کچھ تمہارے مانگے بغیر دیا۔ علاوہ ازیں جو کچھ تم نے مانگا اس میں سے بھی جتنا چاہا اس نے تمہیں دیا۔ ”فون“ تعبیضیہ ہے۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ زبان حال یا قال سے تم نے جو مانگا، یعنی اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے تمہاری حالت جو تقاضا کرتی تھی اور جو بھی تمہاری ضرورت ہو سکتی تھی اس نے اس میں سے جتنا چاہا تمہیں دیا۔

﴿۲﴾ وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا : یعنی مختصر طور پر بھی نہیں گن سکو گے، کیا یہ کہ تم لامحدود نعمتوں کو شمار کر سکو، تو سوچو تم اس کا شکر کس طرح ادا کر سکتے ہو۔ (شوکلانی) ”کَفَّارٌ“ بہت ناشکر۔ ”أَحْصَى يُحْصِي بِأَحْصَاءٍ“ (افعال) شمار کرنا، کیونکہ ”أَحْصَى“ کا معنی نکری ہے اور عرب نکریوں کے ذریعے سے شمار کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ نکریوں سے محدود شمار ہی ہو سکتا ہے۔

﴿۳﴾ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ : انسان پر اللہ تعالیٰ کے کتنے احسانات ہیں اور ہر آن ہوتے رہتے ہیں، مگر وہ ہے کہ ذرا تکلیف پہنچتی ہے تو ناشکری پر اتر آتا ہے۔ ”ظَلُومٌ“ سے یہی مراد ہے، یا ”الْإِنْسَانَ“ میں الف لام عہد کا ہے اور مراد کافر انسان ہے کہ وہ اللہ کا حق دوسروں کو دے کر، یعنی غیر اللہ کی عبادت کر کے بہت بڑا ظلم کر رہا ہے۔ فرمایا: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ [نفسان: ۱۳] ”بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔“ کیونکہ ظلم کا معنی ہے ”وَضَعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَحَلِّهِ“ کہ کسی چیز کو اس کی جگہ کے علاوہ رکھ دینا۔ تو کافر انسان اللہ کی نعمتیں استعمال کر کے نہ اس کی عبادت کرتا ہے نہ اطاعت بلکہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کو مخلوق کے احسانات شمار کرتا ہے، کبھی کسی کو جھوٹی بھرنے والا کہتا ہے، کبھی کسی کو داتا کہتا ہے، کبھی کسی کو دنگیر، کبھی کسی کو مشکل کشا۔ ”الْإِنْسَانَ“ سے مراد یہاں کافر انسان ہونے کی دلیل اس سلسلہ آیات کی ابتدا بھی ہے، فرمایا: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَآخَلَوْا قَوْمَهُمْ ذَاذِ الْبُؤَاءِ ۗ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۗ وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾ [ابراہیم: ۲۸، ۲۹] ”کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لا اتارا، جہنم میں، وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔“ یہ اس کی زبردست ناشکری ہے۔ اے کافر انسان! افسوس تیری اس کافری اور ناشکری پر۔ کاش! تو اپنے اصل داتا اور دنگیر کا احسان مانتا، اسی کا شکر ادا کرتا۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے تو میدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ۗ ﴿۳۵﴾

اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب! اس شہر کو امن والا بنا دے اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں ﴿۳۵﴾

آیت 35 ① وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ.....: عام احسانات کا ذکر کرنے کے بعد اب خاص اس احسان کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مکہ والوں پر کیا تھا اور وہ تھا ان کے باپ ابراہیم علیہ السلام کا ان کے جد اعلیٰ اسماعیل علیہ السلام کو یہاں لا کر آباد کرنا۔ اس سلسلے میں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام نے کن تمناؤں کے ساتھ تمہیں یہاں لا کر بسایا تھا اور کس طرح اس شہر کے پر امن بنانے کی اور اپنے اور اپنے بیٹوں کے لیے بت پرستی سے محفوظ رہنے کی دعا کی تھی، مگر آج تم ان احسانات کو بھول گئے اور بت پرستی کو اپنا دین قرار دے دیا۔

② اَوْتَانَا: یہ ”ذَا أَمِنَ“ (امن والا) کے معنی میں ہے، جیسے ”لَابَسَ“ (دودھ والا) اور ”فَامِرًا“ (کھجور والا) ہے۔ سورہ بقرہ (۱۲۶) میں ”هَذَا بَلَدًا آمِنًا“ اور یہاں ”هَذَا الْبَلَدُ آمِنًا“ میں فرق یہ ہے کہ سورہ بقرہ میں ”هَذَا“ پہلا مفعول اور ”بَلَدًا آمِنًا“ دوسرا مفعول ہے، جب کہ یہاں ”هَذَا الْبَلَدُ“ پہلا مفعول اور ”اَوْتَانَا“ دوسرا مفعول ہے۔ دونوں جگہ ترجمے کا فرق ملاحظہ فرمائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ سورہ بقرہ (۱۲۶) میں موجود پہلی دعا ”رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا“ اس وقت کی ہے جب شہر نہیں بنا تھا، تو دعا کی کہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا دے اور دوسری دعا اس وقت کی جب شہر بن چکا تھا، اسماعیل علیہ السلام بڑے ہو چکے تھے کہ پروردگارا! اس شہر کو امن والا بنا دے۔ امن ایک بہت بڑی نعمت ہے اور خوف بہت بڑی آزمائش ہے۔ رازی فرماتے ہیں، ایک عالم سے پوچھا گیا کہ اگر آپ کو بیماری اور خوف میں سے ایک کے انتخاب پر مجبور کیا جائے تو آپ کیا اختیار کریں گے؟ انھوں نے فرمایا، میں بیماری کو اختیار کروں گا کہ اس میں آدمی کھاپی اور سو تو سکتا ہے، خوف میں اس سے بھی محروم ہو جاتا ہے، آپ ایک بکری کا تصور کریں جس کی ٹانگ ٹوٹ جائے، وہ کھاتی چیتی رہے گی، سو بھی جائے گی، مگر ایک تندرست بکری جس کے سامنے بھیڑ یا ہو، وہ نہ کھا سکے گی، نہ پی سکے گی اور نہ آرام کر سکے گی، حتیٰ کہ نوبت موت تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ قمر میں بھوک سے کھلانے اور خوف سے امن دینے کی نعمت کا ذکر فرما کر قریش کو خاص اپنی عبادت کا حکم دیا ہے۔

③ وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ: ”جَنْبَ يَجْنُبُ“ یہ ”نَصْرٌ“ سے اور افعال اور تفعیل سے ایک ہی معنی میں آتا ہے۔ ”صنم“ اس پتھر یا لکڑی یا کسی دھات کے بنائے ہوئے بت، تصویر یا مجسمے کو کہتے ہیں جو کسی انسان یا فرشتے یا دیوتا کی حقیقی یا خیالی صورت پر پوجا کے لیے بنایا گیا ہو، جب کہ ”دثن“ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو غیر اللہ کی عبادت کے لیے مختص ہو، خواہ قبر ہو یا درخت یا دریا یا بت یا کوئی جانور یا انسان وغیرہ۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم اور اپنے والد کی صنم پرستی اور اس پر اصرار اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لیے وہ اپنے یا اپنی اولاد کے اس میں مبتلا ہونے سے سخت خوف زدہ تھے، سو انھوں نے یہ دعا کی۔ ”بَنِيَّ“ میں ساری اولاد شامل ہے، جیسے بنی آدم یا بنی اسرائیل۔ بیٹوں کی حد تک تو دعا قبول ہوئی، مگر ساری اولاد کے حق

رَبِّ اِنَّهُمْ اَضَلُّنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهُ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ

اے میرے رب! بے شک انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا، پھر جو میرے پیچھے چلا تو یقیناً وہ مجھ سے ہے

میں بعینہ قول نہیں ہوئی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمِن ذُرِّيَّتِيْ اَخْسِيْنَ وَظَالِمٍ لِّنَفْسِهٖ هُمِيْنٌ﴾ [الصافات: ۱۱۳] ”اور ان دونوں (ابراہیم اور اسحاق) کی اولاد میں سے کوئی نیکی کرنے والا ہے اور کوئی اپنی جان پر صریح ظلم کرنے والا ہے۔“ یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کا مالک ہے، وہ اپنی حکمت کے مطابق دعا کرنے والے کی دعا کا جتنا حصہ چاہتا ہے اس کی خواہش کے مطابق پورا کر دیتا ہے اور جو حصہ چاہتا ہے کسی اور صورت میں عطا کر دیتا ہے۔ دعا کسی صورت بھی ضائع نہیں جاتی، البتہ مرضی اسی کی چلتی ہے، کسی دوسرے حتیٰ کہ انبیاء کی بھی نہیں۔ ہمیں بھی ہر وقت اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ ہم یا ہماری اولاد کسی طرح شرک میں مبتلا نہ ہو جائیں، ہمیں اپنی اولاد کے لیے دعا بھی کرنی چاہیے اور اسے توحید کی تعلیم بھی دینی چاہیے۔

آیت 36 ﴿رَبِّ اِنَّهُمْ اَضَلُّنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ﴾: صنم پرستی عام ہونے اور لوگوں کے بہت جلد اس میں مبتلا

ہونے کی بڑی وجہیں دو ہیں، ایک تو یہ کہ ان دیکھے معبود (اللہ تعالیٰ) پر یقین رکھنے کے بجائے انسان چاہتا ہے کہ وہ ایسی چیز کی عبادت کرے جو اسے نظر آئے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ ظاہر کوئی چیز نہیں، کیونکہ کائنات کی ہر چیز اپنے بنانے والے کے وجود اور توحید کی شہادت دے رہی ہے اور لطف یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا یہ دعویٰ نہیں کہ یہ زمین و آسمان اور ساری کائنات میں نے بنائی ہے، اگر کوئی یہ دعویٰ کر لے تو ہر شخص اسے جھوٹا کہے گا، بلکہ خود اس کا دل اسے جھٹلائے گا کہ آسمان و زمین تو تجھ سے اور تیرے باپ دادا سے لاکھوں برس پہلے کے بنے ہوئے ہیں۔ وہ اگرچہ ظاہر ہے مگر اس کی ذات سے زیادہ کوئی چیز آنکھوں سے غائب بھی نہیں، کیونکہ کسی میں اسے دیکھنے کی تاب ہی نہیں۔ [هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ] اس لیے وہ پہلا تقاضا ہی ایمان بالغیب کا کرتا ہے، کوئی اس کے دیدار کا شوق رکھے یا درخواست کرے، جیسے موسیٰ علیہ السلام نے کی تو وہ ناراض نہیں ہوتا بلکہ جنت میں اپنے دیدار کا وعدہ کرتا ہے، مگر کوئی ایمان لانے کے لیے دیکھنے کی شرط لگائے، جیسے نبی اسرائیل نے کہا: ﴿لَنْ نُوْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَرٰى اللّٰهَ جَهَنَّمَ﴾ [البقرہ: ۵۵] ”(اے موسیٰ!) ہم تیرے لیے ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ کو صاف سامنے نہ دیکھ لیں“ تو پھر اس کی آتش غضب بھڑک اٹھتی ہے، پھر کبھی تو وہ بجلی گرا کر بھسم کر دیتا ہے اور اکثر کو اس نے مہلت دے رکھی ہے، قیامت کو انھیں ان کے مطالبے کا جواب دے گا۔ غرض یہی انسان کی بے وقوفی ہے کہ جب وہ اپنی کمزوری کی بنا پر اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا تو ایمان بالغیب کے بجائے نظر آنے والا رب گھڑ کر اس کی پوجا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا سبب محبت میں غلو بھی شامل ہو جاتا ہے، یعنی جس ہستی سے بھی اس کو حد سے زیادہ محبت ہوتی ہے، اسے نیک سمجھتا ہے یا اس کی ہیبت سے ڈرتا ہے، اس کا بت بنا کر اسے پوجنا شروع کر دیتا ہے۔ قوم نوح میں صنم پرستی کی ابتدا اسی طرح ہوئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ نوح۔ بے شمار قوموں کے صنم پرستی میں مبتلا ہونے کی

عَفْوُ مَرَجِيمٍ ﴿۱۱﴾

اور جس نے میری نافرمانی کی تو یقیناً تو بے حد بخشے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۱﴾

وجہ سے ابراہیم علیہ السلام کہہ رہے ہیں کہ اے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا، مراد یہ ہے کہ یہ ان کی گمراہی کا باعث بن گئے، جیسے کہتے ہیں کہ سڑک لاہور لے جاتی ہے، وہ تو صرف ذریعہ ہے، جانے والا جاتا تو خود ہے۔

﴿۱۲﴾ وَكُنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ عَفْوٌ مَرَجِيمٌ : یہاں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی نافرمانی کرنے والوں کے لیے بھی بخشش کی دعا کی، حالانکہ ان الفاظ سے یہ بات نہیں نکلتی، بلکہ صرف یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا معاملہ تیرے سپرد ہے، تو چاہے تو بخش دے، چاہے تو عذاب دے اور ساتھ ہی عرض کی: ”پس بے شک تو غفور ورحیم ہے۔“ بلاشبہ اس میں نہایت ادب، عجز اور سلیقے سے ایک قسم کی سفارش ہے، مگر اے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا نہیں کہا جاسکتا، ہاں انھوں نے اپنے والد کے لیے وعدہ کی وجہ سے بخشش کی دعا کی تھی، پھر اللہ کا دشمن ثابت ہو جانے پر اس سے براءت کا اظہار فرما دیا۔ (دیکھیے توبہ: ۱۱۳) قرآن میں ابراہیم اور عیسیٰ علیہ السلام سے منقول دعاؤں میں ہر نافرمان کا معاملہ، خواہ مشرک ہو یا عام گناہ گار، اللہ کے سپرد کیا گیا ہے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کے ذکر کے ساتھ ایک قسم کی سفارش کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یہ ان دونوں پیغمبروں کی بے شمار تکلیفیں اٹھانے کے باوجود حد درجے کی نرم دلی ہے، عیسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے: ﴿إِنْ تَعَذَّبْنَا لَهُمُ فِئَتَهُمْ عِبَادَكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ [المائدة: ۱۱۸] سورہ مائدہ میں اس آیت کا ترجمہ اور ہمارے رسول کریم ﷺ کا طرز عمل ملاحظہ فرمائیں۔

اس کے برعکس نوح علیہ السلام کی دعا تھی: ﴿رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا﴾ [نوح: ۲۶] ”اے میرے رب! زمین پر ان کافروں میں سے کوئی رہنے والا نہ چھوڑ۔“ اور موسیٰ علیہ السلام کی دعا یہ تھی: ﴿رَبَّنَا أَخْرِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَأَشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾ [يونس: ۸۸] ”اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں پر سخت گرہ لگا دے، پس وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔“ ان دونوں نبیوں کی یہ دعائیں بھی بلا سبب نہ تھیں۔ نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بتا دیا تھا کہ اب تمھاری قوم میں سے مزید کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ (دیکھیے ہود: ۳۶) اور فرعونیوں نے بہت سے معجزے دیکھ کر بھی کہہ دیا تھا کہ موسیٰ! تم جو بھی معجزہ لے آؤ ہم کسی صورت تم پر ایمان لانے والے نہیں۔ (دیکھیے الاعراف: ۱۳۲) اب اگر وہ یہ دعا نہ کرتے تو کیا کرتے؟ ایسے موقع پر تو ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے والد سے صاف لاطلق ہو گئے تھے، فرمایا: ﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ﴾ [التوبة: ۱۱۴] ”پس جب اس کے لیے واضح ہو گیا کہ بے شک وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔“

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ
فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الشَّمْرِاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿۱۵﴾

اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی کچھ اولاد کو اس وادی میں آباد کیا ہے، جو کسی کھیتی والی نہیں، تیرے حرمت والے گھر کے پاس، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ سو کچھ لوگوں کے دل ایسے کر دے کہ ان کی طرف مائل رہیں اور انہیں پھلوں سے رزق عطا کر، تاکہ وہ شکر کریں ﴿۱۵﴾

ت 37 ﴿۱﴾ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي : ”مِنْ“ تعبیض کے لیے ہے۔ ”کچھ اولاد“ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی تو اس وقت اسحاق علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے۔ انہیں اور ان کی والدہ سارہ علیہا السلام کو ابراہیم علیہ السلام نے دوسری جگہ (شام میں) ٹھہرایا ہوا تھا۔

﴿۲﴾ بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ : وادی نیچی جگہ کو کہا جاتا ہے، جہاں کبھی پانی بہتا ہو، خصوصاً پہاڑوں کے درمیان گہری جگہ کو ”وادی“ کہتے ہیں۔ ”غَيْرِ ذِي زَرْعٍ“ مکہ اور اس کے گرد و نواح بلکہ ارض عرب میں کھیتی باڑی نہیں تھی، کیونکہ بارش کے علاوہ وہاں پانی نہیں ملتا تھا اور زمین بھی پتھر لی یا ریتلی تھی، خصوصاً مکہ والی جگہ میں تو بالکل نہ پانی تھا نہ کھیتی باڑی۔ ان غیر آباد بیابان پہاڑوں کے درمیان اسماعیل اور ان کی والدہ ہاجرہ علیہا السلام کو لاکر چھوڑ جانے کا، پھر ہاجرہ علیہا السلام کے صفا و مردہ کے درمیان دوڑنے کا اور پانی تلاش کرنے اور زم زم کے پھوٹ نکلنے کا لہذا واقعہ صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مذکور ہے۔ [بخاری، احادیث الانبیاء، باب ﴿۱﴾ یزعمون ﴿۱﴾ التسلان فی المشی : ۲۳۶۴، ۲۳۶۵] ہزاروں سال بعد ابھی تک وہ ”غَيْرِ ذِي زَرْعٍ“ ہی ہے، البتہ طائف میں کچھ کھیتی باڑی اور پھل وغیرہ ہیں، مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَعْوَدُ السَّاعَةَ حَتَّى يَكْثُرَ الْمَالُ وَيَقْضَى، حَتَّى يَخْرُجَ الرَّجُلُ بِرِزْقِهِ مَالِهِ فَلَا يَجِدُ أَحَدًا يَقْبَلُهَا مِنْهُ، وَحَتَّى تَعْوَدَ أَرْضُ الْعَرَبِ مُرْوَجًا وَأَنْهَارًا» ”قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ مال بہت زیادہ نہ ہو جائے، حتیٰ کہ آدمی اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر نکلے گا، لیکن وہ کوئی ایسا شخص نہیں پائے گا جو اس سے اس کی زکوٰۃ لے لے اور جب تک ارض عرب دوبارہ مردج (سبزہ زار، کھلے کھیت) اور ندیوں نالوں کی صورت میں نہ بدل جائے۔“ [مسلم، الزکوٰۃ، باب الترغیب فی الصدقة قبل أن..... : ۱۵۷/۶۰، ج ۱ : ۱۰۱۳] لفظ ”تَعْوَدُ“ (دوبارہ نہ بدل جائے) سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی کبھی یہ پہاڑ کشمیر کے پہاڑوں کی طرح سبز اور ندیوں نہروں والے تھے، قیامت کے قریب پھر اسی طرح ہو جائیں گے۔

﴿۳﴾ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ : اس سے بعض مفسرین نے اخذ کیا ہے کہ یہ دعا ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ تعمیر کرنے کے بعد کی، ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر بیت اللہ تو ابراہیم علیہ السلام کے وہاں جانے سے بھی بہت پہلے تعمیر ہو چکا تھا، کیونکہ وہ زمین پر اللہ کی عبادت کے لیے بنایا جانے والا پہلا گھر ہے اور سب جانتے ہیں کہ زمین پر اللہ کی عبادت آدم علیہ السلام سے یا اس سے بھی پہلے سے شروع ہے، اس کے بانی اول آدم علیہ السلام ہیں یا اس سے بھی پہلے کی کوئی مخلوق، مثلاً فرشتے یا جن وغیرہ۔ ہاں ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں

رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفَى عَلَى اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا

فِي السَّمَاءِ ﴿۳۸﴾

اے ہمارے رب! یقیناً تو جانتا ہے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور اللہ پر کوئی چیز نہیں چھپتی زمین میں اور نہ آسمان میں ﴿۳۸﴾

سیلابوں کی وجہ سے یہ ایک ٹیلے کی شکل میں بدل چکا تھا، وہ جگہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بتائی اور انھی پہلی بنیادوں پر دوبارہ کعبہ تعمیر ہوا۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۱۲۸) اور سورہ حج (۳۶) ”الْمُحْزَرُّ“ اس لیے کہ کئی کام جو دوسری جگہ حلال ہیں مثلاً شکار کرنا، درخت کا ٹٹا وغیرہ، وہ یہاں حرام ہیں اور اس گھر کی عزت نہ کرنے والے کا یہاں طاقت کے ذریعے سے قبضہ حرام ہے، ممکن نہیں۔ اس لیے اس گھر کا لقب ”الْبَيْتُ الْعَتِيقُ“ بھی ہے، یعنی جو ہمیشہ سے آزاد رہا۔ عتیق کا ایک معنی قدیم بھی ہے۔

﴿۱﴾ رَبَّنَا لِيَقْبَلُوا الصَّلَاةَ : معلوم ہوا کہ آدمی کو خود بھی اور اولاد کو بھی ایسی جگہ ٹھہرانا چاہیے جہاں اہل توحید کی مسجد پہلے سے موجود ہو، یا جب آدمی وہاں سکونت اختیار کرے تو سب سے پہلا کام اپنا مکان اور مسجد بیک وقت بنانے کا کرے، خواہ ہنگی اینٹوں کی چار دیواری ہی ہو، جیسا کہ ہمارے پیارے رسول ﷺ نے مدینہ میں آتے ہی کیا تھا، تاکہ اقامت صلاۃ میں کوئی مشکل پیش نہ آئے اور وہ آبادیاں تو رہنے کے قابل ہی نہیں جو نہایت عالی شان ہونے کے باوجود اکیلے اللہ کی عبادت کے لیے بنائی ہوئی مسجدوں سے خالی ہیں، یا وہاں ایسی مسجدیں گھر سے اتنی دور ہیں کہ نماز کے لیے وقت پر پہنچنا مشکل ہے۔

﴿۵﴾ فَأَجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ : ”أَفْئِدَةً“ ”فؤاد“ کی جمع ہے، یعنی دل، یا ”وَفؤاد“ کی یعنی آنے والے۔ (یعنی) ”مِنَ النَّاسِ“ کچھ لوگوں کے دل۔ ”هَوِي“ تعیض کے لیے ہے۔ ”تَهْوِي“ ”هَوَى يَهْوِي“ (ض) سے گرنا اور ”هَوَى يَهْوِي“ (ع) سے چاہنا اور محبت کرنا مراد ہوتا ہے۔ کوئی چیز جب بلندی سے گرتی ہے تو نہایت تیزی سے گرتی ہے اور بے اختیار ہو کر گرتی ہے، یعنی کچھ لوگوں کے دل ایسے بنا دے کہ بے اختیار اس کی طرف دوڑتے چلے آئیں۔ تفاسیر میں بعض صحابہ و تابعین سے منقول ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اگر دعا میں ”کچھ لوگوں“ کی قید نہ لگاتے تو سب لوگوں کے دل، خواہ مسلم ہوتے یا یہود و نصاریٰ، اس کی طرف کھینچے چلے آتے۔ اس دعا کی قبولیت کا نظارہ ہر مسلمان اپنے دل میں اس گھر کے شوق سے اور وہاں حج وغیرہ کے لیے بار بار جانے والوں کی کثرت سے کر سکتا ہے۔

﴿۶﴾ وَأَرْشُهُمْ مِنَ السَّمَرَاتِ : مکہ میں دنیا کے تمام خطوں سے ہر موسم کا تازہ پھل دیکھ کر اس دعا کی قبولیت آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ اس دعا کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۲۳ تا ۱۲۷)۔

بیت 38 ﴿۱﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي : یعنی ہماری چھپی ہوئی دلی خواہشوں کو اور جو کچھ ہم زبان سے مانگ رہے ہیں تو سب جانتا ہے۔ یہ مانگنے کا بہترین طریقہ ہے کہ صرف تعریف پر اکتفا کیا جائے۔ ”کتاب الاغانی (۳۳۳/۸)“ میں ہے کہ امیر بن ابی الصلت نے عبد اللہ بن جعدان کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

أَذْكُرُ حَاجَتِي أَمْ قَدْ كَفَّانِي حَيَاءُكَ إِنَّ شَيْمَتَكَ الْحَيَاءُ

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْتِعْيَالًا وَاسْتِحْقَاقًا إِنَّ رَبِّي لَسَبِّعُ الدُّعَاءَ ﴿۳۹﴾

سب تعریف اس اللہ کی ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسماعیل اور اسحاق عطا کیے۔ بے شک میرا رب تو بہت دعا سننے والا ہے ﴿۳۹﴾

إِذَا أَنْتَى عَلَيْكَ الْمَرْءُ يَوْمًا كَفَّاهُ مِنْ تَعَرُّضِهِ الشَّنَاءِ

”کیا میں اپنی حاجت ذکر کروں یا یقیناً مجھے تیری حیا ہی کافی ہے، کیونکہ تیری عادت ہی حیا ہے، جب آدمی کسی دن تیری تعریف کر دے تو اسے ضرورت پیش کرنے کے بجائے تعریف ہی کافی ہو جاتی ہے۔“

سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جب مخلوق کا یہ حال ہے تو خالق کا کیا حال ہوگا۔“ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَفْضَلُ الدُّعَاءِ الْحَمْدُ لِلَّهِ» [ابن ماجہ، الأُدب، باب فضل الحامدين : ۳۸۰۰۔

ترمذی : ۳۳۸۲، عن جابر رضی اللہ عنہ] ”سب سے بہتر ذکر لا الہ الا اللہ ہے اور سب سے بہتر دعا الحمد للہ ہے۔“ مقصد یہ ہے کہ پروردگار! ہم جو مانگ رہے ہیں اور جو کچھ ہمارے دل میں ہے تو سب کچھ جانتا ہے، بے شک اللہ پر آسمان میں کوئی چیز ہو یا زمین میں، مخفی نہیں رہتی۔ سو ہماری ظاہر درخواستوں کے ساتھ دلی مرادیں بھی پوری کر دے۔ یاد رہے کہ وہ مشہور روایت جس میں ذکر ہے کہ آگ میں پھینکے جانے کے وقت بارش کے فرشتے نے ابراہیم علیہ السلام کو مدد کی پیش کش کی تو یہ جاننے کے بعد کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے کے بجائے اپنی مرضی سے آیا ہے، تو انھوں نے مدد قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جب اس نے کہا کہ پھر آپ خود ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تو فرمایا: «حَسْبِيَ عَنْ سُؤَالِي عِلْمُهُ بِحَالِي» یا فرمایا: «عِلْمُهُ بِحَالِي يُغْنِي عَن سُؤَالِي» ”مجھے سوال کرنے کے بجائے یہی کافی ہے کہ وہ میرے حال کو جانتا ہے۔“ سو یہ محض ایک اسرائیلی روایت ہے جس کی کچھ حقیقت نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ لَمَّا يَدْعُ اللَّهَ سُبْحَانَهُ غَضِبَ عَلَيْهِ» ”جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دعا نہ کرے اللہ

تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے۔“ [ابن ماجہ، الدعاء، باب فضل الدعاء : ۳۸۲۷۔ السلسلة الصحيحة : ۳۲۳/۶، ح : ۲۶۵۴]

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ ذَٰخِرِينَ﴾ [السومن : ۶۰] ”اور تمہارے رب نے فرمایا مجھے پکارو (مجھ سے دعا کرو) میں تمہاری دعا قبول کروں گا، بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عقرب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔“ ایسی روایات صوفی لوگ اپنے خود ساختہ وظائف و چلہ جات کو رائج کرنے اور دعا سے محروم کرنے کے لیے بیان کیا کرتے ہیں۔

② بعض مفسرین نے فرمایا کہ اہل مکہ کے لیے صحیح عقیدے اور امن اور کھانے پینے کی چیزیں عطا کرنے کی دعا کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرہ و اسماعیل علیہم السلام سے جدائی کے وقت گزرنے والی کیفیت، جو آنکھوں کے آنسوؤں یا دل کی بے قراری کی وجہ سے دونوں میاں بیوی پر گزر رہی تھی، وہ پیش کی ہے، مگر شکوے کا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لائے، یہ حوصلہ پیغمبروں اور ان کے اہل بیت ہی کا ہوتا ہے۔

﴿۳۹﴾ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي.....: ”وَهَبَ يَهَبُ هِبَةً“ کا معنی کسی معاوضے کے بغیر عطا کر دینا ہے۔

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِي ۗ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَاءِ ﴿۱۰﴾

اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی، اے ہمارے رب! اور میری دعا قبول کر ﴿۱۰﴾

معلوم ہوا اولاد اللہ تعالیٰ کا بہرہ ہے، یہ صرف اسباب جمع ہو جانے سے نہیں ہوتی، ورنہ ہر تندرست جوڑے کے ملنے سے اولاد ہو جاتی، بلکہ یہ محض عطاء الہی ہے، وہ بھی اس کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے، چاہے تو لڑکے ہی دے، چاہے لڑکیاں، چاہے دونوں ملا کر دے اور چاہے تو بے اولاد رکھے۔ (مزید دیکھیے الشوری: ۵۰) رازی نے فرمایا، قرآن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ دونوں بیٹے بڑی عمر اور بڑھاپے میں عطا کیے گئے، لیکن یہ بات کہ اس وقت آپ کی عمر کیا تھی معلوم نہیں ہوتی، اس کے لیے صرف اسرائیلی روایات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو ابراہیم علیہ السلام ننانویں (۹۹) برس کے تھے اور اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو آپ ﷺ کی عمر ایک سو بارہ (۱۱۲) برس تھی۔ مگر رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ہم اس کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتے۔

﴿۱۰﴾ لَسَيُعْمَدُ الدُّعَاءُ: لفظی معنی ہے ”دعا کو بہت سننے والا“ مگر مراد قبول کرنے والا ہے، جیسے کہا جاتا ہے، فلاں کی تو سنی گئی، یعنی مراد پوری ہو گئی۔

آیت 40 ﴿۱۰﴾ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ: یہ ابراہیم علیہ السلام کی عاجزانہ دعاؤں کا آخری حصہ ہے، جس میں انھوں نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے اس چیز پر پابند رہنے کی دعا کی ہے جو توحید و رسالت کے یقین و اقرار کے بعد اسلام میں سب چیزوں سے زیادہ ضروری ہے، یعنی نماز جو خاشعین (عاجزی کرنے والوں) کے سوا سب لوگوں کے لیے نہایت دشوار ہے (دیکھیے بقرہ: ۴۵، ۴۶) اور جس کے متعلق موسیٰ علیہ السلام (حَزَاهُ اللَّهُ عَنَّا وَ عَنْ جَمِيعِ اُمَّتِنَا اُحْسَنَ الْحَزَاءِ) نے کہا تھا کہ میں نے بنی اسرائیل کو بہت زیادہ بھگتا ہے، آپ کی امت پانچ نمازوں کی طاقت بھی نہیں رکھے گی۔ سو جو ایمان و کفر کے درمیان فرق کرنے والی سب سے نمایاں چیز ہے، ابراہیم علیہ السلام کو اس کی اتنی فکر تھی کہ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے اس کی پابندی کی خاص طور پر دعا کی۔

﴿۱۰﴾ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِي: ”اور میری اولاد میں سے بھی“ بظاہر یہ ”میں“ تعجیض کے لیے ہے، یعنی مجھے اور میری اولاد میں سے بھی کچھ نماز کے پابند بنا، مگر اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے ساری اولاد کے لیے یہ دعا کیوں نہ کی؟ اس کا جواب اکثر مفسرین نے یہ دیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو انسانی تاریخ سے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان ”لَا يَتَّأَلُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ“ سے اندازہ تھا کہ ساری اولاد نمازی نہیں ہو سکے گی، اس لیے انھوں نے یہ دعا کی کہ ایسا نہ ہو کہ اولاد میں سے کوئی بھی نمازی نہ رہے، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ انھوں نے دعا کی تھی: ﴿رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ [البقرہ: ۱۲۸]

”اے ہمارے رب! اور ہمیں اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت اپنے لیے فرماں بردار بنا۔“

ابن عاشور صاحب ”التحریر و التنوير“ نے لکھا ہے: ”یہ ”میں“ ابتدا سے ہے، تعجیض کے لیے نہیں اور ”مِنْ ذُرِّيَّتِي“

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدِيْ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۗ وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَنَّا ۗ
يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۳۱﴾

اے ہمارے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور ایمان والوں کو، جس دن حساب قائم ہوگا ﴿۳۱﴾ اور تو اللہ کو ہرگز اس سے غافل گمان نہ کر جو ظالم لوگ کر رہے ہیں، وہ تو انہیں صرف اس دن کے لیے مہلت دے رہا ہے جس میں آنکھیں کھلی رہ جائیں گی ﴿۳۱﴾

مذروف کی صفت ہے جس کا عطف یا ئے مکلم پر ہے۔ مقدر عبارت اس طرح ہوگی: ” رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ اجْعَلْ مُقِيْمِيْنَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ “ یعنی مجھے نماز کا پابند بنا اور نماز کا پابند ان کو بھی بنا جو میری اولاد میں سے ہوں۔ ” وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لَّكَ “ کی ترکیب بھی اسی طرح ہو سکتی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ دعا مانگتے وقت یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پرستی سے بچنے کی دعا تو اپنے اور اپنی ساری اولاد کے لیے کریں، فرمایا: ﴿وَ اجْتَنِبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نُّعْبَدَ الضَّمٰنَ﴾ [ابراہیم: ۳۵] (اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بت پوجنے سے بچائے رکھ) مگر نماز کا پابند بنانے کی دعا سب کے لیے کرنے کے بجائے بعض کے لیے کریں۔ جب ہم خود دعا کرتے وقت یہ پسند نہیں کرتے کہ یہ دعا کریں کہ یا اللہ! ہماری کچھ اولاد کو نمازی بنا تو ابراہیم علیہ السلام کیسے پسند کر سکتے ہیں؟“ ابن عاشور کی بات دل کو لگتی ہے۔ (واللہ اعلم)

﴿رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَاؤَنَا﴾: دعا کے بعد پھر قبولیت کی درخواست اپنے عجز کا اظہار اور قبولیت پر اصرار ہے۔ ”دُعَاؤَنَا“ پر کسرہ اس لیے ہے کہ یہ اصل میں ”دُعَائِنَا“ تھا، آیات کے فواصل کی موافقت کے لیے یا، حذف کر کے کسرہ اس پر دلالت کے لیے باقی رکھا گیا ہے۔

آیت 41 رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدِيْ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ: والد کے لیے بخشش کی دعا وہ وعدہ پورا کرنے کے لیے تھی جو انہوں نے گھر سے نکلنے وقت اس سے کیا تھا، مگر جب وہ شرک ہی پر فوت ہو گیا اور اللہ سے اس کی دشمنی ختم ہونے کی امید ہی نہ رہی تو وہ اس سے صاف بری ہو گئے۔ (دیکھیے توبہ: ۱۱۴) رہی اپنی والدہ کے لیے دعا تو شاید وہ پہلے ہی مسلمان ہو چکی ہوں گی، اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق تفصیل سے کچھ بیان نہیں فرمایا۔ تمام مومنین کے حق میں مغفرت کی دعا نوح علیہ السلام (نوح: ۲۸) سے لے کر ہمارے نبی کریم ﷺ (بخاری: ۵۱۰) تک انبیاء اور اہل ایمان کرتے چلے آئے ہیں۔ (دیکھیے حشر: ۱۰)

آیت 42 ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا: ”الظّٰلِمُوْنَ“ سے مراد یہاں کفار اور مشرکین ہیں اور یہ بات اس سورت کی آیت (۴۴) سے صاف واضح ہو رہی ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ ان کفار کو مہلت دے رہا ہے تو مت سمجھو کہ وہ ان کے اعمال سے بے خبر ہے۔

فَهَطِيعِينَ مُقْنِعِي رُؤُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ ۝ وَأَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا أَخْرِنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۖ نَحْبِبْ دَعْوَتَكَ وَتَتَّبِعِ الرَّسُولَ ۖ أَوْلَمْ نَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلِ مَا لَكُم مِّنْ زَوَالٍ ۝

اس حال میں کہ تیز دوڑنے والے، اپنے سروں کو اوپر اٹھانے والے ہوں گے، ان کی نگاہ ان کی طرف نہیں لوٹے گی اور ان کے دل خالی ہوں گے ۝ اور لوگوں کو اس دن سے ڈرا جب ان پر عذاب آئے گا، تو وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا، کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں قریب وقت تک مہلت دے دے، ہم تیری دعوت قبول کریں گے اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے۔ اور کیا تم نے اس سے پہلے قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تمہارے لیے کوئی بھی زوال نہیں ۝

② إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ: "تَشْخُصُ" باب "مَنْعَ" سے ہے، "شَخُوصٌ" کا معنی ہے خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے آنکھوں کا کھلا رہ جانا، حرکت نہ کرنا۔

آیت 43 "فَهَطِيعِينَ" تیز دوڑنے والے۔ "أَهْطَعَ يُهْطِعُ" (افعال) کا معنی ہے تیز دوڑنا۔ یہ لفظ سورہ قمر (۸) اور سورہ معارج (۳۶) میں بھی انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے، یعنی قبروں سے نکل کر صورت کی آواز کی طرف تیزی سے اس طرح دوڑ کر جا رہے ہوں گے کہ سر اوپر کی طرف اٹھے ہوئے اور آنکھیں کھلی، ٹنگلی بندھی ہوگی۔ "مُقْنِعِي" یہ لفظ اصل میں باب افعال سے مذکر اسم فاعل "مُقْنِعِينَ" تھا، "رُؤُوسِهِمْ" کی طرف مضاف ہونے سے نون گر گیا، اس کا معنی ہے دائیں بائیں دیکھے بغیر اوپر کو سر اٹھانا، بعض نے اس کا معنی سر جھکانا بھی کیا ہے۔ (ططاوی) "أَفْئِدَةٌ" "فُؤَادٌ" کی جمع ہے، یعنی دل۔ "هَوَاءٌ" کا معنی ہے خالی، یعنی ان کے دل گھبراہٹ کی وجہ سے سوچ سمجھ سے خالی ہوں گے۔

آیت 44 : ① وَأَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ: یعنی لوگوں کو اس دن سے ڈرایے۔ لوگوں سے مراد تمام لوگ ہیں، کیونکہ ڈرانے کی ضرورت تو نیک و بد ہر شخص کو ہے۔ اگرچہ اہل ایمان کی جزا کا بھی وہی دن ہے مگر یہاں مقام ڈرانے کا ہے، اس لیے اسی کا ذکر فرمایا، یا "النَّاسَ" سے خصوصاً کفار مراد ہیں۔ عذاب کا دن ظالموں کے لیے دنیا میں کسی وقت اور کسی صورت میں ہو سکتا ہے، موت کا وقت بھی مراد ہے اور قیامت کا بھی۔ اس وقت کفار اللہ تعالیٰ کی دعوت قبول کرنے اور رسولوں کی پیروی کرنے کے لیے مہلت مانگیں گے، مگر مہلت کہاں۔ اس مفہوم کی آیات قرآن مجید میں بہت ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ مومنون (۹۹، ۱۰۰)، سورہ سجدہ (۱۲) اور منافقون (۱۰، ۹)۔

② أَوْلَمْ نَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلِ: "ذَوَالٍ" کا معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ، یا ایک حالت سے دوسری کی طرف منتقل ہونا ہے، یہاں مراد دوبارہ زندہ ہو کر اور قبروں سے نکل کر آخرت کی زندگی کی طرف منتقل ہونا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی

وَسَكُنْتُمْ فِي مَسْكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمْ الْأَمْثَالَ ﴿۵﴾ وَقَدْ نَكَّرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ

الْحَبَالُ ﴿۵﴾

اور تم ان لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں آباد رہے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور تمہارے لیے خوب واضح ہو گیا کہ ہم نے ان کے ساتھ کس طرح کیا اور ہم نے تمہارے لیے کئی مثالیں بیان کیں ﴿۵﴾ اور بے شک انہوں نے تدبیر کی، اپنی تدبیر اور اللہ ہی کے پاس ان کی تدبیر ہے اور ان کی تدبیر ہرگز ایسی نہ تھی کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں ﴿۶﴾ طرف سے فرشتے انہیں کہیں گے کہ تم نے تو دنیا میں قسمیں کھائی تھیں کہ مرنے کے بعد ہمیں کبھی دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔ اس کا مقصد انہیں ان کا ماضی یاد دلا کر مزید ذلیل و خوار کرنا ہو گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَقْسُوا يَا اللَّهُ جَهْدَ آيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثَ اللَّهُ فَنًا يُمُوتُ بَيْتِي وَنَدَّ عَلَيْهِ حَقًّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [النحل: ۳۸] اور انہوں نے اپنی کئی قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ اللہ اسے نہیں اٹھائے گا جو مر جائے۔ کیوں نہیں! وعدہ ہے اس کے ذمے سچا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تم تو ایسے متکبر بن گئے اور موت کو بھول بیٹھے تھے کہ قسمیں اٹھاتے تھے کہ ہمارے عروج کو کبھی زوال نہیں۔

آیت 45 وَسَكُنْتُمْ فِي مَسْكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ یعنی تم لوگ اسی عرب، یمن، عراق اور مصر وغیرہ میں رہ رہے ہو جہاں تم سے پہلے عاد، ثمود، قوم نوح و ابراہیم، قوم لوط اور قوم فرعون رہتے تھے اور ان کے گناہوں کی سزا میں ہم نے ان پر جو عذاب نازل کیے وہ سب تمہیں اچھی طرح معلوم ہو چکے، گو تم زبان سے اقرار نہیں کرتے۔ ہم نے تو تمہیں اپنی کتابوں میں اور اپنے پیغمبروں کی زبانی مثالیں دے دے کر بھی سمجھایا، مثلاً کھسی کی مثال (ج: ۷۳)، عکبوت یعنی مکڑی کی مثال۔ (عکبوت: ۴۱)، کتے کی مثال (اعراف: ۱۷۶) اور سراپ کی مثال (نور: ۳۹) وغیرہ۔ اس کے علاوہ پہلے کفار کے انجام بطور مثال بھی مراد ہو سکتے ہیں، مثلاً عاد و ثمود، فرعون، قوم نوح وغیرہم۔ دیکھیے سورہ رعد (۶) اور یونس (۱۰۴)۔

آیت 46 ﴿۱﴾ وَقَدْ نَكَّرُوا مَكْرَهُمْ یعنی ان پہلے کفار اور موجودہ کفار نے اپنے انبیاء اور اہل ایمان کے خلاف اپنی زیادہ سے زیادہ اور خطرناک سے خطرناک جو بھی خفیہ تدبیر اور سازش وہ کر سکتے تھے کی۔ ”مَكْرَهُمْ“ سے یہی مراد ہے اور اللہ کو ان کی ہر سازش کا علم تھا۔ اس آیت کے تحت تفسیروں میں نمرود کا قصہ بھی ذکر کر دیا گیا ہے جو صحت کے ساتھ ثابت نہیں۔ (رازی)

﴿۲﴾ وَإِنْ كَانَ مَكْرَهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْحَبَالُ: یہ ”اِنْ“ نافیہ (یعنی نہیں کے معنی میں) ہے، اس کے بعد لام پر کسرہ ہے، اسے لام جحد کہتے ہیں جو نفی کی تاکید کے لیے آتا ہے اور اس کے بعد فعل مضارع ”اَنْ“ کے ساتھ منصوب ہوتا ہے جو لام جحد

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخَلَّفًا وَعَدِمَ رَسُولَهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۳۸﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ
غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتُ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۳۹﴾

پس تو ہرگز گمان نہ کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا ہے۔ یقیناً اللہ سب پر غالب، بدلے لینے والا ہے ﴿۳۸﴾ جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل دی جائے گی اور سب آسمان بھی اور لوگ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، جو اکیلا ہے، بڑا زبردست ہے ﴿۳۹﴾

کے بعد و جو با محذوف ہوتا ہے۔ عام قراءت یہی ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ ”ان کی تدبیر ہرگز ایسی نہ تھی کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں“ یعنی اللہ کا دین جو پہاڑوں کی طرح مستحکم ہے ان کی سازشیں کسی صورت اسے نقصان نہ پہنچا سکتی تھیں۔

کسانی کی قراءت اس سے مختلف ہے، وہ ”تَنْزُولٌ“ کو لام کے فتح کے ساتھ اور ”نَزْوُلٌ“ کو مرفوع پڑھتے ہیں۔ اس صورت میں ”إِنْ كَانَ مَكْرَهُمْ“ میں ”إِنْ“ ”إِنَّهُ“ کا (یعنی حرف مشبہ بالفعل ”إِنْ“ اور اس کے اسم ضمیر شان ”هُ“ کا قائم مقام) مخفف ہے اور ”تَنْزُولٌ“ میں لام ابتدا تاکید کے لیے ہے۔ معنی یہ ہو گا کہ یقیناً ان کی تدبیر اور سازش ایسی خطرناک اور شدید خوف ناک تھی کہ پہاڑ بھی (اگر کسی طرح اپنی جگہ سے ٹل سکتے تو) ان سازشوں سے ضرور ہی ٹل جاتے۔

یاد رہے کہ یہ ترجمہ ”تَنْزُولٌ“ یعنی لام ابتدا مفتوح اور آخری لام مرفوع پڑھنے کی صورت میں ہو گا، پہلی قراءت (یعنی پہلا لام مکسور اور آخری منصوب) کا یہ ترجمہ اگر کوئی کر لے تو وہ درست نہیں ہو گا۔ معنوی طور پر دوسری قراءت بھی بہت عمدہ ہے اور پہلی بھی۔

آیت 47 فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخَلَّفًا وَعَدِمَ رَسُولَهُ.....: اللہ کے وعدے سے مراد دنیا و آخرت میں اللہ کے رسولوں اور اہل ایمان کی نصرت و عزت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ [المؤمن: ۵۱] ”بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔“ مزید دیکھیے سورہ مجادلہ (۲۱) اور سورہ ابراہیم (۱۳، ۱۴) کی تفسیر۔ اس سے مقصود ایک طرف تو رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا اور دوسری طرف آپ کے مخالفین کو متنبہ کرنا ہے کہ جس طرح پہلے انبیاء ﷺ سے جو ہم نے وعدے کیے وہ سب پورے کیے اسی طرح اپنے آخری رسول ﷺ سے تائید و نصرت کا جو وعدہ کر رہے ہیں اسے بھی یقیناً پورا کریں گے اور ان لوگوں کو تباہ و برباد کریں گے جو آپ کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں، کیونکہ اللہ سب پر غالب ہے، انتقام والا ہے۔

آیت 48 ﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتُ﴾: اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز زمین و آسمان کی موجودہ

و تَرَى الْمَجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ﴿۴۹﴾

اور تو مجرموں کو اس دن زنجیروں میں ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے ہوئے دیکھے گا ﴿۴۹﴾

اس کی صورت بدل جائے گی۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «تَكُونُ الْأَرْضُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عُيْبَةً وَاحِدَةً تَتَكَفَّوْهَا الْجَبَّارُ بِيَدِهِ كَمَا يَكْفُو أَحَدَكُمْ حُبْرَتَهُ فِي السَّفَرِ نَزْلًا لِأَهْلِ الْحَنَةِ» [بخاری، الرقاق، باب يقبض الله الأرض يوم القيامة، ۵۲۰: مسلم، ۲۷۹۰] "قیامت کے دن زمین ایک روٹی بن جائے گی، جبار (اللہ تعالیٰ) اسے اپنے ہاتھ میں الٹ پلٹ کرے گا جس طرح تم میں سے کوئی شخص سفر میں اپنی روٹی الٹ پلٹ کرتا ہے، اہل جنت کی مہمان نوازی کے لیے۔"

ابن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے سنا، فرماتے تھے: «يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى أَرْضٍ بَيْضَاءَ عَفْرَاءَ كَعَفْرَةِ نَعْيٍ، لَيْسَ فِيهَا مَعْلَمٌ لِأَحَدٍ» [بخاری، الرقاق، باب يقبض الله الأرض يوم القيامة: ۶۵۲۱-۲۷۹۰] "لوگ قیامت کے دن سفید نیالی زمین پر اکٹھے کیے جائیں گے، جیسے میدے کی روٹی ہوتی ہے، اس میں کسی کا کوئی نشان نہیں ہوگا۔" قرآن مجید میں بھی ہے کہ قیامت کے دن زمین صاف چٹیل میدان بن جائے گی جس میں کوئی بلندی یا پستی نظر نہیں آئے گی۔ (دیکھئے طہ: ۱۰۵ تا ۱۰۷) رہا یہ سوال کہ یہ تبدیلی زمین و آسمان کی ذات میں ہوگی یا ان کی صفات میں، تو اس کے بارے میں قرآن مجید یا حدیث رسول ﷺ سے کوئی چیز ثابت نہیں، اس لیے ہمیں اسی پر یقین رکھنا ہوگا جو قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔

﴿وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾: یہ ان مشرکین کے رد کے لیے فرمایا جو اپنے شرکاء کا بھی کچھ اختیار سمجھتے ہیں کہ اس دن سب لوگ اس اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں گے جو اکیلا ہے، بڑا بردست ہے، کوئی دوسرا کسی اختیار کا مالک نہ ہوگا۔

آیت 49 ﴿و تَرَى الْمَجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ﴾: "مقرن" قاف اور راء کے فتح کے ساتھ، وہ رسی جس میں دو تیل یا دو آدمی اکٹھے بندھے ہوتے ہیں۔ "مقرنین" کئی آدمی جو آپس میں اکٹھے جکڑے ہوتے ہوں۔ سورہ قص (۳۸) میں ہے: ﴿وَأَخْرَجْنَا مَقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ﴾ یعنی سلیمان علیہ السلام کے تابع کئی جن کر دیے جو زنجیروں میں باہم جکڑے ہوئے تھے۔ لسان العرب میں ہے کہ "مقرنین" یا تو "مقرؤیین" کے معنی میں ہے، یا باب تفعیل تکثیر کے لیے ہے، یعنی کئی مجرم آپس میں زنجیروں میں بری طرح جکڑے ہوئے ہوں گے۔

﴿فِي الْأَصْفَادِ﴾: "أَصْفَادٌ" "صَفْدٌ" (فاء کے فتح کے ساتھ) کی جمع ہے جو اس زنجیر کو کہتے ہیں جو پاؤں میں ڈالی جائے، یا وہ طوق جس کے ساتھ ہاتھ پاؤں کو گردن کی طرف باندھ دیا جاتا ہے۔ [الوسیط للطنطاوی] یعنی اے مخاطب! تو

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطْرَانٍ وَ تَغْشَىٰ وُجُوهُهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾

ان کی قمیصیں رال (بیروزا) کی ہوں گی اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپے ہوگی ﴿۵۰﴾

اس دن کئی مجرموں کو ایک دوسرے کے ساتھ زنجیروں میں بندھے ہوئے دیکھے گا۔ ہر قسم کا مجرم اپنے جیسے مجرموں کے ساتھ جکڑا ہوا ہوگا۔ دیکھیے سورہ فرقان (۱۳) اور سورہ حاقہ (۳۳ تا ۳۰) اور ہر فاسق اپنے جیسے فاسق کے ساتھ ہوگا۔ دیکھیے سورہ صافات (۲۲، ۲۳) اور مریم (۶۸)۔

آیت 50 سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطْرَانٍ: ”سَرَابِيْلُ“ ”سِرْبَالُ“ کی جمع ہے، بمعنی قمیص۔ ”قَطْرَانِ“ کا معنی قاموس اور لسان العرب میں ہے ابل، صنوبر (چلنوزہ) اور اس قسم کے درختوں مثلاً چیز یا دیار وغیرہ سے نکلنے والی گوند، یعنی رال یا گندہ بیروزا جو تیزی سے جلتا ہے اور سخت بدبودار ہوتا ہے، خارش زدہ اونٹوں کو ملا جاتا ہے۔ تمام مترجمین کی طرح میں نے بھی پہلے اس کا ترجمہ گندھک کیا تھا، مگر تفسیر کے وقت مختلف لغات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ”قَطْرَانِ“ رال (بیروزا) ہے۔ بعض اہل علم نے اس کا ترجمہ تارکول کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اس کا مادہ ”قَطْرُ“ ٹپکنے کا مفہوم رکھتا ہے، اس لیے اس میں وہ تمام مائع چیزیں مراد ہو سکتی ہیں جو اشتعال پذیر یعنی شعلہ پکڑنے والی ہیں۔ (واللہ اعلم) ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «النَّارِحَةُ إِذَا لَمْ تَنْبُ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِّنْ قَطْرَانٍ، وَدِرْعٌ مِّنْ حَرْبٍ» [مسلم، الحنائل، باب التشديد في النياحة: ۹۳۴] ”نوحہ یعنی ماتم و بین کرنے والی عورت اگر مرنے سے پہلے تو پہ نہ کرے تو قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گی کہ اس پر ”قَطْرَانِ“ کی قمیص اور خارش کا کرتہ ہوگا۔“ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت ہے ”مِن قَطْرَانِ“ یعنی ان کی قمیصیں کھولتے ہوئے تانبے سے ہوں گی، مگر پہلی قراءت ”قَطْرَانِ“ متواتر اور راجح ہے۔ چہروں کو آگ سے ڈھانپنے کا خصوصاً ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ جسم کا سب سے باعزت حصہ ہے، اس کا حال یہ ہوگا تو دوسرے حصوں کا کیا حال ہوگا۔

یہ معاملہ کفار کے ساتھ ہوگا، کیونکہ مومنوں کے جہدے کے آثار (نشانات) کو جلانا اللہ تعالیٰ نے آگ پر حرام کر دیا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک لمبی حدیث، جس میں قیامت کے کچھ احوال بیان ہوئے ہیں، اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «حَتَّىٰ إِذَا فَرَّغَ اللَّهُ مِنَ الْقَضَاءِ بَيْنَ الْعِبَادِ، وَ أَرَادَ أَنْ يُخْرِجَ بِرَحْمَتِهِ مَن أَرَادَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، أَمَرَ الْمَلَائِكَةَ أَنْ يُخْرِجُوا مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ لَا يُشْرِكُ بِاللَّهِ شَيْئًا، مِمَّنْ أَرَادَ اللَّهُ أَنْ يُرَحِّمَهُ مِمَّنْ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، فَيَعْرِفُونَهُمْ فِي النَّارِ بِأَثَرِ السُّجُودِ، تَأْكُلُ النَّارُ ابْنَ آدَمَ إِلَّا أَثَرَ السُّجُودِ، حَرَّمَ اللَّهُ عَلَى النَّارِ أَنْ تَأْكُلَ أَثَرَ السُّجُودِ» [بخاری، التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿... وَ جوه يومئذ ناصرة...﴾ [۷۴۳۷] ”جب اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلے سے فارغ ہوں گے اور اہل نار میں سے اپنی رحمت کے ساتھ جسے نکالنا چاہیں گے تو فرشتوں کو حکم دیں

لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ فَا كَسَبَتْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾ هَذَا بَلَّغٌ لِلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَ لِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَهٌُ وَاحِدٌ وَ لِيَذْكُرَ أُولَئِكَ الْأَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

تاکہ ہر جان کو اس کا بدلہ دے جو اس نے کمایا بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ﴿۵۱﴾ یہ لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے اور تاکہ انھیں اس کے ساتھ ڈرایا جائے اور تاکہ وہ جان لیں کہ حقیقت یہی ہے کہ وہ ایک ہی معبود ہے اور تاکہ عقلوں والے نصیحت حاصل کریں ﴿۵۲﴾

گے کہ وہ ان لوگوں کو آگ سے نکال لائیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا تھا، ان لوگوں میں سے جن پر اللہ رحم کرنا چاہتا ہوگا، جو "لا الہ الا اللہ" کی شہادت دیتے ہوں گے تو وہ انھیں آگ میں جہدے کے نشان کے ساتھ پچھانیں گے۔ آگ ابن آدم کو کھا جائے گی مگر جہدے کے نشان کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آگ پر حرام کر دیا ہے کہ وہ جہدے کے نشان کو کھائے۔"

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سب سے آخر میں جہنم سے نکلنے والے وہ ہوں گے جو شرک سے پاک ہوں گے اور جن کے جسم پر جہدے کے نشان ہوں گے۔ بے نماز اس نشان سے محروم ہوتے ہیں، انھیں اپنا انجام سوچ لینا چاہیے۔

آیت 51 ﴿۱﴾ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ فَا كَسَبَتْ: یعنی قیامت کے دن کا یہ سارا سلسلہ اس لیے ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کی کمائی کی جزا دے، نیکوں کو نیک اور بدوں کو بد جزا دے۔

﴿۲﴾ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ: اس میں دو چیزیں شامل ہیں، ایک تو یہ کہ یوم حساب بہت جلد آنے والا ہے، فرمایا: ﴿إِفْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ﴾ [الانبیاء: ۱] "لوگوں کے لیے ان کا حساب بہت قریب آگیا" اور فرمایا: ﴿أَنَّى أَمَرَ اللَّهُ فَلَا تَسْتَعْجِلُونَا﴾ [النحل: ۱] "اللہ کا حکم آگیا، سو اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو۔" دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کو حساب لینے میں کوئی دیر نہیں لگتی، آنکھ جھپکنے میں سب کچھ سامنے آجائے گا، فرمایا: ﴿وَ كُلُّ إِنْسَانٍ أَلْمَنَهُ ظَلِيمَةٌ فِي عُنُقِهِ مَوْ نُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ فَنُشْرُوا﴾ ﴿۱﴾ ﴿إِنَّا كَتَبْنَاكَ كَفَىٰ بِفَيْكِ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِينًا﴾ [بنی اسرائیل: ۱۳، ۱۴] "اور ہر انسان کو، ہم نے اسے اس کا نصیب اس کی گردن میں لازم کر دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کتاب نکالیں گے، جسے وہ کھولی ہوئی پائے گا۔ اپنی کتاب پڑھ، آج تو خود اپنے آپ پر بطور محاسب کافی ہے۔"

آیت 52 ﴿۱﴾ هَذَا بَلَّغٌ لِلنَّاسِ: اس آیت میں قرآن مجید نازل کرنے کے چار مقصد بیان ہوئے ہیں: ﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچ جائے۔ ﴿۲﴾ اس کے ذریعے سے وہ آگاہ ہو جائیں اور ڈر جائیں۔ ﴿۳﴾ لوگوں کو علم ہو جائے کہ عبادت صرف ایک اللہ کی کرنی ہے۔ ﴿۴﴾ عقلوں والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔ رازی نے فرمایا، معلوم ہوا کہ انسان میں عقل ہی اصل ہے، یہ نہ ہو تو وہ کبھی نصیحت حاصل نہیں کر سکتا۔

الرُّبْعَةُ تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُّبِينٍ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔
الرز۔ یہ کمال کتاب اور واضح قرآن کی آیات ہیں ①

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ②

بہت بار چاہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، کاش! وہ کس طرح کے مسلم ہوتے ②

آیت 1 الرُّبْعَةُ تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُّبِينٍ: "الکتاب" الف لام کی وجہ سے "کمال کتاب" ترجمہ کیا گیا ہے۔ "الکتاب" اور "قرآن" دونوں مبالغہ کے لیے مصدر ہیں (جن کا معنی ہے لکھنا اور پڑھنا) جو اسم مفعول کے معنی میں ہیں، یعنی یہ اس کلام کی آیات ہیں جو بے شمار بار لکھا ہوا اور بے حد حساب پڑھا ہوا ہے، فرمایا: ﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ﴿۱۷۸﴾ فِي كِتَابٍ مُّكْتُوبٍ ﴿۱۷۹﴾﴾ [الواقعة: ۷۷، ۷۸] "بلاشبہ یہ یقیناً ایک باعزت پڑھی جانے والی چیز ہے، جو ایک ایسی کتاب میں ہے جو چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔" لوح محفوظ میں لکھے جانے اور جبریل علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ سے لے کر قیامت تک نہ اس کے لکھنے والوں کا شمار ہے نہ پڑھنے والوں کا۔ پھر خوبی یہ کہ یہ کتاب ہے تو کمال (الف لام کی وجہ سے) اور قرآن ہے تو ہر بات کو کھول کر بیان کرنے والا۔ قیامت تک کوئی اس جیسی ایک سورت بھی بنا کر نہیں لاسکتا۔

آیت 2 ① رُبَمَا: "رُب" حرف جر ہے، "منا" بمعنی وقت۔ "رُب" کا لفظ تقلیل کے لیے آتا ہے، یعنی کسی وقت، جیسے: "رُبَّ أُنْثَىٰ لَمْ يَلِدْهُ أُمُّكَ" "کئی بھائی ہیں جنہیں تیری ماں نے نہیں جنا" اور تکثیر کے لیے بھی، مثلاً "رُبَّمَا يَنْجُو الدُّكَّانُ" "بہت دفعہ ذہن آدمی کامیاب ہو جاتا ہے۔" فرق موقع کو ملحوظ رکھ کر ہوتا ہے، مثلاً یہی مثال اگر اس طرح ہو کہ "رُبَّمَا يَنْجُو الدُّكَّانُ" تو معنی ہوگا "کسی وقت آدمی بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔" اس آیت میں بعض علماء نے یہ لفظ تقلیل کے لیے قرار دیا ہے، یعنی "کسی وقت" اور بعض نے تکثیر کے لیے، یعنی بہت بار، صاحب معنی اللیب کے بقول یہاں یہی معنی راجح ہے، کیونکہ مرنے کے بعد کفار کا ہر لمحہ اسی حسرت میں گزرے گا۔ "لَوْ" تمنی کے لیے ہے۔ ایسی چیز کی خواہش جو ناممکن ہو تمنی کہلاتی ہے، ممکن کی خواہش "ترتی" کہلاتی ہے۔

② يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا: یہ سورت کسی ہے، جب مسلمان ہر طرح کمزور اور مغلوب تھے تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی کہ وہ وقت آرہا ہے جب یہ کافر چاہیں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے، مگر وقت نکل جانے کے بعد کسی کام کی خواہش کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس وقت سے مراد دنیا میں ایسے مواقع بھی ہیں جب مسلمانوں کو فتح و کامرانی اور کفار کو شکست و رسوائی حاصل ہوگی، جیسے بدر، خیبر اور فتح مکہ وغیرہ اور کفار چاہیں گے کہ اس وقت مسلمان ہوتے تو ہمیں بھی یہ عزت و غنیمت ملتی اور موت کے وقت بھی اس تمنا کا اظہار کریں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُمْ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ﴿۱۰۰﴾﴾ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ذُرَّهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَشَعُّوا وَيُلْهِمُ الْأَمْلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۳﴾

انھیں چھوڑ دے، وہ کھائیں اور فائدہ اٹھائیں اور انھیں امید غافل رکھے، پھر جلدی جان لیں گے ﴿۳﴾

تَعْلَىٰ أَعْمَلُ صَالِحًا فَبِمَا تَرَكْتُ كَلِمًا إِتَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ﴿۱﴾ [المؤمنون: ۹۹، ۱۰۰] ”یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آتی ہے تو کہتا ہے اے میرے رب! مجھے واپس بھیجو، تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کوئی نیک عمل کر لوں۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک بات ہے جسے وہ کہنے والا ہے۔“ پھر موت کے بعد کی سختیوں میں، خصوصاً جب آگ میں داخل ہونے کو ہوں گے، فرمایا: ﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَلَيْتُنَا نَرُدُّ وَلَا نُكَلِّبُ بِأَيِّتِ رَبِّنَا وَنَكُونُ مِنَ الْمُنْذَرِينَ﴾ [الأنعام: ۲۷] ”اور کاش! تو دیکھے جب وہ آگ پر کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے اے کاش! ہم واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی آیات کو نہ جھٹلائیں اور ایمان والوں میں سے ہو جائیں۔“ اور سب سے زیادہ حسرت کے ساتھ یہ خواہش اس وقت کریں گے جب مسلمانوں میں سے جہنم میں جانے والے سب کے سب جہنم سے نکال لیے جائیں گے۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب اہل نار آگ میں جمع ہو جائیں گے اور ان کے ساتھ اہل قبلہ میں سے بھی وہ لوگ ہوں گے جنہیں اللہ چاہے گا تو کفار مسلمانوں سے کہیں گے: ”کیا تم مسلم نہیں تھے؟“ وہ کہیں گے: ”کیوں نہیں؟“ کفار کہیں گے: ”پھر تمہارے اسلام نے تمہیں کیا فائدہ دیا کہ تم بھی ہمارے ساتھ آگ میں پہنچ گئے؟“ وہ کہیں گے: ”ہمارے کچھ گناہ تھے جن کی وجہ سے ہم پکڑے گئے۔“ انھوں نے جو کچھ کہا اللہ تعالیٰ اسے سنے گا اور جو اہل قبلہ میں سے ہوں گے ان کے متعلق حکم دے گا اور وہ نکال لیے جائیں گے، تو جب جہنمی یہ دیکھیں گے تو کہیں گے: ”کاش! ہم بھی مسلم ہوتے اور ہم بھی اسی طرح نکل جاتے جیسے یہ نکلے ہیں۔“ (ابو موسیٰ رضی اللہ عنہما نے) کہا، پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿الَّذِينَ كَانُوا عَلَىٰ الْكُفْرِ وَفُتِنُوا مِنَ النَّارِ﴾ [البقرہ: ۲۴۲، ۲۴۳]۔ مسند نیک حاکم: ۲/۲۴۲، ح: ۲۹۵۴ [شیخ البانی رحمہ اللہ نے ”ظلال السنۃ“ میں اسے صحیح کہا ہے اور اس مفہوم کی کئی احادیث بیان کی ہیں۔

﴿۳﴾ ”مُنْذَرِينَ“ نکرہ ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ ”کاش! وہ کسی طرح کے مسلمان ہوتے“ یعنی گناہ گار بھی ہوتے تو آخر جہنم سے نکل ہی جاتے۔

آیت 3 ﴿۳﴾ ذُرَّهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَشَعُّوا: ”ذُرُّ“ مثال واوی سے فعل امر ہے، اس کا صرف امر اور مضارع استعمال ہوتا ہے، اس کے باقی صیغوں کی جگہ ”تَرَكُ“ کے مشتقات استعمال ہوتے ہیں۔ ”يُلْهِمُهُمْ“ ”لَهُمْ“ سے باب افعلال کا مضارع ”يُلْهِمُ“ ہے جو ”ذُرُّ“ کا جواب ہونے کی وجہ سے یا لام امر مقدر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، اس کی ”یاء“ اور ”يَأْكُلُوا“ اور ”يَتَشَعُّوا“ کا نون بھی اسی وجہ سے گر گئے ہیں۔ یہ سارے امر انھیں ڈانٹنے کے لیے ہیں، یہ نہیں کہ انھیں اجازت دی جا رہی ہے۔ اس معنی کی آیات کے لیے دیکھیے سورۃ مرسلات (۴۶)، سورۃ زخرف (۸۳) اور سورۃ طور (۲۵) وغیرہ۔ ”يَأْكُلُوا وَيَتَشَعُّوا“ سے معلوم ہوا کہ کفار کی زندگی کا مقصد ہی بس یہ ہے۔ ”الْأَمْلُ“ امید، کسی چیز کے حصول کی آرزو، عموماً جس کا حصول بعید ہو۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرِيْبَةٍ إِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ ﴿۵﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ﴿۶﴾ وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ﴿۷﴾

اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر اس حال میں کہ اس کے لیے ایک مقرر لکھا ہوا وقت تھا ﴿۵﴾ کوئی امت اپنے مقرر وقت سے نہ آگے بڑھتی ہے اور نہ وہ پیچھے رہتے ہیں ﴿۶﴾ اور انھوں نے کہا اے وہ شخص جس پر یہ نصیحت نازل کی گئی ہے! بے شک تو تو دیوانہ ہے ﴿۷﴾

﴿۲﴾ وَيْلَهُمُ الْأَمَلُ: ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَّزَ بَيْنَ يَدَيْهِ عَرَزًا ثُمَّ عَرَّزَ إِلَىٰ خَيْبِهِ آخَرَ ثُمَّ عَرَّزَ الثَّلَاثَ فَأَبْعَدَهُ، ثُمَّ قَالَ هَلْ تَدْرُونَ مَا هَذَا؟ قَالُوا أَلَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ هَذَا الْإِنْسَانُ وَهَذَا أَجَلُهُ وَهَذَا أَمَلُهُ يَتَعَاطَى الْأَمَلَ يَخْتَلِجُهُ دُونَ ذَلِكَ» [مسند أحمد: ۱۸/۳، ج: ۱۱۱۳۸، إسناده جيد] "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آگے ایک لکڑی گاڑی، پھر ایک اس کے پہلو میں گاڑی، پھر تیسری اس سے دور گاڑی، پھر فرمایا: "کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟" لوگوں نے کہا: "اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔" فرمایا: "یہ انسان ہے اور یہ اس کی اجل (موت) ہے اور وہ اس کی آرزو ہے۔ وہ آرزو حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور اس کے حصول سے پہلے اس کے راستے میں اجل رکاوٹ بن جاتی ہے۔" عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں: «صَلَّحَ أَوَّلَ هَذِهِ الْأُمَّةِ بِالرُّحْدِ وَالْبِقَعَيْنِ وَيُهْلِكُ آخِرَهَا بِالْبُخْلِ وَالْأَمَلِ» [سلسلة الأحاديث الصحيحة: ۳/۱۵، ج: ۳۴۲۷] "اس امت کے اول کی درنگی زہد اور یقین کے ساتھ ہے اور اس کا آخری حصہ بخل اور امل (امید) کے ساتھ ہلاک ہوگا۔"

آیت 4: إِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ: وہ مقرر لکھا ہوا وقت جب تک باقی رہا اللہ تعالیٰ نے انھیں مہلت دی، لیکن جو نبی مدت پوری ہوئی فوراً انھیں پکڑ لیا گیا۔ اس سے مقصود کفار مکہ کو متنبہ کرنا ہے کہ تم نے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جھٹلانے اور ٹھٹھا اڑانے کی جو روش اختیار کر رکھی ہے اور اس پر ابھی تک ہم نے گرفت نہیں کی تو اس سے تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ تمھاری گرفت ہوگی ہی نہیں؟

آیت 5: وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ: یعنی نہ وہ وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے اور نہ وقت مقرر پر ہلاک ہونے سے بچ سکتی ہے۔ نیز دیکھیے سورہ انعام (۲)۔

آیت 6: ﴿۱﴾ وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ: وہ یہ بات بھی استہزا کے لیے کہہ رہے ہیں، یہ نہیں کہ وہ اسے مانتے تھے۔ "الذِّكْرُ" سے ہر وہ چیز مراد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی، اس میں قرآن مجید بھی شامل ہے اور حدیث بھی۔ ﴿۲﴾ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ: بھجلی آیات میں کفار کو کتاب اللہ کے جھٹلانے پر ڈانٹا گیا تھا، اب ان کی سرکشی کا بیان ہے اور ان کے رسول کے ساتھ استہزا اور آپ کو جھٹلانے کا بیان ہے۔ وہ لوگ مذاق کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پاگل اور دیوانہ کہتے تھے، حالانکہ

لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلِكَةِ ۖ إِنَّ كُنْتُمْ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷﴾ مَا نُنزِّلُ الْمَلِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ مَا كَانُوْا اِذَا مُنْظَرِيْنَ ﴿۸﴾ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَكٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾

تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتا، اگر تو بچوں میں سے ہے ﴿۷﴾ ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر حق کے ساتھ اور اس وقت وہ مہلت دیے گئے نہیں ہوتے ﴿۸﴾ بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں ﴿۹﴾

آپ سب سے زیادہ عقل مند تھے۔ یہ ان کے کفر و استہزا کی بدترین صورت تھی اور انھوں نے یہ بات اس قدر مشہور کر رکھی تھی کہ صحیح مسلم میں ضحاک ازدی کا قصہ مذکور ہے کہ وہ ازد قبیلے کا ایک فرد تھا، مکہ آیا تو اس نے مکہ کے بے وقوفوں سے سنا کہ آپ مجنون ہیں، وہ آپ کے پاس آیا اور آپ کو آپ کا علاج کرنے کی پیش کش کی، آپ نے خطبہ مسنونہ پڑھا، اس نے درخواست کی کہ آپ اسے پھر پڑھیں، آپ نے تین دفعہ یہ خطبہ پڑھا، اس نے اس کی بے حد تعریف کی اور اسی پر مسلمان ہو گیا۔ [مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة و الخطبة : ۸۶۸] سبحان اللہ! علاج کے لیے آنے والے کا خود علاج ہو گیا۔

آیت 7 لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلِكَةِ : کہ فرشتے سامنے آ کر گواہی دیں کہ یہ واقعی اللہ کا سچا پیغمبر ہے، اس کی بیروی اختیار کرو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مطالبے کا کئی جگہ ذکر کیا ہے، فرمایا: ﴿وَقَالُوا لَوْلَا اُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ﴿۸﴾﴾ [الأنعام : ۸] ”اور انھوں نے کہا اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا؟“ اور دیکھیے سورہ زخرف (۵۳) اور سورہ فرقان (۲۲، ۲۱) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب آپ ﷺ ان کو عذاب سے ڈراتے تو انھوں نے ”لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلِكَةِ“ کہہ کر عذاب کا مطالبہ کیا ہو۔ (کبیر)

آیت 8 مَا نُنزِّلُ الْمَلِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ : یعنی فرشتے تو عین اس وقت نازل ہوتے ہیں جب کسی شخص کی موت کا وقت آ گیا ہو، یا کسی قوم پر عذاب کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہو، اس کے بعد انھیں مہلت نہیں دی جاتی۔

آیت 9 ﴿۱﴾ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ : یہاں اللہ تعالیٰ نے لفظ ”قرآن“ کے بجائے لفظ ”ذکر“ استعمال فرمایا، جس میں سب سے پہلے قرآن آتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾﴾ [یوسف : ۲] ”بے شک ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے، تاکہ تم سمجھو۔“ اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال یعنی حدیث بھی ذکر (نصیحت) ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ ﷺ کو اپنا نازل کردہ ذکر قرار دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿قَدْ اَنْزَلْنَا اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۗ رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ ﴿۱۰﴾﴾ [الطلاق : ۱۰، ۱۱] ”یقیناً اللہ نے تمہاری طرف ایک ذکر (نصیحت) نازل کیا ہے، جو ایسا رسول ہے کہ تمہارے سامنے اللہ کی واضح بیان کرنے والی آیات پڑھتا ہے۔“ علاوہ ازیں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بار بار آپ ﷺ جو کریں اسے کرنے کا اور جو کہیں اسے ماننے کا حکم دیا، پہلے کا نام اتار دیا ہے، دوسرے کا اطاعت ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ ﴿۳۱﴾﴾ [آل عمران : ۳۱] ”کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔“ اور فرمایا: ﴿قُلْ اطِيعُوا اللّٰهَ وَاطِيعُوا الرَّسُوْلَ ﴿۳۲﴾﴾ [آل عمران : ۳۲] ”کہہ دے اللہ اور رسول کا حکم مانو۔“

② إِنْ أَنْصَحْنَا نَزَّلْنَا: اس جملے میں اللہ تعالیٰ نے بے حد تاکید کے لیے لفظ ”ہم نے“ کو تین دفعہ دہرایا ”إِنَّا“ میں ”نَا“ (ہم نے) ، دوسرا ”نَحْنُ“ (ہم نے) اور تیسرا ”نَزَّلْنَا“ میں ”نَا“ (ہم نے)۔ بہت کوشش سے بھی تینوں تاکیدوں کا ترجمہ فصیح اردو میں مشکل ہے۔

③ یعنی یہ ”ذکر“ جس کے لانے والے کو تم دیوانہ کہہ رہے ہو، یہ تو خود ہم ہی نے نازل کیا اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ قاضی اسماعیل بصری سے پوچھا گیا کہ اس میں کیا راز ہے کہ پہلی کتابیں قرآن کی طرح محفوظ نہ رہ سکیں؟ انھوں نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت انسانوں کے ذمے لگائی تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ... بِمَا اسْتَحْفَظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ﴾ [المائدة: ۴۴] ”بے شک ہم نے تورات اتاری..... اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ بنائے گئے تھے“ جب کہ قرآن کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لی۔ (الموسیط) ایک حکمت یہ بھی ہے کہ قرآن وحدیث قیامت تک کے لیے تمام لوگوں کے لیے ہیں، جب کہ اس سے پہلے ہر کتاب ایک قوم اور ایک وقت تک کے لیے تھی۔ جس طرح قرآن اپنے الفاظ اور معانی کے اعتبار سے معجزہ ہے کہ جن و انس جمع ہو کر بھی اس جیسی ایک سورت نہیں بنا سکتے، اسی طرح یہ بھی اس کا معجزہ ہے کہ اس میں رد و بدل نہیں ہو سکے گا۔ قرآن کی حفاظت کا یہ وعدہ حیرت انگیز طور پر پورا ہو رہا ہے۔ قرآن کے سوا دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں جو چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اس طرح محفوظ ہو کہ اس کے کسی ایک حرف میں رد و بدل نہ ہوا ہو۔ دنیا بھر میں قرآن کے جتنے نسخے موجود ہیں ان میں معمولی سا بھی اختلاف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہے۔ مسلمانوں پر زوال اور غلامی کے ایام بھی آئے، مگر قرآن کی حفاظت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت جو کسی اور کتاب کو نصیب نہیں ہوئی اور قرآن کی اس طرح حفاظت کے غیر مسلم مخالف بھی معترف ہیں۔

④ منکرین حدیث عموماً حدیث سے انکار کے لیے کہتے ہیں کہ قرآن کی حفاظت کا تو اللہ نے وعدہ کیا، مگر حدیث کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا، اس لیے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ ان سے پوچھیے کہ اس کی کیا دلیل ہے؟ تو وہ یہ آیت پڑھیں گے، حالانکہ اس میں لفظ ”قرآن“ نہیں بلکہ ”الذِّكْرُ“ ہے، جس میں حدیث بھی شامل ہے اور اس کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے اتنا زبردست اور عجیب و غریب انتظام فرمایا کہ دنیا میں کسی شخص کے اقوال و افعال اور احوال اس طرح محفوظ نہیں ہیں جس طرح ہمارے نبی کریم ﷺ کے محفوظ ہیں۔ اس کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور محدثین نے اتنی محنت کی کہ آپ ﷺ کی پوری زندگی ہمارے لیے محفوظ فرمادی، جس کی پیروی اور اطاعت ہمارے لیے لازم تھی۔ اس حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں رجال اور اصول حدیث کے علوم کا الہام فرمایا اور انھوں نے ایک لاکھ سے زائد افراد کی زندگی کے حالات، ان کا قابل اعتبار ہونا یا نہ ہونا، ان کا سن پیدائش و وفات محفوظ فرمایا، جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ روایت جو آپ ﷺ کی طرف منسوب ہے، صحیح ہے یا نہیں۔ کسی نبی کی زندگی کے حالات اور اقوال و افعال کے لیے نہ یہ اہتمام کسی امت کو نصیب ہوا اور نہ کسی نبی کے حالات اس کا ہزارواں حصہ بھی ملتے ہیں جس قدر محمد رسول اللہ ﷺ کے حالات بحفاظت دنیا تک پہنچے ہیں۔ حقیقت یہ

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِعْرِ الْأَوَّلِينَ ۝۱۰ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝۱۱ كَذَلِكَ نَسُكُّهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۝۱۲ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَكَذَلِكَ نَسُكُّهُ
 الْأَوَّلِينَ ۝۱۳

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے اگلے لوگوں کے گردہوں میں رسول بھیجے ۱۰ اور ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا تھا مگر وہ اس کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے ۱۱ اسی طرح ہم یہ بات مجرموں کے دلوں میں داخل کر دیتے ہیں ۱۲ وہ اس پر ایمان نہیں لاتے اور یقیناً (یہی) پہلے لوگوں کا طریقہ گزرا ہے ۱۳

ہے کہ اگر حدیث محفوظ نہ ہو تو قرآن پر عمل ناممکن ہے، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج وغیرہ غرض کوئی چیز بھی حدیث کی تفصیل کے بغیر ادا کرنا ناممکن ہے۔ رہی یہ بات کہ احادیث میں ضعیف روایات کی آمیزش ہے تو جواب یہ ہے کہ جب اس کا حل موجود ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ محدثین نے صحیح و ضعیف کو الگ الگ کر دیا ہے۔ جس طرح شیعہ کے عقیدے سے کہ یہ قرآن وہ نہیں جو علیؑ یا اہل بیت کے پاس تھا، قرآن مجید کی صحت و عظمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ بے دلیل دعویٰ کچھ وزن نہیں رکھتا اور آج تک ان کے مزعوم قرآن کا کہیں وجود نہیں ملا، اسی طرح منکرین حدیث کے اعتراض سے حدیثوں کی حفاظت پر کوئی حرف نہیں آتا، کیونکہ یہ سب اعتراض لاعلمی یا الحاد کا نتیجہ ہیں اور ان سب کا جواب علمائے اسلام نے بہترین طریقے سے دے دیا ہے۔

۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ.....: "شِعْر" کی جمع ہے، معنی ہے لوگوں کا ایسا گردہ جو ایک طریقے اور مذہب پر متفق ہو، خواہ نیک ہوں یا بد۔ یہاں یہ لفظ برے شیعہ یعنی بری جماعت کے معنی میں ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ فَزَعُوا مِنْهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ﴾ [الأنعام: ۱۰۹] "بے شک وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر لیا اور کئی گردہ بن گئے، تو کسی چیز میں بھی ان سے نہیں۔" البتہ صافاٹ میں نیک معنی میں ہے: ﴿وَإِنْ مِنْ شِيَعِهِمْ لَا يَزِيلُهِمْ﴾ [الصافات: ۸۳] "اور بے شک اس کے گردہ میں سے ابراہیم بھی ہے۔" نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ان کے جھٹلانے اور استہزا سے رنجیدہ نہ ہوں، ہر زمانے میں کفار نے انبیاء کی اسی طرح ہنسی اڑائی ہے۔

۱۲ ۱۳ كَذَلِكَ نَسُكُّهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ.....: "نَسُكُّهُ" میں "ہ" ضمیر کے متعلق مفسرین نے دو وجہیں بیان کی ہیں، بعض نے کہا کہ "ہ" کی ضمیر "الذکر" کی طرف جارہی ہے، یعنی ہم مجرموں کے دلوں کے اندر ذکر کو داخل کر دیتے ہیں اور وہ اسے اچھی طرح سنتے اور سمجھتے ہیں، مگر اس طرح کہ وہ باوجود دل سے سمجھنے کے اس پر ایمان بالکل نہیں لاتے اور پہلے لوگوں میں بھی یہی طریقہ گزر چکا ہے اور وہ اسی کی پاداش میں تباہ کیے جاتے رہے ہیں۔ زحمتی، رازی اور سید قطاوی کی تفسیر کے مطابق "نَسُكُّهُ" اور "لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ" میں ضمیر ناسب کا مرجع ایک رہتا ہے۔ ہمارے استاذ شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكَّرَتْ
عَ أَنْبَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ﴿۱۵﴾ وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَ زِينَةً

اور اگر ہم ان پر آسمان سے کوئی دروازہ کھول دیں، پس وہ دن بھر اس میں چڑھتے رہیں ﴿۱۴﴾ تو یقیناً کہیں گے کہ بات یہی ہے کہ ہماری آنکھیں سختی سے باندھ دی گئی ہیں، بلکہ ہم جادو کیے ہوئے لوگ ہیں ﴿۱۵﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے آسمان میں کئی نے بھی یہی تفسیر ذکر فرمائی ہے۔

دوسری تفسیر امام المفسرین طبری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے کہ ”سُكَّرَتْ“ میں ضمیر ”ہ“ ”استہزا و کفر“ کی طرف جاتی ہے، یعنی ہم مجرموں کے جرائم کی پاداش میں ان کے دلوں میں کفر و استہزا داخل کر دیتے ہیں، اس طرح کہ وہ اللہ کے نازل کردہ ذکر پر بالکل ایمان نہیں لاتے، بلکہ اس سے استہزا کرتے ہیں اور پہلے لوگوں کا طریقہ بھی یہی رہا ہے۔ دونوں تفسیروں کا نتیجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔

آیت ۱۴ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ: ”ظَلُّ“ اور ”بَابُ“ میں وقت بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ ”ظَلُّ“ دن کو ہونا، ”بَابُ“ رات کو ہونا۔ اب ایک عجیب انداز میں ان کی بہت دھرمی اور ہر دلیل دیکھ کر بھی ایمان نہ لانے کا بیان ہوتا ہے، یعنی ان کا مطالبہ تو صرف فرشتے لانے کا ہے، اگر اس سے بڑھ کر عین دن کے بارے میں روشنی میں سب کے سامنے ہم آسمان کے دروازے کھول دیں اور یہ لوگ سیزمی لگا کر آسمان پر چڑھنے لگیں تو پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

آیت ۱۴ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكَّرَتْ أَنْبَارُنَا: ”سُكَّرَتْ“ ”سُكَّرًا“ باندھنا، روکنا اور بند کرنا، ”سُكَّرَتْ الْبَابُ“ ”میں نے دروازہ بند کیا۔“ ”سُكَّرَتْ“ باب تفعیل مبالغہ کے لیے ہے، یعنی یہی کہیں گے کہ جادو کے زور سے ہماری آنکھیں بالکل بند کر دی گئی ہیں، اس لیے جادو زدہ ہونے کی وجہ سے ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں محض خیال ہے اور فی الواقع انھوں نے یہ کام کر بھی دکھایا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرَضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَبْسَرٌ ﴿[القمر: ۱، ۲]﴾ ”قیامت بالکل قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا اور اگر وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (یہ) ایک جادو ہے جو گزر جانے والا ہے (یا ہمیشہ سے چلا آنے والا ہے)۔“

آیت ۱۴ ﴿۱﴾ وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا: ”بُرُوجُ“ کی جمع ہے، جو اصل میں بڑے بلند وبالا اور مزین قلعہ یا محل کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّمَا مَا تَكُونُوا يَذُرُّكُمْ لَوْ أَنَّمَا فِي السَّمَاءِ مِنَ السَّمَاءِ: [۷۸] ”تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمہیں پالے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔“ اس کا اصل معنی نمایاں اور ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ﴿وَلَا تَبْرَحْنَ فِي الْبُحْرِ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾ [الأحزاب: ۳۳] ”اور پہلی جاہلیت کے زینت لگا کر نمایاں ہونے کی طرح زینت لگا کر ظاہر نہ ہو۔“ مزید دیکھیے سورہ بروج کی پہلی آیت۔ پچھلی

لِلنَّظِيرِينَ ﴿١٦﴾ وَحَفَظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ﴿١٧﴾ إِلَّا مَنْ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاتَّبَعَهُ

برج بنائے اور اسے دیکھنے والوں کے لیے مزین کر دیا ہے ﴿١٦﴾ اور ہم نے اسے ہر مردود شیطان سے محفوظ کر دیا ہے ﴿١٧﴾ مگر

آیات رسالت کے بعد اب توحید کا بیان شروع ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید کے دلائل کے لیے پہلے عالم بالا کا ذکر فرمایا ہے، پھر زمین کا، پھر ان کے درمیان کی چیزوں کا اور اس کے بعد آدم و ابلیس کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہم نے آسمان میں عظیم الشان اور نمایاں برج بنائے ہیں، یعنی ستاروں کے نمایاں جھرمٹ، سورج اور چاند کی منازل جس سے رات کو ٹھنڈک والی روشنی اور دن کو تیز روشنی اور حرارت کے حصول کے علاوہ وقت، دنوں، مہینوں اور سالوں کا تعین ہوتا ہے۔ انسانوں، حیوانوں اور پودوں کی نشوونما، ان کی بقا اور بے انتہا ضرورتوں کا بندوبست ہوتا ہے، سمندر کا مد و جزر اور بے شمار فوائد جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں، انھی سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان سب کو بنانے والا، چلانے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے؟ کسی کا دعویٰ ہے تو اسے سامنے لاؤ۔ بعض اہل علم نے ”بروجاً“ ان مقامات کو بھی بتایا ہے جہاں آسمان کے محافظ فرشتے رہتے ہیں۔

﴿١٦﴾ وَذَيْفَهَا لِلنَّظِيرِينَ: اللہ تعالیٰ کی قدرت و توحید کے دلائل میں سے ایک بہت بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ اس نے آسمان کو چاند، ستاروں اور سورج سے مزین کر دیا ہے۔ رات کو ستاروں اور چاند کے ساتھ آسمان کی زینت کا نظارہ صحیح طرح وہاں ہوتا ہے جہاں مصنوعی روشنیاں نہ ہوں۔ یہ صرف ایک آسمان ہی پر موقوف نہیں، اس لاکھ دو قدرت والے نے جو چیز بھی پیدا کی خوب صورت پیدا کی اور اس میں زینت کا خاص اہتمام فرمایا، چھوٹے سے چھوٹے کیڑے سے لے کر بڑی سے بڑی مخلوق سب کچھ ہی کمال خوبصورت بنایا، فرمایا: ﴿الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ عَاقِلَةً وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِن طِينٍ﴾ [السجدة: ٧] ”جس نے اچھا بنایا ہر چیز کو جو اس نے پیدا کی اور انسان کی پیدائش توڑی سی مٹی سے شروع کی۔“ اسی لیے رسول اللہ ﷺ صاف ستھرا اور بن ستر کر رہنے کو پسند کرتے تھے، فرمایا: ((إِنَّ اللَّهَ حَمِيْلٌ يُحِبُّ الْحَمَالَ)) [مسلم، الإيمان، باب نحریم الکبیر و بیانہ: ٩١] ”بے شک اللہ خوبصورت ہے، خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔“ وہ سادھوؤں، جوگیوں یا راہبوں اور بے وقوف صوفیوں کی طرح گندے اور بدزیب ہو کر رہنے کو پسند نہیں کرتا۔ وہ دس چیزیں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے فطرت کا حصہ قرار دیا، مثلاً کلی، مسواک، ذریفہ کی صفائی وغیرہ، یہ اسی نظافت اور جمال کو کامل رکھتی ہیں۔

آیت 18.17 ﴿١٧﴾ وَحَفَظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ: یعنی آسمان کو ہم نے ہر مردود شیطان سے محفوظ رکھنے کا زبردست انتظام کر رکھا ہے۔

﴿١٧﴾ إِلَّا مَنْ اسْتَرَقَ السَّمْعَ.....: سرقہ چوری کو کہتے ہیں، باب استعمال سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی مگر جو نہایت کوشش سے، یا نہایت خفیہ رہ کر چوری کرے۔ ”السَّمْعَ“ مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، یعنی سنی ہوئی چیز چرالے۔ ”شہاب“ ہر روشنی کرنے والی چیز جو آگ سے پیدا ہو، عموماً ستارہ جو شعلے کی طرح پچھا کرتا نظر آتا ہے۔ ”شہابٌ مُہینٌ“ روشن شعلہ۔

شہابِ مبینؑ ۱۸

جو سنی ہوئی بات چرا لے تو ایک روشن شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے ۱۸

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: «إِذَا قَضَى اللَّهُ الْأَمْرَ فِي السَّمَاءِ صَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهِ كَالسَّلْسِلَةِ عَلَى صَفْوَانٍ ، فَإِذَا قَرَعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوا الَّذِي قَالَ الْحَقُّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ، فَيَسْمَعُهَا مُسْتَرَفِقُوا السَّمْعِ وَمُسْتَرَفِقُوا السَّمْعِ هَكَذَا ، وَاحِدٌ فَوْقَ آخَرَ - وَوَصَفَ سُفْيَانُ بِيَدِهِ وَفَرَّجَ بَيْنَ أَصَابِعِ يَدِهِ الْيُمْنَى ، نَصَبَهَا نَعْصَهَا فَوْقَ نَعْصِ فَرْيَمًا أَدْرَكَ الشَّهَابُ الْمُسْتَمِعَ قَبْلَ أَنْ يَرِيَهَا إِلَى صَاحِبِهِ فَيُخْرِقُهَا ، وَرَبَّنَا لَمْ يُدْرِكْهُ حَتَّى تَرِيَهَا بِهَا إِلَى الَّذِي يَلْبِيهِ ، إِلَى الَّذِي هُوَ أَسْفَلُ مِنْهُ حَتَّى يُلْفُوهَا إِلَى الْأَرْضِ ، فَتَلْقَى عَلَى فِمْ الشَّاحِرِ فَيَكْذِبُ مَعَهَا مِائَةَ كَذِبَةٍ ، فَيُصَدِّقُ كَذْبًا وَكَذْبًا فَوْجَدْنَاهُ حَقًّا لِلْكَلِمَةِ الَّتِي سَمِعَتْ مِنَ السَّمَاءِ» [بخاری، التفسیر، باب قولہ: ﴿إِذَا مِنْ اسْتَرَفِقَ السَّمْعِ.....﴾ ۴۷۰۱] ”جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کوئی حکم صادر فرماتا ہے تو اس کا کلام سن کر فرشتے اظہار اطاعت و عجز کے لیے اپنے بازو (پر) پھڑپھڑانے لگتے ہیں، (اس کلام کی آواز ایسی ہوتی ہے) جیسے کسی چٹان پر زنجیر کی آواز۔ پھر جب ان کے دلوں کا خوف جاتا رہتا ہے تو وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں کہ اس نے جو فرمایا حق فرمایا اور وہ بلند اور بڑا ہے۔ (اس وقت) فرشتوں سے سنائی دینے والی بات کو چوری سننے والے شیطان سننے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ چوری چھپے سننے والے اس طرح ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں“ اور راوی حدیث سفیان نے دائیں ہاتھ کی انگلیاں کھول کر ایک دوسرے کے اوپر کر کے دکھائیں ”پھر بعض اوقات وہ شعلہ سننے والے کو اس سے پہلے جا پہنچتا ہے کہ وہ اپنے ساتھی کو جلدی سے بتائے اور اسے جلا دیتا ہے اور بعض اوقات اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے ساتھ والے کو جلدی سے بتا چکا ہوتا ہے، جو اس سے نیچے ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے زمین تک پہنچا دیتے ہیں، تو وہ بات کا بہن (نجوی) یا جادوگر کو پہنچا دی جاتی ہے، وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا لیتا ہے تو اس کی بات کو سچا سمجھا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں، کیا اس نے ہمیں فلاں فلاں دن ایسے ایسے نہیں بتایا تھا اور ہم نے دیکھا کہ وہ بالکل درست تھا، اس بات کے متعلق جو آسمان سے سنی گئی تھی۔“ مزید دیکھیے سورہ صافات (۶، ۵) اور سورہ طارق (۳ تا ۱)۔

یاد رہے کہ شیطان صرف وہ بات چرا سکتے ہیں جس کا تعلق آئندہ ہونے والے ان کاموں سے ہوتا ہے، جن کے متعلق فرشتے آسمان کے نیچے آپس میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ فرشتے بادل میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں۔ [بخاری: ۴۷۰۱] مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کی طرف جو وحی ہوتی ہے، اس کی حفاظت کا اتنا زبردست انتظام ہوتا ہے کہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شیطان اسے سن سکے یا چرا سکے، دیکھیے سورہ جن کی ابتدائی اور آخری آیات کی تفسیر۔

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا سَرَاسِیَ وَابْتَثْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ ﴿۱۹﴾
وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرِزْقَيْنَ ﴿۲۰﴾

اور زمین، ہم نے اسے پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ رکھے اور اس میں ہر نئی تلی چیز اگائی ﴿۱۹﴾ اور ہم نے تمہارے لیے اس میں روزیاں بنائی ہیں اور ان کے لیے بھی جنھیں تم ہر گز روزی دینے والے نہیں ﴿۲۰﴾

آیت 19 ① وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا: اب زمین اور اس پر پیدا کردہ اشیاء کو تو حید کی دلیل کے لیے بیان کیا جا رہا ہے۔ ”مَدَدْنَاهَا“ ”مَدَّ بَمَدُّ“ (ن) کا معنی ہے کھینچنا، بھیلانا۔ جب ہم زمین کی وسعت اور پھیلاؤ کو دیکھتے ہیں تو وہ اتنی ہے کہ اس پر چلنے پھرنے، رہنے، کاشت کرنے، مکان یا سڑکیں بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی، مگر آنکھوں کو اس کی انتہا نظر نہیں آتی، خواہ کتنا سفر کر لیں۔ یہ پھیلاؤ اور مدد دلیل ہے کہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے گول بنایا ہے، ورنہ اگر یہ مربع یا کسی اور شکل کی ہوتی تو یہ پھیلاؤ کسی جگہ جا کر ختم ہو جاتا، اب تو گول زمین کی تصویریں بھی آچکی ہیں اور تجربے سے بھی یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے، اس کے باوجود اس کا جھکاؤ ایسا عجیب ہے کہ نہ نظر آتا ہے اور نہ اس کلیے میں کوئی فرق پڑتا ہے کہ ”پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے“ مگر سیکڑوں برس پہلے اس حقیقت کو وہی بیان کر سکتا تھا جس نے اسے پیدا کیا اور پھیلا یا ہے۔

② وَالْأَلْقَيْنَا فِيهَا سَرَاسِیَ: ”سَرَاسِیَ“ کی جمع ہے جو ”رَسَا یُرْسُو“ (ن) کا اسم فاعل ہے، جس کا معنی کسی بھاری چیز کا گڑا ہوا ہونا ہے۔ مراد پہاڑ ہیں جن کا اکثر حصہ زمین کے اندر اور باقی باہر ہوتا ہے۔ اس سے ایک دوسری حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ زمین کو متحرک بنایا گیا ہے، تبھی اس پر بھاری پہاڑ زمین کی گردش میں توازن رکھنے کے لیے گاڑ دیے گئے، تا کہ تیز رفتاری کے باوجود اس میں لرزش اور تھر تھراہٹ پیدا نہ ہو، جیسا کہ گاڑی کے پہیوں کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ان کی مختلف جگہوں پر ضرورت کے مطابق لوہے وغیرہ کے ٹکڑے لگا دیے جاتے ہیں۔ ایک اور آیت میں بھی یہ اشارہ موجود ہے: ﴿وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسِبُهَا جَآوِدًا وَهِيَ كَمُدَّ مَرَاتِحَآلٍ﴾ [النمل: ۸۸] ”اور تو پہاڑوں کو دیکھے گا، انھیں گمان کرے گا کہ وہ جیسے ہوئے ہیں، حالانکہ وہ بادلوں کے چلنے کی طرح چل رہے ہوں گے۔“

③ وَابْتَثْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ: ”فِيهَا“ یعنی زمین میں ہر چیز اتنی اگائی اور پیدا کی جتنی اس کی ضرورت تھی، نہ کسی چیز کو بلا ضرورت پیدا کیا اور نہ ایک خاص حد سے بڑھنے دیا۔ ”فِيهَا“ میں ضمیر جبال (پہاڑوں) کے لیے بھی ہو سکتی ہے، یعنی پہاڑوں کے اندر ہر چیز یعنی معدنیات وغیرہ پورے اندازے سے پیدا کیں۔ (شوکانی)

آیت 20 ④ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ.....: ”مَعَايِشَ“ کی جمع ہے، ”عَاشَ یَعِیْشُ عِیْشًا وَمَعَاشًا وَمَعِیْشَةً“ کا معنی زندہ رہنا ہے، جیسے ”مَاتَ یَمُوتُ مَوْتًا“ کا معنی مرنا ہے۔ پھر یہ لفظ زندگی کی ضرورتوں کے لیے استعمال ہونے لگا، یعنی تمہاری زندگی گزارنے کے لیے کھانے پینے، رہنے، علاج، راحت، سواری، الغرض ہر ضرورت کی چیز تمہارے لیے بھی پیدا کی اور ان کے لیے بھی جنھیں تم روزی دینے والے نہیں۔ اس سے دو قسم کی چیزیں مراد ہیں، ایک تو وہ جن کا تم

وَ اِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنزِلُہُ اِلَّا بِقَدْرِ مَعْلُومٍ ﴿۲۱﴾

اور کوئی بھی چیز نہیں مگر ہمارے پاس اس کے کئی خزانے ہیں اور ہم اسے نہیں اتارتے مگر ایک معلوم اندازے سے ﴿۲۱﴾ سے تعلق ہی نہیں، سمندر کی گہرائیوں میں، پہاڑوں کی بلندیوں میں، صحراؤں کی وسعتوں میں، زمین کی تہوں میں، آباد اور بے آباد زمین کی سطح پر اور فضاؤں میں بے شمار مخلوق ہے جنہیں تم ہرگز روزی دینے والے نہیں۔ ”نَسْتَحْ“ نفی کی تاکید ”پوزنہ قین“ کی باء کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ”ہرگز“ کیا گیا ہے۔ دوسری وہ تمام چیزیں جو تمہاری خدمت کے لیے ہیں، مثلاً چوپائے، سواریاں، بیوی بچے اور نوکر چاکر وغیرہ، جن کے متعلق تم سمجھتے ہو کہ ہم انہیں کھانے کو دے رہے ہیں، خوب سمجھ لو کہ تم ہرگز انہیں روزی نہیں دے رہے، زمین میں ان کی معیشت بھی ہم ہی نے بنائی ہے اور ہم ہی انہیں رزق دے رہے ہیں، فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ [الذاریات: ۵۸] ”بے شک اللہ ہی بے حد رزق دینے والا، قوت والا، نہایت مضبوط ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَيْنَا رِزْقُهَا﴾ [ہود: ۶] ”اور زمین میں کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے۔“

سیت 21 وَ اِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا..... یعنی کوئی بھی چیز قیمتی سے قیمتی ہو یا معمولی سے معمولی، ہمارے پاس اس کے کئی خزانے ہیں، مگر ہم اس کو معلوم اندازے کے مطابق ہی ظاہر کرتے ہیں، مثلاً جلانے اور روشنی کے لیے لکڑی استعمال ہوتی تھی، جب آبادی زیادہ ہوئی تو کوئلہ نکل آیا، مزید بڑھی تو پٹرولیم عطا ہوا، اس سے بھی بڑھی تو گیس نکل آئی، بجلی کے اوون ایجاد ہو گئے۔ توانائی اور سواری کے لیے جانور استعمال ہوتے تھے، پھر پہیہ ایجاد ہوا، پھر کوئلہ استعمال ہونے لگا، پھر پٹرولیم، گیس، بجلی اور ایٹم، الغرض! ایجادات بھی ضرورت کے مطابق اپنے اپنے وقت پر ہوتیں۔ اس سے ان ٹھڈ لوگوں، خصوصاً حکمرانوں کی بات کا غلط ہونا صاف واضح ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ آبادی زیادہ بڑھ رہی ہے، جب کہ ہمارے پاس وسائل کم ہیں، ہم سب کی خوراک کا بندوبست نہیں کر سکتے، اس لیے آبادی کم کرو، ضبط ولادت کرو، ایک یا دو بچے پیدا ہونے دو۔ یہ لوگ درحقیقت اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، جس نے فرمایا کہ ہمارے پاس ہر چیز کے بے شمار خزانے ہیں، مگر ہم مقرر اندازے کے ساتھ ہی اسے نازل کرتے ہیں۔ ان حکمرانوں نے کسی کو خوراک کیا دینی ہے، یہ تو خود عوام کی کمائی پر چلتے ہیں۔ اللہ کا کرم دیکھو، جو زمین پہلے دس من غلہ پیدا کرتی تھی اب سو من نکالتی ہے، بجلی اور دوسری ایجادات سے جو آسائشیں آج عام آدمی کو میسر ہیں وہ چند سو سال پہلے کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی میسر نہ تھیں، بلکہ ان کے خیال میں بھی نہ تھیں، الا یہ کہ وہ سلیمان علیہ السلام جیسا ہو، پیدل سفر اور اونٹوں، گھوڑوں کی جگہ گاڑیاں اور جہاز اور برق و دق صحراؤں کی جگہ آبادیاں اور نہایت صاف اور کشادہ سڑکیں اور ریلویز۔ اُون اور کپاس کی جگہ پٹرولیم کے کپڑے۔ الغرض! کس کس نئی نعمت اور خزانے کا ذکر کیا جائے۔ رہا آبادی اور وسائل کا تناسب، تو وہ اللہ تعالیٰ سے بہتر کون جانتا ہے، اگر آبادی کم کرنے کی ضرورت ہو تو وہ اپنی غیبی تدبیر سے خود ہی کم کر لیتا ہے، کبھی طوفانوں سے، کبھی جنگوں سے، کبھی زلزلوں سے، کبھی وباؤں کے ذریعے سے۔ الغرض ہر جان دار کا

وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ ۗ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ ﴿۳۷﴾

اور ہم نے ہواؤں کو بار آور بنا کر بھیجا، پھر ہم نے آسمان سے پانی اتارا، پس ہم نے تمہیں وہ پلانے کے لیے عطا فرمایا اور تم ہرگز اس کا ذخیرہ کرنے والے نہیں ﴿۳۷﴾

رزق اللہ کے ذمے ہے اور ہر شخص کو اللہ تعالیٰ دنیا میں ایک منہ کھانے کے لیے اور دو ہاتھ کمانے کے لیے دے کر بھیجتا ہے اور ایک ایک شخص کئی کئی افراد کی ضروریات مہیا کرتا ہے۔ دراصل یہ حکمران اس بہانے سے بدکاری اور بے حیائی پھیلانا چاہتے ہیں اور بے حیائی پھیلانے کے خواہش مند لوگوں کی سزا اللہ تعالیٰ نے سورہ نور (۱۹) میں بیان کی ہوئی ہے۔ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کا یہی حکم ہے کہ آبادی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرو، دنیا میں غلبے کا یہ ایک مضبوط ذریعہ بھی ہے اور قیامت کے دن ہمارے نبی ﷺ کے لیے دوسرے انبیاء سے اپنی امت کے زیادہ ہونے کی خوشی اور فخر کا باعث بھی، جیسا کہ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے: ((تَرَوُ جُؤَاؤُ الدُّوْدِ الدُّوْدَ الْوَلُوْدَ فَإِنِّي مُكَابِّرُ بِكُمْ الْأَنْمِ)) اوردادود، النکاح، باب النہی عن تزویج من لم یلد من النساء: ۲۰۵۰۔ نسائی: ۳۲۲۹۔ و صحیحہ الالبانی ۱ "اِسْمِ عَوْرَتِ مِنْ نِکَاحِ کَرُو جُو (خاوند سے) بہت محبت کرنے والی ہو اور بہت بچے جننے والی ہو، کیونکہ میں دوسری امتوں کے مقابلے میں تمہاری کثرت پر فخر کرنے والا ہوں گا۔"

آیت 22 ① وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ: "لَوَاقِحَ" "لَوَاقِحَ" کی جمع بھی ہو سکتی ہے، یہ لفظ مذکر ہونے کے باوجود مؤنث ہے، جیسے "حَائِضٌ" اور "حَامِلٌ"، "لِفَاحٌ" "نَرَجَانُورُ" کے مخصوص پانی کو کہتے ہیں۔ "لَوَاقِحَ" وہ اونٹنی جس نے "لِفَاحٌ" کو قبول کر لیا ہو، یعنی حاملہ ہو چکی ہو اور اپنے پیٹ میں جنین اٹھائے پھرتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کو حمل اٹھانے والی اس لیے قرار دیا کہ وہ اپنے اندر حاملہ اونٹیوں کی طرح ایسے آبی بخارات اور بادلوں کا بوجھ اٹھا کر چلتی ہیں جو بارش برسانے کا ذریعہ بنتے ہیں اور یہ "لَوَاقِحَ" بمعنی "مُلْفِیحَ" (باب افعال سے اسم فاعل، یعنی وہ نر جو حاملہ کرتا ہے) کی جمع بھی ہو سکتی ہے، یعنی یہ ہواؤں کی بادلوں پر اور مادہ درختوں پر، مثلاً کھجور وغیرہ، یا مادہ پھولوں پر عمل کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں کہ ہواؤں کے ذریعے سے بادل برسنے کے قابل ہوتے ہیں، ہواؤں ہی کے ذریعے سے نردختوں اور نر پھولوں کا بُور ان کے مادہ درختوں اور پھولوں تک پہنچتا ہے، جس سے ان کے پھل لانے کا عمل وجود میں آتا ہے۔ آیت کا کمال بلاغت یہ ہے کہ "لَوَاقِحَ" کا لفظ استعمال فرمایا جو حاملہ ہونے اور حاملہ کرنے کے دونوں مفہوم ادا کرتا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

② فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ: "سَقَى يَسْقِي" پلانا، "أَسْقَى يَسْقِي" پلانے کے لیے دینا، مہیا کرنا، یعنی ہم نے آسمان سے پانی اتارا اور تمہیں ایک دوسرے کو پلانے اور اپنے جانوروں اور پودوں کو پلانے کے لیے عطا فرمایا۔

③ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ: یعنی نہ اوپر آسمان میں بارش کا خزانہ تمہارے قبضے میں ہے اور نہ نیچے زمین میں کنوؤں، چشموں، تالابوں کے خزانے پر تمہارا کوئی اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی پانی کو جس مقدار میں چاہتا ہے رکھتا ہے، وہ جب چاہے بارش برسانے تم اسے روک نہیں سکتے، یا جب چاہے روک لے تم اسے اپنی مرضی سے برسان نہیں سکتے۔ اسی طرح اگر وہ چاہے تو

وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلَّمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلَّمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ﴿۲۴﴾ وَإِن رَّبِّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَبَا قَسُونِ ﴿۲۶﴾

اور بے شک ہم، یقیناً ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں ﴿۲۳﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ان لوگوں کو جان رکھا ہے جو تم میں سے بہت آگے جانے والے ہیں اور بلاشبہ ہم نے ان کو بھی جان رکھا ہے جو بہت پیچھے آنے والے ہیں ﴿۲۴﴾ اور بے شک تیرا رب ہی انھیں اکٹھا کرے گا۔ یقیناً وہ کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۵﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو ایک بجنے والی مٹی سے پیدا کیا، جو بد بودار، سیاہ کچھڑ سے تھی ﴿۲۶﴾

چشموں اور کندوں میں تمام جمع شدہ پانی زمین میں جذب ہو جائے اور تمہیں ایک قطرہ بھی پینے کو نہ ملے۔

آیت 23 وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ..... اس آیت میں زندگی اور موت اور وراثت کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہونے کی تاکید ”اِن“، لام تاکید، ”نَا“ ضمیر متکلم، ”نَحْنُ“ ضمیر متکلم، ”نُحْيِي“ اور ”نُمِيتُ“ میں ضمیر متکلم کے ساتھ کی ہے اور آخر میں پھر ”نَحْنُ الْوَارِثُونَ“ میں ”نَحْنُ“ کے ساتھ اور ”الْوَارِثُونَ“ خبر کو الف لام برائے حصر کے ساتھ لاکر تاکید کی انتہا کر دی ہے کہ زندگی اور موت کا مالک صرف اللہ ہے اور صرف وہی وارث ہے۔ عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں اتنی تاکید کا سامان ہی موجود نہیں اور اتنی تاکید کی ضرورت اس لیے ہے کہ کفار کا طرز عمل بتاتا ہے کہ وہ یہ تینوں باتیں نہیں مانتے، ورنہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے۔ جتنا انکار سخت ہو گا اتنی ہی زیادہ تاکید کے ساتھ بات کی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ سب فنا ہو جائیں گے، مال و متاع جو کچھ بچ رہے گا وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔

آیت 23 وَلَقَدْ عَلَّمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ..... اس میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں: ① وہ لوگ جو ہم سے پہلے گزر چکے اور جو ہمارے بعد آنے والے ہیں اللہ تعالیٰ سب کو جانتا ہے۔ اس کا علم ازلی اور ابدی ہے۔ ② وہ لوگ جو اذان کا پہلا لفظ ”اللہ اکبر“ سنتے ہی اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑا سمجھتے ہوئے سب سے پہلے نماز کے لیے چل پڑتے ہیں اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کو جانتا ہے۔ ③ مستقدمین و مستأخِرین، یعنی جہاد اور دوسری نیکیوں میں آگے بڑھنے والے اور پیچھے رہنے والے سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔

آیت 25 وَإِن رَّبِّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ..... کفار دو بارہ زندہ ہونے کے منکر تھے، توحید کے دلائل کے بعد نہایت تاکید کے ساتھ قیامت کا یقین دلایا، کیونکہ یہ اللہ کے حکیم و علیم ہونے کا لازمی نتیجہ ہے اور اس کے بغیر بندہ نہ مومن ہوتا ہے، نہ باز پرس کے یقین کے بغیر کوئی نیکی ہو سکتی ہے اور نہ گناہ سے بچا جا سکتا ہے۔

آیت 26 ① وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ..... اس سورت میں آیت (۱۶) ﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا﴾ سے

وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ تَارِ السَّمُومِ ﴿۱۵﴾

اور جان (یعنی جنوں) کو اس سے پہلے تو کی آگ سے پیدا کیا ﴿۱۵﴾

دلائل توحید کا بیان چلا آ رہا ہے، جب اوپر کی آیات میں مختلف چیزوں کی تخلیق کو بطور دلیل ذکر کیا تو اب انسان کے پیدا کیے جانے کو بطور دلیل ذکر کیا جا رہا ہے، الغرض یہ دلائل توحید میں ساتویں قسم ہے۔ (کبیر)

● **مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ نَسْتُونَ:** عربی زبان میں خشک مٹی کو "تُرَابٌ" کہتے ہیں، جب اسے بھگو دیا جائے تو وہ "طِينٌ" کہلاتی ہے، پھر جب مدت تک پڑی رہنے سے وہ سیاہ ہو جائے تو اسے "حَمَإٍ" کہتے ہیں، بدبو بھی آنے لگے تو "حَمَإٍ نَسْتُونَ" (بدبودار کچڑ) کہتے ہیں، پھر جب وہ خشک ہو کر کھن کھن بجنے لگے تو وہ "صَلْصَالٍ" کہلاتی ہے۔ "نَسْتُونَ" کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ جس کی تصویر بنائی گئی ہو، جیسا کہ "سُنَّةُ الْوَجْهِ" کا معنی "صُورَةُ الْوَجْهِ" آتا ہے اور "نَسْتُونَ" کا معنی ملامت و نرم بھی ہے۔ آیات و تفاسیر سے آدم علیہ السلام کی پیدائش کی ترتیب یہ معلوم ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے پوری زمین سے خشک مٹی لی، جیسا کہ سورہ آل عمران (۵۹) میں آدم علیہ السلام کو "تُرَابٍ" سے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا ہے اور جیسا کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبْضَهَا مِنْ جَمِيعِ الْأَرْضِ فَجَاءَ بَنُو آدَمَ عَلَى قَدَرِ الْأَرْضِ جَاءَ مِنْهُمْ الْأَحْمَرُ وَالْأَبْيَضُ وَالْأَسْوَدُ وَبَيْنَ ذَلِكَ وَالسَّهْلُ وَالْحَزْنُ وَالْحَبِيبُ وَالطَّيِّبُ وَبَيْنَ ذَلِكَ» [ابوداؤد، السنۃ، باب فی القدر: ۶۶۹۳۔ ترمذی: ۲۹۵۵۔ احمد: ۴۰۰۷۴، ج: ۱، ۱۹۶۰] و صحیحہ الالبانی "اللہ تعالیٰ نے آدم کو ایک ٹھٹی سے پیدا فرمایا، جو اس نے ساری زمین سے لی، تو بنی آدم اس زمین کے اندازے کے مطابق وجود میں آئے، ان میں سرخ، سفید، سیاہ اور اس کے مابین لوگ ہیں اور نرم، سخت، خبیث، طیب اور اس کے مابین بھی ہیں۔" پھر اس میں پانی ڈالا تو وہ "طین" ہو گئی، پھر اسے مدتوں پڑا رہنے دیا، جب وہ کالی سیاہ اور ملامت و نرم ہو گئی تو آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ اور شکل و صورت بنائی، فرمایا: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ﴾ [الأعراف: ۱۱] جب وہ سوکھ کر کھن کھن بجنے لگا تو اس میں اپنی خاص پیدا کردہ روح پھونکی، جیسا کہ اس جگہ "صَلْصَالٍ" کا ذکر ہے اور اس کے خوب خشک ہونے کا ذکر سورہ رومن (۱۳) میں ہے، فرمایا: ﴿مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ کہ وہ ٹھکنے والی مٹی آگ میں پکی ہوئی مٹی کی طرح ٹھکنے والی تھی۔

● **وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ:** یہاں "الْجَانَّ" سے مراد اکثر مفسرین نے جنوں کا باپ لیا ہے، بعض جنوں کی جنس مراد لیتے ہیں، بعض نے ابلیس مراد لیا ہے۔ اسے "الْجَانَّ" یا جن (جَنَّ يَجْنُ، بمعنی ڈھانپنا، چھپانا) انسان کی آنکھوں سے چھپنے کی وجہ سے کہتے ہیں، جیسا کہ جنین اور جنوں وغیرہ سب میں ڈھانپنے کا مفہوم شامل ہے۔ جنوں کے بارے میں فرمایا: ﴿إِنَّكَ يَتْلُمُ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ [الأعراف: ۲۷] "بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھتے۔"

وَ إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلٰوٰتٍ مِّنْ حَیۡا تَسُوۡنٍ ﴿۷۸﴾ فَاِذَا سَوَّیۡتُهُۥ وَ نَفَخْتُ فِیۡهِ مِنْ رُّوۡحِیْ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدٰۤیۡنَ ﴿۷۹﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمۡ اَجْمَعُوۡنَ ﴿۸۰﴾ اِلَّا اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰۤی اَنْ یَّكُوۡنَ مَعَ السَّٰجِدِیۡنَ ﴿۸۱﴾ قَالَ یٰۤاِبۡلِیۡسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوۡنَ مَعَ السَّٰجِدِیۡنَ ﴿۸۲﴾ قَالَ لَمۡ اَكُنْ لِاَسۡجِدَ لِیَبۡشَرٍ خَلَقْتَهُۥ مِنْ صَلٰوٰتٍ مِّنْ حَیۡا تَسُوۡنٍ ﴿۸۳﴾

قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنْهَا فَاتَّكُ رَجِیۡمٌ ﴿۸۴﴾

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا بے شک میں ایک بشر ایک بجنے والی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، جو بدبودار، سیاہ کچڑ سے ہوگی ﴿۷۸﴾ تو جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے گرجاؤ ﴿۷۹﴾ تو فرشتوں نے سب کے سب نے، تمام نے سجدہ کیا ﴿۸۰﴾ مگر ابلیس، اس نے انکار کر دیا کہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو ﴿۸۱﴾ فرمایا اے ابلیس! تجھے کیا ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہوتا؟ ﴿۸۲﴾ اس نے کہا میں کبھی ایسا نہیں کہ اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے ایک بجنے والی مٹی سے پیدا کیا ہے، جو بدبودار، سیاہ کچڑ سے ہے ﴿۸۳﴾ فرمایا پھر اس سے نکل جا، کیونکہ یقیناً تو مردود ہے ﴿۸۴﴾

② مِنْ قَبۡلِ مِنْ نَّارِ السُّوۡمِہِ : ”السُّوۡمِہِ“ دراصل سخت گرم ہوا (نو) کو کہتے ہیں، ایک تو اس کے زہریلے ہونے کی وجہ سے (مِنَ السُّمِّ) اور ایک اس لیے کہ وہ جسم کے مسامات کے اندر پہنچ جاتی ہے (مِنَ الْمَسَامِ)۔ مراد خالص آگ جو دھوئیں سے خالی اور اپنی تیزی کی وجہ سے ٹوکی شکل اختیار کر چکی ہے۔

آیت 28 وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ : اوّل انسان کی تخلیق کو بطور دلیل ذکر فرمایا، اب اس کے بعد اس کا قصہ ذکر فرمایا۔ (رازی) ”وَ اِذْ قَالَ“ سے پہلے ”اِذْ کَرَّ“ مقرر مانتے ہیں کہ اے مخاطب عاقل! وہ وقت یاد کر جب.....

آیت 28 ① فَاِذَا سَوَّیۡتُهُۥ : یعنی جب میں اسے برابر کر لوں، مکمل بنا لوں۔ ”مِنَ رُّوۡحِیْ“ اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں۔ یہاں ”رُّوۡحِیْ“ میں ”رُوۡح“ کی ”یاء“ کی طرف اضافت، اضافت تشریحی کہلاتی ہے، یعنی اس کا عزم و شرف بڑھانے کے لیے اسے اپنی روح قرار دیا، یہاں ”میری روح“ سے مراد اللہ تعالیٰ کی مخلوق روح ہے، کیونکہ اس کی ذات کی مثل تو کوئی چیز نہیں، وہ ”لَعۡیۡلِیۡدَةٌ وَّلَعۡیۡلِیۡوۡلَدٌ“ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذاتی روح تو کسی صورت مراد نہیں ہو سکتی، صرف آدم ہی نہیں دوسری جگہ ہر انسان کی روح کو اللہ نے اپنی روح قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿ثُمَّ سَوَّیۡتُهُۥ وَ نَفَخْتُ فِیۡهِ مِنْ رُّوۡحِیۡ﴾ [دیکھیے السجدة: ۷ تا ۹] اور ظاہر ہے کہ انسان مخلوق ہے، یہ ایسے ہی ہے کہ ساری زمین اور اس کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، مگر مسجد حرام کو بیت اللہ (اللہ کا گھر) اور صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو اللہ کی اونٹنی قرار دیا ہے۔

وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ ﴿۴۰﴾ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿۴۱﴾ إِلَى يَوْمِ الْوَعْتِ الْمَعْلُومِ ﴿۴۲﴾ قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۴۳﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿۴۴﴾ قَالَ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ﴿۴۵﴾

اور بے شک تجھ پر قیامت کے دن تک خاص لعنت ہے ﴿۳۹﴾ اس نے کہا اے میرے رب! پھر مجھے اس دن تک مہلت دے جب وہ اٹھائے جائیں گے ﴿۴۰﴾ فرمایا تو بے شک تو مہلت دیے گئے لوگوں سے ہے ﴿۴۱﴾ ایسے وقت کے دن تک جو معلوم ہے ﴿۴۲﴾ اس نے کہا اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں ضرور ہی ان کے لیے زمین میں مزین کروں گا اور ہر صورت میں ان سب کو گمراہ کروں گا ﴿۴۳﴾ مگر ان میں سے تیرے وہ بندے جو خالص کیے ہوئے ہیں ﴿۴۴﴾ فرمایا یہ راستہ ہے جو مجھ تک سیدھا ہے ﴿۴۵﴾

﴿۲﴾ اس آیت سے آیت (۳۹) تک کی مفصل تفسیر کے لیے سورہ اعراف (۱۸ تا ۱۱) اور سورہ بقرہ (۳۰ تا ۳۳) تک کے فوائد ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 35 ﴿۳۵﴾ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ: اس کا ترجمہ ”خاص لعنت“ الف لام کی وجہ سے کیا گیا ہے اور اس کی وضاحت سورہ قصص (۷۸) میں آئی ہے، فرمایا: ﴿وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي﴾ یعنی تجھ پر میری لعنت ہے۔

آیت 35 ﴿۳۵﴾ لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ: میں ان کے لیے زمین میں مزین کروں گا، کیا چیز، آیت کے سیاق و سباق سے عبارت یہ بنتی ہے کہ میں ان کے لیے زمین میں بھی خواہش نفس اور اللہ کی نافرمانی کو مزین اور خوش نما بنا کر پیش کروں گا، جیسا کہ آسمان میں ان کو ممنوعہ پودے کا کھانا خوش نما بنا کر پیش کیا اور گمراہ کر دیا تھا، فرمایا: ﴿وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى﴾ [طہ: ۱۲۱] دوسرا معنی یہ ہے کہ میں انھیں تمام زینت زمین ہی میں دکھاؤں گا کہ جو کچھ ہے یہیں ہے، تاکہ وہ نہ آخرت کی طرف توجہ کریں اور نہ اس کا یقین کریں، سو اس طرح میں ان سب کو گمراہ کروں گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلِكَيْلًا أَخْلَدُوا إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعُ هَوَاهُ ۗ فَمَثَلًا كَسَلَّ الْكَلْبُ﴾ [الأعراف: ۱۷۶] ”اور لیکن وہ زمین ہی کی طرف چٹ گیا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، سو اس کی مثال کتے کی سی ہے۔“

آیت 40 ﴿۴۰﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ: یعنی تیرے وہ بندے جو خالص تیرے لیے چن لیے گئے اور جنہیں تو نے خاص اپنا بنا لیا میں انھیں گمراہ نہیں کر سکوں گا۔

آیت 41 ﴿۴۱﴾ قَالَ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ: یعنی یہی صراط مستقیم اور درست بات ہے جو مجھ پر لازم ہے کہ تو میرے مخلص بندوں کو گمراہ نہ کر سکے گا اور جو میرے لیے خالص ہوگا اس کی حفاظت میں خود کروں گا، جیسے بعد میں فرمایا: ﴿إِنَّ عِبَادِي

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَنٌ إِلَّا مَنْ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَوِينَ ﴿۳۱﴾ وَإِنَّ جَهَنَّمَ
لَكُودَةٌ لَهُمْ أَجْعَلِينَ ﴿۳۲﴾ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ ﴿۳۳﴾ إِنَّ الشَّقِيْنَ

فِي جَنَّتٍ وَعَوِيْنَ ﴿۳۴﴾

بے شک میرے بندے، تیرا ان پر کوئی غلبہ نہیں، مگر جو گمراہوں میں سے تیرے پیچھے چلے ﴿۳۱﴾ اور بلاشبہ جہنم ضرور ان
سب کے وعدے کی جگہ ہے ﴿۳۲﴾ اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لیے ان میں سے ایک تقسیم کیا ہوا
حصہ ہے ﴿۳۳﴾ بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے ﴿۳۴﴾

لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَنٌ ﴿ [الحجر : ۴۲] اور ایک معنی یہ بھی ہے کہ ”هَذَا“ سے اخلاص کی طرف اشارہ ہو، یعنی یہی اخلاص
کی راہ مجھ تک سیدھی پہنچتی ہے اور میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں ہوگا۔ (روح المعانی) دوسرا معنی واضح ہے۔ (واللہ اعلم)
آیت 42 إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ : یہ پچھلی بات ہی کی وضاحت ہے اور مستثنیٰ منقطع ہے اور اگر ”عِبَادًا“ سے مراد
عام ہو تو مستثنیٰ متصل ہوگا، مطلب یہ کہ جو خود ہی بھٹکے ہوں اور جہالت کی بنا پر خود ہی تیری پیروی کرنا چاہیں۔

آیت 44 ﴿ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ ﴾ : یہ سات دروازے مختلف قسم کے گناہ گاروں کے لیے ہوں گے، جو جہنمیوں کو جہنم کے
مختلف درجوں کی طرف پہنچائیں گے۔ قرآن مجید میں جہنم کے درجوں کو ”درکات“ کہا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ إِنَّ الشَّقِيْنَ فِي الدَّرَكِ
الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ [النساء : ۱۴۵] ”بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔“ ابوطالب
کے متعلق صحیح حدیث میں آیا ہے کہ آگ کے ٹخنوں تک پہنچ رہی ہوگی۔ سمرہ بنتی الخدری سے روایت کہ انھوں نے نبی ﷺ سے سنا،
آپ فرماتے تھے: ﴿ إِنَّ مِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ النَّارُ إِلَى كَعْبِيْنِهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ إِلَى حُجْرَتِيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ
تَأْخُذُهُ إِلَى عُقْبِيْهِ ﴾ [مسلم، الحنة وصفة نعیمہا، باب جہنم أعادنا اللہ منہا : ۲۸۴۵] ”ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں
گے جنھیں آگ ٹخنوں تک پکڑے گی اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جنھیں ان کی کمر تک پکڑے گی اور ان میں سے
کچھ ایسے ہوں گے جنھیں ان کی گردن تک پکڑے گی۔“

﴿ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ ﴾ : تقسیم کیے ہوئے حصے سے مراد بدکاروں کے سات حصوں میں تقسیم شدہ مجرموں کا
ایک حصہ ہے، یعنی جس طرح ایک خاص عمل والے لوگ جنت میں ایک خاص دروازے سے داخل ہوں گے، اسی طرح برے
عمل والے لوگ بھی اپنے اعمال کے مطابق جہنم کے مختلف دروازوں سے داخل ہوں گے، جیسے اوپر ذکر ہوا: ﴿ إِنَّ الشَّقِيْنَ
فِي الدَّرَكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ [النساء : ۱۴۵] ”بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔“
شاہ عبدالقادر رزوی فرماتے ہیں: ”شاید بہشت کا ایک دروازہ زیادہ اس لیے ہے کہ بعض موحدین صرف اللہ کے فضل سے
جنت میں جائیں گے، بغیر عمل کے۔“ (موضح)

آیت 45 ﴿ الشَّقِيْنَ ﴾ ”انتہی“ باب افعال سے اسم فاعل ”مُتَّبِعِي“ کی جمع ہے۔ مجرد ”وَفِي بَيْتِيْ وَفَاتِيْ“ ہے، بمعنی

أَدْخُلُوهَا بِسَلِيمٍ آمِنِينَ ﴿۳۷﴾ وَ نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍ إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ

مُتَّقِلِينَ ﴿۳۸﴾

اس میں سلامتی کے ساتھ بے خوف ہو کر داخل ہو جاؤ ﴿۳۷﴾ اور ہم ان کے سینوں میں جو بھی کینہ ہے نکال دیں گے، بھائی بھائی بن کر تختوں پر آنے سے سامنے بیٹھے ہوں گے ﴿۳۸﴾

پہانا اور نقصان دہ چیزوں سے محفوظ رکھنا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۲)۔

﴿۳۷﴾ فِي جَنَّتٍ وَعُيُونٍ: گمراہ لوگوں کے برے انجام کے ساتھ ہی متقی لوگوں کے بہترین انجام کا ذکر ہے اور یہ قرآن مجید کا عام انداز ہے کہ وہ دونوں پہلوؤں کا ساتھ ساتھ ذکر کرتا ہے۔ ”جَنَّتٍ“ ”عُيُونٍ“ کی جمع ہے، گھنے درختوں کا باغ جو زمین کو چھپائے ہوئے ہو۔ ”حَنَّ يَحْنُ“ کا معنی ہے چھپانا۔ ”عُيُونٍ“ کا معنی ہے چشمے، مراد وہ چشمے ہیں جن سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں، یا الگ چشمے، کیونکہ چشموں کا حسن ایک الگ ہی چیز ہے۔ سورہ دہر میں کافور اور زنجبیل کی آمیزش والے چشمے، سلبیل نامی چشمے اور سورہ مطفقین میں تسنیم نامی چشمے کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ یاد رہے کہ جنت سے مراد صرف باغ ہی نہیں، بلکہ سونے چاندی کی اینٹوں کے مکانات اور ایک ایک موتی یا لعل سے بنے ہوئے میلوں لے اور اونچے نیموں کے ساتھ ملے ہوئے باغات ہیں، جیسا کہ صحیح احادیث میں جنت کے اوصاف میں مذکور ہے۔

آیت 46 اَدْخُلُوهَا بِسَلِيمٍ..... یعنی انہیں یہ کہا جائے گا۔ ”بِسَلِيمٍ“ یعنی ہر قسم کے آفات و مصائب سے سلامتی کے ساتھ، ایک دوسرے کو سلام کہتے ہوئے، فرشتوں کے سلام سنتے ہوئے اور پروردگار عالم کے ”سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبِّ رَحِيمٍ“ کے ساتھ۔ (دیکھیے نِسْ: ۵۸) اسی لیے جنت کا ایک نام ”دار السلام“ بھی ہے، فرمایا: ﴿لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ [الأنعام: ۱۲۷] ”آمِنِينَ“ ہر خوف خطرے سے محفوظ۔

آیت 47 وَ نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍ.....: ”نَزَعٌ“ کا معنی کھینچ کر، اکھاڑ کر نکالنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کینہ اور دشمنی دل میں کتنی گہری جڑ پکڑتی ہے۔ ”غَلٍ“ کینہ، کھوٹ، یعنی اللہ تعالیٰ دنیا میں اہل جنت کے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق ہر کینے کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے گا، کیونکہ جس سینے میں کوئی کدورت ہو وہ مکمل خوشی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ دلوں کی صفائی کے بعد وہ بھائی بھائی بن کر آنے سے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔ محبت ہو تو خود بخود چہرے آپس میں مل جاتے ہیں، جب کہ دلوں میں کدورت ہو تو چہرے بھی ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔

دل بدلتے ہیں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (اہل جنت کے متعلق) فرمایا: ﴿قُلُوبُهُمْ عَلَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاجِدٍ لَا اخْتِلَافَ بَيْنَهُمْ وَلَا تَبَاغُضَ﴾ [بخاری، بد، الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة: ۳۲۴۶] ”ان کے دل ایک

لَا يَسْتَهْمُ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿۸﴾

اس میں انھیں نہ کوئی تھکاوٹ چھوئے گی اور نہ وہ اس سے کبھی نکالے جانے والے ہیں ﴿۸﴾

آدی کے دل کی طرح ہوں گے، نہ ان میں کوئی اختلاف ہوگا، نہ آپس میں کوئی بغض۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَخْلُصُ الْمُؤْمِنُونَ مِنَ النَّارِ فَيُحْبَسُونَ عَلَى فَنَطْرَةٍ بَيْنَ الْحَنَةِ وَالنَّارِ، فَيَقْتَضُ لِبَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ مَظَالِمَ كَانَتْ بَيْنَهُمْ فِي الدُّنْيَا، حَتَّى إِذَا هُذِبُوا وَنُقُوا أُذِنَ لَهُمْ فِي دُخُولِ الْحَنَةِ» [بخاری، الرفاق، باب القصاص يوم القيامة: ۶۵۳۵] ”مومن آگ سے بچ کر آئیں گے تو جنت اور جہنم کے درمیان ایک پل پر روک لیے جائیں گے، پھر دنیا میں ان کے ایک دوسرے پر مظالم کا قصاص ایک دوسرے کو دلوایا جائے گا، یہاں تک کہ جب ان کی پوری تراش خراش کر دی جائے گی اور خوب پاک صاف کر دیے جائیں گے تو انھیں جنت میں داخلے کی اجازت ملے گی۔“ اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام اور صلحائے امت باہمی لڑائیوں اور رنجشوں کے باوجود جنت میں جائیں گے، مگر اس سے پہلے ان کے دلوں کی باہمی کدورتیں بالکل دور کر دی جائیں گی اور وہ صاف دل بھائی بھائی ہو کر جنت میں جائیں گے۔

آیت 48 ﴿۱﴾ لَا يَسْتَهْمُ فِيهَا نَصَبٌ: دنیا میں کوئی شخص دکھ، مصیبت، مشقت اور تھکن سے خالی نہیں، بلکہ یہ ساری زندگی ہی محنت اور مشقت کی ہے، یہاں زیادہ سے زیادہ خوشی اور لذت کے ساتھ بھی کوئی نہ کوئی مشقت، محنت، تھکن یا غم ضرور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ بلد کے شروع میں کئی قسمیں کھا کر فرمایا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ﴾ [البلد: ۴] ”بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے“ اور سورہ انشاق میں فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ﴾ [الانشاق: ۶] ”اے انسان! بے شک تو مشقت کرتے کرتے اپنے رب کی طرف جانے والا ہے، سخت مشقت، پھر اس سے ملنے والا ہے۔“ جب کہ جنت میں نہ کوئی دکھ ہوگا نہ تھکاوٹ۔ ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يُنَادِي مُنَادٍ إِنَّ لَكُمْ أَنْ تَصِحُّوا فَلَا تَسْقُمُوا أَبَدًا وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تُحْيُوا فَلَا تَمُوتُوا أَبَدًا، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تُسَبِّحُوا فَلَا تَهْرَمُوا أَبَدًا، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَنْعَمُوا فَلَا تَبْأَسُوا أَبَدًا فَذَلِكَ قَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿وَنُودُوا أَنْ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُشِئْتُمُوهَا لِأَيُّهَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ [الأعراف: ۴۳]» [مسلم، الجنة وصفة نعمتها، باب في دوام نعم أهل الجنة: ۶۸۳۷/۲۲] ”ایک منادی ندا دے گا (اے جنت والو!) بے شک تمہارے لیے یہ ہوگا کہ تم سندرست رہو گے کبھی بیمار نہیں ہو گے اور تمہارے لیے یہ ہوگا کہ تم زندہ رہو گے کبھی تمہیں موت نہیں آئے گی اور تمہارے لیے یہ ہوگا کہ تم جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہیں ہو گے اور تمہارے لیے طے ہو چکا کہ تم خوش حال رہو گے کبھی تنگی اور تکلیف نہیں اٹھاؤ گے۔“ چنانچہ یہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَنُودُوا أَنْ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُشِئْتُمُوهَا لِأَيُّهَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ ”اور انھیں آواز دی جائے گی کہ یہی وہ جنت ہے جس کے وارث تم اس کی وجہ سے بنائے گئے ہو جو تم کیا کرتے تھے۔“

﴿۲﴾ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ: عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا صَارَ أَهْلُ الْجَنَّةِ

ثِقَتِي عِبَادِي اَنِّي اَنَا الْعُقُورُ الرَّحِيمُ ﴿۱۰﴾ وَ اَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيمُ ﴿۱۱﴾

میرے بندوں کو خبر دے دے کہ بے شک میں ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہوں ﴿۱۰﴾ اور یہ بھی کہ بے شک میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے ﴿۱۱﴾

إِلَى الْحَنَّةِ، وَصَارَ أَهْلُ النَّارِ إِلَى النَّارِ، أُتِيَ بِالْمَوْتِ حَتَّى يُحْمَلَ بَيْنَ الْحَنَةِ وَالنَّارِ، ثُمَّ يُدْبَحُ، ثُمَّ يُنَادِي مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْحَنَةِ لَا مَوْتَ، يَا أَهْلَ النَّارِ! لَا مَوْتَ، فَيَزِدَادُ أَهْلَ الْحَنَةِ فَرَحًا إِلَى فَرَحِهِمْ، وَيَزِدَادُ أَهْلَ النَّارِ حُزْنًا إِلَى حُزْنِهِمْ» [مسلم، الجنة و صفة نعمها، باب النار بدخلها الجبارون ۲۸۵۰/۴۳] [جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں پہنچ جائیں گے تو موت کو (ایک مینڈھے کی شکل میں) لایا جائے گا اور اسے جنت اور جہنم کے درمیان رکھ دیا جائے گا، پھر اسے ذبح کر دیا جائے گا، پھر ایک منادی اعلان کرے گا اے جنت والو! اب موت نہیں اور اے آگ والو! اب موت نہیں، تو جنت والے اپنی خوشی کے ساتھ اور زیادہ خوش ہو جائیں گے اور آگ والے اپنے غم کے ساتھ اور زیادہ غم زدہ ہو جائیں گے۔“

آیت 50.49 ﴿۱﴾ ثِقَتِي عِبَادِي اَنِّي اَنَا الْعُقُورُ الرَّحِيمُ ”ثِقَاتًا“ خاص اور اہمیت والی خبر کو کہتے ہیں۔ ”ثِقَتِي“

باب تفصیل سے امر ہے، یعنی یہ بات اچھی طرح بتا دو، تاکہ وہ امید بھی رکھیں اور خوف بھی، کیونکہ ایمان ان دونوں کے درمیان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللَّهِ مِنَ الْعُقُورَةِ، مَا طَمِعَ بِحَنَّتِهِ أَحَدٌ، وَلَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ مَا عِنْدَ اللَّهِ مِنَ الرَّحْمَةِ، مَا قَبِطَ مِنْ حَنَّتِهِ أَحَدٌ» [مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالى ۲۷۵۵] ”اگر مومن جان لے کہ اللہ کے پاس کتنی عقوبت ہے تو کوئی اس کی جنت کا طمع نہ رکھے اور اگر کافر جان لے کہ اللہ کے پاس کس قدر رحمت ہے تو کوئی اس کی جنت سے ناامید نہ ہو۔“ ان آیات میں رحمت و مغفرت کا بیان پہلے اور عذاب الیم کا ذکر بعد میں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اصل اور غالب صفت رحمت ہے، عذاب تو محض عدل کے نتیجے میں ظاہر ہوتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف کی آیت (۱۵۶) کی تفسیر۔

یہاں رحمت کے اظہار کے لیے پہلے ”عِبَادِي“ سے خطاب، پھر ”اَنَا“، ”اَنَا“ ضمیر فصل اور ”الْعُقُورُ الرَّحِيمُ“ کو الف لام کے ساتھ لاکر تاکید پر تاکید فرمائی، دوسری آیت میں ”هُوَ“ ضمیر فصل اور ”الْعَذَابُ“ کو معرف باللام لاکر تاکید فرمائی۔ پہلی آیت میں فرمایا کہ میری صفات رحمت یہ ہیں اور ان کا مالک میرے سوا کوئی نہیں، دوسری آیت میں فرمایا اور میرے عذاب کی صفت یہ ہے، یہ نہیں فرمایا: ”وَ اِنِّي اَنَا الْمُعَذِّبُ.....“ کہ میں ہی ایسا عذاب دینے والا ہوں، بلکہ اپنے عذاب کی صفت بیان فرمائی کہ میرا عذاب ہی ایسا ہے جو عذاب الیم ہے۔

﴿۲﴾ یہ آیات تمہید ہیں ان واقعات کی جو آگے آرہے ہیں، جن میں فرشتوں کی ایک جماعت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی

وَيُتِيهِمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿٥١﴾ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجَلُونَ ﴿٥٢﴾
 قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا لْبَشَرَكَ بَعْلَمٍ عَلَيْهِ ﴿٥٣﴾ قَالَ أَبَشَرْتُمُونِي عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ
 فِيمَا تُبَشِّرُونَ ﴿٥٤﴾ قَالُوا بِشَرِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا مَكُنْ مِنَ الْقَانِطِينَ ﴿٥٥﴾ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ
 مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿٥٦﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿٥٧﴾

اور انھیں ابراہیم کے مہمانوں کے بارے میں خبر دے ﴿٥١﴾ جب وہ اس کے پاس داخل ہوئے تو انھوں نے سلام کہا، اس نے کہا ہم تو تم سے ڈرنے والے ہیں ﴿٥٢﴾ انھوں نے کہا ڈرنے سے، بے شک ہم تجھے ایک بہت علم والے لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں ﴿٥٣﴾ اس نے کہا کیا تم نے مجھے اس کے باوجود خوشخبری دی ہے کہ مجھے بڑھاپا آچکا ہے، تو تم کس بات کی خوشخبری دیتے ہو؟ ﴿٥٤﴾ انھوں نے کہا ہم نے تجھے حق کی خوشخبری دی ہے، سو تو ناامید ہونے والوں سے نہ ہو ﴿٥٥﴾ اس نے کہا اور گمراہوں کے سوا اپنے رب کی رحمت سے کون ناامید ہوتا ہے ﴿٥٦﴾ اس نے کہا تو اے بھیجے ہو! تمہارا معاملہ کیا ہے؟ ﴿٥٧﴾

رحمت کا ظہور ہوا اور انہی کے ذریعے سے اس کے عذاب الیم کا ظہور ہوا۔

آیت 51 : وَيُتِيهِمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ : ”ضَيْف“ یہ ”ضَافٌ يَضِيفُ“ کا مصدر ہے، جو مائل ہونے کے معنی میں آتا ہے، مہمان چونکہ کسی کی طرف مائل ہو کر ہی آتا ہے، اس لیے اسے ”ضَيْفٌ“ کہتے ہیں، یہ واحد، مشبہ اور جمع سبھی کے لیے ”ضَيْفٌ“ واحد ہی آتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں جمع کے لیے آیا ہے۔ بعض لوگ اس کی جمع ”أَضْيَافٌ“ یا ”ضُيُوفٌ“ بھی استعمال کرتے ہیں۔

آیت 52 : إِنَّا مِنْكُمْ وَجَلُونَ : ”وَجَلُونَ“ ”وَجَلٌ يُوَجِّلُ“ (س) سے ”وَجَلٌ“ (صفت مشبہ) کی جمع ہے، بمعنی ڈرنے والے۔ ڈرنے کی وجہ، کھل واقعہ اور اس کے فوائد کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۶۹) سے واقعہ کے آخر تک۔

آیت 52 : قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ..... : یعنی میں نے دنیا کا عام دستور اور اپنا بڑھاپا دیکھ کر محض تعجب کا اظہار کیا ہے، ورنہ یہ مقصد نہیں ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کا اظہار کر رہا ہوں۔

آیت 57 : قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ : غالباً ابراہیم ﷺ قرآن سے سمجھ گئے کہ فرشتوں کے آنے کا مقصد محض مجھے خوش خبری دینا نہیں، کیونکہ عموماً فرشتے کسی بڑی مہم ہی کے لیے آیا کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَّا نُنزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾

[الحجر: ۸] ”ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر حق کے ساتھ۔“

قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ﴿۵۸﴾ إِلَّا آلَ لُوطٍ ؕ إِنَّا لَنَجُّوهُمُ أَجْمَعِينَ ﴿۵۹﴾ إِلَّا
 أُمَّرَاتَهُنَّ قَدَرْنَا ۚ إِنَّمَا لِسِنَ الْغَابِرِينَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ﴿۶۱﴾ قَالَ إِنَّكُمْ بِعِ
 قَوْمٍ مُّكْفَرُونَ ﴿۶۲﴾ قَالُوا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿۶۳﴾ وَ أَتَيْنَاكَ بِالْحَقِّ
 وَ إِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿۶۴﴾

انہوں نے کہا بے شک ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں ﴿۵۸﴾ سوائے لوط کے گھر والوں کے کہ یقیناً ہم ان سب کو ضرور بچالینے والے ہیں ﴿۵۹﴾ مگر اس کی عورت، ہم نے طے کر دیا ہے کہ بے شک وہ یقیناً پیچھے رہنے والوں سے ہے ﴿۶۰﴾ پھر جب لوط کے گھر والوں کے پاس بھیجے ہوئے آئے ﴿۶۱﴾ تو اس نے کہا تم تو ایسے لوگ ہو جن کی جان پہچان نہیں ﴿۶۲﴾ انہوں نے کہا بلکہ ہم تیرے پاس وہ چیز لے کر آئے ہیں جس میں وہ شک کیا کرتے تھے ﴿۶۳﴾ اور ہم تیرے پاس حق لے کر آئے ہیں اور بلاشبہ ہم یقیناً سچے ہیں ﴿۶۴﴾

آیت 62 قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّكْفَرُونَ : جن کی جان پہچان نہ ہو، اجنبی، اوپرے۔ ابراہیم علیہ السلام کی طرح لوط علیہ السلام بھی انہیں پہچان نہ سکے۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ دوسری ساری مخلوق کی طرح یہ دونوں جلیل القدر انبیاء بھی عالم الغیب نہ تھے، ورنہ وہ ان کے آنے سے پہلے ہی انہیں جانتے ہوتے اور ان کے آنے سے باخبر ہوتے، بلکہ ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ہی معلوم ہوتا کہ مجھے اتنی عمر میں اسحاق عطا ہوں گے اور لوط علیہ السلام کو پہلے ہی اپنی قوم کا انجام معلوم ہوتا، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ابراہیم علیہ السلام کا اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے پر صبر، آگ میں ڈالے جانے پر بھی استقامت کا اظہار، جبار مصر کی زیادتی کی آزمائش پر صبر، باجرہ اور اسماعیل کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑنے پر صبر، غرض ان کی کوئی آزمائش، آزمائش نہیں رہے گی، کیونکہ اگر پہلے علم ہو کہ ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا تو ہر شخص آگ میں کود سکتا ہے اور بیٹے کی گردن پر چھری چلانے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ شیعہ حضرات نے تو انبیاء کے علاوہ اپنے بارہ اماموں کو ہر گزری ہوئی اور آنے والی بات جاننے والا قرار دیا۔ دیکھیے ان کی کتاب ”الکافی“ کی فہرست، جسے وہ اتنا معتبر سمجھتے ہیں جتنا اہل سنت صحیح بخاری کو۔

آیت 63 64 قَالُوا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ : ”إمْتِرَاءً“ سے مضارع معلوم ہے، ایسا شک جو انسان کو ایسی بات پر جھگڑنے کے لیے آمادہ کرے جس کی حقیقت کچھ نہ ہو، بلکہ وہ صرف وہم و گمان پر مبنی ہو۔ (ططاوی) اس لیے اس میں جھگڑے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ فرشتوں نے لوط علیہ السلام کو تسلی دینے کے لیے یہ بات کہی کہ ہم تمہیں پریشان کرنے کے لیے نہیں آئے، بلکہ وہ عذاب لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کرتے اور جھگڑتے رہے ہیں اور واقعی ہم سچ کہہ رہے ہیں۔ ”بالحقی“ سے مراد عذاب ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَّا نُنزِلُ السَّبْكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُّنظَرِينَ﴾

فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ الْبَيْلِ وَاتَّبِعْ أَذْيَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ وَامْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَلِكَ الْأَمْرَ أَنَّ دَابِرَ هَوْلَاءِ لِقِطْعَوْمٍ مُّصِحِّينَ ﴿۶۶﴾ وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۶۷﴾

پس تو اپنے گھر والوں کو رات کے کسی حصے میں لے چل اور خود ان کے پیچھے پیچھے چل اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جاؤ جہاں تمہیں حکم دیا جاتا ہے ﴿۶۵﴾ اور ہم نے اس کی طرف اس بات کی وحی کر دی کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہی کاٹ دی جانے والی ہے ﴿۶۶﴾ اور اس شہر کے رہنے والے اس حال میں آئے کہ بہت خوش ہو رہے تھے ﴿۶۷﴾

[الحجر: ۸] "ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر حق (یعنی عذاب) کے ساتھ اور اس وقت وہ مہلت دیے گئے نہیں ہوتے۔"
آیت 65: ﴿۶۵﴾ وَأَتَّبِعْ أَذْيَارَهُمْ: لوط علیہ السلام کو ان کے پیچھے چلنے کا حکم اس لیے دیا کہ وہ ان کی اچھی طرح حفاظت کر سکیں، کوئی پیچھے نہ رہ جائے، سب مسلسل چلتے رہیں اور ٹھہر کر آنے والوں کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ ہماری نبی کریم ﷺ کا طریقہ بھی یہی تھا، چنانچہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سفر میں پیچھے رہتے، کمزوروں کو آگے چلا تے اور سواری پر اپنے پیچھے بٹھاتے اور ان کے لیے دعا فرماتے۔ [أبو داؤد، الجہاد، باب لزوم الساقفة: ۲۶۳۹]

﴿۶۶﴾ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ: کیونکہ مڑ کر دیکھنے میں وہ تیزی باقی نہیں رہے گی جو اللہ کے عذاب کی جگہ سے بھاگنے میں ہونی چاہیے اور وطن چھوڑتے وقت حسرت سے اسے بار بار دیکھنے کے بجائے بس آگے بڑھتے جاؤ، تاکہ نہ دل کسی اور طرف متوجہ ہو اور نہ اللہ کے ذکر و شکر اور تمہاری رفتار میں کوئی کمی واقع ہو، نہ قوم کی بدترین بربادی دیکھتے ہوئے دل میں کوئی رقت پیدا ہو۔
 ﴿۶۷﴾ وَامْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ: وہ جگہ اللہ تعالیٰ نے ذکر نہیں فرمائی، نہ رسول اللہ ﷺ نے۔ تعجب ہوتا ہے کہ بعض مفسرین اس کے بغیر ہی "قَبِيلَ" (کہا جاتا ہے) کہہ کر کبھی شام، کبھی اردن اور کبھی مصر کا نام لیتے ہیں، یہ اندھیرے میں تیر بھینکنے والی بات ہے۔

آیت 66: ﴿۶۶﴾ وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَلِكَ الْأَمْرَ.....: "إِلَيْهِ" کی وجہ سے "قَضَيْنَا" کا معنی "ہم نے وحی کی" کیا جاتا ہے۔ "دَابِرَ" سب سے پیچھے رہ جانے والا، کسی چیز کا وہ حصہ جو سب کے بعد چھ گیا ہو۔ کسی درخت کو اکھاڑتے وقت آخری چیز جڑ ہوتی ہے، اسے بھی "دَابِرَ" کہہ لیتے ہیں۔ یعنی یہ سب لوگ ہلاک کر دیے جائیں گے، ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔
 ﴿۶۷﴾ نَقِطْعَوْمٍ مُّصِحِّينَ: "أَصْبَحَ" کا معنی ہے "دَخَلَ فِي الصُّبْحِ" کہ وہ صبح کے وقت آیا۔ قوم لوط کی ہلاکت کے لیے صبح کا وقت مقرر کیا گیا تھا، جیسا کہ سورہ ہود میں ہے: ﴿إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ﴾ [ہود: ۸۱] "بے شک ان کے وعدے کا وقت صبح ہے، کیا صبح واقعی قریب نہیں ہے۔"

آیت 67: ﴿۶۷﴾ وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ: "الْمَدِينَةِ" کا ترجمہ "اس شہر" الف لام برائے عہد کی وجہ سے کیا ہے۔ مفسرین

قَالَ إِنَّ هَؤُلَاءِ ضَيِّعِي فَلَا تَقْضَحُون ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَ لَا تُخْزُون ۗ ۞ قَالُوا أَوْ لَمْ
نَنْهَكَ عَنِ الْعُلَیِّین ۞

اس نے کہا یہ لوگ تو میرے مہمان ہیں، سو مجھے ذلیل نہ کرو ۱۸ اور اللہ سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو ۱۹ انہوں نے کہا اور کیا ہم نے تجھے سارے جہانوں سے منع نہیں کیا ۲۰

نے اس کا نام ”سدوم“ بتایا ہے۔ قوم لوط کا عمل کرنے والوں کو بہت سی زبانوں میں ”سدومی“ کہا جاتا ہے، اس لیے عربی یا اردو میں اس کے لیے ”لوٹی“ کا جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہ مناسب نہیں۔ اس میں لوط علیہ السلام کی ایک طرح سے توہین ہے۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ بروں کے ساتھ رہنے میں بھی بدنامی ہے، خواہ کتنا نیک ہو، اب لوط علیہ السلام کے اس بد بخت قوم کے پیغمبر ہونے کے باعث کتنے برے فعل کی نسبت ان کے مبارک نام کی طرف کی جاتی ہے۔

② یَسْتَبِشِرُونَ: ”بَشَرَ“ (ض، س)، ”أَبَشَرَ“ اور ”اسْتَبَشَرَ“ تینوں کا معنی خوش ہونا ہے، صرف حروف کے اضافے کی وجہ سے معنی میں اضافہ ہوتا جائے گا، اس لیے معنی کیا گیا ہے ”بہت خوش ہو رہے تھے“ یعنی لوط علیہ السلام کے گھر نہایت خوبصورت لڑکوں کے آنے کی خبر سن کر نہایت خوش خوش بے اختیار دوڑتے ہوئے آئے۔ (دیکھیے ہود: ۷۸) اس سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ شرم و حیا سے خالی ہو کر کتنی ہستی میں گر چکے تھے۔ واضح رہے کہ ”وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِیْنَةِ“ میں ”واو“ ترتیب کے لیے نہیں، بلکہ صرف واقعہ کے مختلف حصوں کو ملانے کے لیے ہے، کیونکہ اگر پہلے وحی آپجلی ہوتی اور لوط علیہ السلام مہمانوں کو جان چکے ہوتے کہ یہ فرشتے ہیں تو انہیں پریشان ہونے کی، قوم کی منگیں کرنے کی اور اپنی یعنی قوم کی بیٹیاں پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ انبیاء بیہوش غیب دان نہیں ہوتے، انہیں صرف وہی معلوم ہوتا ہے جو انہیں وحی کے ذریعے سے بتا دیا جائے۔ سورہ ہود (۸۱۳-۷۷) میں لوط علیہ السلام کی پریشانی کا نقشہ اور فرشتوں کا انہیں تسلی دینا ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 69.68 قَالَ إِنَّ هَؤُلَاءِ ضَيِّعِي: ”ضَيِّعِي“ کی تشریح کے لیے دیکھیے اس سورت کی آیت (۵۱) ”فَلَا تَقْضَحُون“ اور ”لَا تُخْزُون“ دونوں ”فَلَا تَقْضَحُونِی“ اور ”لَا تُخْزُونِی“ تھے، آیات کے آخر کی مناسبت کے لیے یاہ حذف کر کے نون و قاف یہ مسموم رکھا گیا، یعنی مہمان پر زیادتی اور اس کی بے عزتی درحقیقت میزبان کی ذلت و رسوائی ہوتی ہے، تو لوط علیہ السلام نے دو طریقوں سے انہیں اس فعل بد سے ہٹانے کی کوشش کی، پہلی کوشش ان کی مہمانی کا حق ذکر کر کے اور آخری کوشش ”وَ اتَّقُوا اللَّهَ“ کہہ کر اللہ تعالیٰ سے ڈرانے کے ذریعے سے، مگر بے سود۔

آیت 70 قَالُوا أَوْ لَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعُلَیِّین: ”لَمْ نَنْهَكَ“ ”نہی بیٹھی“ سے جمع منکلم مجد معلوم ہے، ”نہی“ کا الف ”نم“ کی وجہ سے حذف ہو گیا، کاف ضمیر مفعول بہ ہے۔ یعنی تم سارے جہان کو مہمان بنا لیا کرو گے تو کیا ہم سب ہی کو چھوڑ دیں گے، کیا ہم نے تمہیں منع نہیں کیا کہ ہمارے ہوتے اجنبی مسافروں کو مہمان نہ بنایا کرو اور ہمارے مقابلے میں کسی

قَالَ هُوَ لَأَبْنَتِي إِنْ كُنْتُمْ فَعِلِينَ ۖ لَعَنُوكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۷۱﴾ فَأَخَذَتْهُمُ
الصَّيْحَةُ نَشْرِقِينَ ﴿۷۲﴾

اس نے کہا یہ میری بیٹیاں ہیں، اگر تم کرنے والے ہو ﴿۷۱﴾ تیری عمر کی قسم! بے شک وہ یقیناً اپنی مدہوشی میں بیٹھے پھرتے تھے ﴿۷۲﴾ پس انھیں صبح نے روشنی ہوتے ہی پکڑ لیا ﴿۷۲﴾

کی حمایت نہ کرو۔ کیسے خوبیٹ اور مسخ شدہ فطرت والے لوگ تھے، جو اپنے شہر میں آنے والے مہمان یا گزرنے والے کو بھی نہیں چھوڑتے تھے، نہ اس میں کوئی شرم محسوس کرتے تھے۔

آیت 71: قَالَ هُوَ لَأَبْنَتِي: اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ ہود کی آیت (۷۸) کی تفسیر۔

آیت 72: لَعَنُوكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ: "عَمْرٌ" عین کے فتح کے ساتھ "عَمْرٌ" ہی کی ایک لغت ہے، اس کا معنی دنیا میں زندگی کی مدت ہے۔ قسم کے وقت "عین" ہمیشہ مفتوح ہوتا ہے۔ لام ابتدا کا ہے جو قسم کے معنی میں ہے۔ "عَمْرٌ" مبتدا ہے اور اس کی خبر "فَسَبِي" یا "يَمِينِي" ہے جو لازماً حذف ہوتی ہے، یعنی مجھے تیری عمر کی قسم۔ "سَكْرَةٌ" نشے میں ہونا، مدہوش ہونا۔ اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی زندگی کی قسم کھائی اور آپ کی اتنی تکریم فرمائی کہ آپ کے علاوہ کسی انسان کی زندگی کی قسم نہیں کھائی۔ لوط علیہ السلام کے قصے کے درمیان یہ جملہ مقررہ ہے، جس سے ان کا گمراہی سے کسی صورت باز نہ آنا بیان کرنا مقصود ہے۔ قسم اور جواب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ اے نبی! آپ کی پوری پاکیزہ زندگی اور عفت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ لوگ جو اس کے بالکل برعکس چلنے والے تھے وہ دراصل ہوش میں نہ تھے اور اسی مدہوشی میں ایسے بھٹکے پھرتے تھے کہ ان کے لیے راہ راست پر آنا ممکن ہی نہ تھا۔

ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ یہ فرشتوں کا کلام ہے اور انھوں نے لوط علیہ السلام کی زندگی کی قسم کھائی ہے۔ ہماری شریعت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قسم کھانا منع ہے، صحیح احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کی چاہے قسم کھا سکتا ہے۔ قسم کے متعلق مفصل بات ان شاء اللہ آگے کسی مقام پر ہوگی۔

آیت 72: فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ نَشْرِقِينَ: "أَشْرَقَتِ الشَّمْسُ" "سورج طلوع ہوا"۔ اس سے پہلے آیت (۶۶) میں "فَصَبْحِينَ" کا لفظ ہے، یعنی صبح کے وقت۔ سورہ قمر (۳۸) میں "بَكْرَةً" کا لفظ ہے، جس کا معنی دن کا پہلا حصہ ہے۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ صبح کے وقت عذاب شروع ہوا اور سورج چڑھنے تک جاری رہا۔ ایک تطبیق یہ ہو سکتی ہے کہ صبح نمودار ہونے سے لے کر سورج چڑھنے کے کچھ بعد تک سارے وقت کو عرف میں صبح کہہ لیتے ہیں اور ایک تطبیق یہ بھی ہے کہ "أَشْرَقَ يُشْرِقُ" مطلقاً تاریکی میں روشنی ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے، جو ظاہر ہے کہ صبح کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے اور سورج نکلنے کے ساتھ مکمل ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا﴾ [الزمر: ۶۹] "اور زمین اپنے رب کے نور کے ساتھ روشن ہو جائے گی۔" میں نے ترجمہ میں یہی معنی اختیار کیا ہے، تاکہ "فَصَبْحِينَ" کے ساتھ مطابقت رہے۔

فَجَعَلْنَا عَلَيْهَا سَافِلَهَا وَ أَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سَجِيلٍ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ
لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ۝ وَإِنَّهَا لِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ۗ وَ إِن
كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ ظَالِمِينَ ۗ

تو ہم نے اس کے اوپر کا حصہ اس کا نیچے کا حصہ کر دیا اور ان پر کھنگر کے پتھروں کی بارش برسائی ۝ بے شک اس میں گہری نظر سے دیکھنے والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں ۝ اور بے شک وہ (بستی) یقیناً ایک دائمی (آباد) راستے پر ہے ۝ بے شک اس میں ایمان والوں کے لیے یقیناً بڑی نشانی ہے ۝ اور بے شک "ایک" والے یقیناً ظالم تھے ۝

آیت 74۔ اس آیت کی تفسیر سورہ ہود (۸۲) میں دیکھیے۔ قرآن مجید نے قوم لوط پر تین طرح کا عذاب ذکر فرمایا ہے، پہلے ان پر "صَبْحَةٌ" (سج) کا عذاب آیا، پھر ان کی بستیوں کو الٹ دیا گیا اور آخر میں ان پر پتھروں کی بارش برسائی گئی۔
آیت 75۔ "إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ....." "لِّلْمُتَوَسِّمِينَ" یہ "وَسَمٌ، سَمَةٌ" سے باب تفعیل کا اسم فاعل ہے۔ "وَسَمٌ" کا معنی نشان ہے، خصوصاً جو گرم لوہے کے ساتھ اونٹ یا گھوڑے پر لگایا جاتا ہے۔ "مِيسَمٌ" گرم کر کے نشان لگانے کا آلہ۔ نشانات کو دیکھ کر بات کی حد تک پہنچنا "تَوَسَّمٌ" کہلاتا ہے، یعنی غور و فکر کرنے والوں اور گہری نظر والوں کے لیے ان بستیوں میں عبرت کے بہت سے نشان موجود ہیں۔

آیت 76۔ "وَإِنَّهَا لِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ" "مُوقِمٍ" ہمیشہ رہنے والا، دائمی، یعنی جو قافلے حجاز سے شام یا عراق سے مصر جاتے ہیں یہ بستی ان کے راستے میں پڑتی ہے، مگر لوگ ہیں کہ اس میں تباہی کے آثار دیکھ کر کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِينَ ۗ وَبِالْآيَاتِ أَكْفَلًا تَعْفَلُونَ﴾ [الصافات: ۱۳۷، ۱۳۸] "اور بلاشبہ تم یقیناً صبح جاتے ہوئے ان پر سے گزرتے ہو اور رات کو بھی، تو کیا تم سمجھتے نہیں؟" جدید محققین کا خیال ہے کہ یہ بستی بحریت (جسے بحر لوط یا اردو میں بحر مردار بھی کہتے ہیں) کے جنوب مشرق میں واقع تھی، بلکہ اس زمانہ میں اردن کی حکومت بحریت کے جنوبی حصہ سے اس کے تباہ شدہ آثار برآمد کرنے کی کوشش بھی کر رہی ہے۔

آیت 77۔ "إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ" یعنی ابراہیم اور لوط علیہم السلام کے قصے میں ایمان والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت اور عذاب الیم کی بہت بڑی نشانی ہے۔ "لَآيَةً" میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، یہاں "لَآيَةً" واحد اس لیے ذکر فرمایا کہ ایمان والوں کے یقین کے لیے یہ ایک نشانی ہی کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں مومنوں کی تعریف بھی ہے۔

آیت 78۔ ① "وَإِن كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ....." یہ "إِن" اصل میں "إِنَّ" تھا، اس کا اسم ضمیر شان "ہ" محذوف ہے، اس کی دلیل اور سبب وہ لام ہے جو "ظَالِمِينَ" پر آیا ہے، جو "مُحَان" کی خبر ہے۔ "الْأَيْكَةُ" اسم جنس ہے، درختوں کے جھنڈ،

فَاتَّقِنَا مِنْهُمْ ۚ وَ إِنَّهُمَا لِيَأْمُرُ قُبَيْنٌ ﴿٧٩﴾ وَ لَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٨٠﴾

وَ اتَيْنَهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٨١﴾

تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور بے شک وہ دونوں (بستیاں) یقیناً ظاہر راستے پر موجود ہیں ﴿۷۹﴾ اور بلاشبہ یقیناً ”حجر“ والوں نے رسولوں کو جھٹلایا ﴿۸۰﴾ اور ہم نے انھیں اپنی نشانیاں دیں تو وہ ان سے منہ پھیرنے والے تھے ﴿۸۱﴾

زیادہ ہوں یا ایک، جیسے ”نمر“ اسم جنس ہے۔ تاء و صدة کے اظہار کے لیے ہے، اس لیے ”الایکة“ کا معنی ہے ایک جھنڈ، جیسے ”نمرۃ“ ایک کھجور۔

② بہت سے علماء کا کہنا ہے کہ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی قبیلہ تھا اور کئی مفسرین انھیں الگ الگ قوم شمار فرماتے ہیں۔ ان کا ظلم یہ تھا کہ وہ شرک میں گرفتار تھے، ناپ تول میں کمی بیشی کرتے تھے، راہ چلتے مسافروں کو لوٹ لیتے تھے۔ ان دونوں کی طرف شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا، تاکہ وہ ظلم کی ان تمام صورتوں سے باز آجائیں۔ مدین والوں کی تفصیل سورہ ہود (۸۴ تا ۹۵) میں ہے اور اصحاب الایکہ کی تفصیل سورہ شعراء (۶۱ تا ۱۹۱) میں ہے۔ بعض کے مطابق اصحاب مدین اسی قوم کے شہری لوگ تھے اور اصحاب الایکہ انھی کے باہر جنگل میں رہنے والے لوگ تھے۔

آیت 79 ﴿٧٩﴾ وَ إِنَّهُمَا لِيَأْمُرُ قُبَيْنٌ : ”اقام“ کے کئی معنی ہیں، یہاں مراد واضح راستہ ہے، جس طرح امام کے پیچھے چلا جاتا ہے، اسی طرح صاف واضح راستے پر چل کر مسافر منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ (طنطاوی) وہ دونوں سے مراد قوم لوط اور اصحاب الایکہ کی بستیاں ہیں کہ وہ ایک ہی راستے پر قریب قریب واقع ہیں۔ مدین اور ایکہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ (قرطبی)

آیت 80 ﴿٨٠﴾ وَ لَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ : ”الحجر“ اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جسے پتھروں سے گھیرا گیا ہو، جیسا کہ حلیم کو بھی حجر کہہ لیتے ہیں۔ ”حَجْرٌ بِحَجْرٍ“ کا معنی روکنا بھی ہے، تو ”الحجر“ وہ جگہ جہاں عام لوگوں کا آنا جانا ممنوع ہو۔ یہ اس سورت میں چوتھا قصہ ہے۔ ”الحجر“ شام اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک مقام ہے، جو صالح علیہ السلام کی قوم حمود کے لوگوں کا مرکز تھا، یہ جگہ خیبر سے تبوک جانے والی سڑک پر واقع ہے اور اب ”مدائن صالح“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ علاقہ ”الغراء“ سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حجاز سے شام کو جو قافلے جاتے ہیں وہ لازماً یہاں سے گزر کر جاتے ہیں اور یہ اس ریلوے لائن کا ایک سٹیشن بھی ہے جو ترکوں کے زمانہ میں مدینہ سے دمشق کو جاتی تھی۔ اس قوم کے مفصل حالات سورہ ہود (۶۵ تا ۶۸)، سورہ اعراف، سورہ قمر اور سورہ شعراء میں ملاحظہ فرمائیں۔

② الْمُرْسَلِينَ : ایک رسول کو جھٹلانا چونکہ سب کو جھٹلانا ہے، اس لیے ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔ (روح المعانی)

آیت 81 ﴿٨١﴾ وَ اتَيْنَهُمْ آيَاتِنَا : ”آیتنا“ ہماری نشانیاں، ان نشانیوں میں اونٹنی کا معجزہ ہی کئی معجزوں پر مشتمل تھا۔ پیغمبر پر نازل شدہ آیات بھی اور ان کی وادی میں زراعت کا عمدہ انتظام اور پہاڑ تراش کر مکان بنانے کا سلیقہ جن کا ذکر سورہ شعراء

وَكَانُوا يَنْجِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ يَبُوتًا أَمِينًا ﴿۸۴﴾ فَأَخَذْتَهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْحِينَ ﴿۸۵﴾ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ فَمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۸۶﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَإِنَّ السَّاعَةَ لَأَتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَبِيلَ ﴿۸۷﴾

اور وہ پہاڑوں سے مکان تراشتے تھے، اس حال میں کہ بے خوف تھے ﴿۸۴﴾ پس انھیں صبح ہوتے ہی چیخ نے پکڑ لیا ﴿۸۵﴾ پھر ان کے کسی کام نہ آیا، جو وہ کمایا کرتے تھے ﴿۸۶﴾ اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کو پیدا نہیں کیا مگر حق کے ساتھ اور یقیناً قیامت ضرور آنے والی ہے۔ پس درگزر کر، خوبصورت طریقے سے درگزر کرنا ﴿۸۷﴾

میں ہے، سب شامل ہیں۔ وہ عقلی دلائل بھی ان نشانیوں میں شامل ہیں جو توحید کی طرف رہنمائی کا کام دیتے ہیں۔ ﴿۸۶﴾ فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ: یعنی انھوں نے کوئی عبرت حاصل نہ کی، بلکہ اذنی کی کونجیں کاٹ ڈالیں اور صالح علیہ السلام کو چیلنج دیا کہ جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو لے آؤ۔

آیت 82-84: ﴿۸۴﴾ وَكَانُوا يَنْجِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ يَبُوتًا أَمِينًا: یعنی اس سے پہلی قوم عاد آندھی سے برباد ہوئی تھی تو انھوں نے اپنے خیال میں پہاڑوں کو تراش کر محفوظ مکان بنا لیے، جن میں کوئی خوف و خطر نہ تھا، مگر صبح کے وقت ایسی چیخ آئی کہ سب کے کلیجے پھٹ گئے اور ایک حد سے بڑھی ہوئی خوفناک آواز (الطَّاعِنَةُ) کے ساتھ پیدا ہونے والے زلزلے نے باقی کسر نکال دی، پھر ان کی تعمیراتی اور زرعی ترقی اور مہارت ان کے کسی کام نہ آئی۔

آیت 85: ﴿۸۵﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ: ”پالہ حق“ کا معنی صحیح، با مقصد کام جو ہو کر رہنے والا ہو، جو بے کار، بے مقصد نہ ہو اور جسے کوئی روک نہ سکے۔ اس کے بالمقابل باطل ہے، فرمایا: ﴿بَلْ تَقْدِرُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ﴾ [الانبیاء: ۱۸] ”بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں۔“ چار انبیاء کے واقعات کے بعد اب اللہ تعالیٰ کی عظیم مخلوق آسمان و زمین اور ان کے درمیان بے شمار مخلوقات کی طرف توجہ دلائی، جن میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور عظمت و قدرت پر دلالت کرتی ہے۔ فرمایا کہ یہ سب ہم نے بے مقصد پیدا نہیں کیا، بلکہ یہ سب کچھ تمہاری ضروریات کے لیے ہے اور ان میں سے ہر چیز کے لیے اللہ کا حکم ماننا ہر حال میں لازم ہے، کسی کو اختیار ہی نہیں کہ وہ سرتابی کر سکے۔ صرف انسانوں اور جنوں کو آزمائش کے لیے کچھ اختیار دیا ہے، اگر اس کا صحیح استعمال کریں گے تو دنیا و آخرت میں اللہ کے انعامات کے مستحق ہوں گے، جیسے ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ذکر ہوا ہے، غلط استعمال کریں گے تو یا تو دنیا ہی میں اللہ کی گرفت میں آ جائیں گے، جیسے لوط، شعیب اور صالح علیہ السلام کی تو میں اللہ کے عذاب کی گرفت میں آئیں۔ اس کے بعد یقیناً قیامت آنے والی ہے، اس میں نیکیوں کو ان کی نیکی کا پورا بدلہ دے گا، اگر دنیا میں بدلہ نہیں ملا تو وہاں کسر نکال دی جائے گی، اسی طرح بروں کو ان کی بدی کا پورا بدلہ ملے گا اور اگر دنیا میں انھیں مہلت ملی رہی تو وہاں کسر پوری کر دی جائے گی۔ اس لیے آپ اور آپ کے ساتھی ان کفار کی زیادتی پر صبر

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلْقُ الْعَلِيمُ ﴿۸۶﴾ وَ لَقَدْ آتَيْنَكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ

بے شک تیرا رب ہی کمال درجے کا پیدا کرنے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۸۶﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھے بار بار

کریں اور ان کی زبان درازی سے درگزر فرمائیں (دیکھیے آل عمران: ۱۸۶) اور درگزر بھی خوبصورت طریقے سے، تاکہ قطع تعلق سے دعوت کا راستہ بند نہ ہو جائے۔ یہ سارا بیان نبی ﷺ کی تسلی کے لیے ہے۔

آیت 86 إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلْقُ الْعَلِيمُ: تو پھر اس کے لیے انہیں دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟ دیکھیے سورہ یس (۸۱)۔

آیت 87 ﴿۱﴾ وَ لَقَدْ آتَيْنَكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي: ”الْمَثَانِي“ ”نَسِي يَنْسِي“ (ض) کے اسم مفعول ”مَنْسِيَّةٌ“ (بروزن

مَضْرُوبَةٌ، مَرْمِيَّةٌ) کی جمع ہے، معنی دوہرا کرنا، دوہرا کرنا ہے، یعنی بار بار دہرائی جانے والی۔

﴿۲﴾ کافروں کی زیادتی سے درگزر کی تلقین کے ساتھ اپنی ایک عظیم نعمت سبع مثنائی اور قرآن عظیم یاد دلائی، تاکہ اتنی بڑی دولت کا مالک ہونے کے احساس سے کفار سے درگزر میں آسانی رہے۔

﴿۳﴾ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي: ”لام“ اور ”قَدْ“ کی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ ہم نے آپ کو سات بار بار دہرائی جانے والی عطا

فرمائیں۔ یہ آیت اس بات کی بھی بڑی واضح دلیل ہے کہ قرآن کے ساتھ حدیث پر بھی ایمان اور عمل واجب ہے، اس کے بغیر قرآن نہ صحیح سمجھا جاسکتا ہے نہ اس پر عمل ہو سکتا ہے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہیں نہیں بتایا کہ وہ سبع مثنائی سات

سورتیں ہیں یا سات آیتیں، نہ یہ بتایا کہ وہ سورتیں ہیں تو کون سی اور آیتیں ہیں تو کون سی؟ بلکہ ایک جگہ سارے قرآن ہی کو مثنائی فرما دیا، فرمایا: ﴿اللَّهُ تَزَوَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَثَانِي﴾ [الزمر: ۶۳] ”اللہ نے سب سے اچھی

بات نازل فرمائی، وہ کتاب جو ایک دوسرے سے ملتی جلتی اور بار بار دہرائی جانے والی ہے۔“ اب لازم ہے کہ پورے قرآن میں سے جو سارا ہی مثنائی ہے، یہ متعین کیا جائے کہ ان سبع مثنائی سے مراد کیا ہے۔ اپنے پاس سے متعین کریں تو کبھی اتفاق

نہیں ہو سکتا، اس لیے کسی مفسر نے سات سورتیں بتائیں، کسی نے سات آیتیں، تو کسی نے کچھ اور بتایا۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کی وضاحت کے بغیر قرآن کی اس آیت کا مفہوم متعین کرنا ممکن ہی نہیں، چنانچہ ابوسعید بن معلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ﴿كُنْتُ

أُصَلِّيَ فَمَرَّ رَبِّي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَانِي، فَلَمَّ آتِيَهُ حَتَّى صَلَّى، ثُمَّ أَتَيْتُهُ، فَقَالَ مَا مَعَكَ أَنْ تَأْتِي؟ أَلَمْ يَقُلِ اللَّهُ: ﴿اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَاعَاكُمْ﴾ [الأنفال: ۲۴]؟ ثُمَّ قَالَ لِي لِأَعْلَمَنَّكَ

سُورَةٌ هِيَ أَعْظَمُ السُّورِ فِي الْقُرْآنِ قَبْلَ أَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِي فَلَمَّا أَرَادَ أَنْ يَخْرُجَ قُلْتُ لَهُ أَلَمْ تَقُلْ لِأَعْلَمَنَّكَ سُورَةٌ هِيَ أَعْظَمُ سُورَةٍ فِي الْقُرْآنِ؟ قَالَ: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ هِيَ السَّبْعُ

الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ الَّذِي أُوتِيْتَهُ﴾ [بخاری، التفسیر، باب ما جاء في فاتحة الكتاب: ۴۴۷۴، ۴۶۷۷]

”نبی ﷺ میرے پاس سے گزرے اور میں نماز پڑھ رہا تھا، تو آپ نے مجھے بلایا، میں آپ کے پاس نہیں آیا، یہاں تک کہ

الْعَظِيمِ ﴿۷۵﴾

دہرائی جانے والی سات آیتیں اور بہت عظمت والا قرآن عطا کیا ہے ﴿۷۵﴾

میں نے نماز پڑھ لی، پھر میں آیا تو آپ نے فرمایا: ”تمہیں میرے پاس آنے سے کس چیز نے روک رکھا؟ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا: ﴿اَسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلَ اِذَا دَاعَاكُمْ﴾ [الأنفال: ۲۴] اللہ کی اور رسول کی دعوت قبول کرو جب وہ تمہیں بلائیں۔“ پھر مجھے فرمایا: ”میں تمہارے مسجد سے نکلنے سے پہلے ضرور تمہیں ایک سورت سکھاؤں گا جو قرآن کی تمام سورتوں سے بڑی (اعظم) ہے۔“ پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، جب آپ نے نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے آپ سے کہا: ”کیا آپ نے فرمایا نہیں تھا کہ میں تمہیں ایک سورت سکھاؤں گا جو قرآن کی تمام سورتوں سے بڑی ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ یہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ سبع مثانی سے سورۃ فاتحہ کی سات آیتیں مراد ہیں، کیونکہ وہ ہر نماز کی ہر رکعت میں بار بار پڑھی جاتی ہیں۔ دوسری تفسیریں مثلاً یہ کہ سات لمبی سورتیں مراد ہیں وغیرہ نبی کریم ﷺ کی صراحت کے بعد کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس لیے بھی کہ لمبی سات سورتوں کی اکثریت تو اتری ہی مدینہ میں ہے، جب کہ یہ آیت کئی ہے۔

﴿۷۵﴾ وَالْقُرْآنَ الْعَظِیْمَ: بہت سے مفسرین نے سبع مثانی سے مراد فاتحہ اور قرآن عظیم سے مراد باقی قرآن لیا ہے، حالانکہ یہ بات درست نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت میں مذکور سبع مثانی بھی اور القرآن العظیم بھی سورۃ فاتحہ ہی کو کہا ہے۔ بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں آپ کے الفاظ ہیں: «أَمُّ الْقُرْآنِ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِیْمُ» [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي.....﴾ [۷۵: ۷۶] ”ام القرآن ہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے۔“ کیونکہ قرآن ہونے کے لیے پورا قرآن ہونا ضروری نہیں، ایک آیت ہو تو وہ بھی قرآن ہے۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ جب قرآن کی سب سے بڑی سورت ہے تو قرآن عظیم (بہت بڑا قرآن) یہی ہے۔ رہی ”واو“ تو وہ ایک ہی چیز کی دو مختلف صفات کے درمیان آجاتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الَّذِي خَلَقَ فَسُوْیَ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَىٰ﴾ [الأعلى: ۱ تا ۴] ”اپنے رب کے نام کی تسبیح کر جو سب سے بلند ہے، وہ جس نے پیدا کیا، پس درست بتایا اور وہ جس نے اندازہ ٹھہرایا، پھر ہدایت کی اور وہ جس نے چارا اگایا۔“ اور اس لحاظ سے بھی فاتحہ کو ”الْقُرْآنَ الْعَظِیْمَ“ فرمایا کہ قرآن مجید کے تمام مضامین اس میں اجمالی طور پر موجود ہیں۔

ایک دفعہ گوجرانوالہ میں ایک منکر حدیث نے بہت اودھم مچایا اور بہت سے لوگوں کے عقیدے خراب کیے، مولانا محمد عبد اللہ رحمہ اللہ (دال بازار والے) کی اس سے گفتگو ہوئی تو مولانا نے سورۃ توبہ کی آیت پڑھی: ﴿إِن عَدَاةَ الشُّرُكْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اَلْمُنَآءُ عَشْرَ شَهْرًا فِی كِتَابِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَهِيَ أَرْبَعَةٌ حُرْمٌ﴾ [التوبة: ۳۶] ”بے شک مبینوں کی گنتی، اللہ کے نزدیک، اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہے، جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار

لَا تُمَدَّتْ عَيْنُكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ اخْفِضْ
جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۸﴾ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿۸۹﴾

اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف ہرگز نہ اٹھا جس کے ساتھ ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو فائدہ دیا ہے اور نہ ان پر غم کرو اور اپنا بازو مومنوں کے لیے جھکا دے ﴿۸۸﴾ اور کہہ دے بے شک میں تو کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿۸۹﴾

حزمت والے ہیں“ اور فرمایا کہ جب حدیث کی ضرورت نہیں تو آپ قرآن سے بتائیں کہ حرمت والے وہ چار ماہ کون سے ہیں؟ اسے بالکل کوئی جواب نہ آیا اور حق بات بہت سے لوگوں کی سمجھ میں آگئی۔

آیت 88 ﴿۸۸﴾ لَا تُمَدَّتْ عَيْنُكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ: ”مَتَّعْنَا“ متاع معمولی اور عارضی ساز و سامان۔

”أَزْوَاجًا“ زوج ایک قسم، مثلاً زور اور مادہ میں سے ہر ایک ایک زوج ہے، دونوں ہوں تو ”زَوْجَان“ (ایک جوڑا) ہے۔ ان ازواج کی بہت سی قسمیں ہیں، مثلاً سرمایہ دار، حاکم، فوجی، زمیندار، کارخانے دار، مذہبی پیشوا وغیرہم، یعنی سبع مشائی اور قرآن عظیم کی دولت رکھتے ہوئے آپ کفار کے مختلف قسم کی دنیاوی نعمتیں رکھنے والوں کی طرف ہرگز نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیے، خصوصاً جب وہ نعمتیں ان کے لیے فتنہ و عذاب ہیں۔ دیکھیے سورہ توبہ (۵۵) اور سورہ طہ (۱۳۰ تا ۱۳۲) کی تفسیر۔

﴿۸۹﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ: ان کے بڑے بڑے سردار اور کفر کے ٹھیکیدار اور ان کے پیروکار اگر ایمان نہیں لاتے تو آپ ان کے ایمان نہ لانے اور جہنم میں جانے پر ٹھنکین نہ ہوں، آپ نے بات پہنچا کر حق ادا کر دیا تو غم کی کیا ضرورت ہے۔

﴿۹۰﴾ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ: ”جَنَاحُ“ بازو، پر، پہلو۔ یہ دراصل ایک استعارہ ہے کہ پرندہ جس طرح اپنے بچوں کو اپنے پروں کے نیچے لے کر سمیٹ لیتا ہے اور انہیں سرد و گرم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح آپ بھی اہل ایمان کے لیے اپنا بازو یا پہلو جھکا دیں، مراد ان کے لیے نرمی، شفقت، محبت اور حفاظت ہے۔ یہی صفت اصحاب رسول ﷺ کی تھی، فرمایا: ﴿أَشَدُّ آدَاءَ عَلَى الْكُفَّارِ رُحْمَةً بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح: ۲۹] ”کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں۔“

آیت 89 ﴿۸۹﴾ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ: یہاں صرف ڈرانے کا ذکر ہے، خوش خبری کا نہیں، اس لیے کہ بات منکروں کے متعلق ہو رہی ہے۔ ”النَّذِيرُ الْمُبِينُ“ (کھلم کھلا ڈرانے والا) کی تفسیر میں وہ حدیث عین حسب حال ہے جو ابو موسیٰ رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے بیان فرمائی: ﴿إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَتَى قَوْمًا فَقَالَ يَا قَوْمِ! إِنِّي رَأَيْتُ الْحَيْشَ بَعِينِي، وَإِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْعُرْيَانُ، فَالنَّجَاءُ، فَأَطَاعَهُ طَائِفَةٌ مِنْ قَوْمِهِ فَأَذْلَجُوا فَأَنْطَلَقُوا عَلَى مَهْلِكِهِمْ فَفَحَّوْا، وَكَذَّبَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ فَأَصْبَحُوا مَكَانَهُمْ، فَصَبَحَهُمُ الْحَيْشُ فَأَهْلَكَهُمْ وَاجْتَنَحَهُمْ، فَذَلِكَ مَثَلٌ مَنْ أَطَاعَنِي فَاتَّبَعَ مَا جِئْتُ بِهِ، وَمَثَلٌ مَنْ عَصَانِي وَكَذَّبَ بِمَا جِئْتُ بِهِ مِنَ الْحَقِّ﴾ [بخاری

الاعتصام بالكتاب و السنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ: ۷۷۸۲] ”میری مثال اور اللہ نے جو کچھ دے کر مجھے بھیجا اس کی مثال اس آدمی کی مثال جیسی ہے جو اپنی قوم کے پاس آیا اور کہنے لگا: ”اے میری قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے لشکر دیکھا

كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِبِينَ ﴿۹۰﴾ الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ ﴿۹۱﴾

(ایسے عذاب سے) جیسا ہم نے ان تقسیم کرنے والوں پر اتارا ﴿۹۰﴾ جنہوں نے کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا (کوئی مان لیا، کوئی نہ مانا) ﴿۹۱﴾

ہے اور میں ننگا ڈرانے والا ہوں (پہلے زمانے میں لوگ دشمن سے ڈرانے کے لیے چیخنے چلانے کے ساتھ کپڑے بھی اتار دیتے تھے، ان سے تشبیہ دی ہے) سو تم بچ جاؤ، بچ جاؤ، اس کی قوم میں سے ایک گروہ نے اس کا کہنا مان لیا، وہ اندھیرے ہی میں چل پڑے اور آرام سے چلتے ہوئے بچ نکلے اور ایک گروہ نے اسے جھٹلا دیا اور صبح تک اسی جگہ رہے۔ صبح کے وقت لشکر نے ان پر حملہ کیا اور انہیں ہلاک اور نیست و نابود کر دیا، سو یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے میری اطاعت کی اور جو کچھ میں نے کر آیا ہوں اس کی پیروی کی اور اس کی (مثال) جس نے میری نافرمانی کی اور اس حق کو جھٹلا دیا جو لے کر میں آیا ہوں۔“

آیت 90-91 ﴿۹۰﴾ كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِبِينَ : ”الْمُقْتَسِبِينَ“ یہ ”قَسَمَ“ سے باب افتعال کا اسم فاعل ہے، ”تقسیم کرنے والے۔“ قرطبی نے فرمایا: ”عِضِينَ“ ”عِضَّةُ“ کی جمع ہے، جس کا معنی کسی چیز کا جز یا ٹکڑا ہے۔ ”عَضَا يَعْضُو عَضْوًا شَيْئًا“ اور ”عَضَى يُعْضِي شَيْئًا“ ”کسی چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔“ ہر ٹکڑا ”عِضَّةُ“ کہلاتا ہے، اس کے آخر سے واؤ حذف کر کے تاء لائی گئی ہے۔ ”الْقُرْآنُ“ قرآن مجید کا نام ہے، پہلے انبیاء کی کتابوں کو بھی ”قرآن“ کہہ لیتے ہیں، کیونکہ وہ بھی پڑھی جاتی تھیں، گویا کتاب اور قرآن کا لفظ سب کے لیے ہے۔ ہمارے قرآن کے لیے عموماً ”هَذَا الْقُرْآنُ“ یا ”ذَلِكَ الْكِتَابُ“ وغیرہ کا اشارہ ساتھ موجود ہوتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿حُفِيفَ عَلَى دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْقُرْآنُ فَكَانَ يَأْمُرُ بَدَوَاتِهِ فَيُفْرَأُ الْقُرْآنُ قَبْلَ أَنْ تُسْرَجَ دَوَابُّهُ﴾ [بخاری، احادیث الأنبياء، باب قول الله تعالى: ﴿وَ أَنْبَا دَاوُدَ زَبُورًا﴾ : ۳۴۱۷] ”داؤد علیہ السلام پر قرآن (پڑھنا) بہت ہلکا کر دیا گیا تھا، چنانچہ وہ اپنی سواریوں کے متعلق حکم دیتے تو ان پر زین ڈالی جاتی اور آپ سواریوں پر زین ڈالے جانے سے پہلے قرآن پڑھ لیتے تھے۔“

﴿۹۱﴾ ان آیات کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جو امام المفسرین طبری رحمۃ اللہ علیہ نے پسند فرمائی ہے۔ یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ”كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِبِينَ“ (جیسا ہم نے ان تقسیم کرنے والوں پر اتارا) کا تعلق پچھلی کس آیت اور کس لفظ کے ساتھ ہے اور اس مشبہ بہ کا مشبہ کیا ہے اور ”أَنْزَلْنَا“ (ہم نے اتارا) سے کیا چیز اتارنا مراد ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ ”أَنْزَلْنَا“ کا مفعول محذوف ہے ”الْعَذَابُ“ یعنی ہم نے عذاب اتارا اور ”كَمَا أَنْزَلْنَا“ کا تعلق اس سے پہلی آیت: ﴿وَقُلْ إِنِّي أَنَا الَّذِي أُنزِلُ إِلَيْكُمُ الْكُتُبَ﴾ کے ساتھ ہے اور معنی یہ ہے، اے نبی! کہہ دے کہ بے شک میں تو تمہیں حکم کھلا ڈرانے والا ہوں، اس قسم کے عذاب سے جیسا ہم نے ان تقسیم کرنے والوں پر نازل کیا تھا، جنہوں نے (اپنی) کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ یعنی اس کے بعض حصوں کو مان لیا اور بعض کو نہ مانا۔ سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طرح کے بعض کاموں کا ذکر کر کے فرمایا: ﴿أَفْتَوْهُمْ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْكُتُبَ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ﴾ [البقرہ: ۸۵] ”پھر کیا تم کتاب کے

قَوْلِكَ لَسْتَ لَهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۹۳﴾ عَمَّا كَانُوا يَعْبَلُونَ ﴿۹۴﴾

سو تیرے رب کی قسم ہے! یقیناً ہم ان سب سے ضرور سوال کریں گے ﴿۹۳﴾ اس کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۹۴﴾

بعض پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟“ اور اس کی جزا دنیا کی رسوائی اور آخرت میں سخت ترین عذاب بیان فرمائی۔ اب یہاں آپ کے زمانے کے اسرائیلیوں کو اس قسم کے عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے جو ان سے پہلوں پر آیا تھا، کیونکہ وہ بھی تورات کے بعض حصوں کا صاف انکار کرتے تھے، مثلاً نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کی تاکید والی آیات۔ اور قریش کو بھی کہ کتاب اللہ کے بعض حصوں کو جھٹلانے والوں پر جس طرح عذاب آیا میں تمہیں بھی ویسے ہی عذاب سے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں، کیونکہ تم نے بھی جھٹلانے کی روش اختیار کر رکھی ہے اور تم قرآن کے بعض حصوں کو ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہو، چنانچہ تم بھی بتوں کی مذمت کی آیات نکال دینے پر ایمان لانے کی پیش کش کرتے ہو، فرمایا: ﴿وَذُوَا لُؤْثُهُنَّ فَيَذَرُوهُنَّ﴾ [القلعہ: ۹] ”وہ چاہتے ہیں کاش! تو زنی کرے تو وہ بھی زنی کریں۔“ اسی طرح ان کا یہ مطالبہ بھی ذکر فرمایا کہ اس قرآن کے علاوہ اور قرآن لے آؤ، یا اس میں تبدیلی کر دو۔ (دیکھیے یونس: ۱۵) دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”کَمَا أَنْزَلْنَا“ کا تعلق آیت (۸۷) ﴿وَلَقَدْ أَنْزَلْنَاكَ سَبْعًا مِنَ السَّمَاوَاتِ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾ سے ہے اور ”أَنْزَلْنَا“ کا مفعول محذوف ”الْكِتَابَ“ ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ کو سب سے بڑی کتابی اور قرآن عظیم عطا فرمائے، جیسے ان لوگوں پر کتاب نازل کی تھی جنہوں نے اپنی کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، کسی حصے کو مان لیا کسی کو نہ مانا، جب ہم ان پر کتاب نازل کر سکتے ہیں تو آپ پر، جن کی پاکیزہ زندگی کے یہ لوگ چالیس سالہ گواہ ہیں، ہم سب سے بڑی کتابی اور قرآن عظیم کیوں نازل نہیں کر سکتے ایہ تفسیر بھی اچھی ہے۔

ت 93.92 ﴿۱﴾ قَوْلِكَ لَسْتَ لَهُمْ أَجْمَعِينَ: ”يَعْبَلُونَ“ میں دل، زبان اور جسم کے تمام حصوں کے افعال شامل

ہیں۔ اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ ”إِنَّ السَّاعَةَ لَأْتِيَةٌ“ (بے شک قیامت آنے والی ہے)، اب اسی بات کو آگے بڑھایا کہ تیرے رب کی قسم! ہم ان سب سے سوال کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا کسی سے سوال کرنا ہی نہایت خوفناک بات ہے، خصوصاً جب زبان، دل اور اعضا کے ہر ہر عمل کے متعلق ہو۔ آسان حساب صرف انہی کا ہوگا جن کا دفتر پیش ہونے پر کسی سوال و جواب کے بغیر نجات ہو جائے گی۔ دیکھیے سورہ انشقاق (۹۷) کی تفسیر۔ تم کھا کر تمام کفار سے باز پرس کا یقین دلانے سے مقصود نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دینا ہے۔

﴿۲﴾ ان آیات میں ذکر ہے کہ قیامت کے دن تمام کفار سے سوال کیا جائے گا، جب کہ سورہ رحمن میں ہے: ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ﴾ [الرحمن: ۳۹] ”پھر اس دن نہ کسی انسان سے اس کے گناہ کے متعلق سوال کیا جائے گا اور نہ کسی جن سے۔“ ایک آیت میں ہے سوال کیا جائے گا، دوسری میں ہے کہ نہیں کیا جائے گا، تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا جواب یہ دیا کہ کسی سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ تم نے کیا کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بندوں سے بھی زیادہ یہ بات جانتا ہے۔ سوال یہ ہوگا کہ کیوں کیا؟ اور ظاہر ہے کہ یہ سزا کی تمہید ہے۔ (ابن کثیر)

فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ﴿۹۴﴾ اِنَّا كَفَيْتَكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ﴿۹۵﴾

پس اس کا صاف اعلان کر دے جس کا تجھے حکم دیا جاتا ہے اور مشرکوں سے منہ پھیر لے ﴿۹۴﴾ بے شک ہم تجھے مذاق اڑانے والوں کے مقابلے میں کافی ہیں ﴿۹۵﴾

آیت 94 : فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ : " صَدَّعَ يَصْدَعُ، الْأَمْرُ " کسی معاملے کو خوب کھول کر بیان کرنا اور "صَدَّعَ بِالْحَقِّ" کھلم کھلا بلند آواز سے حق کا اظہار کرنا۔ شروع میں نبی ﷺ خفیہ اسلام کی دعوت دیتے تھے، اس کے بعد ان آیات میں چھپ کر دعوت دینے کے بجائے صاف اعلانیہ طور پر اللہ تعالیٰ کے احکام سنانے کا اور مشرکین کی پروا نہ کرتے ہوئے ان سے اعراض کرنے کا حکم ہوا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے خود نمٹنے کا ذمہ اٹھایا جو آپ سے استہزا کرتے اور ٹھٹھا اڑاتے تھے۔ یہ حکم مکہ میں نازل ہوا، مدینہ گئے تو وہاں کفار اور اہل کتاب سے جنگ شروع ہوئی اور خطرے کے پیش نظر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کا پیرا دیتے تھے، جب سورہ مائدہ کی آیت (۶۷) ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغُوا مَا أَنزَلْنَا إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَمَا بَلَّغْتُمْ رَسُولَاتُ اللَّهِ وَوَاللَّهُ يَعْصِمُكُم مِّنَ النَّاسِ﴾ (اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اگر تو نے نہ کیا تو تو نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا) اتری تو آپ نے خیمہ سے سر نکال کر پہرے داروں سے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ! انصُرُوا، فَقَدْ عَصَمَنِي اللَّهُ﴾ [ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورة المائدة : ۳۰۴۶ - سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۶۶۴/۵، ج : ۲۴۸۹] "لوگو! چلے جاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ کر دیا ہے۔"

آیت 95 : اِنَّا كَفَيْتَكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ : ہم ان سے نبٹ لیں گے، آپ بے خوف و خطر دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے رہیے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ نبی ﷺ کا مذاق اڑانے والے (بڑے بڑے یہ پانچ) آدمی تھے، ولید بن مغیرہ، اسود بن عبد یغوث زہری، ابو زمعہ اسود بن مطلب، حارث بن عقیل سہمی اور عامر بن وائل۔ جبریل رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے ان سے مذاق اڑانے والوں کی شکایت کی۔ حدیث لمبی ہے، خلاصہ یہ کہ جبریل رضی اللہ عنہ نے ان کے جسم کے کسی نہ کسی حصے کی طرف اشارہ کیا اور وہ پانچوں بری طرح فوت ہوئے۔ [المسنن الکبریٰ للبیہقی ۸/۹، ج : ۱۸۱۸۷] جو مذاق اڑانے والے باقی رہے ان کا انجام عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ﴿أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي عِنْدَ الْبَيْتِ، وَأَبُو جَهْلٍ وَأَصْحَابٌ لَهُ جُلُوسٌ، إِذْ قَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ أَيُّكُمْ يَحْيِيءُ بَسَلِي جَزُورَ بَنِي فُلَانٍ فَيَضَعُهُ عَلَى ظَهْرِ مُحَمَّدٍ إِذَا سَجَدَ؟ فَانْبَعَثَ أَشَقَى الْقَوْمِ، فَجَاءَ بِهِ فَفَطَرَ حَتَّى إِذَا سَجَدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَضَعَهُ عَلَى ظَهْرِهِ بَيْنَ كَبْفَيْهِ وَأَنَا أَنْظَرُ، لَا أَعْنِي شَيْئًا، لَوْ كَانَتْ لِي مَنَعَةٌ، قَالَ فَحَجَلُوا يَضْحَكُونَ وَيُحِيلُ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ، وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَاجِدٌ لَا يَرْفَعُ رَأْسَهُ حَتَّى جَاءَهُ فَاطِمَةُ فَفَطَرَ حَتَّى عَنْ ظَهْرِهِ، فَرَفَعَ رَأْسَهُ ثُمَّ قَالَ اللَّهُمَّ عَلَيكَ بِقَرِيصِ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَسَقَّ عَلَيْهِمْ إِذْ دَعَا عَلَيْهِمْ، قَالَ وَكَانُوا يَرَوْنَ أَنَّ الدَّعْوَةَ فِي ذَلِكَ الْبَلَدِ مُسْتَحَابَّةٌ، ثُمَّ سَمِيَ اللَّهُمَّ عَلَيكَ

الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۹۶﴾ وَ لَقَدْ نَعَلْنَاكَ يٰصِدِّيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ﴿۹۷﴾

جو اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بناتے ہیں، سو عنقریب جان لیں گے ﴿۹۶﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم جانتے ہیں کہ تیرا سینہ اس سے ننگ ہوتا ہے جو وہ کہتے ہیں ﴿۹۷﴾

يٰأَبِي جَهْلٍ، وَ عَلِيكَ بِعُتْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ، وَ شَيْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ، وَ الْوَلِيدَ بْنَ عُتْبَةَ، وَ أُمَيَّةَ بْنَ حَلْفٍ، وَ عُقْبَةَ بْنَ أَبِي مُعَيْطٍ، وَ عَدَّ السَّامِعِ فَلَمْ نَحْفَظْهُ، قَالَ قَوْلَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَقَدْ رَأَيْتُ الَّذِينَ عَدَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَرَغِي فِي الْقَلْبِ قَلْبِ بَدْرٍ [بخاری، الوضوء، باب إذا نكفي على ظهر المصلي قدر: ۲۴۰] ”ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور ابو جہل اور اس کے کچھ ساتھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے آپس میں کہا کہ تم میں سے کون ہے جو بنو فلاں کی ذبح کردہ اونٹنی کی اوجھڑی و بچہ دانی وغیرہ اٹھا کر لائے اور محمد ﷺ (ﷺ) جب سجدہ کرے تو اس کی پیٹھ پر رکھ دے۔ تو ان میں سے سب سے بد بخت شخص اٹھا اور اس نے وہ اوجھڑی وغیرہ لا کر آپ کے کندھوں کے درمیان رکھ دی۔ میں دیکھ رہا تھا مگر کچھ نہ کر سکتا تھا، کاش! مجھ میں آپ کے دفاع کی طاقت ہوتی۔ تو وہ سب ہنتے ہنتے ایک دوسرے پر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ رسول اللہ ﷺ سجدے ہی میں رہے، سر نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور اسے آپ کی کمر سے اتار پھینکا، تو آپ نے سر اٹھایا اور کہا: ”یا اللہ! قریش کو پکڑ۔“ آپ کی یہ بددعا ان پر بڑی شاق گزری، وہ سمجھتے تھے کہ اس شہر میں دعا قبول ہوتی ہے۔ پھر آپ نے نام لے کر فرمایا: ”اے اللہ! ابو جہل کو پکڑ، عقبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عقبہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کو پکڑ۔“ ایک ساتواں بھی گنا جو ہمیں یاد نہیں رہا۔“ ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”پھر اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں نے ان تمام آدمیوں کو جو رسول اللہ ﷺ نے گئے تھے، بدر کے کنوئیں میں ہلاک شدہ کرے ہوئے دیکھا۔“

آیت 96: الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ نبی کریم ﷺ سے استہزا کے ساتھ ساتھ ان کا سب سے بڑا جرم شرک ذکر کر کے فرمایا، یہ لوگ عنقریب انجام دیکھ لیں گے۔ دنیا میں ان کے انجام کا ذکر اوپر گزرا، آخرت کا معاملہ تو بیان ہی میں نہیں آسکتا۔

آیت 97: وَ لَقَدْ نَعَلْنَاكَ يٰصِدِّيقُ اللہ تعالیٰ نے کفار کے استہزا اور کفر و شرک پر اصرار سے متعلق نبی ﷺ کو نہایت تاکید والے الفاظ میں تسلی دی۔ چنانچہ لام تاکید اور ”نَعَلْنَا“ برائے تحقیق کے ساتھ اس بات کا اظہار فرمایا کہ ہم آپ کے حالات سے بے خبر نہیں، بلکہ ہر وقت ہماری توجہ آپ کی طرف ہے، اب بھی اور آئندہ بھی اور ہم جانتے ہیں کہ یقیناً آپ کا سینہ ان کی باتوں سے ننگ پڑ جاتا ہے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ

الْيَقِينُ ﴿۹۹﴾

پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جا (۹۸) اور اپنے رب کی عبادت کر، یہاں تک کہ تیرے پاس یقین آجائے (۹۹)

آیت 98 ﴿۱﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ : کفار کی زیادتیوں اور استہزا کی وجہ سے سینہ کی اس تنگی کا علاج بیان فرمایا کہ اگر آپ کا سینہ اس سے تنگ ہو تو آپ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد کریں۔ تسبیح کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کو ہر عیب، نقص اور ایسی چیزوں سے پاک قرار دینا جو اس کے لائق نہیں اور حمد کا معنی اللہ کی ان تمام صفات کمال کے ساتھ تعریف کرنا جو اس کی شان کے لائق ہیں۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ تسبیح اور حمد میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمال آجاتی ہیں، کیونکہ تسبیح میں تمام صفات سلبیہ (یعنی ہر عیب اور کمی سے پاک ہونا) آگئیں اور حمد میں تمام صفات ثبوتیہ (یعنی ہر خوبی کا مالک ہونا) آگئیں، چنانچہ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر ہر مصیبت اور تنگی میں صبر اور تسبیح و حمد کا حکم دیا، جیسا کہ دیکھیے سورہ طہ (۱۳۰)، فرقان (۵۸)، مومن (۵۵)، طور (۲۸) اور سورہ نصر (۳) وغیرہ۔

﴿۲﴾ وَ كُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ : یعنی نماز پڑھنے والوں میں سے ہو جا، جس طرح قیام اور ”رُكُوعَةُ“ (رکوع) سے مراد پوری نماز لی جاتی ہے، حالانکہ قیام اور ”رُكُوعَةُ“ (رکوع) نماز کا جز ہیں، بکل نہیں، مگر جز سے مراد کل ہے، اسی طرح یہاں سجدہ سے مراد نماز ہے، اسی لیے اس آیت پر سجدہ نہیں۔ سجدے کا ذکر خصوصاً اس لیے کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ، فَأَكْثِرُوا الدُّعَاءَ» [مسلم، الصلاة، باب ما يقال في الركوع والسجود: ۴۸۲، عن ابي هريرة رَضِيَ اللهُ عَنْهُ] ”بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے تو (سجدے میں) دعا کثرت سے کیا کرو۔“ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر پیش آنے والی مصیبت کا علاج اللہ کا ذکر، خصوصاً تسبیح و تحمید اور نماز ہے، ان کی برکت سے دل کو تسلی بھی ہوگی اور فکر و غم کے بادل بھی چھٹ جائیں گے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے چلی پیٹنے اور منگ میں پانی ڈھونے کی مشقت کی وجہ سے خادمہ کے لیے درخواست پر انھیں سوتے وقت تسبیحات فاطمہ کا حکم دیا اور ان تسبیحات کو خادمہ سے بہتر قرار دیا اور خود آپ ﷺ کا عمل تھا کہ جب آپ کو کوئی معاملہ پیش آتا تو نماز میں مصروف ہو جاتے۔ [ابوداؤد، التطوع، باب وقت قيام النبي ﷺ في الليل: ۱۳۱۹۔ مسند أحمد: ۲۸۸/۵، ح: ۲۳۳۶۱]

آیت 99 ﴿۱﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ : یعنی موت آنے تک اپنے رب کی عبادت پر قائم رہیں۔ موت کو ”یقین“ اس لیے فرمایا کہ ہر جان دار کے لیے اس کا آنا یقینی ہے۔ قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی ”یقین“ کا لفظ موت کے معنی میں آیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿حَتَّىٰ أَتَيْنَا الْيَقِينُ﴾ [المندر: ۴۷] ”یہاں تک کہ ہمیں یقین آ پہنچا (یعنی موت

اِنِّیْ اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ۗ سُبْحٰنَهُ وَ تَعٰلٰی عَنَّا یُسْرِکُوْنَ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اللہ کا حکم آگیا، سو اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو، وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں ①

آگئی۔“ اس لیے سب قابل ذکر مفسرین نے اس آیت میں یقین کو بمعنی موت مراد لیا ہے۔ تو جب تک ہوش رہے نماز اور دوسری عبادات زندگی کے آخری دم تک حسب طاقت کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا پہلو کے بل لیٹ کر ادا کرنا فرض ہے۔ بعض جاہل اور بے عمل پیر اس آیت کی رو سے کہتے ہیں کہ عبادت کرتے کرتے جب یقین حاصل ہو جائے تو پھر عبادت کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے وہ اپنے آپ کو نماز، روزہ اور عبادات سے مستثنیٰ قرار دے لیتے ہیں۔ یہ تفسیر کتاب اللہ کے ساتھ کھیل ہے۔ کیا یہ جس یقین کا نام لیتے ہیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل نہ ہو سکا کہ وہ آخر وقت تک نماز، روزہ اور دوسری عبادات کی پابندی کرتے رہے۔ بہر حال آیت میں یقین سے مراد یقین قلبی لینا اور نماز روزہ چھوڑ دینا صریح بے دینی ہے۔

سورة النحل

آیت 1 ① اِنِّیْ اَمْرُ اللّٰهِ: ”اَمْرُ اللّٰهِ“ سے مراد قیامت ہے اور مشرکین پر مختلف قسم کے عذاب کا نزول بھی ہے اور ”اِنِّیْ“ (آگیا) سے مراد بالکل قریب آنا ہے، کیونکہ آہی چکا ہو تو پھر کفار کی طرف سے اسے جلدی لانے کا مطالبہ بے معنی ہے۔

② فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ: مشرکین قیامت یا عذاب کا ذکر آنے پر مذاق اڑانے کے لیے اسے فوراً لانے کا مطالبہ کرتے تھے۔ دیکھیے سورہ انفال (۳۲) اور سورہ عنکبوت (۵۵ تا ۵۳) لفظ ماضی ”اِنِّیْ“ (آگیا) کا مطلب ہے کہ اس کا آنا اتنا یقینی ہے کہ سمجھو آہی چکا، اس لیے جلدی نہ چھاؤ، وہ بالکل قریب ہے اور طے شدہ وقت پر آجائے گا۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ مسلمان بھی بعض اوقات پریشان ہو کر مسلمانوں کے لیے اللہ کی نصرت اور کفر پر عذاب میں تاخیر پر اس کے جلدی آنے کی دعا کرتے تھے، انھیں بھی تسلی دی کہ سمجھو اللہ کا حکم آہی گیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ مَتّٰی تَضُرُّ اللّٰهُ ۗ اِلَّا اِنَّ تَضُرُّ اللّٰهَ قَدْرٌ یُّبَیِّنُ ﴾ [البقرہ: ۲۱۴] ”یہاں تک کہ وہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، کہہ اٹھے اللہ کی مدد کب ہوگی؟ سن لو، بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔“

③ سُبْحٰنَهُ وَ تَعٰلٰی عَنَّا یُسْرِکُوْنَ: عذاب کے جلدی نہ آنے کی وجہ سے وہ کہتے تھے اللہ تعالیٰ وہ عذاب لای نہیں سکتا، ورنہ فوراً کیوں نہیں لے آتا۔ فرمایا ان کا اللہ تعالیٰ کو اپنا حکم نافذ کرنے سے اور عذاب لانے سے عاجز قرار دینا، یا وعدہ خلافی کرنے والا سمجھنا کفر و شرک کا نتیجہ ہے، جس سے اللہ تعالیٰ ہر طرح پاک اور نہایت بلند ہے۔ وہ نہ عاجز ہے نہ وعدہ خلاف، مگر

يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادَةٍ أَنْ أُنذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ ﴿١﴾ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۗ تَعْلَىٰ عَنَّا يُشْرِكُونَ ﴿٢﴾

وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے کہ خبردار کرو کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو مجھ سے ڈرو ﴿۱﴾ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ اس سے بہت بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں ﴿۲﴾

وہ اپنی مرضی کا مالک ہے، ان کی فرمائشوں کا پابند نہیں۔ دیکھیے سورہ حج (۳۷)۔

﴿۴﴾ آیت کے شروع میں مخاطب کر کے فرمایا: ﴿فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ﴾ ”تم اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو“ اور آیت کے آخر میں مشرکین کا ذکر غائب کے لفظ سے کیا: ﴿سُبْحٰنَهُ وَتَعَالَىٰ عَنَّا يُشْرِكُونَ﴾ ”وہ اس سے پاک اور بہت بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں“ اسے التفات کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ اس قابل ہی نہیں کہ انھیں مخاطب کیا جائے۔

آیت 2 ﴿۱﴾ يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ: ملائکہ سے مراد جبریل علیہ السلام اور ان کے ساتھ وحی کے محافظ فرشتے ہیں۔ صرف جبریل علیہ السلام بھی مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ کسی بڑی شخصیت کے لیے جمع کا لفظ بھی بول لیا جاتا ہے۔ ”الزُّرُّوحُ“ سے مراد وہ چیز جس سے زندگی حاصل ہوتی ہے، یہاں مراد وحی ہے، کیونکہ حقیقی زندگی اسی سے حاصل ہوتی ہے، دل کی زندگی اور آخرت کی زندگی بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ [الشوری: ۵۲] ”اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی۔“ یہاں بھی ”رُوحًا“ سے مراد وحی ہے۔ ”أَمْرِهِ“ یعنی فرشتے اس کے حکم کے بغیر نہیں اترتے۔ دیکھیے سورہ مریم (۶۳)۔

﴿۲﴾ عَلٰی مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادَةٍ: معلوم ہوا نبوت وہی چیز ہے جو محض اللہ کی مشیت اور اس کے انتخاب سے عطا ہوتی ہے، فرمایا: ﴿اِنَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾ [الحج: ۷۵] ”اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی۔“ اور فرمایا: ﴿اِنَّهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسْلَتَهُ﴾ [الأنعام: ۱۲۴] ”اللہ زیادہ جاننے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے۔“ یہ اپنی ریاضت یا چلہ کشی سے حاصل ہونے والی چیز نہیں، جیسا کہ قادیانی دجال اور بعض گمراہ لوگوں کا دعویٰ ہے۔

﴿۳﴾ اَنْ اُنذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ: آیت کے اس کلمے میں فرشتوں کو وحی دے کر اپنے تمام رسولوں کی طرف بھیجے کا مقصد بیان فرمایا کہ وہ اللہ کی توحید، اس کے ساتھ کسی بھی قسم کے شرک سے بچنا اور اسی سے ڈرتے رہنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهُ لَا اِلَهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ [الانبیاء: ۲۵] ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔“

آیت 3 ﴿۱﴾ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ: یہاں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید اور قدرت کے بہت سے دلائل نہایت

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿۵﴾ وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿۶﴾

اس نے انسان کو ایک قطرے سے پیدا کیا، پھر اچانک وہ کھلم کھلا بہت جھگڑنے والا ہے ﴿۵﴾ اور چوپائے، اس نے انہیں پیدا کیا، تمہارے لیے ان میں گرمی حاصل کرنے کا سامان اور بہت سے فائدے ہیں اور انھی سے تم کھاتے ہو ﴿۶﴾ عمدہ اور انوکھے انداز سے شروع فرمائے ہیں۔ فرمایا اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ خالق ہے اور زمین و آسمان کی ہر ہستی اور ہر چیز مخلوق ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، پھر خالق و مخلوق یکساں کیسے ہو سکتے ہیں؟

﴿۲﴾ بالحق: باطل کے مقابلے میں حق کا لفظ آتا ہے، یہاں بمعنی حکمت ہے، یعنی زمین و آسمان کی پیدائش بے شمار حکمتوں پر مبنی ہے، یہ کوئی کھیل یا فضول اور بے کار کام نہیں۔ دیکھیے سورہ ابراہیم (۱۹، ۲۰)، سورہ قص (۲۷)، اور سورہ دخان (۳۸، ۳۹) سب سے پہلے اپنی وحدانیت کی دلیل کے لیے زمین و آسمان کا ذکر فرمایا، کیونکہ یہ دوسری اکثر مخلوقات سے عظیم اور ان پر حاوی ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿لَخَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ﴾ [المؤمن: ۵۷] ”یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے بڑا ہے۔“

آیت 4: خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ : ”نطف“ (ض، ن) بچکان۔ ”نُطْفَةٍ“ قطرہ۔ تاء تجمیر کے لیے ہے، یعنی حقیر اور معمولی قطرے سے۔ ”خَصِيمٌ“ مبالغے کا صیغہ ہے۔ زمین و آسمان کے بعد ان میں پیدا کردہ چیزیں توحید کی دلیل کے طور پر پیش فرمائیں، سب سے پہلے انسان کا ذکر فرمایا، یہی بات سورہ نیس میں تفصیل سے بیان فرمائی، فرمایا: ﴿اَوَلَمْ يَرِ الْاِنْسَانَ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵﴾ وَصَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُنْفِخِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿۶﴾ [نہس: ۷۷، ۷۸] ”اور کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے ایک قطرے سے پیدا کیا تو اچانک وہ کھلا جھگڑنے والا ہے اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا، کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا، جبکہ وہ بوسیدہ ہوں گی؟“ ”اِذَا“ ”فَاِذَا“ ”اچانک“ کے معنی میں آتا ہے، یعنی ایسی عجیب چیز کا وجود میں آنا جس کا وہم و گمان بھی نہ ہو، یعنی اگر یاد رکھتا تو ایک حقیر قطرے سے مختلف اطوار سے گزر کر وجود میں آنے والے انسان سے اس جھگڑے کی توقع ہی نہ کی جاسکتی تھی، بلکہ حق یہ تھا کہ وہ اپنی پیدائش کو یاد رکھتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت کے دونوں حصوں سے اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت پر استدلال مقصود ہو، یعنی نطفہ سے پیدا کیا، پھر اس میں کامل طور پر ساری قوتیں یعنی سوچنے سمجھنے کی اور بولنے کی پیدا کر دیں کہ حجت و استدلال اور بحث کے قابل ہو گیا۔ (روح المعانی)

آیت 5: وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ : ”الْأَنْعَامُ“ ”نعم“ (ن اور ع کے فتح کے ساتھ) کی جمع ہے، اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکریاں۔ ”دِفْءٌ“ گرمی، یہ سردی سے ٹھہرنے کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے، ”مَّا يُدْفَأُ بِهِ“ جس

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بِلِغِيهِ إِلَّا بَشِقِ الْأَنْفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرؤُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ

اور تمہارے لیے ان میں ایک جمال ہے، جب تم شام کو چرا کر لاتے ہو اور جب صبح چرانے کو لے جاتے ہو ۝ اور وہ تمہارے بوجھ اس شہر تک اٹھا کر لے جاتے ہیں جس میں تم کبھی پہنچنے والے نہ تھے، مگر جانوں کی مشقت کے ساتھ، بے شک تمہارا رب یقیناً بہت نرمی کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ۝ اور گھوڑے اور خچر اور گدھے، تاکہ تم ان

کے ساتھ گرمی حاصل کی جائے، جیسا کہ ”ملا“ جس کے ساتھ کسی چیز کو بھرا جائے۔ چوپاؤں کا ایک خاص فائدہ ان کی اون اور بالوں سے گرمی مہیا کرنے والا لباس اس کی اہمیت کے پیش نظر پہلے ذکر فرما کر عام فوائد کا ذکر بعد میں فرمایا۔ ”وَمَا تَأْتِيهِمْ“ اور بہت سے فائدے ہیں، مثلاً سواری کرتے ہو، مل چلاتے ہو، پانی کھینچتے ہو، ان کا گوبر جلاتے ہو، کھیتوں میں بطور کھاد ڈالتے ہو، انھیں بیج کی ضرورت کا ہر سامان خریدتے ہو۔ ان منافع میں ”حی“ بھی شامل ہے اور یہ بھی کہ ان کی نسل بڑھنے سے تمہاری دولت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور آخر میں ان منافع میں سے پھر خاص طور پر ایک نفع ذکر فرمایا کہ انھی سے تم کھاتے ہو، یعنی دودھ، دہی، ان سے بننے والی بے شمار چیزیں اور گوشت، الغرض، ان میں تمہارے کھانے کا سامان بھی ہے۔ یہ آیت اسی سورت کی آیت (۶۶) اور (۸۰) کے مشابہ ہے۔

آیت 6 ۝ ۱ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ.....: ”جَمَالٌ“ خوبصورتی، یہ ”سُحْرَمٌ“ سے مصدر ہے۔ ”رَجُلٌ حَبِيلٌ“ خوبصورت آدمی۔ ”تُرِيحُونَ“ یہ ”إِرَاحَةٌ“ (افعال) سے مضارع ہے، شام کو لانا۔ ”تَسْرَحُونَ“ (ف) صبح چرانے کے لیے لے جاتے ہو۔

۲ تُرِيحُونَ: شام کو گھر لانے کا منظر زیادہ خوبصورت ہوتا ہے، کیونکہ جانوروں کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں اور وہ تروتازہ اپنے مالک کی خوشی کا باعث ہوتے ہیں، اس لیے اسے پہلے ذکر فرمایا۔ ایک جمال یہ بھی ہے کہ ان کی کثرت سے ان کے مالک کی دولت مندی کا اظہار ہوتا ہے اور دنیا میں دولت خود ایک جمال ہے۔

آیت 7 ۝ ۲ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بِلِغِيهِ.....: یہ بات قرآن میں کئی جگہ آئی ہے، مثلاً سورۃ مومنوں (۲۱)، ۲۲، سورۃ مؤمن (۸۱ تا ۷۹)، سورۃ نساء (۷۳ تا ۷۱) اور سورۃ زخرف (۱۳ تا ۱۲)۔

آیت 8 ۝ ۳ وَالْغَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا.....: ”رَيْتَةٌ“ مفعول لہ ہے۔ ”وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ“ یعنی ان جانوروں کے علاوہ جن کا ابھی ذکر ہوا، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے وہ چیزیں پیدا کرتا رہے گا جو تم نہیں جانتے۔ اس میں وہ بے شمار حیوانات بھی شامل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے سے نئے پیدا کرتا رہتا ہے، کبھی مختلف نسلوں کے ملاپ سے، کبھی از سر نو صحراؤں، جنگلوں، سمندروں میں اور انسانوں کی تجربہ گاہوں میں اور قیامت تک ایجاد ہونے والی سواریاں اور مشینیں بھی جو

وَالْحَبِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۗ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸﴾

پر سوار ہو اور زینت کے لیے، اور وہ پیدا کرے گا جو تم نہیں جانتے ﴿۸﴾

آیت کے نزول کے وقت موجود تھیں، جن میں گاڑیاں، ہوائی جہاز اور انجنوں سے چلنے والے بحری جہاز وغیرہ سب شامل ہیں اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ مزید کیا کیا ایجادات ہوں گی؟ قرآن نے ان چیزوں کا ذکر کیا مگر انہیں مبہم رکھا، کیونکہ اگر نام لیتے تو بہت سے لوگ شاید انکار ہی کر دیتے۔ کہا جاتا ہے: ”النَّاسُ أَعْدَاءُ لِمَا جَهِلُوا“ ”کہ لوگ جس بات کا علم نہ رکھتے ہوں اس کے مخالف ہوا کرتے ہیں“ اور ذکر نہ کرتے تو جانوروں سے بھی تیز رفتار، آرام دہ اور مزین سواریوں کا توحید و احسان الہی کی دلیل کے طور پر ذکر رہ جاتا جو ”سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا“ کی جانوروں سے بھی بڑھ کر مصداق ہیں اور صاحبِ ظلال القرآن نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ اس لیے بھی کر دیا کہ لوگ نئی ایجادات پر سواری میں حرج نہ سمجھیں کہ ہمارے بزرگ تو اونٹوں گھوڑوں ہی پر سواری کرتے رہے ہیں اور قرآن میں انہی کا ذکر ہے۔

﴿۲﴾ خچر اور گدھے کے گوشت کی حرمت پر تو سب کا اتفاق ہے، البتہ گھوڑے کے گوشت میں اختلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے صحیح احادیث میں اس کا حلال ہونا ثابت ہے۔ بعض لوگ جو اسے حرام سمجھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان تینوں جانوروں کو سواری کے لیے دوسرے جانوروں سے الگ ذکر فرمایا ہے، اگر ان کا کھانا حلال ہوتا ہے تو سواری کے ساتھ انہیں کھانے کی نعمت کا ذکر ضرور ہوتا۔ یہ دلیل اگر درست مانی جائے تو پہلے جانوروں کے فوائد میں سواری کا ذکر نہیں تو ان پر سواری جائز نہیں ہونی چاہیے۔ (طبری) بغوی نے فرمایا کہ یہ آیات حلال و حرام کے بیان سے تعلق ہی نہیں رکھتیں۔ علامہ رشام جمال الدین قاسمی ؒ فرماتے ہیں کہ سب کو معلوم ہے کہ یہ سورت مکی ہے، اگر اس سے گھوڑے کی حرمت ثابت ہوتی تو گدھے کی بھی ضرور ثابت ہوتی، جب کہ گدھے کا گوشت ان آیات کے بعد بھی حلال رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے موقع پر اسے حرام فرمایا اور اسی موقع پر گھوڑے کے حلال ہونے کو برقرار رکھا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں جابر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھریلو گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا اور گھوڑوں کی اجازت دی۔ [بخاری، المغازی، باب غزوة خیبر: ۴۶۱۹] اسماء ؓ فرماتی ہیں، ہم نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک گھوڑا خچر کیا اور اسے کھلایا۔ [بخاری، الذبائح والصيد، باب النحر و الذبح: ۵۵۱۰۔ مسلم، الصيد و الذبائح، باب اباحة اكل لحم الخيل: ۱۹۴۲] اسی طرح جابر ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں گھوڑے کا گوشت کھانے کی اجازت دی اور گھریلو گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا۔ [ترمذی، الأطعمة، باب ما جاء في اكل لحوم الخيل: ۱۷۹۲۔ نسائی: ۴۳۳۳]

علامہ قاسمی فرماتے ہیں کہ ابوداؤد اور نسائی وغیرہ میں خالد بن ولید ؓ سے جو حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے درندوں میں سے ہر کچلی والے جانور اور گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا، اس کی سند میں صالح بن یحییٰ

وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَ مِنْهَا جَائِزٌ وَ لَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ①

اور سیدھا راستہ اللہ ہی پر (جا پہنچتا) ہے اور ان میں سے کچھ (راستے) ٹیزھے ہیں اور اگر وہ چاہتا تو ضرور تم سب کو ہدایت دے دیتا ①

ہے جس میں مقال ہے، امام بخاری نے فرمایا: ”فِيهِ نَظَرٌ“ اور ایسے راوی کی حدیث لینا درست نہیں ہوتا، پھر اگر صحیح بھی فرض کریں تو یہ اوپر ذکر کردہ صحیح احادیث کے مقابلے میں پیش کرنے کے قابل نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حکم خیر سے پہلے کا ہو اور منسوخ ہو۔

تعمیہ: صاحب ہدایہ نے امام ابوحنیفہ سے گھوڑے کی کراہت نقل فرمائی ہے، حرمت نہیں اور لکھا ہے: ”بعض نے کہا ان کے نزدیک کراہت تحریمی ہے اور بعض نے کہا تنزیہی ہے۔ (صاحب ہدایہ کے خیال میں پہلا قول زیادہ صحیح ہے) البتہ اس کے دودھ سے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس سے آلہ جہاد (گھوڑوں) میں کمی واقع نہیں ہوتی۔“ اس سارے کلام سے گھوڑے کا اور گدھے اور خچر کا فرق واضح ہو رہا ہے اور یہ بھی کہ امام ابوحنیفہ کا گھوڑوں کے گوشت کو مکروہ کہنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ آلہ جہاد ہیں، ذبح کرنے سے کمی واقع ہو جائے گی۔

③ وَ زِينَةً: پچھلی آیات میں جمال اور اس آیت میں زینت کے ذکر سے معلوم ہوا کہ انسانی ضروریات صرف کھانا پینا، پہننا اور سواری ہی نہیں بلکہ حسن و جمال اور زینت کا احساس بھی انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے اور اگر حرام طریقے سے نہ ہو تو اس سے فائدہ اٹھانا بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

آیت 9: ① وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ.....: چند انسانی ضروریات کا ذکر فرما کر سب سے ضروری چیز یعنی صحیح راستہ بتانے کے اہتمام کا خاص طور پر ذکر فرمایا، کیونکہ یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے ہم ہر نماز میں یہی دعا کرتے ہیں: ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ [الفاتحة: ۵] ”ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔“ ”قَصْدٌ“ کا معنی سیدھا ہونا۔ ”السَّبِيلُ“ کا معنی راستہ، تو ”قَصْدُ السَّبِيلِ“ سیدھا راستہ جس میں کوئی کجی نہ ہو۔ اسے ”سبیلِ قصد“ بھی کہتے ہیں اور ”سبیلِ قاصد“ بھی۔ گویا ”قَصْدٌ“ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے جو موصوف کی طرف مضاف ہے۔ یہ بات طے ہے کہ دو نقطوں کے درمیان سب سے مختصر خط مستقیم ہی ہوتا ہے، یعنی اپنے بندوں کی سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرنا اللہ ہی کے ذمے ہے اور یہ ذمہ خود اس نے اپنے فضل سے اٹھایا ہے، کسی کا اس پر جبر نہیں۔ یا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیدھا راستہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے والا ہے، یعنی انسان فطرت پر قائم رہے تو خود بخود توحید الہی کا قائل ہو جاتا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جسمانی ضروریات پوری کرنے کا سامان بہم پہنچایا ہے، اسی طرح اس کی ہدایت کا راستہ بھی متعین کر دیا ہے۔

② جب زندگی عطا کرنے والے نے خود راستہ متعین کر دیا تو مفکروں، فلسفیوں اور قانون سازوں کو دستور سازی یا قانون سازی

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِينُونَ ﴿۱۰﴾

وہی ہے جس نے آسمان سے کچھ پانی اتارا، تمہارے لیے اسی سے پینا ہے اور اسی سے پودے ہیں جن میں تم چراتے ہو ﴿۱۰﴾

کی تکلیف سے گریز کرنا چاہیے، کیونکہ ان کا علم ہر چیز کا احاطہ نہیں کرتا، اس لیے ان کے بنائے ہوئے دستور و قانون بدلتے رہتے ہیں اور ہمیشہ انسان کی بربادی ہی کا باعث بنتے ہیں۔ حکام کا کام دستور سازی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے دستور و قانون کو عملاً نافذ کرنا ہے۔ افسوس کہ کفار کی کئی سو سالہ محنت کے نتیجے میں مسلمانوں نے آخر اللہ تعالیٰ کا منصب خود سنبھال لیا اور خلافت ختم کر کے جمہوریت کے نام پر خود دستور ساز اور قانون ساز بن بیٹھے۔ اب نام ان کا مسلم ہے، مگر نظام ان کا اللہ تعالیٰ سے بغاوت اور کفار کے حکم یا اپنی خواہش پر عمل ہے۔

﴿۱۰﴾ وَمِنْهَا جَائِدٌ: ”سَحَارَ عَنِ الطَّرِيقِ“ راستے سے ہٹ گیا۔ ”جَائِدٌ“ اسم فاعل ہے، وہ تمام راستے جو اللہ کی طرف سے نہیں ہیں، یعنی نہ قرآن سے ثابت ہیں نہ حدیث سے، وہ سب صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں اور انھیں اختیار کرنے والے گمراہ ہیں۔

﴿۱۱﴾ وَلَوْ شَاءَ لَهَلَّا بِكُمْ أَجْعَلِينَ: مگر اس سے انسان کو پیدا کرنے کا اصل مقصد جو آزمائش ہے، وہ فوت ہو جاتا، اس لیے کہ جس حد تک راہ دکھانے کا تعلق تھا وہ تو بغیر بھیج کر اور کتابیں اتار کر پورا کر دیا، مگر اس راہ پر چلنا انسان کے اختیار پر چھوڑ دیا، تاکہ اس کے اعمال کے مطابق اسے جزا یا سزا دی جاسکے۔

آیت 10 ﴿۱۰﴾ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً: ”السَّمَاءُ“ کا لفظی معنی بلند چیز ہے، کیونکہ یہ ”سَمُو“ سے مشتق ہے، جس کا معنی بلندی ہے، اس لیے یہ لفظ بادل، بارش، چھت (دیکھیے انبیاء: ۳۲) اور آسمان سب کے لیے بولا جاتا ہے اور ہر جگہ قرینے سے اس کا معنی متعین ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدت و قدرت کے دلائل میں حیوانات کے بعد اب پانی اور نباتات کا ذکر فرمایا، کیونکہ انسان کی غذا لحمیات، نشاتے، شکر وغیرہ زمین سے پیدا ہونے والی بے شمار چیزوں اور پانی سے مکمل ہوتی ہے۔ زمین کا ستر (۷۰) فیصد حصہ نہایت تلخ سمندر ہے، جس کا پانی انسان کے پینے کے لائق نہیں، مگر زمین اور سمندر کو قلعن سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کا نمکین ہونا نہایت ضروری ہے، ورنہ بدبو اور قلعن سے نہ سمندر میں کوئی چیز زندہ رہتی، نہ زمین پر۔ انھیں بخارات کی صورت میں اڑا کر بادلوں سے بیٹھا پانی برسانے والی ایک ہی ذات پاک ہے، اگر وہ پانی نہ برساتا تو انسان، حیوان، نباتات سب کا نام و نشان مٹ جاتا اور اگر وہ سمندر کی طرح شدید کڑواہی برساتا تو پھر بھی خشکی کی ہر زندہ چیز انسان، حیوان اور نباتات معدوم ہو جاتے، فرمایا: ﴿لَوْ شَاءَ جَعَلْنَاهُ أَمْحًا فَلَئِنَّا لَشَاكِرُونَ﴾ [الواقعة: ۷۰] ”اگر ہم چاہیں تو اسے سخت نمکین بنا دیں، پھر تم شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟“

يُثَبِّتُ لَكُمْ بِهِ الزُّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۱﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

وہ تمہارے لیے اس کے ساتھ کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بڑی نشانی ہے جو غور و فکر کرتے ہیں ﴿۱۱﴾ اور اس نے تمہاری خاطر رات اور دن اور سورج اور

﴿۱۱﴾ نَكْمَةُ قِنْطَارٍ شَرَابٍ..... اسی پانی میں سے کچھ حصہ تمہارے پینے کے کام آتا ہے اور کچھ پودے اگانے کے، جن میں تم اپنے جانور چراتے ہو۔ یہ نہ ہو تو نہ تم رہو، نہ تمہارے پودے اور نہ ان میں چرنے والے جانور۔ ”شَجَرٌ“ اگرچہ تنے والے درخت کو کہتے ہیں مگر یہاں زمین سے اگنے والی ہر چیز مراد ہے، دلیل اس کی ”فِيهِ زَيْتُونَ“ (اس میں تم چراتے ہو) ہے۔“

آیت ۱۱ ﴿۱۱﴾ يُثَبِّتُ لَكُمْ بِهِ الزُّرْعَ وَالزَّيْتُونَ..... ایک ہی پانی، ایک ہی زمین، ایک ہی ہوا اور ایک ہی سورج کی پوش سے گندم اور جو وغیرہ کے زمین میں سیدھے یا لٹے دفن شدہ دانے سے کھیتی، گھسلی سے زیتون، قلم سے انگور اور بے شمار کھیتیاں اور پھل پیدا فرمائے۔ لحیات، نشاستہ، شکر، وٹامنز، دوائیں، لکڑی، الغرض! زندگی کی ہر ضرورت کو پیدا کرنے والا کون ہے؟ تم تو زمین میں دانے یا گھسلیاں پھینک کر آگئے تھے اور کئی بیج تم نے ڈالے بھی نہیں تھے، یہ سب اگانے والا کون ہے؟ اپنے اس باپے اور مشکل کشا کا نام تو بتاؤ۔ لطف یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان چیزوں اور آئندہ ذکر ہونے والی چیزوں کا خالق ہونے کا کوئی دعوے دار بھی نہیں۔ ان تمام چیزوں میں اللہ کے بے شمار انعامات اور اس کی توحید اور قدرت کی بہت بڑی نشانی موجود ہے (لَا يَئِسُ مِنَ اللَّهِ فِئْتَمِينَ تَعْلِيمٍ کے لیے ہے) مگر ان کے لیے جو غور و فکر کریں، ان کے لیے نہیں جو سوچنے کی رحمت ہی نہ کریں۔ دیکھیے سورہ رعد (۲۴) اور سورہ واقعہ (۶۳ تا ۶۷)۔

آیت ۱۲ ﴿۱۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ..... تفسیر کا معنی کسی چیز کو اس کا اختیار اور مرضی ختم کر کے اپنا تابع بنا کر اپنی مرضی کے مطابق چلانا ہے۔ رات اور دن کے ساتھ سورج اور چاند کے تعلق کی بنا پر چاروں کا ذکر اکٹھا کیا۔ ”لَكُمْ“ (تمہارے لیے) کا یہ مطلب نہیں کہ رات اور دن اور سورج چاند تمہارے تابع فرمان کر دیے ہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے زبردست حکم ہی کے تابع ہیں، اس کے مقرر کردہ نظام سے نہ ہال برابر ادھر ادھر ہو سکتے ہیں نہ آنکھ جھپکنے کے برابر ادھر ادھر۔ (دیکھیے فاطر: ۴۱) ”لَكُمْ“ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو تمہاری بقا، ضروریات اور منافع کے لیے پابند کر رکھا ہے۔ اسے لام انشاع کہتے ہیں اسی لیے ترجمہ ”تمہاری خاطر“ کیا گیا ہے۔ ”سَخَّرَ“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی یا اختیار استعمال ہی نہیں کر سکتے، صرف انسان کو آزمائش کے لیے کچھ اختیار دیا ہے، وہ بھی صحیح یا غلط راستہ اختیار کرنے کا، باقی وہ بھی اللہ تعالیٰ کے زبردست حکم کے آگے بے بس ہے، زندگی اور موت پر، فقر و غنا پر، صحت و بیماری پر، الغرض بے شمار چیزیں ہیں جن پر انسان کا کچھ اختیار نہیں۔ باقی تمام مخلوق کو جو مکمل مسخر کر دیا اور ان کی مرضی بالکل ختم کر دی تو یہ ان سے پوچھ کر ہی کیا، اگر وہ بھی

وَ النَّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِ رَبِّ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۶﴾

چاند کو مسخر کر دیا اور ستارے اس کے حکم کے ساتھ مسخر ہیں۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں ﴿۱۶﴾

آزمائش قبول کر کے کچھ اختیار چاہتے تو انھیں مل جاتا، مگر انھوں نے جرأت ہی نہیں کی اور عمل خود سپردگی اختیار کی، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَكْبَنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَانِ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ [الأحزاب: ۷۲] ”بے شک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا، بلاشبہ وہ ہمیشہ سے بہت ظالم، بہت جاہل ہے۔“ اور انسان کے فائدے کی مثالوں کے لیے دیکھیے سورہ نبا کی ابتدائی آیات اور سورہ قصص (۷۱، ۷۲)۔

﴿۱۶﴾ وَالنَّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِ رَبِّ.....: ”السَّمَوَاتِ وَالْقَمَرِ“ یہ ”سَخَّرَ“ کے مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب تھے، ”النَّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ“ کو مرفوع اور مبتدا و خبر کی صورت میں الگ فرمایا، کیونکہ سیاروں کا معاملہ سورج چاند سے بھی بے حد وسیع ہے۔ انسان کو اب تک جو کچھ معلوم ہوا ہے اس کے مطابق ایک ایک سیارہ اتنا عظیم ہے کہ سورج چاند اس کے مقابلے میں کچھ حیثیت ہی نہیں رکھتے اور ایسی بے شمار کہکشائیں ہیں جن کا ہر سیارہ ہمارے سورج سے بھی بڑا ہے اور ہم سے اتنے دور ہیں کہ لاکھوں نوری سالوں میں بعض کی روشنی اب زمین تک پہنچی ہے اور بعض کی اب بھی نہیں، حالانکہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھبیس ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ ہمیں تو ان کے یہی فوائد معلوم ہیں کہ یہ رات کی تاریکی میں چراغ، آسمان کے لیے زینت، شیاطین سے آسمان کی حفاظت کا ذریعہ اور برد و بحر کی ظلمتوں میں راستہ بتانے والے ہیں، مگر جب چاند کی اتنی تاثیر ہے کہ اس کے عروج و زوال سے سمندر جھمی عظیم مخلوق مدو جزر کا شکار ہو جاتی ہے تو ان ستاروں کی کائنات پر تاثیر تو انھیں پیدا کرنے والا ہی جانتا ہے۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”(پہلی) چار چیزوں سے تو بندوں کے کام صریح طور پر وابستہ نظر آتے ہیں، مگر ستاروں سے انسانی فوائد کا تعلق ہونا صریح نہ تھا، اس لیے ان کو جدا کر دیا۔ (فتنہ بر)“ ہاں سورج، چاند یا ستاروں کا تقدیر سے یا غیب کی بات معلوم کرنے سے کوئی تعلق نہیں، نہ ان کے پاس ہادش برسانے یا نفع نقصان کا کچھ اختیار ہے۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق اللہ کے ساتھ کفر کرنے والا اور ستاروں پر ایمان رکھنے والا ہے۔ (دیکھیے بخاری: ۱۰۳۸) ستاروں کی تسخیر میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی ایک نہیں بہت سی نشانیاں ہیں، اس لیے لفظ آیات جمع ذکر فرمایا، مگر ان کے لیے جو عقل کو استعمال کرتے ہیں، ان کے لیے نہیں جن کا ذکر سورہ انفال (۲۲) یا سورہ حج (۲۶) وغیرہ میں آیا ہے۔

وَمَا ذَرَأَا لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانًا ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۱۳﴾
 وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا
 وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاجِرَ فِيهِ وَ تَلْتَبْتَعُوا مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۴﴾

اور جو کچھ اس نے تمہارے لیے زمین میں پھیلا دیا ہے، جس کے رنگ مختلف ہیں، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بڑی نشانی ہے جو بصیحت حاصل کرتے ہیں ﴿۱۳﴾ اور وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر دیا، تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زینت کی چیزیں کثرت سے نکالو، جنھیں تم پہنتے ہو۔ اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے، اس میں پانی کو چرتی چلی جانے والی ہیں اور تاکہ تم اس کا کچھ فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو ﴿۱۴﴾

آیت 13 وَمَا ذَرَأَا لَكُمْ فِي الْأَرْضِ "ذَرَأَا" کا اصل معنی کسی چیز کو توالد و تاسل کے ذریعے سے پھیلانا ہے، اسی سے "ذُرِّيَّةٌ" کا لفظ نکلا ہے، جیسے آدم اور حوا علیہما السلام سے بے شمار انسان، ہر حیوان سے بے شمار حیوان، ہر پودے سے بے شمار پودے، الغرض رنگا رنگ مخلوق کا اس طرح تمہارے فائدے کے لیے پھیلانا اللہ تعالیٰ کی توحید کی بہت بڑی نشانی ہے، ان کے لیے جو بصیحت حاصل کریں۔ ویسے "ذَرَأَا" کا معنی "مَخْلَقٌ" بھی آتا ہے، یعنی زمین میں جو کچھ اللہ نے پیدا کر کے پھیلا دیا، مثلاً انسان، حیوان، نباتات، معدنیات، سیالات، گیسیں، بجلی، بھاپ اور کئی قسم کی شعاعیں، الغرض! مختلف رنگوں اور قسموں والی چیزوں میں، جو سب انسان کے فائدے کے لیے ہیں، خالق کی پہچان اور اس کے وحدہ لا شریک نہ ہونے کے یقین کی بہت سی نشانیاں ہیں، مگر ان کے لیے جو بصیحت قبول کرتے ہوں، جو برتن ہی الٹا ہو جائے اس میں کوئی چیز کیسے ڈالی جاسکتی ہے۔ کائنات کی رنگارنگی اللہ کی قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے۔ دیکھیے سورہ روم (۲۲)۔

آیت 14 وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ اور وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے سمندر جیسی عظیم مخلوق کو اگر پھر جائے تو خشکی پر چڑھ کر ہر قسم کی زندگی درہم برہم کر ڈالے، کو پابند فرما دیا کہ اپنی حدود میں رہے اور انسان کو اپنی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے دے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سمندر سے حاصل ہونے والی چار نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ وہ نعمتیں جو سمندر میں بنی اسرائیل کو راستہ دینے یا موسیٰ علیہ السلام کے تابوت کو کنارے پر پہنچانے کی صورت میں ہوئیں، وہ ان کے علاوہ ہیں۔ یہ چار نعمتیں درج ذیل ہیں:

① لِيَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا: "طَرِيًّا" کا مصدر "طَرَأُوهُ" ہے، اس کا فعل "طَرَبٌ" اور "شَرَفٌ" کے وزن پر آتا ہے، یہ "تَابَسٌ" کی ضد ہے، یعنی تروتازہ۔ مراد مچھلیاں اور پانی کا ہر وہ جانور ہے جو پانی کے بغیر زندہ نہ رہ سکے۔ سمندر کا مردار بھی حلال ہے اور محرم کو بھی سمندری شکار کی اجازت ہے۔ بعض لوگوں نے تمام سمندری جانوروں میں سے صرف مچھلی کو حلال قرار دیا ہے، جو پکڑتے وقت زندہ ہو، لیکن یہ بات درست نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ مائدہ (۹۶) اس میں اشارہ ہے کہ سمندری جانور تازہ حالت ہی میں لذیذ اور مفید ہوتا ہے، باسی ہو تو ضرر رساں ہوتا ہے۔ علامہ قاسمی نے فرمایا: "لَحْمًا طَرِيًّا" سے مچھلی کی بناوٹ کا حسن، پک، ملائمت اور تری مراد ہے، ورنہ اس کا گوشت خشک کر کے محفوظ بھی کیا جاتا ہے۔" میں کہتا

وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَآَنْهَارًا وَ سُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵﴾
 عَلَمَاتٌ ۖ وَيَا لَيْتُمْ هُمْ يَهْتَدُونَ ﴿۱۶﴾

اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ تمہیں ہلانہ دے اور نہریں اور راستے بنائے، تاکہ تم منزل تک پہنچ جاؤ ﴿۱۵﴾
 اور علامتیں (بنائیں) اور ستاروں کے ساتھ وہ راستہ معلوم کرتے ہیں ﴿۱۶﴾

ہوں غزوہ سیف البحر میں سمندر کے پانی کی چھوڑی ہوئی بہت بڑی مچھلی صحابہ کرام ایک ماہ تک کھاتے رہے اور بچا کر مدینہ بھی لے گئے۔ یہ اسے نمک وغیرہ لگا کر خشک کرنے کے عمل کے بغیر کیے ممکن ہے، اسی طرح اب برف یا فریزر میں مچھلی ایک عرصہ تک محفوظ رہتی ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کمال ہے کہ سخت نمکین کڑوے پانی میں لذیذ گوشت تیار فرمایا، بناؤ اس میں کون سے نسخہ بخش یا دیگر کا حصہ ہے اور کتنا حصہ ہے؟

﴿۱۵﴾ وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حَبْلًا ۖ : ”تُخْرِجُوا“ کے بجائے ”تَسْتَخْرِجُوا“ سے کثرت کے ساتھ نکالنے کی طرف اشارہ ہے۔ ”حَبْلًا“ جس سے آرائش و زینت حاصل ہو، تاکہ تم اس سے زیور، موتی، مرجان، سونا اور اس میں چھپے ہوئے بے شمار خزانے اور دھاتیں کثرت سے نکالو۔ اس میں اللہ کی یہ نعمت بھی آگئی کہ سمندر کو ایسا بنایا کہ انسان اس میں غوطہ لگا سکے۔ مسلمانوں کے لیے یہ ترغیب بھی ہے کہ وہ غوطہ خوری میں مہارت حاصل کریں، خود بھی اور مشینوں کے ساتھ بھی اور سمندر کے خزانوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ کفار کو کھلانے چھوڑیں کہ وہ اس کے خزانوں اور تیل، گیس اور دوسری معدنیات اور نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں اور مسلمان ان کی محتاجی ہی پر قانع رہیں۔

﴿۱۶﴾ وَتَرَى الْفُلَکَ فَوَاجِرًا فِيهِ: ”فَوَاجِرًا“ ”مَاجِرَةً“ کی جمع ہے، اپنے سینے سے پانی کو پیرنے والی۔ اس لیے تمام بحری جہازوں کا سامنے کا حصہ نوک دار رکھا جاتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت ہے کہ پانی جس میں ہر چیز غرق ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ سوئی بھی اس میں ڈوب جاتی ہے، اسے اس طرح بنایا کہ جب وزن اور حجم کی خاص نسبت رکھنے والی کوئی چیز اس میں ڈالی جائے تو وہ اسے اٹھالیتا ہے، حتیٰ کہ لاکھوں ٹن وزن اٹھانے والے بحری جہاز پانی کو پیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں، مگر پانی اللہ کے حکم سے انہیں اٹھاتا بھی ہے، راستہ بھی دیتا ہے اور خوراک بھی مہیا کرتا ہے۔

﴿۱۷﴾ وَتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ: دور دراز کے کم خرچ اور آسان سفر، دنیا کی سیر، علم کا حصول، حج و عمرہ، تجارت، جہاد، مال غنیمت، الغرض، کوئی ایک فائدہ اور فضل ہو تو گنا جائے، یہ سب کچھ اکیلے اللہ نے بنایا، کسی داتا یا دیوتا کا اس میں کچھ دخل نہیں اور اس نے یہ اس لیے بنایا کہ تم ان نعمتوں کی قدر کرو اور اس کے احکام پر عمل کر کے ربانی اور عملی طور پر شکر ادا کرو۔

آیت 15 ﴿۱۵﴾ وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ..... اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حجر (۱۹) اور سورہ رعد (۳) یہاں پہاڑوں اور نہروں کے ساتھ راستوں کا بھی ذکر فرمایا، کیونکہ پہاڑوں میں دریا ہی راستہ بناتے ہیں اور انہی کے کناروں پر وسیع سڑکیں بنتی ہیں۔

آیت 15 ﴿۱۵﴾ وَعَلَمَاتٌ: یعنی راستوں میں چھوٹے بڑے پہاڑ، دریاؤں کے موڑ، ریت کے ٹیلے، سبزہ زار، باغات، شہر،

أَفَكُنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۷﴾ وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ

اللَّهُ لَعَفْوٌ رَحِيمٌ ﴿۱۸﴾

تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے، اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا؟ پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ﴿۱۷﴾ اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے۔ بے شک اللہ یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۸﴾

آبادیاں، الغرض! بے شمار علامتیں رکھیں جن کے ساتھ لوگ صحیح راستے پر رواں دواں رہتے ہیں۔

﴿۱۷﴾ وَالْبَخْمُ هُمْ يَهْتَدُونَ: ”الْبَخْمُ“ سے مراد یہاں جنس ہے، کوئی ایک ستارہ نہیں، یعنی رات کے وقت سمندر یا خشکی میں جہاں دوسری نشانیاں کام نہیں دیتیں، لوگ ستاروں کے ذریعے سے راستہ معلوم کرتے ہیں۔ راستوں کے علاوہ سمت، قبلہ اور اوقات کی پہچان بھی ستاروں سے حاصل ہوتی ہے۔ ”يَهْتَدُونَ“ میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ (روح المعانی) ”هُم“ کی ضمیر خشکی اور سمندر میں چلنے والے ہر مسافر کو شامل ہے، البتہ سب سے پہلے اہل مکہ اس میں داخل ہیں، کیونکہ وہ تجارت کے لیے کثرت سے سفر کرتے تھے اور ستاروں کے ذریعے سے راستے معلوم کرنے میں مشہور تھے۔ دیکھیے سورہ قریش کی تفسیر۔ اس سے پہلے کفار سے خطاب چلا آ رہا تھا، یہاں ان کا ذکر غائب کی ضمیر سے فرمایا، یہ التفات اتنی بڑی نعمتوں کے باوجود ان کے شرک پر اظہار ناراضگی کے لیے ہے کہ تم لوگ خطاب کے قابل ہی نہیں، مگر اگلی آیت میں پھر خطاب ہے، کیونکہ اس میں ان کو لاجواب کرنے کے لیے ان سے براہ راست سوال ہے۔

آیت 17: أَفَكُنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ..... : یہ سب نعمتیں جو ذکر ہوئیں، سب جانتے اور مانتے ہیں کہ ایک اللہ کی پیدا کردہ ہیں اور جنہیں مشرکین پکارتے ہیں انہوں نے نہ کچھ پیدا کیا ہے، نہ کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ اس کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے (دیکھیے سورہ حج: ۷۳) تو یہ بتاؤ کہ ہر چیز کے خالق کو تم نے ان بے بس ہستیوں کے برابر کر دیا جو کبھی کا پر بھی نہیں بنا سکتیں، تو کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ سچ ہے: ﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ﴾ [الأنعام: ۹۱] ”انہوں نے اللہ کی قدر ہی نہیں کی جو اس کی قدر کا حق تھا۔“ یہ مضمون مفصل سورہ رعد (۱۶) میں ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ زمخشری نے یہاں سوال اٹھایا ہے کہ ”مَنْ“ کا لفظ تو ذوی العقول کے لیے ہوتا ہے، یہاں بتوں کے لیے کیوں استعمال ہوا، پھر جواب دیا ہے کہ چونکہ مشرکین انہیں حاجت روا، مشکل کشا سمجھتے تھے، اس لیے ان کے عقیدے کے مطابق ”كَمَنْ لَا يَخْلُقُ“ فرمایا ہے۔ حالانکہ اس کا سادہ اور صحیح جواب یہ ہے کہ وہ محض پتھروں کو نہیں پوجتے تھے، بلکہ ان ہستیوں کو پکارتے تھے جن کے وہ بت بناتے تھے، مثلاً انہوں نے مریم، ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام کے مجسمے بیت اللہ کے اندر رکھے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں فال کے تیر پکرائے ہوئے تھے۔ [دیکھیے بخاری، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾: ۳۳۵۱، ۳۳۵۲] قوم نوح کے بت بھی اولیاء اللہ ہی کے مجسمے تھے۔ دیکھیے تفسیر سورہ نوح (۲۳) یہ سب ذوی العقول تھے، بلکہ ذوی العقول کے استاد تھے، اس لیے زمخشری نے جو سوال اٹھایا ہے وہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔

آیت 18: ﴿۱۸﴾ وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ شامری نے کہا کہ تم لوگ اللہ کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے تو شکر کس طرح ادا کر سکتے ہو؟ دیکھیے سورہ

وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُسْرُونَ وَ مَا تُعْلِنُونَ ﴿۱۹﴾ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَ هُمْ يُخْلَقُونَ ﴿۲۰﴾

اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو ﴿۱۹﴾ اور وہ لوگ جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں ﴿۲۰﴾

ابراہیم (۳۳) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ إِنَّ اللَّهَ لَعَفْوٌ رَّحِيمٌ: یعنی یہ اس کی بخشش اور مہربانی ہے کہ تمہاری ناشکری کے باوجود تمہیں بے شمار نعمتیں عطا کرتا ہے اور توبہ کرنے اور پلٹ آنے پر تمہارے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَبِإِذَا الْعَبْدُ إِذَا اعْتَرَفَ، ثُمَّ نَابَ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِ» [بخاری، المغازی، باب حدیث الإفک: ۴۱۶۱۔ مسلم: ۲۷۷۰] ”بندہ جب اعتراف کر لے، پھر توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس پر مہربان ہو جاتا ہے۔“ پھر تھوڑے سے شکر پر بہترین جزا دیتا ہے، مقصد امید کا دروازہ کھلا رکھنا ہے۔

آیت ۱۹ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُسْرُونَ وَ مَا تُعْلِنُونَ: اللہ کے سوا کوئی بھی سب لوگوں کے اعمال نہیں جان سکتا، چھپے ہوئے عمل تو بہت دور کی بات ہے، علانیہ بھی نہیں جان سکتا۔ چند لوگوں کے چند اعمال اس کے دیکھنے سننے میں آ بھی جائیں تو بے شمار انسانوں کے اعمال کیسے جان سکتا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ تمام جنوں اور انسانوں کے علانیہ کاموں کے علاوہ ان کے چھپ کر کیے ہوئے کام بھی جانتا ہے، بلکہ سینے کے راز تک جانتا ہے۔ دیکھیے سورہ طہ (۷) اور سورہ اعلیٰ (۷) کی تفسیر۔ لہذا یہ نہ سمجھو کہ تمہارے شرک و کفر کے باوجود تم پر جو رحم فرما رہا ہے اور نعمتوں پر نعمتیں دے رہا ہے یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ وہ تمہارے اعمال سے ناواقف ہے، بلکہ اس تمام ناشکری اور نافرمانی کے باوجود اس کی مہربانی اس لیے ہے کہ شاید تمہاری آنکھیں کھلیں اور تم اپنے کرتوتوں سے باز آ جاؤ۔ اس میں کافروں کے لیے یہ تنبیہ ہے کہ معبود تو وہی ہونا چاہیے اور ہو سکتا ہے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کا جاننے والا ہو۔

آیت ۲۰ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ: اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان کی بے بسی اور عجز کے بیان کے لیے تین اوصاف بیان فرمائے، پہلا یہ کہ وہ کچھ پیدا نہیں کرتے، بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں، خالق صرف ایک ہی ہے، کیونکہ اگر ان کے معبود نیک یا بد فوت شدہ لوگ ہیں تو ان کا خالق اللہ ہے اور وہ نہ زندگی میں کچھ پیدا کر سکتے تھے نہ اب کر سکتے ہیں۔ اس کی تفصیل اسی سورت کی آیت (۱۷)، سورہ رعد (۱۶) اور سورہ حج (۷۳) میں دیکھیں اور اگر ان کے جیسے یا ان کی قبریں ہیں تو وہ بھی کچھ پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ انھیں تم خود اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿أَتَعْبُدُونَ مَا تَدْعُونَ﴾ [الصفات: ۹۵] ”کیا تم اس کی عبادت کرتے ہو جسے خود تراشتے ہو۔“ اگر تمہارے معبود تراشے ہوئے بت ہیں یا قبریں، تو خالق ان کا بھی اللہ تعالیٰ ہے تم نہیں، جیسا کہ اس سے اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ

أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُونَ ۚ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿۱۶﴾ إِلَهُمَّ إِلَهُ وَاحِدٌ ۚ فَالَّذِينَ لَمْ يَرْغَبُوا عَنْ آلِهَتِهِمْ كَمَا عَلَّمَهُمْ اللَّهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُونَ ۚ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿۱۷﴾

مردے ہیں، زندہ نہیں ہیں اور وہ نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے ﴿۱۶﴾ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، پس وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکار کرنے والے ہیں اور وہ بہت تکبر کرنے والے ہیں ﴿۱۷﴾

وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۸﴾ [الصفات: ۹۶] ”حالانکہ اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم بناتے ہو۔“

آیت 21: ﴿۱۸﴾ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ: دوسرا وصف یہ کہ وہ مردہ ہیں زندہ نہیں۔ اس آیت میں ”أَمْوَاتٌ“ سے مراد وہ (نیک یا بد) مردہ لوگ ہیں جن کی مشرک لوگ عبادت کرتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ﴾ ”اور وہ یہ شعور نہیں رکھتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔“ اٹھائے جانے کے شعور کا لفظ جمادات (بتوں اور قبروں) پر صادق نہیں آتا، بلکہ صاحب عقل انسانوں، جنوں اور فرشتوں ہی پر صادق آتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے صرف مردہ کہنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا: ﴿غَيْرُ أَحْيَاءٍ﴾ ”زندہ نہیں ہیں۔“ اس سے قبر پرستوں کا واضح رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ قبروں میں دفن شدہ بزرگ مردہ نہیں زندہ ہیں اور ہم زندوں ہی کو پکارتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ثابت ہو گیا کہ موت وارد ہونے کے بعد نبوی زندگی کسی کو نصیب نہیں ہوتی، نہ دنیا سے ان کا کوئی تعلق ہی باقی رہتا ہے، پھر ان سے کسی نفع یا نقصان کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟ ﴿۱۹﴾ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ: یہ تیسرا وصف ہے کہ انھیں اپنے اٹھائے جانے کا وقت بھی معلوم نہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ معبود کے لیے یوم بعث کا جاننا ضروری ہے۔ (روح المعانی) اور یہ بات کہ مردے کب اٹھائے جائیں گے اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ دیکھیے سورہ اعراف (۱۸۷)۔

آیت 22: ﴿۲۰﴾ إِلَهُمَّ إِلَهُ وَاحِدٌ.....: گزشتہ تمام دلائل اور احسانات بیان کرنے کے بعد ان کا نتیجہ اور خلاصہ بیان فرمایا کہ تمہارا معبود جس کی عبادت حق ہے، وہ ایک ہی ہے۔ ”وَاحِدٌ“ کا مطلب ہے کہ وہ ایک ہے، کوئی اس کا ثانی یا شریک نہیں، نہ ذات میں نہ صفات میں۔ آگے وہ اسباب بیان کیے جو انسان کو توحید سے پھلا کر شرک کی طرف لے جاتے ہیں، یہ اسباب درج ذیل ہیں: ﴿۱﴾ ان میں سے پہلا سبب آخرت پر ایمان نہ ہونا ہے۔ آیت میں مشرکین ہی کو ”فَالَّذِينَ لَمْ يَرْغَبُوا عَنْ آلِهَتِهِمْ كَمَا عَلَّمَهُمْ اللَّهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُونَ ۚ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ“ فرمایا ہے، اگر یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ نے زندہ کر کے باز پرس کرنی ہے اور وہاں جزا و سزا صرف اس کے ہاتھ میں ہوگی، کسی دوسرے کا دخل نہ ہوگا تو آدمی کسی اور کو کس طرح اس کے ساتھ شریک کر سکتا ہے۔ اس لیے آخرت کے منکر اللہ اکیلے کا ذکر سن ہی نہیں سکتے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَخِدَهُ أَشْتَاتَتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۚ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ﴾ [الزمر: ۲۵] ”اور جب اس اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ پڑ جاتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب ان کا ذکر ہوتا ہے جو اس کے سوا ہیں تو وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔“ ﴿۲﴾ دوسرا سبب یہ کہ ان کے دل انکار کرنے والے ہیں، وہ نہ کسی دلیل کو مانتے ہیں نہ اللہ کی تمام نعمتیں جاننے

لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۗ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ﴿۲۳﴾ وَإِذَا

قِيلَ لَهُمْ مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۗ قَالُوا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۲۴﴾

کوئی شک نہیں کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ بے شک وہ تکبر کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۲۳﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے تمہارے رب نے کیا چیز اتاری ہے؟ تو کہتے ہیں پہلے لوگوں کی بے اصل کہانیاں ہیں ﴿۲۴﴾

کے باوجود کوئی نعمت تسلیم کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا﴾ [النحل: ۸۳] ”وہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں۔“ وہ سخ ہو چکے ہیں اور ان پر مہر لگ چکی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿حَتَّمَهُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ [البقرة: ۷] ”اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی نگاہوں پر بھاری پردہ ہے۔“ حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ان کی مثال اٹلے کوزے کی دی گئی ہے، جس میں کوئی چیز داخل نہیں ہوتی، چنانچہ وہ دل نہ نیکی کو نیکی سمجھتے ہیں نہ برائی کو برائی، سوائے ان کی اپنی خواہش کے جس کی محبت انہیں پلا دی گئی ہے۔ [مسلم، الإيمان، باب رفع الأمانة و الإيمان.....: ۱۶۴]

﴿۲۳﴾ تیسرا سبب ان کا استکبار یعنی اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنا ہے۔ ان کا تکبر انہیں کوئی خیر خواہی کی بات نہ سننے دیتا ہے نہ ماننے دیتا ہے اور یہی ان کی تمام بیماریوں کی جڑ ہے اور یہ ایسی خطرناک چیز ہے کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ﴿لَا يَدْخُلُ الْحَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبَرٍ﴾، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ تَوْبَهُ حَسَنًا، وَتَعْلَمَهُ حَسَنَةً. قَالَ إِنَّ اللَّهَ حَمِيلٌ يُحِبُّ الْحَمَالَ، الْكِبَرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَعَمَطُ النَّاسِ﴾ [مسلم، الإيمان، باب تحريم الكبر و بيانه: ۹۱] ”وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر کبر ہوگا۔“ ایک آدمی نے کہا: ”آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو۔“ آپ نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، کبر حق کو تسلیم نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر جانتا ہے۔“

آیت 23: ﴿لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ.....﴾: جس طرح کہا جاتا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو میں دیکھ رہا ہوں اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم اس کی سزا پا کر رہو گے، اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ کے علم کا ذکر ان کے ظاہر اور پوشیدہ اعمال کی سزا کی وعید کے لیے ہے اور یہ سزا کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت نہیں، بلکہ بغض رکھتا ہے، ”إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ“ کہ وہ تکبر کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

آیت 23: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا.....: ”آسَاطِيرُ“ ”أَسْطُورَةٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”أَعَاجِبُ“ ”أَعْجُوبَةٌ“ کی۔ مراد بے اصل جھوٹی کہانیاں اور افسانے ہیں، یہ ان منکبر کفار کا قرآن مجید کے متعلق تبصرہ ہے جو وہ آپس میں کرتے اور اس کو پھیلاتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے، بلکہ محمد (ﷺ) نے پچھلے لوگوں کے کچھ قصے کہیں سے سن لیے ہیں،

لِيَخْلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ وَأَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَزُرُونَ ﴿۲۵﴾ قَدْ نَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عُنُقَهُمْ

تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ پورے اٹھائیں اور کچھ بوجھ ان کے بھی جنھیں وہ علم کے بغیر گمراہ کرتے ہیں۔ سن لو! برا ہے جو بوجھ وہ اٹھا رہے ہیں ﴿۲۵﴾ یقیناً ان لوگوں نے تدبیریں کیں جو ان سے پہلے تھے تو اللہ ان کی عمارت کو ابھی کو جوڑ جاؤ کہ اللہ کے کام کے نام سے لوگوں پر پیش کر رہے ہیں۔

آیت 25 ﴿۱﴾ لِيَخْلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۳۸، ۳۹) اور سورہ عنکبوت (۱۲، ۱۳) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ دَعَا إِلَى هُدًى، سَكَانَ لَهُ مِنَ الْآخِرِ وَمِثْلُ أَحْوَرٍ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذَلِكَ مِنْ أَحْوَرِهِمْ شَيْئًا وَمَنْ دَعَا إِلَى ضَلَالَةٍ، سَكَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ تَبِعَهُ، لَا يَنْقُصُ ذَلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا» (مسلم، العلم، باب من سن سنة حسنة أو سيئة.....: ۲۶۷۴) [جو شخص ہدایت کے کسی کام کی طرف دعوت دے اس کے لیے ان لوگوں کے اجر جتنا اجر ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے، یہ ان کے اجر میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا اور جو شخص گمراہی کے کسی کام کی طرف دعوت دے اس پر ان لوگوں کے گناہوں جتنا گناہ ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے، یہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا۔“ آدم علیہ السلام کے قاتل بیٹے پر قیامت تک کے ہر ناجائز قتل کا بوجھ اس کی مثال ہے۔ دیکھیے سورہ مائدہ (۳۱، ۳۲)۔

﴿۲﴾ یہ اللہ تعالیٰ کا عین عدل ہے کہ گمراہ کرنے والے اپنے گناہوں کا (جو انھوں نے خود کیے) کابل بوجھ اٹھائیں گے اور جن کو گمراہ کیا ان کے سارے بوجھ نہیں بلکہ کچھ بوجھ اٹھائیں گے۔ ”وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ“ میں ”ہن“ تبعیض کے لیے ہے، یعنی ان کے صرف ان گناہوں کو جو انھوں نے ان کے کہنے پر کیے۔ (شعراوی)

﴿۳﴾ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ: اس سے تقلید کا رد نکلتا ہے، کیونکہ تقلید علم کی ضد ہے اللہ اور رسول کی بات دین میں دلیل اور علم ہے، اس کے خلاف جو بھی ہے تقلید اور جہل ہے۔ یہاں بغیر علم گمراہ کرنے والوں اور ان کے پیچھے چل کر گمراہ ہونے والوں میں سے کسی کا عذر تقلید قبول نہیں ہوگا۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا:

الْعِلْمُ مَعْرِفَةُ الْهُدَى بِدَلِيلِهِ مَا ذَاكَ وَالتَّقْلِيدُ يَسْتَوِيَانِ
إِذْ أُجْمِعَ الْعُلَمَاءُ أَنَّ مَقْلَدًا لِلنَّاسِ وَالْأَعْمَى هُمَا سَيِّئَانِ

”علم ہدایت کو اس کی دلیل (قرآن و سنت) کے ساتھ پہچاننے کا نام ہے۔ یہ اور تقلید کبھی برابر نہیں ہو سکتے، کیونکہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ لوگوں کی تقلید کرنے والا اور اندھا دونوں برابر ہیں۔“

آیت 26 ﴿۱﴾ قَدْ نَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ: مکر کا معنی خفیہ اور مضبوط تدبیر یا کسی دوسرے کو حیلے کے ساتھ اس کے مقصد سے روکنا ہے، یہ خیر کے لیے ہو تو قابل تعریف ہے، شر کے لیے ہو تو قابل مذمت۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ اور

عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَأَتَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۱۶﴾

بنیادوں سے آیا۔ پس ان پر ان کے اوپر سے چھت گر پڑی اور ان پر وہاں سے عذاب آیا کہ وہ سوچتے نہ تھے ﴿۱۶﴾

اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ اس سے پہلے لوگوں نے بھی رسولوں کے خلاف خفیہ تدبیریں اور سازشیں جتنی کر سکتے تھے کیسے مگر بری طرح ناکام ہوئے۔

﴿۱۶﴾ فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمُ مِنَ الْقَوَاعِدِ.....: ”بُنْيَانٌ بُنِيَ بُنْيَانِي“ (ض) کا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، بنائی ہوئی عمارت۔ ”الْقَوَاعِدِ“ ”فَاعِدَةٌ“ کی جمع ہے، بنیادیں۔ اس کی تفسیر دو طرح سے کرتے ہیں، ایک تو یہ کہ یہ ایک تمثیل ہے، یعنی ایک معنوی چیز کو نظر آنے والی چیز کے ساتھ تشبیہ دے کر بات سمجھائی گئی ہے، یعنی جس طرح کوئی شخص ایک عمارت بنائے تو دوسرا کوئی شخص خفیہ طریقے سے اس کی بنیادوں کو اس طرح کھوکھلا کر دے کہ عمارت کی چھت گر پڑے اور بنانے والے اپنے ہی مکان کی چھت کے نیچے آ کر ہلاک ہو جائیں۔ اسی طرح کفار نے رسولوں اور اہل ایمان کے خلاف مکر (سازش) کے محل تعمیر کیے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے ان محلوں کی بنیادیں اس طرح ہلا دیں کہ ان کی چھتیں بھی انھی پر گر پڑیں۔ جس طرح کہتے ہیں کہ جو دوسرے کے لیے کنواں کھودتا ہے وہ خود ہی اس میں گر پڑتا ہے۔ یہاں واقعی کنواں ہونا ضروری نہیں۔ کئی مفسرین نے یہ معنی کیا ہے اور رازی نے اسے ترجیح دی ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ رسولوں کے خلاف سازشیں کرنے والے جن عمارتوں میں رہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی بنیادوں کو زلزلے کا ایسا جھٹکا دیا، یا سیلاب میں ایسا گھیرا کہ ان کی چھتیں ان کے اوپر گر پڑیں اور وہ ان کے نیچے آ کر ہلاک ہو گئے، اس طرح اللہ کے عذاب نے انھیں ایسی جگہ سے آگھیرا جہاں سے وہ گمان بھی نہ رکھتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَمَّا أَخَذْنَا بِذُنُوبِهِمْ فَمِنْهُمْ مَن أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۗ وَمِنْهُمْ مَن أَخَذَتْهُ الضَّيْحَةُ ۗ وَمِنْهُمْ مَن حَسَفْنَا بِهٖ الْأَرْضَ ۗ وَمِنْهُمْ مَن أَعْرَفْنَا ۗ﴾ [العنکبوت: ۴۰] ”تو ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑ لیا پھر ان میں سے کوئی وہ تھا جس پر ہم نے پتھراؤ والی ہوا بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے چیخ نے پکڑ لیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے غرق کر دیا۔“ امام المفسرین طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس معنی کو ترجیح دی ہے اور فرمایا کہ جب الفاظ کے ظاہر معنی مراد لیے جاسکتے ہیں اور اس میں کوئی خرابی نہیں، تو تمثیل کی طرف جانے کی کیا ضرورت ہے، چنانچہ اس میں کیا چیز ناممکن ہے کہ کئی کفار اپنے مکانوں کی چھتوں کے نیچے آ کر مر گئے ہوں، جنھیں وہ نہایت مضبوط سمجھتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے رمضان ۱۳۲۶ھ میں کشمیر کے ہولناک زلزلے میں بے شمار کئی منزلہ مکان زمین میں دھنس گئے، بہت سے اپنے مکینوں پر گر پڑے اور اس کے بعد رمضان ۱۳۳۱ھ میں پاکستان میں سیلاب کی وجہ سے شہروں کے شہر بری طرح متاثر ہوئے، حتیٰ کہ تقریباً نصف پاکستان سیلاب کی زد میں آ گیا، یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہے۔ [اللَّهُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَغَافِنَا قَبْلَ ذَلِكَ]

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِنُهُمْ وَ يَقُولُ اَيْنَ شُرَكَائِي الَّذِينَ كُنْتُمْ تَشَاقِقُونَ فِيهِمْ ۗ قَالَ
الَّذِينَ اُولُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ الشُّوْءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفَّوْهُمْ النَّارُ
ظَالِمِيْ اَنْفُسِهِمْ ۗ فَالْقَوْمَ الْاَسٰمُ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْءٍ ۗ بَلٰى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ

تَعْمَلُونَ ﴿۱۸﴾

پھر قیامت کے دن وہ انھیں رسوا کرے گا اور کہے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے بارے میں تم لڑتے
جھگڑتے تھے؟ وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا کہیں گے کہ بے شک کامل رسوائی آج کے دن اور برائی کافروں پر ہے ﴿۱۷﴾
جنہیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں، تو وہ فرماں برداری پیش
کرتے ہیں کہ ہم کوئی برا کام نہیں کیا کرتے تھے۔ کیوں نہیں! یقیناً اللہ خوب جاننے والا ہے جو تم کیا کرتے تھے ﴿۱۸﴾

آیت 27 ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِنُهُمْ وَ يَقُولُ: ”يُخْزِي“ ”خِزْي“ سے باب افعال کا مضارع ہے، بمعنی رسوائی۔
یہ جسمانی عذاب سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ آدمی جسمانی سزا کے آثار چہرے پر ظاہر نہ ہونے دے، مگر رسوائی
کے آثار پورے جسم اور چہرے پر واضح ہوتے ہیں۔ ”ثُمَّ“ نسبتاً ترتیب کے لیے لایا گیا ہے کہ دنیا میں ہلاکت و بربادی کے
بعد آخرت کی رسوائی اور عذاب کہیں سخت اور کبھی ختم نہ ہونے والا ہوگا اور اللہ تعالیٰ خود ان سے پوچھے گا کہ تم نے جو میرے
شریک بنا رکھے تھے اور تم کہتے تھے کہ فلاں کو قبر میں سوال ہوا تو اس نے فلاں بزرگ کا دھوبی ہونے کا حوالہ دیا اور چھوڑ دیا
گیا، فلاں بزرگ کے دم کے باوجود بچہ مر گیا تو اس بزرگ نے چوتھے آسمان پر جاتے ہوئے ملک الموت سے روحوں کا تھیلا
چھین کر سب روحوں کو آزاد کر دیا اور وہ دوبارہ زندہ ہو گئے۔ فلاں صاحب کے لیے لوح محفوظ میں بھی بچہ قسمت میں نہ تھا تو
فلاں بزرگوں نے انھیں بارہ بیٹے عطا کر دیے۔ اس قسم کے تمام مشرکوں سے اللہ تعالیٰ پوچھے گا بتاؤ وہ جو تم نے میرے شریک
بنا رکھے تھے اور جھوٹ پر بنیاد کے باوجود تم مسلمان موجدوں سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، انھیں اب لاؤ، پیش کرو، وہ کہاں
ہیں؟ اس کا جواب وہ کیا دیں گے، البتہ اہل علم (فرشتے، انبیاء اور صالحین) ایک زبان ہو کر کہیں گے کہ آج کامل رسوائی اور
برائی ایمان نہ لانے والوں پر وارد ہوگی۔ اہل ایمان گناہ گاروں سے بھی باز پرس ہوگی، مگر کامل رسوائی صرف کفار کا مقدر ہوگی۔
تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۱۸) ”الْخِزْي“ اور ”الشُّوْء“ کے الف لام کی وجہ سے ”کامل رسوائی“ ترجمہ کیا گیا ہے۔

آیت 28 ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفَّوْهُمْ النَّارُ: ”فَالْقَوْمَ“ ”الْقَى يُلْقِي“ (افعال) سے ماضی معلوم کا جمع مذکر غائب
ہے۔ مراد مستقبل ہے، کیونکہ وہ ماضی کی طرح یقینی ہے۔ ”الْقَاءُ“ کا لفظ اجسام کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے:
”فَلَانَ الْقَى السَّلَاحُ“ کہ فلاں نے ہتھیار پھینک دیے، یعنی اپنے آپ کو حوالے کر دیا۔ ”السَّلْمُ“ کا معنی ”اِسْتِسْلَامٌ“
ہے، یعنی مکمل طور پر تابع اور مطیع ہونا۔

فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۗ فَلَئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿۳۰﴾ وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۗ قَالُوا خَيْرًا ۗ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَ لَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۗ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ ﴿۳۱﴾

پس جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہو، سو بلاشبہ وہ تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے ﴿۳۰﴾ اور جو لوگ ڈر گئے ان سے کہا گیا کہ تمہارے رب نے کیا نازل فرمایا؟ تو انہوں نے کہا بہترین بات۔ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے بھلائی کی اس دنیا میں بڑی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو کہیں بہتر ہے اور یقیناً وہ ڈرنے والوں کا اچھا گھر ہے ﴿۳۱﴾

﴿۳۰﴾ ظَالِمِيْ اَنْفُسِهِمْ: اس سے مراد کفار ہیں، کیونکہ ”الَّذِيْنَ تَتَوَفَّوْهُمْ“ پچھلی آیت میں مذکور ”الْكَافِرِيْنَ“ کی صفت ہے اور اپنی جان پر سب سے بڑا ظلم کفر و شرک ہی ہے۔ (دیکھیے انعام: ۲۲) ظالم ہونے کی حالت میں انہیں فرشتوں کے فوت کرنے میں اس سختی کی طرف بھی اشارہ ہے جو اس وقت ان ظالموں پر گزرتی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ انعام (۹۳) اور سورۃ انفال (۵۰) براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں مومن اور کافر کی موت کے وقت فرشتوں کا ان سے سلوک تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ [مسند احمد: ۴/۲۸۷، ۲۸۸، ح: ۱۸۵۶۱۔ أبو داؤد: ۴۷۵۳]

﴿۳۱﴾ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ: یعنی ساری عمر تو اہل ایمان سے مخالفت اور لڑنے میں گزار دی، اب حقیقت واضح ہونے پر اپنی فرماں برداری کا اظہار کریں گے کہ ہم تو کوئی برا کام کیا ہی نہ کرتے تھے۔ وہاں صاف جھوٹ بول کر سمجھیں گے کہ دنیا کی طرح یہاں بھی ہمارا جھوٹ چل جائے گا، بلکہ اس پر تمہیں بھی اٹھائیں گے۔ دیکھیے سورۃ انعام (۲۲، ۲۳) اور سورۃ مجادلہ (۱۸)۔

آیت 29 فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ: جہنم کے دروازوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ حجر (۳۳)۔

آیت 30 ﴿۱﴾ وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا.....: ”خَيْرًا“، ”خَيْرٌ“ اور ”شَرٌّ“ اصل میں اسم تفضیل کے صیغے ہیں، یعنی ”أَخِيْرٌ“ اور ”أَشْرٌ“، تخفیف کے لیے ”خَيْرٌ“ اور ”شَرٌّ“ بنا دیا گیا، اس لیے ترجمہ کیا ہے ”بہترین بات“ یعنی سب سے اچھی بات۔ یہاں زمخشری نے ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ یہی سوال اس سورت کی آیت (۲۳) میں کفار سے کیا گیا تو ان کا جواب تھا ”أَسْأَلِيْزِ الْأَوَّلِيْنَ“ جو مرفوع ہے اور یہاں متقین سے یہی سوال ہوا تو انہوں نے کہا ”خَيْرًا“ جو منصوب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ”أَسْأَلِيْزِ الْأَوَّلِيْنَ“ مبتدا ”ہی“ کی خبر ہے، اس لیے مرفوع ہے، یعنی کفار نے مانا ہی نہیں کہ رب تعالیٰ نے کچھ نازل فرمایا، ورنہ ”أَسْأَلِيْزِ الْأَوَّلِيْنَ“ منصوب ہوتا، اس کے برعکس متقین کا قول ”خَيْرًا“ ”أَنْزَلَ“ مقدر کا مفعول ہے، یعنی اسی نے خیر نازل فرمائی ہے۔ گویا متقین نے وحی الہی کا نزول بھی تسلیم کیا اور اس کے بہترین ہونے کی شہادت بھی دی۔ اس کے

جَدَّتْ عَدَنٌ يَدْخُلُوهَا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ كَذَلِكَ يَجْزِي

اللَّهُ الْمُتَّقِينَ ﴿۳۱﴾

پہنچنے کے باغات، جن میں وہ داخل ہوں گے، ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، ان کے لیے ان میں جو وہ چاہیں گے (موجود) ہوگا۔ اسی طرح اللہ ڈرنے والوں کو جزا دیتا ہے ﴿۳۱﴾

برعکس کافروں نے دونوں باتوں کا انکار کیا۔

﴿۲﴾ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ : ”حَسَنَةٌ“ کی تعوین تعظیم کے لیے ہے۔ مومن کو دنیا کی زندگی میں بھی وہ سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے جو کافر کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ صحیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِينَ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَاءٌ سُرَّاهُ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَاءٌ ضَرَّاهُ صَبْرًا، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ)) [مسلم، الزهد، باب المؤمن أمره كله خير: ۲۹۹۹] ”مومن کا معاملہ عجیب ہے، کیونکہ اس کا ہر کام ہی بہترین ہے اور یہ مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے تو شکر کرتا ہے، تو وہ اس کے لیے بہترین ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے تو وہ بھی اس کے لیے بہترین ہوتا ہے۔“ قرآن مجید میں مومن سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ حیات طیبہ عطا کرنے کا ہے۔ دیکھیے سورہ نحل (۹۷)۔

﴿۳﴾ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ : اس میں ”دَار“ موصوف اپنی صفت ”الْآخِرَةِ“ کی طرف مضاف ہے۔ آخری گھر اس لیے فرمایا کہ اس کے بعد اور کوئی گھر نہیں، ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہنا ہے۔ ”وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ“ ”نِعْم“ فعل ماضی ہے، یہ مدح کے لیے ہے، مخصوص بالمدح ”جہی“ ہے، اس کی ضد ”بفس“ ہے جو مذمت کے لیے ہے۔ لام تاکید کا معنی ”تو“ کے ساتھ اور ”خَيْرٌ“ کا معنی تفضیل کی وجہ سے ”کہیں بہتر“ کے ساتھ کیا ہے۔

آیت 31 ﴿۱﴾ جَدَّتْ عَدَنٌ : ہمیشہ رہنے کے باغات، کیونکہ ان میں ضرورت اور چاہت کی ہر چیز موجود ہوگی۔ دنیا میں بڑی سے بڑی تفریح گاہ اور اچھے سے اچھے گھر سے بھی دل بھر جاتا ہے، مگر جنت میں ہمیشہ رہنے کے باوجود دل نہیں بھرے گا، کیونکہ دل جو کچھ چاہے گا وہ حاضر ہو جائے گا، فرمایا: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [السجدة: ۱۷] ”پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے، اس عمل کی جزا کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے۔“

﴿۲﴾ كَذَلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ : یعنی اللہ سے ڈرنے اور اس کی منع کردہ چیزوں سے بچنے والوں کو اللہ تعالیٰ ایسے ہی جزا دیتا ہے، جیسا کہ سونا اور ریشم مردوں پر حرام کر دیا اور فرمایا، یہ چیزیں ان (کافروں) کے لیے دنیا میں اور ہمارے لیے آخرت میں ہیں۔ دیکھیے سورہ ذاریات (۱۶، ۱۵) اور سورہ قمر (۵۳، ۵۵)۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۲﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرٌ رَبِّكَ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۳۳﴾ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتٌ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۳۴﴾

جنہیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ پاک ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں سلام ہو تم پر، جنت میں داخل ہو جاؤ، اس کے بدلے جو تم کیا کرتے تھے ﴿۳۲﴾ وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آجائیں، یا تیرے رب کا حکم آجائے۔ ایسے ہی ان لوگوں نے کیا جو ان سے پہلے تھے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کیا کرتے تھے ﴿۳۳﴾ پس ان کے پاس اس کے برے نتائج آچنبچے جو انہوں نے کیا اور انہیں اس چیز نے گھیر لیا جسے وہ مذاق کیا کرتے تھے ﴿۳۴﴾

آیت 32 الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے خم السجدہ (۳۰ تا ۳۲) اور زمر (۷۳، ۷۴) "بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۲۳)۔

آیت 32 ① هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ یہاں استفہام انکار کے لیے ہے اور "يَنْظُرُونَ" بمعنی "يَسْتَنْظِرُونَ" ہے۔ اس میں پھر کفار کا حال بیان کیا ہے کہ ہر قسم کی دلیل واضح ہونے کے بعد ان کے ایمان نہ لانے کا مقصد اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اس انتظار میں ہیں کہ فرشتے ان کی روح قبض کرنے کے لیے آجائیں، یا تیرے رب کا حکم، یعنی عذاب یا قیامت آجائے، تب وہ ایمان لا کر اپنی حالت درست کریں گے، حالانکہ اس وقت تو بہ کرنا یا ایمان لانا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ اس سے مراد ان کی ہمت دھری بیان کرنا ہے، یہ نہیں کہ واقعی وہ انتظار کر رہے ہیں۔ "تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرٌ رَبِّكَ" میں "أَوْ" مانعہ اٹھلا ہے، یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ دونوں چیزیں نہ آئیں، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ایک آجائے اور یہ بھی کہ دونوں اکٹھی آجائیں۔

② كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ : یعنی پہلے لوگوں نے بھی کفر کی روش اختیار کی اور نبیوں کو جھٹلایا۔ (شوکانی)
③ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ یعنی وہ خود ایسے برے عمل کرتے تھے جن کی سزا جہنم تھی اور یہ احقانہ ظلم ہے، کیونکہ وہ اپنے فائدے کے لیے کسی دوسرے پر ظلم کرتے تو شاید انہیں کچھ فائدہ ہوتا، خواہ عارضی ہی سہی، مگر اپنے آپ پر ظلم تو حماقت کی انتہا ہے۔

آیت 34 ① فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتٌ : "سَيِّئَاتٌ" کا مضاف محذوف ہے، یعنی "عَوَاقِبٌ" اس لیے "سَيِّئَاتٌ مَا عَمِلُوا" کا ترجمہ کیا ہے "اس کے برے نتائج نے جو انہوں نے کیا۔"

② وَحَاقَ بِهِمْ : "حَاقٌ يَجِيئُ حَاقًا" بروزن "بَاعٌ يَبِيعُ بَيْعًا" بمعنی احاطہ کیا، گھیر لیا۔ اس کا استعمال برے گھیراؤ ہی

وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا

اور جن لوگوں نے شریک بنائے انھوں نے کہا اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اس کے سوا کسی بھی چیز کی عبادت کرتے اور نہ کے لیے ہوتا ہے۔ ﴿مَا كَانُوا لَهُمْ يَسْتَفْعِدُونَ﴾ ”اس چیز نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے“ ظاہر ہے کہ وہ رسولوں کی رسالت کا، اپنے دوبارہ زندہ ہونے، حساب کتاب ہونے اور عذاب میں گرفتار ہونے کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ عذاب جلدی لاؤ جس کی دھمکیاں تم ہمیں دیتے ہو۔ بتائیے دشمن سے جلد از جلد عذاب کا مطالبہ اس عذاب کا مذاق اڑانا نہیں تو کیا ہے۔ الغرض! اسی عذاب نے اور اللہ کے حضور پیش ہونے کی مشکل گھڑی نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا، جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔

آیت 35 ① وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا کفار اپنے شرک اور کفر یہ اعمال، مثلاً بحیرہ، سائبہ اور وسیلہ وغیرہ کو حرام قرار دینے کے جواز کے لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت کا سہارا لیتے اور اس بہانے سے رسالت پر طعن کرتے اور کہتے کہ اگر یہ شرک اور تحریمات اللہ کی رضا کے خلاف ہوتے تو ہم نہ کرتے اور ہمیں روک دیا جاتا، جب اللہ نے نہیں روکا تو معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ ہم اس کی مشیت کے تحت کر رہے ہیں، مگر اولاً تو بات یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کے شرک اور برے اعمال پر راضی ہوتا تو ان کاموں سے منع کرنے کے لیے نہ پیغمبر بھیجتا اور نہ کتابیں نازل کرتا، جب مسلسل پیغمبروں کے ذریعے سے ان باتوں سے منع کیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں اس کی رضا کے خلاف ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر گرفت نہ ہونے کو سند جواز نہیں بنا سکتے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت ہے۔ مزید دیکھیے سورہ انعام (۱۶۸)۔

② تفسیر ثنائی میں ہے: ”غرض ان کی دلیل سے یہ ہے کہ اللہ ہمارے افعال پر خوش ہے تو ہم کرتے ہیں، بھلا اگر وہ ناراض ہوتا تو کیا ہم کر سکتے تھے، پھر تو کیوں ہم کو ہمارے ان کاموں پر وعید سناتا ہے، مگر حقیقت میں ان کو سمجھ نہیں، وہ اللہ کی مشیت (چاہنے) میں اور رضا (خوش ہونے) میں فرق نہیں جانتے، بے شک جو کچھ ہو رہا ہے اس کی مشیت سے ہو رہا ہے، مجال نہیں کہ اس کی مشیت کے سوا کوئی ہو سکے، کیونکہ مشیت اس کے قانون کا نام ہے، جب تک کسی کام کو حسب قانون فطرت نہ کرو گے کبھی کامیاب نہ ہو گے۔ جب تک گرمی حاصل کرنے کے لیے آگ نہ جلاؤ گے پانی سے وہ کام نہیں نکل سکے گا، جو کام فطرت نے پانی سے متعلق کیا ہے وہ آگ سے نہیں ہوگا۔ یہی تلواریں جس کا کام سراتار دینا ہے، جہاں اس کو چلاؤ گے اپنا اثر دکھا دے گی، خواہ کسی مظلوم پر ہو یا ظالم پر، چنانچہ ہر روز دنیا میں ناقص خون بھی ہوتے ہیں، لیکن ان سب کاموں پر رضائے الہی لازمی نہیں ہے، بلکہ رضا اس صورت میں ہوگی کہ ان سب اشیاء کو شریعت کی ہدایت کے مطابق استعمال کر دو گے۔ پس یہ بے کبھی نہیں تو اور کیا ہے کہ مشیت اور رضا میں فرق نہیں کرتے۔“

③ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ : یعنی پہلے لوگوں نے بھی اللہ کی تقدیر اور مشیت کو اپنے کفر و شرک کا بہانا بنایا۔ اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ یہ لوگ جو قرآن کو ”أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ“ (پہلوں کی کہانیاں) کہہ رہے ہیں تو اللہ کی مشیت اور

وَلَا حَزْمًا مِّنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ ۗ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۗ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلْغَةُ الْمُبِينُ ﴿۲۵﴾

ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے بغیر کسی بھی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے کیا جو ان سے پہلے تھے تو رسولوں کے ذمے صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا اور کیا ہے؟ ﴿۲۵﴾

تقدیر کو بہانا بنانا کون سی نئی بات ہے جو انھوں نے کی ہے، یہ بھی تو وہی گھسی پٹی پرانی بات ہے جو پہلے کفار کرتے آئے ہیں۔ ﴿۲۴﴾ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلْغَةُ الْمُبِينُ : ”الْبَلْغَةُ“ اسم مصدر ہے، بمعنی ”إِبْلَاحٌ“ یعنی پہنچا دینا، یعنی رسولوں کے ذمے صاف واضح پیغام پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں، لہذا اگر کافر کج بختی یا ہت دھری کرتے رہیں اور ایمان نہ لائیں تو پیغمبروں سے اس پر باز پرس نہ ہوگی۔ ہدایت و گمراہی کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”یہ نادانوں کی باتیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو فلاں کام برا لگتا تو کیوں کرنے دیتا، آخر ہر فرقے کے نزدیک بعض کام برے ہیں، پھر وہ کیوں ہوتے ہیں۔ یہاں جواب مجمل فرمایا کہ رسول تو برے کاموں سے منع کرتے آئے ہیں مگر جس کی قسمت تھی اسی نے ہدایت پائی اور جس کو خراب ہونا تھا خراب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا یوں ہی ہوا ہے۔“ (موضح)

﴿۲۵﴾ علامہ قاسمی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ”منہاج السنہ“ کی دوسری جلد کے شروع سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت نقل کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے: ”اپنے ذمے واجب حقوق ادا نہ کرنے اور حرام کاموں کے ارتکاب کے جواز کے لیے اکثر لوگ تقدیر کو دلیل بناتے ہیں، حالانکہ یہ دلیل بالکل غلط اور بے کار ہے، اس کے باطل ہونے پر دنیا کے تمام عقلاء کا اتفاق ہے، خواہ وہ کسی دین سے تعلق رکھتے ہوں۔ جو شخص یہ دلیل پیش کرتا ہے اگر کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلے میں یہی دلیل پیش کرے جس نے اس کا کوئی حق ادا نہ کیا ہو یا اس کا کوئی عزیز قتل کیا ہو، یا اس کا مال چھین لیا ہو، اس کی بیوی کی عزت لوٹی ہو تو وہ اس کی یہ دلیل کبھی قبول نہیں کرے گا، بلکہ اپنا حق لینے کی اور زیادتی کا بدلہ لینے کی پوری کوشش کرے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ کوئی بھی شخص زیادتی کرنے والے کی یہ دلیل نہیں مانے گا۔ دراصل یہ ان سوفسطائیوں کی باتوں جیسی بات ہے، جو کہتے ہیں کہ معلوم نہیں ہم موجود بھی ہیں یا نہیں۔ اس کا نتیجہ جھوٹ، ظلم، زیادتی اور ہر غلط کام کا جواز ہو گا۔ کوئی شخص اپنے دل سے پوچھے تو وہ بھی اسے ایک باطل بات قرار دے گا۔ اس لیے تحقیق کے وقت کسی عدالت میں یہ دلیل قبول نہیں کی جاتی، کیونکہ یہ سراسر جہالت ہے، علم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے جب مشرکوں نے کہا: ﴿لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَزْمًا مِّنْ شَيْءٍ﴾ (اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے، نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے)، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هَلْ بَعْدَ كُفْرِنَ عَلْمٍ فَتَبْخُرُجُوهُ لَنَا إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُخْرَجُونَ﴾ [الأنعام : ۱۴۸] (کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جو ہمارے سامنے پیش کر سکو، تم تو محض گمان کے پیچھے لگے ہوئے ہو اور صرف اٹکل بازی کر رہے ہو) پھر فرمایا: ﴿قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۗ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ﴾ [الأنعام : ۱۴۹] ”کہہ دے پھر کامل دلیل تو اللہ ہی کی

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۗ فَمِنْهُمْ مَنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُمْ مَن حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ ۗ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكذِبِينَ ﴿٣٦﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو، پھر ان میں سے کچھ وہ تھے جنہیں اللہ نے ہدایت دی اور ان میں سے کچھ وہ تھے جن پر گمراہی ثابت ہوگئی۔ پس زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا ﴿۳۶﴾

ہے، سواگر وہ چاہتا تو تم سب کو ضرور ہدایت دے دیتا۔“

معلوم ہوا یہ علم نہیں محض انکل بچو ہے، اس کے ہوتے ہوئے عادل و ظالم، صادق و کاذب، عالم و جاہل، نیک و بد کا کوئی فرق ہی نہیں رہتا، یہ لوگ جو رسولوں کی مخالفت کرنے اور کفر و شرک پر ڈٹے رہنے کی دلیل تقدیر کو بنا رہے ہیں، آپس میں ایک دوسرے کے حقوق مار جانے اور اپنے خلاف چلنے پر کبھی یہ دلیل نہیں مانتے، بلکہ یہی مشرک ایک دوسرے کی مذمت کرتے، دشمنی رکھتے اور لڑائی کرتے ہیں۔ ”قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ“ (کہہ دے پس کامل دلیل تو اللہ ہی کی ہے) میں اللہ تعالیٰ نے شرعی حجت کا ذکر فرمایا اور ”فَلَوْ شَاءَ لَهَدَيْتُكُمْ أَجْمَعِينَ“ (اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا) میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تقدیر والی مشیت کا ذکر فرمایا اور یہ دونوں حق ہیں۔

⑥ اس بات کا ایک اور مطلب بھی بیان کیا جاتا ہے۔ علامہ قاشانی نے فرمایا کہ ان مشرکین نے یہ بات انتہائی جہل کی وجہ سے اور موحدین کو چپ کروانے کے لیے صرف ضد اور عناد سے کہی ہے، کیونکہ اگر وہ علم و یقین سے یہ بات کہتے تو وہ موحد بن جاتے، مشرک رہ ہی نہیں سکتے تھے، کیونکہ جس کو یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کچھ ہو ہی نہیں سکتا، وہ یقیناً یہ بھی جان لے گا کہ دنیا کے سب لوگ بھی کوئی کام کرنا چاہیں، جو اللہ تعالیٰ نہ چاہتا ہو، تو وہ کام ہونا کبھی ممکن ہی نہیں، تو جب اس نے اعتراف کر لیا کہ اللہ کے سوا نہ کسی کے ارادے کی کچھ حیثیت ہے اور نہ کسی کے پاس کوئی قدرت ہے، تو یہ بندہ تو مشرک رہا ہی نہیں، حالانکہ وہ لوگ تو اللہ کے ساتھ شریک بنا رہے تھے اور رسولوں کو جھٹلا رہے تھے۔ معلوم ہوا اپنی اس دلیل کو وہ خود بھی نہیں مانتے تھے۔ (تفسیر قاسمی)

⑦ مفتی محمد عابد نے فرمایا: ”ترک عمل پر تقدیر کو بطور دلیل پیش کرنا طحریں کا عقیدہ ہے، قرآن کریم نے ان کے اس عقیدے کی مذمت فرمائی اور اسے معیوب قرار دیا ہے اور ہمارے لیے ان مشرکوں کا یہ قول بطور مذمت نقل فرمایا، اس لیے ہم میں سے کسی شخص کو، جبکہ وہ قرآن پر ایمان رکھنے کا مدعی ہو، کسی صورت جائز نہیں کہ وہ یہ دلیل پیش کرے جو مشرکین پیش کیا کرتے تھے۔“ (قاسمی)

آیت 36 ﴿۱﴾ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا : ”الطَّاغُوتَ“ یہ ”طَغْيٌ يَطْغَى طَغْيًا“ (ف) سے ہے، آخر میں واو اور تاء مبالغہ کے لیے آتی ہیں، جیسا کہ ”ملکوت“ بہت بڑا ملک۔ ”طاغوت“ کا لفظ ”طَغْيَانٌ“ سے مشتق ہے جس کے

إِنْ تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِنْ شُورِينَ ﴿۳۷﴾
وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مِنْ يَمُونٍ ۗ بَلَىٰ وَعَدَّا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَكِنْ
أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۸﴾

اگر تو ان کی ہدایت کی حرص کرے تو بے شک اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جسے وہ گمراہ کر دے اور نہ کوئی ان کی مدد کرنے والے ہیں ﴿۳۷﴾ اور انھوں نے اپنی پکی قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ اللہ اسے نہیں اٹھائے گا جو مر جائے۔ کیوں نہیں! وعدہ ہے اس کے ذمے سچا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۳۸﴾

معنی اپنی حد سے براہنے کے ہیں۔ یہ شیطان، معبود باطل اور ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو گمراہی کی طرف دعوت دینے والا ہو۔ (شوکانی) شاہ عبدالقادر بریلوی لکھتے ہیں: ”جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے، کچھ سند نہ رکھے ایسے کو طاغوت کہتے ہیں۔ بت، شیطان اور زبردست ظالم سب ہی طاغوت ہیں۔“ (موضح)

﴿۲﴾ اِنْ اَعْبُدُوا اللَّهَ..... چونکہ مشرکین نے دعویٰ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے شرک پر راضی ہے، ورنہ وہ ہمیں شرک کیوں کرنے دیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے لام تاکید اور ”فَعَدَّ“ برائے تحقیق لاکر نہایت تاکید کے ساتھ ان کی تردید فرماتے ہوئے یہ بات کہی کہ ہم نے تو ہر امت میں رسول بھیجا ہی تو حید کی دعوت اور شرک کی تردید کے لیے ہے۔ (دیکھیے انبیاء: ۲۵) مگر ہم نے کسی کو تو حید یا شرک پر مجبور نہیں کیا، بلکہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں عطا کر کے کفر و ایمان کے دونوں راستے بتا کر اختیار دے دیا۔ (دیکھیے دہر: ۳، ۲) اشرف الحواشی میں ہے، یعنی ہر پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرنے اور طاغوت سے بچنے رہنے کی دعوت دی، پھر بعض نے تو دعوت کو قبول کر لیا اور ہدایت پا گئے، مگر بعض نے اپنے کفر و شرک پر اصرار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر گمراہی ثبت کر دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کی اس کے امر سے موافقت ضروری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ایمان کا حکم تو سب کو دیتا ہے مگر اللہ کے ارادہ کے مطابق ہدایت بعض کو ہوتی ہے۔ (شوکانی)

﴿۳﴾ فَيَسِّرْ لِي الْاٰذْيُنَ..... یعنی ان کے تباہ شدہ آثار دیکھ کر بتاؤ کہ کیا رسولوں کو جھٹلانے والوں پر اللہ کا عذاب نہیں آیا، لہذا یہ سمجھنا انتہائی حماقت ہے کہ کفر و شرک کا ارتکاب اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے ذریعے سے اپنی رضامندی کا راستہ بتایا ہے، لہذا اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے پیغمبروں کی پیروی ضروری ہے۔

آیت 37 : اِنْ تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ..... یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ہدایت اور گمراہی کے دونوں راستے واضح کر دیے، اب جو لوگ اس کی عطا کردہ استعداد سے کام نہ لیں اور حق پر باطل کو ترجیح دیں اور اللہ تعالیٰ انہیں باطل میں پڑے رہنے کی سزا دے تو آپ کا ان پر حرص کرنا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اس آیت میں نبی ﷺ کی لوگوں کی ہدایت کے لیے حرص بھی ظاہر ہو رہی ہے۔ (دیکھیے سورہ توبہ: ۱۲۸)۔

آیت 38 : ﴿۱﴾ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ..... : قسم ”حلف“ کو کہتے ہیں، کیونکہ یہ اس وقت اٹھائی جاتی ہے جب

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يُخْتَلَفُونَ فِيهِ وَيَلْعَلَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَذِبِينَ ﴿۳۹﴾

تاکہ وہ ان کے لیے وہ چیز واضح کر دے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور تاکہ جن لوگوں نے کفر کیا جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے ﴿۳۹﴾

لوگ تقسیم ہو جائیں، کچھ لوگ بات کو صحیح کہتے ہیں کچھ غلط۔ ”جَهْدٌ“ کا معنی مشقت ہے، ”جَهْدٌ فَلَا تَدَابَّةَ وَأَجْهَدَهَا“ جب اپنی سواری پر اس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ ڈال دے۔ ”جَهْدَ الرَّجُلِ فِي سَكَاةٍ“ جب آدمی کسی کام میں اپنی انتہائی کوشش صرف کر دے۔ اس کا باب ”فَتَحَّحَ يَفْتَحُ“ ہے۔ (ططاوی) ”أَيْمَانٌ“ ”بَيْمِينٌ“ کی جمع ہے ”فتمسین“، یعنی انھوں نے زیادہ سے زیادہ تاکید کے ساتھ نہایت پکی قسم کھائی کہ جو مر جائے اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ نہیں کرے گا۔ مرنے کے بعد نہ کوئی دوسری زندگی ہے نہ حساب کتاب، اس لیے عذاب کا کیا ڈر؟ مشرکین کی عقل پر تعجب ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی اتنی تعظیم کہ اس کے نام کی پکی قسمیں کھائی جا رہی ہیں، دوسری طرف اس کی اتنی بے قدری کہ اسے اتنا بے بس اور عاجز کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنی پہلی دفعہ بتائی ہوئی چیز کو بھی دوبارہ نہیں بنا سکتا۔

﴿۳۹﴾ بَلَىٰ وَعَدًّا عَلَيْهِ حَقًّا: ”بلی“ کا لفظ کسی نفی کی نفی کے لیے ہوتا ہے، جس سے مراد اس چیز کا اثبات ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا، قیامت نہیں آئے گی۔ فرمایا، کیوں نہیں! یعنی ضرور آئے گی۔ ”وَعَدًّا“ ”وَعَدًّا“ مقدر کا مفعول مطلق ہے، برائے تاکید اور ”حَقًّا“ اس کی صفت ہے، یعنی ”وَعَدَّ اللَّهُ وَعَدًّا حَقًّا“ ”عَلَيْهِ“ کا لفظ اس وعدے کی مزید تاکید کے لیے ہے کہ یہ اس پر لازم ہے۔ مگر یہ اس نے خود اپنے فضل و کرم سے اپنے آپ پر لازم کیا ہے، ورنہ کس کی مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز لازم کرے۔ یعنی تمہارے انکار کرنے اور زور و دانتیں کھانے سے اللہ کا پکا وعدہ ٹل نہیں سکتا، وہ تو ضرور پورا ہو کر رہے گا، البتہ تم ایسی واضح حقیقت کا انکار کر کے اپنی جہالت کا ثبوت دے رہے ہو۔

﴿۳۹﴾ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ: اس میں اس اقلیت کی تعریف ہے جو علم رکھتے ہیں اور جن کا ایمان ہے کہ آخرت اور حساب کتاب حق ہے اور اس اکثریت کی مذمت ہے، جو یہ ایمان نہیں رکھتے، اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر ان کی تردید فرمائی۔ دیکھیے سورہ تغابن (۷۱) اور سورہ لیس (۷۸)۔

آیت ۳۹: وَيَلْعَلَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَذِبِينَ: یعنی وہ کافر اپنا جھوٹا ہونا جان لیں جو قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے اور یہ کہ حساب کتاب، جنت و دوزخ سب بے حقیقت چیزیں ہیں۔ مطلب یہ کہ جب دنیا میں سب باتوں کا فیصلہ نہیں ہوتا تو سب اختلافات کو دور کرنے کے لیے دوسرے جہاں، یعنی آخرت کا ہونا ”لابد“ (جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں) ہے، تاکہ حق و باطل میں امتیاز ہو جائے اور مکررین اپنا کیا پائیں۔ ”كَانُوا كَذِبِينَ“ لفظ ”كَانُوا“ میں، یعنی زمانہ ماضی میں دوام اور استمرار پایا جاتا ہے، اس کے بجائے ”إِنَّهُمْ كَذَبُوا“ یا ”إِنَّهُمْ كَانُوا كَذِبِينَ“ میں یہ مفہوم ادا نہیں ہوتا۔

﴿ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴾ ۛ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا لَنَبُوْنَهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۚ وَلَآ جَزَاءَ لَآخِرَةَ أَكْبَرُ مَ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۴۰﴾

ہمارا کہنا کسی چیز کو، جب ہم اس کا ارادہ کر لیں، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ ہم اسے کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے ﴿۴۰﴾ اور جن لوگوں نے اللہ کی خاطر وطن چھوڑا، اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا، بلاشبہ ہم انہیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر سب سے بڑا ہے۔ کاش! وہ جانتے ہوتے ﴿۴۰﴾

آیت 40 ﴿ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ ﴾: یعنی جس کی قدرت کا یہ حال ہو اس کے لیے مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا بھی ثابت ہوا۔ قرآن وحدیث میں بہت سی جگہ اللہ کے کلام کرنے کا صریح الفاظ میں ذکر ہے۔ (دیکھیے نساء: ۱۶۳-توبہ: ۶) یونان کے کافرانہ فلسفے سے متاثر لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کلام نہیں کر سکتا، نہ سن سکتا ہے، نہ دیکھتا ہے۔ ہمارے کچھ مسلمانوں نے جو قرآن کو بھی ماننا چاہتے ہیں اور یونانی فلسفے کو بھی، انہوں نے اللہ کے کلام کو مخلوق کہہ دیا اور سننے اور دیکھنے کا معنی یہ کیا کہ وہ جانتا ہے، حالانکہ کلام، خلق، سمع، بصر اور علم سب الگ الگ صفات ہیں اور اللہ نے خود اپنی یہ صفتیں بیان فرمائی ہیں، البتہ اس کی یہ صفات مخلوق کی طرح نہیں، بلکہ فرمایا: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ [الشوری: ۱۱] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔“ اسی طرح اللہ کلام بھی کرتا ہے مگر جیسے اس کی شان کے لائق ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس کی مثل نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس کی ثابت شدہ صفات سمع، بصر اور کلام وغیرہ کا بھی انکار کر دو، یا ایسا مطلب بیان کرو جس کا نتیجہ انکار ہو۔

آیت 41 ﴿ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ ﴾: ”هَاجَرُوا“ ”هَاجَرَ يَهْجُرُ“ سے باب مفاعلہ ہے۔ ”هَاجَرَ“ اور ”هَاجَرَ“ کے مفہوم میں فرق ہے۔ ”هَاجَرَ الْمَكَانَ“ ”اس نے فلاں جگہ چھوڑ دی“ ہو سکتا ہے اسے وہ پسند نہ رہی ہو اور وہ اپنے خیال میں اس سے بہتر جگہ چلا گیا ہو، جگہ نے اسے جانے پر مجبور نہیں کیا، وہ اپنی مرضی سے اسے چھوڑ گیا ہے، لیکن ”هَاجَرَ“ یعنی باب مفاعلہ میں مقابلہ پایا جاتا ہے، یعنی قوم کی طرف سے مزاحمت اور مقابلے نے اسے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا، وہ اپنی جگہ چھوڑنے پر از خود راضی نہ تھا۔ (شعراوی)

﴿۲﴾ اللہ کی توحید اور قیامت پر ایمان لانے والوں کا توحید اور قیامت کے منکروں کے ساتھ خوشی سے مل جل کر رہنا ممکن ہی نہ تھا، خصوصاً جب اہل ایمان تعداد اور قوت میں کمزور بھی تھے۔ اپنے وطن کو جہاں بیت اللہ بھی ہو، کون خوشی سے چھوڑ سکتا ہے؟ اس لیے انہوں نے وطن چھوڑا تو دو وجہوں سے، ایک تو قوم کے ظلم کی وجہ سے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا ﴾ اور دوسرا اس لیے کہ اللہ کے دین پر عمل کرنا وطن میں ممکن نہ رہا، تو انہوں نے گھریار، خویش، قبیلے، جانداد، غرض ہر چیز کو اللہ کی خاطر چھوڑ دیا اور ایسی جگہ چلے گئے جہاں وہ ظلم سے بھی بچ جائیں اور اللہ کے دین پر بھی عمل کر سکیں۔ چونکہ یہ سورت مکی ہے، اس لیے اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو کفار کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ ان کی تعداد مردوں،

الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۳۷﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ

وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب ہی پر بھروسہ کرتے ہیں ﴿۳۷﴾ اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجے مگر مرد، جن کی عورتوں اور بچوں سمیت ایک سویا کم و بیش تھی، جن میں عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی رقیہ بنت ابی العاص (بنت رسول ﷺ) بھی تھے، مگر لفظ عام ہونے کی وجہ سے اس میں ہر مہاجر شامل ہے، خواہ مکہ سے حبشہ کی طرف ہو یا مدینہ کی طرف، یا کسی بھی عالم ہستی سے امن کی ہستی کی طرف۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں حبشہ کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کا پیشگی اشارہ ہو۔

﴿۳۷﴾ لَنْبُوؤْتَهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً..... "بُوؤُءٌ يُّبُوؤُ" (تفصیل) رہنے کی جگہ دینا، ٹھکانا دینا۔ اللہ تعالیٰ نے لام اور نون ثقیلہ دو تائیدوں کے ساتھ یہ وعدہ فرمایا، چنانچہ اس نے ان ناتواں اور غریب الوطن مہاجرین کو دنیا میں عزت، شرف، عظمت، حکومت، دولت غرض ہر چیز عطا فرمائی۔ وہ جزیرہ عرب ہی کے نہیں، شام، مصر، عراق، فارس کے مالک بنے اور نصف صدی گزری تھی کہ وہ تمام دنیا پر غالب تھے۔ یہ بھی کوئی اجر صغیر نہیں، اجر کبیر ہے، جو دین کی اشاعت اور آخرت کی تیاری میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کبیر ہی کے مقابلے میں اکبر ہوتا ہے، نہ کہ صغیر کے مقابلے میں، اس لیے فرمایا، یقیناً آخرت کا اجر اکبر ہے، یعنی اس سے بھی بڑا، بلکہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۱۸)، آل عمران (۱۹۵) اور سورہ نساء (۱۰۰)۔

﴿۳۸﴾ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ : اس سے مراد تین طرح کے لوگ ہو سکتے ہیں: ﴿۱﴾ کافر کہ وہ علم رکھتے ہوتے تو ایمان لے آتے۔ ﴿۲﴾ مہاجر کہ وہ ہجرت کی فضیلت جانتے ہوتے تو انہیں بے حد خوشی ہوتی۔ ﴿۳﴾ وہ مومن جنہوں نے ہجرت نہیں کی کہ وہ ہجرت کی فضیلت جانتے ہوتے تو ضرور ہجرت کرتے۔

آیت 42 : **الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ** : صبر اور اللہ پر توکل ہی سے وطن چھوڑنے کی جرأت پیدا ہوتی ہے، ورنہ بندہ مستقبل کے خوف سے کہ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں گیا تو کہاں سے کھاؤں گا، اپنی جگہ سے نہیں ہلتا اور نہ ہلنے کی وجہ سے چکی کے نچلے پاٹ کی طرح ہمیشہ اپنے سینے پر اوپر کے پاٹ کا بوجھ برداشت کرتا رہتا ہے اور آخر کار یا تو ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے یا جان سے۔ دیکھیے سورہ نساء (۹۷)۔

آیت 43 : ﴿۱﴾ **وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ** : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ یوسف (۱۰۹)۔

﴿۲﴾ **فَسَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ** : "أَهْلَ الذِّكْرِ" سے مراد اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہیں، یعنی یہ بات اگر تمہیں معلوم نہیں کہ پہلے تمام رسول مرد (انسان) ہی تھے تو یہود و نصاریٰ سے پوچھ لو جو انبیاء کی تاریخ سے واقف ہیں اور تم ان پر اعتماد بھی مسلمانوں کی نسبت زیادہ کرتے ہو کہ موسیٰ، عیسیٰ، داؤد اور سلیمان وغیرہم ﷺ فرشتے تھے یا بشر؟ پھر محمد ﷺ پر یہ اعتراض کیوں کہ یہ نبی انسان کیوں ہے، فرشتہ کیوں نہیں؟

﴿۳﴾ **إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ** : "اگر تم نہیں جانتے" یہ دراصل تعریض ہے کہ "جانتے تم بھی ہو" کیا اپنے باپ ابراہیم اور

فَسَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۱﴾

طرف ہم وحی کرتے تھے۔ سو ذکر والوں سے پوچھ لو، اگر تم شروع سے نہیں جانتے ﴿۳۱﴾

اسامیل علیہ السلام کو تم نہیں جانتے کہ وہ فرشتہ رسول تھے یا بشر؟ یقیناً تم جانتے ہو، خیر اگر نہیں جانتے تو یہود و نصاریٰ سے پوچھ لو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور یوسف علیہم السلام اور سارے بنی اسرائیل کے انبیاء بشر تھے یا فرشتے؟ تم پر حقیقت واضح ہو جائے گی۔

④ بعض لوگ اس آیت سے تقلید کے وجوب یا جواز پر استدلال کرتے ہیں، حالانکہ آیت کے سیاق و سباق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب مشرکین ہیں اور ”أَهْلَ الذِّكْرِ“ سے مراد اہل کتاب ہیں اور آیت میں ایک خاص اعتراض کے حل میں ان کی طرف رجوع کا حکم دیا جا رہا ہے، اس کا تقلید امر سے کیا تعلق؟

⑤ اگر آیت کو عام بھی سمجھ لیا جائے تو غیر عالم مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنے کسی بھی موجود عالم سے کتاب و سنت کا حکم معلوم کر لیں، کیونکہ فوت شدہ شخص سے پوچھا ہی نہیں جاسکتا۔ ظاہر ہے چاروں امام بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی فوت ہو چکے ہیں، ان سے سوال تو ممکن ہی نہیں۔ ہاں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کتاب و سنت میں محفوظ ہیں اور اماموں کے اقوال ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اب کوئی شخص دونوں میں سے جو بھی پوچھے گا کسی زندہ عالم ہی سے پوچھے گا، وہ عالم مکمل طور پر محفوظ کتاب و سنت سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بھی بتا سکتا ہے اور کسی معتبر یا غیر معتبر کتاب سے امام کا قول بھی۔ اس لیے سائل کا فرض یہ ہے کہ وہ کسی بھی عالم سے یہ پوچھے کہ اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حکم ہے، کیونکہ دین صرف کتاب و سنت کا نام ہے۔ جب بڑے سے بڑے امتی کا قول بھی دین نہیں تو پھر سائل عالم سے کسی امام کا قول کیوں پوچھے؟ کیا وہ امام نبی تھا، یا اللہ تعالیٰ نے اس کی اطاعت کا حکم دیا ہے، یا وحی کے ذریعے سے اس کی خطا کی اصلاح کر دی جاتی تھی۔ اس سے بڑھ کر بد قسمتی کیا ہوگی کہ مسلمانوں نے علماء سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پوچھنے کے بجائے اپنے اپنے فرقے کے بنائے ہوئے امام کے اقوال پوچھنا اور ان پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے کہ مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ اس کا علاج اب بھی سب فرقے چھوڑ کر کتاب و سنت پر متحد ہونا ہے۔ خصوصاً آگے صاف لفظ بھی آرہے ہیں کہ ”بِالْبَيِّنَاتِ وَالزَّبُورِ“ یعنی اہل ذکر سے سوال کرو کہ وہ بینات (دلائل) اور آسمانی کتابوں کے ساتھ جواب دیں، نہ کہ اپنے یا کسی امتی کے قیاس یا عقل سے نکالی ہوئی کسی بات کے ساتھ۔ گویا اس آیت کو اگر تقلید کے متعلق مان بھی لیا جائے تو یہ تقلید کو جز سے اکھڑنے والی اور کتاب و سنت کا پابند بنانے والی ہے۔

⑥ ”إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ“ سے معلوم ہوا کہ اہل ذکر سے پوچھنے کی ضرورت اسے ہے جو لاعلم ہو۔ کیا بڑے سے بڑے مدارس میں دس، دس سال پڑھنے کے بعد اور چالیس پچاس سال پڑھانے کے بعد بھی مقلد حضرات ”لَا تَعْلَمُونَ“ ہی رہتے ہیں، حالانکہ وہ قرآن و سنت پر عمل سے بچنے اور اپنے امام کی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے اتنے علمی و عقلی دلائل جمع کرتے اور پیش

بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۳۳﴾

واضح دلائل اور کتابیں دے کر۔ اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری، تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے اور تاکہ وہ غور و فکر کریں ﴿۳۳﴾

کرتے ہیں جو شاید ان کے امام کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے ہوں۔ میں اپنے ان بھائیوں سے نہایت درد مندی سے عرض کرتا ہوں کہ وہ قیامت کے دن کسی دھڑے یا فرتے میں کھڑے ہونے کے بجائے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے چلنے والی قطار میں شامل ہو جائیں۔ نجات کا بس یہی ایک راستہ ہے۔

آیت 44 : ﴿۱﴾ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ : ”الزُّبُرُ“ ”الزُّبُورُ“ کی جمع ہے، بمعنی ”مَزُبُورٌ“ یعنی مکتوب۔ ”بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ“ یہ جار مجرور گزشتہ آیت کے دو افعال میں سے کسی ایک کے متعلق ہو سکتا ہے، یا تو ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا“ میں ”أَرْسَلْنَا“ کے متعلق، یعنی ہم نے آپ سے پہلے نہیں بھیجے مگر مرد واضح دلائل اور کتابیں دے کر، یا ”فَسَأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ“ میں ”فَسَأَلُوا“ کے متعلق، یعنی اگر تم نہیں جانتے تو ذکر والوں سے واضح دلائل اور کتابوں کے ساتھ پوچھ لو۔ (طحاوی)

﴿۲﴾ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ : ”الذِّكْرُ“ کی تفسیر کے لیے سورہ حجر کی آیت (۹) کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

﴿۳﴾ اس آیت میں ”الذِّكْرُ“ یعنی وحی الہی کو رسول اللہ ﷺ پر نازل کرنے کی دو حکمتیں بیان فرمائیں، ایک تو یہ کہ لوگوں کو اس کا مطلب سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آنے پر آپ ان کے لیے اس کی وضاحت فرمادیں، بلکہ خود اس پر عمل کر کے انہیں اس کی عملی تصویر دکھادیں، کیونکہ آپ کی وضاحت اور نمونے کے بغیر وحی الہی میں بیان کردہ چیزوں کو سمجھنا ممکن ہی نہیں، مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دیگر احکام۔ قرآن مجید کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کا ہر قول، فعل اور حال وحی الہی اور اس کی وضاحت ہی ہے، فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب : ۲۱] ”بلاشبہ یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ہمیشہ سے اچھا نمونہ ہے۔“ مقدم بن معدیکرب رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿أَلَا، إِنِّي أُوتِيتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ، أَلَا يُوشِكُ رَجُلٌ شَبَعَانٌ عَلَيَّ أُرِيكُمْ بِهِذَا الْقُرْآنِ فَمَا وَحَدَّثْتُمْ فِيهِ مِنْ حَلَالٍ فَأَجَلُّوهُ وَمَا وَحَدَّثْتُمْ فِيهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرَّمُوهُ أَلَا وَإِنْ مَا حَرَّمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلُ مَا حَرَّمَ اللَّهُ، أَلَا، لَا يَجِلُّ لَكُمْ الْجِمَارُ الْأَهْلِيَّةُ وَلَا كُلُّ ذِي نَابٍ مِنَ السَّبْعِ وَلَا لِقْطَةُ مُعَاجِدٍ إِلَّا أَنْ يَسْتَعِينِي عَنْهَا صَاحِبُهَا﴾ [أبو داؤد، السنة، باب في لزوم السنة : ۶۶۰۴-۶۶۰۵، ابن ماجه : ۱۲، وصححه الألباني] ”سنو! مجھے کتاب اور اس کے ساتھ اس کی مثل دی گئی ہے، یاد رکھو! قریب ہے کہ ایک پیٹ بھرا ہوا آدمی اپنی شاندار چار پائی پر بیٹھا ہوا یہ کہے کہ اس قرآن کو لازم چڑو، جو اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ سن لو! بے شک جو کچھ اللہ کے رسول نے حرام کیا ہے وہ اسی طرح ہے جیسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ یاد رکھو! تمہارے لیے گھریلو گدھے کا گوشت حلال نہیں اور نہ درندوں میں سے کوئی کچلی والا اور نہ کسی ذمی (کافر) کی گری ہوئی چیز، الا یہ کہ اس کے مالک کو اس کی ضرورت نہ رہے۔“

أَقَامِنَ الَّذِينَ نَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ
حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۴۵﴾ أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقْلِبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۴۶﴾ أَوْ يَأْخُذَهُمْ
عَلَى تَخَوُّفٍ ۖ فَإِنَّ رَبَّكُمُ لَكَرِيمٌ ﴿۴۷﴾

تو کیا وہ لوگ جنھوں نے بری تدبیریں کی ہیں، اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ انھیں زمین میں دھنسا دے، یا ان پر عذاب آجائے جہاں سے وہ سوچتے نہ ہوں ﴿۴۵﴾ یا وہ انھیں ان کے چلنے پھرنے کے دوران پکڑ لے۔ سو وہ کسی طرح عاجز کرنے والے نہیں ﴿۴۶﴾ یا وہ انھیں خوف زدہ ہونے پر پکڑ لے۔ پس بے شک تمہارا رب یقیناً بہت نرمی کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۴۷﴾

دوسری حکمت ”وَأَلَّهْمُ يَنْفَعُ كُرُونَ“ اور تاکہ لوگ وحی الہی میں غور و فکر کریں اور اس سے نصیحت حاصل کریں۔

آیت 45 أَقَامِنَ الَّذِينَ نَكَرُوا السَّيِّئَاتِ.....: فاء عاطفہ ہے، لیکن ہمزہ استفہام عربی میں کلام کے شروع میں آتا ہے، اس لیے عطف کی فاء ہو یا واو، ہمزہ استفہام کے بعد لائی جاتی ہے، لہذا ترجمے میں حرف عطف کا معنی پہلے کیا جاتا ہے۔ ان تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے واضح دلائل اور کتاب دیکھنے سننے کے باوجود رسول اور اہل ایمان کے خلاف سازشیں کرنے والوں کو چار قسم کے عذاب سے خبردار کیا ہے، پہلا یہ کہ کیا وہ اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دے اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے متعلق فرمایا: ﴿فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِإِخْوَتِهِ الْاَرْضَ﴾ [القصص: ۸۱] ”تو ہم نے اسے اور اس کے مکان کو زمین میں دھنسا دیا۔“ خود ہمارے دیکھنے میں آزاد کشمیر کے اندر آنے والے زلزلے میں کئی جگہوں پر زمین بچھی اور کئی آدمی اور مکان اس کے اندر جھنس گئے، پھر دوسرے جھکوں کے ساتھ زمین کے وہ شکاف دوبارہ مل گئے اور دھنسنے والوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ دوسرا یہ کہ انھیں عذاب ایسی جگہ سے آ پکڑے جہاں سے وہ سوچتے بھی نہ ہوں کہ یہاں سے بھی عذاب آ سکتا ہے اور اچانک آ جانے کی وجہ سے نہ اس کا دفاع کر سکیں اور نہ اس سے بھاگ کر بچ سکیں۔ اس کے مشابہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿فَأَتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا﴾ [الحشر: ۲] ”تو اللہ ان کے پاس آیا جہاں سے انھوں نے گمان نہیں کیا تھا۔“

آیت 45 أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقْلِبِهِمْ.....: ”تَقْلِبُ“ چلنا پھرنا، یعنی زندگی کی مصروفیات میں چلتے پھرتے، آتے جاتے اپنے شہر یا سفر میں کہیں بھی پکڑ لے۔ ”بِمُعْجِزِينَ“ یہ ”أَعْجَزَ يُعْجِزُ إِعْجَازًا“ باب افعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، لفظی معنی ہے عاجز کرنے والے، یعنی اگر اللہ چاہے تو انھیں چلتے پھرتے مصروفیت کی حالت میں پکڑ لے، پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کی گرفت سے بچ کر نکل جائیں اور اللہ تعالیٰ کو پکڑنے سے عاجز کر دیں۔ ”بِمُعْجِزِينَ“ پر باہنشی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”کسی طرح عاجز کرنے والے نہیں“ کیا گیا ہے۔

آیت 47 ۱ أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَى تَخَوُّفٍ: ”تَخَوُّفٍ“ کا ایک معنی خوف زدہ ہونا ہے اور ایک معنی ”تَنْقُصُ“ یعنی

أَوْلَمْ يَرَوْا إِلَى مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَتَّيُونَ ظِلُّهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّأْبَلِ سَجْدًا لِلَّهِ

اور کیا انھوں نے اس کو نہیں دیکھا جسے اللہ نے پیدا کیا ہے، جو بھی چیز ہو کہ اس کے سائے دائیں طرف سے اور بائیں آہستہ آہستہ کم ہوتا ہے۔ یعنی عذاب کی ایک صورت یہ ہے کہ انھیں پہلے ہی سے نظر آ رہا ہو کہ عذاب آ رہا ہے، جس کے آنے سے وہ ہر وقت خوف زدہ رہیں اور اس کے نتیجے میں دن بدن ان کی جائیں، مال اور پیداوار کم ہوتی چلی جائیں، حتیٰ کہ دیکھتے دیکھتے وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت میں آ جائیں۔ یہ بھی عذاب کی نہایت تکلیف دہ صورت ہے، کیونکہ انسان خوف کی وجہ سے نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے، بلکہ گھٹلا چلا جاتا ہے۔ اس تفسیر میں ”تَحَوُّفٌ“ اور ”تَنْقُصٌ“ (خوف زدہ ہونا اور آہستہ آہستہ کم ہونا) دونوں معنی آ گئے ہیں۔

② فَإِنْ رَدَّكُمْ لِرَأْوَفٍ رَجِينٌ: یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس اگرچہ عذاب کی بے شمار صورتیں ہیں، مگر وہ تمہیں مہلت دیتا ہے اور درگزر فرماتا ہے، تاکہ تم نافرمانی چھوڑ کر واپس پلٹ آؤ۔ یہ اس کی بے حد شفقت اور نہایت مہربانی ہے کہ تم گناہ کرتے رہتے ہو، اس کے باوجود وہ تمہیں رزق دیتا ہے اور تندرستی بخشتا ہے اور اس کی طرف سے تمہاری فوری گرفت نہیں ہوتی۔ ورنہ اگر وہ تمہیں تمہاری نافرمانیوں کی وجہ سے پکڑے تو زمین پر کوئی چلنے والی چیز باقی نہ رہے۔ دیکھیے سورہ فاطر کی آخری آیت۔

آیت 48 ① أَوْلَمْ يَرَوْا إِلَى مَا خَلَقَ اللَّهُ.....: ”يَتَفَتَّيُونَ“ ”فَاءَ بِنَفْسِي فَبِنَا“ (لوٹنا) سے باب تفعّل ہے۔ سائوں کے لوٹنے سے مراد سورج نکلنے کے بعد ایک جگہ سے دوسری جگہ حتیٰ کہ زوال کے بعد بالکل ہی دوسری طرف منتقل ہونا ہے۔ ”ذُخْرُونَ“ ”ذُخْرٌ يَذْخَرُ ذُخُورًا“ (ع) سے ہے، ”ذُخْرٌ فَلَانٌ لِفُلَانٍ“ فلاں شخص دوسرے کا بالکل مطیع اور اس کے سامنے عاجز اور ذلیل ہو گیا۔ ”أَوْلَمْ يَرَوْا“ میں استفہام پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ ڈانٹنے کے لیے ہے کہ کیا ان مشرکوں کو نظر نہیں آتا، یقیناً یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کے سامنے سجدہ ریز اور عاجز و مطیع ہے، مگر یہ اللہ کے دیے ہوئے اختیار کو اس کی ساری مخلوق کی طرح عاجزی، اطاعت اور عبادت کے بجائے سرکشی اور کفر و شرک میں استعمال کر رہے ہیں۔

② إِلَى مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ.....: یعنی دنیا کی کوئی بھی چیز جو اللہ نے پیدا فرمائی ہے، مثلاً پہاڑ، درخت اور انسان وغیرہ، جس کا سایہ بڑھتا، گھٹتا اور ڈھلتا ہے، ہر ایک ٹکونی طور پر (اپنے اختیار کے بغیر) اللہ تعالیٰ ہی کی فرماں برداری میں مصروف ہے اور وہ قانون قدرت سے بال برابر ادھر ادھر نہیں ہو سکتی۔ یہاں تمام چیزوں پر ذوی العقول کو غلبہ دے کر ”ذُخْرُونَ“ فرمایا ہے۔ (روح المعانی) شاہ عبدالقادر رکنی اس سجدہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”ہر چیز ٹھیک دوپہر میں کھڑی ہے، اس کا سایہ بھی کھڑا ہے، جب دن ڈھلا، سایہ بھی جھکا، پھر جھکتے جھکتے شام تک زمین پر پڑ گیا، جیسے نماز میں قیام سے رکوع اور رکوع سے سجدہ، اسی طرح ہر چیز اپنے سائے سے نماز ادا کرتی ہے۔“ (موضح) ”الْيَمِينِ“ کو اختصار کے لیے واحد اور ”الشَّأْبَلِ“ کو تفصیل کے لیے جمع لائے۔ پہلے سے مراد جنس ہے، اس میں بھی تمام افراد شامل ہیں، دوسرے سے مراد بائیں جانب کے تمام اطراف ہیں۔

وَهُمْ ذَخِرُونَ ﴿۴۹﴾ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ
وَ الْبٰتِيَاةِ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۵۰﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ

طرفوں سے اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے ڈھلتے ہیں، اس حال میں کہ وہ عاجز ہیں ﴿۴۹﴾ اور اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، کوئی بھی چلنے والا (جانور) ہو اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے ﴿۵۰﴾ وہ اپنے

آیت 49 ﴿۴۹﴾ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ : پہلے ان چیزوں کا سجدہ بیان فرمایا جو زمین میں پائی جاتی ہیں، اب یہاں زمین و آسمان میں پائے جانے والے تمام جان دار، خصوصاً فرشتوں کا سجدہ بیان کر کے متنبہ فرمایا کہ ایسی مقرب ہستیاں بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے سر بسجود ہیں اور ان میں کوئی تکبر یا غرور نہیں پایا جاتا، لہذا ان کے متعلق یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور ان کا اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں کوئی حصہ ہے۔ (شوکانی)

آیت 50 ﴿۵۰﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ : ”مِنْ فَوْقِهِمْ“ ”رَبَّهُمْ“ سے حال ہے، یعنی وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اس حال میں کہ وہ ان کے اوپر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے اور تمام اہل اللہ کا اس پر اتفاق ہے۔ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے، درست نہیں، کیونکہ یہ ”الرَّخْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ الْمُسْتَوٰی“ کے خلاف ہے۔ ہاں، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن و حدیث کی رو سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے، مگر کس طرح ہے، یہ معلوم نہیں، نہ صحابہ میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی کیفیت پوچھی، اس لیے امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے، اس کی کیفیت معلوم نہیں، اس لیے اس کی کیفیت کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔“ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ اوپر ہے نہ نیچے، نہ دائیں نہ بائیں، نہ آگے نہ پیچھے، بلکہ وہ لامکان ہے، یعنی کسی جگہ بھی نہیں، کیونکہ عرش اور مکان تو اس کی مخلوق ہے، اگر اسے عرش پر یا کسی مکان میں مانیں تو وہ اپنی مخلوق کا محتاج ٹھہرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اوپر کی جانب ہونے یا عرش پر ہونے کے منکرین میں سے بعض لوگ تو یہاں تک بڑھ گئے کہ انھوں نے کہا یہ کہنا ہی جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت دے، ان کی بات قرآن کی ان متعدد آیات جن میں اللہ تعالیٰ کا عرش پر ہونا یا اوپر کی جانب ہونا بیان ہوا ہے، کے صریح خلاف ہے۔ ان کی بات کا نتیجہ تو یہی ہے کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ موجود ہی نہیں۔ رہی یہ بات کہ اس سے اللہ کا عرش یا مکان کا محتاج ہونا لازم آتا ہے تو یہ بات فضول ہے، کیونکہ بہت سی نیچے والی چیزیں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے اوپر والی چیز کی محتاج ہوتی ہیں، مثلاً چھت کے نیچے پنکھا یا بلب وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کی مثل تو کوئی چیز نہیں، سو عرش اور مکان اللہ تعالیٰ کے مخلوق ہو کر بھی اپنی پیدائش اور وجود میں اللہ کے محتاج ہیں، اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں، کیونکہ وہ ان کے پیدا کرنے سے پہلے بھی ہمیشہ سے موجود ہے۔ ہاں، اس کی کوئی صفت یا اس کی ذات کسی مخلوق کی صفت یا ذات کی مثل نہیں۔ جن لوگوں نے اس سوال پر کہ ”اللہ کہاں ہے“ ناجائز ہونے کا فتویٰ لگایا وہ سوچ لیں کہ ان کا فتویٰ کس کس ہستی پر لگتا ہے۔

مَا يُؤْمَرُونَ

رب سے، جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور وہ کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے ﴿۵﴾

صحیح مسلم میں معاویہ بن حکم السہمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: «كَانَتْ لِي جَارِيَةٌ تَرَعَى غَنَمًا لِي قَبْلَ أُخْدِ وَالْحَوَائِيَّةِ، فَاطَّلَعْتُ ذَاتَ يَوْمٍ فَإِذَا الذَّنْبُ قَدْ ذَهَبَ بِشَاةٍ عَنِ غَنَمِهَا، وَأَنَا رَجُلٌ مِنْ بَنِي آدَمَ، أَسَفُ كَمَا يَأْسَفُونَ، لِكَيْفِي صَكَّكُنْهَا صَكَّةً، فَأَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَظَّمْ ذَلِكَ عَلَيَّ، قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَفَلَا أُعْتَفَئُهَا؟ قَالَ أَتَيْتُ بِهَا، فَأَتَيْتُهُ بِهَا، فَقَالَ لَهَا أَيْنَ اللَّهُ؟ قَالَتْ فِي السَّمَاءِ قَالَ مَنْ أَنَا؟ قَالَتْ أَنْتَ رَسُولُ اللَّهِ، قَالَ أُعْتَفَئُهَا، فَإِنِهَا مُؤْمِنَةٌ» [مسلم، المساجد، باب تحريم الكلام في الصلاة.....: ۵۲۷] ”میری ایک لونڈی تھی جو احد اور جوانیہ (پہاڑ) کی طرف میری بھیڑ بکریاں چرایا کرتی تھی۔ میں نے ایک دن دیکھا کہ بھیڑیا اس کی بھیڑوں میں سے ایک بھیڑ لے گیا تھا، میں بنی آدم ہی میں سے ایک آدمی ہوں، مجھے اسی طرح غصہ آتا ہے جیسے انہیں غصہ آتا ہے، لیکن میں نے اسے (بس) ایک تھپڑ مارا، پھر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپ نے اسے مجھ پر بہت بڑا (گناہ) قرار دیا۔ میں نے کہا: ”یا رسول اللہ! کیا میں اسے آزاد نہ کر دوں؟“ فرمایا: ”اسے میرے پاس لے کر آؤ۔“ میں اسے آپ کے پاس لے کر آیا، آپ نے اس سے فرمایا: ”اللہ کہاں ہے؟“ اس نے کہا: ”آسمان میں۔“ آپ نے فرمایا: ”میں کون ہوں؟“ اس نے کہا: ”آپ اللہ کے رسول ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اسے آزاد کر دو، یہ مومنہ ہے۔“ اس صحیح حدیث کے مطابق یہ سوال کرنے والے کہ ”اللہ کہاں ہے؟“ رسول اللہ ﷺ ہیں اور اس لونڈی کو مومنہ قرار دے رہے ہیں، جس کا جواب یہ ہے کہ آسمان پر ہے۔ اب اس سوال کو ناجائز کہنے والے اور اللہ تعالیٰ کو لامکان کہنے والے سوچ لیں کہ ان کا فتویٰ کس کس پر لگتا ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کا امتی سمجھتے ہیں تو فوراً ان غلط عقائد سے توبہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہیں۔ اہل علم نے اللہ تعالیٰ کے لیے اوپر کی جانب ہونے کے ثبوت کے لیے قرآن و حدیث کے دلائل پر مشتمل کئی کتابیں لکھی ہیں۔ دیکھیے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”الْعُلُوُّ لِلْعَلِيِّ الْغَفَّارِ“ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”الْحَيُوسُ الْإِسْلَامِيَّةُ“، اسی طرح مشہور مسلم فلسفی ابن رشد نے ”مَنَاهِجُ الدَّوَلَةِ“ میں اس موضوع پر بہت لمبی تفصیل لکھی ہے۔

﴿۵﴾ ربیعہ بن عبد اللہ بن ہدیہ کہتے ہیں کہ وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ خطبہ جمعہ میں حاضر تھے۔ انہوں نے منبر پر سورۃ النحل پڑھی، سجدے کا مقام آیا تو اترے اور سجدہ کیا، لوگوں نے بھی سجدہ کیا، یہاں تک کہ اگلا جمعہ آیا تو انہوں نے وہی سورت پڑھی، سجدے کا مقام آیا تو فرمایا: ”لوگو! ہم سجدے کی آیت پڑھتے ہیں تو جس نے سجدہ کیا اس نے درست کیا اور جس نے سجدہ نہیں کیا اس پر کوئی گناہ نہیں“ اور عمر رضی اللہ عنہ نے سجدہ نہیں کیا۔ [بخاری، سجود القرآن، باب من رای ان اللہ عز و حل لم یوجب السجود: ۱۰۷۷] اس سے معلوم ہوا کہ سجدہ والی آیت پر سجدہ کریں تو ثواب ہے، مگر یہ ضروری اور فرض نہیں۔ البتہ

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ فَإَيَايَ فَارْهَبُونَ ﴿۵۱﴾ وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الَّذِينَ وَاَصْبَاءُ اَفْعَبِ اللّٰهُ تَتَّقُونَ ﴿۵۲﴾

اور اللہ نے فرمایا تم دو معبود مت بناؤ، وہ تو صرف ایک ہی معبود ہے، سو مجھی سے پس تم ڈرو ﴿۵۱﴾ اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور عبادت بھی ہمیشہ اسی کی ہے، پھر کیا اللہ کے غیر سے ڈرتے ہو ﴿۵۲﴾ اس میں شک نہیں کہ سجدہ نہ کرنے سے سجدہ کرنے کا ثواب حاصل نہ ہوگا۔

آیت ۵۱: ﴿۱﴾ وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَهَيْنِ اثْنَيْنِ: اوپر بتایا کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز اور اس کی مطیع و فرماں بردار ہیں، اس مناسبت کے ساتھ اب انسانوں کو اس مالک الملک کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانے سے منع فرمایا ہے۔

﴿۲﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ ”الہین“ کا معنی ہی دو معبود ہے، پھر ”اثنین“ کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی قباحت میں زور پیدا کرنے کے لیے بات تاکید کے ساتھ کی جاتی ہے، یہاں ”اثنین“ کا مقصد یہی ہے۔ تو جب دو معبود نہیں بن سکتے تو زیادہ کس طرح بن سکتے ہیں؟ صرف اللہ ہے جو ایلا ہی عبادت کے لائق ہے۔ قرآن میں یہ بات کئی جگہ بیان فرمائی، چنانچہ فرمایا: ﴿لَوْ كُنَّا فِيْهِمْ لَفَسَدْنَا﴾ [الانبیاء: ۲۲] ”اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔“ اور دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۳۹)۔

﴿۳﴾ فَإَيَايَ فَارْهَبُونَ: ”رہبۃ“ اس خوف کو کہتے ہیں جس میں ساتھ بچا بھی جائے، باب ”علم“ سے ہے۔ ”فإيائي“ پہلے لانے میں اور پھر ”فأرهبون“ (جو اصل میں فأرهبوني تھا) میں دوبارہ یاد لانے میں تاکید پر تاکید ہے کہ صرف میری عبادت کرو۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر غائب کے ساتھ تھا، اب تکلم کے ساتھ ہو گیا، اس القات کے لیے پہلی فاء آئی ہے۔ اور ”فإيائي“ اور ”فأرهبون“ دونوں پر فاء آئی ہے، پہلی عطف کے لیے ہے اور دوسری محذوف شرط کی جزا کے لیے ہے، گویا عبارت یوں ہے کہ صرف اللہ ہے جو ایلا ہی عبادت کے لائق ہے (اور وہ میں ہوں) پس صرف مجھ سے (اگر کسی سے ڈرنا ہے) تو مجھ سے ڈرو، کسی دوسرے سے نہیں۔

آیت ۵۲: ﴿۱﴾ وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: ”الذین“ کا معنی یہاں فرماں برداری، مطیع ہونا اور عبادت ہے۔ ”واصباء“ (ہمیشہ) ”وَصَبَّ يَصِيبُ (وَعَدَّ يَعِدُ) وَصُوبًا“ جیسے فرمایا: ﴿دُخُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ﴾ [الصافات: ۹] ”بھگانے کے لیے اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے۔“ یعنی آسمان و زمین صرف اللہ کے پیدا کردہ اور اس کی ملکیت ہیں اور اطاعت و عبادت بھی اسی کا دائمی حق ہے تو پھر ہر چیز کے مالک اللہ کے بجائے اس کے غیر سے ڈرتے ہو؟ کس قدر نادانی اور حماقت کی بات ہے۔

وَمَا يَكُفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَبِمَا نَسَاكُمْ إِذَا كُنْتُمْ لِلَّهِ كَافِرِينَ ۖ تَجْعَلُونَ ۗ ثُمَّ إِذَا كُفِّرُوا
 الْبُرْءَ عَنْكُمْ إِذَا فَرِحُوا بِمَنِّكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ۗ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۖ فَتَسْتَعْتِفُوا
 فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۗ وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ ۖ تَاللَّهِ لَتَسْتَلْنَ عَنَّا
 كُنْتُمْ تَفْتَرُونَ ۗ وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ لَا لَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ ۗ

اور تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے، پھر جب تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو اسی کی طرف تم
 گزر گزاتے ہو ﴿۵۳﴾ پھر جب وہ تم سے اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے تو اچانک تم میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ
 شریک بنانے لگتے ہیں ﴿۵۴﴾ تاکہ وہ اس کی ناشکری کریں جو ہم نے انہیں دیا ہے۔ سو تم فائدہ اٹھا لو، پس عنقریب تم
 جان لو گے ﴿۵۵﴾ اور وہ ان (معبودوں) کے لیے جن کے بارے میں وہ نہیں جانتے، ایک حصہ اس میں سے مقرر
 کرتے ہیں جو ہم نے انہیں دیا ہے۔ اللہ کی قسم! تم اس کے بارے میں ضرور ہی پوچھے جاؤ گے جو تم جھوٹ
 باندھتے تھے ﴿۵۶﴾ اور وہ اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں، وہ پاک ہے اور اپنے لیے وہ جو وہ چاہتے ہیں ﴿۵۷﴾

آیت 53-55: وَمَا يَكُفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ.....: ”نِعْمَةٍ“ (نعمت) نکرہ ہونے کی وجہ سے عام تھی، ”مِنْ“ کے ساتھ عموم کی
 مزید تاکید ہوگی کہ جو بھی نعمت تمہارے پاس ہے، یعنی تمہارا وجود، صحت، عافیت، مال، غرض چھوٹی یا بڑی جو بھی نعمت ہے، وہ
 سب اللہ کی عطا کردہ ہے۔ ”تَجْعَلُونَ“ ”جَعَلُوا جُعُولًا“ (ف) مدد طلب کرنے کے لیے اونچی آواز نکالنا، گزر گزانا۔
 اصل میں یہ لفظ جنگلی جانوروں کے چیخنے چلانے کے لیے آتا ہے، جیسا کہ گائے کی آواز کے لیے ”جُعُولًا“، بکری کے لیے
 ”نُعَاءً“ اونٹ کے لیے ”رُعَاءً“ اور بھیڑیے اور کتے کے لیے ”عُؤَاءً“ آتا ہے۔ ”فَتَسْتَعْتِفُوا“ سو تم فائدہ اٹھا لو، یہ امر ڈانٹنے
 کے لیے ہے۔ ان آیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یونس (۲۱ تا ۲۳)۔

آیت 56: وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ.....: ”لَا يَعْلَمُونَ“ کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ
 مشرک لوگ ہمارے دیے ہوئے رزق کا حصہ ان خداؤں کے لیے مقرر کر دیتے ہیں جو کچھ بھی نہیں جانتے، کیونکہ عالم الغیب
 والہامہ تو صرف اللہ ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ان کے لیے مقرر کر دیتے ہیں جن کے متعلق یہ کچھ نہیں جانتے۔ نہ انہیں ان کی
 حقیقت معلوم ہے نہ ان کا بے اختیار ہونا، محض گمان اور سنی سنائی باتوں پر بنیاد رکھ کر ہمارا دیا ہوا ان کے نام کر دیتے ہیں۔
 دیکھیے سورہ انعام (۳۶ تا ۳۸) اور سورہ یونس (۶۶) شروع آیت میں ان مشرکین کا ذکر سارے کا سارا غائب کے صیغوں کے
 ساتھ کرنے کے بعد آخر میں (بطور التفات) انہیں براہ راست ڈانٹنے کے لیے مخاطب کر لیا اور قسم کھا کر فرمایا کہ مجھے اپنی قسم
 کہ تم جو کچھ طوفان باندھتے رہے ہو ہر صورت اس کے متعلق پوچھے جاؤ گے۔

آیت 57: وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ.....: یہ ان کے اللہ تعالیٰ پر دو عیب لگانے کا بیان ہے، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيَسْكُتُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿۵۹﴾

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ دن بھر کالا رہتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوتا ہے ﴿۵۸﴾ وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، اس خوش خبری کی برائی کی وجہ سے جو اسے دی گئی۔ آیا اسے ذلت کے باوجود رکھ لے، یا اسے مٹی میں دبا دے۔ سن لو! برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں ﴿۵۹﴾

اولاد قرار دی، حالانکہ وہ اولاد سے پاک ہے۔ دوسرا عیب یہ کہ فرشتوں کو جو اللہ کے بندے ہیں، اللہ کی اولاد قرار دیا اور اولاد بھی مؤنث، جبکہ وہ اپنے لیے لڑکے پسند کرتے ہیں، لڑکیوں کو اپنے لیے باعث ذلت قرار دیتے ہیں، یہ کتنی بڑی بے انصافی ہے۔ درمیان میں اللہ تعالیٰ نے ”سُبْحٰنَةُ“ (وہ پاک ہے) کہہ کر اپنی ذات سے ہر قسم کی اولاد کی نفی فرمائی، خواہ لڑکا ہو یا لڑکی، کیونکہ پھر اس کی بیوی بھی ماننا پڑے گی، جب کہ خاندان بیوی کا محتاج ہوتا ہے اور اولاد باپ کی شریک اور جانشین ہوتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ محتاجی، شرکت اور زوال تینوں سے پاک ہے، کیونکہ یہ تینوں اس کے لیے عیب ہیں، وہ ”لَمْ يَلِدْهُ وَكَانَ يُوَكَّدُ“ ہے اور وہ اکیلا ہی غنی ہے، باقی سب اس کے محتاج ہیں، فرمایا: ﴿يَأْتِيهَا النَّاسُ أَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ [فاطر: ۱۰] ”اے لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ ہی سب سے بے پروا، تمام تعریفوں کے لائق ہے۔“ صرف اسی کے لیے بقا ہے، باقی سب کچھ فانی ہے۔ مزید دیکھیے سورۃ النعام (۱۰۱)، سورۃ بنی اسرائیل (۳۰)، سورۃ صافات (۱۵۱-۱۵۲)، سورۃ زخرف (۱۱) اور سورۃ نجم (۲۲، ۲۱)۔

آیت 58-59 وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ : بشارت اچھی خبر جس سے بشرے پر خوشی کے آثار ظاہر ہوں، یہاں بطور استہزا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَيُبْشِرُكُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ [آل عمران: ۲۱] ”سو انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دے۔“ ”ظَلَّ سَكَنًا“ وہ سارا دن اس طرح رہا۔ یہ ”صَارَ“ کے معنی میں بھی آتا ہے کہ وہ اس طرح ہو گیا۔ ”كَظِيمٌ“ کا معنی ”كُنْتُمْ“ (چھپانا) ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَالْكٰظِمِينَ الْغَيْظَ﴾ [آل عمران: ۱۳۴] ”اور غصے کو پی جانے والے۔“ یہ ”سَكَطَ الْفِرْيَانَةُ“ سے لیا گیا ہے۔ جب مشکیزہ پانی سے بھر جائے، پھر اس کا منہ باندھ دیں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی پھٹ جائے گا، مراد غم سے بھرا غم ہے، یعنی لڑکی کی پیدائش کی خبر سن کر سارا دن غم کی وجہ سے اس کا منہ کالا رہتا ہے، مگر وہ غم سے بھرا ہونے کے باوجود اظہار نہیں کرتا۔ اپنے خیال میں اب وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا، اس لیے اس خوش خبری کو وہ اتنا برا سمجھتا ہے کہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے، آیا اسے اپنے پاس رکھے اور جاہل معاشرے کی نظر میں ذلیل ہو کر رہنا برداشت کرے یا اسے مٹی میں چھپا دے، یعنی زندہ فنن کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے خصوصاً متوجہ کرنے کے لیے فرمایا ”أَلَا“ سن لو، خبردار ہو جاؤ، یہ دونوں فیصلے ہی بہت برے ہیں۔ لڑکی کو حقیر اور ذلیل کر کے رکھنا بھی اور اسے زندہ درگور کرنا بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد دینے یا نہ دینے کے متعلق چار قسمیں بنائیں، سب سے پہلے لڑکیوں کو اپنا ہیہ اور عطیہ

لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۗ وَاللَّهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۵۹﴾
 وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ وَ لَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ
 مُّسَمًّى ۗ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۗ وَ لَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿۶۰﴾

ان لوگوں کا جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، بہت برا حال ہے اور اللہ کی سب سے اونچی صفت ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۵۹﴾ اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے پکڑے تو اس کے اوپر کوئی چلنے والا نہ چھوڑے اور لیکن وہ انہیں ایک مقرر وقت تک ڈھیل دیتا ہے، پھر جب ان کا وقت آجاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں ﴿۶۰﴾

قرار دیا، فرمایا: ﴿يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ إِنَاطًا وَيَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذُّكُورَ ۚ أَوْ يَزُوْجَهُمْ ذُكْرًا ۚ وَإِنَاطًا ۚ وَيَجْعَلُ مَن يَشَاءُ عَقِيْبًا ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيْرٌ﴾ [الشوری: ۴۹، ۵۰] ”وہ جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے عطا کرتا ہے، یا انہیں ملا کر بیٹے اور بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے، یقیناً وہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔“ اسلام میں بیٹیوں کی پرورش کا اجر بہت بیان کیا گیا، تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ شوریٰ کی آیت (۵۰) کی تفسیر۔

آیت 60 لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ..... : ”مَثَلُ“ کا معنی کسی چیز کے مشابہ چیز بھی ہے، ضرب المثل، یعنی کہادت بھی اور صفت اور حال بھی۔ یہاں اکثر مفسرین نے صفت معنی کیا ہے، یعنی وہ مشرکین جن کا اوپر ذکر ہوا، آخرت، حساب کتاب اور جزا و سزا پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے ان کا بہت برا حال ہے جو قباحت کی انتہائی مثال ہے، اسی وجہ سے وہ اتنے بے وقوف اور سنگ دل ہو گئے ہیں کہ فرضی خداؤں کے لیے اپنی آمدنی کا ایک حصہ مقرر کرتے ہیں، بیٹیوں کو نہایت حقارت سے دیکھتے ہیں، انہیں زندہ درگور کر دیتے ہیں، حالانکہ بڑھاپے اور کمزوری میں انھی کے محتاج ہوتے ہیں، اپنے لیے بیٹیوں کی پیدائش پر فخر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیوں کے بجائے بیٹیاں بتاتے ہیں۔ فرشتوں کی عبادت کرتے اور انہیں اللہ کی بیٹیاں بتاتے ہیں۔ یہ چند روزہ زندگی سے دھوکا کھانے اور آخرت پر ایمان نہ ہونے کا نتیجہ ہے، اگر انہیں اللہ کے سامنے پیش ہونے کا اور آخرت کی کبھی ختم نہ ہونے والی زندگی کا یقین ہوتا تو ظلم کی ان صورتوں میں سے ایک کی بھی جرأت نہ کرتے۔ اور اللہ کی صفت تو سب سے اونچی ہے، اس کی مثل کوئی چیز نہیں، وہ واحد ہے، احد ہے، اولاد اور والدین سے پاک ہے۔ صرف وہی تمام صفات کمال، جمال اور جلال کا مستحق ہے اور وہی سب پر غالب ہے، زبردست ہے، مگر کمال درجے کا حکیم بھی ہے، وہ اپنے غلبے کو اندھے کی لالچی کی طرح نہیں بلکہ نہایت حکمت سے عمل میں لاتا ہے۔

آیت 61 ﴿۱﴾ وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ..... : ”يُؤَاخِذُ“ یہاں ”يَأْخِذُ“ کے معنی میں ہے، باب مفاعله اس لیے استعمال کیا ہے کہ اس میں پوچھ گچھ کا مفہوم بھی واضح ہوتا ہے۔ ظلم سے مراد کسی چیز کو اس کی جگہ کے علاوہ رکھنا ہے، سب

وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ مَا يَكْرَهُونَ وَتَصِفُ أَلْسِنَتُهُمُ الْكُذِبَ أَنَّ لَهُمُ الْحُسْنَىٰ لَا جَرَمَ أَنَّ
لَهُمُ النَّارَ وَأَنَّهُمْ مُّفْرَطُونَ ﴿۳۱﴾

اور وہ اللہ کے لیے وہ چیز تجویز کرتے ہیں جسے وہ (خود) ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ بے شک انھی کے لیے بھلائی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ انھی کے لیے آگ ہے اور یہ کہ وہ سب سے پہلے (اس میں) پہنچائے جانے والے ہیں ﴿۳۱﴾

سے بڑا ظلم شرک ہے، پھر اللہ کی کسی حد سے تجاوز کرنا اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرنا ظلم کی مختلف صورتیں ہیں۔ یہی بات سورہ فاطر کی آخری آیت میں بیان فرمائی ہے۔

﴿۳۱﴾ ”النَّاسُ“ سے مراد یا تو کافر و مشرک ہیں، یا سارے ہی انسان مراد ہیں، خواہ کتنے نیک ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر اور اس کے احکام کی پوری ادائیگی کوئی بھی نہ کر سکا ہے نہ کر سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا لَنَا يَفْضُ مَا أَعْرَضُ﴾ [عبس: ۲۳] ”ہرگز نہیں، ابھی تک اس نے وہ کام پورا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا۔“ یہ اللہ کا کرم ہے کہ دنیا میں نیک و بد سب کو ایک وقت تک مہلت ملی ہوئی ہے۔ لیکن اگر کبھی دنیا میں اللہ کی گرفت آجائے تو سب نیک و بد، حتیٰ کہ چرند پرند وغیرہ بھی اس کی پیٹ میں آجاتے ہیں، سوائے اس کے جس پر اللہ رحم کرے، پھر قیامت کے دن ہر ایک سے اس کے اپنے ایمان اور نیت و عمل کے مطابق معاملہ ہوگا۔ اس مفہوم کی حدیث کے لیے دیکھیے صحیح بخاری کی ”کِتَابُ الْبَيْعِ“ بَابُ مَا ذُكِرَ فِي الْأَسْوَاقِ (۲۱۱۸) ”میں اس لشکر کا ذکر جو کعبہ پر حملہ کے لیے آئے گا۔“

آیت 62 ﴿۱﴾ وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ مَا يَكْرَهُونَ : مثلاً یہ مشرک اپنے لیے پسند نہیں کرتے کہ ان کی ملکیت کا کوئی دوسرا بھی مالک بنے، مگر اللہ کی ملکیت میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ (دیکھیے روم: ۲۸) اپنے قاصد کی تکریم چاہتے ہیں مگر اللہ کا پیغام لانے والوں سے ٹھٹھا کرتے ہیں، اپنے لیے گالی برداشت نہیں کرتے مگر اللہ کو گالی دیتے ہیں، مثلاً یہ کہنا کہ اللہ کی اولاد ہے، اس کے لیے گالی ہے اور کئی بد بخت ایسے ہیں کہ اللہ نے انھیں سب کچھ دیا اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کو صاف گالیاں دیتے ہیں، پھر اپنے لیے بیٹے اور اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔ غرض جو کچھ وہ اپنے غلاموں کی طرف سے اپنے لیے پسند نہیں کرتے، اللہ کے غلام بلکہ مخلوق ہو کر وہ ساری بد تمیزیاں اس کے ساتھ کرتے ہیں، وہ پھر بھی صبر کرتا ہے اور مہلت دیتا ہے۔ (سبحان اللہ)

﴿۲﴾ وَتَصِفُ أَلْسِنَتُهُمُ الْكُذِبَ : کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا میں چین اور خوش حالی ملی ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کا ہم پر خوش ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لیے اگر آخرت واقعی ہوئی تو وہاں ہمیں یہ سب کچھ ملے گا۔ دیکھیے سورہ مریم (۷۷ تا ۸۰)، سورہ طہ السجدہ (۵۰) اور سورہ کہف (۳۶)۔

﴿۳﴾ وَأَنَّهُمْ مُّفْرَطُونَ: ”مُفْرَطُونَ“ باب افعال سے اسم مفعول ہے۔ ”فَرَطَ“ اسے کہتے ہیں جسے کوئی قوم اپنے سے پہلے

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰى اَمْرِ قِنْ قَبْلِكَ فَرِزَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمٰلَهُمْ فَهَوَ وَاٰلِيَهُمُ الْيَوْمَ
 وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳۳﴾ وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اٰخْتَلَفُوْا فِيْهِ
 وَ هُدًى وَ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۴﴾

اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے بہت سی امتوں کی طرف رسول بھیجے تو شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال خوشنما بنا دیے۔ سو وہی آج ان کا دوست ہے اور انہی کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۳۳﴾ اور ہم نے تجھ پر کتاب نازل نہیں کی، مگر اس لیے کہ تو ان کے لیے وہ بات واضح کر دے جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے اور ان لوگوں کی ہدایت اور رحمت کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ﴿۳۴﴾

بھیج دے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ» [بخاری، الرفاق، باب فی الحوض: ۶۵۷۵، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ] "میں حوض پر تم سے پہلے جا کر تمہارے لیے ضروریات کا بندوبست کرنے والا ہوں۔" یعنی کوئی شک نہیں کہ انہی کے لیے آگ ہے اور یہ مشرک دوسرے گناہ گاروں سے پہلے وہاں پہنچائے جانے والے ہیں۔ "مُفْرَطُونَ" کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ وہ دوزخ میں جھونک دیے جانے کے بعد وہیں چھوڑ دیے جائیں گے اور انھیں قطعی فراموش کر دیا جائے گا، وہیں پڑے سڑتے رہیں گے، فرمایا: ﴿وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنْسُكُمْ كَمَا نَسَيْتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا﴾ [الحاثیہ: ۳۴] "اور کہہ دیا جائے گا کہ آج ہم تمہیں بھلا دیں گے جیسے تم نے اپنے اس دن کے ملنے کو بھلا دیا۔" عرب کہتے ہیں: "مَا أَفْرَطْتُ وَرَأَيْتِي أَحَدًا" "میں نے اپنے پیچھے کسی کو نہیں چھوڑا۔" مفسرین نے دونوں معانی بیان کیے ہیں اور دونوں باتیں ایک ہی وقت میں ہو سکتی ہیں۔

آیت 63 ① تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی قسم کھا کر فرمایا اور اپنی عظمت کے اظہار کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا کہ "ہم" نے رسول بھیجے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو ایک ہے۔

② فَرِزَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمٰلَهُمْ: تو شیطان جو ازلی دشمن تھا، اس نے ان کے وہی برے اعمال جو وہ کرتے تھے، مثلاً کفر و شرک اور دوسری کمینگیاں، وہ ان کے لیے ایسے خوش نما اور خوبصورت بنا دیے کہ انہوں نے سمجھا ہم بہت اچھے کام کر رہے ہیں، چنانچہ اسی دھوکے میں انہوں نے رسولوں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

③ فَهَوَ وَاٰلِيَهُمُ الْيَوْمَ: تو وہی جو ہمیشہ کا دشمن تھا آج ان کا دوست بن گیا اور ظاہر ہے کہ جہاں ان کا دوست جائے گا اس کے ساتھ ہی وہ بھی عذاب الیم میں جائیں گے۔ ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ شیطان جو پہلی کافر قوموں کا دوست بنا تھا آج ان کفار عرب کا بھی وہی دوست ہے اور ان کا نتیجہ بھی وہی ہے جو ان کا ہوا۔ مقصد آپ ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ آپ ان کفار کی حرکتوں سے رنجیدہ اور کبیدہ خاطر نہ ہوں، پہلے بھی ایسے ہوتا رہا ہے۔

آیت 64 : وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ پہلی امتوں کی طرح اس وقت بھی جو لوگ شیطان کے خوش نما پھندوں میں

وَاللّٰهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً

لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿۵۰﴾

اور اللہ نے آسمان سے کچھ پانی نازل کیا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیا۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً ایک نشانی ہے جو سنتے ہیں ﴿۵۰﴾

گرفتار ہیں، ان کے لیے ہر اختلاف کا فیصلہ کرنے کے اصل حقیقت کھول کر بیان کرنے ہی کے لیے ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ پر کتاب نازل کرنے کا مقصد ان تمام چیزوں کی تمہین و وضاحت بھی ہے جس میں لوگ خود فیصلہ نہیں کر سکتے، اس لیے قرآن کی ہر بات کی تفصیل رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و عمل اور تقریر سے فرمائی، ورنہ اللہ کی عبادت نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ غرض سب کچھ اختلاف کی نذر ہو جاتا، لوگ ایک طریقے پر متفق ہی نہ ہو سکتے، نہ کتاب اللہ پر عمل ہو سکتا۔ منکرین حدیث نبی ﷺ کی وضاحت کو ماننے کے لیے تیار نہیں، اس لیے وہ اس ہدایت اور رحمت سے بھی محروم ہیں جو اس کتاب سے اور نبی ﷺ کی تمہین و وضاحت سے اہل ایمان ”لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ“ کو حاصل ہوتی ہے اور درحقیقت وہ قرآن کو بھی نہیں مانتے، ورنہ قرآن کی متعدد آیات میں رسول اللہ ﷺ کو ہر جھگڑے اور اختلاف میں فیصلہ ماننے، ان کا اتباع کرنے اور ان کی اطاعت کرنے کا حکم موجود ہے۔ مزید دیکھیے اسی سورت کی آیت (۸۹)۔

آیت 65 ① وَاللّٰهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً..... ”السَّمَاءُ“ ”سَمَوٌ“ سے مشتق ہے جس کا معنی بلندی ہے، اس لیے ہر اونچی چیز کو ”سَمَاءُ“ کہہ لیتے ہیں۔ یہاں مراد بلندی سے اتارنا بھی ہو سکتا ہے اور بادل سے بھی۔ یہاں پانی کی نعمت کی طرف توجہ دلائی ہے جو زندگی کا اصل ہے، فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَلْحًا سَمِيًّا﴾ [الانبیاء: ۳۰] ”اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی۔“ یعنی زمین مردے کی طرح خشک پڑی تھی، نہ اس میں زندگی کے کوئی آثار تھے، نہ گھاس پھوس، نہ پھول پتیاں اور نہ کڑے مکڑے، اتنے میں بارش ہوئی اور وہ دیکھتے دیکھتے چند دنوں میں ہری بھری اور تر و تازہ ہو گئی اور اس میں ہر قسم کی سرسبزی اور شادابی آگئی اور جگہ جگہ پانی کے چشمے پھوٹنے لگے، گویا مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔ یہ مضمون سورہ حج کی آیت (۶، ۵) میں تفصیل سے بیان ہوا ہے، وہاں اس کی تین حکمتیں بیان ہوئی ہیں اور دیکھیے سورہ روم (۵۰) اور سورہ لیس (۳۳، ۳۴)۔

② إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ: اس سے وہ باسانی سمجھ سکتے ہیں کہ جو مالک زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندگی عطا فرما سکتا ہے، وہ انسانوں کو بھی ان کے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کر سکتا ہے، اس کے لیے کوئی چیز مشکل نہیں۔ سننے سے مراد انصاف اور غور سے سنا ہے، کیونکہ جو دل سے نہ سنے سمجھو بہرا ہے، جسے سنائی نہیں دیتا، فرمایا: ﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ وَالَهُمْ أُذُنٌ لَا يُسْمَعُونَ بِهَا ۗ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ [الأعراف:

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَ دَمٍ لَبِئَآءٌ

خَاصًّا سَائِبًا لِلشَّرْبِ ۚ ﴿٦٦﴾

اور بلاشبہ تمہارے لیے چوپاؤں میں یقیناً بڑی عبرت ہے، ہم ان چیزوں میں سے جو ان کے پیٹوں میں ہیں، گوبر اور خون کے درمیان سے تمہیں خالص دودھ پلانے کے لیے دیتے ہیں، جو پینے والوں کے لیے حلق سے آسانی سے اتر جانے والا ہے ﴿۶۶﴾

۱۷۹] ”ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے نہیں، یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں، بلکہ یہ زیادہ بھلے ہوئے ہیں۔“

تہ 66 ﴿۱﴾ وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً.....: ”الأنعام“ لفظاً مفرد ہے، افعال کا وزن یہاں جمع کے لیے نہیں بلکہ یہ اسم جمع ہے، جیسے ”زَهْطٌ“، ”قَوْمٌ“ اور ”بَقَرٌ“ وغیرہ۔ یہاں لفظ کی رعایت سے اس کے لیے واحد مذکر کی ضمیر ”بُطُونِهِ“ لائی گئی ہے، سورہ مومنون (۲۱) میں ”نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِنَا“ جمع کے معنی کی رعایت سے مؤنث کی ضمیر لائی گئی ہے۔ ”الأنعام“ اصل میں اونٹوں کو کہتے ہیں، کیوں وہ بہت بڑی نعمت ہیں، اس کے ساتھ گائے اور بھینس بکری کو بھی ”الأنعام“ کہہ لیتے ہیں۔ سورہ انعام (۱۳۳، ۱۳۴)، میں ان کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ ”عِبْرَةٌ“ میں تئوین تعظیم کی ہے، بہت بڑی عبرت، معنی ہے عبور کرنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا، ایک چیز سے ایسی نصیحت حاصل کرنا جو دوسری جگہ کام دے۔ ”نُسْقِيكُمْ“ قرآن میں ”سَقَى“ اور ”أَسْقَى“ دونوں لفظ آئے ہیں، اکثر لوگ ان کا ایک ہی معنی کر دیتے ہیں، جبکہ ان میں فرق ہے، ”سَقَى يَسْقِي“ پلانا اور ”أَسْقَى يُسْقِي“ پلانے کے لیے دینا، یعنی ہم تمہیں پلانے کے لیے دیتے ہیں، خود پی لویا کسی کو پلا دو۔ ”فَرْثٌ“ چوپاؤں کی ہضم شدہ خوراک جب تک اوجھڑی میں رہے، جب باہر نکلے تو اسے ”رَوْثٌ“ کہتے ہیں۔ ”لَبِئَآءٌ خَاصًّا“ گوبر کی بو اور رنگ اور خون کی سرخی دونوں سے خالص، سفید اور لذیذ دودھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کتنی عظیم نشانی ہے، کوئی ہے جو گوبر اور خون میں سے خالص دودھ کشید کر سکے؟ ”سَائِبًا لِلشَّرْبِ ۚ“ ”سَاعٌ يَسُوعٌ“ جو آسانی سے حلق میں اتر جائے۔ دودھ ایک مکمل غذا ہے، اس لیے بچے کی مکمل پرورش کے لیے دودھ ہی کافی ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے معراج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ پھر میرے پاس شراب کا ایک برتن اور دودھ کا ایک برتن اور شہد کا ایک برتن لایا گیا تو میں نے دودھ کو پسند کیا تو جبریل علیہ السلام نے فرمایا، یہ فطرت ہے، آپ بھی اس پر ہیں اور آپ کی امت بھی۔ [بخاری، الأشریة، باب شرب اللبن.....: ۵۶۱۰، عن انس بن مالك ؓ] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ثَلَاثٌ لَا تَرُدُّ الْوَسَائِدَ وَاللَّهُنَّ وَاللَّبَنُ﴾ [ترمذی الأدب، باب ما جاء في كراهية رد الطيب: ۲۷۹۰، عن ابن عمر ؓ]۔ سلسلۃ الأحادیث الصحیحہ: ۱۱۸/۲، ح: ۶۱۹] ”تین چیزیں رد نہیں کی جاتیں، گاؤ تیلے، تیل (خوشبو) اور دودھ۔“

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنے اکیلے معبود ہونے اور مخلوق کو دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل کے لیے چوپاؤں میں سے ایک چیز کا ذکر

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۷۰﴾ وَ أَوْسَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا

اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی، جس سے تم نشہ آور چیز اور اچھا رزق بناتے ہو۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً ایک نشانی ہے جو سمجھتے ہیں ﴿۷۰﴾ اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ کچھ پہاڑوں میں سے گھر

فرمایا۔ دیکھیے وہ گھاس اور چارا جو حیوان کھاتے ہیں، وہ پانی اور مٹی سے پیدا ہوتا ہے۔ مٹی اور پانی کو گھاس اور چارے میں بدلنا، پھر جانور کے پیٹ میں اسے خون سے بدلنا، پھر اسے دودھ میں بدلنا کس قدر باعث عبرت ہے کہ اللہ تعالیٰ پوری طرح قادر ہے کہ تمام چیزوں کو ایک حالت سے دوسری جس حالت میں چاہے بدل دے۔

آیت 67 ﴿۱﴾ وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ..... : ”النَّخِيلُ“ اور ”النَّحْلُ“ اسم جنس ہیں، کھجور کا درخت۔ اگر

ایک درخت واضح کرنا ہو تو ”نَخْلٌ“ لگا دیتے ہیں، ”نَخِيلَةٌ“ اور ”نَخْلَةٌ“۔ ”نَخْلٌ يَنْحُلُ“ کا معنی ہے چھان کر عمدہ حصہ الگ کرنا، چھاننا۔ اس لیے بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ چونکہ کھجور پھلوں میں منتخب ترین پھل ہے، اس لیے اسے ”نَخِيلٌ“ کہتے ہیں۔ اس کے پھل کے مختلف وقتوں کے لحاظ سے الگ الگ نام ہیں، ”الْبَلَّحُ“ پھر ”الْبَسْرُ“ پھر ”الْبُرْطُ“ پھر ”الْبَسْرُ“۔ اس لیے اس کے درخت کا نام لیا اور انگور کے پھل کا نام جمع کے ساتھ ”الْأَعْنَابُ“ لیا، کیونکہ انگور کی بے شمار قسمیں ہیں، البتہ اس کی نسل کو عربی میں ”الْكَرْمُ“ کہتے ہیں۔ ”سُكْرًا“ نشہ آور چیز، یہ ”سُكْرٌ“ اور ”سُكْرٌ“ دونوں طرح پڑھا جاتا ہے، جیسے ”رَشْدًا“ اور ”رَشْدًا“

﴿۲﴾ دودھ والے جانوروں کے بعد پھلوں کی نعمت ذکر فرمائی۔ عرب میں یہ دو پھل زیادہ تھے، پھر یہ تازہ بھی کھائے جاتے ہیں اور ذخیرہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ان سے بے شمار مصنوعات بھی بنتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے بنائی ہوئی چیزوں کو دو قسمیں قرار دیا، ایک نشہ آور اور ایک رزق حسن۔ اس سے اشارہ فرمایا کہ نشہ بھی اگرچہ فائدے سے خالی نہیں مگر وہ اچھا رزق نہیں۔ یہ آئندہ شراب کی حرمت کی تمہید ہے اور بطور نعمت اس لیے ذکر کیا کہ مکہ میں شراب حلال تھی اور یہ سورت مکی ہے۔

﴿۳﴾ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ : رزق حسن میں لذت و قوت تو ہے، مگر سکر کی طرح عقل سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا نقصان نہیں، یہ بات عقل والے ہی سمجھتے ہیں۔

آیت 68-69 ﴿۱﴾ وَ أَوْسَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ : وحی کا اصل معنی تو اشارہ سربوہ ہے، یعنی خفیہ طریقے سے بات سمجھا دینا، جو

دوسرا نہ سمجھے۔ یہاں مراد الہام ہے، یعنی دل میں ڈال دینا۔ شہد کی مکھی اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے، اس لیے عرب زبان میں اس کا نام ہی ”النَّحْلُ“ رکھا گیا، جو ”نَحْلٌ يَنْحُلُ“ (ف) کا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، اس کا معنی عطیہ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَتُوا النِّسَاءَ صَدَقْتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ [النساء: ۴] ”اور عورتوں کو ان کے مہر بطور عطیہ (خوش دلی سے) دو۔“ اللہ تعالیٰ نے انسان بلکہ ہر مخلوق کی طبیعت اور فطرت میں اس کے فائدے اور نقصان کی پہچان رکھ دی ہے۔

وَمِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُونَ ﴿۵۸﴾ ثُمَّ كُلُّ مِنْ كُلِّ الشَّجَرِ فَاسْلِكِ سُبُلَ رَبِّكِ

بنانا اور کچھ درختوں میں سے اور کچھ اس میں سے جو لوگ چھپر بناتے ہیں ﴿۵۸﴾ پھر ہر قسم کے پھلوں سے کھا، پھر اپنے رب

سببی وہ فطری رہنمائی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہٴ غشس میں فرمایا: ﴿وَتَقْوِسَ وَمَا سَوَّيْنَا لَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوِيَهَا﴾ [الشمس: ۷، ۸] ”اور نفس کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ٹھیک بنایا! پھر اس کی نافرمانی اور اس کی پرہیزگاری (کی پہچان) اس کے دل میں ڈال دی۔“ البتہ انسان اور دوسری مخلوق کا فرق یہ ہے کہ دوسرے سب فطری ہدایت کے پابند رہتے ہیں، مثلاً جانوروں کو دیکھ لیں، جب ان کا پیٹ بھر جائے تو مجال نہیں کہ ایک لقمہ بھی کھائیں۔ گدھا جسے سب سے کد ذہن سمجھا جاتا ہے، اللہ کی فطری ہدایت کے تحت بچے کو بھی سوار کر لیتا ہے اور پانی کا نالہ آنے پر ٹھہر کر اندازہ کرتا ہے، اگر پار کر سکتا ہو تو چھلانگ لگائے گا ورنہ نہیں۔ یہ انسان ہی ہے جو فطرت کی ہدایت کو جب چاہتا ہے عمل میں لاتا ہے، نہیں چاہتا تو عمل میں نہیں لاتا، کئی دفعہ اتنا کھا جاتا ہے کہ بدحضمی یا بیضے کا شکار ہو جاتا ہے۔

﴿۵۹﴾ اِنَّا نَخْلُقُ مِنْ الْجِبَالِ بَيْوتًا : ”يَعْرِشُونَ“ چھپر بنانے سے مراد گھروں کے باہر یا کھیتوں میں بیٹھنے کے لیے سائے والے چھپر بھی ہیں اور بانسوں اور سرکنڈوں وغیرہ کے وہ کھلے چھپر بھی جو انگوروں کی بیلیں چڑھانے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ ”ہین“ تینوں جگہ تعبیض کے لیے ہے، یعنی ہر پہاڑ، درخت اور چھپر گھر بنانے کے قابل نہیں، ان میں سے مناسب جگہوں کا انتخاب کرو۔ اس کے بعد کھانے پر کوئی پابندی نہیں، ہر پھل میں سے کھاؤ، یعنی ”ثُمَّ كُلِّ مِنْ كُلِّ الشَّجَرِ“ یہ امر اباحت کے لیے ہے، وچوب کے لیے نہیں کہ ضرور ہی ہر پھل میں سے کھاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ جو چاہو کھاؤ، جیسے کہتے ہیں حرام چھوڑ کر ہر چیز کھاؤ، یعنی تمہیں اجازت ہے۔ اس حکم کی تعمیل مشاہدے میں بھی آئی ہے کہ کھیاں پہلے اپنا چھتا بناتی ہیں، پھر خوراک کے لیے نکلتی ہیں۔

﴿۶۰﴾ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی فطرت میں اس کے نفع نقصان کی سمجھ رکھ دی ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقًا ثُمَّ هَدَى﴾ [طہ: ۵۰] ”ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی، پھر راستہ دکھایا۔“ مگر شہد کی مکھی کا خاص طور پر الگ ذکر بھی فرمایا: ﴿وَ أَوْسَخِي رَبَّنَا إِلَى النَّحْلِ﴾ ”اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی فرمائی۔“ اس لیے اہل علم نے اس کے گھر بنانے، اس کے نظام زندگی اور شہد بنانے کے عمل پر بہت تحقیق کر کے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ یہ چھوٹا سا جانور باقاعدہ ایک منظم حکومت کے تحت رہتا ہے۔ پورے چھتے کی ایک ہی ملکہ ہوتی ہے، جس کے حکم اور تقسیم کار کے مطابق تمام کھیاں عمل کرتی ہیں۔ یہ ملکہ دوسری مکھیوں سے قد و قامت اور وضع قطع میں ممتاز ہوتی ہے۔ کھیاں اس کے لیے خاص غذا مہیا کرتی ہیں، جسے ”غذاء الملکہ“ کہتے ہیں، جو نہایت مقوی ہوتی ہے۔ یہ ملکہ تین ہفتوں میں چھ ہزار سے بارہ ہزار تک انڈے دیتی ہے۔ اس کے حکم اور فرائض کی تقسیم کے مطابق تمام کھیاں الگ الگ کام سرانجام دیتی

ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ بَطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ

کے راستوں پر چل جو مسخر کیے ہوئے ہیں۔ ان کے پیٹوں سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہیں، اس

ہیں۔ کچھ دربان ہوتی ہیں جو کسی انجمنی کو اندر نہیں آنے دیتیں، کچھ انڈوں کی حفاظت کرتی ہیں، کچھ نئے نکلنے والے بچوں کی تربیت کرتی ہیں، کچھ موم کے ساتھ چھتا بنانے کے لیے سمداری کا کام کرتی ہیں، کچھ وہ ہیں جو انھیں موم پہنچاتی ہیں۔ بعض سپاہی ہوتی ہیں، جن کا کام چھتے کی حفاظت اور دشمن کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے، کچھ پھولوں اور پھلوں سے رس چوستی ہیں جو ان کے پیٹوں کے کارخانے میں شہد بنتا ہے، وہ کھبیوں اور ان کے بچوں کے لیے خوراک اور انسان کے لیے غذا دو دواتا ہے، جب کہ موم انسان کی متعدد ضروریات، مثلاً روشنی، علاج وغیرہ کے کام آتا ہے۔ ان کا چھتا بھی قدرت کی کارگیری کا عجیب نمونہ ہے، ہر خانہ مسدس (چھ ضلعوں والا) ہوتا ہے جو کھبی کے جسم کے عین مطابق (گول اور لمبا) ہوتا ہے اور ہر ضلع ایسا برابر کہ پرکار اور مسطر سے بھی کوئی فرق نہیں نکلے گا۔ مسدس بنانے میں یہ حکمت ہے کہ گول یا مربع یا کسی بھی اور شکل کا ہوتا تو یا گھر کے اندر کھبی کے جسم سے زائد جگہ بچ جاتی یا گھروں کے باہر درمیان میں جگہ بچ جاتی۔ یہ کھبیاں صفائی کا نہایت اہتمام رکھتی ہیں، اپنے فضلے کے لیے الگ جگہ مقرر رکھتی ہیں۔ چھتے سے فضلہ ساتھ ہی ساتھ باہر نکالتی رہتی ہیں۔ ہمیشہ صاف پانی پیتی ہیں۔ کوئی گندگی سے آلودہ کھبی آجائے تو دربان اندر نہیں جانے دیتے، بلکہ انھیں مار دیا جاتا ہے۔ بے کار کھبیوں کو بھی قتل کر دیا جاتا ہے، اگر کوئی کھبی مر جائے تو فوراً اسے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ گرمی کی شدت سے شہد گرنے کا خطرہ ہوتو پروں سے ہوا دے کر اسے ٹھنڈا رکھتی ہیں۔ ملکہ کھبی کے علاوہ کوئی اور ملکہ ظاہر ہوتو اسے قتل کر دیا جاتا ہے، تاکہ نظام میں خرابی پیدا نہ ہو۔ جیسا کہ ایک خلیفہ کی موجودگی میں دوسرے دعوے دار کو قتل کرنے کا حکم ہے۔ [دیکھیے مسلم، الأمانة، باب حکم من فرق امر المسلمین.....: ۱۸۵۲/۶۰] غرض ایک عجیب منظم سلطنت ہے جو انسان کے فائدے کی خاطر مصروف عمل ہے۔

④ فَاسْتَلْقَىٰ سُبُلَ رَبِّكَ ذُلُلًا : ”ذُلُلًا“ ”ذُلُولًا“ کی جمع ہے، جس کا معنی مطیع اور مسخر ہے اور یہ ”سُبُلًا“ سے حال ہے، یعنی گھر بنانے کے بعد شہد بنانے والی کھبیاں دن کو نکلتی ہیں اور بعض اوقات پھولوں اور پھلوں کی تلاش میں بہت دور نکل جاتی ہیں، پھر پیٹ میں پھلوں کا رس اور پاؤں میں موم کا مادہ لے کر دن بھر میں کئی چکر اپنے گھر کی طرف لگاتی ہیں۔ رات کو دوبارہ اپنے چھتے میں واپس آ جاتی ہیں۔ اتنی دور سے ٹھیک اسی جگہ واپس آنا ممکن نہ تھا، مگر یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرم ہے کہ اس نے کھبیوں، شہروں، صحراؤں اور پہاڑوں کے دور دراز اور بے نشان راستے اس کے لیے ایسے آسان اور مسخر کر دیے ہیں کہ وہ انھی پر واپس پلٹ کر عین اپنے چھتے میں پہنچ جاتی ہے، کبھی دوسرے چھتے میں نہیں جاتی۔ ”فَاسْتَلْقَىٰ سُبُلَ رَبِّكَ ذُلُلًا“ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ تیرے رب نے شہد بنانے کے لیے جو جو مرحلے اور طریقے رکھے ہیں، وہ سب تیری دسترس میں کر دیے ہیں، سو تو ان پر چلتے ہوئے شہد تیار کر۔

⑤ يَخْرُجُ مِنْ بَطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ : ”شَرَابٌ“ یعنی مشروب، اس سے معلوم ہوا کہ شہد اصل میں پینے کی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

لَا يَأْتِيَنَّ الْقَوْمَ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۹﴾

میں لوگوں کے لیے ایک قسم کی شفا ہے۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً ایک نشانی ہے جو غور و فکر کرتے ہیں ﴿۱۹﴾ چیز ہے، خالص پی لو یا دودھ یا پانی وغیرہ ملا کر۔ پھلوں، پھولوں، موسم اور علاقے کے لحاظ سے شہد مختلف رنگوں، ذائقوں اور خاصیتوں کا حامل ہوتا ہے، جبکہ دودھ سفید ہی ہوتا ہے، یہ بھی پروردگار کی کاریگری ہے۔

﴿۱۹﴾ فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ : اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت ہے کہ ایک زہریلے کیڑے کے پیٹ میں تیار ہونے والے مشروب میں لوگوں کے لیے شفا رکھ دی ہے۔ یہاں ”شِفَاءٌ“ نکرہ ہے جو اثبات کے تحت آیا ہے، اس لیے اس کا ہر مرض کے لیے شفا ہونا تو واضح نہیں ہوتا۔ اسی طرح ”لِّلنَّاسِ“ کا الف لام بھی جنس یا استغراق کے لیے مانیں تو سب لوگوں کے لیے شفا مراد ہوگی، عہد کے لیے مانیں تو پھر انہی کے لیے شفا ہوگی جن کا علاج شہد سے ہو سکتا ہے۔ ”شِفَاءٌ“ میں تخوین کا ترجمہ بڑی شفا بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال شہد چونکہ بے شمار پھولوں اور پھلوں کا خلاصہ ہے، جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی بیماری کا علاج ہے، اس لیے شہد میں ہر بیماری کا علاج ہونا کچھ بعید نہیں۔ جس طرح اب کئی ہو میو اور دوسرے ڈاکٹر ایک ہی وقت میں بہت سی دواؤں کا مجموعہ دے دیتے ہیں کہ کوئی دوا تو بیماری کے مطابق ہوگی۔ غرض شہد اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، اس میں لذت بھی ہے اور شفا بھی۔ شہد میں ایک خوبی یہ ہے کہ وہ نمی کو جذب کرتا ہے اور اس میں جراثیم زندہ نہیں رہ سکتے، اس لیے زخم اور پھوڑے پر لگانے سے وہ درست ہو جاتا ہے۔ آنکھوں اور پیٹ کی بیماریوں کا علاج ہے، رسول اللہ ﷺ کے اسہال (دستوں) کے مریض کو بار بار شہد پلانے اور آخر کار اس کے تندرست ہونے کی حدیث صحیح بخاری (۵۷۱۶) میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت اور احادیث سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ شہد ہر بیماری کا علاج ہے، مگر ہر بیماری کے لیے اس کی مقدار خورداک اور طریق استعمال تجربے اور تحقیق ہی سے طے ہو سکتے ہیں جو اطباء کا کام اور ان کی ذمہ داری ہے، مگر افسوس کہ اس پر مسلمان اطباء نے اتنی محنت نہیں کی کہ اس خزانے سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکتے، البتہ اس کی ایک خاصیت سے تمام مسلم اطباء شروع سے فائدہ اٹھاتے آئے ہیں، وہ یہ کہ اس میں رکھی ہوئی چیز محفوظ ہو جاتی ہے، خراب نہیں ہوتی، اس لیے وہ تمام مچھلیوں، خمیرے اور جوارشیں محفوظ رکھنے کے لیے سیکڑوں برس سے شہد میں بناتے آرہے ہیں، جس سے وہ دواؤں کو محفوظ رکھنے کے لیے بالکل جیسی حرام چیز کے محتاج نہیں ہوئے۔ (والحمد للہ)

﴿۲۰﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لٰآيٰةٍ : شہد کی مکھی کے احوال سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت کا علم غور و فکر کرنے والوں ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ شاہ عبد القادر رزق لکھتے ہیں: ”تین پتے بتائے برے میں سے بھلا نکلنے کے: ﴿۱﴾ جانور کے پیٹ سے دودھ۔ ﴿۲﴾ نشے کے انگور اور کھجور سے پاک روزی۔ ﴿۳﴾ اور مکھی کے پیٹ سے شہد۔ یعنی اس قرآن سے جاہلوں کی اولاد عالم نکلے گی، رسول اللہ ﷺ کے وقت میں یوں ہی ہوا، کافروں کی اولاد کامل ہوئی۔“ (موضح)

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ ۗ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُرَدُّ اِلَى الْاَرْضِ الْعَبْرِ لِكِي لَا يَعْلَمَ بَعْدَ
 عِلْمِ شَيْءٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝

اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا، پھر وہ تمہیں فوت کرتا ہے اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو سب سے نئی عمر کی طرف لوٹا جاتا ہے، تاکہ وہ جان لینے کے بعد کچھ نہ جانے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قادر ہے ۝

آیت 70 ۝ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ: بارش اور اس کے اثرات، چوپاؤں اور ان سے حاصل ہونے والے دودھ، کھجور اور انگور اور ان سے حاصل ہونے والی اشیاء اور شہد کی مکھی کی عجیب و غریب کارکردگی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل بیان کرنے کے بعد اب خود انسان کے اندر پائے جانے والے دلائل میں سے چند کا بیان فرمایا۔ اس آیت میں انسان کی زندگی کے چار پانچ دور مذکور ہیں۔ سب سے پہلے پیدائش، اس کے ساتھ فوت کرنے کا ذکر فرمایا، باقی ادوار کا بعد میں ذکر فرمایا، کیونکہ پیدائش کے بعد ہر شخص پر ان تمام ادوار کا گزرنا ضروری نہیں۔ وفات کبھی پیٹ ہی میں ہو جاتی ہے، کبھی زندگی کے کسی اور مرحلے میں۔ کچھ لوگ سب سے نئی عمر کی طرف لوٹا جاتے ہیں، جس میں انسان پھر بالکل بچپن والی حالت کی طرح کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کی بے بسی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اس کے ہوش و حواس سلب ہو جاتے ہیں اور جو کچھ سیکھا پڑھا تھا، یا زندگی میں گزرا تھا سب بھول جاتا ہے۔ ہر کام میں دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ بچپن اور ارذل العمر کے درمیان کے مرحلے ذکر نہیں فرمائے، کیونکہ وہ خود بخود سمجھ میں آ رہے ہیں۔ بچپن، لڑکپن جوانی، کمال قوت کو پہنچنا، ادھڑ عمر، بڑھاپا اور آخر میں ارذل العمر۔ اگر اللہ چاہے تو ان میں سے کسی مرحلے کو بھی ارذل العمر میں بدل دے۔ اس آیت کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ روم (۵۳) اور سورہ نیش (۶۸)۔

۝ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ : یہاں پیدائش کے بعد وفات کو بھی بطور آیت و نعمت ذکر فرمایا۔ آیت (انشائی) تو مومن و کافر ہر ایک کے لیے ہے، البتہ نعمت صرف مومن کے لیے ہے، خواہ وہ زندگی کے کسی مرحلے میں فوت ہو، کیونکہ نئی عمر سے اس کے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں اور زندگی کے جس دور میں بھی فوت ہو قید خانے سے نکلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الدُّنْيَا سَبْحَنُ الْمُؤْمِنِ وَحَتَّةُ الْكَافِرِ» [مسلم، الزهد والرفاق، باب الدنيا سحن للمؤمن وحنة للكافر: ۲۹۵۶، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] "دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے۔" پھر موت کے نعمت ہونے میں کیا شک ہے۔

۝ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "ان کلمات کے ساتھ پناہ مانگا کرو جن کے ساتھ نبی ﷺ پناہ مانگا کرتے تھے: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْحَيِّنِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْبَحْلِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ أُرْدُلِ الْعُمْرِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ» [بخاری، الدعوات، باب الاستعاذة من أُرْدُلِ الْعُمْرِ: ۶۳۷۴] "اے اللہ! میں بزودی سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ مجھے ارذل العمر (سب سے نئی عمر) کی طرف لوٹا جائے اور میں دنیا کی آزمائشوں اور قبر کے عذاب سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ، فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَأْدِي رِزْقِهِمْ
عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ۗ أَفَبِعِنْعَمَةِ اللَّهِ يُجْحَدُونَ ﴿٤٠﴾ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ
مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَ حَفَدَةً ۗ وَ رَزَقَكُمْ مِنْ

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فوقیت بخشی ہے، پس وہ لوگ جنہیں فوقیت دی گئی ہے کسی صورت اپنا رزق ان (غلاموں) پر لوٹانے والے نہیں جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ ہیں کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں، تو کیا وہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں ﴿۴۰﴾ اور اللہ نے تمہارے لیے خود تمہی میں سے بیویاں بنائیں اور تمہارے لیے

﴿۴۰﴾ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ : زندگی کے یہ تمام احوال اور موت کمال علم و قدرت کے بغیر کوئی پیدا نہیں کر سکتا اور وہ ہستی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔

﴿۵﴾ بعض اہل علم نے فرمایا کہ باعل علماء ازل العمر سے محفوظ رہتے ہیں، اگر ان کی عمر زیادہ ہو تب بھی ان کی عقل اور حافظہ قائم رہتے ہیں۔ اس کا اشارہ اس آیت کی بعض تفسیروں سے نکلتا ہے: ﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ﴿[النن: ۶۰، ۵]﴾ ”پھر ہم نے اسے لوٹا کر نیچوں میں سے سب سے نیچا کر دیا، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے۔“ شفق علی رحمۃ اور بہت سے محدثین کا سو سے زیادہ عمر کے باوجود عقل و حافظہ محفوظ رہا۔

آیت 71 ﴿۱﴾ وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ: یعنی جب تم اپنے غلاموں کو اپنے رزق اور اختیار کا کوئی حصہ دے کر اپنے برابر کرنے کے لیے تیار نہیں، حالانکہ انسان ہونے میں وہ بالکل تمہاری طرح ہیں، پھر اللہ کے عہد (غلاموں) کو اس کے شریک کیوں بناتے ہو؟ مکہ کے مشرکوں کی عقل کا ماتم سمجھیے جو حج و عمرہ پر لیکر لیتے ہوئے یہ اقرار کرنے کے بعد کہ تیرا کوئی شریک نہیں، پھر کہتے سوائے ایک شریک کے، جس کا مالک بھی تو ہے، وہ مالک نہیں۔ [مسلم، الحج، باب التلبیۃ و صفتھا.....: ۱۱۸۵] جب وہ مملوک ہے تو شریک کیسے بن گیا؟ تم اپنے لیے جو بات پسند نہیں کرتے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے کیوں تسلیم کرتے ہو۔

﴿۲﴾ اس آیت سے کیونستوں (اشتراکیوں) کے قول کی بھی واضح تردید ہوتی ہے کہ تمام لوگوں کے پاس ایک جیسا رزق ہونا چاہیے، جس کے پاس زائد ہو وہ چھین لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، یہ ممکن ہی نہیں، نہ کائنات کا نظام اس سے چل سکتا ہے نہ کبھی ایسا ہوا ہے، حتیٰ کہ کیونست حکام اور عوام کے معیار زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ مزید کئی آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے، دیکھیے سورہ روم (۲۸) اور سورہ زخرف (۳۲)۔

آیت 72 ﴿۱﴾ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا: ﴿حَفَدَةً﴾ ”حَفَدٌ يَحْفَدُ“ (ض) سے ”حَافِدٌ“ کی جمع ہے، خدمت اور اطاعت میں جلدی کرنے والا، جیسا کہ قنوت کی ایک دعا میں ہے: ﴿وَإِلَيْكَ نَسْعِي وَ نَحْفِيدُ﴾ [ابن خزیمہ: ۱۵۰/۱، ج: ۱۱۰۰] ”حَفِيدٌ“ کی جمع ”حَفَدَاتُ“ آتی ہے۔ ”حَافِدٌ“ اور ”حَفِيدٌ“ بیٹوں کو اور اولاد کی اولاد کو کہتے ہیں،

الْقَاتِلَاتِ ۚ اَقْبَابًا طَلِبِ يُؤْمِنُونَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُونَ ﴿۱۶﴾ وَ يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَبْلُغُ لَهُمْ رِزْقًا مِنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْئًا وَ لَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿۱۷﴾

تمھاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے بنائے اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا تو کیا وہ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا وہ انکار کرتے ہیں ﴿۱۶﴾ اور وہ اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں آسمانوں اور زمین سے کچھ بھی رزق دینے کے مالک ہیں اور نہ وہ طاقت رکھتے ہیں ﴿۱۷﴾

خادم کو بھی کہہ لیتے ہیں۔ (قاموس) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کئی احسان ذکر فرمائے ہیں، ایک تو تہائی اور وحشت دور کرنے کے لیے ساتھی دیا، مرد کے لیے عورت، عورت کے لیے مرد۔ دوسرا یہ کہ وہ ساتھی اس کی جنس انسان سے دیا، کیونکہ دوسری جنس سے نہ انس حاصل ہو سکتا تھا، نہ سکون اور نہ موافقت۔ (دیکھیے روم: ۲۱) ہمارے والد ماجد آدم علیہ السلام کو جنت میں رہنے کے باوجود سکون تمھی حاصل ہوا جب انھیں اپنی جنس سے بیوی ملی۔ (دیکھیے نساء: ۱) اس سے اہل علم نے یہ بات بھی اخذ کی ہے کہ جن و انس کے درمیان نکاح کی اور ان سے اولاد ہونے کی تمام باتیں محض افسانہ ہیں۔ تیسرا یہ کہ میاں بیوی سے اولاد اور اولاد کی اولاد (بیٹے اور پوتے ونواسے) عطا فرمائے، جو بڑھاپے میں خوشی کا باعث اور سہارا بنتے ہیں اور خوش دلی سے بابا کی خدمت کرتے اور اس کے نام اور نسل کی بقا کا ذریعہ بنتے ہیں۔ چوتھا یہ کہ پھر ان سب کی زندگی کی ہر ضرورت کے لیے پاکیزہ رزق عطا فرمایا۔

﴿۱۶﴾ اَقْبَابًا طَلِبِ يُؤْمِنُونَ : یعنی کیا اپنے بنائے ہوئے خداؤں، حاجت رواؤں، مشکل کشاؤں اور داتاؤں کا احسان مانتے ہیں کہ انھوں نے ہی بیماری سے شفا دی، بیٹا دیا، یا روزی بخشی، حالانکہ وہ سب باطل ہیں اور وہم و خیال کے سوا ان کی کچھ حقیقت ہی نہیں۔ دیکھیے سورۃ یونس (۶۶)۔

﴿۱۷﴾ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُونَ : یعنی اللہ تعالیٰ جو سچا معبود ہے اور تمام احسانات اسی کے ہیں، اس کی نعمتوں کی ناشکری اور انکار کرتے ہیں، اس کے بجائے جنوں اور بزرگوں کے احسان مانتے ہیں کہ تندرستی، بیٹے اور روزی یہ دیتے ہیں، حالانکہ یہ سب باطل (جھوٹ) ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ دینے والا اللہ تعالیٰ ہے جس کے مشرک شکرگزار نہیں ہوتے۔

آیت 73 : ﴿۱۷﴾ وَ يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ : "مِنْ دُونِ اللّٰهِ" میں ہر بت، تھان، آستانہ، زندہ و مردہ بزرگ، غرض ہر چیز آگئی جسے وہ پوجتے اور پکارتے ہیں اور ان سب کے لیے "مَا" کا لفظ استعمال فرمایا جو عام طور پر ان چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن میں عقل نہیں۔ "بِرُزْقًا" میں توین تکمیر کے لیے ہے کہ جو کسی معمولی سے معمولی رزق کے مالک بھی نہیں۔ اسی طرح "شَيْئًا" کمرہ ہے کہ کسی بھی رزق کی ملکیت میں ان کا کچھ بھی حصہ نہیں، یعنی ان مشرکوں کی جہالت دیکھو کہ ان معبودوں کو پوجتے اور پکارتے ہیں جو نہ تو آسمان و زمین میں سے کسی بھی طرح کے رزق کی کچھ بھی ملکیت رکھتے ہیں، نہ آسمان سے بارش برسانے کے مالک، نہ زمین سے کچھ اگانے کے قابل، نہ کوئی چیز پیدا کرنے کے قابل، نہ جو چیز آگے اسے

فَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۷۴﴾ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَمَنْ رَزَقْنَاهُ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا هَلْ يَسْتَوُونَ ۗ الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۷۵﴾

پس اللہ کے لیے مثالیں بیان نہ کرو۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۷۴﴾ اللہ نے ایک مثال بیان کی، ایک غلام ہے جو کسی کی ملکیت ہے، کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ شخص جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق دیا ہے تو وہ اس میں سے پوشیدہ اور کھلم کھلا خرچ کرتا ہے، کیا وہ برابر ہیں؟ سب تعریف اللہ کے لیے ہے، بلکہ ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۷۵﴾

باقی رکھنے کے قابل، پھر وہ معبود کیسے بن گئے؟

﴿۷۴﴾ وَلَا يَسْتَوِيْعُونَ: یہ اس غلام گمان کی تردید ہے کہ مالک تو واقعی اللہ تعالیٰ ہے، مگر ہمارے یہ دیگر اس سے دلوانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ سے جو چاہیں منوا سکتے ہیں، جیسا کہ ایک صاحب نے کہا۔

اولیاء راہست قدرت از الہ تیر جنتہ باز آرنش زراہ

”اولیاء کو اللہ کی طرف سے یہ طاقت ملی ہوئی ہے کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو راستے سے واپس لے آتے ہیں۔“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے پاس کسی طرح بھی کوئی طاقت نہیں، نہ خود کچھ دینے کی، نہ اللہ تعالیٰ کو اپنی محبت یا طاقت اور دھونس کے ساتھ مجبور کر کے دلوانے کی، بلکہ انھیں معلوم ہی نہیں کہ کوئی ہمیں پکار بھی رہا ہے۔ (دیکھیے اخفاف: ۶، ۵) ان کے اس عقیدے کی تردید سورہ یونس (۱۸) اور سورہ زمر (۳) میں بھی واضح الفاظ میں کی گئی ہے۔ ”وَلَا يَسْتَوِيْعُونَ“ میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ ایسا اختیار حاصل کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے مجبور شخص ہیں۔

آیت 74 ﴿۷۴﴾ فَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ: مشرک کہتے ہیں کہ جس طرح بادشاہوں کے وزیر اور درباری اس کی سلطنت میں ذخیل ہوتے ہیں اور بادشاہ کو ان کی سننا پڑتی ہے، اسی طرح ہمارے یہ معبود، اوتار اور ٹھا کر بھی اللہ کی سرکار میں صاحب اختیار ہیں، اس واسطے ہم ان کو پوجتے ہیں، سو یہ مثال غلط ہے۔ بادشاہ تو سب کام خود نہیں کر سکتے مگر اللہ ہر چیز آپ کرتا ہے اور اس پر کسی کا رتی برابر بھی دباؤ نہیں ہے۔

﴿۷۵﴾ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ: یعنی یہ تمہاری بے علمی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اللہ ان کی سفارش رد نہیں کر سکتا، کبھی چھت پر چڑھنے کے لیے سیزھی کی ضرورت کی طرح اپنے داتا کو سیزھی قرار دیتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے لیے سیزھی کی ضرورت ہی نہیں، وہ بالکل قریب ہے اور کسی کا محتاج نہیں کہ اس کی سفارش رد نہ کر سکتا ہو۔ یہ سب تمہاری بے عقلی اور بے سمجھی ہے، لہذا تم اللہ تعالیٰ کے لیے اس قسم کی مثالیں بیان نہ کرو۔ اب آگے دو مثالیں بیان کی جاتی ہیں، ان پر غور کرو۔

آیت 75 ﴿۷۵﴾ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا.....: ”عبدًا“ کا معنی ہی غلام ہے، پھر بھی ”مَمْلُوكًا“ کی تصریح اس لیے فرمائی کہ ایک لحاظ سے آسمان وزمین کا ہر شخص ہی ”عبدًا“ ہے، فرمایا: ﴿إِنَّ كُلَّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِيَ الرَّحْمَنِ

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَهُوَ كَانٌّ عَلَى مَوْلَاهُ لَا
 آيِنًا يُوجِّهُهُ لَا آيَاتٍ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ لَا وَمَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَى

صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۶۱﴾

اور اللہ نے ایک مثال بیان کی، دو آدمی ہیں جن میں سے ایک گونگا ہے، کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے، وہ اسے جہاں بھی بھیجتا ہے، کوئی بھلائی لے کر نہیں آتا، کیا یہ اور وہ شخص برابر ہیں جو عدل کے ساتھ حکم دیتا ہے اور وہ سیدھے راستے پر ہے ﴿۶۱﴾

عَبْدُ اللَّهِ [مریم: ۹۳] ”آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس عبد (غلام) بن کر آنے والا ہے۔“ سو یہاں مراد وہ عبد ہے جو کسی آدمی کی ملکیت میں ہے۔

﴿۶۲﴾ وَمَنْ زَرَعْتَهُ مَثَارِثًا حَسَنًا.....: یہاں ”مَثَلًا“ کے مقابلے میں ”مَثَارِثًا“ کہنے کے بجائے ”مَنْ زَرَعْتَهُ مَثَارِثًا“ اس لیے فرمایا کہ انسان مالک بھی ہو تو اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ ہمارا عطا کردہ ہے، ساتھ اسے یہ بھی یاد دلا دیا کہ ہمارا عطا کردہ پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے رہو، اپنا سمجھ کر چھپا کر نہ بیٹھ جاؤ۔

﴿۶۳﴾ هَلْ يَسْتَوِي: یعنی کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک بنانے میں ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک عاجز مملوک غلام کو، جو اپنے مالک کی اجازت کے بغیر ایک کوڑی خرچ نہیں کر سکتا، ایک آزاد شخص کے برابر کر دے جو اپنے مال کا مالک ہے اور جہاں چاہے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتا رہتا ہے۔ تو کیا یہ بے بس غلام اور وہ آزاد مالک کبھی برابر ہو سکتے ہیں؟ حالانکہ یہ دونوں انسان ہوتے ہیں، ذہنی اور جسمانی ساخت اور قوتوں میں تقریباً ایک جیسے ہیں، پھر بھی یہ ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ تو جب یہ برابر نہیں ہو سکتے تو کوئی بھی بت یا بزرگ، نبی یا فرشتہ، زندہ یا مردہ، جو سب اللہ کی مخلوق و مملوک ہیں، وہ ساری کائنات کے خالق اور ہر چیز کے مالک کے برابر ہو سکتے ہیں؟! (قاسمی)

﴿۶۴﴾ الْحَمْدُ لِلَّهِ: اوپر اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کہ ”کیا یہ برابر ہو سکتے ہیں“ ذکر کرنے کے بعد خود کوئی جواب نہیں دیا، کیونکہ اس کا جواب سوال کے اندر ہی موجود ہے اور ہر سننے والا یہ کہنے پر مجبور ہے کہ ”ہرگز نہیں۔“ اس پر اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تعریف فرمائی کہ ایسی عمدگی سے تمہیں کوئی نہیں سمجھائے گا۔

﴿۶۵﴾ بَلْ أَنْزَلْنَاهُمْ لَعْنَةً: معلوم ہوا کہ اہل کتاب اور مشرکین مکہ میں سے کچھ لوگ توحید کی حقیقت کو پہچانتے تھے، مگر ضد اور عناد کی وجہ سے تکلیف اور مردہ پرستی پر ڈٹے ہوئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو کسی موقع پر ایمان لانے کا ارادہ رکھتے تھے، البتہ ان کے اکثر شرک کی قباحت جانتے ہی نہ تھے، بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں شرک کی راہ پر چلے جاتے تھے، اکثریت کا حال یہی رہا ہے۔

آیت 76 ﴿۶۱﴾ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلَيْنِ.....: ”ابکم“ گونگا، اس کے ساتھ اس کا بہرا ہونا بھی لازم ہوتا ہے،

وَاللَّهُ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ ۗ

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۶۷﴾

اور آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ ہی کے پاس ہے اور قیامت کا معاملہ نہیں ہے مگر آنکھ جھپکنے کی طرح، یا وہ اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۶۷﴾

کیونکہ آدمی سن کر ہی بولنا سیکھتا ہے۔ یہ مثال پہلی مثال سے بھی واضح ہے۔ دو آدمی ہیں، ایک میں چار خامیاں ہیں: ﴿۱﴾ وہ ”اَبْکَمٌ“ ہے کہ نہ سنتا ہے نہ بولتا ہے۔ ﴿۲﴾ ”لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ“ یعنی وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا، چلو بول نہیں سکتا تو کسی ہنری کا مالک ہو، ہاتھ پاؤں ہلا کر یا سر پر بوجھ اٹھا کر ہی کچھ کما سکے، نہیں، کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ﴿۳﴾ وہ آزاد نہیں بلکہ غلام ہے اور غلام بھی ایسا بے کار کہ مالک ہی کو اس کا سارا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ ﴿۴﴾ مالک اسے جہاں بھی بھیجے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ وہ بے چارہ راستہ ہی معلوم نہیں کر سکتا، نہ پوچھ سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے شخص میں چار خامیوں کے بجائے دو خوبیاں ہیں: ﴿۱﴾ وہ لوگوں کو عدل کا حکم دیتا ہے۔ معلوم ہوا وہ سنتا، بولتا اور سمجھتا ہے، وہ نہ ”اَبْکَمٌ“ ہے اور نہ ”لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ“ ہے۔ ﴿۲﴾ ”هُوَ عَلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِیْمٍ“ یعنی وہ صحیح ترین راستے پر قائم ہے، جو سب سے مختصر اور منزل پر پہنچانے والا ہے، یعنی وہ نہ کسی پر بوجھ ہے، نہ راستے سے سراسر نادانگہ۔ تو کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! اسی طرح بندوں کے خود ساختہ معبود بت ہوں یا قبریں یا کچھ اور، وہ نہ سنتے ہیں، نہ بولتے ہیں، نہ کچھ کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی جگہ سے بل بھی نہیں سکتے ہیں۔ اپنے مالک پر بوجھ ہیں، یعنی بجائے اس کے کہ یہ اپنے پیار یوں کے کسی کام آئیں خود ان کے پیاری مصیبت اٹھا کر پتھر، ایشیں، سینٹ اور مستری لا کر انھیں بتواتے ہیں۔ پھر ان کی حفاظت اور مرمت کرتے، پہرا دیتے اور صفائی کرتے ہیں۔ یہ دونوں کیسے برابر ہو گئے؟ جب وہ دونوں آدمی برابر نہیں، حالانکہ مخلوق ہونے میں اور آدمی ہونے میں دونوں برابر ہیں، تو مشرکین کے بنائے ہوئے بت اور آستانے جو بے جان ہیں اور ان کے محتاج ہیں، اللہ تعالیٰ کے برابر کیسے ہو گئے اور اس کے شریک کس طرح بن گئے؟

﴿۲﴾ بعض اہل علم نے دونوں آیتوں میں مذکور دو، دو آدمیوں کو مومن و کافر کی مثال قرار دیا ہے۔ بری صفات والے غلام سے مراد کافر اور اچھی صفات والے سے مراد آزاد مومن ہے، مگر اوپر بیان کردہ تفسیر زیادہ صحیح ہے۔

آیت 77 : ﴿۱﴾ وَاللَّهُ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ : ”غَيْبٌ“ جو نہ حواسِ خمسہ سے معلوم ہو سکے، نہ عقل سے، مخلوق سے پوشیدہ ہو۔ ”یَلْبَسُ“ خبر ہے ”غَيْبُ السَّمَوَاتِ“ کی۔ بعد میں آنے کے بجائے پہلے آنے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ ”اللہ ہی کے پاس ہے“ کیا گیا۔ صرف اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے کے دلائل میں سے یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ ساتھ ہی ایک ایسے غیب کا ذکر فرمایا جو اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں، کیونکہ وہ غیب کا علم کسی کو بتایا ہی نہیں گیا اور وہ قیامت ہے اور اس کا علم ہونا سچا معبود ہونے کی دلیل اور علم نہ ہونا باطل ہونے کی دلیل ہے۔ دیکھیے سورہ نحل (۲۱)۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ وَّ الْاَبْصَارَ
وَالْاَفْئِدَةَ لَا عِلْمَ لَكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے
کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے، تاکہ تم شکر کرو ﴿۷۸﴾

﴿۷۸﴾ وَمَا اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ : ”السَّاعَةُ“ زمانے کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ، مراد قیامت ہے، کیونکہ
وہ اچانک اتنے کم وقت میں قائم ہو جائے گی۔ ”اَوْ هُوَ اَقْرَبُ“ میں ”اَوْ“ بمعنی ”بَل“ ہے، جیسا کہ یونس علیہ السلام کے متعلق
فرمایا: ﴿وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ﴾ [الصافات: ۱۰۷] ”اور ہم نے اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا، بلکہ وہ
زیادہ ہوں گے۔“ دوسری جگہ اپنے امر (مُحْسَن) کے متعلق فرمایا: ﴿وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاٰجِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ﴾ [النجم: ۵۰]
”اور ہمارا حکم تو صرف ایک بار ہوتا ہے، جیسے آنکھ کی ایک جھپک۔“ اور یہاں ”اَوْ هُوَ اَقْرَبُ“ فرمایا، کیونکہ آنکھ جھپکنا بھی
کچھ وقت چاہتا ہے، قیامت اس سے بھی کم وقت میں قائم ہو جائے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں، کیونکہ وہ ہر چیز پر
پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

بعض علماء نے اس کا معنی یہ بھی بیان کیا ہے کہ تم قیامت کو بہت دور سمجھ رہے ہو، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آنکھ
جھپکنے سے بھی زیادہ قریب ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيْدًا وَّ كَرِيْبًا﴾ [المعارج: ۶، ۷] ”بے شک
وہ اسے دور خیال کر رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔“

آیت 78 ﴿۱﴾ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ : اس سورت کی آیت (۶۵) ﴿وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَاءً﴾

سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر اور اس کے اکیلے معبود ہونے کے جو دلائل شروع ہوئے تھے وہی سلسلہ کلام جاری ہے۔ اس
آیت میں پہلا انعام ماؤں کے پیٹوں سے نکالنا ہے۔ اس سے پہلے بہت سے مراحل خود بخود اس میں آجاتے ہیں۔ نو ماہ تک پیٹ
میں مکمل بچہ بنانے کے بعد اسے نکلنے کا راستہ مہیا کرنا اور ماں اور بچے دونوں کی خیریت کے ساتھ بچے کو باہر لے آنا کیا معمولی
بات ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے اتنے بڑے احسان کے باوجود انسان کے ناشکری اور شرک اختیار کرنے پر اس کے لیے بہت سخت
الفاظ استعمال فرمائے، فرمایا: ﴿قَبِيْلَ الْاِنْسَانِ مَا اَكْفَرًا﴾ ﴿مِنْ اٰيِ شَيْءٍ خَلْقًا﴾ ﴿مِنْ نُطْفَةٍ خَلَقَهَا فَقَدَرَةٌ﴾ ﴿ثُمَّ السَّمِيْلَ يَسْرِءُ﴾ [عبس: ۱۷ تا ۲۰] ”مارا جائے انسان! وہ کس قدر ناشکرا ہے، اس نے اسے کس چیز سے پیدا کیا۔ ایک
قطرے سے، اس نے اسے پیدا کیا، پس اس کا اندازہ مقرر کیا، پھر اس کے لیے (ماں کے شکم سے نکلنے کا) راستہ آسان کر دیا۔“

﴿۲﴾ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا: انسان ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے تو اسے کچھ علم نہیں ہوتا، پھر کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ اسے فطری طور
پر سکھا دیتا ہے، مثلاً ماں کا دودھ تلاش کر لینا، اسے چوسنا، جو چیز ملے منہ میں ڈالنا وغیرہ اس کی مثال ہیں۔ کھاتے پینے اور
زندگی قائم رکھنے کی دوسری ضروریات کے حصول کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے علاوہ ہر چیز کی فطرت میں رکھ دیا ہے،

أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الظَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوْ السَّمَاءِ مَا يُنْسِكُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ

لَايَةٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٧٩﴾

کیا انھوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا، آسمان کی فضا میں مسخر ہیں، انھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں تھامتا۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿٧٩﴾

ورنہ کوئی چیز زندہ نہ رہتی۔

﴿٧٩﴾ وَجَعَلْ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ : کان، آنکھیں اور دل اگرچہ ہر جاندار کو عطا ہوئے ہیں، مگر دوسرے تمام جاندار ان سے اتنا ہی فائدہ اٹھاتے ہیں جتنا ان کی فطرت میں ہے۔ لہٰذا آج سے لاکھوں سال پہلے جس طرح تیرتی تھی اب بھی اس میں کوئی تبدیلی یا ترقی نہیں ہوئی، یہی حال پرندوں کا اور چوپاؤں اور سمندری جانوروں کا ہے، ورنہ وہ کینڑے کوڑے بھی ایک ہی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں، جب کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے کچھ اختیار سے بھی نوازا ہے کہ وہ ہدایت اور گمراہی میں سے کسی بھی چیز کو اختیار کر سکتا ہے، پھر اس کو عطا کردہ کان، آنکھیں اور دل پھجلی نسلوں کے تجربے قلم سے محفوظ رکھتے ہیں، انھیں بعد والوں تک پہنچاتے اور نئی سے نئی ایجاد میں لگے رہتے ہیں، حتیٰ کہ انسان ان کی بدولت اتنی دنیاوی ترقی کر چکا ہے کہ رہائش، سفر، کھانے پینے، غرض ہر چیز میں پہلے انسان اور آج کے انسان کی آسانئوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ اسی طرح توانائی کے حصول میں وہ ایٹم تک پہنچ گیا ہے، جس سے وہ بربادی کا بے حساب سامان بھی تیار کر چکا ہے اور انسانی فوائد کا بھی۔ غرض اگر انسان اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں پر غور کرے تو کبھی نہ اس کے وجود کا انکار کرے، نہ اس کا کوئی شریک بنائے، نہ اس کے علاوہ کسی کو حاجت روا، مشکل کشا، داتا یا غریب نواز قرار دے کر پکارے، کیونکہ کسی نعمت میں کسی اور کا کوئی حصہ ہی نہیں اور نہ اس کی بندگی اور فرماں برداری میں کوتاہی کرے، بلکہ ہر دم اپنے دل، زبان اور ہر عضو کے ساتھ تولا و عملاً اس کا شکر ادا کرے۔

﴿٧٩﴾ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ : اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ اس لیے بنایا کہ تم شکر کرو۔ یہاں اگرچہ ذکر نہیں فرمایا کہ انسان نے شکر ادا کیا یا نہیں، مگر دوسرے کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اکثر لوگ شکر نہیں کرتے، جیسے فرمایا: ﴿وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ﴾ [المؤمن: ٦١] ”اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔“ اور فرمایا: ﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّاكِرُونَ﴾ [سبا: ١٣] ”اور میرے بندوں میں سے بہت کم شکر کرنے والے ہیں۔“ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کی پہچان کے لیے نہ اپنے ان کانوں سے کام لیتے ہیں، نہ آنکھوں سے اور نہ دلوں سے۔ دیکھیے سورہ اعراف (۱۷۹)۔

آیت 79 : أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الظَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوْ السَّمَاءِ : ”الظَّيْرُ“ ”ظنایر“ کی جمع ہے، اڑنے والا، اگرچہ بعض لوگ ”فَاعِلٌ“ کی جمع ”فَعَّلٌ“ کا انکار کرتے ہیں، مگر شفقینی رحمہ اللہ نے اس کی کئی مثالیں ذکر فرمائی ہیں، جیسا کہ ”صاحِبٌ“ کی جمع ”صَحْبٌ“ امرء القیس نے کہا۔

وَقُوفاً بِهَا صَحْبِي عَلَيَّ مَطْبِعُهُمْ يَقُولُونَ لَا تَهْلِكُ أَسَى وَ تَحْمَلُ

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُودِ الْاَنْعَامِ بُيُوتًا
تَسْتَعْفِفُونَهَا يَوْمَ طَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَا
اَنَابًا وَ مَتَاعًا اِلَى حِينٍ ﴿۸۵﴾

اور اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں سے رہنے کی جگہ بنا دی اور تمہارے لیے چوپایوں کی کھالوں سے ایسے گھر
بنائے جنہیں تم اپنے کوچ کے دن اور اپنے قیام کے دن ہلکا پھلکا پاتے ہو اور ان کی اونٹوں سے اور ان کی پشموں سے
اور ان کے بالوں سے گھر کا سامان اور ایک وقت تک فائدہ اٹھانے کی چیزیں بنائیں ﴿۸۵﴾

”رَاكِبٌ“ کی جمع ”رُكُوبٌ“، ”شَارِبٌ“ کی ”شَرِبٌ“ اور ”سَافِرٌ“ کی ”سَفَرٌ“ وغیرہ۔ کیا ان مشرکوں نے آسمان و
زمین کے درمیان اڑتے ہوئے پرندوں پر غور نہیں کیا، وہ کون سی ہستی ہے جس نے ان کے پردوں، بازوؤں اور دموں کی
ساخت اڑنے کے قابل بنائی اور زمین و آسمان کے درمیان اڑتے ہوئے انہیں گرنے سے تھامے رکھا، کوئی دعوے دار ہی
سامنے لائیں، پھر بھی یہ اللہ کے ساتھ شریک بنا رہے ہیں، سچ ہے کہ ان نشانوں سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو بات سمجھ
جائیں تو مان لیں، جو ماننے پر آمادہ ہی نہ ہوں ان کے لیے ہر نشانی بے فائدہ ہے۔ مزید دیکھیے سورہ ملک (۱۹)۔

آیت ۸۵ ﴿۸۵﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا : ”بُيُوتٌ“ ”بَيْتٌ“ کی جمع ہے۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، جو
تمہارے اوپر ہو، سایہ کر رہی ہو اسے سقف، چھت اور سہا، کہتے ہیں، جو نیچے ہو اسے ارض کہتے ہیں اور جو چاروں طرف سے
تمہارے لیے پردہ کر رہی ہو اسے جدار (دیوار) کہتے ہیں اور جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ ترتیب کے ساتھ منظم ہو جائیں تو
وہ بیت (گھر) ہے۔ ”سَكَنًا“ مصدر ہے، اس کا معنی کسی جگہ میں رہنا بھی ہے، جیسے فرمایا: ﴿اَسْكُنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ
مِنْ وُجُوْدِكُمْ﴾ [الطلاق: ۶] ”انہیں (یعنی مطلقہ بیویوں کو) وہاں سے رہائش دو جہاں تم رہتے ہو، اپنی طاقت کے
مطابق۔“ اس کا معنی سکون اور راحت بھی ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا﴾ [الأعراف: ۱۸۹]
”اور اس سے اس کا جوڑا بنایا، تاکہ وہ اس کی طرف (جا کر) سکون حاصل کرے۔“ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رہائش کے
متعلق اپنی کئی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گھر میں رہنے کی قدر اور اس میں آکر ملنے والی راحت، عافیت اور
سکون کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کے پاس گھر نہ ہو۔ اس آیت سے مکان کی قدر و قیمت اور اس نعمت کی عظمت کا احساس ہوتا
ہے۔ گھر جسمانی اور نفسیاتی سکون کی جگہ ہے۔ اسلام گھر کو سکون کی جگہ دیکھنا چاہتا ہے نہ کہ باہمی جھگڑے اور اختلاف کی،
کیونکہ یہ ”گھر“ کی حکمت اور مقصد کے خلاف ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے گھر کی حرمت رکھی۔ فرمایا کہ بلا اجازت کوئی
دوسرے کے گھر میں داخل نہ ہو، حتیٰ کہ جھانکنے سے بھی منع فرمایا اور تحسس سے بھی۔ گھر کی حرمت سورہ نور (۲۹: ۲۷) اور (۵۸،
۵۹) میں دیکھیں۔ علاوہ ازیں سورہ احزاب کی آیت (۵۳) بھی ملاحظہ فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿اَلَسَفَرُ قِطْعَةٌ
مِّنَ الْعَذَابِ، يَمْنَعُ اَحَدَكُمْ طَعَامَهُ وَ شَرَابَهُ وَ نَوْمَهُ، فَاِذَا قَضَى نَهْمَتَهُ فَلْيَعَجَلْ اِلَى اَهْلِهِ﴾ [بخاری، العمرة، باب

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِمَّا خَلَقَ ظِلَالًا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَ جَعَلَ لَكُمْ
سَرَابِيلَ تَقِيكُمْ الْحَرَّ وَ سَرَابِيلَ تَقِيكُمْ بَأْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَسْلُمُونَ ﴿۸۱﴾

اور اللہ نے تمہارے لیے ان چیزوں سے جو اس نے پیدا کیں، سائے بنا دیے اور تمہارے لیے پہاڑوں میں سے
چھپنے کی جگہیں بنائیں اور تمہارے لیے کچھ قمیصیں بنائیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں اور کچھ قمیصیں جو تمہیں تمہاری
لڑائی میں بچاتی ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرتا ہے، تاکہ تم فرماں بردار بن جاؤ ﴿۸۱﴾

السفر قطعة من العذاب : ۱۸۰۴، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ [سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے جو تمہارے ایک کو اس کے کھانے اور پینے
اور اس کی نیند سے روک لیتا ہے، تو جب تم میں سے کوئی شخص اپنی حاجت پوری کر لے تو جلدی اپنے گھر آ جائے۔“

﴿۸۲﴾ وَ جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْجُلُودِ الْاَنْعَامَ نِيُوْتًا : اگرچہ گھر کوئی بھی ہو بڑی نعمت ہے، مگر اینٹوں، پتھروں کا گھر بنانے میں
نعمت ہونے کے باوجود مشقت، بوجھ اور خرچ زیادہ ہے، سب سے پہلے زمین حاصل کرنا، اینٹیں، پتھر، مصالحہ، مٹی، لکڑی، لوہا، غرض
سب کچھ مہیا کرنا، پھر مستزیوں کے ناز اٹھانا، سارے مراحل مشکل ہیں، پھر وہ مکان کہیں منتقل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا انعام
دیکھیے کہ اس نے ہماری آسانی کے لیے جانوروں کے چمڑوں سے خیمے بنا دیے، چند لکڑیاں اور رسیاں اور بنا بنایا مکمل گھر،
جہاں جاہا میٹھیں ٹھوک کر رسیاں باندھ کر خیمہ بنا لیا، اسی چمڑے کی قاتیں کھڑی کر کے چار دیواری بنالی۔ پھر جب جاہا اکھاڑ کر
تکر کے ساتھ رکھ لیا اور اگلی منزل پر روانہ ہو گئے۔ اب اللہ تعالیٰ نے ان سے بھی ہلکے پلاسٹک اور المونیم کے خیمے عطا فرمادیے۔

﴿۸۳﴾ تَسْتَخْفُونَهَا يَوْمَ ظَلَمْتُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ : ”تَسْتَخْفُونَهَا“ ”حَفَّ يَحْفُ“ سے باب استفعال جمع مذکر
حاضر ہے۔ ”يَوْمَ ظَلَمْتُمْ“ یہاں ”يَوْمَ“ سے مراد وقت ہے۔ ”اَصْوَاتُ“ ”صُوفُ“ کی جمع ہے، بھیڑ کی اون۔
”اَوْبَارُ“ ”وَبْرُ“ کی جمع، اونٹ کی پشم۔ ”اَشْعَارُ“ ”شَعْرُ“ کی جمع ہے، بکریوں کے بال۔ ”اَكَاثًا“ گھر کا ساز و سامان جو
بہت ہو۔ ”اَنْتِ يُوْتُ“ (ان) جب کوئی چیز بہت اور گھنی ہو۔ امرء القیس نے بالوں کی چوٹی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے۔

وَ فَرَعَ يَزِيْرُ الْمُنَّ اَسْوَدَ فَاجِمٍ اَيْبُ كَفِنُو النَّحْلَةَ الْمُتَعَبِلِ
”اَيْبُ“ یعنی گھنے، ”مَتَاعًا“ گھر کی ضرورت کی خاص چیزیں جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ”اَكَاثًا“ میں ”مَتَاعًا“
بھی داخل ہے، مگر اس کی اہمیت کی بنا پر الگ بھی ذکر فرمایا۔ ”اِلَى حِيْنٍ“ ایک وقت تک، یعنی جو اللہ تعالیٰ نے طے کر رکھا
ہے، مثلاً نیا سامان آنے تک، یا اس کے پرانا ہونے تک، یا دنیا سے رخصت ہونے تک۔

﴿۸۴﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِمَّا خَلَقَ ظِلَالًا : ”ظِلَالًا“ ”ظَلَّ“ کی جمع ہے، سائے۔ ”اَكْنَانًا“ اور ”اَكْنَةً“

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ الْمُبِينُ ﴿۸۲﴾

پھر اگر وہ پھر جائیں تو تیرے ذمے تو صرف واضح پیغام پہنچا دینا ہے ﴿۸۲﴾

دونوں ”سکن“ کی جمع ہیں، چھپاؤ کی جگہ یا چیز، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِيْ اَكْفَادٍ﴾ [ختم المسحودہ: ۵] ”اور انھوں نے کہا ہمارے دل پردے میں ہیں۔“ ”سَدَائِيْلٌ“ ”سِرْنَاوَالٌ“ کی جمع ہے، قمیص یا جو لباس بھی پہنا جائے۔ ”تَقِيْلًا“ ”وَفِيْ يَفِيْ“ سے مضارع معلوم واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ فاعل اس کا ضمیر جمع ہے، اس لیے واحد مؤنث ہے۔ چوپاؤں، مکانوں اور خیموں کے بعد گھر سے باہر سردی گرمی اور دشمن سے بچاؤ کرنے والی نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ اس آیت میں ان لوگوں کے لیے جن کے پاس مکان یا خیمہ نہیں، یا وہ سفر میں ہیں تو گرمی وغیرہ سے بچاؤ کے لیے مختلف سایوں کا ذکر کیا، مثلاً درختوں کا سایہ، مکانوں، دیواروں اور پہاڑوں کا سایہ، آبادیوں کا سایہ، چھتریوں کا سایہ، غرض یہی سائے گرمی سردی اور بارش سے بچانے کے کام آتے ہیں۔

﴿وَجَعَلْ لَكُمْ مِنَ الْجِبَالِ اَكْثَاكَ﴾ اس میں پہاڑوں کی قدرتی غاریں، کھود کر بنائے ہوئے مکان اور پہاڑوں میں کھود کر بنائی ہوئی لمبی سرنگیں، جن میں فوجی سامان، اسلحہ، جہاز اور فوج محفوظ رکھی جاتی ہے، سب شامل ہیں۔

﴿وَجَعَلْ لَكُمْ سَرَايِيْلَ تَقِيْلًا حَرًّا﴾ وہ لباس جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں، بعض اہل علم نے فرمایا کہ قرآن کے اولین مخاطب عرب تھے، وہاں گرمی زیادہ تھی، اس لیے صرف گرمی سے بچانے والے لباس ذکر فرمائے۔ مگر اکثر مفسرین نے فرمایا کہ گرمی کا ذکر کافی سمجھ کر سردی کا الگ ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ لباس گرمی سے بچاتا ہے تو سردی سے بھی بچاتا ہے۔ رہا عرب میں گرمی کا زیادہ ہونا تو اسی سورت کے شروع میں جانوروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ﴾ [النحل: ۵] ”تمہارے لیے ان میں گرمی حاصل کرنے کا سامان ہے۔“ معلوم ہوا عربوں کو بھی سردی سے بچنے کی ضرورت تھی، اس لیے یہ بات زیادہ قوی ہے کہ قرآن مجید نے صرف گرمی کا ذکر کر کے سردی سے بچانے کی نعمت پر غور کرنا سننے والوں پر چھوڑ دیا، یا سورت کے شروع میں ”لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ“ (تمہارے لیے ان میں گرمی حاصل کرنے کا سامان ہے) میں سردی سے بچاؤ کا ذکر پہلے ہو چکنے کی وجہ سے یہاں ذکر نہیں فرمایا۔ ”وَسَرَايِيْلَ تَقِيْلًا بَاسِكًا“ اس میں زرہ، خود، ہلٹ پروف (گولی سے محفوظ) ٹیکٹیس، گاڑیاں اور ٹینک وغیرہ سب شامل ہیں۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ یعنی تاکہ تم فرماں بردار اور اللہ تعالیٰ کے تابع بن جاؤ، اس لیے کہ جو شخص ان بے پایاں نعمتوں پر غور کرے گا ضروری ہے کہ وہ ایمان لا کر اس کی اطاعت اختیار کرے۔

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ الْمُبِينُ﴾ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے۔ اس شرط کا جواب محذوف ہے جو بعد والے جملے سے سمجھ میں آ رہا ہے، یعنی اگر وہ پھر جائیں، نہ مانیں تو آپ کا کوئی نقصان ہے نہ آپ پر کوئی ملامت، کیونکہ آپ کے ذمے صرف واضح پیغام پہنچا دینا ہے، آپ اپنا فریضہ ادا کرتے جائیں، ایمان کی توفیق دینا یا نہ

يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا وَأَكْثَرُهُمُ الْكَافِرُونَ ﴿۸۳﴾ وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ

أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿۸۴﴾

وہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں ﴿۸۳﴾ اور جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے، پھر ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا، نہ اجازت دی جائے گی اور نہ ان سے معافی کی درخواست لی جائے گی ﴿۸۴﴾

دینا ہمارے ہاتھ میں ہے، فرمایا: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ﴾ [القصص: ۵۶] ”بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے۔“ پھر ان کا حساب بھی ہمارے ذمے ہے، فرمایا: ﴿فَأِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ﴾ [الرعد: ۴۰] ”بس تیرے ذمے صرف پہنچا دینا ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔“

آیت 83 ﴿يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا﴾: یعنی خوب جانتے ہیں کہ یہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی ذات عنایت فرما رہی ہے، مگر جب عملاً شکرگزاری کا وقت آتا ہے تو انکار کر دیتے ہیں۔ ”ثُمَّ“ یہاں تعجب کے لیے ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے پھر اللہ کی نعمتوں کا انکار کر دیتے ہیں، گویا دل میں نعمتوں کا اقرار اور اپنے عمل سے انکار کرتے ہیں، بلکہ پوچھنے پر اللہ کی نعمتوں کا اقرار زبان سے بھی کرتے ہیں، مثلاً تمہیں کس نے پیدا کیا؟ جواب دیں گے اللہ نے۔ (دیکھیے زخرف: ۸۷) اسی طرح سورہ مومنون (۸۳/۸۹) میں ان کے اعترافات ذکر فرمائے ہیں۔ مگر وہ ایمان لانے پر تیار نہ تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ صرف ”لا الہ الا اللہ“ کہنے سے کام نہیں چلے گا، بلکہ اپنی مرضی چھوڑ کر ہر کام میں اللہ اور اس کے رسول کا حکم ماننا پڑے گا اور اس کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ ہمارے ہاں بس ”لا الہ الا اللہ“ کہنا جنت کے لیے کافی سمجھا گیا ہے، خواہ پوری زندگی اس کے خلاف ہو۔ وجہ اس کی محض طوطے کی طرح کہنا اور مفہوم سے مکمل لاتعلقی ہے۔ بعض اہل علم نے ”يَعْمَتُ اللَّهُ“ سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی لی ہے، یعنی یہ لوگ آپ ﷺ کو اللہ کا رسول جانتے ہوئے بھی مانتے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ﴿وَأَكْثَرُهُمُ الْكَافِرُونَ﴾: ”اَكْثَرُهُمْ“ اس لیے فرمایا کہ ان کے اکثر جانتے ہوئے کافر تھے۔ کچھ جہل کی وجہ سے بھی انکار کرتے تھے، کچھ دل میں ایمان کا ارادہ بھی رکھتے تھے، کچھ چھوٹے بچے تھے، جو فطرتاً مسلمان تھے مگر کفار کی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کا شمار دنیوی لحاظ سے کفار میں ہوتا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے انصاف کا اور انتہائی احتیاط کا ایک نمونہ ہے کہ ان سب کو نعمت پہچان کر پھر کفر کرنے والے قرار نہیں دیا، بلکہ یہ حکم ان کے اکثر پر لگایا۔

آیت 84 ﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا﴾: یعنی قیامت کے دن ہر امت کا پیغمبر اللہ کے سامنے کھڑا ہوگا اور ان تک حق پہنچا دینے کی شہادت دے گا، ساتھ ہی اگر انہوں نے تصدیق کی ہوگی تو اس کی اور اگر جھٹلایا ہوگا تو اس کی بھی شہادت دے گا۔ پیغمبروں کی وفات کے بعد جن لوگوں نے حق پہنچایا وہ یہ شہادت دیں گے۔ اس میں نعمت کے منکروں کے

وَ إِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفِّفْ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۸۵﴾

اور جب وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا، عذاب کو دیکھ لیں گے تو نہ وہ ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی ﴿۸۵﴾

لیے وعید ہے۔ شہادت کے مفہوم کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۳۳)، نساء (۴۱)، حج (۷۸) اور سورہ زمر (۶۹)۔

﴿۸۵﴾ ثُمَّ لَا يُؤَدِّنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا: پھر کافروں کو اجازت نہیں دی جائے گی۔ کس چیز کی؟ دوسری جگہ اس کی وضاحت آئی ہے، اس میں سے ایک تو یہ ہے کہ اس دن نہ وہ بول سکیں گے اور نہ انہیں عذر کرنے کی اجازت دی جائے گی، جیسے فرمایا: ﴿هَذَا يَوْمٌ لَا يَنْطِقُونَ﴾ وَلَا يُؤَدِّنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ﴿۱﴾ [المسرات: ۳۵، ۳۶] ”یہ دن ہے کہ نہ وہ بولیں گے اور نہ انہیں اجازت دی جائے گی کہ وہ عذر کریں۔“ دوسری یہ کہ جب وہ کہیں گے: ﴿رَبِّ ارْحَمْنِي﴾ كَلِمَةً أَعْلَنُ صَالِحًا فِينَا تَرَكَتُ ﴿۲﴾ [المؤمنون: ۹۹، ۱۰۰] (اے میرے رب! مجھے واپس بھیجو، تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کوئی نیک عمل کر لوں) تو انہیں واپس جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، کیونکہ واپس جانے پر بھی وہ وہی کچھ کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں۔ (دیکھیے انعام: ۲۸) قرآن کی بلاغت دیکھیے، یہ فرمایا کہ اجازت نہیں دی جائے گی، یہ ذکر نہیں کیا کہ کس چیز کی؟ کیونکہ وہ کئی چیزیں ہیں۔

﴿۸۶﴾ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ: ”عَسَبٌ يَعْتَبُ عَسَبًا“ (ن، ض) ناراض ہونا۔ ”أُعْتَبْتُ يُعْتَبُ“ ناراضگی دور کرنا۔ ”أَلْعُنِي“ راضی کرنا، مٹانا۔ ”اسْتَعْتَبْتُ فَلَانًا فَلَانًا“ یعنی فلاں نے دوسرے پر اپنی ناراضگی ظاہر کی، تاکہ وہ اس کی ناراضگی دور کر سکے، یا معافی مانگ سکے۔ ”وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ“ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سامنے اس لیے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا جائے گا کہ وہ معافی کی درخواست کر کے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی دور کر سکیں، یعنی انہیں اللہ کو راضی کرنے کی درخواست کا موقع ہی نہیں دیا جائے گا۔

آیت 85 ﴿۸۵﴾ وَ إِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ.....: ”وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا“ سے مراد مشرک ہیں، کیونکہ موحدین تو اپنے گناہوں کی سزا پا کر، یا شفاعت سے، یا محض اللہ کی رحمت سے عذاب سے نکل آئیں گے، فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُعْطِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَعْفُو مَا تُونَ ذَلِكَ لِنِ لِنِ يَشَاءُ﴾ [النساء: ۱۱۶] ”بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا۔“ جب کہ ان ظالموں کے عذاب دیکھ لینے کے بعد نہ اس میں کمی کی جائے گی، نہ ایک لمحے کی مہلت دی جائے گی، بلکہ اسی وقت عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ”الْعَذَابُ“ سے مراد کفار کے ہر طبقے کے لیے خاص عذاب مراد ہے۔

﴿۸۷﴾ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی، جب کہ ابو معید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، جب آپ کے پاس آپ کے چچا کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا: ﴿أَعْلَهُ تَنْفَعُهُ شَفَاعَتِي﴾

وَ إِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَؤُلَاءِ شُرَكَائُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُوا مِنْ

دُونِكَ ؕ قَالِقُوا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۸۶﴾

الذَّكٰرِ

اور جب وہ لوگ جنہوں نے شریک بنائے اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے اے ہمارے رب! یہی ہیں ہمارے وہ شریک جنہیں ہم تیرے سوا پکارا کرتے تھے۔ تو وہ ان کی طرف یہ بات پھینک ماریں گے کہ بلاشبہ یقیناً تم جھوٹے ہو ﴿۸۶﴾

يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُحْمَلُ فِيْ ضَحْضَاحٍ مِنَ النَّارِ يَلْبَغُ كَعْبِيْبِهِ يَغْلِي مِنْ دِمَاعِهِ ﴿ [بخاری، مناقب الأنصار، باب قصة أبي طالب : ۳۸۸۰ - مسلم : ۲۱۰] ”امید ہے کہ قیامت کے دن اسے میری شفاعت پہنچے گی تو اسے ہلکی آگ میں ڈالا جائے گا جو اس کے ٹخنوں تک پہنچے گی، اس سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا۔“ صحیح بخاری ہی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «وَلَوْلَا أَنَا لَكَانَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ» [بخاری، مناقب الأنصار، باب قصة أبي طالب : ۳۸۸۳] ”اگر میں نہ ہوتا تو وہ آگ کے درک اسفل میں ہوتا۔“ ان دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ کفار کے حق میں کوئی سفارش آگ سے نکلنے کے لیے قبول نہیں ہوگی، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی سفارش ان کے والد کے حق میں قبول نہیں ہوگی اور سورہ شعراء (۱۰۰) اور سورہ مدثر (۴۸) میں کفار کے متعلق سفارش نہ ہونے کا ذکر ہے۔ ہاں صحیح بخاری کی اس حدیث سے بظاہر کفار کے حق میں سفارش سے عذاب کی تخفیف ثابت ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ جنت کے طبقات کی طرح جہنم کے بھی درکات ہیں۔ جنت کا سب سے اعلیٰ طبقہ فردوس ہے اور جہنم کا سب سے سخت حصہ درک اسفل ہے۔ یہ فیصلہ ہونے کے بعد کہ کس کافر کو کون سا عذاب ہوگا جب انہیں جہنم کی طرف روانہ کیا جائے گا تو جہنم کے سات دروازوں میں سے ہر ایک کے لیے جو دروازہ اور جو عذاب مقرر ہے وہ وہاں پہنچیں گے، اسے دیکھنے کے بعد پھر انہیں کوئی تخفیف یا سہلت نہیں ملے گی۔ نبی ﷺ کی خیر خواہی، خدمت اور سفارش کی وجہ سے ابوطالب کا فیصلہ پہلے ہی سب سے ہلکے عذاب کا ہو چکا ہوگا، اب وہاں جانے کے بعد اسے مزید تخفیف یا جہنم سے خلاصی حاصل نہیں ہو سکے گی۔

بیت 86 وَ إِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا : کفار جب اپنے ان شریکوں کو دیکھیں گے جنہیں وہ مدد کے لیے پکارتے رہے اور اللہ کا شریک بناتے رہے، یا جن کے بتوں یا قبروں کو پوجتے اور حمد و طواف کرتے رہے، جیسا کہ صحیح بخاری (۳۲۸۸) میں ذکر ہے کہ مشرکین مکہ نے کعبہ کے اندر ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے بت بنا کر رکھے ہوئے تھے۔ قیامت کے دن مشرکین ان بزرگوں کو دیکھیں گے تو اپنے جرم کو ہلکا کرنے اور اپنے بنائے ہوئے داتاؤں و دستگیروں کو اس جرم میں ساتھی بنانے کے لیے کہیں گے، پروردگار! یہ لوگ ہیں جنہیں ہم تیرے سوا پکارا کرتے تھے۔ وہ سب کے سب فوراً سختی سے کہیں گے، بلاشک و شبہ یقیناً تم جھوٹے ہو۔ فوراً کا مفہوم ”قَالَ لَقَوْلًا“ کی فاء سے ظاہر ہو رہا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرک انہیں پکارتے تو رہے ہیں، پھر وہ انہیں جھوٹا کیوں کہیں گے؟ جواب اس کا ایک تو یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے سوا کسی کو پکارتا ہے اسے یعنی اس کے

وَأَلْقُوا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلْمَ وَصَلَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۵۷﴾ الَّذِينَ كَفَرُوا
وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ﴿۵۸﴾

اور اس دن وہ اللہ کے سامنے فرماں بردار ہونا پیش کریں گے اور ان سے گم ہو جائے گا جو وہ جھوٹ باندھا کرتے تھے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا ہم انہیں عذاب پر عذاب زیادہ دیں گے، اس کے بدلے جو وہ لیا کیا کرتے تھے ﴿۵۸﴾

بنائے ہوئے داتا و دیگر کو معلوم ہی نہیں کہ کوئی اسے پکار رہا ہے، نہ انہیں ان کا پکارنا سنائی دیتا ہے، تو وہ انہیں جھوٹا نہ کہیں تو کیا کہیں؟ دیکھیے سورۃ فاطر (۱۳، ۱۳) اور سورۃ اہقاف (۶، ۵) دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا شریک کہیں موجود ہی نہیں، ہر مشرک خواہ بت پرست ہو یا قبر پرست، ولی پرست ہو یا نبی پرست، وہ محض اپنے خیالی بنائے ہوئے حاجت رواؤں، مشکل کشاؤں کو پکارتا ہے، حقیقت میں ان کا کہیں کوئی وجود نہیں، اس لیے وہ انبیاء و اولیاء اور ان کے بنائے ہوئے داتا و دیگر انہیں صاف جھوٹا کہیں گے کہ تم ہمیں نہیں بلکہ اپنے وہم و گمان اور خیال کو پکارتے اور پوجتے رہے ہو۔ دیکھیے سورۃ یونس (۶۶) اور سورۃ نجم (۲۳) رہا شیطان تو اس نے واقعی انہیں شرک کی دعوت دی تھی، مگر وہ نہایت بے حیائی کے ساتھ ان سے صاف بے تعلق ہو جائے گا۔ دیکھیے سورۃ ابراہیم (۲۲)۔

آیت 87 وَالْقَوْلَ إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلْمَ..... : "السَّلْمَ" کا معنی مطیع ہونا، فرماں بردار ہونا ہے۔ یعنی پہلے تو قسمیں کھا کر اپنے مشرک ہونے کا انکار کرتے رہیں گے، جیسا کہ سورۃ انفعام (۲۲، ۲۳) اور سورۃ مجادلہ (۱۸) میں ہے، پھر اپنے بنائے ہوئے شرکاء کو دیکھ کر انہیں اپنے ساتھ پھنسانے کی کوشش کریں گے، جیسا کہ پچھلی آیت میں گزرا۔ جب وہ بھی انہیں صاف جھوٹا کہیں گے اور ان کے پاس کوئی جواب نہیں رہ جائے گا، تو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ کھڑے کر کے ہر طرح فرماں بردار اور سرتاپا بجز و انکسار بن جائیں گے اور وہ تمام حاجت روا، مشکل کشا، داتا اور دیگر جو انہوں نے بنا رکھے تھے اور جن کی مشکل کشائیوں کی جھوٹی کہانیاں انہوں نے گھڑ رکھی تھیں، سب ان سے گم ہو جائیں گے، کوئی نظر نہیں آئے گا۔ بعض لوگوں کو یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اس مقام کی طرح قرآن کی بہت سی آیات میں مشرکین کا بولنا، عذر کرنا، قسمیں اٹھانا مذکور ہے اور کئی آیات میں ان کے مونہوں پر مہر لگنا یا انہیں بولنے کی اجازت نہ ملنا مذکور ہے۔ ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تظہیر یہ دی ہے کہ یہ سب الگ الگ مواقع کا بیان ہے، کیونکہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا، کبھی ان کا حال کچھ ہوگا کبھی کچھ۔ [مسلم، الزکوٰۃ، باب (ثم مانع الزکوٰۃ : ۶۸۷]

آیت 88 الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا..... ان لوگوں کو ہم عذاب پر عذاب زیادہ کرتے جائیں گے، کیونکہ وہ دوسرے مجرم ہوں گے۔ ایک عذاب ان کے کفر کی وجہ سے اور ایک دوسروں کو اللہ کی راہ، یعنی اسلام سے روکنے کی وجہ سے۔ ان کے گمراہ کردہ لوگوں کو جتنا عذاب ہوگا، ان کے اپنے عذاب کے ساتھ وہ بھی شامل ہو جائے گا، بلکہ قیامت تک ان کے گمراہ کردہ

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَؤُلَاءِ ۗ
وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿۸۸﴾

اور جس دن ہم ہر امت میں ان پر انہی میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور تجھے ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے۔ اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی، اس حال میں کہ ہر چیز کا واضح بیان ہے اور فرماں برداروں کے لیے ہدایت اور رحمت اور خوش خبری ہے ﴿۸۸﴾

لوگوں کی جدوجہد کے نتیجے میں جب بھی کوئی گمراہ ہوگا، تو اس کو دیے جانے والے عذاب جتنا عذاب ان سب لوگوں کے عذاب میں بھی بڑھا دیا جائے گا جو اس کی گمراہی کا باعث بنے۔ یہ آیت بھی دلیل ہے کہ اہل جہنم کے عذاب کے لحاظ سے کئی درجے ہوں گے۔

﴿۲﴾ بِمَا كَانُوا يَفْسِدُونَ : اس فساد کی وجہ سے جو وہ پھیلاتے رہے اور اپنے ساتھ کئی دوسروں کو بھی لے ڈوبے، جیسے ناحق قتل کی رسم کی ابتدا کرنے والا آدم علیہ السلام کا بیٹا تھا۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ مائدہ (۳۲)، سورہ اعراف (۲۸) اور سورہ عنکبوت (۱۲، ۱۳)۔

آیت 89 ﴿۱﴾ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت (۱۲۳) اور سورہ نساء کی آیت (۳۱) "مِنْ أَنْفُسِهِمْ" سے مراد خود ان کے چڑوں اور دوسرے اعضاء کی شہادت بھی ہو سکتی ہے۔ دیکھیے سورہ ظم السجدہ (۲۱، ۲۰)۔

﴿۲﴾ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا : "تِبْيَانًا" مصدر ہے، بیان میں مبالغہ ہے، بہت اچھی طرح بیان کرنا، یعنی حلال و حرام اور ہر اس چیز کا واضح بیان ہے جس پر دنیا و آخرت میں انسان کی ہدایت و گمراہی اور کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے، پھر جن احکام کو قرآن نے مختصر طور پر بیان کیا ہے، یا ان کا بیان چھوڑ دیا ہے ان میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و اتباع فرض قرار دے کر سنت و حدیث کی طرف رجوع کا حکم دیا ہے۔

﴿۳﴾ لِكُلِّ شَيْءٍ : قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک وفد فرمایا: ﴿لَعَنَ اللَّهُ الْوَائِمَاتِ وَالْمُوتِشِمَاتِ وَالْمُتَشَمَّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّحَاتِ لِلْحُسْنِ، الْمُتَغَيَّرَاتِ خَلْقَ اللَّهِ، فَبَلَغَ ذَلِكَ امْرَأَةً مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَهَا أُمُّ يَعْقُوبَ، فَجَاءَتْ فَقَالَتْ إِنَّهُ بَلَغَنِي أَنَّكَ لَعَنْتَ كَيْتَ وَكَيْتَ، فَقَالَ وَمَا لِي لَا أَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ هُوَ فِي كِتَابِ اللَّهِ؟ فَقَالَتْ لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَيْنَ الْمَوْحِينَ فَمَا وَجَدْتُ فِيهِ مَا نَقُولُ، فَقَالَ لَيْنَ كُنْتَ قَرَأْتِيهِ لَقَدْ وَجَدْتِيهِ، أَمَا قَرَأْتِ: ﴿وَمَا أَلْعَنُ الرَّسُولَ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ فَأَلْتِ بَلِي، قَالَ فَإِنَّهُ قَدْ نَهَى عَنْهُ﴾ البخاری، التفسیر، سورة الحشر، باب: ﴿وَمَا أَلْعَنُ الرَّسُولَ فَخُذُوهُ.....﴾ : ۴۸۸۶ | "اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی جو جلد میں سوئی کے ذریعے سے تیل کے ساتھ نقش و نگار

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَ

بے شک اللہ عدل اور احسان اور قربت والے کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور برائی اور سرکشی سے منع کرتا۔

بنائی ہیں اور جو بنوائی ہیں اور جو چہرے کے بال اکھڑواتی ہیں اور جو دانتوں کے درمیان فاصلہ کرواتے ہیں، اللہ کی پیدا کردہ چیز کو بدلتی ہیں۔“ بنو اسد کی ایک خاتون ام یعقوب نامی کو یہ بات پہنچی تو وہ آئی اور کہنے لگی: ”مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے ایسی ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے؟“ انھوں نے فرمایا: ”میں اس پر کیوں لعنت نہ کروں جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت کی ہے اور جو اللہ کی کتاب میں بھی ہے۔“ اس نے کہا: ”میں نے دونوں تختیوں کے درمیان (پورا قرآن) پڑھا ہے، اس میں تو تمھاری یہ بات مجھے نہیں ملی۔“ فرمایا: ”اگر تو نے اسے پڑھا ہوتا تو تجھ مل جاتا، کیا تم نے یہ نہیں پڑھا: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ [الحشر: ۷] اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ۔“ اس نے کہا: ”کیوں نہیں؟“ فرمایا: ”پھر بات یہ ہے کہ ان کاموں سے آپ ﷺ نے منع کیا ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے اپنے الفاظ کے مطابق اس میں ہر چیز کے بیان کا مطلب یہ ہے کہ دین کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے ہر حکم پر عمل کرنا اور ہر نہی سے باز رہنا بھی قرآن ہی کا حصہ ہے۔ مفسر شعراوی نے یہاں شیخ محمد عبدہ مصری کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے، انھوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں بیروت میں تھا، ایک مستشرق (غیر مسلم عربی عالم) نے مجھ سے کہا کہ قرآن میں ہے: ﴿مَا قَرَأْتَ فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ﴾ [الأنعام: ۳۸] ”ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔“ میں نے کہا، ہاں ٹھیک ہے۔ اس نے کہا، اچھا یہ بتاؤ کہ ایک اردب (تقریباً ۳۸ کلو) آٹے کی کتنی روٹیاں بنتی ہیں؟ میں نے کہا، یہ معمولی بات ہے، آدو کسی روٹیاں پکانے والے سے پوچھ لیتے ہیں۔ اس نے کہا، نہیں، میں قرآن میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا، قرآن نے تو بتا دیا ہے: ﴿فَسَنَلِّؤُا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ [الانبیاء: ۷] ”اگر تم نہیں جانتے تو اہل الذکر (اسے سمجھنے والے) سے پوچھ لو۔“ غرض قرآن میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔ مزید تفصیل اسی سورت کی آیت (۶۳) اور اس کے حواشی میں ملاحظہ فرمائیں۔

④ وَهَدَىٰ وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ: یہاں تینوں لفظ اسم فاعل کے بجائے مصدر ذکر فرمائے ہیں، مثلاً ”هَادِي“ کے بجائے ”هَدَى“ اور اسی طرح ”رَحْمَةً“ اور ”بُشْرَى“ فرمایا ہے، ایسا مبالغہ کے لیے کیا جاتا ہے، مثلاً زید کو بہت ہی زیادہ عادل کہنا ہو تو ”زَيْدٌ عَادِلٌ“ کے بجائے کہتے ہیں ”زَيْدٌ عَدْلٌ“ یعنی زید عین عدل ہے۔ مقصد یہ کہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔

آیت 90 ① إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ: عدل کا معنی اپنے عقیدے اور عمل میں زیادتی یا کمی سے بچ کر

اعتدال اور درمیانہ راستہ اختیار کرنا ہے۔ انصاف بھی یہی ہے اور قسط بھی۔ ”الْإِحْسَانُ“ کا لفظ دو طرح آتا ہے، ایک ”إِلٰہی“ یا کسی اور حرف کے واسطے کے بغیر، اس کا معنی کام کو بہت اچھی طرح اور پختگی و مضبوطی سے کرنا ہوتا ہے، مثلاً ”أَحْسَنْتُهُ“ کہہ میں نے یہ کام بہت اچھی طرح کیا، اور ایک ”إِلٰہی“ وغیرہ کے واسطے کے ساتھ، جیسے ”أَحْسَنْتُ إِلٰہِيہ“ کہ میں نے اس سے

النُّكْرَ وَالْبَغْيَ ۖ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۱۰﴾

ہے، وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ﴿۱۰﴾

اچھا سلوک کیا، یعنی اس ”اِحْسَان“ کا معنی اللہ کی مخلوق کو نفع پہنچانا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساری مخلوق کو پیدا کرنے اور ہر نعمت عطا فرمانے کا تقاضا یہ ہے کہ نہ تو اس کے حق میں تفریط (کمی) کی جائے نہ افراط (زیادتی)۔ کمی یہ ہے کہ اس کی ذات کا انکار کیا جائے، یا اس کی صفات (جس طرح اس نے بیان فرمائی ہیں) میں سے کسی صفت کا انکار کیا جائے، اسے تعطیل کہتے ہیں، یا اسے مخلوق کے مشابہ کہا جائے، اسے تشبیہ کہتے ہیں۔ یا اس کا مطلب ایسا نکالا جائے جس سے اس صفت کا انکار لازم آتا ہو، اسے باطل تادل یا تحریف کہتے ہیں۔ یا کہا جائے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ اللہ کی صفات مثلاً سمیع یا بصیر وغیرہ کا مطلب کیا ہے، یہ اللہ ہی جانتا ہے، یہ بھی انکار ہی کی ایک صورت ہے، اسے تفویض کہتے ہیں۔ یہ سب اس ضمن کے حق میں تفریط (کمی) ہے اور عدل و قسط کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں افراط (زیادتی) یہ ہے کہ کسی مخلوق کو اس کی ذات یا کسی صفت میں اس کا شریک مانا جائے، یہ اس اکیلے خالق و مالک کے ساتھ سخت ناانصافی اور ظلم عظیم ہے۔ اس لیے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت میں مذکور عدل کا معنی ”لا الہ الا اللہ“ کی شہادت قرار دیا ہے۔ (طبری بسند حسن: ۲۱۹۹۵)

مخلوق کے بارے میں عدل یہ ہے کہ کسی کو اس کے حق سے نہ کم دیا جائے نہ زیادہ، بلکہ ہر ایک کو اس کا حق پورا پورا دیا جائے، خواہ اپنی ذات پر بوجھ آتا ہو، یا جن کے درمیان آپ فیصلہ کر رہے ہیں ان میں سے کسی ایک سے آپ کی دشمنی یا دوستی ہو، تو کسی کا حق پورا دینے میں وہ دشمنی یا دوستی حائل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بہت تاکید فرمائی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَلِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ [النساء: ۵۸] ”اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔“ اور فرمایا: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَا نَقَوْمِهِمْ عَلَىٰ أَنْ تَتَّخِذُوا اِعْدَائِهِمْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ [المائدة: ۸] ”اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ہرگز اس بات کا مجرم نہ بنا دے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو، یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔“ اور فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا﴾ [النساء: ۱۳۵] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف پر پوری طرح قائم رہنے والے، اللہ کے لیے شہادت دینے والے بن جاؤ، خواہ تمہاری ذاتوں یا والدین اور زیادہ قرابت والوں کے خلاف ہو، اگر کوئی غنی ہے یا فقیر تو اللہ ان دونوں پر زیادہ حق رکھنے والا ہے۔“

② ”الإحسان“ کا مطلب اگر کام کو اچھی طرح کرنا ہو تو اس کی وضاحت حدیث جبریل میں ہے کہ نبی ﷺ نے جبریل علیہ السلام کے سوال کہ احسان کیا ہے؟ اس کے جواب سوال میں فرمایا: ﴿أَنْ تُعْبُدَ اللَّهَ كَمَا نَكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ

يُرَاكَ» [بخاری، الإيمان، باب سؤال جبریل النبی ﷺ عن الإيمان و الإسلام..... : ۵۰ - مسلم : ۸] "احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، سو اگر تم اسے نہ دیکھتے ہو تو وہ تمہیں دیکھتا ہے۔" ظاہر ہے مگرانی کے احساس کے ساتھ ہر کام کرنے والا کام کو اچھے سے اچھا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر ہر کام نماز، روزہ، صدقہ، حج، تجارت، صنعت، زراعت اور مزدوری کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی مگرانی دل میں حاضر ہو کہ پروردگار عالم مجھے دیکھ رہا ہے، تو یقیناً انسان ہر عمل بہترین طریقے سے کرے گا اور ہر گناہ سے بچے گا۔

اور اگر "پالی" کی وجہ سے کسی دوسرے پر احسان مراد ہو تو اس کی بہترین مثال بنی اسرائیل کا قارون سے یہ کہنا ہے:

﴿وَأَخْسِنَ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾ [الفصص : ۷۷] "اور احسان کر جیسے اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔" اللہ نے انسان کو جو کچھ دیا ہے کسی بدلے کی خاطر نہیں دیا، بلکہ یہ اس کا احسان اور بے حد لطف و کرم ہے کہ اس نے مخلوق کے کسی حق کے بغیر جو اللہ کے ذمے ہو، ہر نعمت انھیں مفت دی۔ مقصد یہ کہ انسان مخلوق کے ساتھ اس سے کسی معاوضے کی امید کے بغیر اچھا سلوک کرے، اسے اس کے حق سے زیادہ دے دے۔ رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کے ساتھ بھی احسان کا حکم دیا اور بتایا کہ کس طرح ایک فاحش عورت کتے کو پانی پلانے کے عوض جنت میں گئی اور ایک عورت بلی کو باندھ کر بھوکا مارنے کی پاداش میں جہنم میں گئی۔ (دیکھیے بخاری: ۳۳۲۱، ۲۳۶۵) حتیٰ کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ، وَلْيُحَدِّثْ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، فَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ﴾ [مسلم، الصبيد والذبايح، باب الأمر بإحسان الذبيح والقتل... : ۱۶۵۵، عن شداد بن أوس رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] "اللہ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے، تو جب قتل کرو تو اس کا اچھا طریقہ اختیار کرو (یعنی ایذا دے دے کہ نہ مارو اور نہ مثلہ کرو) اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے کرو، اپنی چھری کو تیز کر لو اور اپنے ذبیحے کو آرام پہنچاؤ۔" قرآن مجید میں کئی جگہ احسان کا حکم اور اس کی فضیلت مذکور ہے، فرمایا: ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ [البقرة : ۸۳ - بنی اسرائیل : ۲۳] "اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔" اور فرمایا: ﴿وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ [البقرة : ۱۹۵] "اور نیکی کرو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔" اور فرمایا: ﴿إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ [الأعراف : ۵۶] "بے شک اللہ کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے۔" اور فرمایا: ﴿وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾ [العنكبوت : ۶۹] "اور بلاشبہ اللہ یقیناً نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

③ **وَإِنَّمَا ذِي الْقُرْبَىٰ:** اگرچہ یہ بھی احسان میں شامل تھا، مگر اس کی خاص تاکید کے لیے اسے الگ بھی بیان فرمایا، کیونکہ قربت والوں کا حق زیادہ ہے اور انھیں دینا ویسے بھی مشکل ہوتا ہے، کیونکہ وہ کم ہی احسان مند ہوتے ہیں اور باہمی رنجش بھی دینے لینے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ "ذی القربی" کو دینے کی آیات کے لیے دیکھیے سورہ روم (۳۸)، بنی اسرائیل (۲۶)، بقرہ (۱۷۷) اور سورہ بلد (۱۵، ۱۴) وغیرہ۔

وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ
اللَّهُ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ﴿۹۱﴾

اور اللہ کا عہد پورا کرو جب آپس میں عہد کرو اور قسموں کو ان کے پختہ کرنے کے بعد مت توڑو، حالانکہ یقیناً تم نے اللہ کو اپنے آپ پر ضامن بنایا ہے۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ﴿۹۱﴾

④ وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ: "الْفَحْشَاءُ" وہ گناہ جو برائی میں حد سے بڑھے ہوئے ہوں، مثلاً زنا اور قوم لوط کا عمل، سورہ بقرہ میں شدید نعل کو بھی "الْفَحْشَاءُ" فرمایا۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۶۸) "الْمُنْكَرُ" ایسی برائیاں جن کا عقل انکار کرتی ہو اور فطرت انسانی بھی انہیں برا سمجھتی ہو۔ "الْبَغْيُ" کسی پر ظلم، زیادتی، زبان درازی یا دست درازی کرنا، سرکشی کرنا۔

⑤ اس آیت میں تین بھلائیوں (عدل، احسان، ایثار ذی القربی) کا حکم دیا گیا ہے، جن میں تمام بنیادی نیکیاں آجاتی ہیں اور تین برائیوں (فحشاء، منکر، بغی) سے منع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات کو بگاڑ کر رکھ دینے والی ہیں، اس لیے یہ قرآن مجید کی جامع ترین آیات میں سے ہے۔

آیت 91 ﴿۹۱﴾ وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ: احکام الہی پورے کرنے کا عہد جو ایمان لانے کی صورت میں کیا ہے، یا آپس میں ایک دوسرے سے جائز طور پر کیے گئے عہد و پیمان۔ (شوکانی) "عَهْدٌ فُتِحَ" باب مفاعلہ سے ہے، مراد کسی دوسرے کے ساتھ کیا ہوا عہد ہے۔

② وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا.....: پکا کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ جن قسموں کو پکا نہ کیا گیا ہو ان کا توڑنا جائز ہے، کیونکہ ہر وہ عہد جس پر قسم کھائی جائے اس پر اللہ تعالیٰ کو ضامن بنایا جاتا ہے اور وہ پکا ہو جاتا ہے اور اسے بلا عذر توڑنا جائز نہیں، بلکہ عہد توڑنا نفاق کی علامت ہے۔ بعض قسمیں انسان خود اٹھا لیتا ہے کہ میں ایسا کروں گا یا نہیں کروں گا۔ اگر انہیں پورا نہ کر سکے تو اس کا کفارہ سورہ مائدہ (۸۹) میں مذکور ہے۔ اسی طرح لغو قسم کا حکم سورہ بقرہ (۲۲۵) اور سورہ مائدہ (۸۹) میں گزر چکا ہے۔

③ جس قسم کے متعلق معلوم ہو جائے کہ اس کا پابند نہ رہنا دینی لحاظ سے بہتر ہے تو وہ قسم توڑ دے اور وہ کام کرے جو بہتر ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ فَرَأَى غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا، فَلْيُكْفِرْ عَنْ يَمِينِهِ وَيُفْعَلْ» (مسلم، الأيمان و النذور، باب ندب من حلف ميميناً فرأى غيرها خيراً منها أن يأنى: ۱۶۵۰/۱۲) "جو شخص کسی بات پر قسم کھائے، پھر اس کے علاوہ دوسرے کام کو اس سے زیادہ اچھا سمجھے تو وہ (دوسرا) کام اختیار کرے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے۔"

④ اگر کسی ناجائز کام کا عہد کرے یا قسم اٹھائے تو اسے پورا کرنا جائز نہیں۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۲۳)۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَقَصَّتْ عَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا ۖ تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ ۗ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ ۗ وَلَئِيبَتِن لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۹۲﴾ ۗ وَكُوشَاءَ اللَّهِ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ۗ وَلَكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۗ وَكُلُّشَلْنٍ عَنَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۹۳﴾

اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت مضبوط کرنے کے بعد ککڑے ککڑے کر کے توڑ ڈالا، تم اپنی قسموں کو اپنے درمیان فریب کا ذریعہ بناتے ہو، اس لیے کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھی ہوئی ہو، اللہ تو تمہیں اس کے ساتھ صرف آزما رہا ہے اور یقیناً قیامت کے دن وہ تمہارے لیے ضرور واضح کرے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۹۲﴾ اور اگر اللہ چاہتا تو یقیناً تمہیں ایک ہی امت بنا دیتا اور لیکن وہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور یقیناً تم اس کے بارے میں ضرور پوچھے جاؤ گے جو تم کیا کرتے تھے ﴿۹۳﴾

آیت ۹۲ ﴿۹۲﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَقَصَّتْ عَزْلَهَا: "غزل" مصدر بمعنی مفعول ہے، فعل "غَزَلَ يَغْزِلُ" (ض) آتا ہے، روئی یا اون کا سوت (دھاگا) بنانا۔ "أَنْكَاثًا" "بِنِگٹ" (نون کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے، ککڑے۔

﴿۹۲﴾ یہ ایک تشبیہ ہے جو قسموں کو پختہ کرنے کے بعد ان کو توڑنے والوں کے لیے بیان کی گئی ہے، ضروری نہیں کہ ایسی عورت کہیں پائی بھی گئی ہو، جو عورت بھی ایسا کرے گی اسے یہی کہا جائے گا کہ یہ کتنی احمق ہے۔ اسی طرح قسمیں توڑنے والوں کا حال بھی اس عورت کا سا ہے، اگرچہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم کی بعض روایات میں ہے کہ مکہ میں ایک پاگل عورت تھی جو سوت کا تھی اور پھر اسے بٹ کر ککڑے ککڑے کر ڈالتی تھی۔

﴿۹۳﴾ تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا: "دَخَلًا" سے مراد دھوکا، فریب اور کھوٹ ہے۔ اصل میں "دَخَلًا" اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیز میں داخل کر دی جائے، جب کہ وہ اس میں سے نہ ہو، مثلاً چائے کی پتی میں پنے کے چھلکے ملا دیے جائیں۔ "أَرْبَىٰ" "رَبَا يَرْبُو" (ن) سے اسم تفضیل ہے، کسی چیز کا زیادہ ہونا، بڑھنا۔

﴿۹۴﴾ یعنی کسی گروہ سے اس لیے بد عہدی نہ کرو کہ جب تم نے عہد باندھا اس وقت تم کمزور تھے اور وہ گروہ طاقتور تھا اور اب تم طاقتور اور وہ کمزور ہو گیا ہے، یا اب تمہیں اس سے زیادہ طاقتور کوئی دوسرا حلیف مل گیا ہے، جیسا کہ اہل جاہلیت کرتے تھے۔ (شوکانی، قرطبی) اور جیسا کہ اس زمانے میں اہل مغرب بلکہ تمام کفار کا عام دستور ہے۔

﴿۹۵﴾ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ: کہ تم اپنے عہد پر قائم رہتے ہو یا دوسرے گروہ کو طاقتور یا کمزور پا کر اپنے عہد کا خیال چھوڑ دیتے ہو۔ (قرطبی)

آیت ۹۳ ﴿۹۳﴾ ۗ وَكُوشَاءَ اللَّهِ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً: یعنی اللہ تعالیٰ کو قدرت تھی کہ تمہارے درمیان

وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا السُّوَاءَ بِمَا صَدَدْتُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۗ إِنَّمَا عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۹۵﴾

اور اپنی قسموں کو اپنے درمیان فریب کا ذریعہ نہ بناؤ، (ایسا نہ ہو) کہ کوئی قدم اپنے جمنے کے بعد پھسل جائے اور تم برائی کا مزہ چکھو، اس کے بدلے جو تم نے اللہ کی راہ سے روکا اور تمہارے لیے بہت بڑا عذاب ہو ﴿۹۴﴾ اور اللہ کے عہد کے بدلے کم قیمت نہ لو، بے شک وہ چیز جو اللہ کے پاس ہے وہی تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ﴿۹۵﴾

اختلافات نہ رہنے دیتا۔ (دیکھیے یونس: ۹۹۔ ہود: ۱۱۸، ۱۱۹) مگر اس کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ تمہیں اپنا اختیار استعمال کرنے کا پورا موقع دے، پھر جو گمراہی پر اصرار کرے اس کی رہی گمراہی کی طرف دراز کر دے اور جو حق کی جستجو کرے اسے ہدایت سے سرفراز کر دے۔ دیکھیے سورہ لیل (۱۰ تا ۱۵)۔

﴿۹۴﴾ وَتَشْتَلْنُنَّ عَنَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ: اس سے معلوم ہوا کہ کافر کو بدعہدی کر کے نہ ماریے، ایسی باتوں سے کفر توختا نہیں لانا وبال آتا ہے۔ (موضح)

آیت 94 ﴿۹۴﴾ وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ یعنی ایسا نہ ہو کہ تمہاری دھوکا دہی اور بدعہدی دیکھ کر کوئی شخص مرتد ہو جائے، یا عہد توڑنے والا شخص خود کفر میں مبتلا ہو جائے۔ زمر شری نے فرمایا کہ ”قَدَمٌ“ کو واحد اور نکرہ اس لیے رکھا کہ بدعہدی کے نتیجے میں ایک شخص کا قدم پھسلنا اور اسلام سے دور ہونا بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑی بات ہے، کجا یہ کہ اس حرکت سے بہت سے لوگ مرتد ہو جائیں۔ پہلے ”تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ“ میں قسم کھا کر دھوکا دینے کا سبب بیان فرمایا، تو اس آیت میں ”لَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا“ فرما کر اس کا برا نتیجہ بیان فرمایا۔

﴿۹۵﴾ بِمَا صَدَدْتُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ: اور تم لوگوں کو اسلام سے روکنے کا ذریعہ بناؤ اور تم پر دنیا ہی میں اس کا وبال آجائے۔
﴿۹۶﴾ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ: اور پھر آخرت کے عذاب عظیم میں مبتلا کر دیے جاؤ۔ مطلب یہ کہ اسلام کو بدنام نہ کرو کہ ایمان لانے والے شک میں پڑ جائیں، جس کا گناہ تم پر پڑے گا۔ (موضح)

آیت 95 ﴿۹۵﴾ وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا: اوپر کی آیات میں باہمی معاہدوں کی پابندی پر زور دیا، اب بتایا کہ ایمان لا کر جو اللہ سے عہد باندھا ہے اسے مت توڑو، یعنی مال کے طمع میں آ کر شریعت کی خلاف ورزی نہ کرو (جس میں باہمی معاہدوں کو توڑنا بھی ہے) جو مال خلاف شرع ہاتھ آئے وہ موجب وبال ہے۔ (موضح) کم قیمت سے مراد یہ نہیں کہ زیادہ قیمت لے لو، بلکہ مراد دنیا کا مال ہے، جو قلیل ہی ہے، خواہ پوری دنیا ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ [النساء: ۷۷] ”کہہ دے دنیا کا سامان بہت ہی تھوڑا ہے۔“

مَا عِنْدَكُمْ يَنْقَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا تَنْ ذَكَرْ أَوْ أَنْتَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۷﴾

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اور یقیناً ہم ان لوگوں کو جنہوں نے صبر کیا، ضرور ان کا اجر بدلے میں دیں گے، ان بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۹۶﴾ جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی اور یقیناً ہم انہیں ان کا اجر ضرور بدلے میں دیں گے، ان بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۹۷﴾

﴿۹۶﴾ اِنَّمَا عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ : یہ ”اِنَّمَا“ کلمہ حصر نہیں بلکہ ”اِنَّ مَا“ ہے، جو مصحف عثمانی کے رسم الخط کے مطابق اکتھا لکھا گیا ہے۔ ”مَا“ موصولہ میں مقدر ضمیر کی تاکید ”هُوَ“ کے ساتھ کرنے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا ہے، یعنی جو مال شریعت کے مطابق ہاتھ آئے وہی تمہارے حق میں بہتر ہے، دوسرا کوئی نہیں، جیسا کہ شعیب ؑ نے فرمایا تھا: ﴿يَقِيْتُ اللَّهُ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ لَّمْ تَكُنْهُ مُؤْمِنِيْنَ﴾ [مؤد: ۸۶] ”اللہ کا باقی بچا ہوا تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم مومن ہو۔“ ”جو اللہ کے پاس ہے“ میں جنت بھی شامل ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ رہنے والی ہے اور دنیا فانی ہے۔

آیت 96 ﴿۹۶﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْقَدُ : چاہے وہ مقدار کے لحاظ سے کتنا ہی زیادہ ہو، بلکہ خواہ ساری دنیا ہو۔

﴿۹۷﴾ وَلَنَجْزِيَنَ الَّذِينَ صَبَرُوا : لام تاکید اور نون ثقیلہ کی تاکید اسٹھ ہوں تو قسم جیسی تاکید کا فائدہ دیتے ہیں۔ صبر کا معنی اپنے آپ کو کسی چیز پر باندھنا اور روک کر رکھنا ہے، یعنی جنہوں نے دنیوی طمع کے مقابلے میں اپنے آپ کو حق پر قائم رکھا۔ صبر بہترین عمل ہے، کیونکہ یہ تمام اعمال کی بنیاد ہے، اس کی تین قسمیں ہیں، اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر قائم رہنا اور طبیعت کو ان کا پابند رکھنا صبر ہے، اسی طرح اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں سے روکنا صبر ہے اور تیسری قسم مصیبت کے وقت جزع فزع اور اللہ تعالیٰ کے شکوے سے اپنے آپ کو روکنا صبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر فرمایا کہ ہم صبر کرنے والوں کو ان کے بہترین اعمال کے مطابق بدلہ دیں گے۔ بہترین عمل سے مراد صبر ہے، یعنی ان کے صبر کے مطابق اجر دیں گے۔ ایک معنی یہ بھی ہے کہ ہم انہیں ان کے عمل سے بہت زیادہ اچھا اجر دیں گے، جو کم از کم دس گنا اور زیادہ سے زیادہ بے حساب ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّمَا يُؤْتِي الضَّيُّوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: ۱۰] ”صرف کامل صبر کرنے والوں کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔“

آیت 97 ﴿۹۷﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا تَنْ ذَكَرْ أَوْ أَنْتَىٰ : لفظ ”مَنْ“ (جو بھی) میں مرد اور عورت دونوں آجاتے ہیں، مگر پھر دونوں کا خاص الگ الگ ذکر فرمایا، تاکہ نہ عورتیں اپنے آپ کو کمتر یا محروم سمجھیں، نہ کوئی اور انہیں ایسا خیال کرے۔ اسلام

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿۹۸﴾ إِنَّكَ لَيْسَ لَهُ سُلْطٰنٌ عَلَى
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۹۹﴾

پس جب تو قرآن پڑھے تو مردود شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کر ﴿۹۸﴾ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کا ان لوگوں پر
کوئی غلبہ نہیں جو ایمان لائے اور صرف اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں ﴿۹۹﴾

کے سوا کہیں عورت کو یہ عزت نہیں ملی۔

﴿۹۸﴾ حَيٰوةٌ طَيِّبَةٌ: پاکیزہ زندگی میں حلال روزی، قناعت (اللہ نے جس حال میں رکھا ہے اسی پر خوش رہنا)، سچی عزت، سکون و
اطمینان، دل کا غمی ہونا، اللہ کی محبت، ایمان کی لذت سبھی چیزیں شامل ہیں، جو ایمان اور عمل صالح کی بدولت نصیب ہوتی ہیں،
ایمان یا عمل صالح یا دونوں سے محروم لوگوں کو یہ چیزیں کبھی حاصل نہیں ہوتیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح سے
اخریٰ زندگی ہی نہیں بلکہ دنیوی زندگی بھی نہایت سکھ اور چین سے گزرے گی۔ مہانگی اللہ نے فرمایا کہ ایسا شخص دنیا میں اپنے
عمل سے ایسی لذت پاتا ہے جو مال و جاہ کی لذت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے اس کی قسمت پر راضی کر
کے اسے قناعت عطا فرمادیتا ہے، جس کے نتیجے میں مال بچا بچا کر رکھنے اور بڑھانے کی حرص کم ہو جاتی ہے۔ کافر کی زندگی مال و جاہ
کے باوجود خوشگوار نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی حرص اور دولت کے ہاتھ سے نکل جانے کا خوف دونوں بڑھتے جاتے ہیں۔
اہل ایمان کو آخرت میں اس سے بھی بہت بہتر اجر بدلے میں دیا جائے گا۔ چنانچہ ان سے یہ نہیں کہا جائے گا: ﴿أَذْهَبْتُمْ
طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا﴾ [الأحقاف: ۲۰] ”تم اپنے اچھے اعمال کا بدلہ اپنی دنیا کی زندگی میں لے چکے۔“ بلکہ ان کے
اولیٰ اعمال بھی مکمل کر کے اعلیٰ کے ساتھ ملا دیے جائیں گے۔

آیت 98 ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ﴾: ہدایت کا سرچشمہ قرآن کریم ہے، ادھر گمراہی کا سرچشمہ شیطان ہے،
جو انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اسے کسی صورت آدمی کا قرآن پڑھنا برداشت نہیں، سو وہ ہر حال میں اسے قرآن پڑھنے سے
باز رکھتا ہے اور اگر کوئی پڑھنے لگے تو اس کے دل میں دوسے ڈال کر گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لیے فرمایا کہ جب تم قرآن پڑھنے
لگو تو شیطان سے اللہ کی پناہ مانگ لو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پڑھنے سے پہلے ”أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ یا
اس سے ملتے چلتے الفاظ کے ساتھ اللہ کی پناہ کی دعا کرنا ضروری ہے، کیونکہ وہی ہمیں اس ظالم سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ شیطان
انسان بھی ہوتے ہیں، جن بھی۔ (دیکھیے انعام: ۱۱۲) ان سے پناہ کی دعا کے ساتھ ان سے بچنے کے ذرائع اختیار کرنا بھی ضروری
ہے۔ اگر کوئی شخص ان سے میل جول اور دلی دوستی رکھے اور ”أَعُوذُ بِاللَّهِ“ پڑھ کر اپنے آپ کو ان سے محفوظ سمجھے تو اس کی مثال
اس شخص کی سی ہے جو توپ کے گولوں سے اوٹ لیے بغیر اللہ سے پناہ مانگتا رہے اور اپنے آپ کو گولوں سے محفوظ سمجھے۔

آیت 99 ﴿إِنَّكَ لَيْسَ لَهُ سُلْطٰنٌ عَلَىٰ﴾: شیطان کا صحیح ایمان اور توکل والوں پر تسلط اور غلبہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے
شروع ہی میں فرما دیا تھا: ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِينَ﴾ [الحجر: ۴۲]

إِنَّمَا سُلْطَنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿۱۰۰﴾ وَإِذَا بَدَلْنَا آيَةً مَكَانَ آيَةٍ وَلَا اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۰۱﴾

اس کا غلبہ تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں اور جو اس کی وجہ سے شریک بنانے والے ہیں ﴿۱۰۰﴾ اور جب ہم کوئی آیت کسی دوسری آیت کی جگہ بدل کر لاتے ہیں اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو وہ نازل کرتا ہے، تو وہ کہتے ہیں تو تو گھڑ کر لانے والا ہے، بلکہ ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۱۰۱﴾

”بے شک میرے بندے، تیرا ان پر کوئی غلبہ نہیں، مگر جو گمراہوں میں سے تیرے پیچھے چلے۔“ البتہ وہ انہیں گمراہ کرنے کی کوشش سے باز نہیں آتا اور بعض اوقات وہ کچھ متاثر بھی ہو سکتے ہیں، مگر وہ اللہ سے ذری برکت سے فوراً آگاہ ہو کر اس کے پنے سے نکل جاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ ظَلِيمٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ﴾ [الأعراف: ۲۰۱] ”یقیناً جو لوگ ڈر گئے، جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی (برا) خیال چھوٹا ہے وہ ہشیار ہو جاتے ہیں، پھر اچانک وہ بصیرت والے ہوتے ہیں۔“ اور دیکھیے سورہ حج (۵۳)۔

آیت 100 ﴿وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ﴾: ”یہ“ میں ”وہ“ کی ضمیر شیطان کی طرف جائے تو باء سببیہ ہوگی اور معنی ہوگا کہ وہ لوگ جو اس (شیطان) کی وجہ سے شریک بنانے والے ہیں۔ متن میں ترجمہ اس کے مطابق کیا گیا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جائے، پھر معنی یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو اس (اللہ) کے ساتھ شریک بنانے والے ہیں، یہ معنی بھی درست ہے۔

آیت 101 ﴿وَإِذَا بَدَلْنَا آيَةً مَكَانَ آيَةٍ﴾: یعنی پہلی آیت کا حکم منسوخ کر کے نیا حکم نازل فرماتے ہیں۔ نسخ پر بحث کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت (۱۰۶) اب یہاں سے کفار کے شبہات کا جواب دیا جا رہا ہے۔ (شوکانی)

﴿بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾: یعنی ان کے اکثر لوگ نسخ کی وجہ سے آپ ﷺ کو مفتری اس لیے کہتے ہیں کہ انہیں پہلی شریعتوں کا علم نہیں، اگر ہوتا تو سمجھ لیتے کہ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ سے قاعدہ رہا ہے کہ وہ ایک حکم اتارتا ہے اور پھر جب چاہتا ہے اسے منسوخ کر کے دوسرا حکم دے دیتا ہے۔ ”اَكْثَرُهُمْ“ اس لیے فرمایا کہ کچھ لوگ سب کچھ جاننے کے باوجود ضد اور عناد کی وجہ سے آپ کو مفتری کہتے ہیں۔

﴿اس آیت کے دو مفہوم ہیں، ایک وہ جو اوپر گزرا، وہاں ”آیۃ“ سے مراد شرعی آیت اور حکم ہے، دوسرا معنی نشانی اور معجزہ ہے۔ اس وقت ”آیۃ“ سے مراد آیت کونہی ہوگی، مثلاً ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں نہ جلنا، عصائے موسیٰ، ید بیضا، اللہ کے حکم سے مردہ کو زندہ کرنا وغیرہ۔ امت محمد ﷺ میں اللہ تعالیٰ نے آیات کونہی کا نظام بھی بدل دیا اور بطور معجزہ بھی قرآن ہی نازل فرمایا اور صرف کسی ایک سورت کے مقابلے کا پیشخ دیا، جس کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا، نہ دے سکے گا۔ باقی انبیاء کی آیات یعنی معجزوں کے بدلے یہ آیت یعنی معجزہ ایسا نازل ہوا جو آپ کے بعد قیامت تک موجود ہے۔ جب کچھ جواب نہ آیا تو آپ کو مفتری کہہ دیا، فرمایا نبی مفتری نہیں بلکہ یہ بے چارے بے علم ہیں۔

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَى
 لِلْمُسْلِمِينَ ﴿۱۰۲﴾ وَ لَقَدْ نَعَّمْنَا أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ
 إِلَيْهِ أَعْجَبِي وَ هَذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ ﴿۱۰۳﴾

کہہ دے اسے روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے، تاکہ ان لوگوں کو ثابت قدم رکھے جو ایمان لائے اور فرماں برداروں کے لیے ہدایت اور خوش خبری ہو ﴿۱۰۲﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں اسے تو ایک آدمی ہی سکھاتا ہے، اس شخص کی زبان، جس کی طرف وہ غلط نسبت کر رہے ہیں، عجیبی ہے اور یہ واضح عربی زبان ہے ﴿۱۰۳﴾

تیت 102 ﴿۱﴾ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ: ”نزل“ میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے کا معنی پایا جاتا ہے۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۱۰۶) ”رُوحُ الْقُدُسِ“ یعنی جبرئیل علیہ السلام، یہاں ”رُوحُ“ (موصوف) ”الْقُدُسِ“ (صفت) کی طرف مضاف ہے جو مصدر ہے۔ اس کا معنی طہر اور پاکیزگی ہے، مگر یہاں مصدر بمعنی اسم مفعول ”مُقَدَّسٌ“ ہے، یعنی ”الرُّوحُ الْمُقَدَّسُ“ مبالغے کے لیے اسم مفعول کی جگہ مصدر لائے ہیں، یعنی وہ روح جو سراپا پاکیزگی و طہارت ہے، جیسے ”رَجُلٌ صِدْقِي“ اور ”خَيْرٌ سُوءًا“ ہے، جو اصل میں ”الرَّجُلُ الصَّادِقُ“ اور ”الْخَيْرُ السَّيِّئُ“ تھا۔ ”مِنْ رَبِّكَ“ کا مطلب ہے کہ قرآن نازل کرنا اللہ کی طرف سے ہے، کسی مخلوق کا کلام نہیں اور اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے، ورنہ تربیت کمال نہ ہو سکتی اور ”بِالْحَقِّ“ کا مطلب ہے کہ اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو باطل ہو، یہ آپ ﷺ سے لے کر قیامت تک کے تمام ادوار کے تقاضوں کے عین مطابق اور حق ہے۔

﴿۲﴾ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا: تاکہ وہ ایمان والوں کو ایمان پر خوب قائم رکھے اور وہ ناسخ و منسوخ دونوں کو اللہ کی طرف سے سمجھیں۔ اس لیے جب وہ اس حکمت کو سمجھیں گے جو بعض احکام کے ناسخ و منسوخ ہونے میں پائی جاتی ہے تو ایمان پر ان کے قدم جمیں گے اور ان کے عقائد پختہ ہوں گے۔ شاہ عبد القادر ڈھلے لکھتے ہیں: ”قرآن پاک میں اکثر اللہ تعالیٰ نے نسخ فرمایا ہے، اس پر کافر شبہ کرتے ہیں، اس کا جواب سمجھا دیا، یعنی ہر وقت پر موافق اس وقت کے حکم بھیجے تو یقین والوں کا ایمان قوی ہو کہ ہمارا رب ہر حال سے خبر رکھتا ہے۔“ (موضح)

﴿۳﴾ وَ هُدًى وَ بُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ: ”هُدًى“ یعنی ہر حال میں اس کے مطابق راہ سجدہ دے اور ”بُشْرَى“ ہر کام پر دینی خوش خبری سنا دے۔ (موضح) اس کا صحیح اور مکمل مطلب سمجھنے کے لیے سورہ عنکبوت کی آیات (۵۰، ۵۱) کی تفسیر ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

تیت 103 ﴿۱﴾ وَ لَقَدْ نَعَّمْنَا أَنَّهُمْ يَقُولُونَ.....: یہ قرآن پر ان کا دوسرا طعن تھا۔ اس شخص کی تعین میں کئی روایات ہیں، بعض میں اس کا نام بلعام بتایا گیا ہے، بعض میں مقیس، بعض میں ابن الحضرمی کا ایک غلام۔ مگر ان میں سے صحیح روایت

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيهِمُ اللَّهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۰۴﴾ إِنَّمَا يَفْتَرِي
الْكُذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكٰذِبُونَ ﴿۱۰۵﴾

بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اللہ انہیں ہدایت نہیں دیتا اور انہی کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۰۴﴾ جھوٹ تو وہی لوگ باندھتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے اور وہی لوگ اصل جھوٹے ہیں ﴿۱۰۵﴾

وہ ہے جو عبد اللہ بن مسلم الحضری نے بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے دو عیسائی غلام تھے جو ”عین التمر“ کے باشندے تھے۔ ایک کا نام بیارتھا، دوسرے کا جبر، وہ دونوں اپنی کوئی کتاب پڑھا کرتے تھے، بعض اوقات رسول اللہ ﷺ ان کے پاس سے گزرتے تو ٹھہر جاتے۔ مشرکین کہنے لگے، محمد (ﷺ) ان دونوں سے سیکھتا ہے، تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (طبری: ۲۲۰۷۳) ”الاستیعاب فی بیان الاسباب“ میں اسے صحیح اور دوسری روایات کو ضعیف کہا گیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی ”الاصابة“ میں اسے صحیح کہا ہے۔ بہر حال صرف چند لمحے اس شخص کے پاس ٹھہرنے سے انھوں نے آپ ﷺ کو اس کا شاگرد اور قرآن کو اس کا کلام ہونے کا بہتان جڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جس کی طرف یہ لوگ غلط نسبت کر رہے ہیں وہ خود غبی ہے، جبکہ قرآن فصیح ترین عربی ہے۔

﴿۱۰۴﴾ آلوسی نے فرمایا: ”قرآن نے اس شخص کے نام کی تصریح نہیں کی، حالانکہ اس میں کفار کا جھوٹ زیادہ واضح ہوتا، اس لیے کہ بتانا یہ مقصود ہے کہ ان کی اصل غلطی کسی خاص شخص کو آپ کا معلم قرار دینا نہیں بلکہ کسی بھی بشر کو آپ کا معلم قرار دینا ہے۔“ روح القدس کے ذریعے سے نازل شدہ اللہ کے کلام کی اس سے بڑھ کر کیا توہین ہوگی کہ اسے کسی آدمی کا کلام کہا جائے، خواہ وہ کتنا بڑا عالم ہو۔

آیت 104 إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ.....: ہدایت کا معنی سیدھی راہ دکھانا بھی ہے اور اس پر چلنے کی توفیق دینا بھی۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے۔ یعنی جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے اللہ تعالیٰ انہیں راہ راست کی ہدایت نہیں دیتا۔ وہی اس قسم کی بے سرو پا باتیں کیا کرتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ قرآن جیسی فصیح و بلیغ کتاب کو ایسا شخص تصنیف کر ڈالے جس کی اپنی زبان عربی نہیں ہے۔

آیت 105 ﴿۱﴾ إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكُذِبَ.....: کفار کا قول جو اوپر آیت (۱۰۴) میں ذکر ہوا ہے ”إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ“ (تو تو گھڑ کر لانے والا ہے) یہ اس کا رو ہے کہ جھوٹ تو ان لوگوں کا کام ہے جو ایمان نہیں رکھتے، کیونکہ انہیں اللہ کا خوف نہیں ہوتا، جسے اللہ کا خوف ہو وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ باقی رہا نبی تو وہ اہل ایمان کا سردار ہوتا ہے، اس سے قطعی بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایک لفظ بھی جھوٹ باندھے۔

﴿۲﴾ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكٰذِبُونَ: ”أُولَٰئِكَ“ سے مراد اللہ پر ایمان نہ رکھنے والے ہیں، یعنی انہی کی عادت جھوٹ ہوتی ہے، کیونکہ وہ ایمان ہی سے محروم ہیں، جو آدمی کو گناہ سے باز رکھتا ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مِنْ أَكْرَهٍ وَ قَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَ لَكِنَّ

جو شخص اللہ کے ساتھ کفر کرے اپنے ایمان کے بعد، سوائے اس کے جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن

③ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا اتَّخَذَ نَحْوًا» [بخاری، الإیمان، باب علامات المنافق: ۳۳] "منافق کی نشانیاں تین ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وہ وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔"

شیخ عبد الرحمن مطعی نے "التسکيل" میں لکھا ہے کہ اگر غور کیا جائے تو منافق کی تینوں نشانیوں کی بنیاد جھوٹ ہی ہے، کیونکہ وعدہ خلافی پر مواخذہ اس وقت ہے جب وعدہ کرتے وقت اسے پورا کرنے کی نیت نہ ہو، اگر وعدہ کرتے وقت پورا کرنے کی نیت ہو، پھر کسی عذر سے پورا نہ کر سکے تو اس پر مواخذہ نہیں اور خیانت ہضم نہیں ہو سکتی جب تک جھوٹ نہ بولے۔

آیت 106 ① مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ..... طبری نے معبر سند کے ساتھ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول

نقل فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: «مَنْ كَفَرَ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ فَعَلَيْهِ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ فَأَمَّا مَنْ أَكْرَهَ فَتَكَلَّمَ بِهِ لِسَانَهُ وَ خَالَفَهُ قَلْبُهُ بِالْإِيمَانِ لِيُنْحَوِيَ بِذَلِكَ مِنْ عَدُوِّهِ فَلَا حَرَجَ عَلَيْهِ لِأَنَّ اللَّهَ تَأْخُذُ الْعِبَادَ بِمَا عَقَدَتْ عَلَيْهِ قُلُوبُهُمْ» [طبری: ۳۰۵/۱۷] "جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے اس پر اللہ تعالیٰ کا بھاری غضب ہے اور اس کے لیے عذاب عظیم ہے، لیکن جسے مجبور کر دیا جائے اور وہ زبان سے کوئی بات کہہ دے، جب کہ اس کا دل ایمان کی وجہ سے اس کے خلاف ہو، تاکہ اس کے ساتھ دشمن سے جان بچالے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ اللہ سبحانہ بندوں کو صرف اس چیز پر پکڑتا ہے جو ان کے دلوں کا پکا عقیدہ ہو۔"

③ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: «كَانَ أَوَّلَ مَنْ أَظْهَرَ إِسْلَامَهُ سَبْعَةٌ: رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَبُو بَكْرٍ، وَعَمَارٌ، وَأُمُّهُ سُمَيَّةٌ، وَصُهَيْبٌ، وَبِلَالٌ، وَالْمِقْدَادُ، فَأَمَّا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَمَنْعَهُ اللَّهُ بَعِيَهُ أَبِي طَالِبٍ، وَأَمَّا أَبُو بَكْرٍ فَمَنْعَهُ اللَّهُ بِقَوْمِيهِ، وَأَمَّا سَائِرُهُمْ، فَأَخَذَهُمُ الْمُشْرِكُونَ وَالْيَسُوهُمْ أَذْرَاعَ الْحَدِيدِ وَ صَهَرُوهُمْ فِي الشَّمْسِ، فَمَا مِنْهُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وَاتَاهُمْ عَلَى مَا أَرَادُوا، إِلَّا بِلَالًا، فَإِنَّهُ هَانَتْ عَلَيْهِ نَفْسُهُ فِي اللَّهِ، وَهَانَ عَلَى قَوْمِهِ، فَأَخَذُوهُ، فَأَعْطَوْهُ الْوِلْدَانَ، فَجَعَلُوا يَطْلُقُونَ بِهِ فِي شِعَابِ مَكَّةَ وَهُوَ يَقُولُ: أَحَدًا، أَحَدًا» [ابن ماجہ، السنۃ، باب فضل سلمان و أبي ذر و المقداد رضی اللہ عنہم: ۱۵۰] قال البوصيري رجاله ثقات و

قال الحاكم صحيح الاسناد و آفره الذهبي، وقال الألباني حسن [سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا وہ سات آدمی تھے، رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمار، ان کی والدہ سیمہ، صہیب، بلال اور مقداد رضی اللہ عنہم کو تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا ابوطالب کے ذریعے سے محفوظ رکھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کے ذریعے سے محفوظ رکھا۔ باقی سب کو مشرکین نے پکڑا اور انہیں لوہے کی زر میں پہنا کر دھوپ میں جھلنے کے لیے پھینک دیا، چنانچہ وہ جتنے تھے سب نے اس

مَنْ شَرَحَ بِالْكَفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ ۗ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۵﴾

ہو اور لیکن جو کفر کے لیے سینہ کھول دے تو ان لوگوں پر اللہ کا بڑا غضب ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ﴿۱۵﴾

کے مطابق کہہ دیا جو کفار چاہتے تھے سوائے بلال رضی اللہ عنہ کے۔ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں اس کے نزدیک اس کی جان بے قدر و قیمت ٹھہری (اور اس نے اس کی کوئی پروا نہ کی) اور وہ ان لوگوں کی نظر میں ایسا بے قدر و قیمت ٹھہرا کہ انھوں نے اسے پلا کر بچوں کو دے دیا، وہ اسے لے کر مکہ کی گھاٹیوں میں گھومتے پھرتے اور وہ احد احد (اللہ ایک ہے، ایک ہے) کہتا رہتا۔“

۱۵ اوپر کفار کے شبہات ذکر کر کے اس شخص کا حکم بیان فرمایا جو ایسے شبہات سے متاثر ہو کر ایمان سے پھر جائے اور شرح صدر کے ساتھ کفر قبول کر لے کہ اس پر رب تعالیٰ کا بھاری غضب ہے اور اس کے لیے عذاب عظیم ہے۔ ”إِلَّا مَن أَكْرَهَ“ کے ساتھ اس شخص کے بارے میں فرمایا جس پر کوئی ظالم جبر کرے اور وہ اپنی جان بچانے کی خاطر کلمہ کفر زبان سے کہہ دے، یہ رخصت ہے، لیکن اگر کوئی شخص مرنا قبول کر لے اور منہ سے بھی کلمہ کفر یا خلاف اسلام کوئی بات نہ نکالے تو یہ عزیمت ہے اور ایسا شخص بہت بڑا شہید ہوگا، جیسا کہ اللہ کے پیغمبروں مثلاً ابراہیم اور مسیح علیہ السلام نے موت کے خوف سے کلمہ کفر نہیں کہا اور شہادت قبول کی، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بچا لیا۔ اسی طرح اصحاب الاضداد کا اور سورہ لیس میں مذکور شہید ہونے والے شخص کا واقعہ ہے اور اسلام میں تو اس کی بے شمار مثالیں ہیں، جیسا کہ بلال رضی اللہ عنہ اور دوسرے اصحاب و تابعین۔

۱۶ بعض لوگوں نے جو ابوبکر، عمر، عثمان اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھتے ہیں، جب دیکھا کہ علی، حسن، حسین اور دوسرے بنی ہاشم رضی اللہ عنہم نے تینوں خلفاء کی بیعت کر لی، جو ان کے خلیفہ برحق ہونے کی دلیل ہے تو ان دشمنان صحابہ نے یہ بات بتائی کہ انھوں نے یہ کام مجبوری کی بنا پر تقیہ سے کیا تھا، حالانکہ تقیہ تو ایک رخصت ہے جو کمزور لوگوں کا کام ہے، شیر خدا بھی تقیہ کرے تو حق کا اعلان اور عزیمت پر عمل کون کرے گا۔ پھر تقیہ کا بہانہ بنانے والوں کی کتاب ”الکافی“ میں لکھا ہے کہ ان کے امام اپنی موت کا وقت جانتے ہیں اور ان کی مرضی ہوتی ہے تو مرتے ہیں۔ تو ان کے قول کے مطابق پہلے امام علی رضی اللہ عنہ کو جب اپنی موت کا علم تھا کہ عبد الرحمن بن ملجم کے ہاتھوں ہوگی تو انھیں کون سی مجبوری تھی کہ خلفائے ثلاثہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے، یا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اپنی نیت جگہرام کلثوم کا نکاح کرتے؟

۱۷ علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ زبردستی کروایا ہوا کوئی قول یا فعل معتبر نہیں، اس سے نہ طلاق واقع ہوتی ہے، نہ نکاح، نہ غلام آزاد کرنا، نہ کسی کے نام جائیداد لگوانا، نہ کوئی اقرار یا انکار یا کفر یہ بات کرنا، ہاں جو کچھ وہ شرح صدر کے ساتھ کرے وہ معتبر ہوگا۔ (سیوطی فی الاکلیل)

۱۸ فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ: دنیا میں اللہ کا بڑا غضب یہ ہے کہ مرتد ہونے والا مرد ہو یا عورت اگر توبہ نہ کرے تو اس کا قتل واجب ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ» [بخاری، استنباب المرتدین والمعاندین و قتالہم، باب حکم المرتد.....: ۶۹۲۲] ”جو شخص اپنا دین بدلے اسے قتل کر دو۔“ اور آخرت میں

ذٰلِكَ يَأْتُهُمْ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اُوَلَيْكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَى قُلُوْبِهِمْ وَاَسْمَعَهُمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۗ وَاُوَلَيْكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ اَنْتُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا قُتِلُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَاَصْبَرُوْا ۗ اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَعَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

یہ اس لیے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں محبوب رکھا اور اس لیے کہ اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۱۰۷﴾ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں اور ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور یہی لوگ ہیں جو بالکل غافل ہیں ﴿۱۰۸﴾ کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ، آخرت میں وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۱۰۹﴾ پھر بے شک تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے وطن چھوڑا، اس کے بعد کہ فتنے میں ڈالے گئے، پھر انھوں نے جہاد کیا اور صبر کیا، یقیناً تیرا رب اس کے بعد ضرور بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۱۰﴾

عذاب عظیم کی عظمت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

﴿۱۰۷﴾ بعض لوگوں نے اپنے پاس سے کہا کہ عورت مرتد ہو جائے تو قتل نہیں کی جائے گی، یہ بات درست نہیں، کیونکہ ”مَنْ“ میں مرد و عورت سبھی شامل ہیں اور عورت کے سستی ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔

آیت 107 ذٰلِكَ يَأْتُهُمْ اسْتَحَبُّوا : عذاب عظیم کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور کفر اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ کی طرف سے توفیق ہدایت سے بھی محروم ہو گئے۔

آیت 108 اُوَلَيْكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَى قُلُوْبِهِمْ : دیکھنے اور سننے سے حق دکھائی اور سنائی دیتا ہے اور سوچنے سے سمجھ میں آتا ہے، مگر ان کے عقائد اور ضد کی وجہ سے ان تینوں چیزوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی، سو وہ حق کی طلب میں انھیں استہمال ہی نہیں کرتے، بلکہ آخرت سے بالکل بے خبر اور بے فکر ہیں۔

آیت 109 لَا جَرَمَ اَنْتُمْ فِي الْاٰخِرَةِ : انسان دنیا میں آخرت کے حصول کی تجارت کے لیے آیا ہے، جب وہی حاصل نہ ہوئی تو اس کے خسارے میں کیا شک ہے۔ دیکھیے سورہ عصر۔

آیت 110 ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا : مکہ کے بعض مسلمان کافروں کے مظالم سے تنگ آ کر بظاہر کچھ پلک کھا گئے، یا بعض ناجائز الفاظ منہ سے کہنے پر مجبور ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے، مگر اس کے بعد انھوں نے ایمان کے تقاضے ممکن حد تک پورے کیے، یعنی ہجرت کی، جہاد میں حصہ لیا اور اپنے موقف پر خوب ڈٹے رہے، اس پر

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ مُّجَادِلٌ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوْفَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١١١﴾
 وَصَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ
 فَكَفَرَتْ بِأَنْعَمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿١١٢﴾

جس دن ہر شخص اس حال میں آئے گا کہ اپنی طرف سے جھگڑ رہا ہوگا اور ہر شخص کو پورا دیا جائے گا جو اس نے کیا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا ﴿۱۱۱﴾ اور اللہ نے ایک ہستی کی مثال بیان کی جو امن والی، مطمئنان والی تھی، اس کے پاس اس کا رزق کھلا ہر جگہ سے آتا تھا، تو اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا، اس کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۱۲﴾

اللہ تعالیٰ نے ان کی وہ غلطی معاف فرمادی۔

آیت ۱۱۱ : ﴿يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ﴾: یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لیے مغفور و رحیم ہے اس دن جب.....

﴿مُجَادِلٌ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوْفَىٰ﴾: یعنی اس دن ہر مرد و عورت صرف اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوگا، نہ اسے کسی کی فکر ہوگی نہ کسی کو اس کی۔ ہر ایک بس اپنی ذات کے دفاع کے لیے بحث اور عذر بہانے کر رہا ہوگا، پھر ہر ایک نے جو کیا اسے اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا، کسی پر ظلم نہ ہوگا۔

آیت ۱۱۲ : ﴿وَصَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً﴾: اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے آخرت کے عذاب کا ذکر فرمایا، اس کے

بعد دنیا میں بھی کفران نعمت کی سزا خوف اور بھوک کا ذکر کیا، اس لیے آیت کی ابتدا میں واؤ عطف آئی ہے۔ (قاسمی)

﴿كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً﴾: یعنی اس ہستی کو نہ باہر سے دشمن کا کھٹکا تھا، نہ اندر سے کسی طرح کی فکر و تشویش۔ اس سے مراد کوئی بھی ایسی ہستی ہو سکتی ہے، جیسے عاد و ثمود اور فرعون کی قوم کی بستیاں، مگر مکہ معظمہ میں یہ اوصاف سب سے زیادہ موجود تھے۔ پورے عرب میں کسی کو امن میسر نہ تھا، کسی بھی وقت کسی بھی قبیلے پر حملہ ہو سکتا تھا۔ مرد قتل، عورتیں اور بچے لوٹدی و غلام اور مال مویشی غنیمت بن جاتے۔ کوئی سفر کرتا تو اسے اغوا کر کے بیچ دیا جاتا یا قتل کر دیا جاتا۔ ان کی معیشت بھی نہایت تنگ تھی، وہ اپنے ریوڑ لے کر پانی کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے۔ صرف مکہ میں بیت اللہ کی حرمت کی وجہ سے مکمل امن تھا اور پوری دنیا سے لوگ حج و عمرہ کے لیے آتے تو اہل مکہ کو ان سے خرید و فروخت اور کرایہ مکان وغیرہ کی صورت میں وافر رزق مل جاتا اور ہر قسم کا پھل اور سبزی اور ضرورت کی ہر چیز میسر رہتی۔ اہل مکہ سردی میں یمن کو تجارتی قافلے لے جاتے اور گرمی میں شام کو۔ ان کے قافلوں کو حرم کے احترام میں کوئی کچھ نہ کہتا، جب کہ دوسرے کسی قافلے کا زبردست جنگجوؤں کی معیت کے بغیر سفر کرنا ہی ناممکن تھا۔ ہاں حرمت کے چار مہینوں میں پورے عرب میں امن ہوتا، وہ بھی بیت اللہ کے حج و عمرہ کے احترام کی خاطر۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ قریش، سورہ قصص (۵۷)، عنکبوت (۶۷)، آل عمران

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ﴿۱۱۳﴾

اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس انہی میں سے ایک رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا، تو انہیں عذاب نے اس حال میں پکڑ لیا کہ وہ ظالم تھے ﴿۱۱۳﴾

(۹۷) اور سورہ بقرہ (۱۲۵)۔

﴿۱۱۳﴾ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ : ”أَنْعَمٌ“ ”بِعَمَّةٍ“ کی جمع ہے، جیسا کہ ”أَشُدُّ“ ”شِدَّةٌ“ کی۔ بعض کہتے ہیں ”نُعْمَى“ کی جمع ہے، جیسے ”بُؤْسَى“ کی جمع ”أُبُؤْسٌ“ ہے۔ (قرطبی) اس بستی والوں کی ناشکری اور احسان ناشناسی کی وجہ سے اس واطمینان کی جگہ خوف و ہراس نے اور فرافی رزق کی جگہ بھوک نے انہیں اس طرح گھیر لیا جیسے کپڑا اپنے سینے والے کو گھیر لیتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے کلام میں عجیب جامعیت ہے، بھوک اور خوف کی تلخی کے اظہار کے لیے ”فَأَذَاقَهَا“ (اس کو چکھایا) کا لفظ استعمال فرمایا اور اس عذاب کے چٹ جانے کو لباس بن جانے کے ساتھ تعبیر کیا اور ایک لمبی بات کو دو لفظوں میں سمیٹ دیا۔ اس استعارے کی لذت مومن عالم ہی اٹھا سکتا ہے، اس جاہل و لہو کو اس لذت کی کیا خبر جس نے کہا کہ بھلا لباس بھی چکھا جاتا ہے؟

آیت 113 : وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ : یہ ان احسانات میں سے ایک بہت بڑا احسان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک رسول ان کی طرف بھیجا۔ غالباً اسی لفظ کو بنیاد بنا کر اکثر مفسرین نے اس بستی سے مراد مکہ معظمہ لیا ہے، ورنہ اس کی تعین کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ پہلے رسولوں کی کوئی بستی بھی مراد ہو سکتی ہے اور ان کی طرف آنے والا رسول بھی۔ البتہ اس سے مکہ بالادولی مراد ہے۔ یہاں جس بھوک اور خوف کا لباس چکھانے کا ذکر ہے اس کی تفصیل عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی ہے کہ نبی ﷺ نے جب لوگوں (کے ایمان لانے) سے گریز کو دیکھا تو آپ نے عرض کیا: ﴿اللَّهُمَّ سَبِّعَا كَسْبِعَ يُوسُفَ﴾ ”اے اللہ! یوسف (علیہ السلام) کے سات سالوں جیسے سات سال مسلط فرما۔“ تو انہیں ایسی قحط سالی نے آکپڑا جس نے ہر چیز کو تباہ و برباد کر دیا، یہاں تک کہ وہ چمڑے، مردار اور لاشیں بھی کھا گئے، بھوک کی وہ شدت تھی کہ ان میں سے کوئی آسمان کی طرف دیکھتا تو اسے دھواں نظر آتا۔ [بخاری، الاستسقاء، باب دعاء النبی ﷺ : اجعلها سنين... : ۱۰۰۷] ادھر مسلمانوں کے ساتھ ہر وقت جنگ کی وجہ سے باہر سے آنے والے لوگوں کی آمد بھی رک گئی اور خوف کی یہ حالت تھی کہ وہ ہر وقت مکہ میں اور مکہ سے باہر بھی مسلمانوں کے حملے سے خوف زدہ رہتے تھے۔ بہر حال شوکانی اور کئی مفسرین کہتے ہیں کہ ان آیات میں کسی متعین بستی کا ذکر نہیں ہے، محض ایک تباہ شدہ بستی کی مثال دے کر اہل مکہ کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر تم نے ہماری نعمتوں خصوصاً رسول ﷺ کی ناشکری کی تو تمہارے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا جائے گا۔ شاہ عبدالقادر بریلوی لکھتے ہیں: ”ایسے بہت سے شہر ہوتے ہیں، پر احوال فرمایا کے کا۔“ (موضع)

فَكُلُوا مِنَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا ۖ وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِنَّ كُنتُمْ لِيَآئِهِ تَعْبُدُونَ ﴿۱۱۴﴾
 إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْبَيْتَةَ وَالْدَّمَ وَلَحْمَ الْخُزَيْرِ وَمَا أَهَلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۖ فَمَن
 اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۱۵﴾

سو کھاؤ اس میں سے جو اللہ نے تمہیں حلال، پاکیزہ رزق دیا ہے اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو ﴿۱۱۴﴾ اس نے تو تم پر صرف مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ چیزیں حرام کی ہیں جن پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے، پھر جو مجبور کر دیا جائے، اس حال میں کہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے گزرنے والا، تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۱۵﴾

آیت 114 : ﴿فَكُلُوا مِنَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا.....﴾ : مشرکین نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور اس کے ساتھ شریک بنائے تو اے ایمان والو! اگر تم واقعی صرف اللہ کی بندگی کرتے ہو، جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے تو لازم ہے کہ اپنی عقل اور مصلحت کے بل بوتے پر کسی چیز کو حلال یا حرام قرار نہ دو، جیسا کہ مشرکوں نے اپنے پاس سے بھیرہ اور سائبہ وغیرہ کو حرام قرار دے رکھا ہے، حالانکہ یہ کہیں اللہ کا حکم نہیں اور مردار اور خون وغیرہ کو حلال کر رکھا ہے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ سو تم صرف انھی چیزوں کو کھاؤ جنہیں اللہ نے حلال اور طیب قرار دیا ہے اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

آیت 115 : ﴿وَمَا أَهَلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ﴾ : یعنی جس جانور کو بھی غیر اللہ کے نام کے ساتھ شہرت دی جائے، مثلاً گج بخش کا بکرا، چشتی اجیری کی گائے یا فلاں شاہ کا مرغا، تو یقیناً وہ جانور حرام ہو گیا اور ”أَهْلًا“ کا لفظ ذبح کے علاوہ اس کو بھی شامل ہے، کیونکہ ”أَهْلًا“ کا معنی آواز بلند کرنا ہے، لہذا جس پر غیر اللہ کا نام آ گیا اس میں ایسی خباثت آگئی جو مردار میں بھی نہیں، کیونکہ مردار پر تو صرف اللہ کا نام نہیں لیا گیا مگر ”مَا أَهَلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ“ (جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے) میں اس جانور کی روح اس کے خالق کے سوا دوسرے کے نام پر بھیٹ پڑھا دی گئی۔ یہ آیت شریفہ قرآن میں چار مرتبہ آئی ہے، سورہ بقرہ (۱۷۳)، مائدہ (۳)، انعام (۱۳۵) اور یہاں سورہ نحل (۱۱۵) میں، تمام مقامات پر نظر ڈال لیں۔ اس کے معنی ”مَا ذُبِحَ الصَّوْتُ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ“ ہیں (یعنی جس پر غیر اللہ کا نام بلند کیا جائے)، نہ کہ ”مَا ذُبِحَ بِاسْمِ غَيْرِ اللَّهِ“ (یعنی جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے)۔ گو یہ اس میں بطریق اولیٰ داخل ہے، جس کی بنا پر بعض مفسرین نے ”أَهْلًا“ کی تفسیر ”ذُبِحَ“ کی ہے، جو اس وقت کی صورت حال کے پیش نظر اور بیان واقعہ کے لیے ہے۔ ہمارے دور میں اس نئے شرک کا وقوع ہوا ہے، اس برصغیر پاک و ہند کے علماء نے اسے خوب حل فرمایا ہے اور شاہ عبدالعزیز کی تفسیر عزیزی اس پر شاہد عدل ہے۔

﴿فَمَن اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ.....﴾ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۷۳)، مائدہ (۳) اور سورہ انعام (۱۳۵)۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَ هَذَا حَرَامٌ لِيَتَفَتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۗ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿۱۱۷﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ۖ وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۱۸﴾ وَ عَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَزَمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَ مَا ظَلَمْنَهُمْ وَ لَكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۱۱۹﴾

اور اس کی وجہ سے جو تمہاری زبانیں جھوٹ کہتی ہیں، مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، تاکہ اللہ پر جھوٹ باندھو۔ بے شک جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پاتے ﴿۱۱۷﴾ بہت تھوڑا فائدہ ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۱۸﴾ اور ان لوگوں پر جو یہودی ہوئے ہم نے وہ چیزیں حرام کیں جو ہم نے تجھ پر اس سے پہلے بیان کی ہیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرتے تھے ﴿۱۱۹﴾

آیت 117، 116 وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ: ”اللسنة“ ”اللسان“ کی جمع ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال و حرام کو خود واضح فرما دیا ہے تو اب اسی کے پابند رہو اور یہ جرأت مت کرو کہ تمہاری زبانیں جسے جھوٹ سے حلال کہہ دیں اسے حلال اور جسے حرام کہہ دیں اسے حرام قرار دے لو، اگر ایسا کرو گے تو یہ اللہ پر جھوٹ باندھنا ہوگا اور یہ بات یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ گھڑنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے، اگر اس کے بدلے انہیں دنیا میں کچھ فائدہ حاصل بھی ہو جائے، خواہ پوری دنیا مل جائے، وہ بہت ہی تھوڑا سامان ہے، کیونکہ یہ سامان ہر حال میں ختم ہو جانے والا ہے، پھر ان کا ہمیشہ کا ٹھکانا جہنم ہے۔ مشرکین کے اپنے پاس سے حلال و حرام بنانے کی مثالوں کے لیے دیکھیے سورہ مائدہ (۱۰۳، ۱۰۴)، انعام (۱۳۸) تا (۱۴۰) اور سورہ یونس (۶۰، ۵۹)۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، اس آیت میں ہر وہ شخص داخل ہے جو دین میں کوئی نئی بات (بدعت) ایجاد کرے، جس کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو، یا محض اپنی عقل اور رائے سے اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام یا حرام کردہ چیز کو حلال ہونے کا فتویٰ دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے صحیح ہونے پر تو ساری امت کا اتفاق ہے: ﴿مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ﴾ [بخاری، العلم، باب إن من كذب على النبي صلی اللہ علیہ وسلم: ۱۰۷۔ مسلم، المقدمة: ۳] جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے (کیونکہ یہ درحقیقت اللہ پر جھوٹ ہے)۔

آیت 118 ① وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَزَمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ: حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے جب مسلمان پر حرام کردہ چیزوں کو حلال اور حرام وغیرہ کا ذکر فرمایا اور صرف مجبوری کے وقت انہیں جائز قرار دینے کا ذکر فرمایا، تاکہ امت پر آسانی رہے تو اس کے بعد یہودیوں پر ان چیزوں کے حرام کرنے کا ذکر فرمایا، جن کا ذکر پہلے سورہ نساء (۱۶۰) اور سورہ انعام (۱۳۶) میں گزر چکا ہے، جو پاکیزہ اور حلال ہونے کے باوجود ان کی سرکشی اور ظلم کی وجہ سے ان پر حرام کی گئی تھیں اور اس اصرار و اظلال میں

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا الشُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَ أَسْلَمُوا إِنْ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَعَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۱۹﴾ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۰﴾

پھر بے شک تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنہوں نے جہالت سے برے عمل کیے، پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور اصلاح کر لی، بلاشبہ تیرا رب اس کے بعد یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۱۹﴾ بے شک ابراہیم ایک امت تھا، اللہ کا فرماں بردار، ایک اللہ کی طرف ہو جانے والا اور وہ مشرکوں سے نہ تھا ﴿۱۲۰﴾

شامل تھیں جو ان کی سرکشی کی وجہ سے ان پر لادے گئے تھے۔ پھر ہمارے نبی کریم ﷺ کے آنے پر ان کی حرمت ختم ہوئی اور صرف وہ چیزیں حرام کی گئیں جن کا حرام کرنا بطور سزا نہیں بلکہ بطور مصلحت و رحمت تھا۔

﴿۱۲۰﴾ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا..... اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ نساء (۱۶۰، ۱۶۱) اس سے یہودیوں کے اس دعویٰ کی بھی تردید ہوگئی کہ ان پر حرام کردہ چیزیں ہمیشہ سے حرام چلی آ رہی ہیں، اس لیے ہمیشہ کے لیے حرام ہیں۔ مزید دیکھیے سورہ آل عمران (۹۳)۔

آیت 119: ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا الشُّوْءَ..... اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام گناہ گاروں کو، وہ یہودی ہوں یا عیسائی یا مشرک یا مسلمان، سب کو توبہ اور اصلاح کے بعد بے انتہا مغفرت اور رحمت کی نوید سنائی ہے۔ یاد رہے کہ یہاں جہالت کا معنی لاعلمی نہیں بلکہ بے وقوفی اور اکھڑ پن ہے، جو آدمی سے بے عقلی کے کاموں کا ارتکاب کرواتا ہے، جیسا کہ گھر سے نکلنے کی لمبی دعا میں ہے: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ..... أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ» [ابوداؤد، الأدب، باب ما يقول إذا خرج من بيته: ۵۰۹۴۔ ابن ماجہ: ۳۸۸۴، و صححه الألبانی] "اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ..... میں کسی پر جہالت کروں یا کوئی مجھ پر جہالت کرے۔" اور عمرو بن کلثوم نے کہا -

أَلَا لَا يُجْهَلُنْ أَحَدًا عَلَيْنَا فَتَجْهَلُ فَوْقَ جَهْلِ الْجَاهِلِينَ

"خبردار! ہم پر کوئی جہالت کا ارتکاب ہرگز نہ کرے، ورنہ ہم جاہلوں کی جہالت سے بڑھ کر جہالت کریں گے۔" اس حدیث اور شعر سے جہل کا مفہوم واضح ہوتا ہے جو یہاں مراد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر گناہ لاعلمی سے ہو یا جان بوجھ کر، ہوتا ہی بے وقوفی اور جہالت سے ہے، اسلام سے پہلے والے زمانے کو اسی لیے زمانہ جاہلیت کہتے ہیں۔ دیکھیے سورہ انعام (۵۳)، نساء (۱۸، ۱۹) اور سورہ فرقان (۶۳)۔

آیت 120: ﴿۱﴾ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا..... ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی ﴿وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ﴾ [الشعراء: ۸۴] "اور بیچھے آنے والوں میں میرے لیے سچی ناموری رکھ۔" اس لیے مشرکین مکہ، یہود اور نصاریٰ میں سے ہر ایک ابراہیم علیہ السلام کی عزت و تکریم کرنے والا اور ان کی ملت کا تبع ہونے کا دعوے دار تھا، چنانچہ فرمایا:

شَاكِرًا لِأَنْعُمِهِ + اجْتَبَهُ وَ هَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳۱﴾ وَ آيَاتُهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ
وَ آيَاتُهُ فِي الْآخِرَةِ لِبِئْسَ الصَّالِحِينَ ﴿۳۲﴾

اس کی نعمتوں کا شکر کرنے والا۔ اس نے اسے جن لیا اور اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ﴿۳۱﴾ اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی اور بے شک وہ آخرت میں بھی یقیناً نیک لوگوں سے ہے ﴿۳۲﴾

﴿ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴾ سَلَّمَ عَلَيَّ اِبْرَاهِيمَ ﴿﴾ [الصفات: ۱۰۸، ۱۰۹] ”اور پیچھے آنے والوں میں اس کے لیے یہ بات چھوڑی کہ ابراہیم پر سلام ہو۔“ یعنی بعد میں آنے والے سب لوگ ان پر سلام بھیجیں گے، اس لیے اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کی صفات اور ان کا منج بیان فرمایا، جس سے واضح ہو رہا ہے کہ ان لوگوں میں سے کوئی بھی ملت ابراہیم پر قائم نہیں ہے۔

﴿ اُمَّةٌ ﴾: اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی پہلی صفت ”اُمَّةٌ“ بیان فرمائی۔ اس آیت میں لفظ ”اُمَّةٌ“ کا معنی پیشوا اور امام بھی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ﴾ [البقرة: ۱۲۴] ”بے شک میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔“ اور یہ بھی کہ وہ اکیلے ہی ایک امت (جماعت) تھے، کیونکہ اکیلے ہی میں اتنے کمالات تھے جو ایک جماعت میں ہوتے ہیں اور اکیلے شخص لے اتنا کام کیا جو ایک امت کے برابر تھا۔ تیسرا معنی یہ کہ ایک مدت تک اکیلے ہی وہ اور ان کی بیوی امت مسلمہ تھے، جیسا کہ جبار مصر اور سارہ علیہا السلام کے واقعہ میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے سارہ علیہا السلام سے کہا کہ اس وقت اس سرزمین میں میرے اور تمہارے سوا کوئی مومن نہیں، سو تم ایمان میں میری بہن ہو۔ [بخاری: ۳۳۵۸]

﴿ دُومِرَى صَفْتٌ ﴾ ”قَاتِلًا لِلَّهِ“ بیان فرمائی، یعنی اللہ کے فرماں بردار نہایت عاجزی کے ساتھ، کیونکہ ان دونوں کے مجموعی مفہوم کو قنوت کہتے ہیں۔

﴿ حَقِيقًا ﴾ تیسری صفت ہے، ”حَنَفٌ“ کا معنی ہے ایک طرف جھک جانا، یعنی تمام باطل دینوں سے ہٹ کر حق کی طرف مائل ہونے والا، تمام خداؤں کا انکار کر کے صرف ایک اللہ کی طرف ہو جانے والا۔ جس کی قولی، بدنی اور مالی عبادت، زندگی اور موت سب ایک اللہ کے لیے تھے۔ دیکھیے سورہ انعام (۱۶۱ تا ۱۶۳)۔

﴿ وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴾: یہ مشرکین مکہ اور یہود و نصاریٰ پر تعریض اور ان سب کے ابراہیمی ہونے کے دعویٰ کی نفی کا اظہار ہے کہ وہ تو مشرکوں میں سے نہیں تھے، جب کہ تم سب بتوں کو یا قبروں کو، عزیر یا عیسیٰ علیہ السلام کو اور اپنے احبار و رہبان کو رب بنا کر شرک میں گرفتار ہو چکے ہو۔

آیت 121: شَاكِرًا لِأَنْعُمِهِ؛ شکر نعمت زبان سے بھی ہوتا ہے اور عمل سے بھی۔ اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے شکر نعمت، اس کے احکام کی اطاعت، اس کے امتحانات میں کامیابی اور اس کے حقوق کی ادائیگی سب کو پورا کر دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ اِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى ﴾ [النعم: ۳۷] ”اور ابراہیم جس نے پورا حق ادا کر دیا۔“ اور دیکھیے سورہ بقرہ (۱۲۳)۔

آیت 122: ﴿ وَ آيَاتُهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ﴾: یعنی دنیا میں حیات طیبہ کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ انھیں عطا

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۳﴾ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۗ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۲۴﴾

پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ابراہیم کی ملت کی پیروی کر، جو ایک اللہ کی طرف ہو جانے والا تھا اور مشرکوں سے نہ تھا ﴿۱۲۳﴾ ہفتے کا دن تو صرف ان لوگوں پر مقرر کیا گیا جنہوں نے اس میں اختلاف کیا اور بے شک تیرا رب ان کے درمیان قیامت کے دن یقیناً اس کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۱۲۴﴾

فرمائیں، مثلاً دین حق کی ہدایت، نبوت کی نعمت، صالح اولاد، سیرت حسنہ، وافر مال و دولت اور سچی ناموری وغیرہ۔

﴿۱۲۳﴾ وَإِنَّا فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ: خود ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی: ﴿وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ﴾ [الشعراء: ۸۳] ”مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملا دے۔“ یوسف علیہ السلام نے بھی یہی دعا کی تھی: ﴿تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ﴾ [یوسف: ۱۰۱] ”مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔“

﴿۱۲۴﴾ معلوم ہوا کہ نیک ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، مگر قیامت کو صالحین کا ساتھ ملنا ایک مزید نعمت ہے، اس لیے ہمارے نبی کریم ﷺ کے دنیا سے رخصت ہوتے وقت آخری الفاظ یہی تھے: «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَ أَلْحِقْنِي بِالرَّحِيمِ الْأَعْلَى»

[ترمذی، أبواب الدعوات، باب: ۳۴۹۶۔ ابن ماجہ: ۱۶۱۹۔ سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۶۶۱/۶، ۶۶۲، ح: ۲۷۷۵]

”اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھے سب سے اونچے سچے کے ساتھ ملا دے۔“

آیت 123 ﴿۱﴾ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ..... یعنی حلال و حرام اور دین سے متعلق تمام معاملات میں اصل نہ یہودیت ہے، نہ نصرانیت ہے اور نہ شرک کہ جس کا ارتکاب یہ کفار مکہ کر رہے ہیں، بلکہ اصل ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے جو خالص توحید سے عبارت تھی اور اس میں وہ چیزیں حرام نہ تھیں جو بعد میں یہودیوں پر ان کی شرارت کی وجہ سے حرام کر دی گئیں، اس لیے آپ کے لیے پیروی کے لائق اگر کوئی ملت ہے تو وہ صرف ملت ابراہیم ہے۔ (ابن کثیر)

﴿۲﴾ لفظ ”ثُمَّ“ یہاں حقیقی ترتیب کے لیے نہیں بلکہ ترتیبِ ذکر کی کے لیے ہے اور آخر میں ابراہیم علیہ السلام کے فضائل میں سے یہ ایک بہت بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے، یعنی ان فضائل کے ساتھ پھر ابراہیم علیہ السلام کی اس فضیلت کو دیکھو کہ نبی کریم ﷺ (جو اگرچہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں، مگر ساری اولاد آدم کے سردار ہیں) کو بھی یہی حکم دیا گیا کہ آپ نے ملت ابراہیم کی پیروی کرنی ہے۔ نبی ﷺ کے ملت ابراہیم کے پیروکار ہونے میں جہاں ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت ظاہر ہے وہیں ہمارے نبی ﷺ کی عظمت بھی ظاہر ہے کہ آپ کو ملت ابراہیم کی پیروی کا حکم ابراہیم علیہ السلام کے لیے باعثِ فضیلت تھرا۔

آیت 124 ﴿۲﴾ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ..... یعنی ہفتے کے دن کی تعظیم جیسے ملت اسلام میں نہیں ہے، ابراہیم علیہ السلام

أذْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۗ

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا اور ان سے اس طریقے کے ساتھ بحث کر جو کی شریعت میں بھی نہ تھی۔ یہ دن تو بعد میں صرف ان لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا تھا جنہوں نے اس میں اختلاف کیا تھا، اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان پر جمعہ کے دن کی تعظیم واجب کی تھی، مگر انہوں نے اس میں اختلاف کر کے ہفتے کا دن مقرر کر لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر اسی دن کی تعظیم فرض کر دی کہ اس میں شکار مت کرو۔ اس کی تائید ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «نَحْنُ الْآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، يَبْدَأُ اللَّهُ بِمَنْ أُوْتِيَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا، ثُمَّ هَذَا يَوْمُهُمُ الَّذِي فُرِضَ عَلَيْهِمْ فَاحْتَلَفُوا فِيهِ فَهَدَانَا اللَّهُ فَالْإِنْسَانُ لَنَا فِيهِ نَبْعٌ، الْيَهُودُ غَدَا وَالنَّصَارَى بَعْدَ غَدٍ» [بخاری، الجمعة، باب فرض الجمعة: ۸۷۶] ”ہم سب سے بعد میں آنے والے ہیں، جو قیامت کے دن سب سے پہلے ہوں گے، باوجود اس کے کہ ان لوگوں کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی، پھر یہ ان کا دن جو ان پر فرض کیا گیا تو انہوں نے اس میں اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس (جمعہ کے دن) کی ہدایت دی، سو لوگ اس میں ہمارے پیچھے ہیں، یہودی ہم سے بعد والے دن اور عیسائی اس سے بھی اگلے دن۔“ صحیح مسلم کی حدیث میں اس فرض کردہ دن کی تعیین موجود ہے کہ وہ جمعہ کا دن تھا جس سے اختلاف کر کے یہود نے ہفتہ اور نصاریٰ نے اتوار مقرر کر لیا۔ [دیکھئے مسلم، الجمعة، باب هدایة هذه الأمة ليوم الجمعة: ۸۵۵]

آیت 125 ① **أذْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ:** ”أذْعُ“ کا مفعول یہاں مذکور نہیں کہ کسے دعوت دے، اس لیے مراد عام ہوگا، یعنی غیر مسلم اور مسلم سب کو دعوت دے۔ یا اسے فعل لازم کے قائم مقام قرار دیا جائے، اس وقت مراد یہ ہوگی کہ ہمیشہ دعوت دیتا رہ۔ رب کے راستے سے مراد اسلام اور اس کی تفصیلات ہیں۔ ”بِالْحِكْمَةِ“ ”حِكْمَةٌ“ کا لفظ موقع کے مطابق کئی چیزوں پر بولا جاتا ہے، چنانچہ قاموس میں اس کے یہ معانی لکھے ہیں: ”الْعَدْلُ وَالْعِلْمُ وَالْجَلْمُ وَالنُّبُوَّةُ وَالْقُرْآنُ وَالْإِنْجِيلُ“ اور لکھا ہے کہ ”أَحْكَمَةٌ“ کا معنی ”أَتَقَنَةٌ“ ہے، یعنی اس نے اسے خوب پختہ اور مضبوط کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستے کی طرف دعوت دو چیزوں سے خالی نہیں ہونی چاہیے، ان میں سے ایک حکمت ہے، یعنی ایسی حکم اور پختہ دلیل جو حقیقت کے عین مطابق ہو، جس میں کوئی غلطی نہ ہو اور مخاطب کے نزدیک بھی مسلم ہو، خواہ وہ عناد کی وجہ سے اسے نہ مانے۔ اسے برہان بھی کہتے ہیں: ﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ [البقرة: ۱۱۱] ”کہہ دے لاؤ اپنی دلیل، اگر تم سچے ہو۔“ اس لیے حکمت کو دلیل برہانی کہتے ہیں۔

② **وَالْمَوْعِظَةُ الْحَسَنَةُ:** ”اچھی نصیحت“ سے مراد ایسی بات ہے جو مخاطب کے دل کو نیکی کے عمل کے لیے نرم کرے، یا بدی کے خلاف ابھار دے، ترغیب کے ذریعے سے یا ترہیب (ڈرانے) کے ساتھ، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَثَقِّلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا﴾ [النساء: ۶۳] ”سو تو ان سے دھیان ہٹالے اور انہیں وعظ (نصیحت) کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں بہت اثر کرنے والی ہو۔“ اسے دلیل خطابی کہتے ہیں۔ دعوت کے اس اسلوب میں حسن و

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٦٥﴾

سب سے اچھا ہے۔ بے شک تیرا رب ہی زیادہ جاننے والا ہے جو اس کے راستے سے گمراہ ہوا اور وہی ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے ﴿٦٥﴾

خوبی اور نرمی و ملامت کو ملحوظ رکھنا اور بدزبانی و سخت کلامی سے پرہیز لازم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو حکم دیا: ﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى﴾ [ظہ: ٤٤] ”پس اس سے بات کرو، نرم بات، اس امید پر کہ وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے۔“

﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾: دعوت کے دوران میں اگر حکمت اور موعظہ حسنہ کے باوجود مخاطب بحث اور مجادلے (جھگڑے) پر اتر آئیں تو آپ بھی ان سے مجادلہ کریں، کیونکہ پھر اس کے بغیر چارہ نہیں، مگر یہ ہر حال میں احسن (زیادہ اچھا) ہونا چاہیے۔ کس سے احسن؟ جواب یہ ہے کہ سب سے بہتر یا کم از کم ان کے مجادلے سے بہتر طریقے کے ساتھ ہو، کیونکہ باب مفاعلہ میں دو فریق ہوتے ہیں، یہاں ایک تم ہو اور ایک وہ، اس لیے احسن کا مطلب یہ ہوگا ان کے طریقے سے بہتر، جس میں گالی گلوچ اور ذاتی حملے وغیرہ نہ ہوں، بلکہ ایسی بات ہو جس سے وہ لاجواب ہو جائیں۔ انبیاء اور ان کے حقیقی وارث علماء کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے خاص طور پر نوازتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی والد کو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت (دیکھیے مریم: ۲۲)، پھر بت توڑ کر بت پرستوں کے ساتھ بحث میں ان کو لاجواب کرنا (دیکھیے انبیاء: ۵۱ تا ۶۸)، پھر سورج، چاند اور ستاروں کے پونے والوں کو بحث میں لاجواب کرنا (دیکھیے انعام: ۷۶ تا ۸۳)، پھر بادشاہ وقت کو رب ہونے کے دعویٰ میں لاجواب کرنا (دیکھیے بقرہ: ۲۵۸) اور نوح علیہ السلام کی قوم کا مجادلہ و بحث میں لاجواب ہو کر عذاب لانے کا مطالبہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ (دیکھیے ہود: ۳۲) موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے مکالمے بھی اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ قرآن مجید مشرکین اور اہل کتاب سے مجادلہ احسن پر مشتمل آیات سے بھرا پڑا ہے، بلکہ یہ قرآن مجید کے بنیادی مضامین میں سے ایک ہے۔ دیکھیے ”الغزوة الکبیر“ از شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ۔

﴿بعض لوگوں نے کہا کہ اس قسم کی آیات کئی سورتوں میں ہیں، اس لیے یہ جہاد کے احکام کے ساتھ منسوخ ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ احکام اب بھی مؤثر ہیں اور اگر کوئی شخص حکمت، موعظہ حسنہ اور مجادلہ احسن کے بعد بھی نہ مانے تو اس کے لیے جہاد کا استثنائی سورتوں ہی میں موجود ہے۔ چنانچہ سورہ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ﴾ [العنکبوت: ٤٦] ”اور اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو، مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو، مگر وہ لوگ جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا۔“ ظاہر ہے کہ مجادلہ احسن کے بعد بھی ظلم پر قائم رہنے والوں کے لیے جہاد کے سوا کیا علاج ہو سکتا ہے؟ یہ ایک فطری حقیقت ہے جیسا کہ قندِ زمانی نے کہا ہے۔

فَلَمَّا صَرَخَ الشَّرُّ وَأُمْسَى وَهُوَ عُرْيَانٌ

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۗ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ﴿۳۱﴾

اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمہیں تکلیف دی گئی ہے اور بلاشبہ اگر تم صبر کرو تو یقیناً وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے ﴿۳۱﴾

وَلَمْ يَنْفِقْ سِوَى الْعُلُوٰۤاۤنِ ۗ دِنَاهُمْ كَمَا دَانُوۤا

”پھر جب لڑائی بالکل ظاہر ہوگی اور لنگی ہو کر سامنے آگئی اور زیادتی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تو ہم نے بھی بدلے میں ان سے وہی کیا جو انہوں نے کیا تھا۔“ بلکہ اس آیت سے اگلی آیت میں بھی جہاد کا ذکر موجود ہے، صرف غور کی ضرورت ہے۔

﴿۳۱﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۗ... اس آیت کے فوائد میں سے دو فائدے زیادہ ظاہر ہیں، ایک تو یہ کہ آپ کسی شخص کے ایمان نہ لانے پر اسے دعوت دینا ترک نہ کریں، آپ کو علم نہیں، ہو سکتا ہے وہ ان خوش نصیبوں میں سے ہو جنہیں ہدایت نصیب ہوئی ہے، یہ علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا ”إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ“ (بے شک تیرا رب ہی اسے زیادہ جاننے والا ہے جو اس کے راستے سے بھٹکا ہوا ہے) تو آگے بظاہر اتنا ہی کہنا کافی تھا ”يَا الْمُنَافِقِينَ“ (اور ہدایت پانے والوں کو بھی) مگر اللہ تعالیٰ نے ”وَهُوَ أَعْلَمُ“ کو دوبارہ ذکر فرمایا۔ مقصد یہ ہے کہ کافر لوگ بے شک اپنے آپ کو ہدایت یافتہ اور مسلمانوں کو گمراہ سمجھتے رہیں، مگر اصل گمراہ کون ہے اور اصل ہدایت یافتہ کون ہے، یہ علم تیرے رب ہی کے پاس ہے۔

آیت 126 ﴿۱﴾ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۗ: دا عطف سے معلوم ہوا کہ اس کا تعلق پچھلی آیت سے ہے کہ اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو بدلے میں اتنی زیادتی تم بھی کرو۔ اس آیت سے دو مسئلے واضح طور پر ثابت ہوتے ہیں، ایک یہ کہ قتل وغیرہ کا قصاص اسی طریقے سے لینا جس طریقے سے قاتل نے قتل کیا ہے، جائز ہے اور اس کی تائید اس یہودی سے قصاص والی حدیث سے بھی ہوتی ہے جس نے ایک بچی کا سرد پتھروں میں کچل دیا تھا، تو آپ ﷺ نے اسے بھی اسی طرح قتل کرنے کا حکم دیا۔ [دیکھیے مسلم، القسامۃ والمحابرین، باب ثبوت القصاص فی القتل: ۱۶۷۲/۸۷] اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے حکم سے آپ کے چرواہوں کو قتل کرنے والے اور اونٹنیاں لے جانے والے مجرموں کو بھی قصاص میں اسی طرح آنکھوں میں گرم سلانیاں پھیری گئیں، جیسا کہ انہوں نے کیا تھا۔ [دیکھیے بخاری، الحدود، باب المحابرین من أهل الکفر و الردۃ: ۶۸۰۲] اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ظالم کے ظلم کے برابر بدلہ جائز ہے زیادہ نہیں، فرمایا: ﴿فَمَنْ اِغْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاصْطٰدْ وَا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اِغْتَدٰی عَلَیْکُمْ﴾ [البقرہ: ۱۶۴] ”پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے زیادتی کی۔“ نبی ﷺ نے جو مثلہ کرنے سے منع فرمایا اس سے مراد قصاص کے علاوہ صورتیں ہیں اور ابن ماجہ کی روایت (۲۶۶۷) ﴿لَا قُوْدَ اِلَّا بِالسَّیْفِ﴾ (قصاص تلوار کے سوا جائز نہیں) ثابت نہیں، بلکہ ضعیف ہے، تفصیلی بحث ارواء الغلیل (۲۸۵/۷، ۲۸۹، ج: ۲۲۳۹) میں ملاحظہ فرمائیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کے مال میں

وَاضْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿۱۲۷﴾

اور صبر کرو اور نہیں تیرا صبر مگر اللہ کے ساتھ اور ان پر غم نہ کرو اور نہ کسی تنگی میں مبتلا ہو، اس سے جو وہ تدبیریں کرتے ہیں ﴿۱۲۷﴾

خیانت کرے، یا اس کا مال یا کوئی چیز لے کر واپس نہ دے، پھر مظلوم کو اس کا مال یا کوئی چیز ہاتھ آ جائے، یا وہ اس کے پاس امانت رکھے تو اسے اپنے مال کے برابر اس میں سے رکھ لینا جائز ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”کِتَابُ الْمَظَالِمِ“ میں ”بَابُ فِصَاصِ الْمَظْلُومِ إِذَا وَجَدَ مَالَ ظَالِمِيهِ“ (مظلوم کا قصاص لینا جب اسے اس پر ظلم کرنے والے کا مال مل جائے) میں اسی آیت سے ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ استدلال نقل فرمایا ہے اور مزید احادیث سے اسے مدلل کیا ہے۔ بعض لوگ ایک روایت کی بنا پر اسے منع کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَكْ أَلْمَانَةَ إِلَى مَنْ أَلْتَمَسَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ» [ابوداؤد، البيوع، باب في الرجل يأخذ حقه من تحت يده: ۳۵۲۵] ”جو شخص تمہارے پاس امانت رکھے اس کی امانت ادا کرو اور جو تمہاری خیانت کرے اس کی خیانت مت کرو۔“ اگرچہ اس حدیث پر کلام ہے، مگر صحیح ماننے کی صورت میں بھی اپنا مال واپس لینے کو خیانت نہیں کہا جاسکتا۔ حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے ”المحلی“ کی ”کتاب التقلیس“ کے آخر میں اس مسئلہ پر نہایت عمدہ بحث تحریر فرمائی ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

﴿۱۲۷﴾ وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ: کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالم سے انہیں ان کا بدلہ خود لے کر دے گا اور اپنے ہاں سے انہیں صبر کا اجر عظیم عطا فرمائے گا، اللہ نے فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَقِرُونَ ﴿۱۲۷﴾ وَ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ [الشوری: ۴۰، ۳۹] ”اور وہ لوگ کہ جب ان پر زیادتی واقع ہوتی ہے وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور کسی برائی کا بدلہ اس کی مثل ایک برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے، بے شک وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔“ صحیح بخاری میں ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ وہ (صحابہ کرام) ذلت قبول کرنے کو ناپسند کرتے تھے، مگر جب قدرت پالیتے تو معاف کر دیتے تھے۔ [دیکھیے بخاری، المظالم، باب الانتصار من الظالم، بعد ح: ۲۴۴۶]

﴿۱۲۸﴾ شہادۃ القادر رحمۃ اللہ علیہ نے ”أَذْعُرُ إِلَى سَبِيلِ“ سے لے کر یہاں تک کا خلاصہ بیان فرمایا: ”پہلے جو فرمایا سمجھاؤ بھلی طرح سے، اس میں رخصت دی کہ بدی کے بدلے بدی بری نہیں، مگر صبر زیادہ بہتر ہے۔“ (موضح)

آیت 127 ﴿۱﴾ وَاضْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ: آخر میں پھر صبر کا حکم دیا، ساتھ ہی متنبہ فرمایا کہ اگر صبر جیسا مشکل اور عظیم کام کر لو تو اسے اپنا کمال مت سمجھنا، بلکہ یقین رکھنا کہ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ممکن ہوا، تمہیں اس کا فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اللہ کی نعمت سے غافل نہ ہو، اس کے سامنے عاجز و متکسر رہو اور ہر وقت اس سے دعا کرتے رہو۔

﴿۱۲۸﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کے ایمان نہ لانے پر اتنا غم ہوتا کہ شاید اپنی جان گھٹالیں گے، اس پر اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ نہ آپ ان پر غم کریں اور نہ ان کی سازشوں سے دل تنگ ہوں۔ ”ضَیِّقٌ“ اور ”ضَیِّقٌ“ دونوں کا

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ ﴿۱۲۸﴾

بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو ڈر گئے اور ان لوگوں کے جو نیکی کرنے والے ہیں ﴿۱۲۸﴾

ایک ہی معنی ہے۔ دیکھیے سورہ شعراء (۳) اور سورہ کہف (۶)۔

آیت 128 : ﴿۱﴾ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا..... یعنی دل تنگ وہ ہو جس کا کوئی ساتھی و مددگار نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ تو ہر متقی

اور محسن کا ساتھی اور مددگار ہے اور آپ اللہ کے فضل سے تمام متقی اور محسن لوگوں کے سردار ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَنَا سَيِّدٌ وَلَدَ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ» [ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل: ۳۱، ۴۸، و صحیحہ الألبانی] ”میں قیامت کے دن تمام اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور کوئی فخر نہیں۔“ پھر آپ دل تنگ کیوں ہوں؟ احسان کی تفصیل کے دیکھیے سورہ نمل کی آیت (۹۰)، احسان کا مقام تقویٰ سے اونچا ہے۔

﴿۲﴾ معیت (ساتھ) دو قسم کی ہے، ایک معیت عامہ، یہ ہر شخص بلکہ ہر مخلوق کو حاصل ہے اور اس کے بغیر کوئی چیز باقی نہیں رہ سکتی، فرمایا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ [الحديد: ۴] ”اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی ہو۔“ ایک معیت خاصہ ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ﴿لَا تَخْزَنَنَّ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ [التوبة: ۴۰] ”غم نہ کر بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“ اور جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَفْقِدُنِي﴾ [الشعراء: ۶۲] ”ہرگز نہیں، بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھے ضرور راستہ بتائے گا۔“ یہ خاص معیت ہے، یعنی ہمارا مددگار ہے۔ اس آیت میں معیت خاصہ مراد ہے۔





سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

پاک ہے وہ جو رات کے ایک حصے میں اپنے بندے کو حرمت والی مسجد سے بہت دور کی اس مسجد تک لے گیا جس

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے سورہ بنی اسرائیل، سورہ کہف اور سورہ مریم کے متعلق فرمایا: «إِنَّهُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْأُولَى، وَ هُنَّ مِنْ بِلَادِ مَدْيَنَ» [بخاری، التفسیر، سورہ بنی اسرائیل: ۴۷۰۸] "یہ پہلی قدیم سورتوں میں سے ہیں اور یہ میرے قدیم مال میں سے ہیں۔" اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورت مکی ہے۔ رسول اللہ ﷺ ہر رات سورہ بنی اسرائیل اور سورہ زمر پڑھا کرتے تھے۔ [مسند أحمد: ۶۸۶، ح: ۲۴۴۴۲، عن عائشة رضی اللہ عنہا۔ ترمذی: ۲۹۲۰، و صحیحہ الألبانی]

آیت 1 ① سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ: اس سورت کی ابتدا اللہ تعالیٰ کو ہر ایسی چیز سے پاک قرار دینے سے کی جو اس کے جلال کے لائق نہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ﴾ طحاوی نے فرمایا، اس کی سب سے اچھی نحوی ترکیب یہ ہے کہ "سُبْحَانَ" اسم مصدر ہے اور فعل محذوف "سَبَّحْتُ" یا "أَسْبَحُ" کا مفعول مطلق ہے اور "الَّذِي" کی طرف مضاف ہے، یعنی میں اس (اللہ) کا بے عیب اور کسی سے پاک ہونا بیان کرتا ہوں جو اپنے بندے سے..... (التفسیر الوسیط) معلوم ہوا کہ آگے کوئی ایسا کام بیان ہونے والا ہے جس کا واقع ہونا انسانی طاقت سے باہر ہے، اس لیے بات سبب سے شروع فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان تمام عیبوں، کمزوریوں اور نارسائیوں سے پاک ہے جو مخلوق میں پائی جاتی ہیں اور وہ ان کاموں پر قادر ہے جن پر اس کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا۔

② اَسْرَى: شیخ سلیمان الجمل نے فرمایا: "اَسْرَى" اور "سَرَى" دونوں کا معنی ہے، وہ رات کو چلا، دونوں فعل لازم ہیں، پہلے کا مصدر "اَلْاَسْرَاءُ" ہے اور دوسرے کا "اَلسَّرَى" بروزن "اَلْهَدَى"، اس لیے اسے متعدی بنانے کے لیے "بِعَبْدِهِ" میں باء لائی گئی ہے، جس سے معنی "وہ رات کو چلا" کے بجائے "اس نے (اپنے بندے کو) رات کو چلایا" ہو گیا۔ اس سے رات کی فضیلت بھی ثابت ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ کا راتوں کو قیام، دعائیں، اسراء و معراج، راتوں کا سفر سب اس کی دلیل ہیں۔

③ بِعَبْدِهِ: "اپنے بندے" کا لفظ اس محبت اور تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنے آخری پیغمبر محمد ﷺ سے ہے۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ اگر پیار و محبت اور آپ کی عظمت و شان کے اظہار کے لیے اس سے زیادہ یہاں کوئی لفظ موزوں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسی کو ذکر فرماتا، لفظ "عَبْدٌ" منتخب ہی اس لیے فرمایا کہ تمام مخلوقات کی صفات میں سب سے اونچی اور بڑی صفت اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور بندگی ہے، پھر خاص اپنی طرف نسبت کر کے مزید رتبہ بڑھا دیا۔

رسول اللہ ﷺ کو اپنا عبد (بندہ، غلام) قرار دینے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ مالک اور معبود صرف اللہ تعالیٰ ہے، باقی سب اس کے بندے، غلام، اس کے سامنے عاجز اور مطیع ہیں، کیونکہ "عَبْدٌ" کا معنی یہی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ كُلَّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ

بِرُكُنَا حَوْلَهُ لِزِيَادَةِ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّكَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ①

کے ارد گرد کو ہم نے بہت برکت دی ہے، تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بلاشبہ وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ①

وَالْأَرْضِ إِلَّا آتَى الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿ [مریم: ۹۲] ”زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام بن کر آنے والا ہے۔“ مقصد یہ ہے کہ عبودیت اور الوہیت، یعنی بندگی اور خدائی کے مقام کا فرق بالکل واضح ہو جائے، انھیں ایک نہ سمجھ لیا جائے، جیسا کہ مسیحیت میں ہوا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو، عیسیٰ علیہ السلام کو اور ان کی والدہ کو ایک ہی مجبور قرار دے دیا، انھوں نے عبودیت اور الوہیت کے فرق کو نہ سمجھا۔ بعض جھوٹے مسلمانوں نے بھی احد اور احمد کو ایک قرار دے لیا۔ یہ آیت ان کی واضح تردید کرتی ہے۔ علامہ قاسمی نے امام ابن قیمؒ کی کتاب ”طریق الہجرتین“ سے نقل فرمایا کہ تمام مخلوق میں سے زیادہ قریب ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبودیت (بندگی) میں سب سے کامل ہے اور رسول اللہ ﷺ پوری مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب اور بلند مرتبہ تھے، آپ ﷺ فرماتے تھے: ﴿ وَاللّٰهُ! مَا أَحْبَبْتُ أَنْ تَرْفَعُونِي فَوْقَ مَنْزِلَتِي النَّبِيِّ أَنْزَلَنِي اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ ﴾ ”اللہ کی قسم! اے لوگو! میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے میرے اس مرتبے سے بلند قرار دو جو مجھے اللہ عزوجل نے عطا کیا ہے۔“ [مسند ۱۲۵۵۸، ح: سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۱۰۹۷، عن انسؓ] اور آپ ﷺ فرماتے تھے: ﴿ لَا تَطْرُونِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ إِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُولُوا عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ ﴾ [بخاری، أحادیث الأنبياء، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ... ﴾: ۲۴۴۵] ”مجھے اس طرح حد سے نہ بڑھاؤ جیسا کہ نصاریٰ نے مسیح ابن مریم کو حد سے بڑھا دیا، میں تو صرف ایک عبد (بندہ) ہوں، سو تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔“ اللہ تعالیٰ نے آپ کا ذکر آپ کے بلند ترین مقام اسراء و معراج میں عبودیت کے نام سے فرمایا، چنانچہ فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْ اَنْزَلَ بِعَبْدِنَا ۙ ﴾ اور دعوت کے مقام میں فرمایا: ﴿ وَ اِنَّكَ لَنَا قَاۤئِمٌ عَبْدٌ اللّٰهُ يَدْعُوۡكَ ۙ ﴾ [الحج: ۱۹] اور چیلنج کے مقام میں فرمایا: ﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْۡبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا ۙ ﴾ [البقرة: ۲۳]

④ لَيْلًا: زخم شری نے فرمایا، اگر تم کہو کہ ”اسراء“ کا معنی ہی رات کو چلنا ہے، پھر ”لَيْلًا“ کہنے کا مقصد کیا ہے؟ تو میں کہتا ہوں کہ ”لَيْلًا“ کا لفظ کمرہ کی صورت میں لانے سے رات کی اس مدت کو جس میں سفر کیا، کم بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رات کے ایک تھوڑے سے حصے میں مکہ سے شام تک کا چالیس راتوں کا فاصلہ طے کروا دیا، کیونکہ تکبیر یہاں بعضیہ (بلکہ بقول بعض تقلیل و تخمیر) کا معنی دے رہی ہے (یہ بات ترجمہ میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہے)۔ یاد رہے! چالیس راتوں یا ایک مہینے سے زائد دنوں کا سفر ایک طرف کا ہے، آنے جانے کا دگنا سمجھ لیں۔

⑤ مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا: مسجد حرام کعبہ کے ارد گرد والی مسجد، کیونکہ اسے کئی طرح کی حرمت حاصل ہے۔ بعض علماء پورے حرم کو مسجد حرام کہتے ہیں۔ جس رات یہ سفر ہوا آپ ﷺ ام ہانیؓ کے گھر سوئے ہوئے تھے۔ وہاں

سے آپ کو عظیم کعبہ میں لایا گیا اور پھر آپ عظیم سے براق پر سوار ہو کر مسجد اقصیٰ (دور ترین مسجد) یعنی بیت المقدس پہنچے، اس وقت مکہ سے سب مسجدوں سے دور پائی جانے والی مسجد یہی تھی، چونکہ سفر کی ابتدا عظیم سے ہوئی، اس لیے کئی علماء صرف مسجد کے حصے ہی کو مسجد حرام کہتے ہیں۔ بیت المقدس سے معراج (بیڑھی) کے ذریعے سے اوپر ساتوں آسمانوں سے گزر کر سدرة المنتہیٰ پہنچے، راستے میں متعدد جلیل القدر انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں، جنت و دوزخ کا مشاہدہ بھی کیا، سدہ کے پاس ہی جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھا، وہیں آپ کو پہلے بیچاس نمازوں اور آخر میں روزانہ پانچ نمازوں کا حکم ہوا، پھر پلٹ کر بیت المقدس آئے تو آپ نے امام بن کر تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا کی۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے، لیکن قاضی عیاض وغیرہ کا خیال ہے کہ انبیاء کی امامت آپ نے واپسی پر نہیں بلکہ معراج کو جاتے ہوئے کروائی ہے۔ بہر حال اس کے بعد مسجد حرام تشریف لائے۔ واقعہ اسراء و معراج کی تفصیلات کے لیے تفسیر ابن کثیر اور کتب احادیث کا مطالعہ فرمائیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بڑی تفصیل، ترتیب اور سلیقے سے روایات جمع فرمادی ہیں۔

⑥ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کا نام ”اسراء“ ہے، جو یہاں مذکور ہے اور وہاں سے سدرة المنتہیٰ تک کا سفر ”معراج“ کہلاتا ہے۔ اس کا ذکر سورہٴ نجم اور کتب احادیث میں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں بہت سی احادیث مع سند ذکر فرمائی ہیں، ان میں سے بعض روایات کے آخر میں فرمایا کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا: ”اس حدیث کے الفاظ دلیل ہیں کہ معراج اسی رات ہوئی ہے جب آپ مکہ سے بیت المقدس گئے ہیں اور یہی حق ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔“

⑦ قرطبی نے فرمایا کہ اسراء کا واقعہ حدیث کی تمام کتابوں میں ثابت ہے اور اسلام کے زیر نگین تمام علاقوں کے صحابہ سے مروی ہے، اس لحاظ سے یہ متواتر ہے۔ نقاش نے اسے نقل کرنے والے میں صحابہ ذکر کیے ہیں۔ گو بعض جزئیات میں اختلاف ہے مگر اصل واقعہ بلا شک و شبہ ثابت ہے۔ (قرطبی)

⑧ علمائے سلف و خلف بیہقیہ کا عقیدہ ہے کہ یہ واقعہ بیداری میں روح اور جسم سمیت پیش آیا اور قرآن میں لفظ ”وَعَبْدِي“ سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے، کیونکہ عبد صرف روح کو نہیں کہتے، بلکہ روح مع جسد کو کہتے ہیں۔ پھر اگر یہ خواب کا واقعہ ہوتا تو کفار قریش اسے نہ جھٹلاتے، کیونکہ خواب میں تو ہر ایک کو عجیب و غریب واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور نہ قرآن ہی ”سُبْحَنَ الَّذِي“ کی تمہید کے ساتھ اسے بیان کرتا، کیونکہ ان تمہیدی الفاظ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اہم اور خرق عادت واقعہ بیان کیا جا رہا ہے، پھر ”لَيْلِيْزِيْنَ اَلَيْتِنَا“ اور ”مَا دَاغَ الْبَصْرَ وَمَا ظَلَمِي“ (نجم: ۱۷) میں بھی سر کی آنکھوں سے دیکھنے کا ذکر ہے، پھر براق پر سواری بھی جسمانی معراج کی دلیل ہے۔ بعض علماء نے آیت کریمہ: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْ اَرٰىكَ اِلَّا فَنْتًا لِلنَّاسِ﴾ [بنی اسرائیل: ۶۰] میں لفظ ”الرُّؤْيَا“ سے استدلال کیا ہے کہ یہ خواب کا واقعہ ہے، مگر محققین علمائے لغت نے تصریح کی ہے کہ لفظ ”الرُّؤْيَا“ (جو ”رَأَى يَرَى“ کا مصدر ہے) بیداری میں آنکھوں کے دیکھنے پر بھی استعمال ہوتا ہے، یہاں یہی مراد ہے اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے تصریح فرمائی ہے: ﴿هِيَ رُؤْيَا عَيْنٍ اُرِيَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ اُسْرِيْ بِهٖ اِلَى بَيْتِ الْمَقْدِسِ﴾ [بخاری، مناقب الأنصار، باب المعراج: ۲۸۸۸] ”یہ آنکھوں کا دیکھنا

تھا جو رسول اللہ ﷺ کو اس رات دکھایا گیا جس رات آپ کو بیت المقدس لے جایا گیا۔“ معلوم ہوا کہ اس آیت سے ان علماء کا استدلال درست نہیں ہے، تمام صحابہ روایا و درایا اس پر متفق ہیں کہ آپ ﷺ کو معراج بیداری کی حالت میں ہوئی اور جسم کے ساتھ ہوئی۔ صرف عائشہ اور معاویہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ معراج خواب میں ہوئی، مگر ایک تو یہ روایت سنداً منقطع ہے اور پھر ان کی اپنی رائے اور آیت کریمہ ﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ﴾ [نسی اسرائیل: ۶۰] سے استدلال ہے جو صحابہ کے متفقہ فیصلے کے مقابلے میں توجہ کے قابل نہیں۔ (شوکانی، ابن کثیر)

⑨ علامہ جمال الدین قاسمی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اکثر اہل علم کا کہنا ہے کہ اسراء بعثت نبوی کے بعد ہوا ہے اور یہ کہ وہ ہجرت سے ایک سال پہلے تھا۔ زہری اور ابن سعد وغیرہ کا یہی کہنا ہے، امام نووی نے بھی یہ بات یقین سے کہی ہے، ابن حزم رحمہ اللہ نے مباہلہ کرتے ہوئے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے اور کہا ہے کہ یہ (اسراء و معراج) رجب ۱۲ نبوی میں ہوئی ہے۔ طبیعت کو اطمینان اس بات پر ہوتا ہے کہ اسراء و معراج کے واقعات ابوطالب اور خدیجہ رضی اللہ عنہما کی وفات کے بعد ہوئے ہیں، کیونکہ اس دوران میں مشرکین کی ایذا بہت بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ انعام ان کی طرف سے پیش آنے والی ایذا سے تسلی دینے کے لیے اور آپ کی عزت افزائی اور تکریم کے لیے عطا فرمایا۔ اشرف الموحاشی میں ہے کہ اکثر روایات کے مطابق یہ قصہ ہجرت سے ایک سال قبل کا ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور ملا امین عمری نے اسے قطعی قرار دیا ہے۔ بعض روایات میں تین سال قبل بھی مذکور ہے۔

علامہ شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیحین میں ”شریک عن انس“ کی سند سے جو مذکور ہے کہ اسراء مذکور خواب میں واقع ہوا، وہ کتاب و سنت کی صریح نصوص اور اہل السنۃ و الجماعہ کے عقیدے (کہ اسراء و معراج بیداری میں جسمانی ہوئی) کے خلاف نہیں، کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ پہلے یہ سب کچھ آپ کو خواب میں دکھایا گیا ہو اور پھر اس کی تصدیق بیداری میں دکھا کر کی گئی ہو، جیسا کہ آپ ﷺ نے خواب میں دیکھا: ﴿لَتَذْكُرَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنَّ شَاءَ اللَّهُ أَمِينٌ﴾ ﴿مُحَلِّقِينَ رُءُوسَهُمْ﴾ [الفتح: ۲۷] ”تم مسجد حرام میں ضرور بغرور داخل ہو گے، اگر اللہ نے چاہا، امن کی حالت میں، اپنے سر منڈاتے ہوئے اور کتراتے ہوئے۔“ پھر بیداری میں اس کی تصدیق بالفعل بھی فرمادی گئی۔ اس کی تصدیق عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ صبح کے طلوع ہونے کی طرح دن کو سامنے آ جاتا۔ علاوہ ازیں انس رضی اللہ عنہ سے شریک کے علاوہ بہت سے حفاظ نے یہ روایت بیان کی ہے، لیکن کسی نے بھی شریک کے خواب میں دیکھنے والے الفاظ بیان نہیں کیے۔ اہل علم کی ایک جماعت نے فرمایا کہ شریک بن عبد اللہ بن ابی نمر نے انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت صحیح یاد نہیں رکھی۔ امام مسلم نے فرمایا کہ شریک نے یہ حدیث ثابت بنانی (انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد) کی طرح بیان کی اور اس میں کچھ چیزیں آگے پیچھے کر دیں اور کچھ کم زیادہ کر دیں۔ دوسرے تمام حفاظ کی روایت صحیح ہے اور اس میں شریک والے الفاظ نہیں ہیں۔

● بعض لوگ معراج کی رات میں لیلۃ القدر کی طرح خصوصی قیام اور تلاوت و ذکر کا اہتمام کرتے ہیں، اگر اس کی کوئی حقیقت ہوتی تو کم از کم کسی صحیح سند کے ساتھ اس مہینے اور دن کی تعیین ضرور معلوم ہوتی، جس میں یہ واقعہ ہوا اور صحابہ بھی اس رات

اس کا اہتمام کرتے، جبکہ ستائیس (۲۷) رجب کی کوئی صحیح روایت موجود نہیں اور نہ نبی کریم ﷺ یا صحابہ سے اس رات کی خاص عبادت کا کہیں ذکر ہے، رسی آتش بازی اور چراغاں تو وہ آتش پرستوں کے ساتھ مشابہت ہے جس سے پرہیز لازم ہے۔

❶ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی زیارت کی ہے یا نہیں، یہ بحث سورہ نجم (۹) ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ﴾ میں آئے گی اور معراج کے واقعہ کا بقدر ضرورت ذکر بھی وہیں ہوگا۔ (ان شاء اللہ)

❷ الذی بُرِكَتَا حَوْلَهُ: یعنی وہاں ظاہری اور مادی برکات بھی ہیں کہ وہاں چشموں، نہروں اور ہر قسم کے غلے اور پھلوں کی بہتات ہے اور معنوی و باطنی اعتبار سے بھی وہ خطہ بابرکت ہے کہ بیت المقدس میں چاروں مقدس کتابیں پڑھی گئیں، بہت سے انبیاء و رسل وہاں مبعوث ہوئے، وہاں دنیا میں کعبۃ اللہ کے بعد بنائی جانے والی دوسری مسجد ہے، جو ان تین مساجد میں شامل ہے جن کے علاوہ کسی جگہ ثواب کی نیت سے کجاوے کر کر جانا منع ہے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ یہ اصطلاح بیت المقدس اور شام کے لیے آئی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَنَجِّنِيْهُ وَنُوْطِلِيْ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِي بُرِكَتَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ [الانبیاء: ۷۱] اور ہم نے اسے اور لوط کو اس سرزمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے جہانوں کے لیے برکت رکھی۔“ اور فرمایا: ﴿وَلَسَلِيْنُ الزِّيْرَةَ عَاصِفَةً تُجْرِيْ بِاَقْوَامٍ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِي بُرِكَتَا فِيْهَا﴾ [الانبیاء: ۸۱] ”اور سلیمان کے لیے ہوا (مختر کردی) جو تیز چلنے والی تھی، اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی۔“ ان تمام آیات سے مراد سرزمین شام ہے۔

❸ لِيُرِيَهُ مِنْ اٰيَاتِنَا: اسراء میں پیش آنے والی نشانیاں، مثلاً آپ کے مکان کی چھت کا کھولا جانا، جبریل علیہ السلام کا آپ کا سینہ مبارک چاک کر کے دل کو زم زم سے دھو کر ایمان و حکمت سے بھر کر پھر ملا دینا، براق کی سواری جس کا قدم حدنگاہ پر پڑتا تھا، مہینوں کا سفر لحوں میں طے ہونا، بیت المقدس میں دودھ اور شراب کا پیش کیا جانا اور آپ کا دودھ کو پسند فرمانا، انبیاء علیہم السلام کی ملاقات اور امامت وغیرہ، پھر سفر معراج کی بے شمار نشانیاں ان کے علاوہ ہیں جن کے متعلق فرمایا: ﴿لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى﴾ [النجم: ۱۸] ”بلشبہ یقیناً اس نے اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں۔“

❹ اِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ”سُبْحٰنَ الَّذِيْ اَسْمٰى“ میں اپنا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ فرمایا، پھر ”بُرِكَتَا حَوْلَهُ“ اور ”لِيُرِيَهُ مِنْ اٰيَاتِنَا“ میں تین مرتبہ جمع منکلم برائے تعظیم کے ساتھ، پھر اس آیت کے آخر میں ”اِنَّهُ هُوَ“ غائب کے ساتھ اور اس سے اگلی آیت میں پھر جمع منکلم کے ساتھ فرمایا ہے، پھر بھی سمجھنے میں کسی جگہ کوئی الجھن پیش نہیں آئی بلکہ لطف محسوس ہوتا ہے۔ کلام کا یہ اسلوب بلاغت کا کمال ہے، اسے عربی میں التفات کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ واقعہ اسراء میں کرائی ایمان کے اسے تسلیم کرنے کو اور کفار کے اس سے انکار کو اور دونوں نے اس پر جو کچھ کہا اور کیا یقیناً وہ صرف وہی (اللہ) ہے جو سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا اور اس کے مطابق ہر ایک سے معاملہ کرنے والا اور جزا و سزا دینے والا ہے۔

وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكَيْلًا ۝
 ذُرِّيَّةً مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۗ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ۝ وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي
 الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوقًا كَبِيرًا ۝

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا کہ تم میرے سوا کوئی کارساز نہ پکڑو ۝
 اے ان لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا! بے شک وہ بہت شکر گزار بندہ تھا ۝ اور ہم نے
 بنی اسرائیل کو کتاب میں فیصلہ سنا دیا تھا کہ بے شک تم زمین میں ضرور دو بار فساد کرو گے اور بے شک تم ضرور سرکشی
 کرو گے، بہت بڑی سرکشی ۝

آیت 2 ۱ وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ: یعنی جس طرح نبی کریم ﷺ کو اسراء کا شرف عطا فرمایا، اسی طرح ہم نے موسیٰ ﷺ کو
 کو ”الْكِتَابَ“ (تورات) سے نوازا۔ قرآن مجید میں عموماً نبی کریم ﷺ کے ذکر کے ساتھ موسیٰ ﷺ اور بنی اسرائیل کا ذکر ہوتا
 ہے، تاکہ رسول اللہ ﷺ کو دعوت میں پیش آنے والی مشکلات کی مثال پیش نظر رہے اور آپ کی امت کو رسول کی اطاعت
 اور اس کی نافرمانی کے نتائج پیش نظر رہیں۔

۲ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ: اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا، یعنی تورات کو یا موسیٰ ﷺ کو۔ یہ
 آیت سورہ سجدہ کی آیت (۲۳) کے مشابہ ہے۔

۳ إِلَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكَيْلًا: ”أَلَا تَتَّخِذُوا“ اصل میں ”أَنْ لَا تَتَّخِذُوا“ ہے۔ یہاں ”أَنْ“ کو مصدر یہ مان کر اس
 سے پہلے لام محذوف مانیں گے، یعنی ”بَلَّا تَتَّخِذُوا“ (تاکہ تم.....) یا ”أَنْ“ بمعنی ”أَنْ“ (تفسیر یہ) ہے، یعنی ہم نے موسیٰ
 کو کتاب دی جس کا خلاصہ اور مطلب یہ ہے کہ..... ”وَكَيْلًا“ ”وَكَلَّ يَكْلُ“ (سپرد کرنا) سے ”فَعِيلٌ“ بمعنی مفعول ہے،
 جس کے سپرد اپنا کام کیا جائے، یعنی میرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ سمجھو، نہ اپنے کام کسی اور کے سپرد کرو۔

آیت 3 ۴ ذُرِّيَّةً مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ.....: ”ذُرِّيَّةً“ سے پہلے ”يَا“ حرف ندا محذوف ہے، ”اے ان لوگوں کی اولاد.....!“
 یعنی تم ان صالح لوگوں کی اولاد ہو جنہیں ہم نے نوح ﷺ کے ساتھ کشتی میں سوار کر کے نجات بخشی۔ مقصد بنی اسرائیل کو ایمان
 اور عمل صالح پر ابھارنا ہے کہ دیکھو تم کن لوگوں کی اولاد ہو، تمہارے لیے اپنے صالح آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چل کر ایک اللہ
 کی عبادت کا پابند رہنا، اپنے باپ نوح ﷺ کی طرح ہر وقت اسی کا شکر گزار رہنا اور اس کے سوا کسی کو اپنا وکیل، کارساز اور
 بھروسے کے قابل نہ سمجھنا لازم ہے۔

آیت 4 ۵ وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ.....: ”تُفْسِدُنَّ“ اور ”لَتَعْلُنَّ“ اصل میں ”لَتُفْسِدُونَّ“ اور
 ”لَتَعْلُونَّ“ تھے۔ اللہ تعالیٰ کا علم بندوں کی طرح محدود نہیں کہ اسے صرف گزشتہ اور موجودہ باتوں ہی کا علم ہو، بلکہ اسے

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهِمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ

پھر جب ان دونوں میں سے پہلی کا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے سخت لڑائی والے کچھ بندے بھیجے، پس وہ گھروں آئندہ کسی بھی وقت ہونے والی ہر بات کا اسی طرح علم ہے جس طرح گزشتہ یا موجودہ کا پوری طرح علم ہے اور ہر گزشتہ یا آنے والا کام اس کے کمال علم و حکمت کے مطابق طے شدہ ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی حکم و مضبوط تدبیر و تقدیر کی وجہ سے کوئی خرابی، کوئی حادثہ پیش نہیں آتا۔ اسی تقدیر کے مطابق انسان کو کچھ اختیار دے کر آزما یا گیا ہے اور وہ اپنے اختیار کو کس طرح استعمال کرے گا، اللہ تعالیٰ کو اس کا بھی پہلے سے علم ہے۔ اس علم کے مطابق اس نے بنی اسرائیل کو تورات سے پہلے ہی آگاہ کر دیا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد کرو گے اور بہت بڑی سرکشی کرو گے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو پہلے بتانے کا اور ہماری امت کو یہ خبر دینے کا کیا فائدہ؟ تو جواب یہ ہے کہ مقصد انھیں بتانے کا اور ہمیں اس کی خبر دینے کا یہ ہے کہ فساد اور سرکشی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، تاکہ ہر شخص اس سے بچنے کی پوری جدوجہد کرے۔ ”الارض“ سے مراد سرزمین شام ہے اور لام عہد کا ہے۔ پچھلی تفسیری آیات یعنی سورۃ انبیاء (۸۱) میں مذکور ”الارض التي بئیکمنا فیہا“ سے بھی شام ہی مراد ہے، یا مراد ساری زمین ہے اور یہودیوں کا فساد اور ان کو ملنے والی سزا شام میں بھی واقع ہوئی اور دوسرے علاقوں میں بھی۔

آیت 5.6 ① فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهِمَا.....: اس دو مرتبہ کے فساد اور اس کی سزا کی تعیین کا کوئی مضبوط اور قابل اعتماد ذریعہ ہمارے پاس قرآن و سنت کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ تاریخ خصوصاً قبل مسیح کی تاریخ کی نہ کوئی سند ہے نہ اس کے ثبوت کی کوئی اور پختہ دلیل، رہا ان کا فساد تو اس کا شمار ہی نہیں۔ قرآن مجید میں ان کے مذکورہ فسادات ہی دیکھ لیں، سمندر سے پار ہوتے ہی معبود بنانے کا مطالبہ، پھر سامری کا چھڑا بنانا اور اس کی عبادت، پھر موسیٰ علیہ السلام سے مسلسل مختلف تقاضے، حتیٰ کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے دیکھنے کو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کی شرط قرار دے دیا۔ پھر جہاد کے لیے نکلنے کی دعوت پر ﴿فَإِذَا هَبَّ آئْتُ وَرَبُّكَ فَفَقَاتِلْآ إِنَّا هُنَا قَاعِدُونَ﴾ [المائدہ: ۶۴] کہنا، پھر ان کا سود کھانا، رشوت لینا، سبت (ہفتے کے دن) کی تعظیم کے بجائے حیلے کے ساتھ اس میں شکار کرنا۔ ہمسایہ قوموں کے اثر سے بت پرستی اور زنا کا عام ہونا، کتاب اللہ میں تحریف کرنا، لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانا، اپنے بزرگوں اور نبیوں کو خدا کا درجہ دینا، احبار و رہبان کی تقلید کرنا، احبار و رہبان کا لوگوں کے اموال باطل طریقے سے کھانا اور صحیح دین سے لوگوں کو ہٹانا، اللہ کے نبیوں کو اور نیکی کا حکم دینے والے صالحین کو قتل کرنا، پھر رسول اللہ ﷺ کو بیچانے کے باوجود ان پر ایمان نہ لانا، بلکہ آپ ﷺ کو قتل کرنے کے درپے ہونا۔ غرض ان کے فسادات کا کوئی شمار ہی نہیں، اسی طرح ان پر اللہ کے عذاب کا کوڑا مسلسل برستے رہنا بھی صرف دو دفعہ تک محدود نہیں بلکہ قیامت تک بار بار بدترین عذابوں کا نشانہ بنا کر ان میں مذکور ہے، فرمایا: ﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لِيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ آلِي يُونُسَ الْقَيْمَةِ مَنْ يَسُوءْهُمُ سُوءُ الْعَذَابِ﴾ [الأعراف: ۱۶۷] ”اور جب تیرے رب نے صاف اعلان کر دیا کہ وہ قیامت کے دن تک ان پر ایسا آدمی ضرور بھیجتا رہے گا جو انھیں برا عذاب دے۔“ اس لیے ان دو مرتبہ کی تعیین ایک مشکل کام ہے۔

وَ كَانَ وَعْدًا تَفْعُولًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ أَمَدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَ بَنِينَ

کے اندر گھس گئے اور یہ ایسا وعدہ تھا جو (پورا) کیا ہوا تھا ۝ پھر ہم نے تمہیں دوبارہ ان پر قلبہ دیا اور تمہیں مالوں اور

مفسرین کا اس تعین میں اختلاف بھی اس کی دلیل ہے۔ کوئی بائبل کے بادشاہ سخاریب اور اس کے جنگجو ساتھیوں کو اس کا مصداق قرار دیتا ہے، کوئی عمالقہ کو، کوئی بخت نصر کو، بعض جدید مفسرین نے یہاں بائبل سے لمبی چوڑی عبارتیں نقل کیں اور ان میں مذکور بعض واقعات اور شخصیتوں کو اس کا مصداق قرار دیا، حالانکہ بائبل کی کسی بات پر یقین جائز نہیں، سوائے ان باتوں کے جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں، رسول اللہ ﷺ نے صاف الفاظ میں فرمایا: « لَا تُصَدِّقُوا أَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَدِّبُوا لَهُمْ وَ قُولُوا: ﴿ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَا اُنزِلَ ﴾ [البقرة: ۱۳۶] » [بخاری، الشهادات، باب لا یسأل اهل الشرك... قبل ح: ۲۶۸۵، تعلقاً عن ابي هريرة رَضِيَ اللهُ عَنْهُ] ” اہل کتاب کو نہ سچا کہو اور نہ انہیں جھوٹا کہو، بلکہ یہ کہہ لیا کرو کہ ہم اللہ پر اور جو کچھ اس نے نازل کیا سب پر ایمان لائے۔“ اسی باب میں امام بخاری رَضِيَ اللهُ عَنْهُ نے ابن عباس رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: « يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ، كَيْفَ تَسْأَلُونَ أَهْلَ الْكِتَابِ؟ وَ كَيْتَابُكُمْ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى نَبِيِّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَدُتِ الْأَخْبَارِ بِاللَّهِ تَقَرُّهُ وَ نَهَ لَمْ يُشَبَّ وَ قَدْ حَدَّثَكُمْ اللَّهُ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ بَدَّلُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ وَ غَيَّرُوا بِأَيْدِيهِمُ الْكِتَابَ فَقَالُوا: ﴿ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ﴾ [البقرة: ۷۹] أَفَلَا يَنْهَاهُمْ مَا جَاءَكُمْ مِنْ الْعِلْمِ عَنْ مُسَاءَلَتِهِمْ؟ وَ لَا وَاللَّهِ! مَا رَأَيْنَا مِنْهُمْ رَجُلًا قَطُّ يَسْأَلُكُمْ عَنِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ » [بخاری، الشهادات، باب لا یسأل اهل الشرك عن الشهادة وغيرها: ۲۶۸۵] ” اے مسلمانو کی جماعت! تم اہل کتاب سے کس طرح سوال کرتے ہو، حالانکہ تمہاری کتاب جو اس کے نبی ﷺ کی طرف نازل کی گئی وہ تمام خبروں میں سے اللہ کی طرف سے نئی ہے۔ تم اسے ایسی حالت میں پڑھتے ہو کہ اس میں کوئی ملاوٹ نہیں کی گئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بتا دیا ہے کہ اللہ نے جو کچھ لکھا تھا اہل کتاب نے اسے بدل دیا اور اپنے ہاتھوں سے کتاب کو تبدیل کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے ساتھ تھوڑی قیمت خریدیں۔ کیا وہ علم جو تمہارے پاس آیا ہے تمہیں ان سے سوال کرنے سے منع نہیں کرتا؟ اور نہیں، قسم ہے اللہ کی! ہم نے ان میں سے کسی آدمی کو کبھی نہیں دیکھا کہ وہ تم سے اس کے متعلق سوال کرتا ہو جو تم پر نازل کیا گیا ہے۔“ اب ایسی بات جسے سچا کہا ہی نہیں جا سکتا اس پر یقین کیسے ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ تعین نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ قرآن مجید محض تاریخ کی کتاب نہیں، نہ ہر جگہ اس میں واقعات پوری ترتیب اور تفصیل کے ساتھ مذکور ہوتے ہیں بلکہ اس میں واقعات کا صرف وہی حصہ بیان ہوتا ہے جو نصیحت و عبرت سے تعلق رکھتا ہے، تاہم اگر کسی معتبر ذریعے سے اس کی تفصیل معلوم ہو جائے تو نصیحت و عبرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۲ قرآن مجید کے مطابق مصر سے نکلنے کے بعد موسیٰ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ نے بنی اسرائیل کو ارض مقدس میں داخلے کے لیے جہاد کا حکم دیا اور بتایا کہ اس سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ملکیت بنانا طے فرما دیا ہے، مگر غلامی کی خوگر اس نسل نے نہایت گستاخانہ الفاظ میں

وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ①

بیٹوں سے مدد دی اور تمہیں تعداد میں زیادہ کر دیا ①

جہاد کے لیے نکلنے سے انکار کر دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ مائدہ (۲۰ تا ۲۶) اس کے نتیجے میں وہ چالیس سال وہیں صحرا میں سرگرداں رہے۔ موسیٰ علیہ السلام اس دوران وفات پا گئے، اللہ کے اس جلیل القدر پیغمبر کو ارض مقدس میں جانے کی اس قدر حسرت تھی کہ انھوں نے وفات کے وقت دعا کی کہ یا اللہ! مجھے ارض مقدس سے اتنا قریب کر دے کہ پتھر پھینکنے سے اس زمین میں پہنچ جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر میں وہاں ہوتا تو تمہیں ان کی قبر راستے کی ایک جانب سرخ نیلے کے نیچے دکھاتا۔“ [بخاری، احادیث الانبیاء، باب وفاة موسیٰ و ذکرہ بعد: ۲۴۰۷] جب وہ نسل جو ان ہوئی جو آزادی کے دور میں پیدا ہوئی تھی تو انھوں نے ارض شام اور بیت المقدس کو فتح کیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں آزادی کے ساتھ حکومت کی نعمت بھی عطا فرمائی۔ یہ دور کتنے عرصے پر محیط تھا، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دین سے دوری اور دنیا کی محبت کی بنا پر وہ آپس میں لڑنے لگے، اللہ تعالیٰ کے احکام کو پس پشت پھینک دیا اور اس قدر فساد فی الارض کے مرتکب ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے وہ سخت جنگ والے بندے بھیجے جن کا یہاں اس آیت میں ذکر ہے۔ وہ ان کے گھروں کے اندر گھس گئے اور ان کے گھروں، زمینوں، عورتوں اور بچوں پر قابض ہو گئے اور انھیں بیت المقدس اور ارض شام سے نکال باہر کیا، بیت المقدس میں داخل ہو کر اس کی جتنی بے حرمتی کر سکتے تھے انھوں نے کی۔ یہ پہلے فساد کی سزا تھی۔ اس وقت ان حملہ آوروں کا بادشاہ کون تھا، اللہ تعالیٰ نے واضح نہیں فرمایا۔ اس کے ایک عرصہ بعد بنی اسرائیل کے کچھ سرداروں نے ارض مقدس اور اپنے اسیروں کی واپسی کے لیے وقت کے نبی سے کوئی بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی، جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق طاقت مقرر کیے گئے۔ یہ مفصل واقعہ سورہ بقرہ (۲۴۶ تا ۲۵۱) اور اس کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ اس وقت کفار کا بادشاہ جالوت تھا، ممکن ہے بنی اسرائیل پر عذاب کا کوڑا بھی اسی کے ہاتھوں برسایا ہو۔ بہر حال کفار کو شکست ہوئی اور داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا۔ ارض مقدس پر پھر بنی اسرائیل قابض ہو گئے اور اللہ کا دین پھر غالب ہو گیا۔ طاقت کے بعد داؤد علیہ السلام نے جہاد کے ذریعے سے اس سلطنت کو مزید وسیع کیا، ان کے بعد سلیمان علیہ السلام کو ایسی حکومت عطا ہوئی جو ان کی دعا کے مطابق ان کے بعد کسی کے لائق ہی نہیں۔ اس کی تفصیل سورہ نمل (۱۵ تا ۴۳)، سورہ ص (۱۷ تا ۴۰)، سورہ انبیاء (۷۷ تا ۸۲) اور سورہ سبا (۱۰ تا ۱۴) میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ سب آیات زیر تفسیر آیت: ﴿فَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا﴾ کی تفسیر ہیں۔ ان کی وفات کے بعد پھر اخلاقی زوال اور دنیا پرستی کا دور شروع ہوا، حتیٰ کہ کئی انبیاء و صلحاء، جو گناہ سے منع کرتے تھے، شہید کر دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل ختم ہو گیا، مشرک قوموں کی ہمسائیگی اور دوستی کے نتیجے میں شرک، جادو، قتل ناحق، زنا، ڈاکے وغیرہ پھیل گئے اور اللہ کی حدود معطل ہو گئیں، حتیٰ کہ مسیح علیہ السلام کو بھی انھوں نے اپنے خیال میں سولی پر چڑھا دیا۔ اس سے پچھلے حاشیے میں بھی کئی خرابیاں ذکر ہوئی ہیں۔ وہ آپس

إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيُسْوَءَا
وُجُوهَكُمْ ۖ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ وَلِيَتَّبِعُوا مَا عَلَوُا تَتْبِيرًا ۝۷

اگر تم نے بھلائی کی تو اپنی جانوں کے لیے بھلائی کی اور اگر برائی کی تو انہی کے لیے، پھر جب آخری بار کا وعدہ آیا (تو ہم نے اور بندے تم پر بھیجے) تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور تاکہ وہ مسجد میں داخل ہوں، جیسے وہ پہلی بار اس میں داخل ہوئے اور تاکہ جس چیز پر غلبہ پائیں اسے برباد کر دیں، بری طرح برباد کرنا ۷

میں لڑ کر کئی فرقوں اور کئی سلطنتوں میں بٹ گئے۔ انبیاء کو قتل کرنے اور مسجداً کو اپنے خیال میں سولی دینے کے بعد پھر ان پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سخت ترین کوڑا برسایا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ ان پر اللہ کے سخت لڑاکا لوگ حملہ آور ہوئے اور ان سے وہ سلوک کیا جو اس سے اگلی آیت ”فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيُسْوَءَا وُجُوهَكُمْ“ میں مذکور ہے۔

آیت 7 ﴿فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيُسْوَءَا وُجُوهَكُمْ﴾: ”سَاءَ هُ يَسُوءُهُ“ کا فعل مضارع ہے، جو اصل میں ”يَسُوءُ وَنَ“ تھا۔ ”لام سکتی“ کے بعد ”أَنْ“ مقدر کی وجہ سے نون گر گیا۔ یہ فعل متعدی ہے، ٹنگلین کرنا، برا کر دینا، بگاڑ دینا۔ خوشی ہو یا غم، جسمانی یا قلبی راحت ہو یا اذیت، اس کا اثر چہرے پر نمایاں ہوتا ہے، خوشی میں چہرہ چمک اٹھتا ہے اور غم سے کالا ہو جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَلَمَّا سَأَرَأَوْهُ زُلْفَةً سَيِّئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ [الملك: ۲۷] ”پس جب وہ اس (عذاب) کو قریب دیکھیں گے تو ان لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے (بگاڑ دیے جائیں گے) جنہوں نے کفر کیا۔“ لوط علیہ السلام کے ٹنگلین ہونے کے متعلق فرمایا: ﴿سَيِّءٌ يَبْهَتُ﴾ [ہود: ۷۷] ”وہ ان (مہمانوں) کی وجہ سے مغموم ہو گیا۔“ اور فرمایا: ﴿ظَلَمَ وَجْهَهُ مَسْوُودًا وَهُوَ كَظِيمٌ﴾ [النحل: ۵۸] ”(لڑکی پیدا ہونے کی بشارت ملنے پر) اس کا منہ سارا دن کالا رہتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوتا ہے۔“ ”عَلَوُوا“ ”عَلَا يَعْلُو“ سے ماضی معلوم جمع مذکر غائب ہے، اس کا مفعول محذوف ہے، یعنی ”مَا عَلَوْهُ“ ”تَتْبِيرًا“ ویران کرنا، برباد کرنا، ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دینا۔ ”لِيَتَّبِعُوا“ کی تاکید ”تَتْبِيرًا“ سے کی ہے، اس لیے ترجمہ میں اس کا معنی بری طرح برباد کرنا کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلی دفعہ کا عذاب مکمل ”تَتْبِيرًا“ یعنی دوسری مرتبہ جیسا بری طرح برباد کرنا نہیں تھا، جب کہ دوسری مرتبہ کا عذاب دشمن کے گھروں میں گھسنے اور مسجد کی بے حرمتی سے کہیں بڑھ کر تھا، اس سے بنی اسرائیل بری طرح خوف و غم میں مبتلا ہوئے، حتیٰ کہ ان کے چہرے بگڑ گئے اور دشمن نے بنی اسرائیل کو اس بری طرح برباد کیا کہ وہ مدتوں اٹھ نہیں سکے۔

۲ اس دوسری دفعہ والے بندوں سے مراد کون لوگ ہیں، اگرچہ قرآن نے ان کی تعیین نہیں فرمائی، تاہم اگر دیکھا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت یہودی بیت المقدس سے مکمل بے دخل تھے، وہاں نصرانیوں کا قبضہ تھا اور یہودیوں کو داخلے تک کی اجازت نہیں تھی، وہ مدینہ، خیبر اور دنیا کے مختلف خطوں میں بکھرے ہوئے تھے تو اللہ کی طرف سے ان

عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ ۚ وَإِنْ عُذْتُمْ عُدْنَا ۖ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ﴿۸﴾

تمہارا رب قریب ہے کہ تم پر رحم کرے اور اگر تم دوبارہ کرو گے تو ہم (بھی) دوبارہ کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنایا ہے ﴿۸﴾

زبردست بندوں کے ان پر مسلط ہو کر انھیں مکمل طور پر تباہ و برباد کر کے قدس سے نکال دینے کا اندازہ ہوتا ہے۔ مؤرخین دوسری مرتبہ کا حملہ آور طوطوس (ٹیولس) رومی کو قرار دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کی تعین کا کوئی معتبر ذریعہ نہیں۔ یہاں آکر اسرائیلیوں کی تاریخ ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے بعد وہ دنیا کے مختلف علاقوں میں بکھر گئے، چنانچہ اس کے بعد ان ممالک کی تاریخ کے ضمن ہی میں یہودی تاریخ کا ذکر آتا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے بیت المقدس پر حملہ کیا تو اس وقت یہاں نصرانیوں کی حکومت تھی جنھوں نے مقابلے کی تاب نہ لا کر ۱۶ھ میں صلح کے ذریعے سے شہر کی چابیاں امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کے حوالے کر دیں۔ قدس سے نکلنے کے بعد تقریباً دو ہزار سال تک یہودی بیت المقدس سے بے دخل رہے۔ مگر جب مسلمانوں نے اللہ کے احکام سے بغاوت اختیار کی، شرک و بدعت، فرقت پرستی، عیش و عشرت، زنا، شراب، موسیقی، کفار سے دوستی اور ان کی تقلید اختیار کر لی، اپنے ہی دستور و قانون بنا کر کتاب و سنت پر عمل ترک کر دیا۔ دنیا کی محبت میں جہاد چھوڑ بیٹھے تو ان کی بد عملیوں کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمن یہودیوں کو دوسرے کفار کی مدد (يَحْتَبِلُ فَمِنْ اَللّٰهِ) کے ساتھ پھر ۱۹۶ھ میں بیت المقدس پر قبضے کا موقع دے دیا، مگر یہ سمجھ لینا کہ اب یہ یہودیوں کے قبضے ہی میں رہے گا درست نہیں، مسلمان اپنے دین کی طرف پلٹیں گے، بلکہ پلٹنا شروع ہو چکے ہیں اور مسلمانوں اور یہودیوں کی جنگ ہوگی، اس میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی نصرت عطا ہوگی جس کا ذکر اس حدیث میں ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّىٰ يُقَاتِلَ الْمُسْلِمُونَ الْيَهُودَ، فَيَقْتُلُهُمُ الْمُسْلِمُونَ، حَتَّىٰ يَخْتَبِئَ الْيَهُودِيُّ مِنْ وِرَاءِ الْحَجَرِ أَوْ الشَّجَرِ، فَيَقُولُ الْحَجَرُ أَوْ الشَّجَرُ يَا مُسْلِمُ! يَا عَبْدَ اللَّهِ! هَذَا يَهُودِيٌّ خَلَفَنِي، فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ، إِلَّا الْغُرْفَةَ، فَإِنَّهُ مِنْ شَجَرِ الْيَهُودِ» [مسلم، الفتن، باب لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل... ۲۹۲۲]

”قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ مسلمان یہود سے جنگ کریں گے اور مسلمان انھیں قتل کریں گے، یہاں تک کہ یہودی پتھر اور درخت کے پیچھے چھپے گا تو پتھر یا درخت کہے گا: ”اے مسلم! اے اللہ کے بندے! یہ یہودی میرے پیچھے ہے تو اسے قتل کر دے۔“ سوائے ”غرقتہ“ نامی درخت کے، کیونکہ وہ یہود کے درختوں میں سے ہے۔“

بیت 8 ﴿۸﴾ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ ۚ یہ اللہ کی رحمت کا بیان ہے کہ اتنی سرکشی اور سزا کے بعد بھی اگر تم واپس پلٹ آؤ اور حد سے بڑھی ہوئی اس دوسری سرکشی اور اس کی وجہ سے ناقابل بیان تباہی سے دو چار ہونے کے بعد بھی تورات و انجیل میں مذکور نبی محمد ﷺ کی پیروی اختیار کرو تو پوری امید ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ اعراف کی آیات (۱۵۶، ۱۵۷) میں فرمایا کہ میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، سو میں اسے ان لوگوں کے لیے ضرور لکھ دوں گا جو کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اس رسول کی پیروی کریں گے جو امی نبی ہے، جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ چنانچہ اس بشارت کے مطابق جو اسرائیلی، مثلاً عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے وہ رحمت الہی کے حق دار بن گئے۔

② **وَإِنْ عُدُّوْهُ عُدًّا**: یعنی اگر تم پھر دوبارہ حد سے بڑھے اور فساد کبیر کے مرتکب ہوئے تو ہم دوبارہ تمہارے ساتھ وہی پہلے جیسا سلوک کریں گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو آپ نے یہود مدینہ کے ساتھ صلح کے ساتھ رہنے کا اور متحد ہو کر حملہ آور دشمن کا مقابلہ کرنے کا معاہدہ کیا، مگر بنو قینقاع نے ایک مسلم خاتون کی بے حرمتی کی، پھر معاہدہ توڑ دیا، رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا اور آخر کار انھیں مدینہ سے جلا وطن کر دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ کسی معاملے کے لیے بنو نضیر قبیلہ میں تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ کو چھت سے پتھر گرا کر شہید کرنے کی سازش کی، جو آپ کے علم میں آگئی، آپ نے ان کا محاصرہ کر لیا، وہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکے اور رسول اللہ ﷺ نے انھیں ان کی کتاب تورات میں مذکور سزا دینے کا ارادہ کیا، مگر ان کے ہمدرد عبد اللہ بن ابی منافق کے حد سے بڑھے ہوئے اصرار پر آپ نے ان کی جاں بخشی کر کے انھیں بھی جلا وطن کر دیا۔ پھر تیسرے قبیلے بنو قریظ نے خندق کے موقع پر جب دس ہزار کفار کے لشکر جرار نے مدینہ جیسی چھوٹی سی بستی پر یلتار کر کے محاصرہ کیا ہوا تھا، انھوں نے عین حالت جنگ میں معاہدہ توڑ کر دشمن کا ساتھ دیا، تو حملہ آوروں سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے بنو قریظ کا محاصرہ کر لیا۔ وہ مقابلہ نہ کر سکے تو مسلمانوں میں سے اپنے پرانے خیر خواہ اور ہمدرد سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا، اگر وہ نبی ﷺ کے فیصلے پر حوالے ہوتے تو شاید آپ ﷺ ان سے پہلے قبیلوں کی طرح رعایت فرماتے، مگر جب انھوں نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم مانا، اس امید پر کہ وہ عبد اللہ بن ابی منافق کی طرح ہماری پرانی دوستی کا خیال رکھیں گے تو سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اب وقت آ گیا ہے کہ سعد کو اللہ کا حکم نافذ کرنے کے راستے میں کوئی دوستی حاصل نہ ہو۔“ چنانچہ انھوں نے وہ فیصلہ کیا جو تورات میں مذکور تھا اور جسے رسول اللہ ﷺ نے بھی اللہ کا فیصلہ قرار دیا۔ چنانچہ ان کے تمام بالغ مرد جو سات سو تھے، قتل کر دیے گئے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی و غلام بنا لیا گیا۔ [دیکھتے بخاری، المغازی، باب مرجع النبی ﷺ من الأحزاب.....: ۴۱۲۲] یہ ”وَإِنْ عُدُّوْهُ عُدًّا“ کی ایک تفسیر تھی۔

پھر خیر والوں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے تو امیر المومنین عمر بن خطاب نے تمام یہود و نصاریٰ کو پورے جزیرہ عرب سے جلا وطن کر دیا۔ پھر اللہ کے وعدے کے مطابق ان کی ہر سرکشی پر ان کی سرکوبی کرنے والا کوئی نہ کوئی فرماں روا ہمیشہ ان کا بندوبست کرتا رہا۔ (دیکھیے اعراف: ۱۶۷) قریب زمانے میں بظلم نے انھیں عبرت ناک انجام سے دو چار کیا۔ اب تمام کفار نصاریٰ، کمیونسٹوں اور بت پرست ہندوؤں کی پشت پناہی سے، پھر یہ لوگ فلسطین میں قدس پر قبضہ کر کے اپنی ریاست اسرائیل کے نام سے بنا کر فلسطین کے مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں اور مسلم دشمنی کی وجہ سے تمام کفار ان کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اس کے وعدے کے مطابق عنقریب ان کے ساتھ دوبارہ وہی کچھ ہونے والا ہے جو پہلے ہوتا رہا ہے۔ پھر وہ وقت بھی آ کر رہے گا جب مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں پتھر اور درخت بھی ان کے قتل کے لیے مسلمانوں کو ان کی اطلاع دیں گے، جیسا کہ اس سے پہلے صحیح مسلم کی حدیث میں گزرا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے جسے نافذ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بنی اسرائیل کی یہ ساری داستان مسلمانوں کو عبرت کے لیے سنائی گئی ہے کہ اگر تم نے ایسا کیا

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ
 أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ۝ وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ آخِذْنَا لَهُمْ عَدَابًا أَلِيمًا ۝
 وَيَدْعُ الْإِنْسَانَ بِالْشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ۝

بلاشبہ یہ قرآن اس (راستے) کی ہدایت دیتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور ان ایمان والوں کو جو نیک اعمال کرتے
 ہیں، بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے ④ اور یہ کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان
 کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ⑤ اور انسان برائی کی دعا کرتا ہے اپنے بھلائی کی دعا کرنے کی طرح اور
 انسان ہمیشہ سے بہت جلد باز ہے ⑥

تو تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔

③ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا: ”حَصِيرًا“ یا تو ”حَصْرٌ يَحْصُرُ حَصْرًا“ (ن) سے ہے، جس کا معنی قید کرنا، گھیرنا
 ہے، یعنی قید خانہ، یا مراد وہ حصیر (چٹائی) ہے جو بچھائی جاتی ہے، یعنی جہنم ان کا بچھونا بنے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَقَدْ فُتِنَ جَهَنَّمَ
 مِهَادًا﴾ [الأعراف: ۴۱] ”ان کے لیے جہنم کے بستر ہوں گے۔“

آیت 10.9: إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ یعنی یہ قرآن تمام دینی اور دنیوی معاملات میں سب سے
 سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم رکھنے کا وہ طریقہ سکھایا گیا ہے جس سے اچھا کوئی
 طریقہ نہیں، مگر ترک دنیا اور رہبانیت اختیار کرنے اور انسانی فطرت کے تقاضوں کو پامال کرنے سے بھی منع فرمایا گیا ہے، بلکہ
 اس کے بجائے دنیا میں باعزت اور غالب ہو کر رہنے کا اور انسان کے فطری تقاضوں اور دنیا کی آسائشوں سے بہرہ ور ہونے
 کا بھی ایسا عمدہ طریقہ سکھایا گیا ہے جو ہر قسم کی زیادتی، سرکشی اور ہوس پرستی سے پاک ہے اور دنیا میں ہر مسلم اور غیر مسلم کے
 لیے امن و سلامتی کا ضامن ہے۔

ہاں جو لوگ اس پر ایمان لے آئیں اور اس کے مطابق عمل صالح کریں انہیں وہ اجر کبیر کی بھی بشارت دیتا ہے اور جو
 لوگ آخرت پر ایمان نہ لائیں انہیں اس بات سے بھی آگاہ کرتا ہے کہ دنیا میں وہ بظاہر کتنے ہی خوش حال اور صاحب مال و
 اولاد ہوں دنیا میں بھی ان کے لیے عذاب ہے (دیکھیے توبہ: ۵۵۔ طہ: ۱۲۳ تا ۱۲۷) اور آخرت میں بھی ان کے لیے عذاب الیم
 ہے جو دنیا کے عذاب سے کہیں زیادہ سخت ہے، جیسا کہ سورہ طہ کی مذکورہ آیات کے آخر میں فرمایا: ﴿وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ
 أَشَدُّ وَأَبْقَى﴾ ”اور یقیناً آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ باقی رہنے والا ہے۔“ مسلمانوں کے لیے ان دو آیتوں میں دو
 بشارتیں ہیں، ایک ان کے لیے اجر کبیر کی، دوسری ان کے دشمنوں کا عذاب الیم میں مبتلا ہونا بھی ان کے لیے خوشی کی خبر ہے۔

آیت 11: وَيَدْعُ الْإِنْسَانَ بِالْشَّرِّ: ”يَدْعُو“ اصل میں ”يَدْعُو“ تھا، مگر مصحف عثمانی کے خط میں اسے پڑھنے کے
 مطابق لکھ دیا گیا، کیونکہ یہ واؤ پڑھنے میں نہیں آتی، جیسا کہ: ﴿سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ﴾ [العلق: ۱۸] میں بھی واؤ نہیں لکھی گئی،

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَاتَيْنِ فَمَحْوًا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصَرَةً لِّتَبْتَغُوا
فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۗ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلْنَاهُ تَفْصِيلًا ﴿۱۲﴾

اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا، پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو روشن بنایا، تاکہ تم اپنے رب کا کچھ فضل تلاش کرو اور تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔ اور ہر چیز، ہم نے اسے کھول کر بیان کیا ہے، خوب کھول کر بیان کرنا ﴿۱۲﴾

اسی لیے مسلمانوں نے اسی مصحف کے خط کی حفاظت کرتے ہوئے واؤ نہیں لکھی۔ فراء نے فرمایا کہ اگر یہ واؤ کے ساتھ لکھا جائے تو بھی درست ہوگا۔ (ابن عاشور)

﴿۱۲﴾ ”دُعَاؤُ بِالْحَيْرِ“ یہ ”مَكْتُوبَاتُ بِالْحَيْرِ“ تھا، کاف حذف کرنے سے منصوب ہو گیا۔ مفعول مطلق کا بھی یہی معنی ہے، یعنی انسان بعض اوقات غصے میں یا اکتا کر اپنے لیے یا اپنے اہل و عیال کے لیے اللہ تعالیٰ سے بددعا میں کرتا ہے، مثلاً اللہ کرے میں مر جاؤں، اللہ کرے تمہارا بیڑہ غرق ہو جائے، تمہارا خانہ خراب ہو جائے وغیرہ۔ انسان اسی طرح اصرار سے بددعا کرتا ہے جس طرح حالت اعتدال میں اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے خیر کی دعا کرتا ہے، مثلاً یا اللہ! ہمیں بخش دے، یا اللہ! ہماری حفاظت فرما وغیرہ۔ اسی طرح وہ کفار کے ایمان نہ لانے پر ان کے لیے تباہی و بربادی کی فوراً بددعا کرنے لگتا ہے، حالانکہ اسے کیا خبر کہ ان میں سے کئی لوگوں نے آگے چل کر ایمان لے آنا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں شروع سے بہت جلد بازی پائی جاتی ہے۔ ”كَانَ“ جلد بازی کے استمرار اور تمکن کو ظاہر کر رہا ہے اور ترجمہ بھی اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ ”عَجُولًا“ مبالغے کا صیغہ ہے، بہت جلد باز۔ اپنے حق میں بددعا کی ایک بدترین مثال ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کی وہ دعا ہے جس میں انھوں نے اپنے آپ پر پتھر برسائے یا عذاب الیم لانے کی بددعا کی تھی۔ دیکھیے سورہ انفال (۳۲، ۳۳)۔

﴿۱۳﴾ مگر اللہ تعالیٰ ایسا مہربان ہے کہ بددعاؤں کو فوراً قبول نہیں فرماتا اور اگر وہ قبول کرے تو انسان تباہ و برباد ہو جائے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یونس کی آیت (۱۱)۔

آیت 12 ﴿۱۲﴾ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَاتَيْنِ : ان دونوں کو نشانیاں اس لیے قرار دیا کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا، اس کی کمال کارگیری اور قدرت کا اور اس اکیلے کے عبادت کا حق دار ہونے کا پتا چلتا ہے۔ رات اور دن کو بطور دلیل اور نعمت کے قرآن نے متعدد مقامات پر بیان فرمایا ہے۔ دیکھیے سورہ حم السجدہ (۳۷)، یونس (۶)، آل عمران (۱۹۰)، بقرہ (۱۶۳)، فرقان (۶۲)، سورہ زمر (۵) اور دیگر آیات۔

﴿۱۲﴾ ”مَحَا يَمْحُو مَحْوًا“ (ن) کسی چیز کا نشان ختم کر دینا، مٹا دینا، یعنی رات اور دن جس طرح نشانیاں ہیں اسی طرح ان کا وجود اور ان کا کم یا زیادہ ہوتے ہوئے مسلسل روزانہ ایک دوسرے کے پیچھے آنا بھی نعمت ہیں، کیونکہ رات کی تاریکی اور خاموشی انسان کے سکون، راحت اور نیند کے لیے ضروری ہے اور دن کی روشنی ہر کام کے لیے اور اللہ کا فضل

وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ فِي عُقُبِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ﴿۱۳﴾
اِقْرَأْ كِتَابَكَ ۖ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ﴿۱۴﴾

اور ہر انسان کو، ہم نے اسے اس کا نصیب اس کی گردن میں لازم کر دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کتاب نکالیں گے، جسے وہ کھولی ہوئی پائے گا ﴿۱۳﴾ اپنی کتاب پڑھ، آج تو خود اپنے آپ پر بطور محاسب بہت کافی ہے ﴿۱۴﴾

تلاش کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ اللہ کا انعام ہے کہ آرام کے لیے رات بنا دی، پھر اسے مٹا کر کام کے لیے دن بنا دیا، اگر اللہ تعالیٰ ہمیشہ رات یا ہمیشہ دن بنا دیتا تو زندگی کا سلسلہ کس طرح قائم رہ سکتا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ قصص (۱۱ تا ۷۳)، سورہ نبا (۱۱ تا ۹) اور سورہ روم (۲۳)۔

﴿۱۳﴾ وَتَعْلَمُونَ أَعْدَادَ الْبَيْنَاتِ وَالْحِسَابِ : یعنی اگر نہ دن رات ہوتے اور نہ رات اور دن کے بتدریج روزانہ چھوٹے یا بڑے ہونے کا سلسلہ ہوتا، نہ چاند کے ہلال سے بدر اور بدر سے ہلال بننے کی منزلیں ہوتیں تو ہمیشہ ایک جیسا موسم رہتا اور سال اور مہینوں کا کچھ پتا نہ چلا، نہ وقت کا وجود ہوتا جس پر کئی دینی معاملات، مثلاً نماز، روزے، زکوٰۃ، حج، عید، عدت وغیرہ کا اور تمام دنیوی معاملات کا انحصار ہے۔

﴿۱۴﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ فَضَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا : یعنی ہر وہ چیز جس میں تمہاری دنیا و آخرت کی کامیابی ہے، اسے ہم نے خوب کھول کر بیان کر دیا ہے۔ ”تفصیلًا“ مصدر تاکید کے لیے ہے، اس لیے معنی کیا ہے خوب کھول کر بیان کرنا۔ مزید دیکھیے سورہ انعام (۳۸) اور سورہ نحل (۸۹)۔

﴿۱۵﴾ ان آیات (۱۰ تا ۱۳) کی باہمی مناسبت ابن عاشور اور شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو ملا کر یہ ہے کہ آیت (۱۰) میں جب کفار کے لیے عذاب الیم تیار کرنے کا ذکر فرمایا تو آیت (۱۱) میں کفار کے اس عناد پر مبنی مطالبے کی وجہ بتائی جو وہ مسلمانوں سے کرتے تھے کہ وہ عذاب الیم ابھی لاؤ، چلو ہم پر آسمان گرا دو، اللہ تعالیٰ ہم پر پتھروں کی بارش برسا دے۔ فرمایا انسان جلد بازی سے بغیر سوچے سمجھے اپنے نقصان کی دعا کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت اور خود انسان کی مصلحت کا تقاضا اس کی بددعا کو قبول نہ کرتا ہے۔ (ابن عاشور) آیت (۱۳) میں بتایا کہ کفار کے جلد عذاب کے مطالبے سے یا مسلمانوں کے کفار کو فوراً برباد کرنے کی بددعا سے کچھ حاصل نہیں۔ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”گھبرانے سے فائدہ نہیں، ہر چیز کا وقت اور اندازہ مقرر ہے، جیسے رات اور دن، کسی کے گھبرانے سے رات کم نہیں ہو جاتی، اپنے وقت پر آپ صبح ہو جاتی ہے۔“ (موضح)

آیت ۱۳-۱۴ ﴿۱۳﴾ وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَلْرِيفًا ﴿۱۴﴾ وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَلْرِيفًا : ”طَلْرِيفًا“ کا لفظی معنی اڑنے والا ہے۔ مراد کسی بھی چیز کا وہ جز ہے جو انسان کے حصے میں آئے، گویا وہ اڑ کر اس کے پاس آتا ہے۔ شگون لینے یا قرعہ ڈالنے کی صورت میں اس کے حق میں نکلنے والا نتیجہ خواہ اچھا ہو یا برا۔ انسان کے حصے میں آنے والی چیز یا اس کا عمل جو اس نے کرنا ہے اور اس کا رزق جو اسے ملنا ہے، سب پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و تمیز دے کر یہ اختیار دیا ہے کہ وہ سیدھے راستے پر چلے یا غلط راستے پر، نیک عمل کرے یا بد، پھر بھی اس نے جو کچھ کرنا ہے، خواہ اس کے اختیار میں ہے، جیسے نیکی یا بدی

مِن اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۗ وَ مَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۗ وَلَا تَزِرُ

جس نے ہدایت پائی تو وہ اپنی ہی جان کے لیے ہدایت پاتا ہے اور جو گمراہ ہوا تو اسی پر گمراہ ہوتا ہے اور کوئی بوجھ

اور خواہ اس کے اختیار میں نہیں ہے، جیسے اس کی عمر، اسے پیش آنے والے ایسے یا برے حوادث، سب اللہ تعالیٰ کو پہلے سے معلوم ہے اور وہ ہر انسان نے کرنا ہی کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اندازہ (تقدیر) غلط نہیں ہو سکتے۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ ہر انسان کے نصیب اور حصے میں جو کچھ آنے والا ہے وہ ہم نے اس کی گردن کے ساتھ لازم کر دیا ہے، جیسے گردن میں پڑا ہوا طوق یا ہار۔ جو چیز کسی کو لازم کر دی جائے اور وہ اس سے جدا نہ ہو سکے اس کے متعلق کہا جاتا ہے: "الْوَزْمَةُ فِي عُنُقِهِ" کہ میں نے اسے اس کی گردن میں چپکا دیا ہے۔

② يَوْمَ الْقِيَامَةِ.....: آیت کا پہلا حصہ تقدیر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور یہ حصہ انسان کے ان اعمال سے متعلق ہے جو اس نے دنیا میں کیے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے تحریر کرنے کے لیے فرشتے مقرر فرما رکھے ہیں۔ دیکھیے سورہ ق (۱۸ تا ۱۶) اور انفطار (۱۰ تا ۱۲) ان کی تیار کردہ کتاب اعمال قیامت کے دن ہر انسان کے سامنے آ جائے گی، ایسی صورت میں کہ خود بخود کھلی ہوگی، آدمی خواہ پڑھا ہوا ہے یا ان پڑھ، ہر ایک کو حکم ہوگا کہ اپنے اعمال کی کتاب پڑھ لے اور ہر شخص اسے پڑھ لے گا، گویا اس کی زندگی کی مکمل تصویر اس کے سامنے آ جائے گی، جسے وہ پہلے بھی بہانہ سازیوں کے باوجود خوب جانتا ہوگا۔ (دیکھیے قیامت: ۱۳ تا ۱۵) اس کتاب اعمال میں اس کا کوئی چھوٹا یا بڑا عمل درج ہونے سے رہ نہیں جائے گا۔ دیکھیے سورہ کہف (۳۹)۔

③ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا: اس کی ترکیب یہ کی جاتی ہے "کفی" فعل، باء زائدہ، "نفسک" فاعل، "حسبیا" تمیز اور "عَلَيْكَ" اس کے متعلق ہے۔ یہ ترکیب درست ہے، مگر اس میں کمی صرف یہ ہے کہ باء کو محض زائدہ کہہ دیا گیا ہے، حالانکہ قرآن مجید میں ایک حرف بھی بے مقصد و زائد نہیں، چنانچہ شقیطی، طحاوی اور کئی مفسرین نے صراحت فرمائی ہے کہ یہ "کفی" کی تاکید کے لیے ہے، یعنی آج تو خود اپنے آپ پر بطور محاسب بہت کافی ہے۔ یہی بات "وَ كَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا" (بنی اسرائیل: ۶۵) میں بھی ملحوظ رکھیں۔

④ نفس کے بطور محاسب کافی ہونے میں وہ صورت بھی شامل ہے کہ جب انسان اس کتاب اعمال کو جھلا دے گا، پھر اللہ کے حکم سے زبان پر مہر لگ جائے گی اور خود انسان کے جسم کا ہر حصہ اپنے اعمال کی شہادت دے گا۔ اب خود اپنے جسم سے زیادہ کافی محاسب کون ہو سکتا ہے۔ دیکھیے سورہ یس (۶۵)، نجم السجدہ (۱۹ تا ۲۳) اور سورہ مجادلہ (۱۸)۔

آیت 15 ① مِّن اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ.....: مطلب یہ ہے کہ جو شخص سیدھے راستے پر چلتا ہے وہ کسی پر

احسان نہیں کرتا، بلکہ اس کا فائدہ اسی کو پہنچتا ہے اور جو اس سے ہٹ کر غلط راستے پر چلتا ہے تو اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا۔

② وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى.....: "تَزِرُ" "وَزْرَ يَزِرُ وَزْرًا" (ض) بوجھ اٹھانا۔ "وَازِرَةٌ" اسم فاعل ہے اور "نَفْسٌ" کی صفت ہے جو یہاں پوشیدہ ہے، یعنی کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی، بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔

وَإِذَا زَمَّهَا وَذَمَّ الْآخَرَىٰ وَمَا لَنَا مَعَدِّينَ حَتَّىٰ نُبْعَثَ رَسُولًا ﴿۱۵﴾

اٹھانے والی (جان) کسی دوسری (جان) کا بوجھ نہیں اٹھاتی اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں ﴿۱۵﴾

اس مفہوم کی کئی آیات ہیں، دیکھیے سورہ انعام (۱۶۳) اور سورہ فاطر (۱۸) وغیرہ۔

③ بعض آیات میں کچھ لوگوں کے اپنے گناہوں کے ساتھ دوسروں کے گناہ بھی اٹھانے کا ذکر ہے، جیسا کہ سورہ نحل (۲۵) اور عنکبوت (۱۳) میں ہے: ”وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان کے بھی جن کو وہ بغیر علم کے گمراہ کرتے رہے۔“ تو یہ دراصل دوسروں کا بوجھ نہیں بلکہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے خود ان کا اپنا بوجھ ہے، گناہ کرنے والے اپنا بوجھ خود اٹھائیں گے۔ سورہ مائدہ (۳۲) میں آدم علیہ السلام کے قاتل بیٹے پر ہر قتل کے گناہ کا ایک حصہ ڈالے جانے کا مطلب بھی یہی ہے۔ اسی طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کہ ”میت کو اس کے گھر والوں کے اس پر رونے سے عذاب ہوتا ہے“ کا مطلب بھی اہل علم نے یہ بیان فرمایا کہ جب مرنے والا اس کی وصیت کر گیا ہو، یا اسے معلوم ہو کہ گھر والے ایسا کریں گے، مگر اس نے انھیں منع نہ کیا ہو، کیونکہ اس پر لازم تھا کہ گھر والوں کو بھی اللہ کی نافرمانی سے بچاتا۔ (دیکھیے تحریم: ۶) اگر اس کے منع کرنے کے باوجود کوئی شخص بین کرتا ہے، یا گریبان چاک کرتا ہے تو وہ اس سے بری ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ”کِتَابُ الْحَنَائِزِ“ میں باب باندھا ہے: ”بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَذَّبُ الْمَيِّتُ بِبَعْضِ بُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ“ یعنی رسول اللہ ﷺ کا فرمان کہ میت کو اس کے گھر والوں کے بعض قسم کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ”إِذَا كَانَ النَّوْحُ مِنْ سُنَّتِهِ“ یعنی یہ اس وقت ہے جب بین کرنا اور سننا میت کا طریقہ اور معمول ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَوَآءِ أَنْفُسِكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ [التحریم: ۶] ”اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔“ اور نبی ﷺ نے فرمایا: ﴿كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ﴾ [بخاری، النکاح، باب المرأة راعية.....: ۵۲۰۰] ”تم میں سے ہر ایک حکمران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہونے والا ہے۔“ تو جب یہ میت کا معمول اور طریقہ نہ ہو تو وہ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے فرمانے کے مطابق ﴿وَلَا تَزِمُوا وَآزِمَاتُكُمْ وَذَمَّ الْآخَرَىٰ﴾ [الأعام: ۱۶۴] (اور کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ نہیں اٹھائے گی) کا مصداق ہوگا، یعنی اسے عذاب نہیں ہوگا اور وہ اس فرمان الہی کی طرح ہوگا: ﴿وَإِنْ تَدْعُوا مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ جُنُبِهِمْ لَا يُجِزِلْ مِنْهُ شَيْءٌ﴾ [فاطر: ۱۸] ”اور اگر کوئی بوجھ سے لدی ہوئی (جان) اپنے بوجھ کی طرف بلائے گی تو اس میں سے کچھ بھی نہ اٹھایا جائے گا۔“ [بخاری، الحنائز، باب قول النبي ﷺ: يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه.....، قبل ح: ۱۶۸۲]

④ وَمَا لَنَا مَعَدِّينَ حَتَّىٰ نُبْعَثَ رَسُولًا: یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے عدل کا بیان ہے، فرمایا کہ جب تک ہم کوئی پیغام پہنچانے والا نہ بھیجیں جو ان تک اللہ کے احکام پہنچا دے اور حجت پوری ہو جائے ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں۔ یہاں

بعض مفسرین نے بچپن یا زمانہ جاہلیت میں فوت ہونے والوں کے متعلق مختلف اقوال اور ان کے دلائل کے ساتھ لمبی بحث کی ہے، مگر ایسی کہ آدی کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا، اس لیے میں اس بحث کو واضح طریقے سے تحریر کرتا ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں فوت ہو جانے والے بچے، خواہ مسلمانوں کے ہوں یا مشرکین کے، ان کو عذاب نہیں ہوگا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”باب مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ“ میں اس کے متعلق پہلے ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی روایات ذکر کی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے مشرکین کے بچوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا عَامِلِينَ» [بخاری، الحناظر: ۱۳۸۲، ۱۳۸۳] ”اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ عمل کرنے والے تھے۔“ اس کے بعد ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كُلُّ مَوْلُودٍ يُوَلَّدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبْوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يَنْصُرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ، كَمَثَلِ الْبَيْهَمَةِ تَنْتَجِعُ الْبَيْهَمَةَ، هَلْ تَرَى فِيهَا جَذْعَاء؟» [بخاری: ۱۳۸۵]

”ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا اسے نصرانی بنا دیتے ہیں، یا اسے مجوسی بنا دیتے ہیں، جیسے چوپایہ پیدا ہوتا ہے (تو مکمل اعضا والا ہوتا ہے) کیا تم ان میں کوئی کان کٹا دیکھتے ہو۔“ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر بچہ مسلمان پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد سرہ بن جناب رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث بیان فرمائی ہے، جس میں ہے کہ جبریل اور میکائیل رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کو ایک رات اپنے ساتھ لے جا کر بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کروایا، اس حدیث میں ہے کہ ہم ایک سرسبز باغ میں پہنچے جس میں ایک بہت بڑا درخت تھا، اس کی جڑ کے پاس ایک بزرگ اور بہت سے بچے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ان مشاہدات کی حقیقت پوچھی تو فرشتوں نے تمام مشاہدات کے آخر میں سب کی حقیقت بیان کی اور اس مشاہدے کے متعلق بتایا کہ یہ بزرگ ابراہیم رضی اللہ عنہ تھے اور وہ بچے لوگوں کے بچے تھے۔ [بخاری: ۱۳۸۶] امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”کِتَابُ التَّعْبِيرِ، بَابُ تَعْبِيرِ الرُّؤْيَا بَعْدَ صَلَاةِ الصُّبْحِ (۷۰-۷۱)“ میں یہی حدیث زیادہ تفصیل سے بیان فرمائی ہے۔ اس میں ہے کہ فرشتوں نے بتایا کہ باغ میں جو بچے قد کے بزرگ تھے وہ ابراہیم رضی اللہ عنہ تھے اور وہ بچے جو ان کے ارد گرد تھے وہ ایسے بچے تھے جو فطرت پر فوت ہوئے۔ سرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کچھ مسلمانوں نے پوچھا: «يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَ أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ» ”یا رسول اللہ! اور مشرکوں کے بچے بھی؟“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اور مشرکوں کے بچے بھی۔“ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی اس ترتیب سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب تک آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشرکوں کے بچوں کے متعلق کوئی بات نہیں بتائی گئی، آپ نے یہ بات اللہ کے علم کے سپرد فرمائی، مگر جب آپ ﷺ کو آگاہ کر دیا گیا تو آپ نے مسلم و مشرک تمام لوگوں کے بچوں کے جنتی ہونے کی صراحت فرمادی۔ البتہ دنیوی احکام میں مشرکوں کے بچوں کا حکم ان کے باپوں والا ہی ہوگا۔ اس لیے جہاد کے دوران حملے میں یا لوندی و غلام بناتے وقت ان کا حکم مشرکین ہی کا ہوگا۔ ہاں، وہ کلمہ پڑھ لیں تو انھیں مسلمان سمجھا جائے گا۔

رہ گئے اہل فترت و جاہلیت، یعنی عرب کے وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے تو ان تمام کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انھیں اللہ کی طرف سے توحید کا پیغام نہیں پہنچا، بلکہ وہ اپنے آپ کو ملت ابراہیم پر قرار دیتے تھے اور

وہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد اور امت تھے۔ ایک لمبی مدت گزرنے کی وجہ سے ممکن ہے دین کے تفصیلی احکام ان کو معلوم نہ رہے ہوں، تاہم اکثریت بلکہ تمام لوگوں کے بت پرستی میں مبتلا ہونے کے باوجود توحید اور دین ابراہیم کا پیغام پہنچانے والے کچھ لوگ ان میں ضرور موجود رہے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو نبوت ملنے سے پہلے بھی کچھ لوگ بتوں کی پرستش نہیں کرتے تھے، یہ لوگ ”خفّاء“ کہلاتے تھے، ان میں زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل بھی شامل ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: «أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقِيَ زَيْدَ بْنَ عَمْرٍو بْنِ نُفَيْلٍ بِأَسْفَلِ بَلَدِ حِمْيَرَ قَبْلَ أَنْ يَنْزَلَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْوَحْيُ، فَقَدَّمَتْ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُفْرَةٌ فَأَتَى أَنْ يَأْكُلَ مِنْهَا، ثُمَّ قَالَ زَيْدٌ إِنَّنِي لَسْتُ أَكُلُ مِمَّا تَذْبَحُونَ عَلَيَّ أَنْصَابِكُمْ، وَلَا أَكُلُ إِلَّا مَا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ، فَإِنَّ زَيْدَ بْنَ عَمْرٍو كَانَ يَعْبُدُ عَلَى قُرَيْشٍ ذَبَائِحَهُمْ وَيَقُولُ الشَّأْدُ خَلَقَهَا اللَّهُ وَأَنْزَلَ لَهَا مِنَ السَّمَاءِ الْمَاءَ، وَأَنْبَتَ لَهَا مِنَ الْأَرْضِ، ثُمَّ تَذْبَحُونَهَا عَلَيَّ غَيْرِ اسْمِ اللَّهِ؟ إِنْكَارًا لِلذَّلِكِ وَإِعْظَامًا لَهُ» [بخاری، مناقب الأنصار، باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل: ۳۸۲۶] ”نبی ﷺ نبوت ملنے سے پہلے زید بن عمرو بن نفیل کو مقام بلذح کے نچلے حصے میں ملے، نبی ﷺ کے سامنے ایک دسترخوان پیش کیا گیا تو اس نے اس سے کھانے سے انکار کر دیا، زید نے کہا: ”میں اس میں سے نہیں کھاتا جو تم اپنے نصب کردہ بتوں وغیرہ پر ذبح کرتے ہو اور میں اس کے سوا نہیں کھاتا جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔“ زید بن عمرو قریش پر ان کے ذبیحوں پر عیب لگاتے تھے اور کہتے تھے: ”بھینٹ بکری جو ہے اسے اللہ نے پیدا فرمایا اور اسی نے اس کے لیے آسمان سے پانی اتارا اور زمین سے اس کے لیے پودے اگائے، پھر تم اسے اللہ کے غیر کے نام پر ذبح کرتے ہو۔“ ان کے اس فعل کا انکار کرتے ہوئے اور اسے بہت بڑا گناہ قرار دیتے ہوئے یہ بات کہتے تھے۔“ ورقہ بن نوفل بت پرستی سے بے زار ہو کر نصرانی ہو گئے تھے۔“ [بخاری، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي الى رسول الله ﷺ: ۲] اور ظاہر ہے کہ وہ موحد نصرانی بنے ہوں گے، تثلیث والے مشرک نہیں، کیونکہ پھر انھیں بت پرستی چھوڑ کر نصرانی بننے کی ضرورت نہ تھی اور اسی توحید کی وجہ سے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت تسلیم کی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: «رَأَيْتُ زَيْدَ بْنَ عَمْرٍو بْنِ نُفَيْلٍ قَائِمًا مُسْنِدًا ظَهْرَهُ إِلَى الْكَعْبَةِ يَقُولُ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشِ! وَاللَّهِ! مَا بَيْنَكُمْ عَلَى دِينِ إِبْرَاهِيمَ غَيْرِي» [بخاری، مناقب الأنصار، باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل: ۳۸۲۸] ”میں نے زید بن عمرو بن نفیل کو دیکھا وہ کعبے کے ساتھ پیٹھ کا سہارا لے کر کھڑے کھڑے تھے: ”اے قریش کی جماعت! اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی شخص میرے سوا دین ابراہیم پر نہیں ہے۔“

الغرض جب ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام سے سیکڑوں سال بعد بھی توحید پر قائم اور اس کا پیغام کھلم کھلا کعبہ میں کھڑے ہو کر دینے والے موجود تھے تو ان سے پہلے ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام کے زمانے کے جس قدر قریب جائیں توحید والے اور اپنے آپ کو دین ابراہیم پر قائم کہنے والے یقیناً موجود رہے ہیں۔ یہ تو یمن سے آنے والے عمرو بن لُحی خزاعی کا بیڑا غرق ہوا کہ اس نے کعبہ میں بت لا کر رکھ دیے، جس کے بعد قریش بھی بت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا: ﴿وَإِنْ مِنْكُمْ أَصْفَاءُ

﴿الْأَخْلَافِ فِيهَا نَذِيرٌ﴾ [فاطر: ۲۶۴] ”اور کوئی امت نہیں مگر اس میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا گزرا ہے۔“ یہ ڈرانے والا کوئی امتی بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ آج رسول اللہ ﷺ کی وفات کو تقریباً ۱۳۲۱ برس گزر چکے مگر آپ کی دعوت مسلسل دنیا کے ہر خطے میں جاری ہے اور داعیان اسلام بشارت و نذارت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ زمانہ فترت میں دو قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں، بلکہ آج بھی یہ دونوں قسمیں موجود ہیں، ایک وہ جنہیں کسی ذریعے سے توحید کی دعوت پہنچ گئی، خواہ وہ کسی توحید پر قائم شخص کے ذریعے سے پہنچی ہو یا اس کے مخالف کے ذریعے سے، جیسا کہ ابوسفیان نے اپنے زمانہ کفر میں ہرقل کے سامنے دین اسلام کا بہترین خلاصہ پیش کیا تھا، پھر انھوں نے نہ توجہ سے سنا، نہ سوچنے کی زحمت کی، نہ اسے تسلیم کیا تو ان کے جنہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ انھیں صرف اہل فترت ہونے کی وجہ سے جنتی نہیں کہا جاسکتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كَلِمَاتٍ آلَتِي فِيهَا فَوْجٌ مَّا لَهُمْ حَظٌّ بِهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ۚ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ ۚ وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۚ فَاتَّبَعُوهُمْ بِذُنُوبِهِمْ فَسُخِّقُوا أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ [الملك: ۱۱۷-۱۲۸] ”جب بھی اس (جنہم) میں کوئی گروہ ڈالا جائے گا تو اس کے مگر ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں؟ یقیناً ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تو ہم نے جھٹلادیا اور ہم نے کہا اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری، تم تو ایک بڑی گمراہی میں ہی پڑے ہوئے ہو۔ اور وہ کہیں گے اگر ہم سنتے ہوتے یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں سے نہ ہوتے۔ پس وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے، سو دوری ہے بھڑکتی ہوئی آگ والوں کے لیے۔“

یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ يَفْتَحِرُونَ بِآبَائِهِمُ الَّذِينَ مَاتُوا، إِنَّمَا هُمْ فَحْمٌ جَهَنَّمَ، أَوْ لَيَكُونُنَّ أَهْوَنُ عَلَى اللَّهِ مِنَ الْجُعَلِ الَّذِي يُلْهِيهِ الْجِرَاءُ بِأَنْفِهِ» [ترمذی، المناقب، باب فی فضل الشام واليمن: ۳۹۵۵، حسہ الألبانی] ”کچھ لوگ جو اپنے ان آباء پر فخر کرتے ہیں جو فوت ہو چکے، جو محض جنہم کے کولے ہیں، ان پر فخر کرنے سے باز آجائیں گے ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پاخانے کے اس کیزے سے بھی ذلیل ہوں گے جو اپنی ناک کے ساتھ پاخانے کو دکھلیا جاتا ہے۔“ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے زمانہ جاہلیت میں فوت ہونے والوں کو جنہم کے کولے قرار دیا۔ مزید تفصیل سورہ توبہ کی آیت (۱۱۳) کی تشریح میں تفسیر کی کسی بھی کتاب سے دیکھ لیں۔

اب اہل فترت کے صرف وہ لوگ رہ گئے جنہیں واقعی دعوت نہیں پہنچی تو یہ صرف اہل فترت ہی کے ساتھ خاص نہیں، اب بھی اگر دنیا کے کسی خطے میں واقعی کوئی ایسا شخص موجود ہے جسے بالکل دعوت نہیں پہنچی تو اس آیت ”وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا“ کے تحت حجت پوری کیے بغیر اسے عذاب نہیں ہوگا، خواہ وہ حجت قیامت کے دن پوری کی جائے۔ جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے ان لوگوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے آنے والی احادیث میں سے سب سے صحیح حدیث وہ ہے جو اسود بن سربیع اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”چار آدمی قیامت کے دن اپنی حجت (دلیل) پیش

وَ إِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَا تَدْمِيرًا ۝۱۶

اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں علم نہیں مانتے تو اس پر بات ثابت ہو جاتی ہے، پھر ہم اسے برباد کر دیتے ہیں، بری طرح برباد کرنا ۝۱۶

کریں گے، ایک بہرا آدمی جو کچھ نہیں سنتا، ایک احمق آدمی، ایک حد سے بڑھا اور ایک وہ آدمی جو فترت میں فوت ہوا۔ جو بہرا ہے وہ کہے گا، اے میرے رب! اسلام آیا تو مجھے کچھ سنائی نہ دیتا تھا، احمق کہے گا، اے میرے رب! اسلام آیا اور میں کچھ عقل نہ رکھتا تھا اور بچے مجھے بیگنیاں مارتے تھے، حد سے بڑھا کہے گا، اے میرے رب! اسلام آیا اور میں کچھ سمجھتا نہ تھا اور جو فترت میں فوت ہوا وہ کہے گا، اے میرے رب! میرے پاس تیرا کوئی پیغام لانے والا نہیں آیا۔ تو اللہ تعالیٰ ان سے ان کے پختہ عہد لے گا کہ وہ جو کہے گا اس کی اطاعت کریں گے؟ تو ان کی طرف پیغام بھیجا جائے گا کہ آگ میں داخل ہو جاؤ، تو جو داخل ہو جائے گا وہ اس پر ٹھنڈک اور سلامتی بن جائے گی اور جو داخل نہیں ہوگا اسے گھسیٹ کر اس میں ڈال دیا جائے گا۔ [مسند احمد: ۲۴/۴، ح: ۱۶۳۰۷۔ ابن حبان: ۷۳۵۷] صحیح الجامع (۸۸۱) میں شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح فرمایا ہے، ابن کثیر نے فرمایا کہ اسے اسحاق بن راہویہ نے معاویہ بن ہشام سے ایسے ہی روایت کیا اور یہی نے اسے کتاب الاعتقاد میں ”ضبل عن علی بن عبد اللہ“ کی سند سے روایت کیا اور فرمایا یہ اسناد صحیح ہے۔ محترم زیر علی زئی صاحب نے اردو تفسیر ابن کثیر کی تخریج میں اس کی ایک ہم معنی حدیث کو جو اہل جاہلیت کے متعلق ہے، حاکم (۴۳۹، ۴۴۰) کے حوالے سے حسن لکھا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اگر پیغام پہنچ جاتا تو کوئی شخص کیا کرتا، مگر ان چاروں کا عذر بھی باقی نہیں رہنے دیا جائے گا، بلکہ قیامت کے دن ان کے امتحان کے بعد اس کے نتیجے کے مطابق ان سے سلوک ہوگا، البتہ بچوں کے امتحان کی کوئی روایت صحیح نہیں۔ [وَاللّٰهُ اَعْلَمُ وَعِلْمُهُ اُنْتَمٌ]

آیت ۱۶ ۝ وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ : ”أَمَرْنَا“ امر نبی کی ضد ہے، حکم دینا ”مُتْرَفٌ“ وہ شخص جسے نعمت اور خوش حالی عطا کی گئی ہو اور کھلا چھوڑ دیا گیا ہو کہ جو چاہے کرے۔ کہا جاتا ہے: ”أُتِرْفَتُهُ الْبِعْمَةُ“ اسے نعمت نے سرکش اور باغی بنا دیا۔ ”تَدْمِيرًا“ تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”بری طرح برباد کرنا۔“

۲ یہ پچھلی آیت کے مفہوم ہی کی تکمیل ہے کہ اللہ تعالیٰ حجت تمام کیے بغیر عذاب نہیں دیتا۔ فرمایا، ہم اس بستی کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ ”أَمَرْنَا“ کا مفعول محذوف ہے، وہ یا تو ”بِأَمْرٍ“ ہے، یعنی ہم انھیں کوئی حکم دیتے ہیں، یا ”بِإِيمَانٍ وَالْعَمَلِ الصَّالِحِ“ ہے، یعنی ہم اس بستی کے رسول یا دوسرے مصلح لوگوں کے ذریعے سے اس کے خوش حال لوگوں کو ایمان اور عمل صالح کا حکم دیتے ہیں۔ ”فَفَسَقُوا“ تو وہ اس حکم کو یا ایمان اور عمل صالح کے حکم کو نہیں مانتے، بلکہ ملک بھر میں فسق و فجور پکڑ دیتے ہیں تو ان کا عذاب کا حق دار ہونا ثابت ہو جاتا ہے، تو پھر ہم صرف خوش حال لوگوں ہی کو نہیں بلکہ ان کے پیچھے

وَ كَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ ۗ وَ كَفَى بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا

بَصِيرًا ﴿١٦﴾

اور ہم نے نوح کے بعد کتنے ہی زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں کی پوری خبر رکھنے والا، سب کچھ دیکھنے والا بہت کافی ہے ﴿۱۶﴾

چلنے والے ضعفاء کو بھی بلکہ بستی کی عمارتوں کو بھی بری طرح برباد کر دیتے ہیں۔ ضعفاء کی ہلاکت کے سبب کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۶۶، ۱۶۷)، اعراب (۶۳ تا ۶۸) اور اعراف (۳۸، ۳۹) اور بستی کی بربادی لفظ ”قَرْيَةً“ سے ظاہر ہو رہی ہے۔

﴿۱۶﴾ بعض مفسرین نے ”قَفَسَقُوا فِيهَا“ کی مناسبت سے ”أَمْرًا“ کا محذوف مفعول ”بِالْفِسْقِ“ نکالا ہے، یعنی جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو فسق کا حکم دیتے ہیں..... مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو نیکی کا حکم دیتا ہے اور نافرمانی سے منع کرتا ہے، خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ إِنْ أَنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [الأعراف: ۲۸] ”کہہ دیجیے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔“ اور دیکھیے سورہ نحل (۹۰) اور سبأ (۳۴، ۳۵) ہاں اگر یہ تاویل کی جائے تو الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شرعی حکم تو نیکی ہی کا ہوتا ہے مگر کوئی حکم (جس کے تحت کائنات چل رہی ہے، کافر کفر کر رہے ہیں، ظالم ظلم کر رہے ہیں، مظلوموں پر ظلم ہو رہا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتیں ہیں) ہر قسم کا ہو سکتا ہے، اگرچہ یہ کوئی حکم بھی شرعی احکام کی نافرمانی اور اللہ اور اس کے رسول کو بھلا دینے کے نتیجے ہی میں ہوتا ہے، چنانچہ ان نافرمانوں کی رسی دراز کر دی جاتی ہے اور دنیا کی نعمتوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیے جاتے ہیں کہ جتنی چاہو نافرمانی کر لو، پھر جب فرار واد جرم مکمل ہو جاتی ہے تو اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔ (دیکھیے انعام: ۴۲ تا ۴۵) بعض نے ”أَمْرًا“ کا معنی ”أَمْحَرْنَا“ بھی کیا ہے کہ ہم اس کے ”مترقبین“ کو بہت بڑھا دیتے ہیں تو وہ فخر میں آ کر نافرمانی پر اتر آتے ہیں۔ ان تینوں معنوں میں سے پہلا معنی زیادہ صحیح ہے جو حاشیہ نمبر (۲) میں ذکر ہوا، اگرچہ دوسرے معنوں کی بھی گنجائش ہے۔

آیت 17: ﴿۱﴾ وَ كَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ ۗ یہ ”گھر“ خبر یہ ہے، جس کا معنی ہے ”بہت۔“ قرن ایک زمانے کے لوگ، عام طور پر یہ مدت ایک سو سال بتائی جاتی ہے۔ رسولوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم آنے کے بعد ان کی نافرمانی (فسق) کی وجہ سے نوح علیہ السلام کے بعد ہلاک ہونے والی قوموں اور نسلوں کا بطور مثال ذکر فرمایا کہ مت پوچھو کہ کتنی نسلوں کو ہم نے ہلاک کر دیا، مثلاً عاد، ثمود، شعیب اور لوط علیہم السلام کی قومیں اور قوم فرعون وغیرہ۔ نوح علیہ السلام کے بعد اس لیے فرمایا کہ اس سے پہلے لوگ سب توحید پر تھے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۱۳)۔

﴿۲﴾ وَ كَفَى بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا ۗ اس جملے کا یہاں دو طرح سے تعلق ہے، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام قرون کو ان کے گناہوں کی پاداش ہی میں ہلاک کیا، کیونکہ وہ اپنے بندوں کی پوری خبر رکھنے اور دیکھنے والا ہونے میں بہت ہی کافی ہے۔ ”کفَى بِرَبِّكَ“ کی ترکیب کے لیے اسی سورت کی آیت (۱۴) ملاحظہ فرمائیں۔ دوسرا تعلق یہ ہے کہ کفار قریش اور پوری

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ
يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا ۝۱۸ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ

فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۝۱۹

جو شخص اس جلدی والی (دنیا) کا ارادہ رکھتا ہو ہم اس کو اس میں جلدی دے دیں گے جو چاہیں گے، جس کے لیے چاہیں گے، پھر ہم نے اس کے لیے جہنم بنا رکھی ہے، اس میں داخل ہوگا، مذمت کیا ہوا، دھتکارا ہوا ۱۸ اور جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے لیے کوشش کی، جو اس کے لائق کوشش ہے، جبکہ وہ مومن ہو تو یہی لوگ ہیں جن کی کوشش ہمیشہ سے قدر کی ہوئی ہے ۱۹

امت کو تنبیہ فرمائی کہ یہ مت سمجھنا کہ یہ معاملہ صرف انھی قوموں کے ساتھ ہوا، بلکہ اگر تم بھی اللہ کے رسول ﷺ اور اس کے احکام نہیں مانو گے اور فسق و فجور کا ارتکاب کرو گے تو تمہارے ساتھ بھی اسی طرح ہوگا، اس لیے اپنی اصلاح کر لو۔ اس میں نافرمانوں کو وعید کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جانینوں کے لیے تسلی بھی ہے۔

آیت 18 ۱۸ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ : صاحب کشاف نے فرمایا، وہ شخص جس کا مقصد جلدی حاصل ہونے والی (یعنی دنیا) ہو اور اس کے سوا اس کا کچھ مقصد نہ ہو، جیسا کہ کفار اور اکثر فاسقوں کا حال ہے تو ہم دنیا کے فوائد میں سے جس قدر چاہتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں عطا فرما دیتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں دو قیدیں لگا دیں، ایک یہ کہ ہم دنیا کی وہ چیز اتنی دیتے ہیں جتنی ہم چاہتے ہیں، دوسری قید یہ کہ صرف اسے دیتے ہیں جس کا ہم ارادہ کرتے ہیں۔ اور واقعی ایسا ہی ہے، آپ ان میں سے بہت سے لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ جتنی بھی تمنا رکھیں انھیں اس کا کچھ حصہ ہی ملتا ہے اور بعض اوقات کچھ بھی نہیں ملتا، سو ان کے لیے دنیا کا فقر اور آخرت کا فقر دونوں جمع ہو گئے۔ رہا متقی مومن تو اس کا مقصد صرف آخرت ہوتا ہے، چنانچہ آخرت میں اس کا نفعی ہونا یقینی ہے، اسے پروا نہیں ہوتی کہ دنیا کی آسائش اسے ملتی ہے یا نہیں، اگر اسے دنیا میں بھی مل جائے تو وہ شکر کرتا ہے، اگر نہ ملے تو صبر کرتا ہے، پھر کئی دفعہ فقر اس کے لیے بہتر اور اس کی مراد کے حصول میں زیادہ مددگار ہوتا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ ہود (۱۵، ۱۶) اور سورہ شوریٰ (۲۰)۔

② ”مَذْمُومًا“ ”ذَمٌّ“ سے اسم مفعول ہے جو مدح کی ضد ہے۔ ”مَدْحُورًا“ ”ذُخُورٌ“ سے ہے، جس کا معنی دور کرنا، دفع کرنا ہے، یعنی آخرت میں اس کے عمل کسی طرح بھی قبول نہیں کیے جائیں گے۔

آیت 19 ۱۹ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ : اس آیت میں عمل کی قبولیت کی تین شرطیں بیان ہوئی ہیں، جن میں بنیادی شرط ”وَهُوَ مُؤْمِنٌ“ یعنی ایمان ہے، یہ بات بہت ہی آیات میں بیان ہوئی ہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۱۲۳)، نحل (۹۷) اور مومن (۲۰) وغیرہ۔ کافر کے نیک اعمال قیامت کے دن بے کار ہوں گے۔ دیکھیے سورہ ابراہیم (۱۸)، فرقان (۲۳) اور نور (۳۹)

كُلًّا نَبْدُ هُوْلَاءَ وَ هُوْلَاءَ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَ مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ اَنْظُرْ
كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۚ وَ لِلْآخِرَةِ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان کی اور ان کی بھی، تیرے رب کی بخشش سے اور تیرے رب کی بخشش کبھی بند کی ہوئی نہیں ﴿۲۰﴾ دیکھ ہم نے ان کے بعض کو بعض پر کس طرح فضیلت دی ہے اور یقیناً آخرت درجوں میں بہت بڑی اور فضیلت دینے میں کہیں بڑی ہے ﴿۲۱﴾

وغیرہ۔ کیونکہ کافر کی نیکیوں کا بدلہ دنیا ہی میں اسے دے دیا جاتا ہے۔ دیکھیے ہود (۱۵، ۱۶)، شوری (۲۰) احقاف (۲۰) وغیرہ۔ کافر کی نیکیوں کی مثال صدقہ، صلہ رحمی، مہمان نوازی اور مظلوموں کی مدد وغیرہ ہے۔

دوسری شرط اخلاص ہے، جو ”اَزَادَ الْاٰخِرَةَ“ سے ظاہر ہے اور تیسری شرط آخرت کے لائق عمل صالح ہے، جو ”سَخِي لَهَا سَخِيْحًا“ سے ظاہر ہو رہی ہے اور یہ وہ عمل ہے جو کتاب و سنت کے مطابق ہو، ایسے عمل کا بدلہ ضرور ملے گا اور کئی گنا یا بے حساب ملے گا، جیسا کہ کئی آیات میں مذکور ہے: ﴿اِنَّمَا يُؤْتِي الضُّمُوْرَ اَبْحَثُھُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: ۱۰] ”صرف کامل صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔“ تو جس سنی کو اللہ تعالیٰ مشکور قرار دے وہ ایسی ہی ہوتی ہے۔

آیت 20 ﴿كُلًّا نَبْدُ هُوْلَاءَ وَ هُوْلَاءَ.....: ”مَحْظُوْرًا“ ”حَظَرَ يَحْظُرُ“ (ان) سے اسم مفعول ہے، بمعنی روکنا، یعنی ہم مومن و کافر، نیک و بد ہر ایک کو رزق اور دنیا کی نعمتوں سے نوازتے ہیں، ایسا نہیں کہ گناہ یا کفر کی وجہ سے اس کا رزق بند کر دیں، کیونکہ دنیا امتحان کی جگہ ہے، نیکی یا بدی کی وجہ سے رزق بند کرنے سے یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ہاں! اللہ کی تقدیر کے مطابق مومن کا رزق کم یا زیادہ ہو سکتا ہے اور کافر کا بھی۔

آیت 21 ﴿اَنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ.....: یعنی دنیا میں سب لوگ رزق، حسن، ذہانت، قوت، اقتدار، غرض کسی چیز میں ایک جیسے نہیں، خواہ مومن ہوں یا کافر، یہ چیزیں مومن کے پاس بھی ہو سکتی ہیں اور کافر کے پاس بھی۔ مگر یہ دنیائے فانی ساری کی ساری بھی اللہ کے ہاں کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَوْ كَانَتْ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَّا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ﴾ [ترمذی، الزہد، باب ما جاء فی ہوان الدنیا علی اللہ عزوجل: ۲۲۲۰، صحیحہ الابانہ] ”اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں چھڑکے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی پینے کو نہ دیتا۔“ اور دیکھیے سورۃ انعام (۱۶۵) اور سورۃ زخرف (۳۲)۔

آخرت میں جہنم کے درکات اور جنت کے درجات کا فرق اس سے بھی بڑھ کر ہوگا۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما روای ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ يَتَرَاءَوْنَ اَهْلَ الْعَرْشِ مِنْ فَوْقِهِمْ، كَمَا تَتَرَاءَوْنَ الْكُوْكَبَ الدَّرِيِّ الْعَابِرِ فِي الْاَفْقِ مِنَ الْمَشْرِقِ اَوْ الْمَغْرِبِ لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! تِلْكَ مَنَازِلُ الْاَنْبِيَاءِ لَا يَتَلَعَّهَا غَيْرُهُمْ؟ قَالَ بَلٰی، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ رِحَالُ اَمَنُوْا بِاللّٰهِ وَصَلُّوْا الْمُرْسَلِيْنَ﴾ [بخاری، بدء الخلق، باب ما

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَفْعُودًا وَلَا تَكْفُرْ ۚ وَ قَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا
 إِيَّاهُ ۚ وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ أَمَّا يَبْتَغِئَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا
 أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ﴿۲۲﴾

اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود مت بنا، ورنہ مذمت کیا ہوا، بے یار و مددگار ہو کر بیخار ہے گا ﴿۲۲﴾ اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرو۔ اگر کبھی تیرے پاس دونوں میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ ہی جائیں تو ان دونوں کو ”اف“ مت کہہ اور نہ انہیں جھڑک اور ان سے بہت کرم والی بات کہہ ﴿۲۲﴾

جاء في صفة الجنة و أنها مخلوقة : ۳۲۵۶ - مسلم : ۲۸۴۱ ["اهل جنت اپنے اوپر بالا خانوں والوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح مشرق و مغرب میں دور کسی چمک دار ستارے کو دیکھتے ہیں، باہمی درجات کی کمی بیشی کی وجہ سے۔" لوگوں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! یہ تو انبیاء کی منازل ہوں گی، جہاں کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا؟" فرمایا: "کیوں نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ وہ مرد ہوں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور انھوں نے رسولوں کی تصدیق کی۔"

آیت 22 لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ : "فَعْبُدُوا وَلَا تَكْفُرْ" وہ ہے جس کی مدد وہ چھوڑ دے جس سے اسے مدد کی امید ہو۔ اس آیت میں تمام اعمال کی بنیاد شرک سے پاک ہونا بیان فرمائی گئی ہے۔ بظاہر مخاطب نبی کریم ﷺ ہیں، مگر درحقیقت ہر انسان اس کا مخاطب ہے، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ سے شرک کا صدور کیسے ہو سکتا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ بالفرض اگر اللہ کے ساتھ شریک بنانے کا فعل رسول اللہ ﷺ سے بھی سرزد ہو جائے تو پھر آپ کی بھی کوئی تعریف کرنے والا ہو گا نہ کوئی مدد کرنے والا، بلکہ ہر ایک مذمت ہی کرے گا۔ دیکھیے سورہ زمر (۶۳ تا ۶۷)، حج (۳۱)، مانعہ (۷۲) اور نساء (۱۱۶)۔

آیت 23 ۱ وَ قَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ: پچھلی آیت میں شرک سے منع فرمانے کے بعد صرف اپنی عبادت کی تاکید کے لیے لفظ "قَضَىٰ" استعمال فرمایا، جس میں انتہائی تاکید پائی جاتی ہے، کیونکہ فیصلہ قطعی ہوتا ہے اور وہ بدلائم نہیں جاتا، چنانچہ فرمایا "قَضَىٰ" یعنی قطعی حکم اور فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یعنی صرف اس کے بندے بن کر رہو، غیبی قوتوں کا مالک صرف اس کو سمجھ کر اس سے مانگو۔ انتہائی درجے کی محبت اور خوف کے ساتھ انتہائی عاجزی صرف اس کے لیے اختیار کرو۔ تمہارے دل، زبان اور جسم کے ہر حصے کا اس طرح کا ہر فعل مثلاً قیام، سجدہ، رکوع اور قربانی بلکہ پوری زندگی ایسی عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہونی چاہیے۔

۲ وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا : "إِحْسَانًا" امر "أَحْسِنُوا" کا مصدر ہے، جو تاکید کے لیے ہے اور امر کی جگہ آتا ہے۔ اس کے ساتھ امر کا لفظ ذکر نہیں ہوتا مگر مراد امر تاکید ہی ہوتا ہے، یعنی والدین کے ساتھ بہت نیکی کرو۔ "إِحْسَانًا" اصل میں "إِنْ مَأْ"

وَ اَخْفِضْ لَهَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْنَا كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا ﴿۳۷﴾

اور رحم دلی سے ان کے لیے تواضع کا بازو جھکا دے اور کہہ اے میرے رب! ان دونوں پر رحم کر جیسے انھوں نے چھوٹا ہونے کی حالت میں مجھے پالا ﴿۳۷﴾

ہے، ”ما“ شرط کی تاکید کے لیے ہے، یعنی ”اگر کبھی۔“ ان آیات کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ کے والد اور والدہ دونوں فوت ہو چکے تھے، ان دونوں یا ایک کا بڑھاپے میں جتنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ بظاہر نبی ﷺ کو حکم دینے کے باوجود اصل حکم ہر شخص کو ہے۔ ماں باپ خواہ بوڑھے ہوں یا جوان، ہر حال میں ان کا ادب کرنا اور ان سے نرمی سے بات کرنا فرض اور انھیں جھڑکنا گناہ ہے، مگر چونکہ بڑھاپے میں خدمت کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اور مزاج میں پڑ چڑا پن پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ بسا اوقات زیادہ بڑھاپے کی وجہ سے ہوش و حواس بھی ٹھکانے نہیں رہتے، اس لیے خاص طور پر بڑھاپے کا ذکر فرمایا۔

۳۷) اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر صرف اپنی عبادت کی تاکید کے ساتھ والدین سے احسان کا ذکر فرمایا ہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۳۶) اور سورہ بقرہ (۸۳) دوسرے مقامات پر واضح فرمایا کہ ان سے حسن سلوک لازم ہے، خواہ وہ کافر و مشرک ہوں، بلکہ اگرچہ شرک و کفر کی دعوت بھی دیتے ہوں۔ دیکھیے سورہ لقمان (۱۵) اور سورہ عنکبوت (۸) احادیث میں بھی والدین سے حسن سلوک کی بہت تاکید آئی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «رَغِمَ أَنْفٌ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفٌ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفٌ، قِيلَ مَنْ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟! قَالَ مَنْ أَدْرَكَ وَالِدَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ، أَحَدَهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا ثُمَّ لَمْ يَدْخُلِ الْحَنَّةَ» [مسلم، البر والصلة، باب رغم من أدرك أبويه.....: ۲۵۵۱/۱۰] ”اس کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس کی ناک خاک آلود ہو۔“ پوچھا گیا: ”یا رسول اللہ! کس کی؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے اپنے والدین کو بڑھاپے میں پایا، ان میں سے ایک کو یا دونوں کو، پھر وہ جنت میں داخل نہ ہوا۔“

۳۸) ”عِنْدَكَ“ کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تم والدین کے پاس تھے اور ان کے محتاج تھے، اب وہ بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے تمہارے پاس اور تمہارے محتاج ہیں۔ چنانچہ انھیں ”انف“ بھی نہ کہو، جو آکٹا ہٹ اور بے ادبی کا بلکے سے ہلکا لفظ ہے، پھر اس سے زیادہ کوئی سخت لفظ بولنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

۳۹) قَوْلًا كَرِيمًا: بعض اہل علم نے اس کی تفسیر میں قول کریم کی نقشہ کشی یوں فرمائی کہ ان سے ایسے بات کر جیسے ایک خطا کار غلام اپنے سخت مزاج آقا سے بات کرتا ہے اور بعض نے فرمایا کہ بچپن میں جس طرح تمہارے پیشاب پاخانہ کو صاف کرتے وقت وہ کوئی کراہت محسوس نہ کرتے تھے، بلکہ محبت ہی سے پیش آتے تھے، اب تم بھی ان سے وہی سلوک کرو۔ (بنوئی)

۴۰) 24 ﴿۳۷﴾ وَ اَخْفِضْ لَهَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ : ”جَنَاحَ“ پرندے کے پر کو کہتے ہیں اور بازو کو بھی۔ مطلب یہ کہ جس طرح پرندہ اپنے بچوں کے اوپر اپنے پر جھکا کر انھیں اپنی آغوش میں لے کر ہر سرد و گرم سے محفوظ کر لیتا ہے اس طرح تو بھی رحم کی بنا پر تواضع کے بازو ان پر جھکا دے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے حقوق کی

رَبِّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ ۗ إِنَّ تَكُونُوا ضَالِحِينَ فَإِنَّكَ كَانَ لِلْأَوَابِينَ عَفْوَراً ﴿۲۵﴾ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تَبْذُرْ تَبْذِيرًا ﴿۲۶﴾

تمہارا رب زیادہ جانتے والا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے۔ اگر تم نیک ہو گے تو یقیناً وہ بار بار رجوع کرنے والوں کے لیے ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا ہے ﴿۲۵﴾ اور رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو اور مت بے جا خرچ کر، بے جا خرچ کرنا ﴿۲۶﴾

والدین کے حقوق کی طرح تاکید نہیں فرمائی، کیونکہ اولاد کے لیے ماں باپ کے دل میں قدرتی طور پر شفقت و محبت موجود ہوتی ہے۔ ہاں جو ظلم وہ اولاد پر کرتے تھے اس سے منع فرمایا۔ اس کا ذکر آگے اسی سورت کی آیت (۳۱) میں آ رہا ہے۔

﴿۲۵﴾ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْنَاهَا كَمَا رَبَّنِي صَغِيرًا: معلوم ہوا کہ والدین کے لیے اللہ تعالیٰ سے رحم کی دعا کرنا فرض ہے، کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے، اس لیے روزانہ ان کی زندگی میں اور فوت ہونے کے بعد اپنی دعا کے ساتھ ان الفاظ میں یا دوسرے الفاظ میں ان کے لیے دعا ضرور کرنی چاہیے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ﴾ [ابراہیم: ۴۱] "اے ہمارے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور ایمان والوں کو، جس دن حساب قائم ہوگا۔" الا یہ کہ ان میں سے کسی کی وفات کفر پر ہو تو مرنے کے بعد ان کے لیے استغفار جائز نہیں۔ "رَبِّ ارْحَمْنَاهَا كَمَا رَبَّنِي صَغِيرًا" دعا میں یہ خوبی ہے کہ اس کے ساتھ دعا کرتے ہوئے والدین کے بچپن میں پرورش کا احساس ان کے لیے زیادہ اظہار اور کوشش کے ساتھ دعا کا تقاضا کرتا ہے۔

آیت 25: رَبِّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ : ان الفاظ میں والدین کے لیے دل میں شفقت و رحمت نہ رکھنے پر وعید بھی ہے اور ایسی صالِح اولاد کے لیے تسلی بھی جن کے والدین کسی جائزہ کے بغیر ہی ناراض رہتے ہوں اور اولاد کی ہر قسم کی کوشش کے باوجود کسی طرح خوش نہ ہوتے ہوں، تو فرمایا کہ اگر تم نیک ہو اور تمہارے دل میں والدین کے لیے شفقت و رحمت موجود ہے تو ایسے رجوع کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا ہے۔ بعض اہل علم نے یہ معنی بیان فرمایا کہ اگر تم سے خدمت میں کوتاہی ہوگی یا کوئی زیادتی ہوگی، پھر تم نے رجوع کیا اور توبہ کر لی تو اللہ معاف فرمادے گا۔

آیت 26: ﴿۱﴾ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ : قربت والے سے مراد قریبی رشتے دار ہیں، ماں کی طرف سے ہوں یا باپ کی طرف سے، محرم ہوں یا غیر محرم۔ ان کو پہلے اس لیے رکھا کہ ان کو دینے میں دو اجر ہیں، ایک صلہ رحمی کا اور دوسرا صدقے کا۔ ان کا حق یہ ہے کہ ہر صورت ان سے میل جول اور تعلق قائم رکھا جائے، انہیں دین کی دعوت جاری رکھی جائے، ان کی خوش اور غم میں شرکت کی جائے۔ جب بھی انہیں مدد کی ضرورت ہو مال و جان سے ان کی مدد کی جائے۔ مسکین اور ابن السبیل (مسافر) کی تفسیر سورہ توبہ (۶۰) میں دیکھیں۔

﴿۲﴾ وَلَا تَبْذُرْ تَبْذِيرًا: "تَبْذُرٌ" سے مشتق ہے، جس کا معنی بیچ ہے، یعنی بیچ کی طرح بکھیرنا۔ اللہ تعالیٰ نے

إِنَّ الْمُبْدِرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ ۗ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ﴿۲۷﴾ وَإِنَّمَا تَعْرِضْنَ
عَنَّهُمْ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا ﴿۲۸﴾

بے شک بے جا خرچ کرنے والے ہمیشہ سے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان ہمیشہ سے اپنے رب کا بہت ناشکر ہے ﴿۲۷﴾ اور اگر کبھی تو ان سے بے توجہی کر ہی لے، اپنے رب کی کسی رحمت کی تلاش کی وجہ سے، جس کی تو امید رکھتا ہو تو ان سے وہ بات کہہ جس میں آسانی ہو ﴿۲۸﴾

قربت دار، مسکین اور ابن السبیل کو اس کا حق دینے کے ساتھ ہی بے جا خرچ کرنے سے منع فرمایا۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جائز خرچ کرنے میں بھی میانہ روی کی تاکید فرمائی، خواہ گھر میں خرچ کرے یا صدقہ وغیرہ میں دے۔ آگے آیت (۲۹) میں اس کی تفصیل آ رہی ہے۔ بے جا خرچ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ناجائز کاموں میں خرچ کیا جائے (چاہے ایک پیسہ ہی ہو)، یا جائز کاموں میں بغیر سوچے سمجھے اتنا خرچ کیا جائے جو حق داروں کے حقوق ضائع کرنے اور حرام کے ارتکاب کا سبب بنے۔

آیت 27 : إِنَّ الْمُبْدِرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ : بے جا خرچ کرنے والوں کو ہمیشہ سے شیطانوں کے بھائی، یعنی شیطانوں کے ساتھی اور ان جیسے قرار دیا اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ شیطان ہمیشہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کی ناشکری کرتے ہوئے انھیں غلط جگہ میں خرچ کرتا ہے، اسی طرح جو شخص مالک کے دیے ہوئے مال کو مالک کی نافرمانی میں خرچ کرتا ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔ ترجمے میں ”ہمیشہ“ کا مفہوم ”کائناتاً“ اور ”کان“ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ مفسر طنطاوی لکھتے ہیں: ”وَكَانَ الشَّيْطَانُ فِي كُلِّ وَقْتٍ وَفِي كُلِّ خَالٍ جَحُودًا لِيَنْعَمَ رَبُّهُ لَا يَشْكُرُهُ عَلَيْهَا“

آیت 28 : ﴿۱﴾ وَإِنَّمَا تَعْرِضْنَ عَنْهُمْ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ : ”إِنَّمَا“ اور ”مَا“ سے مرکب ہے، جس میں ”مَا“ ”إِن“ کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”اگر کبھی“ کیا گیا ہے، یعنی ذی القربی، مسکین اور ابن السبیل سے اعراض (بے رخی) بخل کرتے ہوئے ہرگز جائز نہیں، صرف ایک صورت میں جائز ہے کہ تمہارے پاس دینے کے لیے اس وقت کچھ نہ ہو، ہاں تمہیں اللہ کی رحمت (حلال اور دافررزق) کے حصول کی امید ہو (جس سے ناامید ہونا کبھی جائز نہیں) تو ان سے ایسے الفاظ میں معذرت کرو جن میں نرمی اور آسانی ہو۔ ”مَيْسُورًا“ لفظ عموماً مجہول ہی آتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ”مَيْسِرًا فَلَانٌ فَهُوَ مَيْسُورٌ، عَيْسِرٌ فَلَانٌ فَهُوَ مَعْسُورٌ، نَجِسٌ فَلَانٌ فَهُوَ مَنْحُوسٌ، سَعِدٌ فَلَانٌ فَهُوَ مَسْعُودٌ“ اس آیت کی مزید وضاحت سورہ بقرہ (۲۶۱) میں دیکھیں اور ایسے موقع پر رسول اللہ ﷺ کیا فرماتے تھے، اس کے لیے دیکھیے سورہ توبہ کی آیت (۹۲)۔

﴿۲﴾ مہائی دیکھنے نے اس کا ایک اور مفہوم بیان کیا ہے کہ اگر تم مذکورہ لوگوں سے اعراض اس وجہ سے کرو کہ ان سے اعراض کرنے میں تمہیں رب تعالیٰ کی رحمت کے حصول کی امید ہو، مثلاً تمہیں معلوم ہو کہ اگر اسے مال دیا تو یہ اسے نشے پر، زنا پر یا کسی گناہ پر صرف کرے گا تو تب بھی نرمی اور خوش اسلوبی سے اس سے معذرت کرو۔ آیت کے الفاظ میں اس مفہوم کی بھی گنجائش ہے۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا
مَحْسُورًا ﴿۲۹﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۗ إِنَّكَ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا
بَصِيرًا ﴿۳۰﴾

اور نہ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا کر لے اور نہ اسے کھول دے، پورا کھول دینا، ورنہ ملامت کیا ہوا، تھکا ہارا ہو کر بیٹھ رہے گا ﴿۲۹﴾ بے شک تیرا رب رزق فراخ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے، بے شک وہ ہمیشہ سے اپنے بندوں کی پوری خبر رکھنے والا، خوب دیکھنے والا ہے ﴿۳۰﴾

آیت 29 وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً : ”مَغْلُولَةً“ ”عُلٌّ“ سے مشتق ہے، جس کا معنی گردن کا طوق ہے، جس کے ساتھ ہاتھ بھی باندھ دیے جائیں، جیسا کہ مجرموں اور قیدیوں سے کیا جاتا ہے، مراد نکل اور کنجوسی ہے اور ”الْبَسْطُ“ (کھولنا) سے مراد سخاوت ہے۔ ”مَحْسُورًا“ جو تھک ہار کر چلنے سے رہ جائے۔ یعنی بالکل بخیلی کر دے تو خالق و مخلوق دونوں کے ہاں ملامت کیے ہوئے بن جاؤ گے اور پورا ہاتھ کھول دو گے اور سب کچھ دے کر خالی ہاتھ ہو جاؤ گے تو اہل و عیال کی ملامت کے ساتھ ساتھ زندگی کی دوڑ میں تھک ہار کر بیٹھ رہو گے، پھر ممکن ہے کہ بھیک مانگنے تک کی نوبت آجائے۔ سب سے بہتر میان روی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ [الفرقان: ۶۷] ”اور وہ لوگ (عباد الرحمن ہیں) کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ خرچ میں تنگی کرتے ہیں اور (ان کا خرچ) اس کے درمیان معتدل ہوتا ہے۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا سَكَانَ عَنْ ظَهْرِ غَنِيٍّ، وَأَبْدَأُ بِمَنْ تَعُولُ﴾ [بخاری، الزکوٰۃ، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى: ۱۴۲۶] ”بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد غنا موجود رہے (انسان فقیر نہ ہو جائے) اور ابتدا ان سے کرو جن کی تم پرورش کر رہے ہو۔“

آیت 30 : ﴿۱﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ : یعنی اگر حد سے زیادہ خرچ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کسی کا فقر دور کرنا چاہتے ہیں تو یہ آپ کے اختیار میں نہیں، آپ جتنا بھی دے لیں اگر رب تعالیٰ اس کے رزق کا دروازہ کشادہ نہ کرے تو کوئی اسے نہیں کھول سکتا، آپ اللہ کے حکم کے مطابق اعتدال سے خرچ کریں، اس کے فقر و غنا کی فکر آپ کا کام نہیں اور نہ یہ آپ کے بس کی بات ہے۔

﴿۲﴾ إِنَّكَ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا : یعنی وہ خوب جانتا ہے کہ کسے کتنا رزق دینا ہے۔ کسی کو زیادہ اور کسی کو کم رزق دینا اس کی حکمت ہے۔ (دیکھیے شوریٰ: ۲۷) اگر سب لوگ برابر ہوتے تو دنیا کے کام چل ہی نہ سکتے۔ (دیکھیے زخرف: ۲۲) دولت مند ہونا یا فقیر ہونا نیکی یا بدی پر منحصر نہیں، بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے۔ (دیکھیے زخرف: ۲۳-۲۵) زبردستی اس فرق کو مٹایا نہیں جاسکتا، جیسا کہ کیوسٹوں اور سوشلسٹوں کی خواہش اور کوشش تھی، جس کے لیے انھوں نے لاکھوں لوگ تیغ کیے مگر منہ کی کھائی۔ کیونکہ یہ فطرت سے جنگ ہے جو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ رہی سرمایہ داری کہ سود اور دوسرے

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ مَنۢ نَّزَمْتَهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنۢ تَنَالَهُمْ كَبْرٌ خَطَا

کپیڈا ۳۱

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ہی انھیں رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔ بے شک ان کا قتل ہمیشہ سے بہت بڑا گناہ ہے ۳۱

ناجائز طریقوں سے تمام اموال کے مالک صرف چند لوگ بن گئے اور باقی سب ان کے محتاج ہوں، یہ بھی اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں اور جہاں یہ نظام ہو گا وہ معاشرہ بھی لاجور و ظلم و ستم اور حرص و ہوس کا شکار ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر و فقیر کے اس فرق کو ختم کرنا نہیں بلکہ اعتدال پر رکھنا ضروری ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنے کو حرام قرار دیا، چوری ڈاکے، غصب، دھوکے اور سود کی تمام صورتیں حرام قرار دیں، تو دوسری طرف جائز طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کو زکوٰۃ، صدقات، میراث اور دوسرے احکام کے ذریعے سے معاشرے میں پھیلا دینے کا حکم دیا۔ ان احکام پر عمل کرنے کی صورت میں معاشرے میں امیری و غریبی میں اعتدال قائم رہے گا، پھر نہ سرمایہ دارانہ طریقے کی وجہ سے امریکہ اور یورپی ممالک کی طرح دولت چند آدمیوں کی منگی میں جمع ہونے سے پیدا ہونے والے مظالم ہوں گے اور نہ اس فطری فرق کو زبردستی اور مصنوعی طریقوں سے ختم کرنے کی کوشش سے وہ خرابیاں پیدا ہوں گی جو روس، چین اور دوسرے کمیونسٹ ممالک میں پیدا ہوئیں کہ انسان انسانیت کے مرتبے سے گر کر محض ایک حیوان بن گیا، لوگوں کو ان کی فطری آزادی سے محروم کر دیا گیا، حتیٰ کہ اس نظام پر مبنی تمام ممالک آخر کار ناکام ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور وہاں کے رہنے والے مظلوم مسلم اور غیر مسلم سب لوگوں کو مسلمانوں کے جہاد کی برکت سے اس نظام سے نجات اور آزادی کی زندگی نصیب ہوئی۔ (فالحمد للہ) اب بھی اگرچہ وہاں اس کی باقیات موجود ہیں، جن کی وجہ سے ظلم و ستم کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا، اس لیے مسلمانوں کا فرض ہے کہ تمام دنیا کو سرمایہ داری، کمیونزم اور دوسرے تمام ظالمانہ نظاموں سے نجات دلا کر اسلام کا نظام عدل نافذ کریں۔ یہ کام اللہ کے فضل سے شروع ہو چکا ہے اور جہاد اسلامی کی برکت سے تمام دنیا پر اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا۔ (ان شاء اللہ) جیسا کہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ رَسُولَنَا بِالْهُدَىٰ وَ دِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۗ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ [التوبة: ۳۳] ”وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے، خواہ مشرک لوگ برا جائیں۔“

آیت 31 وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ اگرچہ اولاد میں لڑکے لڑکیاں دونوں شامل ہیں، مگر عرب کی تاریخ میں اکثر لڑکیوں ہی کو قتل کرنے کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ إِذَا النُّؤُودُ دُذِّئَتْ سَوَّيْتٌ﴾ [التكوير: ۸] ”اور جب زندہ دفن کی گئی سے پوچھا جائے گا۔“ ”النُّؤُودُ“ مؤنث لانے سے ظاہر یہی ہے کہ زندہ درگور لڑکی ہی ہوتی تھی، لیکن اگر اسے ”نفس موءودہ“ کہا جائے تو پھر لڑکا لڑکی دونوں مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ ”نفس“ کا لفظ زبان عرب میں مؤنث ہے، سو معنی ہوگا:

وَلَا تَقْرُبُوا الزَّوْجِيْنَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۗ وَ سَاءَ سَبِيْلًا ﴿۳۱﴾

اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ ہمیشہ سے بڑی بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے ﴿۳۱﴾

”اور جب زندہ درگور کی ہوئی جان سے سوال کیا جائے گا۔“ اور اگرچہ عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ وہ لڑکی کو غیرت کی وجہ سے قتل کرتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں ہو سکتا۔ اس نے مطلق اولاد لڑکے لڑکی دونوں کا ذکر فرمایا ہے اور قتل کا سبب موجودہ فقہاء آئندہ فقر کا خوف بیان فرمایا ہے، ہاں یہ درست ہے کہ اولاد کو قتل کا باعث فقر کے علاوہ بے جا غیرت بھی تھا۔ ”ثَعْنُ تَزْرُفُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ“ اور ”ثَعْنُ تَزْرُفُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ“ میں تقدیم و تاخیر کی حکمت اور دوسرے فوائد کے لیے دیکھیے سورہ انعام (۱۵۱) ”خِطَا“ اور ”اِنَّكُمْ“ کا وزن اور معنی ایک ہی ہے، یعنی دانستہ گناہ۔

آیت ۳۲ ﴿۳۲﴾ وَلَا تَقْرُبُوا الزَّوْجِيْنَ: ”فَاحِشَةً“ ایسا قول و فعل جو نہایت قبیح ہو۔ پچھلی آیت میں قتل اولاد سے منع فرمایا، جو نسلی انسانی فنا کرنے کا باعث ہے اور اس آیت میں زنا کے قریب جانے سے منع فرمایا، کیونکہ یہ حد سے بڑھی ہوئی برائی کے ساتھ نسب کا نظام خراب کرنے کا باعث ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خاوند کو نہ بیوی پر اعتماد رہے گا اور نہ اسے اولاد کے اپنا ہونے کا یقین ہوگا، وہ غیرت کی وجہ سے بیوی بچوں کو قتل بھی کر سکتا ہے، جیسا کہ اکثر خبریں آتی رہتی ہیں۔ اگر یہ رسم بد عام ہو جائے تو رشتہ داری کا سارا نظام، جو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، ختم ہو جائے گا، نہ باپ کا پتا، نہ کوئی چچا نہ دادا، نہ ان کی اولاد کا علم، نہ ان سے کوئی تعلق نہ رشتہ داری، بلکہ انسان اور حیوان کا فرق ہی ختم ہو جائے گا۔ اس غیبت فعل کی سزا اس وقت مغربی اقوام بھگت رہی ہیں اور انہیں مسلمانوں کے نظام نسب پر شدید حسد ہے، جس کی وجہ سے وہ ان میں بھی بے حیائی اور زنا پھیلانے کا ہر حربہ استعمال کر رہے ہیں۔

﴿۳۲﴾ اللہ تعالیٰ نے زنا اور بعض دوسرے کاموں کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا ہے اور بعض کاموں کا ارتکاب کرنے سے منع کیا ہے۔ آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کام کی رغبت طبعی طور پر آدمی کے دل میں ہو اس کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا، جیسے زنا کہ جنسی جذبہ آدمی کا سب سے غالب جذبہ ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرُبُوا الزَّوْجِيْنَ﴾ [بنی اسرائیل: ۳۲] اور فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتّٰی يَظْهَرْنَ﴾ [البقرہ: ۲۲۲] ”اور ان کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔“ اسی طرح یتیم کے مال کے قریب احسن طریقے سے جانے کے سوا منع فرما دیا، کیونکہ مال کی حرص طبعی جذبہ ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرُبُوا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ﴾ [بنی اسرائیل: ۳۴] البتہ قتل کے ارتکاب سے منع کیا، فرمایا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ حَشِيَةً اِنلَاقٍ﴾ [بنی اسرائیل: ۳۱] اور فرمایا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ [بنی اسرائیل: ۳۳] کیونکہ کسی کو قتل کرنا انسان کا طبعی تقاضا نہیں ہے۔

﴿۳۳﴾ اللہ تعالیٰ نے زنا کے تمام راستے بھی بند فرما دیے جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے: ﴿۱﴾ اجنبی عورت کے ساتھ خلوت حرام فرمادی، اسی طرح مردوں کو عورتوں سے عام میل جول سے بھی منع فرمادیا۔ چنانچہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ وَلَا يَدْخُلُ عَلَيْهَا رَجُلٌ إِلَّا وَمَعَهَا مَحْرَمٌ» [بخاری، جزاء الصید، باب حج النساء: ۱۸۶۲] "کوئی عورت سفر نہ کرے مگر کسی محرم کے ساتھ اور اس کے پاس کوئی مرد نہ جائے مگر اس صورت میں کہ اس عورت کے پاس کوئی محرم موجود ہو۔" مسلم کی اسی روایت میں ہے: «لَا يَخْلُونَ رَجُلًا بِامْرَأَةٍ» [مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره: ۱۳۴۱] "کوئی آدمی کسی عورت کے ساتھ اکیلا نہ ہو۔" اسی طرح عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنِّي كُنْتُ وَالِدُخُولِ عَلَيِ النِّسَاءِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَفَرَأَيْتَ الْحَمُو؟ قَالَ الْحَمُو الْمَوْتُ» [بخاری، النكاح، باب لا يخلون رجل بامرأة.....: ۵۲۳۲۔ مسلم: ۲۱۷۲] "عورتوں کے پاس جانے سے بچو۔" ایک انصاری آدمی نے پوچھا: "آپ "حمو" (خاوند کے قریبی مثلاً اس کے بھائی یا چچا زاد یعنی کزن وغیرہ) کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟" فرمایا: "حمو" تو موت ہے (مطلب یہ کہ اس کا زنا تو بعض اوقات موت تک پہنچا دیتا ہے)۔" (۲) مردوں اور عورتوں دونوں کو نگاہ نیچی رکھنے اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کا حکم دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ نور (۳۱، ۳۰) کیونکہ آنکھیں اور کان دل کا دروازہ ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما روای ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزَّانَا، أُذْرَكَ ذَلِكَ لَا مَحَالَةَ، فَرَزْنَا الْعَيْنَ النَّظْرَ، وَزَنَا اللِّسَانَ الْمَنْطِقَ، وَالنَّفْسُ تَمْتَمِي وَتَسْتَهِي، وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذَلِكَ كَلْمُهُ وَ يُكْذِبُهُ» [بخاری، الاستئذان، باب زنا الحوارح دون الفرج: ۶۲۴۳۔ مسلم: ۲۶۵۷] "اللہ نے ابن آدم پر زنا میں سے اس کا حصہ لکھ دیا ہے، جسے وہ لاحالہ پانے والا ہے، پس آنکھوں کا زنا ان کا دیکھنا ہے، کانوں کا زنا ان کا سننا ہے، زبان کا زنا بولنا ہے اور نفس تمنا اور خواہش کرتا ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب۔" (۳) عورتوں کو پردے کا حکم دیا اور زینت کے اظہار سے سخت منع فرمایا۔ دیکھیے سورہ نور (۳۱) اور سورہ احزاب (۳۳) اس کے ساتھ ہی مردوں اور عورتوں کے نکاح کی تاکید فرمائی اور نکاح کو نہایت آسان بنا دیا، اگر مسائل مہیا نہ ہوں تو پاک دامن رہنے کی انتہائی کوشش کا حکم دیا۔ دیکھیے سورہ نور (۳۲، ۳۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ اسْتَطَاعَ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغْضَى لِلْبَصْرِ، وَأُحْصِنَ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهُ لَهُ وَجَاءٌ» [بخاری، الصوم، باب الصوم لمن خاف على نفسه العزبة: ۱۹۰۵۔ مسلم: ۱۴۰۰] "تم میں سے جو شخص ضروریات نکاح رکھتا ہو وہ نکاح کرے، کیونکہ یہ نظر کو بچا رکھنے اور شرم گاہ کو (زنا سے) محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے اور جو طاقت نہ رکھے وہ روزے کو لازم پکڑے، کیونکہ وہ اس کے لیے (شہوت کو) کچلنے کا باعث ہے۔" (۴) زنا کرنے والوں پر، مردہوں یا عورت، انتہائی احتیاط کے ساتھ ثبوت قائم کرنے اور پوری شدت کے ساتھ حد نافذ کرنے کا حکم دیا۔ کنواری اور کنوارے کے لیے سو کوڑے اور ایک سال جلا وطنی کی حد مقرر فرمائی، جو رجم سے بہت کم ہے اور غیر کنوارے مرد اور عورت کے لیے سو کوڑے اور رجم کی سزا مقرر فرمائی جو انتہائی سخت سزا ہے۔ اس کی واضح احادیث صحیحین وغیرہ میں معروف ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اللہ کی حد نافذ ہو تو معاشرہ اس گندگی سے بالکل پاک ہو جائے۔

④ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً: "گان" دوام کے معنی کے لیے ہے۔ طنطاوی رضی اللہ عنہ نے اس جگہ "گان" کو "منا زال" (ہمیشہ سے)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيهِ

اور اس جان کو قتل مت کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور جو شخص قتل کر دیا جائے، اس حال میں کہ (سے) کے معنی میں لیا ہے اور "فَأَحْسِنُوا" میں تین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "بے شک وہ ہمیشہ سے بڑی بے حیائی ہے اور براراستہ ہے۔" ظاہر ہے کہ زنا بے حیائی میں حد سے بڑھا ہوا کام ہے جو خاندانوں، نسلوں اور معاشروں کو برباد کر دیتا ہے اور خوف ناک جسمانی اور روحانی بیماریوں کا باعث بنتا ہے۔

⑤ وَسَاءَ سَبِيلًا : براراستہ اس لیے ہے کہ اگر یہ کھل جائے تو اس پر چل کر لوگ آپ کے گھر بھی آئیں گے، پھر کسی کی ماں، بیٹی، بیوی یا بہن کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ یہی بات آپ ﷺ نے اس نوجوان کو سمجھائی تھی جس نے آپ سے زنا کی اجازت مانگی تھی۔ سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "ایک نوجوان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے زنا کی اجازت چاہی۔ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے، اسے ڈانٹا اور کہا کہ خاموش ہو جا، تاہم آپ ﷺ نے فرمایا: «أَذْنُهُ» (میرے) قریب آ۔" وہ قریب آیا اور جب بیٹھ گیا تو آپ نے فرمایا: «أَفْتَحِبُّهُ لِأُمَّتِكَ؟» "کیا تو اس کام کو اپنی ماں کے لیے پسند کرتا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں، اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے (ہرگز نہیں)۔" آپ نے فرمایا: «وَلَا النَّاسُ يُحِبُّونَهُ لِأُمَّهَاتِهِمْ» "تو لوگ بھی اس کام کو اپنی ماں کے لیے پسند نہیں کرتے۔" پھر آپ نے فرمایا: «أَفْتَحِبُّهُ لِابْنَتِكَ؟» "اچھا تو اسے اپنی بیٹی کے لیے پسند کرتا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں، اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے (ہرگز نہیں)۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: «وَلَا النَّاسُ يُحِبُّونَهُ لِبَنَاتِهِمْ» "لوگ بھی اس کام کو اپنی بیٹیوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «أَفْتَحِبُّهُ لِأَخْتِكَ؟» "کیا تو اس کام کو اپنی بہن کے لیے پسند کرتا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں، اللہ کی قسم! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: «وَلَا النَّاسُ يُحِبُّونَهُ لِأَخَوَاتِهِمْ» "لوگ بھی اس کام کو اپنی بہنوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔" پھر آپ ﷺ نے پوچھا: «أَفْتَحِبُّهُ لِعَمَّتِكَ؟» "کیا تو اس کام کو اپنی چھو بھئی کے لیے پسند کرتا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں، اللہ کی قسم! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: «وَلَا النَّاسُ يُحِبُّونَهُ لِعَمَّاتِهِمْ» "لوگ بھی اس کام کو اپنی چھو بھئیوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔" پھر آپ ﷺ نے پوچھا: «أَفْتَحِبُّهُ لِخَالَاتِكَ؟» "کیا تو اس کام کو اپنی خالہ کے لیے پسند کرتا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں، اللہ کی قسم! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے (ہرگز نہیں)۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: «وَلَا النَّاسُ يُحِبُّونَهُ لِخَالَاتِهِمْ» "لوگ بھی اس کام کو اپنی خالوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔" پھر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس پر رکھا اور یہ دعا کی: «اللَّهُمَّ اغْفِرْ ذُنُوبَهُ، وَطَهِّرْ قَلْبَهُ وَحَصِّنْ فَرْجَهُ» "الہی! اس کے گناہ بخش، اس کے دل کو پاک کر اور اسے عصمت والا بنا۔" پھر تو یہ حالت تھی کہ یہ نوجوان ایسے کسی کام کی طرف نہیں جھانکتا تھا۔ [مسند احمد: ۲۵۶/۵، ۲۵۷، ج: ۱۲۲۷۴]

آیت 33 ① وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ..... انسانی جان اور عزت کی حفاظت کے لیے قتل اولاد اور زنا کے

سُلْطًا فَلَا يُسْرِفُ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا ﴿۳﴾

مظلوم ہو تو یقیناً ہم نے اس کے ولی کے لیے پورا غلبہ رکھا ہے۔ پس وہ قتل میں حد سے نہ بڑھے، یقیناً وہ مدد دیا

ہوا ہوگا ﴿۳﴾

قریب جانے سے منع کرنے کے بعد اب کسی بھی شخص کو ناحق قتل کرنے سے منع فرمایا۔ قتل مسلم کب ناحق ہے اور کب حق؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا يَجِلُّ دَمُ امْرِيءٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَنَّي رَسُولَ اللَّهِ إِلَّا بِأَخْذِي ثَلَاثِ النَّفْسِ بِالنَّفْسِ، وَالثَّيْبِ الزَّانِي، وَالْمُفَارِقِ لِذِيئِهِ النَّارِكِ لِلْحَمَاعَةِ» [بخاری، الديات، باب قول الله تعالى: ﴿إِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ.....﴾: ۶۸۷۸، عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه] ”کسی مسلمان کو، جو کلمہ ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ پڑھتا ہو، قتل کرنا حلال نہیں، مگر تین چیزوں میں سے کسی ایک کے ساتھ، جان کے بدلے جان، غیر کنوارا زانی اور اپنے دین کو ترک کرنے والا، جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والا۔“ مگر یہ حصر حقیقی نہیں ہے، کیونکہ بعض دوسرے جرائم میں بھی قتل کا جواز ثابت ہے، مثلاً رسول اللہ ﷺ کو گالی دینا اور محرم کے ساتھ نکاح کرنا وغیرہ۔ (بخاری: ۱۸۴۶۔ ابوداؤد: ۴۳۵۶) اس قتل میں خودکشی بھی داخل ہے، یعنی اپنے آپ کو قتل کرنا بھی جائز نہیں۔ (دیکھیے نساء: ۲۹) قتل عمد کی قباحت کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورہ نساء (۹۳)۔

﴿۳﴾ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيَيْهِ سُلْطَانًا: اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو ناحق قتل کر دے تو مقتول کے ولی کو اللہ تعالیٰ نے پورا اختیار دیا ہے کہ چاہے تو قصاص لے لے، چاہے دیت لے لے، یا دیت کے بغیر معاف کر دے۔ ”سُلْطَانًا“ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلم حکمران پر لازم ہے کہ وہ اسے ان تینوں باتوں کا اختیار دے، پھر اگر وہ قصاص لینا چاہے تو اسے قصاص دلائے، اگر قاتل یا اس کے ساتھی مزاحمت کریں تو شریعت کی بغاوت پر ان سے جنگ کرے۔ یہ قصاص معاشرے میں سے قتل ناحق کو ختم کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۷۸، ۱۷۹) کفار کے معاشرہ میں بد امنی اور بے شمار قتل قصاص نہ ہونے ہی کی وجہ سے ہیں۔ اب مسلم حکمرانوں نے بھی ایک آدھ کے علاوہ قصاص کے حکم اور اس کے شرعی طریقے کو چھوڑ کر کفار کا قانون اپنایا تو اس کے نتیجے میں وہ بھی امن کے بجائے خوف اور بد امنی کا شکار ہو گئے۔ کفار کے ملکوں کی طرح نہ وہاں کسی کی جان محفوظ ہے، نہ مال، نہ عزت و آبرو اور اسے ترقی قرار دیا جا رہا ہے۔

﴿۳﴾ فَلَا يُسْرِفُ فِي الْقَتْلِ: قصاص لیتے وقت قتل میں زیادتی یہ ہے کہ قاتل کے بجائے کسی اور کو قتل کر دے، یا قاتل کے ساتھ انھیں بھی قتل کرے جو قتل میں شریک نہیں ہیں، یا قتل سے پہلے مثلہ کرے، یعنی اس کے اعضا کاٹنے یا مختلف طریقوں سے تکلیف دے دے کہ مار دے۔ اس میں صرف یہ استثنا ہے کہ قاتل نے جس طریقے سے قتل کیا ہے اس طریقے سے اسے قتل کر سکتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۹۳)، سورہ نمل (۱۲۶) اور سورہ بقرہ کی آیات قصاص (۱۷۸، ۱۷۹)۔

﴿۴﴾ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا: یعنی مسلم حکومت اور تمام مسلمان اس کی مدد کریں گے، ان سب پر اس کی مدد لازم ہے، بلکہ اللہ

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَ آؤْفُوا بِالْعَهْدِ ۚ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ﴿۳۴﴾ وَ آؤْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الَّتِي عَلَيْكُمْ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿۳۵﴾ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿۳۶﴾

اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کا سوال ہوگا ﴿۳۴﴾ اور ماپ کو پورا کرو، جب ماپ اور سیدھی ترازو کے ساتھ وزن کرو۔ یہ بہترین ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت زیادہ اچھا ہے ﴿۳۵﴾ اور اس چیز کا پیچھا نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک، اس کے متعلق سوال ہوگا ﴿۳۶﴾

تعالیٰ بھی دنیا اور آخرت میں اس کی نصرت فرمائے گا۔

آیت ۳۴ ﴿۳۴﴾ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ..... : احسن یہ کہ ہر طرح اس کی حفاظت کرو، اسے کسی کاروبار میں لگا کر بڑھانے کی کوشش کرو، جب جوان ہو جائے تو اس کا مال اس کے سپرد کر دو، یا اس سے اجازت لے کر کاروبار کرو۔ اس مضمون کی تفصیل سورہ نساء (۱۳ تا ۲۳) میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت ۳۵ ﴿۳۵﴾ وَ آؤْفُوا بِالْعَهْدِ..... : اس میں وہ عہد شامل ہے جو اللہ تعالیٰ سے یا بندوں سے کیا جائے، کیونکہ عہد کے متعلق سوال ہوگا اور جو عہد و اقرار توڑے گا اسے سزا ملے گی۔

آیت ۳۵ ﴿۳۵﴾ وَ آؤْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ..... : ”الکیل“ سے مراد کسی برتن وغیرہ کو پیمانہ بنا کر غلہ وغیرہ کو ماپنا، مثلاً صاع (ٹوپا) اور مد (پروپی) وغیرہ۔ وزن کا معنی تولنا، مثلاً کلو وغیرہ۔ ”الْقِسْطَاسُ“ ترازو۔ مجاہد نے فرمایا، رومی میں قسطاس عدل کو کہتے ہیں۔ ”تَأْوِيلًا“ (انجام) یہ ”أُولُ“ سے مشتق ہے جس کا معنی رجوع ہے، یعنی کوئی کام جس نتیجہ کی طرف پلٹتا ہے، تعبیر کو بھی تاویل کہتے ہیں اور کسی چیز کے اصل مفہوم و مطلب کو بھی۔ انجام کے لحاظ سے بہتر اس لیے کہ پورے ماپ اور تول کی وجہ سے سب لوگوں کا اس پر اعتماد قائم ہو جائے گا، اس کے کاروبار میں برکت اور ترقی ہوگی اور یہ شخص قیامت کے دن کی رسوائی اور لوگوں کے حقوق کے مطالبہ سے محفوظ رہے گا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ مطلقین کی ابتدائی آیات۔

آیت ۳۶ ﴿۳۶﴾ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ : ”لَا تَقْفُ“ ”فَقْنَا يَقْفُو“ (ن) سے نبی کا صیغہ ہے، جس کا معنی پیچھے چلنا ہے۔ ”فَقُوْتُ أُمَّرٌ فَلَانٌ“ ”میں فلاں کے نقش قدم پر چلا۔“ ”فَقْنَا“ گردن کے پچھلے حصے (گدی) کو کہتے ہیں، قافیہ ہر شعر کے آخر میں آنے والا لفظ۔ رسول اللہ ﷺ کا ایک مبارک نام ”الْمُقَفِّي“ بھی ہے، یعنی سب سے پیچھے آنے والا۔ (متدرک ماکم: ۳۱۸۵)، یعنی جس قول یا فعل کے درست ہونے کا علم یعنی یقین نہ ہو اس کا پیچھا مت کرو، مطلب یہ کہ نہ خود اس پر عمل کرو نہ

وَلَا تَنْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴿۳۷﴾

اور زمین میں اکر کر نہ چل، بے شک تو نہ کبھی زمین کو چھاڑے گا اور نہ کبھی لمبائی میں پہاڑوں تک پہنچے گا ﴿۳۷﴾

آگے کسی کو بتاؤ۔ علم وہ ہے جس کا یقین ہو، صرف گمان کے پیچھے چلنا منع ہے، کیونکہ گمان علم نہیں ہوتا، فرمایا: ﴿وَمَا أَهْمُ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنَّ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ﴾ [النجم: ۲۸] ”حالانکہ انھیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمان کے پیچھے چل رہے ہیں۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّمَا كُمْ وَالظَّنُّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ﴾ [بخاری، الأدب، باب: ﴿يَأْيُهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ﴾: ۶۰۶۶] ”گمان سے بچو، یقیناً گمان سب سے جھوٹی بات ہے۔“ اسی طرح سنی سنائی بات بلا تحقیق بیان کرنا بھی منع ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿كُفِيَ بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ﴾ [مسلم، المقدمه، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع: ۵، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] ”آدمی کو جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر وہ بات آگے بیان کر دے جو اس نے سنی ہو۔“ علاوہ ازیں جھوٹی گواہی، کوئی بھی تہمت، جھوٹا خواب بیان کرنا، رسول اللہ ﷺ کی حدیث اس کے صحیح ہونے کا علم ہونے کے بغیر بیان کرنا، قرآن وحدیث کی موجودگی میں کسی کی شخصی رائے یا قیاس پر عمل کرنا (تقلید کرنا) یہ سب چیزیں اس میں شامل ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سب سے منع فرمایا ہے۔

﴿إِنَّ الشَّعْرَ وَالْبَصَرَ...﴾: یہاں ”مَنْ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْنُونًا“ سے مراد وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جس کے کان، آنکھیں اور دل ہیں، یعنی آدمی سے ان تینوں چیزوں میں سے ہر ایک کے بارے میں سوال کیا جانے والا ہے کہ تو نے ان اعضا کو کہاں استعمال کیا ہے؟ جس چیز کا علم نہیں تھا اس کا پیچھا کرنے میں اللہ کے عطا کردہ اعضا کیوں استعمال کیے؟ (دیکھیے حجر: ۹۲، ۹۳) اور ”مَنْ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْنُونًا“ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کان، آنکھیں اور دل میں سے ہر ایک سے خود اس کے متعلق سوال ہونے والا ہے کہ بتاؤ تمہیں اس شخص نے کہاں اور کیسے استعمال کیا۔ دیکھیے سورہ یونس (۶۵) اور طہ السجدہ (۱۹ تا ۲۳) بہر حال قرآن کی آیات میں یہ دونوں مفہوم موجود ہیں، دونوں صورتوں میں قیامت کے دن کی اس ہولناک پیشی سے ڈرایا گیا ہے۔ اس آیت کی ہم معنی یہ آیات بھی ملاحظہ فرمائیں سورہ اعراف (۳۳) اور سورہ بقرہ (۱۶۸، ۱۶۹)۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ چند الفاظ اسلام کے مکمل منج کی ترجمانی کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان پر لازم ہے کہ اس بات کی اپنی حد تک پوری تحقیق کر لے کہ میری زبان جو بات کہہ رہی ہے، یا واقعہ بیان کر رہی ہے، یا روایت نقل کر رہی ہے، یا میری عقل جو فیصلہ کر رہی ہے، یا جو کچھ میں نے قطعی طے کیا، یا جو کام میں کرنے جا رہا ہوں اس کا مجھے پورا علم ہے اور میں اس کے نتائج کو پوری طرح جانتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے بات کا رخ تکبر سے ممانعت کی طرف موڑ دیا، کیونکہ یہ انسان کے اپنی حقیقت سے حد سے زیادہ لاعلم ہونے کی دلیل ہے۔

﴿۳۷﴾ وَلَا تَنْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ ﴿۱﴾ اصل میں حد سے بڑھی ہوئی خوشی کو کہتے ہیں، جس کے ساتھ

تکبر اور لوگوں سے اونچا ہونے کا اظہار ہو۔ ”فی الأرض“ سے اس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ تو اسی زمین سے پیدا ہوا اور اسی کی آغوش میں سمٹ جائے گا۔ (دیکھیے طہ: ۵۔ مرسلات: ۲۵ تا ۲۷) پھر اس پر یہ تکبر کیسا؟ اسلام کے سکھائے ہوئے

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئَةً عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًُا ﴿۳۸﴾

یہ سب کام، ان کا براتیرے رب کے ہاں ہمیشہ سے ناپسندیدہ ہے ﴿۳۸﴾

ادب کے مطابق اپنی چال میں تواضع اور میانہ روی اختیار کر۔ دیکھیے سورۃ لقمان (۱۸، ۱۹) اور فرقان (۶۳)۔

﴿۳۸﴾ إِنَّكَ لَنْ تَخْفَوْا مِنَ الْأَكْثَرِ : اس میں انسان کو مذاق کے انداز میں اس کی حیثیت یاد دلائی گئی ہے۔ نبی ﷺ نے تکبر کا برا انجام بہت سی احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا يَدْخُلُ الْحَنَّةَ مَنْ سَكَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبَرٍ، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَنًا، وَنَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبَرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَغَمَطُ النَّاسِ» [مسلم، الإيمان، باب تحريم الكبر وميانه: ۹۱] ”وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر کبر ہوگا۔“ ایک آدمی نے کہا: ”آدی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا خوبصورت ہو اور اس کا جوتا خوبصورت ہو؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے، کبر تو حق کا انکار اور لوگوں کو حقیر جانتا ہے۔“ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خَبِيْلًا لَمْ يَنْظُرِ اللَّهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [بخاری، اللباس، باب من جر إزاره: ۵۷۸۴ - مسلم: ۲۰۸۵] ”اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کو نہیں دیکھے گا جو اپنی چادر تکبر سے کھینچے۔“

انفوس کہ مسلمان مردوں نے کفار کی تہلیل میں اپنی شلواریں، پتلونیں ٹخنوں سے نیچے رکھنے کو عادت بنا لیا ہے اور عذر یہ کرتے ہیں کہ ہم تکبر سے ایسا نہیں کرتے، حالانکہ اگر بے دھیانی میں بے اختیار کپڑا الٹک جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے تکبر سے ایسا نہیں کیا، لیکن جان بوجھ کر لمبی شلوار سلوانا اور اسے جان بوجھ کر ٹخنوں سے نیچے رکھنا صاف رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اور واضح تکبر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے از خود چادر لٹکانے ہی کو تکبر میں شمار کیا ہے، چنانچہ جابر بن سلیم رضی اللہ عنہما سے ایک لمبی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَارْفَعِ إِزْرَاكَ بِلِي نِصْفِ السَّاقِ فَإِنَّ آيَةَ الْكُفْرَيْنِ وَإِيَّاكَ وَإِسْبَالَ الْإِزَارِ فَإِنَّهَا مِنَ الْمَجِيْلَةِ وَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمَجِيْلَةَ» [ابوداؤد، اللباس، باب ما جاء في إسبال الإزار: ۴۰۸۴] ”اور اپنی چادر نصف پنڈلی تک اٹھاؤ، پھر اگر تم نہیں مانتے تو ٹخنوں تک اور (ٹخنوں سے نیچے) چادر لٹکانے سے بچو، کیونکہ یقیناً یہ تکبر سے ہے اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔“ شیخ البانی رضی اللہ عنہما نے اسے صحیح کہا ہے۔ بے دین لوگوں کا تو کہنا ہی کیا ہے، آج کل بہت سے لوگ بلکہ کئی جماعتیں جو پاکستان ہیں، بلکہ دنیا بھر میں اقامت دین کا علم اٹھائے ہوئے ہیں، ان کے مرد دھڑلے سے اپنے منحنے سے نیچے کپڑا رکھتے ہیں، بلکہ کپڑا اٹھانے والوں کو طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہیں، اس کے برعکس مسلم عورتوں کی اکثریت جنھیں اپنے پاؤں تک چھپانے تھے وہ کپڑا اٹھا کر اپنے حسن کی نمائش کر کے اللہ تعالیٰ کی لعنت کا نشانہ بن رہی ہے۔

آیت 38 ﴿۳۸﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئَةً : «لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ» سے لے کر «وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا»

تک بچپیں چیزیں بیان فرمائی ہیں، جن میں سے بعض کا حکم دیا گیا ہے اور بعض سے منع کیا گیا ہے۔ ان میں ”سَبَّی“ (بری)

وہ ہیں جن سے منع کیا گیا ہے اور وہ چیزیں جن پر عمل کا حکم ہے انھیں بجانہ لانا بھی ”سَبَّی“ (برا) ہے۔ ان تمام چیزوں میں

ذٰلِكَ مِمَّا اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اٰلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْفٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَ مَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

یہ اس میں سے ہیں جو تیرے رب نے حکمت میں سے تیری طرف وحی کی اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود مت بنا، پس تو ملامت کیا ہوا، دھکا مارا ہوا جہنم میں ڈال دیا جائے گا ﴿۳۹﴾ پھر کیا تمہارے رب نے تمہیں بیٹوں کے ساتھ جن لیا اور خود فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالی ہیں؟ بے شک تم یقیناً ایک بہت بڑی بات کہہ رہے ہو ﴿۴۰﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس قرآن میں پھیر پھیر کر بیان کیا، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور وہ انہیں نفرت کے سوا کچھ زیادہ نہیں کرتا ﴿۴۱﴾

سے جو بری ہیں وہ ہمیشہ سے اللہ کے ہاں مکروہ (ناپسندیدہ) ہیں۔ ہیٹلی کا مفہوم ”کان“ ادا کر رہا ہے۔

﴿۳۹﴾ مَكْرُوْهُنَّ : مکروہ کا لفظ فقہاء کی اصطلاح میں حرام سے کم تر درجے کا ہے، یعنی جس کا نہ کرنا اس کے کرنے سے بہتر ہو مگر قرآن و سنت کی اصطلاح میں مکروہ کا لفظ اکثر حرام کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ ان آیات میں منع کردہ تمام چیزیں حرام ہیں، فقہی اصطلاح والی مکروہ نہیں ہیں۔ اس لیے صحیح بخاری اور ترمذی وغیرہ میں باب قائم کرنے وقت لفظ کراہیت لکھا جاتا ہے مگر مراد اس سے حرمت ہی ہوتی ہے۔ بعض اوقات کتاب و سنت میں مکروہ کا لفظ فقہاء والے مکروہ کے معنی میں آتا ہے، مگر اکثر مقامات پر مکروہ کا لفظ حرام ہی کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ زیر تفسیر تمام آیات میں ہے۔

آیت 39 ذٰلِكَ مِمَّا اَوْحٰى اِلَيْكَ : نصیحت کی ابتدا ”لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اٰلٰهًا اٰخَرَ“ سے ہوئی تھی اور اس کے ساتھ بات ختم فرمائی۔ اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۲۲) کی تفسیر۔

آیت 40 اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ : اس آیت میں مشرکین عرب کی جہالت پر طنز ہے، جو یہ کہہ کر فرشتوں کی عبادت کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ دیکھیے سورہ نجم (۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۸)، زخرف (۱۹) اور نحل (۵۷، ۵۸) فرمایا کتنی بڑی بات کہہ رہے ہو کہ وہ جو ہر شے کا خالق و مالک ہے، اس نے تمہیں اولاد میں سے بیٹوں کے لیے خاص کر لیا جو افضل ہیں اور اپنے لیے بیٹیاں بنا لیں جنہیں تم نہایت ردى اور باعث عار سمجھتے ہو اور بعض اوقات زندہ دفن کرنے سے بھی باز نہیں آتے، یقیناً یہ بہت بڑی گستاخی کی بات ہے۔ اگر اس نے اولاد بنانی ہی تھی تو وہ جس طرح کی چاہتا بنا لیتا، پھر وہ محض بیٹیاں ہی کیوں رکھتا؟ (دیکھیے زمر: ۴) وہ تو بیٹے بیٹیوں سے ہے ہی پاک، کیونکہ یہ تمنا ہی کی دلیل ہے۔ دیکھیے سورہ اخلاص کی تفسیر، سورہ بنی اسرائیل کی آخری آیت اور مریم کی آیات (۸۸ تا ۹۵)۔

آیت 41 وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ : ”نُفُوْرًا“ کا معنی نفرت، بدکنا، دور بھاگنا ہے۔ اس قرآن میں پھیر پھیر

قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَأَبْتَعُوا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ﴿۳۱﴾ سُبْحٰنَهُ وَ تَعَلٰی عَنَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا ﴿۳۲﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ

کہہ دے اگر اس کے ساتھ کچھ اور معبود ہوتے، جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو اس وقت وہ عرش والے کی طرف کوئی راستہ ضرور ڈھونڈتے ﴿۳۱﴾ پاک ہے وہ اور بہت بلند ہے اس سے جو یہ کہتے ہیں، بہت زیادہ بلند ہونا ﴿۳۲﴾ ساتوں آسمان اور زمین اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ بھی جو ان میں ہیں اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور

کر بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر ضروری بات کو تکرار کے ساتھ مختلف طریقوں سے بار بار بیان کیا ہے، تاکہ ان لوگوں کو نصیحت ہو، مگر نصیحت تو سننے سے ہوتی ہے، جب کہ یہ لوگ جس قدر سنانے کی کوشش کی جائے اسی قدر دور بھاگتے ہیں، سنا ہی نہیں چاہتے، پھر مانیں گے کیسے؟

آیت 42 ﴿۱﴾ قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ : یعنی اس سے لڑنے اور اس کا تخت الٹ دینے کے لیے جاتے، کیونکہ وہ بھی اپنے کو معبود سمجھتے ہوتے اور جب ایسا نہیں ہوا اور تم دیکھ رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کا نظام خالص اپنی مرضی سے چلا رہا ہے اور یہ نظام اپنی پوری ہم آہنگی اور تناسب سے چل رہا ہے تو معلوم ہوا کہ اس کے مقابلے میں تم نے جتنی زندہ یا مردہ ہستیوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے، وہ سب باطل و بے حقیقت چیزیں ہیں۔ اس آیت کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ مومنون (۹۲، ۹۱) اور انبیاء (۲۲)۔

﴿۲﴾ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عرش پر ہونا صرف رب تعالیٰ کی صفت ہے، کوئی بھی مخلوق عرش پر نہیں جاسکتی، جو لوگ بیان کرتے ہیں کہ معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ عرش پر گئے ان کی بات درست نہیں، کیونکہ یہ آیت اس کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی شخصیت کے عرش پر جانے کی کوئی دلیل ثابت نہیں۔ یہی بات کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں؟ اس کی بحث سورہ نجم کے شروع میں آئے گی۔ (ان شاء اللہ)

آیت 43 ﴿۱﴾ سُبْحٰنَهُ وَ تَعَلٰی عَنَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا : یعنی مشرکین جو اللہ کے ساتھ کوئی معبود بناتے ہیں، یا فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی باتوں سے ہر طرح پاک اور بے حد بلند ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی کی کوئی مجال نہیں، وہی اس کائنات کا بلا شرکت غیر خود مختار مالک و حاکم ہے۔

آیت 44 ﴿۱﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ : زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کر رہی ہے۔ ”سَبَّحَ يَسْبُحُ“ (ف) کا معنی پانی یا ہوا میں تیزی سے چلنا ہے۔ ”سَبَّحَ سَبَّحًا وَ مَبَّحًا“ ستاروں کا افلاک میں تیز چلنا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّبْحُونَ﴾ [یس: ۴۰] ”اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔“ گھوڑے کا تیز چلنا، فرمایا: ﴿وَ النَّبْحُ سَبْحًا﴾ [النازعات: ۳] البتہ باب تقمیل ”التَّسْبِيْحُ“ کا معنی

مَنْ شَىءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۗ إِنَّكَ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿۳۳﴾

لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ بے شک وہ ہمیشہ سے بے حد بردبار، نہایت بخشنے والا ہے ﴿۳۳﴾

اللہ تعالیٰ کی تزیین، یعنی اسے ہر عیب اور کمی سے پاک قرار دینا ہے۔ اصل اس کا بھی اطاعت، عبادت اور پاکیزگی بیان کرنے میں مستعدی و تیزی دکھانا ہے۔ (فخص از راغب) بعض مفسرین نے کہا، مراد یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں زبان حال سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کر رہی ہیں، یعنی ان کی حالت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ انہیں بنانے والا ہر قسم کے عیب سے یا عاجز ہونے سے پاک ہے۔ مگر اس تاویل کی ضرورت تب ہے کہ یہ تمام چیزیں اپنی زبان سے تسبیح نہ کر سکتی ہوں، حالانکہ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ ہر چیز میں ادراک اور سمجھ موجود ہے اور اسے اپنی عبادت اور تسبیح کا طریقہ بھی معلوم ہے، لیکن ان کی اپنی زبان ہے جسے ہم نہیں سمجھتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان میں موجود ہر شخص اور ہر پھیلاتے ہوئے پرندوں کے متعلق فرمایا کہ وہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں اور اس کے بعد فرمایا: ﴿كُلُّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ﴾ [النور: ۴۱] ”ہر ایک نے یقیناً اپنی نماز اور اپنی تسبیح جان لی ہے۔“ اور فرمایا: ﴿إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ لَهَا تَسْبِيحًا بِالْعِشِيِّ وَالْأَشْرَاقِ ۗ وَالظَّيْرَ مَحْشُورًا ۗ كُلُّ لَهَا آوَاتٌ﴾ [ص: ۱۸، ۱۹] ”بے شک ہم نے پہاڑوں کو اس کے ہمراہ مسخر کر دیا، وہ دن کے پچھلے پہر اور سورج چڑھنے کے وقت تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی، جب کہ وہ اکٹھے کیے ہوتے، سب اس کے لیے رجوع کرنے والے تھے۔“ داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی بولی بھی سکھا دی تھی۔ (دیکھیے نمل: ۱۶) بلکہ چیونٹیوں اور پرندوں کے ساتھ ان کی گفتگو بھی سورہ نمل (۷۷) میں ذکر فرمائی۔ اس مقام پر بھی فرمایا: ”اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔“ معلوم ہوا کہ مراد زبان حال سے تسبیح نہیں، کیونکہ یہ زبان تو ہر شخص سمجھتا ہے اور فی الواقع کائنات کے ہر ذرے کی حالت اپنے پیدا کرنے والے کی لاج و قدرت کی اور اس کے ہر کمزوری اور ہر عیب سے پاک ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ اس لیے یہاں ہر چیز کا صرف اپنی زبان حال ہی سے نہیں بلکہ اپنی زبان حال سے بھی تسبیح کرنا مراد ہے اور یہ کچھ بعید نہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ﴿وَلَقَدْ كُنَّا نَسْمَعُ تَسْبِيحَ الطَّعَامِ وَهُوَ يُؤْكَلُ﴾ [بحاری، المناقب، باب علامات النبوة فی الإسلام: ۳۵۷۹] ”ہم (رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں) کھانے کی تسبیح سنتے تھے، جب کہ وہ کھایا جا رہا ہوتا تھا۔“ جمادات و نباتات کے سمجھ رکھنے، محبت اور بغض رکھنے اور تسبیح کے مزید واقعات کے لیے (دیکھیے سورہ بقرہ (۷۳)۔

﴿۳۳﴾ إِنَّكَ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا: اسی لیے وہ تمہاری سب گستاخیاں اور نافرمانیاں دیکھتا ہے، مگر قدرت رکھنے کے باوجود تم سے درگزر فرماتا ہے اور تم پر کوئی عذاب نہیں بھیجتا، بلکہ نہ تمہارا رزق بند کرتا ہے اور نہ تمہیں اپنی نعمتوں سے محروم کرتا ہے، اگر اس کا حد سے بڑھا ہوا یہ علم اور پردہ پوشی نہ ہوتی تو تمہارا کام کب کا تمام ہو چکا ہوتا۔ (دیکھیے سورہ نمل (۶۱) اور سورہ فاطر (۲۵)۔

وَ إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا ﴿۴۵﴾
 وَ جَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرًا وَ إِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي
 الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ آذَانِهِمْ نُفُورًا ﴿۴۶﴾

اور جب تو قرآن پڑھتا ہے ہم تیرے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ایک پوشیدہ پردہ بنا دیتے ہیں ﴿۴۵﴾ اور ہم نے ان کے دلوں پر کئی پردے بنا دیے ہیں، (اس سے) کہ وہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ۔ اور جب تو قرآن میں اپنے رب کا، اکیلے اسی کا ذکر کرتا ہے تو وہ بدکتے ہوئے اپنی بیٹھوں پر پھر جاتے ہیں ﴿۴۶﴾

آیت 45 46 ﴿۱﴾ وَ إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا "اَكِنَّةً" "بَيْنَكَ" کی جمع ہے، چھپانے والی چیز، پردہ۔ "وَقْرًا" بوجھ، مراد بہرا پن ہے۔ "نُفُورًا" "ناپُر" کی جمع ہے، بدکتے ہوئے۔ مصدر بھی ہو سکتا ہے، نفرت کی وجہ سے، یعنی جب انھوں نے آخرت سے انکار کیا اور پھر ضد اور ہٹ دھرمی میں اس قدر بڑھ گئے کہ ہزار سمجھانے کے باوجود انکار کرتے ہی چلے گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اور آپ ﷺ کے درمیان ایک گہرا پردہ حائل ہو گیا، ان کے دلوں پر غلاف چڑھ گئے، مگر ایسے جو کسی کو نظر نہیں آتے، نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اور ان کے کان ہر نصیحت کرنے والے کی بات سننے سے بہرے ہو گئے، مگر وہ بد بخت ان پردوں کے حائل ہونے اور قرآن کی تاثیر سے محروم ہونے پر فکر کے بجائے فخر ہی کرتے رہے اور مذاق اڑاتے رہے۔ یہود کا بھی یہی حال تھا۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۸۸) مشرکین کا حال اللہ تعالیٰ نے سورہ حم السجده (۵) میں بیان فرمایا ہے۔ اگرچہ اس پردے کا باعث ان کی اپنی ضد اور ہٹ دھرمی تھی مگر چونکہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے فرمایا کہ آپ کے قرآن پڑھتے وقت ہم یہ پردہ بنا دیتے ہیں۔

ایک معنی اس آیت کا یہ بھی ہے کہ آپ جب قرآن پڑھتے ہیں اور بعض کفار آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے آتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان کے درمیان ایک ایسا پردہ حائل کر دیتے ہیں جو نظر نہیں آتا، اس پردے کی وجہ سے وہ آپ کو دیکھ نہیں سکتے اور نہ آپ کو کوئی نقصان یا تکلیف ہی پہنچا سکتے ہیں۔ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب سورہ لہب اتری تو عوراء ام جمیل (ابولہب کی بیوی) بڑے جوش سے ہاتھ میں پتھر پکڑے ہوئے آئی اور وہ یہ کہہ رہی تھی: "مَذْمُومًا اُنَيْنَا، وَ اَمْرَةٌ عَصِيْنَا وَ دِيْنَةُ فَلَيْنَا" (ہم مذموم کو نہیں مانتے اور اس کے حکم کی اطاعت نہیں کرتے اور اس کے دین سے دشمنی رکھتے ہیں) رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ میں بیٹھے ہوئے تھے، ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! یہ عورت آرہی ہے، مجھے خوف ہے کہ یہ آپ کو دیکھ لے گی۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ مجھے ہرگز نہیں دیکھے گی" اور آپ نے اس سے بچنے کے لیے قرآن کی چند آیات پڑھیں، ان میں سے ایک آیت یہ بھی تھی: ﴿وَ إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا﴾ فرض وہ آئی اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑی ہو گئی، مگر اس نے رسول اللہ ﷺ کو

تَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَعُونَ بِهِ إِذْ يَسْتَعُونَ إِلَيْكَ وَ إِذْ هُمْ نَجْوَى إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ
 إِنَّ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا تَسْحُورًا ﴿۴۷﴾ أَنْظِرْ كَيْفَ صَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ
 سَبِيلًا ﴿۴۸﴾ وَقَالُوا إِذَا كُنَّا عِظَامًا وَ رُفَاتًا ؕ إِنَّا لَنَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ﴿۴۹﴾

ہم اس (نیت) کو زیادہ جاننے والے ہیں جس کے ساتھ وہ اسے غور سے سنتے ہیں، جب وہ تیری طرف کان لگاتے ہیں اور جب وہ سرگوشیاں کرتے ہیں، جب وہ عالم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ تم بیروی نہیں کرتے مگر ایسے آدمی کی جس پر جادو کیا گیا ہے ﴿۴۷﴾ دیکھ انھوں نے کس طرح تیرے لیے مثالیں بیان کیں۔ پس گمراہ ہو گئے، سو وہ کسی راہ پر نہیں آسکتے ﴿۴۸﴾ اور انھوں نے کہا کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم ضرور نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جانے والے ہیں ﴿۴۹﴾

نہیں دیکھا۔ مختصر یہ کہ ابوبکرؓ سے چند باتوں کے بعد وہ چلی گئی۔ [مسند ابی یعلیٰ : ۲۵۔ مستدرک حاکم : ۲/۳۶۱، ح : ۲۳۷۶] حاکم نے اسے صحیح کہا اور ذہبی نے ان کی موافقت فرمائی، اس کے کئی شواہد ہیں، ابن ووط کی ابن حبان (۶۵۱) پر تعلق ملاحظہ فرمائیں۔ بہر حال پہلا معنی اور دوسرا دونوں درست ہیں کہ آپ کے قرآن پڑھتے وقت اگر وہ پاس ہوتے ہیں تو قرآن سننے کے باوجود اس پردے کی وجہ سے جس طرح قرآن سننے کا حق ہے نہ اسے سن سکتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں اور نہ اثر قبول کرتے ہیں اور اگر وہ ایذا رسانی کی نیت سے آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس پردے کے ذریعے سے ان کی نگاہوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

﴿۴۷﴾ وَإِذَا ذُكِّرْتُمْ : اس آیت کی بہترین تفسیر سورہ زمر کی آیت (۳۵) ہے، اس کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 47 : تَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَعُونَ بِهِ : اللہ تعالیٰ اپنے کمال علم کا ذکر فرما رہے ہیں کہ ہمیں خوب علم ہے جس نیت سے یہ اکیلے اکیلے کان لگا کر آپ کی باتیں سنتے ہیں کہ آپ پر اعتراض کریں یا مذاق اڑائیں، پھر جب وہ آپس کی مجلس میں ان پر تہمرے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے آپ کو جادو زدہ قرار دیتے ہیں۔ اپنے علم کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے کیا ہے کہ ہم ان کی حرکتوں سے بے خبر نہیں کہ یہ ہماری گرفت سے بچ جائیں گے۔

آیت 48 : أَنْظِرْ كَيْفَ صَرَبُوا : یعنی ایک بات نہیں جو آپ کے بارے میں کہتے ہوں، بلکہ مختلف اوقات میں مختلف باتیں کہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ آپ جادوگر ہیں، کبھی کہتے ہیں کسی دوسرے نے آپ پر جادو کر دیا ہے، کبھی کہتے ہیں کہ آپ شاعر ہیں، کبھی کاہن اور کبھی مجنون (دیوانہ) کہتے ہیں۔ ان کی متضاد باتیں خود اس بات کی دلیل ہیں کہ انھیں حقیقت کا کچھ پتا نہیں، اس حال میں کیسے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ انھیں ہدایت کا صحیح راستہ مل سکے، یا مطلب یہ ہے کہ ان باتوں سے دوسروں کو ہدایت سے روکنے کے لیے کوئی راستہ نہیں پاتے۔ (قرطبی)

آیت 49 : وَقَالُوا إِذَا كُنَّا عِظَامًا وَ رُفَاتًا : "رُفَاتًا" "رَفَّتْ رِفَاتٌ" (ن، ض) سے "فُتَاتًا" کی طرح ہے، وہ

قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ۝ أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۚ فَسَيَقُولُونَ مَن يُعِيدُنَا ۗ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَ يَقُولُونَ مَتَى هُوَ ۗ قُلْ عَلَىٰ أَن يَكُونَ قَرِيبًا ۝ يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ ۚ وَ تَظُنُّونَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ۝

کہہ دے تم کسی قسم کے پتھر بن جاؤ، یا لوہا ۝ یا کوئی ایسی مخلوق جو تمہارے سینوں میں بڑی (معلوم) ہو۔ تو عنقریب وہ کہیں گے کون ہمیں دوبارہ پیدا کرے گا؟ کہہ دے وہی جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا، تو ضرور وہ تیری طرف اپنے سر تعجب سے ہلائیں گے اور کہیں گے یہ کب ہوگا؟ کہہ امید ہے کہ وہ قریب ہو ۝ جس دن وہ تمہیں بلائے گا تو تم اس کی تعریف کرتے ہوئے چلے آؤ گے اور سمجھو گے کہ تم نہیں رہے مگر تھوڑا ۝

چیز جو ریزہ ریزہ کر کے مٹی کی طرح کر دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی الوہیت اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے بعد قیامت پر کفار کے اعتراض کا ذکر کر کے اس کا جواب دیا۔

آیت 51-50 ① قُلْ كُونُوا حِجَارَةً مطلب یہ کہ مٹی میں تو پھر بھی نباتات کی صورت میں زندگی کے آثار نظر آ جاتے ہیں، تم کوئی ایسی چیز بن کر دیکھ لو جو کسی طرح بھی زندگی قبول نہ کر سکتی ہو، مثلاً پتھر، لوہا یا کوئی بھی مخلوق جس کا زندہ ہونا تمہارے دلوں میں ان سے بھی بڑی بات ہو، پھر بھی اللہ تعالیٰ تمہیں دوبارہ زندہ کر کے اٹھالے گا۔

② قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ : یعنی جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا وہی تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا، کیونکہ پہلی بار کسی چیز کا پیدا کرنا مشکل اور دوبارہ آسان ہوتا ہے، تو پھر اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ تمہیں دوبارہ زندگی دے۔ (دیکھیے روم: ۱۹) جبکہ اس کے لیے پہلی اور دوسری مرتبہ پیدا کرنا دونوں یکساں آسان ہیں۔

③ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ "أَنْغَضُ يُنْغِضُ" (افعال) کا معنی تعجب یا مذاق کے طور پر سر ہلانا ہے، یعنی لا جواب ہو کر پوچھیں گے، اچھا تو وہ قیامت کب ہوگی؟ آپ ان سے کہہ دیں کہ جب اس کا آنا یقینی ہے تو تمہارا یہ سوال بے کار ہے، جب اس نے آ کر ہی رہنا ہے تو چاہے وہ کتنی دور ہو اسے قریب ہی سمجھو اور اپنی نجات کی فکر کرو۔ اس کی مثال اس نالائق طالب علم کی ہے جسے معلوم ہو کہ امتحان لازماً ہونا ہے، مگر وہ اس کا ہونا اس لیے تسلیم نہ کرے یا اس کے لیے تیاری نہ کرے کہ اس کے متعقد ہونے کی تاریخ معلوم نہیں، یا اس لیے کہ وہ ابھی فوراً کیوں متعقد نہیں ہو رہا۔ ظاہر ہے یہ سراسر حماقت ہے۔

آیت 52 ① يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ : یعنی اس کے بلانے پر تم اس کے مطیع و فرماں بردار بن کر اور اس کی حمد کرتے ہوئے قبروں سے اٹھ آؤ گے۔ دنیا کی طرح کسی قسم کی سرکشی اور انکار کے بجائے اللہ کی حمد کرو گے اور اس کے سامنے مکمل اطاعت کا اظہار کر دو گے۔ (دیکھیے نمل: ۸۷) یا یہ مطلب ہے کہ تم اس کے بلانے پر حاضر ہو جاؤ گے۔ "بِحَمْدِهِ"

وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۗ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزِعُ بَيْنَهُمْ ۗ إِنَّ الشَّيْطَانَ
كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿۵۳﴾

اور میرے بندوں سے کہہ دے وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو، بے شک شیطان ان کے درمیان جھگڑا ڈالتا ہے۔ بے شک شیطان ہمیشہ سے انسان کا کھلا دشمن ہے ﴿۵۳﴾

کا معنی ”وَلِلَّهِ الْحَمْدُ“ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے بلانے پر تمہارا قبروں سے اٹھ کر حاضر ہو جانا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی خوبی ہے، جس پر صرف وہی مستحق حمد و ثنا ہے۔

﴿۵۳﴾ یَوْمَ يَذَّوُنُكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ یونس کی آیت (۴۵) کی تفسیر۔

آیت 53 وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ.....: ”نَزَعَ يَنْزِعُ“ (ف) کا معنی چوکا مارنا، فساد اور بگاڑ پیدا کرنا ہے۔ سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے جو عہد لینے کا ذکر فرمایا اس میں یہ حکم تھا: ﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ [البقرہ: ۸۳] ”اور لوگوں کے لیے اچھی بات کہو۔“ یہاں ہماری امت کو احسن یعنی سب سے اچھی بات کہنے کا حکم دیا۔ ”میرے بندوں“ سے مراد امت مسلمہ ہے، کیونکہ وہی اس کی غلامی اور بندگی کرنے والے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر نہیں فرمایا کہ کس سے احسن بات کہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلم ہو یا کافر، دوست ہو یا دشمن، ہر ایک سے ایسی بات کرنا لازم ہے جس سے بہتر بات آدمی نہ کہہ سکتا ہو۔ اس کے لیے لازماً اسے بولنے سے پہلے سوچنا ہوگا۔ ایک عالم نے کہا کہ میں نے جب بھی اپنی طرف سے اچھی سے اچھی بات کہی، پھر اس پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس سے بھی بہتر بات کہی جاسکتی تھی۔ یہاں احسن بات نہ کہنے کا نقصان بیان فرمایا کہ زبان سے ناہموار بات نکلنے پر شیطان آپس میں جھگڑا اور دشمنی ڈال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کا ایک دوسرے سے دلی بغض یا قطع تعلق سخت ناپسند ہے۔ بہت سی احادیث میں اس کی وعید موجود ہے۔ اسی طرح کافر سے احسن بات نہ کہنے کا نتیجہ اس کا اسلام سے مزید دوری ہوگا۔ اس لیے اس کی طرف سے برائی کا جواب بھی احسن طریقے سے دینا لازم ہے۔ دیکھیے سورہ مومنون (۹۶ تا ۹۸) جب کافر کی طرف سے برائی کا جواب احسن طریقے سے دینا لازم ہے تو پھر مسلمان کی طرف سے ہونے والی برائی کا دفاع احسن طریقے سے کرنا تو بالادولی لازم ہوگا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ احسن بات اور احسن رویے سے جواب کا فائدہ یہ ہوگا کہ دشمن بھی دلی دوست بن جائے گا۔ مگر یہ نعمت اسی کو ملتی ہے جو صبر کرے اور بڑا صاحب نصیب ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ وہ شیطان کی ہر اکساہٹ اور غصہ دلانے پر اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے گا اور غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے گا۔ دیکھیے سورہ حم السجدہ (۳۳ تا ۳۶) شیطان کی انسان سے کھلی عداوت کے ذکر کے لیے دیکھیے سورہ فاطر (۶)، اعراف (۱۱ تا ۲۷) اور سورہ بقرہ میں قصہ آدم و ابلیس۔ ہمیشہ سے دشمنی کا مفہوم ”گان“ سے ظاہر ہے اور آدم کو سجدہ نہ کرنے کے وقت کے لیے کر قیامت تک اس کی دشمنی کا دوام اس کا شاہد ہے۔

رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ ؕ إِنَّ يَشَأُ يَرْحَمَكُمْ أَوْ إِنَّ يَشَأُ يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَمَا أَرْسَلْنَا عَلَيْكُمْ
وَكَيْلًا ۝۵۴ وَ رَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّنَ عَلَى

بَعْضٍ وَ اتَيْنَا دَاوُدَ رُبُورًا ۝۵۵

تھارا رب تمہیں زیادہ جاننے والا ہے، اگر وہ چاہے تو تم پر رحم کرے، یا اگر چاہے تو تمہیں عذاب دے اور ہم نے تجھے ان پر کوئی ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا ۵۴ اور تیرا رب ان کو زیادہ جاننے والا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی ۵۵

آیت 54 : ① رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کو تمہارے متعلق علم اس سے بھی کہیں زیادہ ہے جتنا خود تمہیں اپنے متعلق ہے، اب اگر وہ چاہے تو تمہاری نامناسب باتوں اور کاموں کے باوجود اپنے فضل سے تم پر رحم فرمائے، چاہے تو تمہارے گناہوں کی پاداش میں اپنے عدل کی بنا پر عذاب دے۔ وہ ہر چیز کا مالک ہے، اپنی ملکیت کے ساتھ جو چاہے کرے، نہ اس میں کوئی ظلم ہے اور نہ کسی کو اس سے پوچھنے کی جرات ہے۔ دیکھیے سورہ انبیاء (۲۳)۔

② وَمَا أَرْسَلْنَا عَلَيْكُمْ وَكَيْلًا : ”وَكَيْلًا“ بمعنی ”الْمَوْكُولُ إِلَيْهِ“ ہے، یعنی جس کے سپرد کیا جائے، ذمہ دار بنایا جائے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ سے کوئی باز پرس نہیں، نہ آپ ان کے ذمہ دار ہیں، آپ کا کام پیغام پہنچانا ہے۔

آیت 55 : ① وَ رَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ : لوگوں کے احوال کا ان سے بڑھ کر علم رکھنے کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ زمین و آسمان میں موجود ہر شخص (انسان ہو یا جن یا فرشتہ) سے زیادہ اس کا علم رکھنے والا ہے۔ اس لیے وہ بہتر جانتا ہے کہ کس کو نبوت و رسالت کا شرف عطا کرنا ہے، فرمایا: ﴿اللَّهُ يَضْطَرِّفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾ [الحج: ۷۵] ”اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی۔“

② وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّنَ عَلَى بَعْضٍ : اس لیے اس کے کمال علم کا تقاضا ہے کہ وہ انبیاء و رسل میں سے جسے چاہتا ہے بعض پر فضیلت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے سب پر فضیلت عطا فرما کر آخری نبی بنا دیتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۲۵۳) اس کے نزدیک انتخاب کا معیار دنیا کی دولت یا حکومت نہیں۔ داؤد علیہ السلام بکریاں چرانے والے تھے، اللہ تعالیٰ نے نبی اور بادشاہ بنا دیا، پھر مزید فضیلت بخشی تو بطور فضیلت بادشاہی کے بجائے زبور عطا فرمانے کا ذکر کیا، کیونکہ اللہ کے ہاں فضیلت کا معیار دنیا کی کوئی چیز نہیں، بلکہ آخرت کا علم اور اس کے مطابق عمل ہے۔ دراصل یہ تقار کے اس اعتراض کا جواب ہے جو وہ عموماً رسول اللہ ﷺ پر کیا کرتے تھے کہ انھی کو رسالت کے لیے کیوں چنا گیا؟ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ زخرف (۳۵-۳۱)۔

③ وَ اتَيْنَا دَاوُدَ رُبُورًا : زبور کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے اور اس امت کے سب

قُلْ ادْعُوا الَّذِينَ رَعَيْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ﴿٥٦﴾
 أُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ
 وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۗ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴿٥٧﴾

کہہ پکارو ان کو جنہیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے ﴿٥٦﴾ وہ لوگ جنہیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے ﴿٥٧﴾

سے افضل ہونے پر زبور کے مضامین شہادت دے رہے ہیں۔ (دیکھیے انبیاء: ١٠٥) ہو سکتا ہے کہ کفار سے جہاد میں مشابہت کی وجہ سے داؤد علیہ السلام کا تذکرہ کر دیا ہو۔

④ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّنَ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ اور سورہ بقرہ (٢٥٣) میں یہ فرمان: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ صحیح بخاری (٣٣١٥) اور مسلم (٢٢٤٣) کی ان صحیح روایات کے منافی نہیں جن میں آپ ﷺ نے فرمایا: ”انبیاء کو آپس میں ایک دوسرے پر برتری (فضیلت) مت دو۔“ کیونکہ اس سے مراد محض اپنی خواہش یا تعصب کی بنا پر فضیلت دینا ہے، دلیل کی بنا پر فضیلت دینا نہیں، کیونکہ جب دلیل سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو اسے ماننا ضروری ہوتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ رسول انبیاء سے افضل ہیں۔

آیت 56 ﴿قُلْ ادْعُوا الَّذِينَ رَعَيْتُمْ...﴾: آلوسی نے فرمایا، زعم ظن (یعنی گمان) کے قریب ہے، کبھی جس بات میں شک ہو اس پر بھی ”زعم“ بولا جاتا ہے۔ بعض اوقات کذب (غلط بیانی) کے معنی میں بھی ہوتا ہے اور کبھی ثابت شدہ سچی بات پر بھی بول لیا جاتا ہے جس میں کوئی شک نہ ہو، جیسا کہ کئی احادیث میں ہے، ایسے تمام مقامات میں زعم کا معنی ”قَالَ“ ہوگا۔ زعم ان افعال میں سے ہے جو دو مفعولوں کی طرف متعدي ہوتے ہیں۔ یہاں دونوں مفعول محذوف ہیں، یعنی ”رَعَيْتُمْ“ ”رَعَيْتُمْ“ کہ ان لوگوں کو بلاؤ جنہیں تم نے معبود گمان کر رکھا ہے، یعنی فرشتے، جن، بزرگ، بت، غرض تمام وہ لوگ جن کی تم عبادت کرتے ہو اور مشکلات میں انہیں پکارتے ہو اور انہیں اپنے معبود گمان کرتے اور حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہو، انہیں پکارو۔

② ﴿فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا﴾: پس وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ تم سے ہٹا کر کسی اور کی طرف منتقل کر دینے کے مالک ہیں، پھر کیوں انہیں سجدہ کرتے اور مدد کے لیے پکارتے ہو؟ یہ مضمون اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر بیان فرمایا ہے، دیکھیے سورہ انعام (١٤، ٣٠، ٣١)، یونس (١٠٤) اور سورہ نمل (٦٢)۔

آیت 57 ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ...﴾: ”الْوَسِيلَةَ“ ”قُرْبُ“ (قریب ہونا) وسیلہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ مائدہ

وَإِنْ مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا ۗ

كَانَ ذَلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا ﴿۵۸﴾

اور کوئی بھی بستی نہیں مگر ہم قیامت کے دن سے پہلے اسے ہلاک کرنے والے ہیں، یا اسے عذاب دینے والے ہیں، بہت سخت عذاب۔ یہ (بات) ہمیشہ سے کتاب میں لکھی ہوئی ہے ﴿۵۸﴾

(۳۵) یعنی وہ تمام لوگ جنہیں یہ مشرک پکارتے ہیں، مثلاً فرشتے، انبیاء اور صلحاء وغیرہ وہ خود اپنے رب کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں، یعنی ان میں سے وہ جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ قرب رکھنے والے ہیں (وہ اس کا قرب مزید چاہتے ہیں) اور وہ اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، تو جب وہ سب لوگ جنہیں مشرکین مدد کے لیے پکارتے ہیں، وہ خود اللہ کے زیادہ سے زیادہ قرب کے متلاشی ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، تو پھر انہیں پکارنے کا اور ان سے مدد مانگنے کا کیا فائدہ۔ وہ جس کا قرب چاہتے اور جس کی رحمت کے امیدوار اور جس کے عذاب سے ڈرتے ہیں تم بھی اسی کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرو، اسی کی رحمت کی امید رکھو اور اسی کے عذاب سے ڈرو۔ افسوس کہ آج کل کے مسلمان بھی اولیاء و صلحاء امت، پیروں، بزرگوں اور شہیدوں کے متعلق وہی عقیدہ رکھتے اور اسی طرح ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں جو عقیدہ مشرکین اپنے بتوں کے متعلق رکھتے تھے اور جس طرح وہ اپنے بتوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر پکارتے تھے، یا یہ سمجھ کر انہیں پکارتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مشکل حل کروا سکتے ہیں۔ دیکھیے سورہ یونس (۱۸) اور سورہ زمر (۳) اور نام اس کا وسیلہ رکھتے ہیں، جب کہ حقیقی وسیلہ سے ان اعمال کا کوئی تعلق نہیں، یہ اعمال تو صریح شرک ہیں۔ قرآن و سنت میں مذکور وسیلہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کے ذریعے سے اس کا تقرب حاصل کرنا ہے۔

آیت 58 وَإِنْ مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا..... : ابن کثیر ذک اور کئی مفسرین نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں شروع سے لکھ دیا ہے کہ ہر بستی جو عظیم پر اتر آئے، قیامت سے پہلے یا تو ہم اسے ہلاک کر دینے والے ہیں کہ اس کے تمام رہنے والوں کو تباہ و برباد کر دیں، یا انہیں سخت عذاب دینے والے ہیں، یا بھی قتل و غارت کے ساتھ، یا دشمن کے حملے سے، یا جس مصیبت سے ہم چاہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ اقوام کا ذکر فرمایا، سورہ طلاق میں ہے: ﴿وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَمَتْ عَنْ أُمَّرِئِهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَعَذَّبْنَاهَا عَذَابًا ثَقِيرًا ﴿۱۰۸﴾ قَدْ أَقْبَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا ﴿۱۰۹﴾﴾ [الطلاق: ۱۰۸، ۱۰۹] ”اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرکشی کی تو ہم نے ان کا محاسبہ کیا، بہت سخت محاسبہ اور انہیں ایسی سزا دی جو دیکھنے سننے میں نہ آئی تھی۔ تو انہوں نے اپنے کام کا وبال چکھا اور ان کے کام کا انجام خسارہ تھا۔“ سورہ ہود میں ہے: ﴿وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقَرْيَةَ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ﴿۱۰۲﴾﴾ [ہود: ۱۰۲] ”اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے، جب وہ بستیوں کو اس حال میں پکڑتا ہے کہ وہ ظالم ہوتی ہیں، بلاشبہ اس کی پکڑ بڑی دردناک، نہایت سخت ہے۔“

وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلَّا أَنْ كَذَّبَ بِهَا الْأَوْلُونَ ۖ وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ
مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا ۗ وَ مَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا ﴿۵۹﴾

اور ہمیں کسی چیز نے نہیں روکا کہ ہم نشانیاں دے کر بھیجیں مگر اس بات نے کہ پہلے لوگوں نے انہیں جھٹلادیا اور ہم نے ثمود کو اونٹنی واضح نشانی کے طور پر دی تو انہوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم نشانیاں دے کر نہیں بھیجے مگر ڈرانے کے لیے ﴿۵۹﴾

دوسرے مفسرین نے اس کی تفسیر اور طرح سے کی ہے، ان میں صاحب روح المعانی بھی ہیں، وہ فرماتے ہیں ”وَإِنْ فَنِي فَكَلِمَةٍ“ (جو بھی ہستی ہے) سے مراد ظاہر ہے کہ عام ہے، کیونکہ ”ان“ نافیہ ہے اور ”من“ تمام ہستیوں کو شامل کرنے کے لیے ہے، خواہ مومنوں کی ہوں یا کفار کی اور مطلب یہ ہے کہ ہستیوں میں سے جو بھی ہستی ہے ہم قیامت سے پہلے اسے یا تو اس کے رہنے والوں کی طبعی موت کے ساتھ دیران کر دینے والے ہیں، یا اسے قتل اور مختلف مصائب کے ساتھ سخت عذاب دینے والے ہیں، نیکوں کے لیے ہلاکت اور بروں کے لیے عذاب۔

پہلی تفسیر زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد کفار اور ظالموں کی بستیاں ہیں، کیونکہ بہت سی آیات اس کی تائید کرتی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ﴾ [النقص: ۵۹] ”اور ہم کبھی ہستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں مگر اس صورت میں کہ اس کے رہنے والے ظالم ہوں۔“ اور فرمایا: ﴿ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غَافِلُونَ﴾ [الانعام: ۱۳۱] ”یہ اس لیے کہ بے شک تیرا رب کبھی ہستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں، جبکہ اس کے رہنے والے بے خبر ہوں۔“ اور فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصِلِحُونَ﴾ [مرد: ۱۱۷] ”اور تیرا رب ایسا نہ تھا کہ ہستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے، اس حال میں کہ اس کے رہنے والے اصلاح کرنے والے ہوں۔“ آیت سے مقصود کفار اور ظالموں کو ان کے انجام بد سے ڈرانا ہے کہ خواہ تم کتنے ہی امن سے رہتے ہو مگر ایک نہ ایک دن تم پر ہماری گرفت ضرور آنے والی ہے۔ آیت میں ان نشانیوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو قیامت سے پہلے رونما ہونے والی ہیں۔

آیت 59 ① وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلَّا أَنْ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ پر، جو آخری امت ہے، اپنے خاص فضل اور رحمت کا ذکر فرمایا ہے۔ اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے بہت سی چیزیں نشانی کے طور پر دکھانے کا مطالبہ کیا (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۰ تا ۹۳) مگر اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سنت رہی ہے کہ نشانی دکھانے کے بعد اگر کوئی قوم ایمان نہ لائے تو اسے عذاب کے ساتھ نیست و نابود کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ قوم ثمود کے مطالبے پر بطور نشانی اونٹنی دی گئی، انہوں نے اس پر ظلم کیا تو ”صَيْحَةً“ (چیخ) اور ”رَجْفَةً“ (زلزلے) سے تمام کفار ہلاک کر دیے گئے۔ ہمارے رسول ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی نشانی نہیں دی، تاکہ اس امت کے لیے ایمان لانے کی مہلت باقی رہے۔ اگر موجودہ کفار ایمان نہ لائیں تو ان

وَ إِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ ۗ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً ۗ لِلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ ۗ وَ نَحْوَهُمْ ۗ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا ﴿۵۰﴾

اور جب ہم نے تجھ سے کہا کہ بے شک تیرے رب نے لوگوں کا احاطہ کر رکھا ہے اور ہم نے وہ منظر جو تجھے دکھایا، نہیں بنایا مگر لوگوں کے لیے آزمائش اور وہ درخت بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے۔ اور ہم انھیں ڈراتے ہیں تو یہ انھیں بہت بڑی سرکشی کے سوا زیادہ نہیں کرتا ﴿۵۰﴾

کی اولاد میں سے لوگ ایمان لائیں۔ ہماری امت کو عطا ہونے والی نشانی میں دو وصف ہیں، جو پہلے کسی نبی کی نشانی میں نہیں تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ عنکبوت (۵۱، ۵۰)۔

﴿۵۱﴾ وَمَا تُرْسِلُ بِالآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا: یعنی عذاب سے ڈرانے کے لیے، کیونکہ اگر وہ نہیں ڈریں گے تو ان پر عذاب نازل ہو جائے گا۔

﴿۱﴾ 60 وَ إِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ: لوگوں سے مراد کفار مکہ ہیں اور ان کا احاطہ کر لینے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنا پورا زور لگانے کے باوجود محمد ﷺ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور نہ آپ کی دعوت کو پھیلنے سے روک سکے۔ اس سے مقصود آپ ﷺ کو حوصلہ دلانا ہے کہ آپ بے خوف و خطر اپنی دعوت پیش کرتے رہیے، ان لوگوں کی مخالفت کی کوئی پروا نہ کیجیے، یہ آپ کا بال تک بیک نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ سب پوری طرح ہماری گرفت میں ہیں۔

﴿۲﴾ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ: ”رُؤْيَا“ ”رَأَى“ (ف) کا مصدر ہے، آیت میں مذکور ”الرُّؤْيَا“ سے مراد زمین اور آسمانوں کی وہ عجیب و غریب چیزیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اسراء و معراج کی رات اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے اسراء و معراج کی رات جو کچھ دیکھا ہم نے اسے لوگوں کے لیے فتنہ اور آزمائش ہی بنایا، تاکہ آزمائش ہو جائے کہ کون قوی ایمان والا اور سلیم القلب ہے اور کون ضعیف ایمان والا اور مریض القلب۔ سو مضبوط ایمان والوں کو اسے ماننے میں کوئی تردد نہیں ہوا، چنانچہ وہ امتحان میں کامیاب ہو گئے اور کمزور ایمان والے اور ایمان سے محروم لوگ کہنے لگے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ ایک ہی رات میں مکہ سے بیت المقدس اور ساتوں آسمانوں کے عجائبات دیکھ کر واپس بھی آجائیں؟ یہ ناممکن ہے۔ سو وہ امتحان میں ناکام ہو گئے۔

﴿۳﴾ ”الرُّؤْيَا“ کا لفظ اکثر خواب میں دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی آنکھوں سے دیکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں بیداری میں آنکھوں سے دیکھنا مراد ہے اور اس کی دلیل خود یہ آیت ہے۔ کیونکہ اگر آپ ﷺ کہتے کہ میں نے یہ سب کچھ خواب میں دیکھا ہے تو نہ کسی کو تعجب ہوتا اور نہ کوئی فتنہ و امتحان ہوتا، کیونکہ خواب میں ہر شخص کو ناممکن و محال چیزیں دکھائی دے سکتی ہیں۔ امتحان یہی تھا کہ صرف مضبوط اہل ایمان تسلیم کر سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو یہ سب کچھ رات کے ایک تھوڑے سے حصے میں دکھانے پر قادر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تصریح فرمائی: «جِيءَ رُؤْيَا عَيْنِ أَرْبَعًا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى

وَاذُقْنَا لِلْمَلِكَةِ اسْجُدُوا لِادَمَ فَسَجَدُوا اِلَّا اِبْلِيسَ ؕ قَالَ ؕ اَسْجُدْ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ۗ قَالَ اَرَايْتَكَ هَذَا الَّذِي كَرَّمْت عَلَيَّ لَمَّا اَخْرَجْتَنِي اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَاحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَكَ اِلَّا قَلِيلاً ۗ ﴿۶۱﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، اس نے کہا کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ﴿۶۱﴾ اس نے کہا کیا تو نے دیکھا، یہ شخص جسے تو نے مجھ پر عزت بخشی، یقیناً اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں بہت تھوڑے لوگوں کے سوا اس کی اولاد کو ہر صورت جڑ سے اکھاڑ دوں گا ﴿۶۱﴾

اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ أُسْرِي بِهِ اِلَى بَيْتِ الْمَقْدِسِ ((بخاری، المنقب، باب المعراج.....: ۳۸۸۸) ”یہ آنکھوں سے دیکھا ہوا منظر تھا جو رسول اللہ ﷺ کو اس رات دکھایا گیا جب آپ کو راتوں رات بیت المقدس لے جایا گیا۔“

۴ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ: ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو اس سے پہلے فائدے میں بیان ہوئی اس میں انھوں نے اس کی تفسیر زقوم کے درخت سے کی ہے۔ قرآن مجید میں ”شَجَرَتِ الزَّقْوِمِ“ کا ذکر دو مقامات پر آیا ہے، سورہ صافات (۶۲) اور سورہ دخان (۲۳-۲۶) میں۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر لوگوں کے لیے آزمائش کے طور پر کیا گیا، کیونکہ ایمان سے محروم لوگ مان ہی نہیں سکتے کہ بھڑکتی ہوئی آگ کی تہ میں کوئی درخت اگ سکتا ہے، اس کے برعکس اہل ایمان کو اسے ماننے میں کوئی تردد نہیں ہوتا، کیونکہ ان کا ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ، جبریل امین اور رب العالمین کبھی غلط بیانی نہیں کرتے اور آگ میں درخت پیدا کرنا، یا ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ کو ٹھنڈی اور سلامتی والی بنا دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ یہاں زقوم کو شجرہ ملعونہ کہا گیا ہے، اس کا معنی شجرہ مذمومہ ہے، یعنی قرآن میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔

۵ وَنَحْنُ فَهُمْ ﴿۶۱﴾ فَمَا يَزِيدُهُمْ... یعنی ہم کفار کو مختلف طریقوں سے ڈراتے ہیں، مگر اس سے انھیں بہت بڑی سرکشی میں اضافے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

بیت 61 ﴿۶۱﴾ وَاذُقْنَا لِلْمَلِكَةِ اسْجُدُوا لِادَمَ فَسَجَدُوا اِلَّا اِبْلِيسَ : مہاشی رحمت نے فرمایا کہ اس آیت میں اشارہ ہے کہ گزشتہ آیت میں مذکور کفار کی سرکشی کی اصل وجہ شیطان کی بیروی ہے، کیونکہ وہ بھی تکبر اور سرکشی ہی کی وجہ سے زائدہ درگاہ ہوا تھا، اس لیے آگے اس کے آدم علیہ السلام کو بہکانے کا ذکر فرمایا۔

۲ فَسَجَدُوا اِلَّا اِبْلِيسَ.....: اس سجدے کی حقیقت اور ابلیس کے بہتر ہونے کے دعوے کے متعلق دیکھیے سورہ بقرہ (۳۳)، سورہ اعراف (۱۱) اور اس کے بعد کی آیات۔ ”طِينًا“ اصل میں ”مِنْ طِينٍ“ تھا، ”مِنْ“ حذف ہونے کی وجہ سے منصوب ہو گیا۔

بیت 62 ﴿۶۲﴾ قَالَ اَرَايْتَكَ هَذَا الَّذِي كَرَّمْت عَلَيَّ...: ”اَرَايْتَكَ“ اصل ”اَرَأَيْتَ“ ہی ہے، کاف حرف خطاب ہے، جو مخاطب کے مطابق بدلتا رہتا ہے، مثلاً مخاطب واحد مذکر ہو تو ”اَرَأَيْتَكَ“، تشبیہ مذکر ہو تو ”اَرَأَيْتَكُمَا“ اور جمع مذکر ہو تو ”اَرَأَيْتَكُمْ“، معنی سب کا یہی ہے کہ ”کیا تو نے دیکھا“ مگر مراد ہوتی ہے ”اُخْبِرْنِي“ یعنی ”مجھے بتا۔“ ”لَاخْتَنِكَنَّ“ یہ اصل

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاؤُكُمْ جَزَاءً نُّوْفُوْرًا ۝۳۱ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْكَ وَرَجُلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَاْلْاَوْلَادِ وَاَعِدْهُمْ وَا مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۳۲

فرمایا جا، پھر ان میں سے جو تیرے پیچھے چلے گا تو بے شک جہنم تمہاری جزا ہے، پوری جزا ۳۱ اور ان میں سے جس کو تو اپنی آواز کے ساتھ بہکا سکے بہکا لے اور اپنے سوار اور اپنے پیادے ان پر چڑھا کر لے آ اور اموال اور اولاد میں ان کا حصہ دار بن اور انہیں وعدے دے اور شیطان دھوکا دینے کے سوا انہیں وعدہ نہیں دیتا ۳۲

میں ”خَنَكٌ“ سے مشتق ہے جس کا معنی جڑا ہے۔ عرب کہتے ہیں ”خَنَكُ الْفَرَسِ اُخْنَكُهُ“ (باب ضرب و نصر) ”وَ اُخْتَنَكُهُ“ میں نے گھوڑے کے (نچلے) جڑے میں رسی باندھی اور اسے اپنے پیچھے چلایا۔ مراد یہ ہے کہ میں اس کی اولاد کو لگام کی طرح جڑے میں رسی باندھ کر اپنے پیچھے چلاؤں گا۔ مگر یہ لفظ دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے ”لَا سْتَوِيْلِيْنَ“ ”میں ضرور ان پر غالب ہوں گا“ اور ”لَا سْتَأْصِلُنَّ“ جو ”اِسْتَأْصَلَتِ السَّنَةُ اَمْوَالَهُمْ“ سے اخذ کیا گیا ہے، یعنی قحط نے ان کے اموال کو جڑے سے اکھاڑ پھینکا، ہلاک کر دیا۔

② یعنی نہایت جرأت و تکبر سے اللہ تعالیٰ سے کہنے لگا کہ مجھے بتا کہ یہ شخص جسے تو نے مجھ پر عزت بخشی، یعنی جب بہتر میں ہوں تو تو نے اسے مجھ پر عزت کیوں بخشی؟! اس میں آدم علیہ السلام پر حسد کا اظہار بھی ہے، اللہ کے فرمان کے مقابلے میں اپنے عقلی ڈھکوسلے تیا س سے تعمیل حکم کا انکار بھی اور تکبر و سرکشی کا اظہار بھی اور ان میں سے کوئی بات بھی اللہ تعالیٰ کو گوارا نہیں۔

③ لٰكِن اٰخِزْتَنِيْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ : اس کی تفصیل سورہ اعراف کی آیات (۱۳ تا ۱۷) میں دیکھیں۔ ”اِلَّا قَلِيْلًا“ سے مراد اللہ کے مخلص بندے ہیں۔

آیت 63 قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ : شیطان کی درخواست قبول ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ نافرمان کی دعا بھی قبول کر لیتا ہے اور اس بات کی بھی کہ دعا کی قبولیت اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی علامت نہیں، بلکہ بعض اوقات وہ ناراضگی کی وجہ سے دعا قبول کر لیتا ہے، مثلاً حرام کمائی اور عشق و بدکاری میں کامیابی کی دعا قبول ہونا رضائے الہی کی دلیل نہیں، بلکہ اس کے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔

آیت 64 ① وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ : ”استَفْزِزْ“ ”فَزَّ“ سے مشتق ہے جس کا معنی ہلکا و خفیف ہے۔ ”رَجُلٌ فَرَّ اَىْ خَفِيْفٌ“ ہلکا آدمی، یعنی تو جسے اپنی آواز سے ہلکا اور بے وقعت بنا سکے بنا لے۔ شاہ رفیع الدین فرماتے تھے ”ترجمہ کیا ہے“ اور بہکا جس کو بہکا سکے“ کیونکہ آواز ہلکا اور بے قدر و قیمت ہو کر ہی بہکتا ہے۔

② بِصَوْتِكَ : شیطان کی آواز سے مراد ہر وہ آواز ہے جو اللہ کی نافرمانی کی دعوت دے، اس میں گانا بجانا، بدکاری اور ہر کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۚ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَ كَيْلًا ﴿۱۵﴾

بے شک میرے بندے، تیرا ان پر کوئی غلبہ نہیں اور تیرا رب کافی کارساز ہے ﴿۱۵﴾

برے کام کی دعوت اور تریغیب شامل ہے۔

﴿۱۵﴾ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ : جلب کھینچ کر لانے کو کہتے ہیں اور اس شور کو بھی جس سے گھوڑے کو تیز دوڑانا مقصود ہو۔ ”تخیل“

گھوڑوں کی جماعت کو کہتے ہیں اور گھڑ سواروں کی جماعت کو بھی۔ ”زجل“ ”زاجل“ کی جمع ہے، پیادے۔

﴿۱۶﴾ وَ شَاذِكُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ : اموال میں شیطان کی شراکت یہ ہے کہ حرام طریقے سے کمایا جائے، یا حرام کاموں

میں خرچ کیا جائے، مثلاً سود، رشوت، چوری ڈاکے اور دھوکے وغیرہ سے مال کمایا جائے اور اسے غیر اللہ کے نام پر یا بدکاری و

بے حیائی اور نافرمانی کے کاموں میں خرچ کیا جائے۔ اولاد میں شراکت یہ ہے کہ شیطان انھیں دین حنیف کی تعلیمات کے

خلاف پرورش دلانے میں کامیاب ہو جائے، ان کے لیے زنا اور اللہ کی نافرمانی کے مواقع میسر کر دے، انھیں اپنے سلف صالحین

سے متفر کر دے، میاں بیوی کی صحبت کے وقت دونوں کو شیطان سے بچانے کی دعا مانگنا فراموش کروادے، تاکہ پیدا ہونے

والی اولاد میں اس کا حصہ ہو جائے، یا ان کے نام ایسے رکھوادے جن سے ظاہر ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور نے عطا کیے ہیں۔

مشرکین عرب اپنی اولاد کے نام عبدالعزیز، عبدمنش اور عبدوڈ وغیرہ رکھتے تھے۔ ہمارے زمانے میں رسول بخش، حسین بخش،

بیر بخش، غلام جیلانی اور بیراں دت وغیرہ مشرکانہ نام رکھے جاتے ہیں۔ مزید وہ آیات جن میں مذکور اشیاء میں شیطان کی

مشارکت کا ذکر ہے وہ یہ ہیں سورۃ النعام (۱۳۶، ۱۳۸) اور سورۃ یونس (۵۴)۔

﴿۱۷﴾ وَعٰذُهُمْ : یعنی انھیں جھوٹے وعدے دلا، مثلاً یہ کہ اگر شرک کرو گے تو یہ فائدہ ہوگا، سودی کاروبار سے یہ نفع ہوگا اور یہ

کہ دنیا میں تمھیں مال و دولت ملی ہے، آخرت میں بھی ملے گی اور یہ کہ ابھی بہت وقت ہے عیش کر لو، پھر توبہ کر لینا وغیرہ۔ ان

آیات میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پانچ حکم دیے ہیں: ”اذْهَبْ“ ”اسْتَفْزِزْ“ ”اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ“ ”شَاذِكُمْ“ اور ”عٰذُهُمْ“

یہ تمام احکام تہدید، یعنی ڈانٹنے کے لیے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ﴾ [حکم السجدة: ۷۰] ”جو چاہو کرو۔“ یہ

احکام تعمیل کے لیے نہیں ہیں، کیونکہ یہ سب گناہ ہیں اور اللہ تعالیٰ گناہ کا حکم نہیں دیتا۔

﴿۱۸﴾ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ إِلَّا غُرُورًا : یعنی شیطان کے سب وعدے محض دھوکا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مفہوم کئی اور مقامات پر

بھی بیان فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۃ نساء (۱۲۰)، حدید (۱۳) اور ابراہیم (۲۲) اس سے پہلے شیطان کو مخاطب کر کے بات ہو رہی

تھی، یہاں شیطان کو غائب کے صیغے سے ذکر کیا، یہ التفات شیطان کی تحقیر کے لیے ہے۔

آیت 65 إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ : اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کلام کو سچے ایمان والوں کے اطمینان

کے لیے اس بات پر ختم کیا کہ میرے خاص بندوں پر تو غالب نہیں آسکے گا، کیونکہ انھوں نے اپنا سب کچھ اپنے رب کے سپرد

کر دیا ہے اور رب تعالیٰ بہت کافی وکیل ہے۔ مزید دیکھیے سورۃ حجر (۴۲، ۴۳) اور سورۃ نحل (۹۸، ۱۰۰)۔

رَبِّكُمْ الَّذِي يُرِيحِي لَكُمْ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لَتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۗ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿۶۶﴾
 وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِلَآئَنَا ۗ فَلَمَّا جَعَلْنَا إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۗ
 وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا ﴿۶۷﴾

تھارا رب وہی ہے جو تمہارے لیے سمندر میں کشتیاں چلاتا ہے، تاکہ تم اس کا کچھ نہ کچھ فضل تلاش کرو۔ یقیناً وہ ہمیشہ سے تم پر بے حد مہربان ہے ﴿۶۶﴾ اور جب تمہیں سمندر میں تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے سوا تم جنہیں پکارتے ہو گم ہو جاتے ہیں، پھر جب وہ تمہیں بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو تم منہ پھیر لیتے ہو اور انسان ہمیشہ سے بہت ناشکرا ہے ﴿۶۷﴾

آیت 66 ﴿۶۶﴾ رَبِّكُمْ الَّذِي يُرِيحِي لَكُمْ : ”أُرِيحِي إِزْجَاءً“ کا معنی آہستہ آہستہ چلانا ہے۔ ”أُرِيحِي فَلَانَ الْإِبِلَ“ فلاں نے اونٹوں کو آہستہ آہستہ ہانکا۔ بادلوں کو آہستہ آہستہ چلانے کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (دیکھیے نور: ۴۳) ”الْفُلْكَ“ واحد، جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لیے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے، بہت بڑی کشتی یعنی بحری جہاز۔ ”مِنْ فَضْلِهِ“ قرآن مجید میں روزی کو اکثر فضل فرمایا ہے، کیونکہ دنیا میں جو بھی نعمتیں انسان کو میسر ہیں، یا آخرت میں عطا ہوں گی، وہ محض اللہ کا فضل ہیں، کسی کا اللہ پر کوئی حق واجب نہیں اور اگر کہیں بندوں کا حق کہا گیا ہے تو وہ بھی اللہ ہی کا فضل ہے کہ اس نے اسے اپنے ذمے لازم فرمایا۔

زمین کا تقریباً ستر فیصد حصہ سمندر ہے، اس میں انسان کے کھانے پینے اور استعمال کے لیے بے حساب رزق موجود ہے۔ سمندر کے پانی میں ہزاروں ٹن وزنی جہاز اٹھانے کی صلاحیت اور صرف ہوا کے ذریعے سے جہازوں کو کیڑوں ہزاروں میل دھکیل کر لے جانا صرف اللہ تعالیٰ کے مسخر کرنے کی وجہ سے ہے۔ اب اس کا مزید فضل ہوا تو انجن ایجاد ہو گئے، جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ [النحل: ۸] (اور وہ پیدا کرے گا جو تم نہیں جانتے) میں فرمایا ہے۔ اس میں مسلمانوں کو سمندر کے بے شمار منافع، مثلاً نہایت آسان اور کم خرچ ذریعے سے تعلیم، تجارت اور دوسرے مقاصد کے لیے سفر کی سہولت، گوشت، زینت کی اشیاء، معدنیات، گیس اور تیل وغیرہ حاصل کرنے کی ترغیب بھی ہے، جن سے کفار فائدہ اٹھا رہے ہیں، کیونکہ سمندروں پر ان کا غلبہ ہے اور ظاہر ہے تیس فیصد خشکی پر بھی وہی غالب ہو گا جو ستر فیصد سمندر پر غالب ہے اور امت مسلمہ بری و بحری جہاد چھوڑنے کی وجہ سے دین و دنیا دونوں میں پیچھے رہنے پر قانع ہو چکی ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو نشانہ بازی، شہ سواری اور حیراکی سیکھنے کی بہت ترغیب دلائی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سلسلہ صحیحہ (۱/۲۴۵، ج: ۳۱۵) اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی بعثت کا مقصد ہی اسلام کو تمام دنیا کے ادیان پر غالب کرنا بیان فرمایا۔

﴿۶۶﴾ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا: سمندر میں جہازوں کو چلانے کی پہلی وجہ اللہ کے فضل کی تلاش بیان فرمائی، یہ دوسری وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ہمیشہ سے بے حد مہربان ہے۔ ہمیشہ کا مفہوم ”مُحَانٌ“ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ طحاوی کے الفاظ ہیں: ”وَلِأَنَّهُ سُبْحَانَهُ سَمَانٌ أَوْلًا وَ أَوَّلًا بِكُمْ ذَاتِمْ الرَّحْمَةِ وَالرَّأْفَةِ“ ”کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اپنے بندوں کے ساتھ نرمی و رحمت کرنے والا ہے۔“

آیت 67 ﴿۶۷﴾ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ : زمانہ جاہلیت اور زمانہ نبوت کے کفار کی بت پرستی کے باوجود ان کی فطرت

أَفَأَنْتُمْ أَنْ يَخْفَى بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ
وَكِيلًا ﴿٦٨﴾ أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرَى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ
الزَّيْجِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا ﴿٦٩﴾

تو کیا تم بے خوف ہو گئے کہ وہ تمہیں خشکی کے کنارے دھنسا دے، یا تم پر کوئی پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیج دے، پھر تم اپنے لیے کوئی کارساز نہ پاؤ ﴿۶۸﴾ یا تم بے خوف ہو گئے کہ وہ تمہیں دوسری بار اس میں پھر لے جائے، پھر تم پر توڑ دینے والی آندھی بھیج دے، پس تمہیں غرق کر دے، اس کی وجہ سے جو تم نے کفر کیا، پھر تم اپنے لیے ہمارے خلاف اس کے بارے میں کوئی پیچھا کرنے والا نہ پاؤ ﴿۶۹﴾

میں رکھی گئی توحید کا ذکر بطور دلیل ہو رہا ہے کہ جب سمندر میں طوفان آتا ہے تو پہاڑوں جیسی موجوں میں جہاز گھر جاتا ہے اور موت صاف نظر آنے لگتی ہے تو تم اپنے تمام خداؤں، داتاؤں، مشکل کشاؤں اور حاجت رواؤں کو بھول کر اپنی فطرت میں رکھی ہوئی توحید کی وجہ سے صرف ایک اللہ کو پکارتے ہو، پھر جب وہ تمہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہو، جیسے اپنے رب سے تمہاری کوئی آشنائی ہی نہ تھی اور پھر اپنے خود ساختہ خداؤں کو پکارنے لگتے ہو اور انھی کا احسان ماننے لگتے ہو۔ کس قدر احسان ناشناسی اور ناشکری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مشرک انسان ہمیشہ سے بے حد ناشکرار ہا ہے۔ "الْإِنْسَانُ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے اس سے مراد کفار ہیں، کیونکہ مؤمن شکر گزار ہوتے ہیں، اگرچہ ان کی تعداد کم ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَكَلَيْلٌ فِىنْ عِبَادِىَ الشَّاكِرِينَ﴾ [سبا: ۱۳] "اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے پورے شکر گزار ہیں۔" کفار کا یہ رویہ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر ذکر فرمایا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یونس (۲۲، ۲۳)، عنکبوت (۶۵)، لقمان (۳۲) اور زمر (۸) یہ تو زمانہ جاہلیت کے ان لوگوں کا حال تھا جو مشرک تھے اور اللہ اور رسول نے انہیں مشرک قرار دیا، حالانکہ وہ سخت مصیبت میں صرف اللہ کو پکارتے تھے، مگر ہمارے زمانے کے بعض مسلمان کہلانے والوں کا کمال یہ ہے کہ وہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی اللہ کے ساتھ یا اللہ کے علاوہ دوسروں کو مدد کے لیے پکارنا نہیں بھولتے، پھر بھی نہ ان کی توحید میں کوئی خلل آتا ہے، نہ اسلام کا کچھ بگڑتا ہے۔

آیت 68، 69: أَفَأَنْتُمْ أَنْ يَخْفَى بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ: "خَسَفٌ" کا معنی زمین میں دھنسا دینا ہے۔ "جَانِبَ الْبَرِّ" خشکی کا کنارہ، یہ اس لیے فرمایا کہ زمین میں پانی کا کنارہ خشکی اور خشکی کا کنارہ پانی ہے۔ "حَاصِبًا" نگریزے اڑانے والی آندھی، یا وہ بادل جس سے اولے برسیں۔ "قَاصِفًا" "صَرَبٌ" سے اسم فاعل ہے، درختوں، کشتیوں اور ہر چیز کو توڑ دینے والی آندھی۔ "تَبِيعًا" قرض یا انتقام کا مطالبہ کرنے والا جو پیچھا نہ چھوڑے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی نادانی اور کم عقلی بیان فرمائی ہے کہ تم جب خشکی پر پہنچ جاتے ہو تو اللہ کے عذاب اور

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ
عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ﴿۷۰﴾

ع
۷۰

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے آدم کی اولاد کو بہت عزت بخشی اور انہیں خشکی اور سمندر میں سوار کیا اور انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے جو مخلوق پیدا کی اس میں سے بہت سوں پر انہیں فضیلت دی، بڑی فضیلت دینا ﴿۷۰﴾

اس کی گرفت سے بے خوف ہو کر دوبارہ کفر و شرک میں مبتلا ہو جاتے ہو، کیا تمہیں اس بات کا کوئی خوف نہیں آرہا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ پانی میں ڈبو سکتا ہے تو خشک زمین میں بھی دھنسا سکتا ہے؟ اس کا حکم ہو تو پانی کی طرح زمین تمہیں نگل لے، یا وہ پتھر اڑا کر لانے والی تند و تیز آندھی بھیج کر تمہیں ہلاک کر دے، پھر تمہیں کوئی مددگار نہیں ملے گا۔ یا تمہیں یہ بھی خوف نہیں رہا کہ تمہیں اللہ کی طرف سے پھر کبھی سمندری سفر پیش آجائے اور وہ تمہاری ناشکری کی سزا کے لیے ہر چیز کو توڑ دینے والی طوفانی ہوا کے ذریعے سے تمہیں غرق کر دے؟ پھر تمہیں کوئی ایسی ہستی نہیں ملے گی جو اللہ تعالیٰ سے انتقام کا مطالبہ اور پیچھا کرے۔ معلوم ہوا کہ انسان کو کسی آزمائش سے نجات کے بعد دوبارہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر اور دوبارہ گرفت سے بے پروا ہو کر گز نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ سراسر خسارے کی بات ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ؟ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ﴾ [الأعراف: ۹۹] ”پھر کیا وہ اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں، تو اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو خسارہ اٹھانے والے ہیں۔“ ان آیات میں مذکور معنی اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر واضح فرمایا ہے، دیکھیے سب (۹)، انعام (۶۵) اور سورہ ملک (۱۶، ۱۷) ”فَمَنْ لَّا يَرْجُ وَاللَّكُمُ عَلَيْنَا يَا تَبِيعًا“ کی ہم معنی آیت سورہ شمس (۱۳، ۱۵) میں دیکھیے۔

آیت 70 ﴿۷۰﴾ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو بے شمار نعمتوں کے ساتھ عزت بخشی کہ ان کے جدا جدا اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا فرمایا، جب کہ دوسری ساری مخلوق کو کلہ ”کُنْ“ سے پیدا فرمایا، پھر انہیں سیدھا قد عطا فرمایا، ہاتھوں سے کھانے کا طریقہ سکھایا، احسن تقویم (بہترین شکل و صورت) میں پیدا کیا، عقل و اختیار سے نوازا، لکھ کر اپنا علم اور تجربہ اگلی نسل کو منتقل کرنا سکھایا، ہر لمحہ نئی سے نئی ایجاد کی لیاقت بخشی۔ زمین کی ہر چیز اور ہر جانور کو اپنے کام میں لانے کا سلیقہ بخشا۔ سمندر میں جہازوں پر، زمین میں سواریوں پر اور فضا میں طیاروں پر (جن کا ذکر سورہ نحل: ۸ تا ۱۵ میں ہے) سوار کیا۔

﴿۷۱﴾ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ: ”الرِّزْقُ مَا يُنْتَفَعُ بِهِ“ (قاموس) رزق کا معنی ہے وہ چیزیں جن سے فائدہ اٹھایا جائے، مثلاً کھانا پینا، میاں بیوی کا تعلق، لباس اور مکان وغیرہ۔ ”الطَّيِّبَاتِ“ ”الْحَلَالُ وَالْأَفْضَلُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ“ (قاموس) طیب کا معنی ہے ہر چیز میں سے جو حلال اور سب سے بہتر ہو۔ یعنی ان کے فائدے کی ہر حلال، لذیذ اور بہترین چیز عطا فرمائی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی فطرت مسخ ہو جائے اور وہ طیب کے بجائے خبیث سے فائدہ اٹھانے لگیں، مثلاً مردار، خنزیر وغیرہ کھانے لگ جائیں، نکاح کے بجائے زنا یا قوم لوط کے عمل کا ارتکاب کرنے لگیں اور اپنے حق کے بجائے دوسروں کا حق استعمال کرنے لگیں، بہر حال اللہ تعالیٰ نے طیبات عطا کرنے میں کمی نہیں فرمائی۔

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ قَاوَلِكَ يَفْرَعُونَ كِتَابَهُمْ

وَلَا يُظْلَمُونَ فِتْنًا ۝۱

جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے، پھر جسے اس کی کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دی گئی تو یہ لوگ اپنی کتاب پڑھیں گے اور ان پر کھجور کی گھنٹی کے دھاگے برابر (بھی) ظلم نہ ہوگا ۝۱

۝۱ وَقَضَّيْنَاهُمْ عَلَىٰ سَخِيرٍ مِّنْ حَاقِقَاتٍ تَفْضِيلًا: اوپر تکریم میں ذکر کردہ اشیاء اور بنی آدم کی اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی بہت سی مخلوق پر بہت بڑی برتری عطا فرمائی۔ اپنی بہت سی مخلوق پر برتری عطا فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی ایسی مخلوق بھی ہے جس پر انسان کو برتری عطا نہیں ہوئی۔ بعض نے فرشتوں کو وہ مخلوق قرار دیا، بعض اہل علم نے بعض انسانوں کو بعض فرشتوں سے اور بعض فرشتوں کو بعض انسانوں سے افضل قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَنَا سَيِّدٌ وَوَلَدُ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ» [ترمذی، المنقب، باب سلوا اللہ لی الوسیلة: ۳۶۱۵] "میں روز قیامت تمام اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور کوئی فخر نہیں۔" حقیقت یہ ہے کہ انسان کا علم بہت ہی تھوڑا ہے۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۸۵) اس لیے ایسے معاملات میں خاموشی ہی باعث عافیت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی ساری مخلوق کا علم عطا نہیں فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام کو کیا خبر تھی کہ کوئی خضر بھی ہے اور ہمیں کیا معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کون کون سی ہے، فرمایا: ﴿وَمَا يَعْلَمُ جُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ﴾ [المدثر: ۳۱] "اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" اس لیے بات اپنی حیثیت کے مطابق سوچ سمجھ کر کرنا لازم ہے۔

آیت 71 ۝۱ يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ: امام کا معنی پیشوا بھی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاَجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ اِمَامًا﴾ [الفرقان: ۷۴] "اور ہمیں متقی لوگوں کا پیشوا بنا۔" دوسرا معنی کتاب ہے، فرمایا: ﴿وَكُلَّ شَيْءٍ اَخَصَيْنَاهُ فِيْ اِمَامٍ مُّبِينٍ﴾ [نہل: ۱۲] "اور ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں محفوظ کر رکھا ہے۔" پہلا معنی مراد ہو تو اہل ایمان کے امام انبیاء علیہم السلام ہوں گے اور کفار و مشرکین کے امام ان کے باطل سردار ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَاهُمْ اٰيَةً يَّذْعُونُ اِلَى النَّارِ﴾ [الفصص: ۴۱] "اور ہم نے انہیں ایسے سردار بنایا جو آگ کی طرف دعوت دیتے تھے۔" وہ لوگ جنہوں نے کتاب و سنت کے سوا کسی کی پیروی نہیں کی وہ اپنے امام محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بلائے جائیں گے اور ان سے بڑھ کر کون خوش نصیب ہو سکتا ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھی ہوں اور جنہوں نے کتاب و سنت کو چھوڑ کر کسی اور کی پیروی کی ہوگی، نیک ہو یا بد، وہ ان کے ساتھ بلائے جائیں گے، مگر وہ سب اپنے پیروکاروں سے صاف بری ہو جائیں گے، حتیٰ کہ شیطان بھی اپنے پیروکاروں سے بری ہونے کا اعلان کر دے گا۔ (دیکھیے ابراہیم: ۲۲) وہ نیک امہ اور بزرگ جو زندگی میں اپنی تقلید سے منع کرتے رہے اور کتاب و سنت کی پیروی کی تاکید کرتے رہے، وہ بھی اپنے ان جھوٹے پیروکاروں سے بالکل بری ہو جائیں گے، جنہوں نے اپنے اماموں کی بات مانی نہ کتاب و سنت پر عمل کیا۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۱۶۵-۱۶۷) اور احقاف (۶)

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْلَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْلَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿۷۱﴾ وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذَا لَا تَأْخُذُوكَ خَلِيلًا ﴿۷۲﴾

اور جو اس میں اندھا رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور راستے سے بہت زیادہ بھٹکا ہوا ہوگا ﴿۷۱﴾ اور بے شک وہ قریب تھے کہ تجھے اس سے ضرور ہی بہکا دیں جو ہم نے تیری طرف وحی کی، تاکہ تو ہم پر اس کے سوا جھوٹ باندھ دے اور اس وقت وہ ضرور تجھے دلی دوست بنا لیتے ﴿۷۲﴾

اور اگر دوسرا معنی مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس دن ہر شخص کو اس کی کتاب اعمال کے ساتھ بلایا جائے گا۔ یہاں یہ معنی زیادہ مناسب ہے، کیونکہ آگے کتاب کو دائیں یا بائیں ہاتھ میں دیے جانے کی بات کی گئی ہے۔

﴿۷۲﴾ فَأُولَٰئِكَ يَفْرُقُونَ كَيْبَهُمْ: دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملنے ہی سے انھیں آنے والی خیر و سعادت کا پتا چل جائے گا، چنانچہ وہ خوشی خوشی اسے پڑھیں گے اور دوسروں کو بھی دکھائیں گے۔ دیکھیے سورہ حاقہ (۱۹)۔

﴿۷۳﴾ وَلَا يَظْلُمُونَ فَتِيلًا: بھجور کی گھٹلی کے شکاف میں باریک دھاگے کو ”فتیلہ“ کہتے ہیں، یعنی تھوڑا سا ظلم بھی نہیں ہوگا۔

آیت 72 ﴿۷۱﴾ وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْلَىٰ.....: اس سے مراد دل کا اندھا ہونا ہے، کیونکہ دنیا میں تو آنکھیں مسلم و کافر دونوں کو دیکھتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْبَىٰ الْأَبْصَارَ وَلَكِنَّ تَعْبَىٰ الْقُلُوبَ الَّتِي فِي الضُّلُوفِ﴾ [الحج: ۱۷] ”پس بے شک قصہ یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں اور لیکن وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔“

﴿۷۲﴾ وَأَضَلُّ سَبِيلًا: زیادہ گمراہ اس لیے کہ دنیا میں گمراہ کے راہ راست پر آنے کی امید ہے، قیامت کو اس کا موقع نہیں ہوگا۔

﴿۷۳﴾ یہاں اندھے اٹھائے جانے کا ذکر ہے اور دوسرے مقامات پر ان کے دیکھنے کا ذکر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَرَأَى النَّبِيُّ الْمُؤْمِنِينَ النَّارَ﴾ [الکہف: ۵۳] ”اور مجرم لوگ آگ کو دیکھیں گے۔“ دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ قیامت کے پچاس ہزار سال کے برابر دن میں مجرموں پر مختلف احوال گزریں گے، وہ قبروں سے اٹھتے وقت اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے، بعد میں دیکھنے، سننے اور بولنے کے مراحل سے بھی گزریں گے۔ ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تطبیق یہی ہے۔

آیت 72 ﴿۷۱﴾ وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا.....: ”وَإِنْ كَادُوا“ اصل میں ”وَإِنَّهُمْ كَادُوا“ تھا، دلیل

وہ لام ہے جو بعد میں آ رہا ہے۔ ”فَتَنٌ يَفْتِنُ“ (ض) سونے کو کھرا کھوٹا معلوم کرنے کے لیے آگ میں ڈالنا، آزمائش۔ ”فَتَنَةٌ

عَنْ رَبِّهِ“ کسی کو کسی کی رائے سے ہٹانا۔ کفار مکہ خود تو راہ پر کیا آتے ان کی برابر یہ کوشش رہی کہ کسی طرح آپ ﷺ خالص

توحید پیش کرنے سے باز آجائیں، یا ان احکام کا ایک حصہ چھوڑ دیں یا بدل دیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو دیے جا رہے

ہیں، یا قرآن سے وہ حصہ حذف کر دیں جس میں شرک اور بت پرستی کی مذمت ہے تو ہم ایمان لانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ

کو مقصد سے پھیرنے کے لیے کبھی فریب کاریوں سے، کبھی لالچ سے اور کبھی دھمکیوں سے انھوں نے بے شمار جتن کیے، لیکن

اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ انھیں صاف کہہ دیں کہ میں اللہ تعالیٰ کے ذمے وہ بات نہیں لگا سکتا جو اس نے میری طرف

وَلَوْلَا أَنْ تَبَشَّرْتَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكُنَ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ﴿٧٤﴾ إِذَا لَادَقُوكَ ضَعْفَ الْحَيَوةِ وَ ضَعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْهَا نَصِيرًا ﴿٧٥﴾ وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفْزُؤَنَّكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَ إِذَا لَا يَلْبَثُونَ خِلْفَكَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٧٦﴾

اور اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے تجھے ثابت قدم رکھا تو بلاشبہ یقیناً تو قریب تھا کہ کچھ تھوڑا سا ان کی طرف مائل ہو جاتا ﴿۷۴﴾ اس وقت ہم ضرور تجھے زندگی کے دگنے اور موت کے دگنے (عذاب) کا مزہ چکھاتے، پھر تو اپنے لیے ہمارے خلاف کوئی مددگار نہ پاتا ﴿۷۵﴾ اور بے شک وہ قریب تھے کہ تجھے ضرور ہی اس سرزمین سے پھلا دیں، تاکہ تجھے اس سے نکال دیں اور اس وقت وہ تیرے بعد نہیں ٹھہریں گے مگر تم ہی ﴿۷۶﴾

وحی نہ کی ہو۔ ان کے تقاضے اور آپ کے جواب کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یونس (۱۲۱ تا ۱۲۵)۔

﴿۷۴﴾ وَ إِذَا لَادَقُوكَ خَلِيلًا: کیونکہ توحید کی دعوت سے پہلے وہ آپ سے دلی محبت رکھتے تھے، آپ کو صادق اور امین کہتے تھے۔ اب آپ ان کی طرف مائل ہونے کے تھوڑے سے بھی قریب ہو جائیں تو وہ آپ سے پھر وہی دلی دوستی رکھنے کے لیے تیار ہیں۔ خلیل وہ دوست جس کی دوستی دل کے اندر ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾ [النساء: ۱۲۵] "اور اللہ نے ابراہیم کو خاص دوست بنا لیا۔"

آیت 74 وَلَوْلَا أَنْ تَبَشَّرْتَ..... اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ثابت رکھنے کی وجہ سے آپ ان کی طرف مائل ہونے کے تھوڑا سا قریب بھی نہیں ہوئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کی فطرت اتنی سلیم تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ کا خاص طور پر آپ کو ثابت رکھنا نہ ہوتا تو پھر بھی آپ زیادہ سے زیادہ ان کی طرف مائل ہونے کے تھوڑے سے قریب ہی ہوتے، پوری طرح مائل چھوڑ کر مائل ہونے کے پوری طرح قریب بھی نہ ہوتے۔ اس کے باوجود آپ کبھی اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کرتے تھے، انس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کثرت سے یہ دعا کیا کرتے تھے: «يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ» [ترمذی، القدر، باب ما جاء أن القلوب بين أصعبي الرحمان: ۶۱۴۰، صحیحہ الألبانی] "اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔" اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اہل ایمان کا کفار کی طرف مائل ہونے کے قریب ہونا بھی گوارا نہیں۔

آیت 75 إِذَا لَادَقُوكَ ضَعْفَ الْحَيَوةِ..... اس لیے کہ کسی کا مرتبہ جتنا بلند ہوتا ہے گناہ کرنے پر اسے اتنی ہی سخت سزا ملتی ہے، چنانچہ آپ ﷺ کی بیویوں کے متعلق فرمایا: ﴿يُنِسَاءَ النَّبِيِّ مِنْ نِيَاتٍ مِنْكُمْ يَفَاحِشَةٌ مُبِينَةٌ يُضَعَفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾ [الأحزاب: ۳۰] "اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کھلی برائی کا ارتکاب کرے گی اسے دگنا عذاب دیا جائے گا۔"

آیت 76 ﴿۷۶﴾ وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفْزُؤَنَّكَ..... "استفزز" کا معنی کسی کو گھبراہٹ میں ڈال کر پھلا دینا ہے۔ "الارض"۔

سُئِلَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ﴿١٥﴾ أَقِمِ الصَّلَاةَ
لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ شَهُودًا ﴿١٦﴾

ان کے طریقے (کی مانند) جنہیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا اور تو ہمارے طریقے میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا ﴿۱۵﴾ نماز قائم کر سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور فجر کا قرآن (پڑھ)۔ بے شک فجر کا قرآن ہمیشہ سے حاضر ہونے کا وقت رہا ہے ﴿۱۶﴾

میں الف لام عہد کا ہے، مراد ارض مکہ ہے، یعنی جب قریش کی نبی ﷺ کو توحید سے روکنے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو انہوں نے آپ کو سخت تنگ اور پریشان کرنا شروع کر دیا، تاکہ آپ گھبرا جائیں اور مکہ سے نکل جائیں۔

﴿۱۶﴾ وَإِذَا لَا يَلْبَثُونَ خَلْفَكَ إِلَّا قَلِيلًا: چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بعد میں جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تو ڈیڑھ سال کے بعد ان کے بڑے بڑے سردار بدر میں مارے گئے، آپ کی بددعا سے اہل مکہ قحط اور خوف کا شکار ہو گئے، حتیٰ کہ آٹھ (۸) ہجری میں خود مکہ بھی فتح ہو گیا، جس سے ان کی شان و شوکت اور حکومت خاک میں مل گئی۔ ایک معرور قوم کے لیے یہ عذاب ہی کیا کم ہے کہ وہی شخص جسے انہوں نے نکالا تھا، ان پر فتح پا کر شہر کا مالک بن جائے۔

آیت 77 سُنَّةٌ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ : یعنی پہلے رسولوں کے زمانے میں بھی ہمارا یہ طریقہ رہا کہ جوں ہی ان کی قوم نے انہیں نکالا ان پر عذاب آ گیا اور وہ تباہ ہو گئی، البتہ مکہ میں چونکہ رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کرنے کے بعد بھی کئی مسلمان موجود تھے جو استغفار کرتے تھے اور بعض کفار اور ان کی آئندہ اولاد کے مسلمان ہونے کی امید تھی، اس لیے مکہ کو پہلی قوموں کی بستیوں کی طرح تباہ نہیں کیا گیا۔ دیکھیے سورہ فتح (۲۵) اور انفال (۳۳)۔

آیت 78 ﴿١٦﴾ أَقِمِ الصَّلَاةَ : شروع سورت سے توحید و رسالت اور آخرت کے دلائل اور ان پر اعتراضات کے جوابات کے بعد اعمال کا ذکر فرمایا۔ (رازی) پچھلی آیات کے ساتھ ایک اور مسابقت یہ ہے کہ دشمنوں کے مقابلے کے لیے نماز قائم کیجیے، یہ آپ کے لیے ان سے مقابلے کی قوت کا ذریعہ بنے گی، اسی لیے آپ ﷺ کو جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تو نماز پڑھتے۔ [ابوداؤد، الطلوع، باب وقت قیام النبی ﷺ من اللیل ۱۳۱۶] اعمال میں سب سے افضل نماز ہے، کیونکہ کلمہ اسلام کے بعد یہ مسلمان ہونے کی پہلی شرط اور علامت ہے (دیکھیے توبہ: ۵، ۱۱) اور اس میں دوسرے ارکان اسلام کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ شامل ہے۔ زکوٰۃ اس طرح کہ مالی منفعت قربان کیے بغیر آدمی نماز کے لیے جا ہی نہیں سکتا، روزہ اس طرح کہ دوران نماز روزے کی تمام پابندیاں عائد ہوتی ہیں، حج اس طرح کہ قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے اور کلمہ اسلام تشہد میں شامل ہے اور نماز کا مغز یہ ہے کہ پوری دنیا سے تعلق توڑ کر ایک اللہ سے پوری طرح تعلق جوڑ لے۔ ان آیات میں اقامت صلاۃ کے حکم کے ساتھ اس کے پانچ اوقات بھی بیان فرمائے، یہ اوقات قولاً و فعلاً رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں اور پوری امت مسلمہ چودہ صدیوں سے ان اوقات پر نماز پڑھتی آئی ہے۔ نمازوں کے اوقات کے لیے مزید دیکھیے

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ بِحَمْدِ اللَّهِ الْكَلِيمِ ۝۱۸۱

اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کے ساتھ بیدار رہ، اس حال میں کہ تیرے لیے زائد ہے۔ قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کرے ﴿۱۸۱﴾

سورہ ہود (۱۱۳)، سورہ روم (۱۷، ۱۸) اور سورہ طہ (۱۳۰) تین نمازوں کا صراحت سے ذکر سورہ نور (۵۸) میں ہے، لیکن نمازوں کے اوقات کے اول و آخر کی مکمل حد بندی رسول اللہ ﷺ نے فرمائی اور آپ کو جبریل علیہ السلام نے دو دن نماز پڑھ کر سکھائی۔ [دیکھیے بخاری، مواقیب الصلوٰۃ، باب مواقیب الصلوٰۃ و فضلها: ۵۲۱۔ مسلم: ۶۱۳، ۶۱۴]

﴿۱۸۱﴾ لَيْلُ اللَّيْلِ الْفَجْرِ: قاموس میں ہے: "ذَلِكَ الشَّمْسُ أَيُّ غَرَبَتْ أَوْ اصْفَرَّتْ أَوْ مَالَتْ أَوْ زَالَتْ عَنْ سَكَبِ السَّمَاءِ" یعنی "ذَلِكَ الشَّمْسُ" کا معنی ہے کہ سورج غروب ہو گیا، یا زرد ہو گیا، یا مائل ہو گیا، یا آسمان کے وسط سے ڈھل گیا۔ اس میں تین نمازوں کا ذکر ہے، کیونکہ مشترک لفظ ایک سے زیادہ معنوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ سورج ڈھلنے کے وقت ظہر، زردی کی (غیر محسوس) ابتدا کے وقت عصر کی نماز ہے (پوری طرح زرد ہونے پر نماز مکروہ ہے) اور سورج غروب ہونے کے ساتھ مغرب کی نماز ہے۔ "عَسَقِ الْيَلِ" کا معنی شروع رات کا اندھیرا ہے۔ شفق غائب ہونے کے ساتھ اندھیرا مکمل ہوتے ہی عشاء کا وقت ہو جاتا ہے۔ "إِلَى عَسَقِ الْيَلِ" (سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک) کا معنی تو یہ ہے کہ یہ تمام وقت مسلسل نماز قائم رکھو، مگر یہ اس لیے فرمایا کہ آدمی نماز پڑھ کر اگلی نماز کے انتظار میں ہو تو وہ نماز ہی میں مشغول شمار ہوتا ہے، گویا یہ تمام وقت نماز ہی میں گزرا۔ اس میں ہر وقت نماز کی طرف توجہ رکھنے کی ترغیب ہے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّكُمْ لَم تَرَالُوا فِي صَلَاةٍ مَا أَنْتَظِرْتُمْ الصَّلَاةَ» [ابوداؤد، الصلاۃ، باب وقت العشاء الآخرة: ۴۲۲۔ ترمذی: ۳۳۰] "تم اس وقت تک نماز میں رہو گے جب تک نماز کا انتظار کرتے رہو گے۔" پھر رات کی نیند کے وقفے کے بعد صبح کی نماز کا وقت ہے، اس لیے اسے الگ ذکر فرمایا۔ (نظم الدرر للباقی)

﴿۱۸۲﴾ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ: "أَيُّ وَأَقِمُّ قُرْآنَ الْفَجْرِ" یعنی فجر کی نماز قائم کر۔ یہاں نماز کو قرآن فرمایا، کیونکہ قرآن نماز کا اہم جز ہے اور یہاں جز بول کر کل مراد لیا ہے، جیسا کہ قیام یا "زَكَاةً" یا "سَخِيحَةً" سے پوری نماز مراد ہوتی ہے۔ یہاں نماز کو قرآن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ صبح کی نماز میں قرآن زیادہ پڑھا جاتا ہے بہ نسبت دوسری نمازوں کے۔

﴿۱۸۳﴾ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ شَهُودًا: "شَهُودًا" جس میں حاضر ہوا جائے، یعنی اس میں رات اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ [دیکھیے بخاری، الأذان، باب فضل صلاة الفجر في جماعة: ۶۴۸] یہ معنی بھی ہے کہ رات بھر کے آرام کے بعد طبیعت قرآن پڑھنے اور سننے کے لیے حاضر ہوتی ہے۔

بیت 79: ﴿۱۸۱﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ بِحَمْدِ اللَّهِ الْكَلِيمِ: "مِنَ" بعض کے معنی میں ہے۔ "هُجُودًا" نیند کو کہتے ہیں۔ تہجد ترک ہو، یعنی نیند ترک کرنے کا نام ہے، خواہ رات سونے کے بعد اٹھ کر ہو یا عشاء کے فوراً بعد نیند کے بجائے قیام کیا جائے۔ تہجد کے

لیے سو کر اٹھنا ضروری نہیں۔ سورہ مزل میں فرمایا، رات کا کچھ حصہ قرآن کی تلاوت پر مشتمل نماز کے ساتھ نیند کو ترک کیجیے۔
تفصیل سورہ مزل کی ابتدائی اور آخری آیات میں ملاحظہ فرمائیں۔

② نَافِلَةٌ لَّكَ: ”نَافِلَةٌ“ جو فرض سے زائد ہو، جمع نوافل۔ بعض لوگ اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے لیے تہجد ایک زائد فرض ہے، باقی عوام کے لیے نفل ہے۔ مگر ”أَقْبَبَ الصَّلَاةَ“ سے لے کر آیات کے آخر تک کے اول مخاطب اگرچہ رسول اللہ ﷺ ہیں مگر ان تمام احکام کا مخاطب امت کا ہر فرد بھی ہے۔ اس لیے تحقیق یہی ہے کہ تہجد نبی ﷺ پر بھی فرض نہیں تھی۔

③ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ.....: ”عَسَىٰ“ کا معنی ”امید ہے“، ”قرب ہے“ ہوتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ یہ لفظ فرمائے تو وہ کام واقع ہونا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ ”عَسَىٰ“ طمع اور امید دلانے کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے، جو ملک الملوک ہے، عار ہے کہ امید دلا کر اسے پورا نہ کرے۔ ”مَقَامًا مَّحْمُودًا“ کے لفظی معنی ہیں ”ایسا مقام جس کی تعریف کی جائے“ اور حقیقت یہ ہے کہ ہر مخلص تہجد پڑھنے والے کو اس کی صلاحیت کے مطابق دنیا اور آخرت میں یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ دنیا میں لوگ اس سے محبت رکھتے اور تعریف کرتے ہیں اور آخرت میں بھی اسے یہ نعمت اس کی حیثیت کے مطابق حاصل ہوگی۔ دیکھیے سورہ مریم (۹۶) اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ نعمت عطا فرمائے۔ سب سے اونچا ”مقام محمود“ جو صرف ایک ہی شخص کو ملے گا اور جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے رسول کریم ﷺ سے کیا ہے، وہ مقام شفاعت ہے، جس پر سب پہلے اور پچھلے آپ کی تعریف کریں گے۔ ایک شفاعت میدان محشر کی تنگی سے خلاصی دلا کر حساب کتاب شروع کرنے کی عام شفاعت ہے کہ اس پر سب پہلے اور پچھلے آپ کی تعریف کریں گے اور ایک اپنی امت کے لیے خاص شفاعت ہے جس پر پوری امت آپ کی احسان مند ہوگی اور تعریف کرے گی۔ آپ کے نام ”احمد“ اور ”محمد“ کی شان اس وقت پوری طرح ظاہر ہوگی۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قیامت کے دن لوگ گروہوں کی شکل میں ہوں گے، ہر امت اپنے نبی کا پیچھا کرے گی کہ اے فلاں! آپ سفارش کیجیے، یہاں تک کہ آخر میں شفاعت (کی درخواست) نبی ﷺ تک آپنچے گی تو یہ وہ دن ہے جب اللہ آپ کو مقام محمود پر کھڑا کرے

گا۔ [بخاری، التفسیر، سورہ بنی اسرائیل، باب قوله: ﴿عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا﴾: ۴۷۱۸]

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اذان سنے، پھر یہ دعا پڑھے: ﴿اللَّهُمَّ رَبِّ هَذِهِ الدَّعْوَةُ التَّامَّةُ وَالصَّلَاةُ الْقَائِمَةُ، آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيلَةَ وَالْفَضِيلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُودًا الَّذِي وَعَدْتَهُ﴾ تو اسے قیامت کے دن میری شفاعت نصیب ہوگی۔“ [بخاری، الأذان، باب الدعاء عند النداء: ۶۱۴] شاہ عبد القادر رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں: ”نیند سے جاگ کر قرآن پڑھا کر، یہ حکم سب سے زیادہ تجھ کو دیا ہے کہ تجھ کو بڑا مرتبہ دینا ہے، وہ تعریف کا مقام ہے، شفاعت (کبریٰ) کا کہ جب کوئی پیغمبر نہ بول سکے گا تب آپ (ﷺ) اللہ تعالیٰ سے عرض کر کے خلق کو چھڑوائیں گے تکلیف سے۔“ (موضح)

④ بعض لوگوں نے مقام محمود کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو عرش پر اپنے ساتھ بٹھائے گا۔ طبری نے مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے۔ بعض روایات رسول اللہ ﷺ سے بھی نقل کی جاتی ہیں۔ حافظ ذہبی رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب ”الْعُلُوُّ لِلَّهِ الْعَظِيمِ“

وَقُلْ رَبِّ ادْخُلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ
سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَرَهَقَ الْبٰطِلُ اِنَّ الْبٰطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

اور کہہ اے میرے رب! داخل کر مجھے سچا داخل کرنا اور نکال مجھے سچا نکالنا اور میرے لیے اپنی طرف سے ایسا غلبہ بنا جو مددگار ہو ﴿۸۰﴾ اور کہہ دے حق آگیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل منسے والا تھا ﴿۸۱﴾

میں محمد بن مصعب کے ترجمہ میں فرمایا: ”ہا ہمارے نبی ﷺ کے عرش پر بیٹھنے کا معاملہ تو اس کے متعلق کوئی نص (آیت یا حدیث) ثابت نہیں، بلکہ اس باب میں ایک ضعیف و کمزور روایت ہے اور مجاہد نے آیت کی جو تفسیر کی ہے بعض اہل کلام نے اس کا انکار کیا ہے۔“ (مخلص از تفسیر قاسمی) ظاہر ہے کہ تابعی کے قول سے دین خصوصاً عقیدہ سے متعلق کوئی بات ثابت نہیں ہو سکتی۔ مزید دیکھیے سورہ بنی اسرائیل کی آیت (۲۲) امام ذہبی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا: ”بدعت اور غلو کا نتیجہ دیکھیے کہ ایک طرف ایک منکر اثر کو لے کر نبی ﷺ کو عرش پر بٹھایا جا رہا ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے عرش اور بلندی پر ہونے کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ کے صریح فرمان ﴿الَّذِيْنَ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ کو رد کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔“ (مخلص از قاسمی)

آیت 80 ﴿۸۰﴾ وَقُلْ رَبِّ ادْخُلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ..... اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ اور آپ کے ہر امتی کو یہ دعا سکھائی کہ اے میرے رب! تو مجھے دنیا و آخرت میں جس جگہ بھی داخل کرے باعزت اور آبرو مندانه طریقے سے داخل کر اور جس جگہ سے بھی نکالے باعزت طریقے سے نکال اور میرے لیے دلیل و برہان کے ساتھ قوت و سلطنت کا ایسا غلبہ عطا فرما جو میرا مددگار ہو۔ دلیل کے غلبے کے لیے دعوت اور سلطنت کے غلبے کے لیے جہاد ضروری ہے، جس کا پہلا قدم دار الکفر سے ہجرت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت اس وقت اتری جب آپ ﷺ کو ہجرت کا حکم دیا گیا، چنانچہ یہ دعا قبول ہوئی اور آپ آبرو مندانه طور پر مدینہ وارد ہوئے، انصار سے اور مہاجرین سے دین کی مدد بھی ہوئی۔

﴿۸۱﴾ ”سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا“ سے اس آیت میں مراد قوت و سلطنت کا غلبہ ہے، کیونکہ دلیل و برہان میں تو آپ مکہ میں بھی ہر وقت غالب تھے۔ کوئی شخص سورہ کوثر جیسی ایک سورت بھی نہ بنا سکا تھا، اب عناد اور ضد سے اٹری ہوئی گردنوں کے لیے جہاد کی ضرورت تھی، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے ساتھ ساتھ لوہا بھی نازل فرمایا۔ دیکھیے سورہ حدید (۲۵) کی تفسیر۔ اہل حق کے لیے حق سے دشمنی رکھنے والوں پر غلبہ حاصل کرنا فرض ہے، تب ہی وہ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر سکتے ہیں اور اپنی سلطنت ہی میں وہ پورے اسلام پر عمل کر سکتے ہیں جو اب صرف مسجد، نکاح اور جنازے وغیرہ تک رہ گیا ہے۔ بعض اہل علم نے فرمایا: ”اِنَّ اللّٰهَ لَيَرْزُقُ بِالسُّلْطٰنِ مَا لَا يَرْزُقُ بِالْقُرْآنِ“ ”اللہ تعالیٰ سلطان کے ذریعے سے ان فواحش اور گناہوں سے روک دیتا ہے جن کے ارتکاب سے بہت سے لوگ قرآن سننے کے باوجود باز نہیں آتے۔“

آیت 81 ﴿۸۱﴾ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَرَهَقَ الْبٰطِلُ..... اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ بشارت سنا دینے کا حکم دیا جو تھوڑے ہی عرصے کے بعد پوری ہو گئی اور آپ ﷺ فاتحانہ شان کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

و نُزِّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۚ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

اور ہم قرآن میں سے تھوڑا تھوڑا نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے سراسر شفا اور رحمت ہے اور وہ ظالموں کو خسارے کے سوا کسی چیز میں زیادہ نہیں کرتا ﴿۸۲﴾

نبی ﷺ مکہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کے گرد تین سو ساٹھ بت تھے، آپ ﷺ انہیں ایک لکڑی کے ساتھ کچھ کے مارتے جاتے تھے جو آپ کے ہاتھ میں تھی اور یہ کہتے جاتے تھے: ﴿جَاءَ النُّعَىٰ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ ”حق آگیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل ہمیشہ سے مٹنے والا ہے۔“ ﴿جَاءَ النُّعَىٰ وَ مَا يُبْدِي الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ﴾ [سبا: ۴۹] ”حق آگیا اور باطل نہ پہلی دفعہ کچھ کرتا ہے اور نہ دوبارہ کرتا ہے۔“ [بخاری، التفسیر، سورة بني اسرائيل، باب: ﴿وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ﴾: ۴۷۲۰]

﴿۲﴾ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا: ”ہمیشہ سے“ کا مفہوم ”مکان“ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ طنطاوی نے لکھا ہے: ”أَيُّ مَكَانٍ غَيْرِ مُسْتَقَرٍّ وَلَا ثَابِتٍ فِي سَكَلٍ وَ قَتٍ“ کہ باطل ہر دور میں یعنی ہمیشہ سے ناپائیدار ہے۔

آیت 82 ﴿۱﴾ وَ نُزِّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ : یعنی قرآن میں سے تھوڑا تھوڑا حصہ نازل کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اہل ایمان کے دل میں اگر شک و شبہ یا کفر و نفاق کی کوئی بیماری پیدا ہو جائے تو قرآنی آیات کے ساتھ وہ تمام بیماریاں دور ہو کر ان کے دل اور روح کو مکمل شفا و رحمت حاصل ہو جائے۔ (”سراسر شفا“ کا مفہوم مصدر اور تومین سے ظاہر ہو رہا ہے) مگر ظالموں کو یعنی کفار و مشرکین کو اس سے خسارے ہی میں اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ پہلی آیات کے ساتھ ان آیات کے انکار سے ان کا کفر اور بڑھ جاتا ہے۔ یہاں شفا سے مراد روحانی شفا، یعنی ایمان و یقین کی دولت مراد ہے، جو کفار کو حاصل نہیں ہوتی۔ دیکھیے سورہ یونس (۵۷)، تم السجدہ (۲۳) اور توبہ (۱۲۳، ۱۲۵)۔

﴿۲﴾ اگرچہ اس آیت میں شفا سے اولین مراد روحانی شفا یعنی کفر و نفاق، شکوک و شبہات اور جہل سے شفا ہے، مگر اس کے احکام پر عمل کرنے سے انسان جسمانی بیماریوں سے بھی شفا پاتا ہے اور ان سے محفوظ بھی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ قرآن دم کے لیے پڑھا جائے تو اس سے مسلم و کافر دونوں کی جسمانی بیماریاں دور ہوتی ہیں۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک قبیلہ جنھوں نے کچھ مسافر صحابہ رضی اللہ عنہم کی مہمانی سے انکار کر دیا تھا، اتفاق سے اس قبیلہ کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا، وہ لوگ اپنی ساری کوشش کے بعد صحابہ کے پاس دم کی درخواست لے کر آئے، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے تیس بکریوں کی شرط پر سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تو وہ بالکل تندرست ہو گیا، رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ [بخاری، الإحارۃ، باب ما يعطى في الرقية.....: ۵۰۰۷، ۲۲۷۶] اسی طرح خارجہ بن صلت رضی اللہ عنہ کے چچا نے سفر کے دوران ایک قبیلے کے لوہے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک پاگل کو سورہ فاتحہ کے ساتھ دم کیا تو وہ تندرست ہو گیا اور ان لوگوں نے انھیں سو بکریاں دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ خُذْهَا فَلَعَسَ رَبِّي لَمَنْ أَكَلَ بِرُقِيَّةٍ بَاطِلٍ لَقَدْ أَكَلَتْ بِرُقِيَّةٍ حَقِّي ﴾ [ابو داؤد، الطب، باب كيف الرقى: ۳۸۹۶، صححه الألباني] ”(بکریاں) لے لو، مجھے اپنی عمر کی قسم!

وَ إِذَا أُنْعِمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ آخِرَ صَفْوَةٍ وَأَنَا بِجَانِبِهِ ۚ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوسًا ۝ قُلْ كُلُّ يَعْزَلُ عَلَى شَاكِلَتِهِ ۖ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَى سَبِيلًا ۝ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ ۚ

اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں وہ منہ پھیر لیتا ہے اور اپنا پہلو دور کر لیتا ہے اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت ناامید ہو جاتا ہے ﴿۸۴﴾ کہہ دے ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے، سو تمہارا رب زیادہ جاننے والا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر ہے ﴿۸۵﴾ اور وہ تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے روح

جس نے باطل دم کے ساتھ کھایا (وہ کھاتا رہے) بلاشبہ یقیناً تو نے حق دم کے ساتھ کھایا ہے۔“

آیت 83 وَإِذَا أُنْعِمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ: "الْإِنْسَانِ" سے مراد یہاں کافر یا فاسق انسان ہے، صحیح مومن ایسا نہیں ہوتا۔

صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كَمَلَّةٍ لَهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَصَابَتُهُ سَرَاءُ شُكْرٍ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَاءٌ صَبْرًا، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ» [مسلم، الزهد، باب المؤمن أمره كله خير: ۲۹۹۹] "مومن کا معاملہ بڑا عجیب ہے، کیونکہ اس کا ہر معاملہ ہی خیر ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے کوئی خوشی پہنچے تو وہ شکر کرتا ہے تو وہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے، سو وہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔" مزید دلیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورۃ ہود (۱۱۲: ۹) اور سورۃ معارج (۱۹: ۳۵) اس آیت سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر احسان کے باوجود بے وفائی اور ناشکری کرے تو محسن کو احسان چھوڑنا نہیں چاہیے۔ تمام کفار و فاسق کی ناشکری کے باوجود اللہ تعالیٰ دنیا میں ان پر بھی بے شمار انعامات جاری رکھے ہوئے ہے۔

آیت 84 ۱ قُلْ كُلُّ يَعْزَلُ عَلَى شَاكِلَتِهِ: "شَاكِلَةٌ" وہ طریقہ جو کسی کا ہم شکل اور حسب حال ہو، یعنی ہر شخص اپنے

اس طریقہ پر عمل کرتا ہے جو ہدایت یا گمراہی میں سے اس کے مطابق اور حسب حال ہوتا ہے، کوئی نیک ہے، کوئی بد اور کوئی بین بین، سب ایک طریقے پر نہیں، نہ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے موافق ہے، کیونکہ پھر امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ دیکھیے سورۃ ہود (۱۱۸، ۱۱۹)۔

۲ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَى سَبِيلًا: یعنی ہر شخص اسی طریقے پر خوش ہے جس پر چل رہا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ﴾ [المؤمنون: ۵۲] "ہر گروہ کے لوگ اسی پر خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔" اور ہر شخص اپنے آپ کو سب سے زیادہ صحیح راستے پر سمجھتا ہے، مگر سب سے زیادہ صحیح راستے پر چلنے والوں کا علم صرف تیرے رب کو ہے جو قیامت کے درمیان اپنے بندوں کے تمام اختلافات کا فیصلہ فرمائے گا۔ دیکھیے سورۃ زمر (۳۶)۔

آیت 85 ۱ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الزُّوْجِ: عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ

سے بعض یہود کے روح سے متعلق سوال کرنے پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [دیکھیے بخاری، العلم، باب قول الله تعالى: ﴿وَمَا أُولَئِكَ مِنَ الْعَالَمِينَ﴾ ۱۲۵ - مسلم: ۲۷۹۴] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے، مگر یہ سورت مکی ہے اور

الرُّوحُ ۚ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۱۵﴾

میرے رب کے حکم سے ہے اور تمہیں علم میں سے بہت تھوڑے کے سوا نہیں دیا گیا ﴿۱۵﴾

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قریش نے یہود سے کہا: «أَعْطُونَا شَيْئًا نَسْأَلُ عَنْهُ هَذَا الرَّجُلَ، فَقَالُوا سَلُوهُ عَنِ الرُّوحِ، فَسَأَلُوهُ، فَنَزَلَتْ: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [الإسراء: ۸۵] قَالُوا أَوْتِينَا عِلْمًا كَثِيرًا، أَوْتِينَا التَّوْرَةَ، وَمَنْ أُوْتِيَ التَّوْرَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا، قَالَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِثْلًا لِكُلِّبَتِ رَبِّي لَنَفَعْتُ الْبَحْرُ﴾ [الكهف: ۱۰۹]» «ہمیں کوئی چیز دو جس کے متعلق ہم اس آدمی سے سوال کریں؟» تو انہوں نے کہا: «اس سے روح کے متعلق پوچھو۔» چنانچہ انہوں نے آپ سے پوچھا تو یہ آیت اتری: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ انہوں نے کہا: «ہمیں تو کثیر علم عطا کیا گیا ہے، کیونکہ ہمیں تورات دی گئی ہے اور جسے تورات دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی۔» ابن عباس نے فرمایا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِثْلًا لِكُلِّبَتِ رَبِّي لَنَفَعْتُ الْبَحْرُ﴾ [مسند احمد: ۲۵۵/۱، ح: ۲۳۱۳، صحیحہ الابلیسی] ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ یہ آیت پہلے مکہ میں اتری ہو (کیونکہ یہ سورت مکہ میں اتری تھی) پھر دوبارہ مدینہ میں اتری ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدینہ میں جب یہودیوں نے یہ سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی ہو کہ آپ یہ آیت پڑھ کر سنائیں۔

② روح کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے، مثلاً وحی (مومن: ۱۵)، قوت و ثابت قدمی (مجادلہ: ۲۲) جبریل علیہ السلام (شعراء: ۱۹۳)، قرآن (شوری: ۵۲) اور صبح علیہ السلام (نساء: ۱۷۱) زیر تفسیر آیت میں روح سے مراد وہ چیز ہے جس سے بدن کو زندگی حاصل ہوتی ہے، ہر شخص اس کا مشاہدہ کرتا ہے، کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ فرمایا ان سے کہہ دیجیے روح میرے رب کے حکم سے ہے، یعنی اللہ کے حکم سے ایک چیز بدن میں آپڑی، وہ جی اٹھا جب نکل گئی وہ مر گیا۔ اس کے علاوہ روح کی حقیقت کو صرف وہی جانتا ہے۔ اس میں نکتہ یہ بھی ہے کہ جب آدمی اللہ کے حکم سے پیدا ہونے والی اس مخلوق کی حقیقت نہیں جانتا، جو خود اس میں رہتی ہے تو وہ خالق کی حقیقت کیسے جان سکتا ہے؟

③ وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا: اس مفہوم کی طرف سورہ کہف (۱۰۹) اور لقمان (۲۷) میں بھی اشارہ ہے۔

④ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو صرف وہ باتیں بتائی ہیں جن کی انہیں ضرورت ہے اور جو انسانی عقل و فکر میں آسکتی ہیں، اگرچہ انسانی فکر کے سوچنے پر کوئی پابندی نہیں، مگر اسے اپنی حدود میں رہنا لازم ہے۔ انسان نے ایسی ایسی ایجادات کیں جو بیان سے باہر ہیں مگر وہ اس راز (روح) کی حقیقت کو پانے سے عاجز رہا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک راز اور غیب کی چیز ہے، جسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے؟ کیسے آئی؟ اور کس طرح جاتی ہے؟ کہاں سے آئی اور کہاں جاتی ہے؟ مخلوق کو صرف اتنا معلوم ہے جتنا اس علیم وخبیر نے بتایا ہے، اس سے آگے سب بے بس ہیں اور سب کا علم اللہ کے

وَلَیْنُ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْ اَوْحٰیْنَا اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِہٖ عَلٰیْنَا وَكِیْلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ﴿۸۷﴾ قُلْ لَیْنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَاَنْ یُّوْكَفَّرَ عَنْهُمْ بِبَعْضِ ظَہِیْرًا ﴿۸۸﴾

اور یقیناً اگر ہم چاہیں تو ضرور ہی وہ وحی (واپس) لے جائیں جو ہم نے تیری طرف بھیجی ہے، پھر تو اپنے لیے اس کے متعلق ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہیں پائے گا ﴿۸۶﴾ مگر تیرے رب کی رحمت سے۔ یقیناً اس کا فضل ہمیشہ سے تجھ پر بہت بڑا ہے ﴿۸۷﴾ کہہ دے اگر سب انسان اور جن جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہیں لائیں گے، اگر چہ ان کا بعض بعض کا مددگار ہو ﴿۸۸﴾

مقابلے میں اتنا ہے جتنا سمندر میں سے پرندے کی چونچ میں آنے والا پانی۔

آیت 87 86 ﴿۱﴾ وَلَیْنُ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک اور قدرت کا بیان فرمایا کہ اگر ہم چاہیں تو جو کچھ آپ کی طرف وحی کیا ہے سب لے جائیں، نہ آپ کے سینے میں رہے، نہ آپ کے کسی صحابی یا امتی کے سینے میں، نہ کسی کاغذ یا دوسری چیز میں، پھر اسے حاصل کرنے کے لیے ہمارے مقابلے میں آپ کو کوئی حمایتی نہیں ملے گا۔

﴿۲﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ : لیکن یہ تیرے رب کی رحمت ہے کہ وہ اسے لے نہیں گیا، بلکہ اسے تیرے پاس ہی رہنے دیا ہے۔ یہ متشکی منقطع ہے۔ معلوم ہوا قرآن قیامت تک باقی رہے گا، کوئی شخص اس کے تمام اوراق ختم کر کے بھی اسے ختم نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کا اصل ٹھکانا اہل علم کے سینے میں، (دیکھیے عنکبوت: ۴۹) اور رب کا وعدہ بھی ہے کہ وہ اسے نہیں لے جائے گا، بلکہ اس کی حفاظت کرے گا، فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَحْرُؤُنَا الَّذِیْ کَرُوْا اِذَا اَلَّهُ لَنَحْفِظُوْنَ﴾ [الحجر: ۹] ”بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔“

﴿۳﴾ اِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا : یہاں فضل کبیر اور دوسری جگہ فضل عظیم فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمْنَا لَوْ تَشٰكُنُ تُعَلِّمُوْا وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا﴾ [النساء: ۱۱۳] ”اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور تجھے وہ کچھ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر ہمیشہ سے (عظیم) بہت بڑا ہے۔“ اس فضل کبیر و عظیم میں سے چند یہ ہیں کہ آپ پر کتاب و حکمت نازل فرمائی، اسے آپ کے اور آپ کی امت کے پاس قیامت تک کے لیے باقی رکھا، آپ کو اولاد آدم کا سردار بنایا، تمام لوگوں کے لیے رسول اور آخری نبی بنایا، تمام نبیوں کی امامت اور معراج کا شرف بخشا، شفاعت کبریٰ اور مقام محمود عطا فرمایا۔ جس فضل کو اللہ تعالیٰ عظیم و کبیر فرمائے اسے کوئی کیسے شمار کر سکتا ہے۔

آیت 88 ﴿۱﴾ قُلْ لَیْنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ اس آیت میں پورے قرآن کی مثل لانے کا چیلنج ہے، سورہ ہود (۱۳) میں دس سورتوں کا، بقرہ (۲۳) اور یونس (۲۸) میں ایک سورت کا اور سورہ طور (۳۳) میں اس کے بھی بعض حصے کا، مگر

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ مَثَلٍ ۚ فَاَبَى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوًا ﴿۸۹﴾
 وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَنْزِلَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوعًا ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِمَّنْ
 تُخْبِلُ ۚ وَ عِنَبٍ فَتُجَرُّ الْاَنْهَارُ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقَطَ السَّمَاءُ كَمَا زَعَمْتِ
 عَلَيْنَا كَسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر طرح کی مثال پھیر پھیر کر بیان کی مگر اکثر لوگوں نے کفر کے
 سوا (ہر چیز سے) انکار کر دیا ﴿۸۹﴾ اور انھوں نے کہا ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے، یہاں تک کہ تو ہمارے لیے
 زمین سے کوئی چشمہ جاری کرے ﴿۹۰﴾ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگور کا ایک باغ ہو، پس تو اس کے درمیان نہریں
 جاری کر دے، خوب جاری کرنا ﴿۹۱﴾ یا آسمان کو ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے، جیسا کہ تو نے دعویٰ کیا ہے، یا تو اللہ اور
 فرشتوں کو سامنے لے آئے ﴿۹۲﴾

قرآن کا آغاز یہ ہے کہ نہ اس زمانے میں کفار اس کا جواب دے سکے اور نہ آئندہ قیامت تک اس کا جواب ممکن ہے۔ یہاں
 انسانوں کے ساتھ جنات کو بھی شامل کر دیا ہے، اس لیے کہ کفار یہ اتہام لگاتے تھے کہ کوئی جن اس (محمد ﷺ) پر القا کر جاتا
 ہے اور پھر جنوں کو اپنے سے اعلیٰ اور عالم الغیب بھی سمجھتے تھے۔

آیت 89 ﴿۱﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے ہر طرح سے چیلنج
 کیا ہے اور یہ بھی کہ ہم نے توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے لیے ہر قسم کے دلائل پیش کیے ہیں، یا ہر معنی کو فصاحت و بلاغت
 کے ساتھ ایسے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے کہ وہ مثال کی طرح ذہن میں اترتا چلا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس حد تک
 بیان اور سمجھانے کا تعلق ہے ہم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے بنی اسرائیل (۴۱) اور کہف (۵۴)۔
﴿۲﴾ فَاَبَى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوًا: یعنی کسی طرح بھی ایمان لانے کے لیے تیار نہیں۔

آیت 90 ﴿۱﴾ وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَنْزِلَ لَنَا: ”يَنْبُوعًا“ ”نَبْعٌ يَنْبُعُ“ (ض، ن، ع) پھوٹ نکلتا،
 بروزن ”يَنْفُوعًا“ یا مبالغہ کے لیے بڑھائی گئی ہے، وہ چشمہ جو ہمیشہ جاری رہے۔ ”الْاَرْضِ“ میں الف لام عہد کا ہے، یعنی
 اس مکہ کی سنگلاخ زمین سے جہاں پانی کا نشان نہیں۔ ”يَنْبُوعًا“ کے مطالبے کا مقصد یہ ہے کہ انھیں صرف اتنا پانی کافی نہیں
 جو ان کی ضرورت پوری کرے، بلکہ بہت بڑا اور ہمیشہ جاری رہنے والا چشمہ جاری ہونا چاہیے۔

﴿۲﴾ کفار جب قرآن کے مجزے کا جواب نہ دے سکے تو انھوں نے اپنے ایمان لانے کے لیے مزید مجزوں کا مطالبہ داغ دیا، جیسا کہ
 لاجواب ہونے والے لوگ کیا کرتے ہیں۔ ان تمام مطالبات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کہنے کا حکم دیا وہ آگے آ رہا ہے۔

آیت 92 اَوْ تُسْقَطَ السَّمَاءُ كَمَا زَعَمْتِ: ”كَسَفًا“ ”كِسْفَةً“ کی جمع ہے، ٹکڑے۔ ”قَبِيْلًا“ بمعنی ”مُفَابِلًا“،

أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيِّنٌ مِّنْ زُخْرِفٍ أَوْ تَرْقِي فِي السَّمَاءِ ۗ وَ لَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ
تُنزَلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرُؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ﴿۹۳﴾ وَمَا مَنَعَهُ
النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا ﴿۹۴﴾

یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر ہو، یا تو آسمان میں چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے، یہاں تک کہ تو ہم پر کوئی کتاب اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ تو کہہ میرا رب پاک ہے، میں تو ایک بشر کے سوا کچھ نہیں جو رسول ہے ﴿۹۳﴾ اور لوگوں کو کسی چیز نے نہیں روکا کہ وہ ایمان لائیں، جب ان کے پاس ہدایت آئی مگر اس بات نے کہ انھوں نے کہا کیا اللہ نے ایک بشر کو پیغام پہنچانے والا بنا کر بھیجا ہے؟ ﴿۹۴﴾

جیسا کہ ”عشیرہ“ یعنی ”معاشرہ“ ہوتا ہے، یعنی آنکھوں کے سامنے۔ اس آیت میں ان کے دو مطالبے ذکر ہوئے۔ پہلے مطالبے میں ان بد نصیبوں کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے جس میں ارشاد ہے: ﴿إِنْ نَشَأْ نُغَيِّفْ بِهِمُ الْأَمْرَاضَ أَوْ نُسْقِطَ عَلَيْهِمُ كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ﴾ (سبا: ۹۱) ”اگر ہم چاہیں تو انھیں زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں۔“ اس وعید سے خوف زدہ ہونے کے بجائے وہ جلد از جلد عذاب لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں، جیسا کہ سورہ انفال (۳۲) میں مذکور ہے۔ دوسرے مطالبے یعنی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے لانے کی تفصیل سورہ فرقان (۲۲، ۲۱) میں دیکھیے۔

آیت 93 ① أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيِّنٌ مِّنْ زُخْرِفٍ : ”زُخْرِفٍ“ اصل میں زینت کو کہتے ہیں، یہاں یہ لفظ سونے کے معنی میں ہے، کیونکہ جو چیزیں زینت کے لیے استعمال ہوتی ہیں ان میں سونا بہت قیمتی اور خوبصورت ہے۔ ”تَرْقِي“ ”رُقِي“ بِرُقِي رُقِيَةً ”(ض) دم کرنا اور ”رُقِي رُقِي رُقِيًا“ (ع) چڑھنا۔

② قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ : یہاں قرآن نے کفار کے چھ مطالبوں کا ذکر کیا ہے، جن کے ضمن میں کئی اور مطالبے ہیں۔ فرمایا، میرا رب ہر عیب اور عجز سے پاک ہے، وہ یہ سب کچھ کر سکتا ہے مگر اپنی مرضی سے۔ رہا مجھ سے مطالبے کرنا تو میں تو محض ایک بشر ہوں جو پیغام پہنچانے والا ہے، کیا تم کسی بشر کے متعلق بتا سکتے ہو کہ وہ اس قسم کے تصرفات کی طاقت رکھتا ہو اور پھر میرا کوئی اختیار بھی نہیں، نہ کوئی بات میری اپنی ہے، میں تو محض اللہ کا رسول، یعنی اس کی طرف سے پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا ہوا ہوں اور اس کے حکم کا تابع ہوں، تو میں اس کے اذن کے بغیر یہ چیزیں کیسے لاسکتا ہوں۔ امام رازی کہتے ہیں کہ رسول کے سچا ہونے کے لیے تو ایک معجزہ ہی کافی ہوتا ہے اور آپ کو وہ معجزہ قرآن دیا گیا۔ اب اس کے بعد اگر متعدد معجزات کو معیار صدق قرار دیا جائے تو یہ سلسلہ ختم ہی نہ ہو سکے گا، اس لیے آپ ﷺ اور پہلے تمام رسولوں نے ایسے موقع پر معذرت کر دی کہ یہ اللہ کا کام ہے، ہم تو محض بشر اور رسول ہیں۔

آیت 94 وَمَا مَنَعَهُ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا : یعنی یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ ایک شخص بشر ہوتے ہوئے اللہ کا رسول

قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مُلْكَةٌ يَنْشُونَ مُظْهِرِينَ لَنَزَلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا ﴿۹۵﴾ قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿۹۶﴾
وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۗ وَ مَنْ يُضِلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِهِ ۗ

کہہ دے اگر زمین میں فرشتے ہوتے، جو مطمئن ہو کر چلتے (پھرتے) تو ہم ضرور ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ پیغام پہنچانے والا اتارتے ﴿۹۵﴾ کہہ دے میرے درمیان اور تمہارے درمیان گواہ کے طور پر اللہ کافی ہے، بے شک وہ ہمیشہ سے اپنے بندوں کی پوری خبر رکھنے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ﴿۹۶﴾ اور جسے اللہ ہدایت دے سو وہی ہدایت پانے والا

کیسے ہو سکتا ہے، اگر اللہ کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کسی فرشتے کو بھیج دیتا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے بشر ہونے کو جانتے تھے، آپ کے آبا و اجداد اور ازواج و اولاد، کھانے پینے، چلنے پھرنے اور دوسری تمام انسانی ضروریات کو دیکھتے تھے، اس لیے آپ کو رسول ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اب بہت سے مسلمان کہلانے والے جو باپ دادا سے مسلمان چلے آ رہے ہیں، محمد ﷺ کو رسول مانتے ہیں، مگر آپ کو بشر ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں، کیونکہ مشرکین عرب اور ان لوگوں کا ذہن ایک ہے۔ انھوں نے کہا، بشر رسول نہیں ہو سکتا اور انھوں نے کہا، رسول بشر نہیں ہو سکتا۔ ”فَمَا أَشْبَهَ اللَّيْلَةَ بِاللَّيْلِ“ (سو آج کی رات کل رات سے کس قدر ملتی جلتی ہے) اللہ تعالیٰ نے کفار کا یہ شبہ کنی آیات میں بیان فرمایا ہے، دیکھیے سورہ یونس (۲)، تغابن (۶)، سورہ ق (۲۱) اور انعام (۹، ۸) حقیقت یہ ہے کہ ان سب لوگوں نے اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں بشر کے مقام اور عزت و کرامت کو پہچانا ہی نہیں۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۷۰)۔

آیت 95 قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مُلْكَةٌ : ”مُظْهِرِينَ“ یعنی اگرچہ فرشتے اب بھی زمین پر آتے جاتے ہیں، لیکن اگر وہ انسانوں کی طرح اطمینان سے زمین پر رہ رہے ہوتے تو ہم ان کی طرف کسی فرشتے ہی کو رسول بھیجتے، مگر جب زمین پر ہم نے انسانوں کو بسایا ہے تو ان کی طرف ایک فرشتے کو رسول بنا کر بھیجنے سے کیا فائدہ؟ رسول کا کام صرف اس پیغام کو پہنچانا دینا ہی نہیں بلکہ وہ لوگوں کے لیے عملی نمونہ بھی ہوتا ہے، تاکہ وہ اس کی پیروی کر سکیں۔ یہ مفہوم کہ رسول کا اپنی امت کا ہم جنس ہونا ضروری ہے، کئی آیات میں بیان ہوا ہے۔ دیکھیے سورہ انبیاء (۷)، ابراہیم (۴) اور سورہ انعام (۹، ۸)۔

آیت 96 قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ : ”كَفَى بِاللَّهِ“ کی ترکیب اور تفسیر کے لیے دیکھیے بنی اسرائیل (۱۵) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو سارا معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہوئے ان سے بحث اور جھگڑا ترک کرنے کا حکم دیا، یعنی آپ کہہ دیجیے کہ اگر میں اپنے دعوائے نبوت میں جھوٹا ہوتا تو وہ میری سخت گرفت کرتا۔ (دیکھیے حاق ۴۳: ۴۶) اور پھر اسے ہمیشہ سے خوب معلوم ہے کہ کون شخص انعام و احسان اور ہدایت پانے کے لائق ہے اور کون عقاب و عذاب اور گمراہی کے۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے اور کفار کے لیے وعید۔

آیت 97 وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ : نبوت پر ان کے شبہات کا جواب دینے کے بعد اب انھیں وعید سنائی۔ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُبْيًا وَ بَلْمًا وَ صَمًّا ۗ مَا لَهُمْ جَهَنَّمَ كَلْمًا

حَبَّتْ زِدْنَهُمْ سَعِيرًا ﴿۱۷﴾

ہے اور جنہیں گمراہ کر دے تو تو ان کے لیے اس کے سوا ہرگز کوئی مدد کرنے والے نہیں پائے گا اور قیامت کے دن ہم انھیں ان کے چہروں کے بل اندھے اور گونگے اور بہرے اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب کبھی بھنے لگے گی ہم ان پر بھڑکانا زیادہ کر دیں گے ﴿۱۷﴾

مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے بل بوتے پر یا اپنی عقل، علم یا کسی اور چیز کی بنیاد پر براہِ حق نہیں پاسکتا اور نہ اس پر ثابت قدم رہ سکتا ہے، بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق اور دیکھیری ہے جو کسی کو براہِ حق دکھاتی ہے اور اگر انسان کی بدبختی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی توفیق انسان کے شامل حال نہ ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اسے راہِ راست پر نہیں لاسکتی۔ اس سے مقصود آپ ﷺ کو تسلی دینا ہے۔ (رازی) ”وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ“ میں ہدایت یافتہ کو واحد کے صیغے سے اور ”وَمَنْ يُضِلِلْ فَلَنْ يَجْعَلَ لَهُمْ آوِيَاءً“ میں گمراہ کردہ لوگوں کو جمع کے صیغے سے بیان فرمایا، اس میں حکمت یہ ہے کہ ہدایت کا راستہ ایک ہے، اس پر چلنے والے ایک ہی جماعت ہیں، جبکہ ضلالت کے بے شمار راستے ہیں اور ان پر چلنے والے گروہ بے شمار ہیں۔ (واللہ اعلم)

﴿۱۷﴾ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ : یعنی منہ کے بل چلیں گے، جیسے دنیا میں پاؤں کے بل چلتے تھے۔ اُس دن ان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ”لوگ اپنے چہروں پر کس طرح اکٹھے کیے جائیں گے؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «الْبِيسُ الَّذِي أَمْشَاهُ عَلَى الرَّجُلَيْنِ فِي الدُّنْيَا قَادِرًا عَلَىٰ أَنْ يُسْبِيَهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟» [بخاری، التفسیر، سورۃ الفرقان، باب قوله: ﴿الَّذِينَ يَحْمِلُونَ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ﴾: ۴۷۶۰۔ مسلم: ۲۸۰۶] ”جس نے ان کے پاؤں کے بل چلایا ہے وہ انھیں ان کے چہروں کے بل چلانے پر بھی قادر ہے۔“ ایک مطلب یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن انھیں منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈالا جائے گا، جیسے فرمایا: ﴿يَوْمَ يُنْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ﴾ [القمر: ۴۸] ”جس دن وہ آگ میں اپنے چہروں پر گھسیٹے جائیں گے، چکھو آگ کا چھونا۔“ دونوں صورتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں کہ حشر کے دن وہ منہ کے بل لٹے چلتے ہوئے آئیں گے، پھر فرشتے چہروں کے بل گھسیٹتے ہوئے انھیں جہنم میں پھینک دیں گے۔

﴿۱۸﴾ غُنْيًا وَ بَلْمًا وَ صَمًّا : اندھے، گونگے اور بہرے۔ بعض آیات میں ان کے قیامت کے دن دیکھنے، بولنے اور سننے کا ذکر آیا ہے، تو ایک تطبیق یہ ہے کہ قیامت کے پچاس ہزار سال کے برابر دن کے مختلف اوقات میں ان کی مختلف حالتیں ہوں گی۔ دوسری یہ کہ وہ جمالِ الہی کے دیدار اور جنت کی نعمتوں کے دیکھنے سے محروم ہوں گے، کوئی خوش کن خبر نہیں سنیں گے اور نہ کوئی دلیل بیان کرنے کی طاقت ہوگی، ورنہ حواسِ خمسہ ظاہرہ کے اعتبار سے تو وہ بہت سننے اور دیکھنے والے ہوں گے۔ دیکھیے سورۃ مریم (۳۸) اور سورۃ طور (۱۳، ۱۵)۔

﴿۱۹﴾ كَلَّمَا حَبَّتْ زِدْنَهُمْ سَعِيرًا : ”حَبَّت“ اصل میں ”حَبَبْتُ“ ہے، ”حَبَبْتُ يَحْبُو“ سے واحد مؤنث غائب ماضی معلوم

ذٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاٰيَاتِنَا وَ قَالُوْا اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَ رُفَاتًا ؕ اِنَّا لَسَبْعُوْنُوْنَ
 خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۸۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ
 مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبٰى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

یہی ان کی جزا ہے، کیونکہ انھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو گئے تو کیا واقعی ہم ضرور نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جانے والے ہیں؟ ﴿۸۸﴾ اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اس پر قادر ہے کہ ان جیسے پیدا کر دے اور اس نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے، جس میں کچھ شک نہیں، پھر (بھی) ظالموں نے کفر کے سوا (ہر چیز سے) انکار کر دیا ﴿۸۹﴾

ہے، مصدر ”خَبُوا وَ خُبُوا“ ہے، آگ کی تیزی کا ہلکا ہونا یا بجھنا، یعنی عذاب کبھی ہلکا نہ ہوگا، جیسے فرمایا: ﴿فَلَا يُخَفِّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابَ وَلَا هُمْ يُنصَّرُونَ﴾ [البقرہ: ۸۶] ”سو نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔“

آیت 98 ذٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ : اس آیت میں ان کی سزا کا سبب بیان فرمایا۔ دیکھیے بنی اسرائیل (۳۹)۔

آیت 99 ﴿۱﴾ ”اَوَلَمْ يَرَوْا“ کا معنی ”اَوَلَمْ يَعْلَمُوْا“ ہے، یعنی ”کیا انھیں معلوم نہیں؟“ دیکھیے سورہ نمل اور ابراہیم (۲۳) مطلب یہ کہ انھیں معلوم ہے۔ ”لَمْ“ کے اوپر ہمزہ استفہام برائے توجیح آیا تو اثبات کا مفہوم پیدا ہو گیا، کیونکہ نفی کی نفی اثبات ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ : یہ ان کے قیامت کے انکار کا عقلی جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ جس نے آسمان و زمین کو پیدا فرمایا، وہ ان جیسوں کو بھی پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، کیونکہ زمین و آسمان کی پیدائش ان کی پیدائش سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ دیکھیے سورہ نمل (۸۱)، احقاف (۳۳)، مؤمن (۵۷) اور نازعات (۲۷)۔

﴿۳﴾ اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ : ”ان جیسوں“ سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کو دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ ”مِثْلَهُمْ“ کا لفظ تحقیر کے لیے ہے، جیسے کہا جاتا ہے، تیرے جیسے ذلیل ہی ہوتے ہیں، تیرے جیسوں کی کیا مجال ہے؟ مطلب یہ کہ تمہاری کیا مجال ہے؟ دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ جس نے آسمان و زمین پیدا کیے وہ اس بات پر قادر ہے کہ ان کی جگہ ان جیسے اور لوگ پیدا کر دے جو اسے ایک مانیں، اس قسم کے فاسد شبہات سے پاک ہوں اور قیامت برپا کرنے میں اس کی کمال حکمت کے قائل ہوں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ﴾ [محمد: ۳۸] ”اور اگر تم پھر جاؤ تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے۔“ دونوں معنی ہی درست ہیں۔

﴿۴﴾ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا : ”جَعَلَ“ کا عطف ”قَادِرٌ“ پر ہے جو ”قَدْرٌ“ کی طرح ہے، یعنی وہ ان جیسے لوگ پیدا کرنے پر قادر ہے اور اس نے ان سب کے مرنے اور دوبارہ اٹھائے جانے کا وقت مقرر کر رکھا ہے، جس کی آمد میں کوئی شبہ نہیں، لہذا محض تاخیر کو دیکھ کر دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار سراسر حماقت ہے۔ دیکھیے سورہ ہود (۱۰۳، ۱۰۴)۔

قُلْ لَوْ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّي إِذًا لَأَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْإِنْفَاقِ ۗ وَكَانَ
 الْإِنْسَانُ قَتُورًا ۗ ﴿۱۰۰﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَمَسَّلَ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ جَاءَهُمْ
 فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يُمُوسَىٰ سَحُورًا ﴿۱۰۱﴾

کہہ دے اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو اس وقت تم خرچ ہو جانے کے ڈر سے ضرور
 روک لیتے اور انسان ہمیشہ سے بہت بخیل ہے ﴿۱۰۰﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو نو واضح نشانیاں دیں، سو بنی اسرائیل
 سے پوچھ، جب وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا یقیناً میں تو تجھے اے موسیٰ! جادو زدہ سمجھتا ہوں ﴿۱۰۱﴾

آیت 100 ﴿۱﴾ قُلْ لَوْ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ.....: یعنی اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے، جن کے ختم
 ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں، تب بھی تم کسی کو پھوٹی کوڑی نہ دیتے۔ اس شدید بخل کا نتیجہ ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کا بھی کسی کو
 نعمت عطا کرنا برداشت نہیں، نہ تمہیں یہ برداشت ہے کہ اللہ نے محمد ﷺ کو نبوت سے سرفراز فرمایا، اس لیے کہ تم محمد ﷺ کی
 نبوت و رسالت پر حسد و بخل کرتے ہو۔ یہ دونوں صفات بے حد قبیح ہیں۔ اس کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے سورہ نساء (۵۳)
 (۵۵ تا) روح المعانی میں ہے کہ ما قبل سے رابط میں مختلف اقوال ہیں مگر ان میں تکلف ہے۔

﴿۲﴾ وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا: "قَتَرَ يَفْتَرُ قَتْرًا وَ قَتُورًا" (ن، ض) خرچ میں تنگی کرنا، شدید بخل، حتیٰ کہ اپنی ذات پر خرچ کرنے میں
 بھی بخل کرے۔ اس میں انسان کی طبعی اور جبلتی خصلت بیان فرمائی ہے، جو ہمیشہ سے اس میں پائی جاتی ہے اور جس سے چھٹکارا
 انہی اعمال کی بدولت ہو سکتا ہے جو "مرد بلوغ" (تھزدلامرد) کے علاج کے لیے سورہ معارج کی آیات (۱۹ تا ۲۵) میں بیان ہوئے ہیں۔

آیت 101 ﴿۱﴾ وَ لَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى تِسْعَ آيَاتٍ.....: یعنی ہم موسیٰ ﷺ کو ایسے نو (۹) معجزے دے چکے ہیں جو ان کی نبوت
 پر کھلی نشانی تھے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے اور قریش کو اس مطالبے کا جواب دیا ہے جو انھوں نے نبی ﷺ سے
 کیا تھا کہ ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ یہ کام کر کے نہ دکھا دیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ سے تو چھ معجزوں کا
 مطالبہ کیا گیا ہے، ہم نے موسیٰ ﷺ کو نو معجزے دیے، مگر نہ ماننے والوں نے پھر بھی نہ مانا۔ ان نو (۹) معجزوں کا ذکر سورہ
 اعراف کی آیات (۱۰۷، ۱۰۸، ۱۳۰، ۱۳۳) میں ہے۔ بعض نے ان سے شریعت کے نو (۹) احکام مراد لیے ہیں جو تمام
 شریعتوں میں ثابت تھے، مگر صحیح یہی ہے کہ یہاں نو (۹) معجزات ہی مراد ہیں وہ نو احکام دراصل تورات میں مذکور نو وصیتیں ہیں
 جو بنی اسرائیل کو دی گئیں، ان کا فرعون کے سامنے پیش کیے گئے معجزوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی دلیل سورہ نمل کی آیات
 (۱۰ تا ۱۲) ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے عصائے موسیٰ اور ید بیضا کا ذکر کر کے فرمایا: ﴿فِي تِسْعَ آيَاتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ﴾
 [النمل: ۱۲] یعنی یہ دونوں ان نو (۹) معجزوں میں شامل تھے جو موسیٰ ﷺ کو دے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا۔
 موسیٰ ﷺ کو اور معجزات بھی دیے گئے، مثلاً پتھر سے بارہ چشمے جاری ہونا، گائے کا حصہ مارنے سے مردہ زندہ ہونا، من و سلوٹی،
 بادلوں کا سایہ، پہاڑ کا اکھڑ کر ان پر اکھڑا ہونا وغیرہ، مگر یہ بنی اسرائیل کے لیے تھے۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنزَلَ هَؤُلَاءِ إِلَّا رَبَّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بِصَاطِرٍ وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ
يُفْرَعُونَ مَثُورًا ﴿۱۰۲﴾ فَأَرَادَ أَنْ يَنْتَفِرَهُمْ مِنَ الْأَرْضِ فَأَغْرَقْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ جَمِيعًا ﴿۱۰۳﴾
وَقُلْنَا مِنْ بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا
بِكُمْ لَقِيفًا ﴿۱۰۴﴾

اس نے کہا بلاشبہ یقیناً تو جان چکا ہے کہ انھیں آسمانوں اور زمین کے رب کے سوا کسی نے نہیں اتارا، اس حال میں کہ واضح دلائل ہیں اور یقیناً میں تو اسے فرعون! تجھے ہلاک کیا ہوا سمجھتا ہوں ﴿۱۰۲﴾ تو اس نے ارادہ کیا کہ انھیں اس سرزمین سے پھسلا دے تو ہم نے اسے اور جو اس کے ساتھ تھے، سب کو غرق کر دیا ﴿۱۰۳﴾ اور ہم نے اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس سرزمین میں رہو، پھر جب آخرت کا وعدہ آئے گا ہم تمہیں اکٹھا کر کے لے آئیں گے ﴿۱۰۴﴾

﴿۱۰۲﴾ إِنْ لَأَظُنُّكَ يُنُوسِي فَسَحُورًا: یہ بالکل اسی قسم کا الزام ہے جو کفار مکہ آپ ﷺ کو دیتے تھے، جیسا کہ قرآن میں ہے: ﴿إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا فَسَحُورًا﴾ [بنی اسرائیل: ۴۷] "تم پیروی نہیں کرتے مگر ایسے آدمی کی جس پر جادو کیا گیا ہے۔" ہر زمانے میں باطل پرست ناقابل تردید دلائل سن کر حق پرستوں کے بارے میں ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔

آیت 102 ﴿قَالَ لَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنزَلَ هَؤُلَاءِ...﴾: یعنی مجھ پر تو کسی نے جادو نہیں کیا، مگر تو جو ان معجزات کو دیکھ لینے اور ان کے اللہ کی طرف سے ہونے کے یقین کے باوجود اپنی ضد پر قائم ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیری تباہی کے دن قریب آگئے ہیں۔ "ثُبُورٌ" کا معنی ہلاکت ہے۔ دیکھیے فرقان (۱۳) اس مفہوم کی آیت سورہ نمل کی آیت (۱۳) ہے۔

آیت 103 ﴿فَأَرَادَ أَنْ يَنْتَفِرَهُمْ مِنَ الْأَرْضِ...﴾: "الْأَرْضِ" میں الف لام عہد کا ہے، یعنی زمین مصر۔ یعنی فرعون کا ارادہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو بے دریغ قتل کر کے اتنا خوف زدہ کر دے کہ وہ ایک ایک کر کے ملک سے نکل جائیں۔ وہ انھیں اطمینان سے اکٹھے ہجرت کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا، مگر اس کے منصوبے دھرے رہ گئے اور اللہ تعالیٰ نے سارے بنی اسرائیل کو اکٹھے خیریت سے نکال لیا اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق کر دیا۔ ان کے غرق ہونے کا واقعہ سورہ یونس (۹۲ تا ۸۸) میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

﴿۱۰۲﴾ ابن کثیر ؒ نے فرمایا، اس آیت میں فتح مکہ کی طرف بھی اشارہ ہے، اگرچہ سورت مکی ہے۔ یہاں فرعون کا ارادہ ہے: ﴿أَنْ يَنْتَفِرَهُمْ مِنَ الْأَرْضِ﴾ اور وہاں مکہ والوں کا: ﴿وَإِنْ كَادُوا لَيَنْتَفِرُونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا﴾ [بنی اسرائیل: ۷۶] "اور بے شک وہ قریب تھے کہ تجھے ضرور ہی اس سرزمین سے پھسلا دیں، تاکہ تجھے اس سے نکال دیں۔" فرعون اپنی قوم سمیت غرق ہوا اور بنی اسرائیل وارث بنے، ادھر مشرکین مکہ مغلوب ہوئے اور رسول اللہ ﷺ وارث بنے۔

آیت 104 ﴿وَقُلْنَا مِنْ بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ...﴾: "الْأَرْضِ" سے مراد ارض شام بیان کی جاتی ہے، مگر سورہ شعراء کی آیت (۵۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار بنی اسرائیل کی حکومت فلسطین و شام کے بعد مصر پر بھی قائم ہو گئی

و بِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَّلَهُ ۚ وَ مَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَ نَذِيرًا ﴿۱۰۵﴾ وَ قُرْآنًا
فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَ نَزَلْنَاهُ تَنْزِيلًا ﴿۱۰۶﴾

اور ہم نے اسے حق ہی کے ساتھ نازل کیا اور یہ حق ہی کے ساتھ نازل ہوا اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا ﴿۱۰۵﴾ اور عظیم قرآن، ہم نے اس کو جدا جدا کر کے (نازل) کیا، تاکہ تو اسے لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور ہم نے اسے نازل کیا، (تھوڑا تھوڑا) نازل کرنا ﴿۱۰۶﴾

تھی، فرمایا: ﴿كَذَلِكَ وَأَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ [الشعراء: ۵۹] ”ایسا ہی ہوا اور ہم نے اس (مصر) کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔“ اگرچہ یہ سب فتوحات موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں نہ ہو سکیں۔ دیکھیے سورہ مائدہ (۲۰: ۲۶)۔

﴿۱۰۵﴾ قَدْ أَجَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جَعَلْنَا بِكُمْ لَفِيفًا ۚ لَفِيفًا ”لَفِيفًا“ لَفِيفًا بِالشَّيْءِ أَي ضَمُّهُ إِلَيْهِ وَ وَصْلُهُ بِهِ۔“ ”جَعَلْنَا بِكُمْ لَفِيفًا“ ”أَي مُحْتَمِلِينَ، مُخْتَلِطِينَ مِنْ كُلِّ قَبِيلَةٍ“ (قوموں) یعنی ہم اچھے و برے، مومن و کافر سب کو حشر کے میدان میں جمع کریں گے، تاکہ ان کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر دیا جائے۔

آیت 105 ﴿۱۰۵﴾ وَ بِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ ۚ یعنی اس میں جو بات بھی ہے سراسر حق ہے۔ ”وَ بِالْحَقِّ نَزَّلْنَاهُ“ اور جیسے ہم نے اتارا ویسے ہی وہ اترا ہے، درمیان میں کسی کا دخل نہیں ہوا کہ وہ کوئی کئی بیشی یا تبدیلی کر سکے۔ وحی الہی کی حفاظت کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ جن کی آیات (۲۶: ۲۸) اور اس مفہوم کے قریب سورہ انعام کی آیت (۱۱۵) ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر کر کے جو قرآن کا ذکر فرمایا تو اس سے مقصود کفار قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ آپ ﷺ سے الٹی سیدھی فرمائشیں کرنے کے بجائے اسی قرآن پر غور کیوں نہیں کرتے جو آپ ﷺ کی نبوت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

﴿۱۰۶﴾ وَ مَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَ نَذِيرًا ۚ یعنی ہم نے آپ کو یہ قدرت دے کر نہیں بھیجا کہ لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیں، بلکہ آپ کا کام صرف دعوت دینا، قبول کرنے والے کو خوش خبری دینا اور انکار کرنے والے کو جہنم سے ڈرانا ہے۔ دیکھیے سورہ ناسیہ (۲۱: ۲۲)۔

آیت 106 ﴿۱۰۶﴾ وَ قُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ ”قُرْآنًا“ پر تنوین تنظیم کی ہے اور یہ فعل محذوف ”اَتَيْنَا“ کا مفعول ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو یہ عظیم قرآن دیا، ہم نے اسے جدا جدا کر کے نازل کیا، یعنی اس کی سورتیں اور آیتیں جدا جدا رکھیں اور تقریباً تینتیس برس میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا۔ اس میں کئی حکمتیں ہیں، مثلاً یہ کہ اس کے پڑھنے، یاد کرنے، سمجھنے اور عمل کرنے میں آسانی ہو، موقع محل کے اعتبار سے اس کے مطالب ذہن نشین ہو جائیں، تاکہ آئندہ کسی آیت کے بے موقع استعمال کی گنجائش نہ رہے۔ جب بھی کفار کے طرز عمل سے کوئی پریشانی یا گھبراہٹ ہو تو اس کی آیات کے ساتھ آپ کے دل کو قائم رکھا جائے اور مسلمانوں کو کوئی مسئلہ پیش آئے یا کفار کی طرف سے کوئی اعتراض ہو تو اس کا جواب موقع پر دیا جاسکے۔ مزید دیکھیے سورہ فرقان کی آیت (۳۲: ۳۳)۔

قُلْ آمِنُوا بِهِ أَوْ لَا تُؤْمِنُوا إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُشْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ
لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَ يَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ۝ وَ يَخِرُّونَ
لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَ يَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ۝

کہہ دے تم اس پر ایمان لاؤ، یا ایمان نہ لاؤ، بے شک جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان کے سامنے
اسے پڑھا جاتا ہے وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں ۝ اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک ہے، بے
شک ہمارے رب کا وعدہ یقیناً ہمیشہ پورا کیا ہوا ہے ۝ اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں، روتے ہیں اور وہ
(قرآن) انہیں عاجزی میں زیادہ کر دیتا ہے ۝

آیت 107-109 ① قُلْ آمِنُوا بِهِ أَوْ لَا تُؤْمِنُوا: یعنی تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے اس کی عظمت نہ بڑھتی ہے اور نہ گھٹتی

ہے۔ یہ تہدید و انکار کے طور پر ان لوگوں سے خطاب ہے جو قرآن کے واضح دلائل کی موجودگی میں معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔

② إِنْ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ: یعنی تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، تم سے اچھے اور نیک اہل علم جو پچھلی آسمانی کتابوں کی
تعلیمات سے واقف ہیں اور وحی و نبوت کی حقیقت کو سمجھتے ہیں، جیسے ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن سلام، سلمان فارسی اور نجاشی، وہ
آپ کو رسول مانتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ یہ وہی پیغمبر ہے جس کی بشارت تورات و انجیل میں دی گئی ہے۔

③ إِذَا يُشْلَىٰ عَلَيْهِمْ: ”أَذْقَانِ“ ”ذَقْنِ“ کی جمع ہے، ٹھوڑیاں۔ ”إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا“ اصل میں ”إِنَّهُ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا“
تھا، یعنی حفاء اور اہل کتاب علماء کے سامنے جب قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے ٹھوڑیوں
کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں کہ اس اللہ کا احسان ہے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کا زمانہ پایا اور قرآن پر ایمان لے آئے
اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں کہ ہمارا رب وعدہ خلافی اور ہر عیب سے پاک ہے، یقیناً ہمارے رب کا وعدہ ہمیشہ پورا
ہو کر رہتا ہے، اس لیے اس نے اپنے وعدے کے مطابق آپ ﷺ کو مبعوث فرما دیا۔

④ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس آیت سے استدلال کیا کہ ”سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا“ کو سجدہ تلاوت میں پڑھنا
مستحب ہے۔ (اکلیل)

⑤ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا.....: قرآن کریم میں مذکور نصیحت سن کر شدت تاثر سے ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں روتے
ہوئے گر جاتے ہیں اور قرآن سننا ان کے خشوع اور عجز و انکسار میں اور اضافہ کر دیتا ہے، ایسے اہل کتاب کی یہ کیفیت قرآن
میں کئی جگہ بیان ہوئی ہے۔ دیکھیے ماخذہ (۸۳، ۸۴) اور قصص (۵۴، ۵۳)۔

ٹھوڑیوں کے بل گرنے کے تکرار سے مقصود دو مختلف حالتوں کو ظاہر کرنا ہے، یعنی سجدہ ریز ہو کر اللہ کی تسبیح کرنا اور سجدے
میں گر کر رونا۔ یا یہ سجدے کے تکرار کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ بار بار سجدہ کرتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”نماز میں سجدہ

قُلْ اَدْعُوا اللّٰهَ اَوْ اَدْعُوا الرَّحْمٰنَ ۗ اَيّٰمًا تَدْعُوْنَ فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى ۗ وَلَا تَجْهَرُوْا بِصَلٰتِكُمْ وَلَا تَخَافُوْا بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾

کہہ دے اللہ کو پکارو، یا رحمان کو پکارو، تم جس کو بھی پکارو گے سو یہ بہترین نام اسی کے ہیں اور اپنی نماز نہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ اسے پست کر اور اس کے درمیان کوئی راستہ اختیار کر ﴿۱۱۰﴾

دو بار ہوتا ہے، اس واسطے دو بار فرمایا کہ پہلی بار قرآن کی اعجازی تاثیر کے نتیجے میں اور دوسری بار خشوع و خضوع کے لیے۔“ (موضح) واضح رہے کہ احادیث میں اللہ کے ذکر کے وقت (جس میں قرآن بھی شامل ہے) رونے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں عرش کا سایہ حاصل کرنے والے سات خوش بختوں میں ایک وہ بندہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَقَاصَتْ عَيْنَاهُ» [مسلم، الزکاة، باب فضل احفاء الصدقة ۱۰۳۱ - بخاری: ۶۴۷۹] ”جس نے خلوت میں اللہ کو یاد کیا تو اس کی آنکھیں بہ پڑیں۔“

آیت 110 ﴿۱۱۰﴾ قُلْ اَدْعُوا اللّٰهَ اَوْ اَدْعُوا الرَّحْمٰنَ: کفار مکہ ”رحمان“ نام سے نفرت کرتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس نام سے ان کی نفرت کا تذکرہ کئی آیات میں کیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَسْجُدْوا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ؟ اَسْجُدْ لِمَا تَأْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا﴾ [الفرقان: ۶۰] ”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں اور رحمان کیا چیز ہے؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کے لیے تو ہمیں حکم دیتا ہے اور یہ بات بدکنے میں انہیں اور بڑھا دیتی ہے۔“ ان کی اس نفرت کا ذکر سورہ انبیاء (۳۶) میں بھی ہے۔ صلح حدیبیہ کا معاہدہ لکھا جانے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے کاتب سے فرمایا: ”لکھو ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ“ تو (کفار کے نمائندے) سہیل بن عمرو نے کہا: ”رحمان! اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا رحمان کیا ہے؟ بلکہ لکھو ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ“ جیسا کہ (پہلے) لکھا کرتے تھے۔“ [بخاری، الشروط، باب الشروط فى الجهاد.....]

۲۷۳۱، ۲۷۳۲] اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اللہ کو پکارو یا رحمان کو، اللہ تعالیٰ کو اس کے جس نام سے بھی پکارا جائے وہ سب ہی بہترین ہیں، جب سب ہی بہترین ہیں تو یہ دونوں کیوں بہترین نہ ہوں گے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۱۸۰) کی تفسیر۔ ﴿۱۱۰﴾ وَلَا تَجْهَرُوْا بِصَلٰتِكُمْ: ”صلوات“ سے مراد نماز میں قرآن مجید کی قراءت ہے، چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت اس وقت اتری جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں چھپے ہوئے تھے۔ آپ جب اپنے اصحاب کو نماز پڑھاتے تو قرآن پڑھتے ہوئے اپنی آواز بلند کرتے، جب مشرکین اسے سنتے تو قرآن کو اور اس کے اتارنے والے کو گالی دیتے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو فرمایا: ﴿وَلَا تَجْهَرُوْا بِصَلٰتِكُمْ﴾ اَيْ بِقِرْءَاتِكُمْ فَاسْمَعِ الْمَشْرِكُوْنَ فَيَسُبُوْا الْقُرْآنَ، ﴿وَلَا تَخَافُوْا بِهَا﴾ عَنْ اَصْحَابِكَ فَلَا تُسْمِعُهُمْ ﴿وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا﴾ [بخاری، النفس، سورہ بنی اسرائیل باب: ﴿وَلَا تَجْهَرُوْا بِصَلٰتِكُمْ وَلَا تَخَافُوْا بِهَا﴾ ۴۷۲۲] ”وَلَا تَجْهَرُوْا بِصَلٰتِكُمْ“ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی قراءت کے ساتھ آواز بلند نہ کرو کہ مشرکین اسے سنیں گے تو اسے گالی دیں گے اور نہ اسے اپنے اصحاب سے چھپا کر پڑھو، کیونکہ آپ اسے ان کو سنائیں سکیں گے اور اس کے درمیان کا کوئی راستہ تلاش کرو۔“ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ آیت

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذَّنِّ وَ كَبْرُهُ تَكْبِيرًا ۝

اور کہہ دے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کوئی اولاد بنائی ہے اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ عاجز ہو جانے کی وجہ سے کوئی اس کا مددگار ہے اور اس کی بڑائی بیان کر، خوب بڑائی بیان کرنا ۝

دعا کے متعلق نازل ہوئی۔ [بخاری، التفسیر، سورۃ بنی اسرائیل باب: ﴿ وَلَا تَحْرَبْ بَصَلَاتِكَ وَلَا تَخَافَتْ بَهَا ﴾ : ۴۷۲۳] ابوداؤد میں صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیام اللیل میں ابوبکر رضی اللہ عنہما کو پست آواز اور عمر رضی اللہ عنہما کو بلند آواز سے قراءت کرتے ہوئے سنا تو ابوبکر رضی اللہ عنہما کو کچھ بلند اور عمر رضی اللہ عنہما کو کچھ آہستہ پڑھنے کے لیے فرمایا۔ [ابوداؤد، التلوع، باب رفع الصوت بالقراءة فی صلاة اللیل : ۱۳۲۹] آیت کے الفاظ قراءت اور دعا دونوں معنوں کی گنجائش رکھتے ہیں۔

آیت 111 وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا یعنی ہر خوبی جس کی تعریف ہو سکتی ہے، خواہ وہ صفت جمال ہو یا جلال یا کمال، صرف اللہ کے لیے ہے۔ اس کے سوا کسی اور میں کوئی خوبی ہے تو اسی کی عطا کردہ ہے، اس لیے وہ بھی اسی کی خوبی ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس کے سوا کوئی خواہ کتنا ہی بڑا ہے یا تو اولاد کا محتاج ہے، کیونکہ اسے بڑھا ہونا اور فوت ہونا ہے، اس لیے زندگی میں اسے مدد کے لیے اور مرنے کے بعد وارث کے طور پر اولاد کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا، وہی سب کا وارث ہے، وہ اولاد کی محتاجی سے پاک ہے۔ پھر والد اور اولاد ایک جنس سے ہوتے ہیں، اگر اس کی اولاد ہو تو اس کا ”وَحَدُّهُ لَا شَرِيكَ لَهُ“ ہونا باقی نہیں رہتا۔ پھر ایک جیسے دو یا کئی الہ ماننا پڑیں گے، جس کا نتیجہ سورۃ انبیاء (۲۲) میں مذکور ہے۔ ”لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا“ میں یہود و نصاریٰ کا رد ہو گیا جو غزیر یا مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے تھے اور مشرکین عرب کا بھی جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور اسلام کے پردے میں چھپے ہوئے ان لوگوں کا بھی جو نبی کریم ﷺ کو یاعلیٰ، فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو اللہ کے ذاتی نور کا ٹکڑا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

خدا کے نور سے پیدا ہوئے پانچوں تن محمد است و علی، فاطمہ، حسن و حسین

یا پھر اللہ کے سوا جو بھی ہے وہ اکیلا ہر کام سرانجام نہیں دے سکتا، اس لیے بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی اپنے ولی عہد یا وزیر و مشیر کو حکومت میں شریک کرنا پڑتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اکیلا ہی پوری کائنات کا ایسا بادشاہ ہے جسے کسی شریک کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اس کے سوا ہر ایک کی زندگی میں ایسا مرحلہ آتا ہے جب اسے اپنی کمزوری یا عاجزی کی وجہ سے کسی مددگار اور حمایتی کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ عزیز ہے، سب پر غالب ہے، نہ اسے کوئی کمزوری یا بے بسی لاحق ہوتی ہے، نہ کوئی ایسا ہے جو اس کی بے بسی اور عاجزی میں اس کا پشت پناہ بنے۔ اللہ نے فرمایا کہ اے نبی! اور اے ہر مخاطب! تو اللہ تعالیٰ کے ہر خوبی اور ہر تعریف کے مالک ہونے کا اعلان کر دے، کیونکہ اس میں یہ تینوں کمزوریاں نہیں ہیں اور اس کی بڑائی جتنی ہو سکتی ہے زیادہ سے زیادہ بیان کر۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نہایت جامع آیت ہے، جس میں اللہ کی حمد، تسبیح، تہلیل اور تکبیر تمام چیزیں دلیل کے ساتھ ذکر ہوئی ہیں۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا ۝۱

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی نہ رکھی ①

کہف کا معنی پہاڑ میں کھلی اور وسیع غار ہے، تنگ غار کو ”غار“ یا ”مغارۃ“ کہتے ہیں۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے کہف والوں کا قصہ بیان فرمایا ہے، جس میں اللہ پر ایمان کی برکات بیان ہوئی ہیں کہ اس کی بدولت کس طرح آدمی دشمن سے محفوظ اور تمام دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس میں حق کہنے کی کتنی جرأت پیدا ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کیسے عجیب طریقوں سے عزت و کرامت عطا فرماتا ہے۔ (مہانگی) اس کی فضیلت میں متعدد احادیث ثابت ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ حَفِظَ عَشْرَ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِ سُورَةِ الْكَهْفِ، عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَالِ» [مسلم، صلاة المسافرين، باب فضل سورة الكهف و آية الكرسي: ۸۰۹] ”جو شخص سورہ کہف کی شروع کی دس آیات حفظ کر لے وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔“ مسلم کی اس حدیث میں اس سورت کی آخری دس آیات کی بھی یہی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ اس سورت کے پڑھنے سے گھر میں سکینت اور برکت کا نزول ہوتا ہے۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: «كَانَ رَجُلٌ يَقْرَأُ سُورَةَ الْكَهْفِ وَإِلَى جَانِبِهِ حِصَانٌ مَرْبُوطٌ بِسَطْرَيْنِ، فَتَغَشَّتُهُ سَحَابَةٌ فَجَعَلَتْ تَدْنُو وَ تَذْنُو، وَ جَعَلَ قَرَسُهُ يَنْفِرُ، فَلَمَّا أَصْبَحَ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ، فَقَالَ تِلْكَ السَّكِينَةُ نَزَلَتْ بِالْقُرْآنِ» [بخاری، فضائل القرآن، باب فضل سورة الكهف: ۵۰۱۱] ایک آدمی سورہ کہف پڑھ رہا تھا، اس کے ایک طرف ایک گھوڑا تھا جو دو درسیوں سے بندھا ہوا تھا، تو اسے بادل کے ایک کٹڑے نے ڈھانپ لیا، پھر اس نے قریب آنا شروع کر دیا اور مزید قریب آتا گیا، چنانچہ اس کا گھوڑا بند کئے لگا، جب صبح ہوئی تو وہ نبی ﷺ کے پاس آیا اور آپ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ سکینت تھی جو قرآن کے ساتھ اترتی۔“

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ مِنْ قُرْآنِ سُورَةِ الْكَهْفِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَضَاءٌ لَهُ مِنَ النُّورِ مَا بَيْنَ الْجُمُعَتَيْنِ» [مسندك حاکم: ۳۶۸/۲، ح: ۳۳۹۲، صححه الألبانی فی صحیح الجامع: ۶۴۷۰] ”جو شخص جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھے تو دو جمعوں کے درمیان اس کے لیے نور روشن رہے گا۔“

ت ۱ ① الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي : یہ سورت ان پانچ سورتوں میں شامل ہے جن کی ابتدا ”الْحَمْدُ“ کے ساتھ ہوئی ہے، دوسری چار سورتیں فاتحہ، انعام، سبأ اور فاطر ہیں۔ پچھلی سورت کا خاتمہ بھی ”الْحَمْدُ“ کے ساتھ ہوا ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہر کام کی ابتدا اور انتہا اللہ کے پاکیزہ نام کے ساتھ یا اس کی حمد کے ساتھ کرنی چاہیے۔ ان تمام سورتوں میں سے ہر سورت کا طریقہ اگرچہ مختلف ہے مگر مقصود لوگوں کو اس بات کا یقین دلانا ہے کہ حمد کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، اور کوئی نہیں، کیونکہ کسی میں کوئی خوبی ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے۔

قِيَمًا لِّيُنذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا لِّمَن لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا ۝

بالکل سیدھی، تاکہ وہ اس کی جانب سے آنے والے سخت عذاب سے ڈرائے اور ان مومنوں کو جو نیک اعمال کرتے ہیں، خوش خبری دے کہ بے شک ان کے لیے اچھا اجر ہے ۝

② الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ : سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کے تمام حمد کا مالک ہونے کی دلیل کے لیے چار صفات بیان ہوئی ہیں، یہاں اللہ تعالیٰ کے تمام حمد اور خوبیوں کا مالک ہونے کی ایک ہی دلیل بیان کی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے پر ”الْكِتَابَ“ نازل فرمانا ہے۔ کیونکہ دوسرے تمام انعامات اگرچہ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں مگر یہ نعمت سب سے اہم ہے، کیونکہ اس پر ہمیشہ کی زندگی یعنی اخروی کامیابی یا ناکامی کا دار و مدار ہے۔

③ عَلَى عَبْدِهِ: ”اپنے بندے پر، اپنے غلام پر“ اس میں رسول اللہ ﷺ کو اپنا خاص عبد قرار دینے میں آپ ﷺ کی بے انتہا شان بیان ہوئی ہے، اگرچہ زمین و آسمان میں رہنے والی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی غلام ہے، مگر ”اپنا غلام“ کہنے میں آپ ﷺ کو جو عزت ملی وہ بہت کم لوگوں کو ملی ہے، جیسا کہ ﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ﴾ [بنی اسرائیل: ۱۰] میں ہے اور اس کتاب کی بھی تعریف ہے جو نازل کی گئی۔ ”الْكِتَابَ“ میں الف لام عہد کا ہے، یعنی یہ کتاب، مراد قرآن کریم ہے، کیونکہ جب صرف ”الْكِتَابَ“ کہا جائے تو قرآن کریم ہی مراد ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کے سوا کسی اور میں یہ کمال ہی نہیں کہ اسے ”الْكِتَابَ“ کہا جاسکے۔

④ وَ لَوْ يَجْعَل لِّهٖ عِوَجًا : ”عِوَجًا“ کجی، ٹیزھا پن۔ ”عِوَجًا“ پر توین عموم کے لیے ہے جو نفی کے بعد آکر مزید عام ہو گیا ہے، یعنی اس کتاب میں کسی بھی قسم کا کوئی ٹیزھا پن نہیں، نہ الفاظ میں، نہ معانی میں، نہ فصاحت و بلاغت میں، نہ یہ کہ اس کی آیات کا آپس میں کوئی اختلاف ہو، یا اس کی کوئی خبر غلط نکلے، یا کوئی حکم حکمت سے خالی ہو۔ دیکھیے زمر (۲۸)، بنی اسرائیل (۱۰۲۹) اور نساء (۸۴)۔

آیت 2 ① ”قِيَمًا“ میں مبالغہ ہے، یعنی بالکل سیدھی، پہلے فرمایا تھا کہ اس میں کوئی کجی نہیں رکھی، اب فرمایا بالکل سیدھی ہے۔ بات ایک ہی ہے مگر اس تاکید کا فائدہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایک چیز میں بظاہر کوئی کجی نہیں ہوتی، مگر حقیقت میں اور باریکی سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی نہ کوئی کجی ہوتی ہے، اس سے اس کی بھی نفی ہوگئی۔ جیسے ایک جگہ ہموار نظر آتی ہے مگر آلہ رکھ کر دیکھیں تو پتا چلا ہے کہ ہموار نہیں۔ ”قِيَمًا“ کا معنی نگران بھی ہے، ”مُهَيِّمِينَ“ کا بھی یہی معنی ہے۔ (دیکھیے مائدہ: ۳۸) اس صورت میں مراد یہ ہوگی کہ یہ کتاب پچھلی تمام کتابوں پر نگران ہے، یعنی ان کے مضامین کا درست یا تحریف شدہ ہونا اس کتاب کی تصدیق یا تکذیب سے معلوم ہوتا ہے۔

② لِّيُنذِرَ بَأْسًا..... : یہاں یہ بتایا کہ اس کتاب کو اپنے بندے پر اس لیے نازل فرمایا کہ وہ اس سخت عذاب سے ڈرائے جو

مَا كَيْفَ فِيهِ آيَاتٌ ۚ وَ يُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۗ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ
وَلَا لِآبَائِهِمْ ۚ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۗ إِنَّ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ۝

جس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ۝ اور ان لوگوں کو ڈرائے جنہوں نے کہا اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے ۝ نہ انہیں
اس کا کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو۔ بولنے میں بڑی ہے، جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے، وہ سراسر جھوٹ
کے سوا کچھ نہیں کہتے ۝

اس کی جانب سے ہوگا، مگر یہ نہیں بتایا کہ کسے ڈرائے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ مراد عموم ہے، یعنی کافر و مومن ہر ایک کو اللہ کی
جانب سے آنے والے سخت عذاب سے ڈرائے، یا یہ کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں بتائی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَيُنذِرَ
الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا﴾ [الکہف: ۴] ”اور (تاکہ) ان لوگوں کو ڈرائے جنہوں نے کہا اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی
ہے۔“ اس آیت (۳) میں یہ نہیں بتایا کہ کس چیز سے ڈرائے، اس کا ذکر زیر تفسیر آیت (۲) میں ہے کہ اس کی جانب سے
آنے والے سخت عذاب سے ڈرائے۔ دونوں آیات کو ملائیں تو مضمون یہ بنے گا: ”تاکہ ان لوگوں کو اپنی جانب سے آنے والے سخت
عذاب سے ڈرائے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے۔“ دونوں آیتوں میں ڈرانے کا ذکر دو بار آیا ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ اس کتاب اور پیغمبر کے فرائض میں ڈرانے کا فریضہ زیادہ اہم ہے، کیونکہ ایمان نہ لانے والے زیادہ ہیں، جن
میں سے کوئی مسیح علیہ السلام کو اور کوئی عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتا ہے، کوئی فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتا ہے، کوئی اپنے انبیاء و اولیاء
کو اللہ کے نور کا ٹکڑا اور کوئی انہیں عین اللہ تعالیٰ قرار دیتا ہے، جیسا کہ نصرانیوں نے کہا: ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾
[المائدہ: ۷۲] ”بے شک اللہ مسیح ابن مریم ہی تو ہے۔“ اور ہماری امت کے ایک ظالم نے کہا ہے۔

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ کتاب ان سب کو اس کی جانب سے آنے والے سخت عذاب سے ڈراتی ہے، خواہ وہ دنیا و آخرت
دونوں میں ہو یا صرف آخرت میں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد رکھنے کی تردید کے لیے دیکھیے سورہ مریم (۹۵ تا ۹۸) ”يُنذِرُ
سے عذاب کی ہولناکی بیان کرنا مقصود ہے۔

آیت 5 ﴿۱﴾ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ.....: یعنی اللہ کی اولاد ہونے کی کوئی دلیل نہ ان کے پاس ہے اور نہ ان کے آباء کے
پاس، کیونکہ علم وہ ہے جس کی کوئی دلیل ہو۔ ان کے باپ دادا نے کسی علم کے بغیر محض جہل سے یہ بات نکالی اور انہوں نے
محض جہالت کی بنا پر ان کی تقلید کی۔ امین قیم رحمہ اللہ نے تقلید کے بارے میں کیا خوب کہا۔

الْعِلْمُ قَالَ اللَّهُ قَالَ رَسُولُهُ مَا ذَاكَ وَالْتَقَلِيدُ يَسْتَوِيَانِ
إِذْ أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ أَنَّ مُقَلِّدًا لِلنَّاسِ وَالْأَعْمَى هُمَا سَيِّئَانِ

”علم وہ ہے جو اللہ نے فرمایا اور اس کے رسول نے فرمایا۔ یہ اور تقلید برابر نہیں ہیں، کیونکہ علماء کا اتفاق ہے کہ لوگوں کی تقلید

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسِكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا ⑥

پس شاید تو اپنی جان ان کے پیچھے غم سے ہلاک کر لینے والا ہے، اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے ⑥

کرنے والا اور اندھا دونوں برابر ہیں۔“

⑥ **كَبُرَتْ كَلِمَةً** : ”كَبُرَتْ“ ذمت کے لیے فعل ماضی ہے، گویا افعال مدح و ذم کے قبیل سے ہے۔ ”كَبُرَتْ“ فعل ذم ہے، اس کا فاعل ”ہی“ محذوف ہے، ”كَلِمَةً“ تیز ہے، یعنی یہ جو کچھ انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے، یہ بطور کلمہ (یعنی منہ سے بولنے کے لحاظ سے) ہی بہت بڑی بات ہے، کجا یہ کہ اس کا عقیدہ رکھا جائے۔ اس میں کچھ تعجب کا اظہار بھی ہے کہ کتنی بڑی بات انھوں نے اپنے منہ سے نکال دی۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا ۗ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِذَا ۗ تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَخَطَّوْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَنَخِرَ الْجِبَالُ تَوَدًا ۗ إِنَّ دَعْوَةَ الْرَّحْمَنِ لَوْلَا ۗ وَمَا يَسْتَجِيبُ لِلرَّحْمَنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ۗ إِنَّ كُلَّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتَى الرَّحْمَنِ عَبْدًا ۗ لَقَدْ أَحْضَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۗ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا﴾ [مریم : ۸۸ تا ۹۵] ”اور انھوں نے کہا رحمان نے کوئی اولاد بنا لی ہے۔ بلاشبہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات کو آئے ہو۔ آسمان قریب ہیں کہ اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ڈھکے کر گر پڑیں کہ انھوں نے رحمان کے لیے کسی اولاد کا دعویٰ کیا، حالانکہ رحمان کے لائق نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام بن کر آنے والا ہے۔ بلاشبہ یقیناً اس نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور انھیں خوب اچھی طرح گن کر شمار کر رکھا ہے اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اس کے پاس اکیلا آنے والا ہے۔“

آیت 6 : ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسِكَ : ”بَاخِعٌ“ ”بَخِعٌ يَبْخَعُ نَفْسَهُ“ اس نے اپنے آپ کو غم سے مار ڈالا۔ ”لَعَلَّ“ کا لفظ محبوب چیز کے لیے بولا جائے تو ترجمی، یعنی امید کرنا مراد ہوتا ہے اور ایسی چیز کے لیے بولا جائے جس کا خطرہ ہو تو اسے اشفاق یعنی ڈرنا کہا جاتا ہے، یہاں یہی مراد ہے۔ اس آیت سے مقصود آپ ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے پر آپ اپنے آپ کو رنج و غم سے کیوں گھلا رہے ہیں؟ اس آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو اپنی قوم کے ایمان نہ لانے کا کس قدر صدمہ تھا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ”بَاخِعٌ نَفْسِكَ“ (اپنے آپ کو ہلاک کر لینے والے) کے الفاظ استعمال فرمائے۔ مزید دیکھیے سورہ شعراء (۳) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ النَّاسِ كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ جَعَلَ الْفَرَاشُ وَهَذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِي تَفْعُ فِي النَّارِ يَقَعْنَ فِيهَا، فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَبْرُؤُهُمْ وَيَعْلِبُهُ، فَيَقْتَحِمْنَ فِيهَا، فَأَنَا آخِذٌ بِحُجْرِكُمْ عَنِ النَّارِ وَأَنْتُمْ تَقْتَحِمُونَ فِيهَا﴾ [بخاری، الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصي : ۶۴۸۳ - مسلم : ۲۲۸۴/۱۶] ”میری اور لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک آگ خوب بھڑکائی، جب اس نے اس کے ارد گرد کو روشن کر دیا تو پروانے اور اس قسم کے جانور اس آگ میں گرنے لگے۔ وہ اس میں گرتے تھے اور وہ شخص انھیں روکتا تھا اور وہ اس سے زبردستی آگ میں گھستے تھے۔ تو میں آگ سے بچانے کے

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لِّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ
مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ﴿۸﴾ أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيِّمِ كَانُوا مِنْ
آيَاتِنَا عَجَبًا ﴿۹﴾

بے شک ہم نے زمین پر جو کچھ ہے اس کے لیے زینت بنایا ہے، تاکہ ہم انہیں آزمائیں ان میں سے کون عمل میں
بہتر ہے ﴿۷﴾ اور بلاشبہ ہم جو کچھ اس پر ہے، اسے ضرور ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں ﴿۸﴾ یا تو نے خیال کیا کہ
غار اور کتبے والے ہماری نشانیوں میں سے ایک عجیب چیز تھے؟ ﴿۹﴾

لے تمہاری کردوں کو پکڑنے والا ہوں اور تم زبردستی اس میں گھستے ہو۔“ مزید دیکھیے سورۃ قاطر (۸)، نمل (۷۰) اور نمل (۷۷)۔
”عَلَى الْأَرْضِ“ ان کے قدموں کے نشانات پر، یعنی ان کے پیچھے۔ ”أَسْفًا“ بہت زیادہ فکر و غم، یہ مفعول لڑ ہے، یعنی غم کی وجہ سے۔
آیت 7 ﴿۷﴾ إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لِّهَا..... یعنی ہم نے زمین پر جو کچھ بھی ہے، حیوان، انسان، پودے، ندی نالے،
سمندر اور پہاڑ، غرض ہر چیز اس زمین کی زینت بنائی ہے۔ زینت کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے آل عمران (۱۳) مقصد
انسانوں کی آزمائش ہے کہ ان میں سے عمل میں کون زیادہ اچھا ہے، کون دنیا کی جگہ حج کی طرف دوڑتا ہے اور کون اس کو چھوڑ
کر آخرت کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔

آیت 8 ﴿۸﴾ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا..... ”صَعِيدًا“ مٹی، کیونکہ وہ سمندر سے اوپر اٹھی ہوئی ہے۔ ”صَعِيدًا يَصْعَدُ“
چڑھنا۔ ”جُرُزًا“ چٹیل زمین، جس میں کوئی سبزہ نہ ہو۔ ”جُرُزَاتِ الْأَرْضِ“ قحط یا ندی دل کی وجہ سے زمین پر کوئی اگی
ہوئی چیز نہ رہ گئی۔ سورۃ سجدہ میں فرمایا: ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ
وَأَنْفُسُهُمْ أَفَلَا يُبْصِرُونَ﴾ [السجدة: ۲۷] ”اور کیا اس بات نے ان کی رہنمائی نہیں کی کہ ہم پانی کو چٹیل زمین کی طرف
ہانک کر لے جاتے ہیں، پھر اس کے ذریعے کھیتی نکالتے ہیں جس میں سے ان کے چوپائے کھاتے ہیں اور وہ خود بھی، تو کیا وہ
نہیں دیکھتے؟“ ان دونوں آیتوں میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ کفار جن چیزوں پر اترارے ہیں وہ سب چند دن کے
لیے زمین کی زینت ہیں، پھر ایک وقت آنے والا ہے کہ نہ اس پر کوئی مکان رہے گا نہ باغ، نہ سبزہ، نہ جانور، نہ آدمی، یعنی یہ
ساری چٹیل پہل ختم ہو جائے گی۔

آیت 9 ﴿۹﴾ ﴿۹﴾ أَمْ حَسِبْتَ.....: ”الکھف“ پہاڑ میں وسیع غار۔ ”الرَّقِيِّمِ“ بمعنی ”مَرْقُومٌ“ یعنی لکھی ہوئی تختی یا
کتاب والے۔ ان لوگوں کو ”اصحاب الرقيم“ اس لیے کہتے ہیں کہ جب وہ اچانک غائب ہو گئے اور بہت تلاش کے باوجود نہ ملے تو
ان کے نام ایک تختی یا سل پر لکھ کر خزانے میں محفوظ کر دیے گئے، یا یہ کہ ان کے پاس شریعت کے احکام پر مشتمل لکھی ہوئی کتاب
تھی۔ (شقیلی) یا یہ کہ ان کے جاگنے کے بعد لوگوں نے غار پر ایک تختی نصب کر دی جس پر ان کے نام لکھے ہوئے تھے۔

﴿۹﴾ أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ.....: اس آیت کی تفسیر جو اکثر مفسرین، مثلاً طبری، ابن کثیر، شقیلی رحمہ اللہ نے کی ہے، یہ

إِذْ أَوَى الْفِتْيَةَ إِلَى الْكَهْفِ فَعَالُوا رَبَّنَا إِنَّا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا

رَشْدًا ﴿١٥﴾

جب ان جوانوں نے غار کی طرف پناہ لی تو انھوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمیں اپنے پاس سے کوئی رحمت عطا کر اور ہمارے لیے ہمارے معاملے میں کوئی رہنمائی مہیا فرما ﴿١٥﴾

ہے کہ ”اُمّ“ مقطوعہ انکار کے لیے ہے۔ شقیلی رُتک نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرما رہے ہیں کہ کیا تم نے اصحاب کہف کے قصے کو ہماری نشانوں میں بڑی عجیب نشانی سمجھ لیا ہے۔ بے شک لوگ اسے بہت بڑی اور عجیب بات سمجھیں، مگر یہ ہماری قدرت اور عظیم نشانوں کے سامنے کچھ عجیب نہیں، کیونکہ ہمارا آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنا، پھر زمین میں اس کی زینت کی ہر چیز پیدا کرنا، پھر قیامت کے دن اسے چٹیل میدان بنا دینا اصحاب کہف کے معاملے سے بہت زیادہ عجیب ہے، جنہیں ہم نے تین سو نو (۳۰۹) سال سلائے رکھا، پھر دوبارہ اٹھا دیا۔ اس کی دلیل بہت سی آیات ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے ذکر سے پہلے زمین اور اس کی زینت پیدا کرنے، پھر اسے چٹیل میدان بنانے کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ قصہ ان چیزوں کے مقابلے میں کچھ عجیب نہیں جو اس سے کہیں بڑی ہیں۔ قرآن مجید میں بہت سی جگہ لوگوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ آسمان و زمین کو پیدا کرنا لوگوں کو پیدا کرنے سے بہت بڑی بات ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ﴾ [المؤمن: ۵۷] ”یقیناً آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنا لوگوں کو پیدا کرنے سے بہت بڑا ہے۔“ اور دیکھیے نازعات (۳۳ تا ۴۷) یاد رہے کہ ”اصحاب کہف“ اور ”اصحاب رقیم“ ایک ہی گروہ کے نام ہیں اور صحیح بخاری میں مذکور غار کے اندر پناہ لینے والے تین آدمیوں کا اس واقعہ سے تعلق بہت بعید ہے، جن میں سے ایک والدین سے حسن سلوک کرنے والا، ایک پاک دامن رہنے والا اور ایک اجرت پر مزدور رکھنے والا تھا۔ اور یہ بات یاد رکھیں کہ اصحاب کہف کے قصے، ان کے ناموں اور یہ کہ وہ زمین کے کس حصے میں تھے؟ اس سب سے متعلق نبی ﷺ سے اس کے علاوہ کوئی بات ثابت نہیں جو قرآن سے زائد ہو۔ مفسرین نے ان کے متعلق بہت سی اسرائیلی روایات بیان کی ہیں جن کے قابل اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔“ (شقیلی ملخصاً)

ایک اور تفسیر جو پہلی تفسیر کے علاوہ صاحب روح المعانی اور ابن عاشور رحمۃ اللہ علیہما وغیرہ نے ذکر فرمائی ہے، یہ ہے کہ ”حِسْبَان“ گمان اور علم دونوں معنوں میں آتا ہے، ہاں ”اُمّ“ انکار کے لیے نہیں بلکہ تقریری ہے، یعنی یہ بتانے کے لیے ہے کہ یقیناً یہ لوگ واقعی عجیب تھے۔ گویا یہ کہا گیا: ”اعْلَمْتُمْ اَنْهُمْ عَجِبٌ“ ”جان لے کہ یقیناً وہ لوگ بڑے عجیب تھے۔“ جیسا کہ تم کہتے ہو: ”اعْلَمْتُمْ اَنْ فُلَانًا فَعَلَّ كَذَا“ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ فلاں نے اس طرح کیا۔“ یعنی یقیناً اس نے اس طرح کیا ہے۔ ان مفسرین کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے واقعے کا عجیب ہونا ذکر کرنے کے بعد تفصیل سے واقعہ بیان کر رہے ہیں، تاکہ مخاطب کو سننے کا شوق پیدا ہو جائے۔ یہ تفسیر بھی ہو سکتی ہے۔

آیت 10 ﴿إِذْ أَوَى الْفِتْيَةَ إِلَى الْكَهْفِ.....: ”اوی“ (ض) جگہ پکڑی، پناہ لی۔ ”الْفِتْيَةُ“ ”فتی“ کی جمع قلت ہے،

فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنَا لَهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ

أَخْضَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمدًا ۝

تو ہم نے غار میں ان کے کانوں پر گنتی کے کئی سال پردہ ڈال دیا ۝ پھر ہم نے انہیں اٹھایا، تاکہ ہم معلوم کریں دونوں گروہوں میں سے کون وہ مدت زیادہ یاد رکھنے والا ہے جو وہ ٹھہرے ۝

جوان جو آغا ز شباب میں ہوں۔ ”ہَیْئَتِي“ باب تفعیل سے امر ہے، مہیا فرما، میسر فرما، ”رَشَدًا“ بھلائی، رہنمائی۔ ”اِذًا“ یا تو ”کَانُوا“ کی ظرف ہے، یا ”عَجَبًا“ کی اور یا ”اُدْکُرُ“ کی جو محذوف ہے، یعنی جب چند نوجوان جو اپنی مشرک قوم اور مشرک بادشاہ کے سامنے توحید کا برملا اظہار و اعلان کرنے کی وجہ سے انہیں مطلوب تھے، اپنے گھروں سے نکلے اور انہوں نے ایک پہاڑ کے کھلے غار میں پناہ لی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے ہمارے رب! ہمیں اپنے پاس سے، یعنی محض اپنے فضل اور اپنی جناب سے کوئی بھی رحمت جو تو چاہے عطا فرما، جیسے موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا: ﴿ رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرِ فَحَقِیْذٌ ﴾ [الفصص: ۲۴] ”اے میرے رب! بے شک میں، جو بھلائی بھی تو میری طرف نازل فرمائے، اس کا محتاج ہوں۔“ رحمت میں کھانا پینا، امن و اطمینان اور ضرورت کی ہر چیز شامل ہے۔ ”ہَیْئَتِي لَمَّا اَفْرَا رَشَدًا“ اور ہمارے لیے اس معاملے میں کوئی رہنمائی عطا فرما کہ ہم کیا کریں۔

آیت ۱۱ ﴿ فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ : ”فَضَرَبْنَا“ کا مفعول مقدر ہے، یعنی ”جَحَابًا“ ”تو ہم نے ان کے کانوں پر پردہ ڈال دیا“ یعنی ہم نے انہیں سلا دیا، تاکہ ان کی پریشانی اور گھبراہٹ ختم ہو جائے، کیونکہ نیند اس کا سب سے اچھا علاج ہے اور وہ اپنی مشرک قوم سے بھی محفوظ ہو جائیں۔ یہ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے، کوئی سو جائے تو اسے کہتے ہیں ”ضَرَبَ عَلَیْ آذَانِهِ“ ”اس کے کانوں پر پردہ ڈال دیا گیا۔“ اگرچہ نیند میں آنکھوں اور دوسرے اعضا پر بھی پردہ ہوتا ہے اور انہیں بیرونی دنیا کا کچھ احساس نہیں ہوتا، مگر سب سے آخر میں کانوں کا سننا بند ہوتا ہے اور انسان گہری نیند سو جاتا ہے۔ ”سِنِينَ عَدَدًا“ گنتی کے کئی سال، جن کا شمار آگے آ رہا ہے۔

آیت ۱۲ ﴿ ثُمَّ بَعَثْنَا لَهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ : ”بَعَثَ“ کا معنی کسی ساکن چیز کو حرکت میں لانا ہے۔ یہ لفظ مردہ کو زندہ کرنے اور سوئے ہوئے کو جگانے کے لیے آتا ہے، یعنی پھر ہم نے انہیں اٹھایا، تاکہ ہم معلوم کریں کہ ان سونے والوں کے دو گروہوں میں سے کون سا گروہ ہے جو اپنے وہاں ٹھہرنے کی مدت کو زیادہ یاد رکھنے والا ہے۔ یہ ترجمہ اس وقت ہے جب ”أَخْضَىٰ“ کو اسم تفضیل مانیں اور یہ معنی راجح ہے، کیونکہ باب افعال سے بھی ”أَفْعَلُ“ کے وزن پر اسم تفضیل آ جاتا ہے۔ دوسرا معنی اس صورت میں ہے کہ ”أَخْضَىٰ“ کو ماضی معروف قرار دیں، اس وقت معنی یہ ہو گا کہ دونوں گروہوں میں سے کون ہے جس نے اس مدت کو یاد رکھا ہے جو وہ ٹھہرے ہیں۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کو گزشتہ، موجودہ اور آئندہ ہر چیز کا علم ہے کہ کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو گا، مگر ظاہر ہے کہ یہ علم کہ فلاں کام واقع ہو چکا ہے، اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ کام واقع

لَعْنُ نَقْضِ عَيْكَ نَبَاهُمْ بِالْحَقِّ ۗ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنَاهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ وَ رَبَّنَا
عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُونِهَا إِنَّا
لَقَدْ قُلْنَا إِذَا شَطَطًا ﴿۱۴﴾

ہم تجھ سے ان کا واقعہ ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں، بے شک وہ چند جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے انہیں ہدایت میں زیادہ کر دیا ﴿۱۳﴾ اور ہم نے ان کے دلوں پر بند باندھ دیا، جب وہ کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا ہمارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم اس کے سوا کسی معبود کو ہرگز نہ پکاریں گے، بلاشبہ یقیناً ہم نے اس وقت حد سے گزری ہوئی بات کہی ﴿۱۴﴾

ہو جائے، یعنی تاکہ ہم اپنے علم کے مطابق اس کا واقعہ ہونا جان لیں۔

آیت 13 ﴿۱۳﴾ لَعْنُ نَقْضِ عَيْكَ نَبَاهُمْ بِالْحَقِّ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مشہور تھا، مگر اس میں بہت سی خرافات

اور غلط باتیں شامل تھیں، اس لیے فرمایا کہ ہم تجھ سے ان کا واقعہ ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں۔

﴿۱۴﴾ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ.....: حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے، اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ چند نوجوان تھے اور نوجوان

بوزھوں کی نسبت حق کو زیادہ قبول کرنے والے ہوتے ہیں، اسی لیے اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہنے والے اکثر

نوجوان تھے۔ قریش کے بوزھے بزرگ اپنے دین ہی پر باقی رہے، ان میں سے بہت کم ہی ایمان لائے۔ کئی ایک اگر مثلاً

بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے ”وَزِدْنَاهُمْ هُدًى“ (اور ہم نے انہیں ہدایت میں زیادہ کر دیا) سے استدلال فرمایا کہ ایمان زیادہ ہوتا

ہے اور کم بھی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے لیے آٹھ آیات اور بہت سی احادیث بیان فرمائی ہیں۔ اتنی واضح آیات و احادیث

کو پڑھ کر بھی کئی حضرات اڑے ہوئے ہیں کہ اصل ایمان میں سب برابر ہیں، وہ نہ کم ہوتا ہے نہ بڑھتا ہے، ہمارا اور ابو بکر رضی اللہ عنہما

اور جبرائیل علیہ السلام سب کا ایمان برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے نبی کی بات پر ”سَمِعْنَا وَ آمَنَّا“ کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(آمین)

﴿۱۵﴾ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ: یعنی یہ چند جوان تھے جو اپنی قوم کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے، جیسا کہ ان کے کھانا منگواتے

ہوئے سب سے ستمرا کھانا رکھنے والے شخص سے کھانا منگوانے کی فرمائش سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کی قوم اور بادشاہ مشرک

بت پرست تھے، مگر یہ نوجوان بت پرستی چھوڑ کر اپنے رب کی توحید پر پختہ اور خالص ایمان لے آئے اور اس پر ڈٹ گئے اور اللہ کی

خاطر خویش و اتقارب، مال و منال اور وطن کو چھوڑ کر ہجرت کر گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اور زیادہ ہدایت و ایمان سے نوازا دیا۔

آیت 14 ﴿۱۴﴾ وَ رَبَّنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ: ”رَبَّنَا“ کا معنی باندھنا ہے، یعنی بادشاہ اور قوم کے ڈر سے جس گھبراہٹ اور

پریشانی کا خطرہ تھا اس سے بچانے کے لیے ہم نے ان کے دلوں پر بند باندھ دیا، جس سے وہ مضبوط ہو گئے، جس طرح کھمبھری

هَؤُلَاءِ قَوْمًا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً لَوْ لَا يَأْتُونَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍ بَيِّنٍ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾ وَإِذْ اعْتَرٰثْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأَوَّا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مَرْفَقًا ﴿۱۶﴾

یہ ہماری قوم ہے، جنہوں نے اس کے سوا کئی معبود بنا لیے، یہ ان پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے، پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ﴿۱۵﴾ اور جب تم ان سے الگ ہو چکے اور ان چیزوں سے بھی جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں تو کسی عار کی طرف (جا کر) پناہ لے لو، تمہارا رب تمہارے لیے اپنی کچھ رحمت کھول دے گا اور تمہارے لیے تمہارے کام میں کوئی سہولت مہیا کر دے گا ﴿۱۶﴾

ہوئی چیزیں گھڑی میں ڈال کر ان کو گرہ لگا کر مضبوطی سے باندھ دیا جائے تو وہ بکھرنے سے بچ جاتی ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ان کے دلوں پر بند باندھ دینے سے وہ حق گوئی کے وقت ہر قسم کے خوف سے محفوظ ہو گئے۔

﴿۱۵﴾ اِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : یعنی جب وہ بادشاہ کے سامنے اس کے بھرے دربار میں کھڑے ہوئے اور انہوں نے صاف اعلان کر دیا کہ ہم نہ بادشاہ کو اپنا رب مانتے ہیں نہ تمہارے بتوں کو، بلکہ ان سے ہزاروں لاکھوں سال پہلے موجود آسمانوں اور زمین کے رب کو اپنا رب مانتے ہیں۔ یہ توحید ربوبیت کا اعلان تھا کہ رب صرف ایک ہے۔ ”اور ہم اس کے سوا کسی معبود کو ہرگز نہ پکاریں گے“ یہ توحید الوہیت کا اعلان ہے کہ ہم عبادت بھی صرف اسی کی کریں گے، اسی سے دعا، اسی سے امید اور اسی سے خوف رکھیں گے۔ اگر ہم بادشاہ کو یا اس کے بتوں کو رب یا معبود مانیں تو اس وقت ہم بہت بڑی زیادتی کی بات کہیں گے۔ ”عَظَمًا“ پر تنوین تعظیم کی ہے، کیونکہ شرک سے بڑھ کر نہ کوئی ظلم ہے نہ زیادتی۔ گویا یہ آیت اور سورہ لقمان (۱۳) میں لقمان ؑ کا قول: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ ہم معنی ہیں۔ ”اِذْ قَامُوا“ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ جب انہوں نے اپنی قوم کے باطل عقائد و اعمال چھوڑنے کا پختہ عزم کر لیا اور توحید کی دعوت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ تقریر کی جو آگے مذکور ہے۔

آیت 15 ﴿۱۵﴾ هَؤُلَاءِ قَوْمًا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً : انہوں نے صرف توحید کے اعلان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی قوم کے فعل کا رد بھی فرمایا کہ یہ ہماری قوم کے لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کی کوئی دلیل کیوں نہیں پیش کرتے۔ معلوم ہوا یہ اپنے دعویٰ میں سراسر جھوٹے ہیں۔ چند آیات جن میں مشرکین سے شرک کی دلیل کا مطالبہ کیا گیا ہے، دیکھیے انعام (۱۲۸) اور احقاف (۴)۔

﴿۱۶﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ : یعنی اللہ کے سوا دوسروں کو پکارنا محض جھوٹ ہے اور جو اللہ پر جھوٹ باندھے اس سے بڑا ظالم کون ہے؟

آیت 16 ﴿۱۶﴾ وَ اِذْ اعْتَرٰثْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ : ”مَرْفَقًا“ ”الْاِرْتِفَاقُ“ کا معنی فائدہ اٹھانا ہے، یعنی کوئی سہولت،

و تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزُورُ عَنْ كَافِّهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ
ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِنْهُ ۗ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ ۗ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ

وَمَنْ يَضِلَّ فَلَنْ يُضِلَّهُ ۗ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُرْشِدًا ۝

اور تو سورج کو دیکھے گا جب وہ نکلتا ہے تو ان کی غار سے دائیں طرف کنارہ کرتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بائیں طرف کو کترا جاتا ہے اور وہ اس (غار) کی کھلی جگہ میں ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، جسے اللہ ہدایت دے سو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے گمراہ کر دے، پھر تو اس کے لیے ہرگز کوئی رہنمائی کرنے والا دوست نہ پائے گا ﴿۱۷﴾

آسانی۔ ان کی قوم اور بادشاہ میں سے کسی نے ان کی دعوت قبول نہ کی تو انھوں نے مشورہ کیا کہ جب تم ان لوگوں سے اور ان کے معبودوں سے علیحدہ ہو چکے تو اب یہاں رہ کر جان یا ایمان بچانا مشکل ہے، اس لیے کسی پہاڑ کے کھلے غار میں پناہ لے لو۔ رہا کھانا پینا اور دوسری ضروریات زندگی تو جب تم اپنے رب کی راہ میں ہجرت کر رہے ہو تو وہ خود اپنی رحمت کا دامن پھیلا دے گا اور ہر معاملے میں تمہارے لیے آسانی مہیا فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی اس کا وعدہ فرمایا ہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۱۰۰) باہمی مشورے سے یہ فیصلہ کر کے وہ ایک پہاڑ کے کھلے غار میں جا بیٹھے، نیند غالب آئی تو سو گئے۔ معلوم ہوا کہ جب معاشرے میں رہ کر دین پر عمل ممکن نہ رہے تو ہجرت کے لیے پہاڑ ہی بہترین مقام ہیں، چنانچہ ہمارے نبی ﷺ نے فرمایا: «يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ يَتَّبِعُ بِهَا شَعْفَ الْجِبَالِ، وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ، يَغْرُ بِدِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ» [بخاری، الإيمان، باب من الدين الفرار من الفتن: ۱۹، عن أبي سعيد الخدري] ”قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال چند بکریاں ہوں گی، جن کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش کے مقامات کے پیچھے پھرتا رہے گا، اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے بھاگتا پھرے گا۔“ جب کفار مکہ نے ہمارے نبی ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ طے کر لیا تو آپ ﷺ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تین راتیں غار ثور میں چھپے رہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو کفار سے محفوظ رکھا۔ دیکھیے سورہ توبہ (۳۰)۔

② بعض لوگوں نے اس سے عزالت یعنی لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنے کا استدلال کیا ہے، حالانکہ اصحاب کھف نے کفار سے علیحدگی اختیار کی، انہوں سے نہیں، بلکہ آپس میں تو وہ اکٹھے ہی رہے۔ اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ (قاضی)

﴿۱۷﴾ ۱۷ ﴿۱﴾ وَ تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ یعنی ان کے غار کا منہ شمال کی طرف تھا، جب سورج چڑھتا تو دھوپ دائیں طرف ہو جاتی اور غروب کے وقت بائیں طرف ہو جاتی تھی۔ ان کے بدن غار کے کشادہ حصے میں سورج کی تیز شعاعوں سے محفوظ تھے۔

② مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ: ”هُوَ“ معرفہ کے بعد خبر ”الْمُهْتَدِ“ بھی معرفہ ہے، اس سے صبر کا معنی حاصل ہوا، یعنی جسے اللہ سیدھی راہ پر چلائے سو وہی سیدھی راہ پانے والا ہے، جیسا کہ اصحاب کھف کو ایمان کی نعمت، پھر اعلان حق کی ہمت،

و تَحْسِبُهُمْ أَيَقَاطًا وَ هُمْ رُقُودٌ ۖ وَ نَقَلْتَهُمْ ذَاتَ الیَمِینِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۗ وَ كَلَبَهُمْ
بَاسِطَ ذِرَاعِیْهِ بِالْوَصِیْدِ ۗ لَوْ اظْلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّیْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَ لَلَّیْتَ مِنْهُمْ
رُغْبًا ۙ ۱۸ ۝ وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لیتَسَاءَلُوْا بَیْنَهُمْ ۗ قَالَ قَابِلٌ مِنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۗ قَالُوْا لَبِثْنَا
یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ۗ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۗ فَاْبَعَثُوْا اَحَدًا كُمْ یُورِیْكُمْ هٰذِهِ

اور تو انھیں جاگتے ہوئے خیال کرے گا، حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں اور ہم دائیں اور بائیں ان کی کروٹ پلٹتے رہتے ہیں اور ان کا کتا اپنے دونوں بازو دبلیز پر پھیلائے ہوئے ہے۔ اگر تو ان پر جھانکے تو ضرور بھاگتے ہوئے ان سے پیٹھ پھیر لے اور ضرور ان کے خوف سے بھر دیا جائے ۱۸ اور اسی طرح ہم نے انھیں اٹھایا، تاکہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں، ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا تم کتنی دیر رہے؟ انھوں نے کہا ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے، دوسروں نے کہا تمہارا رب زیادہ جاننے والا ہے جتنی مدت تم رہے ہو، پس اپنے میں سے ایک کو اپنی یہ پھر ہجرت کی توفیق اور غار میں جانے کا راستہ عطا فرمایا، جہاں زندہ رہنے کے لیے دھوپ اور ہوا کی جس مقدار میں ضرورت تھی موجود تھی اور وہ لوگوں کی نگاہوں اور دشمن کی دسترس سے بھی محفوظ رہے۔

آیت 18 ۱ ۝ وَ تَحْسِبُهُمْ أَيَقَاطًا وَ هُمْ رُقُودٌ : ”اَیْقَاطًا“ جمع ہے ”یَقِطُ“ کی اور ”رُقُودٌ“ جمع ہے ”رَاقِدٌ“ کی، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ تم انھیں دیکھو تو سمجھو گے کہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں، یعنی سوتے میں آنکھیں کھلی ہونے اور کروٹیں بدلنے کی وجہ سے تم انھیں جاگتے ہوئے سمجھو گے۔ اور ہم دائیں اور بائیں ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں، تاکہ ایک ہی پہلو پر پڑے رہنے سے مٹی ان کے بدنوں کو نہ کھا جائے اور ان کا کتا اپنے دونوں بازو دبلیز پر پھیلائے ہوئے ہے، جیسے پہرہ ادا رہا ہے۔ ایک الگ تھلگ غار میں ان کا اس طرح لیٹنا ہونا اور چوکھٹ پر کتے کا بیٹھا ہونا ایک ایسا دہشت ناک منظر پیش کرتا تھا کہ اگر کوئی شخص اندر جھانکنے کی کوشش بھی کرتا تو خوف کے مارے بھاگ کھڑا ہوتا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں ایک لمبی مدت تک آرام و سکون سے سلائے رکھنے کا انتظام تھا۔

۲ ۝ کتے کے دبلیز پر بیٹھے رہنے اور غار میں نہ جانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَلَا تَصَاوِرٌ» [بخاری، اللباس، باب النساویر: ۵۹۴۹] ”فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جہاں کتا یا تصویر ہو۔“ البتہ کھتی کے لیے، مویشیوں کی حفاظت کے لیے اور شکار کے لیے کتا رکھنے کی اجازت ہے۔

آیت 19-20 ۱ ۝ وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ یعنی جیسے ہم نے انھیں ایک حیرت انگیز طریقے سے غار کے اندر سلا یا تھا اسی طرح انھیں اٹھا دیا کہ ان کے جسم صحیح سالم تھے، ان میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی، تاکہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے سوال کریں اور جب انھیں پتا چلے کہ وہ اتنی لمبی مدت سونے کے بعد بیدار ہوئے ہیں تو انھیں ہماری قدرت کا اور مردوں کو زندہ کرنے کا

إِلَى الْمَدِينَةِ فليَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا ۝۱۹ إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُسُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا إِذَا أَبَدًا ۝۲۰

چاندی دے کر شہر کی طرف بھیجو، پس وہ دیکھے کہ اس میں کھانے کے لحاظ سے زیادہ ستمرا کون ہے، پھر تمہارے پاس اس سے کچھ کھانا لے آئے اور نرمی و باریک بینی کی کوشش کرے اور تمہارے بارے میں کسی کو ہرگز معلوم نہ ہونے دے ۱۹ بے شک وہ اگر تم پر قابو پالیں گے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے، یا تمہیں دوبارہ اپنے دین میں لے جائیں گے اور اس وقت تم کبھی فلاح نہیں پاؤ گے ۲۰

اپنی ذات میں عملی مشاہدہ ہو جائے، ان کا ایمان و یقین مزید مضبوط ہو جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت پر اس کا شکر ادا کریں۔
 ۲۰ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ : حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”معلوم ہوتا ہے کہ وہ غار میں دن کے پہلے پہر داخل ہوئے تھے اور دن کے آخری حصے میں بیدار ہوئے۔ اس لیے اس سوال کے جواب میں کہ تم کتنی مدت یہاں ٹھہرے، کسی نے ایک دن اور کسی نے دن کا کچھ حصہ کہا، مگر جب غار کے ارد گرد کا عالم بالکل ہی بدلا ہوا نظر آیا تو کہنے لگے، تمہارا رب زیادہ جانتا ہے کہ تم کتنی مدت ٹھہرے ہو۔“

۳۱ اس آیت سے معلوم ہوا کہ نہ پہلے سوال کرنے والے دلی کو وہاں ٹھہرنے کی مدت کا علم تھا، نہ دوسرے ولیوں کو، جب کہ کئی لوگ اپنے ائمہ اور اولیاء کو ”مَا سَكُنَ وَمَا يَكُونُ“ (جو ہو چکا اور جو ہوگا) کا جاننے والا سمجھتے ہیں۔
 ۳۲ یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندے بھی بعض اوقات اندازے اور گمان سے کوئی بات کہہ دیتے ہیں، مگر ایسی بات میں وہ اصل علم اللہ کے حوالے کرنے سے غفلت نہیں کرتے۔

۳۳ قَابَعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هُنَا : غار میں ٹھہرنے کی مدت پر بحث کے بعد جب وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تو انہوں نے اصل مدت کے اندازے کے لیے اپنے کسی ایک ساتھی کو چاندی (کا سکہ) دے کر شہر بھیجنے کا فیصلہ کیا اور اسے چند باتوں کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ ایک یہ کہ کھانا لاتے وقت یہ دیکھ لے کہ شہر میں سب سے ستمرا کھانا کس کا ہے، اس سے تمہارے لیے کچھ کھانا لے آئے۔ ”آزکی“ کا معنی سب سے پاکیزہ، سب سے ستمرا ہے، اس میں کھانے کا حلال و طیب ہونا بھی شامل ہے اور سب سے صاف ستمرا ہونا بھی۔ معلوم ہوا کہ یہ نوجوان شہزادے تھے، یا امراء و وزراء کے چشم و چراغ تھے، جو شہر کے سب سے ستمرے ہوئے کم پر راضی نہ تھے۔ دوسری بات یہ کہ نرمی اور باریک بینی کی کوشش کرے، کیونکہ سختی سے کام بگڑ جاتے ہیں اور باریک بینی اختیار نہ کرنے سے راز کھل جاتے ہیں اور مطلوبہ معلومات بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ کوشش کا مفہوم ”وَلْيَتَلَطَّفْ“ (باب تفعّل) سے ظاہر ہو رہا ہے اور ”الطف“ کے مفہوم میں نرمی اور باریک بینی دونوں شامل ہیں۔ تیسری تاکید

وَ كَذٰلِكَ اَعْتَرٰنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعَدَ اللّٰهُ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۗ

اور اسی طرح ہم نے (لوگوں کو) ان پر مطلع کر دیا، تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت، اس
یہ کی کہ تمہارے بارے میں کسی کو ہرگز معلوم نہ ہونے دے۔ کیونکہ اگر مشرکین کو تمہارا پتا چل گیا تو وہ تمہیں سنگ سار کر دیں
گے، یا جبراً تمہیں دوبارہ اپنے مشرکانہ دین میں واپس لے آئیں گے۔ ایسی صورت میں تم کبھی فلاح نہ پاسکو گے، کیونکہ
مشرکوں پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے۔

آیت 21 ﴿۱﴾ وَ كَذٰلِكَ اَعْتَرٰنَا عَلَيْهِمْ یعنی جس طرح ہم نے انہیں ثابت قدم رکھا اور حیرت انگیز طریقے سے

سلائے رکھا اسی طرح ہم نے شہر والوں کو ان کی حقیقت حال اور جگہ سے مطلع کر دیا۔ بہت سے مفسرین کا بیان ہے اور واقعہ کی
صورت خود بخود بھی یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ شخص کھانا خریدنے کے لیے روانہ ہوا تو اس نے دیکھا کہ شہر کے راستے، لوگوں
کی تہذیب، رہن سہن، زبان اور لباس ہر چیز بدل چکی ہے، اس نے خیال کیا کہ شاید میں پاگل ہو گیا ہوں یا خواب دیکھ رہا
ہوں۔ بالآخر وہ شہر پہنچا اور ایک دکاندار سے کھانا خریدنے لگا اور اس نے سکہ نکالا تو دکاندار ششدر رہ گیا اور اس نے ایک
دوسرے دکاندار کو بلایا، بالآخر کچھ لوگ جمع ہو گئے اور انہیں شک گزرا کہ شاید اس شخص کو کہیں سے پرانا خزانہ ہاتھ لگا ہے۔ مگر
جب اس نے بتایا کہ میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں اور کل ہی یہاں فلاں بادشاہ کو چھوڑ کر گیا ہوں تو لوگوں کی حیرت اور بڑھ گئی
اور وہ اسے پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے آئے۔ وہاں جب پوچھ گچھ ہوئی تو سب معاملہ کھل گیا، اس لیے اصحاب کہف کو دیکھنے
اور انہیں سلام کرنے کے لیے بادشاہ اور اس کے ساتھ لوگوں کا ایک جھوم غار پر پہنچ گیا۔ شہر جانے والا ساتھی اندر داخل ہو گیا اور
سارے ساتھی دوبارہ لیٹ گئے، اسی حال میں اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض کر لی۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا وہاں
تین سو نو (۳۰۹) سال ٹھہرنا بیان فرمایا ہے، اگر وہ اس کے بعد بھی زندہ ہوتے تو ان پر عمارت بنانے یا مسجد بنانے کا سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کی کرامت دیکھنے والے خوش عقیدہ لوگ انہیں شہر لے جاتے اور ہر طرح ان کی خدمت بجالاتے۔

﴿۲﴾ اس آیت سے کئی ساتھیوں کا مال برابر جمع کر کے کھانے وغیرہ کے لیے اکٹھا خرچ کرنا ثابت ہوتا ہے، خواہ کوئی کم کھاتا ہو
یا زیادہ اور یہ آیت اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کسی کو اپنا نائب یا وکیل بنایا جاسکتا ہے۔

﴿۳﴾ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعَدَ اللّٰهُ حَقٌّ یعنی ان پر مطلع ہونے والے شہر کے لوگوں کو یقین آ جائے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے
اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں۔

﴿۴﴾ اِذْ يَتَنٰۤاَزَعُوْنَ بَيْنَهُمْ یعنی ہم نے شہر والوں کو ان پر اس وقت مطلع کیا جب وہ آپس میں اپنے معاملے میں جھگڑ
رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ سر کر جی اٹھنا برحق ہے، کوئی اس کا انکار کرتا تھا، کوئی کہتا کہ حشر صرف روح کا ہو گا بدن کا نہیں۔
مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اصحاب کہف کا حال آنکھوں سے دکھا کر یقین دلا دیا کہ قیامت آئے گی اور حشر بدن اور روح دونوں کا
ہو گا۔ ”اِذْ يَتَنٰۤاَزَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اٰمْرُهُمْ“ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب شہر والے اصحاب کہف کے بارے میں جھگڑ رہے

إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُيُوتًا ۗ رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ ۗ قَالَ
الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ﴿۱۸﴾

میں کوئی شک نہیں۔ جب وہ ان کے معاملے میں آپس میں جھگڑ رہے تھے تو انھوں نے کہا ان پر ایک عمارت بنا دو۔ ان کا رب ان سے زیادہ واقف ہے، وہ لوگ جو ان کے معاملے پر غالب ہوئے انھوں نے کہا ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے ﴿۱۸﴾

تھے کہ یہ کون لوگ تھے؟ غار میں کب آئے؟ کتنی دیر سوئے رہے؟ اب ان کے مرنے پر ان کے ساتھ کیا کیا جائے؟ بعض نے کہا، ان پر دیوار بنا کر غار کا منہ بند کر دیں۔ بعض نے کہا، ان پر ایک عمارت ان کی یادگار کے طور پر بنا دیں۔

﴿۱۸﴾ رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ: یعنی اصحاب کھف اور شہر والوں کے احوال ان کا رب بہتر جانتا ہے۔

﴿۱۸﴾ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ: جن لوگوں کے پاس غلبہ و اقتدار تھا وہ کہنے لگے کہ ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے اور اس طرح ان کی یادگار کو باقی رکھیں گے۔ گزشتہ قوموں میں اسی راستے سے شرک داخل ہوتا رہا اور اب بھی شرک کے سب سے بڑے مراکز انھی قبروں پر تعمیر شدہ عمارتیں مثلاً خانقاہیں وغیرہ یا مسجدیں ہی ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس بیماری میں فرمایا جس میں آپ فوت ہوئے: «لَعَنَ اللَّهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ» [بخاری، الجنائز، باب ما یکرہ من اتخاذ المساجد..... ۱۳۳۰ - مسلم: ۵۲۹] "اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔" جناب رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے نبی ﷺ سے آپ کے فوت ہونے سے پانچ دن پہلے سنا، آپ نے فرمایا: «أَلَا وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوا يَتَّخِذُونَ قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَسَاجِدَ، أَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُورَ مَسَاجِدَ، إِنِّي أَنهَاكُمُ عَنْ ذَلِكَ» [مسلم، المساجد، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور..... ۵۳۲] "جان لو! جو لوگ تم سے پہلے تھے وہ اپنے نبیوں اور صالحین کی قبروں کو مسجدیں بنا لیتے تھے، من لو کہ تم قبروں کو مسجدیں نہ بنانا، میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔"

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ایسا کرنے والوں کو اللہ کے ہاں سب سے بدتر مخلوق قرار دیا، فرمایا: «فَأُولَٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [بخاری، الصلاة، باب هل تبش قبر مشرکی الحاحلیہ..... ۴۲۷ - مسلم: ۵۲۸، عن عائشة رضی اللہ عنہا] ان احادیث میں قبروں پر مسجدیں بنانے سے مراد ان کے پاس مسجدیں بنانا ہے، کیونکہ یہود و نصاریٰ کے عبادت خانے ان کے انبیاء و اولیاء کی قبروں کے پاس ہوا کرتے تھے۔ افسوس کہ بعض مسلمانوں نے یہ تکلف بھی ختم کر کے اپنے بزرگوں کی قبریں عین مسجدوں کے اندر بنانا شروع کر دیں۔ ان لوگوں کی کوئی مسجد کم ہی کسی نہ کسی قبر سے خالی نظر آئے گی، ان کے مولویوں نے اس بدترین فعل کے جواز کے لیے زیر تفسیر آیت کو دلیل بنا لیا، حالانکہ اس میں صرف یہ ذکر ہے کہ ان کے غالب اور بااثر لوگوں نے یہ کہا۔ رہی یہ بات کہ انھوں نے درست کہا یا غلط، اس کی وضاحت رسول اللہ ﷺ نے فرمادی، چنانچہ

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَاِبُهُمْ ۚ وَيَقُولُونَ خُمُسَةٌ سَادِسُهُمْ كَاِبُهُمْ رَجْبًا بِالْغَيْبِ ۗ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ ۚ وَثَامِنُهُمْ كَاِبُهُمْ ۗ قُلْ رَبِّي أَعْلَمُ بِعَدَّتِهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا ۚ وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا ﴿۲۱﴾

عقرب وہ کہیں گے تین ہیں، ان کا چوتھا ان کا کتا ہے اور کہیں گے پانچ ہیں، ان کا چھٹا ان کا کتا ہے، بن دیکھے پتھر پھینکتے ہوئے اور کہیں گے سات ہیں، ان کا آٹھواں ان کا کتا ہے۔ کہہ دے میرا رب ان کی تعداد سے زیادہ واقف ہے، انہیں بہت تھوڑے لوگوں کے سوا کوئی نہیں جانتا، سو تو ان کے بارے میں سرسری بحث کے سوا بحث نہ کر اور ان لوگوں میں سے کسی سے ان کے بارے میں فیصلہ طلب نہ کر ﴿۲۱﴾

جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن یخصص القبر، وأن یفعد علیہ، وأن یسنی علیہ» [مسلم، الحناظر، باب البہی عن تخصیص القبر.....: ۹۷۰] "رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ قبر چونا گچ (سیمنٹ) بنائی جائے اور اس سے کہ اس پر بیٹھا جائے اور اس سے کہ اس پر عمارت بنائی جائے۔" بلکہ آپ ﷺ نے ایسی قبروں کو برابر کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ابو الہیاج الاسدی، علی رضی اللہ عنہ کے داماد فرماتے ہیں کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: «ألا أبعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ أن لا تدع تمثالا إلا طمسستہ ولا قبرا مشرفا إلا سوتتہ» [مسلم، الحناظر، باب الأمر بتسویة القبر: ۹۶۹] "کیا میں تمہیں اس کام پر مقرر نہ کروں جس پر مجھے رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا؟ وہ یہ ہے کہ کوئی مورتی نہ چھوڑ جسے تو مٹا نہ دے اور نہ کوئی اونچی قبر جسے تو برابر نہ کر دے۔" اللہ کی حکمت دیکھیے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبریں برابر کرنے پر اس شخص کو مقرر فرمایا جس کے نام لیواؤں نے سب سے زیادہ قبروں کو پختہ اور اونچا بنانا تھا، تاکہ کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔

آیت ۲۲ ۱ سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَاِبُهُمْ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت اہل کتاب میں اور ان کے ذریعے سے مشرکین عرب میں اصحاب کہف سے متعلق طرح طرح کی باتیں موجود تھیں، مگر مستند معلومات کسی کے پاس نہ تھیں۔

۲ اصحاب کہف کے ناموں کے بارے میں کوئی صحیح مرفوع روایت نہیں ہے۔ ناموں کی صراحت غالباً اسرائیلی کتب تواریخ سے ماخوذ ہے اور ان اسماء کے تلفظ میں بھی بہت اختلاف ہے، کسی قول پر بھی اعتماد نہیں ہو سکتا۔ (فتح الباری) پھر بعض لوگ ان ناموں کے خواص اور فائدے بیان کرتے ہیں اور مختلف بیماریوں کے لیے ان کو لکھتے ہیں جو کسی صورت بھی صحیح نہیں، بلکہ اگر "یا" حرف ندا کے ساتھ لکھے جائیں، یا ان ناموں میں نفع پہنچانے یا نقصان سے بچانے کی تاثیر کا عقیدہ رکھا جائے تو صاف شرک ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس بارے میں بعض روایات بھی گھڑ لی گئی ہیں جو ابن عباس اور دیگر اصحاب رضی اللہ عنہم کی

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايٍ ؕ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ عَدَاۗءًا ۖ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۗ وَ اذْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ
وَقُلْ عَلَيَّ أَنْ يَهْدِيَنِّي رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا ﴿۲۳﴾

اور کسی چیز کے بارے میں ہرگز نہ کہہ کہ میں یہ کام کل ضرور کرنے والا ہوں ﴿۲۳﴾ مگر یہ کہ اللہ چاہے اور اپنے رب کو یاد کر جب تو بھول جائے اور کہہ امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے قریب تر بھلائی کی ہدایت دے گا ﴿۲۳﴾

طرف منسوب ہیں، مگر ان میں سے کوئی روایت بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما یا سلف صالحین سے ثابت نہیں۔ نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ان ناموں کے ساتھ علاج کی تردید کی ہے۔

﴿۳﴾ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے اہل کتاب یہ تو جانتے تھے کہ کسی زمانے میں یہ واقعہ ہوا ہے، مگر وہ اس کی حقیقت سے بے خبر تھے۔ اس لیے محض اٹکل سے اس کی تفصیلات بیان کرتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کے متعلق ان کے دو قول ذکر فرما کر ان کی تردید فرمائی، البتہ تیسرے قول کا ذکر فرما کر کہ وہ سات تھے، اس کی تردید نہیں فرمائی، بلکہ فرمایا، کہہ دے میرا رب ان کی تعداد سے متعلق زیادہ جانتا ہے اور انھیں بہت تھوڑے لوگوں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پھر اس بحث کے بے فائدہ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں سے سرسری بحث کے سوا کوئی بحث کریں، نہ ان کے متعلق ان میں سے کسی سے کچھ پوچھیں، کیونکہ ان کے پاس اس کا کچھ علم نہیں۔ اکثر اہل علم نے، جن میں ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی ہیں، آخری قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس بات میں مختلف اقوال ہوں اسے بیان کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تمام اقوال ذکر کیے جائیں اور صحیح قول کی طرف اشارہ کر دیا جائے اور بحث کا فائدہ بھی بیان کیا جائے کہ اس سے کیا حاصل ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تینوں باتیں بیان فرمادیں۔ (قاسمی ملخصاً)

آیت 24.23 ﴿۱﴾ وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايٍ ؕ : یہاں شان نزول میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

اصحاب کہف، روح اور ذوالقرنین سے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ”میں تمہیں کل جواب دوں گا“ اور ”ان شاء اللہ“ نہ کہا، تو پندرہ (۱۵) دن وحی رکی رہی، پھر یہ آیت اتری: ﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايٍ ؕ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ عَدَاۗءًا ۖ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قاضی نے اسے کئی وجہوں سے بے کار قرار دیا ہے۔ قاسمی نے فرمایا کہ ان کی بات حق ہے، کیونکہ محمد بن اسحاق نے یہ روایت ایک مجہول شیخ سے بیان کی ہے، جیسا کہ ابن کثیر (اور طبری) میں اس کی سندیں موجود ہیں۔ (محاسن التاویل)

﴿۲﴾ اس آیت کا ایک معنی تو مشہور ہے کہ کسی کام کے متعلق یہ مت کہو کہ میں کل یہ کام کرنے والا ہوں، مگر اس کے ساتھ ”ان شاء اللہ“ ضرور کہو، کیونکہ اللہ نے چاہا تو کام ہوگا، ورنہ نہیں۔ اس کی مثال سلیمان علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ انھوں نے کہا: ﴿لَأَطُوفَنَّ اللَّيْلَةَ عَلَى مِائَةِ امْرَأَةٍ أَوْ تِسْعٍ وَتِسْعِينَ، كُلُّهُنَّ يَأْتِيَنِي بِفَارِسٍ يُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَقَالَ لَهُ صَاحِبُهُ قُلْ إِنَّ شَاءَ اللَّهُ، فَلَمْ يَقُلْ إِنَّ شَاءَ اللَّهُ، فَلَمْ تَحْمِلْ مِنْهُنَّ إِلَّا امْرَأَةً وَاحِدَةً جَاءَتْ بِسِقِّ رَجُلٍ، وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَوْ قَالَ إِنَّ شَاءَ اللَّهُ، لَحَاجَهُدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَرُسَانَا أَجْمَعُونَ﴾ [بخاری، الجهاد والسير، باب من طلب الولد للجهاد:

وَلِيَعْلَمُوا فِي كَنَفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ﴿۲۵﴾

اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور نو (سال) زیادہ رہے ﴿۲۵﴾

۱۹۲۸] ”آج رات میں اپنی سو (۱۰۰) یا فرمایا ننانوے (۹۹) عورتوں کے پاس جاؤں گا اور ہر عورت ایک بیٹا جنے گی، جو جہاد فی سبیل اللہ کا شہسوار ہوگا۔“ ان کے ایک ساتھی نے کہا: ”ان شاء اللہ کہیے۔“ مگر سلیمان علیہ السلام نے (مشغولیت وغیرہ کی وجہ سے) ان شاء اللہ نہ کہا، تو ان عورتوں میں سے صرف ایک عورت کو حمل ہوا اور وہ بھی ادھورا بیٹا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! اگر وہ ان شاء اللہ کہتے تو سب عورتوں کے بیٹے ہوتے جو شہسوار ہوتے اور سب اللہ کے راستے میں جہاد کرتے۔“

دوسرا معنی یہ ہے کہ اسے نبی! کسی کام کے بارے میں (اپنی مرضی سے) یہ مت کہیے کہ کل میں یہ کام کرنے والا ہوں، مگر یہ کہ اللہ چاہے، یعنی اللہ چاہے گا کہ آپ وہ کام کریں تو وہ آپ کو اجازت دے گا، پھر آپ اس کے اذن سے یہ کہہ سکتے ہیں۔ (قاسمی) یہ معنی ”إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ“ الفاظ کے زیادہ قریب ہے اور سورہ نجم کی آیات (۴، ۳): ﴿وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ میں بھی یہی مفہوم ہے۔

﴿۲۵﴾ وَادْكُرْ زَيْنًا إِذْ أَنْهَيْتَ: یعنی جب بھول جائیں تو یاد آنے پر ”ان شاء اللہ“ کہہ لیں۔ یاد رہے کہ قسم کے ساتھ ”ان شاء اللہ“ کہہ لے تو قسم پوری نہ کرنے پر کوئی کفارہ نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر قسم سے متصل ”ان شاء اللہ“ نہ کہے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا، مگر یہ آیت دلیل ہے کہ اگر اس کا ارادہ ”ان شاء اللہ“ کہنے کا تھا مگر بھول کر نہیں کہہ سکا اور یاد آتے ہی اس نے کہہ لیا تو اس کا اعتبار ہوگا۔ مستدرک حاکم (۳۰۳/۲، ج: ۷۸۳۳) میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول مروی ہے کہ ”جب آدمی کسی بات پر قسم کھالے تو وہ ایک سال تک ”ان شاء اللہ“ کہہ سکتا ہے“ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج السالکین میں فرمایا: ”یہ نسیان کی صورت میں ہے۔“ (محاسن التاویل ملخصاً)

﴿۲۶﴾ وَقُلْ عَسَىٰ أَنْ يَهْدِيَنَا رَبِّي..... اور کہہ دیجیے کہ مجھے اپنے رب سے امید ہے کہ وہ مجھے اصحاب کھف کی خبر سے بھی قریب تر لوگوں کی ہدایت کا باعث بننے والی خبریں بتائے گا جن سے میری رسالت ثابت ہوگی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے غیب کی بہت سی خبریں آپ کو بتائیں جن کی کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔

آیت 25 وَلِيَعْلَمُوا فِي كَنَفِهِمْ..... بعض مفسرین نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نو سالوں کا ذکر الگ الگ اس لیے فرمایا کہ اگر ششہ سال ہوں تو تین سو سال اور قمری ہوں تو ان کے ٹھہرنے کی مدت تین سو نو سال تھی۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ”ثَلَاثِمِائَةٍ وَتِسْعَ سِنِينَ“ (یعنی تین سو نو سال) کہنا کافی بھی تھا اور مختصر بھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ششہ اور قمری کے اس فرق کی کوئی دلیل نہیں۔ نو سالوں کو الگ ذکر کرنے کی وجہ آیات کے فواصل (آخری الفاظ) ہیں، جن سے کلام میں حسن پیدا ہوتا ہے اور بلاغت کے لحاظ سے قرآن کے الفاظ ”ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا“ کے درمیان اور ”ثَلَاثِمِائَةٍ وَتِسْعَ سِنِينَ“ کے درمیان فرق زمین و آسمان کا ہے۔ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ کبھی اختصار میں حسن ہوتا ہے اور کبھی تطویل میں۔ اس

قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لِيُثْوَا لَهُ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَبْصُرُ بِهِ وَأَسْمِعُ مَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَرَائِي ۚ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ﴿۲۶﴾ وَأَثَلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾

کہہ دے اللہ زیادہ جاننے والا ہے جتنی مدت وہ رہے، اسی کے پاس آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی باتیں ہیں، وہ کس قدر دیکھنے والا اور کس قدر سننے والا ہے، نہ اس کے سوا ان کا کوئی مددگار ہے اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے ﴿۲۶﴾ اور اس کی تلاوت کر جو تیری طرف تیرے رب کی کتاب میں سے وحی کی گئی ہے، اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور نہ اس کے سوا تو کبھی کوئی پناہ کی جگہ پائے گا ﴿۲۷﴾

لیے ان کے ٹھہرنے کی مدت تین سو نو سال ہی تھی، قمری سال تھے تو سب قمری اور شمسی تھے تو سب شمسی۔ تین سو شمسی اور تین سو نو قمری کی تفریق ایک ذہنی آج کے سوا کچھ نہیں۔ (محاسن التاویل)

آیت ۲۶ : ﴿۱﴾ قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لِيُثْوَا..... یعنی اگر اہل کتاب آپ سے اس مدت میں اختلاف کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کا علم تم سے زیادہ ہے، لہذا جو مدت اس نے بتائی ہے وہی صحیح ہے، تمہاری بات کا اعتبار نہیں۔
آیت ۲۷ : ﴿۲﴾ اِنَّ غَيْبُ السَّمَوَاتِ..... یہ اللہ کے ”اعلم“ ہونے کی دلیل ہے کہ آسمانوں کا اور زمین کا غیب صرف اس کے پاس ہے۔ رہا دیکھنے اور سننے کے ذریعے سے علم تو وہ کس قدر دیکھنے والا اور کس قدر سننے والا ہے، اس پر تعجب تو ہو سکتا ہے، بیان میں نہیں آ سکتا۔ تو پھر اس کی بات درست ہے یا ان کی جو ان صفات سے خالی ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ اس کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں اور اس کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے فیصلے میں کسی کو بھی شریک نہیں کرتا۔

آیت ۲۷ : ﴿۱﴾ وَأَثَلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ : یعنی اصحاب کھف کے بارے میں جو بات آپ کو اس کتاب میں بتائی جا رہی ہے وہ بالکل کافی اور جامع مانع ہے۔ آپ اسی کو جو ان کا توں پڑھ کر سناتے رہیے، یا یہ کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی بچی کتاب ہے، یہی ان کو پڑھ کر سنائیں اور ان کی مخالفت کی پروا نہ کریں۔

﴿۲﴾ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ..... : ”مُلْتَحَدًا“ کا معنی اتحاد کی جگہ ہے، جو ”لَحْدًا“ سے باب افتعال ہے، جس کا معنی ماہل ہونا ہے۔ قبر کو بھی اسی لیے لحد کہتے ہیں کہ وہ ایک طرف ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ ”مُلْتَحَدًا“ سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں آدمی ایک طرف جا کر پناہ لے لے۔ یعنی اگر آپ کسی کی خاطر داری سے اس کتاب کی تبلیغ میں کوتاہی کریں گے، یا اس میں کوئی رد و بدل کریں گے تو آپ کو اس کے سوا کہیں پناہ نہ ملے گی۔ اس مفہوم کی آیات کے لیے دیکھیے سورہ مائدہ (۶۷) اور یونس (۱۵) یہ خطاب بظاہر آپ ﷺ سے ہے مگر مقصود اہل کتاب اور کفار تک سب کو متنبہ کرنا ہے کہ تمہاری خاطر آپ ﷺ اپنے مالک کی کتاب میں کوئی رد و بدل کرنے والے نہیں۔

﴿۳﴾ اس آیت پر اور بعض علمائے تفسیر کے قول کے مطابق اوپر کی آیت پر اصحاب کھف کا قصہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدْوَةِ وَالْعُشِيِّ يَرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ
عَيْنَكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تَطْعُمْ مَنْ آغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبِعْ
هُنَالَهُ وَكَانَ أَمْرُهُ قُرْطًا ﴿۱۸﴾ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَ مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ
فَلْيُكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَإِنْ يَسْتَعِينُوا يَأْتُوا بِنَاءٍ
كَالْهَيْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ ۖ وَسَاءَتْ مَرْتَفَعًا ﴿۱۹﴾

اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ رو کے رکھ جو اپنے رب کو پہلے اور پچھلے پہر پکارتے ہیں، اس کا چہرہ چاہتے ہیں اور تیری آنکھیں ان سے آگے نہ بڑھیں کہ تو دنیا کی زندگی کی زینت چاہتا ہو اور اس شخص کا کہنا مت مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا کام ہمیشہ حد سے بڑھا ہوا ہے ﴿۱۸﴾ اور کہہ دے یہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، پھر جو چاہے سو ایمان لے آئے اور جو چاہے سو کفر کرے۔ بے شک ہم نے ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے، جس کی قاتوں نے انھیں گھیر رکھا ہے اور اگر وہ پانی مانگیں گے تو انھیں پگھلے ہوئے تانبے جیسا پانی دیا جائے گا، جو چہروں کو بھون ڈالے گا، برا مشروب ہے اور بری آرام گاہ ہے ﴿۱۹﴾

مضمون شروع ہو رہا ہے جس میں ان حالات پر تبصرہ ہے جو نبی ﷺ اور مسلمانوں کو ان دنوں مکہ میں درپیش تھے۔

آیت 28 : ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ : "لَا تَعْدُ عَيْنُكَ" "عَدَا يَعْدُو" (ن) سے نبی کا صیغہ ہے، تجاوز نہ کریں تیری آنکھیں۔ یہ وہی حکم ہے جو اس سے پہلے سورۃ انعام (۵۲) میں گزر چکا ہے۔ مراد وہ کمزور مسلمان ہیں جن کے پاس قریش کے چودھریوں کو بیٹھنا گوارا نہ تھا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ چھ آدمی تھے تو مشرکین نے آپ سے کہا، ان لوگوں کو دور ہٹا دیں کہ یہ لوگ ہم پر جرأت نہ کریں۔ میں تھا، ابن مسعود، قبیلہ ہذیل کا ایک آدمی، بلال اور دو آدمی اور جن کا میں نام نہیں لیتا۔ تو رسول اللہ ﷺ کے دل میں آیا جو اللہ نے چاہا کہ آئے، تو آپ ﷺ نے اپنے دل میں کوئی بات سوچی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَلَا تَنْظُرِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدْوَةِ وَالْعُشِيِّ يَرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾ [الأنعام: ۵۲] "اور ان لوگوں کو دور نہ ہٹا جو اپنے رب کو پہلے اور پچھلے پہر پکارتے ہیں، اس کا چہرہ چاہتے ہیں۔" [مسلم، فضائل الصحابة، باب في فضل سعد بن أبي وقاص، ۲۶/۱۳۶۳] اس آیت میں بھی آپ کو ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے آپ کو روک کر رکھنے کا حکم ہے جن میں مذکورہ صفات پائی جاتی ہیں، کیونکہ ان صفات کی وجہ سے وہی اس قابل ہیں کہ آپ ان کے ساتھ رہیں۔ ان کو چھوڑ کر آپ کی نگاہیں آگے مت بڑھیں کہ آپ دنیا کی زندگی کی زینت کا ارادہ رکھتے ہوں اور ایسے لوگوں کی بات مت مانیں، جن کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چل رہے ہیں۔

آیت 29 : ﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ : "الْحَقُّ" پر الف لام عہد کا ہے، اس لیے اس کا ترجمہ "یہ حق" کیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا فَاخْضَرَّتْ مِنْ سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَّكِنِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۗ نِعْمَ الثَّوَابُ ۗ وَحَسُنَتْ أُجْرُهُمْ ۗ وَتَرْتَقَىٰ ۗ وَاحْتَرَبَ لَهُمْ تَنَلًا رَجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زُرْعًا ۗ كَلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا ۗ وَفَجَّرْنَا خِلْفَيْهَا نَهْرًا ۗ

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، بے شک ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے جو اچھا عمل کرے ۵۰ یہی لوگ ہیں جن کے لیے بھنگی کے باغات ہیں، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں انھیں کچھ نلگن سونے کے پہنائے جائیں گے اور وہ باریک اور گاڑھے ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے، ان میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوں گے۔ اچھا بدلہ ہے اور اچھی آرام گاہ ہے ۵۱ اور ان کے لیے ایک مثال بیان کر، دو آدمی ہیں، جن میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو باغ بنائے اور ہم نے ان دونوں کو کھجور کے درختوں سے گھیر دیا اور دونوں کے درمیان کچھ کھیتی رکھی ۵۲ دونوں باغوں نے اپنا پھل دیا اور اس سے کچھ کمی نہ کی اور ہم نے دونوں کے درمیان ایک نہر جاری کر دی ۵۳

۵۰ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ : یعنی مجھے تمھاری کوئی پروا نہیں، مانو گے تو اپنا بھلا کرو گے اور نہ مانو گے تو اپنی شامت لاؤ گے، میں مومنوں کو اپنی مجلس سے نہیں اٹھا سکتا۔

۵۱ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا : "اَعْتَدْنَا" میں تاء اصلی ہے۔ "لِلظَّالِمِينَ" سے مراد کفار و مشرکین ہیں۔

۵۲ أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا : "سُرَادِقُ" وہ پردہ جو خیمے کے ارد گرد لگایا جاتا ہے، یعنی قات، جمع "سُرَادِقَاتُ" (تاموس) "الْمَهْلُ" کھلی ہوئی دھات، وہ تانبہ ہو یا سیسہ وغیرہ اور نہایت گرم تیل کی تلچھت۔ "فَرْتَقَىٰ" طرف مکان ہے، ارتفاق کی جگہ، اصل اس کا یہ ہے کہ آدمی اپنی مرفق (کہنی) پر ٹیک لگا کر آرام کرتا ہے۔ جہنم کو آرام کی جگہ بطور طنز کہا ہے، درد وہاں کہنی پر سر رکھ کر کیسے سوسکتا ہے۔ یعنی چاروں طرف آگ کی دیوار ہوگی، کہیں بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔

آیت 30-31 : إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا : ظالمین یعنی کفار کے بعد اہل ایمان اور ان کے اجر کا ذکر فرمایا۔ اس مفہوم کی آیات

کہ جو اچھا عمل کرے ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے، کے لیے دیکھیے آل عمران (۱۷۱، ۱۹۵)۔

آیت 32-33 : وَاحْتَرَبَ لَهُمْ تَنَلًا رَجُلَيْنِ : کفار کو مسلمان فقراء کے مقابلے میں اپنے اموال و انصار پر فخر تھا، اس بنا

وَ كَانَ لَهُ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَ هُوَ يُجَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَ أَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۵﴾
 وَ دَخَلَ جَنَّتَهُ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ ۚ قَالَ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَذِهِ أَبَدًا ﴿۳۶﴾ وَ مَا أَظُنُّ
 السَّاعَةَ قَائِمَةً ۚ وَ لَئِن رُّدِدْتُ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۷﴾

اور اس کے لیے بہت سا پھل تھا تو اس نے اپنے ساتھی سے، جب اس سے باتیں کر رہا تھا، کہا میں تجھ سے مال میں زیادہ اور نفری کے لحاظ سے زیادہ باعزت ہوں ﴿۳۵﴾ اور وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، کہا میں گمان نہیں کرتا کہ یہ کبھی برباد ہوگا ﴿۳۶﴾ اور نہ میں قیامت کو گمان کرتا ہوں کہ قائم ہونے والی ہے اور واقعی اگر مجھے میرے رب کی طرف لوٹایا گیا تو یقیناً میں ضرور اس سے بہتر لوٹنے کی جگہ پاؤں گا ﴿۳۷﴾

پروہ مسلمانوں کو حقیر سمجھتے اور مجلس میں ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ بیان فرما کر سمجھایا کہ یہ چیزیں فخر کے لائق نہیں ہیں، کیونکہ ایک لمحہ میں فقیر غنی ہو سکتا ہے اور غنی فقیر۔ دنیا میں اگر فخر کی کوئی چیز ہے تو وہ ہے اللہ کی اطاعت اور اس کی عبادت اور یہ ان فقراء کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کافر و مومن کی ایک مثال بیان فرمائی کہ دو آدمی تھے (ان کے نام یا زمانہ معلوم نہیں، نہ ہی اس میں کوئی فائدہ ہے) ان میں سے ایک کو، جو کافر تھا، اللہ تعالیٰ نے انگوروں کے دو باغ عطا فرمائے تھے، جو بہت ہی خوب صورت اور نفع آور تھے۔ انگوروں کے باغوں کو کھجوروں نے گھیر رکھا تھا، دونوں باغوں کے درمیان بھیتی تھی اور دونوں باغوں کے درمیان اللہ کے حکم سے نہر چل رہی تھی۔ باغوں اور کھیتوں کو پانی کی کوئی کمی نہ تھی، چنانچہ دونوں باغوں نے پوری پیداوار دی اور کسی قسم کی کمی نہیں کی۔

آیت 34 وَ كَانَ لَهُ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ.....: ”ثَمَرٌ“ کی توین بکثیر کے لیے ہے، یعنی اس کے علاوہ بھی اس کے پاس بہت سا پھل تھا یا بہت نفع تھا، کیونکہ نفع کو بھی ثمر کہہ لیتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد اولاد لی ہے کہ کھیتوں اور باغوں کے علاوہ اس کی اولاد بھی بہت تھی۔ اس کی دلیل آگے مومن کا قول ہے: ﴿وَ لَئِن تَوَدَّ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَ أَعَزُّ نَفَرًا﴾ [الکھف: ۳۶] ”اگر تو مجھے دیکھتا ہے کہ میں مال اور اولاد میں تجھ سے کم تر ہوں۔“ دوسرا آدمی مومن تھا مگر تار دار تھا، اب اس کافر نے فخر سے گفتگو کرتے ہوئے اسے کہا، میرے پاس تم سے مال بھی زیادہ ہے اور آدمی بھی، یعنی اولاد، نوکر چاکر اور دوست۔ الغرض! اس بے ایمان نے اپنے مال و جاہ کے بھروسے پر مومن بھائی پر فخر کیا اور اسے اپنے باغات کا مشاہدہ کرانے کے لیے ساتھ لے چلا۔ (کبیر)

آیت 35-36 وَ دَخَلَ جَنَّتَهُ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ.....: اپنی جان پر ظلم کرنے والا اس لیے کہ اس نے تین باتیں کہیں جو تینوں کفر ہیں، اگرچہ وہ رب تعالیٰ کے وجود کو مانتا تھا، جیسا کہ ”وَ لَئِن رُّدِدْتُ إِلَىٰ رَبِّي“ سے ظاہر ہے۔ پہلی یہ کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی برباد ہوگا، حالانکہ اللہ کے سوا کسی بھی چیز کو ہمیشہ سے یا ہمیشہ کے لیے باقی سمجھنا نری جہالت اور دہریت

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاهُ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لَيْكَأَ هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ ﴿۳۹﴾ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ إِنَّ تَرَنُّنًا أَنَا قَلَّ مِنْكَ مَالًا وَوَلَدًا ﴿۴۰﴾

اس کے ساتھی نے، جب کہ وہ اس سے باتیں کر رہا تھا، اس سے کہا کیا تو نے اس کے ساتھ کفر کیا جس نے تجھے حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک قطرے سے، پھر تجھے ٹھیک ٹھاک ایک آدمی بنا دیا ﴿۳۷﴾ لیکن میں، تو وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا ﴿۳۸﴾ اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے یہ کیوں نہ کہا ”جو اللہ نے چاہا، کچھ قوت نہیں مگر اللہ کی مدد سے“ اگر تو مجھے دیکھتا ہے کہ میں مال اور اولاد میں تجھ سے کم تر ہوں ﴿۳۹﴾ ہے اور اللہ تعالیٰ کے اختیار اور ارادے کا انکار ہے، وہ جب چاہے کسی بھی چیز کو ”سُئِنٌ“ کہہ کر فنا کر سکتا ہے اور کرتا رہتا ہے۔ دوسری یہ کہ میں قیامت کو قائم ہونے والی نہیں سمجھتا، حالانکہ یہ اللہ کی قدرت کا انکار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جب پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے تو دوبارہ بھی قادر ہے۔ تیسری بات یہ کہ اگر بالفرض میں اپنے رب کی طرف دوبارہ لے جایا گیا تو مجھے یہاں سے بہتر جگہ ملے گی، کیونکہ یہ میرا حق ہے۔ دیکھیے خم السجدہ (۵۰) اور سورہ مریم (۷۷) یہ اعمال کی جزا و سزا سے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت و عدل سے انکار ہے اور مذکورہ تینوں باتیں کفر ہیں۔ (مہمانی)

آیت ۳۷ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ.....: ”تُرَابٍ“ اور ”نُطْفَةٍ“ کی تینوں تفسیر کے لیے ہے۔ اس کے مومن ساتھی نے، جسے وہ اپنے مال و جاہ پر فخر کرتے ہوئے فخر کا طعن دے رہا تھا، اس سے گفتگو کرتے ہوئے اسے جواب میں کفر کا طعن دیا اور کہا کیا تو نے اس ہستی سے کفر کیا جس نے تجھے حقیر مٹی سے، پھر ایک قطرے سے پیدا کیا، پھر ٹھیک ٹھاک ایک آدمی بنا دیا۔ دیکھیے حج (۵)، بقرہ (۲۸) اور مومنون (۱۳ تا ۱۴) تفسیر وحیدی میں ہے: ”افسوس کہ اکثر مسلمان مال دار بھی اسی غرور میں مبتلا ہیں، مساکین بلکہ علماء و صلحاء تک کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔“

آیت ۳۸ لَيْكَأَ هُوَ اللَّهُ رَبِّي.....: ”لَيْكَأَ“ اصل میں ”لَيْكُنْ“ (لیکن میں) ہے، یعنی تم کفر کرتے ہو تو کرتے رہو، لیکن میں یہ ظلم کبھی نہیں کروں گا، بلکہ وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا ساتھی مشرک تھا۔ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے چند کلمات سکھائے جنہیں میں پریشانی اور بے چینی کے وقت کہوں: ﴿اللَّهُ إِلَهُ رَبِّي لَا أُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا﴾ [ابوداؤد، الوتر، باب في الاستغفار: ۱۵۶۵] ”اللہ، اللہ ہی میرا رب ہے، میں اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بناتی (بناتا)۔“

آیت ۳۹ وَلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ.....: اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو اپنی کوئی چیز اچھی لگے تو اسے یہ کلمات کہنے چاہئیں: ﴿مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ﴾ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ﴿يَا أَبَا هُرَيْرَةَ! أَفَلَا أُذَلِّكَ عَلَى سَنَنِ الْحَنَّةِ تَحْتَ الْعَرْشِ، قَالَ قُلْتُ نَعَمْ، فِذَلِكَ أَبِي وَ أُمِّي، قَالَ أَنْ تَقُولَ لَا قُوَّةَ إِلَّا

فَصَبِي رَيْءٍ أَنْ يُؤْتَيْنِ خَيْرًا مِنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ فَتُصْبِحُ صَعِيدًا زَرَقًا ﴿۴۱﴾ أَوْ يُصْبِحَ مَاؤَهَا غُورًا فَلَنْ تَسْتَطِيعَ لَدَّ طَلَبًا ﴿۴۲﴾ وَ أُحِيطَ بِمَقْرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَى مَا أَنفَقَ فِيهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا وَ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا ﴿۴۳﴾

تو قریب ہے کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا کر دے اور اس پر آسمان سے کوئی عذاب بھیج دے تو وہ چٹیل میدان ہو جائے ﴿۴۱﴾ یا اس کا پانی گہرا ہو جائے، پھر تو اسے کبھی تلاش نہ کر سکے گا ﴿۴۲﴾ اور اس کا سارا پھل مارا گیا تو اس نے اس حال میں صبح کی کہ اپنی ہتھیلیاں ملتا تھا اس پر جو اس میں خرچ کیا تھا اور وہ اپنی چھتوں سمیت گرا ہوا تھا اور کہتا تھا اے کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ﴿۴۳﴾

بِاللَّهِ، قَالَ أَبُو بَلَجٍ وَأَصْبُ اللَّهُ قَالَ : فَإِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ أَسْلَمَ عَبْدِي وَاسْتَسْلَمَ، قَالَ فَقُلْتُ لِعَمْرٍو قَالَ أَبُو بَلَجٍ قَالَ عَمْرٍو قُلْتُ لِأَبِي هُرَيْرَةَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ فَقَالَ : لَا إِنِّهَا فِي سُورَةِ الْكُهْفِ : ﴿۴۱﴾ وَ لَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتِكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ﴿۴۲﴾ [مسند احمد : ۲/۳۲۵، ج : ۸۹۹۷] "اے ابو ہریرہ! کیا میں تمہیں عرش کے نیچے جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ بتاؤں؟" میں نے کہا: "ہاں! آپ پر میرے ماں باپ قربان!" فرمایا: "تم کہو" "لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ" ابو بلج راوی کہتے ہیں، میرا گمان ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرا بندہ مطیع ہو گیا اور اس نے اپنا آپ میرے سپرد کر دیا۔" ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے ان کے شاگرد نے پوچھا: "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ" تو انہوں نے فرمایا: "نہیں، یہ کلمہ سورہ کہف میں ہے: ﴿۴۱﴾ وَ لَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتِكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ﴿۴۲﴾" شعیب الرضوی نے کہا کہ یہ روایت عرش کے لفظ کے بغیر صحیح ہے۔ صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ نے "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ" کی یہی فضیلت رسول اللہ ﷺ سے بیان کی ہے۔ [بخاری، القدر، باب لا حول ولا قوة الا بالله : ۶۶۱۰] باقی وہ روایات جن میں یہ کلمات پڑھنے سے نظر بد یا کسی بھی نقصان سے محفوظ رہنے کا ذکر ہے، وہ سب ضعیف ہیں۔ (البانی) مگر ان کی فضیلت کے لیے آیت ہی کافی ہے۔

آیت 41-40 "صَعِيدًا" میدان، "زَرَقًا" جس میں قدم پھسلتا ہو۔ اس مومن نے اپنے مغرور ساتھی سے کہا کہ اگر تم مجھے مال و اولاد میں اپنے سے کم دیکھتے ہو تو یہ کوئی ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں، میں قریب ہے کہ میرا رب دنیا میں یا آخرت میں مجھے تمہارے باغ سے بہتر عطا کر دے اور تمہارے باغ پر آسمان سے کوئی عذاب بھیج کر زمین کو چٹیل میدان بنا دے۔ جہاں قدم پھسلتا ہو، یا وہ چشمہ جس سے اس کی نہر نکلتی ہے، اس کا پانی گہرا چلا جائے اور تم کسی صورت اسے حاصل نہ کر سکو۔ دیکھیے سورہ ملک کی آخری آیت۔

آیت 42 : ﴿۴۲﴾ وَ أُحِيطَ بِمَقْرِهِ..... لفظی معنی ہے اس کے پھل کو گھیر لیا گیا، یعنی سب مارا گیا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا اس

وَلَمْ تَكُنْ لَهُ فِتْنَةً يَتَصَوَّرُهُ مِنَ دُونِ اللَّهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۳۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ ۚ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَ خَيْرٌ عُقْبًا ﴿۳۴﴾

اور اللہ کے سوا اس کا کوئی گروہ نہ تھا جو اس کی مدد کرتے اور نہ وہ (خود) بچنے والا تھا ﴿۳۳﴾ وہاں ہر طرح کی مدد اللہ سچے کے اختیار میں ہے، وہ ثواب دینے میں بہتر اور انجام کی رو سے زیادہ اچھا ہے ﴿۳۴﴾

مومن نے کہا تھا کہ رات اللہ کی طرف سے کسی عذاب مثلاً طوفانی بارش، یا سردی کی شدید لہر، یا آگ لگنے سے اس کا سارا باغ برباد ہو گیا، انکو چھتوں سمیت گر گئے اور صبح ہوئی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کافر کی عجیب تصویر کھینچی ہے، کیونکہ جب ایک لخت صدمہ پہنچتا ہے تو آدمی پہلے گنگ رہ جاتا ہے، پھر کچھ سنبھلتا ہے تو بات کرتا ہے، یہ مشرک بھی اپنے باغ کی حالت دیکھتے ہی اپنی دونوں ہتھیلیاں پھیرنے لگا۔ اس سے دو صورتیں مراد ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ایک دوسری پر طے لگا اور دوسری یہ کہ حسرت و افسوس سے الگ الگ ہی ان کو الٹ پلٹ کرنے لگا کہ ہائے ہائے! میں نے اس میں کس قدر رقم خرچ کی تھی، نفع کے بجائے اصل بھی گیا۔ اب اسے یاد آیا کہ مومن بھائی کی بات سچی تھی اور کہنے لگا، کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا، غرور و تکبر کی راہ سے اپنے نفس کی پیروی نہ کرتا، بلکہ بھائی کی بات مان لیتا اور اپنی ساری شان و شوکت کو اللہ ہی کا عطیہ سمجھتا۔

آیت 43 وَلَمْ تَكُنْ لَهُ فِتْنَةٌ "مُنْتَصِرًا" کا معنی انتقام لینے والا بھی ہے اور خود بچنے والا بھی، یعنی عذاب آیا تو اس کا کوئی گروہ نہ تھا جو اس کی مدد کرتے، سوائے اللہ کے اور نہ وہ خود بچنے والا تھا۔ "بِنِ دُونِ اللَّهِ" کا ایک مطلب یہ ہے جو ترجمے میں گزرا۔ زبخشی اور کئی مفسرین نے یہی معنی کیا ہے، یعنی اس "وقت اللہ کے سوا" اسے کوئی بچانے والا نہ تھا، مگر اس کو وہ ناراض کر چکا تھا۔

"بِنِ دُونِ اللَّهِ" کا دوسرا معنی یہ ہے کہ پھر "اللہ کے مقابلے میں" اس کا کوئی گروہ نہ تھا جو اس کی مدد کو پہنچتا..... یہ معنی بھی کئی مفسرین نے کیا ہے۔ کسی بھی کافر کو جب یہ معاملہ پیش آتا ہے تو وہ اس وقت ہر طرف سے ناامید اور مجبور ہو کر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، مگر تب وقت گزر چکا ہوتا ہے اور اس کا ایمان اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا، جیسا کہ فرعون غرق ہوتے وقت ایمان لے آیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے یونس (۹۰ تا ۹۲) انبیاء ﷺ کے مخلصین نے اللہ کا عذاب دیکھا تو کہنے لگے، ہم اللہ اکیلے پر ایمان لے آئے۔ (دیکھیے مومن: ۸۳) اور قارون کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے بعینہ یہ الفاظ فرمائے جو زیر تفسیر قصے والے شخص کے متعلق فرمائے، فرمایا: ﴿وَقَسْنَا لَهُ الْوِزْنَ فَخَسَّنَا بِهِ وَ يَدَارِدُهُ الْأَرْضَ فَ مَا كَانَ لَهُ مِنَ فِتْنَةٍ يَتَصَوَّرُهُ مِنَ دُونِ اللَّهِ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنتَصِرِينَ ﴿۸۱﴾ [الفصص: ۸۱] "تو ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، پھر نہ اس کے لیے کوئی جماعت تھی جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کرتی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کرنے والوں میں سے تھا۔" مگر ان میں سے کسی کے ایمان نے اسے فائدہ نہ دیا۔

آیت 44 ﴿۱﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ : "هُنَالِكَ" کا معنی اس وقت بھی ہے اور اس جگہ بھی، اس لیے دونوں کو ملحوظ

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ اَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتٌ
الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوهُ الرِّيْحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۱۵﴾

اور ان کے لیے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کر، جیسے پانی، جسے ہم نے آسمان سے اتارا تو اس کے ساتھ زمین کی نباتات خوب مل جل گئی، پھر وہ چورا بن گئی، جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱۵﴾

رکھ کر ترجمہ اس موقع پر کیا گیا ہے۔ ”الْوَالِيَّةُ“ واؤ کے فتح کے ساتھ معنی ہے ”مدد“ اور واؤ کے کسرہ کے ساتھ معنی ہے ”حکومت، اختیار“ یعنی اس موقع پر صرف اللہ سچے ہی کی مدد کار آمد ہو سکتی ہے، جیسا کہ پچھلی آیت کی تفسیر میں گزرا۔
﴿۲﴾ هُوَ خَيْرٌ نُّوَابًا وَخَيْرٌ عُقْبًا : اہل علم متفق ہیں کہ ”خیر“ اور ”شُر“ دونوں اسم تفضیل ہیں، یعنی اصل میں ”اُخَيْرُ“ اور ”اَشْرُ“ تھے، تخفیف کے لیے انھیں ”خَيْرُ“ اور ”شُرُ“ کر دیا گیا۔ یعنی بدلہ دینے میں اللہ سب سے بہتر ہے، اس جیسا یا اس سے اچھا بدلہ کسی کے پاس نہیں اور اچھے انجام کے لحاظ سے بھی وہی سب سے بہتر ہے۔ اس کے عطا کردہ انجام جیسا انجام بھی کسی کے پاس نہیں۔ ”خَيْرُ“ کا لفظ دوبارہ تاکید اور مبالغہ کے لیے ہے۔

آیت 45 وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا : ”هَشِيْمًا“ یہ ”فَعِيْلٌ“، بمعنی ”مَفْعُوْلٌ“ ہے، یعنی چورا چورا کیا ہوا۔ ”تَذْرُوهُ“ ”ذَرًا يَذْرُو“ (ن) ہواؤں کا اڑانا۔ ”نُقْتَدِرًا“ ”قَدَرٌ يَقْدِرُ“ سے باب افتعال کا اسم فاعل ہے، حروف زیادہ ہونے سے معنی زیادہ ہو گیا، یعنی پوری قدرت رکھنے والا۔ یہ دنیا کی بے ثباتی کی ایک اور مثال ہے، یعنی دنیا کی مثال اس پانی کی سی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا، اس کے ساتھ زمین سے پودے اگے، پھرتے گھنے ہو گئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہایت خوب صورت منظر پیش کرنے لگے، جسے دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے، پھر وہ بھتی پک کر زرد ہو گئی، پھر ایسی خشک ہوئی کہ ٹوٹ پھوٹ کر چورا ہو گئی۔ اسی طرح آسمان سے روح اتری، زمین سے بننے والے بدن سے مل کر انسان بڑھنا شروع ہو گیا، بچپن کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے جوانی آ گئی، ماں باپ جوان اولاد کو دیکھ کر کھل اٹھے، پھر تھوڑی ہی مدت بعد بڑھاپا آ گیا۔ اب اس نے فنا ہونا ہی ہونا ہے، جس طرح کچی ہوئی فصل کو پانی دیا جائے یا کھاد، اسے ریزہ ریزہ ہونا ہی ہے، اسی طرح بوڑھے کو مقوی غذا دی جائے یا کشتے، اس نے قبر میں جا کر مٹی کے ذرات میں بدلنا ہی ہے۔ پھر کچی پودے اگتے ہی اکھاڑ لیے جاتے ہیں، کئی سرسبز پودے جو بن پر کاٹ لیے جاتے ہیں، پھر اگر کوئی حادثہ پیش نہ آئے تو پکنے پر کاٹ لیے جاتے ہیں، یا خود ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کوئی بچپن میں، کوئی جوانی یا ادھیڑ عمر میں فوت ہو جاتے ہیں، اگر یہ مدت خیریت سے گزر جائے تو بڑھاپے کے بعد یہاں رہنے کا معاملہ ہر حال میں ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے تمام مرحلوں کے درمیان ”فاء تعقیب“ رکھی، یعنی ”فَاخْتَلَطَ“ اور ”فَاَصْبَحَ“ یعنی یہ مرحلے ایک دوسرے کے پیچھے جلد از جلد آتے چلے جاتے ہیں۔ اس مفہوم کی آیات کے لیے دیکھیے یونس (۲۳)، زمر (۲۱) اور حدید (۲۰)۔

أَمْوَالٌ وَ الْبُنُونُ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ الْبَقِيَّةُ الصَّالِحَةُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَ

خَيْرٌ أَمَلًا ﴿۱۷﴾

مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب میں بہتر اور امید کی رو سے زیادہ اچھی ہیں ﴿۱۷﴾

آیت 46 ﴿۱۷﴾ أَمْوَالٌ وَ الْبُنُونُ..... اس آیت سے مقصود لوگوں کو نیک اعمال کی طرف توجہ دلانا ہے، تاکہ وہ باقی رہنے والے نیک اعمال کو چھوڑ کر، جو آخرت میں کام آنے والے ہیں، محض دنیا کی زندگی کی زینت والی چیزوں میں مشغول نہ رہیں، کیونکہ دنیا کی زندگی بے ثبات اور عارضی ہے، جیسا کہ پچھلی آیت میں مثال سے واضح فرمایا، تو اس کی چمک دک اور زینت اس سے بھی زیادہ بے ثبات اور عارضی ہے۔ سو باقی کو فانی پر ترجیح دینا ہی کامیابی ہے۔ اس آیت میں مال اور بیٹوں ہی کا ذکر فرمایا، کیونکہ مال میں انسان کی ملکیت کی ہر چیز آجاتی ہے، مکان، مویشی اور سونا چاندی وغیرہ۔ دوسری آیات میں ان کی تفصیل اور ان کا فتنہ و آزمائش ہونا تفصیل سے ذکر فرمایا، دیکھیے آل عمران (۱۵، ۱۳)، منافقون (۹) اور تغابن (۱۵، ۱۳)۔

﴿۱۷﴾ وَ الْبَقِيَّةُ الصَّالِحَةُ: ان الفاظ میں وہ تمام نیک اعمال آجاتے ہیں جو اللہ کو راضی کرنے والے ہیں اور ان کا اجر قیامت کے دن کے لیے باقی ہے۔ عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ”الْبَقِيَّةُ الصَّالِحَةُ“ کیا ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا: ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ سُبْحَانَ اللَّهِ وَ الْحَمْدُ لِلَّهِ وَ اللَّهُ أَكْبَرُ وَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ﴾ [مسند احمد: ۷۱/۱، ح: ۵۱۵] ”الْبَقِيَّةُ الصَّالِحَةُ“ کا ایک خاص مفہوم بھی ہے، یعنی وہ اعمال جن کا ثواب آدمی کو فوت ہونے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ﴾ [مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته: ۱۶۳۱] ”جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل اس سے منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے، ایک وہ صدقہ جو جاری رہنے والا ہو (مثلاً مسجد، شفا خانہ، کنواں وغیرہ)، ایک وہ علم جس سے نفع اٹھایا جائے (مثلاً تدریس، تصنیف، تبلیغ وغیرہ) اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے (یا شاگرد وغیرہ جو دعا کرتے رہیں)۔“ مسلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿رِبَاطٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَقِيَامِهِ، وَإِنْ مَاتَ، حَرَى عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِي كَانَ يَعْمَلُهُ، وَأُجْرِي عَلَيْهِ رِزْقُهُ، وَأَمِنَ الْفِتَانَ﴾ [مسلم، الإمارة، باب فضل الرباط في سبيل الله عز وجل: ۱۹۱۳۔ ترمذی: ۱۶۶۵۔ نسائی: ۳۱۶۹، ۳۱۷۰] ”اللہ کے راستے میں ایک دن اور ایک رات کا رباط (سرحد پر دشمن کے مقابلے کے لیے رہنا) ایک ماہ کے روزے اور اس کے قیام سے بہتر ہے، پھر اگر وہ فوت ہو جائے تو اس کا وہ عمل اس کے لیے جاری رکھا جاتا ہے جو وہ کرتا تھا اور اس کے لیے اس کا رزق جاری رکھا جاتا ہے اور آزمائش کرنے والوں (منکر و نکیر) سے امن میں رہتا ہے۔“ مسلم میں ایک دن اور ایک رات کے لفظ ہیں اور اس میں ”فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ کے الفاظ نہیں ہیں۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ جاریہ، تعلیم

وَيَوْمَ نُسِئُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۗ وَ حَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۗ ﴿۴۷﴾
 وَ عَرَضُوا عَلَى رَبِّكَ صَفًّا ۖ لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّنْ
 نَجْعَلَ لَكُمْ قُوْعِدًا ۗ ﴿۴۸﴾

اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تو زمین کو صاف میدان دیکھے گا اور ہم انہیں اکٹھا کریں گے تو ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے ﴿۴۷﴾ اور وہ تیرے رب کے سامنے صفیں باندھے ہوئے پیش کیے جائیں گے، بلاشبہ یقیناً تم ہمارے پاس اسی طرح آئے ہو جیسے ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا، بلکہ تم نے گمان کیا تھا کہ ہم تمہارے لیے کبھی وعدے کا کوئی وقت مقرر نہیں کریں گے ﴿۴۸﴾

دین، دعا کرنے والی اولاد صالح اور جہاد فی سبیل اللہ خاص باقیات صالحات ہیں، جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔
 ﴿۴۷﴾ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ : یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں ان اعمال کا بدلہ تیرے رب کے ہاں تمام بدلوں سے بہتر ہے اور ان کے اجر کی امید بھی سب امیدوں سے بہتر ہے۔

آیت 47 ﴿۴۷﴾ ۱ ﴿۴۷﴾ وَيَوْمَ نُسِئُ الْجِبَالَ : ”یَوْمَ“ ”أَذْكُرُ“ محذوف کی وجہ سے منصوب ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے اجر کی پائیداری کی مناسبت سے اب قیامت کے دن کا ذکر فرمایا، یعنی اس دن کو یاد کیجیے جب پہاڑوں کو چلایا جائے گا اور وہ مختلف حالتوں سے گزرتے ہوئے آخر سب کی طرح رہ جائیں گے، زمین کے سمندر، پہاڑ اور اونچی نیچی تمام جگہیں ہموار ہو جائیں گی اور پوری زمین پر نگاہ کے لیے کوئی رکاوٹ یا اوٹ باقی نہیں رہے گی۔ پہاڑوں پر گزرنے والی کیفیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ نبا (۲۰)، حاقہ (۱۳ تا ۱۵)، طور (۹، ۱۰)، تکویر (۳)، نمل (۸۸)، معارج (۸، ۹)، قارعہ (۴، ۵)، مزل (۱۳) اور واقعہ (۶، ۵) زمین کے ہموار ہونے کے ذکر کے لیے دیکھیے سورہ طہ (۱۰۵ تا ۱۰۷)۔

﴿۴۸﴾ وَ حَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا : اللہ تعالیٰ پہلے اور پچھلے سب لوگوں کو اکٹھا کرے گا، کسی کو باقی نہیں چھوڑے گا۔ دیکھیے سورہ واقعہ (۴۹، ۵۰) دوسرے مقام پر وضاحت فرمائی کہ اس حشر میں جن و انس کے علاوہ دوسری تمام مخلوقات بھی شامل ہوں گی، چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا يَنْبَغِي فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي سَائِرِ مَخَلَقَاتِهِ إِلَّا أَنْ يُعَذِّبَ اللَّهُ النَّاسَ فِي الْآيَاتِ الَّتِي لَهُمْ لِيَتَذَكَّرُوا فِيهَا وَلَعَلَّ يُهْتَفَ بِهِنَّ﴾ [الأنعام: ۳۸] ”اور زمین میں کوئی چلنے والا جاندار نہیں اور نہ کوئی پرندہ ہے جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے مگر تمہاری طرح اٹس ہیں، ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی، پھر وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَتَوَدَّ أَنْ يَنْقُضَ اللَّهُ أَعْيُنَهُمْ وَلِيُنَظَّرَهُمْ فِي يَوْمِ أَهْلِيهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتَّى يُنَادَى لِلشَّاةِ الْجَلْحَاءِ مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَاءِ﴾ [مسلم، البر والصلة، باب تحريم الظلم: ۲۵۸۲] ”قیامت کے دن حق والوں کو ان کے حقوق ہر صورت ادا کیے جائیں گے، حتیٰ کہ بغیر سینگ والی بکری کو سینگ والی بکری سے بدلہ دلایا جائے گا۔“

آیت 48 ﴿۴۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ : یعنی اللہ تعالیٰ ان سے یہ بات فرمائے گا۔ دیکھیے سورہ انعام (۹۴)

وُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَ يَقُولُونَ يَوْمَلْنَا مَا لَ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَ وَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَ لَا يَظْلِمُ مَرَاتَبًا أَحَدًا ۝

اور کتاب رکھی جائے گی، پس تو مجرموں کو دیکھے گا کہ اس سے ڈرنے والے ہوں گے جو اس میں ہوگا اور کہیں گے ہائے ہماری بربادی! اس کتاب کو کیا ہے، نہ کوئی چھوٹی بات چھوٹی ہے اور نہ بڑی مگر اس نے اسے ضبط کر رکھا ہے، اور انھوں نے جو کچھ کیا اسے موجود پائیں گے اور تیرا ب کسی پر ظلم نہیں کرتا ۝

یہ خطاب آخرت کے منکروں سے ہوگا، جیسا کہ اس آیت کے آخر میں ہے: ﴿بَلْ زَعَمْتُمْ أَنَّن فَجَعَلْنَا لَكُمُ فَوَعْدًا﴾ بلکہ تم نے گمان کیا تھا کہ ہم تمہارے لیے کبھی وعدے کا کوئی وقت مقرر نہیں کریں گے۔ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿تُحْشَرُونَ حُفَاةَ عُرَاةٍ غُرُلًا قَالَتْ غَائِثَةٌ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! الرَّجَالُ وَالنِّسَاءُ يَنْظُرُ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ؟ فَقَالَ الْأَمْرُ أَشَدُّ مِنْ أَنْ يُهْمَهُمْ ذَلِكَ﴾ [بخاری، الرقاق، باب الحشر: ۶۵۲۷] ”تم قیامت کے دن ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بغیر ختنے کے اکٹھے کیے جاؤ گے۔“ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے کہا: ”یا رسول اللہ! مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو دیکھیں گے؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”معاملہ اس سے کہیں سخت ہوگا کہ انھیں اس بات کی سوچ آئے۔“ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ حدیث آئی ہے، اس میں ہے کہ آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نَعْبُدُكَ وَوَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ﴾ [الانبیاء: ۱۰۴] ”جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کی ابتدا کی (اسی طرح) ہم اسے لوٹائیں گے۔ یہ ہمارے ذمے وعدہ ہے، یقیناً ہم ہمیشہ (پورا) کرنے والے ہیں۔“ اس حدیث میں یہ بھی ہے: ﴿ثُمَّ إِنَّ أَوَّلَ الْخَلْقِ يَكْسِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِبْرَاهِيمَ﴾ [بخاری، التفسیر، سورة الانبیاء، باب: ﴿كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نَعْبُدُكَ وَوَعْدًا عَلَيْنَا﴾: ۶۵۲۶، ۴۷۴۰] ”پھر سب سے پہلے جسے لباس پہنایا جائے گا وہ ابراہیم (علیہ السلام) ہوں گے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ مسلسل بے لباس کفار ہی رہیں گے۔

آیت 49 ﴿۱﴾ مَالِ هَذَا الْكِتَابِ: بھائی ﷺ نے رسم عثمانی میں لام جارہ کو الگ لکھنے کا ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ مجرم اتنے خوف زدہ ہوں گے کہ وہ بعض کلمات پر رک جایا کریں گے۔ علامہ قاسمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ بھائی کے لطیف نکتوں میں سے ایک ہے۔

﴿۲﴾ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً اس کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے آل عمران (۳۰) اور زلزال (۸، ۷)۔

﴿۳﴾ وَلَا يَظْلِمُ مَرَاتَبًا أَحَدًا: یعنی کسی کو بے تصور سزا نہیں دے گا اور نہ ایسا ہوگا کہ اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو اور اس کے نامہ اعمال میں درج کر دیا جائے۔

وَ إِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَہٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَ هُمْ لَکُمْ عَدُوٌّۭ بِئْسَ لِلظٰلِمِیْنَ بَدَلًا ۝۵۰
مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلَقْتُۢهُمْ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ مَا کُنْتُ تُشْخِذُ الضّٰلِیْنَ

عَصَدًا ۵۱

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، وہ جنوں میں سے تھا، سو اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی، تو کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر دوست بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں، وہ (شیطان) ظالموں کے لیے بطور بدل برا ہے ۵۰ میں نے انہیں نہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں حاضر کیا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے میں اور نہ ہی میں گمراہ کرنے والوں کو بازو بنانے والا تھا ۵۱

آیت 50 ﴿ ۱ ﴾ وَ إِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا اس سلسلہ کلام میں آدم و ابلیس کا قصہ ذکر کرنے کی مناسبت یہ ہے کہ

کفار کو متنبہ کیا جائے کہ تم جس غرور و تکبر کی راہ پر چل رہے ہو اور فقراء مسلمین کو حقیر سمجھتے ہو یہ وہی راہ ہے جس پر تم سے پہلے شیطان نے قدم رکھا تھا، پھر دیکھ لو کہ اس کا انجام کیا ہوا؟

﴿ ۲ ﴾ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ : ” فَفَسَقَ “ میں فاء تعلیل یعنی وجہ بیان کرنے کے لیے ہے، جیسے کہتے ہیں : ” سَرَقَ فَقَطَعَتْ يَدُهٗ “ ” اس نے چوری کی، تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ “ یعنی شیطان جنوں میں سے تھا، اس لیے اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ اگر فرشتوں سے ہوتا تو کبھی نافرمانی نہ کرتا، کیونکہ فرشتے نہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں نہ اس کے حکم کے بغیر کوئی کام کرتے ہیں۔ دیکھیے انبیاء (۲۶ تا ۲۸) اور تحریم (۶) معلوم ہوا کہ ابلیس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اصل میں فرشتہ تھا، نام اس کا عزرایل تھا، یا جن تھا مگر کثرت عبادت کی وجہ سے فرشتوں کا استاد بن گیا، بالکل بے اصل بات ہے۔ رہا یہ سوال کہ سجدے کا حکم تو فرشتوں کو تھا، جنوں کو تھا ہی نہیں تو اس کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۱۴) اور سورہ بقرہ (۳۴) کی تفسیر۔

﴿ ۳ ﴾ اَفَتَتَّخِذُوْنَہٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗ اَوْلِيَآءَ اس سے معلوم ہوا کہ ابلیس کی اولاد ہے، مگر ان کی نسل کیسے بڑھی اور کیسے بڑھتی ہے اس کے متعلق صحیح ذریعے سے ہمارے پاس کوئی علم نہیں۔

﴿ ۴ ﴾ بِئْسَ لِلظٰلِمِیْنَ بَدَلًا : ” بِئْسَ “ کا فاعل ” هُوَ “ ضمیر ہے، جو ابلیس کی طرف لوٹی ہے، یعنی اللہ کے بدلے میں ابلیس کو دوست بنایا تو تم نے بہت برا بدل حاصل کیا۔

آیت 51 ﴿ ۱ ﴾ مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ اللہ تعالیٰ نے اپنے معبود برحق ہونے کی سب سے بڑی دلیل جو قرآن

میں بیان فرمائی ہے اور بار بار بیان فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر چیز کا خالق میں ہوں، میرے سوا کوئی کبھی بھی پیدا نہیں کر سکتا تو پھر میری بندگی اور دوستی چھوڑ کر مخلوق کی بندگی اور دوستی کیوں؟ مثلاً دیکھیے سورہ نحل (۱۷)، رعد (۱۶)، لقمان (۱۱)، فاطر (۳۰)

وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَائِيَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَجَعَلْنَا
بَيْنَهُمْ مَوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُمْ مُوَاقِعُوهَا وَ لَمْ يَجِدُوا عَنْهَا
مَصْرَفًا ﴿۵۳﴾ وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَ كَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ
شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

شئیء جَدَلًا ﴿۵۴﴾

اور جس دن فرمائے گا پکارو میرے ان شریکوں کو جو تم نے گمان کر رکھے تھے، سو وہ انہیں پکاریں گے تو وہ انہیں کوئی
جواب نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک ہلاکت کی جگہ بنا دیں گے ﴿۵۲﴾ اور مجرم لوگ آگ کو دیکھیں گے تو یقین
کر لیں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور اس سے پھرنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے ﴿۵۳﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے
اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر مثال پھیر پھیر کر بیان کی ہے اور انسان ہمیشہ سے سب چیزوں سے زیادہ جھگڑنے
والا ہے ﴿۵۴﴾

اور احقاف (۴) وغیرہ۔ اس آیت میں فرمایا کہ جب میں نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تو ان شیاطین کا کوئی وجود نہ تھا کہ وہ ان
کے بنانے میں میرے شریک ہوتے اور نہ میں نے انہیں ان کی اپنی پیدائش میں شریک کیا۔ مطلب یہ کہ یہ خود میرے پیدا کردہ
ہیں، پھر یہ میرے شریک اور تمہاری بندگی اور اطاعت کے مستحق کیسے بن گئے؟ اور مخلوق خالق کی ہمسرے کیسے بن گئی؟
﴿۵۲﴾ وَمَا كُنْتُمْ تَدْعُونَ النُّصَلِينَ عَضُدًا: یعنی نہ میں نے کسی بھی مخلوق سے پیدا کرنے میں کوئی مشورہ یا مدد لی اور نہ کبھی
اس طرح کے شریروں اور نافرمانوں کو، جن کا کام دوسروں کو گمراہ کرنا اور شرارت پھیلانا ہے، اپنا بازو، یعنی مددگار بنانے والا
تھا۔ میں نے کسی کی بھی مدد یا مشورے کے بغیر اپنی مرضی کے مطابق ساری مخلوق پیدا کی۔ گویا "النُّصَلِينَ" پر الف لام عہد کا
ہے، مراد شیطان اور اس کی اولاد ہے۔ اس کی ہم معنی آیت کے لیے دیکھیے سورہ سبأ (۲۲، ۲۳)۔

آیت 52 ﴿۵۲﴾ وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَائِيَ.....: یعنی ان مشرکوں سے اس دن کا ذکر کیجئے جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ
میرے شریکوں کو آواز دو جنہیں تم نے میرے شریک سمجھ رکھا تھا، وہ انہیں پکاریں گے مگر مدد تو کجا، وہ انہیں جواب بھی نہیں دیں
گے۔ دیکھیے قصص (۶۲ تا ۶۳)، فاطر (۱۳، ۱۴)، احقاف (۶، ۵)، مریم (۸۱، ۸۲)، انعام (۹۴) اور ابراہیم (۲۲)۔
﴿۵۳﴾ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَوْبِقًا: "وَبَقَّ يَبْقَى" (ض، ع، ب) روزانہ "وَزَتْ" ہلاک ہونا، یعنی ہم ان مشرکوں اور ان لوگوں کے
درمیان جنہیں وہ دنیا میں اپنا معبود سمجھتے تھے ہلاکت کی ایک جگہ بنا دیں گے جس سے ان کا ایک دوسرے تک پہنچنا ممکن
نہ رہے گا۔

آیت 53 ﴿۵۳﴾ وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ.....: آگ میں جانے سے پہلے آگ کو دیکھنا اور اس بات کا یقین کہ اب اس میں
جائے بغیر کوئی چارہ نہیں، بجائے خود ایک بہت بڑا عذاب ہے۔ مزید دیکھیے شوریٰ (۲۴ تا ۲۷)۔

آیت 54 ﴿۵۴﴾ وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ.....: مثال سے بات بہت اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے۔ اس سورت میں

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَ يَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ سُنَّةٌ
الْأُولَىٰ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾

اور لوگوں کو کسی چیز نے نہیں روکا کہ وہ ایمان لائیں، جب ان کے پاس ہدایت آگئی اور اپنے رب سے بخشش مانگیں،
مگر اس بات نے کہ ان کو پہلے لوگوں کا سا معاملہ پیش آجائے، یا ان پر عذاب سامنے آمو جو ہو ﴿۵۵﴾

اللہ تعالیٰ نے کئی مثالیں بیان فرمائی ہیں، مثلاً دنیا کی زندگی کی مثال اور آخرت پر ایمان رکھنے والے مسکین اور ایمان نہ رکھنے
والے دو باغوں کے مالک کی مثال وغیرہ۔ اس کے علاوہ دوسری سورتوں میں بھی مختلف دلیلوں، کئی طریقوں اور مثالوں سے
بات سمجھائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی باتیں مجھ (بقرہ: ۲۶)، کبھی (حج: ۷۳) کتے (اعراف: ۱۷۷) اور گدھے (جمہ: ۵)
کی مثالیں دے کر سمجھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے مختار مطلق اور مخلوق کے بے اختیار ہونے کے لیے مالک اور غلام کی مثالیں کئی
جگہ بیان ہوئی ہیں۔ دیکھیے نخل (۷۵، ۷۶) اور روم (۲۸) قرآن و حدیث کی تمام مثالوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگ بات پر غور و
فکر کریں اور اسے سمجھیں، مگر انہیں جاننے والے ہی سمجھتے ہیں۔ (دیکھیے حشر: ۲۱۔ عنکبوت: ۲۳) پھر ان مثالوں سے کچھ لوگ فائدہ
اٹھا کر ہدایت پالیتے ہیں اور کچھ الٹی سمجھ سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۲۶۔ رعد: ۱۷، ۱۸) آیت کی مزید تفصیل کے
لیے دیکھیے بنی اسرائیل (۸۹) اس آیت میں ”فِي هَذَا الْقُرْآنِ“ پہلے ہے، کیونکہ اس سورت کی ابتدا ہی قرآن کے ذکر سے ہوئی
ہے اور یہ سورت قرآن کے وصف میں سے ہے اور بنی اسرائیل میں ”لِلنَّاسِ“ پہلے ہے، کیونکہ اس سورت کا بنیادی مضمون ”النَّاسُ“
(لوگوں) کے احوال کی طرف توجہ ہے، جو نبی الحقیقت ”النَّاسُ“ (لوگ) ہیں، جن میں تقویٰ اور احسان پایا جاتا ہے۔ (بھائی)

﴿۵۵﴾ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا : یعنی جو چیزیں جھگڑا کر سکتی ہیں، انسان ان میں سب سے زیادہ جھگڑنے والا ہے،
اس لیے خواہ خواہ جیل و حجت کیے جاتا ہے اور حق بات کی طرف نہیں آتا۔ قرآن میں جا بجا ہمارے نبی ﷺ اور دوسرے انبیاء
کے ساتھ کفار کے جھگڑے مذکور ہیں۔ جھگڑے کی ایک مثال سورہ زخرف (۵۷، ۵۸) میں دیکھیے۔

آیت 55 وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا.....: اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں کی تائید میں آیات موجود ہیں۔

ایک مطلب یہ ہے کہ رسولوں کے واضح نشانیاں لانے کے باوجود لوگوں کو ایمان لانے اور استغفار سے روکا تو صرف اس بات
نے کہ اللہ کے علم میں تھا کہ یہ لوگ اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ان پر ہمارا عذاب اسی طریقے سے نہ آجائے
جس طرح پہلے لوگوں، مثلاً قوم نوح، عاد اور ثمود وغیرہ پر آیا، جس نے انہیں جڑ سے اکھیڑ دیا، یا قیامت کے دن کا عذاب ان
کے سامنے نہ آجائے، یعنی ان کی تقدیر ہی میں ایمان لانا نہیں ہے۔ یہ تفسیر ”مَا نَعَهُ الْخَلْقُ“ ہے۔ یعنی ان دونوں چیزوں میں
سے ایک ضرور ہوگی کہ اگر دنیا میں پہلے لوگوں جیسے عذاب سے بچے رہے تو قیامت کا عذاب ان کی آنکھوں کے سامنے ضرور
آئے گا اور دونوں جمع بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں پہلے لوگوں کی طرح عذاب بھی آئے گا اور آخرت میں بھی عذاب کو
سامنے دیکھ لیں گے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک بھی نہ ہو۔ اس معنی کی تائید میں فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ

وَمَا تُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا نُبَشِّرِينَ وَ مُنذِرِينَ ۚ وَ يُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ وَ اتَّخَذُوا آيَاتِي وَ مَا أَنْزَرْنَا هُرُوجًا ۝۱۰۰ وَ مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدُهُ ۚ إِنْكَارًا جَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَ إِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَى فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا ۝

اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، باطل کو لے کر جھگڑا کرتے ہیں، تاکہ اس کے ساتھ حق کو پھسلا دیں اور انہوں نے میری آیات کو اور ان چیزوں کو جن سے انہیں ڈرایا گیا، مذاق بنا لیا ۱۰۰ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی گئی تو اس نے ان سے منہ پھیر لیا اور اسے بھول گیا جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا، بے شک ہم نے ان کے دلوں پر پردے بنا دیے ہیں، اس سے کہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ رکھ دیا ہے اور اگر تو انہیں سیدھی راہ کی طرف بلائے تو اس وقت وہ ہرگز کبھی راہ پر نہ آئیں گے ۱۰۰

لَا يُؤْمِنُونَ ۚ وَ لَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ نَبْرُوا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝ [یونس : ۹۷، ۹۶] ”بے شک وہ لوگ جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی، وہ ایمان نہیں لائیں گے، خواہ ان کے پاس ہر نشانی آجائے، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔“ اس معنی کی مزید آیات کے لیے دیکھیے یونس (۱۰۱) اور مائدہ (۳۱)۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے ایمان لانے اور استغفار کرنے سے روکا تو صرف ان کے اس مطالبے نے کہ ان پر پہلے لوگوں جیسا جزا سے اکھاڑ دینے والا عذاب آجائے، یا قیامت کا عذاب ان کی آنکھوں کے سامنے آجائے، یعنی وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے اسی مطالبے پر ڈٹے رہے، نہ ایمان لائے نہ اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ اس مفہوم کی آیات بہت ہیں، مثلاً شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرا دے، اگر تو بچوں سے ہے۔ (شعراء : ۱۸۷) اسی طرح قوم ہود کا مطالبہ (احقاف : ۲۲)، ثمود کا مطالبہ (اعراف : ۷۷)، قوم لوط (عنکبوت : ۲۹)، قوم نوح (ہود : ۳۲) اور مشرکین مکہ کا مطالبہ (انفال : ۳۲) آیت میں دونوں معنی کی گنجائش ہے اور دونوں درست ہیں۔

آیت 56 ﴿۱﴾ وَ مَا تُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا نُبَشِّرِينَ وَ مُنذِرِينَ : یعنی رسولوں کا کام بشارت و نذارت ہے، عذاب لانا یا نہ لانا ان کے اختیار میں نہیں اور کافر لوگ باطل کے ذریعے سے جھگڑا کر کے حق کو شکست دینا چاہتے ہیں، مثلاً یہ کہ تم رسول ہو تو صفا پہاڑ سونے کا بنا دو وغیرہ، حالانکہ یہ نہ رسول کا کام ہے نہ اس کے اختیار میں ہے۔ دوسرے کئی مقامات پر فرمایا کہ کافروں کی یہ خواہش نہ کبھی پوری ہوگی اور نہ اللہ کا نور پھونگوں سے بجھایا جاسکے گا۔ دیکھیے توبہ (۳۲) اور شوریٰ (۱۶)۔

﴿۲﴾ وَ اتَّخَذُوا آيَاتِي : اللہ کی آیات اور اس کے رسولوں کو مذاق بنا لینا جھٹلانے کی بدترین صورت ہے۔

آیت 57 ﴿۱﴾ وَ مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ : یعنی اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ جس

وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ لَعَجَلَ لَعَجَلَ لَهُمُ الْعَذَابُ ۗ بَلْ لَهُمْ مَوْعِدٌ لَنْ يَجِدُوا مِنْ دُونِهِ مَوْبِلًا ۝۵۹ وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْتُمُوهَا لَمَّا ظَلَمْتُمْ وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَوْعِدًا ۝۶۰ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَلْبِهِ لَا أُبْرِخُ حَتَّىٰ أَتْلُغَ بَحْرَيْنِ أَوْ أَدْرُجَ

اور تیرا رب نہایت بخشنے والا، خاص رحمت والا ہے، اگر وہ انہیں اس کی وجہ سے پکڑے جو انہوں نے کیا ہے تو یقیناً ان کے لیے جلد عذاب بھیج دے، بلکہ ان کے لیے وعدے کا ایک وقت ہے جس سے بچنے کی وہ ہرگز کوئی پناہ گاہ نہ پائیں گے ۵۹ اور یہی بستیاں ہیں، ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، جب انہوں نے ظلم کیا اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے ایک مقرر وقت رکھ دیا تھا ۶۰ اور جب موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا میں نہیں ہوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں

جس کے متعلق آیا ہے وہ سب ایسے ہیں کہ ان سے بڑا ظالم کوئی نہیں، مثلاً اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ دیکھیے سورہ کہف (۱۵)۔

۲ اِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ اَكِنَّةً..... "اَكِنَّةً" "كِنَانًا" کی جمع ہے، پردے۔ "وَقَفْرًا" کا معنی ہے بوجھ، بہرا پن۔ یعنی جب کوئی شخص کسی کے سیدھی طرح سمجھانے سے کوئی اثر نہیں لیتا، بلکہ جانتے بوجھتے ہٹ دھرم اور جھگڑا لو بن جاتا ہے، اللہ کی واضح آیات کا مذاق اڑاتا ہے اور اپنے کرتوتوں اور ان کے برے نتائج سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کرتا تو آخر کار اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور اس کے کان حق بات سننے سے بہرے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص اسے سیدھی راہ کی طرف بلائے بھی تو ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اس کی یہ کیفیت اگرچہ اس کے اپنے عمل سے پیدا ہوتی ہے، مگر خالق چونکہ ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے اس کیفیت کے پیدا کرنے کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر دیا ہے۔

آیت 58 ۱ وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۱۵۶)، سورہ نجم (۳۲) اور زمر (۵۳)۔

۲ لَوْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ لَعَجَلَ لَعَجَلَ لَهُمُ الْعَذَابُ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ نحل (۶۱) اور فاطر (۴۵)۔

۳ بَلْ لَهُمْ مَوْعِدٌ لَنْ يَجِدُوا مِنْ دُونِهِ..... "مَوْبِلًا" "وَأَلْ يَبْلُ إِلَى مَكَانٍ" کسی جگہ کی طرف پناہ لینا۔ "مَوْبِلًا" پناہ کی جگہ، یعنی ان کے عذاب کے وعدے کا ایک وقت ہے، دنیا میں ہو یا آخرت میں۔ جب ان کی گرفت ہوگی تو اس سے بچنے کے لیے وہ کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے۔ تو اسے کفار قریش! تمہیں بھی ڈرتے رہنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ آخر کار تمہارا بھی وہی حشر ہو جو ان بستیوں کا ہوا۔

آیت 59 ۱ وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْتُمُوهَا.....: مراد ہیں سہا، ثمود، مدین اور قوم لوط کی تباہ شدہ بستیاں، جن کی سرگزشت سے

عرب کے تمام لوگ واقف تھے اور جن پر قریش کا اپنے سفروں میں آتے جاتے ہمیشہ گزر ہوتا تھا۔

آیت 60 ۱ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَلْبِهِ.....: یہاں سے تیسرا قصہ شروع ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام خضر کے پاس علم حاصل

کرنے کے لیے گئے۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ ایک مستقل قصہ ہے، تاہم اس میں اس بات کی تائید بھی ہے جو پہلے دونوں قصوں میں

۱۰) أَحْضَى حَقْبًا

کے ملنے کے مقام پر پہنچ جاؤں، یا مدتوں چلا رہوں ۱۰

گزری۔ اوپر ذکر فرمایا کہ کافر اپنے مال و جاہ پر مغرور رہتے اور مسلمانوں کو ذلیل سمجھ کر آپ ﷺ سے کہتے کہ اگر ان کو اپنے پاس نہ بٹھاؤ تو ہم آپ کے پاس بیٹھیں۔ اس پر دو بھائیوں کا قصہ بیان فرمایا اور پھر دنیا کی مثال بیان فرمائی اور بتایا کہ ابلیس غرور کے سبب ہی ہلاک ہوا اور اب خضر اور موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا کہ دیکھو موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر اولوالعزم پیغمبر اتنے زیادہ علم و عمل کے باوجود خضر علیہ السلام سے علم حاصل کرنے کے لیے گئے اور ان کے سامنے تو اسے اختیار کرتے ہوئے ان کی ہر شرط قبول کی۔ (راز و موع)

② "لَقَدْ تَدْرَأُ" "فَتَى" کا معنی نوجوان ہے، خادم کو بھی "فَتَى" کہہ لیتے ہیں، کیونکہ بہتر خدمت نوجوان ہی کر سکتے ہیں۔ یہ یوشع بن نون تھے جو موسیٰ علیہ السلام سے بہت محبت رکھتے تھے، ان کی خدمت کے لیے ان کے ساتھ رہتے تھے، موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے جانشین بنے اور انہی کے ہاتھوں بیت المقدس فتح ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر خوش دلی سے خدمت کرے تو اس سے خدمت لی جا سکتی ہے۔

③ جَمَعَ الْبَحْرَيْنِ: "بَحْر" کا لفظ عربی زبان میں نمکین پانی والے سمندر پر بھی بولا جاتا ہے اور ٹھنڈے پانی والے دریا پر بھی۔ (قاموس) فارسی میں بھی دریا کا لفظ دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وہ دو بحر ذکر نہیں فرمائے، کیونکہ مراد قصہ گوئی نہیں، نصیحت ہے اور وہ ان دو دریاؤں کی تعیین کے بغیر بھی پوری ہے۔ بعض مفسرین نے ان سے بحر فارس اور بحر روم مراد لیے ہیں، مگر یہ ملتے نہیں۔ بعض نے بحر ابيض اور بحر احمر مراد لیے ہیں۔ بعض نے افریقہ کے اور بعض نے اندلس کے دو دریا مراد لیے ہیں۔ بعض نے دجلہ و فرات مراد لیے ہیں، مگر مصر کو مد نظر رکھیں تو سوڈان کی طرف سے مصر میں آنے والے دریاے نیل میں ملنے والے کئی دریاؤں کے نیل کے ساتھ ملنے کی کوئی جگہ مراد ہو سکتی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے دہاں گم ہونے کی علامت کے ساتھ متعین فرمایا۔ اب اندازے سے ان جگہوں میں سے دو دریاؤں کے جمع ہونے کی کوئی ایک جگہ متعین کرنا ممکن نہیں اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ "حَقْبًا" "حَقْبَةً" کی جمع ہے، لمبی مدت کو "حَقْبَةً" کہتے ہیں۔ اس واقعہ کی تفصیل رسول اللہ ﷺ نے خود بیان فرمائی ہے، قارئین اس پوری حدیث کو غور سے پڑھیں، آئندہ فوائد میں اس کا بار بار ذکر آئے گا۔

④ ابی بن کعب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں کھڑے خطبہ دے رہے تھے کہ ان سے پوچھا گیا: "لوگوں میں سب سے زیادہ علم والا کون ہے؟" انھوں نے فرمایا: "میں ہوں۔" تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ناراضگی کا اظہار فرمایا، کیونکہ انھوں نے یہ بات اللہ کے سپرد نہیں کی (کہ اللہ بہتر جانتا ہے)۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ میرا ایک بندہ دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ ہے، وہ تم سے زیادہ عالم ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: "اے میرے رب! پھر میری اس سے ملاقات کیسے ہو سکتی ہے؟" فرمایا: "اپنے ساتھ ایک مچھلی لے لو اور اسے کسی مکمل (کھجور کے

نرم چٹوں کی بنی ہوئی ٹوکری، میں رکھ لو، تو جہاں مچھلی کو گم پاؤ، وہ وہیں ہوگا۔“ تو انھوں نے ایک مچھلی لی، اسے ایک ٹوکری میں رکھا اور چل پڑے اور اپنے ساتھ اپنے جوان یوشع بن نون کو بھی لے لیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک خاص قسم کی چٹان کے پاس پہنچے تو دونوں لیٹ گئے اور سو گئے۔ مچھلی تڑپی اور دریا میں جاگری اور اس نے دریا میں اپنا راستہ سرنگ کی صورت میں بنا لیا اور اللہ تعالیٰ نے مچھلی سے پانی کا بہاؤ روک دیا تو وہ اس پر طاق کی طرح ہو گیا۔ جب (موسیٰ علیہ السلام) جاگے تو ان کا ساتھی انھیں مچھلی کے متعلق بتلانا بھول گیا، چنانچہ وہ دونوں دن کا باقی حصہ اور رات بھر چلتے رہے۔ اگلا دن ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جوان سے کہا: ”ہمارا دن کا کھانا لاؤ، ہمیں اپنے اس سفر میں بہت تھکاوٹ ہوئی ہے۔“ (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: ”موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت تک کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی جب تک وہ اپنی اس جگہ سے آگے نہیں گزرے جس کا انھیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا۔“ تو ان کے جوان نے ان سے کہا: ”کیا آپ نے دیکھا کہ جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی بھول گیا اور مجھے اس کا ذکر کرنا شیطان ہی نے بھلایا ہے اور اس نے دریا میں اپنا عجیب راستہ بنا لیا۔“ سو مچھلی کے لیے سرنگ بنی اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے جوان کو تعجب ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ”یہی تو ہم ڈھونڈ رہے تھے۔“ چنانچہ وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانوں کا پیچھا کرتے ہوئے واپس پلٹے، یہاں تک کہ اس چٹان تک آپہنچے، تو اس وقت (وہاں) ایک آدمی کپڑا اوڑھ کر لینا ہوا تھا۔ اسے موسیٰ علیہ السلام نے سلام کہا تو خضر نے کہا: ”اور تیری (اس) سرزمین میں سلام کیسا؟“ کہا: ”میں موسیٰ ہوں۔“ اس نے کہا: ”بنی اسرائیل والے موسیٰ؟“ کہا: ”ہاں، میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ کو جو کچھ سکھایا گیا ہے اس میں سے کچھ بھلائی مجھے سکھا دیں۔“ اس نے کہا: ”تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکے گا، اے موسیٰ! میں اللہ کے علم میں سے ایک ایسے علم پر ہوں جسے تم نہیں جانتے اور تم اللہ کے علم میں سے ایک ایسے علم پر ہو جسے میں نہیں جانتا۔“ تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ”تم مجھے اگر اللہ نے چاہا تو صبر کرنے والا پاؤ گے اور میں تمہارے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔“ تو خضر نے اس سے کہا: ”پھر اگر تو میرے پیچھے چلا ہے تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں مت پوچھنا، یہاں تک کہ میں تیرے لیے اس کا کچھ ذکر شروع کروں۔“ چنانچہ وہ دونوں چل پڑے، دریا کے کنارے پر جا رہے تھے کہ ایک کشتی گزری، انھوں نے ان سے بات کی کہ وہ انھیں سوار کر لیں۔ ان لوگوں نے خضر کو پہچان لیا، اس لیے انھوں نے ان کو کسی اجرت کے بغیر سوار کر لیا۔ جب وہ دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو اچانک ہی خضر نے کشتی کے تختوں میں سے ایک تختہ تیشے کے ساتھ اکھیر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا: ”ایسے لوگ جنہوں نے ہمیں اجرت کے بغیر سوار کر لیا، تم نے بڑھ کر ان کی کشتی کا تختہ اکھیر دیا، تاکہ اس میں سوار لوگوں کو غرق کر دو، بلاشبہ یقیناً تو ایک بڑے کام کو آیا ہے۔“ کہا: ”کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ یقیناً تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا؟“ کہا: ”مجھے اس پر نہ پکڑ جو میں بھول گیا اور مجھے میرے معاملے میں کسی مشکل میں نہ پھنسا۔“ (ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے) کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہ پہلی دفعہ موسیٰ علیہ السلام سے بھول ہوئی تھی۔“ فرمایا: ”اور ایک چڑیا آئی اور کشتی کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی، اس نے دریا میں ایک ٹھونکا مارا تو خضر نے اس سے کہا: ”میرا علم اور تیرا علم اللہ کے علم میں سے اتنا ہی ہے جتنا اس چڑیا نے اس دریا سے کم کیا ہے۔“ پھر وہ دونوں کشتی سے نکلے، ابھی وہ کنارے پر چل ہی رہے تھے کہ خضر نے ایک لڑکا دیکھا جو لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنَهُمَا نِسِيًّا حَوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا
 قَالَ لِقَتْلِهِ أُتَيْنَا عَدَاءَنَا ۖ لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾

تو جب وہ دونوں ان کے آپس میں ملنے کے مقام پر پہنچے تو وہ دونوں اپنی مچھلی بھول گئے، تو اس نے اپنا راستہ دریا میں سرنگ کی صورت بنا لیا ﴿٦١﴾ پھر جب وہ آگے گزر گئے تو اس نے اپنے جوان سے کہا ہمارا دن کا کھانا لا، بے شک ہم نے اپنے اس سفر سے تو بڑی تھکاوٹ پائی ہے ﴿٦٢﴾

تھا، تو خضر نے اس کا سر پکڑا اور اسے اپنے ہاتھ سے اکھیر کر قتل کر دیا۔ موسیٰ نے اس سے کہا: ”کیا تو نے ایک بے گناہ جان کو کسی جان کے بدلے کے بغیر قتل کر دیا، بلاشبہ یقیناً تو ایک بہت برے کام کو آیا ہے۔“ کہا: ”کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ ہرگز مہر نہ کر سکے گا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اور یہ پہلی سے سخت (متنبیہ) تھی۔“ کہا: ”اگر میں تجھ سے اس کے بعد کسی چیز کے متعلق پوچھوں تو مجھے ساتھ نہ رکھنا، یقیناً تو میری طرف سے پورے عذر کو پہنچ چکا ہے۔“ پھر وہ دونوں چل پڑے، یہاں تک کہ جب وہ ایک بستی والوں کے پاس آئے، انھوں نے اس کے رہنے والوں سے کھانا طلب کیا تو انھوں نے انکار کر دیا کہ ان کی مہمان نوازی کریں، پھر انھوں نے اس میں ایک دیوار پائی جو چاہتی تھی کہ گر جائے۔ فرمایا، ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔ تو خضر اٹھے اور اسے اپنے ہاتھ سے سیدھا کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ”ایسے لوگ جن کے پاس ہم آئے تو نہ انھوں نے ہمیں کھانا کھلایا اور نہ ہماری مہمان نوازی کی، اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اجرت لے لیتے۔“ (خضر نے) کہا: ”یہ میرے اور تیرے درمیان جدائی ہے۔“ اس کے بعد پورا واقعہ بیان فرمایا جو آیت (۷۸) سے آیت (۸۲) کے آخر تک ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما پڑھا کرتے تھے: ”وَأَمَّا الْعَلَامُ فَكَانَ كَافِرًا وَكَانَ أَبُوَاهُ مُؤْمِنِينَ“ یعنی وہ لڑکا کافر تھا اور اس کے ماں باپ مؤمن تھے۔ [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿٦٢﴾ و إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أُبْرِحُ... ﴿٦٢﴾: ۵۷۲۵]

آیت 61 ﴿٦١﴾ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا: مچھلی پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتی، معلوم ہوا وہ مچھلی مردہ تھی، پھر اگر اسے نمک لگا کر خشک نہ کیا جائے تو وہ شدید بدبودار ہو جاتی ہے اور کیرڑوں سے بھر جاتی ہے۔ معلوم ہوا اسے نمک لگا کر خشک کیا گیا تھا۔ اس مردہ مچھلی کا زندہ ہونا معجزہ تھا۔

﴿٦٢﴾ پانی کو موسیٰ علیہ السلام کے لیے پہاڑوں کی شکل دینا (شعراء: ۶۳) یا سرنگ کی، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے اور معجزہ ربانی۔ جس طرح پانی کے ایک قطرے (نقطہ) سے احسن تقویم میں انسان کی صورت گری اس خلاق علیم کی قدرت کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

آیت 62 ﴿٦٢﴾ أُتَيْنَا عَدَاءَنَا: معلوم ہوا سفر کے لیے کھانا ساتھ لے جانا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور توکل کے منافی نہیں اور یہ کہ بھوک، پیاس، تھکاوٹ، بھول چوک، غرض انسان کو پیش آنے والی چیزیں انبیاء علیہم السلام کو بھی پیش آتی ہیں، کیونکہ وہ بھی انسان ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ آدمی کو جو عارضہ پیش آئے، اس کا ذکر کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا ارادہ اللہ تعالیٰ کے شکوے کا نہ ہو۔

قَالَ ارْعَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنسِينَاهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ
 أَذْكُرَكَ ۖ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ﴿۶۴﴾ قَالَ ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغُ ۖ فَارْتَدَّا عَلَى
 آثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۵﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَوَعَدْنَاهُ مِنْ

اس نے کہا کیا تو نے دیکھا جب ہم اس چٹان کے پاس جا کر ٹھہرے تھے تو بے شک میں مچھلی بھول گیا اور مجھے وہ
 نہیں بھلائی مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں اور اس نے اپنا راستہ دریا میں عجیب طرح سے بنالیا ﴿۶۴﴾ اس نے
 کہا یہی ہے جو ہم تلاش کر رہے تھے، سو وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانوں پر پیچھا کرتے ہوئے واپس لوٹے ﴿۶۵﴾ تو
 ان دونوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنے ہاں سے ایک رحمت عطا کی اور اسے

﴿۶۴﴾ لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا: شاید اس تھکاوٹ کی وجہ اس نعمت کا احساس دلانا ہو کہ صبح راستے پر طلب علم کے لیے جاتے
 ہوئے اللہ تعالیٰ کی خاص مدد شامل ہوتی ہے، جس سے تھکن نہیں ہوتی اور جب اس کی مدد نہ ہو تو انسان تھک کر رہ جاتا ہے۔

آیت ۶۴ ﴿۶۴﴾ فَارْتَدَّا عَلَى آثَارِهِمَا قَصَصًا: یہ واقعہ انبیاء و اولیاء، خصوصاً موسیٰ، یوشع بن نون اور خضر علیہ السلام کے غیب نہ جاننے
 کی کئی طرح سے دلیل ہے: ﴿۱﴾ موسیٰ علیہ السلام کا کہنا کہ مجھ سے زیادہ کوئی عالم نہیں، حالانکہ ان سے زیادہ علم والے موجود تھے۔
 ﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ کا ناراض ہونا۔ ﴿۳﴾ موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے خضر کا پتا پوچھنا۔ ﴿۴﴾ مجمع البحرین اور مچھلی کی نشانی کی ضرورت
 عالم الغیب کو نہیں ہوتی۔ ﴿۵﴾ مچھلی کے نکل جانے کا علم نہ ہونا۔ ﴿۶﴾ اگلا سفر، تھکاوٹ کے احساس کی وجہ معلوم نہ ہونا۔ ﴿۷﴾ قدموں
 کے نشانوں کو دیکھتے ہوئے واپسی کی اسے کیا ضرورت ہے جس کی نگاہ سے کچھ اوجھل نہ ہو۔ مزید اگلی آیات میں ملاحظہ فرمائیے۔

آیت ۶۵ ﴿۶۵﴾ ﴿۱﴾ عَبْدًا مِنْ عِبَادِنَا: اس سے مراد خضر علیہ السلام ہیں (خاء کے فتح اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ، یا خاء کے کسرہ اور
 ضاد کے سکون کے ساتھ)۔ نبی ﷺ نے فرمایا: «إِنَّمَا سُمِّيَ الْخَضِرُ لِأَنَّهُ جَلَسَ عَلَى فَرْوَةٍ بِيضَاءٍ فَإِذَا هِيَ نَهْتَرُ مِنْ
 خَلْفِهِ خَضْرَاءً» [بخاری، أحاديث الأنبياء، باب حديث الحضرة.....: ۳۴۰، ۲] "ان کا نام خضر اس لیے پڑا کہ وہ سفید زمین
 کے ایک قطعے پر بیٹھے تو وہ ان کے پیچھے سرسبز ہو کر لہلہانے لگا۔" یہ اللہ کے نبی تھے، اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے آخر میں
 فرمایا کہ میں نے یہ اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ (کھف: ۸۲) بلکہ یہ سب اللہ کے حکم سے تھا جو وحی کی صورت میں انبیاء کو صادر
 ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کا اوپر مفصل حدیث میں یہ کہنا کہ میرے پاس ایک علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے سکھایا ہے، تم اسے نہیں
 جانتے..... ولی کتنا بھی مقرب ہو اس کا الہام حجت نہیں، نہ وہ الہام سے کسی کو قتل کر سکتا ہے، ورنہ ہر مومن اللہ کا ولی ہے۔
 (بقرہ: ۲۵۷) وہ اللہ کے امر کا بھانہ بنا کر جسے چاہے گا قتل کر دے گا، جب کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

محقق علماء جن میں امام بخاری، ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر علیہم السلام جیسے عظیم ائمہ شامل ہیں، فرماتے ہیں کہ خضر علیہ السلام فوت ہو
 چکے ہیں، کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتے تو سورہ آل عمران کی آیت (۸۱) کے مطابق ان پر لازم تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس
 آکر آپ پر ایمان لاتے اور آپ کے ساتھ مل کر جہاد کرتے، جب کہ ان کے آنے کا کہیں ذکر نہیں، نہ کسی صحابی سے ان کے

لَدُنَّا عِلْمًا ﴿۱۵﴾

اپنے پاس سے ایک علم سکھایا تھا ﴿۱۵﴾

ملنے کا کوئی ذکر ہے۔ صحیح بخاری کی وہ حدیث بھی اس کی دلیل ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا: «أُرَاتِكُمْ لَيْلَتِكُمْ هَذِهِ، فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقَى مِمَّنْ هُوَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ» [بخاری، العلم، باب السمر في العلم، ۱۱۶، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما] "آج رات سے ایک سو سال پورے ہونے تک زمین کی پشت پر جو بھی ہے کوئی باقی نہیں رہے گا۔" جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ زمین پر نہیں بلکہ دریاؤں اور سمندروں میں رہتے ہیں، ان کا رد جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ہوتا ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے ایک ماہ قبل فرمایا: «مَا مِنْ نَفْسٍ مَنُفُو سَةِ الْيَوْمِ، تَأْتِي عَلَيْهَا مِائَةُ سَنَةٍ، وَ هِيَ حَيَّةٌ يُؤْمِنُ بِهَا» [مسلم، فضائل الصحابة، باب بيان معنى قوله ﷺ: على رأس مائة.....: ۲۵۳۸] "کوئی بھی جان جو آج پیدا ہو چکی ہے اس پر سو سال نہیں آئیں گے کہ وہ اس وقت زندہ ہو۔" جو لوگ حضرت رضی اللہ عنہ کے زندہ ہونے کے قائل ہیں ان کے پاس کوئی صحیح دلیل نہیں ہے، ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ تمام روایات جن میں حضرت رضی اللہ عنہ کے اب تک زندہ ہونے کا ذکر ہے سب جھوٹی ہیں۔ سب سے بڑی دلیل جو وہ حضرات بیان کرتے ہیں، یہ ہے کہ بہت سے صالحین سے ان کی ملاقات ہوئی ہے، حالانکہ اسے دلیل کہنا دلیل کی توہین ہے، کیونکہ جنھوں نے انھیں دیکھا ہے انھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ خضر ہیں؟ کیا انھوں نے پہلے حضرت رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے کہ ملاقات پر وہ انھیں پہچان گئے؟ رہا کسی ملنے والے کے کہنے سے کہ "میں خضر ہوں" اسے خضر مان لینا سادہ لوحی کی انتہا ہے، جس سے فائدہ اٹھا کر شیطان نے بے شمار لوگوں کو گمراہ کیا ہے، مگر وہ سب وہی ہیں جو صحابہ کے بعد آئے، کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم آسانی سے شیطان کے فریب میں آنے والے نہیں تھے۔ صحیح بخاری اور ترمذی میں جس میں الحیاء (آب حیات) کا ذکر ہے وہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں اور آپ کے سوا کسی دوسرے کے قول سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔

﴿۱۵﴾ اَتَيْنَاهُ نَجْمًا فَنَجَدْنَا : قرآن مجید میں "رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ" سے مراد نبوت کئی جگہ لی گئی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِنَ الْقُرَيْبِيِّنَ عَظِيمٍ... أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ﴾ [الرہف: ۳۱، ۳۲] "اور انھوں نے کہا یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟ کیا وہ تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) تقسیم کرتے ہیں؟" مزید دیکھیے سورہ دخان (۶، ۵) اور قصص (۸۶) اور "اللہ کی طرف سے علم" بول کر وہی اور نبوت مراد لی گئی ہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۱۱۳) اگرچہ یہ الفاظ نبوت کے ساتھ خاص نہیں، مگر ان کے ساتھ "وَمَا فَحَصْتَهُ عَنْ أَمْرِي" واضح دلیل ہے کہ یہاں ان الفاظ سے مراد نبوت اور وحی الہی ہی ہے اور بلاشک وشبہ حضرت رضی اللہ عنہ کے نبی تھے۔ (شقیلی) علم لدنی سے صرف اولیاء کا علم مراد لینا اور انھیں نبیوں سے بھی اونچا درجہ دینا صاف الحاد اور بے دینی ہے، جس کے ذریعے سے زندیق لوگ شریعت کا طوق گردن سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ اللہ کے احکام جو شیطان کے ہر قسم کے دھل سے محفوظ ہوں، صرف انبیاء کے ذریعے سے نازل ہوتے ہیں۔ دیکھیے سورہ جن (۲۸۳۲۶) اور سورہ حج (۵۲) جو شخص کسی اور کو یہ درجہ دے وہ کافر ہے، اسے توبہ کروائی جائے، اگر نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ (قرطبی مختص)

﴿۱۶﴾ حضرت رضی اللہ عنہ کے عالم الغیب نہ ہونے کی دلیل ان کا موسیٰ رضی اللہ عنہ سے یہ پوچھنا ہے کہ اس سرزمین میں سلام کیسا؟ پھر موسیٰ رضی اللہ عنہ

قَالَ لَهُ مُوسَى هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَ مِنَّا عَلِيمًا رُشْدًا ۖ قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۖ وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ۗ قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ۗ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلَنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحَدِّثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۗ فَانطَلَقَا ۗ حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۗ قَالَ أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا ۗ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا ۗ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۗ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ۗ

موسیٰ نے اس سے کہا کیا میں تیرے پیچھے چلوں؟ اس (شرط) پر کہ تجھے جو کچھ سکھایا گیا ہے اس میں سے کچھ بھلائی مجھے سکھا دے ۱۶ اس نے کہا بے شک تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا ۱۷ اور تو اس پر کیسے صبر کرے گا جسے تو نے پوری طرح علم میں نہیں لیا ۱۸ اس نے کہا اگر اللہ نے چاہا تو مجھے ضرور صبر کرنے والا پائے گا اور میں تیرے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا ۱۹ کہا پھر اگر تو میرے پیچھے چلا ہے تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں مت پوچھنا، یہاں تک کہ میں تیرے لیے اس کا کچھ ذکر شروع کروں ۲۰ سو دونوں چل پڑے، یہاں تک کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے اسے پھاڑ دیا۔ کہا کیا تو نے اسے اس لیے پھاڑ دیا ہے کہ اس کے سواروں کو غرق کر دے، بلاشبہ یقیناً تو ایک بہت بڑے کام کو آیا ہے ۲۱ کہا کیا میں نے نہ کہا تھا کہ تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا ۲۲ کہا مجھے اس پر نہ پکڑ جو میں بھول گیا اور مجھے میرے معاملے میں کسی مشکل میں نہ پھنسا ۲۳

کے اپنا نام بتانے پر ان کا یہ پوچھنا کہ بنی اسرائیل والے موسیٰ؟ پھر ان کا موسیٰ علیہ السلام سے صاف کہنا کہ آپ کے پاس جو علم ہے وہ میں نہیں جانتا..... پھر اپنے اور موسیٰ علیہ السلام کے علم کو اللہ کے علم سے جزیائی کی چونچ کے پانی کو دریا سے نسبت کی طرح قرار دینا ہے۔ کس قدر بد نصیب ہیں وہ لوگ جو حضرت علیہ السلام کو نبی کے بجائے ولی قرار دیتے ہیں، پھر ان کے چند واقعات کو سامنے رکھ کر اولیاء کو علم لدنی کا ضمیمہ لگا کر عالم الغیب بنا دیتے ہیں۔

آیت 66-70 ان آیات اور گزشتہ آیات میں اپنے علم پر عجب سے پرہیز، طلب علم کے لیے سفر، آخری دم تک حصول علم کا عزم مصمم، استاذ کے سامنے طلب علم کے لیے درخواست کا طریقہ، استاد کا ادب، اس کے کسی حکم کی نافرمانی نہ کرنا، اپنے کسی بھی کام یا عہد میں اپنے آپ پر بھروسے کے بجائے ان شاء اللہ کہہ کر اسے اللہ کے سپرد کرنا سکھایا گیا ہے اور یہ کہ استاذ تعلیم کے لیے شاگرد پر بعض شرطیں عائد کر سکتا ہے۔

آیت 71-73 ان آیات سے اولو العزم پیغمبروں سے بھول کا صادر ہونا ثابت ہوتا ہے اور کامل استاذ کا شاگرد کی غلطی پر

فَانطَلَقَا ۗ حَتَّىٰ اِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَتَنَّهُۥ ۙ قَالَا اَقْتُلْ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۗ لَقَدْ جِئْتَ

سَيِّئًا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾

پھر وہ دونوں چل پڑے، یہاں تک کہ جب وہ ایک لڑکے سے ملے تو اس نے اسے قتل کر دیا۔ کہا کیا تو نے ایک بے گناہ جان کو کسی جان کے بدلے کے بغیر قتل کر دیا، بلاشبہ یقیناً تو ایک بہت برے کام کو آیا ہے ﴿۷۴﴾

مواخذہ، پہلی غلطی پر مواخذہ میں نسبتاً نرمی کرنے ("اَلَمْ اَقْتُلْ" "اَلَمْ اَقْتُلْ لَكَ" سے نرم ہے) اور بھول کے عذر پر درگزر کرنے کا سبق حاصل ہوتا ہے۔

آیت 74 ﴿۷۴﴾ حَتَّىٰ اِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَتَنَّهُۥ : اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکا جوان تھا، اگرچہ وہ اپنے جیسے لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کیونکہ گزشتہ حدیث میں ہے کہ وہ کافر تھا جب کہ اس کے والدین مومن تھے، اگر وہ بچہ ہوتا تو اسے کافر نہ کہا جاتا، کیونکہ مومنوں کی اولاد کو بچپن میں کافر نہیں کہا جاتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسے کسی کو قتل نہ کرنے کی وجہ سے بے گناہ کہا ہے، بچہ ہونے کی وجہ سے نہیں۔ اس لیے خضر علیہ السلام کا اللہ کے حکم سے ایک کافر کو قتل کرنا کوئی جائے اعتراض نہیں۔ "غلام" کا لفظ بچے کے علاوہ جوان اور ادھیڑ عمر پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث معراج میں موسیٰ علیہ السلام نے ہمارے نبی ﷺ کو "هَذَا الْغُلَامُ" کہا ہے۔ [بخاری: ۳۲۰۷]

﴿۷۴﴾ بعض حضرات نے اس سوال کے جواب میں کہ خضر علیہ السلام کے لیے اس لڑکے کا قتل کیونکر جائز تھا، خضر علیہ السلام کو فرشتوں میں سے قرار دیا ہے جو اللہ کے حکم سے کونی امور سرانجام دیتے ہیں، مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ کارکنان قضا و قدر نہ کھاتے ہیں، نہ مہمان نوازی کے طور پر کھانے کا سوال کرتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کا بھنا ہوا ٹھنڈا پیش کرنے کا واقعہ اس کی دلیل ہے۔



قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۖ قَالَ إِنْ سَأَلْتِكِ عَنْ شَيْءٍ عِمْ
بَعْدَهَا فَلَا تُصَحِّبْنِي ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا ۖ فَأَنطَلَقَا ۖ حَتَّى إِذَا آتَيْتَا أَهْلَ
قَرْيَةٍ اسْتَظَصَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَنْ يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَتَّقَصَّ
فَأَقَامَهُ ۗ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ

کہا کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا ۷۵ کہا اگر میں تجھ سے اس کے بعد کسی چیز کے متعلق پوچھوں تو مجھے ساتھ نہ رکھنا، یقیناً تو میری طرف سے پورے عذر کو پہنچ چکا ہے ۷۶ پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ جب وہ ایک بستی والوں کے پاس آئے، انھوں نے اس کے رہنے والوں سے کھانا طلب کیا تو انھوں نے انکار کر دیا کہ ان کی مہمان نوازی کریں، پھر انھوں نے اس میں ایک دیوار پائی جو چاہتی تھی کہ گر جائے تو اس نے اسے سیدھا کر دیا۔ کہا اگر تو چاہتا تو ضرور اس پر کچھ اجرت لے لیتا ۷۷

آیت 76-75 قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ : ”کیا میں نے تجھے نہیں کہا تھا“ ان الفاظ میں تشبیہ پہلے سے سخت ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ درگزر و دفعہ ہوتی ہے، تیسری دفعہ کوئی معاف نہ کرے تو وہ حق بجانب اور معذور ہے اور یہ کہ استاذ اگر سمجھے کہ میں طالب علم کو نہیں پڑھا سکتا تو وہ عذر کر سکتا ہے۔

آیت 77 اسْتَظَصَا أَهْلَهَا : بعض صوفیوں نے اس آیت سے گدائی کے مستحب ہونے کا استدلال کیا ہے اور اسے باقاعدہ سالک کے آداب میں شمار کیا ہے، اس لیے عموماً صوفی لوگ روزی کمانے کے بجائے گدائی کو اور دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے کو کمال ولایت و توکل سمجھتے ہیں اور اس کام میں مہارت رکھتے ہیں، حالانکہ یہ ان کی جہالت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَا زَالَ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ حَتَّى يَأْتِيَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَيْسَ فِيهِ وَجْهٌ مُزْعَةٌ لَحْمٍ » [بخاری، الزکوٰۃ، باب من سال نکثرًا: ۱۴۷۴- مسلم: ۱۰۴/۱۰۴۰] ”آدمی لوگوں سے مانگتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے منہ پر گوشت کی بوٹی نہیں ہوگی۔“ ان دونوں انبیاء نے اپنے حق کا سوال کیا ہے جو بطور ضیافت بستی والوں پر فرض تھا۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ ہم نے نبی ﷺ سے عرض کیا: « إِنَّكَ تَبْعُنَا فَنَنْزِلُ بِقَوْمٍ لَا يَقْرَؤُنَا، فَمَا تَرَى فِيهِ؟ فَقَالَ لَنَا إِنْ نَزَلْتُمْ بِقَوْمٍ فَأَمَرَكُمْ بِمَا يَنْبَغِي لِلضَّيْفِ فَأَقْبَلُوا، فَإِنْ لَمْ يُفْعَلُوا فَخَذُوا مِنْهُمْ حَقَّ الضَّيْفِ » [بخاری، المظالم، باب فصاص المظلوم إذا وجد مال ظالمه: ۲۴۶۱- مسلم: ۱۷۲۷] ”آپ ہمیں بھیجتے ہیں اور ہم کسی قوم کے پاس جاتے ہیں اور وہ ہماری ضیافت نہیں کرتے، تو آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟“ آپ ﷺ نے ہمیں فرمایا: ”اگر تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور تمہارے لیے ان چیزوں کا حکم دیا جائے جو مہمان کے لیے چاہئیں تو قبول کر لو، اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان سے مہمان کا حق لے لو۔“

قَالَ هَذَا فِرَاقٌ بَيْنِي وَ بَيْنِكَ ۚ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝۸۰ أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَعْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَ كَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ۝۸۱ وَ أَمَّا الْعُلْمُ فَكَانَ أَبُوهُ مُؤْمِنِينَ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَ كُفْرًا ۝۸۲ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا فَنَدَدْنَا لَكُمُ الْوَيْلَ وَ أَقْرَبَ رَحْمًا ۝۸۳ وَ أَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَ كَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَ كَانَ

کہا یہ میرے درمیان اور تیرے درمیان جدائی ہے، عنقریب میں تجھے اس کی اصل حقیقت بتاؤں گا جس پر تو صبر نہیں کر سکا ۸۰) ربی کشتی تو وہ چند مسکینوں کی تھی، جو دریا میں کام کرتے تھے، تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی چھین کر لے لیتا تھا ۸۱) اور رہا لڑکا تو اس کے ماں باپ دونوں مومن تھے تو ہم ڈرے کہ وہ ان دونوں کو سرکشی اور کفر میں پھنسا دے گا ۸۲) تو ہم نے چاہا کہ ان دونوں کو ان کا رب اس کے بدلے ایسی اولاد دے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر اور شفقت میں زیادہ قریب ہو ۸۳) اور رہ گئی دیوار تو وہ شہر میں دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان دونوں کے لیے ایک خزانہ تھا اور ان کا باپ نیک تھا تو تیرے رب

آیت 78 ﴿ هَذَا فِرَاقٌ : اس پر اصل میں تنوین تھی، پھر تخفیف کے لیے مضاف کر دیا۔

آیت 79 ﴿ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ : اس آیت میں کشتی کا مالک ہونے اور اسے کرایہ پر چلانے کے باوجود ان لوگوں کو مسکین کہا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ مسکین وہ ہے جس کی آمدنی اس کی ضروریات سے کم ہو، یعنی وہ ضرورت مند لوگ جو نہ مانگتے ہیں اور نہ کسی کو ان کی حالت کی خبر ہوتی ہے کہ ان پر صدقہ کریں۔ [دیکھیے بخاری، الزکوٰۃ، باب قول اللہ عز و جل : ﴿ لَا يَسْئَلُونَ النَّاسَ بِالْحَقِّ ﴾ : ۱۶۷۹۔ مسلم : ۱۰۳۹، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] فقیر کی حالت مسکین سے بدتر ہوتی ہے۔ ”وَ كَانَ وَرَاءَهُمْ“ کا معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ”ان کے آگے“ کیا ہے۔ [بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنَهُمَا نِسَاءً ﴾ : ۷۷۶]

آیت 80-81 ﴿ وَأَمَّا الْعُلْمُ فَكَانَ أَبُوهُ مُؤْمِنِينَ : ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنے مومن بندوں کی آنے والے قوتوں سے بھی حفاظت کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ﴿ إِنَّ اللَّهَ يُدْفِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ﴾ [الحج : ۳۸] ”بے شک اللہ ان لوگوں کی طرف سے دفاع کرتا ہے جو ایمان لائے۔“

آیت 82 ﴿ ۱ وَ كَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا : اللہ تعالیٰ اپنے صالح بندوں کی وفات کے بعد بھی ان کی مومن اولاد کی خاص نگہداشت فرماتا ہے اور قیامت کو بھی انہیں خاص رعایت دے گا۔ دیکھیے سورۃ طور (۲۱)۔

أَبُوهُمَا صَالِحًا ۖ فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۗ رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ ۗ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ۗ ذَلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۗ وَيَسْأَلُونَكَ

نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں، تیرے رب کی طرف سے رحمت کے لیے اور میں نے یہ اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ یہ ہے اصل حقیقت ان باتوں کی جن پر تو صبر نہیں کر سکا ﴿۵۶﴾ اور وہ تجھ سے

﴿۵۶﴾ ان تینوں واقعات کی اصل حقیقت بیان کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ادب کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ کشتی کو عیب دار کرنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے، لڑکے کے قتل کے ارادہ کی نسبت اپنی طرف اور اس کے صالح باپ کو بہتر اولاد عطا کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی ہے اور یتیم لڑکوں کے بالغ ہو کر اپنا خزانہ سنبھالنے کے ارادہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی ہے۔

﴿۵۷﴾ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي : یہ حضرت علیؓ کے نبی ہونے کی واضح دلیل ہے، کیونکہ کسی ولی کو اللہ کی طرف سے الہام کی بنا پر کسی بد سے بد کو بھی قتل کرنے کی اجازت نہیں، کیونکہ اس کے الہام میں شیطان دخل ہو سکتا ہے۔ ”لَمْ تَسْطِعْ“ اصل میں ”لَمْ تَسْتَطِعْ“ تھا، تخفیف کے لیے تاء کو حذف کر دیا۔ حضرت علیؓ کے کلام کی ابتدا میں ”لَمْ تَسْتَطِعْ“ ہے، کیونکہ وہاں بات شروع ہو رہی ہے، اختصار کی ضرورت نہیں، بات ختم ہونے پر قصہ مختصر کیا جاتا ہے، اس لیے یہاں ”لَمْ تَسْتَطِعْ“ فرمایا۔ ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے ذہنی بوجھ تھا تو ثقیل لفظ بولا اور وضاحت کے بعد بوجھ اتر جانے پر خفیف لفظ بولا ہے۔

آیت 83 ﴿۵۷﴾ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ ذِي الْقُرْنَيْنِ : واد کے ساتھ ذوالقرنین کے قصے کا موسیٰ علیہ السلام کے قصے پر عطف ہے۔ بھائی حضرت نے فرمایا، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ قصہ میں علم کے حصول کے لیے سفروں کا ذکر تھا اور ذوالقرنین کے قصہ میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سفروں کا ذکر ہے۔ چونکہ علم عمل کی بنیاد ہے، اس لیے اس کا ذکر پہلے فرمایا۔ ایک مناسبت یہ ہے کہ دو باغوں والے شخص اور اہلیس کے تکبر اور ان کے انجام کے بعد موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کا اتنے مرتبے کے باوجود اور ذوالقرنین جیسے عظیم بادشاہ کا مشرق و مغرب کی سلطنت کے باوجود ہر قسم کے کبر و غرور سے پاک ہونے کا اور حد درجہ کی تواضع اختیار کرنے کا ذکر فرمایا، تاکہ ان کے نقش قدم پر چلا جائے۔

﴿۵۸﴾ ذوالقرنین کون تھا، کس ملک کا تھا، قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہیں۔ البتہ اتنا واضح ہے کہ عرب کے لوگ اس سے واقف تھے۔ ان کے شعروں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے، اس لیے انھوں نے اس کے متعلق سوال کیا، مگر ان سے گزشتہ فاتح فرماں رواؤں میں سے کسی ایک کی تعیین نہیں ہوتی، اس لیے مفسرین میں اس کے متعلق بہت ہی اختلاف ہے۔ آلوسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابو یحییٰ البیرونی نے اپنی کتاب ”الآثار الباقیة عن القرون الخالیة“ میں ذکر کیا ہے کہ ذوالقرنین (یحییٰ کا) ابو کرب جمیری ہے، جس کی اولاد ہونے پر، مشرق و مغرب کا بادشاہ ہونے پر اور مسلم ہونے پر شیخ یعنی نے اپنے اشعار میں نثر کا

عَنْ ذِي الْقُرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ۝

ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں تو کہہ میں تمہیں اس کا کچھ ذکر ضرور پڑھ کر سناؤں گا ﴿۱۸﴾

اظہار کیا ہے، جو روح المعانی میں منقول ہیں۔ البیرونی نے اس قول کے حقیقت کے سب سے زیادہ قریب ہونے کا ایک قرینہ یہ لکھا ہے کہ یمن کے بادشاہوں کے لقب لفظ ”ذو“ سے شروع ہوتے تھے، جیسے ذونواس اور ذویزن وغیرہ۔ بعض نے یونانی فاتح سکندر مقدونی کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے، جیسے علامہ قاسمیؒ وغیرہ، جب کہ بہت سے مفسرین مثلاً ابن قیم، طحاوی اور آلوسی وغیرہ نے شدت سے اس کی تردید کی ہے، کیونکہ یہ سکندر ارسطو کا شاگرد اور بت پرست تھا، جب کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین مومن، موحد اور متقی تھا۔ برصغیر کے ایک مفسر نے ذوالقرنین کے متعلق قرآن میں مذکور صفات ایرانی بادشاہ خورس پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے بعد آنے والے ایک صاحب نے تاریخ اور بائبل سے خورس ہی کو سب سے زیادہ ذوالقرنین کا مصداق ٹھہرانے کا حق دار قرار دیا ہے۔ اشرف الحواشی میں ہے کہ بعض کے نزدیک اس سے مراد ایک اور بادشاہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا ہم عصر تھا اور ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہی سے اللہ تعالیٰ نے اسے خارق عادت اسباب و وسائل عطا فرمائے۔ اس کے وزیر خضر تھے، اس لیے خضر کے قصے کے ساتھ اس کا قصہ بیان کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اور ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اس کو ترجیح دی ہے۔ ابن کثیر نے اس کا نام بھی اسکندر بیان کیا ہے۔

یہ ہیں بڑے بڑے اہل علم یا متجددین کے اقوال جن کا ماخذ جاہلی اشعار ہیں، جن کی کوئی سند نہیں، یا زمانہ قبل مسیح کی تاریخ، جس کے مؤرخین کا حال قابل اعتماد ذرائع سے معلوم ہے نہ ان کی ثقافت، یا آثار قدیمہ ہیں جن کی معدوم زبانیں یورپی کفار نے اندازے سے پڑھیں، جو کسی طرح بھی اعتماد کے قابل نہیں، یا بائبل جس میں مذکور باتوں کو (جو نہ قرآن و حدیث کے مطابق ہوں نہ مخالف) ہم رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق نہ سچا کہہ سکتے ہیں نہ جھوٹا۔ پھر ایسی باتوں پر یقین کیسے ہو سکتا ہے!؟ لطف یہ ہے کہ جو بھی نیا مفسر نئی سے نئی بات نکال کر قدیم تاریخ، آثار قدیمہ، جاہلی اشعار، بائبل کے اقوال کا ڈھیر لگا دیتا ہے، وہ اتنا ہی بڑا صاحب کمال گنا جاتا ہے، حالانکہ ان میں سے کسی سے بھی یقین کی دولت حاصل نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کسی قصے کو تاریخ کے طور پر بیان نہیں کرتا، بلکہ اس کے ان حصوں کو اجاگر کرتا ہے جن سے عبرت اور سبق حاصل ہو۔ قرآن کے مطابق ذوالقرنین اللہ کا نیک بندہ تھا جس نے جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے سے مشرق سے مغرب تک اللہ کے دین کو غالب کیا اور اپنے محروم (تحت) ممالک میں امن قائم کیا اور انھیں دشمنوں سے محفوظ رکھنے کی نہایت عمدہ تدبیر کی۔ اگر ہم کسی قابل یقین ذریعے سے اس کی تعیین نہ کر سکیں یا اس کے مفصل حالات معلوم نہ کر سکیں تو قرآن کے منشا و مقصد میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ آخر کتنے ہی نبی ہیں جن کے نام قرآن و حدیث میں نہیں۔ دیکھیے سورہ مومن (۷۸) تو کیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر امت میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا گزرا ہے، ہم ان ناقابل اعتماد ذرائع سے ہند، چین، روس، یورپ اور افریقہ میں آنے والے نبیوں کے نام متعین کرنے کی بے کار کوششوں میں وقت ضائع کریں گے، تاکہ لوگ کہیں واہ! کیا بات نکالی ہے۔

إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۳۷﴾ فَاتَّبَعَهُ سَبَبًا ﴿۳۸﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ
مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا قُلْنَا
يَا الْقُرْنَيْنِ إِنَّمَا أَنْتَ تُعَذِّبُ وَإِنَّمَا أَنْتَ تُتَّخَذُ فِيهِمْ حُسْنًا ﴿۳۹﴾

بے شک ہم نے اسے زمین میں اقتدار دیا اور اسے ہر چیز میں سے کچھ سامان عطا کیا ﴿۳۷﴾ تو وہ کچھ سامان ساتھ لے کر چلا ﴿۳۸﴾ یہاں تک کہ جب وہ سورج غروب ہونے کے مقام پر پہنچا تو اسے پایا کہ وہ دلدل والے چشمے میں غروب ہو رہا ہے اور اس کے پاس ایک قوم کو پایا۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین! یا تو یہ ہے کہ تو (انھیں) سزا دے اور یا یہ کہ تو ان کے بارے میں کوئی نیک سلوک اختیار کرے ﴿۳۹﴾

﴿۳۷﴾ ذوالقرنین کے اس لقب کی مختلف وجہیں بیان کی گئی ہیں، کیونکہ قرن کے کئی معانی ہیں، سینگ، کنارہ، بالوں کی مینڈھی۔ دو سینگوں والا سے مراد مرد شجاع ہے، کیونکہ عرب شجاع آدمی کو کہتے تھے ہیں، کیونکہ مینڈھا اپنے سینگوں سے ٹکراتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے تاج پر دو سینگ بنے ہوئے تھے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ زمین کے مشرق و مغرب کے دونوں کناروں تک پہنچا۔ چوتھی یہ کہ اس کے سر کے بالوں کی دو مینڈھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ چاروں باتیں بیک وقت بھی وجہ تسمیہ ہو سکتی ہیں۔ ﴿۳۸﴾ قُلْنَا سَأَلْنَاوَأَعَيْنَاكَ فَنَدَىٰ لَكَ الْكُوٰٓءُ: ”ذکوٰۃ“ توین کی وجہ سے ترجمہ ”کچھ ذکر“ کیا گیا ہے، یعنی اس کی پوری تاریخ نہیں بلکہ کچھ ذکر بیان کروں گا، جس سے تم نصیحت اور سبق حاصل کر سکو۔

یٰت 84 **إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ**: ”مَكَّنَّا“ سے مراد حکومت و اقتدار ہے۔ دیکھیے سورہ حج (۳۱) ہر چیز میں سے کچھ سامان سے مراد وہ تمام وسائل ہیں جن کی اقتدار کے لیے ضرورت ہوتی ہے، مثلاً شجاعت، قوت، تدبیر و رائے، فوج، دولت، اسلحہ، سامان سفر، تعمیر و ترقی کے ذرائع وغیرہ۔ ان اسباب کی تفصیل میں بعض مفسرین کی اسرائیلی روایات پر مبنی عجیب و غریب روایات کی کچھ حشیت نہیں اور نہ کسی صحیح حدیث میں ان کا پتلا ملتا ہے۔

یٰت 85-86 ﴿۱﴾ فَاتَّبَعَهُ سَبَبًا: ”نَبَعَ“ ساتھ گیا، ”اتَّبَعَ“ (انحال) ساتھ لے گیا، یعنی اس نے اپنے اقتدار کو مضبوط اور وسیع کرنے کے لیے اور پوری زمین پر اللہ کا کلمہ غالب کرنے کے لیے ایک لمبے سفر کی تیاری کی اور اس کے لیے درکار افواج، اسلحہ اور سامان سفر ساتھ لے کر مغرب کی طرف جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکل پڑا۔ راستے میں ہر مقابل کو زیر کرتا ہوا اور ہر رکاوٹ کو روندتا ہوا زمین کے اس حصے تک جا پہنچا جہاں تک اس وقت آبادی موجود تھی اور سفر ممکن تھا، اس سے آگے سمندر سے پہلے وسیع و عریض دلدلی علاقہ تھا، جس میں نہ خشکی کے ذرائع سے سفر ہو سکتا تھا، نہ بحری ذرائع سے۔ وہاں اس نے سورج غروب ہونے کا مشاہدہ کیا تو وہ اسے ایک کچھڑ والے چشمے میں غروب ہوتا ہوا نظر آیا، کیونکہ آگے سمندر کے اثر سے اور چشموں کی کثرت سے زمین دلدل اور کچھڑ بنی ہوئی تھی۔ جس طرح سمندر، صحرا یا میدان میں سے جو چیز بھی سامنے ہو سورج اسی میں غروب ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض لوگوں نے جو اعتراض کیا ہے کہ قرآن کے بیان کے مطابق سورج کچھڑ والے چشمے

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ اِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۷۵﴾ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا فَلَهٗ جَزَآءٌ الْحُسْنٰى ۗ وَ سَتَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۷۶﴾

اس نے کہا جو شخص تو ظلم کرے گا سو ہم اسے جلدی سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ اسے عذاب دے گا، بہت برا عذاب ﴿۷۵﴾ اور رہا وہ جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیا تو اس کے لیے بدلے میں بھلائی ہے اور عقرب ہم اسے اپنے کام میں سے سراسر آسانی کا حکم دیں گے ﴿۷۶﴾

میں غروب ہوتا ہے، انھوں نے غور ہی نہیں کیا کہ قرآن نے ذوالقرنین کا مشاہدہ بیان فرمایا ہے اور اب بھی دیکھنے والے کو ایسے ہی نظر آئے گا۔ اصل حقیقت دوسری جگہ بیان فرمائی ہے، فرمایا: ﴿وَالنَّسْفُ نَجْوٰی لِمُسْتَقْرَٰٓئِهَآ﴾ [نہس: ۳۸] اور سورج اپنے ایک ٹھکانے کے لیے چل رہا ہے۔ (جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے)۔“

قُلْنَا يٰٰذَا النُّعْرٰنِيْنَ : یعنی مغرب کی طرف آبادی کے آخری حصے میں اس نے ایک قوم کو پایا تو ہم نے کہا کہ اے ذوالقرنین! تمہیں اختیار ہے، چاہو تو انھیں قتل، قید یا غلامی کی صورت میں یا جس طرح چاہو سزا دو، یا ان کے بارے میں کوئی نیک سلوک اختیار کرو۔

﴿۳﴾ اللہ تعالیٰ کے فرمان ”قُلْنَا يٰٰذَا النُّعْرٰنِيْنَ“ (ہم نے کہا اے ذوالقرنین!) کو بعض مفسرین نے ذوالقرنین کے نبی ہونے کی دلیل قرار دیا ہے، مگر یہ الفاظ اس مفہوم کے لیے صریح نہیں ہیں، کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ طاہوت کی طرح کوئی نبی ہو، جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اسے یہ پیغام دیا ہو، جیسے فرمایا: ﴿فَقُلْنَا اٰخِرُ نُوْبُهٗ بِبَعْضِهَآ﴾ [البقرہ: ۷۳] ”تو ہم نے کہا اس پر اس کا کوئی ٹکڑا مارو۔“ یا اس قوم کو مکمل طور پر ذوالقرنین کے اختیار میں دینے کی حالت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہو، اس لیے اکثر سلف اس کے نبی ہونے کے قائل نہیں۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اللہ کا نیک، مخلص اور مجاہد بندہ تھا، جس نے اپنے آرام کو چھوڑ کر ساری زندگی غلبہ اسلام کے لیے جہاد میں صرف کر دی۔

تیت 87-88 ﴿ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ : ذوالقرنین نے اپنی فتح و قوت کے نشے میں آ کر سب کو تہ تیغ کرنے یا غلام بنانے کے بجائے ہر ایک سے وہ سلوک کرنے کا اظہار کیا جس کے وہ لائق تھا۔ ”اَمَّا مَنْ ظَلَمَ“ (جو شخص ظلم کرے گا) سے مراد کفار و مشرکین ہیں۔ دیکھیے سورہ انعام (۸۴) اس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ ان کے مقابلے میں ایمان اور عمل صالح والوں کا ذکر ہے، یعنی کفار و مشرکین میں سے ہر ایک سے اس کے حسب حال سخت سزا کا سلوک کروں گا، جنگ پر آمادہ لوگوں کو قتل اور قید کروں گا اور غلام بناؤں گا۔ دوسروں سے جزیہ لے کر غلام بنا کر رکھوں گا، پھر قیامت کے دن وہ اپنے کفر و شرک کی بہت بری سزا پائیں گے۔ رہے ایمان اور عمل صالح والے تو ان کے لیے بدلے میں بھلائی ہی بھلائی ہے اور ہم ان کے ساتھ اپنے تمام معاملات میں آسانی کا سلوک کریں گے۔ ہمارے نبی ﷺ نے بھی اپنی جنگوں میں اسی پر عمل فرمایا۔

ثُمَّ أَتْبَعَهُ سَبِيًّا ۙ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ النَّسْرِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا ۗ كَذٰلِكَ ۙ وَ قَدْ أَحْطٰنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۙ ﴿٩١﴾

پھر وہ کچھ اور سامان ساتھ لے کر چلا ﴿٩٠﴾ یہاں تک کہ جب وہ سورج نکلنے کے مقام پر پہنچا تو اسے ایسے لوگوں پر طلوع ہوتے ہوئے پایا جن کے لیے ہم نے اس کے آگے کوئی پردہ نہیں بنایا تھا ﴿٩١﴾ ایسے ہی تھا اور یقیناً ہم نے جو کچھ اس کے پاس تھا اس کا علم کی رو سے احاطہ کر رکھا تھا ﴿٩١﴾

آیت 90.89 ثُمَّ أَتْبَعَهُ سَبِيًّا : مغرب کی طرف انسانی آبادی کے آخری حصے تک تمام علاقے فتح کر کے اسلام کے زیر نگیں لانے کے بعد اب اس نے مشرق کی طرف آبادی کے آخری حصے تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے ایک نہایت طویل اور دشوار سفر کے لیے ہر قسم کا ساز و سامان مہیا کیا اور اپنی زبردست افواج اور جنگی ساز و سامان ساتھ لے کر بے شمار دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں اور صحراؤں کو عبور کرتا ہوا اور تمام بادشاہوں کو شکست دیتا ہوا مشرق کی طرف آبادی کی ابتدا تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایسے لوگوں پر طلوع ہوتا ہے جن کے پاس سورج کی پیش سے بچنے کے لیے کوئی پردہ تھا نہ مکان، نہ کوئی عمارت، نہ خیمہ، نہ لباس۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے ذکر نہیں فرمایا، مگر اہل مغرب کے ساتھ اس کے سلوک سے ظاہر ہے کہ اس نے انھیں بھی اسلام کی دعوت دی اور ہر ایک کے ساتھ اس کے رویے کے مطابق سلوک کیا ہے اور انھیں وحشی زندگی کے بجائے تہذیب و تمدن کی تعلیم دی۔

آیت 91 ۙ كَذٰلِكَ ۙ وَ قَدْ أَحْطٰنَا : یعنی اہل مشرق سے اس کا سلوک بھی اہل مغرب جیسا تھا، یا مطلب یہ ہے کہ کوئی اس کے مغرب و مشرق اور اس کے درمیان تمام علاقوں کے پامال کرنے کو ناممکن نہ سمجھے، یقیناً ایسے ہی ہوا اور اس مقصد کے لیے اس نے جو افواج اور ساز و سامان مہیا کیا اور اپنا عیش و آرام ترک کر کے مسلسل سفر اور جنگوں کی جو تکالیف برداشت کیں اس کی پوری خبر ہم ہی کو ہے، کسی دوسرے کو کیا خبر؟

﴿٩٢﴾ ذوالقرنین کی زندگی سے جو سبق حاصل ہوتے ہیں ان میں سے پہلا سبق یہ ہے کہ اقتدار حاصل ہوتے ہی بلند ہمت مسلم حکمران تو عمری ہی میں تمام دنیا کو فتح کرنے کا عزم کر لیتے ہیں، کیونکہ ذوالقرنین کے اتنی بے پناہ افواج کو لے کر اتنے طویل اور دشوار گزار سفر اور پیش آنے والے معرکوں کے لیے طویل عرصے کی بھی ضرورت تھی۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ اگرچہ شاہی محلات، طاؤس و رباب، قالین و کنجواب، حسیناؤں اور حاشیہ نشینوں کے جھرمٹ میں زندگی گزارنے میں بھی لذت اور لطف ہے، مگر گھوڑے کی پشت پر پہاڑوں، صحراؤں، جنگلوں اور دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے اور زخم کھانے کے بعد فتح میں جو سرور اور اسلام کو سر بلند کرنے میں جو لذت ہے عیش پرستی کی لذت کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

﴿٩٣﴾ اقتدار حاصل ہونے کے بعد ہمارے نبی کریم ﷺ اور آپ کے خلفاء کا مشن بھی مسلسل جہاد کے ذریعے سے مشرق سے

مغرب تک اسلام پھیلا نا تھا اور آپ ﷺ کو اس وقت تک تمام دنیا کے لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا جب تک وہ اسلام قبول نہ کریں، یا جزیہ دے کر محکوم و مقہور نہ بن جائیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے زمین کے تمام مشرق و مغرب دکھا دیے اور بتا دیا کہ آپ کی امت کی سلطنت یہاں تک پہنچے گی۔ [ابن ماجہ، الفتن، باب ما یکون من الفتن: ۳۹۵۲] اور فی الواقع چند ہی سال میں مشرق کے آخر تک تھمیر بن مسلم نے پہنچ چکے تھے اور مغرب کے آخر تک عقبہ بن نافع بنکے۔ جنوب و شمال کی طرف جو علاقے رہ گئے ان کے متعلق بھی آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا يَنْقُضُ عَلَيَّ ظَهْرَ الْأَرْضِ بَيْتٌ مَدْرٍ وَلَا وَبْرٌ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللَّهُ كَلِمَةَ الْإِسْلَامِ بَعْرًا عَزِيزًا أَوْ ذُلًّا ذَلِيلًا إِمَّا يُعَرِّضُهُمُ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ فَيَجْعَلُهُمُ مِنْ أَهْلِهَا أَوْ يُدْخِلُهُمْ فَيُدْخِلُهُمْ لَهَا» [مسند أحمد: ۴/۶، ح: ۲۳۸۷۶، عن المقداد بن عائشة رَضِيَ اللهُ عَنْهُ] "زمین کی پشت پر ایشوں یا بالوں کا بنا ہوا کوئی گھر (یا خیمہ) باقی نہیں رہے گا، مگر اللہ تعالیٰ اس میں کلمہ اسلام کو داخل کر دے گا، ۶۰ت والے کو عزت بخش کر اور ذلیل کو ذلت دے کر، یا تو انھیں عزت دے گا اور انھیں یہ کلمہ پڑھنے والوں میں داخل کر دے گا، یا انھیں ذلیل کرے گا اور وہ اس کے محکوم بن جائیں گے۔" اب دیکھیے وہ محمدی ذوالقرنین کب اٹھتا ہے جو یہ کارنامہ سرانجام دے گا؟ بہر حال ہم سب کو کسی ذوالقرنین کا انتظار کرنے کے بجائے جتنا ہو سکے خود ہی اسلام کی سر بلندی اور کفر کو مٹانے کے لیے جہاد کی ضروریات مہیا کرنے اور دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے مسلسل جہاد میں مصروف رہنا لازم ہے، کیا خبر اللہ کس کو یہ سعادت بخش دے!! یہی ذوالقرنین کا مشن اور عمل تھا اور یہی ہمارے پیارے پیغمبر اور آپ کے خلفاء کا مشن اور عمل تھا اور یہی کام ہمارے ذمے ہے۔

④ جیسا کہ شروع سورت کی تفسیر میں گزرا کہ اس سورت کی ابتدائی یا آخری آیات کا حفظ کرنا دجال کے فتنے سے محفوظ رکھتا ہے، جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا بَيْنَ خَلْقِ آدَمَ إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ خَلِقُ أَكْبَرُ مِنَ الدَّجَالِ» [مسند الفتن، باب فی بقیة من أحادیث الدجال: ۲۹۹۶، عن عسراء بن حصین رَضِيَ اللهُ عَنْهُ] "آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر قیامت قائم ہونے تک کوئی مخلوق دجال سے بڑی نہیں ہوئی۔" پھر جو شخص اس سے محفوظ رہا وہ دوسرے فتنوں سے تو بالادولی محفوظ رہے گا۔ اصحاب کہف اور ذوالقرنین دونوں کے قصوں کا خلاصہ یہ ہے کہ فتنے میں مبتلا کرنے والے کفار کے ساتھ مؤمن گزارا نہیں کر سکتا۔ اگر اس کے پاس اقتدار نہیں تو وہ ایمان بچانے کے لیے غاروں اور پہاڑوں میں چلا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی جان و ایمان دونوں کی حفاظت فرماتا ہے اور اگر صاحب اقتدار ہے تو پوری عمر کفر اور کفار کی کمر توڑنے میں مصروف رہتا ہے، تاکہ وہ غالب آکر اس کے ایمان کے لیے خطرہ نہ بن سکیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صرف اس سورت یا اس کی چند آیات کا پڑھنا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے تقاضوں پر عمل بھی فتنوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ سے دوستی کا ٹھہ لے، اپنی ایمانی غیرت کو چھپکایاں دے کر مسلا دے، کفر و شرک پر زبان بند رکھ کر کافر معاشرے میں تیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا رہے اور ہر جمعہ کو سورہ کہف کی تلاوت کر لیا کرے، بلکہ حفظ آیات میں ان پر عمل بھی شامل ہے۔ تفصیل کے لیے

ثُمَّ اتَّبَعَ سَبِيلًا ﴿۹۲﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا ۙ

پھر وہ کچھ اور سامان ساتھ لے کر چلا ﴿۹۲﴾ یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو ان کے اس طرف کچھ

دیکھے سورہ کہف (۱۰۲ تا ۱۰۴)۔

آیت 93.92 ﴿۱﴾ ثُمَّ اتَّبَعَ سَبِيلًا..... : مغرب و مشرق کے سفر کے بعد ذوالقرنین کا یہ تیسرا سفر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی

جہت بیان نہیں فرمائی کہ وہ شمال ہے یا جنوب یا چاروں جہتوں کا کوئی کونا۔ معلوم ہوتا ہے اسے پوشیدہ رکھنے ہی میں اللہ کی حکمت ہے۔ چنانچہ مدت دراز سے لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی دو پہاڑوں کے درمیان اس جھسی بلندی والی یہ دیوار کسی نے نہیں دیکھی۔ دیوار چین یا افغانستان میں در بند اور خوزامہ کے درمیان کسی زمانے میں پائی جانے والی دیوار یا کسی اور دیوار کی نہ یہ ہیئت ہے، نہ ان کے پار رہنے والوں میں کہیں یا جوج ماجوج کا وجود ہے۔

﴿۲﴾ بہت سے مفسرین نے ذوالقرنین کا یہ سفر شمال کی طرف قرار دیا ہے، کوئی اسے روس کا علاقہ قرار دیتا ہے، کوئی تاتاریوں کو یا جوج ماجوج کا مصداق ٹھہراتا ہے، جنھوں نے شمال کی جانب سے نکل کر دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ بعض انھیں مغل یا ترک قرار دیتے ہیں، مگر سب بلا دلیل اندھیرے میں پتھر پھینکتے چلے جاتے ہیں۔ بعض حضرات اپنے دعوے کے کسی جز کی دلیل کے طور پر بائبل سے کچھ نقل کر کے پورے دعوے کی دلیل کے فریضے سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، حالانکہ موجودہ بائبل پر یقین ممکن ہی نہیں۔ ان حضرات کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ ذوالقرنین کی دیوار ختم ہو چکی اور اس کے پیچھے روکے ہوئے یا جوج ماجوج، جو نکلنے تھے، نکل چکے، حالانکہ قرآن و سنت دونوں سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت کی تفصیل کی ضرورت ہو تو وہ قرآن مجید کی کسی دوسری آیت ساتھ ملانے سے پوری ہو جاتی ہے، اگر پھر بھی ضرورت باقی رہے تو صحیح حدیث ملانے سے وہ بھی پوری ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں یا جوج ماجوج کے نکلنے کا ذکر ایک اور مقام پر بھی آتا ہے، فرمایا: ﴿حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ ﴿۹۱﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقِّ إِذَا هَمَّ شَاخِصَةٌ أَبْصَارِ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِنْ هَذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۹۲﴾﴾ [الانبیاء، ۹۱، ۹۲] ”یہاں تک کہ جب یا جوج اور ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر اونچی جگہ سے دوڑتے ہوئے آئیں گے اور سچا وعدہ بالکل قریب آجائے گا تو اچانک یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ جنھوں نے کفر کیا۔ ہائے ہماری بربادی! بے شک ہم اس سے غفلت میں تھے، بلکہ ہم ظلم کرنے والے تھے۔“ سورہ کہف اور سورہ انبیاء دونوں کی آیات کو ملانے سے صاف واضح ہے کہ اس دیوار کے زمین کے برابر ہونے اور یا جوج ماجوج کے مومنین مارتے ہوئے نکلنے کا وقت ایک ہی ہے اور اس کے بعد نفع صور اور قیامت بالکل قریب ہوں گی۔ اس کی مزید تفصیل صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کی زبانی موجود ہے کہ یہ سب کچھ دجال کے نکلنے اور مسیح علیہ السلام کے زمین پر نازل ہونے کے بعد ہوگا۔ چنانچہ نو اس بن سمرعان رضی اللہ عنہما سے مروی لمبی حدیث میں دجال کے نکلنے، فتنہ و فساد پھیلانے، پھر مسیح علیہ السلام کے نازل ہو کر اسے قتل کرنے کا ذکر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿۹۱﴾

لوگوں کو پایا جو قریب نہ تھے کہ کوئی بات سمجھیں ﴿۹۱﴾

”عیسیٰ علیہ السلام اسی طرح (مصروف) ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائے گا کہ میں نے اپنے کچھ ایسے بندے نکالے ہیں کہ کسی میں ان سے لڑنے کی طاقت نہیں، اس لیے میرے بندوں کو طور کی طرف لے جا کر محفوظ کر لو، تو اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کو بھیجے گا اور وہ ہر اونچی جگہ سے دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ ان کے پہلے لوگ طبریہ جمیل پر پہنچیں گے تو اس میں جو بھی (پانی) ہے پی جائیں گے اور ان کے آخری لوگ گزریں گے اور کہیں گے کہ یہاں کبھی ضرور پانی رہا ہے۔ اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی محصور رہیں گے، یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک کے نزدیک نیل کا سر آج تمہارے نزدیک سو دینار (تین سو گرام سونے) سے بہتر ہوگا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی گردنوں میں کیڑے ڈال دے گا تو وہ سب ایک شخص کی موت کی طرح ہلاک ہو جائیں گے، پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی زمین پر اتریں گے تو زمین میں ایک بالشت جگہ بھی نہیں پائیں گے جسے ان کی سزا اور گندگی نے نہ بھر رکھا ہو۔ تو اللہ تعالیٰ بنی آدم کی گردنوں جیسے پرندے بھیجے گا جو انہیں اٹھا کر وہاں پھینک دیں گے جہاں اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ ایسی بارش برسائے گا کہ کوئی مکان یا خیمہ اس کے بغیر نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ بارش زمین کو دھو دے گی، یہاں تک کہ اسے آئینے کی طرح صاف کر دے گی۔ پھر زمین کو حکم ہوگا کہ اپنے پھل اُگا اور اپنی برکت واپس لا تو ان دنوں ایک جماعت انار کا ایک حصہ کھائے گی اور اس کے چھلکے سے سایہ حاصل کرے گی اور دودھ والے جانوروں میں برکت دی جائے گی، یہاں تک کہ دودھ والی اونٹنی لوگوں کی کئی جماعتوں کو کافی ہوگی اور دودھ والی گائے لوگوں کے ایک قبیلے کو کافی ہوگی اور دودھ والی بکری لوگوں کے ایک خاندان کو کافی ہوگی۔ تو وہ اسی حال میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک طیب ہوا بھیجے گا جو ان کی بظلوں کے نیچے اتر کرے گی اور ہر مومن اور ہر مسلم کی روح قبض کر لے گی اور بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے، جو گدھوں کی طرح ایک دوسرے سے جنسی ملاپ کریں گے تو ان پر قیامت قائم ہوگی۔“ [مسلم، الفتن، باب ذکر الدجال : ۲۹۳۷]

اس صحیح حدیث سے ذوالقرنین کی دیوار کا زمین کے برابر ہو چکا ہونا اور یاجوج ماجوج کا روسی، چینی یا تاتاری ہونا اور ان کے خروج کا واقع ہو چکا ہونا صاف غلط ثابت ہوتا ہے اور یہ بات طے شدہ ہے کہ قرآن مجید اور صحیح حدیث کے خلاف جو بات بھی ہے وہ باطل اور جھوٹ ہے، خواہ وہ بات کہنے والا کتنا بڑا ہو اور خواہ وہ بائبل کی کسی کتاب میں موجود ہو، کیونکہ بائبل کے محفوظ نہ رہنے اور اس میں اضافہ اور تبدیلی کی شہادت قرآن مجید میں کئی جگہ موجود ہے۔ دیکھیے سورہ مائدہ (۱۳)، انعام (۹۱)، بقرہ (۷۹) اور آل عمران (۷۸) اس کے مقابلے میں قرآن و سنت کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ دیکھیے سورہ حجر (۹)، قیامہ (۱۶، ۱۷)، خم السجدہ (۲۲) اور نجم (۲۳)، بلکہ اس میں کئی ایسی عبارتیں ہیں کہ کوئی یہودی یا عیسائی انہیں عام مجمع میں پڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتا، مثلاً لوط، داؤد اور سلیمان علیہم السلام پر تہمتوں کے طوفان والی عبارتیں۔ اور اس بات پر امت کا اتفاق

ہے کہ اہل کتاب کی کوئی بات قرآن و سنت کے خلاف ہو تو وہ جھوٹ ہے اور اگر نہ خلاف ہو نہ موافق تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انھیں نہ سچا کہو نہ جھوٹا۔ زیر تفسیر آیات کے بارے میں اسرائیلی روایات قرآن مجید اور صحیح احادیث کے خلاف ہیں، اس لیے بے بنیاد اور باطل ہیں۔

③ یاجوج اور ماجوج نجی نام ہیں، اس لیے عجم اور تانیث (مجوس کی طرح قبیلہ ہونے) کی وجہ سے غیر منصرف ہیں۔ اگر انھیں عربی مانا جائے تو یاجوج بروزن ”يَفْعُولُ“ مثلاً ”يَرْبُوعُ“ اور ماجوج بروزن ”مَفْعُولُ“ مثلاً ”مَعْفُولُ“ ہوگا اور ان کا ماخذ ”أَجُّ يَوْجٌ“ ہوگا۔ ”أَجُّ الظَّلِيمِ“ کا معنی زشت مرغ تیز دوڑا اور ”أَحَبُّ النَّارِ“ آگ بھڑک اٹھی۔ غرض یاجوج اور ماجوج کا اشتقاق ایک ہی مادے سے ہے اور اس کے مفہوم میں تیزی اور اشتعال شامل ہے اور یہ لفظ معرفہ اور تانیث کی وجہ سے غیر منصرف ہیں۔ (تاکمی)

④ یاجوج اور ماجوج آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، جیسا کہ صحیحین میں ہے: «يَقُولُ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ يَا آدَمُ! اقْبُلْ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِي يَدَيْكَ قَالَ يَقُولُ أُخْرِجْ بَعَثَ النَّارَ، قَالَ وَمَا بَعَثَ النَّارِ؟ قَالَ مِنْ شَكْلِ أَلْفٍ تِسْعِمِائَةٍ وَتِسْعَةِ وَتِسْعِينَ، قَالَ فَذَلِكَ جِئِنَ يَشِيبُ الصَّغِيرُ ﴿٦٥٣٠﴾ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَنَلٍ حَنَلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَرَى وَمَا هُمْ بِسُكَرَى وَلَكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ﴿٦٥٣١﴾ قَالَ فَاسْتَنْدَ ذَلِكَ عَلَيْهِمْ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَيْنَا ذَلِكَ الرَّجُلُ؟ فَقَالَ أُنْبِئُوا فَإِنَّ مِنْ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ أَلْفَ، وَمِنْكُمْ رَجُلٌ ﴿٦٥٣٢﴾ [مسلم، الإيمان، باب قوله: يقول الله لآدم.....: ٢٢٢٢ - بحاری: ٦٥٣٠] ”اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ”اے آدم! وہ عرض کریں گے: ”لبیک و سعدیک اور ہر خیر حیرے ہی ہاتھ میں ہے۔“ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ”آگ والی جماعت کو نکالو۔“ وہ عرض کریں گے: ”اور آگ والی جماعت کیا ہے؟“ فرمائیں گے: ”ہر ہزار میں سے نو سو تانوے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو یہ وہ وقت ہوگا کہ بچہ بوڑھا ہو جائے گا اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور تو لوگوں کو نشے میں دیکھے گا، حالانکہ وہ ہرگز نشے میں نہیں ہوں گے اور لیکن اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔“ راوی نے کہا، تو یہ بات ان پر بہت شاق گزری، انھوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! ہم میں وہ ایک آدمی کون ہوگا؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”خوش ہو جاؤ کہ یاجوج ماجوج میں سے ایک ہزار اور تم میں سے ایک آدمی ہوگا۔“ بعض مفسرین نے یاجوج ماجوج کی شکل و صورت، قد کے لیے اور چھوٹے ہونے اور ان کے کانوں کے متعلق عجیب و غریب اقوال و روایات لکھی ہیں جن میں سے کوئی بھی قرآن و سنت سے ثابت نہیں۔ (ابن کثیر)

⑤ اس حقیقت پر بعض کم فہم لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ یورپی اقوام نے زمین کا ہر کونا چھان مارا ہے مگر انھیں نہ کہیں یاجوج ماجوج نظر آتے ہیں نہ پہاڑوں جیسی بلند لوہے اور تانبے کی کوئی دیوار نظر آتی ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے مخفی رکھنا چاہے کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا۔ بنی اسرائیل میدان تیبہ میں چالیس سال تک چند میل کے دائرے میں گھومتے رہے، نہ وہ اس دائرے سے نکل سکے اور نہ کسی اور کو ان کا پتا چل سکا، ورنہ وہ انھیں نکلنے کا راستہ بتا کر وہاں سے نکال لیتا۔ ایمان ہو تو اس دیوار، یاجوج ماجوج، نزول مسیح، دجال، دابۃ الارض سب پر یقین آ جاتا ہے اور اگر ایمان نہ ہو تو انسان ”ایک جمع ایک، جمع ایک، برابر تین“

قَالُوا يَا قَرْنَيْنِ إِنَّا يَا جُوجَ وَمَا جُوجَ مُمْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۗ قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝

انھوں نے کہا اے ذوالقرنین! بے شک یا جوج اور ما جوج اس سرزمین میں فساد کرنے والے ہیں، تو کیا ہم تیرے لیے کچھ آمدنی طے کر دیں، اس (شرط) پر کہ تو ہمارے درمیان اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دے ۱۹) اس نے کہا جن چیزوں میں میرے رب نے مجھے اقتدار بخشا ہے وہ بہتر ہیں، اس لیے تم قوت کے ساتھ میری مدد کرو کہ میں تمہارے درمیان اور ان کے درمیان ایک موٹی دیوار بنا دوں ۲۰)

کے بجائے ”برابر ایک“ جیسی صریح خلاف عقل بات پراڑ جاتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے رازوں تک اپنی نارسائی کو تسلیم نہیں کرتا۔ آیت 94 ۱ قَالُوا يَا قَرْنَيْنِ جب وہ قریب نہ تھے کہ کوئی بات سمجھیں تو ذوالقرنین سے ان کی گفتگو کیسے ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ اشاروں کی زبان میں، جو بین الاقوامی زبان ہے، یا ذوالقرنین کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ان کی زبان سمجھا دی ہوگی، جیسا کہ داؤد و سلیمان علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی بولی سکھا دی تھی۔

۲) فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا اس قوم اور یا جوج ما جوج کے درمیان دو پہاڑ تھے جن کے درمیان ایک درہ تھا، جہاں سے آ کر وہ لوگ لوٹ مار کر کے چلے جاتے تھے۔ دو پہاڑوں کے درمیان ان کے برابر ایک بلند دیوار کوئی اولوالعزم بادشاہ ہی بنا سکتا تھا، جس کے پاس ہر قسم کے وسائل ہوں۔ کوئی قوم کتنی بھی مال دار ہو، یہ کام سرانجام نہیں دے سکتی۔ اس لیے انھوں نے اخراجات ادا کرنے کی پیشکش کر کے اپنے اور یا جوج ما جوج کے درمیان رکاوٹ بننے والی دیوار بنانے کی درخواست کی جو پہاڑوں کی طرح ان کا راستہ روک سکے۔

آیت 95 ۱ قَالُوا مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ : ذوالقرنین نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ میری دسترس میں دیا ہے وہ تمہارے دیے ہوئے اخراجات سے کہیں بہتر ہے، سو تم خرچ کی فکر مت کرو۔ ہاں، تم عملی طور پر آدمیوں اور محنت کے ساتھ میری مدد کرو، تاکہ میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک موٹی دیوار بنا دوں۔ اس سے ذوالقرنین کی سیر چشمی، فراخ دلی اور سخاوت نفس کے ساتھ ساتھ رعایا کو دشمن سے محفوظ رکھنے کے لیے مضبوط ترین دفاع کا بندوبست کرنا واضح ہوتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے بھی ملکہ سبا کو ہدیے بھیجنے پر ایسا ہی جواب بھیجا تھا: ﴿فَمَا أَتَيْنَ اللَّهُ خَيْرٌ مِمَّا أَتَيْتُمْ﴾ [النمل: ۳۶] ”جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو اس نے تمہیں دیا ہے۔“ رعایا کی زندگی کے ایک ایک لمحے تک پرنیس لگا دینے والے جمہوری حکمران، جو ملکیت کو گالی قرار دیتے ہیں، رعایا کے لیے اللہ کی رحمت بننے والے ملوک کے طرز عمل سے سبق حاصل کریں۔

۲) فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ ”رَدْمًا“ کا معنی خالی جگہ کو پتھروں سے پر کرنا اور پتھروں کی بنی ہوئی موٹی دیوار ہے، ”سَحَابٌ مُرْدَمٌ“ تہ بہ تہ بادل۔

أَتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوا حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا ۖ
 قَالَ أَتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۗ فَمَا اسْتَطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ۙ
 قَالَ هَذَا رَحْمَةٌ مِنِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ مَرْيَمَ حَقًّا ۙ

تم میرے پاس لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لاؤ، یہاں تک کہ جب اس نے دونوں پہاڑوں کا درمیانی حصہ برابر کر دیا تو کہا ”دھوکو“ یہاں تک کہ جب اس نے اسے آگ بنا دیا تو کہا لاؤ میرے پاس کہ میں اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیل دوں ﴿۹۶﴾ پھر نہ ان میں یہ طاقت رہی کہ اس پر چڑھ جائیں اور نہ وہ اس میں کوئی سوراخ کر سکے ﴿۹۷﴾ کہا یہ میرے رب کی طرف سے ایک رحمت ہے، پھر جب میرے رب کا وعدہ آ گیا تو وہ اسے زمین کے برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ ہمیشہ سے سچا ہے ﴿۹۸﴾

آیت 96 اَتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ ”زُبَرَ“ کی جمع ہے، جیسا کہ ”عُرْفَةٌ“ کی جمع ”عُرَفٌ“ ہے، معنی ہے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے۔ پہاڑوں کے درمیان ان کی بلندی کے برابر لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے مہیا

کرنا، انھیں اوپر پہنچانا اور جوڑنا ہمارے اس ترقی یافتہ دور میں بھی امر محال نظر آتا ہے، مگر اہرام مصر کو دیکھیں تو ماننا پڑتا ہے کہ ہم سے ہزاروں سال پہلے برٹشلس (دوڑنی اشیاء کو کھینچنے اور اوپر لے جانے) کا علم آج سے بہت آگے تھا۔ چنانچہ ذوالقرنین نے پہاڑوں کے دونوں کناروں کے برابر لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے جوڑنے کے بعد ایک جان کر نے کے لیے انھیں آگ سے سرخ کرنے کا حکم دیا، ادھر تانبے کو پگھلانے کا بندوبست کیا۔ جب لوہے کی ایشیں اور تھخے سرا سر آگ بن گئے تو اس نے کہا، اب پگھلا ہوا تانبا لاؤ، تاکہ میں اس پر ڈالوں۔ اس طرح وہ لوہے اور تانبے کی بہت موٹی، مضبوط اور پہاڑوں کے برابر بلند اور چکنی دیوار بن گئی، جس پر نہ یا جوج ماجوج چڑھ سکتے تھے، نہ اس میں سوراخ کر سکتے تھے۔ ہزاروں فٹ اونچی اس دیوار کو بنانے میں سائنس کے کیا کیا علوم استعمال ہوئے، لوہے اور تانبے کی کتنی مقدار صرف ہوئی، اتنی بلندی پر لوہے کو کیسے سرخ کیا گیا اور تانبے کی اتنی مقدار اس قدر بلندی پر پہنچانے تک کیسے پگھلی ہوئی حالت میں رکھی گئی اور اتنی موٹی دیوار جب سرخ ہوئی ہوگی تو اس کے پاس کھڑا ہو کر پگھلا ہوا تانبا کیسے ڈالا گیا ہوگا، پھر یہ کام کتنی مدت میں مکمل ہوا، یہ سب آجھاب صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس سارے عمل میں ذوالقرنین پہ نفس نفیس کام میں شریک رہا، بلکہ اپنے ہاتھوں سے کام کرتا رہا۔ یہی سنت ہمارے پیارے پیغمبر ﷺ کی ہے کہ آپ کعبہ کی تعمیر میں مسجد نبویؐ بنانے اور خندق کھودنے میں پہ نفس نفیس برابر شریک رہے۔

آیت 97 فَمَا اسْتَطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ ”اسْتَطَاعُوا“ بھی اصل میں ”اسْتَطَاعُوا“ تھا، جو ظہور کے لیے تاء حذف

کر دی۔ چڑھنے کے لیے ہلکا لفظ ”اسْتَطَاعُوا“ اور نقب کے لیے بھاری لفظ ”اسْتَطَاعُوا“ استعمال فرمایا، کیونکہ ایسی دیوار پر چڑھنا اس میں نقب کی بہ نسبت آسان ہے۔

آیت 98 قَالَ هَذَا رَحْمَةٌ مِنِّي ۖ ذوالقرنین نے دیوار بنا کر اسے اپنا کارنامہ قرار دینے کے بجائے اپنے رب

و تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَ نَفَخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ۝

اور اس دن ہم ان کے بعض کو چھوڑیں گے کہ بعض میں ریلا مارتے ہوں گے اور صور میں پھونکا جائے گا تو ہم ان کو جمع کریں گے، پوری طرح جمع کرنا ۹۹

کی رحمت قرار دیا، جس کی بدولت وہ لوگ یا جوج ماجوج کے حلقوں سے محفوظ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی مضبوطی کے باوجود اسے لازوال قرار دینے کے بجائے فرمایا کہ جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو وہ اسے زمین کے برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ ہمیشہ سے سچا ہے۔ ذوالقرنین کی بات اور وہ بانوں والے بے ایمان کی بات کا موازنہ کریں، جو اپنے بانوں کو کبھی برباد نہ ہونے والا کہہ رہا تھا، تو موسیٰ و کافر کی سوچ کا فرق صاف واضح ہو جاتا ہے۔

② فَاِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلْنَا دَكَّاءَ.....: ذوالقرنین کی اس بات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ساری دنیا کی بادشاہت ملنے کے باوجود آخرت کی فکر ہر وقت رہنی چاہیے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اس وعدے سے مراد قیامت کے قریب یا جوج ماجوج کے نکلنے کا وقت ہے، جیسا کہ سورہ انبیاء (۹۶، ۹۷) میں ہے۔ زینب بنت جحش فرماتی ہیں: «اسْتَيْقَظَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ النَّوْمِ مُحَمَّرًا وَجْهَهُ وَهُوَ يَقُولُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَبَلَ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرِّ قَدِ اقْتَرَبَ، فَفُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمٍ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ بِمِثْلِ هَذِهِ وَعَقَدَ سُفْيَانُ تِسْعِينَ أَوْ مِائَةَ قَبِيلٍ أَنْهَلِكَ وَفِينَا الصَّالِحُونَ؟ قَالَ نَعَمْ إِذَا كَثُرَ الْحَبْتُ» [بخاری، الفن، باب قول النبي ﷺ: ويل للعرب.....: ۷۰۵۹] "رسول اللہ ﷺ نیند سے لا الہ الا اللہ کہتے ہوئے بیدار ہوئے، جب کہ آپ کا چہرہ سرخ تھا، فرمایا: "عرب کے لیے بہت بڑی تباہی ہے، اس شر سے جو بہت قریب آ گیا ہے، آج یا جوج ماجوج کی دیوار میں اتنا حصہ کھول دیا گیا۔" اور سفیان نے نوے (۹۰) یا سو (۱۰۰) کی گرہ بنائی، یعنی انگوٹھے اور شہادت کی انگلی ملا کر گول دائرہ بنا کر دکھایا۔ پوچھا گیا: "کیا ہم اپنے آپ میں صالحین کے موجود ہوتے ہوئے ہلاک ہو جائیں گے۔" فرمایا: "ہاں، جب برائی زیادہ ہو جائے گی۔"

آیت 99 ① وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ: اس دن سے مراد یہ ہے کہ ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار کے مسمار ہونے کے وقت یا جوج ماجوج سمندر کی موجوں کی طرح بے حساب تعداد میں یلغار کرتے ہوئے نکلیں گے۔ اسی کیفیت کو ﴿وَهُمْ مِنْ كَلْبٍ حَدَابٍ يَنْسُلُونَ﴾ [الانبیاء: ۹۶] میں بیان کیا گیا ہے۔

② وَ نَفَخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا: "الصُّور" سے مراد وہ سینگ ہے جس میں فرشتہ پھونک مارے گا تو حشر برپا ہو جائے گا۔ یہ تفسیر خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: «الصُّورُ قَرْنٌ يُنْفَخُ فِيهِ» [ابوداؤد، السنن، باب في ذكر البعث والصور: ۴۷۴۲ - الصحیفة: ۱۰۸۰] "صوروہ قرن ہے جس میں پھونکا جائے گا۔" اس آیت میں مذکور نفع سے مراد دوسرا نفع ہے جس سے سب لوگ قبروں سے نکل کر میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے۔

وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ عَرْضًا ۝ الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَنِ ذِكْرِي وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ۝ أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِي أَوْلِيَاءَ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ۝ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعِيَّهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝

اور اس دن ہم جہنم کو کافروں کے عین سامنے پیش کریں گے ۱۰۰ وہ لوگ کہ ان کی آنکھیں میرے ذکر سے پردے میں تھیں اور وہ سن ہی نہ سکتے تھے ۱۰۱ تو کیا جن لوگوں نے کفر کیا انہوں نے گمان کر لیا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو حمایتی بنا لیں گے۔ بے شک ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے بطور مہمانی تیار کر رکھا ہے ۱۰۲ کہہ دے کیا ہم تمہیں وہ لوگ بتائیں جو اعمال میں سب سے زیادہ خسارے والے ہیں ۱۰۳ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں ضائع ہو گئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک اچھا کام کر رہے ہیں ۱۰۴

آیت 100 وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ یہ پیش کرنا بھی عذاب سے پہلے عذاب ہوگا۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۵۳) کی تفسیر۔
آیت 101 الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ "غِطَاءٌ" میں تعزین تنظیم کے لیے ہے، معنی ہے سخت گاڑھا پردہ، یعنی اپنی عقل کی آنکھ نہ تھی کہ قدرتیں دیکھ کر یقین لاتے اور ضد کی وجہ سے کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے کہ سمجھانے سے سمجھ جاتے۔ مزید دیکھیے سورہ ملک (۱۰)۔

آیت 102 أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا : سورت کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد بتانے والوں کو ڈرانے اور اصحاب کہف کے اعلان توحید کے ذکر سے ہوئی تھی، آخر میں پھر وہی بات دہرائی، یعنی کیا ان کفار نے میرے خاص بندوں، جیسے مسیح، عزیر، روح القدس اور فرشتوں وغیرہ کو اپنا معبود بنا کر یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہیں میرے مقابلے میں لاکھڑا کریں گے اور اپنا حمایتی بنا لیں گے۔ استفہام انکاری ہے، یعنی یہ گمان سراسر غلط ہے، بلکہ وہ سب ان کی عبادت سے بے زاری کا اعلان کریں گے اور ان کے مقابل مدعی بن کر کھڑے ہوں گے۔ دیکھیے سورہ مریم (۸۲) اور احقاف (۶، ۵) اگرچہ "عِبَادِي" سے نیک و بد سبھی مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ سب اللہ کے بندے ہیں (دیکھیے مریم: ۹۳) مگر پہلا معنی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ "میرے بندے" کہہ کر اپنا بنا لینے میں جو عزت افزائی ہے وہ خاص بندوں ہی کا حصہ ہے۔

آیت 103 إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا : "نُزُلًا" کا معنی وہ چیزیں ہیں جو مہمان نوازی کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ جہنم بطور مہمانی کفار کو مذاق ہے۔ "نُزُلًا" کا ایک معنی منزل بھی ہے، یعنی ہم نے جہنم کو کافروں کی منزل کے طور پر تیار کر رکھا ہے۔

آیت 104 الَّذِينَ ضَلَّ سَعِيَّهُمْ : یعنی جتنے نیک اعمال انہوں نے کیے سب کفر کی شامت سے رازگاہاں گئے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَائِهِمْ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزَنًا ﴿٥٠﴾ ذَلِكَ جَزَاءُ هُمْ جَاهَنَّمَ بِمَا كَفَرُوا وَ اتَّخَذُوا آيَاتِي وَ رُسُلِي هُزُوًا ﴿٥١﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿٥٢﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿٥٣﴾

یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، تو ان کے اعمال ضائع ہو گئے، سو ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے ﴿۵۰﴾ یہ ان کی جزا جہنم ہے، اس وجہ سے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوں کو مذاق بنایا ﴿۵۱﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے فردوس کے باغ مہمانی ہوں گے ﴿۵۲﴾ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، وہ اس سے جگہ بدلنا نہ چاہیں گے ﴿۵۳﴾ دیکھیے سورۃ البراقیم (۱۸۱)، نور (۲۴)، اور فرقان (۲۳) یہ مطلب بھی درست ہے کہ ”جن کی ساری کوشش دنیا کی زندگی میں کم ہو کر رہ گئی“ یعنی اللہ تعالیٰ اور آخرت کی پروا نہ کی اور دنیا کی خوش حالیوں اور کامیابیوں کو اپنا اصل مقصد بنائے رکھا۔

آیت 105 أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات اور آخرت کو ماننے ہی نہ تھے، سو انہوں نے اس کے لیے کچھ بھی نہ کیا، ان کے دلوں کے پلڑے میں کچھ ہی نہیں تو صرف ایک پلڑے کا وزن کیا جائے؟

آیت 107 إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کفار کے بعد ان کے مقابل اہل ایمان کی مہمانی کا ذکر فرمایا۔ فردوس کا معنی وہ باغ ہے جس میں تمام باغوں کے درخت، پھول اور پودے ہوں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿فِيهَا نِسَاءٌ كَالنِّسَاءِ فِي الدُّنْيَا، وَأَعْلَى الْمَجْنَّةِ وَأَعْلَى الْمَجْنَّةِ، وَفَوْقَهُ عَرْشُ الرَّحْمَنِ، وَبِهِ نَفْحَةُ أَنْهَارِ الْحَمِيمِ﴾ [بخاری، باب ما جاء في الجنة، باب ما جاء في عرش الرحمن، ۷۴۲۳] ”جب تم اللہ سے مانگو تو اس سے فردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے افضل اور جنت کا سب سے اونچا مقام ہے اور اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں نکلنے لگی ہیں۔“

آیت 108 لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا: ایک جگہ زیادہ دیر رہنے سے آدمی اکتا جاتا ہے، مگر جنتی جنت سے کبھی دوسری جگہ نقل ہونا نہیں چاہیں گے، کیونکہ اس سے بہتر عیش کی کوئی جگہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا كَفْتُمْ لِنَفْسِكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ ﴿٥٢﴾ نُزُلًا مِّنْ حَقِّوْرِي رَحْمَةٍ جَبِيْرَةٍ ﴿٥٣﴾﴾ اور تمہارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تمہارے دل چاہیں گے اور تمہارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تم مانگو گے۔ یہ بے حد بخشش والے، نہایت مہربان کی طرف سے مہمانی ہے۔ اور اسی آیت قدسی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَعَدَدْتُ لِعِبَادِي الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا حَفْظٌ خَلَّصَ﴾ [بخاری، باب ما جاء في الجنة، باب ما جاء في حفة الجنة، ۳۲۴۴۔ مسلم، ۲۸۲۴] کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لَكَلِمَتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَتُ رَبِّي وَ لَوْ

کہہ دے اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے سیاہی بن جائے تو یقیناً سمندر ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ ”میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزرا۔“ اور ان سب نعمتوں سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگی، پھر جنت کی نعمتیں ہر آن نبی سے نئی ہوتی رہیں گی، نہ ختم ہوں گی نہ کہیں رکیں گی، کیونکہ وہ اللہ کے کلمہ کن سے وجود میں آئیں گی اور اللہ کے کلمات کی کوئی انتہا نہیں، دیکھیے اس سے اگلی آیت۔

آیت 109 ① قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا.....: کیونکہ سمندر مخلوق ہے جس کی حد اور انتہا ہے، جب کہ اللہ کا کلام اس کی صفت ہے، مخلوق نہیں، نہ اللہ کی ذات کی کوئی انتہا ہے نہ اس کی صفات کی۔ اگر اللہ کے کلمات لکھنے کے لیے سارے سمندر سیاہی بن جائیں اور زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں، پھر اتنی سیاہی ہم اور لے آئیں، بلکہ مزید سات سمندر سیاہی بن جائیں تو سب ختم ہو جائیں گے، مگر اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ (دیکھیے لقمان: ۲۷) کیونکہ محدود چیز لامتناہی اور غیر محدود کا احاطہ کبھی نہیں کر سکتی۔

② اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ کی ذات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اسی طرح اس کی دوسری صفات کی طرح صفت کلام بھی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ وہ جب چاہے، جس سے چاہے، جو چاہے کلام کرتا ہے، اس کے کلام کی کوئی انتہا نہیں، وہ ہمیشہ کلام پر قادر رہے گا، جیسے رسولوں کے متعلق فرمایا: ﴿مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللَّهُ﴾ [البقرة: ۲۵۳] ”ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام فرمایا۔“ اور فرمایا: ﴿وَ كَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا﴾ [النساء: ۱۶۴] ”اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔“ اور فرمایا: ﴿وَ إِنْ أَحَدٌ مِنَ الْبَشَرِ لَكِنَّهُ لَشَآءٌ لِّكَ فَآجِزُهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلِمَةَ اللَّهِ﴾ [التوبة: ۶] ”اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔“ اتنی واضح آیات کے باوجود مسلمانوں کے بہت سے گمراہ فرقے اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کے منکر ہیں۔ ان کے مطابق اللہ کا کلام وہ معانی ہیں جو اس کی ذات میں ہیں۔ وہ بول نہیں سکتا، نہ اس کے الفاظ ہیں نہ آواز۔ الفاظ اور آواز کو اس نے پیدا کیا ہے، اس لیے یہ قرآن بھی مخلوق ہے، اللہ کا کلام نہیں۔ صرف اس کا مفہوم و معنی اللہ کی صفت ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض نے کہا کہ نماز میں قرآنی آیت کا مفہوم عربی الفاظ کے بجائے فارسی، اردو یا کسی اور زبان میں ادا کر دیا جائے تو نماز ہو جائے گی، کیونکہ قرآن کی تلاوت ہوگی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق قرآن عربی ہے۔ دیکھیے سورۃ یوسف (۲) وغیرہ۔ امام اہل السنۃ احمد ابن حنبل رحمہ اللہ نے انہی گمراہ فرقوں کی طرف سے بے شمار عذاب برداشت کیے، مگر قرآن کو اللہ کا کلام کہتے رہے، اسے مخلوق نہیں مانا اور امت کو صراط مستقیم سے ہٹنے نہیں دیا۔ بھلا کوئی شخص اپنے آپ کو تو کلام پر قادر سمجھے اور اپنے لیے گونگا ہونے کو عیب جانے، حالانکہ گونگے کے دل میں بھی معانی موجود ہوتے ہیں، مگر تمام صفات حسہ کے مالک کے متعلق کہے کہ وہ نہ بولتا ہے نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ کوئی اس کا کلام سن سکتا ہے۔ ایسا عاجز رب انہی کو مبارک ہو قرآن و حدیث میں مذکور ہمارا رب تو بولتا بھی ہے، سنتا بھی اور وہ تمام صفات کمال کا مالک ہے۔ بعض پیغمبروں نے خود اس کا کلام سنا، بعض کو فرشتے کے ذریعے

چُنْتَا بِشَآئِهِ قَدًّا ۝۱۹

میرے رب کی باتیں ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کے برابر اور سیاہی لے آئیں ۱۹

سے پہنچا، رسولوں کی معرفت آیا ہوا کلام ہم پڑھتے بھی ہیں اور سنتے بھی۔ [وَالْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَىٰ نِعْمِهِ السَّمِيعَةِ وَالْأَلْبَابِ الْكَامِلَةِ] ۱۹ یہاں انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ان عقل پرستوں نے صفات کا انکار کیوں کیا؟ پھر قرآن کے الفاظ کو مخلوق کہنے پر اتنا اصرار کیوں کیا کہ جو بھی قرآن کو مخلوق نہ کہے وہ ہر قسم کے سرکاری عہدے سے معزول ہے، حتیٰ کہ وہ نہ کسی مسجد کا خطیب ہو سکتا ہے نہ امام، نہ اپنے طور پر کسی مسجد میں پڑھا سکتا ہے، نہ درس دے سکتا ہے اور اہل السنہ، خصوصاً ان کے امام احمد ابن حنبل رضی اللہ عنہ نے اس کے انکار میں اتنی شدت کیوں کی اور اتنا عذاب کیوں جھیلایا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ خیر القرون گزرنے کے بعد عملی کمزوریوں کی وجہ سے طبائع قرآن و سنت پر عمل کی پابندیوں کو بوجھ سمجھنے لگیں، حکمرانوں کی مطلق العنانی میں بھی یہ دونوں چیزیں رکاوٹ تھیں، جیسا کہ ہم آج کل کے اکثر حکمرانوں اور ان کی اسلامی نظریاتی کونسلوں کے علماء کو دیکھتے ہیں۔ چنانچہ علمائے سوء نے عقل کا نام لے کر آزادی کی راہ میں رکاوٹ بننے والی ہر چیز کو راستے سے ہٹا دینے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انہی دنوں مامون الرشید نے یونانی کتابوں کے تراجم کروائے تھے۔ دنیاوی معاملات میں اپنے پیش رو لوگوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں، مگر ساتھ ہی یونانی فلسفے کا بھی ترجمہ ہوا تو اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی ان کے عقائد ان لوگوں پر اثر انداز ہوئے۔ چنانچہ محترمہ، یعنی عقل پرستوں نے ان کے کچھ بنیادی اصول تسلیم کر لیے، مثلاً ایک سے ایک ہی چیز کا صدور ہو سکتا ہے۔ محل حوادث حادث ہوتا ہے، یعنی جس سے کوئی نئی چیز وجود میں آئے وہ ذات قدیمہ، یعنی اللہ تعالیٰ نہیں ہو سکتا۔ لہذا اللہ تعالیٰ نہ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے، نہ بولتا ہے، نہ حرکت کر سکتا ہے، نہ وہ عرش پر ہے، نہ آسمان پر اترتا ہے، نہ قیامت کے دن زمین پر آئے گا، کیونکہ یہ سب حوادث ہیں۔ یہ عقائد قرآن و حدیث کا صاف انکار تھے، کیونکہ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر وقت نئی سے نئی حالت میں ہے، فرمایا: ﴿كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ [الرحمن: ۲۹] ”ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے۔“ وہ سمجھتا ہے، بصیر ہے، قیامت کے دن زمین پر آئے گا وغیرہ۔ ان لوگوں کے مقابلے میں مسلم علماء میں سے ایک تو متکلمین اٹھے جنہوں نے ان کا جواب دیا، مگر بد قسمتی سے ان کے اصول مان بیٹھے، چنانچہ انہوں نے فلاسفہ کے اصول بچانے کے لیے قرآن و حدیث کی تاویل بلکہ تحریف کی۔ کلام بھی چونکہ حادث ہے، یعنی ہر لفظ پہلے کے بعد نئے سے نیا آتا ہے اور ان کے بقول اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں کا محل نہیں، لہذا انہوں نے اللہ کے کلام کا انکار کرنے کے لیے تاویل کا سہارا لیا اور کہا کہ قرآن کے معانی قدیم ہیں، وہ تو اللہ کی ذات میں ہیں، مگر الفاظ مخلوق ہیں، اصل مفہوم جس زبان اور جن الفاظ میں بھی ادا ہو جائے وہی قرآن ہے۔ حدیث سے وہ پہلے ہی یہ کہہ کر جان چھڑا چکے تھے کہ حدیث سے قرآن پر اضافہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہ ان کے کہنے کے مطابق غیر فقہ صحابی کی روایت کردہ حدیث قیاس کے خلاف ہو تو رد کر دی جائے گی۔ رہا قرآن، تو اس میں من مانی تبدیلی کے لیے اس کے الفاظ کو اللہ کا کلام ماننے سے انکار کر دیا، صرف معنی و مفہوم کو قرآن قرار دیا۔ یہود و نصاریٰ میں بھی تحریف کا دروازہ یہیں سے کھلا کہ تورات و انجیل کے تراجم کو اللہ کا کلام کہہ دیا گیا، حتیٰ کہ اصل زبان والی کتابیں دنیا

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ ۚ فَمَن كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ

کہہ دے میں تو تم جیسا ایک بشر ہی ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، پس سے مفقود ہو گئیں۔ تراجم میں تبدیلی کچھ مشکل نہ تھی، لہذا اب وہ کتب اس قابل ہی نہیں رہیں کہ ان پر اعتماد کیا جاسکے۔ امام احمد ابن حنبل سنت ان کے عقلی ڈھکوسلوں کے مقابلے میں کہتے تھے کہ کوئی آیت یا حدیث پر وضو جس میں ہو کہ قرآن مخلوق ہے، ہم مان لیں گے۔ امام صاحب اسی پر قائم رہے۔ قرآن کے الفاظ ہی کو اللہ کا کلام کہنے پر ڈٹے رہے، جس کے نتیجے میں قرآن محفوظ رہا اور حدیث بھی حجت رہی۔ یہ ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ [الحجر: ۹] کے وعدے کی تکمیل تھی۔ ان لوگوں نے مسلمانوں سے ان کی معنوی قوت ختم کرنے کے لیے ایمان کو بھی صرف دل کا فعل قرار دیا، اقرار کو بھی صرف مسلمان تسلیم ہونے کے لیے ضروری قرار دیا، اقرار نہ بھی کرے تو لوگوں کے نزدیک نہ سہی اللہ کے ہاں پکا مؤمن ہے۔ اقرار کر لے، عمل نہ بھی کرے تو اللہ کے ہاں اور مسلمانوں کے ہاں پکا مؤمن ہے۔ یہ اہل سنت محدثین ہی تھے جنہوں نے اسلام پر ان حملوں کا دفاع کیا اور جو سختی بھی ان پر گزری اسے برداشت کیا۔ کتنے ہی اس امتحان میں ناکام ہوئے، کتنے شہادت پا کر سرخرو ہوئے۔ اب بھی قرآن و حدیث پر قائم رہنے والوں کا ایسے لوگوں سے مقابلہ جاری ہے جو قرآن کے الفاظ کو اللہ کا کلام نہیں مانتے، اللہ تعالیٰ کی صفات، سننے، دیکھنے، رحم کرنے، اترنے، چڑھنے، عرش پر ہونے کو نہیں مانتے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام کے ٹھیکیدار بھی بنے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ قرآن و سنت پر قائم علماء صریح دلائل سے ان لوگوں کے عقائد کا باطل ہونا بیان کرتے رہتے ہیں اور قرآن و حدیث پر ذرہ برابر آج آنے دیتے ہیں نہ ان میں کوئی لفظی یا معنوی تحریف برداشت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «بَرِئْتُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ حَلْفٍ عُدُوْهُ لَوْ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَأْوِيلَ الْحَاهِلِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَحْرِيفَ الْغَالِيْنَ» [السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۰۹/۱۰، ج: ۶۱۴۳۹] "قرآن و حدیث کے اس علم کے وارث بعد میں آنے والے تمام لوگوں میں سے ان کے وہ عادل لوگ ہوں گے جو اس سے جاہلوں کی تاویل، باطل پرستوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ اور غلو کرنے والوں کی تحریف کو دور کریں گے۔" [اللَّهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ]

آیت 110 ﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ.....﴾ اللہ کے کبھی ختم نہ ہونے والے کلمات میں سے تمام پیغمبر اور ہمارے نبی ﷺ جو کلمات لے کر آئے، کفار نے ان پر ایمان لانے سے اس لیے انکار کر دیا کہ انہیں لانے والے بشر تھے۔ ان کے خیال میں بشر اللہ کا رسول نہیں ہو سکتا تھا۔ دیکھیے سورۃ ابراہیم (۱۱) اور بنی اسرائیل (۹۳) کی تفسیر۔ عقل کے ان اندھوں کو دیکھو کہ احسن تقویم والے انسان کو اللہ کا رسول ماننے کے لیے تیار نہیں، مگر بے جان پتھروں کو معبود مان رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان سے کہہ دیجیے کہ میں تمہاری طرح ایک بشر ہونے کے سوا کچھ نہیں، نہ میں رب ہوں، نہ رب ہونے میں میرا کوئی حصہ ہے، نہ عالم الغیب ہوں، نہ اپنے یا تمہارے لیے کسی نفع یا نقصان کا مالک ہوں، بلکہ میں تمہاری طرح صرف ایک بشر ہوں، آدم علیہ السلام کی اولاد ہوں۔ میرے والدین بھی ہیں، بیوی بچے بھی، کھانے پینے کی اور دوسری بے شمار اشیاء کی محتاجی میں بھی تمہارا شریک ہوں۔ پیدائش، بچپن، جوانی، بڑھاپے، تندرستی، بیماری اور وفات سب میں تمہاری طرح ہوں، ہاں اللہ تعالیٰ

رَبِّهِ فَلْيُعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ۝

جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو لازم ہے کہ وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے ۱۱۰

کا مجھ پر احسان ہے کہ اس نے اپنے کلمات پہنچانے کے لیے مجھے وحی کا شرف عطا فرمایا ہے، جس کا اصل الاصول ایک اللہ کی عبادت ہے۔ سو تم میری نبوت مانو اور اللہ کی توحید پر ایمان لے آؤ۔

واضح رہے کہ قرآن مجید کے مطابق بشر ہوتا ہے، جسے اللہ رسالت کے لیے چن لیتا ہے۔ کوئی یہ کہے کہ بشر رسول نہیں ہو سکتا، یا یہ کہے کہ رسول بشر نہیں ہو سکتا، دونوں کا عقیدہ ایک ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ حافظ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ ”ان مشرکین سے جو آپ کی رسالت کو جھٹلاتے ہیں، کہہ دیجیے کہ میں محض تمہارے جیسا ایک بشر ہوں، پھر جو شخص سمجھتا ہے کہ میں جھوٹا ہوں تو جیسا کلام میں لے کر آیا ہوں وہ لے کر آئے، دیکھو میں نے عالم الغیب نہ ہوتے ہوئے ماضی کے جو واقعات (اصحاب کہف، ذوالقرنین وغیرہ کے) عین واقعہ کے مطابق تمہیں بتائے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ مجھے اطلاع نہ دیتا تو میں تمہیں کبھی نہ بتا سکتا۔“ یہ تفسیر بھی اچھی ہے۔

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ.....: ”يَرْجُوا“ ”رَجَاءً“ کا معنی امید ہے، اس کے ضمن میں خوف بھی ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ امید پوری نہ ہو۔ غرض اس کے معنی امید اور خوف دونوں کر لیے جاتے ہیں۔ بندے اور اس کے رب کے تعلق کو نمایاں کر کے فرمایا کہ جو اپنے رب کی ملاقات اور دیدار کی امید رکھتا ہے، یا اس سے ملاقات کے وقت اس کے عذاب سے ڈرتا ہے، اس کے لیے دو کام ضروری ہیں، پہلا یہ کہ وہ صالح عمل کرے اور صالح عمل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے سے بتایا ہے، اس کے علاوہ سب بدعت اور گمراہی ہے۔ دوسرا یہ کہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے، نہ کسی دوسرے کی عبادت کرے اور نہ ریا کاری کرے، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت اگر شرک اکبر ہے تو ریا کاری (دکھاوا) شرک اصغر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «قَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشُّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِيَ غَيْرِي تَرَكْتَهُ وَبَشَرْتَهُ» [مسلم، الزهد، باب تحريم الربا: ۲۹۸۵، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] ”اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے، میں تمام حصے داروں سے کہیں زیادہ (ہر قسم کے) حصے سے بے نیاز ہوں، جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے سوا کسی اور کو حصے دار بنایا تو میں اس عمل کو اور اس کے حصے کو چھوڑ دیتا ہوں۔“ یعنی میں وہ حصہ بھی قبول نہیں کرتا جو اس عمل میں سے اس نے میرے لیے کیا ہے، کیونکہ اس میں دوسرا بھی حصے دار ہوتا ہے، تو میں اپنا حصہ بھی چھوڑ کر اسی کو دے دیتا ہوں، اب وہ اس کا اجرا سی سے لے، میں تو صرف وہ عمل قبول کرتا ہوں جو سارے کا سارا میرے لیے ہو، کسی دوسرے کا اس میں حصہ نہ ہو۔ جناب ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: «مَنْ سَمِعَ سَمِعَ اللَّهُ بِهِ، وَمَنْ يُرَائِي يُرَائِي اللَّهُ بِهِ» ”جو شخص سنانے (شہرت) کی خاطر عمل کرے اللہ تعالیٰ (اس کی بدعتی) سب کو سنا دے گا اور جو لوگوں کو دکھانے کے لیے کوئی کام کرے گا اللہ تعالیٰ اسے سب لوگوں کو دکھا دے گا۔“ [بخاری، الرقاق، باب الربا والسمة: ۶۴۹۹]



كَهَيْعَص ۱ ۱ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكِرِيَّا ۲ اِذْ نَادَى رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا ۳

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کَهِيعَص ۱ تیرے رب کی اپنے بندے زکریا پر رحمت کا ذکر ہے ۲ جب اس نے اپنے رب کو چھپی آواز سے پکارا ۳

ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے، جو عیسائی تھا، جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کہا: ”جو کتاب محمد ﷺ پر نازل ہوئی ہے اس کا کوئی حصہ تمہیں یاد ہے تو مجھے پڑھ کر سناؤ۔“ چنانچہ جعفر رضی اللہ عنہ نے سورہ مريم کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا، اللہ کی قسم! اسے سن کر نجاشی رونے لگا، حتیٰ کہ اس کی ڈاڑھی تر ہو گئی اور جتنے پاروی اس کے پاس بیٹھے تھے وہ بھی رونے لگے، یہاں تک کہ ان کی کتابیں تر ہو گئیں، پھر نجاشی نے کہا: ﴿إِن هَذَا وَاللَّهِ! وَالَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ لِيُخْرِجَ مِنْ مِشْكَاةٍ وَاجِدَةٍ﴾ [مسند احمد: ۲۰۲/۱، ۲۰۳، ۲۰۴، ح: ۱۷۴۵، حسنہ محفوقہ] ”اللہ کی قسم! یہ کلام اور وہ کلام جو موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے ایک ہی مشکاۃ (روشنی کے طاق) سے نکل رہا ہے۔“

آیت ۱ کَهِيعَص: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی پہلی آیت کی تفسیر۔

آیت ۲ ۱ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكِرِيَّا: یہاں ”هَذَا“ مذروف ہے، یعنی یہ تیرے رب کی اپنے بندے زکریا پر رحمت کا ذکر ہے۔ رحمت سے مراد یہاں زکریا علیہ السلام کی دعا قبول کرنا اور انھیں سخت بڑھاپے اور بیوی بانجھ ہونے کے باوجود بچہ دینا جیسا عظیم مرتبے والا بیٹا عطا فرمانا ہے۔

۲ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿سَكَانَ زَكْرِيَّا نَحَارًا﴾ [مسلم، الفضائل، باب من فضائل زكريا عليه السلام: ۲۳۷۹] ”زکریا علیہ السلام نحر (ترکھان) تھے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ وہ داؤد علیہ السلام کی طرح اپنے ہاتھ کی کمانی سے کھاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿مَا أَكَلُ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ وَإِنَّ نَبِيَّ اللَّهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ سَكَانٌ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ﴾ [بخاری، البيوع، باب كسب الرجل و عمله بيده: ۲۰۷۲، عن المقدم عليه] ”کسی شخص نے کبھی اپنے ہاتھ کی کمانی سے بہتر نہیں کھایا اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمانی سے کھاتے تھے۔“

آیت ۳ ۱ اِذْ نَادَى رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا: اس آیت میں اس جگہ اور وقت کا ذکر نہیں جب ان کے دل میں اس دعا کا داعیہ پیدا ہوا۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ آل عمران (۳۷، ۳۸)۔

۲ نِدَاءً خَفِيًّا: چھپی آواز سے آہستہ آواز بھی مراد ہو سکتی ہے اور لوگوں سے الگ جگہ میں دعا بھی۔ اس کی وجہ بعض اہل علم نے یہ لکھی ہے کہ بڑھاپے میں بیٹا مانگتا لوگوں کی ہنسی کا باعث ہوتا، پھر اگر نہ ملتا تو لوگ مزید ہنستے، مگر صحیح بات یہ ہے کہ خفیہ دعا ریا کا امکان نہ ہونے کی وجہ سے افضل ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿أَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾ [الأعراف: ۵۵] ”اپنے رب کو گڑگڑا کر اور خفیہ طور پر پکارو۔“ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز کو قرار

قَالَ رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿٥﴾ وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَرَائِي وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ﴿٦﴾

کہا اے میرے رب! یقیناً میں ہوں کہ میری ہڈی کمزور ہو گئی اور سر بڑھاپے سے شعلے مارنے لگا اور اے میرے رب! میں تجھے پکارنے میں کبھی بے نصیب نہیں ہوا ﴿۵﴾ اور بے شک میں اپنے پیچھے قرابتداروں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی شروع سے بانجھ ہے، سو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا کر ﴿۶﴾

دیا۔ [مسلم، الصيام، باب فضل صوم المحرم: ۱۱۶۳، عن أبي هريرة رَضِيَ اللهُ عَنْهُ] اور اس شخص کو عرش کا سایہ پانے والے سات خوش نصیبوں میں شمار فرمایا جس نے خلوت میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں بہ پڑیں، حدیث کے الفاظ ہیں: «ذَكَرَ اللَّهُ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ» اسی طرح اس شخص کو بھی جس نے اس طرح چھپا کر صدقہ کیا کہ بائیں ہاتھ کو معلوم نہیں کہ دایاں کیا خرچ کر رہا ہے، حدیث کے الفاظ ہیں: «تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ» [بخاری، الزكوة، باب الصدقة باليمين: ۱۴۲۳]

آیت 4 ① قَالَ رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ "الْعَظْمُ" اگرچہ واحد ہے مگر مراد جنس ہے، یعنی میری جو ہڈی بھی ہے کمزور ہو گئی ہے۔ اگر جمع کا لفظ بولتے "الْعِظَامُ" یعنی ہڈیاں، تو اس سے ہڈیوں کا کوئی مجموعہ بھی مراد ہو سکتا تھا۔ "اشْتَعَلَ الرَّأْسُ" سارے سر کے بال سفید ہونے کو آگ کے شعلے مارنے سے تشبیہ دے کر آگ کا لفظ حذف کر دیا اور بڑھاپے کی وجہ سے سر کو شعلے مارنے والا بنا دیا، اسے استعارہ کہتے ہیں۔ ان الفاظ میں اپنی انتہائی کمزوری کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے، کیونکہ وہ کمزوروں پر زیادہ رحم فرماتا ہے۔ یہ دعا کے آداب میں سے ایک آداب ہے۔

آیت 5 ② وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا: "شَقِيًّا" بیگنی کے لیے ہوتا ہے، اس پر نفی آنے سے نفی کی بیگنی مراد ہوتی ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا، اس لیے ترجمہ "میں کبھی بے نصیب نہیں ہوا" کیا گیا ہے۔ اس میں اپنے آپ پر اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ لطف و کرم کا واسطہ دے کر دعا کی ہے، خصوصاً اس بات کا واسطہ دے کر کہ تو نے مجھے ہمیشہ دعا قبول ہو جانے کی عادت ڈال دی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا ذکر کر کے دعا کرنا بھی دعا کے آداب میں شامل ہے، جیسا کہ سورہ فاتحہ میں عرض مطلب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا﴾ [الأعراف: ۱۸۰] "اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، سو اسے ان کے ساتھ پکارو۔"

آیت 5 ① وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَرَائِي "الْمَوَالِيَ" کی جمع ہے۔ یہاں مراد قرہبی رشتے دار اور بچوں کے بیٹے ہیں جو اولاد نہ ہونے کی صورت میں وارث بنتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے ان میں سے کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو اس لائق ہو کہ میرے مرنے کے بعد بنی اسرائیل کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکے اور میرا اول یعقوب کا علمی و

يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ ۗ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ①

جو میرا وارث بنے اور آل یعقوب کا وارث بنے اور اے میرے رب! اسے پسند کیا ہو یا بنا ①

عملی وارث بن سکے، جس سے تیرے دین پر عمل اور اس کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رہ سکے، بلکہ مجھے ان سے خطرہ ہے کہ وہ دین کو بگاڑیں گے اور اپنی من مانیوں کریں گے، جیسا کہ سورہ اعراف (۱۶۹) میں بنی اسرائیل میں سے کتاب کے وارث بننے والے بعض لوگوں کا حال ذکر ہوا ہے۔

② بعض لوگ اس آیت کو انبیاء کی دنیاوی جائداد کی وراثت کی دلیل بتاتے ہیں، حالانکہ ان آیات ہی میں اس کا رد موجود ہے، کیونکہ ذکر یا علیؑ ایسے وارث کی دعا کر رہے ہیں جو ان کا اور آل یعقوب کا وارث بنے۔ ظاہر ہے کہ اولاد تو اپنے باپ کی دنیوی جائداد کی وارث ہوتی ہے، پورے خاندان اور قوم کی وارث نہیں ہوتی، اس لیے یہاں علمی ورثہ ہی مراد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا تُورَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةً)) [بخاری، فرض الخمس، باب فرض الخمس: ۳۰۹۳، عن ابی بکرؓ] [ہمارا (یعنی انبیاء کا) کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔] جو لوگ کہتے ہیں کہ ابو بکرؓ نے فاطمہؓ کو فدک اور دوسری جائدادوں میں سے ورثہ نہیں دیا، انھیں سوچنا چاہیے کہ انھوں نے آپ ﷺ کے چچا عباسؓ کو اور اپنی بیٹی عائشہؓ اور دوسری ازواج مطہرات کو بھی تو حصہ نہیں دیا اور دلیل کے طور پر یہ (مذکورہ بالا) حدیث پر بھی۔ پھر اگر انھوں نے حصہ نہیں دیا تو علیؓ ہی اپنی خلافت میں عباس اور حسن و حسینؓ کو اور امہات المؤمنین کو وہ حصہ دے کر اپنے فرض سے سبک دوش ہو جاتے، مگر ان کا ابو بکرؓ کے فیصلے پر کار بند رہنا اس حدیث کی عملی تائید و تصدیق ہے۔ مزید دیکھیے سورہ نمل کی آیت (۱۶)۔

③ وَكَانَتْ اِمْرَاَتِي عَاقِرًا : "عاقرا" وہ ہے جس کے ہاں اولاد نہ ہوتی ہو۔ یہ لفظ مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ "كانت" کا لفظ بیگانگی پر دلالت کرتا ہے، اس لیے ترجمہ "شروع سے بانجھ ہے" کیا گیا ہے۔ اتنے الحاح و اصرار سے اپنی ضرورت بیان کرنے کے بعد اپنی صلب سے وارث عطا کرنے کی دعا کی، جو ان کی اور آل یعقوبؑ کی نبوت، علم اور اوصاف حمیدہ کا وارث بنے۔

آیت 6 ④ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا : "رضيًّا" بمعنی "مفعول" ہے، مطلب پسند کیا ہوا، یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور لوگوں، سب کا پسندیدہ ہو۔ اللہ جسے پسند کر لے لوگ بھی اس سے محبت کرتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ الْعَبْدَ نَادَى جِبْرِيلُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ فَلَانًا فَأُحِبُّهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ فَيُنَادِي جِبْرِيلُ فِي أَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ فَلَانًا فَأُحِبُّهُ فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الْأَرْضِ» [بخاری، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة صلوات الله عليهم: ۳۲۰۹، عن ابی ہریرہؓ] [جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریلؑ سے کہتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تو بھی اس سے محبت کر، تو جبریلؑ بھی اس سے محبت کرتے ہیں، پھر

يُذَكِّرِيَا إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِعِلْمٍ اسْمُهُ يَحْيَىٰ ۚ لَمْ نُجْعَلْ لَهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ أَلَيْسَ لِي عِلْمٌ وَكَانَتْ أُمَّرَاتِي عَاقِرًا وَ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ قَالَ كَذَلِكَ ۚ قَالَ رَبِّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَ قَدْ خَلَقْتَنِي مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُنْ شَيْئًا ۝

اے زکریا! بے شک ہم تجھے ایک لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں، جس کا نام یحییٰ ہے، اس سے پہلے ہم نے اس کا کوئی ہم نام نہیں بنایا ۝ کہا اے میرے رب! میرے لیے لڑکا کیسے ہوگا جب کہ میری بیوی شروع سے بانجھ ہے اور میں تو بڑھاپے کی آخری حد کو پہنچ گیا ہوں ۝ کہا ایسے ہی ہے، تیرے رب نے فرمایا ہے یہ میرے لیے آسان ہے اور یقیناً میں نے تجھے اس سے پہلے پیدا کیا جب کہ تو کچھ بھی نہ تھا ۝

جبریل علیہ السلام آسمان والوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتے ہیں، سو تم بھی اس سے محبت کرو، تو آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔“

۲ ذکر یا علیہ السلام کی بیٹے کے لیے دعا ایک تو یہاں آئی ہے، ایک سورہ آل عمران (۳۸) میں اور ایک سورہ انبیاء (۸۹) میں۔ تینوں جگہ ہی الفاظ معانی کا خزینہ اور موتیوں کا گنبد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور بانجھ اور بوزھی بیوی کو اولاد کے قابل بنا کر یحییٰ علیہ السلام عطا فرمادے۔ (دیکھیے سورہ انبیاء ۹۰)۔

آیت 7 ۱ یُذَكِّرِيَا إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِعِلْمٍ اسْمُهُ يَحْيَىٰ : یہ بشارت دوران نماز ہی فرشتوں کے ذریعے سے مل گئی تھی۔ دیکھیے سورہ آل عمران (۳۹) اس میں یحییٰ علیہ السلام کی فضیلت دو پہلوؤں سے بیان کی گئی ہے، ایک یہ کہ ان کا نام اللہ تعالیٰ نے خود رکھا، دوسرے یہ کہ ان کا نام ایسا رکھا جو اس سے پہلے کسی کا نہیں تھا۔ عربی زبان میں ”یحییٰ“ کا معنی ”زندہ رہے“ ہے۔ ۲ اس سے معلوم ہوا کہ پیدائش سے پہلے بھی بچے کا نام رکھا جاسکتا ہے، ساتویں دن نام رکھنے کا حکم آخری حد ہے۔

آیت 8 ۱ قَالَ رَبِّ أَلَيْسَ لِي عِلْمٌ : ”عِتِيًّا“ ”عَتَا يَعْتُو عِتِيًّا“ بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ جانا۔ خشک لکڑی کو ”غاب“ اور ”غاسب“ کہتے ہیں، جو بھی بڑھاپے یا فساد یا کفر کی انتہا کو پہنچ جائے اسے ”غاب“ ”عَتَا يَعْتُو“ سے اسم فاعل) کہا جاتا ہے۔ (طبری) یہاں خیال پیدا ہوتا ہے کہ خود ہی دعا کی، پھر یہ پوچھنے کا کیا مطلب کہ میرے لیے لڑکا کیسے ہوگا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ ذکر یا علیہ السلام نے یہ سوال عام دستور کے خلاف بیٹے کی خوش خبری سن کر مزید اطمینان حاصل کرنے کے لیے غیر اختیاری طور پر کیا۔ اس کے علاوہ یہ سوال بے پناہ خوشی اور تعجب کے اظہار کی ایک شکل بھی ہو سکتا ہے۔ شاہ عبد القادر برکاتی لکھتے ہیں: ”انوکھی چیز مانگنے پر تعجب نہ ہوا، جب سنا کہ ملے گی تب تعجب کیا۔“ (موضح) بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ پوچھنا دراصل معلوم کرنے کے لیے تھا کہ بیٹا اسی بانجھ بیوی سے ہوگا یا کسی اور بیوی سے اور میرے بڑھاپے کا کیا بنے گا؟

آیت 9 ۱ قَالَ كَذَلِكَ : یعنی ایسے ہی ہے کہ تیرے بڑھاپے اور تیری اسی بیوی کے بانجھ پن کے باوجود تیرے ہاں

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۖ قَالَ آيَتُكَ إِلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝ فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۝ لِيُتَيَسَّرَ لَكُمْ خُذَ الْكِتَابِ بِقُوَّةٍ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝

کہا اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے۔ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تندرست ہوتے ہوئے لوگوں سے تین راتیں بات نہیں کرے گا ۱۰ تو وہ عبادت خانے سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آیا، پس انھیں اشارے سے کہا کہ پہلے اور پچھلے پہر تسبیح کرو ۱۱ اے یحییٰ! کتاب کو قوت سے پکڑ اور ہم نے اسے بچپن ہی میں فیصلہ کرنا عطا فرمایا ۱۲

لڑکا ہوگا، کیونکہ جس نے تجھے اس وقت پیدا کر لیا جب تو کچھ بھی نہ تھا تو اس کے لیے یہ کام تو بہت آسان ہے۔

آیت 10 ① قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً: یعنی کوئی ایسی نشانی بتا دے کہ ان حالات میں ہمارے ہاں لڑکے کی پیدائش ہونے والی ہو تو مجھے پہلے سے اس کا پتا چل جائے۔

② قَالَ آيَتُكَ إِلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ.....: ”سویًّا“ تندرست، صحیح اعضاء والا، نہ گونگا نہ بہرا۔ یہاں تین راتوں کا ذکر ہے، جبکہ سورہ آل عمران میں تین دنوں کا ذکر ہے، یعنی نشانی یہ ہے کہ تین دن رات صحیح سالم، تندرست ہوتے ہوئے تم لوگوں سے بات چیت نہ کر سکو تو سمجھ لو کہ حمل قرار پا گیا۔ لوگوں کے ساتھ کلام سے زبان بند ہو گئی تھی، اللہ کے ذکر اور تسبیح و تحمید سے نہیں۔ دیکھیے سورہ آل عمران (۴۱)۔

آیت 11 ① فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ: ”المِحْرَاب“ نماز کی جگہ، یادہ کمرہ جس میں وہ عبادت کیا کرتے تھے، یا مسجد، کیونکہ بنی اسرائیل کی مساجد کو ”مِحْرَابُ“ کہا جاتا تھا، کیونکہ وہ ایسے مقامات ہیں جن میں شیطانوں سے حرب (جنگ) کی جاتی ہے۔ (طنطاوی)

② فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا: یعنی حمل کی نشانی کے طور پر زبان بند ہو گئی تو اشارے سے لوگوں کو پہلے اور پچھلے پہر اللہ تعالیٰ کی تسبیح کا حکم دیا، کیونکہ خود انھیں علامت ظاہر ہونے پر اللہ کی طرف سے یہی حکم تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَذْكُرُ رَبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ﴾ [آل عمران: ۴۱] ”اور اپنے رب کو بہت یاد کر اور شام اور صبح تسبیح بیان کر۔“

آیت 12 ① لِيُتَيَسَّرَ لَكُمْ خُذَ الْكِتَابِ بِقُوَّةٍ.....: اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے بہت سی وہ باتیں چھوڑ دیں جو خود ہی سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، کچھ سمجھدار ہوئے تو والد کے جانشین کے طور پر تیار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ اے یحییٰ! تورات کو قوت کے ساتھ پکڑو، یعنی اسے حفظ کرو، معانی و مطالب سمجھو، اس پر عمل کرو اور اس کے احکام پوری قوت کے ساتھ اپنے آپ پر اور پوری قوم پر نافذ کرو۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں بچپن ہی میں فیصلہ کرنے کی

وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً ۖ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿۱۳﴾ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾
وَسَلَّمَ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾

اور اپنی طرف سے بڑی شفقت اور پاکیزگی (عطا کی) اور وہ بہت بچنے والا تھا ﴿۱۳﴾ اور اپنے ماں باپ کے ساتھ بہت نیک سلوک کرنے والا تھا اور وہ سرکش، نافرمان نہ تھا ﴿۱۴﴾ اور سلام اس پر جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن فوت ہوگا اور جس دن زندہ ہو کر اٹھایا جائے گا ﴿۱۵﴾

توت عطا فرمادی اور وہ نو عمری ہی میں اپنے والد کے علم و فضل، بنی اسرائیل کی سیادت اور وحی و نبوت کے وارث بن گئے اور پوری توت سے بنی اسرائیل کو تورات پڑھانے اور فیصلے کرنے لگے۔ والد کمزور تھے اور یہ نو جوان، سو والد کی جگہ لوگوں کو کتاب کا علم سکھانے لگے۔ اگر کوئی کہے کہ بچپن میں یہ کیسے ہو سکتا ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ نبوت کا سارا معاملہ خرق عادت یعنی دنیا کے عام معمول، عادت اور دستور کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے اس خرق عادت پر بھی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

آیت 13 وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا "حَنَانًا" کا عطف "الْحَكْمَ" پر ہے، یعنی ہم نے اسے حکم (توت فیصلہ) اور بڑی شفقت اور پاکیزگی عطا کی۔ "حَنَانًا" اور "زَكَاةً" پر تین تخم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "بڑی شفقت اور پاکیزگی" کیا ہے۔ پاکیزگی سے مراد اخلاق و کردار کی پاکیزگی ہے جو گناہوں سے بچنے سے حاصل ہوتی ہے۔ "تَقِيًّا" "وَفِي بَيْتِي" سے "فَعْبِلًا" کے وزن پر ہے، پہلی واؤ کو تاء سے بدل دیا گیا ہے، یعنی اللہ کی نافرمانی سے بہت بچنے والا تھا۔ "مِّن لَّدُنَّا" اپنے پاس سے، یعنی یہ حکم حنان اور زکوٰۃ کسی اور کے پاس ہیں ہی نہیں، صرف ہمارے پاس ہیں اور ہم ہی نے اپنے پاس سے انھیں عطا کیے۔

آیت 14 وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ آرزوؤں اور امنگوں سے پیدا ہونے والی اولاد عموماً مغرور، سرکش اور نافرمان ہوتی ہے، یہی اللہ ایسے نہ تھے، بلکہ ماں باپ کے ساتھ بہت نیک سلوک کرنے والے تھے۔ وہ نہ سرکش تھے اور نہ اپنے والدین یا اپنے رب کی نافرمانی کرنے والے تھے۔ ظاہر یہ ہے کہ "عَصِيًّا" "غَضِي يَعْبِسِي" سے "فَعُولٌ" کے وزن پر ہے، تعلیل کے بعد "عَصِيًّا" بن گیا۔ "فَعْبِلًا" کے وزن پر بھی ہو سکتا ہے، دونوں وزن مبالغہ کے لیے ہیں۔ (شنتظیلی)

آیت 15 ﴿۱﴾ وَسَلَّمْ عَلَيْهِ یعنی ان تینوں وقتوں میں وہ ہر پریشانی سے سلامت رہیں گے۔ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "اللہ جو بندے پر سلام کہے اس کا معنی یہ ہے کہ اس پر کچھ پکڑ نہیں۔" (موضح) سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "أَوْحَشُ مَا يَكُونُ الْخَلْقُ فِي ثَلَاثَةِ مَوَاطِنَ يَوْمَ يُؤَلَّدُ فَبِرَى نَفْسَهُ خَارِجًا مِمَّا كَانَ فِيهِ وَ يَوْمَ يَمُوتُ فَبِرَى قَوْمًا لَمْ يَكُنْ عَابِنَهُمْ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ فَبِرَى نَفْسَهُ فِي مَحْشَرٍ عَظِيمٍ قَالَ فَأَكْرَمَ اللَّهُ فِيهَا يَحْيَى بْنَ زَكَرِيَّا فَحَصَّه بِالسَّلَامِ عَلَيْهِ" [طبری : ۲۳۷۵۱، بسند صحیح] "آدی سب سے زیادہ خوف زدہ تین مواقع پر ہوتا ہے، جس دن پیدا ہوتا ہے اور اپنے آپ کو اس جگہ سے نکلنے ہوئے دیکھتا ہے جہاں وہ تھا اور جس دن فوت ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کو دیکھتا ہے جنہیں اس نے نہیں

وَأَذْكُرُ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۖ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا ۗ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ ﴿۱۶﴾

اور کتاب میں مریم کا ذکر کر، جب وہ اپنے گھر والوں سے ایک جگہ میں الگ ہوئی جو مشرق کی جانب تھی ﴿۱۶﴾ پھر اس نے ان کی طرف سے ایک پردہ بنا لیا تو ہم نے اس کی طرف اپنا خاص فرشتہ بھیجا تو اس نے اس کے لیے ایک پورے انسان کی شکل اختیار کی ﴿۱۶﴾

دیکھا تھا اور جس دن وہ زندہ کیا جائے گا اور اپنے آپ کو بہت بڑے محشر (اکٹھ) میں دیکھے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں وقتوں میں یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو عزت بخشی اور انھیں سلامت رکھنے کی خاص نعمت عطا فرمائی۔“

﴿۱۶﴾ یحییٰ علیہ السلام کے کچھ اوصاف حمیدہ اس سے پہلے سورہ آل عمران (۳۹) میں گزر چکے ہیں۔

آیت 16 ﴿۱۶﴾ وَأَذْكُرُ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ : زکریا اور مریم علیہما السلام کے واقعات میں مناسبت کی وجہ سے ان کا ذکر سورہ آل عمران (۳۵ تا ۴۰)، سورہ انبیاء (۲۱ تا ۳۹) اور یہاں اکٹھا آیا ہے، کیونکہ ان میں کئی طرح سے مناسبت ہے۔ مریم علیہا السلام کی کرامت بے موسم پھل دیکھ کر زکریا علیہ السلام کے دل میں بے وقت اولاد کی خواہش اور امید پیدا ہوئی۔ پھر زکریا علیہ السلام کو خلاف عادت پینا عطا ہوا اور مریم علیہا السلام کے ہاں ان سے بھی بڑھ کر خلاف عادت پینا پیدا ہوا۔ دونوں قصے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی دلیل ہیں۔

﴿۱۶﴾ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا : ”تنبذ“ کا معنی پھینکنا ہے۔ ”انْتَبَذَتْ“ الگ ہوئی، یعنی بالکل الگ ہو گئی، گویا اس نے اپنے آپ کو گھر والوں سے دور پھینک دیا۔ یاد رہے کہ مریم علیہا السلام کو ان کی والدہ نے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کیا تھا اور وہ اپنے بہنوئی زکریا علیہ السلام کی کفالت میں وہاں مصروف عبادت رہتی تھیں۔ حدیث معراج میں رسول اللہ ﷺ نے یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو خالہ زاد بھائی فرمایا۔ مریم علیہا السلام کی نیکی، پاکیزگی اور شرافت ضرب المثل تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿كَمُلُ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيرٌ وَلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا أَسِيَّةُ امْرَأَةٍ فِرْعَوْنُ وَمَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَإِنَّ فَضْلَ غَائِثَةَ عَلَيَّ مِنَ النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيدِ عَلَيَّ سَائِرِ الطَّعَامِ﴾ [بخاری، أحاديث الأنبياء، باب قوله تعالى: ﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا...﴾]

۳۴۱۱- مسلم [۲۴۳۶] ”مردوں میں بہت سے کمال ہوئے ہیں اور عورتوں میں سے کمال نہیں ہوئیں مگر فرعون کی بیوی آسیہ اور مریم بنت عمران اور عائشہ کی فضیلت عورتوں پر اس طرح ہے جیسے ثرید (گوشت کے ساکن میں جھگوٹی ہوئی روٹی) کی فضیلت تمام کھانوں پر۔“ علیحدہ ہونے کا مطلب بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ امام آنے کی وجہ سے الگ ہوئیں اور بعض نے فرمایا کہ عبادت کے لیے مکمل تہائی کی خاطر الگ ہوئیں، بظاہر ان دونوں میں سے کوئی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وجہ بیان نہیں فرمائی۔ اصل حقیقت وہی بہتر جانتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نصاریٰ نے مشرق کو اسی لیے قبلہ بنا لیا کہ مریم علیہا السلام کے ہاں مسجداً کی پیدائش بیت المقدس کی مشرقی جانب میں ہوئی۔ [طبری و صحیحہ ابن کثیر: ۲۳۷۵۷]

آیت 17 ﴿۱۷﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا : ایام سے فارغ ہونے پر غسل کے لیے پردہ اتار لیا، یا عبادت میں

قَالَتْ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتُ تَقِيًّا ۝۱۸ قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلٌ رَبِّكَ ؕ اِلٰهَابِ

لِكَ عَلْمًا زَكِيًّا ۝۱۹

اس نے کہا بے شک میں تجھ سے رحمان کی پناہ چاہتی ہوں، اگر تو کوئی ڈر رکھنے والا ہے ۝۱۸ اس نے کہا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں، تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں ۝۱۹

مکمل تنہائی کے لیے۔

۲) قَاۤرَسَلْنَاۤ اِلَيْهَا رُوْحًا: روح سے مراد یہاں جبریل علیہ السلام ہیں، جیسا کہ سورہ شعراء (۱۹۳) اور سورہ قدر (۴) میں انھی کے متعلق روح کا لفظ آیا ہے۔ اگرچہ ہر روح کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر جبریل علیہ السلام کو خاص طور پر اپنا قرار دینے میں ان کی شان کی بلندی کا اظہار ہے، جیسا کہ ہر گھر اور ہر اونٹنی اللہ کی ملکیت ہے، مگر بیت اللہ اور ناقۃ اللہ کی شان انوکھی ہے۔ اس لیے ”رُوْحًا“ کا ترجمہ ”اپنا خاص فرشتہ“ کیا ہے۔

۳) فَتَنَّاۤ لَهَاۤ بِشْرًا سَوِيًّا: ”سَوِيًّا“ پورے اعضا والا تندرست (انسان)۔ جبریل علیہ السلام انسان کی شکل میں اس لیے آئے کہ مریم علیہا السلام کے لیے انھیں ان کی اصل صورت میں دیکھنا شدید خوف کا باعث یا ناقابل برداشت ہوتا۔ ہمارے نبی ﷺ نے بھی اپنی زندگی میں جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں صرف دو بار دیکھا ہے۔ دیکھیے سورہ نجم (۱۸۳۵) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتے اللہ کے حکم سے اپنی شکل بدل سکتے ہیں۔

تیت 18: قَالَتْ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ: تنہائی میں ایک کامل حسین و جوان مرد کو دیکھ کر مریم علیہا السلام سخت گھبرا گئیں کہ کہیں اس کی نیت بری نہ ہو۔ اس لیے بچاؤ کا کوئی اقدام کرنے سے پہلے اس ذات کی پناہ پکڑی جس کے رحم کی کوئی حد نہیں، تاکہ وہ اپنی بندی پر رحم فرما کر اس کی عصمت محفوظ رکھے۔ ساتھ ہی اس مرد کو اللہ کا خوف دلایا کہ اگر تجھ میں اللہ تعالیٰ کا ذرا برابر بھی ڈر ہے تو میں تجھ سے رحمان کی پناہ پکڑتی ہوں۔ ”تَقِيًّا“ کو نکرہ لانے سے یہ مفہوم پیدا ہوا کہ اگر تجھ میں کسی بھی قسم کا اللہ کا خوف ہے، کیونکہ اللہ کا خوف انسان کو برائی سے ہٹا دیتا ہے۔

تیت 19: قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلٌ رَبِّكَ: جبریل علیہ السلام نے کہا کہ میں تو تیرے اسی رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں جس کی تو پناہ پکڑ رہی ہے، تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں۔ بعض شرک کے بیمار یہاں سے کشید کرتے ہیں کہ دیکھو! جبریل بیٹا دے سکتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ غور کرتے تو لفظ ”رَسُوْلٌ“ میں ان کی غلط فہمی کا علاج موجود ہے۔ قاصد کا اپنا کچھ نہیں ہوتا، اسے جو پیغام یا جو چیز دے کر بھیجا جاتا ہے وہ اسے وہاں پہنچا دیتا ہے جہاں اسے حکم ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ صاف الفاظ میں عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے کلمہ ”سُكُنْ“ کے ساتھ پیدا کرنے کا ذکر فرمایا، دیکھیے سورہ آل عمران (۵۹) چونکہ وہ چیز قاصد کے ہاتھ بھیجی گئی ہوتی ہے، اس لیے بعض اوقات وہ اس کی نسبت اپنی طرف کر دیتا ہے، جیسا کہ یہاں جبریل علیہ السلام نے پاکیزہ لڑکا عطا کرنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی، حالانکہ عطا وہ صحیحیے والے ہی کی تھی۔ مشہور سات قرآن میں سے ابو عمرو بن

قَالَتْ أَلَىٰ يَكُونُ لِي عُلْمٌ وَ لَمْ يَسْئُرِي بَشْرٌ وَ لَمْ أَكُ بَعِيًّا ۖ قَالَ كَذَلِكَ ۗ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّئٌ ۗ وَ لِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِنَّا ۗ وَ كَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ۖ

اس نے کہا میرے لیے لڑکا کیسے ہوگا، جب کہ مجھے نہ کسی بشر نے چھوا ہے اور نہ میں کبھی بدکار تھی ﴿۲۰﴾ اس نے کہا ایسے ہی ہے، تیرے رب نے کہا ہے یہ میرے لیے آسان ہے اور تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے بہت بڑی نشانی اور اپنی طرف سے عظیم رحمت بنائیں اور یہ شروع سے ایک طے کیا ہوا کام ہے ﴿۲۱﴾

الطاء بصری کی قراءت ”لِيَهَبَ لِكَ“ ہے، جس کا معنی ہے کہ میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں، تاکہ وہ تجھے ایک لڑکا عطا کرے۔ (ابن کثیر) جس طرح دوسرے چھ قاریوں کی قراءت کے صحیح ہونے پر امت کا اتفاق ہے اسی طرح ابو عمرو بن العلاء بصری کی قراءت صحیح ہونے پر بھی امت کا اتفاق ہے۔ اس قراءت سے دوسری قراءت کی بھی تفسیر ہوگئی کہ اصل عطا اللہ تعالیٰ کی ہے۔ رسول ہونے کی وجہ سے اس کی نسبت جبریل علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے۔

آیت 20: ﴿قَالَتْ أَلَىٰ يَكُونُ لِي عُلْمٌ : ”بَعِيًّا“ کا معنی زانیہ ہے، اس کی جمع ”بَعَايَا“ اور مصدر ”بَعَاءٌ“ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَكْرَهُوا قَتْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ [النور: ۳۲] ”اور اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔“ مریم علیہا السلام نے کہا کہ اولاد کے لیے تو مرد اور عورت کا ملنا ضروری ہے، جبکہ مجھے نہ کسی بشر نے نکاح کے ساتھ چھوا ہے اور نہ میں بدکار ہوں۔ ”لَمْ يَسْئُرِي بَشْرٌ“ میں اگرچہ نکاح یا زنا کسی بھی طریقے سے کسی مرد کے چھونے کی نفی ہے اور یہی معنی سورہ آل عمران (۴۷) میں مراد ہے، مگر یہاں زنا کے مقابلے میں آنے کی وجہ سے چھونے کا مطلب نکاح کے ساتھ چھونا ہے۔

آیت 21: ﴿قَالَ كَذَلِكَ﴾ جبریل علیہ السلام نے کہا، ایسے ہی ہوگا کہ نکاح یا زنا کے بغیر ہی تمہیں بیٹا عطا ہوگا۔

﴿قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّئٌ﴾ : مزید کہا کہ تیرے رب نے فرمایا ہے کہ کسی مرد کے بغیر تجھے بیٹا دینا میرے لیے بالکل آسان ہے۔

﴿وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ : واؤ کے بعد یہاں الفاظ محذوف ہیں، یعنی اور (ہم نے اس طرح کیا) تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کی بہت بڑی نشانی اور معجزہ بنائیں کہ ہم صرف عورت سے بھی انسان پیدا کر سکتے ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے تین نشانیاں موجود ہیں کہ ماں باپ کے بغیر انسان (آدم علیہ السلام)، ماں کے بغیر انسان (حواء علیہا السلام) اور ماں باپ دونوں کے ساتھ انسان۔ تینوں ہماری قدرت کاملہ کا اظہار ہیں، اب اس سے ہماری قدرت کی چوتھی نشانی بھی پوری ہوگئی۔ چاروں میں سے کوئی بھی اللہ کے سوا کسی کے بس میں نہیں۔ دوسری جگہ فرمایا، انسان تو دور، ایک مکھی پیدا کرنا بھی کسی کے بس میں نہیں۔ دیکھیے سورہ حج (۷۳) اس لحاظ سے ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت کی دلیل ہے۔

وَ فِي كُلِّ شَيْءٍ لَّهُ آيَةٌ تَدُلُّ عَلَىٰ أَنَّهُ وَاحِدٌ

شُرک کے پیاروں کو دیکھیے، وہ صحیح علیہ السلام کا خالق جبریل علیہ السلام کو قرار دے رہے ہیں۔ [فَالْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي عَاقَبَنَا مِنْ

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَدَّتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْرِ النَّخْلَةِ ۖ قَالَتْ

يَلَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا وَكُنْتُ نَسِيًّا مَّسِيًّا ﴿۲۳﴾

پس وہ اس (لڑکے) کے ساتھ حاملہ ہوگئی تو اسے لے کر ایک دور جگہ میں الگ چلی گئی ﴿۲۲﴾ پھر درد زہ اسے کھجور کے تنے کی طرف لے آیا، کہنے لگی اے کاش! میں اس سے پہلے مرجاتی اور بھولی بھلائی ہوتی ﴿۲۳﴾

بَيِّنَةُ الْإِشْرَاقِ بِهِ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ]

لَهُ وَرَحْمَةً مِنَّا : اور اسے اپنی طرف سے عظیم رحمت بنائیں بنی اسرائیل کے لیے اور قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے بھی، کیونکہ مسیح علیہ السلام نے محمد رسول اللہ ﷺ کی بشارت دی اور آپ پر ایمان لانے اور آپ کی پیروی کا حکم دیا، اس طرح وہ ان کے لیے جہنم سے نجات اور جنت میں داخلے کا باعث بنے۔ "آیۃ" اور "رَحْمَةً" میں تینوں تعظیم و تقییم کے لیے ہے، لہذا ترجمہ بہت بڑی نشانی اور عظیم رحمت کیا گیا ہے۔

وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا : "مَقْضِيًّا" "قَضَىٰ يَقْضِي" کا اسم مفعول ہے، جو اصل میں "مَقْضُوٰى" تھا، معنی فیصلہ کیا ہوا۔ "كَانَ" ہیئتگی کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "شروع سے طے کیا ہوا" کیا ہے، یعنی یہ بات تقدیر میں طے ہو چکی ہے، کسی طرح ٹل نہیں سکتی۔

آیت ۲۲ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَدَّتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا : "قَصِيًّا" "قَضَىٰ يَقْضِي قُضُوًا" "رَضِيَ يَرْضَىٰ" کی طرح ناقص واوی "عَلِمَ يَعْلَمُ" سے ہے۔ "قَصِيًّا أَيْ بَعِيدًا" یعنی دور۔ "فَحَمَلَتْهُ" جبریل علیہ السلام کے یہ کہنے اور ان میں روح پھونکنے کے بعد وہ حاملہ ہو گئیں۔ روح پھونکنے کی کیفیت کے لیے دیکھیے سورہ انبیاء (۹۱) اور سورہ تحریم (۱۲) حاملہ ہونے کے بعد فطری تقاضے کے مطابق حمل کی مدت پوری کرنے کے دوران لوگوں کے طعن و ملامت سے بچنے کے لیے وہ بیت المقدس سے دور ایک مقام پر منتقل ہو گئیں۔ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے وہب کا قول ذکر کیا ہے کہ وہ بیت اللحم میں منتقل ہوئیں، جو بیت المقدس سے آٹھ میل دور تھا اور وہیں عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ نصاریٰ اس میں کوئی شک نہیں کرتے۔ مگر وہب کا قول اسرائیلیات ہی سے ماخوذ ہے، نہ اس کے صحیح ہونے کا یقین ہو سکتا ہے اور نہ نصاریٰ کے کہنے کا۔ البتہ اکثر علماء کا کہنا یہی ہے۔ حمل کے کتنا عرصہ بعد عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ بس حمل ہونے کی دیر تھی کہ اس کے ساتھ ہی ولادت ہو گئی۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ بات کسی قابل اعتماد ذریعے سے نہیں آئی اور وحی الہی کے بغیر کسی واقعہ کے متعلق سیکڑوں برس بعد اگر کوئی شخص سنی سنائی بات بیان کرے تو خواہ وہ کتنا عظیم ہو، وہ بات یقین کی شہدک نہیں پہنچا سکتی۔ اس لیے ظاہر یہی ہے کہ حمل کی عام مدت پوری ہوئی اور جمہور مفسرین کا قول بھی یہی ہے۔

آیت ۲۳ ﴿۱﴾ فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ : "جَاءَ يَجِيءُ يَجِيءُ" کا معنی ہے آنا اور "أَجَاءَ يَجِيءُ" (افعال) کا معنی ہے لانا، مگر اس کے مفہوم میں مجبور کر کے لانا پایا جاتا ہے۔ (زمخشری) "الْمَخَاضُ" عورت کو بچے کی پیدائش کے وقت ہونے

فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَا تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾

تو اس نے اسے اس کے نیچے سے آواز دی کہ غم نہ کر، بے شک تیرے رب نے تیرے نیچے ایک ندی (جاری) کر دی ہے ﴿۲۴﴾

والادرد، یعنی درد زہ۔ ”مِخْضَتِ الْمَرْأَةِ“ (ع) جب عورت کے ہاں پیدائش کا وقت قریب ہو۔ یہ ”مِخْضُ“ سے ماخوذ ہے، جس کا معنی شدید حرکت ہے اور یہ نام رکھنے کی وجہ ولادت کے قریب ماں کے پیٹ میں بچے کا شدت سے حرکت کرنا ہے۔ یعنی درد زہ کی شدت سے مجبور ہو کر وہ کھجور کے ایک تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں اور آنے والے وقت کا تصور کر کے، جب ہر طرف سے برائی کی تہمت لگے گی، طعنے ملیں گے، گزشتہ زندگی کی ساری نیکی، پاک بازی اور شرافت کا خاکہ اڑایا جائے گا، کہنے لگیں کہ اے کاش! میں اس سے پہلے مر گئی ہوتی اور کسی کو یاد ہی نہ ہوتا کہ کوئی مریم بھی تھی۔

﴿۲۴﴾ یہ آیت دلیل ہے کہ دین میں فتنے کے وقت موت کی تمنا جائز ہے۔ حدیث میں کسی تکلیف مثلاً مرض یا فقر وغیرہ کی وجہ سے موت کی تمنا سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی شخص موت کی تمنا کسی تکلیف کی وجہ سے جو اسے پہنچے، ہرگز نہ کرے، اگر اسے ضرور ہی کرنی ہے تو یوں کہے: «اللَّهُمَّ أُحْيِي مَا سَكَنتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِي وَتَوَفِّي إِذَا سَكَنتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِي» [بخاری، المرضی، باب تعنی المریض الموت: ۵۶۷۱] ”اے اللہ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندہ رہنا میرے لیے بہتر ہو اور مجھے فوت کر لے جب وفات میرے لیے بہتر ہو۔“

آیت 24 فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا ”سَرِيًّا“ ”سَرِيًّا“ (ض) (چلنا) سے ہوتو معنی ہے ندی، کیونکہ اس میں پانی چلتا ہے اور ”سَرُوًّا يَسْرُوًّا“ (سَرَفٌ يَسْرُفُ) سے ہوتو معنی ہے سردار۔ مریم ؑ کو ان کے نیچے سے کس نے آواز دی؟ اس کے متعلق مفسرین کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ وہ جبریل ؑ تھے، کیونکہ عیسیٰ ؑ نے قوم کے طعن و ملامت کے وقت ہی بات کی تھی۔ طبری نے ابن عباس ؓ سے یہ بات نقل فرمائی ہے کہ یہ جبریل تھے اور عیسیٰ ؑ نے قوم کے پاس لے جانے سے پہلے کلام نہیں کیا۔ مگر یہ روایت عوفی کے طریق سے ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ سعید بن جبیر، ضحاک، عمرو بن میمون اور قتادہ کا کہنا بھی یہی ہے کہ انھیں نیچے سے جبریل ؑ نے آواز دی تھی اور ان کے نیچے ایک ندی چلنے کی بشارت دی تھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ انھیں ان کے نیچے سے عیسیٰ ؑ نے آواز دی تھی۔ ابن جریر نے اسے ترجیح دی ہے۔ اس کی تین وجہیں ہیں، ایک یہ کہ اگر کوئی مانع نہ ہو تو ضمیر قریب ترین مرجع کی طرف لوثی ہے اور یہاں اس سے پہلے قریب ترین ذکر عیسیٰ ؑ کا ہے، یعنی ”فَحَسْبَتْهُ فَإِنَّبَدَّتْ بِه“ اور اگر جبریل ؑ نے آواز دی ہوتی تو ان کا نام آتا تھا۔ دوسری یہ کہ اس وقت مریم ؑ کا حوصلہ مضبوط کرنے کی ضرورت تھی اور ظاہر ہے کہ عیسیٰ ؑ کا اس وقت بولنا ایک معجزہ تھا، جس سے انھیں اطمینان حاصل ہوا۔ تیسری یہ کہ قوم کے پاس جانے سے پہلے ان کے کلام کرنے سے مریم ؑ کو یقین ہو جائے کہ قوم کے لوگوں کی ملامت کے وقت بھی یہ بول کر ان کی تسلی کر دیں گے۔ بظاہر ابن جریر کی بات زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم)

وَهُزِّيَ إِلَيْكَ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسْقِطُ عَلَيْكَ رَطْبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِي وَاشْرَبِي
 وَقَرِي عَيْنًا ۖ وَآمَّا تَرَيْنَ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا ۖ فَقُوِي ۖ إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا
 فَلَنْ أَكَلِمَهُ الْيَوْمَ أَنْسِيًّا ﴿٢٦﴾

اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا، وہ تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں گرائے گی ﴿۲۵﴾ پس کھا اور پی اور ٹھنڈی آکھ سے رو،
 پھر اگر کبھی تو آدمیوں میں سے کسی کو دیکھے تو کہہ میں نے تو رحمان کے لیے روزے کی نذرمانی ہے، سو آج میں ہرگز
 کسی انسان سے بات نہیں کروں گی ﴿۲۶﴾

آیت 25-26 ﴿٢٥﴾ وَهُزِّيَ إِلَيْكَ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ : ”قَرِي عَيْنًا“ مشہور شعوی فراء نے فرمایا کہ قریش اور ان کے آس
 پاس کے لوگ ”قَرِي عَيْنًا“ (قاف کے فتح کے ساتھ) کہتے ہیں اور قیس، تمیم اور اہل نجد ”قَرِي عَيْنًا“ (قاف کے کسرہ کے ساتھ)
 کہتے ہیں۔ پہلی صورت میں ”قَرِي عَيْنًا“ قاف کے فتح کے ساتھ ہوگا جو مشہور قراءت ہے، دوسری صورت میں قاف کے کسرہ کے
 ساتھ ”قَرِي عَيْنًا“ ہوگا جو شاذ قراءت ہے۔ مصدر ”قَرِي عَيْنًا“ ہے، ٹھنڈا ہونا۔ (بقاعی) تنہائی، بھوک، پیاس، ولادت کی
 تکلیف، ولادت کے بعد کی کمزوری اور بدنامی کے خوف میں سے ہر چیز کا اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر بہترین علاج فرما دیا۔
 ایک کمزور خاتون جو ابھی ولادت کے جان شکن مرحلے سے نکلی ہو، کھجور کے تنے کو کس قدر حرکت دے سکتی ہے؟ مگر فرمایا کہ
 اسے حرکت دو، وہ تازہ پکی ہوئی کھجوریں تم پر گرائے گی۔ اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ وہ کھجوروں کے پھل دینے کا وقت نہ تھا۔
 ممکن ہے ایسا ہی ہو، کیونکہ مریم علیہا السلام کو ان کے کمرے میں بے موسم رزق ملتا تھا، تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ آل عمران (۳۷)
 لیکن اگر کھجوروں کے پھل کا موسم بھی مانا جائے تو کوئی جوان اور مضبوط آدمی کھجور کا تنا ہلا کر دیکھ لے کہ کتنی کھجوریں گرتی ہیں؟
 ولادت کی کمزوری کے لیے تمام اطباء تازہ پکی ہوئی کھجور کے مفید ہونے پر متفق ہیں۔ پینے کے لیے ان کے نیچے رب تعالیٰ نے
 ندی جاری فرمادی۔ تنہائی اور پریشانی کے علاج کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک، خوبصورت اور عظیم المرتبت بیاض عطا کیا اور سب سے
 بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی تمام عنایات عام عادت کے خلاف معجزانہ طور پر ہوئیں۔ رہی آئندہ کی ملامت جو قوم کے پاس جانے
 کی صورت میں پیش آنے والی تھی، اس کا علاج یہ بتایا گیا کہ اگر کسی بھی وقت کوئی آدمی دیکھو تو اسے اشارے سے کہہ دو کہ میں
 نے رحمان کی خاطر روزے کی نذرمانی ہے، اس لیے میں کسی انسان سے کسی صورت بات نہیں کروں گی۔ کسی بھی وقت کسی انسان
 کو دیکھنے کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے عمل کے دوران وہ تیار ہیں۔

﴿٢٦﴾ إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا : چونکہ شادی کے بغیر بچہ پیدا ہونے پر ملامت کرنے والوں کا کسی طرح کی صفائی دینے
 سے بھی مطمئن ہونا ممکن نہ تھا، اس لیے ان کے جواب میں مکمل خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ جاہلوں کے جواب میں دانش مند
 لوگوں کا یہی دتیرہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِذَا حَاطَبْتَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ [الفرقان: ۶۳] ”اور جب جاہل
 لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہے۔“ عربی کا مقولہ ہے: ”أَذَلُّ النَّاسِ سَفِيهَةٌ لَا يَجِدُ مُسَافِهَا“ کہ سب

فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحِيَّةً ۖ قَالُوا يَمْرَيْمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿۱۷﴾ يَاخْتِ هُرُونَ مَا كَانَ
أَبُوكَ أَمْرًا سَوْءًا ۖ وَمَا كَانَتْ أُمَّكَ يَغِيًّا ﴿۱۸﴾

پھر وہ اسے اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس لے آئی، انھوں نے کہا اے مریم! یقیناً تو نے تو بہت انوکھا کام کیا ہے ﴿۱۷﴾
اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں کوئی بدکار تھی ﴿۱۸﴾

سے زیادہ ذلیل وہ ہے وقف ہے جسے اپنے جواب میں کوئی بے وقوفی کرنے والا نہ ملے۔

﴿۱۷﴾ فَلَنْ أَكَلِمَةَ الْيَوْمَ انبِيَاً: اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل میں خاموشی کا روزہ رکھنا جائز تھا، مگر ہماری شریعت میں اس سے منع کر دیا گیا، بلکہ اس طرح کی نذر ماننا بھی منع ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: «بَيْنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ إِذَا هُوَ بِرَجُلٍ فَسَأَلَ عَنْهُ فَقَالُوا أَبُو إِسْرَائِيلَ نَذَرَ أَنْ يَقُومَ وَلَا يَقْعُدَ وَلَا يَسْتَظِلَّ وَلَا يَتَكَلَّمَ وَيَصُومَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّةً فَلَيْتَكَلَّمُ وَلَيْسْتَظِلَّ وَلَيْقَعُدَ وَلَيْتَمَّ صَوْمَهُ» [بخاری، الايمان والنسور، باب النذر فيما لا يملك و في معصية: ۶۷۰۴] ”نبی ﷺ خطبہ دے رہے تھے، اس دوران میں آپ نے ایک آدمی کو کھڑے ہوئے دیکھا تو اس کے متعلق پوچھا، لوگوں نے بتایا کہ یہ ابو اسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے کہ دھوپ میں کھڑا رہے گا، سائے میں نہیں جائے گا اور کلام نہیں کرے گا اور روزہ رکھے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اسے حکم دو کہ بیٹھ جائے اور سائے میں بھی جائے اور کلام کرے اور اپنا روزہ پورا کرے۔“ ”فَأَمَّا“ میں ”إِنْ“ شرطیہ اور ”مَا“ ابہامیہ برائے تاکید ہے، اس لیے ترجمہ ”اگر کبھی“ کیا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

آیت 27 ﴿۱۸﴾ فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحِيَّةً: اپنے بچے کی بات سن کر اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ کرامات دیکھ کر مریم رضی اللہ عنہا کو اطمینان ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اسے ذلیل نہیں ہونے دے گا۔ چنانچہ وہ ایام نفاس گزرنے اور طبیعت بحال ہونے کے بعد کسی تھجک کے بغیر اپنے بچے کو اٹھائے ہوئے اپنے لوگوں کے پاس آگئیں۔

﴿۱۹﴾ قَالُوا يَمْرَيْمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا: ”فَرِيًّا“ (ض) کا معنی چڑے کو قطع کرنا ہے۔ ”فَرِيًّا“ بروزن ”فَعِيلٌ“ بمعنی فاعل یا مفعول ہے، قطع کرنے والی یا قطع کی ہوئی، یعنی عام عادت اور معمول کے خلاف چیز، اس لیے اس کا معنی بعض نے عظیم، بعض نے عجیب اور بعض نے منکر یعنی انوکھی کیا ہے۔ بہتان کو بھی افترا کہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی واقعہ کے خلاف ہوتا ہے۔ لفظی معنی ہے ”تو ایک انوکھی چیز کو آئی ہے“ یعنی تو نے ایک انوکھا کام کیا ہے۔ مراد کنواری کے ہاں بچے کی پیدائش ہے۔

آیت 28 ﴿۱۸﴾ يَاخْتِ هُرُونَ مَا كَانَ أَبُوكَ أَمْرًا سَوْءًا.....: مریم رضی اللہ عنہا کے بھائی کا نام ہارون تھا جو اپنی منگی اور شرافت میں مشہور تھا، یعنی ایسے صالح بھائی کی بہن، ایسے باپ کی بیٹی جو کسی طرح برا نہ تھا اور ایسی ماں کی بیٹی جس میں بدکاری کی کوئی خصلت نہ تھی، تو نے یہ کیا گل کھلا دیا؟ ان الفاظ میں وہ مریم رضی اللہ عنہا کو اشارتاً برائی سے متہم کر رہے تھے۔ ”کسی طرح برا“ اور ”بدکاری کی کسی خصلت والی“ کا مفہوم ”اَمْرًا سَوْءًا“ اور ”يَغِيًّا“ کے نکرہ ہونے سے واضح ہو رہا ہے، جو عموم پر دلالت کرتا ہے۔

فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ - قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْأَرْحَامِ صَبِيًّا ۗ قَالَ إِنْ عِبَدُ اللَّهُ - أَتْنِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۗ

تو اس نے اس کی طرف اشارہ کر دیا، انھوں نے کہا ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی تک گود میں بچہ ہے ۱۴ اس نے کہا بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے ۱۵

۱۴ عظیم پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کے بھائی کا نام بھی ہارون تھا اور وہ بھی نبی تھے۔ اس آیت میں مذکور ہارون کو بعض اہل کتاب نے موسیٰ علیہ السلام کا بھائی ہارون سمجھ لیا اور اعتراض جڑ دیا کہ مریم علیہا السلام ہارون علیہ السلام کی بہن کیسے ہو سکتی ہیں، ان کے درمیان تو مدت دراز ہے۔ علمائے اسلام نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں، مثلاً یہ کہ ہارون علیہ السلام کی بہن سے مراد ہارون علیہ السلام جیسی نیک اور صالح خاتون ہے وغیرہ۔ مگر رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے بعد وہ سب جواب محض تکلف ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس آیت میں مذکور ہارون مریم علیہا السلام کے بھائی تھے۔ یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ موسیٰ و ہارون علیہ السلام کے والد بھی عمران تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ مریم اور ان کے بھائی ہارون کے والد بھی عمران تھے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے نجران بھیجا تو وہاں کے لوگوں (نصاری) نے کہا، یہ بتاؤ کہ تم جو پڑھتے ہو ”يَأْتِيكَتُّهُرُونَ“ (اے ہارون کی بہن!) موسیٰ علیہ السلام تو عیسیٰ علیہ السلام سے اتنی مدت پہلے تھے۔ میں واپس آیا اور اس بات کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: «الْأَخْبَرْتَهُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا يُسْتَمُونَ بِأَنْبِيَاءِهِمْ وَالضَّالِحِينَ قَبْلَهُمْ» [ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورة مریم: ۳۱۵۵۔ مسلم: ۱۲۱۳۵] ”تم نے انھیں یہ کیوں نہ بتایا کہ وہ لوگ اپنے سے پہلے انبیاء اور صالحین کے ناموں پر (اپنے بچوں کے) نام رکھتے تھے (یعنی مریم علیہا السلام کے بھائی کا نام ہارون، موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون علیہ السلام کے نام پر رکھا گیا تھا)۔“

آیت 29 فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ قَالُوا كَيْفَ..... : مریم علیہا السلام نے خاموشی کے روزے کی وجہ سے اپنی پاکدامنی کی شہادت کے لیے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے پوچھ لو۔ وہ سب کہنے لگے کہ ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی تک گود میں بچہ ہے؟ یہاں ”كَانَ“ زمانہ حال تک استمرار (بیٹھتی) کے معنی میں ہے۔ یہ آیت دلیل ہے کہ آئندہ آیات میں عیسیٰ علیہ السلام کی گفتگو گود کے وقت کی گفتگو ہے۔ معجزات کے بعض منکروں نے اسے عیسیٰ علیہ السلام کی جوانی کی گفتگو قرار دیا ہے، مگر یہ آیات اور سورہ آل عمران کی آیت (۳۶) عیسیٰ علیہ السلام کی گود میں گفتگو کی صریح دلیل ہیں۔ علاوہ ازیں صحیح حدیث میں تین بچوں کی گود میں گفتگو کا ذکر ہے جن میں سے ایک عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ [بخاری، احادیث الانبیاء، باب: ﴿وَإِذْ كَرَّمْنَا مَرْيَمَ...﴾ : ۳۱۶۶، عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہما]

آیت 29 ۱ قَالَ إِنْ عِبَدُ اللَّهُ : گویا سب سے پہلا کلمہ جو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زبان سے ادا کیا وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا اعتراف تھا، جو ان کے خود اللہ تعالیٰ ہونے یا اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہونے یا تین معبودوں میں سے ایک ہونے کی صاف نفی ہے۔

۲ أَتْنِي الْكِتَابَ : ظاہر ہے کہ کتاب اور نبوت کا ملنا کچھ مدت بعد ہی ہوا ہوگا، کیونکہ دودھ پیتا بچہ نبوت کے فرائض دعوت و

وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ ۝ وَأَوْصِنِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَبَرًّا

بِوَالِدَيْ ۝ وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ۝

اور مجھے بہت برکت والا بنایا جہاں بھی میں ہوں اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کی خاص تاکید کی، جب تک میں زندہ رہوں ۝ اور اپنی والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا (بنایا) اور مجھے سرکش، بد بخت نہیں بنایا ۝

تلخیص، اصلاح امت وغیرہ کیسے ادا کر سکتا ہے؟ اس لیے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی درست ہیں۔ ایک تو یہ کہ ازل سے اللہ تعالیٰ نے میرا نبی ہونا اور مجھے کتاب ملنا لکھ دیا ہے، جیسا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «كُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوحِ وَالْحَسَدِ» [صحیح الجامع للألبانی: ۴۵۸۱، عن مسیرة الفجر ﷺ] "میں اس وقت نبی تھا جب آدم ﷺ روح اور جسم کے درمیان تھے۔" حالانکہ اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کو چالیس برس کی عمر میں نبوت عطا ہوئی، اس لیے مراد تقدیر میں نبی لکھا ہونا ہے۔ دوسرا معنی یہ کہ ماضی کا لفظ بول کر مستقبل مراد لیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اتنے یقینی ہیں کہ سمجھو واقع ہو چکے ہیں۔ یہ انداز بیان قرآن مجید میں عام ہے، جیسے قیامت کے متعلق فرمایا: ﴿إِنِّي أَهْرُ اللَّهُ فَلَا تَسْتَعْجِلُونَا﴾ [النحل: ۱] "اللہ کا حکم آ گیا، سو اس کے جلدی آنے کا مطالبہ مت کرو۔" اسی طرح سورہ زمر کی آیت (۶۸) میں ماضی کے چاروں صیغے مستقبل کے معنی میں ہیں۔

آیت 31 ① وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ : "مُبْرَكًا" یہاں باب مفاعلہ مقابله کے معنی میں نہیں بلکہ مبالغہ کے لیے ہے، یعنی بہت برکت والا۔ برکت کا معنی خیر کثیر ہے جو "بِرْكَةٌ" سے ہے، جس کا معنی تالاب ہے جس میں بہت پانی ہوتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے لوگوں کے لیے بہت خیر و برکت اور نفع پہنچانے والا بنایا ہے۔

② وَأَوْصِنِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ : نماز اور زکوٰۃ کی خاص تاکید کی وجہ کے لیے دیکھیے سورہ توبہ (۱۱، ۵) اس آیت سے معلوم ہوا کہ نماز، زکوٰۃ اور شریعت کے دوسرے احکام موت تک کسی کو معاف نہیں۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کو بھی فوت ہونے تک عبادت کا حکم ہوا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾ [الحجر: ۹۹] "اور اپنے رب کی عبادت کر، یہاں تک کہ تیرے پاس یقین (موت) آجائے۔" موسیٰ علیہ السلام کو نبوت ملی تو وحید کی تاکید کے بعد نماز کا حکم ہوا۔ دیکھیے سورہ طہ (۱۳) ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے نماز کا پابند رہنے کی دعا کی۔ دیکھیے سورہ ابراہیم (۴۰) جب اولوالعزم پیغمبروں کو کسی صورت نماز معاف نہیں ہوئی تو بعض صوفیوں کو کیسے معاف ہو گئی اور پیغمبروں کو صرف دل کی نماز کافی نہیں ہوئی تو انہیں کیسے کافی ہو گئی؟ درحقیقت یہ لوگ اسی سورہ مریم کی آیت (۵۹) کی حقیقی تصویر ہیں۔

③ چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے یہ بات موجود تھی کہ کچھ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو معبود بنائیں گے، اس لیے انہیں ساری زندگی نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا، تاکہ سب لوگ جان لیں کہ جو خود کسی معبود کے سامنے نماز پڑھتا ہے وہ کسی صورت معبود نہیں ہو سکتا۔ (بقائے)

آیت 32 ① وَبَرًّا بِوَالِدَيْ ۝ : دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۳) وہاں "عَصِيًّا" فرمایا اور یہاں "شَقِيًّا" معلوم ہوا کہ

وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَ يَوْمَ أَمُوتُ وَ يَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ﴿٣٣﴾ ذَلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٣٤﴾

اور خاص سلامتی ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن فوت ہوں گا اور جس دن زندہ ہو کر اٹھایا جاؤں گا ﴿۳۳﴾ یہ ہے عیسیٰ ابن مریم۔ حق کی بات، جس میں یہ شک کرتے ہیں ﴿۳۴﴾

والدین سے بدسلوکی کرنے والا شقی اور بد نصیب ہے، خصوصاً ایسی والدہ سے جو باپ اور ماں دونوں کی جگہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «رَغِمَ أَنْفٌ ثُمَّ رَغِمَ أَنْفٌ ثُمَّ رَغِمَ أَنْفٌ قِيلَ مَنْ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ مَنْ أَدْرَكَ أَبُوَيْهِ عِنْدَ الْكَبِيرِ أَحَدَهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا فَلَمْ يَدْخُلِ الْحَنَّةَ» [مسلم، البر والصلة، باب رَغِمَ مَنْ أَدْرَكَ أَبُوَيْهِ أَوْ أَحَدَهُمَا..... : ۲۵۵۶، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] "اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو!" پوچھا گیا: "یا رسول اللہ! کون؟" فرمایا: "جس نے اپنے والدین میں سے ایک کو یا دونوں کو بڑھاپے میں پایا پھر جنت میں داخل نہ ہوا۔" جنت میں داخلے سے محروم ہو جانے سے بڑھ کر کیا بد بختی ہوگی؟

﴿۳۳﴾ عیسیٰ علیہ السلام نے صرف والدہ کا نام لیا، تاکہ لوگوں کو ان کے باپ کے بغیر پیدا ہونے کا یقین ہو جائے اور والدہ کا ہر تہمت سے پاک ہونا ثابت ہو جائے۔

آیت 33 ﴿وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ.....﴾: دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۵) وہاں "سَلَّمَ" اور یہاں "السَّلَامُ" ہے، اس لیے ترجمہ "خاص سلامتی" کیا ہے۔ اس خاص سلامتی میں وہ خصوصیت بھی شامل ہے جو صرف عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو حاصل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا مِنْ مَوْلُودٍ يُوَلَّدُ إِلَّا وَالشَّيْطَانُ يَمْسُهُ حِينَ يُوَلَّدُ فَيَسْتَهْلُ صَارِخًا مِنْ مَسِّ الشَّيْطَانِ إِلَّا مَرْيَمَ وَأَنَّهَا تَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ وَأَقْرَأُوا إِنْ شِئْتُمْ: ﴿وَإِنِّي أُعِينُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾» [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿وَإِنِّي أُعِينُهَا بِكَ...﴾ : ۴۵۴۸، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] "کوئی بچہ نہیں مگر اس کا حال یہ ہے کہ شیطان اسے پیدا ہوتے وقت چھوتا ہے تو وہ اس کے چھونے کی وجہ سے چلاتے ہوئے اونچی آواز سے روتا ہے، سوائے مریم کے اور اس کے بیٹے کے۔" پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے: "اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ﴿وَإِنِّي أُعِينُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾" (یعنی مریم علیہا السلام کی والدہ نے دعا کی تھی کہ یا اللہ!) میں اس (مریم) کو اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔"

آیت 34 ﴿ذَلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ.....﴾: "قَوْلَ الْحَقِّ" اصل میں "الْقَوْلُ الْحَقُّ" تھا، یعنی وہ بات جو حق اور سچ ہے، تخفیف کے لیے موصوف کو صفت کی طرف مضاف کر دیا، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سچ بات صرف وہ ہے جو یہاں خود ان کی زبانی بیان کر دی گئی کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے سچے رسول ہیں اور ان کا نسب ہر شک و شبہ اور ہر عیب سے پاک ہے۔ رہے ان کی والدہ اور ان پر تہمت تراشنے والے یہود اور انھیں رب قرار دینے والے نصاریٰ، تو ان کی بات محض شکوک و

مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَكَيْدٍ سُبْحَانَهُ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۳۵﴾ وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَأَعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿۳۶﴾ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۳۷﴾

کبھی اللہ کے لائق نہ تھا کہ وہ کوئی بھی اولاد بنائے، وہ پاک ہے، جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اس سے صرف یہ کہتا ہے کہ ”ہوجا“ تو وہ ہو جاتا ہے ﴿۳۵﴾ اور بے شک اللہ ہی میرا رب اور تمہارا رب ہے، سو اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے ﴿۳۶﴾ پھر ان گروہوں نے اپنے درمیان اختلاف کیا تو ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا، ایک بہت بڑے دن کی حاضری کی وجہ سے بڑی ہلاکت ہے ﴿۳۷﴾

شبہات پر مبنی ہے، اس میں حق کا کوئی شاہ نہیں۔

آیت 35 ﴿۱﴾ مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَكَيْدٍ : ”کان“ استمرار کے لیے ہے، یعنی اللہ کے لائق نہ پہلے کبھی تھا اور نہ ہے کہ وہ کوئی بھی اولاد بنائے۔ ”وکید“ نکرہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ تھا ”کوئی اولاد“ لیکن اس سے پہلے ”من“ آنے کی وجہ سے عموم اور زیادہ ہو گیا، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”کہ وہ کوئی بھی اولاد بنائے“ لڑکا یا لڑکی، کسی فرشتے کو یا جن کو، یا انسان کو یا کسی اور مخلوق کو۔

آیت 36 ﴿۲﴾ يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ : یعنی جسے یہ قدرت حاصل ہو کہ کلمہ ”کن“ سے ہر چیز وجود میں لاسکتا ہو، اسے بیٹا بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ بیٹے کی ضرورت تو اسے ہے جو بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے محتاج ہو، یا فنا ہونے والا ہو اور اسے وارث کی ضرورت ہو۔ مزید دیکھیے سورہ بنی اسرائیل کی آخری آیت۔ پھر جب وہ آدم کو ”سکن“ کہہ کر پیدا کر سکتا ہے تو عیسیٰ علیہ السلام کو بھی آدم علیہ السلام کی طرح ”کن“ کہہ کر پیدا کر سکتا ہے، دیکھیے سورہ آل عمران (۶۰، ۵۹)۔

آیت 36 : ﴿۳﴾ وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ : یہ گود میں عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کا آخری حصہ اور خلاصہ ہے۔ اس کا عطف ”قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ“ پر ہے، یعنی انہوں نے کہا کہ بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس کے بعد اللہ کی عطا کردہ نعمتیں بیان کیں، درمیان میں ”ذَلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ“ سے ”كُنْ فَيَكُونُ“ تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے جملہ معترضہ ہے، پھر عیسیٰ علیہ السلام کی اس بات ”وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ“ پر ان کا کلام مکمل ہوتا ہے۔ یعنی عبادت اسی کا حق ہے جو ہمارا رب ہے، میری اور تمہاری پرورش کرنے والا ہے، سو اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

آیت 37 ﴿۱﴾ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ : عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق حق بات تفصیل سے بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ پھر بنی اسرائیل سے باہر کے کسی گروہ نے نہیں بلکہ خود ان کے اپنے گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ ”مِنْ بَيْنِهِمْ“ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ یہود نے انہیں ولد الزنا اور جادوگر قرار دیا اور نصاریٰ کئی گروہوں میں بٹ گئے، کسی نے کہا اللہ مسیح ہی تو

أَسْمِعْ بِهِمْ وَ أَبْصِرْ يَا تَوْنَنَا لَكِن الظُّلْمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳۸﴾

کس قدر سننے والے ہوں گے وہ اور کس قدر دیکھنے والے، جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے، لیکن یہ ظالم آج کھلی گمراہی میں ہیں ﴿۳۸﴾

ہے۔ (مائدہ: ۷۲) کسی نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ (توبہ: ۳۰) کسی نے کہا مسیح تین (معبودوں) میں سے تیسرا ہے وغیرہ۔ مائدہ (۷۳) یہود نے ان کی شان گھٹانے کی کوشش کی تو نصاریٰ نے انھیں ان کی حد سے بڑھا دیا۔ ہاں اہل حق نے بھی کہا کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ یہود ان کی شان گھٹانے اور ان پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے کافر ہو گئے اور نصاریٰ ان کی شان میں غلو کی وجہ سے کافر ہو گئے، البتہ اہل حق ایمان پر قائم رہے۔

﴿۲﴾ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا..... : ”فَوَيْلٌ“ پر توین (تہویل) یعنی اس کی ہولناکی کے اظہار کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”بڑی ہلاکت“ کیا ہے۔ ”فَشْهَدٌ“ یہاں راجح قول میں مصدر یہی ہے، یعنی اس عظیم دن میں حاضری کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے بہت بڑی ہلاکت ہے جنھوں نے کفر کیا، اگر اس دن کی حاضری نہ ہوتی تو یہ لوگ اس ہلاکت سے بچ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف ”ان لوگوں کے لیے“ کہنے کے بجائے صراحت سے فرمایا: ”ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا بہت بڑی ہلاکت ہے۔“ معلوم ہوا کہ اس ویل کا باعث کفر ہے۔ یوم عظیم پچاس ہزار سال کا دن (معارض: ۴) اور اللہ کے سامنے حساب کے لیے پیش ہونے کا دن ہے۔ [اللَّهُمَّ حَاسِبُنَا حِسَابًا يَسِيرًا]

آیت 38 : أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ..... : یہ دونوں فعل تعجب ہیں۔ اللہ تعالیٰ تعجب سے فرماتے ہیں کہ جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے تو وہ کس قدر سننے والے اور کس قدر دیکھنے والے ہوں گے۔ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے تعجب کرنے کو نہیں مانتے، کیونکہ تعجب تو انسان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ انسان جیسا تو نہیں کہ تعجب کرے۔ اس لیے وہ اس کی تاویل کرتے ہیں کہ ان کی حالت ایسی ہوگی کہ اس پر تعجب کیا جائے، اگرچہ ان کی حالت واقعی ایسی ہوگی مگر جب انسان کے سننے، دیکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کو بھی سننے دیکھنے والا مانتے ہیں تو اس کے تعجب کرنے میں کیا تعجب ہے۔ ہاں انسان کا سننا، دیکھنا اور تعجب اس کی ہستی کے مطابق ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا اس کی شان کے مطابق، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [النور: ۱۱] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔“ لطف کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعجب کرنے کے منکر اس کے سنجیدہ و بصیر ہونے اور دوسری صفات کے بھی منکر ہیں، مگر انکار ایسی تاویل کے پردے میں کرتے ہیں جو درحقیقت آیات و احادیث کی تحریف ہے۔ یعنی آج تو حق سے اندھے اور بہرے ہو رہے ہیں مگر آخرت میں ان کے کان اور آنکھیں خوب کھلی ہوں گی اور کہیں گے: ﴿رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا﴾ [السجدة: ۱۶] ”اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا،“ مگر اس وقت کا دیکھنا اور سننا کسی کام نہ آئے گا۔ ”الظُّلْمُونَ“ پر الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ ”یہ ظالم“ کیا گیا ہے۔

وَأَنْذَرَهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٩﴾
 إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِنَّا يُرْجِعُونَ ﴿٤٠﴾

۳۹

اور انہیں بچھتاوے کے دن سے ڈرا جب (ہر) کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۳۹﴾ بے شک ہم، ہم ہی زمین کے وارث ہوں گے اور ان کے بھی جو اس پر ہیں اور وہ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿۴۰﴾

آیت 39 ① وَأَنْذَرَهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ..... مراد قیامت کا دن ہے جس میں حسرت اور بچھتاوے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ زمر (۵۶)، انعام (۳۱) اور بقرہ (۱۶۷)۔

② إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ..... ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يُؤْتَى بِالْمَوْتِ كَهَيْئَةِ كَبِشٍ أُمْلَحَ فَيُنَادِي مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْحَنَةِ! فَيَسْرَبُونَ وَ يَنْظُرُونَ فَيَقُولُ هَلْ تَعْرِفُونَ هَذَا؟ فَيَقُولُونَ نَعَمْ هَذَا الْمَوْتُ وَكُلُّهُمْ قَدْ رَأَاهُ ثُمَّ يُنَادِي يَا أَهْلَ النَّارِ! فَيَسْرَبُونَ وَ يَنْظُرُونَ فَيَقُولُ هَلْ تَعْرِفُونَ هَذَا؟ فَيَقُولُونَ نَعَمْ، هَذَا الْمَوْتُ وَكُلُّهُمْ قَدْ رَأَاهُ فَيُدْبِحُ ثُمَّ يَقُولُ يَا أَهْلَ الْحَنَةِ! خُلُودٌ فَلَا مَوْتَ وَ يَا أَهْلَ النَّارِ! خُلُودٌ فَلَا مَوْتَ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَ أَنْذَرَهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ﴾ وَهُوَ لَاءِ فِي غَفْلَةٍ أَهْلُ الدُّنْيَا ﴿وَ هُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾» [بخاری، التفسیر، باب فوله عز وجل: ﴿وَ أَنْذَرَهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ﴾: ۴۷۳۰]

”موت کو ایک چسکبرے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا، پھر ایک آواز دینے والا آواز دے گا: ”اے جنت والو! تو وہ سر اٹھائیں گے اور دیکھیں گے۔ وہ کہے گا: ”کیا تم اسے پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں! یہ موت ہے“ اور وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے، پھر وہ آواز دے گا: ”اے آگ والو! تو وہ سر اٹھائیں گے اور دیکھیں گے، وہ کہے گا: ”کیا تم اسے پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں! یہ موت ہے“ اور وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے تو اسے ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر وہ کہے گا: ”اے جنت والو! (اب) بیٹھتی ہے، کوئی موت نہیں اور اے آگ والو! (اب) بیٹھتی ہے، کوئی موت نہیں۔“ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَ أَنْذَرَهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ﴾ (اور انہیں بچھتاوے کے دن سے ڈرا جب فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں) یعنی وہ سراسر دنیا کی غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔“ نبی ﷺ کا موت کے ذبح کے ذکر کے بعد اس آیت کو پڑھنا دلیل ہے کہ ”قُضِيَ الْأَمْرُ“ (فیصلہ کر دیے جانے) سے مراد موت کا ذبح کر دیا جانا ہے۔ مسند احمد (۹/۳، ج: ۱۱۰۷۲) میں اسی حدیث کے شروع میں ہے کہ جب (تمام) جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے۔

آیت 40 ① إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ..... اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے اپنا ذکر تین دفعہ جمع متکلم کی ضمیر سے کیا ہے۔ دنیا کے بادشاہ بھی حکم دیتے وقت یا اپنی شان و شوکت کے اظہار کے وقت کہا کرتے ہیں کہ ”ہم حکم دیتے ہیں“ ”ہم یہ کریں گے“ وغیرہ، حالانکہ وہ اکیلے حکم دے رہے ہوتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ جس کی عظمت کی کوئی حد نہیں، اکیلا

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِبْرَاهِيمَ ۗ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذْ قَالَ لِاٰبِيهِ يَا بُتِّ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا ﴿۴۲﴾

اور اس کتاب میں ابراہیم کا ذکر کر، بے شک وہ بہت سچا تھا، نبی تھا ﴿۴۱﴾ جب اس نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ! تو اس چیز کی عبادت کیوں کرتا ہے جو نہ سنتی ہے اور نہ دیکھتی ہے اور نہ تیرے کسی کام آتی ہے؟ ﴿۴۲﴾

ہونے کے باوجود اپنی عظمت کے اظہار کے لیے کیوں نہ فرمائے گا کہ بے شک ہم، ہم ہی زمین کے وارث ہوں گے۔ اردو ترجمے میں ”ہی“ کا لفظ تیسرے ”ہم“ کی جگہ لگایا گیا ہے، جو لفظ ”نِدْبَتْ“ میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سب فنا ہو جائیں گے اور ہمارے سوال کا وارث (پیچھے رہنے والا) کوئی نہ ہوگا۔

آیت 41 ﴿۴۱﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِبْرَاهِيمَ : اس سورت کا اصل موضوع توحید و نبوت اور حشر کے واقعات بیان کرنا ہے۔ توحید کے منکر و قسم کے لوگ تھے، ایک یہود و نصاریٰ جنہوں نے عیسیٰ اور عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دے لیا اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو گئے، چنانچہ پچھلی آیات میں مریم اور مسیح علیہ السلام کا قصہ بیان کر کے ان کے غلط عقائد کی تردید فرمائی۔ دوسرے مشرکین عرب، جو بت پرستی میں مبتلا تھے اور اس غلط عقیدے کے باوجود ابراہیم علیہ السلام کے دین پر قائم ہونے کے دعوے دار تھے۔ یہاں سے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کر کے ان کی تردید مقصود ہے، تاکہ معلوم ہو کہ کس طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور قوم کو بت پرستی سے نکالنے کی کوشش کی اور بالآخر وطن اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر اللہ کی راہ میں ہجرت کی، مگر تم ہو کہ ایک طرف تو ان کی اولاد میں سے ہو اور ان کے دین پر ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہو، لیکن دوسری طرف بت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو اور توحید کی آواز اٹھانے والوں کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کر رہے ہو۔ اگر واقعی تم ابراہیم علیہ السلام کے دین کے پیرو ہو تو اس شرک پر عمل پیرا ہونے اور توحید پرستوں سے دشمنی کا کیا مطلب؟

آیت 42 ﴿۴۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا : ”صِدِّيقًا“ ”صدق“ سے ماخوذ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو صدیق اس لیے فرمایا کہ وہ بات میں بہت سچے تھے اور اپنے رب کے ساتھ معاملے میں بھی سچے تھے۔ اللہ کی خاطر گھر سے بے گھر ہونا، آگ میں جلنے کو گوارا کرنا، وطن سے بے وطن ہونا، پردیس میں اپنی عزت و ناموس کے خطرے میں ہونے کو برداشت کرنا، بیوی بچے کو بے آباد و مستغلاخ وادی میں چھوڑنا، اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے کے حکم کی تعمیل، اسی (۸۰) برس کی عمر میں تختے کا حکم ہونے پر فوراً عمل کرنا، یہ ان کے ہر معاملہ میں صدق کی چند مثالیں ہیں۔ ”صِدِّيقًا“ کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ نساء (۶۹) اور یوسف (۴۶)۔

آیت 42 ﴿۴۲﴾ ”يَا بُتِّ“ کے معنی کے لیے دیکھیے سورہ یوسف (۴)۔

آیت 43 ﴿۴۳﴾ اِذْ قَالَ لِاٰبِيهِ يَا بُتِّ لِمَ تَعْبُدُ : اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کا والد بت پرست تھا۔ مزید دیکھیے سورہ انعام (۷۴) ابراہیم علیہ السلام نے اسے نہایت ادب، نرمی، حسن اخلاق اور بہترین دلائل کے ساتھ بت پرستی ترک کرنے کی نصیحت کی کہ کہیں وہ بڑے پن اور ضد میں آکر حق سے انکار نہ کر دے۔ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے اس سے ان بتوں کو پوجنے کی وجہ پوچھی

يَا بَتِ اِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْ اِهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿٣٣﴾ يَا بَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ۗ اِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿٣٤﴾

اے میرے باپ! بے شک میں، یقیناً میرے پاس کچھ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا، اس لیے میرے پیچھے چل، میں تجھے سیدھے راستے پر لے جاؤں گا ﴿۳۳﴾ اے میرے باپ! شیطان کی عبادت نہ کر، بے شک شیطان ہمیشہ سے رحمان کا سخت نافرمان ہے ﴿۳۴﴾

کہ جن کی کسی عقل مند کے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، کجا یہ کہ ان کی عبادت کی جائے، جو تعظیم، محبت اور عاجزی کا انتہائی مرتبہ ہے۔ کیونکہ عبادت تو اس کی ہونی چاہیے جو ہر طرح سے دوسروں سے غنی ہو، کسی کا محتاج نہ ہو، سب نعمتوں کا مالک ہو، سب کو پیدا کرنے والا، رزق دینے والا ہو، زندگی، موت، ثواب اور عذاب کا مالک ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے اسے توجہ دلائی کہ صاحب عقل کو لازم ہے کہ جو بھی کرے کسی صحیح مقصد کے لیے کرے۔ کوئی بھی چیز یا شخص جو زندہ ہو، صاحب عقل ہو، ستاد دیکھتا ہو، کوئی فائدہ یا نقصان بھی پہنچا سکتا ہو مگر عدم سے وجود میں آیا ہو اور اس کا اختیار کسی اور کا عطا کردہ ہو تو عقل سلیم اس کی عبادت میں عار محسوس کرے گی، خواہ وہ کتنی اونچی مخلوق مثلاً انسان ہو یا فرشتہ، کیونکہ وہ خود اپنی ضروریات کے لیے اس ہستی کا محتاج ہے جو نہ اپنے وجود میں کسی کی محتاج ہے اور نہ اپنی بقا میں۔ پھر پتھر، لکڑی یا دھات کے بنے ہوئے بت یا مٹی اور اینٹوں سے بنی ہوئی قبریں کہ جن میں زندہ لوگوں والی کوئی خوبی ہے ہی نہیں، جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں، نہ کسی کے کام آسکیں، ان کی عبادت کیوں؟

آیت 43 ﴿٣٣﴾ يَا بَتِ اِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ: ”مِنَ الْعِلْمِ“ میں ”مِنَ“ جمعیت کے لیے ہے، یعنی کچھ علم۔ دوسری بات میں بھی ان کی نرمی، دانائی اور حسن ادب دیکھیے۔ ”ابا جی“ کے لقب کے ساتھ مخاطب کیا، یہ نہیں کہا کہ آپ حد درجہ کے جاہل ہیں اور مجھے اللہ تعالیٰ نے صدیقیت اور نبوت کا عظیم مرتبہ عطا کیا ہے، بلکہ یہ کہا کہ میرے پاس کچھ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا اور وہ ہے سیدھے راستے کا علم، اس لیے اس میں میرے پیچھے چلنے میں عار محسوس نہ کریں۔ بے شک آپ باپ ہیں مگر یوں سمجھیں کہ میں اور آپ ایک سفر پر ہیں، مجھے راستے کا علم ہے اور آپ کو نہیں، تو آپ کو باپ ہونے کے باوجود میرے پیچھے چلنا ہوگا، تاکہ میں آپ کو صحیح منزل تک پہنچا دوں اور آپ غلط راستے پر چل کر بھٹکتے نہ پھریں۔ (زمخشری)

آیت 44 ﴿٣٤﴾ اِهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا : ”سَوِيًّا“ ”سَوِيٌّ سَوِيٌّ“ (ع) سے ”فِعْلٌ“ کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے، سیدھا برابر راستہ جس میں نہ زیادتی ہے کہ اس کی عبادت ہو جو اس کا حق دار نہیں اور نہ کمی کہ حق دار کی عبادت بھی نہ کی جائے۔ (قاسمی)

آیت 44 ﴿٣٤﴾ يَا بَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ: تیسری بات کی ابتدا بھی محبت اور ادب میں ڈوبے ہوئے الفاظ ”ابا جان“ سے کی اور اسے بت پرستی سے منع کرنے اور ہٹانے کے لیے اس کی حقیقی تصویر ایسی کھینچی کہ ہر عقلمند کو اس سے نفرت ہو جائے، یعنی

يَأْتِيَنِي إِني أَخَافُ أَنْ يَبْسُكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ فَتَكُونُ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا ﴿٥٥﴾ قَالَ
أَرَاغِبُ أَنْتَ عَنِ الْهِتَى يَا بُرْهَيْمُ ۗ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهَ لِأَرْجَمْنَاكَ وَاهْجُرْنَا وَلِيًّا ﴿٥٦﴾

اے میرے باپ! بے شک میں ڈرتا ہوں کہ تجھ پر رحمان کی طرف سے کوئی عذاب آگے، پھر تو شیطان کا ساتھی بن جائے ﴿۵۵﴾ اس نے کہا کیا بے رغبتی کرنے والا ہے تو میرے معبودوں سے اے ابراہیم!؟ یقیناً اگر تو باز نہ آیا تو میں ضرور ہی تجھے سنگسار کر دوں گا اور مجھے چھوڑ جا، اس حال میں کہ تو صحیح سالم ہے ﴿۵۶﴾

یہی نہیں کہ بت پرستی کسی بھی نفع سے خالی ہے، بلکہ اس میں بے حد نقصان ہے، کیونکہ یہ درحقیقت شیطان کی عبادت ہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۱۱۷) کیونکہ وہی اس پر آمادہ کرتا اور اسے خوش نما بنا کر دکھاتا ہے، خود شیطان کی عبادت تو کوئی نہیں کرتا۔ ”إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَنِ عَصِيًّا“ میں ”إِنَّ“ کے ساتھ شیطان کی عبادت سے منع کرنے کی وجہ بیان فرمائی، جو یہ ہے کہ شیطان ہمیشہ سے تمہارے اس رب کا سخت نافرمان ہے جس کی رحمت کی کوئی حد نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ناشکرے اور سخت نافرمان کی بات ماننے والا بھی سخت نافرمان ہو گا۔ ہمیشہ کا معنی ”کَانَ“ سے واضح ہو رہا ہے۔

آیت 45 يَأْتِيَنِي إِني أَخَافُ: چوتھی بات یہ کہ اسے بت پرستی کے برے انجام اور اس کے وبال اور عذاب سے ڈرایا اور اس میں بھی حسن ادب کو ملحوظ رکھا۔ صاف الفاظ میں یہ نہیں کہا کہ تم پر عذاب آپڑے گا، بلکہ فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ تجھے رحمان کی طرف سے کوئی عذاب آگے اور پھر تو شیطان کا ساتھی بن جائے۔ یہاں ”میں ڈرتا ہوں“ اور ”کوئی عذاب آگے“ کے الفاظ قابل غور ہیں کہ وہ کتنی سخت بات کو کس قدر نرمی کے ساتھ بیان کر رہے ہیں۔ پھر یہ بات کہ عذاب کا نتیجہ شیطان کا دوست اور ساتھی بننا ہو گا۔ معلوم ہوا کہ شیطان کا ساتھی بننا عذاب سے بھی بدتر ہے۔ یہ آخری نصیحت بھی ”يَأْتِيَنِي“ کے پیارے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ (زمخشری)

آیت 46 : ﴿٥٦﴾ قَالَ أَرَاغِبُ أَنْتَ عَنِ الْهِتَى يَا بُرْهَيْمُ ۗ : ”رَغِبَ فِيهِ“ کا معنی رغبت کرنا اور ”رَغِبَ عَنْهُ“ کا معنی بے رغبتی کرنا ہوتا ہے۔ والد نے جواب میں بیٹے کی بات کا انکار کرتے ہوئے ہمزہ استفہام سے بات شروع کی کہ ”کیا بے رغبتی کرنے والا ہے تو میرے معبودوں سے اے ابراہیم!؟“ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک بتوں سے بے رغبتی زیادہ قابل گرفت تھی، اس لیے ”أَرَاغِبُ“ کا ذکر خبر ہونے کے باوجود پہلے کیا، رہا بیٹا تو شرک سے منع کرنے کی وجہ سے اسے ”أَنْتَ“ کے ساتھ مبتدا ہونے کے باوجود بعد میں مخاطب کیا اور ابراہیم کا نام ایسا قابلِ نفرت ٹھہرا کہ اسے سب سے آخر میں لیا۔ ابراہیم علیہ السلام کو دیکھیے کہ وہ ہر بات ”يَأْتِيَنِي“ سے شروع کرتے ہیں، ادھر مشرک باپ کی خصوصی مہربانی دیکھیے کہ اس نے مخاطب کیا بھی تو آخر میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقیدے کی بنا پر پیدا ہونے والی دوستی اور دشمنی نسب کی وجہ سے پیدا ہونے والی دوستی اور دشمنی سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔

﴿٥٦﴾ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهَ لِأَرْجَمْنَاكَ : ”تَنْتَهَى“ تھا، ”لَمْ“ کی وجہ سے یاہ گرتی۔ ”وَلِيًّا“ کا معنی ہے صحیح

قَالَ سَلِّمْ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۗ إِنَّكَ كَانَ بِنِي حَفِيًّا ﴿٤٧﴾

کہا تجھ پر سلام ہو، میں اپنے رب سے تیرے لیے ضرور بخشش کی دعا کروں گا، بے شک وہ ہمیشہ سے مجھ پر بہت مہربان ہے ﴿٤٧﴾

سالم اور ایک دوسرا معنی ہے لمبی مدت۔ اگر تو بتوں کی تردید اور نفرت سے باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا، یعنی پتھر مار مار کر ختم کر دوں گا۔ تو مجھے چھوڑ کر صحیح سلامت نکل جا، ایسا نہ ہو کہ مجھ سے اپنی ہڈیاں تڑوا بیٹھے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ لمبی مدت تک مجھے چھوڑ کر نکل جا کہ میں تمھاری شکل نہ دیکھوں۔

﴿٤٨﴾ اس واقعہ میں ہمارے نبی کریم ﷺ کے لیے تسلی کا سامان موجود ہے، کیونکہ آپ کو بھی اپنے اقارب کی طرف سے ایسے ہی سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح حق کے ہر داعی کے لیے بھی تسلی ہے کہ اعلان حق پر اسے اپنے قریب ترین عزیزوں کی طرف سے شدید مخالفت کے سامنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ خصوصاً جب کفار دلیل کے سامنے لاجواب ہو جاتے ہیں تو پھر ان کا غیظ و غضب حد سے گزر جاتا ہے، جیسے یہاں ابراہیم علیہ السلام سے لاجواب ہو کر باپ نے سنگسار کرنے کی دھمکی دے کر گھر سے نکال دیا۔ بتوں کو توڑنے کے بعد ان کے پرہت لاجواب ہوئے تو انھوں نے کہا: ﴿حَزَقُوهُمُ الْغَنَاءَ وَالْأَسْيَاءَ﴾ [الانبیاء: ۶۸] ”اسے جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔“ لوط علیہ السلام کی قوم لاجواب ہوئی تو کہا: ﴿أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ﴾ [الأعراف: ۸۲] ”انھیں اپنی بستی سے نکال دو۔“ نوح علیہ السلام کی قوم نے لاجواب ہو کر کہا: ﴿لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ﴾ [الشعراء: ۱۱۶] ”اے نوح! یقیناً اگر تو باز نہ آیا تو ہر صورت سنگسار کیے گئے لوگوں میں سے ہو جائے گا۔“ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے دلائل کے سامنے بے بس ہونے پر کہا تھا: ﴿لَئِنْ اتَّخَذَتِ الْهَالِغَةُ غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ﴾ [الشعراء: ۲۹] ”یقیناً اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تجھے ضرور ہی قید کیے ہوئے لوگوں میں شامل کر دوں گا۔“ کفار کی ان تمام دھمکیوں سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے دلائل ذکر فرمائے ہیں جو قابل دید ہیں اور ان کے جواب میں کفار کی بے بسی بالکل واضح ہے۔ ہمارے پیارے پیغمبر کے سامنے بھی جب کفار کی کوئی پیش نہ گئی تو انھوں نے آپ کو قتل، قید یا جلا وطن کرنے کی سازش کی، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَإِذْ يَمَكُورُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ﴾ [الأنفال: ۳۰] ”اور جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، تیرے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے، تاکہ تجھے قید کر دیں، یا تجھے قتل کر دیں، یا تجھے نکال دیں۔“

سیت 47 ﴿٤٧﴾ قَالَ سَلِّمْ عَلَيْكَ ۖ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جاہل باپ کے اس سنگ دلا نہ جواب کے مقابلے میں پھر انتہائی نرمی کا مظاہرہ کیا اور اسے ”سَلِّمْ عَلَيْكَ“ کہا کہ آپ سلامت رہیں۔ جاہلوں کے جواب میں ہمیں بھی یہی کہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ دیکھیے سورۃ فرقان (۶۳) اور قصص (۵۵) جب کوئی ضد اور عناد پر تل جائے تو یہ رخصت ہونے اور ترک تعلق کا سلام ہے اور یہ جائز ہے، البتہ عام حالات میں کفار کو سلام میں پہل جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَا تَبْدَأُ وَالْيَهُودَ﴾

وَأَعْتَزِلْكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُوا رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ﴿٣٨﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلْتَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٣٩﴾

اور میں تم سے اور ان چیزوں سے جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، کنارہ کرتا ہوں اور اپنے رب کو پکارتا ہوں، امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکارنے میں بے نصیب نہیں ہوں گا ﴿۳۸﴾ تو جب وہ ان سے اور ان چیزوں سے جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے، الگ ہو گیا تو ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور ہر ایک کو ہم نے نبی بنایا ﴿۳۹﴾

وَلَا النَّصَارَىٰ بِالسَّلَامِ) (مسلم، السلام، باب النهي عن اثناء أهل الكتاب : ۲۱۶۷، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] "یہود و نصاریٰ کو سلام میں پہل مت کرو۔"

② سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي : ابراہیم علیہ السلام نے اس وعدے کو نبھایا، دیکھیے سورہ شعراء (۸۶) اور ابراہیم (۲۱) مگر اب فوت شدہ مشرک دوستوں یا رشتہ داروں کے لیے استغفار جائز نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ توبہ (۱۱۳) اور سورہ ممتحنہ (۴)۔

③ إِنَّكَ كَانَ بِنِي حَبِيئًا : "حَبِيئًا" "حَفِيئًا جَفَاؤَةً" (رضی) سے ہے، کسی پر بہت مہربان ہونا، اس کے معاملات کی نگر رکھنا، اس کے متعلق کثرت سے پوچھتے رہنا۔ مزید دیکھیے سورہ اعراف (۱۸۷) "كَانَ" سے ہمیشہ کا معنی واضح ہوتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے مجھ پر بہت مہربان رہا ہے اور اس نے مجھے دعا قبول ہونے کی عادت ڈال دی ہے۔

آیت 48 ﴿١﴾ وَأَعْتَزِلْكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ : یعنی تم سے اور تمہارے معبودوں سے تعلق توڑ کر جب میں اپنے اکیلے رب کو پکاروں گا تو مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکارنے میں بے نصیب نہیں رہوں گا اور وہ کسی بھی مرحلے پر مجھے بے یار مددگار نہیں چھوڑے گا۔ اشارے سے یہ بھی کہہ دیا کہ میرا رب تمہارے بتوں کی طرح نہیں ہے کہ انہیں کتابی پکارتے رہو، وہ خاک نفع نہیں پہنچا سکتے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار بھی کہ اس پر میرا کسی کا زور نہیں، محض اس کے فضل سے امید ہے، کیونکہ اس اکیلے کو پکارنے والا کبھی بے نصیب نہیں رہتا۔

② ابراہیم علیہ السلام کی کفار سے اور ان کے بتوں سے علیحدگی اور ایمان لانے تک واضح دشمنی کا ذکر قرآن میں کئی جگہ ہے۔ دیکھیے سورہ انبیاء (۶۵ تا ۶۷)، سورہ شعراء (۷۵ تا ۷۷) اور سورہ ممتحنہ (۴)۔

آیت 49 ﴿١﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلْتَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ : وطن سے ہجرت اور مشرکین سے کنارہ کشی کے عوض اللہ تعالیٰ نے انہیں جو بے شمار نعمتیں عطا کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ انہیں بڑی شان والا بیٹا اور پوتا یعنی اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) عطا کیے، تاکہ ان کا دل لگ جائے اور بے وطنی سے وحشت نہ ہو۔

② وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا : یہ آیت دلیل ہے کہ اسحاق اور یعقوب علیہم السلام ان کی زندگی ہی میں نبی بن چکے تھے، کیونکہ اگر بعد میں نبی بنا مراد ہوتا تو یوسف علیہ السلام کا بھی ذکر ہوتا، کیونکہ وہ بھی نبی تھے۔ بیٹے اور پوتے کی خوشی ہی کچھ کم نہیں ہوتی، کجا یہ کہ ان کی

و وَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾ وَ اذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَوْسَىٰ ۚ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلِصًا وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَبِيًّا ﴿۵۱﴾

اور ہم نے انھیں اپنی رحمت سے حصہ عطا کیا اور انھیں سچی ناموری عطا کی، بہت اونچی ﴿۵۰﴾ اور کتاب میں موسیٰ کا ذکر کر، یقیناً وہ خالص کیا ہوا تھا اور ایسا رسول جو نبی تھا ﴿۵۱﴾

پہلے ہی خوش خبری بھی مل جائے (ہود: ۷۱) اور اپنی آنکھوں سے انھیں نبوت کے عالی مقام پر فائز بھی دیکھ لیا جائے۔ یہاں اسماعیل علیہ السلام کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ وہ ان کے پاس نہیں رہے۔ ان کا ذکر الگ آگے آرہا ہے۔

﴿۵۱﴾ یہ آیت اس حقیقت کی بھی ایک مثال ہے کہ جو شخص اللہ کی خاطر کوئی چیز چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ اس سے کہیں بہتر چیز اسے عطا فرماتا ہے۔

آیت 50 ﴿۱﴾ وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا : ”مِنْ“ جمعیت کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”حصہ“ کیا ہے۔ اس رحمت سے مراد نبوت اور دینی و دنیوی بے شمار برکتیں ہیں، مثلاً اموال و اولاد کی کثرت، ارض مقدس کی خلافت، نسل در نسل نبوت و امامت وغیرہ۔

﴿۲﴾ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا : ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر ”لِسَانَ حَسَنًا“ (اچھی شہرت) فرمائی۔ [طبری بسند ثابت] ”لِسَانَ“ بول کر وہ چیز مراد لی ہے جو زبان کے ساتھ ہوتی ہے، یعنی شہرت و ناموری، جیسا کہ ”نَبَأٌ“ بول کر احسان مراد لیتے ہیں، کیونکہ وہ ہاتھ کے ساتھ ہوتا ہے۔ ”لِسَانَ صِدْقٍ“ سچی ناموری کا مطلب یہ ہے کہ وہ واقعی اس ناموری اور شہرت کے حق دار تھے اور ان کا عمل اس شہرت کو سچا ثابت کرتا تھا، اس لیے ان کا ذکر خیر ہمیشہ کے لیے لوگوں کی زبان پر جاری کر دیا۔ چنانچہ یہودی، عیسائی اور مسلمان سب ان کی تعظیم کرتے ہیں اور نماز میں درود ابراہیمی بھی ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی مقبولیت ہی کا ثمر ہے۔ دیکھیے سورہ شعراء (۸۳)۔

آیت 51 ﴿۱﴾ وَ اذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَوْسَىٰ ۚ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلِصًا : ”مُخْلِصًا“ کا معنی ہے ”خالص کیا ہوا، چنا ہوا۔“ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے فرمان : ﴿وَ اضْطَرَعْنَاكَ لِنَفْسِي﴾ [طہ: ۷۱] (اور میں نے تجھے خاص طور پر اپنے لیے بنایا ہے)، طہ کی آیت (۱۳) اور اعراف کی آیت (۱۴۳) سے ہوتی ہے۔

﴿۲﴾ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَبِيًّا : ”رَسُوْلًا“ کا لفظی معنی بھیجا ہوا ہے اور ”نَبِيًّا“، ”نَبَأٌ“ سے ”فَعِيْلٌ“ کے وزن پر ہے جو فاعل اور مفعول دونوں معنوں میں آتا ہے۔ مفعول ہو تو وہ جسے اللہ کی طرف سے خبر دی جائے اور اگر فاعل ہو تو وہ جو اللہ کی طرف سے خبر دینے والا ہو۔ ”نَبَأٌ“ عام خبر کو نہیں بلکہ اس خبر کو کہتے ہیں جو بڑی عجیب یا اہم ہو۔ قرآن مجید میں یہ دونوں لفظ عموماً ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوئے ہیں، تاہم بعض مقامات ایسے ہیں جن سے دونوں کے مرتبہ یا کام کی نوعیت کے اعتبار سے کافی فرق پایا جاتا ہے۔ دیکھیے سورہ حج (۵۲) شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”جس کو اللہ تعالیٰ کی وحی آئی وہ نبی، ان میں سے جو

وَ نَادَيْتُهُ مِنْ جَانِبِ الظُّورِ الْأَيْمَنِ وَ قَرَّبْتُهُ لِحِجَّتِي ﴿۵۲﴾

اور ہم نے اسے پہاڑ کی دائیں جانب سے آواز دی اور سرگوشی کرتے ہوئے اسے قریب کر لیا ﴿۵۲﴾

خاص ہیں اور امت رکھتے ہیں یا کتاب، وہ رسول ہیں۔“ (موضح)

﴿۵۲﴾ یہاں ”رَسُولًا“ کے بعد ”نَدَيْتُهُ“ لانے کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پیغام پہنچانے کے لیے کوئی بھی بھیجا جائے اسے رسول کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھیجے تو اس کا رسول، کوئی اور بھیجے تو اس کا رسول۔ جیسا کہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق سورہ لیس میں مذکور مرسلیں کسی نبی کی طرف سے بھیجے ہوئے داعی تھے اور جیسا کہ یزید بن شیبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم عرفات میں ایک جگہ وقوف کیے ہوئے تھے (ان کے شاگرد عمرو بن عبد اللہ وہ جگہ امام کی جگہ سے دور بیان کرتے تھے) تو ہمارے پاس ابن مرثد انصاری آئے اور انہوں نے کہا: «إِنِّي رَسُولُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْكُمْ» [ابو داؤد، المناسک، باب موضع الوقوف بعرفة: ۱۹۱۹۔ ابن ماجہ: ۳۰۱۱ و صحیحہ الألبانی] ”میں تمہاری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول یعنی پیغام لانے والا ہوں۔“ اس آیت میں ”رَسُولًا“ کی تاکید ”نَدَيْتُهُ“ کے ساتھ اس لیے فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام کو کسی کی طرف سے بھیجا ہوا محض ایک داعی نہ سمجھا جائے، بلکہ وہ نبی بھی تھے جو وحی الہی سے سرفراز تھے۔

آیت 52 ﴿۵۲﴾ وَ نَادَيْتُهُ مِنْ جَانِبِ الظُّورِ : طور کا معنی پہاڑ ہے، بعض خاص پہاڑوں کا نام بھی طور ہے، جیسے الیہ کے قریب صحرائے سینا کے ایک پہاڑ کو طور سینا یا طور سینین کہتے ہیں۔ صاحب قاموس نے چند اور مقامات پر واقع پہاڑوں کا بھی ذکر کیا ہے جنہیں طور کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کے مدین سے واپس مصر جاتے ہوئے پیش آیا۔ اس کی تفصیل سورہ طہ (۳۶۶۹)، نمل (۱۳ تا ۱۷) اور قصص (۳۵ تا ۳۹) میں موجود ہے۔ ابن کثیر نے سورہ قصص کی آیت (۳۰) ﴿ثَوْدِي مِنْ شَاطِئِ النَّوَادِي الْأَيْمَنِ﴾ کی تفسیر میں فرمایا: ”یعنی وادی کی اس جانب سے جو موسیٰ علیہ السلام کے دائیں طرف پہاڑ کے مغربی کنارے سے ملتی تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْعَرَبِ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مَوْسَىٰ الْأَمْرَ﴾ [الفصل: ۴۴] ”اور اس وقت تو مغربی جانب نہیں تھا جب ہم نے موسیٰ کی طرف حکم کی وہی کی۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے آگ کی طرف رخ قبلہ کی جانب کیا تھا اور انہوں نے پہاڑ کے مغربی حصے کو اپنی دائیں طرف کیا ہوا تھا۔“ آلوسی نے فرمایا: ”مِنْ جَانِبِ الظُّورِ الْأَيْمَنِ“ سے مراد پہاڑ کی وہ جانب ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب تھی، کیوں کہ خود پہاڑ کا کوئی دایاں ہوتا ہے نہ بائیں۔ ”الْأَيْمَنِ“ ”يُسْمَى“ سے بھی ہو سکتا ہے جس کا معنی برکت ہے، یعنی اس کی مبارک جانب سے، اس معنی کے لحاظ سے پہاڑ کی مبارک جانب بھی مراد ہو سکتی ہے، مگر پہلا معنی بہتر ہے۔ ”نَادَيْتُهُ“ (ہم نے اسے آواز دی) آواز دینے سے مراد اس جانب سے اللہ کا کلام ظاہر ہونا ہے۔ ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام الفاظ کی صورت میں سنا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو سنا تھا اس میں نہ حرف تھے، نہ آواز تھی۔ انہوں نے صرف کانوں سے نہیں بلکہ تمام اعضاء کے ساتھ سنا تھا، جس سے انہیں یقین ہو گیا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہم نے اسے طور کی مبارک

وَهَبْنَا لَهُ مِنْ رَحْمَتِنَا أَخَاهُ هَارُونَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ وَادْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّكَ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا ﴿۵۴﴾

اور ہم نے اسے اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون نبی بنا کر عطا کیا ﴿۵۳﴾ اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کر، یقیناً وہ وعدے کا سچا تھا اور ایسا رسول جو نبی تھا ﴿۵۴﴾

جانب سے آتے ہوئے آواز دی، مگر یہ بات عقل کی دسترس سے باہر ہے اور احادیث کے دلائل اس کے صاف خلاف ہیں۔ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کا آواز دینا اور کلام کرنا ثابت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے منکر اس کے کلام کے بھی منکر ہیں، اس لیے وہ نہ اس میں حروف مانتے ہیں، نہ آواز اور نہ اس کا کانوں سے سنا جاتا۔ مگر الفاظ اور آواز سے خالی چیز کو کلام کہنا جس طرح عقل سے بعید ہے اسی طرح قرآن و حدیث کے بھی صریح خلاف ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۱۲۳)، کہف (۱۰۹) اور توبہ (۶)۔

﴿۵۳﴾ وَكَرَبْنَاهُ نَجِيًّا: ”نَجِيًّا“ ”فَعِيلٌ“ بمعنی ”مُفَاعِلٌ“ ہے، جیسے ”جَلِسَ“ بمعنی ”مُحَالِسٌ“ اور ”نَدِيمٌ“ بمعنی ”مُنَادِمٌ“ ہے۔ ”مُنَاجَاةٌ“ ایک دوسرے سے چھپی آواز میں بات کرنا، سرگوشی کرنا، یعنی ہم نے اسے سرگوشی کرتے ہوئے قریب کر لیا۔ شاہ عبد القادر برکات لکھتے ہیں: ”ان سے کلام ہوا، بیچ میں فرشتہ نہ تھا۔“ (موضح) اللہ تعالیٰ نے جس طرح واضح الفاظ میں موسیٰ علیہ السلام سے خود کلام کرنے کا ذکر فرمایا ہے کسی اور کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا۔

آیت 53 ھَرُونَ نَبِيًّا: موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی تو انھوں نے اپنی مدد کے لیے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت عطا کرنے کی درخواست کی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے قبول فرمایا اور اپنی خاص رحمت سے ان کے بھائی کو نبی بنا کر انھیں بہ فرما دیا۔ آج تک موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی بھائی نے اپنے بھائی کے لیے اتنے اونچے مرتبے کی دعائیں کی اور نہ ہارون علیہ السلام کے سوا کسی کو سفارش سے یہ مقام حاصل ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست کا ذکر سورہ طہ (۲۹ تا ۳۵)، شعراء (۱۲، ۱۳) اور قصص (۳۴، ۳۵) میں ہے۔

آیت 54 ﴿۱﴾ وَادْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ.....: یہ پانچواں قصہ اسماعیل علیہ السلام کا ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے اور تمام حجاز کے باپ۔ (ابن کثیر) گو تمام انبیاء وعدے کے سچے ہوتے ہیں مگر اسماعیل علیہ السلام میں یہ صفت خاص طور پر پائی جاتی تھی۔ سب سے پہلے تو ان میں یہ وصف تھا کہ وہ وعدے کے ساتھ ”ان شاء اللہ“ کہہ لیا کرتے تھے، جیسا کہ انھوں نے والد سے وعدہ کرتے وقت کہا تھا: ﴿سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الضَّعِيفِينَ﴾ [الصفحات: ۱۰۲] ”اگر اللہ نے چاہا تو تو ضرور مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔“ پھر یہ وعدے کی سچائی ہی تھی کہ انھوں نے اپنے والد سے وعدہ کیا کہ ذبح ہوتے وقت صبر کروں گا، پھر بے دھڑک چھری کے نیچے لیٹ گئے اور ارف تک نہ کیا۔ اس سے بڑھ کر وعدہ وفا کیا ہوگی؟ وعدہ پورا کرنا ایمان ہے اور وعدہ خلافی نفاق۔ ابوسفیان نے ہرقل کے پاس اقرار کیا تھا: ﴿يَأْمُرُنَا بِالصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ وَالْعَفَافِ وَالْوَفَاءِ﴾

وَ كَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَ الزَّكَاةِ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾

اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور وہ اپنے رب کے ہاں پسند کیا ہوا تھا ﴿۵۵﴾

بِالْعَهْدِ وَأَذَاءِ الْأَمَانَةِ [بخاری، الجهاد، واليسر، باب دعاء النبي ﷺ إلى الإسلام..... : ۲۹۶۱] کہ نبی ﷺ ہمیں نماز، حج، پاک دامنی، وعدہ پورا کرنے اور امانت ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے وعدہ خلافی کو منافق کی تین نشانیوں میں سے ایک قرار دیا۔ [بخاری، الإيمان، باب علامات المنافق : ۳۳، عن أبي هريرة رضى الله عنه]

﴿۵۵﴾ یہاں طبری اور ابن کثیر نے سہل بن عقیل سے نقل کیا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام نے ایک آدمی سے اس کے آنے تک ایک جگہ میں رہنے کا وعدہ کیا، وہ بھول گیا تو ایک دن رات اس کے آنے تک وہیں ٹھہرے رہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّكَ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ﴾ اور سفیان ثوری سے نقل کیا ہے کہ مجھے خبر پہنچی ہے کہ ایک سال وہیں ٹھہرے رہے۔ مگر یہ دونوں روایات بعض علماء کے اقوال ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ہرگز بیان نہیں فرمائیں۔ ظاہر ہے ان دونوں بزرگوں نے یہ روایات بنی اسرائیل سے لی ہیں اور ہم اہل کتاب کی کسی بات کو سچا کہہ سکتے ہیں نہ جھوٹا۔

﴿۵۶﴾ سنن ابی داؤد وغیرہ میں اسی طرح کا واقعہ ہمارے نبی ﷺ کے متعلق بھی مروی ہے کہ نبوت سے پہلے ایک آدمی کے آنے تک ٹھہرنے کے وعدے کی وجہ سے آپ ﷺ تین دن رات وہیں ٹھہرے رہے، مگر شیخ البہانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ﴿وَ كَانَ رَسُولًا نَبِيًّا﴾ : اللہ تعالیٰ نے اسحاق اور یعقوب علیہ السلام کو صرف نبی (مریم : ۳۹) اور اسماعیل علیہ السلام کو ”رَسُولًا نَبِيًّا“ فرمایا، اس سے ان کے بلند مرتبے کا اظہار ہوتا ہے۔ اسماعیل علیہ السلام جو جبرہم کی طرف رسول تھے، جن کے وہ داماد بھی تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ مِنْ وَلَدِ إِبْرَاهِيمَ إِسْمَاعِيلَ﴾ [ترمذی، المناقب عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء في فضل النبي ﷺ : ۳۶۰۵] ”اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کو منتخب فرمایا۔“

آیت 55 ﴿۵۵﴾ وَ كَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَ الزَّكَاةِ : اسماعیل علیہ السلام کے اس عمل کی پابندی کا حکم ہمارے نبی ﷺ کو اور ان کے ذریعے سے ہمیں بھی دیا گیا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ أَمُرُ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَ اصْطَلِبْ عَلَيْهَا - لَا تَسْتَلِكْ رِزْقًا نَحْنُ نَزَرْنَاكَ - وَ الْعَاقِبَةُ لِلشَّقْوَى﴾ [خلع : ۱۳۲] ”اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور اس پر خوب پابند رہ، ہم تجھ سے کسی رزق کا مطالبہ نہیں کرتے، ہم ہی تجھے رزق دیں گے اور اچھا انجام تقویٰ کا ہے۔“ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچانے کا حکم دیا۔ دیکھیے سورہ تحریم (۶)۔

﴿۵۶﴾ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا : رب تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہونے کا باعث سب سے پہلے تو خود اس ذات پاک کا کسی کو منتخب فرمایا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾ [الحج : ۷۵] ”اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی۔“ اور فرمایا: ﴿اللَّهُ يَخْتِيبُ إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ﴾ [الشوری : ۱۳] ”اللہ اپنی طرف چن لیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف راستا سے دیتا ہے جو رجوع کرے۔“ پھر اللہ تعالیٰ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَادْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ ۖ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ۗ وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝

اور کتاب میں ادريس کا ذکر کر، بے شک وہ ایسا نہایت سچا تھا، جو نبی تھا ﴿۵۸﴾ اور ہم نے اسے بہت اونچے مقام پر بلند کیا ﴿۵۹﴾

کے ہاں پسندیدہ (مَرْضِيًّا) ہونے کا ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق کسی بندے کا فرائض کی ادائیگی اور نوافل کی کثرت ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ [دیکھئے بخاری، الرفاق، باب التواضع: ۶۵۰۲، عن ابي ابي هريرة رَضِيَ اللهُ عَنْهُ] اور ابو ہریرہ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ الْعَبْدَ نَادَى جِبْرِيلُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحْبِبْهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ فَيُنَادِي فِي أَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحْبِبُوهُ فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الْأَرْضِ» [بخاری، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة صلوات الله عليهم: ۳۲۰۹]

”اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو آواز دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے سو تو بھی اس سے محبت کر، تو جبریل اس سے محبت کرتا ہے، پھر جبریل آسمان والوں میں اعلان کر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے، تم بھی اس سے محبت کرو تو آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔“

”مَرْضِيًّا“ کا حقیقی مصداق ایسا شخص ہوتا ہے۔

آیت 56 وَادْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ : یہ چھٹا قصہ ادريس علیہ السلام کا ہے، بعض مفسرین نے ادريس علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے انبیاء میں شمار کیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ معراج کے موقع پر جب نبی ﷺ کی ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے نبی ﷺ کو ”مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْأَخِ الصَّالِحِ“ (صالح نبی اور صالح بھائی کو مرحبا) کہہ کر خطاب کیا اور آدم اور ابراہیم علیہ السلام کی طرح ”مَرْحَبًا بِالْوَلَدِ الصَّالِحِ“ (صالح بیٹے کو مرحبا) نہیں کہا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے، کیونکہ ”بَابُ ذِكْرِ إِدْرِيسَ عَلَيْهِ السَّلَامُ“ میں وہ حدیث معراج لائے ہیں۔ دیکھیے فتح الباری ”بَابُ ذِكْرِ إِدْرِيسَ عَلَيْهِ السَّلَامُ“ اس سے پہلے باب میں امام بخاری نے فرمایا: ”ابن مسعود اور ابن عباس رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا سے ذکر کیا جاتا ہے کہ ایسا ہی ادريس ہیں۔“ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کے لانے کو بھی امام بخاری کی اس رائے کا اظہار کہا ہے کہ ادريس علیہ السلام نوح علیہ السلام سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں ہوئے ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں ایسا علیہ السلام کو نوح یا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں شمار فرمایا گیا ہے۔ دیکھیے سورہ انعام (۸۳، ۸۵) لیکن اکثر مفسرین کی تحقیق یہ ہے کہ ان کا زمانہ نوح علیہ السلام سے بھی پہلے کا ہے، چنانچہ بخاری نے ”بَابُ ذِكْرِ إِدْرِيسَ عَلَيْهِ السَّلَامُ“ کے ترجمہ الباب میں فرمایا: ”وَهُوَ جَدُّ أَبِي نُوحٍ وَ يُقَالُ جَدُّ نُوحٍ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ“ یعنی وہ نوح علیہ السلام کے والد کے دادا ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کے دادا ہیں۔ ابن جریر، قرطبی اور ابن کثیر رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا کی رائے بھی یہی ہے، دلیل اسی سورت کی آیت (۵۸) کی تفسیر میں آرہی ہے۔

آیت 57 وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا : حدیث معراج میں رسول اللہ ﷺ کی چوتھے آسمان پر ان سے ملاقات مذکور ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَةِ آدَمَ وَ مِنْ حَٰوِلَا مَعَ نُوحٍ وَ مِنْ ذُرِّيَةِ إِبْرَاهِيمَ وَ إِسْرَائِيلَ وَ مِنْ هَدَيْنَا وَ اجْتَبَيْنَا إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ

یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا نبیوں میں سے، آدم کی اولاد سے اور ان لوگوں میں سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا اور ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد سے اور ان لوگوں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور ہم نے جن لیا۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس مقام کے ”مَكَانًا عَلِيًّا“ (بہت اونچا مقام) ہونے میں کوئی شک نہیں۔ بعض لوگوں نے جو کہا ہے کہ انہیں زندہ آسمان پر اٹھایا گیا، تو یہ رسول اللہ ﷺ سے کسی قوی سند کے ساتھ ثابت نہیں بلکہ صرف کعب کا قول ہے جو اسرائیلی روایات بیان کرتے ہیں۔

آیت 58 ① أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ : مراد وہ انبیاء ہیں جن کا اس سورت میں ذکر ہے۔ یہ دس ہیں جن میں پہلے ذکر کیا اور آخری اور لیس ﷺ ہیں۔ ابن کثیر نے فرمایا، سدی اور ابن جریر اور قرطبی رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا: ”یہاں آدم کی اولاد سے مراد ادریس ہیں اور نوح کے ساتھ سوار ہونے والوں کی اولاد سے مراد ابراہیم ہیں اور ابراہیم کی اولاد سے مراد اسحاق، یعقوب اور اسماعیل ہیں اور اسرائیل کی اولاد سے مراد موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ ابن مریم ﷺ ہیں۔“ ابن جریر فرماتے ہیں: ”اسی لیے ان کے نسب الگ الگ ذکر فرمائے ہیں، ورنہ آدم کی اولاد تو سب ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں وہ بھی ہیں جو ان لوگوں کی اولاد میں سے نہیں جو نوح ﷺ کے ساتھ کشتی میں تھے اور وہ ادریس ہیں جو نوح ﷺ کے دادا ہیں۔“ ابن کثیر نے فرمایا: ”یہی بات زیادہ ظاہر ہے کہ ادریس ﷺ نوح ﷺ کے آبائی نسب میں شامل ہیں۔“

رہا ادریس ﷺ کا ہمارے نبی ﷺ کو بیٹے کے بجائے بھائی کہنا، تو یہ تو واضح سے بھی ہو سکتا ہے اور امام بخاری کا حدیث معراج کو لانا ”وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا“ کی تفسیر کے طور پر بھی ہو سکتا ہے اور جو ادریس اور الیاس ﷺ کو ایک قرار دینا ہے تو صحابہ کرام اگر رسول اللہ ﷺ سے بیان کریں تو وہ بات یقینی ہے، ورنہ وحی الہی کے بغیر ہزاروں سال پہلے کے متعلق ان کی بات یقینی کیسے ہو سکتی ہے؟ خصوصاً جب یہ بھی امکان ہو کہ وہ بات اہل کتاب میں سے کسی سے سن کر بیان ہوئی ہے۔ اس لیے امام بخاری کا ادریس ﷺ کو جزم کے ساتھ نوح ﷺ کے والد کا دادا قرار دینا ہی راجح معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

② وَ مِنْ هَدَيْنَا وَ اجْتَبَيْنَا : چند انبیاء ﷺ کے نام ذکر کرنے کے بعد ان الفاظ کے ساتھ تمام انبیاء کو بھی شامل فرمادیا، جیسا کہ سورہ انعام کی آیت (۸۷) میں ہے۔ اس آیت میں جو فرمایا: ﴿إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَ بٰكِيًا﴾ اس میں صراحت فرمائی کہ ان انبیاء کے سامنے جب رحمان کی آیات پڑھی جاتیں تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے۔ ”بٰكِيًا“ ”بکی بکی بکاء“ (ض) سے اسم فاعل ”باک“ کی جمع ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اہل علم کا اجماع ہے کہ انبیاء کی اقتدا میں یہاں سجدہ کرنا مشروع ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے ذکر فرمایا: ﴿قَرَأَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ سُورَةَ مَرِيَمَ فَسَجَدَ وَقَالَ هٰذَا السُّجُودُ فَأَيُّنَ الْبٰكِيُّ؟﴾ ”عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم پڑھی تو سجدہ کیا اور فرمایا: ”یہ تو سجدہ ہوا

آيَةُ الرَّحْمَنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ﴿٥٩﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ

جب ان پر رحمان کی آیات پڑھی جاتی تھیں وہ سجدہ کرتے اور روتے ہوئے گر جاتے تھے ﴿٥٩﴾ پھر ان کے بعد ایسے نالائق مگر رونے والے کہاں ہیں؟“ حکمت بن بشر نے اسے صحیح کہا ہے۔ آیات الہی سن کر رونا، دل کا ڈر جانا، روٹنے کھڑے ہونا اور روتے ہوئے سجدے میں گر جانا، یہ صفات اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی اور نیک بندوں کی بیان کی ہیں۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۱۰۹ تا ۱۰۷)، مائدہ (۸۳)، انفال (۲) اور زمر (۲۳) وغیرہ۔

آیت 59 ﴿٥٩﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ : لفظ ”خَلَفَ“ لام کے سکون کے ساتھ ”اولاد“ واحد جمع دونوں کے لیے ایک ہی لفظ آتا ہے اور اکثر بری اولاد اور مذمت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور لام کے فتح کے ساتھ ”خَلَفَ“ ”جانشین“ کے معنی میں آتا ہے، وہ چاہے اولاد ہو یا کوئی اور۔ اس کا استعمال اکثر مدح و تعریف کے لیے ہوتا ہے اور دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہوتے ہیں۔

﴿٥٩﴾ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ : نماز ضائع کرنے میں سب سے پہلے اس عقیدے کی ایجاد ہے کہ ایمان صرف دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے اور ان دونوں چیزوں سے ایمان مکمل ہو جاتا ہے۔ عمل کرے تو اچھا ہے، درجہ بڑھ جائے گا، ورنہ ایمان میں نہ کمی ہوتی ہے نہ اضافہ، جب کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کو ایمان قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُنْزِلَ إِنَّمَا تَكْفُرُ﴾ [البقرة: ۱۷۳] ”اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ تمہارا ایمان ضائع کر دے۔“ مگر ان لوگوں نے نماز کو ایمان ماننے سے انکار کر دیا، پڑھنے والا بھی مومن، نہ پڑھنے والا بھی، جو انکار نہ کرے پکا مومن۔ پھر اس عقیدے کی ایجاد کہ نماز تو دل کی ہوتی ہے، قیام، سجدے اور رکوع کی کیا ضرورت ہے اور اسے طریقت اور معرفت قرار دینا نماز ضائع کرنے کا عام بہانہ ہے۔

اس کے علاوہ نماز کو صحیح وقت پر نہ پڑھنا، یا اسے رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہ پڑھنا، کبھی پڑھنا، کبھی نہ پڑھنا، یا سرے سے اسے ترک کر دینا، سب نماز ضائع کرنے کی صورتیں ہیں۔ نماز ترک کر دینے سے انسان کے پاس اسلام کی آخری عملی شہادت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے امام احمد کے قول اور امام شافعی کے ایک قول کے مطابق نماز کا تارک کافر ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں، دیکھیے سورہ توبہ کی آیات (۵) اور (۱۱) کی تفسیر۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث اس بحث کے لیے فیصلہ کن نظر آتی ہے، ابو امامہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَنْتَقَضَنَّ عُرَى الْإِسْلَامِ عُرْوَةَ عُرْوَةَ فَكُلُّمَا انْتَقَضَتْ عُرْوَةٌ تَشَسَّ النَّاسُ بِالنَّبِيِّ تَلِيهَا فَأَوْلَاهُنَّ نَقَضْنَا الْحُكْمَ وَ آخِرُهُنَّ الصَّلَاةُ﴾ [صحیح ابن حبان، التاريخ، باب ذكر الأخبار بان أول ما يظهر..... : ۶۷۱۵۔ مسند أحمد : ۲۵۱۶۵، ح : ۲۲۲۲۲] ”اسلام کی کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹی جائیں گی، جب بھی کوئی کڑی ٹوٹے گی تو لوگ اس کے بعد والی کو مضبوطی سے پکڑ لیں گے، چنانچہ سب سے پہلے ٹوٹنے والی کڑی ”حکم“ ہوگی (یعنی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلے کرنا) اور سب سے آخری کڑی نماز ہوگی۔“

وَ اتَّبِعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غِيَاً ۝۹

جانشین ان کی جگہ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے تو وہ عنقریب گمراہی کو ملیں گے ۹

۹ وَ اتَّبِعُوا الشَّهَوَاتِ : انسان میں کئی شہوات و خواہشات پائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر خواہش کی تکمیل کے لیے جائز طریقے بتائے ہیں، مثلاً عبادت کی ذہنی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنے ایک ہی رب اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کے رسول ﷺ کے طریقے کے مطابق کرنا، جنسی خواہش کے لیے نکاح کرنا اور لونڈیاں رکھنا۔ مالی حرص کے لیے جائز طریقے سے مال کمانا، خرچ کرنا اور اس کی زکاۃ دینا، غصے کی جہلت کا رخ کفار اور دشمنان اسلام کے ساتھ جہاد کی طرف موڑنا، غرض ہر فطری جذبے کو پورا کرنے کا سامان بھی فرمایا اور اللہ کے حکم سے تجاوز پر حد بھی نافذ فرمائی۔ شرک کو ناقابل معافی جرم قرار دیا، زنا پر حد رکھی، قوم لوط کے عمل کو حرام قرار دیا، سود کو حرام قرار دیا، ڈاکے اور چوری کی حد مقرر کی، قتل یا زہمی کرنے والوں پر قصاص یا دیت لازم فرمائی۔ پہلے انبیاء کے نالائق جانشینوں نے جس طرح اللہ کے احکام کی بیروی کے بجائے اپنی خسیس خواہشات کی پیروی کی، رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ہماری امت کے خواہش پرستوں نے بھی وہی کام کیا، بلکہ انہوں نے اپنے پاس سے ایسے فقہی ضابطے بنائے اور انہیں اللہ کا حکم باور کروایا کہ جن سے اللہ کی حدود سے باطل ہو گئیں۔ ساتھ ہی ہر حرام کام کی سزا سے بچنے کے لیے اس کا نام بدل دیا، یا اس کی حد سے بچنے کا حیلہ ایجاد کر دیا۔ وحدت الوجود اور تصور شیخ کے شرکیہ عقیدے اور عمل کو طریقت اور معرفت کا خوش نما نام دے لیا۔ زنا کی سزا سے بچنے کے لیے کہہ دیا کہ اجرت پر لا کر عورت سے زنا کرنے پر حد نہیں۔ زنا کا نام حلال اور متحہ رکھ دیا۔ ماں، بہن، بیٹی اور دوسری محرمات سے، یہ جانتے ہوئے کہ حرام ہیں، نکاح کر کے زنا کرے تو حد معاف قرار دی۔ کانوں اور آنکھوں کے زنا کو سامع، روح کی غذا یا آرت اور فنون لطیفہ کہہ دیا۔ سود حلال کر لیا مگر نام اس کا منافع رکھ دیا۔ دار الحرب میں سود کو بالکل ہی جائز قرار دے لیا۔ جان بوجھ کر زکوٰۃ سے بچنے کے لیے کوئی بھی حیلہ کرنا جائز کر دیا اور کہہ دیا کہ یہ مکروہ بھی نہیں۔ کوئی خوبصورت لڑکی پسند آجائے اور جھوٹے گواہ بھگت کر قاضی سے اپنے حق میں فیصلہ کروا کر اس سے زنا کر لے تو اسے اللہ کے ہاں بھی گرفت سے بری قرار دیا۔ زنا پر پکڑا جائے، چار گواہ بھی بھگت جائیں مگر زانی کے صرف یہ کہہ دینے سے کہ یہ میری بیوی ہے، حد ختم کر دی، خواہ وہ بیوی ہونے کا کوئی ثبوت بھی پیش نہ کر سکے اور خواہ وہ عورت چینی چلاتی رہے کہ میں اس کی بیوی نہیں بلکہ فلاں کی بیوی ہوں۔ انگور اور کھجور کے سوا کسی بھی چیز سے بنی ہوئی شراب حلال قرار دی اور نشہ آنے کے باوجود بھی اس سے حد ساقط کر دی اور نام بدل کر نیند، طلا یا کوئی اور رکھ لیا۔ قتل جان بوجھ کر کرے مگر تیز دھار آلے سے نہ کرے، یا آگ اور فائر سے نہ کرے تو قصاص ختم کر دیا، خواہ جان بوجھ کر اس سے بد فعلی کر کے مار دے، یا پتھروں سے مار دے، یا برف کے بلاک میں رکھ کر یا ڈبو کر مار دے، یا اسے قید کر کے بھوکا مار دے، یا دیوار میں چن کر مار دے، قصاص ختم کر دیا، صرف دیت لی جاسکتی ہے۔ چوری شہادتوں

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ﴿٦٠﴾
 جَنَّتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًا ﴿٦١﴾

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا ﴿٦٠﴾ بیگلی کے باغات میں، جن کا رحمان نے اپنے بندوں سے (ان کے) بن دیکھے وعدہ کیا ہے۔ بلاشبہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا وعدہ ہمیشہ سے پورا ہو کر رہنے والا ہے ﴿٦١﴾

سے ثابت ہو جائے مگر صرف چور کے دعویٰ کر دینے سے کہ میں اس کا مالک ہوں، خواہ وہ مالک ہونے کی کوئی دلیل بھی نہ دے، حد موقوف کر دی گئی۔ غرض یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ہاں جان، مال اور عزت و آبرو اس قدر برباد نہیں تھی جس قدر مسلمانوں نے خواہش پرستی میں آکر اسے برباد کیا اور نام اس کا تو انہیں اسلام رکھ دیا۔ ان لوگوں نے تو یہ سب کچھ حیلے ایجاد کر کے کیا مگر موجودہ اکثر مسلم حکمرانوں نے حیلے کا تکلف بھی چھوڑ دیا اور صاف الفاظ میں حکم الہی کو وحشیانہ کہہ کر اسلام کی آخری کڑی نماز سے بھی فارغ ہو گئے۔ غرض رسول اللہ ﷺ کی وہ بات سچی ہوئی: «لَتَتَّبِعَنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتَّىٰ لَوْ سَلَكَوا حُجْرًا ضَبَّ لَسَلَكْتُمُوهُ» (بخاری، احادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام: ۳۴۵۶، عن ابي سعيد رَضِيَ اللهُ عَنْهُ) "تم اپنے سے پہلوں کے طریقوں پر چل نکلو گے (جس طرح) بالشت بالشت کے ساتھ اور ہاتھ ہاتھ کے ساتھ (برابر ہوتا ہے) حتیٰ کہ اگر وہ سانڈے کے بل میں داخل ہوئے ہیں تو تم بھی اس میں ضرور داخل ہو گے۔" نتیجہ مسلمانوں کی غلامی اور اللہ کے دشمنوں کے ان پر مسلط ہونے کی صورت میں سب کے سامنے ہے، جسے اللہ نے "غِيَا" (گمراہی) فرمایا ہے۔ علاج اس کا بھی وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔

﴿٦١﴾ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غِيَاً: "گمراہی کو ملیں گے" کا مطلب یہ ہے کہ دنیا و آخرت دونوں میں جنت کی راہ نہیں پا سکیں گے اور اس سے بھٹکے ہی رہیں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "غِيَاً" کی تفسیر خسار فرمائی ہے۔ [طبری بسند ثابت] "غِيَاً" کی تفسیر جہنم کی ایک وادی یا کنواں صحیح سند کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے یا ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں۔ ہاں، یہ درست ہے کہ ساری کی ساری جہنم ہی گمراہی کا انجام بد ہے، جسے مجرم جا ملیں گے۔

آیت 60: إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا : نماز ضائع کرنے اور خواہشات کی پیروی جیسی بیماریوں کے لیے نسخہ شفا توبہ، ایمان اور عمل صالح ہے۔ توبہ، ایمان اور عمل صالح، یعنی نماز کی پابندی اور اپنی خواہشات کو اللہ کے حکم کے تابع کرنے والا شخص جنت میں داخل ہوگا اور اس کا کوئی اجر مارا نہ جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ» [ابن ماجہ، الزهد، باب ذکر الذنوب: ۴۲۵۰، عن ابي عبد الله بن مسعود رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَحَسَنَةُ الْأَلْبَانِي] "گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص جیسا ہے جس کا کوئی گناہ نہ ہو۔"

آیت 61: جَنَّتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَنُ عِبَادَهُ..... : بیگلی کی جنتوں کا وعدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اپنے رحمان ہونے اور

لَا يَسْعُونَ فِيهَا لَعْوًا إِلَّا سَلَامًا ۗ وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ﴿۳۷﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۳۸﴾

وہ اس میں کوئی لغو بات نہ سنیں گے مگر سلام اور ان کے لیے اس میں ان کا رزق صبح و شام ہوگا ﴿۳۷﴾ یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اسے بناتے ہیں جو بہت نچنے والا ہو ﴿۳۸﴾

بندوں کو اپنا بندہ کہنے کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی رحمت کس قدر بے حساب و بے کنار ہے اور فرماں بردار بندوں سے اس کا تعلق کتنا گہرا اور پیارا ہے۔ ”بن دیکھے“ کا مطلب یہ ہے کہ بندوں سے اس رحمان نے وعدہ کیا ہے جس رحمان کو انہوں نے نہیں دیکھا، یعنی بن دیکھے اس پر ایمان لائے ہیں۔ دوسرا معنی ہے کہ رحمان نے ان سے ایسی جنتوں کا وعدہ کیا ہے جو انہوں نے دیکھی نہیں مگر انہیں دیکھے بغیر ہی ان کے ملنے کا یقین ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ رحمان کا وعدہ ہمیشہ پورا ہو کر رہنے والا ہے۔ ”اِنَّ“ تقلیل کے لیے ہے۔ ”قَاتِبِيًّا“ ”اَتِي يَأْتِي“ سے اسم مفعول ہے۔ اللہ کا وعدہ جنت ہے اور اس کے بندے یقیناً اس میں آنے والے ہیں، یہ بات اس لیے فرمائی کہ عموماً لوگ ان دیکھی چیزوں کے کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کرتے۔ (بقائ) اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہنے پر مشتمل آیات کے لیے دیکھیے سورہ رعد (۳۱)، آل عمران (۱۹۳، ۱۹۵)، بنی اسرائیل (۱۰۸)، مزمل (۱۷، ۱۸) اور فرقان (۱۶، ۱۵)۔

آیت 62 ﴿۱﴾ لَا يَسْعُونَ فِيهَا لَعْوًا إِلَّا سَلَامًا : اہل ایمان کے لیے دنیا میں ایک شدید تکلیف لغو کلام سنا ہے، جیسے وہ سنا نہیں چاہتے۔ اس تکلیف کا اندازہ اور اس سے بچنے کی نعمت کی قدر صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جنہیں اس سے سابقہ پڑا ہو۔ جنت میں انہیں ایسی باتوں کے بجائے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا فرشتوں کی طرف سے یا ایک دوسرے کی طرف سے سلام کی آواز آئے گی۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۵۸) اور سورہ رعد (۲۳، ۲۴) یا ایسی بات سنائی دے گی جو ہر طرح کی تکلیف سے پاک اور سراسر سلامتی والی ہوگی، یعنی کوئی لغو یا تکلیف دہ بات ان کے کانوں میں نہیں پڑے گی۔

﴿۲﴾ بُكْرَةً وَعَشِيًّا: بظاہر معنی یہ ہے کہ اتنی دیر کے بعد جتنی دیر کے بعد دنیا میں صبح سے شام ہوتی ہے مگر یہ معنی راجح نہیں، کیونکہ اتنی دیر تو دنیا میں کھانے پینے سے صبر کرنا مشکل ہے، تو وہ جنت ہی کیا ہوئی جس میں صرف صبح و شام راشن ملے۔ اس لیے اس کا معنی ہر وقت اور ہمیشہ ہے، یعنی ہر وقت جب بھی انہیں کھانے کی یا لذت کی کسی بھی چیز کی خواہش ہوگی، کیونکہ جنت میں دنیا کی طرح کا نہ دن ہوگا اور نہ رات۔ صبح شام بول کر پہنچگی مراد لینا صرف عربی ہی نہیں ہر زبان کا عام محاورہ ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ جنتیوں کو ہر وہ چیز ملے گی جس کی انہیں خواہش ہوگی، خواہ کسی وقت خواہش ہو۔ دیکھیے سورہ زخرف (۱۷)۔

آیت 63 ﴿۱﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ..... : یعنی جنت کا وارث وہ ہوگا جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور کفر و شرک اور گناہوں سے بہت بچنے والا ہو۔ اس آیت میں متقی لوگوں کو جنت کا وارث بنانے کا ذکر ہے۔ یہی بات سورہ مومنون (۱۰ تا ۱۱) اور اعراف (۲۲، ۲۳) میں بیان کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اہل جنت کس کے وارث بنیں گے؟ اس کا ایک جواب

وَمَا تَنْزِيلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۗ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَلِكَ ۗ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٥﴾ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ ۗ هَلْ

اور ہم نہیں اترتے مگر تیرے رب کے حکم کے ساتھ۔ اسی کا ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو اس کے درمیان ہے اور تیرا رب کبھی کسی طرح بھولنے والا نہیں ﴿٦٥﴾ جو آسمانوں کا اور زمین کا اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کا رب ہے، سو اس کی عبادت کرو اور اس کی عبادت پر خوب صابر رہو۔ کیا تو اس پر ہے کہ ان کے باپ آدم کو جنت ملی تھی اور اولاد اپنے باپ کی جائداد کی وارث ہوتی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم دونوں میں بنی آدم کی جگہ بنائی ہے۔ اہل جہنم اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے جنت میں اپنی جگہ سے محروم ہو جائیں گے تو اس کے وارث جنتی ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كُلُّ أَهْلِ الْحَنَّةِ يَرَى مَفْعَدَهُ مِنَ النَّارِ فَيَقُولُ لَوْلَا أَنَّ اللَّهَ هَدَانِي فَيَكُونُ لِي شُكْرٌ، وَكُلُّ أَهْلِ النَّارِ يَرَى مَفْعَدَهُ مِنَ الْحَنَّةِ فَيَقُولُ لَوْلَا أَنَّ اللَّهَ هَدَانِي فَيَكُونُ عَلَيْهِ حَسْرَةٌ» [صحیح الجامع: ۴۵۱۴۔ مسند أحمد: ۵۱۲/۲، ح: ۱۰۶۶۳۔ مستدرک حاکم: ۴۳۶/۲، ح: ۳۶۲۹، عن امی ہریرہ رضی اللہ عنہا] ”تمام اہل جنت آگ میں اپنا ٹھکانا دیکھیں گے تو کہیں گے، اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے مجھے ہدایت دی (تو میں یہاں ہوتا)، تو وہ بہت شکر کرے گا اور تمام اہل نار جنت میں اپنی جگہ دیکھیں گے تو کہیں گے، اگر ایسا ہوتا کہ مجھے اللہ تعالیٰ ہدایت دے دیتا (تو میں یہاں ہوتا)، تو اس کے لیے بہت حسرت ہوگی۔“ مگر اس جواب میں یہ خیال گزرتا ہے کہ جنتیوں کو صرف جہنمیوں والی جگہ بطور میراث ملے گی، حالانکہ جنت میں ان کا اپنا حصہ بھی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَعَدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ [ال عمران: ۱۳۳] ”(یہ جنت) ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔“ لہذا یہ معنی مروج ہے۔ اس لیے اکثر مفسرین نے ”نورث“ کا معنی یہ کیا ہے کہ ہم متقی لوگوں کو ہر طرح سے اس کا مالک بنا دیں گے، وہ کبھی ان سے واپس نہ لی جائے گی، بلکہ وہ میراث کی طرح انھی کی ہو جائے گی، کیونکہ کسی چیز کی ملکیت حاصل ہونے کی سب سے سچی صورت میراث ہے، اس لیے کہ ملکیت حاصل ہونے کی دوسری تمام صورتوں میں ملکیت چھیننے کی گنجائش ہوتی ہے، بیع ہو یا ہبہ یا غصب، اس کا مالک اسے واپس لے سکتا ہے، یا بدل سکتا ہے، مگر وارث کو یہ فکر نہیں ہوتی۔ یہ معنی بھی مضبوط ہے۔

آیت 65.64 ﴿٦٥﴾ وَمَا تَنْزِيلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ: ”نزل“ کے بجائے ”تنزل“ اس لیے فرمایا کہ باب تفاعل میں ٹھہر ٹھہر کر کام کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم وقفے وقفے سے ٹھہر ٹھہر کر تیرے رب ہی کے حکم سے اترتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: «قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِجِبْرِيلَ: مَا يَمْنَعُكَ أَنْ تَرُورَنَا أَكْثَرَ مِمَّا تَرُورَنَا فَنَزَلْتُ: ﴿وَمَا تَنْزِيلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَنْ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا﴾» [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿وَمَا تَنْزِيلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ﴾] [۴۷۳۱] ”ایک مرتبہ نبی ﷺ نے جبریل رضی اللہ عنہ سے کہا: ”آپ ہماری ملاقات کے لیے جتنا آتے ہیں اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے؟“ تو یہ آیت اتری: ﴿وَمَا تَنْزِيلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ﴾ شاہ عبدالقادر بریلوی لکھتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ

تَعَلَّمْ لَهُ سَبِيًّا ﴿١٥﴾

کا کوئی ہم نام جانتا ہے؟ ﴿١٥﴾

نے یہ کلام سکھایا جبریل علیہ السلام کو کہ جواب میں یوں کہو۔ سو یہ کلام ہے اللہ کا جبریل کی طرف سے، جیسا کہ ”إِنَّا كُنَّا نَعْبُدُ وَإِنَّا كُنَّا نَسْتَعِينُ“ ہم کو سکھایا۔

﴿١٥﴾ لَهٗ مَا يَبِينُ آيَاتِنَا : یعنی صرف یہی نہیں کہ ہم اپنی مرضی سے اترنے کا اختیار نہیں رکھتے، بلکہ ہم اپنی مرضی سے کسی کام کا اختیار بھی نہیں رکھتے، کیونکہ جو کچھ ہمارے آگے ہے، یا ہمارے پیچھے ہے، یا اس کے درمیان ہے، یعنی دائیں اور بائیں ہے، چاروں جہتوں کی ہر چیز کا مالک صرف اللہ ہے۔ اگلی آیت میں فرمایا کہ آسمان و زمین اور ان کے مابین اشیاء کا رب بھی وہی ہے۔ اس میں اوپر نیچے کی جہتیں اور ان کے درمیان کی ہر چیز بھی آگئی، اس کے علاوہ جو ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اس میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے بھی آگئے، یعنی جس ہستی کا قبضہ، ملکیت اور ربوبیت اتنی مستحکم اور وسیع ہے کہ زمان و مکان میں سے کوئی چیز اس سے باہر نہیں، تو اس کی مرضی کے بغیر زمین پر اترنا تو کچا ہم کوئی حرکت بھی نہیں کر سکتے۔

﴿١٦﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا : ”نَسِيًّا“ ”فَبِعِلْمِ“ کے وزن پر مبالغہ ہے، بہت بھولنے والا۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ بہت بھولنے والا تو نہیں مگر کم بھولتا ہے، بلکہ اس طرح مبالغے کا لفظ آئے تو مبالغے کی نئی مراد نہیں ہوتی بلکہ نئی میں مبالغہ مراد ہوتا ہے، اس لیے معنی یہ ہوگا کہ تیرا رب کبھی کسی طرح بھولنے والا نہیں۔ کبھی کا مفہوم ”کَانَ“ سے واضح ہو رہا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ دیکھیے سورہ آل عمران (۱۸۲) اور انفال (۵۱) کی تفسیر۔ یہاں رب تعالیٰ سے بھولنے کی نفی کا مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام اگر دیر سے اتریں تو یہ مطلب نہیں کہ آپ کے رب نے آپ کو بھلا دیا ہے، جیسا کہ یہ مشرکین باتیں بنا رہے ہیں، وہاں بھولنے کا تو کسی طرح سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی حکمت کا تقاضا جبریل علیہ السلام کا اجازت کے ساتھ وقفے سے آنا ہی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ نضحیٰ کی تفسیر۔ ابودرداء رضی اللہ عنہما سے بیان فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿مَا أَحَلَّ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ فَهُوَ حَلَالٌ وَمَا حَرَّمَ فَهُوَ حَرَامٌ وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ عَافِيَةٌ فَاقْبَلُوا مِنَ اللَّهِ الْعَافِيَةَ فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُنْ نَسِيًّا، ثُمَّ تَلَا هَذِهِ الْآيَةَ: ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾﴾ [مستدرک حاکم: ۲/۳۷۵، ح: ۳۴۱۹۱ و سندہ حسن (حکمت بن ہشیر)] ”اللہ نے جو کچھ اپنی کتاب میں حلال کیا وہ حلال ہے اور جسے حرام کیا وہ حرام ہے اور جس سے خاموش اختیار فرمائی وہ معاف ہے، کیونکہ یہ وہی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ کوئی چیز بھول جائے۔“ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾۔

﴿١٧﴾ ”وَاصْطَلِبْ“ ”صَبْرٌ يَصْبُرُ“ سے باب افتعال کا فعل امر ہے۔ ”تاء“ کو ”طاء“ کر دیا اور حرف زیادہ ہونے سے معنی زیادہ ہو گیا، خوب صابر رہ، یعنی اس کی بندگی کرتے رہیے اور اس راہ میں جو مصائب و مشکلات پیش آئیں ان کا پورے صبر کے ساتھ مقابلہ کیجیے، اگر ہماری طرف سے کبھی یاد فرمائی یا مدد یا تسلی دینے میں کچھ تاخیر ہو جائے تو گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

و يَقُولُ الْإِنْسَانُ إِذَا مَا مِثٌ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾ أَوْ لَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَا خَلَقْنَاهُ
 مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿۶۷﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ
 جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾

اور انسان کہتا ہے کیا جب میں مر گیا تو کیا واقعی عنقریب مجھے زندہ کر کے نکالا جائے گا؟ ﴿۶۶﴾ اور کیا انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے ہی اسے اس سے پہلے پیدا کیا، جب کہ وہ کوئی چیز نہ تھا ﴿۶۷﴾ تو قسم ہے تیرے رب کی! بے شک ہم ان کو اور شیطانوں کو ضرور اکٹھا کریں گے، پھر بے شک ہم انہیں جہنم کے گرد ضرور گھنٹوں کے بل گھرے ہوئے حاضر کریں گے ﴿۶۸﴾

﴿۶۶﴾ هَلْ تَعْلَمُ لِمَ سَبَبْنَا: وہ دو شخص جن کا نام ایک ہو، ایک دوسرے کے ”سببی“ (ہم نام) کہلاتے ہیں۔ شاہ عبد القادر زکریا فرماتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ کے جتنے نام ہیں سب اس کی صفت ہیں، یعنی کوئی ہے اس کی صفت کا؟“ (موضح) یہاں ”سَبَبْنَا“ کا معنی ”نظیر“ اور ”مثیل“ ہے۔ گویا اس آیت اور دوسری آیت: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشوری: ۱۱۱] کا معنی ایک ہی ہے، یعنی جب اس جیسا آپ کسی کو نہیں سمجھتے تو پھر اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ اس کے راستے پر چلتے رہیے۔

﴿۶۷﴾ وَمَا نُنزِّلُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَإِنَّا بِالْحَقِّ لَنُحْضِرُكُمْ ﴿۶۷﴾ لَمْ يَكُنْ لَكَ مِن قَبْلُ شَيْءٌ ﴿۶۷﴾ لَمْ يَكُنْ لَكَ مِن قَبْلُ شَيْءٌ ﴿۶۷﴾ کی تفسیر۔ آیت 66 وَ يَقُولُ الْإِنْسَانُ إِذَا مَا مِثٌ اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ لیس (۷۶)۔

آیت 67 أَوْ لَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَا خَلَقْنَاهُ تو کیا جس ذات پاک نے اس وقت اسے پیدا فرمایا جب یہ کچھ بھی نہ تھا، اس کے لیے یہ مشکل ہے کہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندگی دے سکے؟ دوبارہ زندہ کرنے کی یہ سب سے قوی دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے بار بار قرآن مجید میں بیان فرمائی ہے۔ دیکھیے سورہ دہر (۲۰)، واقعہ (۶۲)، روم (۴۷)، حج (۵)، بنی اسرائیل (۵۱) اور انبیاء (۱۰۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى كَذَّبَنِي ابْنُ آدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذَلِكَ، وَشَتَمَنِي وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذَلِكَ، فَأَمَّا تَكْذِيبُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ: لَنْ يُعِيدَنِي كَمَا بَدَأَنِي، وَ لَيْسَ أَوَّلُ الْخَلْقِ بِأَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ إِعَادَتِهِ، وَأَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا، وَأَنَا الْأَحَدُ الصَّمَدُ، لَمْ أَلِدْ وَلَمْ أُولَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لِي كُفُوًا أَحَدٌ﴾ [بخاری، التفسیر، باب تفسیر سورة ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾: ۴۹۷۴، عن أبي هريرة ؓ] ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ابن آدم نے مجھے جھٹلایا حالانکہ یہ اس کا حق نہ تھا اور ابن آدم نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ اس کا حق نہ تھا، اس کا مجھے جھٹلانا تو اس کا یہ کہنا ہے کہ جس طرح اس نے مجھے پہلے پیدا کیا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا، حالانکہ مجھے پہلی دفعہ پیدا کرنا دوبارہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان نہیں اور رہا اس کا مجھے گالی دینا، تو اس کا یہ کہنا ہے کہ اللہ نے اولاد بنا رکھی ہے، حالانکہ میں ایک ہوں، بے نیاز ہوں، نہ میں نے کسی کو جنا، نہ کسی نے مجھے جنا اور نہ ہی کبھی میرا کوئی ہمسر ہے۔“

آیت 68 ﴿۶۸﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ”جِثِيًّا“ ”حَنَّا نُحْشِرُهُمْ حُشْرًا“ اور ”حَتَّى يَحْشُرَهُمْ حُشْرًا“ (ن، ض) سے اسم قائل

ثُمَّ لَنَزَعْنَنَ مِنْ كُلِّ شَيْعَةٍ اِيَهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ۝۶۹ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِاللَّذِينَ هُمْ اُولٰى بِهَا صٰلِحِيًّا ۝۷۰ وَ اِنْ مِنْكُمْ اِلَّا وَاٰرِدُهَا ؕ كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝۷۱

پھر بے شک ہم ہر گروہ میں سے اس شخص کو ضرور کھینچ نکالیں گے جو ان میں سے رحمان کے خلاف زیادہ سرکش ہے ۶۹ پھر یقیناً ہم ان لوگوں کو زیادہ جاننے والے ہیں جو اس میں جھوٹے جانے کے زیادہ حقدار ہیں ۷۰ اور تم میں سے جو بھی ہے اس پر وارد ہونے والا ہے۔ یہ ہمیشہ سے تیرے رب کے ذمے قطعی بات ہے، جس کا فیصلہ کیا ہوا ہے ۷۱

”نَحَابٌ“ (الْحَائِبِيُّ) کی جمع ہے، گھٹنوں کے بل کرنے والے۔ قیامت کے منکروں کو اس کا یقین دلانے کے لیے قسم اٹھا کر فرمایا کہ تیرے رب کی قسم ہے کہ ہم انہیں اور ان کو گمراہ کرنے والے شیطانوں کو ضرور اکٹھا کریں گے۔ شیطانوں میں قرین بھی شامل ہیں (دیکھیے سورہ ق: ۲۳) اور ابلیس کی اولاد اور انسانوں میں سے گمراہ کرنے والے شیطان بھی۔ دیکھیے سورہ انعام (۱۱۳) جہنم کے گردان کی حاضری کی تصویر دکھانے کے لیے فرمایا کہ وہ جہنم کے گرد نہایت ذلیل و خوار اور خوف زدہ ہو کر گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے اور ان میں کھڑا ہونے کی طاقت نہیں ہوگی۔ دیکھیے سورہ جاثیہ (۲۸)۔

② ”تیرے رب کی قسم“ اس میں دو فائدے حاصل ہو رہے ہیں، ایک تو قسم کی وجہ سے بات کی تاکید، دوسرا رسول اللہ ﷺ کی شان کی رفعت، جیسا کہ سورہ ذاریات کی آیت (۲۳): ﴿فَوَزَّبَ السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ اِنَّهُ لَحَقُّ فَعْلًا مَا اَنَّهُ تَطْلِفُونَ﴾ سے آسمان و زمین کی عظمت ظاہر ہو رہی ہے۔ (مطلحی)

آیت 69 : ثُمَّ لَنَزَعْنَنَ مِنْ كُلِّ شَيْعَةٍ اِيَهُمْ : ”عِتِيًّا“ ”عَنَا يَعْتُو“ سے ”عَتُوًّا“ کی طرح مصدر ہے، تکبر، سرکشی، حد سے گزرتا۔ ”شَيْعَةٍ“ وہ گروہ جو ایک ہی قسم کا ہو، یعنی پھر ہم ہر باغی گروہ میں سے اس کے سب سے بڑے سرکش اور پیشوا کو، جس نے انہیں کفر و شرک میں پھنسایا اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں سرکشی کی راہ دکھائی، نکال کر الگ کھڑا کریں گے اور ایسے لوگوں کو سب سے پہلے جہنم میں جھونکیں گے، کیونکہ انہوں نے دو جرم کیے، خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، پھر درجہ بدرجہ ان کے پیروکاروں کی باری آئے گی۔ دیکھیے سورہ اعراف (۳۸، ۳۹)، نحل (۲۵) اور عبکوت (۱۳)۔

آیت 70 : ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِاللَّذِينَ هُمْ : ”صٰلِحِيًّا“ ”صَلِيٍّ يَصْلِي“ بروزن ”رَضِيٍّ يَرْضِي“ کا مصدر ہے، آگ میں داخل ہو کر اس کی تپش کی تکلیف اٹھانا، یعنی پھر ہمیں خوب معلوم ہے کہ اس جہنم میں جھوٹے جانے کے زیادہ لائق کون ہے اور وہ گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے دونوں ہیں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قَالَ لِكُلِّ ضِعْفٌ وَلٰكِنْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ [الاعراف: ۳۸] ”اللہ فرمائے گا سبھی کے لیے دگنا (عذاب) ہے اور لیکن تم نہیں جانتے۔“ کیونکہ گمراہ ہونے والوں نے بھی کئی لوگوں کو گمراہ کیا۔

آیت 71 : وَ اِنْ مِنْكُمْ اِلَّا وَاٰرِدُهَا : لغت کے اعتبار سے ”وارد ہونے“ کے معنی ”داخل ہونا“ اور ”اوپر سے گزرتا“ دونوں ہو سکتے ہیں، اس لیے ترجمہ ”وارد ہونے والا“ ہی کر دیا ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں ”وارد ہونے“ سے مراد

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَ نَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثًا ۝۷۲

پھر ہم ان لوگوں کو بچالیں گے جو ڈر گئے اور ظالموں کو اس میں گھنٹوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے ۷۲

جسر (پل) سے گزرنا ہے، جسے بعض احادیث میں ”صراط“ بھی کہا گیا ہے۔ عام لوگوں نے فارسی اور عربی کو جمع کر کے اس کا نام ”پل صراط“ رکھ لیا ہے۔ یہ پل چونکہ جہنم کے اوپر رکھا جائے گا، اس لیے یہ جہنم پر سے گزرنا ہی ہے۔ متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ ہر نیک و بد اور ہر کافر و مومن کو اس پل پر سے گزرنا پڑے گا۔ جن مفسرین نے اس کے معنی ”داخل ہونا“ کیے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ حدیث کے مطابق ”تَحِلَّةُ النَّفْسِ“ یعنی قسم پوری کرنے کے لیے ہر مومن و کافر ایک مرتبہ جہنم میں داخل ہوگا، مگر مومنوں پر وہ آگ ٹھنڈی اور باعثِ رحمت بنا دی جائے گی۔ مگر پہلا معنی راجح ہے، اگر کسی حدیث میں لفظ ”دخول“ (داخل ہونا) آیا ہے تو صراطِ اولیٰ حدیث کے مطابق اس سے مراد بھی گزرنا ہے۔ اس معنی سے کتاب و سنت کے دلائل کے درمیان تطبیق ہو جاتی ہے۔

آیت 72 ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا..... یعنی پھر ہم پرہیزگاروں کو جہنم سے بچالیں گے (صراط سے سلامت گزار کر یا صراط سے جہنم میں گرنے کے بعد) اور کافروں کو ہمیشہ کے لیے اسی میں گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔ انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین اور عام مسلمان جہنم کے اوپر صراط سے اپنے اعمال کے مطابق تیزی سے یا گرتے پڑتے گزر جائیں گے اور کافر اور زیادہ گناہ کار مسلمان پل پر سے جہنم میں گر پڑیں گے، پھر اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو سزا پوری ہونے کے بعد یا شفاعت سے یا محض اپنے فضل سے جہنم سے نکال لے گا اور صرف کافر و مشرک ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ اس کی دلیل ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت میں رب تعالیٰ کو دیکھنے کا ذکر فرمایا، اس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ثُمَّ يُؤْتِي بِالْحَسْرِ فَيَجْعَلُ بَيْنَ ظَهْرِي جَهَنَّمَ، قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَمَا الْحَسْرُ؟ قَالَ مَذْحَضَةٌ مَرَّةٌ عَلَيْهِ حَطَا طَيْفٌ وَ كَلَالِيْبٌ، وَ حَسَكَةٌ مُفْلَطْحَةٌ لَهَا شَوْكَةٌ عَقِيْقَةٌ تَكُوْنُ بِنَحْدِ، يُقَالُ لَهَا السَّعْدَانُ، الْمُؤْمِنُ عَلَيْهَا كَالطَّرْفِ وَ كَالْبَرْقِ وَ كَالرِّيْحِ وَ كَأَجَاوِيْدِ الْخَيْلِ وَ الرَّكَابِ، فَنَاجِ مُسْلِمٌ، وَ نَاجِ مَخْدُوْشٌ، وَ مَكْدُوْشٌ فِي نَارِ جَهَنَّمَ، حَتَّى يَمْرَأَ جِرْهُمُ يُسْحَبُ سَحْبًا، فَمَا أَنْتُمْ بِأَشَدَّ لِيْ مُنَاشِدَةً فِي الْحَقِّ، قَدْ تَمَّيْنُ لَكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِ يَوْمَئِذٍ لِلْحَبَّارِ، وَ إِذَا رَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ نَحَوْا فِي إِخْوَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا إِخْوَانُنَا كَانُوْا يُصَلُّوْنَ مَعَنَا وَ يَصُوْمُوْنَ مَعَنَا وَ يَعْمَلُوْنَ مَعَنَا، فَيَقُوْلُ اللَّهُ تَعَالَى: اذْهَبُوا فَمَنْ وَحَدَّثْتُمْ فِي قَلْبِهِ بِمُقَالِ دِيْنَارٍ مِنْ إِيمَانٍ فَأَخْرَجُوْهُ..... فَيَسْفَعُ النَّبِيُّوْنَ وَ الْمَلَائِكَةُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ فَيَقُوْلُ الْحَبَّارُ بَقِيْتُ شَفَاعَتِي، فَيَقْبِضُ قَبْضَةً مِنَ النَّارِ فَيَخْرُجُ أَقْوَامًا قَدْ اْمْتَحَسُّوْا)) [بخاری، التوحید، باب: ﴿ وَ جَوْدٌ يَوْمَئِذٍ نَاصِرَةٌ..... ﴾ : ۷۴۳۹، عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ] پھر

جسر (پل) کو لایا جائے گا اور اسے جہنم کے درمیان رکھ دیا جائے گا۔ ہم نے کہا: ”یا رسول اللہ! اور وہ جسر (پل) کیا چیز

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ
مَّقَامًا وَ أَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾

اور جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان لوگوں سے کہتے ہیں جو ایمان
لائے کہ دونوں گروہوں میں سے کون مقام میں بہتر اور مجلس کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہے ﴿۷۳﴾

ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”وہ بہت پھسلانے والا ہے، اس پر کندھے اور آکلڑے ہیں اور بہت چوڑے گوگرد (ایک کانٹا جو سہ
گوشہ ہوتا ہے)، جن میں مزے ہوئے کانٹے ہیں، جو نجد میں ہوتے ہیں، انہیں سعدان کہتے ہیں، مومن اس پر سے نگاہ کی
طرح اور بجلی کی طرح اور آندھی کی طرح اور بہترین گھڑ سواروں اور اونٹ کے سواروں کی طرح گزر جائیں گے، پھر کوئی صحیح
سلامت بچ کر نکلے والا ہوگا، کوئی زخمی ہو کر بچ نکلے والا، کوئی جہنم کی آگ میں گر دیا جائے والا، یہاں تک کہ ان کا آخری شخص
گھسٹتا ہوا گزر جائے گا۔ تو تم مجھ سے اس حق کا، جو بالکل واضح ہو چکا ہو، اس سے زیادہ مطالبہ کرنے والے نہیں جس قدر
مومن اپنے بھائیوں کے بارے میں اس دن جبار (اللہ تعالیٰ) سے مطالبہ کرے گا اور اس وقت جب وہ دیکھیں گے کہ وہ بچ
نکلے ہیں، کہیں گے، اے ہمارے رب! ہمارے بھائی ہیں جو ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے
اور ہمارے ساتھ عمل کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، جاؤ اور جسے پاؤ کہ اس کے دل میں دینار کے برابر ایمان ہے اسے
نکال لو۔۔۔ (الہی حدیث ہے جس میں نصف دینار کے برابر ایمان والوں کو، پھر ذرہ برابر ایمان والوں کو آگ سے نکالنے کا
ذکر ہے) چنانچہ انبیاء، فرشتے اور مومن شفاعت کریں گے، پھر جبار فرمائے گا، میری شفاعت باقی رہ گئی تو وہ آگ میں سے
ایک مٹھی بھرے گا اور ایسے لوگوں کو نکالے گا جو کونکہ ہو چکے ہوں گے۔“

آیت 73 وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ : ”مَقَامًا“ جائے قیام، یعنی رہنے کی جگہ، گھر وغیرہ۔ ”نَدِيًّا“ ”نَدْوَاتُ
الْقَوْمِ“ ”أَنْدُوهُمْ“ (میں نے قوم کو جمع کیا) سے ہے۔ ”النَّادِي“ ”النَّدِي“ اور ”النَّمْنَدِي“ کا معنی لوگوں کی مجلس، اکٹھے
ہونے کی جگہ۔ کفار جب اللہ تعالیٰ کی واضح آیات سنتے اور ان کا حق ہونا اس قدر واضح ہوتا کہ وہ کسی صورت نہ ان کا جواب
دے پاتے اور نہ غلط کہہ سکتے، تو اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اور اپنے آپ کو حق پر ثابت کرنے کے لیے دنیوی لحاظ سے
کمزور ایمان والوں سے کہتے کہ اپنی حالت اور ہماری حالت دیکھو! کس کے رہنے کے مکانات بہتر اور کس کی مجلس زیادہ
شان و شوکت والی اور سچی ہوئی ہے؟ گویا انہوں نے دنیوی ساز و سامان اور شان و شوکت کو اپنے حق پر ہونے اور اللہ تعالیٰ
کے ان پر راضی ہونے کی دلیل قرار دیا۔ قرآن مجید میں تمام انبیاء کے زمانے کے کفار کی یہی سوچ بیان ہوئی
ہے۔ دیکھیے سورۃ احقاف (۱۱)، انعام (۵۳)، سبا (۳۵)، مومنون (۵۶، ۵۵)، مریم (۷۷)، کہف (۳۵، ۳۶) اور
ظہر السجدہ (۵۰)۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِئَاسًا ۗ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَبْذُذْ لَهُ الرَّحْمَنُ مَدَاةً حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ ۗ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضْعَفُ جُنْدًا ۗ

اور ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے جو ساز و سامان میں اور دیکھنے میں کہیں اچھے تھے ﴿۷۴﴾ کہہ دے جو شخص گمراہی میں پڑا ہو تو لازم ہے کہ رحمان اسے ایک مدت تک مہلت دے، یہاں تک کہ جب وہ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، یا تو عذاب اور یا قیامت کو، تو ضرور جان لیں گے کہ کون ہے جو مقام میں زیادہ برا اور لشکر کے اعتبار سے زیادہ کمزور ہے ﴿۷۵﴾

آیت 74 وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ: "اَثَاثًا" گھر کا ساز و سامان جس میں اونٹ، گھوڑے، بھینٹ بکریاں اور غلام وغیرہ بھی شامل ہیں۔ "رِئَاسًا" "رَأَى يَرَى" (ف) کا مصدر ہے، بمعنی مفعول یعنی دیکھنے کی چیزیں۔ مصدری معنی بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ ترجمہ میں کیا گیا ہے۔ یعنی جب نافرمانی کے بعد ان سے کہیں بڑھ کر ساز و سامان اور شان و شوکت والوں کو ان کی دنیوی خوش حالی ہمارے عذاب سے نہ بچا سکی تو یہ بے چارے کس شمار و قطار میں ہیں؟ حقیقت میں دنیا کے ٹھاٹھ باٹ اور جاہ و جلال پر پھولنا اور نادار مسلمانوں کو حقیر جانتا پر لے درجے کی حماقت ہے۔

آیت 75 ۱. قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ: اس سوال کے جواب میں کہ ہم کفار سے کیا کہیں؟ حکم ہوا کہ ان سے کہو، آؤ! مہلت کر لیں اور ہم تم دونوں مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہم دونوں میں سے جو فریق گمراہی پر ہے اسے اللہ تعالیٰ ایک مدت تک مہلت دے اور اسے اس کی اسی حالت میں رکھے، تاکہ کفار جب اس استدرج اور مہلت کی وجہ سے کفر کی حالت میں فوت ہوں تو انہیں پتا چل جائے کہ کس کے رہنے کی جگہ بدترین اور کس کا لشکر اور جتھا کمزور ترین ہے۔ اس تفسیر میں "فَلْيَبْذُذْ" کو اصل معنی "امر" پر رکھا گیا ہے۔ ابن کثیر اور ابن جریر نے صرف یہی تفسیر فرمائی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال سورہ آل عمران کی آیت (۶۱) اور سورہ بقرہ کی آیت (۹۴) ہے۔ (شنتیطی)

۲. دوسری تفسیر اس آیت کی یہ ہے کہ اس سوال کے جواب میں کہ ہم کفار کی اس دلیل کا کیا جواب دیں؟ حکم ہوا کہ ان سے کہو کہ جو لوگ گمراہی میں مبتلا ہیں اللہ تعالیٰ نے طے کر رکھا ہے کہ انہیں کچھ نہ کچھ مہلت دے، تاکہ ان پر رحمت تمام ہو جائے۔ یہ نہ کہیں کہ ہمیں سوچنے کا وقت نہیں ملا۔ پھر جب دنیا ہی میں مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوں گے، یا موت کے وقت اس عذاب کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے، تو خود ہی اچھی طرح جائزہ لے لیں گے کہ کس کی رہنے کی جگہ زیادہ بری اور کس کا جتھا اور لشکر زیادہ کمزور ہے۔ آیت میں لفظ "الرَّحْمَنُ" کی حکمت یہ ہے کہ گمراہوں کو مہلت دینا اللہ تعالیٰ کی بے انتہا رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کفر سے توبہ کر لیں۔ قرآن مجید میں کئی آیات میں یہ بات

وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى وَالْبَقِيَّةَ الصَّالِحَاتِ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ مَرَدًّا ﴿٥١﴾ أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتِيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا ﴿٥٢﴾

اور اللہ ان لوگوں کو جنہوں نے ہدایت پائی، ہدایت میں زیادہ کرتا ہے اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے بہتر اور انجام کے لحاظ سے کہیں اچھی ہیں ﴿٥١﴾ تو کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا مجھے ضرور ہی مال اور اولاد دی جائے گی ﴿٥٢﴾

مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے۔ دیکھیے سورہ آل عمران (۱۷۸)، انعام (۴۳)، سبأ (۱۷) اور قلم (۴۵، ۴۳) اس تفسیر کی صورت میں ”فَلْيَسُدُّ لَهُ الرِّخْلَيْنِ“ میں امر بمعنی خبر ہے۔ یہ معنی زیادہ قوی ہے، کیونکہ اس کے بعد والی آیت: ﴿وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى﴾ میں فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کافروں کو ان کی گمراہی میں مہلت دیتا ہے، اسی طرح ہدایت والوں کی ہدایت میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔

آیت 76 ﴿٥١﴾ وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى: یعنی جس طرح گمراہوں کو ڈھیل دیتا ہے اور وہ بدی کے راستے میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اسی طرح ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی مزید نیک کام کرنے کی توفیق دیتا جاتا ہے، جس سے وہ اس کی خوشنودی کے راستوں پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پھر ایمان کے بعد اغلاص کی دولت سے نوازنا بھی ”زَادَهُمْ هُدًى“ (انہیں ہدایت کی مزید توفیق دینا) میں داخل ہے۔ (کبیر)

﴿٥٢﴾ وَالْبَقِيَّةَ الصَّالِحَاتِ.....: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ کہف کی آیت (۳۶)۔

آیت 77 أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا.....: اوپر کی آیات میں حشر کے یقینی ہونے کے دلائل بیان فرمائے اور کفار کے شبہات کا جواب دیا تھا، اب ان لوگوں کا قول نقل فرمایا جو حشر میں طعن کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ صحیحین میں ہے، خباب ابن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «كُنْتُ قَبِيْنَا فِي الْحَاجِلِيَّةِ وَكَانَ لِي عَلَى الْعَاصِ بْنِ وَائِلٍ ذَيْنٌ فَأَتَيْتُهُ تَقَاضَاةً، قَالَ: لَا أُعْطِيكَ حَتَّى تَكْفُرَ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقُلْتُ لَا أَكْفُرُ حَتَّى يُبَيِّنَ لَكَ اللَّهُ ثُمَّ تَبِعْتُ، قَالَ دَعْنِي حَتَّى أَمُوتَ وَأُبْعَثَ فَسَأَلُونِي مَالًا وَوَلَدًا فَأَقْضَيْكَ فَتَرَلْتُ: ﴿أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتِيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا﴾»

أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمَّا أَخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ﴿﴾ « [بخاری، البيوع، باب ذكر القين والحداد: ۲۰۹۱۔ مسلم: ۳۵، ۳۶] ۲۷۹۵ ”میں زمانہ جاہلیت میں لوہار کا کام کیا کرتا تھا اور میرا عاص بن وائل (ایک مال دار کافر) پر کچھ قرض تھا۔ میں (ایک دن) تقاضے کے لیے اس کے پاس گیا، وہ کہنے لگا: ”میں تمہارا قرض اس وقت تک ادا نہیں کروں گا جب تک تم محمد ﷺ کی رسالت سے انکار نہ کرو۔“ خباب رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اللہ کی قسم! میں (محمد ﷺ کی رسالت سے) ہرگز انکار نہیں کروں گا، یہاں تک کہ تو مرکز دوبارہ زندہ ہو جائے۔“ کافر کہنے لگا: ”جب میں مرکز دوبارہ زندہ ہوں گا تو تم میرے پاس آنا،

أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ۖ كَلَّا ۗ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَ نَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۙ

کیا اس نے غیب کو جھانک کر دیکھ لیا ہے؟ یا اس نے رحمان کے ہاں کوئی عہد لے رکھا ہے؟ ﴿۷۸﴾ ہرگز نہیں! ہم ضرور لکھیں گے جو کچھ یہ کہتا ہے اور اس کے لیے عذاب میں سے بڑھائیں گے، بہت بڑھانا ﴿۷۹﴾

اس وقت میرے پاس خوب مال بھی ہوگا اور اولاد بھی، میں تمہارا قرض ادا کروں گا۔“ اس پر اللہ نے یہ (چار آیات ”فَرَدًّا“ تک) نازل فرمائیں۔“ اس واقعہ میں کفار کا قیامت سے مذاق کی صورت میں انکار کرنا بھی ہے اور اس کے خیال میں بالفرض قائم ہونے کی صورت میں دنیا پر قیاس کرتے ہوئے وہاں بھی مال و اولاد ملنے کے یقین کا اظہار بھی ہے۔ ایک ہی سانس میں اللہ تعالیٰ کے قیامت قائم کرنے پر قادر ہونے سے انکار ہے اور اسی سانس میں قیامت کے دن اسے مال و اولاد دینے پر قادر ہونے کا اظہار ہے۔ شرک ایسے ہی جاہل ہوتے ہیں۔ یہاں چونکہ زیادہ نمایاں قیامت کے دن دنیا کی طرح مال و اولاد ملنے کے یقین کا اظہار ہے، اس لیے اس سے پہلے آیات (۷۳، ۷۴) میں اس کا رد کیا ہے، اب مزید تین آیات میں اس کا رد فرمایا ہے۔

آیت 78 أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ : یعنی یہ بات تو ”کہ وہ جنت میں جائے گا اور خوب مال و دولت پائے گا“ وہی کر سکتا ہے جس نے غیب پر اطلاع پائی ہو، یا اس بے حد رحم والی ذات پاک سے کوئی عہد لے رکھا ہو جس نے اپنی بے حد رحمت کی بنا پر اپنے فرماں بردار بندوں سے انعام کا عہد کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ علم غیب جب پوری مخلوق میں سے کسی کے پاس نہیں تو اسے کیسے حاصل ہو گیا؟ رہا قیامت کے دن نعمتوں کا عہد، تو وہ رحمت کے حق داروں ہی سے ہے، جو ایمان دار ہیں۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۱۸) اس کافر سے وہ عہد کب اور کیسے ہوا؟

آیت 79 ﴿۱﴾ ”كَلَّا“ یہ لفظ انکار اور ڈانٹ کے لیے آتا ہے، یعنی یہ دونوں باتیں ہرگز نہیں ہیں، تو پھر ایک ہی بات رہ جاتی ہے کہ اس نے اپنے پاس سے ایک جھوٹی بات اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دی ہے۔ یہاں سورہ مریم میں اس تیسری بات کا ذکر نہیں، کیونکہ اس سے پہلے سورہ بقرہ میں یہود کے دعوے کی تردید کرتے ہوئے یہ بات گزر چکی ہے اور قرآن کی آیات ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں، فرمایا: ﴿وَقَالُوا لَنْ نَمُوتَ النَّازِلَ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۗ قُلْ أَتَّخَذُكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَفْلٰكُنْ يُخَلِّفُ اللَّهُ عَهْدَآءَ أَمْ قَسَمَؤُنَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ [البقرہ: ۸۰] ”اور انھوں نے کہا ہمیں آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گئے ہوئے چند دن۔ کہہ دے کیا تم نے اللہ کے پاس کوئی عہد لے رکھا ہے؟ تو اللہ کبھی اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا، یا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔“ (شقیلی)

﴿۲﴾ وَ نَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا : یعنی ہم اسے کئی گنا زیادہ عذاب دیں گے، ایک عذاب کفر کا، ایک استہزاء اور مذاق اڑانے کا، ایک اللہ کی راہ سے روکنے کا، ایک دوسروں کو کفر کی راہ پر لگانے کا، ایک فساد پھیلانے کا۔ مزید دیکھیے سورہ نعل (۸۸)، اعراف (۳۸) اور عنکبوت (۱۳) اسی طرح دنیا میں بھی مال و اولاد اور ہر قسم کی زیب و زینت کے ذریعے سے اسے عذاب

و نَرِيْتُهُ مَا يَقُوْلُ وَ يَاتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِلٰهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عَزًا ﴿۸۱﴾
 كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًا ﴿۸۲﴾

اور ہم اس کے وارث ہوں گے ان چیزوں میں جو یہ کہہ رہا ہے اور یہ اکیلا ہمارے پاس آئے گا ﴿۸۰﴾ اور انہوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا لیے، تاکہ وہ ان کے لیے باعث عزت ہوں ﴿۸۱﴾ ہرگز ایسا نہ ہوگا، عنقریب وہ ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے خلاف مد مقابل ہوں گے ﴿۸۲﴾

دیں گے، پھر موت اور آخرت میں مزید عذاب دیں گے، فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُعَذِّبَ بِهٖمۡ بِمَا فِى الدُّنْيَا ﴾ [النوبة: ۸۵] "اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ انہیں ان (اموال و اولاد) کے ذریعے سے دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔"

آیت 80 ﴿۸۰﴾ وَ نَرِيْتُهُ مَا يَقُوْلُ: یعنی جس مال و اولاد پر یہ فخر کر رہا ہے اس کے ہلاک ہونے کے بعد ان سب کے وارث ہم بنیں گے، جیسا کہ اسی سورت میں ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا وَ الْبَيْتَاتُ يَرْجَعُوْنَ ﴾ [مریم: ۶۰] "بے شک ہم، ہم ہی اس زمین کے وارث ہوں گے اور ان کے بھی جو اس پر ہیں اور وہ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔" ﴿۸۱﴾ وَ يَاتِيْنَا فَرْدًا: یعنی قیامت کے دن جب ہمارے پاس آئے گا تو اس کے ساتھ نہ اولاد ہوگی، نہ مال اور نہ کوئی جھٹلا۔ دیکھیے سورۃ انعام (۹۴)۔

آیت 81 ﴿۸۱﴾ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِلٰهَةً.....: حشر و نشر کے بیان کے بعد اب ان کے بنائے ہوئے معبودوں کی نفی ہے، خواہ انسان ہوں یا فرشتے یا جن یا بت یا آستانے یا قبریں۔ یعنی اللہ کے سوا انہوں نے اس لیے معبود بنا رکھے ہیں کہ ضرورت اور حاجت کے وقت اللہ تعالیٰ سے سفارش کر کے کام کروا سکیں، مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ سے کہہ کر اسے ٹال دیں، یا وہ موت اور قیامت کے وقت ان کو عذاب سے بچالیں اور اس طرح وہ ان کے لیے قوت و عزت کا باعث بن جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ یونس (۱۸) اور سورۃ زمر (۳) میں مشرکین کا یہی عقیدہ بیان فرمایا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کر ہی نہیں سکتا اور نہ کر سکے گا، آیت الکرسی میں ہے: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ يَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۵] "کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟"

آیت 82 ﴿۸۲﴾ كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ: انکار اس معنی میں کریں گے کہ وہ کہیں گے، ہم نے کبھی ان سے نہیں کہا تھا کہ ہماری عبادت کرو، یا ہمیں مصیبت کے وقت پکارو اور نہ ہمیں یہ خبر تھی کہ وہ ہماری عبادت کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات کئی جگہ بیان فرمائی ہے۔ دیکھیے سورۃ یونس (۲۹، ۲۸)، نحل (۸۶)، قصص (۶۳)، فاطر (۱۳، ۱۴) اور احقاف (۶، ۵) اسی طرح کفار بھی اپنے معبودوں کی عبادت سے مکر جائیں گے اور ان کے خلاف ہو جائیں گے، بلکہ قسم کھا کر کہیں گے کہ اللہ کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھیے سورۃ انعام (۲۳) بلکہ وہ اور ان کے معبود ایک دوسرے کو لعنت کریں گے۔ دیکھیے عنکبوت کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

أَلَمْ تَرَ أَنَا أَرْسَلْنَا الشَّيْطَانَ عَلَى الْكُفْرَيْنَ تَوَزَّهُمْ أَزًّا ﴿۳۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَذَابًا ﴿۳۴﴾

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے، وہ انھیں ابھارتے ہیں، خوب ابھارنا ﴿۳۳﴾ پس تو ان پر جلدی نہ کر، ہم تو بس ان کے لیے گن رہے ہیں، اچھی طرح گنتا ﴿۳۴﴾

(۲۵) اور سورہ بقرہ (۱۶۷، ۱۶۸)۔

② وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا: یعنی بجائے اس کے کہ وہ ان کے لیے بچاؤ یا عزت کا سبب بنیں، ان ان کی پکڑ کا سبب بنیں گے اور قیامت کے دن ان کے شدید مخالف اور ان کے لیے باعث حسرت ہوں گے۔ بے شمار معبودوں کے لیے "ضِدًّا" واحد کا لفظ استعمال فرمایا، کیونکہ "ضِدًّا" کا لفظ مصدر ہے، جو واحد و جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ ان پوجنے والوں کے خلاف ان کے معبودوں کے اتحاد و اتفاق کی وجہ سے ان کو "شَيْءٌ وَاحِدٌ" (ایک ہی چیز) فرض کر کے واحد کا صیغہ لایا گیا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمام مسلمانوں کے متعلق فرمایا: «وَهُمْ يَتَدَعَلُونَ عَلَى مَنْ سِوَاهُمْ» [أبو داؤد، المذہب، باب أيقاد المسلم من الكافر؟: ۴۵۳۰۔ نسائی: ۴۷۳۸۔ صحیح الجامع: ۶۶۶۶] "وہ اپنے سوا سب کے مقابلے میں ایک ہاتھ ہوتے ہیں۔"

آیت 83 أَلَمْ تَرَ أَنَا أَرْسَلْنَا الشَّيْطَانَ.....: "أَزًّا" قاموس میں ہے: "أَزٌّ يَزُّ" اور "أَزٌّ يَزُّ" (ض، ن) "أَزٌّ الشَّيْءُ" اس نے کسی چیز کو سخت حرکت دی۔ "أَزُّ النَّارِ" اس نے آگ کو بھڑکایا۔ "أَزَّتْ الْقِدْرُ" ہانڈی سخت ایلنے لگی۔ "أَزُّ نَزْرٍ سَكَرٌ يَزُّ" الہر بجل "ہانڈی ایلنے جیسی آواز۔ یعنی کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کافر لوگ، جنہوں نے طے کر رکھا ہے کہ انہوں نے کسی صورت حق کو تسلیم نہیں کرنا، ہم نے ان پر شیاطین کو مسلط کر دیا ہے، جو انھیں برائی پر شدت سے ابھارتے رہتے ہیں اور انھیں گناہوں کی آگ میں اس طرح مسلسل جھوکے رکھتے ہیں کہ وہ اسی بیچ و تاب میں ہانڈی کی طرح ایلنے اور شعلوں کی طرح بھڑکتے رہتے ہیں۔ (بقائ) اس آیت کی ہم معنی اور وضاحت کرنے والی آیات کے لیے دیکھیے سورہ زخرف (۳۶، ۳۷)، ثم السجدہ (۲۵)، اعراف (۲۰۲) اور بنی اسرائیل (۶۳)۔

آیت 84 ﴿۱﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ: یعنی ایسا نہ کریں کہ جس طرح وہ شیاطین کے ابھارنے سے برائیوں میں جلدی کرتے ہیں کہ آپ بھی ان پر جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرنے لگیں، بلکہ صبر اور حوصلے سے انتظار کریں اور ان پر رحمت پوری ہونے دیں۔ دیکھیے سورہ احقاف (۳۵) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الَّتَانِي مِنَ اللَّهِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ» [مسند ابی یعلیٰ: ۴۲۵۶۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۰۷۶۷۔ سلسلۃ الأحادیث صحیحہ: ۲۹۴/۴، ح: ۱۷۹۵، عن أنس رضی اللہ عنہ] "انانہ (بردباری، وقار، آہستہ روی) اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔"

② إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَذَابًا: آدمی کے اطمینان، صبر و ثبات اور خوشی کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اس کا سب

يَوْمَ نُحْشِرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الزَّحْنِ وَفَدًا ۝ وَ نَسُوقُ الْبُغْرِينَ إِلَى جَهَنَّمَ وَهَدًا ۝

جس دن ہم متقی لوگوں کو رحمان کی طرف مہمان بنا کر اکٹھا کریں گے ﴿۸۵﴾ اور بھروسوں کو جہنم کی طرف پیا سے ہانک کر لے جائیں گے ﴿۸۶﴾

سے زیادہ قوت والا مددگار مسلسل اس کے دشمن کی نگرانی کر رہا ہو اور نہ دشمن کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز پریشان کن ہو سکتی ہے۔ فرمایا، ہم تو بس ان کو دی ہوئی مہلت کا ایک ایک سانس گن رہے ہیں اور گنی ہوئی چیز نے آخر ختم ہونا ہے، پھر یہ کسی صورت بچ نہیں سکیں گے، تو پھر جلدی کیسی؟ دیکھیے سورہ ہود (۸) روزوں کے جلدی گزرنے کی وجہ بھی ”أَيَّامًا تَعْدُوذِيَّتٍ“ فرمائی۔ بعض سلف یہ آیت پڑھتے تو روتے اور کہتے کہ گنتی ختم ہونے کا نتیجہ تیری جان کا نکلنا ہے، تیرا قبر میں داخل ہونا اور تیرا اہل و عیال سے جدا ہونا ہے۔ ایک اور بزرگ نے فرمایا، ہر سانس جو تجھے زندگی بخش رہا ہے تیری زندگی کے سانسوں کی گنتی کم کرتا جا رہا ہے، پھر اس شخص کی زندگی کا کیا حال ہے جسے زندہ رکھنے والی چیز ہی اس کی زندگی کے زوال کا باعث ہے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

إِنَّ الْحَبِيبَ مِنَ الْأَحْبَابِ مُخْتَلَسٌ لَا يَمْنَعُ الْمَوْتَ بَوَّابٌ وَلَا حَرَسٌ
وَكَيْفَ يَفْرُحُ بِالذَّنْبِ وَلَذَّتْهَا فَتَى يُعَدُّ عَلَيْهِ اللَّفْظُ وَالنَّفْسُ

”ہر دوست اپنے دوستوں سے اچانک چھین لیا جانے والا ہے۔ موت کو کوئی دربان روک سکتا ہے، نہ کوئی پہرے دار۔ دنیا اور اس کی لذت کے ساتھ کیسے خوش ہو سکتا ہے وہ جو ان کا ایک ایک لفظ اور سانس گنا جا رہا ہو۔“ (روح المعانی)

آیت 86-85 يَوْمَ نُحْشِرُ الْمُتَّقِينَ : ”وَفَدًا“ ”وَأَفْدًا“ کی جمع ہے۔ ”وَفَدًا يَفْدُو فِدًا وَ وَفُودًا“ بروزن ”وَعَدًا

يَعْدُو“ کسی کے پاس جانا۔ وفد چند آدمیوں کی جماعت کو کہتے ہیں جو کسی اہم کام کے لیے یا کوئی عطیہ حاصل کرنے کے لیے کسی بادشاہ یا بڑی شخصیت کے پاس جائے۔ ”نَسُوقُ“ ”سَاقٌ يَسُوقُ سَوْقًا“ بروزن ”قَالَ يَقُولُ“ جانوروں کو ہانکنا۔ بعض اوقات کسی کو بھی چلانے کے معنی میں آجاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَسَيُتِيقُ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا﴾ [الزمر:

۷۳] ”اور وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈر گئے، گردہ در گردہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔“ ”الْبُغْرِينَ“ جرم وہ گناہ جسے کرنے والا سزا کا حق دار ہو۔ ”وَهَدًا“ ”وَأَرْدًا“ کی جمع ہے۔ ”وَرَدٌ يَرِدُ وَرُودًا“ پانی پینے کے لیے جانا، چونکہ اس مقصد کے لیے پیاسا ہی جاتا ہے، اس لیے ”وَهَدًا“ کا معنی ”پیا سے“ ہے۔ ان آیات میں متقین اور بھروسوں کا انجام بیان ہوا ہے۔ پہلی آیت میں رحمان کی طرف جانے کا ذکر فرمایا، جنت وغیرہ کا ذکر نہیں فرمایا، یعنی متقی لوگ رحمان کے معزز مہمان بن کر جائیں گے۔ دنیا میں شاہی مہمانوں کے قدم زمین پر نہیں نکلتے، اس دن بے حد بے انتہا رحم والے، شاہوں کے شاہ کے معزز مہمانوں کے اعزاز و اکرام کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ دوسری آیت میں جہنم کا ذکر ہے، رحمان کا ذکر نہیں۔ کیونکہ آخر دم تک جرم

لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾ وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ
وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِذَا ۙ تَكَادُّ السَّمَوَاتُ يَنْقَطِرْنَ مِنُّهُ وَ تَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَ تَخِرُّ
الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۸۹﴾ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَنِ وَلَدًا ﴿۹۰﴾ وَ مَا يَتَّبِعُنِي لِلرَّحْمَنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۱﴾

وہ سفارش کے مالک نہ ہوں گے مگر جس نے رحمان کے ہاں کوئی عہد لے لیا ﴿۸۷﴾ اور انھوں نے کہا رحمان نے کوئی اولاد
بنالی ہے ﴿۸۸﴾ بلاشبہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات کو آئے ہو ﴿۸۹﴾ آسمان قریب ہیں کہ اس سے پھٹ پڑیں اور زمین
شق ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر گر پڑیں ﴿۹۰﴾ کہ انھوں نے رحمان کے لیے کسی اولاد کا دعویٰ کیا ﴿۹۱﴾ حالانکہ رحمان کے لائق
سے باز نہ آنے والے مجرم اس رحمان کے کسی رحم کے مستحق نہیں جو زمین و آسمان سے بھی زیادہ گناہوں کو چپے دل سے معافی
کی ایک درخواست پر معاف کر دیتا ہے۔ سورہ زمر (۷۳ تا ۷۱) میں متقین اور کفار کے اس مرحلے کا تفصیل سے ذکر آیا ہے۔

آیت 87 لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ.....: یعنی شفاعت کا حق دار وہ ہو گا جسے رحمان کے ہاں عہد نجات حاصل
ہو۔ اس عہد سے مراد کلمہ شہادت کا اقرار ہے۔ یہ تفسیر ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے۔ (ابن کثیر مع حاشیہ حکمت
بن بشر) ایک حدیث میں بتجگانہ نماز کی پابندی کو بھی عہد قرار دیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا
وَ بَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ» [مسند احمد: ۳۴۶/۵، ح: ۲۳۰۰۱۔ ترمذی: ۲۶۲۱۔ ابن ماجہ: ۱۰۷۹،
عن بريدة رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَ صححه الألبانی] ”وہ عہد جو ہمارے اور ان (مشرکین) کے درمیان ہے نماز ہے، جس نے اسے ترک کر
دیا تو وہ بلاشبہ کافر ہو گیا۔“ معلوم ہوا کہ کبیرہ گناہوں کے مرتکب ایمان والوں کی تو شفاعت ہوگی مگر کافر کی کوئی شفاعت نہیں
کر سکے گا۔ پس ”لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ“ کے معنی یہ ہیں کہ شفاعت کے مستحق وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے رحمان
کے ہاں عہد حاصل کر رکھا ہے، کفار نہیں۔ اس معنی کی شاہد کنی آیات ہیں۔ دیکھیے سورہ مدثر (۲۸)، شعراء (۱۰۱، ۱۰۰)، مومن
(۱۸)، انبیاء (۲۸) اور دوسری آیات۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب مجرمین کے حق میں کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا تو وہ خود
دوسروں کے حق میں شفاعت کا اختیار بالادلی نہیں رکھیں گے۔ دوسرا مطلب آیت کا یہ ہے کہ شفاعت کا اختیار صرف
اسی کو ہو گا جس کو اللہ تعالیٰ شفاعت کی اجازت دے گا، کوئی نبی یا فرشتہ اپنی مرضی سے کسی کی شفاعت نہیں کر سکے گا، فرمایا:
«مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ» [البقرہ: ۲۵۵] ”کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش
کرے۔“ اس آیت میں تمام مشرکین کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ مشرک بت پرست ہوں یا قبر پرست، زندہ پرست ہوں یا
مردہ پرست، ہر قسم کی شفاعت سے محروم رہیں گے۔ گویا یہ ”يَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا“ کا جواب ہے۔ (کبیر، شوکانی، شقیطی)

آیت 88-95 پہلی آیات سے مناسبت یہ ہے کہ جب شفاعت کی نفی فرمائی اور سب سے بڑھ کر شفاعت کی حق دار
اولاد ہوتی ہے، اس لیے ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دے رکھی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کی نفی فرمائی، تاکہ خاص

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ إِلَّا آتَى الرَّحْمَنِ عَبْدًا ﴿۳۰﴾ لَقَدْ أَحْضَرْتَهُمْ وَعَدَّهُمْ

نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے ﴿۳۰﴾ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام بن کر آنے والا ہے ﴿۳۰﴾ بلاشبہ یقیناً اس نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور انہیں خوب اچھی طرح گن کر شمار کر رکھا ہے ﴿۳۰﴾ اور ان میں سے ہر

و عام ہر سفاشی کی نفی ہو جائے اور ہر اس عزت کی نفی ہو جائے جس کے حصول کا باعث وہ اپنے معبودوں کو سمجھتے تھے۔ (بقائے)

﴿۳۰﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا: اللہ تعالیٰ نے ان کا قول نقل کرتے ہوئے ساتھ ہی اس کے باطل ہونے کی دلیل بھی ذکر فرما دی کہ وہ کہتے ہیں کہ اس رحمان نے اولاد بنا رکھی ہے جس کی بے پناہ رحمت سے ساری کائنات وجود میں آئی ہے اور ہر چیز اپنی بقا کے لیے اسی کی محتاج ہے، جبکہ وہ کسی کا محتاج نہیں، سب اس کے محتاج ہیں، فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ [فاطر: ۱۵] ”اے لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ ہی سب سے بے پروا، تمام تعریفوں کے لائق ہے۔“ بیٹا باپ کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ باپ اپنی کمزوری کی وجہ سے اولاد کا محتاج ہوتا ہے اور جس عقیدے، یعنی مسیح کو کفارہ بنانے کے لیے اسے اللہ کا بیٹا قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کو رحمان ماننے کے بعد اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

﴿۳۱﴾ یہود غزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے تھے اور مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، جبکہ امت مسلمہ کے کئی نادان رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا جزو قرار دیتے ہیں۔

﴿۳۱﴾ لَقَدْ جِئْتُمُوهُمْ شَيْئًا إِذْ...: اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد قرار دینے والوں کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ تھا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شدت غضب میں ان ظالموں کو مخاطب فرما کر بات کی اور تاکید کے دو لفظوں ”لام“ اور ”قَدْ“ کے ساتھ، جن کے جمع ہونے سے قسم کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، فرمایا قسم ہے کہ تم ایک بہت ہی بھاری بات تک آپہنچے ہو، جو اس قدر خوفناک اور بھاری ہے کہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے تصور اور اس بات کے بوجھ سے ”سَبَّحَ شِدَادًا“ یعنی ساتوں نہایت مضبوط آسمان پھٹ پڑیں، یہ وسیع اور محکم زمین شق ہو جائے اور انتہائی ٹھوس اور سخت پہاڑ مٹی کی بوسیدہ دیوار کی طرح ڈھے کر گر پڑیں کہ ان لوگوں نے (یہاں پھر نفرت سے مشرکوں کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ کیا ہے) رحمن کے لیے اولاد کا دعویٰ کر دیا، حالانکہ رحمان کے لائق ہی نہیں کہ وہ (کسی کو بھی، خواہ پیغمبر ہو یا فرشتہ) اولاد بنائے۔ تو سین کے الفاظ مفعول اول ہیں جو محذوف ہیں، ”وَلَدًا“ مفعول ثانی ہے، یعنی اس کی اولاد ہونا ناممکن اور محال ہے، اس لیے کہ اولاد ہم جنس ہوتی ہے اور اللہ کا کوئی ہم جنس نہیں۔ پھر اولاد کمزوری میں سہارے کے لیے ہوتی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ہر کمزوری سے پاک اور اپنی ذات و صفات میں ہر ایک سے بے نیاز ہے۔ وہ ہمیشہ سے عزیز و غالب ہے اور ہمیشہ عزیز و غالب رہے گا۔ دیکھیے سورۃ بنی اسرائیل کی آخری آیت کی تفسیر۔ اس کے علاوہ اولاد بیوی سے ہوتی ہے اور خاوند بیوی کا محتاج ہوتا ہے، جب اللہ کی بیوی ہی نہیں اور وہ کسی کا محتاج ہی نہیں تو اولاد کیسی؟ فرمایا: ﴿أَفَنِيكُنْ لَهُ وَلَدًا وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ صَاحِبَةً﴾ [الانعام: ۱۰۱] ”اس کی اولاد کیسے ہوگی، جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں۔“

عَدَا ۞ وَكُلُّهُمْ أُمَّتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَرْدًا ۞ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

ایک قیامت کے دن اس کے پاس اکیلا آنے والا ہے ۞ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ہوتی؟

۞ لَقَدْ أَحْضَنَهُمْ وَعَدَاهُمْ عَدَاً : اللہ تعالیٰ نے سب کا احاطہ کر رکھا ہے، ایک ایک اس کے شمار میں ہے اور سب اکیلے اکیلے اس کے پاس آنے والے ہیں، اگر زمین و آسمان میں کوئی بھی اس کی اولاد دوتا تو یقیناً اسے معلوم ہوتا۔ کیا تم اللہ سے بھی زیادہ باخبر ہو، فرمایا: ﴿قُلْ أَتُكْفِرُونَ بِاللَّهِ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ﴾ [یونس : ۱۸] ”کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟“ نیز دیکھیے سورہ یونس (۶۸)، بنی اسرائیل (۴۰) اور نجم (۱۹ تا ۲۲) ابوموسیٰ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ أَحَدٌ أَضْبَرَ عَلَيَّ أُذَى سَمِعَهُ مِنَ اللَّهِ إِنَّهُمْ لَيَدْعُونَ لَهُ وَلِذَا وَإِنَّهُ لَيُبَاقِيهِمْ وَيَرْزُقُهُمْ﴾ [بخاری، الأدب، باب المصبر في الأذى : ۶۰۹۹] ”اللہ تعالیٰ سے زیادہ تکلیف دہ بات پر صبر کرنے والا، جسے وہ سن رہا ہو اور کوئی نہیں۔ لوگ اس کے لیے اولاد بتاتے ہیں اور وہ (اس کے باوجود) انھیں عاقبت دیتا ہے اور رزق دیتا ہے۔“

آیت 96 سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا : ”وُدُّ“ اور ”حُبُّ“ ہم معنی ہیں۔ ”وُدًّا“ کی تین تعظیم کے لیے ہے۔ کافروں کے برے عقائد و اعمال اور ان کے انجام بد کا ذکر کرنے کے بعد ایمان اور عمل صالح والوں پر اپنے انعامات کا ذکر فرمایا۔ اس آیت کے تین معنی ہو سکتے ہیں اور تینوں درست ہیں، جن کی قرآن و حدیث سے تائید ہوتی ہے۔ اللہ کے کلام سے بڑھ کر جامع کلام کوئی نہیں کہ جس کے تھوڑے سے کلمات میں بہت سے معانی جمع ہیں۔ پہلا معنی یہ ہے کہ جو لوگ صدق دل سے ایمان لائے اور انھوں نے اس دعویٰ کی تصدیق کے لیے کتاب و سنت کے مطابق اخلاص کے ساتھ عمل کیے (کیونکہ عمل صالح کے ثمن اجزا ہیں: ایمان، اخلاص اور اتباع کتاب و سنت) تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایمان والوں کے دلوں میں ان کے لیے عظیم محبت رکھ دے گا، جب کہ دشمنوں کے دلوں میں ان کی ہیبت اور رعب ڈال دے گا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا رعب ایک مہینے کی مسافت پر دور دشمن پر پڑ جاتا تھا۔ اسمہانی نے فرمایا کہ یہ محبت انھیں لوگوں کی محبت حاصل کرنے کی کسی کوشش یا لوگوں کی دوستی کے اسباب میں سے کسی سبب، مثلاً قرابت، کسی پر احسان، مروت یا خوش اخلاقی وغیرہ کے بغیر محض رحمان کی عنایت سے حاصل ہوتی ہے (جن لوگوں سے وہ ملا بھی نہیں ہوتا وہ بھی اس سے محبت رکھتے ہیں)۔ (بقائے) صفت رحمان اور دلوں میں محبت پیدا کرنے کے درمیان مناسبت بالکل واضح ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال موسیٰ علیہ السلام کو محبوب خلاق بنانا ہے، فرمایا: ﴿وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ حُبِّيَ مِنِّي﴾ [طہ : ۳۹] ”اور میں نے تجھ پر اپنی طرف سے عظیم محبت ڈال دی۔“ اسی طرح ”رَبُّنَا اللَّهُ“ (ہمارا رب اللہ ہی ہے) کہہ کر استقامت اختیار کرنے والوں کو فرشتے بشارت دیتے ہیں: ﴿نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾ [حج السجدة : ۳۱] ”ہم تمہارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی۔“ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما

سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا ﴿٦١﴾

کے عنقریب ان کے لیے رحمان عظیم محبت پیدا کر دے گا ﴿۶۱﴾

سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ الْعَبْدَ نَادَى جِبْرِيلُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحْبِبْهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ فَيُنَادِي فِي أَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحْبِبُوهُ فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الْأَرْضِ » [بخاری، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة صلوات الله عليهم: ۷۴۸۵، ۳۲۰۹] ”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل کو بلاتا ہے (اور کہتا ہے کہ) بے شک اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تو بھی اس سے محبت کر، تو جبریل بھی اس سے محبت کرتا ہے اور آسمان والوں میں اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے، اس لیے تم سب اس سے محبت کرو، تو آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔“

صحیح مسلم میں مزید یہ الفاظ ہیں: « وَإِذَا أَبْغَضَ اللَّهُ عَبْدًا دَعَا جِبْرِيلَ فَيَقُولُ إِنِّي أَبْغَضُ فُلَانًا فَأَبْغِضْهُ، قَالَ: فَيَبْغِضُهُ جِبْرِيلُ، ثُمَّ يُنَادِي فِي أَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللَّهَ يُبْغِضُ فُلَانًا فَأَبْغِضُوهُ، قَالَ فَيَبْغِضُونَهُ، ثُمَّ تُوَضَّعُ لَهُ الْبُغْضَاءُ فِي الْأَرْضِ » ”اور جب وہ کسی بندے سے بغض رکھتا ہے تو جبریل کو بلاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں فلاں سے بغض رکھتا ہوں، تم بھی اس سے بغض رکھو۔“ فرمایا: ”تو جبریل اس سے بغض رکھتا ہے، پھر وہ آسمان والوں میں اعلان کر دیتا ہے کہ اللہ فلاں سے بغض رکھتا ہے، اس لیے تم بھی اس سے بغض رکھو۔“ فرمایا: ”تو وہ اس سے بغض رکھتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں دلی دشمنی رکھ دی جاتی ہے۔“ [مسلم، البر والصلوة، باب إذا أحب الله عبدا، أمر جبريل : ۲۶۲۷] واضح رہے کہ یہ آیت کہ معظّمہ میں نازل ہوئی جہاں مسلمان انتہائی مظلومیت و کس پیڑسی کی زندگی بسر کر رہے تھے، گویا اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا کہ عنقریب حالات بدلیں گے (لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوں گے) اور تم ذلیل و رسوا ہونے کے بجائے محبوبِ خلافت بن کر زندگی گزارو گے۔ چنانچہ یہ وعدہ پورا ہوا اور رہتی دنیا تک لوگوں کے دلوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ محبت پیدا ہوئی جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

دوسرا معنی اس آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے آپس میں محبت پیدا فرمادے گا، جو پہلے جانی دشمن تھے ایمان کے بعد دلی دوست بن جائیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي آيَاكَ بِتَضَرُّدٍ وَ بِاللَّؤْمِيَيْنِ ﴿٦١﴾ وَ الْكُفَّارِ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنفَقَتْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَئِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٢﴾ [الأنفال: ۶۲، ۶۳] ”وہی ہے جس نے تجھے اپنی مدد کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ توت بخشش اور ان کے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی۔ اگر تو زمین میں جو کچھ ہے، سب خرچ کر دیتا ان کے دلوں میں الفت نہ ڈالتا اور لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت ڈال دی، بے شک وہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔“ یہ رحمان کی اس رحمت ہی کا نتیجہ ہے کہ مدتوں لڑنے والے اوس و خزرج بھائی بھائی بن گئے، ہمش کے بلال، روم کے صہیب، ایران کے سلمان، مدینہ کے انصار اور مکہ کے

قَالَمَّا يَسْرَنُهُ يَلْسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَ تُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لِّدَا ۝

سو اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم نے اسے تیری زبان میں آسان کر دیا ہے، تاکہ تو اس کے ساتھ متقی لوگوں کو خوشخبری دے اور اس کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرائے جو سخت جھگڑا لو ہیں ۝

قریش آپس میں بھائی بھائی بن گئے اور ”اِنَّمَا التَّوَفُّؤُنَ اِخْوَةٌ“ کا عملی نقشہ دنیا کے سامنے آ گیا۔ اگر ان کی کوئی باہمی رنجش رہ بھی گئی تو اللہ تعالیٰ نے جنت میں جانے سے پہلے اسے دور کرنے کا وعدہ فرمایا۔ دیکھیے سورہ حجر (۴۷) جیسا کہ اوپر گزرا، یہ محبت ایمان داروں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے، کفار کے دلوں میں نہیں، اس کی مثال ثمامہ بن اثال اور ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہما ہیں جنہوں نے شہادت دی کہ اسلام لانے سے پہلے ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ میخوش کوئی نہ تھا، لیکن پھر ایمان لانے کے بعد آپ سے بڑھ کر محبوب کوئی نہ تھا۔

تیسرا معنی یہ ہے کہ ”وَدَا“ مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، محبوب چیز، یعنی ایمان اور عمل صالح والے جو چیز محبوب رکھیں گے، پسند کریں گے رحمان جنت میں انہیں وہی عطا فرمائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَنُكَفِّرَنَّ فِيهَا مَا تَشْتَهَىٰ اَنفُسُكُمْ وَلَنَكْتُمَنَّ فِيهَا مَا تَدَعُونَ﴾ [حکمہ السجدۃ: ۲۱] ”اور تمہارے لیے اس (جنت) میں وہ کچھ ہے جو تمہارے دل چاہیں گے اور تمہارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تم مانگو گے۔“ یہ معنی ابو مسلم نے بیان فرمایا ہے۔ (قاسمی)

آیت 97 - قَالَمَّا يَسْرَنُهُ يَلْسَانِكَ : یہ ساری سورت بلکہ پورا قرآن متقین کو خوش خبری اور منکرین کو ڈرانے کے لیے ہے۔ اس آیت سے پہلی آیات میں بھی اللہ تعالیٰ کی اولاد بتانے والوں کی تردید اور ان کا انجام بد مذکور ہے اور ایمان اور عمل صالح والوں کو حصول محبت کی خوش خبری دی گئی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے قرآن مجید میں تین خوبیاں رکھنے کا ذکر فرمایا، تاکہ بشارت و نذارت بہترین طریقے سے ہو سکے۔ پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسان کر دیا ہے اور اللہ کی آسان کی ہوئی چیز سے زیادہ آسان کیا چیز ہوگی۔ دیکھیے سورہ قمر (۷۱) دوسری یہ کہ اسے رسول اللہ ﷺ کی زبان ”عربی“ میں اتارا جس سے زیادہ بات واضح کرنے کی خوبی کسی زبان میں نہیں اور جس کے اولین مخاطب یہ زبان بولنے والے تھے، جو اس زبان کے باریک سے باریک اشاروں کو بھی سمجھتے تھے۔ دیکھیے سورہ شعراء (۱۹۴ تا ۱۹۵)، یوسف (۲۰۱)، زخرف (۳ تا ۱۱) اور نحل (۱۰۳)۔

تیسری یہ کہ اس کے ساتھ خوش خبری دینے اور ڈرانے کے لیے نبی کریم ﷺ کو یہ دے کر بھیجا گیا، جو خود اہل عرب سے تھے، تاکہ وہ اسے پڑھ کر سنائیں اور عمل کر کے دکھائیں۔ دیکھیے سورہ نحل (۴۳) پہلی خوبی لفظ ”يَسْرَنُهُ“ میں، دوسری ”يَلْسَانِكَ“ میں اور تیسری ”لِتُبَشِّرَ بِهِ“ اور ”تُنذِرَ بِهِ“ کے صیغہ خطاب میں بیان ہوئی ہے۔

”لِّدَا“ ”اَلْدُّ“ کی جمع ہے، سخت جھگڑا اور ضدی شخص، جو کسی طرح حق بات کو نہ مانے۔ اس سے مراد قریش اور دوسرے

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هَلْ يُحِشُّ مِنْهُمْ مِنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رَكْعَاتٍ ۙ

اور ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانے کے لوگوں کو ہلاک کر دیا، کیا تو ان میں سے کسی ایک کو محسوس کرتا ہے، یا ان کی کوئی بھٹک سنتا ہے؟ ﴿۹۸﴾

معاند کفار ہیں۔ دیکھیے سورہ زخرف (۵۷، ۵۸)۔

آیت 98 وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ: یہاں گزشتہ آیت میں مذکور سخت جھگڑالو قوم کو ان سے پہلی سخت جھگڑالو قوموں کی ہلاکت کا ذکر کر کے ڈرایا گیا ہے کہ ہم نے ان سے پہلے ایسی کتنی ہی سخت ضدی قوموں کو ہلاک کر دیا۔ غور سے دیکھو! ان میں سے کوئی تمہیں کہیں کھلتا ہے، یا اس کی بھٹک ہی کان میں پڑتی ہے؟ یہی حال اس زمانے کے کافروں کا ہونے والا ہے۔



ظہ ۱ مَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْفَىٰ ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

ظہ۔ ۱ ہم نے تجھ پر یہ قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تو مصیبت میں پڑ جائے ۱

آیت 1 ظہ: ظاہر یہی ہے کہ یہ حروف مقطعات میں سے ہیں، کیونکہ یہ دونوں حرف دوسری جگہ مقطعات میں استعمال ہوئے ہیں، ”طا“، ”طسہ“ (شعراء) میں اور ”ھا“ ”کھیعص“ (مریم) میں۔ مقطعات کی تفسیر کے لیے سورہ بقرہ کی پہلی آیت کی تفسیر دیکھیے۔ عبدالرزاق نے اپنی صحیح سند کے ساتھ قتادہ اور حسن کا قول نقل کیا ہے کہ ”ظہ“ کا معنی ہے ”یا رُحُلُ!“ اے آدمی! کیونکہ قبیلہ بنو عک میں یہ لفظ اس معنی میں بولا جاتا تھا، مگر پہلی بات زیادہ صحیح ہے، کیونکہ قرآن مجید قریش کی لغت میں نازل ہوا ہے۔

آیت 2 مَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْفَىٰ: ”شَفِي يَشْفِي شَفَاوَةً وَ شَقَاءً“ بروزان ”رَضِيَ يَرْضَى“ یہ سعادت

کی ضد ہے۔ سعادت کی دو قسمیں ہیں، دنیوی اور اخروی۔ اسی طرح شقاوت کی بھی دو قسمیں ہیں، دنیوی اور اخروی۔ اخروی شقاوت بدبختی و بد نصیبی ہے، جیسا کہ کفار کہیں گے: ﴿رَبَّنَا عَلَّمْنَا شِقْوَتَنَا﴾ [المؤمنون: ۱۰۶] ”پروردگارا! ہم پر ہماری بدبختی غالب آگئی۔“ دنیوی شقاوت ایسے کاموں میں پھنس جانا جو مشقت اور تھکاوٹ کا باعث ہوں، جیسے کہتے ہیں ”فُلَانٌ أَشَقَىٰ مِنْ رَأِيصِ مُهْمَرٍ“ ”فلاں گھوڑی کے پچھیرے کو سدھانے والے سے بھی زیادہ مشقت اور مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔“ مفسرین نے اس آیت کے دو معنی بیان فرمائے ہیں اور دونوں درست ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نزول وحی کے بعد ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں، اس کے لیے آپ دن رات دعوت و تبلیغ کے لیے اتنی مشقت اٹھاتے اور کفار کی بے رشتی پر اس قدر غم زدہ ہوتے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ اتنی بھی مشقت اور فکر کیا کہ آپ مصیبت ہی میں پڑ جائیں، ہم نے آپ پر یہ قرآن شقاوت کے لیے نہیں بلکہ آپ کی سعادت کے لیے اتارا ہے۔ آپ کے ذمے یہ نہیں کہ تمام لوگوں کو مسلمان کر کے چھوڑیں۔ آپ کا کام نصیحت ہے، پھر جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ قبول کر لے گا، دوسروں کے آپ ذمہ دار نہیں ہیں۔ لوگوں کے مسلمان نہ ہونے پر رسول اللہ ﷺ کے غم و افسوس کا اور آپ کو تسلی دینے کا ذکر بہت سی آیات میں ہے، مثلاً: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا﴾ [الکہف: ۶] ”بس شاید تو اپنی جان ان کے پیچھے غم سے ہلاک کر لینے والا ہے، اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے۔“ اور فرمایا: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ [الشعراء: ۳] ”شاید تو اپنے آپ کو ہلاک کرنے والا ہے، اس لیے کہ وہ مومن نہیں ہوتے۔“ دوسرا معنی اس آیت کا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ عبادت خصوصاً قیام میں بہت محنت کرتے، تو اللہ تعالیٰ نے اس میں میانہ روی کا

إِلَّا تَذَكَّرَةً لِّمَن يَخْشَى ﴿٦﴾ تَنْزِيلًا مِّنْ خَلْقِ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتِ الْعُلَى ﴿٧﴾

بلکہ نصیحت کرنے کے لیے، اس کو جو ڈرتا ہے ﴿٦﴾ اس کی طرف سے اتارا ہوا ہے جس نے زمین کو اور اونچے آسمانوں کو پیدا کیا ﴿٧﴾

حکم دیا اور فرمایا: ﴿فَأَقْرَهُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ [الزمر: ۲۰] یعنی اے نبی! آپ جتنا قیام آسانی سے کر سکتے ہیں کریں۔ تفصیل کے لیے سورہ مزمل کا آخری رکوع ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 3 : **إِلَّا تَذَكَّرَةً لِّمَن يَخْشَى** : ”إِلَّا“ کے ساتھ استثنا منقطع ہے، کیونکہ ”تَذَكَّرَةً“ شقاوت میں شامل نہیں ہے، لہذا یہاں ”إِلَّا“ بمعنی ”لِکِنِّ“ ہے، چنانچہ یہاں اس کا ترجمہ ”بلکہ“ کیا گیا ہے اور یہ جو فرمایا کہ اس قرآن کو اس شخص کی نصیحت کے لیے اتارا جو ڈرتا ہے، اس سے مراد یہ نہیں کہ قرآن دوسرے لوگوں کی نصیحت کے لیے نہیں اترا، کیونکہ قرآن بلکہ پورا دین برائے جن تک پہنچانے کے لیے اتارا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَأْتِيهَا الزُّسُوفُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ [المائدة: ۶۷] ”اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔“ اور نبی ﷺ قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ (دیکھیے سہا: ۲۸) بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس سے فائدہ وہی اٹھائے گا جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، جسے اللہ اور آخرت کا ڈر نہیں اسے صحیح راستے پر ڈال دینا آپ کے ذمے نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَيَذَكَّرُ مَن يَخْشَى﴾ [الأعلى: ۱۰، ۱۱] ”عقرب نصیحت حاصل کرے گا جو ڈرتا ہے اور اس سے علیحدہ رہے گا جو سب سے بڑا بد نصیب ہے۔“ علاوہ ازیں دیکھیے سورہ بقرہ (۵۲)، سورہ ق (۲۵) اور نازعات (۳۵)۔

آیت 4 : ﴿تَنْزِيلًا﴾ فعل محذوف کی وجہ سے منسوب ہے جو ”مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ“ سے معلوم ہو رہا ہے، یعنی ”نَزَلَ هَذَا الْقُرْآنُ تَنْزِيلًا“۔ تنزیل کا معنی تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا ہے، اس کی حکمت کے لیے دیکھیے سورہ فرقان کی آیت (۳۲) ”الْعُلَى“ ”عُلَى“ کی جمع ہے جو ”أَعْلَى“ کی مؤنث ہے، جیسے ”کُتِبَ“ کی جمع ”کُتِبَ“ ہے، یعنی یہ قرآن کسی جادوگر، کاہن، شاعر، شیطان، جن، انسان، فرشتے یا کسی بھی مخلوق کا کلام نہیں، بلکہ اس خالق کا نازل کردہ ہے جو صرف تمہارا ہی خالق نہیں بلکہ اس عظیم الشان زمین کا، جس کے اوپر اور ان بے حد بلند و بالا آسمانوں کا، جن کے نیچے تم رہتے ہو، سب کا خالق وہی ہے۔ دیکھیے سورہ نازعات (۲۷، ۳۳) اس سے اس قرآن کی عظمت سمجھ لو کہ کیا یہ اپنے لانے والے یا اپنے ماننے والوں کے لیے کسی طرح بھی باعث شقاوت ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ یہ ان کے لیے سراسر سعادت ہی سعادت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدًا إِلَّا غَلَبَهُ فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا وَأَنْبِشِرُوا وَأَسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرُّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدَّلْجَةِ﴾ [بخاری، الإیمان، باب الدین یسر: ۳۹، عن ابی ہریرۃ ؓ] ”بے شک یہ دین آسان ہے اور کوئی بھی شخص دین میں جب بھی بے جا سختی کرے گا تو وہ اس پر غالب آجائے گا۔ تو تم سیدھے چلو اور قریب رہو اور (اللہ سے ملنے

الزَّخْنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ⑤

وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا ⑤

والے اجر پر) خوش ہو جاؤ اور صبح و شام اور رات کے کچھ حصے (میں عبادت) کے ساتھ مدد حاصل کرو۔“

آیت 5 : ① الزَّخْنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى: یعنی آپ پر قرآن کا نازل کرنا اور زمین اور بلند آسمان کو پیدا کرنا جس بے حد رحم والے کی رحمت کا نتیجہ ہے وہ رحمان عرش پر بلند ہے۔ عرش کا لفظی معنی تخت ہے اور ”اسْتَوَى“ کا معنی ”اِرْتَفَعَ“ (بلند ہوا) ہے۔ عرش کے اوپر اللہ تعالیٰ ہے اور پوری کائنات کی تدبیر فرما رہا ہے، فرمایا: ﴿ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ يُدِيرُ الْأَمْرَ﴾ [یونس: 3] ”پھر وہ عرش پر بلند ہوا، ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔“ اس آیت اور دوسری آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے، مگر یہ بات کہ وہ عرش کے اوپر کس طرح ہے؟ کھڑا ہے یا بیٹھا ہے یا کس کیفیت میں ہے؟ کوئی نہیں جانتا، نہ جان سکتا ہے، کیونکہ مخلوق محدود ہے اور وہ لامحدود۔ مخلوق میں سے کوئی بھی خالق کو تو کجا اس کی معلومات میں سے بھی کوئی چیز پوری طرح نہیں جان سکتا، مگر جو وہ چاہے، فرمایا: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ [البقرة: 255] ”اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرتے مگر جتنا وہ چاہے۔“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے، جو انبیاء و پیغمبروں کے بعد اللہ تعالیٰ کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے تھے، نبی ﷺ سے یہ سوال نہیں کیا کہ وہ اپنے تخت پر کس طرح ہے؟ اسی لیے کسی شخص نے امام مالک رضی اللہ عنہ سے ”الزَّخْنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى“ کے متعلق پوچھا کہ کس طرح؟ تو انھوں نے فرمایا: ”الْإِسْتِوَاءُ مَعْلُومٌ وَالْكَيفُ مَجْهُولٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بَدْعَةٌ“ ”یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ عرش کے اوپر ہے، مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ کس طرح ہے اور اس کے متعلق سوال بدعت ہے۔“ مزید فرمایا: ”میں تمہیں برا آدمی خیال کرتا ہوں، اسے میرے پاس سے نکال دو۔“ تو سوال کرنے والا یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ اے ابو عبد اللہ! میں نے اس کے متعلق اہل عراق اور اہل شام سے پوچھا مگر کسی کو آپ (کے صحیح جواب) جیسی توفیق عطا نہیں ہوئی۔ (تفسیر بغوی)

خلاصہ یہ کہ جو بات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے بتائی ہے اس پر ایمان رکھنا فرض ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے، اللہ تعالیٰ کے عرش کو قیامت کے دن آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے (دیکھیے حاقہ: 17) اس کے پائے بھی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿النَّاسُ يَصْعَقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَكُونُ أَوَّلَ مَنْ يُقْبِقُ فَإِذَا أَنَا بِمُوسَى آخِذًا بِعَاقِبَةِ مَنْ قَوَائِمِ الْعَرْشِ فَلَا أَدْرِي أَفَاقَ قِبَلِي أَمْ جُوزِي بِصَعْقَةِ الطُّورِ﴾ [بخاری، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى: ﴿وَوَاعَدْنَا مُوسَى ثَلَاثِينَ...﴾ : 2398، عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ] ”لوگ قیامت کے دن بے ہوش ہو جائیں گے تو سب سے پہلا شخص جو ہوش میں آئے گا میں ہوں گا۔ اچانک میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ وہ عرش کے پایوں میں سے ایک پائے کو پکڑے ہوئے ہوں گے، تو میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے، یا انھیں طور کی بے ہوشی کا بدلہ دیا گیا۔“ مگر اللہ کا عرش پر ہونا

یا اس کی کوئی بھی صفت مخلوق کی صفت کے مشابہ نہیں، فرمایا: ﴿كَشِبَاهُ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [الشوری: ۱۱۱] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سنے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔“ تمام سلف کا اللہ تعالیٰ کے عرش پر بلند ہونے اور دوسری صفات کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔ خیر القرون گزرنے کے بعد جب عقیدہ و اعمال کی بدعات شروع ہوئیں تو اللہ تعالیٰ کے متعلق آیات و احادیث کی بھی اپنی اپنی بدعات کے مطابق تاویل بلکہ تحریف کی جانے لگی۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے کہا کہ عرش کے اوپر ہونے کا مطلب زمین و آسمان کی حکومت کا مالک ہونا ہے، ورنہ نہ کوئی عرش ہے اور نہ اللہ تعالیٰ اس کے اوپر ہے۔ وہ نہ اوپر ہے نہ نیچے اور نہ کسی اور جہت میں، نہ وہ آسمان دنیا پر اترتا ہے اور نہ قیامت کے دن زمین پر آئے گا۔ غرض تاویل کے نام پر صریح آیات و احادیث کا انکار کر دیا۔ مگر اتنے بڑے بڑے علماء پر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے اتنی جرأت کے ساتھ اس عرش عظیم و کریم کا انکار کیسے کر دیا کہ جس پر اپنے بلند ہونے کا ذکر خود رحمان نے فرمایا اور جسے قیامت کے دن تمام لوگوں کے اوپر آٹھ فرشتوں کے اٹھانے کا ذکر قرآن کریم نے فرمایا ہے اور جس کے پایوں کا ذکر اس کے حبیب ﷺ نے فرمایا ہے۔ [فَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ هَذِهِ الْأَهْوَاءِ الْمُضِلَّةِ وَالْعَقَائِدِ الْبَاطِلَةِ وَنُحَدِّثُ لَانَ رَحْمَةَ اللَّهِ تَعَالَى] مزید دیکھیے سورہ اعراف (۵۴)، حاق (۱۷) اور سورہ فجر (۲۲) مفسر جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں: ”فکلیات کے جدید ماہرین کی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ عرش ایک حقیقی وجود ہے جس کا باقاعدہ جسم ہے، کائنات کے جتنے عالم ہیں وہ سب کا مرکز ہے، یعنی جذب، تاثیر، تدبیر اور نظام سب کا مرکز ہے (تمام کلبکاشیں جن کا ایک ایک سیارہ سورج سے بھی ہزاروں گنا بڑا ہے، اسی کے گرد گردش کر رہی ہیں اور اس کے انکار یا تاویل کی گنجائش ہی نہیں)۔“ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ”کہ ہم انصاف کے ترازو قیامت کے دن رکھیں گے“ کے متعلق جب عقل پرستوں کی عقل میں یہ بات نہ آسکی کہ اعراض کا وزن کیسے ہوگا تو انھوں نے وزن اعمال کا انکار کر دیا، یا تاویل کر دی۔ جب کہ جدید ایجادات میں تقریباً ہر چیز کا میٹر تیار ہو چکا ہے، بجلی، بخار، حرارت، سردی، کشافت، نمی، خشکی غرض بے شمار اعراض کے ماپنے تو لنے کے پیمانے وجود میں آچکے ہیں جن کی وجہ سے عقل پرستوں کے انکار اور تاویل کا تارو پود کھمچکا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے زمین پر قرآن نازل فرمایا، اس لیے پہلے اس کا ذکر فرمایا، پھر بلند آسمان کا، پھر رحمان کے عرش پر ہونے کا کہ دیکھو یہ رحمت کہاں سے نازل ہوئی اور کس عظیم شخصیت پر نازل ہوئی۔ اس میں قرآن کی رفعت و عظمت کا بھی بیان ہے اور صاحب قرآن کی عظمت کا بھی۔ مزید آپ ﷺ کو اور آپ کی امت کو اس نعمت کی قدر کا احساس دلانا بھی ہے اور کفار کی طرف سے پیش آنے والی مزاحمت اور مصائب و تکالیف کے مقابلے میں تسلی اور خوش خبری بھی کہ اس رمضان کی پشت پناہی حاصل ہونے کے بعد تمہیں کس بات کی پروا ہے۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کا ذکر تفصیل سے کیا کہ انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کس کس طرح حاصل ہوتی ہے اور انھیں کیا کیا آزمائشیں پیش آتی ہیں۔

لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَى ① وَإِنْ تَجَهَّزْ
بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى ② اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى ③ وَهَلْ
أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى ④ إِذْ رَأَى نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَعَلِّي آتِيكُمْ

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور جو گیلی مٹی کے نیچے ہے ① اور اگر تو اونچی آواز سے بات کرے تو وہ تو پوشیدہ اور اس سے بھی پوشیدہ بات کو جانتا ہے ② اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب سے اچھے نام اسی کے ہیں ③ اور کیا تیرے پاس موسیٰ کی خبر پہنچی ہے ④ جب اس نے ایک آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا تم ٹھہرو، بے شک میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں تمہارے پاس اس

آیت 6 لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ : ”الثَّرَى“ گیلی مٹی کے نیچے سے مراد زمین کا سب سے نچلا حصہ ہے، یعنی وہ عرش پر مستوی ہو کر آسمانوں سے لے کر زمین کی آخری گہرائی تک ہر چیز کی تدبیر ہی نہیں کر رہا بلکہ ان سب کا مالک بھی وہ اکیلا ہی ہے۔ ملک بھی اسی کا ہے، ملکیت بھی اسی کی۔ حاکم بھی وہی ہے، مالک بھی وہی۔ ہر چیز کا وجود، حرکت، سکون، تغیر یا ثبات سب کچھ اسی کے امر سے ہے۔

آیت 7 وَإِنْ تَجَهَّزْ بِالْقَوْلِ : یعنی اگر تم اونچی آواز سے بات کرو تو وہ اسے بلا دلی سنتا ہے، کیونکہ وہ تو سز (پوشیدہ بات) کو جانتا ہے اور اخفی (اس سے زیادہ پوشیدہ) کو بھی۔ سز سے مراد وہ بات ہے جو تنہائی میں چپکے سے کہی جائے اور اخفی (اس سے زیادہ چھپی بات) وہ ہے جو ابھی دل میں ہو اور زبان پر نہ آئی ہو۔

آیت 6 اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ : یعنی جس ہستی کی یہ صفات بیان ہوئی ہیں وہ اللہ ہے جس کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں۔ ”لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۱۸۰)۔

آیت 11:9 ① وَهَلْ آتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى : قرآن کی عظمت کے ذکر اور دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی مشقت اور تکلیف کی طرف اشارہ فرما کر اب یہاں سے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے، اس سے مقصود آپ ﷺ کو تسلی دینا ہے، کیونکہ جن دنوں یہ سورت نازل ہوئی کہ میں نبی ﷺ کو ایسے ہی حالات درپیش تھے، جیسے موسیٰ علیہ السلام کو پیش آچکے تھے۔ اس کے علاوہ گزشتہ آیت میں ”اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ کے ساتھ توحید کا جو بیان ہوا تھا اس کی مزید وضاحت مقصود ہے کہ ہر نبی یہی دعوت لے کر آیا۔ خصوصاً گزشتہ انبیاء میں سے جس نبی کے واقعات سب سے زیادہ مشہور ہیں انہیں بھی پہلی وحی میں آگاہ کر دیا گیا: ﴿إِنَّمَا أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي﴾ [ظہ: ۱۴] اور سورت کے آخر میں بھی یہی بات دہرائی: ﴿إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ [ظہ: ۹۸] ”تمہارا معبود تو اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے۔“

فَمِنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجْدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿١٥﴾ فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يُمُوسَى ﴿١٦﴾

سے کوئی انگارا لے آؤں، یا اس آگ پر کوئی رہنمائی حاصل کر لوں ﴿۱۵﴾ تو جب وہ اس کے پاس آیا تو اسے آواز دی گئی اے موسیٰ! ﴿۱۶﴾

”وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى“ یہ ”مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْفَى“ پر عطف ہے، یعنی نزول وحی آپ کے لیے باعث شقاوت نہیں بلکہ باعث سعادت ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ نعمت باعث سعادت تھی۔ اور کیا آپ کو موسیٰ کی خبر پہنچی کہ ان کو یہ سعادت ملنے کا آغاز کیسے ہوا؟ استفہام ان کی خبر سننے کا شوق دلانے کے لیے ہے، پوچھنے کے لیے نہیں۔ آگ دیکھنے کا ذکر مزید شوق دلانے کے لیے ہے کہ معلوم ہو آگ دیکھنے کے بعد کیا ہوا؟ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب مدین میں دس سال تک جلا وطنی کی زندگی گزارنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل و عیال سمیت مصر آ رہے تھے۔ اس قصے کا کچھ حصہ سورہ یونس اور سورہ اعراف میں گزر چکا ہے۔ یہاں جو بات ذکر ہوئی ہے اس سے پہلے کی سرگزشت کا ذکر سورہ قصص میں ہے۔

﴿۲﴾ ”جب اس نے آگ دیکھی“ سے معلوم ہوا کہ یہ رات کا وقت تھا اور سردی کا موسم تھا۔ گھر والے ساتھ تھے اور سب کو رات گزارنے کے لیے آگ کی ضرورت تھی۔ سورہ قصص (۲۹) اور سورہ نمل (۷) میں ہے: ﴿لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ﴾ ”تاکہ تم تپ لو۔“ ”أَوْ أَجْدُ عَلَى النَّارِ هُدًى“ سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام راستہ بھول گئے تھے، آگ جلانے کا پتہ (چھتاق) پاس نہیں تھا، اگر تھا تو سردی کی شدت یا لکڑیوں کی کمی کی وجہ سے آگ نہیں جل رہی تھی۔ اندھیرے میں آگ کے ذریعے سے متوجہ کرنے میں ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام گمراہی کی تاریکی میں ہدایت کی روشنی کا باعث بنیں گے۔ [التحریر و التنبیہ]

﴿۳﴾ اِنِّي اَنْتُ نَارًا: ”اَنَسَ“ (افعال) اس نے واضح طور پر دیکھا، اسی لیے آنکھ کی پتلی کو ”انسان العین“ کہتے ہیں، کیونکہ اسی سے کوئی چیز واضح معلوم ہوتی ہے۔ ”اَنَسَ“ کے ساتھ تاکید اور لفظ ”اَنْتُ“ کے استعمال سے ظاہر ہو رہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پورے یقین کے ساتھ ایک بہت بڑی آگ دیکھنے کا ذکر فرما رہے ہیں، کیونکہ ”نَارًا“ کی توہین بھی تعظیم کے لیے ہے۔ یہ آگ موسیٰ علیہ السلام کو متوجہ کرنے کے لیے تھی جو انہیں ایک درخت میں لگی ہوئی نظر آئی اور درخت ہی سے آواز آئی کہ بے شک میں تیرا رب ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نور نہیں تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی درخواست کی تو جواب ”لَنْ تَرَانِي“ ملا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۱۳۳)۔

﴿۴﴾ كَعَلَىٰ آيَاتِهِمْ فَمِنْهَا بِقَبَسٍ: ”قَبَسٌ“ مصدر بمعنی مفعول، اخذ کی ہوئی چیز۔ آگ جلانے کے لیے جلتی ہوئی آگ میں سے لکڑی یا سرکنڈے وغیرہ کے سرے پر آگ کا شعلہ لیا جائے تو اسے ”قَبَسٌ“ کہتے ہیں اور ”جَذْوَةٌ“ بھی۔ ”جَذْوَةٌ“ کا ایک معنی انگارا بھی ہے۔ (قاموس)

﴿۵﴾ هُدًى: یعنی کوئی راستہ بتانے والا مل جائے، یا آگ کی روشنی میں راستے کے آثار مل جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی

إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَأَخْلَعُ نَعْلَيْكَ ۖ إِنَّكَ بِالْوَادِي الْمَقَدَّسِ طُوًى ﴿١٦﴾

بے شک میں ہی تیرا رب ہوں، سو اپنی دونوں جوتیاں اتار دے، بے شک تو پاک وادی طوئی میں ہے ﴿١٦﴾

زبان پر وہی چیز جاری فرمادی جو فی الواقع وجود میں آنے والی تھی، چنانچہ انھیں کفر کی برودت سے بچانے والا ایمان کا شعلہ بھی مل گیا اور صراطِ مستقیم کی رہنمائی بھی حاصل ہو گئی۔

﴿١٦﴾ ”طُوًى“ (آواز دی گئی) یہ آواز ایک درخت سے آرہی تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ قصص (۳۰) فعل مجہول لانے میں بھی یہ جاننے کا شوق ابھارنا مقصود ہے کہ آواز دینے والا کون تھا اور اس نے کیا آواز دی؟

آیت 12 ﴿١﴾ فَأَخْلَعُ نَعْلَيْكَ: غالباً اسی سے یہودیوں نے یہ مسئلہ بنا لیا ہے کہ جوتا پہن کر نماز پڑھنا جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ غلطی دور کرنے کے لیے فرمایا: «خَالِفُوا النَّبِيَّ فَإِنَّهُمْ لَا يُصَلُّونَ فِي نَعَالِهِمْ وَلَا حِفَافِهِمْ» [أبو داؤد، الصلاة، باب الصلاة في النعل: ۶۵۲ و صححه الألبانی] ”یہودیوں کے خلاف عمل کرو، کیونکہ وہ اپنے جوتوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے۔“ اگر دوسری حدیث نہ ہوتی تو اس حدیث کی رو سے جوتوں سمیت نماز پڑھنا فرض تھا۔ وہ حدیث یہ ہے، عبد اللہ عمرو بن العاص فرماتے ہیں: «رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي حَافِيًا وَمُتَّعِلًا» [أبو داؤد، الصلاة، باب الصلاة في النعل: ۶۵۳] ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو ننگے پاؤں اور جوتا پہن کر (دونوں طرح) نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔“

﴿٢﴾ إِنَّكَ بِالْوَادِي الْمَقَدَّسِ طُوًى: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”طوئی اس وادی کا نام ہے۔“ [طبری بسند حسن] یہ الفاظ دلیل ہیں کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے جوتے ناپاک تھے، اگر وہ پاک ہوتے تو اس وادی کو پاک بنا کر جوتے اتارنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: «تَيْنَمَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُصَلِّي بِأَصْحَابِهِ إِذْ خَلَعَ نَعْلَيْهِ فَوَضَعَهُمَا عَنْ يَسَارِهِ، فَلَمَّا رَأَى ذَلِكَ الْقَوْمُ أَلْفَوْا نَعَالَهُمْ، فَلَمَّا قَضَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاتَهُ قَالَ مَا حَمَلَكُمْ عَلَى الْقَائِكُمْ نَعَالِكُمْ؟ قَالُوا زَيْنَاكَ أَلْفَيْتُ نَعْلَيْكَ فَأَلْفَيْنَا نَعَالَنَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَابَنِي فَأَخْبَرَنِي أَنَّ فِيهِمَا قَدْرًا، أَوْ قَالَ أَدَى، وَقَالَ إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمْ إِلَى الْمَسْجِدِ فَلْيَنْظُرْ فَإِن رَأَى فِي نَعْلَيْهِ قَدْرًا أَوْ أَدَى فَلْيَسْسُحْهُ وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا» [أبو داؤد، الصلاة، باب الصلاة في النعل: ۶۵۰ و صححه الألبانی] ”رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کو نماز پڑھا رہے تھے، دوران نماز آپ نے اپنے جوتے اتارے اور اپنی بائیں طرف رکھ دیے۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا تو انھوں نے بھی اپنے جوتے اتار دیے۔ جب آپ نے اپنی نماز پوری کی تو فرمایا: ”تمہارے جوتے اتارنے کا باعث کیا ہوا؟“ انھوں نے کہا: ”ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے جوتے اتارے تو ہم نے بھی اتار دیے۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میرے پاس جبریل آئے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ ان میں گندگی لگی ہے۔“ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی مسجد کو آئے تو دیکھ لے، پھر اگر اپنے جوتوں میں کوئی گندگی

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُؤْمَرُ ۝۱۳

اور میں نے تجھے چن لیا ہے، پس غور سے سن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے ۝۱۳

دیکھیے تو اسے مل کر صاف کر لے اور انھیں پہن کر نماز پڑھ لے۔“

یہ حدیث دلیل ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو تے اتارنے کے حکم کی وجہ وادی کا پاک ہونا اور جوتوں کا ناپاک ہونا تھا۔ یہ وجہ نہ تھی کہ کسی مقدس جگہ میں جوتے پہن کر جانا منع ہے، کیونکہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ مسجد پاک ترین جگہ ہے اور اسے پاک رکھنے کا حکم بھی ہے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۱۲۵) اور سورہ حج (۲۶) اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: «أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَاءَ الْمَسَاجِدِ فِي الدُّوْرِ وَأَنْ تُنْظَفَ وَتُطَيَّبَ» [ابوداؤد، الصلاة، باب اتخاذ المساجد في الدور: ۴۵۵۔ ترمذی: ۵۹۴۔ ابن ماجہ: ۷۵۸، صحیح] ”رسول اللہ ﷺ نے محلوں میں مسجدیں بنانے کا حکم دیا اور حکم دیا کہ انھیں صاف ستھرا رکھا جائے اور خوشبودار بنایا جائے۔“ جوتے پاک ہوں تو مسجد میں جا سکتے ہیں تو کسی اور جگہ کیوں نہیں جا سکتے؟ بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جوتے مردار گدھے کے چمڑے کے تھے، اس لیے انھیں اتارنے کا حکم ہوا، مگر یہ روایات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔ اس لیے یہ بات اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے جوتوں میں کیا چیز تھی جو وادی مقدس کے لائق نہ تھی، کیونکہ پاک جوتے جب مسجد نبوی میں پہننے جا سکتے ہیں تو تین مسجدوں سے زیادہ مقدس جگہ کون سی ہوگی؟

۱۳) اس آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ نہ موسیٰ علیہ السلام غیب جانتے تھے اور نہ ہمارے رسول کریم ﷺ، ورنہ جبریل علیہ السلام کو جوتوں میں نجاست کی اطلاع کے لیے دوران نماز آپ کے پاس آنے کی ضرورت نہ تھی اور اگر موسیٰ علیہ السلام غیب جانتے ہوتے تو نہ راستہ بھولتے اور نہ آگ کو عام آگ سمجھتے، نہ اللہ تعالیٰ کو وادی مقدس کا بتا کر انھیں جوتے اتارنے کا حکم دینا پڑتا اور نہ یہ کہہ کر تعارف کروانا پڑتا کہ میں تیرا رب تجھ سے مخاطب ہوں اور نہ اس کے بعد جبریل علیہ السلام کو بار بار آ کر وحی پہنچانا پڑتی۔ مگر افسوس کہ دلیوں اور نیوں کو غیب دان کہنے والے ذرہ برابر نہیں سوچتے۔

۱۴) اوپر کی حدیث سے معلوم ہوا کہ جوتے پاک کرنے کے لیے کپڑے کو پاک کرنے کی طرح دھونا ضروری نہیں، بلکہ صرف مٹی سے مل کر صاف کر دینا کافی ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث ہر اس بہانے کا جواب ہے جو جوتوں سمیت نماز سے روکنے والے کرتے ہیں، مثلاً یہ کہ یہ سفر کے لیے ہے، یا یہ کسی میدان وغیرہ میں نماز کے لیے ہے مسجد کے لیے نہیں، یا یہ کہ جوتا نیا ہو تو جائز ہے، یا یہ کہ دھویا ہوا ہو تو ٹھیک ہے، یا یہ کہ جوتا پہننا اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی کے ادب کے خلاف ہے وغیرہ، ان تمام باتوں کا جواب اسی حدیث پر غور کرنے سے مل جاتا ہے۔

۱۵) جیسا کہ اوپر گزرا جوتوں سمیت نماز پڑھنا فرض نہیں مستحب ہے۔ اس لیے اگر لاعلم لوگوں کے فتنے میں پڑنے کا خوف ہو تو جوتوں سمیت نماز پڑھنے سے پہلے انھیں اچھی طرح سمجھنا لازم ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ متضرر ہو کر نماز پڑھنا ہی چھوڑ دیں۔

إِنِّى أَنَا اللهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِى ۚ وَ أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِى ﴿۱۴﴾

بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر ﴿۱۴﴾

اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے۔ دیکھیے سورہ حج (۷۵) قادیانی دجال نے اسے مجاہدہ و کسب سے حاصل ہو سکنے کا دعویٰ کیا، چنانچہ اس کی زندگی ہی میں اس کے پیروکاروں میں سے تیرہ آدمیوں نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ دیکھیے قادیانیت از ابوالحسن علی ندوی۔

آیت 14 ﴿۱﴾ إِنِّى أَنَا اللهُ: اللہ تعالیٰ نے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو اس تعلق سے آگاہ کیا جو اللہ تعالیٰ اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تھا کہ بلاشبہ میں تیرا رب ہوں جو تجھ سے مخاطب ہوں، یعنی تجھے پیدا کرنے والا، تیری پرورش کرنے والا اور تیری ہر ضرورت پوری کرنے والا میں ہی ہوں۔ پھر جوتے اتارنے کے حکم کے بعد وحی کو غور سے سننے کی تاکید فرمائی، کیونکہ چننے سے مقصود ہی وحی کے ذریعے سے رسالت کی ذمہ داریاں سونپنا تھا۔ اب ضمیر متکلم ”اے“ کے بعد اپنا ذاتی نام بتایا، کیونکہ ملاقات میں پہلی چیز یہی ہے کہ ایک دوسرے کا نام معلوم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کہ میں تو اپنے کلیم کا نام جانتا ہی ہوں، میرا نام اللہ ہے۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے باقی سب نام صفاتی ہیں جن میں اس کے نانوے نام بھی شامل ہیں اور وہ بے شمار نام بھی جن سے اس نے ابھی تک کسی کو آگاہ نہیں کیا۔ لفظ ”اللہ“ عربی زبان میں اس ذات پاک کا نام ہے۔ جب ”اللہ“ کہہ دیا تو اس میں اس کے تمام نام بھی آگئے اور تمام صفات بھی۔ ”اے“ کے ساتھ تاکید موسیٰ علیہ السلام سے شک کا امکان دور کرنے کے لیے ہے، کیونکہ انوکھی بات سن کر جلدی یقین نہیں آتا۔

﴿۲﴾ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا: ”إِنِّى“ کی پہلی خبر ”أَنَا اللهُ“ تھی، ”دوسری خبر ہے۔ یہ سب سے پہلی بات ہے جسے جانا، اس پر یقین رکھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہر جن وانس پر واجب ہے۔ اسی بات کی تعلیم کے لیے تمام انبیاء مبعوث فرمائے گئے۔ دیکھیے سورہ انبیاء (۲۵) ”فَاعْبُدْنِى“ یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے جن وانس کو پیدا کیا گیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ الذاریات: ۵۶ ”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔“ یعنی جب میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تو میری عبادت کر۔ عبادت میں ہر وہ عمل آجاتا ہے جو انتہائی محبت کے ساتھ انتہائی درجے کی عاجزی اور تعظیم پر دلالت کرتا ہو، اس میں قول، فعل اور دل کا اخلاص سب شامل ہیں۔

﴿۳﴾ وَ أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِى: ”فَاعْبُدْنِى“ میں اگرچہ ہر قسم کی بدنی و مالی عبادت کا ذکر آ گیا تھا، لیکن چونکہ نماز تمام عبادتوں کی جامع اور سب سے اہم عبادت ہے اور اسلام قبول کرنے کے بعد ایمان کی سب سے پہلی شرط اور علامت ہے کہ جس سے مسلمان کی پہچان ہو کر اس کا خون اور مال محفوظ ہو جاتا ہے (دیکھیے توبہ: ۱۱، ۵) اس لیے اس کا خاص طور پر الگ ذکر بھی فرمایا۔ شاہ عبد القادر عظیمی لکھتے ہیں: ”موسیٰ علیہ السلام کو پہلی وحی میں نماز کا حکم ہے اور ہمارے پیغمبر ﷺ کو بھی ” فرمایا گیا۔“ (موضح)

إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِيُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ ﴿١٥﴾

یقیناً قیامت آنے والی ہے، میں قریب ہوں کہ اسے چھپا کر رکھوں، تاکہ ہر شخص کو اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کوشش کرتا ہے ﴿١٥﴾

”لِذِكْرِي“ کی دو تفسیریں ہیں اور دونوں درست ہیں۔ پہلی یہ کہ نماز کا مقصد یہ ہے کہ بندہ اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو، ایک نماز سے فارغ ہو تو اگلی کے انتظار میں مشغول رہے، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آتا ہے: «وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ» [بخاری: ۱۶۸۰۶] اس طرح اس کا سارا وقت ہی نماز میں شمار ہوگا جو اللہ کی یاد کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل کی آیت (۷۸) کی تفسیر۔ ہر وقت یاد رکھنے کا نتیجہ اللہ کی نافرمانی سے اجتناب ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ [العنکبوت: ۴۵] ”بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔“ دوسری تفسیر یہ کہ اگر بھول جائے تو یاد آنے پر نماز پڑھ لے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّ إِذَا ذَكَرَهَا لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذَلِكَ ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾» [بخاری، مواقيت الصلاة، باب من نسي صلاة فليصل إذا ذكر.....: ۵۹۷، عن أنس رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] ”جو شخص کوئی نماز بھول جائے تو جب اسے یاد آئے پڑھ لے، اس کا کفارہ اس کے سوا کچھ نہیں۔“ اور پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾ ”اور نماز میری یاد کے وقت قائم کر۔“ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ نَسِيَ صَلَاةً أَوْ نَامَ عَنْهَا فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا» [مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفاتية.....: ۶۸۴/۳۱۵، عن أنس رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] ”جو شخص کوئی نماز بھول جائے، یا اس سے سویا رہ جائے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب اسے یاد آئے پڑھ لے۔“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَادْكُرْ رَبَّكَ إِذَا قَسَيْتَ﴾ [الكهف: ۲۴] ”اور اپنے رب کو یاد کر جب تو بھول جائے۔“

آیت ۱۵ ① إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ: توحید، عبادت اور نماز کی تاکید کے بعد ایمان کے ایک اور بنیادی رکن قیامت کے یقینی ہونے کا ذکر فرمایا، تاکہ ہر شخص کو اس کی سعی و کوشش کی جزا دی جائے۔ اس صورت میں ”لِيُجْزَىٰ“ ”آتِيَةٌ“ کے متعلق ہوگا۔ قیامت کا یقین ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت پر آمادہ کرتی ہے، ورنہ باز پرس اور اللہ کے سامنے پیش ہونے کا یقین نہ ہو تو جائز و ناجائز کی تمیز کون کرتا ہے؟

② أَكَادُ أُخْفِيهَا لِيُجْزَىٰ.....: یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ جس کام کے متعلق ”كَادُ يَكَادُ“ استعمال ہو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ واقع ہونے کے قریب ہے مگر واقع نہیں ہوا، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت (۲۰): ﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يُخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ﴾ (بجلی قریب ہے کہ ان کی نگاہوں کو اچک لے) میں ہے۔ مفسرین نے اس کے بہت سے جواب دیے ہیں، مگر مجھے ابن جزئی رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ کے جواب پر اطمینان ہوتا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقت کو پوشیدہ رکھا ہے اور کسی کو نہیں بتایا، یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ قیامت کے واقع ہونے کو بھی چھپا کر رکھتا اور کسی کو اس کی خبر نہ دیتا، مگر یہ اس کا کرم ہے کہ اس

فَلَا يَصُدُّكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدَى ﴿١٦﴾ وَمَا تِلْكَ بِبَيْنِكَ
يُمُونِي ﴿١٧﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ أَتَوَكَّلُ عَلَيْهَا ۖ أَهْشُ بِهَا عَلَىٰ غَنِيِّ وَلِيٍّ فِيهَا

سو تجھے اس سے وہ شخص کہیں روک نہ دے جو اس پر یقین نہیں رکھتا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگا ہوا ہے، پس تو ہلاک ہو جائے گا ﴿۱۷﴾ اور یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ! ﴿۱۶﴾ کہا یہ میری لاشی ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں

نے اسے پوشیدہ نہیں رکھا، بلکہ اس کے واقع ہونے کی بات سب کو بتا دی ہے، تاکہ لوگ بالکل غافل نہ رہیں۔ اس صورت میں ”سکاذ“ اور ”أخفیی“ دونوں اپنے اصل معنی پر رہتے ہیں کہ قریب تھا کہ قیامت کا واقع ہونا چھپا لیا جاتا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ (التسہیل)

آیت 16 ﴿فَلَا يَصُدُّكَ عَنْهَا.....﴾ اس آیت سے حاصل ہونے والے فوائد میں سے ایک فائدہ مفسر زمخشری کے الفاظ میں یہ ہے: ”جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ جم غفیر ہیں، کیونکہ کفار کے لیے قیامت کو تسلیم کرنے سے زیادہ مشکل کوئی چیز نہیں، نہ ہی وہ اس سے زیادہ کسی چیز کا انکار کرتے ہیں۔ سو ایسا ہرگز نہ ہو کہ ان کی طرف سے آنے والے مصائب کی کثرت اور ان کی بہت بڑی تعداد تمہیں خوف زدہ کر دے اور ان کی کثرت تمہارے قدم پھسلنے کا باعث بن جائے۔ یاد رکھو کہ وہ جس قدر بھی تعداد میں زیادہ ہوں، وہ صرف اور صرف اپنی خواہش نفس کے پیچھے چل رہے ہیں، کسی دلیل و برہان کے پیچھے نہیں اور اس میں بہت بڑی ترغیب ہے کہ دلیل کا علم اور اس کی پیروی لازم ہے اور تقلید سے بچنا نہایت ضروری ہے، کیونکہ تقلید اور اہل تقلید کا انجام ہلاکت ہے۔“ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ دنیا پرست لوگوں، خصوصاً کفار کی مجلس اور ان سے نری اور مدہنت اختیار کرنے سے پرہیز لازم ہے۔ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”نہ روک دے اس سے“ یعنی قیامت کے یقین لانے سے یا نماز سے۔ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو برے کی صحبت سے منع کیا تو اور کوئی کیا ہے؟“ (موضح)

آیت 17 ﴿وَمَا تِلْكَ بِبَيْنِكَ يُمُونِي﴾ اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں کیا ہے، بلکہ اس میں حکمت یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس کے عصا ہونے کا یقین ہو جائے، بعد میں سانپ بننے پر انہیں یہ شک پیدا نہ ہو کہ شاید میں نے کوئی اور چیز پکڑی ہوئی تھی۔ (واللہ اعلم) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے دل سے ہیبت دور کرنے اور مانوس کرنے کے لیے لاشی کے متعلق سوال فرمایا ہو، تاکہ انہیں اگلا حکم دیں۔

آیت 18 ﴿قَالَ هِيَ عَصَايَ.....﴾: جواب میں اگرچہ اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا کہ ”یہ میری لاشی ہے“ مگر موسیٰ علیہ السلام نے یہ بتانے کے بعد اس کے کئی فوائد بھی بیان کر دیے۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خیال کیا کہ یہ بات ظاہر ہے کہ میرے ہاتھ میں لاشی ہے اور ظاہر بات کے متعلق سوال نہیں ہوتا، اس لیے انہوں نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ اس لیے پوچھا ہے کہ میں بتاؤں کہ میں نے لاشی کیوں پکڑ رکھی ہے؟ اس لیے جواب میں ”یہ لاشی ہے“ کہہ کر اس کے چند فوائد بیان کیے، مگر آخر میں بات مختصر کر دی کہ اگر مزید وضاحت کی ضرورت ہوئی تو پھر پوچھ لیا جائے گا۔ (ابن عاشور)

مَارِبُ أُخْرَى ۱۸

اور اس کے ساتھ اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور میرے لیے اس میں کئی اور ضرورتیں ہیں ۱۸

دوسری توجیہ علمائے معانی نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کی لذت میں بے اختیار بات لمبی ہوتی گئی، مگر ایک طرف فرط محبت کا تقاضا تھا کہ بات لمبی سے لمبی ہوتی جائے، تو دوسری طرف ادب زیادہ بات کرنے سے مانع تھا، اس لیے ایک اپنی ضرورت ”یک لگانا“ اور ایک اپنی بکریوں کی ضرورت ”پتے جھاڑنا“ بیان کر کے آخر میں یہ کہہ کر بات مختصر کر دی کہ ”وَلِيَّ فِيهَا مَارِبُ أُخْرَى“ یہ توجیہ بھی بہترین ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے لاشعی کے بہت سے دیگر فوائد بھی بیان کیے ہوں جن کا ماہر اللہ تعالیٰ نے اپنے الفاظ میں بیان فرما دیا ہو۔ اس صورت میں یہ اختصار موسیٰ علیہ السلام کے کلام میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں ہوگا۔ (واللہ اعلم)

② أَهْلُ يَهَا عَلَى شَيْءٍ : حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے ”هَشْ“ کا معنی یہ نقل کیا ہے کہ لاشعی کے ساتھ شہنی کو بلانا، تاکہ پتے گر پڑیں مگر شاخ نہ ٹوٹے۔ یہ لفظ لاشعی مار کر پتے جھاڑنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ”مَارِبُ“ ”مَارِبَةُ“ (را کے فتح، کسرہ اور ضمہ کے ساتھ) کی جمع، حاجت یعنی وہ کام جن کی ضرورت پڑتی ہے۔ لاشعی کے فوائد پر حافظ نے ”کتاب العصاب“ لکھی ہے جس میں لاشعی کے فوائد اور عربوں کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ ابن الاعرابی سے پوچھا گیا کہ ”وَلِيَّ فِيهَا مَارِبُ أُخْرَى“ سے کیا مراد ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ”میں موسیٰ علیہ السلام کی تمام ضروریات تو بیان نہیں کر سکتا، البتہ لاشعی کی ضرورت کی چند چیزیں تمہیں بتاتا ہوں، وہ یہ کہ لاشعی سانپ، بچھو، بھیڑیے، بھڑے ہوئے سانڈ اور کھیت اجاڑنے والے جانوروں کے لیے ساتھ رکھی جاتی ہے۔ بڑی عمر کے بڑھے، کمزور و بیمار لوگ، کئی ہوئی ٹانگ والے اور لنگڑے اس کا سہارا لیتے ہیں، یہ انھیں دوسری ٹانگ کا کام دیتی ہے۔ اندھے کو قائمہ کا کام دیتی ہے۔ دھوبی، رنگ ریز اور تور اور چولھے کی راکھ بلانے والوں کے کام آتی ہے۔ چونا کوٹنے، تل وغیرہ چھڑنے کے کام آتی ہے۔ ڈاک لے جانے والوں اور کرائے کے جانوروں کے ساتھ جانے والوں کے کام آتی ہے کہ فاصلہ لمبا ہو تو وہ لاشعی کے سہارے چھلانگ لگاتے جاتے ہیں۔ فالج زدہ کے جھکاؤ کو سیدھا کرتی ہے اور رعشہ کے مریض کے لرزہ کو کنٹرول کرتی ہے۔ چرواہے اسے بکریوں کے لیے اور تمام سوار اپنی سواری کے لیے ساتھ رکھتے ہیں۔ کوئی بھاری بوجھ ہو تو اس میں داخل کر کے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات دو آدمی اس کا ایک ایک کنارہ پکڑ لیتے ہیں۔ چاہو تو دیوار میں ٹھونک کر شیخ بنا لو یا کھلی جگہ میں گاڑ کر سترہ بنا لو یا چھتری بنا لو۔ اگر نوک لگا دو تو برجی بن جائے گی، کچھ اور بڑھا دو تو تیزہ بن جائے گی۔ لاشعی کوڑے کا کام بھی دیتی ہے اور اسلحہ بھی ہے۔ کندھے پر رکھ کر اس کے ساتھ کمان، ترکش اور پانی یا دودھ وغیرہ کا برتن بھی لٹکا سکتے ہو۔ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے رسی چھوٹی ہو تو لاشعی ساتھ ملا کر پانی نکال سکتے ہو۔ چادر اس کے اوپر ڈال کر سایہ حاصل کر سکتے ہو اور درندوں کا مقابلہ کر سکتے ہو وغیرہ۔“

قَالَ الْقَوْمُ يُؤَسِّي ۝ فَالْقَوْمُ فَادَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَى ۝ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۝ سَعِيدٌ هَا
سَيْرَتَهَا الْأُولَى ۝ وَأَضْمُ يَدَكَ إِلَى جَنَاحِكَ تَخْرُجَ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ
آيَةٌ أُخْرَى ۝

فرمایا اسے پھینک دے اے موسیٰ! ۱۵ تو اس نے اسے پھینکا تو اچانک وہ ایک سانپ تھا جو دوڑتا تھا ۱۶ فرمایا اسے
پکڑ اور ڈر نہیں، عنقریب ہم اسے اس کی پہلی حالت میں لوٹا دیں گے ۱۷ اور اپنا ہاتھ اپنے پہلو کی طرف ملا، وہ کسی
عیب کے بغیر سفید (چمکتا ہوا) نکلے گا، اس حال میں کہ ایک اور نشانی ہے ۱۸

آیت 19-21 ۱؎ اللہ تعالیٰ کے حکم پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو اچانک وہ سانپ بن گیا جو دوڑتا تھا، یعنی حقیقی اور زندہ
سانپ تھا۔ قرآن مجید میں اس کے لیے تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں ”حَيَّةٌ“ (سانپ)، ”جَانٌّ“ (پتلا چمڑی جیسا چمکتا ہوا
سانپ) اور ”ثُعْبَانٌ“ (بہت بڑا اژدہا)۔ معلوم ہوا کہ لاشھی پھینکتے ہی تپلے سانپ جھسی بنی، پھر بڑھتے بڑھتے بہت بڑا اژدہا
بن گئی۔ موسیٰ علیہ السلام خوف زدہ ہو کر بے اختیار بھاگ اٹھے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ دیکھیے سورہ نمل (۱۰) اور قصص (۳۱) اللہ تعالیٰ
نے فرمایا کہ اسے پکڑو اور ڈر نہیں، ہم اسے دوبارہ پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔

۲؎ اہل علم نے لاشھی کے ایک لمحہ میں سانپ اور پھر دوبارہ لاشھی بننے میں کئی حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے
کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کے جدا جدا ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنی قدرت کا عین الیقین عطا فرمادیا کہ کس طرح اس کے حکم سے
ایک بے جان چیز اتنی خطرناک ہو جاتی ہے کہ اس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی اور پھر کس طرح اتنی خطرناک چیز اس کے حکم
سے بے جان لکڑی بن جاتی ہے، جو حرکت بھی نہیں کر سکتی۔ مقصد یہ یقین دلانا تھا کہ فرعون اپنی تمام تر قہرمانیوں کے باوجود
اللہ کے حکم کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ دوسری حکمت یہ کہ اس زمانے میں جادو اپنے عروج پر تھا، اس کے توڑ کے لیے یہ معجزہ دیا
اور انھیں مشاہدہ بھی کروادیا، تاکہ میدان میں لاشھی کے سانپ بننے سے موسیٰ علیہ السلام خوف زدہ ہو کر بھاگ نہ انھیں، بلکہ انھیں
آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوت کا ہر وقت احساس رہے۔ تیسری حکمت بقایٰ ﷺ نے ربط آیات کے
ضمن میں لکھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے آغاز سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے آنے کا ذکر فرمایا ہے، جسے ”السَّاعَةُ“
کہتے ہیں، یعنی ایک لمحہ، ایک گھڑی، قیامت کا ذکر کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو ایک لمحے میں لاشھی کو سانپ اور سانپ کو لاشھی بنا
کر ایک گھڑی میں قیامت قائم ہونے کا مشاہدہ کروادیا۔ (نظم الدرر)

آیت 22 ۱؎ وَأَضْمُ يَدَكَ إِلَى جَنَاحِكَ دوسری جگہ اس کی تفصیل آئی ہے کہ حکم ہوا کہ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر
اسے اپنے پہلو کے ساتھ لگاؤ گے تو وہ چمکتا ہوا سفید نکلے گا، مگر وہ سفیدی برص وغیرہ جیسا عیب نہیں ہوگی، بلکہ ایک معجزہ
ہوگی۔ ”کسی عیب کے بغیر“ کی تصریح اس لیے فرمائی کہ برص کو بہت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے۔

لِنُرِيكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى ﴿٢٣﴾ اِذْهَبْ اِلَى فِرْعَوْنَ اِنَّهُ كَفٰى ﴿٢٤﴾ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿٢٥﴾ وَبَيِّرْ لِي اَمْرِي ﴿٢٦﴾ وَاحْلِلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ لِي وِزِيْرًا مِّنْ اَهْلِي ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾

تاکہ ہم تجھے اپنی چند بڑی نشانیاں دکھائیں ﴿٢٣﴾ فرعون کی طرف جا، بے شک وہ سرکش ہو گیا ہے ﴿٢٤﴾ اس نے کہا اسے میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے ﴿٢٥﴾ اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے ﴿٢٦﴾ اور میری زبان کی کچھ گہرہ کھول دے ﴿٢٧﴾ کہ وہ میری بات سمجھ لیں ﴿٢٨﴾ اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک بوجھ بٹانے والا بنا دے ﴿٢٩﴾ ہارون کو، جو میرا بھائی ہے ﴿٣٠﴾

آیت 23 ﴿لِنُرِيكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى﴾: یہاں ”مِنْ“ بعض کے معنی میں ہے، یعنی ہم نے عصا اور ید بیضا تمہیں اپنے چند بڑے معجزے دکھانے کے لیے عطا کیے ہیں۔ یہ معنی بھی ہے کہ ہم نے یہ معجزے تمہیں اپنے کچھ مزید بڑے معجزے دکھانے کے لیے دیے ہیں۔ ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۱۰۱)۔

آیت 24 ﴿اِذْهَبْ اِلَى فِرْعَوْنَ.....﴾: نبوت اور معجزات عطا کرنے کے بعد حکم ہوا کہ یہ معجزات لے کر فرعون کے پاس جاؤ جو تکبر اور سرکشی میں ہر حد سے تجاوز کر گیا ہے، حتیٰ کہ بندہ ہو کر رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کر بیٹھا ہے۔ اس حکم کی مزید تفصیل آگے آیات (۲۸-۲۹) میں آ رہی ہے۔

آیت 25-26 ﴿قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي.....﴾: دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَيَضِيْقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي﴾ [الشعراء: ۱۳] ”اور میرا سینہ تنگ ہوتا ہے اور میری زبان چلتی نہیں۔“ یعنی اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے سے میرے دل میں جو تنگی محسوس ہوتی ہے وہ دور فرما دے اور اس منصب عظیم کا بوجھ اٹھانے کے لیے جس ہمت، پامردی اور حوصلہ مندی کی ضرورت ہے وہ میرے دل میں پیدا فرما دے اور میرا تبلیغ رسالت کا کام میرے لیے آسان فرما دے۔

آیت 27-30 ﴿١﴾ وَاحْلِلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي.....: سورہ شعراء کی آیت (۱۳): ﴿وَيَضِيْقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں وہ روانی نہ تھی جسے وہ اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ فرعون کو بھی ان پر طعن کے لیے یہی کمزوری ملی کہ کہا: ﴿وَلَا يَلْكُؤُاْ يٰٓيٰمِيْنُ﴾ [الزحرف: ۵۲] ”اور یہ (موسیٰ) قریب نہیں کہ بات واضح کرے۔“ اگرچہ فرعون کی بات کا کچھ اعتبار نہیں، کیونکہ جھوٹا الزام لگا دینا اس سے کچھ بعید نہ تھا۔ الغرض اس کے لیے انھوں نے دو دعائیں کیں، ایک تو یہ کہ اے میرے رب! میری زبان کی کچھ گہرہ کھول دے، تاکہ لوگ میری بات سمجھ لیں۔ کچھ گہرہ کا مفہوم ”عُقْدَةٌ“ کی توہین سے ظاہر ہو رہا ہے۔ زبان سے مکمل گہرہ دور کرنے کی دعا کے بجائے انھوں نے یہ کہہ کر اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے لیے نبوت کی درخواست کر دی کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں اور میرے اہل خانہ میں سے میرا بوجھ بٹانے والے ہوں گے۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ کسی بھائی نے اپنے بھائی کے لیے موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ بہتر دعا نہیں کی۔ بعض تفسیر میں موسیٰ علیہ السلام

اَشْدُّ بِهِ اَزْرِي ۝۳۱ وَ اَشْرِكُهُ فِي اَمْرِي ۝۳۲ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝۳۳ وَ نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝۳۴
 اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝۳۵ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُوْلَكَ يٰمُوْسٰى ۝۳۶ وَ لَقَدْ مَنَّا عَلَيْكَ
 مَرَّةً اٰخَرٰى ۝۳۷

اس کے ساتھ میری پشت مضبوط کر دے ۳۱ اور اسے میرے کام میں شریک کر دے ۳۲ تاکہ ہم تیری بہت تسبیح کریں ۳۳ اور تجھے بہت یاد کریں ۳۴ بے شک تو ہمیشہ ہمارے حال کو خوب دیکھنے والا رہا ہے ۳۵ فرمایا بے شک تجھے تیرا سوال عطا کر دیا گیا اے موسیٰ! ۳۶ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ پر ایک اور بار بھی احسان کیا ۳۷

کے بچپن میں انکارا منہ میں ڈالنے کا ذکر ہے، مگر وہ اسرائیلی روایات میں سے ہے، جن سے کسی بات کا یقین حاصل نہیں ہوتا۔
 ۳۲ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا..... : یعنی مددگار جو اس عظیم بوجھ کو اٹھانے میں میرا شریک ہو۔ شاہ عبد القادر رُحْمَةُ لکھتے ہیں :
 ”ایسے بڑے پیغمبروں کو (ساری) خلق کی طرف بہت (یعنی مکمل) خیال نہیں ہوتا، ایک پیش کار چاہیے کہ خلق کو تسبیح میں سمجھائے، ہمارے پیغمبر ﷺ کے پیش کار ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، ابتدا میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تبلیغ ہی سے بہت سے لوگ مسلمان ہوئے ہیں، جن کا شمار کبار صحابہ میں ہے۔“ (موضح)

آیت 31-32 اَشْدُّ بِهِ اَزْرِي..... : ”اَشْدُّ“ اکثر قراءت کی قراءت کے مطابق یہ ”شَدُّ يَشْدُو“ (ن) سے ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ فعل امر ہے۔ اسی طرح ”اَشْرِكُهُ“ ”اَشْرَكَ يَشْرِكُ“ (افعال) سے فعل امر ہے۔

آیت 33-34 كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا..... : یعنی ان دعاؤں سے ہمیں کوئی دنیاوی مفاد مقصود نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے تعاون سے تیری تسبیح اور تیرا ذکر بہت زیادہ کر سکیں گے، مثلاً دنیوی ضروریات آپس میں تقسیم کر لیں گے تو تسبیح و ذکر اور دعوت کے لیے زیادہ وقت نکل سکے گا۔

آیت 35 اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا : ”كُنْتَ“ میں ”سكان“ استمرار کے لیے ہے کہ ”بے شک تو ہمیشہ ہمارا نگران اور نگہبان رہا ہے۔“ یعنی جب ہم بچے تھے اس وقت بھی تو نے ہماری پرورش کی اور ہمیں دشمنوں سے محفوظ رکھا، اب بھی تیری اسی رحمت کے وسیلے سے تیری جناب میں درخواست ہے کہ ہماری یہ دعائیں قبول فرما۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور پہلی نوازشوں کے وسیلے سے دعا کا سبق بھی ہے۔

آیت 36 قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُوْلَكَ..... : یعنی تم نے منہ مانگی مراد پائی اور ہم نے تمہاری ہر درخواست کو منظور فرمایا۔ سینہ کھل گیا، کام آسان ہو گیا، زبان کی گرہ بھی مکمل یا بقدر ضرورت کھل گئی۔ چنانچہ اس کے بعد ہر جگہ موسیٰ رضی اللہ عنہ نے خود ہی فرعون اور چادوگروں سے بحث کی ہے، کہیں ہارون رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں آیا اور ہارون رضی اللہ عنہ کو بھی نبی بنا کر وزیر بنا دیا گیا۔

آیت 37 ۱ وَ لَقَدْ مَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اٰخَرٰى : اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی، نبوت و رسالت کے منصب پر فائز ہونے، عصا و

إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ﴿۱﴾

جب ہم نے تیری ماں کو وحی کی، جو وحی کی جاتی تھی ﴿۱﴾

یہ بیضا کے معجزے عطا ہونے، ان کا آنکھوں سے مشاہدہ کرنے اور اس موقع پر کی ہوئی چاروں دعاؤں کی قبولیت میں سے ہر ایک عظیم احسان تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے ان سے پہلے کیے گئے آٹھ احسانات کا ذکر فرمایا۔ مقصد یہ کہ میں نے تم پر پہلے بھی احسان کیے، اب بھی کیے اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا، کیونکہ میں نے تمہیں بنایا ہی خاص اپنے لیے ہے، فرمایا: ﴿وَاضْطَعْنَاكَ لِنَفْسِي﴾ [طہ: ۶۱] ”اور میں نے تجھے اپنے لیے خاص طور پر بنایا ہے۔“ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو آئندہ کے وعدے کا یقین دلانے کے لیے پچھلے احسانات یاد دلائے، فرمایا: ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ ﴿۱﴾ ﴿لَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ﴾ ﴿۲﴾ ﴿وَوَجَدَكَ عَابِلًا فَأَغْنَىٰ﴾ [الضحیٰ: ۵ تا ۸] ”اور یقیناً عنقریب تیرا رب تجھے عطا کرے گا، پس تو راضی ہو جائے گا۔ کیا اس نے تجھے یتیم نہیں پایا، پس جگہ دی اور اس نے تجھے راستے سے ناواقف پایا تو راستہ دکھا دیا اور اس نے تجھے تنگدست پایا تو غنی کر دیا۔“ (ابن عاشور)

”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ پر ایک اور بار بھی احسان کیا“ اس میں احسان کو مجمل رکھا ہے، تاکہ شوق پیدا ہو کہ وہ کیا احسان تھا، پھر چار آیات (۳۱ تا ۳۸) میں پے در پے آٹھ احسان ذکر فرمائے: ﴿۱﴾ ”إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ“ ﴿۲﴾ ”وَأَلْقَيْنَا عَلَيْكَ حَجْرَةَ مِثْقَالِ عَسْفَرٍ“ ﴿۳﴾ ”وَلِصْنَعِ عَلِيٍّ عِنِّي“ ﴿۴﴾ ”فَرَجَعْنَاكَ إِلَىٰ أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ“ ﴿۵﴾ ”وَقَتَلْنَا نَفْسًا فَجَبْنَاكَ مِنَ الْعَمَىٰ“ ﴿۶﴾ ”وَقَتَلْنَا قُتُوبًا“ ﴿۷﴾ ”فَلَقَّبْتُ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ لَا تَمُرُّ حَجَّتٌ عَلَىٰ قَدْرِ يَتِيمِ سَاسِي“ ﴿۸﴾ ”وَاضْطَعْنَاكَ لِنَفْسِي“

آیت 38 ﴿۱﴾ **﴿۱﴾** **إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ** : جب کسی چیز کی عظمت بیان کرنا مقصود ہو تو یہ انداز اختیار کیا جاتا ہے ”جو وحی کی جاتی تھی“ یعنی اس کی عظمت محدود الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی، جیسا کہ ﴿فَغَشِيَهُمْ مِنْ آلِيهِ مَا غَشِيَهُمْ﴾ [طہ: ۷۸] اور ﴿فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ﴾ [النجم: ۱۰] میں ہے۔

﴿۲﴾ یہاں موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بتانے اور مطمئن کرنے کے لیے ”أَوْحَيْنَا“ (ہم نے وحی کی) اور ”يُوحَىٰ“ (جو وحی کی جاتی تھی) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ وحی کے لفظی معنی اشارہ سرریعہ یا دل میں کوئی بات ڈال دینے کے ہیں۔ اصطلاح میں جب یہ لفظ کسی نبی کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی فرشتے کے ذریعے سے پیغام بھیجا ہوتے ہیں۔ قرآن میں دونوں معنوں کے اعتبار سے وحی کا لفظ استعمال ہوا ہے، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف جو وحی بھیجی گئی وہ بھی لفظی معنی کے اعتبار سے تھی، یعنی خواب میں یا کسی خفیہ طریقے سے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی گئی جس سے ان کو یقین و اطمینان حاصل ہو گیا، کیونکہ اس بات پر تقریباً علماء کا اتفاق ہے کہ اللہ کے جتنے نبی ہوئے ہیں مردوں میں سے ہوئے ہیں، عورتوں میں سے کسی عورت کو نبی نہیں بنایا گیا۔ دیکھیے سورہ یوسف (۱۰۹) اور انبیاء (۷) لہذا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی نہیں تھیں کہ ان کے لیے

أَنْ أَفْذِيهِ فِي النَّابُوتِ فَأَقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ فَيُلْقِيهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذُهُ عَدُوٌّ لِي
 وَ عَدُوٌّ لَهُ ۖ وَالْأَقْيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِثِّي ۗ وَ لِيُضَنَّ عَلَى عَيْنِي ﴿٣٩﴾ إِذْ تَمْشِي أُخْتُكَ
 فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى مَنْ يَكْفُلُهُ ۖ فَرَجَعْنَاكَ إِلَى أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ ۗ
 وَ قَتَلْتَ نَفْسًا فَجَعَلْنَاكَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنِكَ فَتَوَّأَى ۗ فَوَقَّلتُ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ ۗ
 ثُمَّ جِئْتَ عَلَى قَدَرٍ يَهُوسَى ﴿٤٠﴾ وَ اصْطَنَعْتَكَ لِنَفْسِي ﴿٤١﴾

یہ کہ تو اسے صندوق میں ڈال، پھر اسے دریا میں ڈال دے، پھر دریا سے کنارے پر ڈال دے، اسے ایک میرا دشمن اور اس کا دشمن اٹھالے گا اور میں نے تجھ پر اپنی طرف سے ایک محبت ڈال دی اور تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے کی جائے ﴿۳۹﴾ جب تیری بہن چلی جاتی تھی، پس کہتی تھی کیا میں تمہیں اس کا پتا دوں جو اس کی پرورش کرے؟ پس ہم نے تجھے تیری ماں کی طرف لوٹا دیا، تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور وہ غم نہ کرے۔ اور تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم نے تجھے غم سے نجات دی اور ہم نے تجھے آزمایا، خوب آزمانا، پھر کئی سال تو مدین والوں میں ٹھہرا رہا، پھر تو ایک مقرر اندازے پر آیا اے موسیٰ! ﴿۴۰﴾ اور میں نے تجھے اپنے لیے خاص طور پر بنایا ہے ﴿۴۱﴾

وہی کے وہ معنی مراد لیے جائیں جو کسی نبی کے لیے ہوتے ہیں۔ (کبیر)

آیت 39 ﴿٣٩﴾ 1 أَنْ أَفْذِيهِ فِي النَّابُوتِ: یعنی تمہارا کام بس اتنا ہے کہ صندوق میں ڈال کر دریا (نیل) میں ڈال دو۔ آگے دریا کو ہمارا حکم یہ ہے کہ اسے راستے میں روکنے یا لے جا کر سمندر میں ڈالنے کے بجائے عین فرعون کے محل کے پاس ساحل پر لگا دے۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل سورہ قصص (۱۳ تا ۱۴) میں ہے۔

﴿٢٠﴾ وَالْأَقْيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِثِّي: یعنی تمہاری صورت ایسی بنائی اور اس میں اپنی طرف سے ایسی انوکھی دل ربائی رکھی کہ جو کوئی تمہیں دیکھتا ہے اختیار محبت کرنے لگتا۔ ”وَلِيُضَنَّ عَلَى عَيْنِي“ کا عطف ”الْأَقْيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِثِّي“ سے حاصل ہونے والے مفہوم پر ہے، جس کی تقدیر یوں ہوگی: ”وَالْأَقْيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِثِّي لِتُحَبَّ وَ لِيُضَنَّ عَلَى عَيْنِي“ اور میں نے تجھ پر ایک انوکھی محبت ڈال دی، تاکہ تجھ سے محبت کی جائے اور تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے کی جائے۔ اس عطف کی مزید توجیہات مفصل کتب میں دیکھیں۔ ”مَحَبَّةً“ میں تنوین تکبیر کے لیے ہے، اس لیے ”ایک انوکھی محبت“ ترجمہ کیا ہے، یعنی جو اسباب کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ بلا اسباب خاص اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی۔

آیت 40 41 ﴿٤٠﴾ 1 ”إِذْ تَمْشِي أُخْتُكَ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ قصص (۱۱ تا ۱۳) اور ”وَقَتَلْتَ نَفْسًا“ سے آخر آیت تک کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ قصص (۱۳ تا ۲۸)۔

إِذْهَبْ أَنْتَ وَ أَخُوكَ بِآيَتِي وَلَا تَنِيَابَا فِي ذِكْرِي ﴿٣١﴾ إِذْهَبَا إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ ظَلَمٌ ﴿٣٢﴾

تو اور حیرا بھائی میری آیات لے کر جاؤ اور میری یاد میں سستی نہ کرنا ﴿٣١﴾ دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک وہ سرکش ہو گیا ہے ﴿٣٢﴾

﴿٣١﴾ وَقَتْلِكَ قُتُونَا : ”قُتُونَا“ ”فَتَنَ يَفْتِنُ“ کا مصدر ہے، جیسا کہ ”فَعُوذُ“ اور ”خُرُوجُ“ وغیرہ ہیں۔ اس کی تینوں تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا ہے ”اور ہم نے تجھے آزما یا، خوب آزما نا۔“ اس آزمائش میں شاہ زادگی کی آسانشوں کے بعد ان کے ہاتھوں قبلی کا نادانستہ قتل، پھر اپنے قتل ہونے کا خوف، پھر بے سروسامانی میں فوری ہجرت، بھوکے پیاسے اور شدید خوف کی حالت میں کئی دن رات کا سفر، پردیس اور دس سالہ مزدوری سب شامل ہیں، جن سب میں زبردست تربیت کا سامان تھا۔ حافظ ابن کثیر نے ایک لمبی حدیث ”حدیث فتون“ مکمل ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے۔ ﴿٣٢﴾ ثُمَّ جِئْتُ عَلَى قَدْرٍ يُؤْمِنُ : یعنی تمہارا راہ بھول کر وادی طوئی میں آنا اور میرے ساتھ کلام اور نبوت و رسالت سے سرفراز ہونا، کسی طے شدہ منصوبے کے بغیر اور اچانک نہیں تھا، بلکہ عین میرے مقرر کردہ وقت اور فیصلے کے مطابق تھا۔ اگرچہ ہر کام ہی اللہ کی تقدیر سے ہے، مگر اس ”قَدْرٍ“ سے مراد خاص طور پر طے کرنا ہے، جیسا کہ اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَاصْطَلَعْتَكَ لِغَيْبِي﴾ ”صَنَّعَ يَصْنَعُ“ کا معنی بنانا ہے، ”اصْطَلَعُ“ باب افتعال سے ہے، صاد کی مناسبت سے تاء کو طاء سے بدل دیا اور حروف کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی میں نے تجھے خاص طور پر اپنے کام یعنی رسالت و نبوت کے لیے تیار کیا ہے۔ یہ تمام احسانات کا خلاصہ ہے۔

آیت 42 ﴿١﴾ إِذْهَبْ أَنْتَ وَ أَخُوكَ بِآيَتِي : یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے گھر میں اور پھر مدین میں کی گئی، چونکہ اس وقت وہاں ہارون علیہ السلام موجود نہیں تھے، اس لیے موسیٰ علیہ السلام کو مسہر پہنچ کر انھیں ساتھ لے جانے کا حکم دیا۔ ”بِآيَتِي“ یعنی تم فرعون کے پاس خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے بلکہ میری نشانیاں عصا اور ید بیضا تمہارے پاس ہوں گی، اس لیے بلا جھجک جاؤ اور میرا پیغام پہنچاؤ۔

﴿٢﴾ وَلَا تَنِيَابَا فِي ذِكْرِي : ”لَا تَنِيَابَا“ ”وَلَيْ نَبِيٍّ وَنِيَابَا“ بروزن ”وَعَدَّ بَعْدُ“ سستی کرنا، کوتاہی کرنا، تھک کر رہ جانا۔ یعنی میری یاد میں کمی نہ کرنا، اس سے تمہارا عزم قوی اور قدم ثابت رہے گا، کیونکہ جب تم مجھے یاد کرو گے تو میرے بے شمار عظیم احسانات تمہارے سامنے رہیں گے، جس سے ادائے رسالت میں کوئی ضعف نہیں آئے گا۔ (طبری) اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی دشمن کے مقابلے کے وقت اپنے ذکر کثیر کا حکم دیا (دیکھیے انفال: ۳۵) اور ہر حال میں ذکر کرنے والوں کی تعریف فرمائی اور انھیں ”أُولَئِكَ الْأَنْبَاءُ“ قرار دیا۔ دیکھیے سورہ آل عمران (۱۹۰)۔

آیت 43 ﴿١﴾ إِنَّهُ ظَلَمٌ : ”ظَلَمٌ“ کا اصل معنی حد سے بڑھ جانا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّا لَنَأْتِطَعُ الْمَاءَ حَمَلْنَاكُمْ فِي

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى ﴿۳۸﴾

پس اس سے بات کرو، نرم بات، اس امید پر کہ وہ نصیحت حاصل کر لے، یا ڈر جائے ﴿۳۸﴾

الْحَارِثِيُّ ﴿۳۸﴾ [الحاقہ: ۱۱] "بلاشبہ ہم نے ہی جب پانی حد سے تجاوز کر گیا، تمہیں کشتی میں سوار کیا۔" فرعون کی طغیانی اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر ذکر فرمائی ہے کہ وہ اپنے رب اعلیٰ ہونے کا دعوے دار تھا۔ (نازعات: ۲۴) وہ بلا شرکت غیرے معبود (اللہ) ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا۔ (قصص: ۳۸) اس نے بنی اسرائیل کو یہ باتیں نہ ماننے کی وجہ سے غلامی اور بدترین عذاب کا نشانہ بنا رکھا تھا، ان کے بیٹے نہایت بے رحمی سے قتل کرتا، عورتوں کو زندہ رکھ کر اپنی اور اپنی قوم کی زیادتیوں کا نشانہ بناتا اور مردوں سے بے گار لیتا تھا۔ (قصص: ۴) جسے چاہتا انکار پر تیل میں ڈال دیتا تھا۔ (شعراء: ۲۹)

آیت 44 ﴿۳۸﴾ ۱ **فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا**: اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرعون کو دعوت دیتے وقت نرم بات کہیں، جس میں ترغیب ہو، اسے غصہ دلانے والی نہ ہو۔ ہر داعی کو یہی اسلوب اختیار کرنا لازم ہے، کیونکہ دعوت الی اللہ سے مقصود مخاطب کی ہدایت اور اصلاح ہوتی ہے نہ کہ اپنی برتری ثابت کرنا، یا سخت کلامی سے دل کا غصہ نکالنا۔ دیکھیے سورہ نحل (۱۲۵) اور آل عمران (۱۵۹) اللہ تعالیٰ نے وہ نرم بات بھی خود ہی سکھا دی، جیسا کہ آگے آیت (۴۷) میں آ رہا ہے اور دیکھیے سورہ نازعات (۱۸، ۱۹) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَا عَائِشَةُ! إِنَّ اللَّهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرَّفْقَ وَيُعْطِي عَلَى الرَّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ وَمَا لَا يُعْطِي عَلَى مَا سِوَاهُ» [مسلم، البر والصلة، باب فضل الرفق: ۲۵۹۳، عن عائشة ؓ] "اے عائشہ! بے شک اللہ تعالیٰ بہت نرمی والا ہے، نرمی کو پسند فرماتا ہے اور نرمی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو نہ سختی پر عطا کرتا ہے اور نہ اس (نرمی) کے سوا کسی اور چیز پر عطا کرتا ہے۔" اور یہ بھی فرمایا: «إِنَّ الرَّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ» [مسلم، ایضا: ۲۵۹۴] "نرمی جس چیز میں بھی ہوتی ہے اسے زینت بخشتی ہے اور جس سے بھی نکال لی جائے اسے عیب دار بنا دیتی ہے۔" ہاں اگر کہیں نرمی بالکل ہی بے اثر ٹھہرے اور کوئی شخص ہٹ دھرمی اور تکبر سے کسی طرح باز نہ آئے تو اس سے حق بات سختی کے ساتھ کہنے کی بھی اجازت ہے، کیونکہ وہاں "حکمت" کا تقاضا یہی ہے، جیسا کہ سورہ عنکبوت (۴۶) میں ہے اور زیر تفسیر آیات میں آیت (۴۸) میں موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے۔

۲ **لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى**: "لَعَلَّ" کا لفظ ترحمی (امید کرنے) کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں امید کا ذکر آئے تو وہ بات یقینی ہوتی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ فرعون نصیحت یا ڈرنے سے محروم رہے گا، پھر "لَعَلَّ" کا لفظ کیوں فرمایا؟ اس کی دو توجیہیں ہیں اور دونوں درست ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ "لَعَلَّ" موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کی نسبت سے ہے کہ تم اس سے نرم بات اس امید کے ساتھ کہو کہ وہ نصیحت حاصل کرے گا، یا ڈر جائے گا۔ ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو تو علم نہیں تھا کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ اسی طرح مخاطب کتنا بھی سرکش ہو، داعی کو ہمیشہ امید کا

قَالَ رَبَّنَا إِنَّنا نَخافُ أَنْ يَفْرُطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْغَى ۝ قَالَ لَا تَخَافَا إِنِّي مَعَكُمَا أَسْعُرُ وَآزِي ۝

دونوں نے کہا اے ہمارے رب! یقیناً ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا، یا کہ حد سے بڑھ جائے گا ۝
فرمایا ڈرو نہیں، بے شک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں ۝

چراغ دل میں روشن رکھنا لازم ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ ”لعل“ کا لفظ ”امید ہے“ کے علاوہ ”سختی“ یعنی ”تاکہ“ کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسے سورۃ بقرہ (۲۱) میں فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ ”تاکہ تم بچ جاؤ۔“ ”يَتَذَكَّرُو“ نصیحت حاصل کر کے ایمان لے آئے یا کم از کم ڈر کر ظلم سے باز آجائے، کیونکہ ایک سرکش آدمی سے یہی امید کی جاسکتی ہے۔

آیت 45: قَالَ رَبَّنَا إِنَّنا نَخَافُ..... : موسیٰ علیہ السلام نے مصر پہنچ کر ہارون علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا اور دونوں بھائیوں نے اپنی بے سروسامانی اور فرعون کی سرکشی، حاکمانہ تسلط اور ظلم و ستم پر غور کیا تو انسانی فطرت کے مطابق ڈرے اور اپنے رب سے اس کا اظہار کرتے ہوئے عرض کی کہ اے ہمارے رب! ہم تو ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرتے ہوئے ہمیں قید یا قتل نہ کر دے، یا کوئی اور خوف ناک سزا نہ دے، یا اس کی سرکشی اور بڑھ جائے اور وہ کفر اور گمراہی میں مزید بڑھ جائے، یا تیری ذات و صفات کے بارے میں کوئی نامناسب بات کہہ گزرے، جس سے ہمیں ہر تکلیف سے زیادہ تکلیف پہنچے۔

آیت 45: ① إِنِّي مَعَكُمَا ۝ بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں، اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ ہے، فرمایا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ [الحديد: ۴] ”اور وہ تمہارے ساتھ ہے، تم جہاں کہیں بھی ہو۔“ مگر یہاں اس سے مراد خاص معیت (ساتھ) ہے، یعنی میں تمہاری ہر طرح سے حفاظت و نصرت کروں گا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ﴿لَا تَخْزَنَنَّ إِنَّا اللَّهُ مَعَنَا﴾ [التوبة: ۴۰] ”غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“ غور کیجیے پورے مصر کے مسائل کے مالک، بے پناہ فوج کے پہرے میں رب اور معبود ہونے کے دعوے دار کے پاس مقبور و مجبور اور غلام قوم کے دو آدمی جاتے ہیں، جن کے پاس بظاہر ایک لاٹھی کے سوا کچھ نہیں، نہ انھیں کوئی پہرے دار روک سکتا ہے اور نہ فوج کو روکنے کی جرأت ہوتی ہے۔ وہ سیدھے فرعون کے بھرے دربار میں بلا خوف و خطر جا کر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اس کے ہر سوال کا جواب دیتے ہیں اور اس کے ہر مغالطے کا پردہ چاک کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ لاجواب ہو کر قید کی دھمکی دیتا ہے، مگر اسے نہ قید کرنے کی جرأت ہوتی ہے اور نہ کسی اور زیادتی کی، اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا مظاہرہ اور کیا ہوگا؟

② أَسْعُرُ وَآزِي : میں دوسرے بھیجے والوں کی طرح نہیں جو اپنا قاصد بھیج کر نہ اسے دیکھ سکتے ہیں اور نہ اس کی بات سن سکتے ہیں، بلکہ میں ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں، تمہاری اور سب کی ہر بات سن رہا ہوں اور ہر عمل دیکھ رہا ہوں۔ ایسی کوئی بات اور ایسا کوئی کام نہ ہونے دوں گا جس کا تمہیں خوف ہے۔

فَأْتِيَهُمْ فَقُولًا إِنَّا رَسُولُ رَبِّكَ فَأَنْزِلْ مَعَنَا بِنِي إِسْرَائِيلَ ۗ وَلَا تُعَذِّبُهُمْ ۗ قَدْ جِئْنَاكَ
بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ ۗ وَ التَّلَامُ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى ۝ إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ
عَلَى مَن كَذَّبَ وَ تَوَلَّى ۝

تو اس کے پاس جاؤ اور کہو بے شک ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، پس تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج
دے اور انھیں عذاب نہ دے، یقیناً ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آئے ہیں اور سلام
اس پر جو ہدایت کے پیچھے چلے ۝ بے شک ہم، یقیناً ہماری طرف وحی کی گئی ہے کہ عذاب اس پر ہے جس نے جھٹلایا
اور منہ پھیرا ۝

آیت 47 ﴿۱﴾ فَأْتِيَهُمْ فَقُولًا إِنَّا رَسُولُ رَبِّكَ : اللہ تعالیٰ نے فرعون کو تین چیزوں کی دعوت پہنچانے کا حکم دیا، ایک
دعوت توحید کہ رب تو نہیں بلکہ وہ ہے جو تیرا بھی رب ہے اور جب وہ تیرے جیسے رب کہلانے والوں کا رب ہے تو باقی تمام
خلوق کا رب ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ دوسری دعوت رسالت کہ ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں اور اس کا پیغام
لے کر تیرے پاس آئے ہیں اور تیسری قوم کی آزادی کا مطالبہ کہ رب تعالیٰ کی توحید اور اپنی رسالت پر ایمان کی دعوت کے
بعد خاص تیری طرف یہ پیغام بھی لے کر آئے ہیں کہ بنی اسرائیل کو آزادی دے کر میرے ساتھ بھیج دے کہ وہ اللہ کی زمین
میں جہاں آزاد رہ سکیں چلے جائیں اور یہ کہ انھیں ان مختلف قسم کے عذابوں سے رہا کر دے جن سے تو نے انھیں دوچار کر رکھا
ہے۔ معلوم ہوا کہ اسلام کی دعوت میں غلام اور مظلوم اقوام کو غلامی سے نجات دلانا بھی شامل ہے۔ یہ کہنا کہ یہ جہاد فی
سبیل اللہ نہیں، غلط ہے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۳۶-۲۵۲)۔

﴿۲﴾ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ : یہ اس بات کی تفصیل ہے کہ ”ہم تیرے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے آئے ہیں“ یعنی
یقین جانو کہ ہم تمہارے رب کی طرف سے اپنی رسالت کی نشانی اور دلیل بھی لے کر آئے ہیں، اگر تم اسے دیکھے بغیر ہی ایمان
لے آؤ تو بہت ہی اچھا ہے، ورنہ ہم وہ بھی پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔

﴿۳﴾ وَ التَّلَامُ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى : اس میں ہدایت کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ ساتھ فرعون کو بھی سلام ہے، اگر وہ
ہدایت قبول کر لے۔ معلوم ہوا کہ اگر وہ ہدایت قبول نہ کرے تو اسے کوئی سلام نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی کافر بادشاہوں
قیصر و کسری وغیرہ کو جو خط لکھے ان میں یہی لکھا: «الْسَّلَامُ عَلَيَّ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى» [بخاری: ۶۲۶۰] ”سلام ہو اس شخص
پر جو اسلام کو قبول کرے“ یعنی ایمان نہ لانے والوں کے لیے نہ سلامتی کی دعا ہے اور نہ ان کے لیے اللہ کی گرفت سے سلامتی
کی کوئی صورت ہے۔ آپ ﷺ نے ان سب کو لکھا: «أَسْلِمْتُ تَسْلِمًا» [بخاری: ۷] ”مسلمان ہو جاؤ تو سلامت رہو گے۔“
آیت 48 ﴿۲﴾ إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا : توحید و رسالت اور بنی اسرائیل کو اپنے ظلم و ستم اور غلامی سے آزاد کرنے کی دعوت کے

قَالَ فَمَنْ رَبُّكُمَا يُوسَىٰ ﴿٤٩﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ ﴿٥٠﴾

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ ﴿٥١﴾

اس نے کہا تو تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ! ﴿٤٩﴾ کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی، پھر راستہ دکھایا ﴿٥٠﴾ اس نے کہا تو پہلے زمانوں کے لوگوں کا کیا حال ہے؟ ﴿٥١﴾

ساتھ ہی خوش خبری بھی سنائی کہ جو ہدایت کی پیروی کرے گا سلامت رہے گا۔ اس آیت میں ڈرانے کا فریضہ سرانجام دیا کہ ہمیں وحی کے ذریعے سے بتایا گیا ہے کہ جو جھٹلائے گا اور منہ پھیرے گا اس پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔ اس ڈرانے میں بھی نرم سے نرم الفاظ، جو ممکن تھے، ملحوظ رکھے، یہ نہیں فرمایا کہ تم پر عذاب نازل ہوگا۔ اس سلامتی اور عذاب دونوں کو عام رکھا، اس میں دنیا اور آخرت دونوں کی سلامتی اور عذاب شامل ہیں۔ یہ مضمون سورہ نازعات (۳۰ تا ۳۹) اور سورہ قیامہ (۳۱ تا ۳۵) وغیرہ میں بھی بیان ہوا ہے۔

آیت 49 قَالَ فَمَنْ رَبُّكُمَا يُوسَىٰ : یعنی وہ کون ہے جسے تم نے مجھے چھوڑ کر رب بنا رکھا ہے؟ واضح رہے کہ فرعون اپنے رب اعلیٰ ہونے کا دعوے دار تھا (نازعات: ۲۴) اور اپنے ”الہ“ یعنی معبود ہونے کا بھی۔ (تھصص: ۳۸)

آیت 50 ① قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ : یعنی صرف یہی نہیں کہ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، بلکہ اس نے ہر چیز کو پیدا کرتے ہوئے اسے اس کی حسب ضرورت اور حسب حال شکل و صورت عطا فرمائی۔ چلنے والے، اڑنے والے اور تیرنے والے ہر جاندار کو، ہر درخت، پہاڑ اور دریا کو اور زمین و آسمان غرض ہر مخلوق کو ایسی شکل و صورت عطا فرمائی کہ کوئی دوسرا نہ اسے بنا سکتا ہے، نہ کوئی نقص یا عیب نکال سکتا ہے اور نہ اس سے بہتر شکل پیش کر سکتا ہے۔ دیکھیے سورہ سجدہ (۷) اور سورہ ملک (۳)۔

② ثُمَّ هَدَىٰ : یعنی اس کے حسب حال شکل و صورت عطا فرما کر اسے زندگی گزارنے اور اپنی بناوٹ سے کام لینے کا راستہ بھی بتایا ہے، چنانچہ پرندے کا بچہ انڈے سے نکلنے ہی دانہ چکنے لگتا ہے، پلٹ کا بچہ تیرنے لگتا ہے، جبکہ جانور اور انسان کا بچہ پیدا ہوتے ہی دودھ پینے لگتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ نہ سکھاتا تو کون سکھا سکتا تھا؟ الغرض، اس کائنات میں ہر چیز جو بھی کام کر رہی ہے اس کی دی ہوئی ہدایت اور تعلیم ہی سے کر رہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا رب تو نہیں بلکہ وہ بزرگ و برتر اللہ ہے جس کی یہ اور یہ صفات ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے عموماً وہی دلائل پیش کیے جو ان کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیے تھے۔ دیکھیے سورہ شعراء (۲۳ تا ۲۹)۔

آیت 51 . قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ : یہ سوال پوچھنے کی تین وجہیں ہو سکتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں سب کا حل موجود ہے۔ پہلی وجہ شاہ عبد القادر بریلوی کے الفاظ میں یہ ہے: ”فرعون شاید دوہرہ مزاج تھا۔ آدمیوں کی پیدائش کو سمجھتا تھا جیسے

قَالَ عَلِمَهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّي ۚ وَلَا يَنْسَى ۙ ﴿٥٢﴾

کہا ان کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب میں ہے، میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے ﴿٥٢﴾

برسات کا سبزہ، نہ اول کسی نے پیدا کیا، آپ ہی پیدا ہو گیا، نہ آخر باقی رہا، گل کر مٹی ہو گیا۔ جب سنا کہ سب کے سر پر ایک رب ہے تب یہ پوچھا کہ اگلی علق کہاں گئی؟ بتایا ان کا حساب لکھا ہوا موجود ہے کہ ایک ایک آدمی پھر حاضر ہو گا۔“ (موضح) دوسری وجہ اس کے یہ پوچھنے کی کہ پھر پہلے زمانوں کے لوگوں کا کیا حال ہے، یہ ہو سکتی ہے کہ وہ یہ کہلوانا چاہتا تھا کہ جو لوگ سیکڑوں برس سے نسلًا بعد نسل دوسروں کو اپنا رب سمجھتے اور ان کی بندگی کرتے رہے ہیں، وہ سب گمراہ اور مستحق عذاب تھے۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان کو گمراہ اور مستحق عذاب قرار دیں گے تو ان کے خلاف تمام لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھیں گے اور وہ ان کی دعوت سے متنفر ہو جائیں گے۔ اہل حق کے خلاف اہل باطل جاہلوں کو مشتعل کرنے کا یہ ہتھکنڈا ہمیشہ سے استعمال کرتے رہے ہیں اور آج بھی اسے کارگر حربہ سمجھتے ہیں۔ سورہ شعراء کی آیات (۲۹۳-۲۹۴) کی روشنی میں یہ مطلب سب سے واضح نظر آتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس معاملے کو اللہ کے علم کے سپرد کر دیا، چنانچہ فرعون کا وار خالی گیا۔

تیسری وجہ یہ کہ فرعون یہ باور کروانا چاہتا تھا کہ رسول تو عالم الغیب ہوتے ہیں، اگر تم واقعی رسول ہو تو پہلے یہ بتاؤ کہ پہلے زمانوں کے لوگوں کا کیا حال ہے، ان کا حال ہمیں بتاؤ۔ مقصد یہ تھا کہ جب نہیں بتا سکیں گے تو ہم کہہ دیں گے کہ یہ کیسا رسول ہے جو پہلے زمانوں کے لوگوں کے احوال بھی نہیں جانتا؟ جواب یہ دیا کہ یہ جانتا رسولوں کی ذمہ داری نہیں بلکہ یہ رب تعالیٰ کا کام ہے۔

آیت 52: ﴿٥٢﴾ قَالَ عَلِمَهَا عِنْدَ رَبِّي : یعنی مجھے ان کے حال سے کوئی بحث نہیں۔ وہ اپنے اس رب کے پاس پہنچ گئے جس کے پاس ان کے تمام اعمال اور نیوٹوں کا ریکارڈ موجود ہے، جیسے ان کے اعمال ہوں گے وہی اسی بدلہ ان کو مل جائے گا۔ ہمیں فکر اپنے حال کی ہونی چاہیے کہ ہم کس طرح اپنے آپ کو عذاب کا مستحق ہونے سے بچا سکتے ہیں؟ یہ نہایت ہی حکیمانہ جواب ہے، جو صحیح بھی ہے اور اس سے فرعون بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

﴿٥٢﴾ فِي كِتَابٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّي ۚ وَلَا يَنْسَى ۙ : چونکہ لکھی ہوئی بات زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر حجت تمام کرنے کے لیے کرنا کا تین مقرر فرمائے، جو ہر ایک کی کتاب تیار کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی آگاہ فرما دیا کہ کتاب میں لکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ غلطی یا بھول سے بچنے کے لیے لکھنے کا محتاج ہے، نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ ہر نقص کی طرح ان دونوں نقصوں سے بھی پاک ہے۔ اس میں ایک چوٹ بھی ہے، کیونکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر چیز کا خالق و باری نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے، دراصل یہ فرعون سے کہا جا رہا ہے کہ تو، جس کی سرشت میں بھٹکتا اور بھولنا رکھ دیا گیا ہے، کیا تجھے رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے حیا نہیں آتی؟ سبحان اللہ۔

بت کریں آرزو خدائی کی شان ہے حیرت کبریائی کی

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَ سَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا وَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
فَأَخْرَجْنَا بِهٖ أَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتَّى ﴿٥٣﴾ كُلُّوْا وَ ارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ ۗ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ
لِّأُولِي النَّهْلِ ﴿٥٤﴾ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَ فِيهَا نُعِيدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى ﴿٥٥﴾

وہ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور تمہارے لیے اس میں راستے جاری کیے اور آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ کئی قسمیں مختلف نباتات سے نکالیں ﴿٥٣﴾ کھاؤ اور اپنے چوپایوں کو چراؤ، بے شک اس میں عقول والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں ﴿٥٤﴾ اسی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں ایک اور بار نکالیں گے ﴿٥٥﴾

آیت 53-54 ﴿٥٣﴾ ١ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا: یہ دونوں آیات موسیٰ علیہ السلام کا کلام بھی ہو سکتی ہیں، جسے نقل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے زمین سے مختلف نباتات نکالنے کا ذکر آنے پر اپنے لیے غائب کے صیغوں کے بعد جمع شکلم کا صیغہ استعمال فرما دیا، یعنی ”فَأَخْرَجْنَا بِهٖ أَزْوَاجًا“ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام ”وَلَا يَنْتَهِي“ پر ختم ہو گیا ہو اور ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مقام کی مناسبت سے اپنی مزید نعمتیں بیان فرمائی ہوں۔ اس صورت میں بھی اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنا ذکر غائب کے صیغے سے فرمایا اور ”فَأَخْرَجْنَا“ میں اپنی عظمت کے اظہار کے لیے جمع شکلم کا صیغہ استعمال فرمایا۔

﴿٥٤﴾ ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی چار نعمتیں ذکر فرمائی ہیں، پہلی نعمت زمین کو انسان کے لیے بچھونا بنانا۔ اس کا ذکر کئی آیات میں فرمایا۔ دیکھیے سورہ زخرف (٩، ١٠، ٩)، سورہ نبا (٦)، ذاریات (٢٨) اور رعد (٣) وغیرہ۔ دوسری نعمت زمین میں راستے بنانا سکھایا۔ دیکھیے سورہ زخرف (٩)، انبیاء (٣١)، نوح (١٩) اور نحل (١٥) تیسری نعمت آسمان سے پانی اتارنا، اس کا ذکر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہے۔ چوتھی نعمت بنی آدم اور ان کے مویشیوں کے لیے بے شمار قسم کی کھانے اور استعمال کی چیزیں اگانا۔ دیکھیے سورہ سجدہ (٢٤)، نازعات (٣١، ٣٢، ٣٣)، عیس (٢٥، ٢٦) اور سورہ نحل (١٠)۔ (ششقیلی)

﴿٥٥﴾ ”شَتَّى“ کی جمع ہے، مختلف، جیسا کہ ”مَرِيضٌ“ کی جمع ”مَرَضَى“ ہے۔ ”النَّهْلِ“ ”نَهْيَةٌ“ کی جمع ہے، جس کا معنی عقل ہے، کیونکہ عقل انسان کو نامناسب کاموں سے منع کرتی ہے۔ ”نَهْيٌ يَنْهَى“ کا معنی ہے منع کرنا۔

آیت 55 ﴿٥٥﴾ ١ وَمِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَ فِيهَا نُعِيدُكُمْ: یعنی تم سب کے باپ آدم علیہ السلام کا پتلا مٹی سے بنایا گیا اور تمہاری غذا میں اور ضرورت کی تمام چیزیں بھی مٹی سے نکلتی ہیں۔ یہ پہلا مرحلہ ہے جو موت تک چلتا ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ کہ موت کے بعد دوبارہ مٹی میں جاؤ گے، پھر کوئی انسان قبر میں دفن ہو یا نہ ہو، بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے اجزائے مٹی میں جائیں گے۔ تیسرے مرحلے میں قیامت کے دن انہی اجزا کو دوبارہ روح پھونک کر زندہ کر دیا جائے گا، فرمایا: ﴿قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَمُوتُونَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُونَ﴾ [الأعراف: ٢٥] ”فرمایا تم اسی میں زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔“

وَلَقَدْ أَرَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَابَى ﴿۵۶﴾ قَالَ أَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا

بِسُحْرِكَ يُبْوَسِي ﴿۵۷﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اسے اپنی نشانیاں سب کی سب دکھلائیں، پس اس نے جھٹلایا اور انکار کر دیا ﴿۵۶﴾ کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہماری سر زمین سے اپنے جادو کے ذریعے نکال دے اے موسیٰ! ﴿۵۷﴾

بعض روایات میں ذن کے وقت مٹی کی پہلی مٹھی ڈالتے ہوئے ”وَمِنْهَا أَخْلَقْنَاكُمْ“ دوسری مٹھی ڈالتے ہوئے ”وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ“ اور تیسری مٹھی ڈالتے وقت ”وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى“ پڑھنے کا ذکر ہے، مگر وہ روایات ضعیف ہیں، البتہ آیت پڑھے بغیر تین مٹھی مٹی ڈالنا مستون ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: «أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى عَلَيَّ جَنَازَةً ثُمَّ أَتَى قَبْرَ الْمَسِيَّبِ فَحَنَى عَلَيْهِ مِنْ قَبْلِ رَأْسِهِ ثَلَاثًا» [ابن ماجہ، الجنائز، باب ما جاء في حنو التراب في القبر: ۱۰۶۵، صحیح] ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازے پر نماز پڑھی، پھر میت کی قبر پر آئے اور اس کے سر کی طرف (مٹی کی) تین مٹھیاں ڈالیں۔“

آیت ۵۶ ﴿۵۶﴾ وَ لَقَدْ أَرَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا : یہ آیت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی باہمی گفتگو ذکر کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو دوبارہ آگے بیان کرنے سے پہلے جملہ معترضہ کے طور پر آئی ہے، یعنی فرعون کفر میں اتنا پکا تھا کہ ہماری تمام نشانیاں دیکھنے اور موسیٰ علیہ السلام کو دل سے سچا سمجھنے کے باوجود ایمان نہیں لایا، حتیٰ کہ اس نے آخری نشانی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی کہ سمندر پھٹ گیا اور اس کے پانی کا ہر حصہ ایک بہت بڑے پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل ان راستوں سے بحیریت گزر گئے (شعراء: ۶۳-۶۴)، اس کے باوجود وہ ایمان نہ لایا، بلکہ اپنے رب ہونے کے جھوٹے دعوے کو سچا ثابت کرنے کے لیے پوری فوج کو لے کر سمندر میں داخل ہو کر غرق ہوا، مگر غرق ہونے سے پہلے تک وہ جھٹلاتا اور انکار ہی کرتا رہا۔ دیکھیے سورہ قمر (۴۲، ۴۱) اور یونس (۹۰-۹۴)۔

آیت ۵۷ ﴿۵۷﴾ ﴿۱﴾ قَالَ أَجِئْتَنَا : فرعون نے یہ بات تمام نشانیاں دیکھنے کے بعد نہیں کہی، کیونکہ اگر ایسا ہو تو جادو گروں سے ہونے والا یہ مقابلہ طوفان، جراد، قتل وغیرہ حتیٰ کہ سمندر پھٹنے کے واقعہ کے بعد ماننا پڑے گا، کیونکہ ”آيَاتِنَا كُلَّهَا“ میں یہ سب شامل ہیں۔ اس لیے قرآن مجید کے دوسرے مقامات کی صراحت کے مطابق فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ید بیضا والا معجزہ دیکھ کر یہ بات کہی۔ دیکھیے سورہ اعراف (۱۰۶-۱۲۶) اور شعراء (۵۱۳-۵۱۴)۔ (ابن عاشور)

﴿۲﴾ لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا : ہر باطل پرست اور جابر و ظالم حکمران جب داعی حق کے سامنے لاجواب ہو جاتا ہے تو اس کی دعوت ٹھکرانے کے لیے یہی جھٹکنڈا استعمال کرتا ہے، یعنی اسے اقتدار کا بھوکا ہونے کا طعنہ دیتا ہے، گویا اقتدار پر قابض رہنا اس کا تو بیدارشی حق ہے مگر کسی دوسرے کے لیے اس کے قریب پھٹلنا بھی جائز نہیں۔

﴿۳﴾ ”بِسُحْرِكَ“ میں ”جادو“ کی اضافت موسیٰ علیہ السلام کے لیے آنے والی ضمیر (کاف) کی طرف کرنے میں ان معجزوں کی تحقیر

فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهِ فَأَجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَا نُخْلِفُهُ نَحْنُ وَلَا أَنْتَ
مَكَانًا سَوِيًّا ۝ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمَ الزَّيْنَةِ وَأَنْ يُخَشِرَ النَّاسُ صُحْيَ ۝ فَتَوَلَّى
فِرْعَوْنُ وَجَمَعَ كَيْدَهُ ثُمَّ أَتَى ۝

تو ہم بھی ہر صورت تیرے پاس اس جیسا جادو لائیں گے، پس تو ہمارے درمیان اور اپنے درمیان وعدے کا ایک
وقت طے کر دے کہ نہ ہم اس کے خلاف کریں اور نہ تو، ایسی جگہ میں جو مساوی ہو ۝ کہا تمہارے وعدے کا وقت
زینت کا دن ہے اور یہ کہ لوگ دن چڑھے جمع کیے جائیں ۝ پس فرعون واپس لوٹا، پس اس نے اپنے داؤ پیچ جمع
کیے، پھر آ گیا ۝

مرا وہ کہ تو اپنے اس بے قدر و قیمت جادو کے ذریعے سے ہمیں سرزمین مصر سے نکالنا چاہتا ہے۔ تیرے اس جادو کی ہمارے
کامل اور ماہر فن جادوگروں کے جادو کے مقابلے میں کیا حیثیت ہے؟

آیت 58 ۝ فَأَجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا: ”مَوْعِدًا“ طرف زمان بھی ہو سکتا ہے، مکان بھی اور مصدر میسی بھی، یعنی
ہمارے ساتھ وہ وقت بھی طے کر لو جس میں مقابلہ ہوگا اور جگہ بھی، البتہ جگہ ایسی ہونی چاہیے جو قطبوں اور بنی اسرائیل دونوں
کے لیے برابر ہو، تاکہ کسی کو آنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ ”مَكَانًا سَوِيًّا“ کا مطلب برابر اور ہموار
زمین ہے، جہاں سب مقابلہ دیکھ سکیں۔

آیت 59 ۝ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمَ الزَّيْنَةِ: ”صُحْيَ“ وہ وقت جب سورج نکلنے کے بعد اس کی حرارت کا آغاز ہوتا ہے۔
موسیٰ علیہ السلام تو خود چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہوں، تاکہ ان تک حق کا پیغام پہنچے اور وہ معجزات الہی کو اور حق کی فتح کو
اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ چنانچہ ”يَوْمَ الزَّيْنَةِ“ اور دوپہر کا وقت مقرر کر دیا گیا، تاکہ لوگ چھٹی کی وجہ سے فارغ ہوں اور
دوپہر تک تمام علاقوں سے ہر شخص آسانی سے پہنچ جائے، دن کی روشنی زیادہ سے زیادہ ہو اور اگر مقابلہ طول پکڑ جائے تو
مغرب تک لمبا وقت مل جائے۔ ”يَوْمَ الزَّيْنَةِ“ مصریوں کے ہاں معروف دن تھا، یہ اس دن منایا جاتا جب نیل کی طغیانی
اپنی انتہا کو پہنچ جاتی اور دور تک پانی پھیل جاتا، جس کے بعد فصلوں کی کاشت کا آغاز ہوتا۔ ابن عاشور رضی اللہ عنہ نے اس کا اندازہ
پندرہ ستمبر لگایا ہے۔ تفصیل ”التحریر و التنوير“ میں دیکھیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے جگہ کا ذکر نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
”يَوْمَ الزَّيْنَةِ“ میں تمام لوگوں کا جشن منانے کے لیے کسی خاص جگہ جمع ہونا معروف تھا، جیسا کہ حکومتوں نے بڑے بڑے
سیڈیم بنا رکھے ہوتے ہیں، اس لیے زینت کا دن اور وقت طے کرنے کے بعد جگہ کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

آیت 60 ۝ فَتَوَلَّى فِرْعَوْنُ وَجَمَعَ: یعنی فرعون نے مجلس برخواست کر دی اور پھر اپنے سرداروں سے مشورے اور سب
کے اتفاق کے بعد پوری کوشش سے ایک طرف تو سلطنت کے ہر علاقے سے ماہر جادوگر جمع کر لیے اور انھیں انعام و اکرام اور

قَالَ لَهُمْ مُوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۖ وَقَدْ خَابَ مَن
افْتَرَىٰ ﴿٦١﴾ فَنَادَوْا آمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ أَسْرُوا النَّجْوَىٰ ﴿٦٢﴾ قَالُوا إِنَّ هٰذِهِنَّ لَسَحْرَن
يُرِيدُنَ أَنْ يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهَا وَ يُدْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ النَّثْلَىٰ ﴿٦٣﴾

موسیٰ نے ان سے کہا تمہاری بربادی ہو! اللہ پر کوئی جھوٹ نہ باندھنا، ورنہ وہ تمہیں عذاب سے ہلاک کر دے گا اور یقیناً ناکام ہوگا جس نے جھوٹ باندھا ﴿٦١﴾ تو وہ اپنے معاملے میں آپس میں جھگڑ پڑے اور انہوں نے پوشیدہ سرگوشی کی ﴿٦٢﴾ کہا بے شک یہ دونوں یقیناً جادوگر ہیں، چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہاری سرزمین سے اپنے جادو کے ذریعے نکال دیں اور تمہارا وہ طریقہ لے جائیں جو سب سے اچھا ہے ﴿٦٣﴾

قرب شاہی کا وعدہ کر کے مقابلے کے لیے تیار کیا اور دوسری طرف عام لوگوں کو دیکھنے کی ترغیب دی کہ مقابلہ دیکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع ہوں۔ پھر فرعون سب کچھ ساتھ لے کر میدان مقابلہ میں آ گیا۔ دیکھیے سورہ اعراف (۱۰۹، ۱۱۰)، شعراء (۳۳، ۳۵) اور نازعات (۲۲، ۲۳)۔

آیت 61 ﴿٦١﴾ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا : ”وَيْلَكُمْ“ ”تمہاری بربادی ہو“ نصیحت کرتے ہوئے سختی کا لفظ بھی استعمال ہو سکتا ہے اور محبت اور بے تکلفی کا بھی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بصیر رضی اللہ عنہما کو فرمایا تھا: «وَيْلٌ أُمِّهِ وَسَعَرَ حَرْبٍ» [بخاری، الشروط، باب الشروط في الجهاد..... : 2731، 2732] ”اس کی ماں مرے! یہ تو لڑائی بھڑکانے والا ہے۔“ موسیٰ علیہ السلام نے پہلے فرعون کو نصیحت کی تھی، اب اس کے امراء اور جادوگروں کو بھی نصیحت کرنا ضروری تھا، چنانچہ انہیں سمجھایا بھی اور ڈر لیا بھی۔

آیت 62 ﴿٦٢﴾ فَنَادَوْا آمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ : نصیحت بعض پر موثر ہوئی، بعض پر نہیں۔ چنانچہ وہ آپس میں چپکے چپکے جھگڑنے لگے، تاکہ فرعون یا موسیٰ یا عوام میں سے کسی کو ان کے باہمی اختلاف کی خبر نہ ہونے پائے۔ ”النَّجْوَىٰ“ آپس کی خفیہ بات، سرگوشی۔ ”أَسْرُوا“ انہوں نے پوشیدہ کیا۔ ”النَّجْوَىٰ“ (سرگوشی) خود پوشیدہ ہوتی ہے، پھر ”أَسْرُوا“ سے اس کی مزید پوشیدگی کا اندازہ کریں اور اس سے پہلے ”بَيْنَهُمْ“ (آپس میں) کا لفظ بتاتا ہے کہ اس جھگڑے کی خبر اس محدود گروہ کے درمیان ہی رہی، باہر نہیں نکلے۔ (ابن عاشور) کوئی کہنے لگا، موسیٰ جادوگر ہے اور کوئی کہنے لگا، یہ چہرہ جادوگر کا نہیں ہو سکتا۔

آیت 63 ﴿٦٣﴾ قَالُوا إِنَّ هٰذِهِنَّ لَسَحْرَن : یہ ”ان“ اصل میں ”ہُنَّ“ حرف تاکید ہے، جس کی علامت خبر ”لَسَحْرَن“ پر لام تاکید ہے۔ یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ ”ہُنَّ“ اپنے اسم کو نصب دیتا ہے، اس لیے ”هٰذِهِنَّ“ کے بجائے ”هٰذِهِنَّ“

فَأَجْبِعُوا كَيْدَكُمْ ثُمَّ اتُّوْا صَفًا ۖ وَ قَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلَى ﴿٣٧﴾

سو تم اپنی تدبیر پختہ کرو، پھر صف باندھ کر آ جاؤ اور یقیناً آج وہ کامیاب ہوگا جس نے غلبہ حاصل کر لیا ﴿۳۷﴾

ہونا چاہیے تھا۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ”اِنّ“ کے نون کو جزم دینے کے بعد اس کا عمل ختم کر دیا گیا اور ”هٰذِیْنِ“ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، دوسرا یہ کہ ”اِنّ“ (نون ساکن کے ساتھ) ”اِنَّهٗ“ یعنی ”اِنّ“ اور ضمیر شان کی جگہ آیا ہے، چنانچہ ”اِنّ“ کا اسم ضمیر شان تھی اور ”هٰذِیْنِ“ اگلے جملے کا مبتدا ہے اور وہ جملہ ”اِنّ“ کی خبر بن رہا ہے۔ (ابن جریر) مزید جواب لمبی تفسیروں میں دیکھیں۔ ”اَلْمَثَلُ“ ”اَلْمَثَلُ“ اسم تفضیل کا مؤنث ہے، بمعنی ”اَفْضَلُ“ سب سے اچھا۔

② آخر باہمی مشورے کے بعد مال و دولت اور جاہ و منصب کی حرص نے ان سب کو مقابلے پر متفق کر دیا اور فیصلہ یہ ٹھہرا کہ یہ دونوں یقیناً جا دو گے اور چاہتے ہیں کہ اقتدار حاصل کر کے تمھیں تمھارے وطن سے نکال دیں اور تمھارے دین و مذہب کو، جو سب سے اچھا ہے اور تمھاری عیش و عشرت والی بہترین زندگی کو حکومت پر قبضہ کر کے ختم کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ مَا ذِیْبَانِ جَائِعَانِ اُرْسِلَا فِی غَنَمٍ بِاَفْسَدِ لَهَا مِنْ جَرْحِ الْمَرْءِ عَلٰی الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِذِیْبِهِ ﴾ [ترمذی، الزهد، باب حدیث ما ذیبان جائعان..... ۲۳۷۶- ابن حبان: ۳۲۲۸، عن کعب بن مالکؓ، صحیح] ”دو بھوکے بھیڑیے، جو بھیڑ بکریوں میں چھوڑ دیے جائیں، وہ انھیں اس قدر برباد کرنے والے نہیں جس قدر آدمی کی مال اور بلند مرتبہ (شہرت) کی حرص اس کے دین کو برباد کرنے والی ہے۔“

آیت 64: ① فَأَجْبِعُوا كَيْدَكُمْ: ”جَمَعَ يَجْمَعُ“ (ف) جمع کرنا اور ”أَجْمَعُ“ (افعال) پختہ کرنا، پختہ ارادہ کرنا، اتفاق کرنا۔ لہذا ”فَأَجْبِعُوا“ (افعال) کا ترجمہ ”جمع کرو یا اکٹھا کرو“ درست نہیں۔ یعنی یہ تذبذب اور اختلاف چھوڑ دو کہ موسیٰ (علیہ السلام) کا مقابلہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، تم اپنا ارادہ اور اپنی خفیہ تدبیر پختہ اور مستحکم کرو اور پھر صف کی صورت میں اکٹھے ہو کر میدان میں آؤ، تاکہ سب پر تمھارا رعب پڑے اور دفعتاً ایسا حملہ کرو کہ حریف کے قدم اکھڑ جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جا دو گے بہت بڑی تعداد میں تھے اور انھوں نے ایک بے ہنگم جہوم کی صورت میں سامنے آنے کے بجائے باقاعدہ فوجی ترتیب سے آگے پیچھے صفیں باندھ کر اپنی ہیبت اور شان و شوکت کے اظہار کا فیصلہ کیا۔ ”صَفًا“ یہاں جنس کے معنی میں ہے اور اس سے ایک صف مراد نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَوْمَ يَقُومُ الزُّوْحَرُ وَالْمَلِكُ صَفًا﴾ [النبا: ۳۸] ”جس دن روح اور فرشتے صف بنا کر کھڑے ہوں گے۔“ فرعون کے حکم سے مصر کے تمام شہروں میں سے ہر ماہر جا دو گروہاں لایا گیا تھا، اس لیے مراد کنی صفیں ہیں۔

② وَ قَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلَى: ”اسْتَعْلَى“ ”عَلَا يَعْلُو“ سے استفعال ہے۔ زائد حروف مبالغے کے لیے ہیں، یعنی آج کے مقابلے کی اتنی اہمیت ہے کہ جس نے اس میں واضح اور نمایاں غلبہ حاصل کر لیا اس کا سکہ ہمیشہ کے لیے پیٹھ گیا اور جو اس میں رہ گیا پھر کبھی سر نہ اٹھا سکے گا۔

قَالُوا يَبُوسَىٰ إِمَّا أَنْ تُلْقِي وَ إِمَّا أَنْ نَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَلْقَى ۖ قَالَ بَلْ أَلْقَوُا ۖ
 وَإِذَا جِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَى ۖ فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ
 خِيفَةً مُّوسَىٰ ۖ قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ ۖ وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ
 مَا صَنَعُوا إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سِحْرٍ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ۖ فَأَلْقَى السَّحْرَةَ
 سُجَّدًا قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَ مُوسَىٰ ۖ

انہوں نے کہا اے موسیٰ! یا تو یہ کہ تو پھینکے اور یا یہ کہ ہم پہلے ہوں جو پھینکے ۱۵ کہا بلکہ تم پھینکو، تو اچانک ان کی
 رسیاں اور ان کی لائٹھیاں، اس کے خیال میں ڈالا جاتا تھا، ان کے جادو کی وجہ سے کہ واقعی وہ دوڑ رہی ہیں ۱۶ تو
 موسیٰ نے اپنے دل میں ایک خوف محسوس کیا ۱۷ ہم نے کہا خوف نہ کر، یقیناً تو ہی غالب ہے ۱۸ اور پھینک جو تیرے
 دائیں ہاتھ میں ہے، وہ نکل جائے گا جو کچھ انہوں نے بنایا ہے، بے شک انہوں نے جو کچھ بنایا ہے وہ جادوگر کی چال
 ہے اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتا جہاں بھی آئے ۱۹ تو جادوگر گرا دیے گئے، اس حال میں کہ سجدہ کرنے والے تھے،
 انہوں نے کہا ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے ۲۰

آیت 65 قَالُوا يَبُوسَىٰ إِمَّا أَنْ تُلْقِي..... : فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے عصا کو سانپ بنتے ہوئے دیکھا تو لوگوں کی نگاہ میں
 اسے بے وقعت بنانے کے لیے اسے جادو قرار دے کر کہا کہ ہم بھی مقابلے میں ایسا ہی جادو لائیں گے، چنانچہ اس کے مطابق
 جادوگروں نے لائٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بننے کے شعبدے کی تیاری کی اور میدان میں آ کر یہ پیش کش کی جو اس آیت
 میں مذکور ہے۔ اس پیش کش کے الفاظ سے اپنے جادو پر ان کے اعتماد کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اس بات کا بھی کہ اگر تم پہلے
 تیار نہیں ہو تو ہم اس کے لیے بالکل تیار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جس خیال سے بھی یہ پیش کش کی ہو اس میں اللہ تعالیٰ
 کی یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ ان کے جادو کا سارا کمال لوگوں کے سامنے آنے کے بعد اسے حق کے مقابلے میں بے حقیقت ثابت
 کیا جائے، جیسا کہ اس سے پہلے خود فرعون کے منہ سے موسیٰ علیہ السلام کو اختیار دلوا لیا گیا کہ مقابلے کا مقام اور دن وہ مقرر کریں۔

آیت 66 وَإِذَا جِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ..... : ”اچانک“ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسی زبردست تیاری کر
 رکھی تھی کہ ان کے لائٹھیوں اور رسیوں کو پھینکنے کے بعد ان کے دوڑنے اور حرکت کرنے میں کوئی تاخیر نہیں ہوئی۔ صف در صف
 کھڑے ہوئے جادوگروں کی بیک وقت پھینکی ہوئی لائٹھیوں اور رسیوں سے میدان دوڑتے ہوئے سانپوں کی شکل میں بدل
 گیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ اعراف میں ان کے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کرنے کا ذکر فرمایا ہے اور ان کے جادو کو سحر عظیم قرار دیا
 ہے۔ اس آیت سے لے کر آیت (۷۶) تک کی تفسیر کے لیے سورہ اعراف کی آیت (۱۱۵) سے (۱۲۶) کی تفسیر ملاحظہ
 فرمائیں۔ یہاں چند مختصر سے اشاروں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

قَالَ آمَنْتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ أَدْنَ لَكُمْ ؕ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ؕ فَلَا قِطْعَانَ
 أَيَدَيْكُمْ وَأَنْجَلَكُمْ مِنْ خِلَافٍ وَ لَأَوْصَلَيْتُكُمْ فِي جُدُوعِ النَّخْلِ ؕ وَ لَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا
 أَشَدُّ عَذَابًا وَ أَبْقَى ۗ قَالُوا لَنْ نُؤْتِيَكَ عَلَى مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيْتِ وَ الَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ
 مَا أَنْتَ قَاضٍ ؕ إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۗ إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِنُعْطِيَ لَنَا حَظِينَا وَ مَا

کہا تم اس پر اس سے پہلے ایمان لے آئے کہ میں تمہیں اجازت دوں، یقیناً یہ تو تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، پس یقیناً میں ہر صورت تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں مخالف سمت سے بری طرح کاٹوں گا اور ضرور ہر صورت تمہیں کھجور کے تنوں پر بری طرح سولی دوں گا اور یقیناً تم ضرور جان لو گے کہ ہم میں سے کون عذاب دینے میں زیادہ سخت اور زیادہ باقی رہنے والا ہے ④ انہوں نے کہا ہم تجھے ہرگز ترجیح نہ دیں گے ان واضح دلائل پر جو ہمارے پاس آئے ہیں اور اس پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، سو فیصلہ کر جو تو فیصلہ کرنے والا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ تو اس دنیا کی زندگی کا فیصلہ کرے گا ④ بے شک ہم اپنے رب پر اس لیے ایمان لائے ہیں کہ وہ ہمارے لیے ہماری خطائیں

آیت 71: ۱ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ: یعنی یہ تمہارا ”گرو“ ہے اور تم اس کے چیلے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم آپس میں طے کر کے آئے ہو کہ پہلے چیلے ایک شعبہ دکھائیں گے، پھر وہ سب کے سامنے ”گرو“ سے شکست کھالیں گے، تاکہ دیکھنے والے ان کے ”گرو“ کا کہنا مان لیں اور اس کے معتقد بن جائیں۔ فرعون نے یہ شبہ اسی وقت پیدا کر دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عوام بھی ان کے شیخ ہو جائیں۔

② فَلَا قِطْعَانَ أَيَدَيْكُمْ: شبہ پیدا کرنے کے بعد اوپر سے دھکی بھی دے دی، تاکہ ان کو ایمان پر قائم رہنے سے بھیر دیا جائے اور دوسرے لوگ بھی مرعوب ہو جائیں۔

③ فِي جُدُوعِ النَّخْلِ: ”جُدُوع“ ”جِدْع“ (جیم کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے ”تنے“۔ سولی دینے کے لیے اونچے سے اونچا میسر کھبا اس وقت کھجور کا تنا تھا۔ ظاہر ہے کہ سولی تنے کے اوپر دی جاتی ہے، مگر یہاں ”فِي جُدُوعِ النَّخْلِ“ (کھجوروں کے تنوں میں) فرمایا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ ”فِي“ ”عَلَى“ کے معنی میں ہے، مگر ”فِي“ کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ تمہیں کھجوروں کے تنوں کے اوپر لے جا کر کیلوں یا رسیوں کے ساتھ تنوں میں پیوست کر دوں گا اور اس طرح تم عبرت ناک انجام کو پہنچو گے۔ سولی کی تفصیل سورہ اعراف (۱۲۶ تا ۱۱۵) میں دیکھیں۔

④ وَ لَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَ أَبْقَى: یعنی وہ عذاب جس سے موسیٰ (علیہ السلام) نے تمہیں مقابلے سے پہلے ڈر لیا تھا کہ ”وَيَذَلُّكُمْ لَا تَقْتَدُوا عَلَى اللَّهِ لَدَيْهَا فَيَنْجِتْكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ“ وہ زیادہ سخت اور دریا ہے یا میرا عذاب؟ فرعون حقیقت حال سے واقف تھا، مگر اپنی شکست فاش پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ دھمکیاں دے رہا تھا۔

آیت 72-73: ۱ قَالُوا لَنْ نُؤْتِيَكَ عَلَى مَا جَاءَنَا: مگر جادو گروں کا ایمان تو ایک لمحہ میں اس قدر پختہ ہو گیا تھا کہ نہ ان

أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ التَّعْرِدِ وَاللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَى ۖ إِنَّهُ مَنْ يَأْتِ رَبَّهُ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى ۗ وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَى ۗ جَنَّاتٌ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۗ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّى ۖ

بخش دے اور جادو کے وہ کام بھی جن پر تو نے ہمیں مجبور کیا ہے اور اللہ بہتر اور سب سے زیادہ باقی رہنے والا ہے ﴿۷۶﴾ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو اپنے رب کے پاس مجرم بن کر آئے گا تو یقیناً اسی کے لیے جہنم ہے، نہ وہ اس میں مرے گا اور نہ جیے گا ﴿۷۷﴾ اور جو اس کے پاس مومن بن کر آئے گا کہ اس نے اچھے اعمال کیے ہوں گے تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے سب سے بلند درجے ہیں ﴿۷۸﴾ بیٹنگلی کے باغات، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے اور یہ اس کی جزا ہے جو پاک ہو ﴿۷۹﴾

کے دل میں مال و دولت اور دنیوی جاہ و منصب کی کچھ قدر باقی رہ گئی، جس کے لیے انھوں نے یہ مقابلہ کیا تھا اور نہ اب فرعون کی دھمکیوں کا ان پر کچھ اثر ہوا۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ تو اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے کہ ہماری چند روزہ دنیاوی زندگی کا خاتمہ کر دے؟ سو ہمیں اس کی پروا نہیں۔ مگر آج ایک شخص ساٹھ سال قرآن پڑھ کر بھی حقیر دنیا کے بدلے اپنے ایمان کو فروخت کر دیتا ہے۔

آیت 74 لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ وَلَا يَخْيُونَ، وَلَكِنَّ نَاسٍ مِّنْكُمْ أُصَابَتْهُمُ النَّارُ لِيَذُنُوبِهِمْ فَأَمَّا تَعَالَىٰ اللَّهُ تَعَالَىٰ إِمَانَهُ، حَتَّىٰ إِذَا كَانُوا فَحْمًا أُنزِلَ بِالشَّقَاعَةِ، فَجِيءَ بِهِمْ ضَبَائِرٌ ضَبَائِرٌ، فَبُتُوا عَلَىٰ أَنْهَارٍ الْحَنَةِ، ثُمَّ قِيلَ يَا أَهْلَ الْحَنَةِ ائْتُوا عَلَيْهِمْ، فَيَسْتَوُونَ نَبَاتِ الْجَبَةِ تَكُونُ فِي حَمِيلِ السَّيْلِ ﴿مسلم، الإيمان، باب إثبات الشفاعة وإخراج الموحدين من النار: ۱۸۵﴾، عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه [”آگ والے، جو اسی میں رہنے والے ہیں، وہ تو اس میں نہ مریں گے اور نہ جہیں گے اور لیکن کچھ لوگ، جنہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے آگ لگ جائے گی تو اللہ تعالیٰ انہیں ایک طرح کی موت دے دے گا، یہاں تک کہ جب وہ کولہ ہو جائیں گے تو شفاعت کا اذن ہو جائے گا۔ سو انہیں ڈھیروں کی صورت میں لایا جائے گا اور وہ جنت کی نہروں (کے کناروں) پر بکھیر دیے جائیں گے، پھر کہا جائے گا کہ اے جنتیو! ان پر پانی انڈیلو، تو وہ اس طرح آگ آئیں گے جیسے سیلاب کی لائی مٹی میں جزی بوٹیوں کے بیج (نوراً) آگ آتے ہیں۔“ نہ مرے گا اور نہ جیے گا“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ فاطر (۳۶)، ابراہیم (۱۷۵)، نساء (۵۶)، اعلیٰ (۱۳۶) اور زخرف (۷۷)۔

آیت 76.75 فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَى : ”الْعُلَى“ ”عُلَى“ کی جمع ہے، جو اسم تفضیل ”أَعْلَى“ کی مؤنث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿فِي الْحَنَةِ مِائَةٌ دَرَجَةٍ مَا تَبَيْنَ كُلُّ دَرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، وَالْفِرْدَوْسُ أَعْلَاهَا دَرَجَةٌ وَمِنْهَا تُفَعَّرُ أَنْهَارُ الْحَنَةِ الْأَرْبَعَةُ وَمِنْ فَوْقِهَا يَكُونُ الْعَرْشُ فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللَّهَ فَاَسْأَلُوهُ الْفِرْدَوْسَ﴾

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاصْرَبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخْفُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَى ۝

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا، پس ان کے لیے سمندر میں ایک خشک راستہ بنا، نہ تو پکڑے جانے سے خوف کھائے گا اور نہ ڈرے گا ۝

[ترمذی، صفة الجنة، باب ما جاء في صفة درجات الجنة: ۲۵۳۱، عن عبادة بن الصامت رضی اللہ عنہ] "جنت میں سو درجے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ ان میں سب سے اعلیٰ درجہ فردوس ہے، اسی سے جنت کی چاروں نہریں جاری ہوتی ہیں اور اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے تو جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگا کرو۔" ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَتَرَاءَوْنَ أَهْلَ الْعَرْشِ مِنْ فَوْقِهِمْ كَمَا تَتَرَاءَوْنَ الْكُوكَبَ الدَّرِيِّ الْغَائِبَ فِي الْأَفْقِ مِنَ الْمَشْرِقِ أَوْ الْمَغْرِبِ لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! تِلْكَ مَنَازِلُ الْأَنْبِيَاءِ لَا يَبْلُغُهَا غَيْرُهُمْ؟ قَالَ بَلَىٰ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! رِجَالٌ آمَنُوا بِاللَّهِ وَصَدَّقُوا الْمُرْسَلِينَ» [بخاری، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة و أنها مخلوقة: ۳۲۵۶، عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ] "جنت والے اپنے سے اوپر بالا خانوں والوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم اس چمک دار ستارے کو دیکھتے ہو جو آسمان کے مشرقی یا مغربی کنارے میں باقی رہ گیا ہو، ان کے ایک دوسرے سے درجات زیادہ ہونے کی وجہ سے۔" لوگوں نے کہا: "یا رسول اللہ! یہ انبیاء کے مقام ہوں گے کہ ان کے سوا کوئی ان تک نہیں پہنچ سکے گا؟" آپ نے فرمایا: "کیوں نہیں؟ مجھے اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ وہ آدمی ہوں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور انھوں نے رسولوں کی تصدیق کی۔" جنت کی نہروں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ محمد (۱۵)۔

آیت 77 ۱. وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ..... فرعون کے جادوگروں کے مقابلے میں ناکام ہونے اور ان کے ایمان قبول کر لینے کے بعد ایک لمبی مدت گزری، جس میں بنی اسرائیل پر ظلم کے کئی پہاڑ ٹوٹتے رہے، ساتھ ہی فرعون اور اس کی قوم پر قحط، طوفان، ٹنڈی دل، جوؤں، مینڈکوں اور خون کی صورت میں معجزے کے طور پر کئی عذاب آئے، جن میں سے ہر عذاب آنے پر وہ لوگ اپنے ایمان لانے کا اور بنی اسرائیل کو آزادی دینے کا وعدہ کرتے مگر عذاب ٹل جانے پر صاف مکر جاتے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو راتوں رات بنی اسرائیل کو ساتھ لے جانے کا حکم دیا۔ اس کا ذکر سورہ اعراف (۱۳۰ تا ۱۳۵) میں تفصیل سے ہے۔ یہاں وہ ساری بات حذف کر کے فرعون کا انجام ذکر فرما دیا۔ اس لیے اس آیت کا عطف آیت (۵۶) ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ﴾ پر ہے کہ فرعون کے تمام آیات (نشانیوں) کو جھٹلانے اور انکار کا انجام کیا ہوا؟ اس کا عطف موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مقابلے کے واقعہ پر نہیں۔ (بقای)

۲. أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي.....: یہ قصہ تفصیل کے ساتھ سورہ شعراء (۵۲ تا ۶۶) اور یونس (۹۰ تا ۹۲) میں مذکور ہے۔ یہاں

فَاتَّبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُمْ مِنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾ وَأَصْلًا فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ ﴿۷۹﴾

پس فرعون نے اپنے لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا تو انھیں سمندر سے اس چیز نے ڈھانپ لیا جس نے انھیں ڈھانپا ﴿۷۸﴾ اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور سیدھے راستے پر نہ ڈالا ﴿۷۹﴾

”فَأَجْعَلْ لَهُمْ طَرِيقًا“ (پس ان کے لیے راستہ بنا) کے بجائے ”فَأَضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا“ (پس ان کے لیے سمندر میں ایک خشک راستہ مار) فرمایا، مقصود لمسی بات کو مختصر کرنا ہے، یعنی ”إِجْعَلْ لَهُمْ بِضْرِبِ الْبَحْرِ بَعْصًا طَرِيقًا“ (سمندر پر اپنی لامسی مارنے کے ساتھ ان کے لیے اس میں خشک راستہ بنا)۔ گویا ”إِضْرِبْ“ میں ”إِجْعَلْ“ کا معنی سود دیا ہے، اسے تفسیرین کہتے ہیں۔

﴿۷۸﴾ لَا تَخَفْ دَرَكًا وَلَا تَخْشَى: ”لَا تَخْشَى“ کا مفعول ذکر نہیں فرمایا، تاکہ وہ عام رہے۔ معنی یہ ہو گا کہ نہ تو پکڑے جانے سے خوف کھائے گا اور نہ کسی بھی دوسری چیز سے ڈرے گا، مثلاً غرق ہونے، راستہ بھول جانے، بھوک پیاس سے ہلاک ہونے یا کسی اور دشمن کے حملے سے، غرض کسی بھی خطرے کا تجھے ڈر نہیں ہوگا۔ بعض مفسرین نے اس کا مفعول ”عَرَفًا“ محذوف مانا ہے، یعنی تو غرق ہونے سے نہیں ڈرے گا، مگر محذوف مفعول مقام کی مناسبت سے کوئی بھی ہو سکتا ہے، اس لیے اسے عام رکھنا بہتر ہے اور پھر اس میں غرق ہونا بھی آجاتا ہے۔

آیت 78 فَغَشِيَهُمْ مِنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ: یعنی ان کو سمندر سے ایسی عظیم چیز نے ڈھانپ لیا جو انسانی بیان میں نہیں آسکتی اور اگر اللہ تعالیٰ اسے اس طرح بیان فرمائے جس طرح اسے بیان کرنے کا حق ہے تو انسان کی کوتاہ عقل میں وہ سامنے نہیں سکتی، اس لیے اس کی تفصیل مت پوچھو۔ مراد ان سب کا سمندر میں غرق ہونا، پانی کی راہ سے آگ کا ایندھن بننا اور مرتے وقت اور بعد میں فرشتوں کی مار بے حساب و بے شمار ہے جو بیان سے باہر ہے۔ دیکھیے سورہ مومن (۴۵، ۴۶) اس کی مزید مثالیں یہ ہیں: ﴿إِذْ يَغْشَى السَّيْرَةَ مَا يَغْشَى﴾ [النجم: ۱۶] اور: ﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَى: فَغَشِيَهُمَا مَآخِطٌ﴾ [النجم: ۵۳، ۵۴] اور: ﴿فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ﴾ [النجم: ۱۰]

آیت 79 وَأَصْلًا فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ: یہاں ایک سوال ہے کہ ”أَصْلًا“ (گمراہ کیا) اور ”مَا هَدَىٰ“ (سیدھے راستے پر نہ ڈالا) دونوں کا مطلب ایک ہی ہے تو تکرار کا کیا فائدہ؟ اس سوال کے کئی جواب ہیں، ایک تو یہ کہ یہ تاکید کے لیے ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَهْوَاتٍ عِزِّ أَحْيَاءٍ﴾ [النحل: ۲۱] ”مردے ہیں، زندہ نہیں ہیں۔“ دوسرا یہ کہ ”فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا“ میں امکان تھا کہ اگر بعض چیزوں میں اس نے اپنی قوم کو غلط راستے پر ڈالا تو بعض میں درست سمت پر بھی چلایا ہو، چلو دنیا ہی کا کچھ فائدہ پہنچایا ہو۔ فرمایا، نہیں! کسی چیز میں بھی درست راستے پر نہیں ڈالا، بلکہ انھیں اتنا بے وقوف اور بے وقعت بنا دیا کہ وہ اس کی سراسر حماقتوں میں بھی اس کے پیچھے ہی چلتے رہے۔ (زخرف: ۴۵) (بقای) جیسا کہ آج کل دہریہ ملک چین میں حکومت کے حکم پر ایک یا دو بچوں سے زیادہ بچے پیدا ہونے پر عموماً انھیں ہسپتال ہی میں زہر کا ٹیکہ لگا کر مار

يَسْتَبِي إِسْرَائِيلَ قَدْ أَجْبَيْتَكُمْ مِنْ عَدْوِكُمْ وَوَعَدْتُكُمْ جَانِبَ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوى ۝۸۰

اے بنی اسرائیل! بے شک ہم نے تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دی اور تمہیں پہاڑ کی دائیں جانب کا وعدہ دیا اور تم پر من اور سلوی اتارا ۝۸۰

دیا جاتا ہے اور اگر کوئی اپنا بچہ مرنے سے بچالے تو اس کا پیدائش کے رجسٹر میں اندراج ہو سکتا ہے نہ اسے رجسٹرڈ شہری کی مراعات حاصل ہو سکتی ہیں۔ کوئی اولاد والا ہی اس دردناک کیفیت کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود پوری قوم خوشی یا بے بسی سے ان احکام کے پیچھے چل رہی ہے، اس سے بڑھ کر ”ماہدی“ کیا ہوگا؟

تیسرا جواب یہ کہ دراصل یہ فرعون کے اس دعویٰ پر طنز ہے جو اس نے کیا تھا: ﴿مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَى وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ﴾ [المومن: ۲۹] ”میں تو تمہیں وہی رائے دے رہا ہوں جو خود رائے رکھتا ہوں اور میں تمہیں بھلائی کا راستہ ہی بتا رہا ہوں۔“ اور زیر تفسیر سورت کی آیت (۶۳) میں بھی اس کے چیلوں نے اپنے طریقے کو سب سے افضل قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے رد میں فرمایا کہ ”فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور انہیں سیدھے راستے پر نہ ڈالا۔“ (مختصری)

آیت 80 ﴿يَسْتَبِي إِسْرَائِيلَ قَدْ أَجْبَيْتَكُمْ﴾ : یہ تین آیتیں موسیٰ علیہ السلام کے قصے کے درمیان جملہ معترضہ کے طور پر آئی ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے دو آیات (۵۶، ۵۵) گزر چکی ہیں۔ اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بنی اسرائیل مخاطب ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے یہود کو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد کروائی جا رہی ہوں، جیسا کہ: ﴿يَسْتَبِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ [البقرہ: ۴۰، ۴۱، ۶۲] میں ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو تین نعمتیں یاد دلائیں۔ سب سے پہلے غلامی سے نجات کی عظیم نعمت، اس کے بعد طور پر بلا کردہ نبی احکام پر مشتمل کتاب عطا کرنے کی نعمت اور آخر میں بلا مشقت من و سلوی کا پاکیزہ اور لذیذ ترین رزق عطا کرنے کی نعمت۔ من و سلوی کی تفسیر کے لیے دیکھیں سورہ بقرہ (۵۷)۔

آیت 81 ﴿وَوَعَدْتُكُمْ جَانِبَ الطُّورِ الْأَيْمَنِ﴾ : اس واقعہ کا ذکر سورہ بقرہ (۵۲) میں بھی ہے اور اس کی تفصیل سورہ اعراف (۱۳۲ تا ۱۳۷) میں ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہاڑ کی دائیں جانب سے مراد کیا ہے؟ کیونکہ پہاڑ کی ہر جانب ہی کھڑے ہونے والے شخص کے لحاظ سے دائیں بھی ہو سکتی ہے اور بائیں بھی۔ جواب اس کا یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت اور اسلام میں جغرافیہ اور محل وقوع میں جہتوں کے تعین کے لیے مشرق کو اصل قرار دیا گیا ہے، چنانچہ یمن اور شام کے نام اسی مناسبت سے رکھے گئے ہیں کہ کعبہ سے مشرق کی طرف رخ کریں تو دائیں طرف یمن ہے، جس کا معنی دایاں ہے اور بائیں طرف شام۔ امرؤ القیس نے بھی ایک بادل کے برسنے کا محل وقوع بیان کرتے ہوئے کہا ہے ۔

عَلَى قَطَنِ بِالشِّيمِ أَيْمَنُ صَوْبِهِ وَ أَيْسَرُهُ عَلَى الْبَسْتَارِ فَيَذْبُلُ

”غور سے دیکھنے پر اس کی بارش کا دایاں حصہ قطن مقام پر تھا اور اس کا بائیں حصہ ستار پھر یذبل نامی مقام پر تھا۔“

كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي، وَمَنْ يَعْصِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوِيَ ﴿۸۱﴾ وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَى ﴿۸۲﴾

کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں اور ان میں حد سے نہ بڑھو، ورنہ تم پر میرا غضب اترے گا اور جس پر میرا غضب اترتا تو یقیناً وہ ہلاک ہو گیا ﴿۸۱﴾ اور بے شک میں یقیناً اس کو بہت بخشے والا ہوں جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھے راستے پر چلے ﴿۸۲﴾

اس صورت میں اگر ”الْإِيمَانُ“ سے مراد دائیں جانب لیں تو موسیٰ علیہ السلام کے طور کی مغربی جانب اس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونے پر پہاڑ کی دائیں طرف (جنوب) مراد ہوگی، جیسا کہ مدین سے مصر کو آتے ہوئے پہلی وحی کے وقت وہ پہاڑ کی مغربی جانب میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْعَرَبِينَ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ﴾ [القصص: ۴۰] اور اس وقت تو مغربی جانب میں نہیں تھا جب ہم نے موسیٰ کی طرف حکم کی وحی کی۔ اور اگر ”الْإِيمَانُ“ کو ”یَمِينُ“ (دائیں) کے بجائے ”شِمَالُ“ (برکت) سے اسم تفضیل مانیں تو دائیں بائیں کی تعین کی ضرورت ہی نہیں بلکہ طور کی جانب ایمن (با برکت جانب) اور اس سورت کی آیت (۱۲): ﴿إِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا نُقَدِّسُ ظُلْمَى﴾ میں مذکور وادی مقدس دونوں سے مراد وادی طویٰ ہوگی۔ (ابن عاشور)

آیت 81 ۱ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ : طغیان کا معنی حد سے بڑھنا ہے۔ رزق میں حد سے تجاوز یہ ہے کہ دوسرے کا حق کھا جائے، ناشکری یا فضول خرچی کرنے لگے، نعمت پر اتارنے لگے، رزق میں واجب حقوق ادا نہ کرے، اسے اللہ کی نافرمانی میں خرچ کرنے لگے، یا جس جگہ یا جس وقت اسے جواز کر رکھنے سے منع کیا گیا ہے وہاں جوڑنے کے پیچھے پڑ جائے۔ غرض حکم یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو اللہ کی حدود سے تجاوز اور نافرمانی کا ذریعہ مت بناؤ۔

آیت 82 ۲ فَقَدْ هَوِيَ: ”هَوِيَ يَهْوِي“ (ض) ادبچی جگہ سے گرنا۔ چونکہ ایسا گناہ جس کے بعد اٹھانا نہ ہو، ہلاک ہونے کی صورت ہی میں ہوتا ہے، اس لیے یہاں ”هَوِيَ“ کا معنی ”ہلاک ہو گیا“ کرتے ہیں۔

آیت 82 ۳ وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ : نافرمانی اور طغیان کی وعید کے بعد توبہ کی ترغیب دی۔ معلوم ہوا مغفرت کے لیے چار چیزیں شرط ہیں، ایک توبہ یعنی کفر و شرک اور نافرمانی سے باز آ جانا، دوسری ایمان یعنی اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ، یوم آخرت اور دوسری ایمانیات پر صدق دل سے اعتقاد رکھنا، تیسری عمل صالح یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایات کے مطابق نیک عمل کرنا اور چوتھی آخر دم تک سیدھے راستے پر قائم رہنا۔ ”اهْتَدَى“ سے یہی مراد ہے اور یہی چیز سب سے مشکل ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے لفظ ”شَحَّ“ (پھر) کے بعد ذکر فرمایا، جیسا کہ: ﴿شَحَّ كَان مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَةِ﴾ [البلد: ۱۷] میں ہے۔ گویا یہ آیت سورہ طم السجدہ کی آیات (۳۰-۳۲)

وَمَا أَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يَهُوسَى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمْ أَوْلَاءٌ عَلَيَّ أَثَرِي وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَى ﴿۸۴﴾

اور تجھے تیری قوم سے جلد کیا چیز لے آئی اے موسیٰ؟! ﴿۸۳﴾ کہا وہ یہ میرے نشان قدم پر ہیں اور میں تیری طرف جلدی آ گیا اے میرے رب! تاکہ تو خوش ہو جائے ﴿۸۴﴾

کی ہم معنی ہے۔

آیت 83 وَمَا أَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يَهُوسَى : اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام سے طور کے دائیں جانب میں آنا اور موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کرنا طے فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے خود قوم کے ساتھ آنے کے بجائے ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کر کے انہیں طور کی طرف سفر جاری رکھنے کا حکم دیا اور خود اپنے رب سے کلام اور ملاقات کے شوق میں نہایت تیزی کے ساتھ وعدے کے مقام پر پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مناجات اور تورات عطا کرنے کے بعد پوچھا کہ موسیٰ! تجھے کیا چیز تیری قوم سے جلدی لے آئی؟

آیت 84 قَالَ هُمْ أَوْلَاءٌ عَلَيَّ أَثَرِي : یہاں ایک سوال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں جلدی کی وجہ بتانے کے بجائے کہ پروردگار! میں تجھے راضی کرنے کے لیے جلدی آ گیا، یہ کیوں ضروری سمجھا کہ پہلے یہ عرض کریں کہ قوم کے لوگ میرے پیچھے میرے نشان قدم پر آرہے ہیں، یعنی نشان منٹے سے بھی پہلے وہ اس پر چلے آ رہے ہیں، یعنی میں کوئی زیادہ جلدی نہیں آیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے بے خبر نہ تھا کہ وہ کیوں جلدی آ گئے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا عتاب قوم کے ساتھ نہ آنے پر تھا اور یہ سوال اپنے کلیم کی تربیت کے لیے تھا کہ تمہارا پہلے آنا مناسب نہ تھا، بلکہ غلامی سے تازہ تازہ نکلی ہوئی قوم کے ساتھ رہنا ضروری تھا، تاکہ کتاب ملنے سے پہلے ہر قدم پر ان کی رہنمائی کرتے اور ان کی غلطیوں پر سرزنش کرتے۔ ویسے بھی کسی قوم کے رئیس کا حق یہ ہے کہ وہ ان کے پیچھے رہ کر ان کے ہر فرد کا خیال رکھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو اہل و عیال سمیت رات کو نکلنے کا حکم دیتے ہوئے یہ ادب سکھایا: ﴿وَإِذْ أَخْبَارُ هُنَا﴾ [الحجر: ۶۵] ”اور خود ان کے پیچھے پیچھے چل۔“ اور جیسا کہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے رسول کریم ﷺ کے متعلق ذکر فرمایا: «كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَلَّفُ فِي الْمَسِيرِ فَيُرْجَى الضَّعِيفُ وَيُرَدُّ وَيَدْعُو لَهُمْ» [أبو داؤد، الجهاد، باب في لزوم المسافة: ۲۶۳۹۔ سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۲۱۲۰] ”رسول اللہ ﷺ سفر میں پیچھے رہتے، کمزور (کی سواری) کو ہانکتے اور (پیدل کو) پیچھے بٹھا لیتے اور ان کے لیے دعا کرتے۔“ موسیٰ علیہ السلام کا ذوق شوق میں جلدی آنا اگرچہ بری بات نہ تھی مگر بادشاہوں کے حضور پیش ہونے کے کچھ آداب ہوتے ہیں اور شاہوں کے شاہ کا ادب تو سب سے بڑھ کر ہے۔ اس کی ایک مثال ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کی جلدی ہے کہ وہ مسجد میں پہنچے تو نبی ﷺ رکوع میں تھے، انھوں نے صف میں ملنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا، نبی ﷺ سے اس بات کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «زَادَكَ اللَّهُ جِرْصًا وَلَا تَعُدُّ» [بخاری، الأذان، باب إذا ركع دون الصف:

۱۷۸۳] ”اللہ تعالیٰ تمہاری حرص زیادہ کرے اور دوبارہ ایسا نہ کرنا۔“ [فاسمی، بغاصی، ابن عاشور]

قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا ۚ قَالَ يَقَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعَدًّا حَسَنًا ۚ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ أَمْ أَرَدْتُمْ أَنْ يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُم مَّوْعِدِي ﴿۸۶﴾

فرمایا پھر بے شک ہم نے تو تیری قوم کو تیرے بعد آزمائش میں ڈال دیا ہے اور انھیں سامری نے گمراہ کر دیا ہے ﴿۸۵﴾ تو موسیٰ اپنی قوم کی طرف پلٹا غصے سے بھرا ہوا، افسوس کرتا ہوا، کہا اے میری قوم! کیا تمہارے رب نے تمہیں اچھا وعدہ نہ دیا تھا؟ پھر کیا وہ مدت تم پر لمبی ہوگئی، یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی غضب اترے؟ تو تم نے میرے وعدے کی خلاف ورزی کی ﴿۸۶﴾

آیت 85 ﴿۸۵﴾ قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ: یہ فاء تعلیل کے لیے ہے، یعنی تمہارا قوم کو چھوڑ کر چلے آنا اور مفسدوں کے لیے موقع فراہم کر دینا اس کا باعث بنا کہ تمہارے بعد ہم نے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔ یہاں ایک بات یاد رہنی چاہیے کہ انھیں پھنسا کر سامری نے گمراہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی صراحت بھی فرمادی کہ انھیں سامری نے گمراہ کر دیا، مگر تمام اسباب کا خالق چونکہ اللہ تعالیٰ ہے اور تمام دل اس کے ہاتھ میں ہیں، اس لیے آزمائش میں ڈالنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی۔

﴿۸۶﴾ مِّنْ بَعْدِكَ: موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو تیس دنوں کے اعتکاف کا بنا کر گئے تھے، جسے اللہ تعالیٰ نے چالیس دنوں کے ساتھ مکمل فرمایا تو قوم اس سے بے خبر تھی، انھیں معلوم نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کب آئیں گے؟ اس مدت سے فائدہ اٹھا کر سامری نے کیا جو کچھ کیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ”بَعْدِكَ“ سے پہلے ”مِّنْ“ کا لفظ زیادہ فرمایا، جو ”بعض“ کے معنی میں ہے، یعنی تمہارے بعد کے عرصے میں سے کچھ عرصے میں سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔ (بقای)

آیت 86 ﴿۸۶﴾ فَرَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ ۚ: ”غَضْبَانَ“ مبالغہ کے وزن پر ہے، اس لیے ”غصے سے بھرا ہوا“ ترجمہ کیا ہے۔ ”أَسِفًا“ ”أَسِفًا“ ”أَسِفًا“ (ع) سے صفت کا صیغہ ہے، اس کا معنی سخت غم و افسوس کرنے والا بھی ہے اور غصے والا بھی۔ (قاموس) یہاں ”غَضْبَانَ“ کے بعد افسوس زیادہ مناسب ہے۔ حرف ”فَاء“ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے مکالمہ اور کتاب دینے کے آخر میں انھیں قوم کے گمراہ ہونے کی اطلاع دی۔ ”فَرَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ“ تو یہ خبر سنتے ہی موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔

﴿۸۶﴾ قَالَ يَقَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعَدًّا حَسَنًا: اس وعدے سے مراد توبہ، ایمان اور عمل صالح کے بعد اس پر استقامت اختیار کرنے والے کے لیے مغفرت کا وعدہ، طور کی جانب ایمین پر موسیٰ علیہ السلام سے کلام اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے تورات عطا کرنے کا وعدہ اور من و سلویٰ نازل کرنے کا وعدہ ہے۔ (طبری)

قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلِكِنَا وَلَكِنَّا حُبَلْنَا أَوْزَارًا فَمِنْ زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَدَتْهَا

انہوں نے کہا ہم نے اپنے اختیار سے تیرے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کی اور لیکن ہم پر لوگوں کے زیوروں کے

۱۰ اَفْطَالَ عَلَيْهِمُ الْعَهْدُ.....: ”العہد“ کا معنی ہے وصیت، کسی آدمی سے کوئی بات طے کر لینا، پختہ وعدہ، قسم، حرمت کا خیال رکھنا، امان، ذمہ، ملاقات، بیچان، زمانہ، وفا، اللہ تعالیٰ کی توحید وغیرہ۔ (قاموس) یہاں ملاقات بھی معنی ہو سکتا ہے اور مدت بھی کہ کیا تمہیں میری ملاقات کو بہت لمبی مدت ہو چکی تھی کہ تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی؟ تیس دنوں سے دس دن ہی تو زیادہ گزرے تھے، یہ کون سی لمبی مدت تھی کہ تم نے مجھ سے کیے ہوئے سب وعدے توڑ ڈالے۔ وعدہ خلافی سے مراد ان کا طور کے دامن تک جانے کے لیے موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے چلتے رہنے کے بجائے راستے میں ٹھہر جانا، پھڑے کی پرستش اور مجاوری پر اڑ جانا اور ہارون علیہ السلام کے انھیں چلتے رہنے کی تاکید اور پھڑے کی عبادت ترک کرنے کی نصیحت پر یہ کہنا کہ ”لَنْ نَبْرَحَ عَلَيْهِ يَوْمَئِذٍ كَافِينَ“ یعنی ہم اسی پر مجاور بن کر بیٹھے رہیں گے یہاں تک کہ موسیٰ ہمارے پاس آئیں۔ یہ تمام باتیں وعدے کی خلاف ورزی تھیں۔ (طبری)

آیت 87 ۱ قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلِكِنَا: انہوں نے وعدہ خلافی کا نہایت ہی بودا عذر پیش کیا کہ اس وعدہ خلافی میں ہمارا کوئی اختیار ہی نہ تھا۔ سامری نے ہمیں پھسلا یا ہی اس طرح کہ ہم میں نیک و بد کی پہچان ہی نہ رہ گئی۔ کوئی پوچھے کہ سامری نے تم پر کوئی فوج کشی کی تھی یا تلوار تان رکھی تھی کہ تمہارا اختیار ختم ہو گیا تھا؟ قیامت کے دن ہر مجرم اپنے آپ کو بے قصور اور بے اختیار ٹھہرائے گا اور اپنے تمام جرائم کا ذمہ دار شیطان کو ٹھہرائے گا مگر وہ صاف کہہ دے گا کہ میں نے تم پر کوئی فوج کشی نہیں کی تھی، صرف دعوت دی تھی، تم نہ مانتے تو میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ دیکھیے سورہ ابراہیم (۲۲)۔

۲ وَلَكِنَّا حُبَلْنَا أَوْزَارًا.....: اس آیت کی تفسیر اکثر مفسرین نے یہ کی ہے کہ بنی اسرائیل نے مصر سے نکلنے سے پہلے فرعون کی قوم کے لوگوں سے ان کے زیورات ادھار مانگ لیے تھے، بعض نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کام انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر کیا تھا۔ اب وہ ان کے لیے بوجھ بن گئے تھے، کیونکہ وہ مال غنیمت کے حکم میں تھے اور پہلی امتوں کے لیے غنیمت حلال نہ تھی۔ چنانچہ ہارون علیہ السلام یا سامری کے کہنے پر کہ ان زیورات کو اپنے پاس رکھنا گناہ ہے، سب زیور ایک گڑھے میں پھینک کر انھیں آگ لگا دی گئی اور سامری نے اس سے فائدہ اٹھا کر اس سونے یا چاندی سے چھڑا بنا دیا۔ بعض نے یہ لکھا ہے کہ فرعون کی قوم جب غرق ہوئی اور ان کی لاشیں کنارے پر آئیں تو بنی اسرائیل نے ان کے زیور اتار لیے، اس زمانے میں عورتوں کی طرح مرد بھی سونے چاندی کے کنگن اور زیور وغیرہ پہنتے تھے۔ ”زینۃ القوہر“ سے قوم فرعون کے زیور مراد ہیں۔ بہت سے لوگوں کو یہ اصرار ہے کہ یہ سلف کی تفسیر ہے اور اس سے انحراف سلف سے انحراف ہے۔ مگر قرآن وحدیث سے یا کسی صحابی سے صحیح سند کے ساتھ اس کی طرف معمولی اشارہ بھی نہیں ملتا کہ ہجرت کے وقت پوری قوم کو، حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام کو دھوکے سے قوم فرعون کے زیورات حاصل کرنے کی فکر پڑی ہوئی تھی، نہ آیات ہی میں کوئی اشارہ ہے کہ ”زینۃ القوہر“ میں ”القوہر“

فَكَذَلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ ۝

کچھ بوجھ لاد دیے گئے تھے تو ہم نے انہیں پھینک دیا، پھر اس طرح سامری نے (بنا) ڈالا ۝

سے مراد قوم فرعون ہے۔ دراصل یہ بات تورات اور پہلے صحیفوں سے لی گئی ہے، جن میں یہود نے اتنی تحریف کر دی ہے کہ انبیاء پر ہتھیں لگانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ داؤد اور لوط علیہم السلام پر ان کی ہتھیں معروف ہیں۔ اس واقعہ میں بھی انہوں نے بارون علیہ السلام پر ہتھ لگائی ہے کہ پتھر اپنا کر لوگوں کو اس کی عبادت پر لگانے والے وہ تھے۔ [نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ هَذَا وَابْتِهَامِ] اس کے برعکس قرآن مجید میں دوسرے مقام پر تصریح ہے کہ وہ تمام زیور بنی اسرائیل کے اپنے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ خَلْقِهِ عَجَلًا غَسَسَ الْإِنسَانُ أَكْثَارًا ﴿۱۶۸﴾﴾ [الأعراف: ۱۶۸] ”اور موسیٰ کی قوم نے اس کے بعد اپنے زیوروں سے ایک پتھر اپنا لیا جو ایک جسم تھا، جس کی گائے جیسی آواز تھی۔“ ”مِنْ خَلْقِهِمْ“ (اپنے زیوروں سے) کی تصریح کے باوجود انہیں قوم فرعون کے زیور قرار دینا عجیب بات ہے۔

اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں نوٹ وغیرہ تو تھے نہیں، نقدی سونے یا چاندی ہی کی صورت میں ہوتی تھی، جسے زیورات کی صورت میں لوگ پہن لیتے یا گھروں میں محفوظ رکھتے، ان کا کافی بوجھ بن جاتا تھا، خصوصاً جب ان کے ساتھ تانبے وغیرہ کی آمیزش اور پہننے کے لیے چمڑے، دھاگے یا لوہے کی زنجیریں وغیرہ بھی ساتھ ہوتیں۔ اس لیے اس سفر میں ذمہ داریاں تقسیم کرتے وقت ہر ایک کے اپنے اپنے بوجھ اٹھانے کے بجائے کچھ لوگوں کے ذمے اسے اٹھانے کی ذمہ داری لگائی گئی۔ ظاہر ہے کہ اتنی اہم ذمہ داری قوم کے سربراہ اور وہ لوگوں ہی کی ہو سکتی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام بھی انہی لوگوں سے مخاطب تھے، کیونکہ وہ ایک وقت میں ساری قوم کے ہزاروں، یا بقول بعض لاکھوں لوگوں سے تو بات نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے یہ وجہ بتائی کہ ہم پر لوگوں کے زیوروں کا بوجھ تھا، ہم نے اسے جس قدر ہو سکے ہلکا کرنے کے لیے آگ میں پھینکا کہ زائد چیزیں جل جائیں اور خالص سونے اور چاندی کی اینٹیں بنالی جائیں اور منزل پر پہنچ کر ہر ایک کو اس کے نام لکھے ہوئے کے مطابق اس کے حصے میں آنے والا خالص چاندی یا سونا دے دیا جائے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سامری نے اس سے پتھرے کا مجسمہ بنا دیا۔

۱۱ اللہ تعالیٰ نے سونے اور چاندی میں یہ وصف رکھا ہے کہ یہ بطور قیمت شروع سے مقرر چلے آ رہے ہیں۔ دینار و درہم بھی ان کے بنتے تھے اور یہی فطری طریقہ تھا جس سے ہر شخص کا مال خود اس کے پاس ہوتا تھا۔ چالاک یہودیوں نے بینک بنا کر لوگوں کا سونا چاندی اپنے پاس جمع کر لیا اور انہیں رسیدیں جاری کر دیں کہ جب چاہو یہ دکھا کر اپنا سونا چاندی لے لو۔ لوگوں نے صرف اتنی سہولت کی خاطر کہ بوجھ نہ اٹھانا پڑے، ان رسیدوں سے لین دین شروع کر دیا، جس نے آگے نوٹوں کی صورت اختیار کر لی۔ اب صرف بوجھ سے بچنے کی خاطر سارا کاروبار یا نوٹ پر چلتا ہے یا بینک کے چیکوں پر۔ لوگوں کے پاس کاغذ کے ایک ٹکڑے کے سوا کچھ بھی نہیں اور اس کاغذ کی حیثیت یہ ہے کہ حکومتیں جب چاہتی ہیں اس کی قیمت کبھی آدھی کم کر دیتی

فَاخْرَجَ لَهُمْ عَجَلًا لَّهُ خُومًا فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ نُوسَىٰ ه قَتِيۡبًا ۝

پس اس نے ان کے لیے ایک چھڑا نکالا، جو محض جسم تھا، اس کے لیے گائے کی آواز تھی، تو انھوں نے کہا یہی تمہارا معبود اور موسیٰ کا معبود ہے، سو وہ بھول گیا ۝

ہیں، کبھی چوتھا حصہ۔ جو شخص ایک کروڑ روپے کے سونے کا مالک تھا، صرف ایک اعلان کے بعد پچاس لاکھ کے وعدے والے کاغذ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں رہتا اور اگر نئے نوٹ جاری ہو جائیں اور یہ بروقت نہ بدلوا سکے تو بالکل ہی خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ بینک دیوالیہ ہو جائے تو اس کا چیک کسی کام کا نہیں رہتا اور ساری رقم ہی برباد ہو جاتی ہے۔ ضروری بوجھ سے جان چھڑانے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو اس کے مخلص بندے یہود کے قتلے کو توڑ کر سود اور بینکوں کو ختم کر کے سونے یا چاندی کے سکے جاری کریں گے، تاکہ کوئی کسی کا حق نہ مار سکے۔ یہاں مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ بوجھ سے جان چھڑانے میں بنی اسرائیل کو کتنا نقصان ہوا اور اب مسلم اور غیر مسلم بوجھ اٹھائے پھرنے سے بچنے کی خاطر کتنے بڑے خسارے میں پڑے ہوئے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں درحقیقت کچھ بھی نہیں، سب یہودی سود خوروں یا ان کے گماشتوں کے پاس ہے۔ ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی مالیت سونے چاندی کی صورت میں محفوظ رکھے، صرف اتنا بیچ لے جتنے استعمال کی ضرورت ہے۔ سونے کی قیمت ہمیشہ ایک رہی ہے اور رہے گی۔ دیکھیے صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے ایک دینار میں بکری خریدنا منقول ہے، ہجرت کو چودہ سو تیس سال گزرنے کے باوجود آج بھی بکری کی قیمت یہی ہے۔

آیت 88 1 فَاخْرَجَ لَهُمْ عَجَلًا : مصری لوگ ہندوؤں کی طرح گائے کی پرستش کرتے تھے اور اس کی تقدیس کے قائل تھے۔ بنی اسرائیل میں بھی مسلمان ہونے کے باوجود قبلی مشرکوں کی غلامی اور ان سے میل جول کی وجہ سے یہ عقیدہ سرایت کر گیا تھا، جس کا وقتاً فوقتاً اظہار ہوتا رہتا تھا، جیسا کہ اس وقت ہوا جب موسیٰ علیہ السلام نے انھیں کوئی گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۶۷) اب موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں سامری نے بنی اسرائیل کے زیوروں سے گائے کا چھڑا بنایا جو بے جان تھا، مگر ایسی کاری گری سے بنایا گیا تھا کہ اس میں رکھے گئے سوراخوں کی وجہ سے خود بخود گائے کی سی آواز نکلتی تھی۔ وہ لوگ جنھوں نے سمندر سے پار ہوتے ہی چند بت پرستوں کے پاس سے گزرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام سے ان کے معبودوں جیسا معبود بنانے کا مطالبہ داغ دیا تھا، انھی جاہلوں نے فوراً اسے اپنا معبود تسلیم کر لیا اور کہنے لگے، تمہارا اور موسیٰ کا اصل معبود تو یہ ہے، موسیٰ بھول میں پڑ گئے جو طور پر کسی معبود سے کلام کے لیے گئے ہیں۔ ہمارے بعض صوفی حضرات بھی تصور شیخ کے شرک میں اس حد تک بڑھ گئے کہ جو محبت اپنے رب سے کرنی تھی اور جس طرح ہر وقت اسی کو اپنے سامنے رکھنا تھا، وہ محبت اور یاد شیخ کی نذر کردی اور یہاں تک کہہ دیا۔

اے قوم بیچ رفتہ کجاں کجاں معشوق در بیجا ست کجاں کجاں کجاں

”اے حج کو گئے ہوئے لوگو! تم کہاں ہو، تم کہاں ہو؟ معشوق تو یہاں ہے، تم کہاں ہو، تم کہاں ہو؟“

أَفَلَا يَرَوْنَ إِلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا ۚ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ﴿٨٨﴾ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هُرُونَ مِنْ قَبْلِ يَقُومِرَ إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهِ ۗ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي ﴿٨٩﴾

تو کیا وہ دیکھتے نہیں کہ وہ نہ ان کی کسی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے کسی نقصان کا مالک ہے اور نہ کسی نفع کا ﴿۸۸﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہارون نے ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اے میری قوم! بات یہی ہے کہ اس کے ساتھ تمہاری آزمائش کی گئی ہے اور یقیناً تمہارا رب رحمان ہی ہے، سو میرے پیچھے چلو اور میرا حکم مانو ﴿۸۹﴾

﴿٨٩﴾ جَسَدًا لَّهُ خُورًا..... بعض مفسرین نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ وہ گوشت پوست کا پھنڑا بن گیا، مگر اس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ وہ محض دھات کا بنا ہوا ایک بے جان مجسمہ تھا۔ ”خُورًا“ گائے کی آواز۔

آیت 89 أَفَلَا يَرَوْنَ إِلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا..... : یہ وہی دلیل ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد اور قوم کے سامنے پیش کی تھی: ﴿يَأْتِيهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ مَلَآنًا يَلْمِزُهُمْ وَلَا يَجْزُوا وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا﴾ (مریم: ۴۲) ”اے میرے باپ! تو اس چیز کی عبادت کیوں کرتا ہے جو نہ سنتی ہے اور نہ دیکھتی ہے اور نہ تیرے کسی کام آتی ہے۔“ موسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ اکثر دلائل وہی ہیں جو ان کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیے تھے، دیکھیے سورہ شعراء۔ بنی اسرائیل کی عجائب پرستی دیکھیے کہ دھات کے بنے ہوئے پھنڑے کے بے جان مجسمے کو صرف آواز کی وجہ سے معبود، حاجت روا اور مشکل کشا مان بیٹھے۔ مجسمہ بھی اس جانور کا جسے تمام جانوروں سے سادہ لوح سمجھا جاتا ہے اور جو خود انسان کا خدمت گار اور اس کی خوراک ہے۔ یہ نہ سوچا کہ اس مجسمے سے تو وہ خود ہزار گنا با اختیار ہیں کہ بول سکتے ہیں، اپنی مرضی سے چل پھر سکتے ہیں اور بقدر استطاعت کچھ نہ کچھ فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہیں، جب کہ بت پھنڑے کا ہو یا انسان کا، بات کرنے، چلنے پھرنے، سننے دیکھنے، ہر چیز سے عاری ہے۔ سورہ اعراف کی آیات (۱۹۳، ۱۹۵) میں یہ بات نہایت تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔

آیت 90 ﴿٩٠﴾ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هُرُونَ..... : موسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے ہارون علیہ السلام نے نہایت اچھے طریقے سے نصیحت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہارون علیہ السلام کے خطاب کا ذکر ”وَلَقَدْ“ (بلاشبہ یقیناً) کے ساتھ شروع فرمایا، اس میں بائبل کا رد ہے جس کا کہنا ہے کہ وہ پھنڑا ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا۔ فرمایا، یقینی بات یہ ہے کہ ہارون علیہ السلام نے تو اپنی قوم کو اس کی عبادت سے منع فرمایا تھا۔ ہارون علیہ السلام کے خطاب کا حسن دیکھیے کہ سب سے پہلے یہ کہہ کر انہیں اپنا اور ان کا باہمی تعلق بتایا کہ ”يَقُومِرَ“ (اے میری قوم!) یعنی اپنے ایک فرد کی بات سنو، جو تمہارا ایک فرد ہے اور تم سب کی اس سے رشتہ داری ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی قوم سے فرمایا: ﴿لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى﴾ (الشوری: ۲۳) ”میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا، مگر رشتہ داری کی وجہ سے دوستی۔“ پھر باطل معبود کی نفی کے بعد صرف معبود برحق ”رحمان“ کو اپنا رب ماننے کی تاکید فرمائی جو ہر حال میں انسان پر رحم فرماتا ہے، جیسا کہ ”لا الہ الا اللہ“ میں پہلے ہر معبود کی نفی اور آخر میں اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے کا اثبات ہے۔ آخر میں اپنی نبوت اور موسیٰ علیہ السلام کی خلافت کی وجہ سے اپنے پیچھے چلنے اور اپنا حکم ماننے کی

قَالُوا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَلَقِينَ حَتَّى يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَى ۖ قَالَ يَهُودُؤُنَّ مَا مَنَّكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ۗ إِلَّا تَتَّبِعَنِ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي ۗ ﴿٩٢﴾

انہوں نے کہا ہم اسی پر مجاور بن کر بیٹھے رہیں گے، یہاں تک کہ موسیٰ ہماری طرف واپس آئے ﴿٩١﴾ کہا اے ہارون! تجھے کس چیز نے روکا، جب تو نے انہیں دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں ﴿٩٢﴾ کہ تو میری پیروی نہ کرے؟ تو کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟ ﴿٩٣﴾

تلقین فرمائی۔ نصیحت کی یہ بہترین ترتیب ہے۔

﴿٩٢﴾ یہاں ایک نکتہ قابل ذکر ہے کہ شیعہ حضرات رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بجائے علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کی دلیل کے طور پر ایک حدیث بڑے زور و شور سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أَنْتَ مَنِىْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوسَى إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي» [مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل علي بن أبي طالب رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: ٢٤٠٤/٣١، عن سعد بن أبي وقاص رَضِيَ اللهُ عَنْهُ] ”تم مجھ سے اسی مقام پر ہو جو ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام سے تھا، سوائے اس بات کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔“ ان حضرات کو دیکھنا چاہیے کہ اپنے مخالفین کے اتنے بڑے مجمع میں، جو ہارون علیہ السلام کے قتل تک پر تیار تھا، ہارون علیہ السلام نے تقیہ اختیار نہیں کیا، بلکہ سب لوگوں کے سامنے واضح الفاظ میں حق بیان فرمایا اور لوگوں کو اپنے اتباع اور اطاعت کی دعوت دی اور دوسروں کی پیروی اور اطاعت سے منع فرمایا، تو اگر امت محمد ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے میں خطا پر ہوتی تو علی رضی اللہ عنہ پر لازم تھا کہ وہی کرتے جو ہارون علیہ السلام نے کیا تھا اور کسی بھی تقیہ اور خوف کے بغیر اپنی خلافت کا اعلان کرتے اور صاف الفاظ میں کہتے ”فَأَطِيعُوا أَمْرِي“ تو جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ امت کا فیصلہ درست تھا۔ (رازی)

آیت 91: قَالُوا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَلَقِينَ.....: ”عَلَقٌ يَعْكُفُ عُنُقُوْنَا“ (ان) کا معنی عبادت اور تقرب کے ارادے سے کسی جگہ بیٹھ رہنا ہے۔ ہارون علیہ السلام نے نبی اسرائیل کو پھڑے کی عبادت چھوڑنے اور اپنے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے طور کی طرف جانے کے لیے کہا تو انہوں نے نہایت ڈھٹائی سے ان کی دونوں باتوں کا انکار کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے واپس آنے تک ہم نہ تمہارے ساتھ جائیں گے اور نہ پھڑے کی مجاوری چھوڑیں گے۔

آیت 92-93: قَالُوا يَهُودُؤُنَّ مَا مَنَّكَ.....: آیت (٩٢) سے (٩٩) تک موسیٰ علیہ السلام کی شدید غصے اور افسوس کے ساتھ واپسی اور قوم کو ڈانٹنے اور ان سے سوال جواب کا ذکر ہے۔ اس کے بعد دو آیات میں اس عرصے میں ہارون علیہ السلام کی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی اور قوم کے ان کی کوئی بھی بات نہ ماننے کا ذکر ہے، جس سے مقصود ہارون علیہ السلام کا دامن ہر کوتاہی سے پاک قرار دینا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو پھڑے کی عبادت کرتے دیکھا تھا، انہیں ہارون علیہ السلام کی اصلاح کی کوشش اور نصیحت کا علم نہ تھا، اس لیے قوم کو ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ ہی انہوں نے شدید غصے کی حالت میں تورات کی تختیوں کو پھینک دیا

قَالَ يَبْنُوهُ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۚ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ

اس نے کہا اے میری ماں کے بیٹے! نہ میری ڈاڑھی پکڑ اور نہ میرا سر، میں تو اس سے ڈرا کہ تو کہے گا تو نے

اور ہارون علیہ السلام کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے (اعراف: ۱۵۰، ۱۵۱) اور کہنے لگے کہ جب تم نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہو گئے ہیں تو تمہیں کس چیز نے روکا کہ میرے پیچھے چلے آؤ اور آکر مجھے ان کے گمراہ ہونے کی خبر دو، تو کیا تم نے میرا حکم نہیں مانا؟

آیت ۹۴ ① قَالَ يَبْنُوهُ لَا تَأْخُذْ : "يَبْنُوهُ" اصل میں "يَا ابْنِ أُمِّي" تھا، یاہ کو الف سے بدلنے کے بعد حذف کر دیا۔ ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کا دل نرم کرنے کے لیے انھیں ماں کا بیٹا کہہ کر مخاطب کیا، کیونکہ ماں کی جانب والی قربت باپ کی جانب والی قربت سے زیادہ شفقت، نرمی اور پیار کا تقاضا کرتی ہے۔ (شقیلی)

② إِنِّي خَشِيتُ : ہارون علیہ السلام نے سفر جاری نہ رکھنے کا یہ عذر بیان کیا کہ یہ لوگ راستے میں پھنسا رہا کرو ہیں بیٹھ رہنے پر اڑ گئے تھے، اگر میں توحید پر قائم لوگوں کو لے کر آپ کی طرف آتا تو قوم دو حصوں میں بٹ جاتی اور اگر میں انھیں لے کر پھنسا پوجنے والوں سے لڑتا تو پھر بھی دو دھڑے بن جاتے، جن کی ایک دوسرے کو قتل کرنے کی وجہ سے نہ مٹنے والی شدید دشمنی بن جاتی۔ غالب دھڑا پھڑے والوں کا تھا اور وہ اس قدر قوت میں تھے کہ انھوں نے مجھے بالکل کمزور سمجھا اور قریب تھے کہ مجھے قتل کر دیتے، اس لیے میں نے آپ کے آنے کا انتظار کیا، تاکہ آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا انتظار نہ کیا، کیونکہ آپ کے احسانات اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معجزات کی وجہ سے آپ کی بیعت اور آپ کا اکرام ان کے دلوں میں موجود ہے۔ مجھے امید تھی کہ آپ آکر انھیں سنبھال لیں گے۔

③ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ : بعض صلح کل سیاسی حضرات، جو دوٹ لینے کی خاطر بدعتی اور مشرک لوگوں کے سامنے شرک کی تردید سے اجتناب کرتے ہیں، بلکہ قبروں پر چادریں بھی چڑھا دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے اگر شرک کو برداشت کرنا پڑے تو وہ بھی کر لینا چاہیے، مگر پھوٹ ڈال کر سب ضائع کرنے سے بچنا چاہیے۔ ان حضرات نے غور نہیں کیا کہ ہارون علیہ السلام نے شرک کے مقابلے میں کسی نرمی یا سمجھوتے سے کام نہیں لیا، بلکہ انھوں نے صاف الفاظ میں شرک کی تردید، توحید کی تبلیغ اور اپنی اتباع و اطاعت کی تاکید فرمائی۔ دیکھیے آیت (۹۰) اگر وہ شرک کی تردید نہ کرتے تو قوم کو ان کے قتل کے درپے ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ ہاں انھوں نے حالات کو دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کی آمد تک علیحدہ ہونے یا لڑنے کے بجائے ان کے فرمان کا انتظار ضروری سمجھا اور اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

④ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي : اس سے معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی تھی، کیونکہ وہ اگر ڈاڑھی منڈے ہوتے تو انھیں ڈاڑھی پکڑنے کا کیا خوف تھا۔ قرآن مجید کی دوسری آیت ساتھ ملانے سے امت مسلمہ کے ہر فرد پر ڈاڑھی رکھنا فرض ثابت ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ﴾ [الأنعام: ۸۴] "اور اس

بَنِي إِسْرَائِيلَ وَ لَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ﴿٣٧﴾

بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا انتظار نہ کیا ﴿٣٧﴾

(ابراہیم) کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو (ہم نے ہدایت دی)۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے کئی اور پیغمبروں اور ان کے آباء، اولاد اور بھائیوں میں سے ہدایت یافتہ لوگوں کا ذکر کر کے فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِمْ تَقْتَدُونَ﴾ [الأنعام: ۹۰] ”یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی، سو تو ان کی ہدایت کی پیروی کر۔“ نبی ﷺ کو ہارون علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی پیروی کا حکم آپ کی امت کے لیے بھی پیروی کا حکم ہے۔ دیکھیے سورہ ص (۲۳) ڈاڑھی بڑھانا فطرت ہے، کسی نبی سے ڈاڑھی منڈوانا یا کتروانا ثابت نہیں۔ یہود و نصاریٰ ڈاڑھی منڈواتے ہیں تو صرف ہمارے رسول ہی کی نہیں، اپنے پیغمبر کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿عَشْرٌ مِّنَ الْفَطْرَةِ: قَصُّ الشَّارِبِ وَإِعْقَاءُ اللَّحْيَةِ وَالسَّوَاكُ وَاسْتِشْقَاءُ الْمَاءِ وَقَصُّ الْأُظْفَارِ وَغَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَتَنْفُ الْإِبطِ وَحَلَقُ الْعَانَةِ وَانْتِقَاصُ الْمَاءِ، قَالَ زَكَرِيَّا قَالَ مُضْغَبٌ وَنَسِيتُ الْعَاشِرَةَ إِلَّا أَنَّ تَكُونُ الْمُضْمَضَةَ﴾ [مسلم، الطہارۃ، باب حصال الفطرۃ: ۲۶۱] ”دس چیزیں فطرت میں سے ہیں: ① مونچھیں کترنا۔ ② ڈاڑھی بڑھانا۔ ③ مسواک کرنا۔ ④ ناک میں پانی ڈالنا۔ ⑤ ناخن کاٹنا۔ ⑥ پوروں کو دھونا۔ ⑦ بغلوں کے بال اکھیرنا۔ ⑧ زیر ناف صفائی کرنا۔ ⑨ پانی سے استنجا کرنا۔“ زکریا نے کہا کہ حدیث کے راوی مصعب نے کہا کہ میں دسویں چیز بھول گیا، شاید وہ کلی کرنا ہو۔“ مرد اور عورت کے درمیان فرق کی سب سے بڑی ظاہری نشانی ڈاڑھی ہے۔ کسی مرد کے خنصے نکال دیے جائیں تو اس کی ڈاڑھی بھی معدوم ہو جائے گی۔ یہ خلق اللہ (اللہ کی پیدائش) میں شامل ہے، جس کے متعلق شیطان نے قسم کھا کر کہا تھا کہ میں بنی آدم کو حکم دوں گا تو وہ اللہ کی پیدا کردہ شکل کو بدل ڈالیں گے۔ ڈاڑھی بڑھانے کے حکم کی احادیث معروف ہیں: ”أَعْفُوا اللَّحْيَ، أَرْجُوا اللَّحْيَ، وَفَرُّوا اللَّحْيَ، أَوْفُوا اللَّحْيَ“ اور ”لَا تُشَبِّهُوا بِالْمَجْجُوسِ“ اس کے متعلق بہت سی تصانیف موجود ہیں۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کی گھنی ڈاڑھی تھی۔ [مسند أحمد: ۸۹/۱، ح: ۶۸۷، عن علی بن ابی طالب و حسنہ شعب الأرنؤوط] جو آپ کے بے مثال حسن کا حصہ تھی۔ آپ سے ساری زندگی اس کا ایک بال کاٹنا بھی ثابت نہیں۔ صحابہ کرام اور تابعین، جنہوں نے قیصر و کسریٰ کے خزانے فتح کیے اور زمین کے مشرق و مغرب کو اپنا تابع فرمان بنایا، ان میں کوئی ڈاڑھی منڈا نہ تھا۔ افسوس ہے ان مسلمانوں پر! جن کی فطرت اس حد تک مسخ ہو چکی کہ وہ شیطان کے پیچھے لگ کر انبیاء اور صحابہ و تابعین کی وضع اور مردانگی کے اس عظیم شرف سے محروم ہی نہیں ہوئے بلکہ مرد ہوتے ہوئے عورتوں اور مخنثوں والا حلیہ بنا کر اس پر فخر کرنے لگے اور الٹا ڈاڑھی کا مذاق اڑانے لگے، جیسے ناک کئے لوگ ناک والے کو کھوکھنا شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کی اطاعت کی طرف پلٹنے اور اپنی گم کردہ عظمت و مردانگی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

قَالَ فَمَا حَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ

کہا تو اے سامری! تیرا معاملہ کیا ہے؟ ﴿۹۵﴾ اس نے کہا میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں نے نہیں دیکھی، سو میں نے

آیت 95 ﴿۹۵﴾ قَالَ فَمَا حَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ : ہارون علیہ السلام سے جس زہانی اور عملی شدت کے ساتھ سوال ہوا تھا سامری سے سوال کرتے ہوئے وہ شدت نظر نہیں آتی، کیونکہ انہوں پر غصہ زیادہ آتا ہے اور ان کے معقول عذر بیان کرنے پر غصہ ہی نہیں دل کا کلام بھی ختم ہو جاتا ہے، بلکہ ان کے لیے دعا نکلتی ہے۔ چنانچہ ہارون علیہ السلام کی بات سن کر موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلَا تَجْعَلْ لِي فِي رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾ [الأعراف: ۱۵۱] ”اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر لے اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم والا ہے۔“

اس کے برعکس سامری کی بد طبیعتی پہلے ہی معلوم تھی، سو سوال میں وہ شدت نہیں مگر اس کا عذر گناہ سن کر، جو بدتر از گناہ تھا، اسے ایسی سزا سنائی جو شاید کسی کو بھی نہ دی گئی ہو۔ اس کی مثال جنگ تبوک میں تین مخلص مسلمانوں کے لشکر سے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے ان سے بایکاٹ ہے، جس کا نتیجہ ان کے اخلاص و امانت کی بدولت ان کی توبہ کی قبولیت اور قرآن میں ہمیشہ کے لیے ذکر خیر کی صورت میں نکلا۔ اس کے برعکس منافقین کا عذر بظاہر قبول کر لیا جاتا ہے، مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں کسی جنگ میں ساتھ لے جانے، ان کا جنازہ پڑھنے، ان کی قبر پر کھڑا ہونے سے منع کر دیا جاتا ہے اور آخرت کے بدترین عذاب کی نوید سنادی جاتی ہے۔

آیت 96 ﴿۹۶﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ میں نے اس آیت کی تفسیر کے لیے بہت زیادہ تفاسیر کا مطالعہ کیا، کئی اہل علم

سے بھی پوچھا، جو کچھ تفاسیر میں لکھا ہے، میں وہ نقل کرتا ہوں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ“ (میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں نے نہیں دیکھی) یعنی میں نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا، جب وہ فرعون کو ہلاک کرنے کے لیے آئے تو ”فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ“ (سو میں نے رسول کے پاؤں کے نشان سے ایک مٹھی اٹھالی) یعنی جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کے پاؤں کے نشان سے۔ یہی بات بہت سے مفسرین یا زیادہ تر مفسرین کے ہاں مشہور ہے۔“ (ابن کثیر) جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا، اکثر مفسرین نے یہی تفسیر کی ہے، بلکہ بعض نے تو اس کے علاوہ کسی تفسیر کو سلف کی تفسیر سے انحراف قرار دیا ہے، یعنی سامری نے مٹی کی وہ مٹھی پھڑے کے مجھے میں ڈالی تو اس سے گائے کی آواز آنے لگی۔ مگر اس تفسیر کی قرآن، حدیث یا آیات کے سیاق میں کوئی دلیل نہیں۔ شروع سورت سے یہاں تک جبریل علیہ السلام کا کوئی ذکر نہیں کہ الف لام عہد کا مان کر جبریل علیہ السلام مراد لیے جائیں۔ نہ پورے قرآن میں جبریل علیہ السلام کے متعلق ”الرَّسُولِ“ (معرّف باللام) آیا ہے کہ ان کا لقب مان لیا جائے۔ پھر گھوڑی کا تو دور دور تک کچھ پتا نہیں۔ بعض تابعین کے اقوال یہاں دلیل نہیں بن سکتے، کیونکہ نہ وہ موقع پر موجود تھے اور نہ انھوں نے بتایا کہ یہ تفسیر انھوں نے کہاں سے لی۔ اگر انھوں نے پہلی کسی کتاب سے لی ہے،

أَثَرُ الرَّسُولِ فَبَدَّنُهَا وَكَذَلِكَ سَوَّلَتْ لِي تَفْسِيرُ ⑤

رسول کے پاؤں کے نشان سے ایک مٹھی اٹھالی، پھر میں نے وہ ڈال دی اور میرے دل نے اسی طرح کرنا میرے لیے خوشنما بنا دیا ⑤

جیسا کہ ظاہر ہے، تو ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی تصدیق یا تکذیب دونوں سے منع فرمایا ہے۔ شک والی بات علم نہیں ہو سکتی اور نہ قرآن مجید (جس میں کوئی شک نہیں) کی تفسیر شک والی بات کے ساتھ کرنا علم تفسیر ہے۔ اس تفسیر سے پیدا ہونے والے سوالات، مثلاً تمام لوگوں میں سے سامری نے جبریل علیہ السلام کو کیسے پہچانا؟ اسے کیسے معلوم ہوا کہ اس مٹھی میں کیا کرشمہ ہے وغیرہ، سب کے جوابات کے لیے مزید کہانیاں درج کی گئی ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں۔

کئی مفسرین نے ابو مسلم اصفہانی (معزلی) کی تفسیر اختیار کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے جو کچھ فرمایا قرآن میں اس کی صراحت نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی اور توجیہ ہو سکتی ہے کہ ”الرَسُولُ“ سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں اور رسول کے پاؤں کے نشان سے ایک مٹھی پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ میں نے ان کی سنت اور ان کے طریقے سے کچھ حصہ اخذ کیا۔ بعض اوقات آدمی کہتا ہے: ”فَلَانٌ يَفْعُوْ اَثْرَ فُلَانٍ وَ يَفْتَنُ اَثْرَهُ“ ”فلاں شخص فلاں کے نشان قدم کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے نشان قدم کے پیچھے جاتا ہے۔“ جب وہ اس کے طریقے پر چلتا ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب سامری کو ملامت کی اور اس سے قوم کو گمراہ کرنے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا ”بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ“ یعنی مجھے معلوم ہو گیا کہ تم لوگ جس راہ پر ہو وہ حق نہیں تو ”فَقَبَضْتُ قَبْضَةً فِىْ اَثْرِ الرَّسُوْلِ (وَ قَدْ كُنْتُ)“ اس سے پہلے اے رسول! میں نے آپ کے دین اور طریقے کا کچھ حصہ اختیار کیا تھا، ”فَبَدَّنْتُهَا“ پھر میں نے اس طریقے کو پھینک دیا اور اسے چھوڑ کر پھڑے کی پرستش میرے نفس نے میرے لیے خوشنما بنا دی۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے اسے دنیا اور آخرت کے عذاب کی اطلاع دی اور اس نے رسول کو غائب کے صیغے سے اسی طرح ذکر کیا جیسے آدمی اپنے سردار سے گھٹگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ امیر صاحب اس بارے میں کیا فرماتے ہیں اور امیر صاحب کیا حکم دیتے ہیں؟ رہا اس کا موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا منکر ہونے کے باوجود انھیں رسول کہنا، تو وہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے کفار کا قول ذکر فرمایا: ﴿وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نَزَّلَ عَلَيْنَا الذِّكْرَ اذْكَرُ لِمَنْ جَعَلْنَاكَ﴾ [الحجر: ۶] ”اور انھوں نے کہا اے وہ شخص جس پر یہ نصیحت نازل کی گئی ہے! بے شک تو تو دیوانہ ہے۔“ حالانکہ وہ لوگ آپ پر نصیحت کا نزول تسلیم نہیں کرتے تھے۔ رازی لکھتے ہیں کہ ابو مسلم نے جو ذکر کیا ہے وہ تحقیق کے زیادہ قریب ہے اور اس میں (پہلے) مفسرین کی مخالفت کے سوا کوئی خرابی نہیں۔ پھر رازی نے اس کی تائید میں کئی چیزیں ذکر کی ہیں۔ بہت سے بعد میں آنے والے مفسرین نے بھی یہ تفسیر اختیار کی ہے، مگر ”بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ“ کے بعد ”فَقَبَضْتُ قَبْضَةً“ کی تفسیر ”وَ قَدْ كُنْتُ قَبَضْتُ“ کے ساتھ کرنا تکلف ہے، اسی طرح کسی کی پیروی کے لیے ”يَفْعُو“ اور ”يَفْتَنُ اَثْرَهُ“ تو معروف ہے مگر اس

منہوم کے لیے ”يَقْبِضُ قَبْضَةً مِنْ أُثْرِهِ“ کے استعمال کی لغت عرب میں کوئی نظیر نہ ابوسلم نے پیش کی ہے، نہ رازی نے اور نہ بعد میں آنے والے کسی بزرگ نے۔ پہلی تفسیر پر ابوسلم کا اعتراض کہ اس کی قرآن میں تصریح نہیں، اس تفسیر پر بھی وارد ہوتا ہے کہ اس کی تصریح بھی قرآن میں نہیں، محض کھینچ کھانچ کر یہ مطلب نکالا گیا ہے۔

ایک اردو مفسر نے یہ بات نکالی ہے کہ سامری ایک فتنہ پرداز شخص تھا۔ اس نے پھنڑا بنا کر اس میں کسی تدبیر سے پھنڑے کی سی آواز پیدا کر دی۔ پھر مزید جسارت یہ کی کہ خود موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ایک پر فریب داستان گھڑ کر رکھ دی، اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے وہ کچھ نظر آیا جو دوسروں کو نظر نہ آیا تھا اور ساتھ ہی یہ افسانہ بھی گھڑ دیا کہ رسول کے نقش قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے۔ رسول سے مراد ممکن ہے جبریل ہی ہوں، یا اس نے رسول کا لفظ خود موسیٰ علیہ السلام کے لیے استعمال کیا تھا تو یہ اس کی ایک اور مکاری تھی، وہ اس طرح موسیٰ علیہ السلام کو ذہنی رشوت دینا چاہتا تھا۔ (طنص) مگر ساری قوم کے سامنے اس کے جھوٹ پر موسیٰ علیہ السلام جیسے پُر جلال پیغمبر کا ذہنی رشوت لے کر خاموش رہنا اور صرف اسے سزا سنانے پر اکتفا کرنا اور قوم کے سامنے اس کے جھوٹ اور فریب کو واضح نہ کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

ایک اور عقلی بزرگ نے ”بَصَوْتُ بِمَانِهِ يَبْصُرُ وَايَهُ“ کی یہ توجیہ کی ہے کہ اس نے کہا کہ مجھے کشفی مشاہدہ ہوا جو صرف مجھی کو ہوا کہ جبریل علیہ السلام کے آتے ہی میں نے ان کے (یا ان کے گھوڑے کے) نقش قدم سے ایک مٹھی خاک اٹھالی ہے اور ایک پھنڑا بنا کر اس میں ڈال دی ہے، جس سے وہ بولنے لگا، مگر اب آپ کے ڈانٹنے سے معلوم ہوا کہ یہ محض میرے نفس کا دھوکا تھا۔ (طنص) تعجب ہوتا ہے کہ یہ حضرات بات بناتے بناتے کہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دیکھنے کی تفسیر کشفی مشاہدہ قادیانی طرز تفسیر کے سوا کچھ نہیں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام قوم کے سامنے اس فریب کا پردہ چاک نہ کریں؟ مجھے تو سلامتی اسی میں نظر آتی ہے کہ جس آیت کی تفصیل قرآن مجید کے الفاظ سے واضح نہ ہو اور نہ رسول اللہ ﷺ سے آئی ہو، اہل کتاب کی کسی روایت پر یقین کرنے یا زبردستی کوئی مطلب نکالنے کے بجائے تشابہات میں سے سمجھ کر اس پر مجمل ایمان رکھا جائے اور اس کی تفصیل اللہ کے سپرد کر دی جائے، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ [آل عمران: ۷] ”وہی ہے جس نے تجھ پر یہ کتاب اتاری، جس میں کچھ آیات محکم ہیں، وہی کتاب کی اصل ہیں اور کچھ دوسری کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں، پھر جن لوگوں کے دلوں میں توکھی ہے وہ اس میں سے ان کی پیروی کرتے ہیں جو کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں، فتنے کی تلاش کے لیے اور ان کی اصل مراد کی تلاش کے لیے، حالانکہ ان کی اصل مراد نہیں جانتا مگر اللہ اور جو علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر جو عقلموں والے ہیں۔“ آخر ہم حروف مقطعات، اللہ تعالیٰ کی صفات، سداذ القرنین، دابۃ الارض،

قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَنْ تُخْلَفَهُ،
وَأَنْظُرْ إِلَى إِلْهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۝

کہا پس جا کہ بے شک تیرے لیے زندگی بھر یہ ہے کہ کہتا رہے ”ایک دوسرے کو چھوٹا نہیں“ اور بے شک تیرے لیے
ایک اور بھی وعدہ ہے جس کی خلاف ورزی تجھ سے ہرگز نہ کی جائے گی اور اپنے معبود کو دیکھ جس پر تو مجاور بنا رہا،
یقیناً ہم اسے ضرور اچھی طرح جلا دیں گے، پھر یقیناً اسے ضرور سمندر میں اڑا دیں گے، اڑانا اچھی طرح ۝

یا جوج ماجوج اور قرآن مجید کی کتنی ہی باتوں کی تفصیل نہیں جانتے، مگر ہمارا ان پر ایمان ہے۔ سامری کے جواب کی تفصیل میں
اگر ہمارا کوئی فائدہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور ذکر فرما دیتا۔ سو ہمارا ایمان ہے کہ اگرچہ ہم تفصیل نہیں جانتے مگر جو ہمارے
رب نے فرمایا وہ حق ہے۔

آیت 97 ① قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ: ”مِسَاسَ“ ”فَاتِلُ يُفَاتِلُ مُفَاتِلَةٌ وَفَاتِلًا“ کی طرح باب مفاعله
کا مصدر ہے جس میں مشارکت پائی جاتی ہے، یعنی ایک دوسرے کو چھوٹا، ہاتھ لگانا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ زندگی بھر کے
لیے ایسی بیماری اور عذاب میں مبتلا ہوا کہ وہ کسی کو ہاتھ لگاتا یا کوئی اسے ہاتھ لگاتا، دونوں صورتوں میں اسے شدید تکلیف ہوتی،
جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ وہ اس سے بچنے کے لیے خود ہی کہتا پھرتا کہ نہ میں تمہیں ہاتھ لگاتا ہوں اور نہ تم مجھے
ہاتھ لگاؤ۔ بعض تابعین نے کہا ہے کہ ہاتھ لگنے کی صورت میں سامری اور دوسرے شخص دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا، مگر انھوں
نے اس خبر کا ذریعہ نہیں بتایا۔ زندگی ہی میں تمام انسانوں سے اس کا تعلق کاٹ دیا گیا اور وہ تنہائی کے بدترین عذاب میں مبتلا
ہو گیا۔ اس کے عمل سے سزا کی مناسبت اللہ علم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ گائے کی آواز والا پھڑپھڑانا اسے معبود کی صورت میں
پیش کرنے سے اس کا مقصد شہرت اور لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے کی خواہش تھی، اللہ تعالیٰ نے ایسی سزا دی کہ کسی ایک شخص
سے بھی نزل سکے۔

② وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَنْ تُخْلَفَهُ: مراد موت، قبر اور آخرت کا عذاب ہے۔

③ وَأَنْظُرْ إِلَى إِلْهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا: ”ظَلَّ يَظُلُّ“ (ع) سے واحد مذکر حاضر ہے، جو اصل میں ”ظَلَلْتُ“ تھا
(پہلے لام کے کسرہ کے ساتھ)، بولنے میں دشواری ختم کرنے کے لیے پہلا لام حذف کر دیا گیا۔ وزن ”فَعَلْتُ“ کے بجائے
”فَلْتُ“ رہ گیا۔ ”لَنُحَرِّقَنَّهُ“ جلانے میں شدت کے اظہار کے لیے باب تفعیل استعمال ہوا ہے۔ ”نَسْفٌ يَنْسِفُ نَسْفًا“
(ض) اڑانا، بکھیرنا۔ ”النِّسْجُ“ نمکین سمندر اور پیٹھے دریا دونوں معنوں میں آتا ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ سونے یا چاندی
کے پھڑے کو آگ میں جلانے سے وہ دھات اڑانے اور بکھیرنے کے قابل تو نہیں ہوتی بلکہ زیادہ خالص اور مضبوط ہو جاتی
ہے۔ اس کا جواب بعض مفسرین نے یہ دیا ہے کہ وہ گوشت پوست کا پھڑا بن گیا تھا، مقصد یہ تھا کہ ہم اسے ذبح کر کے اچھی

إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

تمہارا معبود تو اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے ﴿۹۸﴾

طرح جلا کر دریا یا سمندر میں اڑا کر بکھیر دیں گے، مگر گوشت پوست کا پھنڑا بننے کی بات بالکل بے اصل ہے۔ دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہم اسے خوب گرم کریں گے، تاکہ وہ نرم ہو جائے، پھر ریتی کے ساتھ اسے ذرہ ذرہ کر کے دریا میں بکھیر دیں گے، مگر قرآن مجید میں ریتی کا ذکر نہیں۔ اس لیے بعض مفسرین نے فرمایا کہ ”حَرْقٌ يَحْرُقُ“ (ن) کا معنی پینا بھی آتا ہے اور باب تفعیل میں مزید مبالغہ ہو گیا۔ یہ جواب بھی زبردستی پر مبنی ہے، کیونکہ ”تَحْرِيقٌ“ کا معنی جلاتا ہی آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل سے مجھے اس کا بالکل واضح جواب مل گیا، وہ یہ کہ حکیم جس دھات کا چاہتے ہیں کشتہ بنا لیتے ہیں، جو راکھ کی صورت میں اتنا باریک ہو جاتا ہے کہ بھونک سے اڑ جاتا ہے۔ اطباء کو انبیاء کے کمال سے تو کوئی نسبت ہی نہیں، لہذا ان کے لیے دھات کو راکھ بنانا کیا مشکل ہے؟

﴿۹۸﴾ موسیٰ علیہ السلام کا عمل اس بات کی دلیل ہے کہ غیر اللہ کی عبادت کے لیے جو چیز بھی استعمال ہو رہی ہو اسے مسمار کرنا، جلاتا اور اس کا نام و نشان مٹا دینا لازم ہے، خواہ وہ کوئی بت ہو یا درخت یا قبر۔ ابو الہیاج اللاسدی (علی رضی اللہ عنہما کے داماد) فرماتے ہیں کہ مجھے علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: «أَلَا أُبْعَثُكَ عَلَيَّ مَا بَعَثَنِي عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ لَا تَدْعَ بَشَرًا إِلَّا أَطْمَسْتَهُ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَّيْتَهُ» [مسلم، الحناجز، باب الأمر بتسوية القبر: ۹۶۹] ”کیا میں تمہیں اس کام پر نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا؟ وہ یہ ہے کہ کسی مجھے کو نہ چھوڑ دے جسے مٹا نہ دو اور کسی اونچی قبر کو نہ چھوڑ دے جسے برابر نہ کر دو۔“ اللہ کی شان دیکھیے، اونچی قبریں برابر کرنے پر علی رضی اللہ عنہما کو مقرر فرمایا جنہیں تمام قبر پرست، اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی دنیوی و اخروی ذلت و رسوائی کا باعث اہل کتاب کی پیروی میں قبر پرستی اور شرک کی دوسری صورتوں میں مبتلا ہونا اور توحید سے منہ موڑنا ہے۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اپنی توحید کی طرف پلٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) «لِحَرْقَاتِكُمْ» اور «لِنَسْفَتِكُمْ» میں لام تاکید اور نون ثقیلہ کے ساتھ اور پھر ”نَسْفًا“ مفعول مطلق کے ساتھ تاکید کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہر صورت اسے جلائیں گے اور ہر صورت دریا میں اڑا کر بکھیریں گے۔ کسی طرح ایسا کرنے سے نہیں ملیں گے، خواہ کوئی مقابلے پر آ جائے، یا منت و سماجت کرے، یا اپنے اس معبود کے غیظ و غضب سے ڈراتا رہے، یہ کام ہو کر رہے گا۔

آیت 98 ﴿۹۸﴾ إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا یہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے جنہوں نے سامری سے خطاب کے بعد اپنی امت کے لوگوں کو مخاطب فرمایا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے معبود بحق ہونے کی دو دلیلیں بیان ہوئی ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ اس صفت میں ساری صفات آ جاتی ہیں، تفصیل اس کی علم کلام کی کتابوں میں ”لا الہ الا اللہ“ کی تشریح میں مذکور ہے۔ دوسری دلیل خاص صفت علم ہے جس کے گھیرے سے کوئی چیز باہر نہیں۔ ”وَسِعَ“

كَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءٍ مَا قَدْ سَبَقَ ۗ وَ قَدْ آتَيْنَكَ مِنْ لَدُنَّا ذِكْرًا ۗ مَنْ
أَعْرَضَ عَنْهُ فَإِنَّهُ يَخِلُّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِلاًا ۚ خُلِدِينَ فِيهِ ۗ وَسَاءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
حِطًّا ۗ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ ۚ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ۗ

اسی طرح ہم تجھ سے کچھ وہ خبریں بیان کرتے ہیں جو گزر چکیں اور یقیناً ہم نے تجھے اپنے پاس سے ایک نصیحت عطا کی ہے (۹۹) جو اس سے منہ پھیرے گا تو یقیناً وہ قیامت کے دن ایک بڑا بوجھ اٹھائے گا (۱۰۰) ہمیشہ اس میں رہنے والے ہوں گے اور وہ ان کے لیے قیامت کے دن برا بوجھ ہوگا (۱۰۱) جس دن صور میں پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس دن اس حال میں اکٹھا کریں گے کہ نیلی آنکھوں والے ہوں گے (۱۰۲)

کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ گھبراہٹ والی چیز میں اس کے اندر والی چیز سے زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔ (ابن عاشور) جو ”مُخْلِ شَيْءٍ“ سے بھی وسیع ہے، اس کی وسعت کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟

آیت 99 كَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ یعنی جیسے ہم نے آپ کو موسیٰ علیہ السلام، بنی اسرائیل، فرعون اور اس کی قوم کے حالات بتائے ہیں، ایسے ہی ہم آپ کو ان چیزوں کی کچھ خبریں سناتے ہیں جو آپ سے پہلے گزر چکیں۔ جنہیں نہ آپ نے دیکھا تھا اور نہ آپ کو کیا آپ کی قوم کو ان کا علم تھا۔ دیکھیے ہود (۴۹) ان سے مقصود محض وقت گزاری یا لطف اٹھانا نہیں بلکہ مقصود نصیحت ہے اور ہم نے اپنے پاس سے آپ کو یہ عظیم نصیحت عطا کی ہے۔ اس عظیم نصیحت سے مراد وحی الہی کے ذریعے سے نازل ہونے والی کتاب و حکمت (قرآن و سنت) ہے۔ اس کے سوا بڑے سے بڑے آدمی کی بات نہ اللہ کے پاس سے ہے اور نہ اس پر عمل کی اجازت ہے۔ دیکھیے سورہ اعراف (۳) ”ذِكْرًا“ کی توین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”عظیم نصیحت“ کیا ہے اور ”مِنْ“ تعمیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”کچھ خبریں“ کیا ہے، تمام خبریں سننے کی نہ ضرورت ہے اور نہ سنی جاسکتی ہیں۔ ”مَا“ اکثر غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے، اس لیے ترجمہ ان لوگوں کے بجائے ”ان چیزوں کی کچھ خبریں“ کیا گیا ہے، ”ان احوال کی کچھ خبریں“ بھی ترجمہ ہو سکتا ہے۔

آیت 100, 101 مَنْ أَعْرَضَ عَنْهُ : منہ پھیرنے سے مراد اس نصیحت پر ایمان نہ لانا اور عمل نہ کرنا ہے۔ ”وَزُرًّا“ پر تنوین تعظیم و تہویل کے لیے ہے، بڑا بوجھ، بھاری بوجھ۔ ”حِطًّا“ بمعنی ”مَحْمُولٌ“ ہے، جیسے ”ذُبْحٌ“ بمعنی ”مَذْبُوحٌ“ ہے، اٹھایا ہوا (بوجھ)۔ ”سَاءٌ“ فعل ذم ہے، جس کا قائل ضمیر مبہم ”هُوَ“ ہے اور جس کے ابہام کی توضیح ”حِطًّا“ تیز کے ساتھ کی گئی ہے۔

آیت 102 يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ : یہ پچھلی آیات میں مذکور ”يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ سے بدل ہے جو قیامت کے دن کی وضاحت کر رہا ہے۔ ”الصُّورِ“ کی تشریح کے لیے دیکھیے سورہ انعام (۷۳) اور کہف (۹۹)۔ ”زُرْقًا“ ”أَزْرَقِي“ کی جمع ہے،

يَتَخَفَتُونَ بَيْنَهُمْ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا عَشْرًا ۖ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ إِذْ يَقُولُ أَمْثَلُهُمْ
طَرِيقَةً إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا يَوْمًا ۗ وَ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ۖ
فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۙ

آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے ہوں گے تم دس راتوں کے سوا نہیں ٹھہرے ۖ ہم زیادہ جاننے والے ہیں جو کچھ وہ کہہ رہے ہوں گے، جب ان کا سب سے اچھے طریقے والا کہہ رہا ہوگا کہ تم ایک دن کے سوا نہیں ٹھہرے ۖ اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھیں گے تو کہہ دے میرا رب انہیں اڑا کر بکھیر دے گا ۖ پھر انہیں ایک چٹیل میدان بنا کر چھوڑے گا ۙ

جس کا معنی نیلے رنگ والا ہے۔ یہاں اس کے دو معنی مراد ہو سکتے ہیں، ایک نیلے جسم اور نیلے چہروں والے، مراد سیاہ رنگ والے، کیونکہ جلی ہوئی جلد نیلگوں کالی ہو جاتی ہے۔ اس کی ہم معنی آیت کے لیے دیکھیے سورہ آل عمران (۱۰۶)۔ دوسرا معنی ”اندھے“ ہے، کیونکہ بہت نیلی آنکھ اندھے آدمی کی ہوتی ہے، یعنی قیامت کے دن اندھے اٹھائے جائیں گے، اس کی ہم معنی آیت کے لیے دیکھیے سورہ طہ (۱۲۴، ۱۲۵)۔ طبری نے صرف یہی معنی بیان فرمایا ہے۔

آیت 103: يَتَخَفَتُونَ بَيْنَهُمْ اسے عدد میں قاعدہ ہے کہ تین سے دس تک کی گنتی میں اگر کوئی چیز مذکر ہو تو عدد مؤنث آئے گا اور اگر کوئی چیز مؤنث ہو تو عدد مذکر ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَتَلَمِيذًا أَيَّامًا خُصُومًا﴾ [الحاقة: ۷] ”اس نے اس (آدمی) کو ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلائے رکھا۔“ اس لیے یہاں ”عَشْرًا“ کا معنی دس راتیں ہوگا۔ ”تَخَافَتُ“ (تفاعل) کا معنی خوف وغیرہ کی وجہ سے آہستہ آواز سے بات کرنا ہے۔ ان کی یہ حالت قیامت کی ہولناکی کی وجہ سے ہوگی۔

آیت 104: نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ ”أَمْثَلُ“ بمعنی ”أَفْضَلُ“ ہے۔ ”الْمَثَالَةُ“ یعنی ”الْفَضْلُ“۔ ”طَرِيقَةً“ سب سے اچھے طریقے والا سے مراد یہاں سب سے اچھی رائے والا ہے۔ اسے زیادہ اچھی رائے والا اور عقل مند اس لیے فرمایا کہ اس نے دنیا کے عارضی اور ختم ہونے کو اور آخرت کے ہمیشہ اور باقی رہنے کو دوسروں سے زیادہ سمجھا، اس لیے اس نے کہا کہ دس راتیں کہاں، تم تو ایک دن سے زیادہ دنیا میں نہیں ٹھہرے۔ طبری نے فرمایا کہ قیامت کی ہولناکی انہیں دنیا کا عیش و عشرت ایسا بھلائے گی کہ وہ دنیا میں رہنے کی صحیح مدت بھی نہیں بتا سکیں گے۔ دیکھیے سورہ مومنون (۱۱۴ تا ۱۱۴) اور روم (۵۵)۔

آیت 105-106: ① وَ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ : قرطبی نے فرمایا کہ قرآن مجید میں جہاں بھی کسی سوال کا ذکر آیا ہے اس کے لیے جواب میں ”قُلْ“ کا لفظ آیا ہے۔ صرف اس مقام پر فاء کے ساتھ ”فَقُلْ“ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے تمام مقامات پر ان سوالات کا جواب ہے جو ہو چکے تھے، یہاں فاء اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آئندہ ہونے والے

لَا تَرَى فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ۗ يَوْمَئِذٍ تَتَذَكَّرُونَ الذَّالِمِينَ لَا عِوَجَ لَهُ ۗ وَخَشَعَتِ
الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَسًا ۝

جس میں تو نہ کوئی کجی دیکھے گا اور نہ کوئی ابھری جگہ ۝ اس دن وہ پکارنے والے کے پیچھے چلے آئیں گے، جس کے لیے کوئی کجی نہ ہوگی اور سب آوازیں رحمان کے لیے پست ہو جائیں گی، سو تو ایک نہایت آہستہ آواز کے سوا کچھ نہیں سنے گا ۝

سوال کا جواب دیا کہ ”فَإِنْ سَأَلْتَهُ فَقُلْ.....“ یعنی اگر وہ تجھ سے پوچھیں تو کہہ دینا..... یعنی فاء دلیل ہے کہ اس سے پہلے شرط محذوف ہے۔

۲) فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا... : صور چھوٹنے کے ساتھ قیامت قائم ہونے اور تمام لوگوں کے جمع کرنے کے ذکر پر منکرین قیامت کی طرف سے سوال آنے والا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب پہلے ہی دے دیا کہ ان کے خیال میں اتنے بلندو بالا اور محکم پہاڑوں کو ان کی جگہ سے کوئی بلا نہیں سکتا، اس لیے وہ پوچھیں گے کہ ان پہاڑوں کا کیا بنے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ پوچھیں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ میرا رب انہیں اڑا کر بکھیر دے گا۔ ”يَنْسِفُهَا“ کی تاکید ”نَسْفًا“ کے ساتھ فرمائی، تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ”يَنْسِفُ“ اپنے اصل معنی میں نہیں ہے بلکہ مجاز ہے۔ یعنی فی الحقیقت اللہ تعالیٰ انہیں ریزہ ریزہ کر کے اڑا دے گا۔ پہاڑوں پر گزرنے والی حالتوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ نبا (۲۰) کی تفسیر۔ ”قَائِلًا“ میدان۔ ”صَفْصَفًا“ ہموار۔

آیت 107 : لَا تَرَى فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا : ”عِوَجًا“ کجی، مراد نیچی جگہ ہے۔ ”أَمْتًا“ معمولی ابھری ہوئی جگہ، یعنی ہر بلندی اور پستی، حتیٰ کہ سمندروں کی گہرائی اور پہاڑوں کی بلندی ختم ہو کر پوری زمین بائبل ہموار ہو جائے گی، جس میں ذرہ برابر نیچی یا اونچی جگہ دکھائی نہ دے گی۔

آیت 108 : ۱) يَوْمَئِذٍ تَتَذَكَّرُونَ الذَّالِمِينَ..... : یعنی قیامت کے دن سب لوگ حشر کے لیے قبروں سے نکل کر پکارنے والے کی آواز کی طرف نہایت تیزی کے ساتھ سر اٹھائے ہوئے دوڑتے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَمِنْطِقِينَ مَفْجَعِينَ زُؤُوسِهِمْ﴾ (ابراہیم: ۴۳) ”اس حال میں کہ تیز دوڑنے والے، اپنے سروں کو اوپر اٹھانے والے ہوں گے۔“ اس کی طرف جانے میں کوئی کجی نہ ہوگی، یعنی تیر کی طرح سیدھے جائیں گے اور ذرہ بھر ادھر ادھر نہ ہوں گے۔ اس حالت کا نقشہ سورہ ابراہیم (۴۲)، (۴۳)، سورہ قمر (۸۵، ۸۶) اور سورہ ق (۳۱، ۳۲) میں دیکھیے۔ ”لَا عِوَجَ لَهُ“ کا دوسرا معنی یہ ہے کہ پکارنے والے کی پکار میں کوئی کجی نہ ہوگی کہ کسی تک پہنچے اور کسی تک نہ پہنچے، ہر شخص تک سیدھی پہنچے گی۔

۲) وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ... : یعنی اتنی بے شمار مخلوق کے دوڑنے اور اکٹھے ہونے پر کوئی شور و غل نہ ہوگا۔ سب آوازیں رحمان کے لیے پست ہو جائیں گی۔ ”رحمان“ کے لیے پست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس بے حد رحم والے رب کی رحمت اور

يَوْمِيذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أِذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَ رَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾ يَعْلَمُ مَا
بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴿١١٠﴾

اس دن سفارش نفع نہ دے گی مگر جس کے لیے رحمان اجازت دے اور جس کے لیے وہ بات کرنا پسند فرمائے ﴿۱۰۹﴾ وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے ﴿۱۱۰﴾

اس کے کرم کی طلب میں سب عاجزی سے خاموش ہوں گے۔ ”هَسْنَا“ ہلکی سے ہلکی آواز یا قدموں کی ہلکی سے ہلکی آہٹ، تھکسکھاہٹ۔

آیت 109 ﴿١٠٩﴾ يَوْمِيذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ : اس آیت میں اس دن کی مزید ہیبت اور عظمت بیان ہوئی ہے کہ مشرکین کا کہنا کہ ہمارے معبود ہماری سفارش کر کے ہمیں بچالیں گے، بالکل غلط ہے۔ وہاں کوئی سفارش نفع نہ دے گی۔

﴿٢﴾ إِلَّا مَنْ أِذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ : اس کے دو مطلب ہیں، دونوں مراد ہیں اور دونوں کی تائید آیات قرآن سے ہوتی ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ نہایت مختصر لفظوں میں بہت زیادہ معانی ہوتے ہیں۔ ایک معنی یہ ہے کہ اس دن سفارش نفع نہ دے گی مگر اس کی جس کو رحمان سفارش کرنے کی اجازت دے اور جس کے بات کرنے کو پسند فرمائے۔ دوسرا یہ کہ اس دن سفارش نفع نہ دے گی مگر اس کو جس کے حق میں رحمان سفارش کی اجازت دے اور جس کے حق میں بات کرنے کو پسند فرمائے۔ دیکھیے سورہ مریم (۸۷)، سبا (۲۳)، زخرف (۸۶)، نجم (۲۶) اور نبا (۲۸)۔

آیت 110 ﴿١١٠﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ : دیکھیے آیت الکرسی (بقرہ: ۲۵۵) کی تفسیر۔

﴿٢﴾ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا : ”پہ“ کی ضمیر کے مرجع کے لحاظ سے اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں اور تینوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ ”پہ“ میں ”ہ“ ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے قرار دی جائے۔ معنی یہ ہوگا کہ کسی کا علم اتنا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا احاطہ کر سکے، مخلوق کا محدود علم خالق کا احاطہ کیسے کر سکتا ہے؟ دوسرا یہ کہ یہ ضمیر ”يعلمهم“ کے مصدر ”علمتم“ کے لیے قرار دی جائے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کوئی شخص اللہ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا اور اس صورت میں یہ آیت الکرسی کے جملہ ”وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ“ کا ہم معنی ہوگا۔ تیسرا یہ ہے کہ ”ہ“ ضمیر ”مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ“ میں موجود ”مَا“ کی طرف لوٹ رہی ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان میں سے کسی کا علم بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتا، جو لوگوں کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو (چاہے وہ فرشتے ہوں یا جن یا انسان یا کوئی اور) لوگوں کے اگلے پچھلے حال کا پورا علم نہیں ہے کہ جان سکیں کہ کس کے حق میں شفاعت کرنی چاہیے اور کس کے حق میں نہیں کرنی چاہیے، اس لیے شفاعت کو اللہ تعالیٰ کے اذن (اجازت) پر موقوف رکھا گیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تشبیہ ہے جو فرشتوں یا انبیاء و اولیاء اور بزرگوں کی پرستش اس امید پر کرتے ہیں کہ وہ قیامت کے دن ہماری سفارش کریں گے۔

وَعَنْتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ ۗ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿١١١﴾ وَ مَنْ يَعْمَلْ مِنَ
الضَّالِحَاتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخْفُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا ﴿١١٢﴾

اور سب چہرے اس زندہ رہنے والے، قائم رکھنے والے کے لیے جھک جائیں گے اور یقیناً ناکام ہوا جس نے بڑے ظلم کا بوجھ اٹھایا ﴿۱۱۱﴾ اور جو شخص کچھ نیک اعمال کرے اور وہ مومن ہو تو وہ نہ کسی بے انصافی سے ڈرے گا اور نہ حق تلفی سے ﴿۱۱۲﴾

آیت 111 ﴿١١١﴾ وَعَنْتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ : ”عَنْتِ“ ”عَنْتَا يَعْنُو عُنُوًّا“ (ن) سے واحد مؤنث غائب، ماضی معلوم ہے، اصل میں ”عَنْوَتْ“ تھا، ذلیل اور عاجز ہو کر جھک جانا۔ اس میں سے اسم فاعل ”عَانٍ“ یا ”الْعَانِي“ آتا ہے، جس کا معنی قیدی ہے، کیونکہ قیدی بے حد عاجز، بے بس اور ذلیل ہوتا ہے۔ یعنی اس دن صرف تمام آوازیں ہی رحمان کے لیے پست نہیں ہوں گی بلکہ تمام چہرے، حتیٰ کہ ان سرکش متکبر لوگوں کے چہرے بھی اس حی و قیوم کے سامنے ذلیل قیدیوں کی طرح جھکے ہوں گے جن کی پیشانی دنیا میں کبھی اللہ کے سامنے جھکی نہ تھی۔ کیونکہ وہ سب فانی و محتاج ہیں اور انھیں حی و قیوم کے سامنے جھکے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ ”لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ“ کی تفسیر آیت الکرسی (بقرہ: ۲۵۵) میں دیکھیے۔

﴿١١٢﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا: یہاں ”ظُلْمًا“ پر تین تعظیم کی ہے، اس لیے ترجمہ ”بڑے ظلم کا بوجھ اٹھایا“ کیا ہے۔ بڑے ظلم سے مراد مشرک ہونا اور مسلمان نہ ہونا ہے۔ (طبری) اس کا ترجمہ ”کسی ظلم کا بوجھ اٹھایا“ درست نہیں، کیونکہ گناہ گار مومن و موحد سزا پا کر یا سزا کے بغیر اللہ کے اذن سے جنت میں چلے جائیں گے اور جنت میں پہنچ جانے والا ناکام نہیں۔ دلیل اور تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ انعام (۸۴)، بقرہ (۲۵۴) اور یونس (۱۰۶) کی تفسیر۔

آیت 112 ﴿١١٢﴾ وَ مَنْ يَعْمَلْ مِنَ الضَّالِحَاتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ : ”مِنَ الضَّالِحَاتِ“ میں ”مِنَ“ تبعیض کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”کچھ نیک اعمال“ کیا ہے۔ انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے تمام اعمال صالحہ تو کر ہی نہیں سکتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿كَانَ لَنَا يَفْقُضُ مَا أَمَرَدُ﴾ [عبس: ۲۳] ”ہرگز نہیں، ابھی تک اس نے وہ کام پورا نہیں کیا جس کا اس نے اسے حکم دیا۔“ اس لیے وہ اتنے عمل ہی کا مکلف ہے جتنی اس میں طاقت ہے، فرمایا: ﴿لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرہ: ۲۸۶] ”اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔“ اور فرمایا: ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن: ۱۶] ”سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔“ مفسرین نے اس سے مراد فراموش لیے ہیں۔

﴿١١٢﴾ عمل کی قبولیت کے لیے دو شرطیں بیان فرمائیں۔ عمل کا صالح ہونا یعنی کتاب و سنت کے مطابق ہونا اور عمل کرنے والے کا صاحب ایمان ہونا۔ نہ کافر کا کوئی عمل قبول ہے اور نہ وہ عمل جو کتاب و سنت سے ثابت نہ ہو۔ دیکھیے سورۃ کہف کی آخری آیت۔ ﴿١١٢﴾ فَلَا يَخْفُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا: بے انصافی یہ ہے کہ کسی کو ان گناہوں پر سزا دی جائے جو اس نے نہیں کیے اور حق تلفی یہ ہے کہ کسی کو ہولی نیکیوں پر پانی پھیر دیا جائے۔ اسی کو سورۃ جن (۱۳) میں ”بَحْسًا“ اور ”زَهْقًا“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے

وَ كَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَ صَرَفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعَلَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ

اور اسی طرح ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا اور اس میں ڈرانے کی باتیں پھیر پھیر کر بیان کیں، شاید کہ وہ ڈر جائیں، یا یہ ان کے لیے کوئی نصیحت پیدا کر دے ﴿۱۱۳﴾ پس بہت بلند ہے اللہ جو حقیقی بادشاہ ہے، اور قرآن پڑھنے میں متعدد آیات میں جزا و سزا میں عدل و انصاف کا اعلان کیا ہے، مگر گناہ گار مومنوں کو معاف کر دینا فضل ہے جو عدل کے منافی نہیں۔

آیت ۱۱۳ ﴿۱﴾ وَ كَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا : ”اسی طرح“ کا اشارہ اس سورت میں مذکور آیات کی طرف ہے کہ ہم نے پورا قرآن ہی ان آیات کی طرح نازل کیا ہے۔ ”قُرْآنًا عَرَبِيًّا“ کی تفسیر سورۃ یوسف (۲) میں دیکھیے۔

﴿۲﴾ وَ صَرَفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ: یعنی بار بار اور مختلف طریقوں کے ساتھ دینا اور آخرت میں اپنی گرفت اور عذاب سے ڈرایا ہے۔

﴿۳﴾ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ..... : تاکہ وہ ڈر جائیں، یا کم از کم یہ ان کے دل میں کسی طرح کی عبرت و نصیحت پیدا کر دے اور وہ سوچیں کہ پچھلی امتوں کا کیا انجام ہوا؟ اگر ہم بھی گناہ کریں گے تو انھی کی طرح تباہ و برباد ہوں گے۔ (ابن کثیر) ”ذِكْرًا“ کی تئوین تکمیر کی وجہ سے ”کسی طرح کی نصیحت“ ترجمہ کیا ہے۔

آیت ۱۱۴ ﴿۱﴾ فَتَعَلَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ.....: ”فَتَعَلَى“ ”عَلَا يَعْلُو عُلُوًّا“ بلند ہونا۔ باب تفاعل میں تاء اور الف کے اضافے سے معنی میں مبالغہ پیدا ہو گیا ”پس بہت بلند ہے۔“ ”الْمَلِكُ الْحَقُّ“ ”حَقٌّ يَجُوقُ“ ثابت ہونا۔ لفظ حق باطل کے مقابلے میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی حقیقی، سچی اور پائدار ہے۔ دوسرے تمام بادشاہ دنیا میں نہایت محدود اختیارات کے مالک ہیں اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی سے، وہ نہ چاہے تو کچھ بھی نہیں کر سکتے اور آخرت میں ان کے وہ اختیار بھی ختم ہو جائیں گے۔ پھر اس میں کیا شک ہے کہ حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہی ہے اور باقی سب باطل ہیں۔

سروری زبیا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے حکمران ہے اک وہی باقی بتان آزری صحیح بخاری (۱۱۴۰) میں تہجد کے لیے اٹھتے وقت رسول اللہ ﷺ کی ایک لمبی دعا مذکور ہے، اس دعا میں ہے: «وَلِلَّهِ الْحَمْدُ أَنْتَ الْحَقُّ وَ وَغَدُكَ الْحَقُّ، وَ لِقَاءُكَ حَقٌّ» دعاؤں کی کسی کتاب یا اصل صحیح بخاری سے یہ مکمل دعا یاد کر لیں، یہ دعا تہجد کے وقت پڑھنا مسنون اور بے حد برکت کا باعث ہے۔

﴿۲﴾ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ.....: یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ قیامہ (۱۹۴-۱۶) میں بیان ہوا ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک دفعہ جلدی کرنے اور جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھنے سے منع فرما دیا، تو دوبارہ اس حکم کی کیا ضرورت تھی؟ شاہ عبدالقادر برہنہ نے اسے یوں حل فرمایا ہے: ”جبریل جب قرآن لاتے آپ ﷺ ان کے پڑھنے کے ساتھ پڑھنے لگتے کہ بھول نہ جاویں۔ اس کو پہلے منع فرمایا تھا سورۃ قیامہ میں اور تسلی کر دی تھی کہ اس کا یاد رکھنا اور لوگوں تک پہنچانا ذمہ ہمارا ہے، لیکن بندہ بشر ہے، شاید بھول گئے ہوں، پھر تنقید کیا اور بھولنے پر مثل فرمائی آدم علیہ السلام کی۔“ (موضح)

يُقْضَى إِلَيْكَ وَحْيُهُ ۖ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ﴿٣١﴾

جلدی نہ کر، اس سے پہلے کہ تیری طرف اس کی وحی پوری کی جائے اور کہہ اے میرے رب! مجھے علم میں زیادہ کر ﴿٣١﴾

﴿٣١﴾ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا: رسول اللہ ﷺ کے جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ جلدی پڑھنے کے پیچھے اصل جذبہ زیادہ سے زیادہ علم کے حصول اور حفظ کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف جلدی کرنے سے منع فرمایا، مگر اصل جذبے کی تعریف کی اور اس کی تکمیل کے لیے دعا سکھائی، جیسا کہ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھاتے ہوئے رکوع کی حالت میں پایا تو صف میں بیٹنے سے پہلے ہی رکوع میں چلے گئے اور پھر اسی حالت میں رکوع میں مل گئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «زَاذَكَ اللَّهُ حِرْصًا وَلَا تَعُدُّ» [بخاری، الأذان، باب إذا ركع دون الصف: ٧٨٣] "اللہ تمہاری حرص زیادہ کرے اور دوبارہ ایسا نہ کرنا۔" دوبارہ ایسی جلدی سے منع کرنے کے ساتھ نیکی میں حرص کی تعریف فرمائی۔ "رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا" میں "عِلْمًا" عام ہے اور اس سے مراد علم نافع ہے۔ دین یعنی قرآن و حدیث کا علم ہو یا دنیا کا ایسا علم جو دنیا و آخرت دونوں میں نافع ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے: «اللَّهُمَّ أَنْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي وَ عَلَّمْتَنِي مَا يَنْفَعُنِي وَ زِدْنِي عِلْمًا» [ترمذی، الدعوات، باب سبق المفردون...: ٣٥٩٩، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَ صَحَّحَهُ الألبانی] "اے اللہ! مجھے اس کے ساتھ نفع دے جس کا تو نے مجھے علم دیا اور مجھے اس کا علم دے جو مجھے نفع دے اور مجھے علم میں زیادہ کر۔" انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کی اکثر دعائیں تھیں: «اللَّهُمَّ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ فِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ» [بخاری، الدعوات، باب قول النبي ﷺ: رَبَّنَا آتِنَا...: ٦٣٨٩] "اے اللہ! اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھلائی عطا کر اور ہمیں دوزخ سے بچا۔" مسلمانوں پر دنیا کی ہر ضرورت کا علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، تاکہ انھیں غیر مسلموں کا محتاج نہ ہونا پڑے اور وہ دنیا میں اسلام کو غالب رکھ سکیں، مثلاً طب، زراعت، ہیئت، جغرافیہ، ہندسہ، سائنس، اسلحہ سازی وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ کو جو بھی نئی چیز معلوم ہوتی اس سے جہاد میں فائدہ اٹھایا کرتے تھے، جیسا کہ جنگ احزاب میں خندق تیار فرمائی اور صحابہ اور تابعین مجاہدین نے جنگوں میں منجیق کا استعمال فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے بحری جہاد کی خوش خبری دی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بحری بیڑا تیار کیا، جس کے نتیجے میں بحر روم پر مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا اور جدید سے جدید ایجادات اور تدابیر کے نتیجے میں سلطان محمد الفاتح رضی اللہ عنہ نے قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ ظاہر ہے کہ تیس فیصد خشکی پر بھی اسی کی حکومت ہوگی جو ستر فیصد سمندر پر اپنا تسلط منوا سکے۔ داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زرہ سازی کا فن سکھایا اور اسے بطور احسان قرآن مجید میں ذکر فرمایا۔ قرآن مجید میں احکام کی آیات اتنی نہیں جتنی زمین و آسمان، سورج، چاند، بحر و بر، نباتات و جمادات و حیوانات اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور کرنے کی تاکید والی آیات ہیں۔ مسلمانوں نے اس میں غفلت کی اور کفار نے ان پر محنت کر کے جدید سے جدید ایجادات، مثلاً مشین، موٹر، ریل، ہوائی جہاز، بجلی، بارود، بم، میزائل، ایٹم، کمپیوٹر وغیرہ تیار کر کے مسلمانوں کو اپنا محتاج بلکہ غلام بنا لیا۔ اب مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان تمام علوم میں مہارت حاصل کریں جو کفار کے ساتھ جہاد کے لیے ضروری ہیں اور اس طرح یہ سب کچھ علم دنیا ہونے کے باوجود علم آخرت بن جائے گا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم "وَاعْبُدُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ" کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ فَنَسَىٰ وَ لَمْ يَجِدْ لَهُ عَزْمًا ﴿١١٥﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے آدم کو اس سے پہلے تاکید کی، پھر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادے کی کچھ پختگی نہ پائی ﴿١١٥﴾ کی تعمیل ہوگی۔ البتہ اس بات کا اہتمام نہایت ضروری ہے کہ یہ علوم سیکھنے والے قرآن و حدیث کے علم سے آراستہ اور یقین و ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے سے سرشار ہوں، تاکہ وہ سائنس پڑھتے پڑھتے کفار سے متاثر ہو کر محض دنیا پرست اور ملحد نہ بن جائیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ اس وقت مذموم ہو جائے گا جب اس سے مقصود صرف دنیا ہو اور آخرت سے غفلت اختیار کی جائے۔ ایسی صورت میں یہ تمام علوم رکھنے والا اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق بے علم ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٧﴾ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ ﴿١٠٨﴾ [الرؤم: ١٠٧، ١٠٨] ”اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (علم نہیں رکھتے)۔ وہ دنیا کی زندگی کے ظاہر کا علم رکھتے ہیں اور وہ آخرت سے وہی غافل ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿فَبِمَنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَنَا فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾﴾ [البقرہ: ٢٠٠] ”پھر لوگوں میں سے کوئی تو وہ ہے جو کہتا ہے، اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں دے دے اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔“ ان لوگوں کا علم، علم نافع نہیں، اس لیے اس سے پناہ مانگی جائے، جیسا کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: ﴿اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا﴾ [مسلم، الذکر والدعاء، باب فی الأدعية: ٢٧٢٢] ”اے اللہ! بے شک میں تیری پناہ چاہتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے اور ایسے دل سے جو خشوع نہ رکھے اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو اور ایسی دعا سے جو قبول نہ کی جائے۔“

آیت 115 ﴿١١٥﴾ وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ: ”عہدنا إلیہ“ کا معنی ”اؤضاً“ ہے کہ اس نے اسے تاکید کی۔ تاکید سے مراد مخصوص درخت کے قریب نہ جانے کا حکم ہے۔ ”نسی“ کا معنی عام طور پر ”وہ بھول گیا“ آتا ہے، مگر یہاں مراد جان بوجھ کر عمل ترک کرنا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ابلیس نے آدم و حوا علیہما السلام کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا اور ان دونوں کے لیے اپنے خیر خواہ ہونے کی قسم اٹھائی تھی: ﴿مَا نَهَكُمَا رَبُّكُمَا عَنِ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَن تَكُونَا مَلَائِكَةً أَوْ تَكُونَا مِنَّا الْخَالِدِينَ ﴿٢٠﴾﴾ [الأعراف: ٢٠] ”تم دونوں کے رب نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا مگر اس لیے کہ کہیں تم دونوں فرشتے بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ۔“ معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو وہ درخت کھاتے وقت اللہ تعالیٰ کا حکم یاد تھا، مگر شیطان کے وسوسے سے لالچ میں آ کر حکم عدولی کر بیٹھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کو عصیان (نافرمانی) قرار دیا، فرمایا: ﴿وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ﴿١٢١﴾﴾ [طہ: ١٢١] ”اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو وہ بھٹک گیا۔“ بھول کر کیے ہوئے عمل کو نافرمانی نہیں کہا جاتا۔ طبری نے حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے کہ ”فَنَسَىٰ يَنْسُو لَفَنَزْكَ“ یعنی ”فَنَسَىٰ“ کا معنی ”اس نے عمل ترک کر دیا“ ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

﴿٢﴾ قرآن میں آدم علیہ السلام کا یہ قصہ چھٹی بار بیان ہو رہا ہے، اول سورہ بقرہ، دوم اعراف، سوم حجر، چہارم بنی اسرائیل، پنجم کہف

وَ إِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰی ۙ فَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوُّكَ وَ لِرِیْوَجِكَ فَلَا يُخْرِجُکُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ فَمَشٰی ۙ اِنَّ لَکَ اَلًا تَجُوْعَ فِیْهَا وَ لَا تَعْرِی ۙ وَ اَنْتَ لَا تَطْبُوْۤا فِیْهَا وَ لَا تَضْحٰی ۙ

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، اس نے انکار کیا ﴿۱۱۷﴾ تو ہم نے کہا بے شک یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے، سو کہیں تم دونوں کو جنت سے نہ نکال دے کہ تو مصیبت میں پڑ جائے گا ﴿۱۱۸﴾ بے شک تیرے لیے یہ ہے کہ تو اس میں نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا ہوگا ﴿۱۱۹﴾ اور یہ کہ تو اس میں نہ پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کھائے گا ﴿۱۲۰﴾

اور ششم یہاں اور ہر جگہ ایک خاص مقصد کے تحت مختلف انداز سے اس قصے کو دہرایا گیا ہے۔ یہاں ما قبل سے اس کی مناسبت کے سلسلہ میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا تعلق آیت: ﴿كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْۢ مَّا قَدْ سَبَقَ ۙ﴾ [ظلمہ: ۹۹] (اسی طرح ہم تم سے ان چیزوں کی کچھ خبریں بیان کرتے ہیں جو پہلے گزر چکیں) سے ہے، یعنی اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے کہ ہم قصے بیان فرمائیں گے، چنانچہ اس کے تحت آدم ﷺ کا قصہ بیان فرما دیا۔ ایک مناسبت یہ ہے کہ ”رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا“ کہنے کا حکم دینے کے بعد آپ ﷺ کے علم میں اضافے کے لیے آدم ﷺ کا قصہ بیان فرمایا اور ایک مناسبت وہ ہے جو اور پر شاہ عبدالقادر غوثؒ کی توضیح میں گزر چکی ہے۔

آیت 116: وَ إِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْۤا اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۲۳۳-۲۳۴) اور اعراف (۱۲، ۱۱)۔

آیت 117: فَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوُّكَ عداوت کا اظہار سجدے سے انکار کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۲۲) ”فَمَشٰی“ تو مصیبت میں پڑ جائے گا، یعنی روزی کے لیے محنت مشقت کرنا پڑے گی اور جنت کی تمام آسائشیں اور نعمتیں چھین لی جائیں گی۔ آدم ﷺ کی طرف خاص شقاوت کی نسبت اس لیے ہے کہ مرد کو عورت کا منتظم اور اس کے اخراجات کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اس لیے اصل آدم ﷺ ہی ہیں اور حوا علیہا السلام ان کے تابع۔

آیت 118، 119: اِنَّ لَکَ اَلًا تَجُوْعَ گویا آدم اور حوا علیہما السلام کو بتا دیا گیا کہ تمہاری تمام بنیادی ضروریات کا یہاں انتظام کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی بنیادی ضرورتیں یہی چار چیزیں ہیں: بھوک دور کرنے کے لیے کھانا، پیاس بجھانے کے لیے پانی، ستر ڈھانپنے کے لیے لباس اور سردی گرمی سے بچنے کے لیے مکان۔ یہ دراصل شقاوت کی تفسیر ہے اور اس شقاوت سے مراد دنیوی شقاوت ہے نہ کہ اخروی۔ شقاوت کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ ظلمہ (۲)۔

﴿۱۲۰﴾ ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے بھوک کے بعد پیاس کے بجائے ننگا ہونے کا ذکر کیا اور پیاس کے بعد دھوپ میں جلنے کا ذکر فرمایا۔ اس میں ایک تو آیات کے آخری الفاظ کی مناسبت مقصود ہے اور ایک یہ کہ اگر بھوک، پیاس اور ننگے ہونے اور

فَوَسَّوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا أَدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مَلِكٍ لَا يَبْلَى ﴿۱۳﴾
 فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوَاتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفْنَ عَلَيْهَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ ۖ وَ
 عَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى ﴿۱۴﴾

پس شیطان نے اس کے دل میں خیال ڈالا، کہنے لگا اے آدم! کیا میں تجھے دائمی زندگی کا درخت اور ایسی بادشاہی بتاؤں جو پرانی نہ ہو؟ ﴿۱۳﴾ پس دونوں نے اس میں سے کھا لیا تو دونوں کے لیے ان کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں اور وہ دونوں اپنے آپ پر جنت کے پتے چکانے لگے اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو وہ بھٹک گیا ﴿۱۴﴾

دھوپ میں جلنے کو اکٹھا ذکر کیا جاتا تو پہلی دونوں اور دوسری دونوں کا مجموعہ ہم شکل ہونے کی وجہ سے ایک ایک نعمت نظر آتا، الگ الگ ذکر کرنے سے چار نعمتیں نمایاں ہو گئیں۔ (قاسمی)

آیت 121، 120 ﴿۱﴾ فَوَسَّوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ : قرآن میں شیطان کے دوسرے انداز ہونے اور پھسلانے کی نسبت بعض آیات میں صرف آدم ﷺ کی طرف کی گئی ہے اور بعض میں آدم و حوا دونوں کی طرف۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں تو شیطان آدم ﷺ ہی کے دل میں دوسرے انداز ہوا ہے، حوا ﷺ کا ذکر ان کے تابع ہونے کی حیثیت سے ہے، لہذا عوام میں جو یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ شیطان نے پہلے حوا ﷺ کو پھسرایا اور پھر ان کے ذریعے سے آدم ﷺ کو قابو کیا، وہ قطعی غلط اور لغو ہے اور اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔ دونوں آیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۲۱، ۲۰)۔

﴿۲﴾ وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى : آدم ﷺ کا واقعہ نہایت عجیب ہے کہ اتنا عظیم شخص، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا، فرشتوں سے اس کو سجدہ کروایا، کمال عقل بخشی، اپنی جنت میں ہر نعمت عطا فرمائی، اسے صاف لفظوں میں شیطان کی دشمنی سے آگاہ کر دیا اور دشمن کی بات ماننے پر جنت سے نکلنے کی تنبیہ بھی فرمادی، اتنے عظیم شخص کو اس کے اتنے مہربان پروردگار نے صرف ایک چیز سے منع فرمایا، مگر وہ اپنے رب کی اتنی عنایتوں اور شیطان کی واضح دشمنی کے علم کے باوجود اس کے درغلانے سے اپنے رب کی حکم عدولی کیسے کر گزرا؟ جو شخص بھی اس واقعہ میں غور و فکر کرے گا اس کا تعجب بڑھتا ہی جائے گا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اللہ کی تقدیر کو نہ کوئی روک سکتا ہے اور نہ بنا سکتا ہے اور یہ کہ دلیل جتنی بھی واضح اور مضبوط ہو اس سے کبھی فائدہ حاصل ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس کا فیصلہ فرمایا ہو اور اسے مقدر فرمایا ہو۔ (رازی) صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں موسیٰ ﷺ کے آدم ﷺ سے سوال اور ان کے جواب سے بھی ایسی بات سمجھ میں آتی ہے۔ اس حدیث سے اگر کوئی یہ استدلال کرے کہ گناہ جب اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں لکھ دیا ہے تو ہمارا کیا قصور ہے اور ہمیں ملامت کیوں کی جاتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آدم ﷺ نے توبہ قبول ہونے اور گناہ معاف ہونے کے بعد یہ جواب دیا ہے، اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جب ان سے پوچھا: ﴿أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكَ الشَّجَرَةِ﴾ [الأعراف: ۲۲] کہ کیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا

ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدَىٰ ﴿۱۶۲﴾

پھر اس کے رب نے اسے چن لیا، تو اس پر مہربانی فرمائی اور ہدایت دی ﴿۱۶۲﴾

تھا تو انھوں نے نہ تقدیر کا بہانہ بنایا اور نہ اپنا قصور اللہ تعالیٰ کے ذمے لگایا، بلکہ صاف تسلیم کیا: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ [الأعراف: ۲۳] ”اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے۔“ اس کے برعکس ابلیس نے اپنا گناہ ماننے کے بجائے اسے اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دیا: ﴿قَالَ فِيمَا آغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَكَ عَصَاكَ الْمُتَّوِّمِينَ﴾ [الأعراف: ۱۶] ”اس نے کہا پھر اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا میں ضرور ان کے لیے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا۔“ گناہ کی معافی کے بغیر تقدیر کا عذر غلط ہے۔ ایک اور جواب جو اس سے بھی قوی ہے، یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے آدم علیہ السلام سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ آپ نے نافرمانی کیوں کی تھی؟ بلکہ انھوں نے انھیں اپنی اولاد کو جنت سے نکالنے اور مصیبت میں ڈالنے پر ملامت کی تھی، حالانکہ مصیبت پر ملامت نہیں کی جاتی، خواہ وہ کسی غلطی کی وجہ سے آئی ہو، بلکہ تسلی دی جاتی ہے، مثلاً اگر کسی کی غلطی کی وجہ سے کوئی حادثہ ہو جائے تو اسے غلطی پر ملامت کے بجائے مصیبت میں تعزیت کی جاتی ہے کہ اللہ کی تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا، اس لیے غم مت کرو۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ﴿إِحْتَجَّ آدَمُ وَ مُوسَى ، فَقَالَ مُوسَى يَا آدَمُ ! أَنْتَ أَبُوْنَا ، أَنْتَ خَبِيتْنَا وَ أَخْرَجْتَنَا مِنَ الْجَنَّةِ ، فَقَالَ لَهُ آدَمُ أَنْتَ مُوسَى ، اصْطَفَاكَ اللَّهُ بِكَلَامِهِ ، وَ حَظَّ لَكَ بِيَدِهِ ، أَتَلُو مُوسَى عَلَى أَمْرِ قَدْرَهُ اللَّهُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَنِي بِأَرْبَعِينَ سَنَةً؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : فَحَجَّ آدَمُ مُوسَى ، فَحَجَّ آدَمُ مُوسَى﴾ [مسلم، القدر، باب حجاج آدم و موسى صلى الله عليهما وسلم: ۲۶۵۲] ”آدم اور موسیٰ علیہ السلام کی بحث ہو گئی تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا، تم ہمارے باپ ہو، تم نے ہمیں نامراد کر دیا اور ہمیں جنت سے نکال دیا۔“ تو آدم علیہ السلام نے ان سے کہا: ”اے موسیٰ! اللہ عزوجل نے تمہیں اپنے کلام کے لیے چنا اور تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے (کتاب) لکھی۔ اے موسیٰ! کیا تم مجھے ایک ایسے کام پر ملامت کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے مجھ پر طے کر دیا تھا۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تو آدم، موسیٰ پر دلیل میں غالب آگئے، تو آدم، موسیٰ پر دلیل میں غالب آگئے۔“

آیت 122: ﴿ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ: ”جَسَى يَجْسِي“ (ض) کا معنی کھینچ کر لانا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَوَلَمْ نُنَكِّنْ لَهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجَنَّبِي إِلَيْهِ كُنُوزٌ كُلُّ شَيْءٍ﴾ [القصص: ۵۷] ”اور کیا ہم نے انھیں ایک باامن حرم میں جگہ نہیں دی؟ جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھینچ کر لائے جاتے ہیں۔“ ”اجْتَبَى“ (اختیار) کا معنی کسی چیز کو اپنے لیے لے لینا، چن لینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آدم علیہ السلام کو اپنے لیے کھینچ لینے اور چن لینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دل میں توبہ کا خیال ڈالا، انھیں توبہ کی توفیق دی اور توبہ کے کلمات کی تعلیم دی، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ [البقرة: ۳۷] ”پھر آدم نے اپنے رب

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ، فَاَمَّا يَا تُبَيُّنُكُمْ مَنِىْ هُدًى هُ فَمَنْ اَتْبَعِ
هُدَاىِ فَلَآ يَضِلُّ وَ لَآ يَشْفِى ۝۳۳

فرمایا تم دونوں اکٹھے اس سے اتر جاؤ، تم میں سے بعض بعض کا دشمن ہے، پھر اگر کبھی واقعی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پوری طرح پیروی کی تو نہ وہ گمراہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پڑے گا ۳۳ سے چند کلمات سیکھ لیے تو اس نے اس کی توبہ قبول فرمائی۔“ قرآن کے مطابق وہ کلمات یہ تھے: ﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَ اِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [الاعراف : ۲۳] ”اجْتَبَا سَرِيْبَةً“ میں لفظ ”سَرِيْبَةً“ اس چننے کے سبب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

② كِتَابٌ عَلَيْهِ وَ هُدًى : یعنی اس کی توبہ قبول فرمائی اور ہدایت دی، یعنی صراطِ مستقیم پر گامزن کر دیا اور اس پر ثابت قدمی عطا فرمائی۔ ابنِ عاشور نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں ”اجْتَبَا“ اور ”ہدایت“ کے الفاظ اکٹھے آئیں وہاں نبوت عطا کرنا مراد ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اَجْتَبَيْنَاهُمْ وَ هَدَيْنَاهُمْ اِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الانعام : ۸۷] اور فرمایا: ﴿ اَجْتَبَا وَ هَدَا اِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [النحل : ۱۲۱] اور تیسری آیت یہ ہے۔

③ آدم ﷺ کا گناہ توبہ و استغفار کی وجہ سے ان کے لیے پہلے سے بھی زیادہ بلند مقام کا ذریعہ بن گیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی حکمت ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے انبیاء سے غلطی کا صادر ہونا ناممکن کیوں نہیں بنا دیا اور وہ ہے رسول کا غلطی سرزد ہونے کے بعد توبہ و استغفار میں اپنی امت کے لیے اسوہ اور نمونہ بنا۔ کیونکہ غلطی کے بعد والی ندامت، آہ و زاری، آئندہ نہ کرنے کا عزم اور پچھلی غلطی پر دن رات استغفار اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ اگر انسان سے غلطی نہ ہو، جس کے بعد وہ توبہ و استغفار کرے، تو اللہ تعالیٰ بنی آدم کی صفِ لپیٹ کر گناہ کرنے والی کوئی اور قوم لے آئے، جو گناہ کرے، پھر استغفار کرے اور اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔ [مسلم، النوبة، باب سقوط الذنوب بالاستغفار و التوبة : ۲۷۴۹، عن ابي هريرة رَضِيَ اللهُ عَنْهُ] پھر اس مہربان رب کی رحمت اور لطف و کرم کی کیا حد ہے جو توبہ کے بعد پہلے گناہوں کو بھی نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ دیکھیے سورہ فرقان (۷۰) اللہ تعالیٰ ہم گناہ گاروں کو بھی ایسی ہی توبہ کرنے والوں میں شامل فرمائے۔ (آمین)

④ درخت میں سے کھانے کے بعد یہاں توبہ قبول کرنے کا ذکر پہلے ہے اور زمین پر اترنے کا حکم بعد میں، حالانکہ اصل ترتیب یہ تھی کہ درخت میں سے کھاتے ہی انہیں جنت سے نکال دیا گیا، مگر یہاں آدم ﷺ کی توبہ کا قبول ہونا اور نبوت عطا ہونا پہلے اس لیے ذکر فرمایا کہ سننے والوں کو آدم ﷺ کا انجام معلوم ہو جائے کہ وہ کس قدر اچھا ہوا۔

آیت 123 ① قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ : اس کی تفسیر سورہ بقرہ کی آیت (۳۶) میں دیکھیے، یعنی توبہ قبول ہونے کے باوجود زمین پر رہنے کا فیصلہ قائم رہا، کیونکہ انہیں پیدا ہی زمین کی خلافت کے لیے کیا گیا تھا۔

② فَمَنْ اَتْبَعِ هُدَاىِ : سورہ بقرہ (۳۸) میں ”فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىِ“ ہے، یعنی جس نے میری ہدایت کی پیروی کی اور

وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى ﴿۳۱﴾

اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو بے شک اس کے لیے ننگ گزران ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے ﴿۳۱﴾

یہاں ”اِثْبَع“ (افتعال) ہے، اس میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے تکلف اور مبالغہ ہے، یعنی جس نے میری ہدایت کی پوری طرح پیروی کی تو وہ نہ دنیا میں جنت کے راستے سے بھٹکے گا اور نہ آخرت میں جنت سے محروم رہ کر بد نصیب ہوگا، بلکہ سیدھا چلا ہوا اپنے گھر جنت میں پہنچ جائے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «صَمِنَ اللَّهُ لِمَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ أَلَّا يُضِلَّ فِي الدُّنْيَا وَلَا يَشْفَى فِي الْآخِرَةِ ثُمَّ تَلَا: ﴿فَمَنْ أَثْبَعُ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْفَى﴾» [مصنف ابن أبي شيبة: ۱۰/۴۶۷، ج: ۳۰۵۷۵۔ مستدرک حاکم: ۲/۳۸۱، ج: ۳۴۳۸ و صححه ووافقه الذهبي] جو شخص قرآن کی پیروی کرے اللہ تعالیٰ اس کا ضامن ہے کہ وہ نہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں بد نصیب۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ”تو جو میری ہدایت کے پیچھے چلا تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پڑے گا۔“ معلوم ہوا ہدایت وہی ہے جو اللہ کی طرف سے آئے، اللہ تعالیٰ نے ہدایت خود بھیجے گا وعدہ کیا اور اسے پورا فرمایا ہے۔ اللہ کے سوا کسی کی رہنمائی منزل پر نہیں پہنچا سکتی، خواہ کوئی عالم ہو یا درویش، انسان ہو یا جن یا کوئی اور اللہ کی کتاب کے مطابق زندگی گزارنا دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب زندگی کا ضامن ہے، فرمایا: ﴿تَنْ عَلَيَّ صَالِحًا قَبْلَ ذِكْرِي أَوْ أَنْتَفَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنْ يَحْيِيَنَّكَ حَيَاتًا طَيِّبَةً ۗ وَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [النحل: ۹۷] ”جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی اور یقیناً ہم ان کا اجر ضرور بدلے میں دیں گے، ان بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کرتے تھے۔“

آیت 124 ﴿۳۱﴾ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي: ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی نصیحت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ [الحجر: ۹] ”بے شک ہم، ہم نے ہی یہ ذکر یعنی نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔“

﴿۳۲﴾ فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا: ”مَعِيشَةٌ“ زندگی، وہ چیزیں جن پر زندگی گزرتی ہے، مثلاً کھانا پینا اور دوسری ضروریات۔ (قاموس) ”ضَنْكًا“ ”ضَنْكَ يَضُنُّ ضَنْكًا وَضَنَّكَ وَضَنَّكَ“ مصدر بمعنی اہم فاعل ہے، اس لیے ”مَعِيشَةٌ“ کی صفت ہونے کے باوجود لفظ میں تبدیلی نہیں ہوئی، یہ واحد جمع اور مذکر مؤنث سب کے لیے ایک ہی رہتا ہے، یعنی وہ تنگی والی زندگی گزارے گا۔ اس کی تفسیر رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے، اس لیے وہ سب سے راجح ہے۔ صحیح ابن حبان میں ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اللہ عزوجل کے اس قول ”فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا“ کے متعلق روایت کیا، آپ نے فرمایا: «عَذَابُ الْقَبْرِ» (مراد عذاب قبر ہے۔) ”التَّفْسِيرُ الصَّحِيحُ الْمَسْبُورُ“ میں اسے الاحسان (۳۱۹)، مستدرک حاکم (۳۸۱/۱، ج: ۱۳۰۵) اور کئی کتابوں سے نقل کیا گیا ہے اور مختلف ائمہ سے اس کا حسن، جید یا صحیح ہونا بھی نقل کیا گیا ہے۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْ اَعْمٰی وَ قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتٰنٰكَ اٰیٰتِنَا فَنَسِيْتَهَا
وَ كَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنٰسٰی ﴿۱۶﴾

کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو دیکھنے والا تھا ﴿۱۵﴾ وہ فرمائے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات آئیں تو تو انہیں بھول گیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا ﴿۱۶﴾

امام طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حسن سند کے ساتھ اس کی تفسیر ”الشفاء“ فرمائی ہے۔ ”الشفاء“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ ظہر (۲) ”مَعِيْنَةٌ ضَنْكًا“ کے الفاظ میں دنیا اور قبر دونوں کی تنگ زندگی شامل ہے۔ اللہ کی نصیحت سے منہ موڑنے والا شخص اللہ پر توکل اور اس کے عطا کردہ پر قناعت سے محرومی کی وجہ سے ہر وقت زیادہ سے زیادہ مال و جاہ کی ہوس میں مبتلا رہتا ہے۔ مال کی دوادیاں ملنے پر تیسری کی تلاش میں چل نکلتا ہے۔ باؤ لے کتے کی پیاس کی طرح اس کی حرص ختم نہیں ہوتی۔ اربوں کھربوں کا مالک ہونے کے باوجود فقیر ہوتا ہے، حرص اور بخل کی کمیگی کی وجہ سے اسے کسی کی دلی محبت حاصل نہیں رہتی۔ اموال و اولاد اس کے لیے راحت بننے کے بجائے اللہ کی طرف سے عذاب بن جاتے ہیں۔ دیکھیے سورہ توبہ (۵۵)، (۸۵) پھر وہ وقت آ جاتا ہے کہ اسے گولیوں کے بغیر نیند نہیں آتی اور ہر آسائش حاصل ہوتے ہوئے بھی اسے اس رنج و الم سے بھری ہوئی زندگی سے چھٹکارے کی کوئی صورت خود کشی کے سوا نظر نہیں آتی۔ یقین نہ ہو تو جاپان، سویڈن، ناروے وغیرہ میں خود کشی کا تناسب دیکھ لیں۔

﴿۱۵﴾ وَ حَشَرْنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰی : دنیا میں اللہ تعالیٰ کی آیات سے کان اور آنکھیں بند کر لینے اور حق کو تسلیم نہ کرنے کی پاداش میں قیامت کے دن اسے اندھا، گونگا اور بہرا کر کے اٹھایا جائے گا۔ (بنی اسرائیل : ۹۷) قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہے۔ دیکھیے سورہ معارج (۴) اس کے مختلف اوقات میں لوگوں کے احوال مختلف ہوں گے۔ قبر سے اٹھتے وقت وہ اندھا ہوگا، پھر جہنم کی ہولناکی اور اہل ایمان کی عزت دکھانے کے لیے بیٹا کر دیا جائے گا۔ دیکھیے سورہ طور (۱۳، ۱۵) اور سورہ مریم (۳۸)۔

سیت 126 ﴿۱۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتٰنٰكَ : ”كَذٰلِكَ“ (اسی طرح) سے مراد ”اندھا ہونا“ ہے، جس کا ذکر سوال میں ہے کہ پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ جواب ملے گا: ﴿كَذٰلِكَ اَتٰنٰكَ اٰیٰتِنَا فَنَسِيْتَهَا﴾ کہ اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات آئیں تو تو انہیں بھول گیا۔ دونوں آیتوں کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ ایک لمبی بات کو اس طرح مختصر کیا گیا ہے کہ حذف شدہ الفاظ خود بخود سمجھ میں آرہے ہیں۔ سوال میں اندھے ہونے کا ذکر ہے، جواب میں بھلانے کا ذکر ہے۔ یہ اختصار تین جگہوں پر ہے، پہلا اختصار ”وَ حَشَرْنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰی (وَ نَسَاہُ)“ ”ہم قیامت کے دن اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے (اور اسے بھلا دیں گے)“ ”دوسرا اور تیسرا اختصار ”قَالَ كَذٰلِكَ اَتٰنٰكَ اٰیٰتِنَا فَنَسِيْتَهَا (وَ عَمِيْتْ عَنْهَا) وَ كَذٰلِكَ الْیَوْمَ (وَ تُحْشَرُ اَعْمٰی)“ ”وہ فرمائے گا، اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات آئیں تو تو انہیں بھول گیا (اور ان سے اندھا بن گیا) اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا (اور اندھا کر کے اٹھایا جائے گا)۔“ اسے بلاغت کی اصطلاح میں ”اِحْتِنَاكُ“ کہتے ہیں۔ (ابن عاشور)

وَ كَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ أَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِآيَاتِ رَبِّهِ ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَى ﴿۱۷۷﴾

اور اسی طرح ہم اس شخص کو جزا دیتے ہیں جو حد سے گزرے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لائے اور یقیناً آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ باقی رہنے والا ہے ﴿۱۷۷﴾

② واضح رہے کہ آیات کو بھلانے سے مراد یہاں ان پر ایمان نہ لانا اور عمل نہ کرنا ہے، حفظ کرنے کے بعد بھول جانا مراد نہیں۔ اس کی دلیل اگلی آیت ہے: ﴿وَ كَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ أَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِآيَاتِ رَبِّهِ﴾ [عہ: ۱۶۷] ”اور اسی طرح ہم اس شخص کو جزا دیتے ہیں جو حد سے گزرے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لائے۔“ ایمان لانے والا شخص جو حفظ کے بعد کسی بیماری یا مصروفیت کی وجہ سے کچھ آیات بھول جائے، وہ اس میں داخل نہیں ہے۔

③ قرآن یاد کرنے کے بعد بھول جانے پر وعید کی کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ چند ضعیف روایات درج ذیل ہیں: ① مسند احمد (۲۸۵/۵، ج: ۲۸۲۳) میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَمَا مِنْ رَجُلٍ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَنَسِيَهُ إِلَّا لَقِيَ اللَّهَ يَوْمَ يَلْقَاهُ وَهُوَ أَحَدٌ مِنْهُمْ» ”اور کوئی بھی شخص جو قرآن پڑھے پھر اسے بھول جائے، وہ اللہ تعالیٰ سے جس دن ملے گا تو اس حال میں ملے گا کہ کوڑھی ہو گا۔“ اس کی ایک سند میں عیسیٰ بن فائد مجہول راوی ہے، اس کا شیخ بھی مجہول ہے۔ دوسری سند میں بھی عیسیٰ بن فائد مجہول ہے۔ ② سنن ابوداؤد (۳۶۱) اور ترمذی (۲۹۱۶) میں انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «عَرَضْتُ عَلَيَّ أَحْوَرُ أُمَّتِي حَتَّى الْقَدَاةُ يُنْخِرُ جُهَا الرَّجُلِ مِنَ الْمَسْجِدِ وَعَرَضْتُ عَلَيَّ ذُنُوبُ أُمَّتِي فَلَمْ أَرْ ذَنْبًا أُعْظِمُ مِنْ سُورَةِ مِنَ الْقُرْآنِ أَوْ يَنْهَا رَجُلٌ لَمْ نَسِيهَا» ”میرے سامنے میری امت کے اجر پیش کیے گئے، یہاں تک کہ وہ تنکا بھی جسے آدمی مسجد سے نکالے اور میرے سامنے میری امت کے گناہ پیش کیے گئے، تو میں نے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ کسی آدمی کو قرآن کی کوئی سورت یا آیت عطا کی گئی پھر اس نے اسے بھلا دیا۔“ شیخ ناصر الدین البہانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کی سند ضعیف ہے، کیونکہ ابن جریج اور مطلب بن عبد اللہ دونوں مدلس ہیں اور اسے ”عن“ کے لفظ سے روایت کرتے ہیں اور بخاری اور ترمذی نے اسے ضعیف قرار دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں ضعیف ابی داؤد (۱۷۱)۔

④ ضعیف اور موضوع روایات نے امت کو کس قدر نقصان پہنچایا، اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دیکھا کہ وہ ان روایات ہی کی وجہ سے قرآن حفظ کرنے سے محروم رہے، حالانکہ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جسے کسی مصروفیت یا بیماری یا غفلت کی وجہ سے قرآن بھول جائے وہ اس شخص سے ہزار گنا بہتر ہے جس نے قرآن پڑھا ہی نہیں، یا یاد ہی نہیں کیا، کیونکہ وہ اس سے تو ہر حال میں قرآن کا علم زیادہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ غفور درحیم ہے۔ اسے سب سے بڑے گناہ شرک کے قائم مقام قرار دینا یا کوڑھی ہونے کا باعث قرار دینا راویوں کی جہالت اور تدلیس ہی کا کارنامہ ہے۔

آیت 127 ① وَ كَذَلِكَ نَجْزِي : یعنی اسی طرح ہر ایک مجرم کو اس کے جرم کے موافق جزا دی جائے گی۔

أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ يَيشُونَ فِي مَسْكِهِمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ

لَايِتِ لِأُولِي النُّهى

پھر کیا اس بات نے ان کی رہنمائی نہیں کی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے، جن کے رہنے کی جگہوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں، بے شک اس میں عقلوں والوں کے لیے یقیناً کئی عظیم نشانیاں ہیں ﴿۱﴾

﴿۱﴾ مَنْ أَسْرَفَ : حد سے گزرنے والا سب سے بڑھ کر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کسی کو اس کا شریک ٹھہرائے، پھر وہ ہے جو عبودیت (ہندگی) کے مقام سے بڑھ کر اتنا بڑا (متکبر) بنے کہ اپنی خواہش نفس کے پیچھے لگ کر اپنے خالق و مالک کی کوئی بات نہ مانے۔

﴿۲﴾ وَالْعَذَابُ الْآخِرَةُ : یعنی اگرچہ دنیا اور قبر کی تنگی والی زندگی اور محشر میں اندھا کر کے اٹھایا جانا اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا فراموش کر دینا، ان میں سے ہر ایک بہت بڑا عذاب ہے، مگر آخرت یعنی سب سے آخری مرحلے کا عذاب (جہنم) سب سے زیادہ سخت اور سب سے زیادہ باقی رہنے والا ہے۔ سخت اتنا کہ اس کی آگ دنیا کی آگ سے ستر گنا تیز اور باقی رہنے والا ایسا کہ جہنمی اس سے خلاصی کے لیے موت کی تمنا کریں گے، مگر موت ذبح کی جا چکی ہوگی، اسی لیے فرمایا: ﴿لَا يَبْئُوتُ فِيهَا وَلَا يَخْفَى﴾ [ظلمہ: ۷۴] ”نہ وہ اس میں مرے گا اور نہ جیے گا۔“ جہنم سے ان کے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

تہ 128 ﴿۱﴾ أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ : ”ہدایٰ یھدی“ را رہنمائی کرنا۔ ”الْقُرُونِ“ ”قُرُونٌ“ کی جمع ہے۔ قرن کا معنی متعین کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کا فرمان سب سے زیادہ معتبر ہے، جو آپ نے عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا، آپ نے فرمایا: ﴿يَعِيشُ هَذَا الْعُلَامُ قُرْنَا، فَعَاشَ مِائَةَ سَنَةٍ﴾ [سلسلة الأحاديث الصحيحة: ۱۵۹/۶، ج: ۲۶۶۰] ”یہ لڑکا ایک قرن زندہ رہے گا“ تو وہ سو سال زندہ رہے۔“ سلسلہ صحیحہ کی اس روایت میں ابن عساکر کے حوالے سے مزید یہ ہے کہ عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی: ”یا رسول اللہ! میرے ماں باپ قربان! قرن کتنا ہوتا ہے؟“ فرمایا: ”سو سال۔“ عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں پچانوے برس جی چکا ہوں اور رسول اللہ ﷺ کی بات پوری ہونے میں پانچ برس رہ گئے ہیں۔ محمد بن قاسم کہتے ہیں کہ ہم نے بعد میں پانچ سال گئے، پھر وہ فوت ہو گئے۔

﴿۲﴾ قرون سے مراد عاد و ثمود ہیں، کیونکہ عرب لوگ یمن، نجران اور اس کے گرد و نواح کی طرف جاتے ہوئے قوم عاد کے رہنے کی جگہوں سے گزرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جوک کے سفر میں ثمود کے مکانات سے گزرے تھے۔ اسی طرح ان سفروں میں قوم لوط اور اہل مدین کی تباہ شدہ بستیاں سب سے بڑی شاہراہ پر واقع تھیں، جہاں سے وہ صبح و شام گزرتے تھے۔ دیکھیے سورہ حجر (۷۶ تا ۷۹) اور صافات (۲۸ تا ۳۳)۔

﴿۳﴾ اس سورت میں پیغمبروں کو جھٹلانے والے لوگوں کا اور ان کے بدترین انجام کا ذکر گزر چکا ہے۔ حق یہ تھا کہ اہل عرب تاریخ سے سبق حاصل کرتے اور کفر و شرک سے باز آجاتے، مگر وہ اپنی سرکشی پر جھے رہے۔ اس لیے بطور تعجب فرمایا کہ کیا اس

وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَ أَجَلٌ مُّكَمَّلًا ﴿٧٩﴾

اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو تیرے رب کی طرف سے پہلے ہو چکی اور ایک مقرر وقت نہ ہوتا تو وہی (پہلے لوگوں والا عذاب) لازم ہو جاتا ﴿٧٩﴾

بات نے ان کی رہنمائی نہیں کی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر ڈالا، جن کے رہنے کی جگہوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں اور جنہیں دیکھنے سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ لوگ قد و قامت، صنعت و زراعت اور قوت و مہارت میں ان سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ مدائن صالح، اہرام مصر اور دوسرے آثار قدیمہ شاہد ہیں کہ اس قوت کے لوگ پھر پیدا نہیں ہوئے۔ دیکھیے سورہ فجر (٦ تا ١٣) اور سورہ روم (٩، ١٠) ان لوگوں کے آثار آنکھوں سے دیکھ کر اور اپنے آبا و اجداد سے تو اتار کے ساتھ ان کی قوت و ہیبت اور عذاب الہی سے بربادی کے واقعات سن کر بھی کیا ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ لوگ بھی ان کی روش پر اڑے رہے تو ان کا انجام کیا ہوگا؟

﴿٧٩﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ : ”النُّهَىٰ“ کی تفسیر اسی سورت کی آیت (٥٣) میں دیکھیے۔ ”النُّهَىٰ“ جمع ہونے کی وجہ سے ترجمہ ”عقلوں والے“ کیا ہے اور ”آیات“ پر تینوں تعظیم کی وجہ سے ترجمہ ”کئی عظیم نشانیاں“ کیا ہے۔

آیت 129 ﴿٧٩﴾ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ اصل میں ” وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ وَأَجَلٌ مُّكَمَّلًا لَكَانَ (العَذَابُ) لِزَامًا“ ہے، فواصل (آیات کے آخری حروف) کی مطابقت کے لیے ”وَأَجَلٌ مُّكَمَّلًا“ کو مؤخر کر دیا گیا۔

﴿٨٠﴾ ”لِزَامًا“ بروزن ”فَتَالَ“ باب مفاعلہ کا مصدر ہے اور اسم فاعل کے معنی میں برائے مبالغہ ہے، لازم ہونے والا۔

﴿٨١﴾ ”لَكَانَ“ میں ضمیر ”هُوَ“ اس کا اسم ہے جو پچھلی آیات کے مضمون ”العَذَابُ“ (وہی عذاب) کی طرف لوٹ رہی ہے۔

﴿٨٢﴾ جب پہلی قوموں کی ہلاکت کا ذکر فرمایا تو سوال پیدا ہوا کہ اب ان جھٹلانے والوں کو کیوں ہلاک نہیں کیا جا رہا؟ فرمایا کہ اس کے دو سبب ہیں، ایک تو وہ بات جو رب تعالیٰ کی طرف سے پہلے طے ہو چکی اور دوسرا وہ وقت جو مقرر ہو چکا۔ پہلے طے شدہ

بات سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اس کے غضب پر غالب ہونا ہے، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَمَّا خَلَقَ اللَّهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِي كِتَابِهِ وَهُوَ يَكْتُبُ عَلَى نَفْسِهِ وَهُوَ وَضَعَ عِنْدَهُ عَلَى الْعَرْشِ إِنَّ رَحْمَتِي تَغْلِبُ غَضَبِي﴾ [بخاری، التوحيد، باب قول الله: ﴿وَبِحَدْرِكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ﴾ : ٧٤٠٤] ”جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا فرمائی تو اپنے آپ پر یہ بات لکھ دی، اور وہ خود ہی اپنے آپ پر لکھتا ہے، اور اسے اپنے پاس عرش پر رکھ لیا کہ بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔“ اور اس نے اپنی رحمت سے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ پیغام پہنچانے اور حجت پوری کرنے کے بغیر عذاب نہیں دیتا۔ دیکھیے بنی اسرائیل (١٥) اور نساء (١٦٥) اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ کفار کی نسل سے بے شمار

مسلمان پیدا ہوں گے، اس لیے اس نے فوراً عذاب نازل کرنے کے بجائے کفار کو مہلت دے رکھی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہر ایک کا وقت مقرر شدہ ہے، جس سے پہلے کوئی قوم یا شخص جتنی بھی نافرمانی کرے، اسے مہلت دی جاتی ہے، تاکہ وہ یہ نہ کہہ

ایک کا وقت مقرر شدہ ہے، جس سے پہلے کوئی قوم یا شخص جتنی بھی نافرمانی کرے، اسے مہلت دی جاتی ہے، تاکہ وہ یہ نہ کہہ

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۖ وَمِنْ

سو اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور سورج طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی حمد سکے کہ مجھے وقت نہیں ملا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْذِنُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ [الأعراف: ۳۴] "اور ہر امت کے لیے ایک وقت ہے، پھر جب ان کا وقت آجاتا ہے تو وہ ایک گھڑی نہ پیچھے ہوتے ہیں اور نہ آگے ہوتے ہیں۔" اگر یہ دو باتیں نہ ہوتیں تو وہی پہلی قوموں والا عذاب لازم ہو جاتا۔

آیت 130 ﴿فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ﴾ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے انھیں مہلت دینا طے فرما دیا ہے تو اب خواہ وہ کتنی تکلیف دہ باتیں کہیں، ساحر کہیں یا شاعر، کاہن کہیں یا مجنون، مذاق اڑائیں یا اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ باتیں کہیں، آپ کے پاس صبر اور اللہ سے فریاد کے سوا چارہ نہیں، کیونکہ ہر مصیبت میں دو ہی چیزیں مددگار ثابت ہوتی ہیں، ایک صبر اور دوسری اللہ تعالیٰ کا ذکر اور تسبیح و تحمید، جس کی جامع صورت نماز ہے، اس لیے دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ [البقرة: ۱۵۰] "اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔"

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ اس کا لفظی معنی اگرچہ یہ ہے کہ "اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر" مگر مراد نماز ہے، جیسا کہ جز بول کر کل مراد لیا جاتا ہے، رکعت یا سجدہ بول کر پوری نماز مراد لی جاتی ہے، اسی طرح تسبیح و حمد بول کر پوری نماز مراد لی ہے، کیونکہ رکوع اور سجدہ کی طرح تسبیح و حمد بھی نماز کا جز ہے۔ دلیل اس کی جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو آپ نے چودھویں رات کے چاند کو دیکھ کر فرمایا: ﴿إِنَّكُمْ سَتَرُونَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هَذَا لَا تُضَامُونَ فِي رُؤْيَيْهِ فَإِنْ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ لَا تَعْلَبُوا عَلَىٰ صَلَاةٍ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا فَاَفْعَلُوا ثُمَّ قَرَأُ﴾ ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ﴾ [قی: ۳۹] [بخاری، التفسیر، باب قوله ﴿وسبح بحمد ربك﴾.....] [۴۸۵۱] "تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جیسے اسے دیکھ رہے ہو، اسے دیکھنے میں تمہیں کوئی بھیڑ پیش نہیں آئے گی۔ تو اگر تم یہ کر سکو کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے کی نماز کی ادائیگی میں کوئی تم پر غالب نہ آئے (رکاوٹ نہ بنے) تو ایسا کرو۔" پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ﴾۔ یہ سورہ ق کی اس آیت اور زیر تفسیر آیت کے الفاظ ایک ہیں، اس لیے یہاں بھی "وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ" سے مراد نماز ہی ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں، ان کے اوقات کے اول و آخر کی تعیین، ان کی رکعات، ان کے ادا کرنے کا طریقہ سب کچھ حدیث سے معلوم ہوتا ہے، حدیث کے انکار کا مطلب درحقیقت قرآن کا انکار ہے۔ صرف قرآن مجید سے ان میں سے کسی بات پر عمل ممکن نہیں، بلکہ نماز کے علاوہ زکوٰۃ، صیام، حج غرض کسی بھی حکم پر پوری طرح عمل ممکن نہیں۔ اس لیے کسی بھی مسلمان کو یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ قرآن مجید نے بھی پانچ نمازوں کو فرض قرار دیا ہے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے دن رات میں فرض بتایا ہے اور اپنے قول و عمل سے ان کا نمونہ پیش فرمایا ہے۔ اس لیے سلف صالحین نے ایسی تمام آیات کی تفسیر، جن

اَنَابِيَّ الْيَلِّ فَسَبَّحْ وَاطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَى ﴿١٣٦﴾

کے ساتھ تسبیح کر اور رات کے کچھ اوقات میں بھی پس تسبیح کر اور دن کے کناروں میں، تاکہ تو خوش ہو جائے ﴿١٣٦﴾

میں نماز کے اوقات کی طرف اشارہ ہے، حدیث کو مد نظر رکھ کر ہی کی ہے۔

اس آیت سے پانچ نمازوں کا حکم کس طرح ثابت ہوتا ہے؟ اس بارے میں مفسرین کا بیان مختلف ہے۔ مجھے بقایٰ رحمت کی تفسیر بہتر معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ”قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ“ سے مراد فجر کی نماز ہے۔ ”قَبْلَ غُرُوبِهَا“ سے مراد ظہر اور عصر کی نماز ہے۔ ”وَبَيْنَ آتَابِي الْيَلِّ“ سے مراد مغرب اور عشاء ہے اور ”وَاطْرَافَ النَّهَارِ“ (دن کے کناروں) سے مراد فجر اور عصر ہے، کیونکہ فجر دن کے پہلے کنارے میں ہے اور عصر دن کے آخری کنارے میں، یہی مغرب تو وہ رات میں شامل ہے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دو نمازوں (فجر اور عصر) کا ذکر ”قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ“ میں ہو چکا ہے، اس تفسیر کے مطابق ان کا ذکر دوبارہ لازم آتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ان دونوں نمازوں کی مزید تاکید کے لیے ان کا دوبارہ ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوَسْطَىٰ وَكُونُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ﴾ [البقرة: ۲۳۸] (سب نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے رہو) میں ”صلاة وسطیٰ“ کا ذکر اس کی فضیلت و اہمیت کے پیش نظر دوبارہ کیا گیا ہے۔ فجر اور عصر کے فضائل کے پیش نظر ان کی مزید تاکید کے لیے انہیں دوبارہ ذکر فرمایا، کیونکہ حدیث کے مطابق ان دونوں نمازوں میں رات اور دن کے فرشتے شامل ہوتے ہیں اور جیسا کہ اوپر گزرا کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کے حصول کے لیے ان دونوں نمازوں کا خاص دخل ہے۔ نمازوں کے اوقات کے لیے مزید دیکھیں سورہ بنی اسرائیل (۷۸)۔

﴿لَعَلَّكَ تَرْضَى﴾: یہ اشارہ ہے اس طرف کہ صبر اور نماز کی برکت سے آپ کو مقام محمود حاصل ہوگا۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۷۹) سورہ صغیٰ میں فرمایا: ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى﴾ [الصغیٰ: ۵] اور یقیناً عنقریب تیرا رب تجھے عطا کرے گا، پس تو راضی ہو جائے گا۔“ حدیث میں ہے کہ اہل جنت کو بھی راضی کیا جائے گا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَقُولُ لِأَهْلِ الْجَنَّةِ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! فَيَقُولُونَ لَيْسَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِي يَدَيْكَ، فَيَقُولُ خَلْ رَضِينُمْ؟ فَيَقُولُونَ وَمَا لَنَا لَا نَرْضَى يَا رَبَّ! فَقَدْ أَعْطَيْنَا مَا لَمْ نَعْطِ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ؟ فَيَقُولُ أَلَا أُعْطِيكُمْ أَفْضَلَ مِنْ ذَلِكَ؟ فَيَقُولُونَ يَا رَبَّ! وَأَيُّ شَيْءٍ أَفْضَلُ مِنْ ذَلِكَ؟ فَيَقُولُ: أَجَلْتُ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِي فَلَا أُسْحَطُ عَلَيْكُمْ بَعْدَهُ أَبَدًا﴾ [بخاری۔ التوحید، باب كلام الرب مع أهل الجنة: ۷۵۱۸، عن أبي سعيد الخدري رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] ”اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائے گا، اے اہل جنت! وہ کہیں گے، بار بار تیری جناب میں حاضر ہیں اے ہمارے رب! اور بار بار حاضر ہیں! تو وہ فرمائے گا، کیا تم راضی (خوش) ہو گئے؟ وہ کہیں گے، ہمیں کیا ہے کہ ہم خوش نہ ہوں، جب کہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمایا جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں فرمایا۔ وہ فرمائے گا، کیا میں تمہیں اس سے بھی افضل چیز عطا کروں؟ وہ کہیں گے، اے رب! اور اس سے افضل کیا ہے؟ وہ فرمائے گا، میں تمہیں اپنی رضا عطا کرتا ہوں، سو اس کے بعد میں تم پر کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔“

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الدُّنْيَا لِنَفْسِهِمْ
فِيهِ ۗ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَ أَبْقَى ۝

اور اپنی آنکھیں ان چیزوں کی طرف ہرگز نہ اٹھا جو ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی کی زینت کے طور پر برتنے کے لیے دی ہیں، تاکہ ہم انھیں اس میں آزمائیں اور تیرے رب کا دیا ہوا سب سے اچھا اور سب سے زیادہ باقی رہنے والا ہے ۝

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «إِذَا دَخَلَ أَهْلُ الْحَنَّةِ الْحَنَّةَ، قَالَ يَقُولُ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى تَرِيدُونَ شَيْئًا أَزِيدُكُمْ؟ فَيَقُولُونَ أَلَمْ تُبَيِّضْ وُجُوهَنَا؟ أَلَمْ تُدْخِلْنَا الْحَنَّةَ وَ تَنْجِنَا مِنَ النَّارِ؟ قَالَ فَيَكْشِفُ الْجَحَابَ، فَمَا أُعْطُوا شَيْئًا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلَى رَبِّهِمْ ۝» [مسلم، الإيمان، باب إثبات رؤية المؤمنين..... : ۱۸۱، عن صهيب رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] ”جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا: ”تم کوئی چیز چاہتے ہو کہ میں تمہیں مزید دوں؟“ تو وہ کہیں گے: ”کیا تو نے ہمارے چہرے سفید نہیں کیے؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں فرمایا اور ہمیں آگ سے نجات نہیں دی؟“ فرمایا: ”تو اس وقت اللہ جحباب اٹھا دے گا، تو انھیں کوئی چیز عطا نہیں کی گئی ہوگی جو انھیں اپنے رب عزوجل کے دیدار سے زیادہ محبوب ہو۔“

آیت 131 ۝ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ..... : ”مَدَّ يَمُدُّ“ (ن) پھیلانا، لہا کرنا۔ آنکھیں پھیلانے سے مراد عجب سے دیر تک دیکھتے رہنا ہے۔ ”مَدَّ يَمُدُّ“ عام طور پر پاؤں یا ہاتھ پھیلانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ”مَدَّ يَمُدُّ“ یا ”مَدَّ رِحْلَهُ“ اس نے اپنا ہاتھ پھیلا یا اپنا پاؤں پھیلا یا۔ یہاں آنکھیں پھیلانا استعارہ ہے، یعنی جس طرح پسندیدہ چیز کی طرف شوق اور حرص سے ہاتھ پھیلا یا جاتا ہے آپ اپنی آنکھیں مت پھیلائیں۔ معلوم ہوا دیکھنے پر پابندی نہیں، دیکھتے چلے جانے پر پابندی ہے، کیونکہ اس سے دل میں اس چیز کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک چھڑ کے پر کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔ ”أَزْوَاجًا“ کی تئیں تقلیل کے لیے ہے، یعنی دنیا کی وہ زیب و زینت ہم نے ہر کافر کو نہیں دی، بلکہ ان کے چند قسم کے لوگوں ہی کو دی ہے، کیونکہ بہت سے کفار نہایت بد حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ”زَهْرَةٌ“ ”زَهْرٌ“ کی واحد ہے، پھول، جیسے ”نَمْرَةٌ“ ”نَمْرٌ“ کی واحد ہے۔ استعارے کے طور پر زیب و زینت کو بھی ”زَهْرَةٌ“ کہتے ہیں، کیونکہ پھول کی طرح زینت بھی نگاہ و دل کو لے جاتی ہے۔ ”زَهْرَةَ الدُّنْيَا“ دنیا کی زندگی کی زینت۔ دنیا کی زینت کے جامع بیان کے لیے دیکھیے سورہ آل عمران (۱۴) اور سورہ توبہ (۲۴) بلکہ انسان کو ملنے والی ہر چیز ہی دنیا کی زندگی کی زینت ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا أَوْتَيْنَهُمْ شَيْئًا فَمَتَّاعُوا الدُّنْيَا وَ زِينَتَهَا﴾ [القصص : ۶۰] ”اور تمہیں جو کچھ بھی دیا گیا ہے سو دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے۔“ معلوم ہوا کفار کو ملنے والی کسی بھی چیز کی طرف نگاہ پھیلانا جائز نہیں، کیونکہ یہ سب کچھ ان کے فتنہ و آزمائش کے لیے ہے اور حقیقت میں ان کی زندگی دشوار کرنے کا باعث ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا﴾ [طہ : ۱۲۴] ”تو بے شک اس کے لیے تنگ گزاراں ہے۔“ اور دیکھیے سورہ توبہ (۵۵)۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا تَسْأَلْ رِزْقًا وَلَا نَحْنُ نَسْأَلُكَ وَالْعَاقِبَةُ

لِلتَّقْوَى ﴿۳۳﴾

اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور اس پر خوب پابند رہ، ہم تجھ سے کسی رزق کا مطالبہ نہیں کرتے، ہم ہی تجھے رزق دیں گے اور اچھا انجام تقویٰ کا ہے ﴿۳۳﴾

② وَرِزْقِي رَبِّكَ حَبِيرٌ وَأَبْتِي: ”تیرے رب کا رزق“ سے مراد حلال رزق ہے، کیونکہ وہ رب کے حکم کے مطابق کمایا گیا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی شان کی بلندی کے لیے اس کی نسبت اپنی طرف کی، ورنہ کافروں کو ملنے والا رزق بھی اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے۔ یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی حلال روزی اور آخرت میں اس کا عطا کردہ اجر و ثواب کفار کو ملنے والی نعمتوں سے کہیں بہتر اور پائیدار ہے، کیونکہ دنیا فانی اور آخرت باقی ہے۔

آیت 132 ﴿۱﴾ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ.....: ”اصْطَبِرْ“ ”صَبْرٌ يَصْبِرُ“ سے باب افتعال کا امر ہے، تاء کو طاء سے بدل

دیا ہے اور حروف کے اضافے سے مبالغہ مقصود ہے، اس لیے ترجمہ ”خوب پابند رہ“ کیا گیا ہے۔ ان آیات میں بظاہر تمام اوامر کے مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں، مگر امت کا ہر فرد نبی کریم ﷺ کے تابع ہونے کی وجہ سے ان کا مخاطب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ وَاصْرِبْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرٍ سِنِينَ وَفِرْقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ [ابو داؤد، الصلاة، باب منى يوم الغلام بالصلاة: ۵۹۵، عن عبد الله بن عمرو رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] ”اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہوں اور انھیں اس کی وجہ سے مارو جب وہ دس برس کے ہوں اور آپس میں ان کے بستر الگ کر دو۔“ یعنی بجائے اس کے کہ آپ کے گھر والے دنیا داروں کے عیش و آرام کی طرف نگاہیں بڑھائیں، آپ انھیں نماز کی تاکید کریں اور خود بھی اس پر خوب پابندی کریں۔ کیونکہ یہ چیز ان کا اور آپ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے جوڑ دے گی اور تم میں حلال روزی پر، چاہے وہ مقدار میں کتنی ہی تھوڑی ہو، صبر و قناعت کا جذبہ پیدا کرے گی اور اصل غنا صبر و قناعت سے ہے، نہ کہ مال و دولت سے۔

② لَا تَسْأَلْكَ رِزْقًا.....: عام طور پر روزی کمانے کی وجہ سے آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نماز میں سستی کرتا ہے، اس لیے فرمایا، ہمارا مطالبہ آپ سے روزی کمانے کا نہیں عبادت اور نماز کا ہے، روزی تمہیں ہم دیں گے۔ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام عبادت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو روزی کمانے کے لیے پیدا نہیں فرمایا، بلکہ اپنے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ اگر وہ اللہ کا بندہ (غلام) بن کر اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے تو اسے رزق کی کوئی کمی نہیں آئے گی، فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُوا] ﴿۱﴾ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ﴿۲﴾ [الذاریات: ۵۶ تا ۵۸] ”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ میری عبادت کریں، نہ میں ان سے کوئی رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں، بے شک اللہ ہی بے حد رزق دینے والا، طاقت والا، نہایت مضبوط ہے۔“ انسان کی بے صبری اور بخل و حرص کا علاج نماز کی

وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَنَا بِآيَةٍ مِنْ رَبِّنَا ۗ أَوَلَمْ تَأْتِهِمُ بَيِّنَةٌ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ﴿۱۳۳﴾ وَكُوْنَا أَهْلَكْنَهُمْ بِعَذَابٍ مِّن قَبْلِهِ لَقَالُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ مِّن قَبْلِ أَنْ نَذَلَّ وَنَخْزَىٰ ﴿۱۳۴﴾

اور انھوں نے کہا یہ ہمارے پاس اپنے رب سے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتا اور کیا ان کے پاس وہ واضح دلیل نہیں آئی جو پہلی کتابوں میں ہے؟ ﴿۱۳۳﴾ اور اگر ہم انھیں اس سے پہلے کسی عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیتے تو یہ لوگ ضرور کہتے اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے، اس سے پہلے کہ ہم ذلیل ہوں اور رسوا ہوں ﴿۱۳۴﴾

محافظة اور اس پر دوام ہے۔ دیکھیے سورہ معارج (۱۹/۳۵۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يَقُولُ يَا ابْنَ آدَمَ! تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِي أَمَلًا صَدْرَكَ عَنِّي وَأَسَدٌ فَفَرِّكَ وَإِلَّا تَفْعَلْ مَلَأْتُ يَدَيْكَ شُغْلًا وَلَمْ أَسُدَّ فَفَرِّكَ» [ترمذی، صنفہ القیامۃ، باب أحادیث ابنینا بالضرار.....: ۲۶۶۶، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے ابن آدم! میری عبادت کے لیے پوری طرح فارغ ہو جا، (تو) میں تیرا سینہ غنا سے بھر دوں گا اور تیری فقیری دور کر دوں گا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میں تیرے دونوں ہاتھ مشغولیت سے بھر دوں گا اور تیری فقیری دور نہیں کر دوں گا۔"

﴿۱۳۳﴾ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ: یعنی چاہے دنیا میں ان کے دن تکلیف سے گزریں مگر آخرت میں ہمیشہ رہنے والا عیش و آرام انھی کا حصہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ كَانَتْ الْأَجْرَةُ هَمَّةً جَعَلَ اللَّهُ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ وَجَمَعَ لَهُ شَمْلَهُ وَأَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ وَمَنْ كَانَتْ الدُّنْيَا هَمَّةً جَعَلَ اللَّهُ فَقْرَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَفَرَّقَ عَلَيْهِ شَمْلَهُ وَلَمْ يَأْتِهِ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا مَا قَدَّرَ لَهُ» [ترمذی، صنفہ القیامۃ، باب أحادیث ابنینا بالضرار.....: ۲۶۶۵، عن أنس بن مالك رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] "جس شخص کی فکر صرف آخرت ہو اللہ تعالیٰ اس کی دولت مندی اس کے دل میں رکھ دیتا ہے اور اس کے لیے اس کے تمام معاملات جمع کر دیتا ہے اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے اور جس کی فکر صرف دنیا ہو اللہ تعالیٰ اس کا فقر اس کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیتا ہے اور اس کے تمام معاملات کو بکھیر دیتا ہے اور دنیا اسے اتنی ہی ملتی ہے جو اس کے مقدر میں ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ دنیا و آخرت دونوں میں اچھا انجام تقویٰ ہی کا ہے۔

ت ۱۳۳ وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَنَا : کفار کہا کرتے تھے کہ اگر محمد ﷺ نبی ہیں تو گزشتہ انبیاء کی طرح اپنے سچا ہونے کی کوئی نشانی کیوں پیش نہیں کرتے؟ فرمایا، اس سے زیادہ آپ کی سچائی کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ پہلی آسمانی کتابیں آپ کے آنے کی خبر دے رہی ہیں۔ یقیناً یہ خبر اہل کتاب کو معلوم ہے اور ان کے واسطے سے کفار مکہ تک پہنچ چکی ہے۔ پہلی کتابوں میں آپ ﷺ کے ذکر خیر کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۱۵۷)، فتح (۲۹) اور صف (۶)۔

ت ۱۳۴ وَلَوْلَا أَهْلَكْنَهُمْ بِعَذَابٍ : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو عذاب دینے سے پہلے انبیاء کو مبعوث

قُلْ كُلُّ مُتَرَبِّصٍ فَتَرَبِّصُوا ۗ فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ أَصْحَبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَ مَنْ اهْتَدَى ۗ

کہہ دے ہر ایک منتظر ہے، سو تم انتظار کرو، پھر تم جلد ہی جان لو گے کہ سیدھے راستے والے کون ہیں اور کون ہے جس نے ہدایت پائی ﴿۱۳۵﴾

کرنے اور کفار کو مہلت دینے کی حکمت دوبارہ بیان فرمائی۔ اس سے مقصود ان کا عذر ختم کرنا اور ان پر حجت تمام کرنا ہے اور یہی ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا دستور رہا ہے۔ دیکھیے سورہٴ قصص (۵۹) اور بنی اسرائیل (۱۵)۔

آیت 135 ﴿۱﴾ قُلْ كُلُّ مُتَرَبِّصٍ فَتَرَبِّصُوا..... : ”کُلُّ“ کی تئوین اس کے محذوف مضاف الیہ کی جگہ آئی ہے، یعنی ”کُلُّ وَاجِدٍ“ ہر ایک، مطلب یہ ہے کہ اگر پہلی کتابوں میں موجود واضح دلائل تمہارے لیے نبی ﷺ پر ایمان لانے کے لیے کافی نہیں اور تمہیں اپنی مرضی کی نشانی دیکھنے پر اصرار ہے تو تم ایمان لانے کے لیے نشانی کا انتظار کرتے رہو، ہم تمہارے لیے دنیا میں اللہ کی گرفت اور آخرت میں اس کے عذاب کا انتظار کر رہے ہیں۔ جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ سیدھے راستے والے کون ہیں اور وہ کون ہے جس نے ہدایت پائی ہے؟ اس سے رسول اللہ ﷺ کے اپنے راہ حق پر ہونے کے یقین کا اظہار ہوتا ہے، کیونکہ اتنے دعوے سے یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جسے اپنے حق پر ہونے کا مکمل یقین ہو۔

﴿۲﴾ فَتَرَبِّصُوا: امر کے ساتھ اگر قرینہ بھی ہو تو وہ دوام کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں قرینہ یہ ہے کہ انتظار اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ چیز وجود میں نہ آئے جس کا انتظار ہے۔ انتظار کا یہ حکم وعید اور خبردار کرنے کے لیے ہے۔ اسے متار کہتے ہیں، یعنی ہم نے تمہیں تمہاری انتظار کی حالت پر چھوڑ دیا ہے، کیونکہ ہمیں تمہارے برے انجام کا یقین ہے۔ اس کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے سورہٴ سجدہ (۳۰) اور سورہٴ توبہ (۵۲) تاریخ شاہد ہے کہ بہت جلد کفار کو مسلمانوں کا راہ راست پر ہونا معلوم ہو گیا۔ بدر کے دن ان کو جو اسلام نہیں لائے، مثلاً ابو جہل اور کفر و شرک کے دوسرے ہلاک ہونے والے سردار اور ان کو بھی جو مسلمان ہو گئے، مثلاً ابوسفیان اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اور ان سب کو جنھوں نے جزیرہٴ عرب، شام، عراق، ایران، مصر اور پھر زمین کے مشرق و مغرب پر اسلام کا غلبہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی بات پوری ہوئی۔ ”جلد ہی جان لو گے“ میں یہ بھی شامل ہے کہ بہت جلد قیامت کے دن تمہیں اس بات کا علم یقین اور عین یقین حاصل ہو جائے گا۔ کیونکہ ”کُلُّ آتٍ قَرِيبٌ“ کہ آنے والی ہر چیز قریب ہی ہے۔



اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

لوگوں کے لیے ان کا حساب بہت قریب آ گیا اور وہ بڑی غفلت میں منہ موڑنے والے ہیں ①

یہ سورت مکہ میں نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۃ بنی اسرائیل، کہف، مریم، طہ اور سورۃ انبیاء کے متعلق فرمایا: «هُنَّ مِنَ الْعِنَاقِ الْأُولَى وَهُنَّ مِنْ تِلَادِي» [بخاری، التفسیر، سورۃ الانبیاء: ۴۷۳۹] ”یہ پہلی قدیم سورتوں میں سے ہیں اور یہ میرے قدیم مال میں سے ہیں۔“

آیت 1 ① اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ : ”اِقْتَرَبَ“ ”قَرِبَ يَقْرُبُ“ (ع، ک) میں سے باب افتعال کا ماضی معلوم ہے۔ حروف میں اضافے سے معنی میں مبالغہ پیدا ہوتا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”بہت قریب آ گیا۔“ ”غَفْلَةٍ“ میں تخوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”بھاری غفلت“ کیا گیا ہے۔

② ”النَّاسُ“ کا لفظ عام ہے، یعنی سب لوگوں کے لیے ان کا حساب بہت قریب آ گیا، اس کے باوجود انہیں اس کی کچھ فکر نہیں، بلکہ وہ بھاری غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، یعنی دنیا کی دلچسپیوں میں محو ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”فِي غَفْلَةٍ“ کی تفسیر ”غَفْلَةٌ أَهْلُ الدُّنْيَا“ (دنیا والوں کی غفلت) فرمائی ہے۔ [بخاری: ۴۷۳۰] مزید دیکھیے سورۃ مریم (۳۹)۔

③ حِسَابُهُمْ : حساب کے لفظ میں دنیا و آخرت دونوں کا محاسبہ شامل ہے۔ دنیا میں محاسبہ جیسا کہ کفار قریش کو بدر اور فتح مکہ کی صورت میں پیش آیا اور ہر انسان کو سال میں ایک دو دفعہ پیش آتا رہتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ يَرْوُونَ آفَتَهُمْ يَفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ﴾ [التوبة: ۱۲۶] ”اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں پھر بھی وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت پکارتے ہیں۔“ دنیا کے محاسبے کے فوراً بعد موت کی صورت میں محاسبہ پیش آئے گا، فرشتے کفار کی جانیں نکالتے ہوئے کہہ رہے ہوں گے: ﴿أَتَرْجُوا أَنْفُسَكُمْ أَيُّكُمْ يُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ﴾ [الأنعام: ۹۳] ”نکالو اپنی جانیں، آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا، اس کے بدلے جو تم اللہ پر ناحق (باتیں) کہتے تھے اور تم اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے۔“ موت کے بعد قبر کے سوال و جواب کی صورت میں محاسبہ اور آخر میں قیامت کے دن حساب ہوگا۔ حساب کے لفظ میں یہ تمام محاسبے شامل ہیں مگر یوم حساب کے طور پر قیامت کا دن مشہور ہے، اس لیے اکثر مفسرین نے یہاں صرف اسی کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حساب کے یہ تمام مرحلے بالکل قریب ہیں۔ حساب کی کچھ صورتیں تو زندگی ہی میں ہر روز پیش آتی رہتی ہیں، پھر موت کے قریب میں کسی کو شک نہیں، رہی قیامت تو اگرچہ وہ لوگوں کو دور دکھائی دیتی ہے مگر ہر آنے والی چیز قریب ہے، خواہ کتنے انتظار کے بعد آئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ

مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرِ مَنْ رَزَيْهِمْ فُحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝

ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت نہیں آتی جو نبی ہو مگر وہ اسے مشکل سے سنتے ہیں اور وہ کھیل رہے ہوتے ہیں ①

بَعِيدًا: وَرَزَيْهِمْ قَرِيْبًا [المعارج: ۷۰۶] ”بے شک وہ اسے دور خیال کر رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔“ نیز دیکھیے سورہ نحل (۱)، حج (۴۷) اور قمر (۱) اس لحاظ سے بھی یوم حساب بہت قریب آ گیا ہے کہ دنیا کی مدت کا اکثر حصہ گزر چکا۔ اب آخری نبی ﷺ کے آنے کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا، بلکہ قیامت ہی آئے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ يُعْنِي إِصْبَعَيْنِ» ”میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح (قریب قریب) بھیجے گئے ہیں۔“ [بخاری، الرقاق، باب قول النبي ﷺ: بعثت أنا والساعة كهاتين: ۶۵۰۵، عن أنس ﷺ]

④ مُعْرِضُونَ: یعنی لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنا حساب نہایت قریب آنے کے باوجود ایسی بھاری غفلت میں پڑے ہیں کہ ہر نصیحت سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ”النَّاسُ“ کے لفظ سے تمام لوگوں کو حساب کے بہت قریب آنے سے ڈرایا مگر آئندہ آیات میں کفار و مشرکین کی غفلت اور اعراض کو زیادہ اجاگر فرمایا ہے۔ اس آدمی کی غفلت و اعراض میں کیا شک ہے جو یہ جانتے ہوئے بھی خبردار نہیں ہوتا کہ مجھے یقیناً مرنا ہے، صرف اس لیے کہ موت یا قیامت کا دن اسے متعین کر کے نہیں بتایا گیا۔ اس کی مثال اس نکلے طالب علم کی سی ہے جسے معلوم ہے کہ امتحان یقیناً ہوتا ہے مگر وہ اس لیے بے پروا ہے کہ ابھی امتحان کی تاریخ کا اعلان نہیں ہوا۔ ابن کثیر نے یہاں ابوالعلاءؒ کا ایک شعر نقل فرمایا ہے۔

النَّاسُ فِي غَفْلَاتِهِمْ وَرَحَى الْمَنِيَّةِ تَطْحَنُ

”لوگ اپنی غفلتوں میں پڑے ہوئے ہیں، جب کہ موت کی چکی ہستی چلی جا رہی ہے۔“

آیت ۲ ① مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرِ مَنْ رَزَيْهِمْ: ”إِلَّا اسْتَمَعُوهُ“ ”تَسْمِعُ يَسْمَعُ“ کا معنی سننا ہے، باب اشتغال میں تاء کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، جو موقع کی مناسبت سے خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے۔ عام طور پر ”اسْتَمَعَ“ کا معنی کان لگا کر سننا آتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ کفار کے لیے نصیحت کو کان لگا کر سننا مشکل ہے، خصوصاً جب وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہوں، اس لیے معنی کیا گیا ہے ”مگر وہ اسے مشکل سے سنتے ہیں۔“

② بچھلی آیت میں لوگوں کے غفلت میں گرفتار ہونے اور منہ موڑنے کا ذکر تھا۔ اس آیت میں بتایا کہ انھیں اس غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ان کے رب کی طرف سے قرآن و سنت کی صورت میں نئی سے نئی نصیحت آتی رہتی ہے، مگر قبول کرنا تو دور کی بات، وہ اسے توجہ اور اطمینان سے سنتے بھی نہیں، بلکہ کھیلتے اور مذاق اڑاتے ہوئے بڑی مشکل اور گرانی سے سنتے ہیں۔

③ ”ذِكْرِ مَنْ رَزَيْهِمْ“ (ان کے رب کی طرف سے نصیحت) سے معلوم ہو رہا ہے کہ رب تعالیٰ صرف کھانے پینے اور دنیوی ضرورتیں پوری کرنے والا رب اور پروردگار ہی نہیں، بلکہ انسان کی روحانی ضرورتیں اور آخرت کی نجات کی ضامن

لَا هِيَّةَ قُلُوبُهُمْ ۚ وَ أَسْرُوا النَّجْوَى ۚ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۗ هَلْ هَذَا إِلَّا بَشْرٌ مِثْلَكُمُ ۗ
 أَفَتَأْتُونَ السِّعْرَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ﴿۳﴾

اس حال میں کہ ان کے دل غافل ہوتے ہیں۔ اور ان لوگوں نے خفیہ سرگوشی کی جنھوں نے ظلم کیا تھا، یہ تم جیسے ایک بشر کے سوا ہے کیا؟ تو کیا تم جادو کے پاس آتے ہو، حالانکہ تم دیکھ رہے ہو؟ ﴿۳﴾

چیزوں کو مہیا کرنے والا رب بھی ہے۔

﴿۳﴾ ”مُخَدَّطٌ“ کا معنی ”نیا“ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں سے لوگوں کی طرف قرآن اور حدیث کی صورت میں نئی سے نئی نصیحت آتی رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے اور جو چاہے کلام کر سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام ماننے سے انکار کر دیا، بلکہ اسے مخلوق قرار دیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا ناممکن ہے۔ اس بحث کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۱۳۳)، توبہ (۶) اور کہف (۱۰۹)۔

آیت 3 ﴿۱﴾ لَا هِيَّةَ قُلُوبُهُمْ وَأَسْرُوا النَّجْوَى.....: ”لَا هِيَّةَ“ ”لَهِيَ يَلْهِي“ (ع) یا ”لَهَا يَلْهَوُ“ (ن) سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔ ”لَهَوُ“ وہ چیز ہے جو انسان کو اس کے ضروری اور اہم کاموں سے کسی اور کام میں مشغول کر دے۔ (راغب) جیسا کہ مادہ پرست لوگ آخرت کی فکر چھوڑ کر صرف دنیا کی طلب میں مشغول ہیں۔ آج کل کے علوم و فنون سائنس، آرٹ وغیرہ میں کوئی چیز ایسی نہیں جو آخرت کی یاد دلانے والی ہو، بلکہ یہ سب روشن خیالیاں دن بدن موت اور آخرت کی فکر سے دور لے جا رہی ہیں۔ مزید دیکھیے سورہ روم (۶، ۷)۔

﴿۲﴾ وَأَسْرُوا النَّجْوَى : یہاں نوحو کا ایک مشہور سوال ہے کہ جب فاعل ظاہر ہو تو خواہ وہ واحد ہو یا تشبیہ یا جمع، فعل واحد کے صیغے کے ساتھ آتا ہے۔ یہاں ”الَّذِينَ ظَلَمُوا“ فاعل ظاہر ہونے کے باوجود فعل جمع کے صیغے کے ساتھ کیوں آیا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ ”أَسْرُوا“ کا فاعل ضمیر جمع ہے اور ”الَّذِينَ ظَلَمُوا“ اس سے بدل ہے، یعنی کفار نے باہمی خفیہ مشورے سے لوگوں کو آپ ﷺ سے دور رکھنے کے لیے خفیہ مشاورت کر کے طے کیا کہ لوگوں سے یہ کہو اور خفیہ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اگر لوگوں کو پتا چل گیا کہ یہ ان کی طے کردہ بات ہے تو وہ اس سے متاثر نہیں ہوں گے۔

﴿۳﴾ هَلْ هَذَا إِلَّا بَشْرٌ مِثْلَكُمُ.....: یعنی یہ کوئی فرشتہ نہیں ہے، بلکہ تمھاری طرح کا ایک انسان ہے، اب جو یہ معجزات دکھاتا ہے اور اس کلام کو سن کر لوگ گرویدہ ہو رہے ہیں تو یہ سب جادو ہے۔ کفار نے آپ ﷺ کی نبوت پر دو طرح سے طعن کیا، ایک یہ کہ آپ بشر ہیں اور بشر نبی نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات کئی جگہ بیان فرمائی ہے، مثلاً دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۹۳)، تغابن (۶)، قمر (۲۳)، مومنون (۳۳، ۳۴)، فرقان (۷) اور ابراہیم (۱۰) پہلے کفار و مشرکین کہتے تھے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا، آج کل کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نبی بشر نہیں ہو سکتا، بات ایک ہی ہے، ﴿بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ﴾ [المؤمنون: ۸۱] ”بلکہ انھوں نے کہا جیسے پہلوں نے کہا تھا۔“ اللہ تعالیٰ نے آگے اس کا رد فرمایا۔ دوسرا طعن یہ تھا کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں

قُلْ رَبِّي يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۵۱﴾ بَلْ قَالُوا
أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۖ فَلْيَأْتِنَا بِالْبَيِّنَاتِ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوْثُونَ ﴿۵۲﴾

اس نے کہا میرا رب آسمان و زمین میں ہر بات کو جانتا ہے اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۵۱﴾ بلکہ انھوں نے کہا یہ خوابوں کی پریشان باتیں ہیں، بلکہ اس نے اسے گھڑ لیا ہے، بلکہ یہ شاعر ہے، پس یہ ہمارے پاس کوئی نشانی لائے جیسے پہلے (رسول) بھیجے گئے تھے ﴿۵۲﴾

بلکہ جادو ہے۔ کفار کا یہ طعن بھی اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ ذکر فرمایا ہے، مثلاً دیکھیے سورہ مدثر (۲۴) اور ذاریات (۵۲)۔

آیت 4 قُلْ رَبِّي يَعْلَمُ الْقَوْلَ : یعنی پیغمبر ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تم نے خفیہ مشورے سے جو بات طے کی ہے وہ میرے رب سے مخفی نہیں۔ وہ آسمان و زمین میں ہونے والی ہر بات کو جانتا ہے، کیونکہ وہ سب کچھ بھی ہے اور علیم بھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ”يَعْلَمُ السِّرَّ“ (وہ چھپی بات کو جانتا ہے) کے بجائے ”يَعْلَمُ الْقَوْلَ“ فرمایا، یعنی وہ ہر بات جانتا ہے، تمہاری خفیہ سرگوشیاں بھی اور بلند آواز سے گفتگو بھی۔ اس لیے اس کے پیغمبر کے خلاف تمہاری یہ خفیہ مجلسیں یا علانیہ مخالفت تمہارے کسی کام نہیں آئیں گی اور تم غلبہ اسلام کو کسی طرح نہیں روک سکو گے۔ ایک قراءت میں ”قُلْ رَبِّي“ ہے، یعنی کہہ دے کہ میرا رب آسمان و زمین میں ہونے والی ہر بات جانتا ہے۔

آیت 5 ۱ بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ : ”أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ یوسف (۲۴)۔

۲ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو جھٹلانے والے کفار کے مختلف اقوال ذکر کر کے ثابت کیا کہ یہ خوب جانتے ہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، مگر ضد اور عناد کی وجہ سے اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، اس لیے سخت بدحواس اور مذہذب ہیں کہ قرآن کو کیا کہہ کر جھٹلائیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ خوابوں کی پریشان باتیں ہیں، پھر کہتے ہیں کہ نہیں، بلکہ آپ ﷺ نے اسے خود تصنیف کر کے اللہ کے ذمے لگا دیا ہے۔ پھر اس پر تسلی نہیں ہوتی تو کہتے ہیں کہ نہیں، اصل یہ ہے کہ آپ شاعر ہیں اور یہ قرآن آپ کے شاعرانہ تخیل کا نتیجہ ہے۔ سورہ مدثر (۲۵ تا ۱۸) میں کفار کے ایک کھڑبھج کی اسی طرح کی پریشان خیالی کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی ایسی تمام باتوں کا جواب دے رکھا تھا کہ اگر تمہیں اس قرآن کے اللہ کا کلام ہونے میں شک ہے تو اس جیسی کتاب بنا کر لے آؤ، یا دس سورتیں بنا کر لے آؤ، چلو! یہ بھی نہیں تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ۔ اگر یہ بھی نہ کرو اور کبھی نہیں سکو گے، تو جہنم کی آگ سے ڈر کر اس پر ایمان لے آؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا گیا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ کفار کے پاس اس کا کوئی جواب نہ اس وقت تھا اور نہ قیامت تک اس کا جواب لا سکتے ہیں۔ مگر وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھے، اس لیے کہنے لگے کہ اس معجزے کو دیکھ کر ہم ایمان نہیں لائیں گے، ہمارے پاس تو یہ رسول وہ معجزے لے کر آئے جو پہلے رسولوں کو دیے گئے تھے، مثلاً صالح علیہ السلام کی اونٹنی، موسیٰ علیہ السلام کا عصا، عیسیٰ علیہ السلام کا مردہ کو زندہ کرنا، ناپینا کو پینا کرنا وغیرہ۔

مَا أَمَدَّتْ قَبْلَهُمْ مِنْ قَرِيْبَةٍ أَهْلَكْنَاهَا ۖ أَفَهُمْ يُؤْمِنُونَ ﴿۶﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِيْ اِلَيْهِمْ فَسَلُّوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷﴾ وَمَا

ان سے پہلے کوئی ہستی، جسے ہم نے ہلاک کیا، ایمان نہیں لائی تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے؟ ﴿۶﴾ اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجے مگر کچھ مرد، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، پس ذکروالوں سے پوچھ لو، اگر تم نہیں جانتے ہو ﴿۷﴾ اور ہم نے

آیت 6 : مَا أَمَدَّتْ قَبْلَهُمْ مِنْ قَرِيْبَةٍ : اس آیت میں تین باتیں نہایت اختصار کے ساتھ بیان فرمائی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایمان لانے کی شرط کے طور پر تم نے پہلے رسولوں جیسا معجزہ لانے کا مطالبہ کیا ہے، سو پہلی امتوں کو ایسے معجزات دکھائے گئے، وہ ان پر ایمان نہیں لائے، تو تم جو ان سے کہیں بڑھ کر سرکش اور ضدی ہو، کیسے ایمان لاؤ گے؟ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۵۹) دوسری یہ کہ جو قومیں معجزات دیکھ کر ایمان نہیں لائیں انہیں ہلاک کر دیا گیا، کیونکہ صریح معجزہ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ایمان نہ لانے والی قوم ہلاک کر دی جاتی ہے، تو تم ایسا مطالبہ کیوں کرتے ہو جس کا نتیجہ تمہاری ہلاکت ہے؟ تیسری یہ کہ تمہیں معجزہ نہ دکھانا اللہ تعالیٰ کی تم پر رحمت ہے کہ اس نے تمہیں مہلت دے رکھی ہے اور اس کے علم میں تمہاری کئی نسلوں کا مسلمان ہونا مقدر ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ عنکبوت (۵۱ تا ۵۸) کی تفسیر۔

آیت 7 : ﴿۱﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا : یہ ”هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ“ (یہ تم جیسے ایک بشر کے سوا ہے کیا) کا جواب ہے، یعنی وہ تمام رسول جو آپ سے پہلے آئے، جن کے رسول ہونے کو یہ بھی مانتے ہیں، مثلاً ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق وغیرہم ﷺ، وہ سب بشر تھے، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ تو یہ لوگ آپ کو بشر ہونے کی وجہ سے رسول کیوں نہیں مانتے؟ دیکھیے سورہ انعام (۹۱) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: «سَكَانَ بَشَرًا مِّنَ الْبَشَرِ يُغَلِّبُ ثُبُوْبَهُ وَ يَحْلِبُ شَاتَهُ وَيَحْدِمُ نَفْسَهُ» [مسند احمد: ۲۵۶/۶، ح: ۲۶۲۴۸۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة: ۶۷۱] ”آپ ﷺ انسانوں میں سے ایک انسان تھے، اپنا کپڑا خود نٹول لیا کرتے تھے اور اپنی بکری کا دودھ خود دودھ لیتے تھے اور اپنا کام خود کر لیتے تھے۔“ زمین میں اگر فرشتے رہا کرتے تو رسول بھی فرشتہ آتا، اب انسان بتتے ہیں تو ان کے لیے نمونہ اور ان کی رہنمائی کرنے والا انسان ہی ہو سکتا ہے۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۹۳، ۹۵)۔

﴿۲﴾ فَسَلُّوْا اَهْلَ الذِّكْرِ : اس جملے کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ نحل (۴۳)۔

آیت 8 : ﴿۱﴾ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا : ”جَسَدًا“ کا معنی بے جان جسم ہے، یہ جُسد کا ہم معنی ہے۔ محقق ائمہ لغت کا یہی قول ہے، جیسا کہ ابواسحاق زجاج نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿فَاَخْرَجْنَاهُمْ عَجَلًا جَسَدًا اَلْمُخْوَانَةَ﴾ [حلقہ: ۸۸] کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ [التحریر والتبوير] یہ ان کے اس اعتراض کا جواب ہے: ﴿مَا لِ هَذَا الرَّسُوْلِ يَا كُلَّ الطَّعَامِ وَيَبْسُخِي فِي الْاَسْوَابِ﴾ [الفرقان: ۷] ”اس رسول کو کیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی ان کا

جَعَلْنَهُمْ جَسَدًا لَا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ ①

انہیں محض جسم نہیں بنایا تھا جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے ①

ایک اعتراض یہ بھی تھا: ﴿هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ﴾ [الانبیاء: ۳] ”یہ تمہارے جیسا ایک بشری تو ہے۔“ ان اعتراضوں کے ساتھ مطالبہ یہ تھا: ﴿فَلْيَأْتِنَا بآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ﴾ [الانبیاء: ۵] ”ہاں یہ ہمارے پاس کوئی نشانی لائے جس طرح پہلے رسول بھیجے گئے۔“ ﴿فَلْيَأْتِنَا بآيَةٍ﴾ کا جواب پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں دوسرے دونوں اعتراضوں کا جواب دیا کہ اس سے پہلے تمام رسول جو ہم نے بھیجے، بشر تھے فرشتے نہ تھے، مرد تھے عورتیں نہ تھے۔ اسی طرح وہ بے جان جسم نہ تھے جو نہ کھاتے ہوں اور نہ بازاروں میں چلتے پھرتے ہوں، بلکہ وہ کھاتے پیتے بھی تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔ (فرقان: ۲۰) ان کی بیویاں بھی تھیں اور اولاد بھی۔ (رعد: ۳۸) جیسے تمہارے جد امجد ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے جد امجد یعقوب، اسحاق اور ابراہیم علیہم السلام۔ تو جب ان سب کو بشر ہونے، کھانے پینے، بازاروں میں چلنے پھرنے اور صاحب آل و اولاد ہونے کے باوجود رسول مانتے ہو تو نبی امی ﷺ کو رسول کیوں نہیں مانتے؟

② مشرکین خواہ پہلے زمانے کے ہوں یا رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے یا ہمارے زمانے کے، سب کا ذہن یہی ہوتا ہے کہ بزرگ کھانے پینے سے بے نیاز اور بڑی بچوں سے مستغنی ہوتے ہیں اور دنیا کے دھندوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان کی نگاہ میں بزرگ اور پیر بننے والے حضرات کمائی وغیرہ چھوڑ کر کنیاؤں اور خاتونوں میں ڈیرے لگا لیتے ہیں۔ ان بزرگوں کے بعض عقیدت مند ان کے متعلق عجیب و غریب قصے مشہور کر دیتے ہیں، جن کا ہونا ممکن ہی نہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو ”تذکرۃ الاولیاء“ پڑھ لیں، مثلاً فلاں بزرگ نے پہلے ایک دن کھانے کا ناغہ کیا، پھر ایک ماہ کا، پھر ایک سال کا اور پھر ساری عمر کا۔ پنجاب کے ایک بزرگ کے متعلق ان کے عقیدت مندوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ انھوں نے بارہ سال کچھ کھائے بغیر جنگل میں عبادت کرتے ہوئے گزار دیے، صرف ایک لکڑی کی روٹی ان کے پاس تھی، جسے کبھی کبھار وہ دانٹوں سے کاٹتے تھے۔ پھر بارہ سال انھوں نے ایک کنویں میں الٹے لٹک کر اللہ کی عبادت کرتے ہوئے گزار دیے۔ ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ الٹا لٹکا کون سی عبادت ہے؟ اور اس عرصے کی نمازیں، روزے اور وضو وغسل سب کہاں گئے؟ ان لوگوں کے ہاں یہ بزرگی ہے، جب کہ وہ تین صحابہ، جن میں سے ایک نے کہا تھا کہ میں ہمیشہ ساری ساری رات قیام کیا کروں گا، کبھی سوؤں گا نہیں، دوسرے نے کہا تھا کہ میں ہمیشہ دن کو روزہ رکھوں گا کبھی روزے کے بغیر نہیں رہوں گا اور تیسرے نے کہا تھا کہ میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا، تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا تھا: ﴿وَاللَّهِ! إِنِّي لَأُحْسِنُكُمْ لِلَّهِ وَانْتَقَامُكُمْ لَهُ لَكِنِّي أُصَوْمُ وَأُفِطِرُ وَأُصَلِّي وَأُزُقُّ وَأُزَوِّجُ النِّسَاءَ فَصَمَّ رَغَبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي﴾ [بخاری، النکاح، باب الترغیب فی النکاح: ۵۰۶۳] ”اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ پرہیزگار ہوں، لیکن میں قیام کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزے رکھتا ہوں، کبھی نہیں بھی رکھتا اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو جس نے میرے طریقے سے بے رغبتی کی وہ مجھ سے نہیں۔“

ثُمَّ صَدَقْتَهُمُ الْوَعْدَ فَأَنْجَيْنَهُم مِّنْ نَّشَأِهِمْ وَ أَهْلَكْنَا السُّرْفِينَ ﴿۹﴾ لَقَدْ

أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۰﴾

پھر ہم نے ان سے وعدہ سچا کر دیا تو ہم نے انہیں نجات دی اور اسے بھی جسے ہم چاہتے تھے اور ہم نے حد سے بڑھنے والوں کو ہلاک کر دیا ﴿۹﴾ بلاشبہ یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے، جس میں تمہارا ذکر ہے، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟ ﴿۱۰﴾

﴿۹﴾ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ : یہ بھی کفار کے ایک غلط عقیدے کا رد ہے کہ اللہ کے رسول اور خاص بندے مرتے نہیں۔ کئی جاہلوں نے ایک عبارت بنا رکھی ہے جسے وہ قرآن کی آیت قرار دے کر سنا تے ہیں: ”أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا يَمُوتُونَ وَلَكِنَّهُمْ مِنْ دَارٍ إِلَىٰ دَارٍ يَنْتَقِلُونَ“ ”یاد رکھو! اللہ کے ولی مرتے نہیں، بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔“ اگر کوئی شخص کہہ بیٹھے کہ اللہ کے رسول ﷺ یا فلاں بزرگ فوت ہو گئے ہیں تو یہ لوگ اسے گستاخ قرار دے کر اس پر حملہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا کہ پہلے گزرے ہوئے رسول ہمیشہ رہنے والے نہ تھے، بلکہ اپنی طبعی زندگی گزار کر فوت ہو گئے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِنْ مِتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ﴾ | الانبیاء: ۳۴ | ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کے لیے پختگی نہیں رکھی، سو کیا اگر تو مر جائے تو یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔“ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ زمر (۳۰، ۳۱)۔

آیت 9 ثُمَّ صَدَقْتَهُمُ الْوَعْدَ.....: ”صَدَقَ يَصْدُقُ“ لازم بھی آتا ہے، یعنی سچ کہنا اور متعدد بھی، یعنی سچا کر دکھانا، ”پھر ہم نے ان سے وعدہ سچا کر دیا۔“ ”ثُمَّ“ (پھر) کا لفظ یہ بتانے کے لیے ہے کہ رسولوں کی مخالفت ہوئی، انہیں ستایا گیا، جنگیں بھی ہوئیں مگر پھر آخر کار ہم نے ان سے مدد کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا، سو ہم نے رسولوں کو نجات دی اور ان کو بھی جنہیں ہم چاہتے تھے۔ اس میں رسولوں کے پیر و کار بھی شامل ہیں اور کفار میں سے وہ بھی جنہیں آئندہ ایمان لانا تھا، یا جن کی اولاد کو ایمان کی توفیق ملنا تھی۔ عربوں پر سب کو ہلاک کرنے والا عذاب نہ آنے میں یہی حکمت تھی۔ ”اور حد سے بڑھنے والوں کو ہلاک کر دیا“ اس میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے پیر و کاروں کے لیے خوش خبری ہے اور کفار کے لیے وعید۔ رسولوں سے کیے گئے مدد کے وعدے اور اسے پورا کرنے کے ذکر پر مشتمل آیات سورہ مجادلہ (۲۱)، صافات (۷۱ تا ۷۳)، ابراہیم (۱۳، ۱۴) اور یوسف (۱۱۰) میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 10 لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا... : اس آیت میں کفار کی ان تمام پریشان کن باتوں کا اکتھا جواب ہے جو وہ نبی ﷺ اور قرآن کے متعلق کہتے تھے کہ یہ خوابوں کی پراگندہ باتیں ہیں، یا من گھڑت باتیں ہیں، یا جادو ہے، یا شاعری ہے، تو فرمایا کہ قرآن کا ان میں سے کسی بات سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ ہم نے تو تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے، تمہارے ہی حالات اور زندگی کے معاملات پر بحث کی گئی ہے اور انہی کے متعلق تمہاری راہنمائی کی گئی ہے۔ اس

وَكَمْ قَصَبْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ ﴿۱۱﴾ فَلَمَّا
 أَحْسَبُوا بِأَسْنَاءِ إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ ﴿۱۲﴾ لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ
 فِيهِ وَمَسْكِنُكُمْ عَلَيْكُمْ مُشْكُونٌ ﴿۱۳﴾

اور کتنی ہی بستیاں ہم نے توڑ کر رکھ دیں جو ظالم تھیں اور ان کے بعد اور لوگ نئے پیدا کر دیے ﴿۱۱﴾ تو جب انھوں نے ہمارا عذاب محسوس کیا اچانک وہ ان (بستیوں) سے بھاگ رہے تھے ﴿۱۲﴾ بھاگو نہیں اور ان (جگہوں) کی طرف واپس آؤ جن میں تمہیں خوش حالی دی گئی تھی اور اپنے گھروں کی طرف، تاکہ تم سے پوچھا جائے ﴿۱۳﴾

میں خواب، جادو یا شاعری کی کون سی بات ہے، تو کیا تم سمجھتے نہیں؟ ”فِيهِ ذِكْرُكُمْ“ کا ایک معنی یہ ہے کہ ایمان لانے کی صورت میں یہ کتاب ساری دنیا میں تمہاری ناموری، شہرت اور عز و شرف کا باعث ہے، جیسا کہ دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ﴾ [الرہوف : ۴۴] یعنی بے شک یہ قرآن تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے عز و شرف کا باعث ہے۔ ذکر کا ایک معنی نصیحت بھی ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [الذاریات : ۵۵] ”اور نصیحت کر، کیونکہ یقیناً نصیحت ایمان والوں کو نفع دیتی ہے۔“ تو آیت کا ترجمہ یہ ہوگا ”بلاشبہ یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہاری نصیحت کا سامان ہے۔“ آیت میں ذکر کے تینوں معنی بیک وقت مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ ان میں کوئی باہمی تعارض نہیں۔

آیت 11 : ﴿وَكَمْ قَصَبْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً : ”قَصَبٌ“ کا معنی کسی سخت چیز کو توڑنا ہے۔ کہا جاتا ہے: ”فَلَانٌ قَصَبٌ ظَهَرَ فَلَانٌ“ کہ فلاں نے فلاں کی کمر توڑ دی۔ ”انْقَضَتْ سِنَةٌ“ فلاں کا دانت ٹوٹ گیا۔ ”گھ“ یہاں نکشیر کے لیے ہے، ”کتی ہی بستیاں“ سے مراد بہت سی بستیاں ہیں، اس سے کوئی خاص ہستی مراد نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب وہ روایت موضوع ہے جس میں ان سے نقل کیا گیا ہے کہ اس سے مراد یمن کے شہروں کے لوگ ہیں۔ [الاستیعاب فی بیان الاسباب] آیت کے الفاظ کے مطابق بھی وہ بستیاں عام ہیں اور کوئی خاص علاقہ مراد نہیں۔

آیت 12 : ﴿وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ : ”الْإِنْشَاءُ“ کا معنی نئی چیز بنانا ہے۔ ”بَعْدَهَا“ بعض مقامات پر ”مِنْ بَعْدِهَا“ ہوتا ہے، اس میں کچھ دیر بعد مراد ہوتا ہے، یہاں ”بَعْدَهَا“ کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان بستیوں کی ہلاکت کے بعد ساتھ ہی نئے سرے سے اور تو میں وہاں لے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت اور بعد والی آیات میں اپنا ذکر جمع کے صیغے سے کیا ہے۔ مراد اس سے اپنی عظمت کا اظہار ہے۔

آیت 12 : ﴿فَلَمَّا أَحْسَبُوا بِأَسْنَاءِ : احساس کا معنی حواس سے معلوم کرنا، مثلاً دیکھنا یا سنا وغیرہ۔ ”يَرْكُضُونَ“ ”رُكُضٌ“ ”يَرْكُضُ“ (ن) کا معنی سواری کو تیز دوڑانے کے لیے ایڑ لگانا ہے، مراد تیزی سے بھاگنا ہے، یعنی جب انھوں نے ہمارے عذاب کو اپنے حواس یعنی آنکھوں یا کانوں وغیرہ سے محسوس کیا تو بہت تیزی کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے۔

آیت 12 : ﴿لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ : یعنی ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ انھیں کہا جائے یا فرشتے ان سے

قَالُوا يٰوَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا
خٰبِدِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لِعٰبِيْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَا اَنْ
نَّتَّخِذَ لَهُوًا لَّا لَخَدْنٰهُ مِنْ لَدُنَّا ؕ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾

انھوں نے کہا ہائے ہماری بربادی یقیناً ہم ظالم تھے ﴿۱۴﴾ تو ان کی پکار ہمیشہ یہی رہی، یہاں تک کہ ہم نے انھیں کٹے ہوئے، بجھے ہوئے بنا دیا ﴿۱۵﴾ اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، کھیلنے کے لیے نہیں بنایا ﴿۱۶﴾ اگر ہم چاہتے کہ کوئی کھیل بنائیں تو یقیناً اسے اپنے پاس سے بنا لیتے، اگر ہم کرنے والے ہوتے ﴿۱۷﴾

کہتے ہیں کہ بھاگو نہیں، بلکہ ان جگہوں کی طرف جن میں تمہیں خوشحالی دی گئی تھی اور اپنے گھروں کی طرف واپس آؤ، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ ان تمام نعمتوں کی تم نے کیا قدر کی؟ ایک معنی یہ ہے کہ اپنی انھی مجلسوں میں دوبارہ واپس آؤ، تاکہ پہلے کی طرح تمہارے نوکر چاکر ہاتھ باندھ کر تم سے سوال کریں کہ سرکار کیا حکم ہے؟ تیسرا معنی یہ ہے کہ بھاگو نہیں، بلکہ اپنی وہی پہنچائیتیں اور کونسلیں جما کر بیٹھو، تاکہ لوگ اپنے مسائل کا حل تم سے پوچھنے کے لیے آئیں اور مانگنے والے تم سے مانگنے کے لیے آئیں، جنہیں تم فخر و ریا کے لیے دیا کرتے تھے۔ بہر حال یہ سب کچھ انھیں ڈانٹنے اور ان کا مذاق اڑانے کے لیے کہا جا رہا ہے۔

آیت 14 قَالُوا يٰوَيْلَنَا : جب اللہ کا عذاب آگھیرتا ہے تو بدکار سے بدکار تو میں بھی گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے اسی طرح او ویلا پجاتی ہیں، مگر اس وقت گناہوں کے اعتراف اور توبہ کرنے کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ دیکھیے سورہ مؤمن (۸۵)۔

آیت 15 فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ : ”حَصِيْدًا“ ”حَصَدٌ يَحْصُدُ“ (درافتی سے کاٹنا) سے ”فَعِيْلٌ“ بمعنی مفعول (مَحْصُوْدٌ) ہے۔ فَعِيْل کا وزن مذکر و مؤنث اور واحد، شنیہ، جمع سب کے لیے ایک ہی آتا ہے، معنی کٹے ہوئے۔

آیت 16 وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ : کچھلی آیات میں ظالم بستیوں کو برباد کرنے کا ذکر فرمایا تھا، اب اس کی حکمت بیان فرمائی کہ ایسا نہیں ہے کہ ہم نے اس زمین و آسمان کو کھیلنے کے لیے پیدا کر دیا ہے کہ لوگ جیسے چاہیں ظلم و ستم کرتے پھریں اور ان سے کوئی باز پرس نہ ہو۔ بلکہ ان کے پیدا کرنے میں ہماری بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں ہیں اور کائنات میں ہر عمل کی جزا یا سزا کا عمل جاری ہے۔ لہذا اگر ان ظالموں کو ہلاک کیا گیا تو یہ عدل و انصاف اور جزا و سزا کے قانون کے عین مطابق تھا۔ تمہیں چاہیے کہ آنے والی دوسری زندگی میں جو ابدی کے لیے تیاری کرو۔

آیت 17 لَوْ اَرَدْنَا اَنْ نَّتَّخِذَ لَهُوًا : یعنی بغرض مجال اگر ہم اپنی دل لگی اور کھیل کے لیے کھیلنے کی کوئی چیز بناتے تو اپنے پاس بنا لیتے اور تمہیں اس کا پتا نہ چلنے دیتے، کیونکہ لہو و لعب تو نقص اور خامی کی بات ہے، اس لیے ہم اسے کسی کی نگاہ کے سامنے نہ آنے دیتے۔ تو یہ آسمان و زمین جو ہر وقت تمہارے سامنے ہیں، ہم کھیل اور دل لگی کے لیے کیسے بنا سکتے ہیں؟ یہ ساری بات بطور فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کس قدر رحیم و کریم ہے کہ اس نے انسان کی چھوٹی عقل کو سمجھانے اور ہر طرح سے مطمئن

بَلْ تَقْدِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۖ وَ لَكُمْ الْوَيْلُ وَمَا تَصِفُونَ ﴿۱۸﴾
 وَ لَهُ فَنٌ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَ مَنْ عِنْدَكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ﴿۱۹﴾

بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں تو وہ اس کا دماغ کچل دیتا ہے، پس اچانک وہ مٹنے والا ہوتا ہے اور تمہارے لیے اس کی وجہ سے بربادی ہے جو تم بیان کرتے ہو ﴿۱۸﴾ اور اسی کا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو اس کے پاس ہیں وہ نہ اس کی عبادت سے تکبر کرتے ہیں اور نہ ذرہ برابر تھکتے ہیں ﴿۱۹﴾
 کرنے کے لیے اس کی ذہنی سطح کے مطابق بات کی ہے، ورنہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا ارادہ کرے، کیونکہ لفظ ”لو“ ہوتا ہی محال چیز کے بیان کے لیے ہے۔

﴿۱﴾ طبری نے صحیح سند کے ساتھ مجاہد سے ”لَا تَقْدِفُ تِلْكَ بَيْنَ لَدُنَا“ کا معنی نقل کیا ہے کہ ہم اس لہو و لعب کو اپنے پاس بنا لیتے، نہ جنت اور جہنم پیدا کرتے اور نہ ہی موت اور قیامت۔ یعنی پھر زمین و آسمان، انسان، جن اور ان کی جزا و سزا کے سلسلے کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ دیکھیے سورہ مومنون (۱۱۵)، سورہ ص (۲۷) اور سورہ ملک (۲)۔

آیت 18 ﴿۱﴾ بَلْ تَقْدِفُ بِالْحَقِّ: ”قَدِفٌ يَقْدِفُ“ (ض) کا معنی کسی چیز کو سختی کے ساتھ پھینک مارنا۔ ”فَيَدْمَغُهُ“ ”دَمَغٌ يَدْمَغُ“ (ف) کسی چیز کا دماغ کو توڑنا، یہاں تک کہ اس کی وہ جھلی پھٹ جائے جس کے پھٹنے سے روح نکل جاتی ہے۔ ”زَاهِقٌ“ ”زُهُوقٌ“ کا معنی کسی چیز کا مکمل طور پر ختم ہو جانا ہے۔ یعنی ہم نے اس کائنات کو بے مقصد نہیں بنایا، بلکہ اس میں حق و باطل کا معرکہ جاری ہے اور اس کا نظام ہم نے اس طرح بنایا ہے کہ باطل نے جب بھی سرائٹھایا حق نے ضرب کاری لگا کر اسے نیست و نابود کر دیا۔ اسی طرح اب بھی بالآخر باطل فنا ہو جائے گا اور حق قائم و دائم رہے گا۔

﴿۲﴾ ”وَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ“ میں ”إِذَا“ فہم یعنی اچانک کے معنی میں ہے اور ”هُوَ زَاهِقٌ“ جملہ اسیہ ہے جو استمرار کے لیے ہے اور جس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ باطل نہایت تیزی کے ساتھ مٹتا ہے اور اس کا نثار غرضی نہیں، دائمی ہوتا ہے۔ (آلوسی)
 ﴿۳﴾ وَ لَكُمْ الْوَيْلُ وَمَا تَصِفُونَ: یعنی اگر تم یہ کہو گے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا یہ سلسلہ ایک کھیل بنایا ہے اور دوبارہ زندہ ہونا، حساب کتاب اور جنت و دوزخ سب فرضی قبضے کہانیاں ہیں تو تمہارے اس بیان کا نتیجہ تمہاری بربادی کی صورت میں ظاہر ہوگا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

آیت 18 ﴿۱﴾ وَ لَهُ فَنٌ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ: ”فَنٌ“ کا لفظ عموماً عقل والی مخلوقات کے لیے استعمال ہوتا ہے، اگرچہ یہاں زمین و آسمان کے عقلاء کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دیا گیا ہے مگر اس میں آسمان و زمین، ان کے اندر پائے جانے والے تمام اجرام فلکی اور دوسری تمام مخلوقات بھی شامل ہیں اور وہ سب اللہ کی ملکیت ہیں۔ کیونکہ یہ زمین آسمانوں کے اندر ہے اور ہر آسمان اپنے سے اوپر والے آسمان کے اندر ہے اور سب سے اوپر والا آسمان عرش کے اندر ہے اور اللہ سبحانہ عرش عظیم کا مالک ہے، جیسا کہ آگے آیت (۲۲) میں آ رہا ہے: ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾ تو اس سے عقلاً یہ بات ثابت

يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ﴿۲۰﴾

وہ رات اور دن تسبیح کرتے ہیں، وقفہ نہیں کرتے ﴿۲۰﴾

ہوئی کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے اور ملک یعنی بادشاہ بھی۔ (بقائے)

﴿۲۰﴾ وَمَنْ عِنْدَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ : یعنی عرش اٹھانے والے (حادثہ : ۱۷) اور دوسرے فرشتے اور اللہ کی وہ مخلوق جسے وہی جانتا ہے۔ یعنی اتنی عظمت والے فرشتے جب ہمیشہ اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے آپ کو اس سے بڑا نہیں سمجھتے تو پھر انسان کی کیا بساط ہے کہ اپنے آپ کو اس کی عبادت سے بالاتر سمجھے؟

﴿۲۱﴾ وَلَا يَسْتَخِيرُونَ : ”حَسْرَ يَحْسِرُ حُسُورًا (ض)“ تھک کر رہ جانا۔ سورہ ملک میں ہے : ﴿يَنْقَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ حَاسِرًا وَهُوَ حَسِيرٌ﴾ [الملك : ۴] ”نظر ناکام ہو کر تیری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی۔“ یہاں ایک سوال ہے کہ ”يَسْتَخِيرُونَ“ باب استفعال سے ہے جس میں طلب کا معنی پایا جاتا ہے، یا حروف میں اضافے کی وجہ سے معنی میں مبالغہ ہو جاتا ہے، یہاں باب استفعال لانے میں کیا نکتہ ہے؟ اہل علم نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ ”وَلَا يَسْتَخِيرُونَ أَي لَا يَطْلُبُونَ أَنْ يَنْقَطِعُوا عَنْ ذَلِكَ فَاتَّسَجَ ذَلِكَ قَوْلُهُ «يَسْتَخِيرُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ»“ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تھکنا چاہتے ہی نہیں اور انھیں اس کی طلب ہی نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ رات دن اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں، وقفہ نہیں کرتے۔“ (بقائے) اس کا سب سے اچھا جواب وہ ہے جو ابوالسعود اور آلوسی رحمہما نے دیا ہے کہ جب حرف نفی مبالغہ کے لفظ پر آئے تو مراد مبالغہ کی نفی نہیں ہوتی بلکہ نفی میں مبالغہ ہوتا ہے، جیسا کہ ”وَمَا سَأَلَكَ بِظُلْمٍ لِّلْعَبِيدِ“ کا معنی یہ نہیں ہوگا کہ ”تیرا رب بندوں پر بہت زیادہ ظلم کرنے والا نہیں“ بلکہ یہ ہوگا کہ ”تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔“ دیکھیے سورہ آل عمران (۱۸۲) اور انفال (۵۱) چنانچہ ”وَلَا يَسْتَخِيرُونَ“ کا معنی ہوگا ”اور وہ ذرا برابر نہیں سمجھتے۔“ ”وَلَا يَسْتَكْبِرُونَ“ کی بھی یہی توجیہیں ہیں۔ اس کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے سورہ نحل (۵۰، ۴۹) اور نساء (۱۷۲)۔

آیت 20 يَسْبِحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ : ”الْفُتُورُ“ کا معنی کسی کام سے رک جانا ہے، جیسا کہ فرمایا : ﴿قَدْ جَاءَكَ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكَ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرَّسُولِ﴾ [المائدة : ۱۹] ”بے شک تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے، جو تمہارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے، رسولوں کے ایک وقفے کے بعد۔“ یعنی فرشتے رات دن اللہ کی تسبیح کرتے ہیں، کبھی نہیں رکتے، وقفہ نہیں کرتے۔ یہاں ایک سوال ہے جو عبد اللہ بن حارث بن نوفل نے کعب احبار سے کیا کہ آپ بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے متعلق فرمایا : ﴿يَسْبِحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ﴾ تو کیا انھیں آپس کی بات چیت، پیغمبروں کو وحی پہنچانا اور دوسرے کام تسبیح میں رکاوٹ نہیں بنتے؟ انھوں نے فرمایا : ”بیٹا! اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تسبیح ایسے ہی کر دی ہے جیسے تمہارے لیے سانس لینا کر دیا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ تم بات کرتے ہوئے سانس لیتے جاتے ہو اور چلتے ہوئے سانس لیتے رہتے ہو؟“ [طبری من طرق يعقوب أحدهما الآخر . حکمت بن بشیر] دن رات بغیر وقفے کے تسبیح سے مراد مبالغہ بھی ہو سکتا ہے کہ

أَوْ اتَّخَذُوا إِلَهًا مِّنَ الْأَرْضِ هُمْ يُنْشِرُونَ ﴿۲۱﴾

یا انھوں نے زمین سے کوئی معبود بنا لیا ہے، جو زندہ کریں گے ﴿۲۱﴾

وہ بہت زیادہ تسخیر کرتے ہیں، جیسے کہتے ہیں کہ فلاں تمھاری ہر وقت تعریف کرتا ہے، یا میں دن رات تمھیں یاد کرتا ہوں وغیرہ۔ مفسر آلوسی نے اس توجیہ کی تعریف کی ہے۔ (روح المعانی) یا جس طرح ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرمایا: «سَمَّاكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللَّهَ عَلَى كُلِّ أُحْيَانِيَةٍ» [مسلم، الحنف، باب ذكر الله في حال الجنابة وغيرها: ۳۷۳] "آپ ﷺ اپنے تمام اوقات میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔" ظاہر ہے آپ اپنی انسانی ضروریات، دعوت و تبلیغ اور جہاد کے لیے بات بھی کرتے تھے، کھاتے پیتے اور سوتے بھی تھے، اس کے باوجود اللہ کی یاد سے دل غافل نہیں ہوتا تھا۔ یہ توجیہ کعب احبار کی توجیہ سے ملتی جلتی ہے۔

آیت 21 ﴿۲۱﴾ أَوْ اتَّخَذُوا إِلَهًا مِّنَ الْأَرْضِ هُمْ يُنْشِرُونَ.....: "اَوْ" کسی جملہ استنبہامیہ کے بعد آتا ہے، جو ہر مقام پر سیاق و سباق سے سمجھ میں آ رہا ہوتا ہے۔ یہاں پہلی آیات کو مد نظر رکھتے ہوئے مفسر بقایٰ رحمت نے فرمایا: "کیا یہ لوگ جان چکے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کی برہستی اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اس میں اسی کا امر نافذ ہے اور یہ جان کر اپنی گمراہی سے باز آچکے ہیں یا جاننے کے باوجود اپنی ہمت پر قائم ہیں اور انھوں نے زمین سے کچھ معبود بنا لیے ہیں جو اکیسے زندگی کی روح پھونک سکتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر یہ ایسے بے چاروں کو معبود کیوں مان رہے ہیں؟"

﴿۲۱﴾ "إِلَهًا مِّنَ الْأَرْضِ" کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بنائے ہوئے معبود سب زمین سے تعلق رکھتے ہیں، بت ہوں یا قبریں، درخت ہوں یا دریا، جانور ہوں یا انسان یا جن، مردہ داتا و دیگر ہوں یا زندہ، سب اسی مٹی سے ہیں جو قدموں تلے روندی جاتی ہے۔ ان کی کوڑھ مغزی دیکھو کہ انھوں نے کس قدر بے وقعت ہستیوں کو اس رب کے ہوتے ہوئے حاجت روا اور مشکل کشا بنا لیا جو زمین ہی کا نہیں عرش کا بھی رب ہے۔ اگلی آیت میں اسی مناسبت سے فرمایا: ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ "سو پاک ہے اللہ جو عرش کا رب ہے، ان چیزوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔" جو زمین و آسمان دونوں کا مالک ہے اور دونوں میں اسی کی عبادت ہوتی ہے۔ دیکھیے سورہ زخرف (۸۳، ۸۵)۔

﴿۲۱﴾ هُمْ يُنْشِرُونَ: ماوردی نے فرمایا: "اس میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ اس کا معنی "يَخْلُقُونَ" ہے، یعنی وہ پیدا کرتے ہیں، یہ قطرب کا قول ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا معنی "يُحْيُونَ" ہے، یعنی وہ دوبارہ زندہ کریں گے، یہ مجاہد کا قول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ دونوں معنوں میں آتا ہے۔ پہلے معنی کی تائید سورہ روم کی آیت (۲۰) سے ہوتی ہے اور دوسرے معنی کی سورہ عمس کی آیت (۱۹) سے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا انھوں نے کوئی ایسے معبود بنائے ہیں جو پہلی دفعہ پیدا کرتے ہیں یا دوبارہ زندہ کریں گے؟ یہ شان تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ [الروم: ۲۷] "اور وہی ہے جو خلق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور وہ اسے زیادہ آسان ہے۔" اس کے سوا کوئی نہ پیدا کر سکتا ہے اور نہ دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ دیکھیے سورہ فرقان (۳)۔

لَوْ كَانَ فِيهَا إِلَهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۗ فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَنَّا يَصِفُونَ ﴿۲۲﴾

اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔ سو پاک ہے اللہ جو عرش کا رب ہے، ان چیزوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں ﴿۲۲﴾

﴿۴﴾ هُمْ يُنشِرُونَ : یعنی کیا ان کے کوئی ایسے معبود ہیں کہ وہی زندگی بخشنے ہیں اور دوبارہ بھی وہی زندہ کریں گے؟ یہ ان کے معبودوں سے مذاق ہے کہ ذرا ان کی اوقات تو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اکیلے ہی یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔

﴿۵﴾ ابن جریر نے ”مِنَ الْأَرْضِ“ کو ”يُنشِرُونَ“ کے متعلق کیا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ یا انھوں نے کوئی ایسے معبود بنا رکھے ہیں جو (لوگوں کو) زمین سے دوبارہ زندہ کریں گے۔

آیت 22 لَوْ كَانَ فِيهَا إِلَهَةٌ إِلَّا اللَّهُ..... : یعنی ان لوگوں نے تو زمین سے لے کر کئی معبود بنا رکھے ہیں، جب کہ

زمین اور آسمان دونوں میں ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌُ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌُ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ﴾ [الرعرع: ۸۷] ”اور وہی ہے جو آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہی کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔“

کیونکہ معبود برحق تو وہ ہے جو پوری قدرت اور مکمل اختیار رکھنے والا ہو اور کسی معاملے میں عاجز نہ ہو۔ اب اگر زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور بھی قادر و مختار ہوتے تو کائنات کا یہ سلسلہ کبھی کا درہم برہم ہو چکا ہوتا۔ کیونکہ ان سب کی ہمیشہ تکفیش رہتی اور کوئی چیز اپنی مرتبہ شکل میں نہ بن سکتی اور نہ چل سکتی، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَا أَشْخَذَ

اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنَ الْإِلٰهِ إِذَا دَخَلَ كُنَّ إِلٰهًا يَخْلُقُ وَ لَعَلَّا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَنَّا

يَصِفُونَ﴾ [المؤمنون: ۹۱] ”نہ اللہ نے (اپنی) کوئی اولاد بنائی اور نہ کبھی اس کے ساتھ کوئی معبود تھا، اس وقت ضرور ہر معبود، جو کچھ اس نے پیدا کیا تھا، اسے لے کر چل دیتا اور یقیناً ان میں سے بعض بعض پر چڑھائی کر دیتا۔ پاک ہے اللہ اس

سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔“ اسی طرح ان میں سے ہر ایک اپنی قوت و اختیار منوانے کے لیے پوری کائنات کا اختیار حاصل کرنے کی کوشش کرتا اور عرش پر قبضے کی جدوجہد کرتا، نتیجہ پوری کائنات کی تباہی ہوتا، فرمایا: ﴿قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ إِلٰهَةٌ كَمَا

يَقُولُونَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلَى ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا﴾ [بنی اسرائیل: ۷۲] ”کہہ دے اگر اس کے ساتھ کچھ اور معبود ہوتے، جیسا کہ کہ یہ کہتے ہیں تو اس وقت وہ عرش والے کی طرف کوئی راستہ ضرور ڈھونڈتے۔“

خلاصہ یہ کہ زمین و آسمان میں کسی فساد کا نہ ہونا اور پوری کائنات میں زبردست ترتیب اور ہم آہنگی کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا مالک اور انھیں چلانے والا ایک ہی ہے۔ یہ دلیل بہت زبردست، نہایت ہی سادہ اور آسانی سے سمجھ میں

آنے والی ہے۔ ایک چھوٹے سے گھر کا نظام کبھی درست نہیں چل سکتا اگر اس کا ذمہ دار ایک نہ ہو اور نہ ایک مملکت میں دو فرماں روا رہ سکتے ہیں، تو اتنی بڑی کائنات کا نظام دو فرماں رواؤں کی صورت میں کیسے چل سکتا ہے؟ علمائے اسلام نے اس

دلیل کی کئی طرح سے تشریح فرمائی ہے، میں ان میں سے صرف دو تشریحات نقل کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ اگر ہم دو معبود فرض

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ ﴿۲۳﴾ أَمْ اِتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُلُوبًا بِرُءُوسِهِمْ

اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جاتا ہے ﴿۲۳﴾ یا انہوں نے اس کے سوا کوئی معبود کریں تو کسی چیز کو حرکت دینے یا ساکن رکھنے میں اگر دونوں میں اختلاف ہو جائے تو یہ ناممکن ہے کہ دونوں کا ارادہ پورا ہو جائے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی کا ارادہ بھی پورا نہ ہو (کیونکہ پھر وہ قادر و مختار ہی کیا ہوئے؟) اگر صرف ایک کا ارادہ پورا ہو تو دوسرا عاجز ٹھہرا، جو کسی صورت معبود برحق نہیں ہو سکتا اور دونوں کے اختلاف کا ممکن ہونا اس کے واقع ہونے کے قائم مقام ہے۔ دوسری تشریح یہ ہے کہ عدم سے وجود میں آنے والا ہر جز ناممکن ہے کہ دو قدرتوں کے نتیجے میں پیدا ہو۔ جب وہ دونوں میں سے ایک کی قدرت سے وجود میں آیا، تو دوسرا زند اور بے کار ٹھہرا، جس کا اس جز میں کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح کائنات کے ہر جز اور ہر ذرے میں غور کرتے جائیں، نتیجہ صرف ایک قادر و مختار نکلے گا۔ | ابن عطیہ فی المحرر الوجیز |

آیت 23 لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ : اللہ تعالیٰ کی اس صفت کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ ہر چیز کا مالک اور سلطان وہ خود ہے، کسی کی کیا جرأت کہ اس کے کسی کام کے متعلق پوچھے کہ ایسا کیوں کیا؟ کیونکہ اپنی ملکیت میں وہ جو چاہے کرے۔ اگر وہ زمین و آسمان کی تمام مخلوق کو عذاب دے تو بھی عین عدل ہوگا، کیونکہ وہ مالک ہے اور اپنی چیز سے جو چاہے کرے۔ جس طرح انسان اپنی خریدی ہوئی ایک اینٹ کو مکان کی پیشانی پر لگا دیتا ہے، دوسری کو چولھے یا بھٹی میں لگا دیتا ہے اور کوئی اسے غلام نہیں کہتا، حالانکہ وہ اینٹ کا خالق بھی نہیں، صرف عارضی مالک ہے اور اگر اللہ تعالیٰ مخلوق پر رحم فرمائے تو اس کا فضل ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا ہر کام اتنا محکم اور درست ہے کہ اس میں کوئی خامی یا خلل نہیں، اس نے جو کیا اور جو فرمایا سب نہایت عمدہ اور کمال شن و خوبی والا ہے۔ اس لیے اس کے کسی کام کے متعلق سوال یا اعتراض کی گنجائش نہیں۔ مفسر بقاعی نے ایک قدیم فلسفی سے نقل کیا ہے کہ کسی نے اس سے پوچھا، جب اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور اس کے سوا کوئی چیز نہ تھی تو اس نے یہ جہان کیوں بنایا؟ اس نے جواب دیا کہ اس سے ”کیوں“ کا سوال ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ کوئی اس سے اوپر ہو تو یہ سوال کرے۔ اس کے برعکس لوگوں سے دونوں وجہوں سے سوال ہو سکتا ہے اور ہوگا، کیونکہ وہ مالک نہیں غلام ہیں اور مالک غلام سے پوچھ سکتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اس نے کوئی کام کیوں کیا اور اس لیے کہ ان کے ہر کام میں خامی اور خلل موجود ہے۔ قیامت کے دن سوال کا ذکر کئی آیات میں ہے، دیکھیے سورہ حجر (۹۲) اور صافات (۲۳)۔

آیت 24 ① أَمْ اِتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُلُوبًا بِرُءُوسِهِمْ : یہ بات شرک کے نہایت قبیح اور باطل ہونے کے بیان کے لیے پھر دہرائی۔ ② قُلُوبًا بِرُءُوسِهِمْ : اس سے پہلے شرک کے باطل ہونے کی دو عقلی دلیلیں بیان فرمائیں، ایک ”لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ“ اور دوسری ”لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ“، اس آیت میں اس کی دو عقلی دلیلیں بیان فرمائیں اور کفار سے مطالبہ فرمایا کہ تم بھی اپنی کوئی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرو۔ ظاہر ہے کفار کے پاس شرک کی کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی، ان کا سرمایہ محض وہم و گمان اور نفس کی خواہشیں ہیں (سورہ نجم: ۲۳، ۲۸۔ یونس: ۶۶) یا آبا و اجداد کی تقلید (زخرف: ۲۱ تا ۲۳) اور دونوں میں سے کوئی بھی دلیل

هَذَا إِذْ كُرَّ مِنْ مَعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِي ۖ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقَّ فَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿۳۷﴾

منا لیے ہیں؟ کہہ دے لاؤ اپنی دلیل۔ یہی ان کی نصیحت ہے جو میرے ساتھ ہیں اور ان کی نصیحت بھی جو مجھ سے پہلے تھے، بلکہ ان کے اکثر حق کو نہیں جانتے، سو وہ منہ پھیرنے والے ہیں ﴿۳۷﴾

یا رہبان نہیں ہے۔

﴿۳۷﴾ هَذَا إِذْ كُرَّ مِنْ مَعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِي: یہ توحید کے حق ہونے اور شرک کے باطل ہونے کی دو نقلی دلیلیں ہیں۔ ”مَنْ مَعِيَ“ (جو میرے ساتھ ہیں) سے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے مسلم مراد ہیں اور ان کے ذکر سے مراد قرآن کریم ہے جو اس امت کے لیے نصیحت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (الانبیاء: ۱۰) ”بلاشبہ یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ذکر (تمہاری نصیحت) ہے، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟“ ”وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِي“ (اور مجھ سے پہلے لوگوں کی نصیحت) سے مراد پہلی امتوں پر نازل ہونے والی کتابیں تورات، انجیل، زبور اور صحف ابراہیم وغیرہ ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ قرآن مجید اور پہلی کتابیں تمہاری دسترس میں ہیں، کسی میں شرک کی کوئی دلیل ہے تو دکھا دو۔ پہلے پچھلے تمام اہل علم کی شہادت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، فرمایا: ﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَالنَّبِيُّ كَذَّابٌ ۖ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ [آل عمران: ۱۸] ”اللہ نے اس بات کی شہادت دی کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب پر غالب ہے، کمال حکمت والا ہے۔“ قرآن مجید میں کفار سے شرک کی نقلی دلیل پیش کرنے کا مطالبہ کئی آیات میں آیا ہے۔ دیکھیے سورہ احقاف (۳) اور زخرف (۴۵)۔

﴿۳۷﴾ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقَّ: لفظ ”بَل“ کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے سامنے عقلی یا نقلی دلیلیں پیش کر کے یہ امید نہ رکھیں کہ وہ قبول کر لیں گے، کیونکہ یہ جاہل ہیں اور انھیں حق کا علم ہی نہیں۔ ”وَالنَّاسُ أُغْتَابُوا لِمَا جَهِلُوا“ (لوگ جس چیز کا علم نہ رکھتے ہوں اس کے دشمن ہوتے ہیں)۔ ”أَكْثَرُهُمْ“ سے معلوم ہوا کہ وہ سب ایسے نہیں بلکہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو حق جانتے ہیں مگر عناد کی وجہ سے تسلیم نہیں کرتے اور کچھ ایسے لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جن کی طبیعتیں حق جان کر اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو چکی ہوتی ہیں، جیسے عمر بن خطاب اور ان جیسے دیگر اصحاب (رضوانہم) تھے اور ایسے لوگوں کی امید پر ہی داعیان حق کا حوصلہ قائم رہتا ہے۔

﴿۳۸﴾ فَهُمْ مُعْرِضُونَ: اس میں ان کے جہل کا سبب بیان فرمایا کہ وہ حق معلوم کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور نہ کسی دلیل پر غور کرتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَنْظُرُونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ﴾ [يوسف: ۱۰۵] ”اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے گزرتے ہیں اور وہ ان سے بے دھیان ہوتے ہیں۔“

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوْحٍ إِلَيْهِ إِنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ﴿۷۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ ۗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ﴿۷۶﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو ﴿۷۵﴾ اور انھوں نے کہا رحمان نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے، وہ پاک ہے، بلکہ وہ بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے ﴿۷۶﴾

آیت 25 ﴿۱﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ: پچھلی آیت میں ”هَذَا ذِكْرٌ مَنْ مَعْبُودٍ وَذِكْرٌ مَنْ قَبْلِي“ کہہ کر جو بات اختصار کے ساتھ کہی گئی تھی اب وہ واضح الفاظ میں تاکید کے ساتھ دہرائی گئی ہے اور جس بات کا حوالہ صرف چند کتابوں کے ساتھ خاص تھا اب تمام رسولوں کے ذکر کے ساتھ اسے عام کر کے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ آپ سے پہلے جو بھی رسول ہم نے بھیجا، خواہ اسے کتاب دی یا نہ دی، اسے یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، سو میری عبادت کرو۔ مزید دیکھیے سورہ نحل (۳۶) معلوم ہوا تمام رسول توحید الوہیت کی دعوت دینے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے کہ عبادت صرف اللہ کی کرو اور اسی سے دعا اور فریاد کرو، کیونکہ توحید ربوبیت کے تو اکثر کفار بھی قائل تھے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو خالق، مالک اور رازق مانتے تھے، مگر پکارتے وقت غیر اللہ کو بھی پکارتے اور انھیں نفع نقصان کا مالک سمجھتے تھے، یا یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ اپنی بات اللہ تعالیٰ سے منوا سکتے ہیں اور ہماری حاجتیں پوری کروا سکتے ہیں۔ دیکھیے سورہ یونس (۱۸) اور سورہ زمر (۳)۔

آیت 26 ﴿۲﴾ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر پہلے اپنی صفات کے تعدد کی بنا پر جمع منکلم کے ساتھ کیا ہے، مراد اپنی عظمت کا اظہار ہے، پھر جب توحید کا ذکر آیا تو اپنا ذکر واحد منکلم کے ساتھ فرمایا کہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ“ اس میں ”أَنَا“ (میں) بھی واحد ہے اور ”فَاعْبُدُونِ“ (جو اصل میں ”فَاعْبُدُونِي“ تھا) کی یائے منکلم بھی واحد ہے، یہاں جمع کا صیغہ استعمال نہیں فرمایا، تاکہ شبہ بھی پیدا نہ ہو کہ معبود ایک سے زیادہ ہیں۔

آیت 26 ﴿۱﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا: عقلی اور نقلی دلیلوں سے شرک کی تردید کے بعد اب ان لوگوں کا رد کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے صاحب اولاد ہونے کے قائل تھے۔ عرب کے بعض مشرکین کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ بعض یہود کا کہنا تھا کہ (نعوذ باللہ) جنات اللہ تعالیٰ کے سرال ہیں، جن سے فرشتے پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح یہود نے عزیزیہ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بتایا۔ نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو اور بعض مسلمان کہلانے والوں نے نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور کا ٹکڑا قرار دیا اور بعض نے کہا۔

خدا کے نور سے پیدا ہوئے ہیں پانچوں تن محمد است، علی، فاطمہ، حسین و حسن

چونکہ یہ شرک کی بدترین صورت اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی گستاخی تھی (دیکھیے مریم: ۹۰ تا ۹۸۔ بقرہ: ۱۱۶۔ نساء: ۱۷۱)

اس لیے اللہ تعالیٰ نے کئی طرح سے اس کا رد فرمایا۔

لَا يَسْقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ﴿۲۷﴾

وہ بات کرنے میں اس سے پہل نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم کے ساتھ ہی عمل کرتے ہیں ﴿۲۷﴾

﴿۲۷﴾ سب سے پہلے یہ کہہ کر رد فرمایا کہ "وَقَالُوا لَوِ اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا" (اور انھوں نے کہا رحمان نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے) یعنی باپ اور اولاد ایک جنس ہوتے ہیں، اب کہاں رحمان کہ جس کی کمال رحمت سے یہ کائنات وجود میں آئی اور مسلسل چل رہی ہے اور جس کے سوا "رحمان" نام کا مصداق تم بھی کسی کو نہیں سمجھتے۔ اگر اس کی اولاد مانو تو والد اور اولاد کے ایک جنس ہونے کی وجہ سے فرشتوں کو اور عزیر و مسیح علیہ السلام کو اور ایک ہی نور سے ہونے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ اور پیغمبر اور پیغمبر کو اسم رحمان کا مصداق ماننا پڑے گا۔ خود ہی سوچ لو کیا یہ رحمان تھے؟

﴿۲۸﴾ پھر "سُبْحَانَكَ" کہہ کر رد فرمایا، یعنی جن کمزوریوں کی وجہ سے اولاد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان سے پاک ہے۔ انسان کو اولاد کی ضرورت اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ہوتی ہے، تاکہ وہ مشکل میں اس کی مدد کرے، بڑھاپے میں اس کا سہارا (عصائے پیری) بنے اور مرنے کے بعد اس کی جانشین بنے۔ پھر اولاد کے لیے بیوی کا ہونا لازم ہے، انسان اپنی خواہش نفس کی وجہ سے بیوی کا محتاج ہوتا ہے۔ دیکھیے سورۃ انعام (۱۰۱) رحمان ان تمام کمزوریوں سے پاک ہے، اگر اس میں یہ کمزوریاں ہوں تو وہ رحمان نہیں ہوگا، بلکہ خود رحم کے قابل ہوگا، جس طرح تمام انسان، جن، فرشتے اور تمام مخلوقات ہیں۔ پھر وہ نہ رحمان ہوگا اور نہ تمام عیوب اور کمزوریوں سے پاک۔ [سُبْحَانَكَ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ]

﴿۲۹﴾ پھر "بَنِي عِبَادًا" کہہ کر رد فرمایا، یعنی جنہیں یہ لوگ اولاد کہہ رہے ہیں وہ بندے (غلام) ہیں۔ غلام اپنے مالک کی اولاد نہیں ہوتا اور اولاد اپنے باپ کی غلام نہیں ہوتی۔ بندگی اور ولدیت جمع نہیں ہو سکتیں۔ اہل علم نے اس آیت سے استدلال فرمایا کہ اگر کسی کا بیٹا غلامی کی حالت میں اس کی ملکیت میں آئے تو آزاد ہو جائے گا، کیونکہ ولدیت اور عبدیت جمع نہیں ہو سکتیں۔

﴿۳۰﴾ "مَكْرُومُونَ" کفار نے ان ہستیوں کی عظمت شان کی وجہ سے انھیں اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس شبہ کو یہ کہہ کر رد فرمایا کہ ان ہستیوں کی تمام عظمت و رفعت صرف اس لیے ہے کہ انھیں عزت عطا کی گئی ہے۔ اس میں ان کا اپنا کمال کچھ نہیں، جب کہ والد اور اولاد اوصاف میں یکساں اور برابر کا جوڑ ہوتے ہیں۔

آیت 27 ﴿۲۷﴾ لَا يَسْقُونَهُ بِالْقَوْلِ : یعنی ان کی بندگی اور فرماں برداری کا یہ حال ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر بات تک نہیں کرتے۔

﴿۲۸﴾ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ : "بِأَمْرِهِ" کو پہلے لانے سے دو باتیں واضح ہوئیں، ایک یہ کہ وہ جو کرتے ہیں اس کے حکم سے کرتے ہیں، اس کے حکم کے بغیر نہیں کرتے۔ دوسری یہ کہ وہ ہر کام صرف اس کے حکم سے کرتے ہیں، کسی اور کے حکم سے نہیں۔ غور کرو، بندگی اور غلامی کی انتہا ہے کہ مولا کی مرضی کے بغیر نہ بولتے ہیں نہ کچھ کرتے ہیں، بھلا اولاد بھی اس طرح ہوتی ہے؟ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ سے اولاد کی نفی فرمائی۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ وَهُمْ
 مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَهٌُ مِنْ دُونِهِ فَذَلِكَ نَجْزِيهِ
 جَهَنَّمَ كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿۲۹﴾

وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے اور وہ اسی کے خوف سے ڈرنے والے ہیں ﴿۲۸﴾ اور ان میں سے جو یہ کہے کہ میں اس کے سوا معبود ہوں تو یہی ہے جسے ہم جہنم کی جزا دیں گے۔ ایسے ہی ہم ظالموں کو جزا دیتے ہیں ﴿۲۹﴾

آیت 28 ﴿۱﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ : یعنی جو کام وہ کر چکے یا جو آئندہ کریں گے وہ ان سب کو جانتا ہے۔ اس میں ان کے اس قدر اطاعت گزار اور فرماں بردار ہونے کی وجہ بیان فرمائی ہے، یعنی وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری پہلی، پچھلی، ظاہر اور پوشیدہ ہر بات جانتا ہے، اس لیے وہ اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

﴿۲﴾ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ : یعنی وہ اسی کے حق میں سفارش کرتے ہیں جسے وہ پسند کرے اور جس کے حق میں سفارش کو پسند کرے اور اس کی اجازت دے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۵۵) اور سہا (۲۳) مراد اس سے اہل ایمان اور اہل توحید ہیں، کیونکہ کافر و مشرک نہ اللہ کو پسند ہیں اور نہ اسے ان کے حق میں سفارش پسند ہے۔ یہ سفارش دنیا میں بھی ہے، جیسا کہ فرشتے اہل ایمان کے حق میں دعا اور استغفار کرتے ہیں (دیکھیے سورہ مؤمن : ۷۹ تا ۹۳) اور انبیاء و رسل بھی ان کے حق میں دعا کیا کرتے تھے۔ آخرت میں بھی فرشتے اور انبیاء سفارش کریں گے۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكِبَائِرِ مِنْ أُمَّتِي » [مستدرک حاکم : ۱۶۹۱، ج : ۲۲۸، و صحیحہ الدہبی] ”میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہوں والے لوگوں کے لیے ہوگی۔“ اس میں بھی اولاد کی نفی ہے، کیونکہ اولاد والد کی مرضی کے خلاف بھی سفارش کر سکتی ہے۔

﴿۳﴾ وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ : اس میں فرشتوں اور رسولوں کی اللہ تعالیٰ کے لیے انتہائی تعظیم کا ذکر فرمایا کہ وہ اس کے خوف کی وجہ سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی اولاد نہ ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ والد اور اولاد کا یہ حال نہیں ہوتا۔

آیت 29 ﴿۱﴾ وَمَنْ يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَهٌُ مِنْ دُونِهِ..... : یعنی بالفرض اگر ان فرشتوں یا انبیاء میں سے کوئی یہ کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میری بندگی کرو، تو ہم اسے اس کی جزا جہنم دیں گے۔ فرشتوں اور انبیاء سے یہ بات کبھی سرزد نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کو شرک کرنے کی صورت میں تمام اعمال ضائع ہونے کی وعید سنائی ہے، حالانکہ انھوں نے شرک کرنا ہی نہیں تھا۔ دیکھیے سورہ انعام (۸۸ تا ۸۳) اور زمر (۶۵)۔

﴿۲﴾ كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ : اس سے بڑا ظلم کیا ہو گا کہ ہر لحاظ سے ناقص اور فقیر مخلوق اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں رب اور

أَوْلَم يَرِ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۖ وَ
جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۰﴾

اور کیا جن لوگوں نے کفر کیا یہ نہیں دیکھا کہ سارے آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے تو ہم نے انہیں پھاڑ کر الگ کیا اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی، تو کیا یہ لوگ ایمان نہیں لاتے ﴿۳۰﴾
معبود ہونے کا دعویٰ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ شرک سے بڑا ظلم اور بے انصافی کوئی نہیں۔ (القمان: ۱۳) اور اسی لیے آخرت میں اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں۔ دیکھیے سورہ نساء (۴۸، ۱۱۶) اور مائدہ (۷۲)۔

آیت 30 ﴿۱﴾ أَوْلَم يَرِ الَّذِينَ كَفَرُوا : ”رَتْقًا“ کا معنی دو یا کئی چیزوں کا آپس میں سختی سے جڑا اور چپکا ہوا ہونا ہے، خواہ وہ فطری ہو (جیسے پتھر) یا کسی کے بنانے سے۔ (راغب) یہ مصدر بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہے، یعنی بالکل بند۔ ”فَتَقْنَا“ کا معنی ایسی جڑی ہوئی چیزوں کو الگ کرنا ہے۔ ”أَوْلَم يَرِ“ کا معنی ہے ”اور کیا دیکھا نہیں“ اور جہاں دیکھی جانے والی چیز نہ ہو وہاں معنی ہے ”اور کیا جانا نہیں۔“ (دیکھیے سورہ فصل) اس آیت کے دو معنی ہیں اور دونوں درست ہیں۔ طبری نے حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے: «كَانَتَا مُلْتَزِمَتَيْنِ» ”سارے آسمان اور زمین آپس میں سختی سے ملے ہوئے تھے۔“ یعنی کیا یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکار کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ بے بس ہستیوں کو شریک بنا رہے ہیں، انہیں معلوم نہیں کہ سارے آسمان اور زمین ایک ٹھوس تودہ تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پناہ قوت اور کمال قدرت کے ساتھ ان کو الگ الگ کر کے درمیان میں ہوا اور خلا کا فاصلہ کر دیا اور آسمانوں کو سات آسمان اور زمین کو سات زمینیں بنا دیا۔ دیکھیے سورہ طلاق (۱۲) بھلا اس کے سوا کسی کی یہ مجال ہے؟ آج کل سائنس بھی تسلیم کرتی ہے کہ کائنات پہلے ایک تودے کی شکل میں تھی، پھر ایک بہت بڑے دھماکے کے ساتھ جدا جدا ہوئی، مگر بے چارے سائنس دان وہ دھماکا کرنے والے سے نا آشنا ہی رہے۔ (الاما شاء اللہ)

دوسرا معنی یہ ہے کہ کیا اللہ کی توحید کے منکروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان بند تھا، اس سے ایک قطرہ نہیں برستا تھا اور زمین بند تھی، اس سے ایک پتہ نہیں اگتا تھا؟ ہم نے اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ اپنی مخلوق کے فائدے کے لیے بارش کے ساتھ آسمان کے دہانے کھول دیے اور اس کے ساتھ زمین کے مسام کھول کر طرح طرح کی نباتات پیدا فرمادیں۔

﴿۲﴾ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ : اس میں انسان، حیوان، پودے اور درخت سب شامل ہیں۔ پانی سے جاندار چیز کی پیدائش کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ نور (۳۵) اور نباتات کی پیدائش کے لیے دیکھیے سورہ انعام (۹۹)۔

﴿۳﴾ ہمارے استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ امام رازی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”یعنی جن چیزوں میں جان ہے، جیسے حیوانات اور نباتات، ان سب کی پیدائش پانی سے ہے، لیکن فرشتے اور جن یا دوسری کوئی چیز جس کے متعلق ثابت ہو جائے کہ اس کے مادہ میں پانی کو دخل نہیں ہے، وہ اس سے مستثنیٰ قرار پائیں گی۔“ (کبیر) دراصل یہ اس سوال کا جواب ہے کہ فرشتے اور جن تو پانی

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ ۖ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿٣١﴾

اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے کہ وہ انھیں بلانہ دے اور ہم نے ان میں کشادہ راستے بنا دیے، تاکہ وہ راہ پائیں ﴿٣١﴾

سے نہیں بلکہ نور اور آگ سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی پیدائش پانی سے کیسے تسلیم کی جاسکتی ہے؟ اس جواب کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ”کُلٌّ“ سے مراد کائنات کی ہر چیز نہیں ہوتی، بلکہ ہر موقع کی مناسبت سے ”کُلٌّ“ کا معنی کیا جاتا ہے، جیسا کہ ملکہ سہا کے متعلق بدہنہ نے کہا تھا: ﴿وَأُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [النمل: ٢٢] ”اور اسے ہر چیز میں سے حصہ دیا گیا ہے۔“ اور قوم عاد پر آنے والی آندھی کے متعلق اللہ نے فرمایا: ﴿كُلُّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا﴾ [الأحزاب: ٢٥] ”جو ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے برباد کر دے گی۔“ مفسر رازی کا یہ جواب معقول ہے۔ تاہم اگر ”کُلٌّ شَيْءٍ“ ہر زندہ چیز کا وجود پانی سے مان لیا جائے، جس میں انسان کے ساتھ جن اور فرشتے بھی شامل ہوں تو کچھ بعید نہیں، جب مٹی سے بننے والے انسان کا اصل پانی ہے تو آگ اور نور سے بننے والے جنوں اور فرشتوں کا اصل بھی پانی ہو سکتا ہے۔ آج جب ایٹم کو پھاڑنے کی صورت میں مادے کا توانائی میں بدلنا مشاہدے سے ثابت ہو چکا ہے، جس سے انسان کو بے پناہ تعمیری اور تخریبی قوت حاصل ہوئی ہے اور قیامت کے دن سمندر کے پانی آگ کی صورت اختیار کر جائیں گے (دیکھیے سورہ تکویر: ٦) تو اللہ کے حکم سے پانی آگ کے علاوہ نور کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

﴿٣١﴾ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ : یعنی زمین و آسمان میں حیرت انگیز نظام قائم کرنے والے ہم ہیں، کوئی اور نہیں، کیا اس پر بھی یہ لوگ توحید کا راستہ اختیار نہیں کرتے، بلکہ دوسروں کو ہمارا شریک سمجھ رہے ہیں؟

﴿٣٢﴾ رازی فرماتے ہیں: ”اس آیت (٣٠) سے آیت (٣٣) تک چار آیات میں کائنات کو بنانے والے کے وجود اور اس کے صرف ایک ہونے کے چھ قسم کے دلائل مذکور ہیں۔“ (کبیر)

آیت 31 ﴿٣١﴾ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ : ”رَوَاسِيَّةٌ“ کی جمع ہے جو ”رَسَا يَرْسُو رُسُوًا“ سے ام فاعل ہے، یعنی زمین میں گڑے ہوئے۔ ارضیات کے ماہروں پر اب یہ حقیقت ظاہر ہوئی ہے کہ پہاڑوں کا بہت بڑا حصہ زمین کے نیچے گڑا ہوا ہے۔

﴿٣٢﴾ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ : ”مَيِّدٌ مَيِّدًا وَ مَيِّدَانًا“ حرکت کرنا، معہا ہونا۔ (قاموس) ”أَنْ تَمِيدَ“ اصل میں ”أَنْ لَا تَمِيدَ“ ہے۔ یہ تیسری دلیل ہے، یعنی اگر زمین میں یہ بھاری پہاڑ نہ گڑ دیے جاتے تو اس میں ہر وقت زلزلے اور حرکت کی حالت رہتی، اس میں نہ وہ توازن ہوتا اور نہ سکون جو مخلوق کے رہنے کے لیے ضروری ہے۔ وہ کسی وقت بھی ایک طرف جھک جاتی، یا زلزلے سے دو چار رہتی جس سے زمین کے ستر فیصد حصے پر پھیلا ہوا سمندر کا پانی خشکی پر چڑھ دوڑتا اور زمین پر ایک تنفس بھی باقی نہ رہتا۔ اب بھی کبھی کبھار اللہ تعالیٰ زلزلے کے ذریعے سے اپنی نعمت یا دلاتا رہتا ہے، جس سے سمندر کا پانی خشکی پر چڑھ دوڑتا ہے اور مٹیوں تک آبادیوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا ۗ وَهُمْ عَنْ آيَاتِنَا مُعْرِضُونَ ﴿۳۱﴾ وَهُوَ الَّذِي
خَلَقَ الْإِنِّلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۗ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿۳۲﴾

اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا اور وہ اس کی نشانیوں سے منہ پھرنے والے ہیں ﴿۳۱﴾ اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند پیدا کیے، سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں ﴿۳۲﴾

﴿۳۱﴾ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا: ”فِجَاجًا“ کی جمع ہے، یعنی پہاڑوں کے درمیان کھلا راستہ۔ زمخشری نے ”فِجَاجًا“ کو ”سُبُلًا“ سے حاس قرار دیا ہے، کیونکہ یہ کمرہ ”سُبُلًا“ کی صفت ہے جو پہلے آئی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَسْنَا لَكُمْ إِلَهًا سُبُلًا﴾ ﴿انج: ۲۰﴾ تاکہ تم اس کے کھلے راستوں پر چلو، یعنی اگر یہ بلند اور ٹھوس پہاڑ اس طرح واقع ہوتے کہ ان میں کوئی راستہ نہ ہوتا، یا ان میں دشمنوں کی موقی بلکہ خود انکھڑے ہوتے تو نہ زمین کی ایک طرف کے لوگ دوسری طرف جاسکتے، نہ ایک شہر کے لوگ دوسرے شہر کے لوگوں سے مل سکتے اور نہ خود پہاڑوں پر آبادی ہو سکتی۔ یہ ہماری قدرت کا کما ہے کہ ہم نے پہاڑوں میں ندی نالوں، دروں اور دھولوں کی صورت میں آنے جانے کے کشتہ دو راستے بنا دیے ہیں، جس سے پہاڑ بھی میدانوں کی طرح آباد ہیں۔

﴿۳۲﴾ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ: تاکہ وہ زمین میں جہاں جانا چاہیں اس کے لیے راہ پائیں اور تاکہ وہ زمین و آسمان اور پہاڑوں کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے دیکھ کر اس کی توحید کی راہ پائیں۔ ”يَهْتَدُونَ“ میں دونوں مفہوم شامل ہیں۔

آیت 32 ﴿۱﴾ وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا ﴿۱﴾ زمین کے چند عجیب کے ذکر کے بعد آسمان کے عجائب کی طرف متوجہ فرمایا۔ لوگوں کی بنائی ہوئی چھوٹی سی چھتیں بھی دیواروں یا ستونوں کے بغیر قائم نہیں رہ سکتیں اور پھر ان میں ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان سے بڑے والی چیزیں کسی نہ کسی نقصان کا باعث بنتی ہیں، وہ جتنی دیر بھی رہیں آخر گر پڑتی ہیں۔ چوران میں نقب لگا کر مال و متاع چرا کر لے جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے آسمان کو زمین کے لیے ایسی چھت بنایا جو ستونوں کے بغیر قائم ہے۔ دیکھیے سورہ رعد (۲) اور لقمان (۱۰) اور کرنے سے مومن سے منقول ہے۔ دیکھیے سورہ فاطر (۴۱) اور سورہ حج (۶۵) اس سے کوئی نقصان وہ چیز نیچے آنے کے بجائے زندگی کو قائم رکھنے والی چیزیں، مثلاً سورج کی تیز روشنی (ضیا) اور حرارت، چاند اور ستاروں کا نور، رات دن کا آنا جانا، بادل، بارش، ہوا میں، فرشتے اور اللہ تعالیٰ کی سبے شہر نظر نہ آنے والی رحمتیں اترتی ہیں۔ پھر نقب تو بہت دور، راز چرانے کی کوشش کرنے والے شیاطین سے بھی شہاب ثاقب کے ذریعے سے اس کی حفاظت کا زبردست انتظام کیا گیا ہے۔ دیکھیے سورہ حجر (۱۲) اور صافات (۶) اور ﴿۱۰﴾

﴿۲﴾ وَهُمْ عَنْ آيَاتِنَا مُعْرِضُونَ: یعنی مشرک لوگ آسمان اور اس میں پائی جانے والی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، مثلاً سورج، چاند، ستارے، رات، دن، بارش، بادل، بجلی، جواہر اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی سبے شمار چیزیں۔ کیونکہ اگر وہ عبرت کی نظر سے ان تمام چیزوں کو دیکھیں تو یقین کر لیں کہ ان کا بنانے والا موجود ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

آیت 33 ﴿۱﴾ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ الْإِنِّلَ وَالنَّهَارَ: پچھلی آیت میں مشرکوں کے زمین و آسمان کی نشانیوں سے منہ موڑنے

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ - أَقَابِينَ مِتَّ فَهُمْ الْخَالِدُونَ ﴿۳۴﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کے لیے بھیجی نہیں رکھی، سو کیا اگر تو مر جائے تو یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۳۴﴾

کا ذکر فرمایا، اس آیت میں ان میں سے چند نشانیاں ذکر فرمائی ہیں، یعنی رات، دن، سورج اور چاند۔ بڑی نشانیوں کے ذکر کے بعد چھوٹی نشانیوں، مثلاً ستاروں وغیرہ کے ذکر کی ضرورت نہیں رہی۔ ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۱۲)، قصص (۷۲، ۷۱)، یونس (۶۰، ۵)، فرقان (۶۲، ۶۱)، انعام (۹۶) اور لیس (۳۷ تا ۴۰)۔

﴿۳۴﴾ كُلُّ فِي فَلَاكٍ يَسْبُحُونَ: ”فَلَاكٍ“ دراصل چرخے کے دھاگا بنانے والے نکلے پر گھومنے والے گول چترے کو کہتے ہیں، پھر ہر دائرے کو فلک کہہ لیتے ہیں۔ ”سَبَّحَ يَسْبُحُ“ (ف) کا معنی تیرنا ہے۔ نہایت تیزی سے چلنے کو بھی تیرنے سے تشبیہ دیتے ہیں، جیسا کہ حتمی نے کہا ہے۔

أَعْرُ مَكَانٍ فِي الدُّنْيَا سَرَّحَ سَابِغٍ وَ خَيْرٌ جَلِيسٍ فِي الرِّمَانِ بِكِنَابٍ

”دنیا میں سب سے زیادہ باعزت جگہ تیرنے والے گھوڑے کی زین ہے اور زمانے میں سب سے بہتر ہم نشین کتاب ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ سورج، چاند اور تمام سیارے اپنے اپنے دائرے میں نہایت تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ کوئی اپنے مقرر کردہ مدار سے نہ ادھر ادھر ہوتا ہے اور نہ خراب ہو کر رکتا ہے۔ نہ کسی میں کوئی حادثہ رونما ہوتا ہے اور نہ تصادم، فرمایا: ﴿ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ﴾ [یس: ۳۸] ”یہ اس کا مقرر کردہ اندازہ ہے جو سب پر غالب، سب کچھ جاننے والا ہے۔“

آیت 34 ﴿۳۴﴾ ﴿۱﴾ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ: اس سے پہلے چار آیات میں خالق کائنات کے وجود اور اس کی توحید کے چھ دلائل بیان فرمائے۔ اب یہاں سے بیان فرمایا کہ یہ نظام ہمیشہ قائم رہنے کے لیے نہیں بلکہ امتحان اور آزمائش کے لیے بنایا گیا ہے۔ (کبیر)

﴿۲﴾ بقایٰ نے پچھلی آیت کے ساتھ یہ مناسبت ذکر کی ہے کہ اس میں رات دن کے آنے جانے کا ذکر ہے، جس سے ہر انسان کی عمر کا سلسلہ آخر منقطع ہو جاتا ہے، اس لیے فرمایا کہ ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر کے لیے بھیجی نہیں رکھی، خواہ نیک ہو یا بد۔ یہ آیت حضرت علیؓ کے زندہ نہ ہونے کی بھی ایک بہت مضبوط دلیل ہے۔ رہے عیسیٰ علیہ السلام، تو ان کی عمر بہت طویل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ انھیں ہمیشہ کی زندگی حاصل ہے، کیونکہ قیامت کے قریب زمین پر اترنے کے بعد انھوں نے بھی فوت ہوتا ہے۔ [بخاری، العلم، باب السمر فی العلم: ۱۱۶، عن ابن عمرؓ] وہ حدیث بھی اس کی صریح دلیل ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿فَإِنَّ رَأْسَ مِغَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقَى مَعَهُ هُوَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ﴾ [بخاری، العلم، باب السمر فی العلم: ۱۱۶، مسلم: ۲۵۳۸] ”جو لوگ آج زمین کی پشت پر موجود ہیں آج سے ایک سو سال کے سرے پر ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا۔“

﴿۳﴾ أَقَابِينَ مِتَّ فَهُمْ الْخَالِدُونَ: اس میں ان لوگوں کا جواب ہے جو یہ کہہ کر خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے کہ محمد ﷺ عنقریب مرجائیں گے تو ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ دیکھیے سورہ طور (۲۰) فرمایا، اس میں ان کے لیے خوشی کا موقع تو تب ہو جب

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَ نَبْلُوَكُمْ بِالْسَّرِّ وَالْعَيْدِ فِتْنَةً وَ الْيَنَّا تُرْجَعُونَ ﴿۳۵﴾

ان موت کو چکھنے والی ہے اور ہم تمہیں برائی اور بھلائی میں جلا کرتے ہیں، آزمانے کے لیے اور تم ہماری ہی
لوٹائے جاؤ گے ﴿۳۵﴾

میں ہمیشہ زندہ رہنا ہو۔

ت 35 ﴿۳۵﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ: ”ذَائِقَةُ“ ”ذَائِقٌ يَذُوقُ“ (ان) سے اسم فاعل ہے، یعنی چکھنے والی۔ اس
میں تمام بت پرستوں کی تردید ہے جو اپنے دیوی دیوتاؤں کے ہمیشہ زندہ رہنے کا عقیدہ رکھتے ہیں، اسی طرح ان قبر پرستوں کا
میں جو اپنے داتاؤں، حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں کے لیے موت کا لفظ گالی بکھتے ہیں۔ چنانچہ جب بھی رسول کریم ﷺ یا
کسی بزرگ کے بارے میں موت یا فوت کا لفظ آئے وہ اس کے بجائے انتقال (جگہ بدلنے) کا لفظ استعمال کریں گے، یا
کہیں گے وہ پردے میں ہو گئے ہیں یا پردہ فرما گئے ہیں۔ اللہ کے بندے یہ نہیں سوچتے کہ موت تو مومن کا تحفہ ہے، جس کے
خبر اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کا دیدار ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں دو شعر نقل فرمائے ہیں جو
م شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے ہی کسی موقع پر پڑھے۔

تَمَنَّى رِحَالًا أَنْ أَمُوتَ وَإِنْ أَمُتَ فَيَسِّرْ سَبِيلًا لَسْتُ فِيهَا بِأَوْحَدٍ
فَقُلْ لِلَّذِي يَبْغِي حِلَافَةَ الَّذِي مَضَى نَهْيًا لِأَخْرَجِي مِثْلَهَا فَكُنْ قَدِ

”کچھ لوگوں نے میری موت کی تمنا کی ہے اور اگر میں مر جاؤں تو یہ ایسا راستہ ہے جس میں میں اکیلا نہیں ہوں۔ سو اس شخص
سے کہہ دو جو جانے والے کے بعد اس کی جگہ کا طلب گار ہے کہ تو بھی اس جیسی ایک اور (موت) کے لیے تیار ہو جا اور سمجھ
لے کہ وہ بس آ ہی چکی۔“ ایک فارسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

بے فنائے خود میسر نیست دیدارِ شما سے فروشد خویش را اول خریدارِ شما

”اپنے فنا ہونے کے بغیر تمہارا دیدار میسر نہیں ہو سکتا، اس لیے تمہارا خریدار پہلے اپنے آپ کو فروخت کرتا ہے۔“ مزید دیکھیے
سورۃ زمر (۳۰)، آل عمران (۱۸۵)، عنکبوت (۵۶، ۵۷) اور نساء (۷۸)۔

﴿۳۵﴾ وَ نَبْلُوَكُمْ بِالْسَّرِّ وَالْعَيْدِ فِتْنَةً: ”نَبْلُوْكُمْ“ ”نَبَلًا يَبْلُو“ اور ”يَبْلُو“ ”يَبْلُو“ کا معنی ایک ہی ہے، آزمانا، جلا کرنا۔
”فِتْنَةً“ آزمائش۔ ”فِتْنَةً“ لفظ کی تبدیلی کے ساتھ ”نَبْلُوْكُمْ“ کا مفعول مطلق ہے، مفعول لہ بھی ہو سکتا ہے۔ ترجمہ
مفعول لہ کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ شر سے مراد دنیا میں بدحالی اور سختی ہے اور خیر سے مراد خوشحالی اور آسانی ہے۔ یعنی ہم
تمہیں کبھی سختی سے دوچار کرتے ہیں، کبھی نرمی کا سلوک کرتے ہیں۔ کبھی تم پر بیماری آتی ہے، کبھی صحت۔ کبھی دولت وافر ہوتی
ہے کبھی فقیری، غرض ان تمام حالتوں سے مقصود تمہاری آزمائش ہے کہ تم نعمت پر شکر اور مصیبت پر صبر کرتے ہو یا نہیں۔ کافر
اور فاسق خوشحالی میں غل اور تکبر کرنے لگتا ہے اور مصیبت میں بے صبری اور جزع فزع۔ دیکھیے سورۃ معارج (۲۱ تا ۲۹) مومن

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا ۖ أَهَذَا الَّذِي يَذْكُرُ إِلَهُكُمْ ۗ
وَهُمْ يَذْكُرُ الرَّحْمَنَ هُمْ كَافِرُونَ ﴿۳۶﴾

اور جب تجھے وہ لوگ دیکھتے ہیں جنہوں نے کفر کیا تو تجھے مذاق ہی بناتے ہیں، کیا یہی ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے، اور وہ خود رحمان کے ذکر ہی سے منکر ہیں ﴿۳۶﴾

کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «غَضَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كَلِمَةٌ خَيْرٌ وَتَيْسَرٌ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاهُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاهُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ» [مسلم، الزهد، باب المؤمن امره كلمه خير - ۲۹۹۹، عن ابي جعفر] "مؤمن کا معاملہ خوب ہے، کیونکہ اس کا سارا معاملہ ہی خیر ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو نہ صل نہیں۔ اگر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے، سو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے، وہ بھی اس کے لیے بہتر ہے۔" اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق کو آزمانے کا ذکر کی آیات میں آیا ہے، دیکھیے سورہ اعراف (۹۳، ۹۵، ۱۶۸) اور سورہ النجم (۳۲، ۳۳)۔

﴿۳۶﴾ وَإِنَّا لَنَرَجِعُهُنَّ : "اِنِنَّا" پہلے لانے سے کام میں نصر پیدا ہو گیا ہے، یعنی تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہم تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق اچھی یا بری جزا دیں گے۔ "لوٹنے کا جو گے" اس نے فرمایا کہ ہمارے والد ماجد آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد جنت میں رکھا گیا، پھر ان کی خطا سے انہیں جنت سے نکالا گیا۔ معلوم ہوا ہمارا اصل وطن جنت ہے، آزمائش کے لیے کچھ مدت زمین پر گزارنے کے بعد ہمیں دوبارہ اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہو گا، اگر کامیاب ہوئے تو دوبارہ جنت ملے گی اور ناکام ہوئے تو جہنم۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۳۸، ۳۹)۔

آیت 36 ﴿۳۶﴾ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ كَفَرُوا : "هُزُوًا" مصدر بمعنی مفضول ہے، یعنی جسے مذاق کیا جائے۔ پچھی آیت میں لوگوں کو غیر شرکے ساتھ آزمانے کا ذکر فرمایا۔ بنی نوع انسان کے لیے سب سے بڑی خیر رسول کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے اور آپ کی آمد لوگوں کے لیے سب سے بڑی آزمائش بھی ہے کہ کون نعمت کی قدر کرتے ہوئے آپ پر ایمان لاتا ہے اور کون ناشکری اور کفر کرتا ہے۔ اس آیت میں اس نعمت کے عطا ہونے پر ناشکری کرنے والے لوگوں، یعنی کافروں کے رویے کا ذکر فرمایا کہ جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کو مذاق ہی بناتے ہیں، عقیدگی سے نہ کوئی بات سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔

﴿۳۷﴾ أَهَذَا الَّذِي يَذْكُرُ إِلَهُكُمْ : یہ جملہ ان کے ٹھٹھے کی تفسیر ہے، یعنی وہ آپ کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ کیسی بیوقوفی ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے؟ ذکر کرنے سے مراد اچھائی سے ذکر کرنا بھی ہوتا ہے اور برائی سے بھی، تبہیں اس کا حال کے قرینے سے ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص آپ سے آپ کے کسی دوست کے متعلق بیان کرتا ہے کہ وہ آپ کا ذکر کر رہا تھا، تو ظاہر ہے اس کی مراد یہی ہے کہ وہ آپ کی تعریف کر رہا تھا اور اگر آپ کے کسی مخالف کے متعلق بیان کرے کہ وہ آپ کا ذکر کر رہا تھا تو اس سے مراد یہی ہوگی کہ وہ برائی کے ساتھ آپ کا ذکر کر رہا تھا۔ جیسا کہ بت توڑنے والے کو تلاش کرتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام کی

خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۗ سَأُورِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ ﴿۳۷﴾

انسان سراسر جلد بازی پیدا کیا گیا ہے، میں عنقریب تمہیں اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، سو مجھ سے جلدی کا مطالبہ نہ کرو ﴿۳۷﴾

قوم کے لوگوں نے کہا تھا: ﴿سَبِغْنَا قَفَى يَدِكُمْ هُمْ يُقَالُ لَمَّا ابْرَاهِيمُ﴾ | الانبیاء: ۶۰ | ”ہم نے ایک جوان کو سنا ہے، وہ ان کا ذکر کرتا ہے، اسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔“ ”أَهْدَا“ (کیا یہی ہے) میں ہمزہ تعجب کے اظہار کے لیے اور ”هَذَا“ تحقیر کے لیے استعمال ہوا ہے۔

﴿وَهُمْ يَذُكُرُ الرَّحْمَنَ هُمْ كَظْفَرُونَ﴾: یعنی ان کے معبودوں کا برائی سے ذکر کرنے پر آپ کا مذاق اڑانا انہیں کس طرح زیب دیتا ہے، جب کہ خود ان کا حال یہ ہے کہ وہ رحمان کے ذمہ سے منکر ہیں؟ انہیں اس بے حد رحر والے کا ذکر گوارا نہیں جس نے انہیں پیدا کیا، ان پر انعام فرمایا اور جس اکیلے کے ہاتھ میں ان کا نفع اور ان کا نقصان ہے۔ پھر مذاق کے حق دار یہ لوگ ہیں یا ہمارا رسول؟ ”يَذُكُرُ الرَّحْمَنَ“ کی تفسیر بعض مفسرین نے قرآن مجید فرمائی ہے کہ ﴿لَاقًا كُنْ نَزَلْنَا إِلَى الْكُرْبِ﴾ | النحر: ۹ | یعنی وہ خود رحمان کے نازل کردہ ذکر کے منکر ہیں۔

آیت 37 ﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾: کسی چیز کے وقت سے پہلے اس کا ارادہ عمل (جلد بازی) ہے، یعنی جلد بازی

انسان کی فطرت میں شامل ہے، وہ پیدا ہی جلد بازی کیا گیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا﴾ | ہی: اسرائیل: ۱۱ | ”اور انسان ہمیشہ سے بہت جلد باز ہے۔“ ”جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے“ سے مراد مبالغہ ہے، جیسے فرمایا: ﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ﴾ | برود: ۵۹ | ”اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ضعف سے پیدا کیا۔“

﴿سَأُورِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ﴾: ”فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ“ اصل میں ”فَلَا تَسْتَعْجِلُونِي“ ہے۔ آیات کے آخری حروف

کی موافقت کے لیے نون پر کسرہ باقی رکھ کر ”یا“ حذف کر دی گئی۔ اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے، ایک یہ کہ کفار کی شدید مخالفت اور رسول اللہ ﷺ کا مذاق اڑانے پر مسلمان تخت غم زود اور پریشان تھے اور کفار پر جلد از جلد عذاب کے فتنہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کو جلد بازی قرار دے کر تسلی دی کہ میں تمہیں اپنی نشانیاں ضرور دکھاؤں گا، مگر ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے، اس سے پہلے اس کا مطالبہ مت کرو۔ نشانوں سے مراد کفار پر آنے والی آفات و مصائب ہیں، مثلاً بدر، احد، خندق، حدیبیہ اور فتح مکہ میں کفار کی شکست اور ان کے اقتدار کا خاتمہ۔ اس مطلب کا قرینہ یہ ہے کہ کفار کے عذاب جلدی لانے کے مطالبے کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ انسان کی سرشت میں جلد بازی ہے، وہ کسی سے ناراض ہو اور اس کے پاس طاقت ہو تو وہ فوراً انتقام لیتا ہے۔ اپنی اس سرشت کے مطابق انہوں نے اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی یہ خیال کیا کہ اگر اس کے پاس انتقام کی طاقت ہوتی تو وہ فوراً عذاب نازل کر دیتے، چنانچہ وہ آپ ﷺ کا مذاق اڑاتے اور عذاب میں دیر کی وجہ سے بار بار اس کے جلد لانے کا مطالبہ کرتے۔ فرمایا تم عذاب کے جلدی آنے کا مطالبہ کیوں کرتے ہو؟ اب تک جو ہم نے تمہیں ڈھیل دی ہے اس میں ہماری کئی حکمتیں ہیں، جن میں سے تم پر جنت پوری کرنا اور تم میں سے کئی لوگوں کا

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۸﴾ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينٌ لَا يَكْفُونُ عَنْ وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿۳۹﴾ بَلْ تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۴۰﴾

اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو ﴿۳۸﴾ کاش! وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اس وقت کو جان لیں جب وہ نہ اپنے چہروں سے آگ کو روک سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں سے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۳۹﴾ بلکہ وہ ان پر اچانک آئے گی تو انہیں مبہوت کر دے گی، پھر وہ نہ اسے ہٹا سکیں گے اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی ﴿۴۰﴾

اسلام قبول کرنا بھی ہے۔ اس سے تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہمیں تمہاری کارستانیوں اور شرارتوں کو اراہیں؟ ذرا غمخوار! ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم تم سے کیسے انتقام لیتے ہیں۔ دنیا میں بھی قتل ہو گے اور ذلت و رسوائی برداشت کرنا پڑے گی اور آخرت میں بھی تمہیں جہنم کی آگ کا ایذا نصیب ہونا پڑے گا۔

آیت 38 وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ.....: یہ ان کے عذاب طلب کرنے میں جلدی کی تفصیل ہے۔ کفار رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے اور آپ کا اور مسلمانوں کا مذاق اڑانے کے لیے بار بار پوچھتے کہ عذاب کا وہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ جھٹلانے کے ساتھ ساتھ جڑانے اور بھڑکانے کے لیے طنز یہ بھی کہتے کہ ”اگر تم سچے ہو۔“ ”كُنْتُمْ“ عیاشی کا اظہار کرتا ہے اور ”صَادِقِينَ“ اسم فاعل بھی سچ کے دوام کا اظہار کرتا ہے، یعنی تم جو ہمیشہ سچ بولتے ہو، تمہاری صفت ہی صادق ہے تو عذاب کا جو وعدہ تم نے کیا تھا وہ کب پورا ہوگا؟ (بھائی)

آیت 39 ﴿۱﴾ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا.....: یعنی ان لوگوں کے عذاب کو جھٹلانے اور اسے ناممکن سمجھنے کی اصل وجہ ان کا جہل ہے، انہیں اس وقت کا علم ہی نہیں جب آگ انہیں چاروں طرف سے گھیر لے گی۔ یہ نہ اپنے چہروں سے آگ کو روک سکیں گے، جو ان کے جسم کا سب سے اہم اور خوبصورت حصہ ہے اور نہ پشتوں سے، جو جسم کا سب سے مضبوط حصہ ہے۔ جب ان اعضا کو آگ سے نہ بچا سکے تو دوسرے اعضا کو کیسے بچائیں گے؟ کفار کو آگ کے چاروں طرف سے گھیرنے کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ دیکھیے سورۃ کہف (۲۹)، اعراف (۳۱)، زمر (۱۶)، ابراہیم (۵۰)، مؤمنون (۱۰۳) اور دوسری آیات۔ ”لَوْ“ کی دو تفسیریں ہیں، ایک یہ کہ یہ حرف شرط ہے اور اس کی جزم و تردید ہے، جو خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے، یعنی اگر کافر لوگ اس وقت کو جان لیں تو نہ کبھی اسے جلدی طلب کریں، نہ اس کا مذاق اڑائیں اور نہ اس کا انکار کریں۔ دوسری تفسیر یہ کہ یہ حرف تمنی ہے، یعنی ”کاش کہ کافر لوگ اس وقت کو جان لیں“ اس صورت میں جڑا کی ضرورت نہیں۔

﴿۲﴾ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ: کوئی ان کی مدد کو نہیں آئے گا اور نہ وہ اپنی یا ایک دوسرے کی مدد کر سکیں گے۔ دیکھیے سورۃ طارق (۱۰)، صافات (۲۶، ۲۵) اور شعراء (۹۲، ۹۱)۔

آیت 40 ﴿۱﴾ بَلْ تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً.....: ”بلکہ وہ ان کے پاس اچانک آئے گا۔“ ”تَأْتِيهِمْ“ کی ضمیر سے مراد کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَلَقَدْ اسْتَهْزِئَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿۴۱﴾

قُلْ مَنْ يَكْفُرْ بِالْبَيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمَنِ مُبَلِّغُهُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُعْرِضُونَ ﴿۴۲﴾

اور بلاشبہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو ان میں سے جن لوگوں نے مذاق اڑایا انھیں اسی چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ﴿۴۱﴾ کہہ کون ہے جو رات اور دن میں رحمان سے تمہاری حفاظت کرتا ہے، بلکہ وہ اپنے رب کے ذکر سے منہ پھیرنے والے ہیں ﴿۴۲﴾

قیامت ہے، کیونکہ آگ کا چاروں طرف سے گھیرنا قیامت کے دن ہوگا۔ اچانک آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آنے سے پہلے اس کا وقت معلوم ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں اور نہ اللہ تعالیٰ نے وہ کسی کو بتایا ہے۔ دیکھیے سورہ ظہ (۱۵)، اعراف (۱۸۷) اور نازعات (۲۳-۲۶)۔ نہ قیامت آہستہ آہستہ بتدریج آئے گی کہ اس کے آنے کا طم ہو جائے۔ (بقای) بلکہ اچانک آئے گی، اسی لیے اس کا ایک نام ”انساعۃ“ ہے، اس لیے کہ وہ ایک ساعت (گھڑی) میں قائم ہو جائے گی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَلْتَقُمْ مِنَ السَّاعَةِ وَقَدْ نَسَرَ الرَّحْلَانِ ثَوْبَيْمَا فَلَا يَتَبَايَعَانِهِ وَلَا يَطْوِيَانِهِ وَلْتَقُمْ مِنَ السَّاعَةِ وَقَدْ انْصَرَفَ الرَّجُلُ بَيْنَ لِفْحِيهِ فَلَا يَطْعُمُهُ وَلْتَقُمْ مِنَ السَّاعَةِ وَهُوَ يَلِيطُ حَوْضَهُ فَلَا يَسْقِي فِيهِ وَلْتَقُمْ مِنَ السَّاعَةِ وَقَدْ رَفَعَ أَحَدُكُمْ أُكُلْتَهُ بِئْسَ فِيهِ فَلَا يَضَعُهَا» (بخاری، الرفاق، باب: ۶۵۰۶-۶۵۰۷ مسلم: ۲۹۵۴) قیامت اس حال میں قائم ہوگی کہ دو آدمیوں نے اپنا کپڑا پھیلا لیا ہوگا، پھر نہ اس کی خرید و فروخت کر سکیں گے اور نہ اسے لپیٹ سکیں گے اور قیامت اس حال میں قائم ہوگی کہ آدمی اپنے دودھ والے جانور کا دودھ لانے کا تو اسے پے گا نہیں اور قیامت اس حال میں قائم ہوگی کہ وہ اپنے حوض کی لپائی کر رہا ہوگا تو اس میں اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکے گا اور قیامت اس حال میں قائم ہوگی کہ اس نے لقمہ اپنے منہ کی طرف اٹھایا ہوگا تو کھ نہیں سکے گا۔

﴿۴۱﴾ قَبْلَهُمْ: ”بَهِتٌ يَبْهَتُ بَهْتًا“ (ع، ن، ہ، ک) اچانک آچلانا، لاجواب کر دینا، حیران کر دینا۔ (قاموس) ”یعنی وہ انھیں مبہوت (حیرت زدہ) کر دے گی۔“ ﴿فَلَا يَسْتَضِيْعُونَ سَرَّهَا﴾ کیونکہ نہ وہ اسے ہٹا سکیں گے اور نہ اس پر صبر کر سکیں گے۔ ”وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ“ اور نہ انھیں کوئی مہلت ملے گی کہ ایک لمحہ آرام کر لیں، کیونکہ مہلت کی مدت تو اس سے پہلے پوری ہو چکی ہوگی۔ (تاکس)

آیت 41 ﴿وَلَقَدْ اسْتَهْزِئَ بِرُسُلٍ...﴾: ”حاق یحوق“ گھیر لینا۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ آپ کفار کے مذاق اڑانے اور جھٹلانے سے بدول نہ ہوں، آپ سے پہلے پیغمبروں کا بھی اسی طرح مذاق اڑایا گیا۔ انھوں نے اللہ کے جس عذاب سے ڈرایا اس کا بھی مذاق اڑایا گیا۔ آخر کار ان مذاق اڑانے والوں کو اسی عذاب نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ آپ کا مذاق اڑانے والوں کا انجام بھی یہی ہوگا۔

آیت 42 ﴿قُلْ مَنْ يَكْفُرْ بِالْبَيْلِ...﴾: ”كَلًّا بَكْمًا“ (ف) پھرا دینا، حفاظت کرنا۔ (قاموس) ”مِنَ الرَّحْمَنِ“

أَمْ لَهُمُ إِلَهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِنْ دُونِنَا لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ أَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِنَّا يُصْحَبُونَ ﴿۳۷﴾

یا ان کے لیے ہمارے سوا کوئی اور معبود ہیں، جو انہیں بچتے ہیں؟ وہ نہ خود اپنی جانوں کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہماری طرف سے ان کا ساتھ دیا جاتا ہے ﴿۳۷﴾

سے مراد ”مِنَ أَسْمَاءِ الرِّحْمَانِ“ یا ”مِنَ عَذَابِ الرِّحْمَانِ“ ہے۔ (ظہری وغیرہ) کچھلی آیت میں رسولوں کا مذاق اڑانے والی گزشتہ اقوام کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے حیرینے کا ذکر تھا، اس آیت میں موجود کفار سے خطاب ہے کہ وہ کون ہے جو رات یا دن کسی وقت آنے والے رحمان کے عذاب سے تمہاری حفاظت کرتا ہے؟ اور حقیقت یہ سوال کفار کو ا جواب کرنے کے لیے ہے، کیونکہ اگر وہ اس کا جواب دیں تو انہیں ماننا پڑے گا کہ دن رات پیش آنے والی بے شمار آفات و مصائب سے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ان کی حفاظت کرتا ہے اور نہ ہی سکتا ہے، اس لیے وہ اس سوال کا جواب ہی نہیں دیں گے۔ ”بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُعْرِضُونَ“ بلکہ وہ یہ جواب دینے سے گریز ہی کریں گے جس میں ان کے رب کا ذکر آئے۔ (التسبیح) (مختصری نے فرمایا: ”بلکہ انہوں نے اپنے رب کے اذرا یا یہ نسبت وہی سے منہ موز رکھا ہے، وہ اس کے عذاب سے بچاؤ کریں گے۔“

② ابن کثیر رحمہ اللہ نے ”مِنَ الرِّحْمَانِ“ کا معنی ”مِنَ الرِّحْمَانِ“ فرمایا ہے، یعنی وہ کون ہے جو دن رات میں آنے والی بے شمار آفات سے رحمان کے ہاتھ تمہاری حفاظت کرتا ہے؟ ظاہر ہے ایسا کوئی نہیں۔

③ ”الرِّحْمَانِ“ کے معنی میں اشارہ ہے کہ رات دن میں پیش آنے والی بے شمار آفات و حوادث سے تمام انسانوں حتیٰ کہ کفار کی بھی ایک وقت تک حفاظت کرے اللہ تعالیٰ کی نعمت رحمت کا نتیجہ ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا مَعْشِرَةٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِمْ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ﴾ (اس کے لیے اس (انسان) کے آگے اور اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے نبی پرہیز دار ہیں، جو اللہ کے حکم و یعنی عذاب اور دوسری آفات سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔“

④ ”قُلْ مَنْ يَكْفُرْ“ میں کفار کو مخاطب فرمایا۔ پھر نفرت کے اظہار کے لیے انہیں غائب کے صیغے سے ذکر فرمایا کہ ”بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُعْرِضُونَ“ یعنی یہ عذاب کے قابل ہی نہیں۔ اسے التفات کہتے ہیں، اس کی ایک اور مثال کے لیے دیکھیے سورہ یونس (۲۲)۔

آیت 43 ① أَمْ لَهُمُ إِلَهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِنْ دُونِنَا: ”أَمْ“ کا دلف اس سے پہلے مخذوف بملہ استفہامیہ پر ہوتا ہے۔ (بغلافی) یعنی کیا حقیقت وہی ہے جو اوپر تشریح کی ہے کہ ہم رب عذاب سے انہیں کوئی بچانے والا نہیں، یا ہمارے سوا ان کے کوئی ایسے معبود ہیں جو ان کو بچاتے اور ان کا دفاع کرتے ہیں؟ ”مِنَ دُونِنَا“ کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”یا ان کے کوئی ایسے معبود ہیں جو ہمارے مقابلے میں ان کو بچاتے اور ان کا دفاع کرتے ہیں۔“

② لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ أَنْفُسِهِمْ: یہ اس کا رد ہے کہ ان کے معبود انہیں بچا سکتے ہیں، یعنی ان کے بنائے ہوئے معبود اپنی مدد نہیں کر سکتے تو ان کی یا کسی اور کی کیا مدد کریں گے؟

بَلْ نُنْقِصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَ أَبَاءَهُمْ حَتَّى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَا نَأْتِي الْأَرْضَ
نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا أَفَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴿۴۱﴾

بلکہ ہم نے انھیں اور ان کے باپ دادا کو ساز و سامان دیا، یہاں تک کہ ان پر لمبی عمر گزر گئی، پھر کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو آتے ہیں، اسے اس کے کناروں سے گھٹاتے آتے ہیں، تو کیا وہی غائب آنے والے ہیں؟ ﴿۴۱﴾

﴿۴۱﴾ وَلَا هُمْ وَمَنَّا يُضْحِكُونَ : ”اور نہ ہماری طرف سے ان کا ساتھ دیا جاتا ہے“ یہ کفار کے اس عقیدے کا رد ہے کہ ہمارے معبود ہمیں بچانے کی طاقت نہ بھی رکھتے ہوں تو انھیں اللہ تعالیٰ کی تائید اور اس کا ساتھ حاصل ہے، ان کی بدولت وہ جو چاہیں کروا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے معبود نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اور نہ انھیں، نہ ان کی نعمت یا تائید حاصل ہے۔ اس کے قریب معنی والی نیت دینیجیے جبراً زبردستی۔ (الانوار، شمارہ ۱)

آیت 44 ﴿۴۱﴾ بَلْ نُنْقِصُهَا هَوْلًا وَ أَبَاءَهُمْ : ”بلکہ میں ان کے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے پروا ہونے، غمگین اور اڑانے اور جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان پر جو معہ پائی کی، انھیں اور ان کے آباء و اجداد کو دنیا کے ساز و سامان سے فائدہ اٹھانے کا جو موقع دیا تو اس پر احسان مند ہونے کے بجائے اس عداوت میں پڑ گئے کہ یہ نعمت ہمیشہ رہے گی، کبھی زائل نہ ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ”أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلِ مَا نَكُفُّ مِنْ رِزْقِ اللَّهِ أَن نُّرْسِلَ إِلَيْكُمْ رَسُولًا مِّنْ قِبَلِ اللَّهِ أَن نَّأْتِيَكُمْ بِالْحَدِيدِ“ اور کیا تم نے اس سے پیسے قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تمہارا یہ نعمتی بھی زوال نہیں آئے اور پھر ہوتے ہوتے اپنی خوش حالی میں اس قدر مست ہو گئے کہ سر سے بھول ہی گئے کہ ان کے اوپر کوئی ان کا رعب بھی ہے، جو عذاب چاہے عذاب بھیج کر ان کا نام و نشان مٹا سکتا ہے۔

﴿۴۲﴾ أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا : ”بلکہ میں اپنی آسمانوں سے نہیں دیکھ رہے کہ زمین کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اسے مسلسل کم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مسلمان شہروں پر شہر اور علاقوں پر مارتے فتح کرتے چلے جا رہے ہیں اور وہ وقت آ رہا ہے کہ ان کی مقبوضہ زمین گھٹتے گھٹتے ساری کی ساری ان کے قبضے سے نکل جائے گی، تو کیا پھر بھی میں غائب ہوں گے؟ زمین کو اس کے کناروں سے کم کرتے چلے آنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ زمین سے مراد زمین کے رہنے والے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ”وَسُئِلَ الْقُرَيْشُ أَلْبِقَىٰ كُنَّا فِيهَا قَوْمًا نَّيْمًا“ اور اس نعمتی سے پڑھ چکے ہیں جس میں نمر تھے۔ ”میں یہ قسمتی سے مراد نعمتی میں رہنے والے ہیں۔ یعنی کیا یہ کافر ہمارے زبردست قدرت اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے کہ بے سرو سامان ہوا، غنیمت و تقویٰ، مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے اور ان سرداروں کے ساتھی مسلمان ہوتے جا رہے ہیں، جس سے کفار کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے، جو آخر کار ختم ہو جائے والی ہے۔ تیسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ کیا یہ لوگ ہمارے زبردست قدرت نہیں دیکھتے کہ ہم آسمانی اور زمینی آفات مثلاً طوفانوں، بیماریوں، زلزلوں، آتش فشاںوں، پھاروں کی بدولت زمینوں، پہاڑوں، دریاؤں اور دوسرے عذابوں کی صورت میں ہزاروں لاکھوں لوگوں کی بدولت ان کے آباء و اجدادوں کو چھوڑ دیتے ہیں؟ ان کے ارد گرد ہود و طوفان،

قُلْ إِنَّمَا أُنذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۗ وَلَا يَسْمَعُ الصَّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا مَا يُنذَرُونَ ﴿۴۵﴾ وَ لِيَن مَسْتَهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ يُونِكُنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۴۶﴾

کہہ دے میں تو تمہیں صرف وحی کے ساتھ ڈراتا ہوں اور بہرے پکارو نہیں سنتے، جب کبھی ڈرائے جاتے ہیں ﴿۴۵﴾ اور یقیناً اگر انہیں تیرے رب کے عذاب کی ایک لپٹ چھو جائے تو ضرور ہی کہیں گے ہائے ہماری بربادی! بلاشبہ ہم ہی ظالم تھے ﴿۴۶﴾

صالح علیہ السلام اور قوم سبا کی برباد شدہ بستیاں ان کی آنکھوں کے سامنے ہیں، بھلا ہماری اس عظیم الشان قوت کے مقابلے میں یہ لوگ غالب آسکتے ہیں؟ پہلا مطلب الفاظ کے بہت قریب ہے، مگر سورت مکی ہونے کی وجہ سے آخری دو مطلب بیان کیے گئے ہیں، کیونکہ مکہ میں مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ مزید دیکھیے سورہ رعد (۴۱)۔

آیت 45 ﴿۱﴾ قُلْ إِنَّمَا أُنذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ : یعنی آپ ان سے کہہ دیں کہ میرا کام تو وحی کے مطابق تمہیں اللہ کے عذاب سے ڈرانا ہے، عذاب انہیں نہیں۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور فوراً عذاب لانا اس کی کوئی اور شرعی حکمتوں کے خلاف ہے، کیونکہ اس سے آزمائش کا مقصد فوت ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ وَلَا يَسْمَعُ الصَّمَّ الدُّعَاءَ : بہروں سے مراوکار ہیں جنہیں حق سنائی ہی نہیں دیتا۔ الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ ”یہ بہرے“ کیا گیا ہے۔ آیت کے شروع میں کفار کو مخاطب فرمایا کہ ”میں تو تمہیں وحی کے ساتھ ڈراتا ہوں“ پھر فرمایا ”یہ بہرے پکار نہیں سنتے“، بعد میں انہیں غائب کے صیغے سے ذکر فرمایا کہ یہ لوگ مخاطب کرنے کے اہل ہی نہیں، یہ التفات ہے۔

﴿۳﴾ إِذَا مَا يُنذَرُونَ : ”جب ڈرائے جاتے ہیں“ کے الفاظ سے ان کے بہرا پن کی شدت بیان کرنا مقصود ہے، کیونکہ بہرہ تو کوئی بھی بات نہیں سنتا، خواہ ڈرانے کی ہو یا خوش خبری کی، مگر نام دستور ہے کہ ڈرانے کے وقت زیادہ سے زیادہ اونچی آواز کے ساتھ پکارا جاتا ہے۔ تو جو بہرہ اتنی بلند پکار نہ سنے وہ کوئی اور آواز کیا سنے گا؟

آیت 46 ﴿۱﴾ وَلِيَن مَسْتَهُمْ نَفْحَةٌ : ”نَفْحَةٌ“ کسی چیز کا ایک دفعہ کا تھوڑا سا حصہ، مثلاً ہوا کا ہلکا سا جھونکا، آگ یا گرمی کی معمولی سی لپٹ، خوشبو کی بلکی سی لپٹ۔ یعنی آج تو یہ لوگ تکبر کی وجہ سے بہرے ہو رہے ہیں مگر جد ہی ان کی یہ حالت بدل جائے گی اور عذاب کا تو ذکر ہی کیا، اگر صرف ایک مرتبہ اس کی ڈراس لپٹ انہیں چھو بھی گئی، تو ساری شیئی ختم ہو جائے گی اور واویلا کرنے لگیں گے، مگر اس وقت تیج پکار کچھ فائدہ نہ دے گی۔ کفار کا عذاب دیکھتے ہی اپنے ظالم ہونے کا اقرار قرآن مجید میں کئی جگہ مذکور ہے۔ دیکھیے سورہ مؤمن (۸۴، ۸۵)۔

﴿۲﴾ ہلکے سے ہلکے عذاب سے ان کی یہ حالت ہونے کی تصویر کشی کے لیے تین مہلے استعمال کیے گئے۔ لفظ ”مَسَّ“ (چھونا) اور ”نَفْحَةٌ“ کا لفظ، جس کا معنی کسی بھی چیز کا کم از کم ہونا ہے اور ”نَفْحَةٌ“ میں ”نَاءُ“ جو ایک مرتبہ کے مفہوم کو واضح کرتی ہے۔ (زمخشری)

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ حَرْدَلٍ آتَيْنَا بِهَا ۖ وَكَفَىٰ بِنَا حَسِيبِينَ ﴿۴۷﴾ وَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِلْمُتَّقِينَ ﴿۴۸﴾

اور ہم قیامت کے دن ایسے ترازو رکھیں گے جو عین انصاف ہوں گے، پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا اور اگر رائی کے ایک دانہ کے برابر عمل ہوگا تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں ﴿۴۷﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون کو خوب فرق کر دینے والی چیز اور روشنی اور نصیحت عطا کی ان متقی لوگوں کے لیے ﴿۴۸﴾

آیت 47 ﴿۱﴾ وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ : سچھلی آیات میں ذکر ہوا ہے کہ کفار کے پاس جب تک قدرت رہتی ہے وہ عدل و انصاف سے کنارہ کش اور ظلم و جور پر تے رہتے ہیں اور اختیار ختم ہوتے ہی حق کا اعتراف کرنے لگتے ہیں، اس آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اس طرح نہیں، وہ ہمیشہ ”فَاتَيْنَا بِالْقِسْطِ“ انصاف پر قائم ہے، حتیٰ کہ قیامت کے دن بھی وہ انصاف کے ترازو قائم فرمائے گا، پھر کسی جان پر کچھ ظلم نہیں ہوگا۔ (بقائے)

﴿۲﴾ ”الْمَوَازِينُ“ ”میزان“ کی جمع ہے۔ ”الْقِسْطُ“ مصدر ہے جو اسم فاعل ”مُقْسِطٌ“ کے معنی میں ہے اور ”الْمَوَازِينُ“ کی صفت ہے، جیسے مبالغے کے لیے ”دَلَّ آدَىٰ كُو“ ”رَجُلٌ عَدْلٌ“ کہہ لیتے ہیں، یعنی اتنا عادل آدمی کہ سراپا عدل ہے۔ یعنی ہم ایسے ترازو رکھیں گے جو اتنے انصاف والے ہیں گویا عین انصاف ہیں۔ موصوف واحد ہو یا تشبیہ یا جمع، مذکر ہو یا مؤنث، اگر اس کی صفت مصدر ہو تو وہ سب کے لیے ایک جیسی ہوتی ہے۔ ”الْقِسْطُ“ مفعول لہ بھی ہو سکتا ہے، یعنی ہم انصاف کے لیے بہت سے ترازو رکھیں گے۔

﴿۳﴾ ”الْمَوَازِينُ“ سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن متعدد ترازو ہوں گے، جن کے ساتھ ائمال کا وزن کیا جائے گا، پھر یا تو ہر آدمی کے لیے الگ ترازو ہوگا یا ہر عمل کے لیے۔ نیز دیکھیے سورہ اعراف (۷۱)۔

﴿۴﴾ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا : ”پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہیں کیا جائے گا“ یعنی نہ نیکیوں میں کچھ کمی آئے گی اور نہ برائیوں میں کوئی اضافہ ہوگا۔

﴿۵﴾ وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ زلزال (۸، ۷) اور قحطان (۱۶۱)۔

﴿۶﴾ وَكَفَىٰ بِنَا حَسِيبِينَ : ہم حساب لینے والے کافی ہیں، ہمیں کسی مددگار کی ضرورت نہیں، پھر نہ ہمارے حساب کے بعد کسی پڑتال کی گنجائش ہے اور نہ ہمیں اپیل ہو سکتی ہے۔

آیت 48 ﴿۱﴾ وَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ... : سورت کے شروع سے توحید، نبوت اور قیامت پر بات چلی آ رہی ہے، اب چند انبیاء کے واقعات کا آغاز ہوتا ہے۔ مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ ان انبیاء کی طرح آپ بھی پوری

الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ ﴿۴۹﴾ وَهَذَا ذِكْرٌ مُّبْرَكٌ أَنْزَلْنَاهُ ۗ وَأَنْتُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ ﴿۵۰﴾

ترجمہ

جو جن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہ قیامت سے ڈرنے والے ہیں ﴿۴۹﴾ اور یہ ایک بابرکت نصیحت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، تو کیا تم اسی سے منکر ہو؟ ﴿۵۰﴾

تن وہی سے دعوت کا فریضہ انجام دیتے رہیں اور اس راہ میں آنے والی ہر مشکل میں صبر و استقامت سے کام لیں، اس کے علاوہ اس بات کی تفصیل ہے کہ پہلے تمام انبیاء بشر تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کا ذکر فرمایا۔ قرآن مجید میں آٹھ مومنیوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ دعوت کے ساتھ جہاد کا سلسلہ موسیٰ علیہ السلام سے شروع ہوا ہے اور دعوت کے منت میں ان کے درمیان بڑی مماثلت ہے۔

﴿۲﴾ الْفُرْقَانُ وَضِيَاءٌ وَذِكْرٌ لِلْمُتَّقِينَ "الْفُرْقَانُ" اور "ضِيَاءٌ" کا معنی ایک ہی ہے، الف اور نون کی وجہ سے معنی میں مبالغہ پیدا ہوا ہے، یعنی حق و باطل کے درمیان ٹوبہ فرق کرنے والی چیز ہے۔ اس سے مراد تورات بھی ہے، معجزے اور جادو کے درمیان فرق کرنے والے معجزے ہی اور موسیٰ علیہ السلام کی مرئی اور انبیاء و فرمویوں پر حاصل ہونے والی فتح و نصرت بھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ہم پر کوہِ طور پر فرما دیا۔ یہ "الْفُرْقَانُ" کتاب معجزات اور نصرت الہی تینوں کی صفت ہو سکتی ہے، کیونکہ تینوں ہی حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز ہیں۔ اسی طرح "ضِيَاءٌ" اور "ذِكْرٌ لِلْمُتَّقِينَ" بھی تینوں کی صفت ہیں، کیونکہ تورات، معجزات اور نصرت الہی تینوں ہی حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز ہیں، ایمان کی روشنی بھی ہے اور نصیحت بھی۔ کتاب معجزات اور نصرت الہی کے مشابہ سے حق و باطل کے درمیان فرق، ایمان کی روشنی اور نصیحت اسی کو نصیب دہنی کے حوالے ہوئے تفصیل کے لیے جو ذیل آیت ۵۰ کی آیت ہے۔

آیت 49 ﴿۱﴾ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ "الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ" اس کا معنی ہے کہ وہ اپنے رب کو دیکھے بغیر اس کا شدید خوف رکھتے ہیں اور وہ ایک کونوں کی نگاہوں کے تابع ہونے کی حالت میں بھی وہ اپنے رب سے بہت ڈرتے ہیں۔ ان کے کسی عمل سے تمنا نہ ہو کہ وہ ان میں سے کسی شخص کو پہنچا کر ان سے عمل و باہوش صرف اپنے رب کی خشیت ہے۔

﴿۲﴾ وَهُمْ مِنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ : یہ معنی ہے کہ اس میں ہوسچا ہوتا ہے "السَّاعَةِ" کا معنی ہے کسی آنے والے حادثے کا شہید ہونا یعنی ہر وقت قیامت کا۔ اور جب رب اور وہ ایمان اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔

آیت 50 ﴿۱﴾ وَهَذَا ذِكْرٌ مُّبْرَكٌ أَنْزَلْنَاهُ : "هَذَا" اس کے مراد قرآن مجید ہے، سامعین کے ذہن میں حاضر ہونے کی وجہ سے اس کی طرف "هَذَا" کے ساتھ اشارہ فرمایا ہے۔ "ذِكْرٌ" یعنی یہ نصیحت ہے اور یہ دہانی بھی۔ "مُبْرَكٌ" جس میں بہت برکت، یعنی یہ شمار بھلائیوں میں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کے اظہار کے لیے حج منکلمہ کا صیغہ استعمال فرمایا ہے۔ اسے نازل کیا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ مُرْشَدًا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَلِيمِينَ ﴿۵۱﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ
وَ قَوْمِهِ مَا هَذِهِ الشَّائِئِلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاقِفُونَ ﴿۵۲﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس سے پہلے ابراہیم کو اس کی سمجھ بوجھ عطا فرمائی تھی اور ہم اسے جاننے والے تھے ﴿۵۱﴾ جب
اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کیا میں یہ مورتیاں جن کے تم مجاور بنے بیٹھے ہو؟ ﴿۵۲﴾

﴿۵۲﴾ أَفَأَنْتُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ : ہم نے موسیٰ اور ہارونؑ کو تورات اور حجرات عطا کیے مگر لوگ انھیں مانتے ہو تو یہ بابرکت
ذکر یعنی قرآن بھی ہر نے ہی نازل کیا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ تم اسے نہیں مانتے؟

آیت 51 ﴿۵۱﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ مُرْشَدًا : ”الرُّشْدُ“ ہدایت اور سیدھا راستہ، یہ لفظ ”رُشْدٌ“ کے مقابلے میں
آتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ ”جواہر ہدایت“ میں ”رُشْدٌ“ صاف واضح ہو چکی۔
اور سمجھ بوجھ اور ہوش مندی کے معنی میں بھی جیسا کہ فرمایا: ﴿فَإِنْ أَنْسَلْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا﴾ ”پھر اگر تم ان سے
کچھ سمجھ داری معذور کرو۔“ ”رُشْدًا“ ”جین و سمجھ بوجھ جو اس کے اہل تھی۔“

﴿۵۲﴾ مِنْ قَبْلُ : یعنی موسیٰ اور ہارونؑ سے پہلے یہ نبوت عطا کرنے سے پہلے۔ بعض نے کہا غارت نکلنے کے بعد۔ تفصیل
کے لیے دیکھیے سورۃ النعام ۷۵ تا ۷۹۔

﴿۵۱﴾ وَكُنَّا بِهِ عَلِيمِينَ : یعنی ہم اسے جانتے تھے کہ ہم نے اس میں کیا کیا خوبیوں اور صلاحیتیں رکھی تھیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی
جتنی بھی خوبیاں بیان کر لی جائیں اللہ تعالیٰ کی یہ شہادت ان سب سے بڑھ کر ہے۔ یہ منصب عطا ہی اسے ہوتا ہے جو اللہ کے
علم میں اس کا اہل ہو، فرمایا: ﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ ”اللہ زیادہ جانتے والا ہے جہاں وہ
اپنی رسالت رکھتا ہے۔“

آیت 52 ﴿۵۲﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَ قَوْمِهِ : ”الشَّائِئِلُ“ ”نشتان“ کی جمع ہے، اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق کی مثل بنانی
ہوئی صورت، مجسمہ۔ بت پرست عموماً انسانوں کے جسموں کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ سمجھ بوجھ جو موسیٰ علیہ السلام سے پہلے اللہ
تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی، یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کا حق ہون اور بتوں اور دوسرے تمام معبودوں کا باطل ہونا۔
ابراہیم علیہ السلام کی قوم بت پرست بھی تھی، ستارے، چاند اور سورج کی پرستش بھی کرتی تھی اور بادشاہ تو بھی رب مانتی تھی۔
ستارے، چاند اور سورج کے معبود نہ ہونے کے لیے ابراہیم علیہ السلام کی نہایت مدلل، مؤثر اور لا جواب دعوت سورۃ النعام ۷۶ تا
۸۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔ بادشاہ کے رب نہ ہونے کی دعوت سورۃ بقرہ (۲۵۸) میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں بتوں کے
بے اختیار ہونے کی تبلیغ اور اس کا عملی اظہار فرمایا ہے۔

﴿۵۲﴾ مَا هَذِهِ الشَّائِئِلُ : ”هَذِهِ“ کا اشارہ بتوں کی تمثیل کے لیے ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے نادان بچے ہوئے اپنے باپ
اور اپنی قوم سے بتوں کا تذکرہ نہایت تمثیل کے ساتھ کرتے ہوئے پوچھا: ”یہ مورتیاں جن کے تم مجاور بنے بیٹھے ہو، کیا چیز

قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عِبِدِينَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَ آبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوا أَحِثْنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنْتَ مِنَ اللَّعِينِينَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ رَزَقَكُمُ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ ۗ وَأَنَا عَلَىٰ ذَلِكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿۵۶﴾

انہوں نے کہا ہم نے اپنے باپ دادا کو انہی کی عبادت کرنے والے پایا ہے ﴿۵۳﴾ کہا بلاشبہ یقیناً تم اور تمہارے باپ دادا کھلی گمراہی میں تھے ﴿۵۴﴾ انہوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس حق لایا ہے، یا تو کھینے والوں سے ہے؟ ﴿۵۵﴾ کہا بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے، جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور میں اس پر گواہی دینے والوں سے ہوں ﴿۵۶﴾

ہیں؟“ گویا ابراہیم علیہ السلام ان کو کوئی چیز ماننے ہی پر تیار نہ تھے، کیونکہ وہ نہ سنتے تھے اور نہ کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ دیکھیے سورہ مریم (۳۲)۔

آیت 53 قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا ابراہیم علیہ السلام کے والد اور ان کی قوم کے پاس بتوں کی عبادت کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہ تھی، اس لیے انہوں نے تقلید کا سہارا لیا اور کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرنے والے پایا ہے، حالانکہ باپ دادا سیدھے راستے پر ہوں تو بے شک ان کے پیچھے چلو، لیکن اگر وہ غلط راستے پر ہوں تو غلط راستے پر چلتے جانا کہاں کی دانش مندی ہے؟

آیت 54 قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَ آبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ : اس کا یہ معنی نہیں کہ تم اور تمہارے باپ دادا ماضی میں گمراہی میں مبتلا تھے اب نہیں، بلکہ ”سکھان“ دوام اور استمرار کے لیے ہے اور ”فی“ ان کے گمراہی میں بری طرح پھنسے ہونے کے اظہار کے لیے ہے، جیسا کہ ابوالسعود نے فرمایا: ”وَ مَعْنَى ”كُنْتُمْ“ مُطْلَقٌ اسْتَفْرَاژِهِمْ عَلَى الضَّلَالِ لَا اسْتَفْرَاژَهُمُ الْمَاضِي الْحَاصِلِ قَبْلَ زَمَانِ الْخَطَابِ الْمُنْتَابِلِ لَهُمْ وَلَا بَنَائِهِمْ“ خلاصہ یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے واشگاف الفاظ میں فرمادیا کہ بلاشبہ یقیناً تم اور تمہارے باپ دادا پہلے بھی کھلی گمراہی میں مبتلا تھے اور اب بھی مسلسل ایسے ہی چلے آ رہے ہو۔ کیونکہ بت پرستی سے بڑھ کر کھلی گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے؟

آیت 55 قَالُوا أَحِثْنَا بِالْحَقِّ : قوم کو بت پرستی کے حق ہونے کا اتنا یقین تھا کہ وہ سوچ ہی نہ سکتے تھے کہ کوئی شخص اسے کھلی گمراہی قرار دے سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ابراہیم علیہ السلام جیسے حسن اخلاق والے شخص سے (جو کوئی ایسی بات کہتا ہی نہیں جو کسی کو ناگوار گزرے) صاف گمراہی کا فتویٰ سن کر انہیں یقین نہ آیا کہ ابراہیم علیہ السلام یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں۔ وہ سمجھے کہ آپ مذاق کر رہے ہیں، اس لیے انہوں نے پوچھا کہ آپ یہ حقیقت بیان کر رہے ہیں یا دل لگی کر رہے ہیں؟

آیت 55 ۱ قَالَ بَلْ رَزَقَكُمُ : ”بل“ (بلکہ) سے پہلے کلام کا کچھ حصہ محذوف ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے، یعنی میں یہ بات مذاق سے نہیں بلکہ پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ یہ مورتیاں اور مجسمے رب نہیں ہیں بلکہ تمہارا رب صرف وہ

و تَالَّهِ لَا كَيْدَانَ أَصْنَامَكُمْ بَعْدَ أَنْ تَوَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذْدًا إِلَّا كَيْدًا لَهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ ﴿۵۸﴾

اور اللہ کی قسم! میں ضرور ہی تمہارے بتوں کی خفیہ تدبیر کروں گا، اس کے بعد کہ تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے ﴿۵۷﴾ پس اس نے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، سوائے ان کے ایک بڑے کے، تاکہ وہ اسی کی طرف رجوع کریں ﴿۵۸﴾

ہے جو تمام آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے۔ ”رَبُّكُمْ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ مبتدا اور خبر دونوں کے معرفہ ہونے سے حصر کا معنی پیدا ہو رہا ہے۔

﴿۵۷﴾ وَأَنَا عَلَىٰ ذَلِكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ: یعنی میں یہ بات دلیل سے ثابت کر سکتا ہوں، تمہاری طرح نہیں کہ آبا و اجداد کی تقلید کے سوا میرے پاس کوئی دلیل ہی نہ ہو (کیونکہ شہادت اسی بات کی دی جاتی ہے جس کا انسان کو یقینی علم ہو، جب کہ تقلید اور علم ایک دوسرے کے منافی ہیں)۔ (رازی)

آیت 57 ﴿۵۷﴾ وَ تَالَّهِ لَا كَيْدَانَ أَصْنَامَكُمْ: ابراہیم علیہ السلام نے زبان سے بتوں کی تردید کے بعد سمجھا کہ ان لوگوں کو زبانی سمجھانا کافی نہیں بلکہ ان کے دماغوں میں ان بتوں کی خدائی اور مشکل کشائی کا جما ہوا عقیدہ ختم کرنا ایک زبردست عملی کارروائی کے بغیر ممکن نہیں، جس سے ان کی بے بسی صاف واضح ہو جائے۔ چونکہ ان تک پہنچنا اور کارروائی کرنا آسان نہ تھا، تو اس کام کے لیے انھوں نے اس دن کا انتخاب فرمایا جب سب لوگوں کے جشن پر جانے سے کارروائی کا موقع مل سکتا تھا۔ دیکھیے سورہ صافات (۹۰ تا ۸۸)۔

﴿۵۸﴾ ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کے باطل ہونے کو عمل سے ثابت کرنے سے پہلے اللہ کی قسم کھا کر اپنے ارادے کا اعلان فرمایا۔ کچھ لوگ پختہ قبروں یا آستانوں اور بتوں کو خفیہ طریقے سے توڑ دیتے ہیں اور ردپوش ہو جاتے ہیں اور اپنے اس عمل کو سنت ابراہیمی قرار دیتے ہیں، لیکن اگر واقعی وہ سنت ابراہیمی کے پیروکار ہیں تو انھیں چاہیے کہ اعلان کر کے یہ کام کریں، تاکہ اس کے نتیجے کے ذمہ دار بھی خود بنیں اور ابراہیم علیہ السلام جیسی استقامت دکھائیں۔ یہ نہیں کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔

﴿۵۹﴾ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات دل میں کہی۔ بعض نے لکھا ہے کہ جب سب لوگ چلے گئے تو انھوں نے ایک آدھ آدمی کی موجودگی میں یہ بات کہی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اسرائیلیات ہیں۔ قرآن مجید نے صاف الفاظ میں ان کے اپنے والد اور قوم کے سامنے یہ بات کہنے کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر قوم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے، اس لیے انھوں نے اس کی پروا نہیں کی۔

آیت 58 ﴿۵۸﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذْدًا: ”جُذْدًا“ (قطع کرنا اور ریزہ ریزہ کرنا) میں سے ”فَعَالٌ“ بمعنی مفعول (مَنْحَذُوذٌ) ہے، یعنی ریزہ ریزہ، ٹکڑے ٹکڑے۔ اسی کے ہم وزن اور ہم معنی ”حُطَامٌ“ اور ”فُتَاتٌ“ ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے لوگ اپنے خاص جشن کے موقع پر گھروں سے باہر نکلتے اور سارا دن جشن مناتے، چنانچہ انھوں نے

قَالُوا مَنْ فَعَلَ هَذَا بِالْهَيْتِنَا إِنَّكَ لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۵۹﴾

انہوں نے کہا ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کس نے کیا ہے؟ بلاشبہ وہ یقیناً ظالموں سے ہے ﴿۵۹﴾

ابراہیم علیہ السلام کو بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی مگر انہوں نے بیماری کا عذر کر لیا۔ (صافات: ۸۸ تا ۹۰) ابراہیم علیہ السلام موقع پا کر بت خانے کے اندر داخل ہو گئے، پہلے ان سے کچھ خطاب کیا، جس کا تذکرہ سورہ صافات میں ہے، جواب نہ پا کر پوری قوت سے انہیں توڑنا شروع کر دیا اور ایک کے سوا سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہاں اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے سب کو توڑ کر کھا ڈالا بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا، مگر یہ محض اسرائیلی روایت ہے، قرآن یا حدیث میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ پھر پتھر کے بت توڑنے کے لیے کھڑے کے بجائے ہتھوڑا استعمال ہوتا ہے۔ ہاں اگر کھڑی کے بت ہوں تو الگ بات ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کو کیسے ٹکڑے ٹکڑے کیا اور اس کے لیے صرف ایک ہتھیار استعمال کیا یا جس جس اوزار کی ضرورت تھی سب استعمال فرمائے۔

﴿۱﴾ إِلَّا كَيْدًا لَهُمْ: ”کھبڑا“ کمرہ ہے، سوائے ان کے ایک بڑے کے۔ معلوم ہوا کہ ان کے بڑے بت کئی تھے، مگر ابراہیم علیہ السلام نے ایک بڑے کے سوا چھوٹے بڑے تمام بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کی تائید آئندہ آیت (۶۳) ”بَلْ كَذَّبُوا بِكَيْدِهِمْ هَٰذَا“ سے بھی ہوتی ہے کہ ”یہ کام ان کے اس بڑے نے کیا ہے۔“ معلوم ہوا کہ اس بڑے کے سوا اور بھی بڑے بت تھے جو اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ (بقائ) جو لوگ اسے ان کے سب بتوں سے بڑا بت قرار دیتے ہیں قرآن کے الفاظ ان کا ساتھ نہیں دیتے۔

﴿۲﴾ ”سوائے ان کے ایک بڑے کے“ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں یا ان کے معبودوں کو ”کبیر“ نہیں فرمایا، ہاں ”ان کے ہاں کبیر“ فرمایا ہے، کیونکہ وہ اسے کبیر مانتے تھے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت کا خط بھیجتے ہوئے لکھا: ”إِلَىٰ هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ“ دیکھیے ہرقل کو صرف رومیوں کے ہاں عظیم فرمایا ہے، کافر کو مطلقاً عظیم نہیں فرمایا۔ (سعدی)

﴿۳﴾ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ: ان کے ایک بڑے بت کو کچھ نہیں کہا، تاکہ جب وہ سب بتوں کو ٹوٹا ہوا اور اسے صحیح سلامت دیکھیں تو اس سے پوچھیں کہ جناب آپ کے غصے کا باعث کیا ہوا کہ آپ نے ان سب خداؤں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اگر آپ نے یہ کام نہیں کیا تو آپ کے ہوتے ہوئے کوئی ظالم یہ کام کیسے کر گیا؟ ایک معنی اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ایک بڑے کے سوا تمام بت ٹکڑے ٹکڑے کر دیے کہ وہ لوگ جب یہ ماجرا دیکھیں گے تو فوراً ان کا ذہن ابراہیم علیہ السلام ہی کی طرف جائے گا، پھر جب وہ ان سے پوچھیں گے تو انہیں شرک کی تردید کا بہترین موقع مل جائے گا۔

آیت ۵۹ ﴿۱﴾ قَالُوا مَنْ فَعَلَ هَذَا بِالْهَيْتِنَا: مشرکوں کے عقل سے عاری ہونے کی کیسی زبردست تصویر ہے۔ کہنے لگے، ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا ہے؟ سوچا ہی نہیں کہ وہ معبود ہی کیا جو اپنا دفاع بھی نہ کر سکے؟ لطف یہ کہ سب نے یہی کہا کہ کوئی اور ان کے خداؤں کا یہ حال کر گیا ہے۔ قبر پرستوں کا بھی یہی حال ہے۔

جو کروٹ بدلنا نہیں جانتے ہیں انہیں آپ مشکل کشا مانتے ہیں

قَالُوا سَبِعْنَا فَتَى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهَا اِبْرَاهِيمُ ۗ قَالُوا فَاَتُوا بِهِ عَلَى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُونَ ﴿۶۱﴾

لوگوں نے کہا ہم نے ایک جوان کو سنا ہے، وہ ان کا ذکر کرتا ہے، اسے ابراہیم کہا جاتا ہے ﴿۶۱﴾ انھوں نے کہا پھر اسے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے لاؤ، تاکہ وہ گواہ ہو جائیں ﴿۶۱﴾

﴿۶۱﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الظَّالِمِيْنَ : ”ہاں“ اور لام کی تاکید کے ساتھ، بے شک وہ یقیناً ظالموں سے ہے کہ اس نے مشکل کشاؤں کی تعظیم کے بجائے ان کا یہ حال کر دیا ہے۔ یا اس لیے کہ مارنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، اس ظالم نے تو انہیں اتنا مارا ہے کہ ان کا کچھ باقی ہی نہیں چھوڑا اور نہ انہیں ذلیل کرنے میں کوئی کسر رہنے دی ہے۔ (رازی)

آیت 60 : قَالُوا سَبِعْنَا فَتَى يَذْكُرُهُمْ : بتوں کو توڑنے کا مجرم حلاش کرنے میں انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ جن لوگوں نے وہ تقریر سنی تھی، جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد اور قوم کے سامنے کی تھی اور جس میں انھوں نے صاف اعلان کیا تھا کہ اللہ کی قسم! میں ضرور تمہارے بتوں کی خفیہ تدبیر کروں گا، انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک جوان کو سنا ہے جو ان (بتوں) کا ذکر کرتا تھا، اسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔ ان مشرکوں کا ابراہیم علیہ السلام کی تحقیر کا انداز دیکھیے، وہ انہیں ابراہیم نامی ایک غیر معروف جوان بتا رہے ہیں، حالانکہ ابراہیم علیہ السلام جیسی شخصیت گم نام ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بھلا سورج یا چاند بھی چھپے رہ سکتے ہیں؟ پھر وہ اس عمل کا باعث ان کی جوانی کو قرار دے رہے ہیں، حالانکہ ان جابلوں کو معلوم ہی نہیں کہ اس جوان کی جوانی دیوانی نہیں بلکہ ایسی ہوش مند ہے جس پر بے شمار بچتے عمروں کی بچتے عمری قربان ہے۔ ”يَذْكُرُهُمْ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۳۶)۔

آیت 61 : ﴿۶۱﴾ قَالُوا فَاَتُوا بِهِ عَلَى اَعْيُنِ النَّاسِ : کہنے لگے، اگر ایسا ہے تو اسے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے لاؤ۔ ﴿۶۲﴾ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُونَ : اس کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ اسے لوگوں کے سامنے لاؤ، تاکہ وہ گواہ ہو جائیں کہ یہی شخص ہے جو بتوں کی برائی بیان کرتا تھا اور ان کا بندوبست کرنے کی قسمیں اٹھاتا تھا اور اس کا مجرم ہونا ثابت ہو جائے کہ یہ کام بھی اسی کا ہے اور ہو سکتا ہے کہ کوئی موقع کا گواہ بھی مل جائے، جس نے اسے بت توڑتے ہوئے دیکھا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرک ہونے کے باوجود وہ لوگ ملزم پر جرم ثابت کرنا ضروری سمجھتے تھے، جو ان کے نزدیک جرم تھا۔ بقایٰ بظنہ لکھتے ہیں: ”اب اللہ تعالیٰ کی جناب ہی میں ان لوگوں کی شکایت ہے جو (مسلمان ہو کر) اپنے دین کے اکابر کو بغیر کسی دلیل یا تہمت کے پکڑ کر بند کر دیتے ہیں (نہ فرد جرم، نہ کوئی گواہ اور نہ کوئی اور ثبوت، بلکہ اکثر اوقات انہیں بے گناہی کے جرم میں پکڑ لیتے ہیں)۔“ دوسرا معنی یہ ہے کہ اسے لوگوں کے سامنے لاؤ، تاکہ وہ گواہ ہو جائیں اور آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس کے ساتھ کیسا عبرتناک سلوک کیا جاتا ہے، تاکہ آئندہ کسی کو ایسی حرکت کی جرأت نہ ہو۔ وہ تو ابراہیم علیہ السلام کو مجرم ثابت کرنے کے لیے لوگوں

قَالُوا ءَأَنْتَ فَعَلْتَ هَذَا بِالْهَيْتِنَا يَا إِبْرَاهِيمُ ۖ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا

انھوں نے کہا کیا تو نے ہی ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کیا ہے اے ابراہیم! ﴿۱۶۳﴾ اس نے کہا بلکہ ان کے اس بڑے کو اکٹھا کر رہے تھے مگر درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابراہیم علیہ السلام کی دلی تمنا پوری ہونے کا سامان ہو رہا تھا کہ کسی طرح سب لوگ جمع ہوں تو وہ ان کے سامنے بتوں کی بے بسی اور مشرکوں کی بے عقلی واضح کریں، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے عید کے دن دوپہر کے وقت تمام لوگوں کو کھلے میدان میں جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دیکھیے سورہ طہ (۵۸، ۵۹)۔

آیت 63.62 ﴿۱﴾ قَالُوا ءَأَنْتَ فَعَلْتَ هَذَا..... لوگوں کے سوال کے جواب میں کہ اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کام کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے ان کے بتوں کی بے بسی و بے چارگی واضح کرنے کے لیے شدید طنز کرتے ہوئے فرمایا: ”بلکہ یہ کام ان کے اس بڑے نے کیا ہے، سو ان سے پوچھ لو اگر وہ بولتے ہیں۔“ مراد خود ان کے منہ سے اس بات کا اقرار کروانا تھا کہ بت نفع یا نقصان تو دور کی بات ہے بول کر بتا بھی نہیں سکتے کہ ان کا یہ حال زار کون کر گیا ہے۔ ”فَسَلُّوهُمْ“ (سو ان سے پوچھ لو) یعنی صحیح سالم رہنے والے ان کے اس بڑے سے پوچھو کہ اس نے بت کیوں توڑے اور اگر کسی اور نے توڑے ہیں تو اس نے اپنے ساتھیوں کا دفاع کیوں نہیں کیا؟ اور ٹوٹے ہوئے خداؤں سے بھی پوچھو کہ کس نے ان کا یہ حال کیا اور یہ بھی کہ وہ خود یا ان کا بڑا ان کا دفاع کیوں نہیں کر سکے؟ ان کے ایک بڑے بت کو سالم چھوڑنے میں یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا اپنے ساتھ کسی بڑے یا چھوٹے مد مقابل کو برداشت نہیں کرتا تو رب تعالیٰ جس کی صفت ہی ”اللہ اکبر“ ہے، اپنے ساتھ کسی شریک کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟

﴿۲﴾ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَمْ يَكْذِبْ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ إِلَّا ثَلَاثَ كَذَبَاتٍ: يَنْتِنُ مِنْهُنَّ فِي ذَاتِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، قَوْلُهُ: ﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ [الصافات: ۸۹] وَقَوْلُ: ﴿بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا﴾ [الأنبياء: ۶۳] وَقَالَ بَيْنَا هُوَ ذَاتَ يَوْمٍ وَسَارَةٌ إِذْ أَتَى عَلَى حَبَّارٍ مِنَ الْحَبَابَةِ، فَصَلَّ لَهُ إِنَّ هَاهُنَا رَحُلًا مَعَهُ امْرَأَةٌ مِنْ أَحْسَنِ النَّاسِ فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ فَسَأَلَهُ عَنْهَا فَقَالَ مَنْ هَذِهِ؟ قَالَ أُحْتَبِي فَأَتَى سَارَةَ فَقَالَ يَا سَارَةُ لَيْسَ عَلَيَّ وَجْهِ الْأَرْضِ مِنْ مِثْلِي وَغَيْرِي، وَإِنْ هَذَا سَأَلَنِي عَنْكَ فَأَحْبَبْتُهُ أَنْكَ أُحْتَبِي فَلَا تُكْذِبِينِي» [بخاری، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى: ﴿وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾: ۳۳۵۸-۳۳۷۱ مسلم] [ابراہیم علیہ السلام نے تین دفعہ کے سوا کبھی جھوٹ نہیں کہا، جن میں سے دو اللہ تعالیٰ کی ذات کی خاطر تھے۔ ان کا کہنا: ﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ [الصافات: ۸۹] ”میں بیمار ہوں“ اور ان کا یہ کہنا: ﴿بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا﴾ [الأنبياء: ۶۳] ”بلکہ اسے ان کے اس بڑے نے کیا ہے۔“ اور آپ ﷺ نے فرمایا: ”اور ایک دفعہ وہ اور (ان کی بیوی) سارہ سفر کر رہے تھے کہ وہ جابر لوگوں میں سے ایک جابر (کی بہستی) کے پاس آئے۔ اسے بتایا گیا کہ یہاں ایک آدمی ہے جس کے ساتھ ایک عورت ہے جو حسین ترین لوگوں سے ہے۔ اس نے ان کی طرف پیغام بھیجا اور اس کے متعلق پوچھا اور کہا: ”وہ کون ہے؟“ کہا: ”وہ میری بہن ہے۔“

فَسَلُّوهُمْ إِنْ كَانُوا يَنْطَفُونَ ﴿۳﴾

نے یہ کیا ہے، سوال سے پوچھ لو، اگر وہ بولتے ہیں ﴿۳﴾

پھر سارہ کے پاس آئے تو کہا، اے سارہ! اس سرزمین پر میرے اور تمہارے سوا کوئی مومن نہیں اور اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اسے بتایا ہے کہ تو میری بہن ہے، سو مجھے مت جھلانا۔“

بعض لوگوں نے اس حدیث میں ابراہیم علیہ السلام کے تین جھوٹوں کے ذکر کی وجہ سے اس حدیث کا انکار ہی کر دیا کہ ایک صدیق نبی جھوٹ کیسے بول سکتا ہے؟ ایک روشن خیال بزرگ نے تو امام بخاری اور تمام ائمہ حدیث کے ساتھ اس حدیث کو صحیح کہنے والے حضرات کے متعلق یہاں تک لکھ دیا ہے: ”ایک گروہ روایت پرستی میں غلو کر کے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے بخاری و مسلم کے چند راویوں کی صداقت زیادہ عزیز ہے اور اس بات کی پروا نہیں کہ اس سے ایک نبی پر جھوٹ کا الزام عائد ہوتا ہے۔“ ان بزرگوں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اس حدیث کے روایت کرنے والے ائمہ کرام یعنی بخاری، عمرو بن حفص، ان کے والد، سلیمان الأعمش، ابراہیم نخعی، علقمہ اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کی صداقت کو عزیز نہ رکھنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ جب ان کی صداقت ہی عزیز نہ رہی تو امت کے اتفاق کے ساتھ ”أَصْحَحَ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللَّهِ“ اور دوسری کتب حدیث کی کیا حیثیت رہ جائے گی اور امت کے پاس باقی کیا رہ جائے گا؟ لطف یہ کہ ان بزرگوں نے ائمہ حدیث کے صدق پر یہ مہربانی بزرگ خود منکرین حدیث کے فتنے کے سدباب کے لیے فرمائی ہے۔ بھلا اس کرم فرمائی کے بعد منکرین حدیث کو کسی مزید محنت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ ایک بزرگ نے یہ تک کہہ دیا کہ ”نبی کو جھوٹا کہنے سے بہتر ہے کہ اس حدیث کے راویوں کو جھوٹا کہہ دیا جائے۔“ سبحان اللہ! ابراہیم علیہ السلام کو جھوٹا کس نے کہا ہے؟ اور آپ حضرات کی دلیری کا کیا کہنا کہ جن راویوں کو پوری امت بالاتفاق سچا قرار دیتی ہے آپ انہیں جھوٹا قرار دے رہے ہیں۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اچھے خاصے ذہین حضرات صحیح حدیث اور ائمہ حدیث پر اتنی جرأت کرتے ہوئے یہ بات نہ سمجھ سکے کہ اس حدیث میں ابراہیم علیہ السلام کو جھوٹا نہیں کہا گیا بلکہ اعلیٰ درجے کا سچا (صدیق) ثابت کیا گیا ہے۔ کیونکہ جس شخص نے پوری زندگی میں ان تین باتوں کے سوا کوئی جھوٹ نہ بولا ہو، جو حقیقت میں جھوٹ ہیں ہی نہیں، بلکہ صرف ظاہر میں جھوٹ ہیں، وہ کس قدر سچا ہوگا۔ بلاغت میں اسے ”تَأْكِيْدُ الْمَدْحِ بِمَا يَسْبُغُهُ الدَّمُّ“ کہا جاتا ہے، یعنی ایسی تعریف جو بظاہر مذمت ہو، جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

وَلَا عَيْبَ فِيهِمْ غَيْرَ أَنْ سُبُوْفُهُمْ بَيْنَ فُلُوْلٍ مِنْ قِرَاعِ الْكِتَابِ

”یعنی ان میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ ان کی تلواروں میں لشکروں کو کھٹکھٹانے کی وجہ سے دندانے پڑے ہوئے ہیں۔“

ظاہر ہے کہ دشمنوں کے مقابلے کی وجہ سے تلواروں میں دندانے پڑ جانا کوئی عیب نہیں، تو جن کا عیب یہ ہے ان کی خوبیوں کا حال کیا ہوگا۔

اب آپ ان تینوں واقعات پر غور کریں۔ وہ لوگ ابراہیم علیہ السلام سے پوچھتے ہیں کہ اے ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کے

ساتھ تو نے یہ کام کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں، بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ کام کیا ہے۔ ”بلکہ“ کا معنی یہی ہے کہ میں نے نہیں کیا، حالانکہ ابراہیم کو خوب معلوم تھا کہ انھوں نے ہی یہ کام کیا ہے۔ یہ بظاہر صاف جھوٹ ہے مگر حقیقت میں یہ ایک تدبیر تھی جس کے ذریعے سے وہ ان کے منہ سے اقرار کروانا چاہتے تھے کہ بت بول نہیں سکتے، نفع نقصان کا مالک ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مشرکین بھی ابراہیم علیہ السلام کے مقصد کو سمجھ رہے تھے اور ان کے پاس یہ ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بت بولتے نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کا اقرار کیا۔ اب جس شخص کا جھوٹ دشمنوں کے مونہوں سے کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کا اقرار کروالے کہ اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں کچھ نہیں، اس شخص کے صدیق ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ [الصفات: ۸۹] کہ میں بیمار ہوں، وہ سمجھے کہ اتنے بیمار ہیں کہ ساتھ نہیں جاسکتے، حالانکہ جو شخص اتنا بیمار ہو وہ پتھروں وغیرہ کے اتنے محسوس کا ستیا ناس کیسے کر سکتا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام کے ذہن میں کفر و شرک سے نفرت کی وجہ سے پیدا ہونے والی تکلیف یا کوئی بیماری تھی، اسے عربی زبان میں تعریض کہتے ہیں کہ کہنے والا اپنے الفاظ سے کچھ مراد لے اور سننے والے کچھ اور سمجھیں۔ سننے والوں کے لحاظ سے واقعہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس پر کذب کا لفظ بولا جاتا ہے، مگر یہ حقیقت میں جھوٹ نہیں ہوتا، بلکہ جھوٹ سے بچنے کا ایک طریقہ ہے، جیسا کہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «إِنِّي فِي الْمَعَارِضِ لَمَمْدُوحَةٌ عَنِ الْكُذِبِ» [الأدب المفرد: ۸۵۷] ”بے شک معاریض میں کذب سے بچنے کی گنجائش ہے۔“ اسی طرح سارہ علیہا السلام کو بہن کہنا بظاہر واقعہ کے خلاف تھا مگر انھیں بہن کہتے وقت اپنی مراد ابراہیم علیہ السلام نے خود بیان فرمادی جو بالکل درست ہے۔ ان دونوں واقعوں میں ابراہیم علیہ السلام نے تعریض سے کام لیا ہے۔ غور کیجیے وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ساری زندگی میں ان تین کے سوا کوئی جھوٹ نہیں بولا، ابراہیم علیہ السلام کو سچا ثابت کر رہی ہے یا جھوٹا؟ چلیں مان ہی لیں کہ اس حدیث میں ابراہیم علیہ السلام کا تین دفعہ جھوٹ بولنا واقعی بیان ہوا ہے، پھر بھی اس میں ابراہیم علیہ السلام پر کوئی گناہ لازم نہیں آتا اور نہ ان کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے، کیونکہ وہ حالت جنگ میں تھے اور جنگ میں جھوٹ بولنا جائز ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْحَرْبُ خُدْعَةٌ» [بخاری، الجهاد والسير، باب الحرب خدعة: ۳۰۲۹] ”جنگ دھوکے کا نام ہے۔“ بتائیے!

اس میں ابراہیم علیہ السلام کے صدق پر کیا حرف آتا ہے؟

اوپر مذکور بزرگوں نے بڑے زور شور سے یہ بات کہی ہے کہ سند صحیح ہونا کافی نہیں، متن بھی صحیح ہونا ضروری ہے۔ یہ بات فی الواقع درست ہے اور خود محدثین نے اسے حدیث کی صحت کے لیے شرط قرار دیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ امام بخاری اور دوسرے محدثین کو اس حدیث میں ابراہیم علیہ السلام کی توہین نظر آتی تو وہ کبھی اسے صحیح قرار نہ دیتے۔ افسوس! ہمارے ان بزرگوں کی طعن تشنیع کا نشانہ محدثین ہی بنتے ہیں، اپنی رائے اور قیاس سے ایک نئی شریعت ایجاد کر لینے والے حضرات کے متعلق ان کے دلوں اور قلموں میں بہت نرم گوشہ ہے۔ [فہامی اللہ المُنْتَكِحِي]

پائل کے حوالے سے ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۷۵ سال اور سارہ کی عمر ۶۵ سال نقل کر کے بھی اس حدیث پر اعتراض کیا گیا ہے کہ اس عمر میں عورت میں کیا حسن باقی رہ جاتا ہے جو شاہِ مصر اس پر فریفتہ ہو۔ افسوس! ہمارے یہ حضرات ائمہ محدثین پر

فَرَجَعُوا إِلَىٰ أَنفُسِهِمْ فَقَالُوا إِنَّكُمْ أَنتُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۶۴﴾ ثُمَّ نَكَسُوا عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا هَؤُلَاءِ يَتَّبِقُونَ ﴿۶۵﴾

تو وہ اپنے دلوں کی طرف لوٹے اور کہنے لگے یقیناً تم خود ہی ظالم ہو ﴿۶۴﴾ پھر وہ اپنے سروں پر لٹے کر دیے گئے، بلاشبہ یقیناً تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ﴿۶۵﴾

اس قدر خفا ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح کتاب کی حدیث انھیں غلط نظر آئی اور وہ کتاب جس میں تحریف کی خود اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے اور جس کی داخلی شہادتیں اس کے بے شمار جھوٹوں کی نشان دہی کر رہی ہیں، وہ انھیں اس قابل نظر آئی کہ انھوں نے اس کے ساتھ صحیح حدیث رسول ﷺ کو رد کر دیا۔ [إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ] ﴿۶۴﴾ یہاں ایک اشکال باقی رہ جاتا ہے کہ صحیح بخاری میں مذکور حدیث شفاعت میں ہے کہ لوگ جب ابراہیم علیہ السلام کے پاس شفاعت کی درخواست لے کر جائیں گے تو وہ اپنے تین کذبات کا ذکر کر کے شفاعت سے عذر کر دیں گے۔ اگر یہ جھوٹ نہیں تو ابراہیم علیہ السلام شفاعت سے معذوری کیوں ظاہر کریں گے؟ اہل علم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو جو مرتبہ عطا فرمایا تھا ان کے خیال کے مطابق اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان موقعوں پر بھی تعریض کے بجائے صاف کہتے کہ ہاں، میں نے بت توڑے ہیں اور مشرکین کی عید پر جانے سے بیماری کے عذر کے بجائے صاف لفظوں میں انکار کر دیتے کہ میں نہیں جانتا۔ اسی طرح جبار مصر کے سامنے صاف کہہ دیتے کہ سارہ میری بیوی ہے، پھر جو آزمائش آتی اس پر صبر کرتے، جس طرح دوسری بہت سی آزمائشوں پر انھوں نے صبر کیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں امامت کے رتبے پر سرفراز فرمایا۔ اپنے اس عمل کو اپنے آپ پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کے مقابلے میں کمتر سمجھ کر وہ شفاعت سے معذوری ظاہر کریں گے۔ [احکام القرآن لابن العربی] دیکھیے اسی حدیث شفاعت میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام شفاعت سے یہ کہہ کر عذر کر دیں گے کہ لوگوں نے میری پرستش کی، اس لیے مجھے شفاعت کے لیے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے، حالانکہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔

آیت 64 .. فَرَجَعُوا إِلَىٰ أَنفُسِهِمْ : ابراہیم علیہ السلام کی اس زبردست چوٹ نے انھیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ سب نے اپنے دل میں غور کیا تو کہہ اٹھے کہ تم اس جوان کو خواہ مخواہ ظالم کہہ رہے ہو، ظالم تو تم خود ہو جو ایسی بے حقیقت چیزوں کو اپنا معبود قرار دے کر پوجتے پکارتے اور انھیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا قرار دیتے ہو، جن کی بے بسی اور بے چارگی کا حال یہ ہے کہ وہ خود اپنے اوپر آنے والی مصیبت کو بھی دفع نہیں کر سکتے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے آپ پر گزری ہوئی مصیبت کسی دوسرے کے سامنے بیان بھی نہیں کر سکتے، تو پھر اس سے بڑھ کر ظلم اور حماقت کیا ہو سکتی ہے؟ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ [انسان: ۱۳] ”بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔“ بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تم ہی ظالم ہو کہ تم نے اپنے بتوں کی حفاظت کا خاطر خواہ بندوبست نہیں کیا، مگر پہلا معنی ہی صحیح اور مقام کے مناسب ہے۔

آیت 65 .. ثُمَّ نَكَسُوا عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ : ”نگس“ کا معنی سر کے بل التا کرنا ہے، یعنی سر نیچے اور پاؤں اوپر کر دینا،

قَالَ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ۗ أَفِ لَكُمْ وَلِيًّا
تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ قَالُوا حِرْزُوهُ ۖ وَأَنْصُرُوا إِلَهَتَكُمْ إِنَّ
كُنْتُمْ فَعِلِينَ ۝

کہا پھر کیا تم اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں کچھ نفع دیتی ہے اور نہ تمہیں نقصان پہنچاتی ہے؟ ۝
اف ہے تم پر اور ان چیزوں پر جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، تو کیا تم سمجھتے نہیں ۝ انہوں نے کہا اسے جلا
دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو، اگر تم کرنے والے ہو ۝

یہ کسی بھی شخص کی بدترین حالت ہے۔ ”نُكِسَ الْوَلَدُ“ جب بچے کی ٹانگیں سر سے پہلے باہر آئیں۔ ”نُكِسَ فِي الْمَرَضِ“
تندرست ہو کر پھر بیمار ہو جانا۔ یعنی اگر چہ ابراہیم علیہ السلام کا جواب سنتے ہی ان کے دلوں نے فیصلہ کر دیا کہ ظالم تم خود ہو جو ایسے
بے حس اور بے بس بتوں کو معبود بنا بیٹھے ہو جو بول کر یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ان پر کیا گزری، مگر پھر حق تسلیم کرنے کے بجائے
ان پر ضد اور جہالت سوار ہو گئی، جس سے ان کی عقل الٹی ہو گئی اور وہ بغیر کسی حیا کے وہ بات کہنے لگے جس سے ان کی
بے وقوفی اور حماقت بالکل واضح ہو رہی تھی۔ ”نُكِسُوا“ لٹے کر دیے گئے، جیسے کسی چیز نے زبردستی انہیں سر کے بل اوندھا کر
دیا ہو، چنانچہ کہنے لگے: ﴿لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا هَلُوا لَآءِ يَنْطِقُونَ﴾ ”بلاشبہ یقیناً تو جانتا ہے کہ یہ بولنے نہیں۔“

آیت 66: قَالَ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ.....: ابراہیم علیہ السلام اتنے بڑے مجمع میں ان کی زبان سے یہی کہلوانا چاہتے تھے
اور سب کچھ اسی ترتیب سے ہو رہا تھا جو ابراہیم علیہ السلام کی توقع اور خواہش کے مطابق تھی۔ ان کے لیے توحید کی دعوت اور شرک
کے رد کا ایسا سنہرا موقع شاید اس سے پہلے کبھی نہ آیا ہو، چنانچہ فرمایا کہ جب یہ بول ہی نہیں سکتے تو فائدہ یا نقصان پہنچانے کا تو
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تو پھر کیا تم ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں نہ کچھ فائدہ پہنچاتی ہیں اور نہ نقصان؟ ”مَا“ کا
لفظ عموماً ان چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن میں عقل نہیں ہوتی۔

آیت 67: أَفِ لَكُمْ وَلِيًّا تَعْبُدُونَ.....: ”اف“ کا اصل معنی ہر گندی کھجی جانے والی چیز ہے، مثلاً میل، گندگی، ناخن
کے تراشے اور اس قسم کی چیزیں۔ یہی لفظ ہر اس شخص یا چیز کے لیے بولا جاتا ہے جس سے اکتاہٹ کا اظہار کرنا اور اسے گندا
اور نہایت حقیر قرار دینا مقصود ہو۔ (راغب) ”اف“ کی تینوں سے نفرت کی شدت کا اظہار ہو رہا ہے، یعنی میری زبردست
نفرت، اکتاہٹ اور تحقیر تم جیسے بے عقلوں کے لیے اور تمہارے بنائے ہوئے معبودوں کے لیے ہے، کیا تم نہیں سمجھتے کہ ایسے
بے حس اور بے بس پتھر وغیرہ بھی کبھی اس قابل ہو سکتے ہیں کہ کوئی ہوش مند انسان ساری کائنات کے خالق و مالک اللہ تعالیٰ کو
چھوڑ کر ان کی عبادت کرے؟

آیت 66: ① قَالُوا حِرْزُوهُ ۖ وَأَنْصُرُوا إِلَهَتَكُمْ : یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان دلیل سے لاجواب ہو جاتا ہے تو یا تو نیکی

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَيَّ اِبْرَاهِيمَ ﴿۱۶۹﴾

ہم نے کہا اے آگ! تو ابراہیم پر سراسر ٹھنڈک اور سلامتی بن جا ﴿۱۶۹﴾

اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے یا بادی غالب آ جاتی ہے۔ بادی کے غلبے کی صورت میں جب اس کے پاس کوئی دلیل نہیں رہتی اور وہ مکمل طور پر لاجواب ہو جاتا ہے تو اپنے مخالف کو دھکیاں دیتا ہے۔ دیکھیے نوح علیہ السلام کی قوم (شعراء: ۱۱۶)، ابراہیم علیہ السلام کو ان کے والد کی دھمکی (مریم: ۳۶)، لوط علیہ السلام کی قوم (شعراء: ۱۶۷)، شعیب علیہ السلام کی قوم (اعراف: ۸۸)، فرعون کی موئی علیہ السلام کو دھمکی (شعراء: ۲۹) اور چادو گروں کو دھمکی (شعراء: ۳۹)۔ پھر اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اپنے لاجواب کر دینے والے حریف کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی جب دلیل میں ہر طرح لاجواب ہو گئی تو ابراہیم علیہ السلام کی جان کے درپے ہو گئی۔ مشورہ ہوا کہ اسے قتل کر دو یا جلا دو۔ دیکھیے سورہ عنکبوت (۲۳) آخر فیصلہ یہ ٹھہرا کہ اپنے محبوبوں کا انتقام لینے کی اور ان کی نصرت کی یہی صورت ہے کہ اسے جلا کر رکھ بنا دو۔

﴿۱۶۹﴾ اِن كُنْتُمْ فَعَلِيْنَ : یہ الفاظ ان کے ضمیر کی کٹکٹاش کا اظہار کر رہے ہیں کہ اول تو ابراہیم کو نقصان پہنچانے والے تمہارے کسی اقدام کا کوئی جواز نہیں۔ دلیل کا جواب دلیل ہے، مار ڈالنا نہیں، لیکن اگر تمہارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں اور تم نے ضرور ہی اس کے خلاف کچھ کرنا ہے تو پھر معمولی سزا مت سوچو۔ اپنے محبوبوں کی مدد کرتے ہوئے اس کا قصہ نہایت عبرت ناک سزا کے ساتھ ختم کرو، تاکہ آئندہ کوئی اس بحث کی جرأت ہی نہ کرے۔ (بقای)

آیت 69 ﴿۱﴾ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا..... "بَرْدًا" ٹھنڈک، "سَلَامًا" سلامتی۔ مبالغہ کے طور پر مصدر بمعنی اسم فاعل ہے۔ یہاں کچھ عبارت محذوف ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ اپنے فیصلے کے مطابق انھوں نے ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کا زبردست انتظام کیا، چنانچہ کڑیاں جمع کرنے کے لیے باقاعدہ ایک چار دیواری بنائی گئی، جیسا کہ فرمایا: ﴿قَالُوا ابْنُوا آلَهُ عِندِي كَمَا بَنُوا لَكَ فِي الْعَدُوِّ وَقَوْمِكَ الْمَعْبُوتِينَ﴾ [الصافات: ۹۷] "انھوں نے کہا، اس کے لیے ایک عمارت بناؤ، پھر اسے بھڑکتی آگ میں پھینک دو۔" پھر جب آگ خوب بھڑک اٹھی اور اس کی تپش چاروں طرف پھیل گئی تو انھوں نے نتیجتاً ذریعے سے یا جیسے بھی ہو سکا، ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینک دیا تو ہم نے حکم دیا کہ اے آگ! ابراہیم پر سراسر ٹھنڈک ہو جا، مگر تکلیف دینے والی ٹھنڈک نہیں، بلکہ ایسی کہ سراسر سلامتی ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ صرف "بَرْدًا" (سراسر ٹھنڈک) فرماتے تو شدید ٹھنڈک ابراہیم علیہ السلام برداشت نہ کر سکتے، اس لیے آگ کو ٹھنڈک کے ساتھ سلامتی والی بن جانے کا حکم دیا۔

﴿۲﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابراہیم علیہ السلام کے لیے معجزہ یعنی فطرت کے عام قوانین کے برعکس معاملہ تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے موئی علیہ السلام کو سمندر پر اپنی لاشی مارنے کا حکم دیا تو سمندر پھٹ گیا اور پانی کا ہر حصہ ایک بہت بڑے پہاڑ کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا، فرمایا: ﴿فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالظَّوْدِ الْعَظِيمِ﴾ [الشعراء: ۶۳] "پس وہ پھٹ گیا تو ہر ٹکڑا بہت بڑے پہاڑ کی طرح ہو گیا۔" جب کہ پانی کی فطرت بہنا ہے، ایسے ہی آگ کی فطرت جلانا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے بعد وہ ابراہیم علیہ السلام

کے لیے گلزار بن گئی۔ اگر کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھ لے: ﴿إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ [آل عمران: ۴۷] ”جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے یہی کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔“ اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے آگ کو ”کوئی“ (ہو جا) سے خطاب فرمایا، پھر آگ کی کیا مجال تھی کہ ٹھنڈی اور سلامتی والی نہ ہوتی۔ (شائی) اگر کسی کو پھر بھی اصرار ہے کہ آگ کا کام جلانا ہی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بھی ٹھنڈی نہیں ہو سکتی تو اسے قرآن مجید پر ایمان کے دعوے کا تکلف نہیں کرنا چاہیے۔

③ ام شریک رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپکلی کو مار دینے کا حکم دیا اور فرمایا: ﴿وَكَانَ يُنْفَعُ عَلَيَّ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ﴾ [بخاری، الأبیاء، باب قوله تعالى: ﴿وَإِتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾ ﴿۳۳۵۹﴾] ”یہ ابراہیم علیہ السلام پر پھونکیں مارتی تھی۔“ محدث عبد الرزاق نے اپنی مصنف (۸۳۹۲) میں معمر بن الزہری عن عروہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿كَانَتِ الضَّفْدَعُ تُطْفِئُ النَّارَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ وَكَانَ اللَّوْزُ يُنْفَعُ فِيهِ فَتَهَىٰ عَنْ قَتْلِ هَذَا وَأَمْرٌ بِقَتْلِ هَذَا﴾ ”میتھک ابراہیم علیہ السلام سے آگ بجھاتے تھے اور چھپکلی اس میں پھونکیں مارتی تھی، سو انھیں قتل کرنے سے منع فرمایا اور اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔“ مسند احمد کے محقق نے لکھا ہے کہ یہ سند شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ﴿أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِللَّوْزِ الْقَوَائِمُ وَلَمْ أَسْمَعْهُ أَمْرًا بِقَتْلِهِ﴾ ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپکلی کو ”قویس“ (بہت نافرمان) فرمایا اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسے قتل کرنے کا حکم دیتے ہوئے نہیں سنا۔“ اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ﴿أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ بِقَتْلِهِ﴾ ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔“ [بخاری: ۳۳۰۶] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے چھپکلی کو قتل کرنے کی حدیث کسی صحابی کے واسطے سے سنی ہے، اس صورت میں بھی حدیث صحیح ہے، کیونکہ تمام صحابہ روایت حدیث میں معتبر ہیں۔

④ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کا آخری قول، جب انھیں آگ میں پھینکا گیا ”حَسْبِيَ اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ“ تھا، یعنی مجھے اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔ [بخاری، التفسیر، باب: ﴿الدِّينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ﴾ ﴿۱۵۶۴﴾]

⑤ بغوی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ کعب احبار سے روایت کی گئی ہے کہ جب انھوں نے ابراہیم علیہ السلام کو متنجس میں رکھ کر آگ کی طرف پھینکا تو جبریل علیہ السلام آپ کے سامنے آئے اور کہا: ”ابراہیم! تمہیں کوئی حاجت ہے؟“ فرمایا: ”تمہاری طرف تو نہیں۔“ انھوں نے کہا: ”پھر اپنے رب سے سوال کرو۔“ فرمایا: ﴿حَسْبِيَ مِنْ سُؤَالِي عِلْمُهُ بِحَالِي﴾ ”مجھے میرے سوال کرنے سے اس کا میری حالت کو جاننا ہی کافی ہے۔“ بغوی نے یہ کہہ کر اس کے ضعف کی طرف اشارہ کر دیا ہے: ”رَوَى عَنْ كَعْبٍ“ کہ کعب سے روایت کی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس روایت کا کوئی سرچر نہیں، اس لیے شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”لَا أَصْلَ لَهُ“ [سلسلة الأحاديث الضعيفة: ۶۱] اور ابن عراق نے ”تنزيه الشريعة المرفوعة عن الأخبار الشنيعة الموضوعه“ میں یہ روایت ذکر کر کے فرمایا: ”ابن تيمية رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، یہ روایت موضوع ہے۔“ علاوہ ازیں یہ روایت ان

آیات و احادیث کے بھی خلاف ہے جن میں دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، فرمایا: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ ذُرِّيَّةً﴾ [المؤمن: ۶۰] ”اور تمہارے رب نے فرمایا، مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿مَنْ لَمْ يَدْعُ اللَّهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ﴾ [سلسلة الأحاديث الصحيحة: ۱۵۳/۶، ح: ۲۶۵۴۔ ترمذی: ۲۳۷۳۔ ابن ماجہ: ۳۸۲۷] ”جو اللہ تعالیٰ سے دعا نہ کرے اللہ تعالیٰ اس پر غصے ہو جاتا ہے۔“

کعب احبار والی باطل روایت صحیح بخاری کی اس حدیث کے بھی خلاف ہے جو اوپر گزری کہ ابراہیم علیہ السلام نے آگ میں پھینکے جانے کے وقت آخری الفاظ ”حَسْبِيَ اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ“ کہے تھے۔ قرآن میں ابراہیم علیہ السلام کی بہت سی دعائیں مذکور ہیں، اگر دعا کے بجائے اللہ تعالیٰ کا علم ہی کافی ہو تو اللہ تعالیٰ کو تو ہر شخص کی ہر حالت کا علم ہے، پھر اس سے دعا اور سوال کا معاملہ تو سرے سے ختم ہے، حالانکہ دعا اس لیے نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری حالت کا علم نہیں بلکہ دعا خود ایک عبادت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿الِدُعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ﴾ [ترمذی، التفسیر، باب ومن سورة البقرة: ۲۹۶۹] ”دعا ہی عبادت ہے۔“ اسی حدیث میں ہے کہ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ ذُرِّيَّةً﴾ [المؤمن: ۶۰] ”اور تمہارے رب نے فرمایا مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔“ بعض صوفیاء نے جو اس باطل روایت کو دلیل بنا کر کہا ہے کہ تمہارا اس سے سوال کرنا تمہاری طرف سے اس پر تہمت لگانا ہے، یہ ان کی بہت بڑی گمراہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کو اللہ تعالیٰ پر تہمت لگانا قرار دے رہے ہیں۔ (خلاصہ سلسلہ صحیح) شیخ محمد امین شفق علی رحمۃ اللہ علیہ ”اضواء البیان“ میں فرماتے ہیں: ”ابوالعالیہ سے روایت ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ”وَسَلِّمْنَا“ نہ فرماتے تو اس کی سردی ان کے لیے اس کی گرمی سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی اور اگر ”عَلَيْ إِبْرَاهِيمَ“ نہ فرماتے تو اس کی ٹھنڈک ہمیشہ تک باقی رہتی۔ اور سردی سے ہے کہ اس دن جو آگ بھی تھی بجھ گئی۔ اور کعب اور قنادہ سے ہے کہ آگ نے صرف ابراہیم علیہ السلام کو باندھنے والی رسیاں جلائیں۔ اور نہ مال بن عمرو سے ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ”میں ان ایام جیسا خوش حال کبھی نہیں رہا جن دنوں میں آگ میں تھا۔“ اور شعیب حمانی سے ہے کہ انھیں آگ میں ڈالا گیا تو ان کی عمر سولہ (۱۶) سال تھی۔ اور ابن جریج سے ہے کہ اس وقت وہ چھبیس (۳۶) برس کے تھے۔ اور کلبی سے ہے کہ جتنی آگیں تھیں سب ٹھنڈی ہو گئیں، چنانچہ کسی آگ نے ایک کھری تک نہیں پکائی۔ اور بعض نے قصے میں ذکر کیا ہے کہ نمرود نے اپنے محل میں سے جھانکا تو دیکھا کہ ابراہیم علیہ السلام تخت پر ہیں اور سایوں کا فرشتہ ان کا دل لگا رہا ہے، تو اس نے کہا، تیرا رب بہت اچھا رب ہے، میں اس کے لیے چار ہزار گائیں قربانی کروں گا اور پھر اس نے ابراہیم علیہ السلام کو کچھ نہیں کہا۔“

شیخ شفق علی رحمۃ اللہ علیہ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں: ”یہ سب اسرائیلیات ہیں اور مفسرین اس قصے میں اور دوسرے

وَ أَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ﴿۷۰﴾ وَ نَجِّنَاكَ وَ لُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ ﴿۷۱﴾

اور انھوں نے اس کے ساتھ ایک چال کا ارادہ کیا تو ہم نے انھی کو انتہائی خسارے والے کر دیا ﴿۷۰﴾ اور ہم نے اسے اور لوط کو اس سرزمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے جہانوں کے لیے برکت رکھی ﴿۷۱﴾

بہت سے قصوں میں ایسی بہت سی باتیں بیان کر دیتے ہیں۔ ”یہاں تھوڑا سا غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ سب تابعین اور راوی اس وقت تو موجود ہی نہ تھے جب ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا گیا، نہ ان پر وحی اتری اور نہ وہ درمیان کی کوئی سند بیان کرتے ہیں، پھر انھیں ان باتوں کا پتا کیسے چلا؟ ظاہر ہے یہ وہی سنی سنائی باتیں ہیں جنہیں تفسیر قرآن میں کسی طرح بھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔ مزید دیکھیے اس تفسیر کا مقدمہ۔

﴿۷۰﴾ یہ واقعہ حق کی طرف دعوت اور اس پر استقامت کا عجیب و غریب واقعہ ہے۔ اس میں ہمارے نبی کریم ﷺ اور پوری امت مسلمہ کے لیے حق کی خاطر جان کی بازی لگا دینے کا سبق ہے اور یہ بھی کہ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو تمام اسباب ختم ہونے کے باوجود اپنے بندے کا بال بھی بیکا نہیں ہونے دیتا۔

آیت 70 وَ أَرَادُوا بِهِ كَيْدًا : ”الْأَخْسَرِينَ“ اگرچہ اسم تفضیل ہے، مگر یہاں کسی سے زیادہ خسار اٹھانے والے مراد نہیں، بلکہ یہ خاسرین میں مبالغہ ہے، اس لیے ترجمہ ”انتہائی خسارے والے“ کیا گیا ہے۔ اگر تفضیل کا معنی لیں تو ”أَخْسَرِينَ مِنْ كُلِّ خَاسِرٍ“ مراد ہوگا، یعنی ہر خسارے والے سے زیادہ خسارے والے۔ ”کَيْدًا“ خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کی سازش ان سے خفیہ رکھی تھی۔ شاید ان کا مقصد یہ ہو کہ ابراہیم علیہ السلام ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ (ابن عاشور) ”فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ“ میں ”هُمْ“ اور ”الْأَخْسَرِينَ“ دونوں کے معرّف ہونے سے قصر کا فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ بس وہی انتہائی خسارے والے ہوئے، ابراہیم علیہ السلام کو ذرہ بھر خساراً نہیں ہوا۔ انھیں خسارے والے (ناکام) اس لیے قرار دیا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی کسی بھی دلیل کا جواب نہ دے سکے جس کے ساتھ انھوں نے سورج، چاند اور ستاروں کو بے بس ثابت کیا، یا جس کے ساتھ انھوں نے بادشاہ کا بے اختیار ہونا ثابت کیا، یا بتوں کا معبود نہ ہونا ثابت کیا۔ پھر نہ ان سے بت توڑنے کا انتقام لے سکے اور نہ انھیں آگ میں جلا سکے، بلکہ وہ سب کچھ جو انھوں نے انھیں مزادینے کے لیے تیار کیا تھا ان کے لیے معجزہ اور ان کی عظمت شان کا باعث بن گیا اور انتہائی خساراً یہ کہ اس واقعہ کے بعد اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ گیا، جیسا کہ سورہ حج میں ان قوموں کا ذکر فرمایا جن پر اللہ کا عذاب آیا، تو ان میں قوم ابراہیم کا بھی ذکر ہے، آخر میں فرمایا: ﴿فَأَمَلَيْتُ لِلْكَافِرِينَ ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ﴾ (الحج : ۷۰) ”تو میں نے ان کافروں کو مہلت دی، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا تو میرا عذاب کیسا تھا؟“

آیت 71 وَ نَجِّنَاكَ وَ لُوطًا : اس واقعہ کو دیکھ کر لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ دیکھیے سورہ عنکبوت (۲۶)

وَوَهَبْنَا لَهَا إِسْحَاقَ ۖ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ ﴿۷۲﴾ وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يُهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ وَكَانُوا

لَنَا عِبْدِينَ ﴿۷۳﴾

اور ہم نے اسے اسحاق اور زائد انعام کے طور پر یعقوب عطا کیا اور سبھی کو ہم نے نیک بنایا ﴿۷۲﴾ اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے ساتھ رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف نیکیاں کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی بھیجی اور وہ صرف ہماری عبادت کرنے والے تھے ﴿۷۳﴾

اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلنے سے محفوظ رکھا تھا اسی طرح ابراہیم اور لوط علیہ السلام دونوں کو ان ظالموں کے پنجے سے بحفاظت نکال کر شام کی طرف ہجرت کرنے کی آسانی عطا فرمائی۔ یہ بھی عظیم احسان تھا، کیونکہ وہاں سے ان کا نکلنا آسان نہ تھا۔ شام کی طرف ہجرت سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام عراق کے رہنے والے تھے۔ برکت والی زمین کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۱) کی تفسیر۔

آیت 72 ﴿۷۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهَا إِسْحَاقَ ۖ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً ۖ: "نَافِلَةً" کا معنی زائد عطیہ ہے۔ اس آیت کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ ہم نے اسے اسحاق عطا کیا اور زائد انعام کے طور پر یعقوب (پوتا) عطا کیا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب دونوں زائد انعام کے طور پر عطا کیے۔ مفسر ابن عاشور رحمہ اللہ نے اس کی بہت عمدہ توجیہ فرمائی ہے کہ سورہ صافات (۱۰۰) میں مذکور ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام ہجرت کے لیے روانہ ہوئے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: ﴿رَبِّ هَبْ لِي مِنْ الصَّالِحِينَ﴾ "اے میرے رب! مجھے (لڑکا) عطا کر جو نیکوں سے ہو۔" فرمایا: ﴿فَبَشِّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ﴾ [الصافات: ۱۰۱] "تو ہم نے اسے ایک بہت بردبار لڑکے کی بشارت دی۔" یہ بردبار لڑکا اسماعیل علیہ السلام تھے جن کی قربانی کا واقعہ بھی اس مقام پر مذکور ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا تو اسماعیل علیہ السلام کی ولادت سے قبول ہو گئی تھی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسحاق اور یعقوب علیہ السلام کو عطا کیے تو وہ بغیر دعا اور بغیر امید کے عطا فرمائے، اس لیے دونوں کو زائد عطیہ قرار دیا جو اسماعیل علیہ السلام کے بعد بلا طلب عطا ہوئے۔ دونوں کی خوش خبری بھی انھیں دی گئی تھی: ﴿فَبَشِّرْنَاهُمَا بِإِسْحَاقَ ۖ وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ﴾ [حود: ۷۱] "تو ہم نے اس (سارہ) کو اسحاق کی بشارت دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی۔"

﴿۷۳﴾ وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ: "كُلًّا" سے مراد ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہ السلام ہیں، کیونکہ آخری بات انھی کی ذکر ہوئی ہے۔ لوط علیہ السلام کا ذکر ابراہیم علیہ السلام کی معیت کے طور پر آیا ہے، ان کا الگ ذکر آگے آ رہا ہے۔ [التحویر والتنویر] "صَالِحِينَ" صلاح فساد کی ضد ہے۔ "صَلَحَ" (ف، ک) درست ہونا، یعنی ہم نے ان تمام پیغمبروں کو درست عقیدے اور درست عمل والا اپنا مکمل فرماں بردار بنایا۔

آیت 73 ﴿۷۳﴾ وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يُهْدُونَ بِأَمْرِنَا: یعنی وہ صرف خود ہی ہر لحاظ سے درست اور ہمارے مکمل فرماں بردار

وَلَوْطًا اتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ تَعْبُدُ الْعَصِيَّةَ ۗ إِنَّهُمْ
 كَانُوا قَوْمًا سَوِيًّا فَيَسْقِيَنَّهُ ۗ وَادْخَلْنَاهُ فِي رَحْمَتِنَا ۗ إِنَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ۗ وَنُوحًا إِذْ
 نَادَى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۗ وَنَصْرَانًا
 مِنَ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا سَوِيًّا فَأَعْرَفْنَاهُمْ أَجْعَبِينَ ۗ

اور لوط، ہم نے اسے حکم اور علم عطا فرمایا اور اسے اس ہستی سے نجات دی جو گندے کام کیا کرتی تھی۔ یقیناً وہ برے لوگ تھے جو نافرمان تھے ۗ اور ہم نے اسے اپنی رحمت میں داخل کر لیا، یقیناً وہ نیک لوگوں سے تھا ۗ اور نوح کو بھی جب اس نے اس سے پہلے پکارا تو ہم نے اس کی دعا قبول کر لی، پھر اسے اور اس کے گھر والوں کو بہت بڑی گھبراہٹ سے بچا لیا ۗ اور ہم نے ان لوگوں کے خلاف اس کی مدد کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، بے شک وہ برے لوگ تھے تو ہم نے ان سب کو غرق کر دیا ۗ

نہ تھے، بلکہ وہ اپنی قوم کے پیشوا بھی تھے جو ہماری وحی کے مطابق دوسروں کو بھی حق کی طرف دعوت دیتے تھے۔ معلوم ہوا اصل ہدایت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہو اور جو ائمہ اللہ کے حکم کے بغیر حکم دیں تو وہ ہدایت کے امام نہیں، گمراہی کے امام ہیں۔

ۗ وَادْخَلْنَاهُ فِي رَحْمَتِنَا ۗ إِنَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ : یعنی صالحیت اور امامت کے علاوہ ہم نے انہیں اپنی وحی سے بھی سرفراز فرمایا۔ ”فِعْلُ الْعَصِيَّةِ“ میں اگرچہ تمام نیک اعمال آجاتے ہیں مگر اسلام لانے کے بعد اللہ کے حقوق میں سے سب سے اہم عمل نماز اور بندوں کے حقوق میں سے سب سے اہم حق زکوٰۃ کا ذکر خاص طور پر فرمایا، کیونکہ اگر یہ نہیں تو اسلام بھی محترم نہیں۔ دیکھیے سورہ توبہ (۵)۔

ۗ وَكَانُوا لَنَا غَدِيْنًا : ”آقا“ پہلے آنے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، یعنی وہ صرف ہماری عبادت کرنے والے تھے، کسی اور کو ہمارے ساتھ شریک کرنے والے نہ تھے۔

آیت 75:74 ۗ وَلَوْطًا اتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا : لوط علیہ السلام کا ذکر الگ کرنے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ انہیں پہلے تینوں انبیاء کے علاقے اور قوم کے علاوہ کسی دوسرے علاقے اور قوم کی طرف بھیجا گیا تھا۔ لوط علیہ السلام کا قصہ سورہ اعراف (۸۰)، ہود (۸۱) اور حجر (۶۱) میں گزر چکا ہے۔ ان کی ہستی کے ضمیمہ اعمال کا ذکر گزشتہ سورتوں کے علاوہ سورہ عنکبوت (۲۸ تا ۳۵) اور سورہ قمر (۳۳ تا ۳۷) وغیرہ میں بھی موجود ہے۔ اس ہستی کا نام سدوم مشہور ہے۔

آیت 77:76 ۗ اِبْرٰهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ : ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے نجات دینے کے بعد نوح علیہ السلام کو پانی کے طوفان سے نجات دینے کا ذکر فرمایا۔ ۗ وَنُوحًا إِذْ نَادَى مِنْ قَبْلُ : نوح علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر سورہ نوح (۲۶ تا ۲۸) میں تفصیل سے مذکور ہے، اسی طرح سورہ قمر

و دَاوُدَ وَ سُلَيْمَانَ إِذْ يَخْتَلِنَ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَسَتْ فِيهِ عَنَمُ الْقَوْمِ وَ كُنَّا
لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ ﴿۱۰﴾ فَفَقَّهْنَاهَا سُلَيْمَانَ ۚ وَ كَلَّمَا آتَيْنَا حُكْمًا وَ عَلَمًا ۚ وَ سَخَّرْنَا مَعَ

اور داؤد اور سلیمان کو، جب وہ کھیتی کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے، جب اس میں لوگوں کی بکریاں رات چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کے وقت حاضر تھے ﴿۱۰﴾ تو ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا اور ہم نے ہر ایک کو حکم اور علم عطا

میں ہے: ﴿فَدَعَا رَبُّكَ آتَى مَغْلُوبًا فَانْتَصَرَ﴾ [القدر: ۱۰] ”تو اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہوں سو توبہ لے۔“ ﴿۱۰﴾ فَتَجَنَّبْنَاهُ وَأَهْلَهُ: ”أَهْلَهُ“ سے مراد ان کے مشرک بیٹے اور بیوی کے سوا باقی گھر والے ہیں۔ بیٹے کے متعلق دیکھیے سورہ ہود (۳۰-۳۳) اور بیوی کے متعلق سورہ تحریم (۱۰)۔

﴿۱۰﴾ مِنَ الْكُزْبِ الْعَظِيمِ: ”الْكُزْبِ“ کا معنی ہے ”أَقْصَى الْعَنَمِ“ یعنی آخری حد کو پہنچا ہوا غم۔ ”الْكُزْبِ الْعَظِيمِ“ سے مراد کفار کی نوح علیہ السلام سے ساڑھے نو سو برس کی مسلسل مخالفت، بدسلوکی، ایذا رسانی، استہزاء اور سنگسار کرنے کی دھمکیاں بھی ہیں، جن کا شکوہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور کیا، جو سورہ نوح کی آیت (۵) سے آیت (۲۳) تک میں مذکور ہے اور جن کا ذکر سورہ ہود (۳۸) اور شعراء (۱۱۲) میں ہے۔ پہاڑوں جیسی موجوں والا طوفان بھی مراد ہے، جس نے اللہ کے حکم سے زمین پر بسنے والا ایک مشرک بھی باقی نہ چھوڑا۔

﴿۱۱﴾ فَأَعْرَفْنَاهُمْ أَجْبَعِينَ: اس کی تفصیل سورہ ہود (۳۷-۳۹) میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 79.78 ﴿۱﴾ وَ دَاوُدَ وَ سُلَيْمَانَ إِذْ يَخْتَلِنَ فِي الْحَرْثِ ”نَفَسَتْ“ کا معنی ہے جانوروں کا رات کو کھیت میں پھیل جانا اور اس کی کھیتی اور پودوں کو کھا جانا۔ ”عَنَمٌ“ کا لفظ بھیڑ بکری دونوں پر آتا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے داؤد اور سلیمان علیہم السلام کو عطا کردہ نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ پہلے وہ نعمت ذکر فرمائی جو دونوں کو عطا ہوئی تھی اور جو بعد میں آنے والی تمام نعمتوں سے افضل ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ كَلَّمَا آتَيْنَا حُكْمًا وَ عَلَمًا﴾ ”حُكْمًا“ سے مراد قوت فیصلہ ہے اور ”عَلَمًا“ سے مراد علم شریعت ہے۔

﴿۲﴾ ان آیات کی تفسیر رسول اللہ ﷺ سے نہیں آئی، البتہ ابن جریر نے ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس آیت کے متعلق فرمایا: «كُرْمٌ قَدْ أُبْتُتْ عَنَاقِدُهُ فَأَفْسَدَتْهُ الْعَنَمُ قَالَ فَقَضَى دَاوُدُ بِالْعَنَمِ لِصَاحِبِ الْكُرْمِ فَقَالَ سُلَيْمَانُ غَيْرُ هَذَا يَا نَبِيَّ اللَّهِ! قَالَ وَمَا ذَلِكَ؟ قَالَ تَدْفَعُ الْكُرْمَ إِلَى صَاحِبِ الْعَنَمِ فَيَقُومُ عَلَيْهِ حَتَّى يَعُودَ كَمَا كَانَ وَ تَدْفَعُ الْعَنَمَ إِلَى صَاحِبِ الْكُرْمِ فَيُصِيبُ مِنْهَا حَتَّى إِذَا عَادَ الْكُرْمُ كَمَا كَانَ دَفَعْتَ الْكُرْمَ إِلَى صَاحِبِهِ وَ دَفَعْتَ الْعَنَمَ إِلَى صَاحِبِهَا قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ: ﴿فَفَقَّهْنَاهَا سُلَيْمَانَ ۚ وَ كَلَّمَا آتَيْنَا حُكْمًا وَ عَلَمًا﴾» مستدرک: ۲/ ۵۸۸،

ح: ۱۳۸] ”یہ انگور کی بیلیں تھیں جن کے گچھے نکل چکے تھے، جنھیں بھیڑ بکریوں نے اجاڑ دیا تھا۔ فرماتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا کہ بھیڑ بکریاں انگور کی بیلیوں کے مالک کو دے دی جائیں، تو سلیمان علیہ السلام نے کہا: ”اے اللہ کے نبی! اس کا فیصلہ اور ہے۔“ انھوں نے پوچھا: ”وہ کیا ہے؟“ عرض کی: ”آپ انگور کی بیلیں بھیڑ بکریوں والے کے حوالے کر دیں، وہ ان کی نگہداشت کرے جب تک وہ دوبارہ پہلے جیسی نہ ہو جائیں اور بھیڑ بکریاں انگور کی بیلیوں والے کے حوالے کر دیں وہ اس وقت

دَاوُدُ الْجَبَالُ يُسَبِّحُنَ وَالظَّيْرُ وَكُنَّا فَعِلِينَ ﴿۴﴾

کیا اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا، جو تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی اور ہم ہی کرنے والے تھے ﴿۴﴾

تک ان سے فائدہ اٹھاتا رہے اور جب انگوڑوں کی بلیں پہلی حالت پر لوٹ آئیں تو آپ انگوڑوں کی بلیں اس کے مالک کے سپرد اور بھیڑ بکریاں اس کے مالک کے سپرد کر دیں۔“ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”تو ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا اور ہم نے ہر ایک کو حکم اور علم عطا کیا۔“ ابن کثیر کے محقق دکتور حکمت بن بشیر نے فرمایا: ”حاکم نے اسے روایت کر کے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ (اس سند میں ابو اسحاق کی تالیس موجود ہے)۔“ دکتور حکمت بن بشیر لکھتے ہیں: ”طبری نے صحیح سند کے ساتھ مجاہد کا یہی قول نقل فرمایا ہے اور قتادہ اور ابن زید کا یہی قول صحیح سند کے ساتھ مسند عبد الرزاق میں بھی مروی ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم داؤد اور سلیمان کے فیصلے کے وقت حاضر تھے، یعنی ہمیں اس کی ایک ایک جزئی کا پورا علم ہے۔ اگرچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے یہ تفسیر رسول اللہ ﷺ سے سننے کی صراحت نہیں کی، تاہم واقعہ کی صورت وہی معلوم ہوتی ہے جو انھوں نے بیان کی ہے۔ اس لیے بھی کہ بائبل میں اس واقعہ کا ذکر نہیں اور نہ یہ یہودی لٹریچر میں معروف ہے اور پھر عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اسراعیلیات بیان کرنے میں معروف بھی نہیں ہیں۔

﴿۴﴾ داؤد اور سلیمان علیہ السلام دونوں میں سے ہر ایک کا فیصلہ ان کا اجتہاد تھا، کیونکہ اگر وہ وحی سے ہوتا تو داؤد علیہ السلام کے فیصلے کے بعد اور فیصلے کی گنجائش نہ ہوتی۔ انبیاء بھی اجتہاد فرماتے ہیں مگر ان کے اجتہاد اور دوسرے لوگوں کے اجتہاد میں یہ فرق ہے کہ انبیاء کے اجتہاد میں اگر کوئی خطا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کر دیتا ہے، جیسا کہ یہاں سلیمان علیہ السلام کے فیصلے کے ساتھ اس کی اصلاح فرمادی اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کریم ﷺ کو فرمایا: ﴿عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتُ لَلكُفْرِ﴾ [التوبة: ۴۳] ”اللہ نے تجھے معاف کر دیا، تو نے انہیں کیوں اجازت دی۔“ اور فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾ [التحریم: ۱] ”اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟“ اگر کسی بات پر اللہ تعالیٰ خاموشی اختیار فرمائے، تو وہ اللہ تعالیٰ کی موافقت کی وجہ سے حق ہوتی ہے اور وحی کا حکم رکھتی ہے، یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ [النجم: ۴، ۳]۔ انبیاء علیہ السلام کے سوا کسی مجتہد کی خطا کی بذریعہ وحی اصلاح نہیں ہوتی، اس لیے ان کے اجتہادات شریعت میں حجت نہیں ہیں۔

﴿۴﴾ مسئلہ: اگر کسی کے جانور دن کے وقت کسی دوسرے کے کھیت یا باغ کو چر جائیں تو جانور والے پر کوئی تاوان نہیں ہے اور اگر رات کے وقت چر جائیں تو جس قدر نقصان ہو اس قدر تاوان جانور والے کے ذمے ہوگا، جیسا کہ براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میری ایک اونٹنی تھی جو بہت نقصان کیا کرتی تھی، ایک دفعہ وہ ایک باغ میں داخل ہو گئی اور وہاں نقصان کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں بات کی گئی تو آپ نے فیصلہ فرمایا: ”دن کے وقت باغات کی نگرانی اور حفاظت ان کے مالکوں کے ذمے ہے اور رات کے وقت جانوروں کی نگرانی ان کے مالکوں کے ذمے ہے اور رات کے وقت جانور جو نقصان کر جائیں تو وہ ان کے مالکوں کے ذمے ہے (کہ اسے پورا کریں)۔“ [ابو داؤد، الإجارة، باب المواشي فمفسد زرع

قوم : ۳۵۷۰۔ ابن ماجہ : ۲۳۳۲۔ سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ : ۱/۲۳۷، ح : ۲۳۸] بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جانور والے پر کسی صورت تاوان نہیں ہے اور دلیل میں ”الْعَمَاءُ جُرْحُهَا جُبَارٌ“ (جانور کا کسی کو زخمی کر دینا معاف ہے) پیش کرتے ہیں، حالانکہ اس حدیث میں صرف زخم کے معاف ہونے کا ذکر ہے، کھیت کے نقصان کے معاف ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ لہذا براء بن عازب رضی اللہ عنہ والی حدیث میں اور اس میں کوئی تعارض نہیں ہے کہ براء رضی اللہ عنہ کی حدیث کو منسوخ کہا جائے۔ (قرطبی)

⑤ اس آیت سے اس حدیث کی تائید ہوتی ہے جو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ» [بخاری، الاعتصام بالکتاب والسنة، باب أجر الحاكم إذا اجتهد..... : ۷۳۵۲] ”جب حاکم فیصلہ کرے اور پوری کوشش کرے، پھر درست فیصلہ کرے تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جب وہ فیصلہ کرے اور پوری کوشش کرے، پھر خطا کر جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔“ یہاں اللہ تعالیٰ نے اگرچہ ”فَفَقَّهْنَاهَا سُلَيْمَانَ“ (ہم نے وہ فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا) کہہ کر سلیمان رضی اللہ عنہ کے فیصلے کی تائید فرمائی، مگر داؤد اور سلیمان دونوں کے متعلق فرمایا: ﴿وَجَلَّآ تَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا﴾ کہ ہم نے ہر ایک کو حکم اور علم عطا کیا۔

⑥ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سلیمان رضی اللہ عنہ کے کمال فہم و ذکاوت کا ایک اور واقعہ روایت کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: «كَانَتِ امْرَأَتَانِ مَعَهُمَا ابْنَاهُمَا جَاءَ الذُّبُّ فَذَهَبَ بِأَبْنِ إِحْدَاهُمَا فَقَالَتْ صَاحِبَتُهَا إِنَّمَا ذَهَبَ بِأَبْنِيكَ، وَقَالَتِ الْأُخْرَى إِنَّمَا ذَهَبَ بِأَبْنِيكَ، فَتَحَاكَمْتَا إِلَى دَاوُدَ فَقَضَى بِهِ لِلْكُبْرَى، فَخَرَجْنَا عَلَى سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوُدَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ فَأَخْبَرْتَاهُ فَقَالَ اتَّوَيْنِي بِالسَّكِينِ بِالسَّقِينِ أَشَقُّهُ بَيْنَهُمَا، فَقَالَتِ الصَّغْرَى لَا تَفْعَلْ بِرَحْمَتِكَ اللَّهُ، هُوَ ابْنُهَا، فَقَضَى بِهِ لِلصَّغْرَى» [بخاری، الأنبياء، باب قول الله تعالى: ﴿وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ.....﴾ : ۳۴۲۷۔ مسلم : ۱۷۲۰۔ نسائی : ۵۴۰۵] ”دو عورتیں تھیں جن کے پاس ان کے بیٹے تھے۔ بھڑیا آیا اور ان میں سے ایک کے بیٹے کو لے گیا۔ وہ اپنی ساتھی عورت سے کہنے لگی کہ وہ تو تمہارا بیٹا لے گیا ہے۔ دوسری کہنے لگی، وہ تمہارا بیٹا ہی لے گیا ہے۔ چنانچہ وہ دونوں فیصلے کے لیے داؤد رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں۔ انھوں نے اس کا فیصلہ بڑی کے حق میں کر دیا۔ دونوں جاتے ہوئے سلیمان بن داؤد رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزریں تو انھیں یہ بات بتائی، انھوں نے فرمایا: ”میرے پاس چاقولاؤ، میں اسے دونوں کے درمیان چیر دوں۔“ تو چھوٹی نے کہا: ”ایسا نہ کریں، اللہ آپ پر رحم کرے، یہ اسی کا بیٹا ہے۔“ چنانچہ انھوں نے اس کا فیصلہ چھوٹی کے حق میں کر دیا۔“ امام نسائی نے اس حدیث پر باب باندھا ہے کہ حاکم کے لیے تجاویز ہے کہ جو کام اس نے نہیں کرنا، اس کے متعلق کہے کہ میں ایسا کرتا ہوں، تاکہ حق واضح ہو جائے۔

⑦ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات بیٹا باپ سے زیادہ بات سمجھ لیتا ہے، اس میں کفار عرب کے لیے بھی سبق ہے جو رسول اللہ ﷺ کی رہنمائی کے باوجود آبا و اجداد کی رسوم چھوڑنے پر تیار نہ تھے اور ان مقلدین کے لیے بھی جنھوں نے چار اماموں کے بعد اجتہاد کا دروازہ قیامت تک کے لیے بند کر دیا ہے۔ بتائیے اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے فیض عام کی توہین اور کیا ہوگی؟

⑧ وَسَعَزْنَا مَعَ دَاوُدَ النَّجْجَالِ يُبْسَخَنَ وَالظَّلِيْرَ : اس سے پہلے ابراہیم اور نوح رضی اللہ عنہما کی خاطر آگ اور پانی کو مسخر کرنے کا ذکر فرمایا تھا۔ اب داؤد اور سلیمان رضی اللہ عنہما دونوں پر مشترکہ نعمت و علم کا ذکر کرنے کے بعد دونوں کو عطا کردہ نعمتیں الگ الگ

وَعَلَّنَهُ صَنْعَةَ الْبُؤْسِ لَكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِنْ بَأْسِكُمْ ۚ فَهَلْ أَنْتُمْ شَاكِرُونَ ﴿۸۰﴾ وَاسْلَيْمَنَ

اور ہم نے اسے تمہارے لیے زرہ بنانا سکھایا، تاکہ وہ تمہاری لڑائی سے تمہارا بچاؤ کرے۔ تو کیا تم شکر کرنے

ذکر فرمائیں۔ چنانچہ داؤد علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر اور پابند کر دیا اور انہیں اتنی خوبصورت آواز عطا

فرمائی کہ جب وہ اللہ کی کتاب زبور پڑھتے یا تسبیح کرتے تو پہاڑ اور پرندے بھی ان کے ساتھ تسبیح کرتے۔ سورہ سبا میں فرمایا:

﴿يُجِيبَالْأَوَّابِينَ مَعَهُ وَالظَّالِمِينَ﴾ [سبا: ۱۰] "اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح کو دہراؤ اور پرندوں کو بھی (یہی حکم دیا)۔"

سورہ ص میں فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ وَإِبْرَاهِيمَ نَحْنُ نَسْجِدُ بِالْعِشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ وَالظَّيْرِ عَشُورًا ۖ كُلُّ لَدَا أَوَّابٍ﴾ [ص: ۱۸، ۱۹]

"بے شک ہم نے پہاڑوں کو اس کے ہمراہ مسخر کر دیا، وہ دن کے پچھلے پہر اور سورج چڑھنے کے وقت تسبیح کرتے

تھے اور پرندوں کو بھی، جب کہ وہ اکٹھے کیے ہوتے، سب اس کے لیے رجوع کرنے والے تھے۔" سبحان اللہ! وہ کیسا حسین

منظر ہو گا جب اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ اور پرندے بھی مصروف تسبیح ہوتے ہوں گے۔ بعض لوگوں نے پہاڑوں کی

تسبیح کا مطلب داؤد علیہ السلام کی بلند اور سریلی آواز سے ان کا گونج اٹھنا اور پرندوں کی تسبیح سے مراد ان کا ٹھہر جانا قرار دیا ہے، مگر

درحقیقت یہ پہاڑوں اور پرندوں کی ان کے ہمراہ تسبیح کو ناممکن سمجھ کر اس کا انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز داؤد علیہ السلام پر خاص

نعمت کے طور پر ذکر فرمائی ہے، پہاڑوں کی گونج تو ہر بلند آواز سے پیدا ہوتی ہے، اچھی ہو یا بری، اس میں داؤد علیہ السلام کی

خصوصیت کیا ہوئی؟ اس لیے صحیح معنی یہی ہے کہ پہاڑ اور پرندے فی الواقع ان کے ہمراہ تسبیح کرتے تھے۔ مزید تفصیل کے

لیے دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۲۳)۔

﴿وَكُنَّا فَعَلِينَ﴾ یعنی تعجب مت کرو کہ وہ پہاڑ اور پرندے کیسے بولتے اور تسبیح کرتے تھے، یہ سب کچھ ہمارے کرنے سے

ہوتا تھا۔ (کبیر)

آیت 80 : وَعَلَّنَهُ صَنْعَةَ الْبُؤْسِ لَكُمْ "بُؤْسِ" اور "بِئْسَ" ایک ہی ہے جو موقع کے لحاظ سے مختلف ہوتا

ہے، چنانچہ لڑائی کا لباس زرہ ہے۔ یہ داؤد علیہ السلام پر تیسرا انعام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہمراہ پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر

کرنے کے علاوہ ان کے لیے لوہے کو بھی نرم کر دیا اور انہیں اس کی تاروں اور حلقوں سے زرہیں بنانے کا ہنر سکھایا۔ چنانچہ

اتنی ہلکی اور عمدہ زرہیں بنانے کے موجود وہی ہیں۔ انھی سے دوسروں نے یہ فن سیکھا۔ یہ نعمت صرف انھی پر نہیں تھی، بلکہ قیامت

تک تمام لڑنے والوں کے لیے نعمت ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر لازم ہے، تو کیا تم شکر کرنے والے ہو؟ یہ سوال دراصل شکر

کے حکم کی تاکید ہے۔ داؤد علیہ السلام کے متعلق مزید دیکھیے سورہ سبا (۱۰، ۱۱) اور سورہ ص (۱۷ تا ۲۶)۔

آیت 81 : ﴿وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً﴾ : اللہ تعالیٰ نے پانی کو حکم دیا تو اس نے نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو چھوڑ

کر ان کی ساری قوم کو غرق کر دیا۔ آگ کو حکم دیا تو وہ ابراہیم علیہ السلام پر برد و سلام بن گئی۔ داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح کے لیے پہاڑوں

اور پرندوں کو مسخر کر دیا، فرمایا: ﴿وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ وَالْحَيَّاتِ﴾ [الانبیاء: ۷۹] مگر پانی یا آگ کو نوح

الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا مَوْعِدَنَا يَحْيَىٰ وَعَلِيٌّ ۖ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ ۗ ﴿٨١﴾

والے ہو؟ ﴿۸۱﴾ اور سلیمان کے لیے ہوا (مسخر کردی) جو تیز چلنے والی تھی، اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے ﴿۸۱﴾

یا ابراہیم ﷺ کے تابع فرمان نہیں کیا، نہ پہاڑوں یا پرندوں کو داؤد علیہ السلام کے حکم کا پابند کیا، مگر سلیمان علیہ السلام کا خاصہ یہ ہے کہ ہوا ان کے حکم کے تابع کر دی گئی، فرمایا: ﴿تَجْرِي بِأَمْرِهِ﴾ کہ وہ اس کے حکم سے چلتی تھی۔

﴿عَاصِفَةً﴾ کا معنی ہے ”شدیدۃ الہبوب“ بہت سخت تیز چلنے والی ہوا۔ سورہ ص میں فرمایا: ﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَاب﴾ [ص: ۳۶] ”تو ہم نے اس کے لیے ہوا کو تابع کر دیا، جو اس کے حکم سے بہت نرم چلتی تھی، جہاں کا وہ ارادہ کرتا تھا۔“ اور سورہ سبأ میں فرمایا: ﴿وَلَسَلَيْنَا الرِّيحَ عُذُوبًا شَهْرًا زَوَّاحًا شَهْرًا﴾ [سبأ: ۱۲] ”اور

(ہم نے) ہوا کو سلیمان کے (تابع کر دیا) پہلے پہر اس کا چلنا ایک ماہ کا تھا اور پچھلے پہر اس کا چلنا بھی ایک ماہ کا۔“ یہاں ایک سوال ہے کہ ایک جگہ اس کو تند و تیز بتایا، دوسری جگہ نہایت نرم؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اس ہوا میں دونوں خوبیاں موجود ہوتی تھیں، تند و تیز اتنی کہ صبح کے وقت چند گھنٹوں میں ایک ماہ کا سفر طے کر لیتی، اسی طرح پچھلے پہر بھی چند گھنٹوں میں اتنا ہی سفر طے کر لیتی اور نرم اور ہموار اتنی کہ سلیمان علیہ السلام اور ان کے ہمراہیوں کو کوئی تکلیف یا جھکا محسوس نہ ہوتا۔

﴿تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا﴾: قرآن مجید میں ارض مبارک شام کو کہا گیا ہے۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل۔ اس آیت میں سلیمان علیہ السلام کے اپنے کسی بھی سفر سے ان کے دار الحکومت شام کی طرف واپسی کا ذکر ہے، کیونکہ بعض اوقات آدمی سفر میں جاتے ہوئے بہت دور پہنچ جاتا ہے اور واپسی اس کے لیے مشکل ہوتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہوا سلیمان علیہ السلام کے حکم سے ارض مبارک کی طرف چلتی تھی۔ رہا سلیمان علیہ السلام کا دوسرے مقامات کی طرف جانا، تو اس کا ذکر سورہ ص (۳۶) میں ہے کہ ہوا ان کے حکم سے اسی طرف چل پڑتی تھی جہاں ان کا ارادہ ہوتا، جیسا کہ پچھلے فائدے میں گزرا ہے۔

﴿ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کرنے سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے اس سے ہوا کا ان کے بحری بیڑوں کے موافق چلنا مراد لیا ہے، کیونکہ اس زمانے میں بحری جہازوں کا چلنا موافق ہوا پر موقوف تھا۔ یہ حضرات بائبل کا حوالہ دیتے ہیں۔ بعض تابعین نے کہا کہ سلیمان علیہ السلام اور ان کی افواج لکڑی کے بہت لمبے چوڑے چوڑے پر بیٹھ جاتے تو سلیمان علیہ السلام کے حکم سے ہوا انہیں اٹھا کر ان کی منزل مقصود کی طرف چل پڑتی۔ بعض نے اس طرح کے ایک مربع میل قالین کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے ان میں سے کوئی صاحب بھی موقع پر موجود نہیں تھا اور نہ انہوں نے اپنی معلومات کا کوئی ذریعہ بیان کیا ہے۔ رہی بائبل، تو اس کی حیثیت مقدمے میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ ص میں ذکر فرمایا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے دعا کی تھی: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي نُلُوكًا لَّا يُنْبَغِي لِأَخِي قَبْلِي﴾ [ص: ۳۵] ”اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو۔“ اس دعا کو قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ہوا ان کے تابع کر دی کہ ان

وَمِنَ الشَّيْطَانِ مَنْ يَغْوُصُونَ لَهُ وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا ذُوْنَ ذٰلِكَ ۗ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۷۵﴾

اور کئی شیطان جو اس کے لیے غوطہ لگاتے تھے اور اس کے علاوہ کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کے نگہبان تھے ﴿۷۵﴾ کے حکم سے وہ جہاں کا ارادہ کرتے چل پڑتی تھی۔ آج کل انسان مہینوں کا سفر گھنٹوں میں ہوائی جہاز کے ذریعے سے طے کر رہا ہے، اگر سمندری سفر کی تیزی ہی مراد ہو تو یہ وہ سلطنت تو ہرگز نہیں جو سلیمان علیہ السلام کے بعد کسی کے لائق ہی نہیں۔ کیونکہ ہوائی جہاز سمندر ہی نہیں خشکی کو بھی عبور کرتے چلے جا رہے ہیں اور وہ تقریباً ہر ملک میں موجود ہیں۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ ان کے لیے ہوا کی وہ تسخیر ہوائی جہازوں اور اس قسم کے آلات کی محتاج نہ تھی، بلکہ وہ اس سے بہت اعلیٰ چیز تھی جس کی بدولت وہ ہوا کے ذریعے سے سمندروں اور خشکی پر مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرتے ہوئے جہاں چاہتے چلے جاتے تھے۔ اس کی تفصیل اگر انسان کی سمجھ میں آسکتی یا اس کی ضرورت ہوتی تو اللہ تعالیٰ بیان فرما دیتا، ہمیں اتنا ہی کافی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا۔

﴿۷۶﴾ وَكُنَّا بِحُجَّتِ الشَّيْطٰنِ عَلَيْهِمْ : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تند و تیز ہوا نہایت نرمی سے چلتی ہوئی سلیمان علیہ السلام کو لے کر مہینوں کا سفر پہروں میں طے کر لے؟ فرمایا، ہم ہمیشہ سے ہر چیز کا علم رکھتے ہیں اور ہمارے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔

آیت 82 : ﴿۷۷﴾ وَمِنَ الشَّيْطٰنِ مَنْ يَغْوُصُونَ لَهُ : اللہ تعالیٰ نے ہوا کے علاوہ کئی شیطان جن بھی سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیے۔ گویا عناصر اربعہ میں سے ہوا کے علاوہ آگ سے بنی ہوئی کچھ مخلوق بھی ان کے تابع فرمان کر دی گئی، پھر اس مخلوق کے ذریعے سے غوطہ خوری کے ساتھ بہت سے سمندری منافع حاصل کرنے کی استطاعت بخشی اور انھی کے ذریعے سے مٹی اور اس سے نکلنے والے پتھر وغیرہ سے ہر وہ چیز بنانا ان کی دسترس میں کر دیا جو وہ بنانا چاہتے تھے۔ گویا تسخیر عناصر کی عجیب نعمت انھیں عطا فرمائی گئی۔ (بقاعی) بعض منحرف مفسرین کا کہنا ہے کہ شیاطین کا لفظ جن و انس دونوں پر آ جاتا ہے، جیسا کہ سورہ انعام (۱۱۲) میں ”شَّيْطٰنِ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ“ کا ذکر ہے، اس لیے دراصل یہ سرکش اور قوی قسم کے دیہاتی لوگ تھے، جن سے سلیمان علیہ السلام غوطہ خوری اور عمارت کی تعمیر کا کام لیتے تھے۔ مگر سورہ سبأ میں صراحت ہے: ﴿۷۸﴾ وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَغْوِلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاٰذَنِ رَبِّهِ ۗ وَمَن يَزِيغُ وَّهُمْ عَنْ اٰمٰرِنَا لِنُفِقَهُ مِنَ الْعَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۷۹﴾ يَغْوِلُوْنَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَّخٰرِبٍ وَتَمَاثِيْلٍ وَحِفَاظٍ كَالْحِوَابِ ۗ وَفُوْرٌ مِّنْ سَابِغٍ اَعْمَلُوْا اِلَآ ذَاوُدَ شَكَرًا ۗ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۸۰﴾ [سبأ: ۱۱۲، ۱۱۳] ”اور جنوں میں سے کچھ وہ تھے جو اس کے سامنے اس کے رب کے اذن سے کام کرتے تھے اور ان میں سے جو ہمارے حکم سے کچی کرتا ہم اسے بجز کچی آگ کا کچھ عذاب چکھاتے تھے۔ وہ اس کے لیے بناتے تھے جو وہ چاہتا تھا، بڑی بڑی عمارتیں، مجسمے اور حوضوں جیسے لگن اور ایک جگہ جمی ہوئی دیکیں۔ اے داؤد کے گھر والو! شکر ادا کرنے کے لیے عمل کرو۔ اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے پورے شکر گزار ہیں۔“ سورہ سبأ (۱۳) ہی میں ذکر ہے کہ ان جنوں کے متعلق بعض لوگوں کا عقیدہ تھا کہ وہ غیب دان ہیں

مگر جنوں کو سلیمان علیہ السلام کی وفات کا علم اس وقت تک نہ ہوا جب تک دیمک نے ان کی لاشی کو کھا نہیں لیا، پھر جب سلیمان علیہ السلام گرے تو جنوں کی حقیقت کھل گئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلیل عذاب (عمار تیس وغیرہ بنانے کے کام) میں نہ رہتے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے غوطہ خوری اور دوسرے دشوار کاموں کے لیے جنوں میں سے کچھ شیاطین کو سلیمان علیہ السلام کے تابع کیا تھا، ورنہ دیہاتی سرکش اور قوی انسان تو سلیمان علیہ السلام سے پہلے بھی عمارتیں بناتے تھے اور اب بھی بناتے ہیں، پھر سلیمان علیہ السلام کی وہ بے مثال سلطنت کیا ہوئی جس بھی سلطنت ان کے بعد کسی کے لائق ہی نہیں ہے۔

② وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا دُونَ ذَلِكَ : اس کی تفصیل کچھ پچھلے فائدے میں گزری ہے، کچھ سورہ سبا (۱۳ تا ۱۴) میں آئے گی۔

③ وَكَانَ لَهُمْ حَفِظِينَ : یعنی اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی قدرت سے سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا اور خود ان کی حفاظت فرمائی کہ نہ وہ بھاگ سکتے تھے، نہ ان کی نافرمانی کر سکتے تھے، نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتے تھے اور نہ کوئی چیز یا کوئی کام خراب کر سکتے تھے، کیونکہ جو ان کے حکم سے ذرا بھی سرتابی کرتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بھڑکتی ہوئی آگ سے سزا دی جاتی، فرمایا:

﴿وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا ذُنُوبَهُ مِنَ عَذَابِ الشَّعِيرِ﴾ [سبا: ۱۲] "اور ان میں سے جو ہمارے حکم سے کجی کرنا ہم اسے بھڑکتی آگ کا کچھ عذاب چکھاتے تھے۔" اور جو زیادہ ہی سرکشی دکھانے والے تھے انھیں بیڑیوں میں اکٹھے جکڑنے کا بندوبست موجود تھا، فرمایا: ﴿وَأَخْرَجْنَا مُقْتَرِنِينَ فِي الْأَصْفَادِ﴾ [ص: ۳۸] "اور کچھ اوروں کو بھی (تابع کر دیا) جو بیڑیوں میں اکٹھے جکڑے ہوئے تھے۔" ظاہر ہے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا، ورنہ انسان کی کیا بساط کہ اتنی خوفناک قوتوں کو قابو میں رکھ سکے۔

④ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلیمان علیہ السلام کے تابع جو جن کیسے گئے تھے وہ کافر تھے، کیونکہ شیطان کا کفر معلوم ہے۔ اگر وہ مسلمان ہوتے تو خود ہی اللہ کے پیغمبر کے تابع ہو جاتے، پھر ان کی خاص حفاظت کی ضرورت نہ تھی۔

⑤ سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد اگر کوئی شخص کوئی جن پکڑ لے، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما نے زکوٰۃ فطر کی حفاظت کرتے ہوئے تین دفعہ شیطان کو پکڑا تھا، تو اللہ کی طرف سے اس کے لیے ان کے نقصان سے حفاظت کا کوئی ذمہ نہیں۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سرکش جن کو پکڑ کر چھوڑ دیا تھا، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ سے بیان فرماتے ہیں: «إِنَّ عِفْرِينَ بَيْنَ الْجَنِّ نَفَلَتْ عَلَيَّ الْبَارِحَةَ لِيَقْطَعَ عَلَيَّ صَلَاتِي فَأَمْكَنَتَنِي اللَّهُ مِنْهُ فَأَخَذْتُهُ فَأَرَدْتُ أَنْ أَرْطُلَهُ عَلَى سَارِيَةٍ مِنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ حَتَّى تَنْظُرُوا إِلَيْهِ كُلُّكُمْ، فَذَكَرْتُ دَعْوَةَ أَبِي سُلَيْمَانَ: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَبْتَغِي لِإِخْوَتِي مِنْ بَعْدِي﴾ [ص: ۳۵] فَرَدَّدْتُهُ خَاسِمًا» [بخاری، احادیث الانبياء، باب قول الله تعالى: ﴿ووهبنا لداود سليمان﴾ [۳۵۲۳] "ایک سرکش جن گزشتہ رات مجھ پر حملہ آور ہوا، تاکہ مجھ پر میری نماز قطع کر دے، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قابو دے دیا اور میں نے اسے پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دوں، تاکہ تم سب اسے دیکھو، پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان (علیہ السلام) کی دعا یاد آئی: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَبْتَغِي لِإِخْوَتِي مِنْ بَعْدِي﴾ "اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو۔" تو میں نے اسے دفع دور کرتے ہوئے پیچھے دھکیل دیا۔"

وَ اَيُّوبَ اِذْ نَادَى رَبَّهُ اَنْى مَسْنَى الضُّرِّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّحِیْمِ ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا

اور ایوب، جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بے شک میں، مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم والا ہے ﴿۸۳﴾ تو ہم نے اس کی دعا قبول کر لی، پس اسے جو بھی تکلیف تھی دور کر دی اور اسے اس کے گھر

آیت 84-83 ﴿۱﴾ وَ اَيُّوبَ اِذْ نَادَى رَبَّهُ یعنی ایوب کو یاد کرو۔ داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی آزمائش ان نعمتوں کے

ساتھ ہوئی جن پر شکر واجب تھا، جبکہ ایوب علیہ السلام کی آزمائش ایسی تکالیف کے ساتھ ہوئی جن پر صبر لازم تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شکر اور صبر لازم و ملزوم ہیں۔ صبر وہی کر سکتا ہے جو شکر ہو اور شکر وہی کرتا ہے جو صابر ہو۔ بے صبر اشاکر نہیں ہوتا اور ناشکرا صابر نہیں ہوتا۔ ان کا واقعہ قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک یہاں سورہ انبیاء میں اور ایک سورہ ص (۳۱ تا ۴۳) میں۔ ایک دفعہ زیر تفسیر آیات کا ترجمہ ملاحظہ کریں، ساتھ ہی سورہ ص کی آیات کا ترجمہ دیکھیں، وہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کر جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بے شک شیطان نے مجھے بڑا دکھ اور تکلیف پہنچائی ہے۔ اپنا پاؤں مار، یہ نہانے کا اور پینے کا ٹھنڈا پانی ہے اور ہم نے اسے اس کے گھر والے عطا کر دیے اور ان کے ساتھ اتنے اور بھی، ہماری طرف سے رحمت کے لیے اور عقلوں والوں کی نصیحت کے لیے۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایوب علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ نبی تھے۔ اللہ کی طرف سے ان پر ایسی آزمائش آئی کہ وہ شدید اور لمبی بیماری میں مبتلا ہو گئے، ان کے اہل و عیال بھی جدائی یا فوت ہونے کی وجہ سے ان سے جدا ہو گئے۔ (ثانی) جب کمانے والے ہی نہ رہے تو مال مویشی بھی ہلاک ہو گئے، مگر ایوب علیہ السلام نے ہر مصیبت پر صبر کیا، نہ کوئی داویا کیا اور نہ کوئی حرف شکایت لب پر لائے۔ جب تکلیف حد سے بڑھ گئی تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ ایک یہ کہ اے میرے رب! مجھے شیطان نے بڑا دکھ اور تکلیف پہنچائی ہے۔ دوسری یہ کہ اے میرے رب! مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم والا ہے۔ اس دعا میں انھوں نے اپنی حالت زار بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ارحم الراحمین ہونے کے بیان ہی کو کافی سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور حکم دیا کہ زمین پر اپنا پاؤں مارو۔ انھوں نے پاؤں مارا تو ٹھنڈے پانی کا چشمہ نمودار ہو گیا۔ حکم ہوا کہ اسے پیو اور اس سے غسل کرو۔ وہ مبارک پانی پینے اور اس کے ساتھ غسل کرنے سے ان کی ساری بیماری دور ہو گئی اور وہ پوری طرح صحت مند ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کے گھر والے بھی عطا فرمادے اور اتنے ہی اور عطا فرمادے۔ بیماری کے دوران انھوں نے کسی پر ناراض ہو کر اسے کوڑے مارنے کی قسم کھائی تھی، اب وہ سزا زیادہ سمجھ کر پریشان تھے کہ اسے اتنے کوڑے ماروں تو زیادتی ہوتی ہے، نہ ماروں تو قسم ٹوٹی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ مشکل بھی حل فرمادی کہ اتنے تنگوں کا مٹھالے کر ایک دفعہ مار دو، جتنے کوڑے مارنے کی تم نے قسم کھائی تھی، اس سے تمھاری قسم پوری ہو جائے گی، قسم توڑنے کا گناہ نہیں ہوگا۔

﴿۲﴾ "الضُّرُّ" اور "الضُّرُّ" میں فرق یہ ہے کہ ضاد کے فتح کے ساتھ "ضُرُّ" نفع کی ضد ہے، اس سے مراد کوئی بھی نقصان ہے،

مَا بِهِ مِنْ خُزْرٍ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَذِكْرَى لِلْعَابِدِينَ ﴿۳۳﴾

والے اور ان کے ساتھ ان کی مثل (اور) عطا کر دیے، اپنے پاس سے رحمت کے لیے اور ان لوگوں کی یاد دہانی کے لیے جو عبادت کرنے والے ہیں ﴿۳۳﴾

مالی ہو یا جانی یا کوئی اور، جبکہ ضاد کے ضمہ کے ساتھ ”خُزْرٌ“ سے مراد آدمی کی جسمانی بد حالی ہے، مثلاً بیماری، لاغری یا بڑھاپا وغیرہ۔ (اعراب القرآن از رویش)

۳۱ ایوب علیہ السلام نے شدید تکلیف دہ بیماری اور اموال و اولاد کی ہلاکت جیسے مصائب کی آزمائش میں جس طرح صبر کیا، پھر جس طرح انھوں نے اللہ کی جناب میں اپنی حالت زار کا ذکر کر کے اس کے ارحم الراحمین ہونے کے واسطے سے دعا کی اور جسے شرف قبولیت عطا ہوا، اس سے چند اسباق حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ شدید بیماری اور مال و اہل کی تباہی کے ساتھ آزمائش اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی، اسی طرح اس پر صبر کی توفیق دینا، پھر دعا قبول فرما کر صحت سے نوازا اور دگنے اہل و عیال عطا فرمانا، سب کچھ اللہ کی عظیم رحمت تھی۔ دوسرا یہ کہ اس میں عبادت گزار بندوں کے لیے یاد دہانی ہے کہ اگر اللہ کے بندوں کا مصائب کے ذریعے سے امتحان ہو اور وہ اس پر صبر کریں اور اللہ تعالیٰ ہی کی جناب میں اپنی فریاد پیش کریں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ملتا ہے اور آدمی کے گمان سے بھی بہت زیادہ ملتا ہے۔ یہاں ”ذِكْرَى لِلْعَابِدِينَ“ فرمایا، جبکہ سورہ ص (۳۳) میں ”ذِكْرَى لِرَبِّكَ الْأَكْبَابِ“ فرمایا، معلوم ہوا عبادت کرنے والے ہی عقل والے ہیں، جو بندگی نہیں کرتے وہ کہتے ہی ہوشیار نظر آئیں، عقل سے خالی ہیں۔ تیسرا یہ کہ آزمائش میں صبر اور اللہ تعالیٰ ہی سے بار بار رجوع اور استعاضہ و فریاد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کی تعریف میں تین جملے ارشاد فرمائے: ﴿۱﴾ ﴿إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا﴾ ”ہم نے اسے صبر کرنے والا پایا۔“ ﴿۲﴾ ﴿يَعْمَرُ الْعَبْدَ﴾ ”وہ بہت اچھا بندہ تھا۔“ ﴿۳﴾ ﴿إِنَّا أَزَاوَبُ﴾ ”یقیناً وہ بہت رجوع کرنے والا تھا۔“ اس سے معلوم ہوا کہ آزمائش میں کامیابی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شاباش بھی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تحسین و آفرین ایوب علیہ السلام کے حق میں بہت ہی بڑی شہادت ہے۔

۳۲ دکتور محمد بن محمد ابوہبہ رضی اللہ عنہما اپنی کتاب ”الاسرائیلیات والموضوعات فی کتب التفسیر“ میں لکھتے ہیں کہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت فرمایا: ”وہب بن منبہ سے ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں ایک لمبا قصہ روایت کیا گیا ہے، جسے ابن جریر نے اور ابن ابی حاتم نے سند کے ساتھ اس (وہب بن منبہ) سے نقل کیا ہے۔ بعد میں آنے والے کئی ایک مفسرین نے بھی اسے ذکر کیا ہے۔ اس واقعہ میں غرابت ہے، ہم نے لمبا ہونے کی وجہ سے اسے ترک کر دیا ہے۔“ ابوہبہ فرماتے ہیں: ”عجیب بات یہ ہے کہ روایات پر نقد کرنے والے حافظ ابن کثیر بھی ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں انھی باتوں میں پڑ گئے ہیں جن میں دوسرے حضرات پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہاں بہت سی اسرائیلیات ذکر فرمائی ہیں، جن پر کوئی تعاقب نہیں فرمایا، حالانکہ ان کے متعلق ہمارا مشاہدہ ہے کہ وہ ایسی جو بات بھی ذکر فرماتے ہیں اس کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ

کہاں سے آئی اور اسلامی روایات میں کیسے داخل ہوئی؟ میں نہیں سمجھتا کہ وہ ان روایات کو (بلا نقد) بیان کرنا جائز سمجھتے ہوں۔ چنانچہ انھوں نے ذکر کیا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ”ان کے سارے بدن میں جذام (کوڑھ) ہو گیا اور ان کے دل اور زبان کے سوا کوئی چیز سلامت نہ رہی، جن کے ساتھ وہ اللہ عزوجل کا ذکر کرتے تھے، یہاں تک کہ پاس بیٹھنے والوں کو ان سے نفرت ہو گئی اور انھیں شہر کے ایک کونے میں الگ رہائش رکھنا پڑی۔ ان کی بیوی کے سوا ان پر شفقت کرنے والا کوئی نہ رہا، جس نے ان کی آزمائش کے دوران ناقابل بیان مصیبتیں اٹھائیں، حتیٰ کہ وہ محنت مزدوری کرنے لگیں، بلکہ انھوں نے اسی وجہ سے اپنے بال بھی فروخت کر دیے۔“ پھر ذکر فرماتے ہیں: ”بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس آزمائش میں بہت لمبی مدت تک مبتلا رہے۔ پھر اختلاف ہے کہ انھیں اس دعا کے لیے بے قرار کرنے کا باعث کیا تھا؟ چنانچہ حسن بصری اور قتادہ نے کہا، ایوب رضی اللہ عنہ سات سال اور کچھ مہینے آزمائش میں مبتلا رہے، اس عرصے میں انھیں کوڑا پھینکنے کی جگہ میں ڈال دیا گیا اور ان کے بدن میں کیڑے پڑ گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی تکلیف دور فرمائی اور انھیں اجر عظیم عطا فرمایا اور ان کی بہت اچھی تعریف فرمائی۔ اور وہب بن منہب نے کہا کہ آپ تین سال تکلیف میں مبتلا رہے، نہ زیادہ نہ کم۔ سُدّی نے کہا، ایوب رضی اللہ عنہ کا گوشت جھڑ گیا، صرف ہڈیاں اور پٹھے باقی رہ گئے۔“ پھر ایک لمبا قصہ ذکر کیا، پھر ابن کثیر نے وہ واقعہ ذکر فرمایا جو ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے عن الزہری عن انس بن مالک روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نبی ایوب رضی اللہ عنہ پر ان کی آزمائش اٹھارہ برس رہی۔ دور و نزدیک کے سب لوگوں نے انھیں چھوڑ دیا۔ ان کے دوستوں بھائیوں میں سے صرف دو آدمی صبح اور شام ان کے پاس آتے تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا، جانتے ہو! اللہ کی قسم! ایوب نے کوئی ایسا گناہ کیا ہے جو دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔ سناہی نے کہا، وہ کیا ہے؟ اس نے کہا، اٹھارہ سال ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم نہیں کیا کہ اس کی تکلیف دور کر دیتا۔ جب شام کو دونوں ان کے پاس گئے تو اس آدمی نے اس بات کا ذکر کر دیا۔ ایوب رضی اللہ عنہ نے کہا، مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہاں یہ بات اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں دو آدمیوں کے پاس سے گزرتا جو جھگڑ رہے ہوتے، جس میں وہ اللہ کا ذکر کرتے تو میں گھر آ کر ان کی طرف سے کفارہ دے دیتا کہ کہیں وہ ناحق اللہ کا ذکر نہ کر رہے ہوں۔ اور وہ حاجت کے لیے باہر جایا کرتے تھے، جب فارغ ہو جاتے تو ان کی بیوی ہاتھ پکڑ کر لے آتی۔ ایک دن اس نے آنے میں دیر کی تو اسی جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی: ﴿أَرْضُ بِرِجْلِكَ هَذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ﴾ [ص: ۷۲] ”اپنا پاؤں مار، یہ نہانے کا اور پینے کا ٹھنڈا پانی ہے۔“

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایوب رضی اللہ عنہ کے قصے میں سب سے صحیح روایت وہ ہے جو ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے بیان کی ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے، پھر یہ روایت بیان کی۔ شیخ ناصر الدین البانی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ (سلسلہ صحیح: ۱۷) مگر صحیح بات یہی ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ حافظ ابن حجر کے قول سے اس کا صحیح ہونا ثابت نہیں ہوتا، صرف دوسری روایتوں سے اس کا بہتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان کی مراد اس حدیث کا صحیح ہونا ہو تب بھی ان کی بات محل نظر ہے۔ ابن کثیر نے ”الْبِدَايَةُ وَالْآخِرَةُ“ میں ایوب رضی اللہ عنہ کے تذکرہ میں فرمایا: ”هَذَا غَرِيبٌ رَفَعَهُ جَدًّا وَالْأَشْبَهُ أَنْ يَكُونَ مَوْثُوقًا“ ”اس روایت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہونا بہت ہی غریب ہے، زیادہ قریب یہی ہے کہ یہ صحابی کا قول ہے۔“

اس روایت کی تمام سندوں میں زہری کی روایت ”عن“ کے لفظ کے ساتھ آئی ہے اور زہری کا اپنی تمام تر عظمت و جلالت کے باوجود مدلس ہونا معروف و مشہور ہے۔ اس لیے صحیحین کے سوا ان کی تالیس والی روایت کو صحیح نہیں کہا جاسکتا۔

ایوب رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے صرف ایک صحیح حدیث آئی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «بَيْنَمَا أَيُّوبُ يُغْتَسِلُ غُرْبَانًا خَرَّ عَلَيْهِ رَجُلٌ حَرَادٍ مِنْ ذَهَبٍ فَجَعَلَ يَحْتَبِي فِي نَوْبِهِ فَنَادَاهُ رَبُّهُ يَا أَيُّوبُ! أَلَمْ أَكُنْ أَعْنَيْتُكَ عَمَّا تَرَى؟ قَالَ بَلَى يَا رَبِّ! وَلَكِنْ لَا غِنَى لِي عَنْ بَرَكِكَ» [بخاری، احادیث الانبیاء، باب قول الله تعالى: ﴿وأيوب إذ نادى ربه...﴾ : ۳۲۹۱] ”ایوب رضی اللہ عنہ کپڑے اتار کر غسل کر رہے تھے، غسل کے دوران ہی ان پر سونے کی ٹڈیوں کا ایک ذل (شکر) آگرا۔ ایوب رضی اللہ عنہ لوہوں کے ساتھ اسے اپنے کپڑے میں بھرنے لگے تو انھیں ان کے رب نے آواز دی: ”اے ایوب! کیا میں نے تمہیں اس سے غمی نہیں کر دیا جو تم دیکھ رہے ہو؟“ انھوں نے عرض کی: ”کیوں نہیں، تیری عزت کی قسم! لیکن میرے لیے تیری برکت سے کسی طرح بے پروائی ممکن نہیں۔“

اس کے علاوہ ایوب رضی اللہ عنہ کے متعلق تمام اقوال تابعین یا صحابہ سے مروی ہیں اور سب وہب بن منہب کے بیان ہی کا خلاصہ یا تفصیل ہیں، جو صاف ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل سے لیے گئے ہیں۔ حقیقت صرف وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے اور جس کا خلاصہ اس آیت کے فائدہ نمبر (۱) میں گزر چکا ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بیان پر اپنے پاس سے یا ان اہل کتاب سے لے کر اضافہ کرے جنھوں نے انبیاء پر تہمتیں باندھیں، بلکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو بھی نہیں بخشا اور کہہ دیا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ دیکھیے سورہ آل عمران (۱۸۱) اور یہ کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَارْتَبَتْ أَعْيُنُهُمْ فَوَلَّوْا الْخُبْرَاءَ﴾ [المائدہ : ۶۴] ”انھی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور ان کی باتوں کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی ہے۔“

۵ ابوہبہ فرماتے ہیں، ہمیں جو عقیدہ رکھنا واجب ہے وہ یہ ہے کہ ایوب رضی اللہ عنہ کی آزمائش یقیناً ہوئی، ان پر جسم اور اہل و مال کی شدید تکلیف آئی، جس پر انھوں نے ایسا صبر کیا کہ صبر میں ضرب المثل بن گئے اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر ان کی تعریف فرمائی، مگر ان کی آزمائش اس حد تک نہیں پہنچی جو ان جھوٹی داستانوں میں بیان ہوئی ہے کہ انھیں جذام (کوڑھ) ہو گیا، ان کے سارے جسم پر چھوڑے بن گئے، انھیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا۔ ان کے جسم میں کیڑے ریگلتے پھرتے تھے اور ہڈیوں اور پٹھوں کے سوا سارا گوشت جھڑ گیا تھا اور ان سے دور ہی سے بد بو آتی تھی وغیرہ۔ ایوب رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس سے کہیں معزز و مکرم تھے کہ انھیں کوڑے پر پھینک دیا جائے، یا وہ ایسے مرض میں مبتلا ہوں جس سے لوگ ان کی دعوت سے متنفر ہوں۔ اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہی اس قدر محبوب حالت میں ہو تو ایسی دعوت کا کیا فائدہ اور اس سے حاصل کیا ہوگا؟ پھر انبیاء ہمیشہ اپنی قوم کے اونچے نسب میں سے مبعوث کیے جاتے رہے ہیں (جیسا کہ حدیث ہرقل میں ہے)۔ ایوب رضی اللہ عنہ کی ایسی حالت میں ان کا قبیلہ کہاں تھا کہ ان کی حفاظت کرتا، ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرتا، بجائے اس کے کہ ان کی بیوی لوگوں کے گھروں میں کام کرے، بلکہ اپنے سر کے بال فروخت کرتی پھرے اور ان پر ایمان لانے والے کہاں گئے، کیا سب انھیں چھوڑ گئے، کیا ایمان کا تقاضا یہی ہے؟

وَاسْمِعِيلَ وَادْرِيسَ وَذَا الْكُفْلِ كُلُّ قِنِ الصُّبْرَيْنِ ﴿۸۵﴾

اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو۔ ہر ایک صبر کرنے والوں سے تھا ﴿۸۵﴾

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی ساری داستانیں بے بنیاد ہیں، نہ عقل سلیم انھیں تسلیم کرتی ہے اور نہ صحیح نقل۔ ایوب علیہ السلام پر آنے والی بیماری ایسی ہرگز نہ تھی جس سے نفرت پیدا ہو، کیونکہ یہ ان کے منصب ہی کے خلاف تھا، بلکہ وہ اس قسم کی کوئی بیماری تھی جس کا جسم پر کوئی نشان ظاہر نہیں ہوتا، مثلاً کوئی جسمانی درد، ریومازم، جوڑوں یا ہڈیوں وغیرہ کی تکلیف۔ جب اللہ کا فضل ہوا تو زمین پر پاؤں مارنے کے نتیجے میں نمودار ہونے والے جشے کا ٹھنڈا پانی پینے اور اس کے ساتھ غسل کرنے سے مکمل شفا یاب ہو گئے۔ قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ کی بات دل کو بہت لگتی ہے، وہ فرماتے ہیں: ”ایوب علیہ السلام کے معاملے میں کوئی بات ثابت نہیں سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی کتاب میں دو مقامات پر بتائی ہے، ایک: ﴿وَإِيُوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ﴾ [الانبیاء: ۸۳] اور دوسری: ﴿رَبَّنَا إِنِّي أَسْتَعِيذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ النَّاصِطِ وَعَذَابِ﴾ [ص: ۹۱] رہے نبی کریم ﷺ! تو آپ سے اس حدیث کے سوا ایوب علیہ السلام کے متعلق ایک حرف بھی ثابت نہیں جس میں ان پر غسل کے دوران سونے کی ٹنڈیاں گرنے کا ذکر ہے۔ پھر جب اس کے سوا قرآن اور حدیث میں کوئی بات ثابت ہی نہیں تو وہ کون صاحب ہیں جنہوں نے ایوب علیہ السلام کا حال آنکھوں سے دیکھا یا کانوں سے سنا؟ رہی اسرائیلی روایات! تو وہ علماء کے نزدیک قطعی طور پر متروک ہیں، اس لیے ان کے پڑھنے سے اپنی نگاہیں بچا کر رکھو اور ان کے سننے سے اپنے کان بند رکھو۔ کیونکہ وہ تمہاری سوچ میں محض خیال کا اور دل میں صرف خرابی کا اضافہ کریں گی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ! كَيْفَ تَسْأَلُونَ أَهْلَ الْكِتَابِ؟ وَكِتَابِكُمْ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى نَبِيِّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَدُتِ الْأَخْبَارُ بِاللَّهِ تَقَرُّوهُ وَنَهْ لَمْ يُشَبَّ، وَقَدْ حَدَّثَكُمْ اللَّهُ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ بَدَّلُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ وَغَيَّرُوا بِأَيْدِيهِمُ الْكِتَابَ فَقَالُوا: ﴿هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لَيْشَتَرُوا بِهِ شَيْئًا قَلِيلًا﴾ [البقرة: ۷۹] أَفَلَا يَنْهَأُكُمْ مَا جَاءَكُمْ مِنَ الْعِلْمِ عَنْ مُسَاءَلَتِهِمْ؟ وَلَا وَاللَّهِ! مَا زَأَيْنَا رَجُلًا مِنْهُمْ قَطُّ نَسْأَلُكُمْ عَنِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَيْكُمْ» [بخاری، الشهادات، باب لا يسأل أهل الشرك عن الشهادة وغيرها: ۲۶۸۵] ”اے مسلمانو کی جماعت! تم اہل کتاب سے کس طرح سوال کرتے ہو، جب کہ تمہاری کتاب، جو نبی ﷺ پر نازل کی گئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی خبروں میں سے سب سے تازہ ہے۔ تم اسے اس حال میں پڑھتے ہو کہ اس میں کوئی ملاوٹ نہیں کی گئی اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو لکھا تھا اہل کتاب نے اسے بدل دیا اور انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اللہ کی کتاب میں تبدیلی کر دی اور کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے ساتھ بہت تھوڑی قیمت حاصل کریں۔ تو کیا تمہارے پاس جو علم آیا ہے وہ تمہیں ان سے سوال کرنے سے منع نہیں کرتا؟ نہیں! قسم ہے اللہ کی! ہم نے ان میں سے کسی آدمی کو کبھی تم سے اس کے متعلق سوال کرتے ہوئے نہیں دیکھا جو تم پر نازل کیا گیا ہے۔“ آخر میں ابو عبیدہ نے آلوسی، طبری اور دوسرے علماء سے اس مفہوم کی عبارتیں نقل کی ہیں۔ ایوب علیہ السلام کے متعلق مزید دیکھیے سورہ ص (۴۱ تا ۴۴)۔

وَأَدْخَلْنَهُمْ فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُمْ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۸۶﴾ وَذَا النُّونِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا

اور ہم نے انھیں اپنی رحمت میں داخل کر لیا۔ یقیناً وہ نیک لوگوں سے تھے ﴿۸۶﴾ اور مچھلی والے کو، جب وہ غصے سے بھرا کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے تین پیغمبروں کا ذکر فرمایا جو خاص طور پر صبر کی صفت سے آراستہ تھے۔ اسماعیل علیہ السلام نے ذبح کے متعلق اپنے والد ماجد کے پوچھنے پر کہا: ﴿سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ﴾ [الصافات: ۱۰۲] ”اگر اللہ نے چاہا تو مجھے ضرور صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔“ اور اس نے واقعی صبر کر کے دکھایا۔ اسی طرح وادی غیر ذی زرع میں مستقل رہائش پر اور شکار اور زعم کے ساتھ زندگی گزارنے پر صبر کیا، پھر بیت اللہ کی تعمیر میں ہر طرح کی مشقت برداشت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد میں سید ولد آدم ﷺ کو پیدا فرمایا۔ اسماعیل اور ادریس علیہ السلام کا ذکر سورہ مریم (۵۷: ۳۵۳) میں گزر چکا ہے۔ ذوالکفل کے متعلق قرآن وحدیث میں تفصیل نہیں آئی۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ انبیاء کے ساتھ ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے نبی تھے۔ (واللہ اعلم) اس کے علاوہ تفاسیر میں ان کے متعلق بیان کردہ تمام اسرائیلیات پر مبنی اور بے اصل ہیں۔

﴿۸۶﴾ مُحَمَّدٌ مِنَ الصَّابِرِينَ: صبر کا لفظی معنی باندھنا ہے، یہ تین طرح کا ہوتا ہے: ① اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر، یعنی اپنے آپ کو اس کی فرماں برداری کا پابند رکھنا۔ ② اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے صبر، یعنی اپنے آپ کو اس سے روک کر رکھنا۔ ③ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تقدیر میں لکھے ہوئے آلام ومصائب آنے پر اپنے آپ کو جزع فزع اور اللہ تعالیٰ یا مخلوق کے شکوہ و شکایت سے روک کر رکھنا۔ کوئی بھی شخص صابر نہیں کہلا سکتا جب تک وہ صبر کی ان تینوں قسموں سے پوری طرح آراستہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام پیغمبروں کے متعلق شہادت دی کہ انھوں نے صبر کا پورا حق ادا کیا۔

آیت 86 . وَأَدْخَلْنَهُمْ فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُمْ مِنَ الصَّالِحِينَ: ”صَلَحٌ يَصْلُحُ صَلَاحًا“ (ف، ن، ک) درست ہونا۔ یہ فساد کی ضد ہے۔ (قاموس) اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء کی تعریف فرمائی کہ وہ پوری طرح صالح تھے، ان کا دل اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کی محبت اور ہر وقت اس کے ذکر سے درست تھا۔ ان کی زبان اس کے ذکر، اس کے دین کی دعوت اور ہر وقت سچ کہنے سے درست تھی اور دوسرے تمام اعضاء اس کے احکام کی اطاعت اور منع کردہ چیزوں سے اجتناب کی وجہ سے درست تھے، کیونکہ ان تینوں کے درست ہوئے بغیر کوئی شخص صالح نہیں کہلا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صبر و صابریت کی وجہ سے ہم نے انھیں اپنی رحمت میں داخل کر لیا اور انھیں نبوت عطا کی۔ دنیا و آخرت کی نعمتیں عطا فرمائیں، یہی کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ان کی تعریف فرمائی اور قیامت تک کے لیے انھیں حقیقی ناموری عطا فرمائی۔ (سعدی)

آیت 87 : ﴿۱﴾ وَذَا النُّونِ: یعنی مچھلی والے کو یاد کرو۔ ”النُّون“ کی جمع ”نِيسَان“ ہے، جیسے ”نُحُوت“ کی جمع ”حِيسَان“ ہے۔ اس سے مراد یونس بن مثنیٰ (بروزن ششٹی) ہیں جو نینوی (پہلے نون کے کسرہ اور دوسرے کے فتح کے ساتھ) کے رہنے والے تھے، جو موصل (عراق) کے قریب تھا۔

﴿۲﴾ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا: باب مفاعله سے اسم فاعل ہے جس میں مشارکت ہوتی ہے، یا معنی میں مبالغہ مراد ہوتا

فَلَنْ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي

ہوا چلا گیا، پس اس نے سمجھا کہ ہم اس پر گرفت نکل نہ کریں گے تو اس نے اندھیروں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی ہے۔ یونس علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو دعوت دی اور وہ مسلسل کفر کرتے رہے تو آخر اکتا کر سخت غصے کی حالت میں ان کے حق میں بدعا کی اور عذاب کی دھمکی دے کر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر انہیں چھوڑ کر نکل پڑے۔ جب کہ منصب رسالت کا تقاضا تھا کہ ان کے تمام تر غیظ و غضب اور کفر و طغیان کے باوجود انہی میں رہتے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ہرگز انہیں چھوڑ کر نہ جاتے، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال دعوت میں گزار دیے، نہ اکتائے اور نہ ان کے حق میں بدعا کی، جب تک اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ آئندہ ان کی قوم میں سے کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا۔ دیکھئے سورہ ہود (۳۶) اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کریم ﷺ کو فرمایا: ﴿قَاضِيْنَ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ﴾ [القصص: ۷۸] ”پس اپنے رب کے فیصلے تک صبر کر اور مجھل والے کی طرح نہ ہو۔“ اور فرمایا: ﴿قَاضِيْنَ كَمَا صَبَرَ اُولُو الْعُرْوَةِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَنُفُورِهِمْ﴾ [الاحقاف: ۳۵] ”پس اولوالعزم رسولوں کی طرح صبر کر اور ان کے لیے جلدی (عذاب کا) مطالبہ نہ کر۔“ اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کے بلا اجازت نکلنے کو غلام کا بھاگ جانا قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿اِذَا بَقِيَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ﴾ [الصافات: ۱۴۰] ”جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ کر گیا۔“ یونس علیہ السلام کے واقعہ کے لیے مزید دیکھیے سورہ یونس (۹۸) اور سورہ صافات (۱۳۹ تا ۱۳۸)۔

③ **فَلَنْ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ**: ”اَنْ“ اصل میں ”اَنَا“ سے مخفف ہے، ”نا“ کو حذف کر کے ”اَنْ“ کے نون کو ساکن کر دیا گیا ہے، یا ”اَنْ“ حرف تفسیر ہے جو ”اَنْی“ کے معنی میں ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ ”فَقَدَرٌ يَّقْدِرُ“ کا معنی قادر ہونا، قابو پانا ہے، تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ کا جلیل القدر پیغمبر یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر قابو نہیں پاسکے گا؟ اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ انھوں نے یہ ہرگز نہیں سمجھا کہ اللہ تعالیٰ ان پر قابو نہیں پاسکے گا، بلکہ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کی معمولی کوتاہی پر بھی سخت ننگلی کا اظہار فرماتے ہیں۔ اس آیت میں ان کی حالت کا بیان ہے کہ بلا اجازت ان کے چلے جانے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ سمجھ رہے ہوں کہ مجھے کوئی پکڑ نہیں سکے گا۔ دوسرا جواب اس سے بہتر ہے کہ یہاں ”لَنْ نَقْدِرَ“ قادر ہونے کے معنی میں نہیں، بلکہ ننگلی کرنے اور گرفت کرنے کے معنی میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ﴾ [الرعد: ۲۶] ”اللہ رزق فراخ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَمَنْ قَدِرْ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيَنْفِقْ مِنْهُ اِنَّهُ اللّٰهُ﴾ [الطلاق: ۷] ”اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو تو وہ اس میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔“ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ یونس علیہ السلام نے سمجھا کہ ان کے بلا اجازت قوم سے نکل جانے پر ہم ان پر کوئی گرفت نہیں کریں گے۔ بعض اہل علم نے پہلے معنی کو سرے سے غلط قرار دیا ہے۔

④ **فَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ**: یہاں ایک ایسی بات حذف کر دی گئی ہے، جو سورہ صافات (۱۳۹ تا ۱۳۸) میں مذکور ہے۔ خلاصہ

كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿٥٨﴾

معبود نہیں، تو پاک ہے، یقیناً میں ظلم کرنے والوں سے ہو گیا ہوں ﴿۵۸﴾

اس کا یہ ہے کہ وہ قوم سے نکلے تو سمندری سفر کے لیے ایک کشتی میں سوار ہوئے جو ضرورت سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ طوفان آیا اور سب کے ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہوا تو کشتی ہلکی کرنے کے لیے سامان پھینکنے کے بعد کچھ آدمیوں کو سمندر میں پھینکنے کا فیصلہ ہوا۔ قرعہ ڈالا گیا تو کئی اور آدمیوں کے ساتھ یونس علیہ السلام کے نام کا قرعہ نکلا، چنانچہ دوسروں کے ساتھ انھیں بھی سمندر میں پھینک دیا گیا، جہاں اللہ کے حکم سے ایک بہت بڑی مچھلی نے انھیں سالم ہی نگل لیا۔ اب وہ ایسی جگہ تھے جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ یہ ایسا قید خانہ تھا جہاں نہ کوئی ملاقاتی، نہ مقدمہ لڑنے والا، نہ پیروی کرنے والا، نہ قید کی کوئی میعاد، بلکہ تاقیامت قید کا فیصلہ (اگر وہ تسبیح نہ کریں) اور نہ اللہ کے سوا امید کی کوئی روشنی۔ ان کئی اندھیروں میں انھوں نے اپنے رب کو اس حال میں آواز دی کہ وہ غم سے بھرے ہوئے تھے، فرمایا: ﴿إِذْ نَادَى وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿۵۸﴾﴾ [الفلم: ۵۸] ”جب اس نے پکارا، اس حال میں کہ وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔“

۵ قرآن مجید میں ”الظُّلْمَاتِ“ کا لفظ ہر جگہ جمع ہی آیا ہے، واحد کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ (ابن عاشور) پھر سمندر کی تاریکیوں کا کوئی حساب ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ مُّتَجِنٍّ يَبْغُضُهُ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ مَوَّجٌ مِنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ مُّظْلِمٌ ﴿۵۹﴾﴾ [النور: ۴۰] ”یا (کفار کے اعمال کی مثال) ان اندھیروں کی طرح ہے جو نہایت گہرے سمندر میں ہوں، جسے ایک موج ڈھانپ رہی ہو، جس کے اوپر ایک اور موج ہو، جس کے اوپر ایک بادل ہو، کئی اندھیرے ہوں، جن میں سے بعض بعض کے اوپر ہوں۔“ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق سمندر کے اندھیرے جب صرف ”الظُّلْمَاتِ“ ہی نہیں بلکہ ”ظُلُمَاتٍ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ“ میں تو ”الظُّلْمَاتِ“ کی جمع کا صیغہ مکمل کرنے کے لیے رات کا اندھیرا شامل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یونس علیہ السلام کی دعا دن کے وقت ہو تب بھی ”فِي الظُّلُمَاتِ“ ہی ہے۔ [التفسیر القرآنی للشیخ عبد الکریم الخطیب]

۶ ﴿أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ:﴾ یہ ”أَنْ“ بھی اصل میں ”أَنْتَ“ سے مخفف ہے، یا حرف تفسیر بمعنی ”أَنَّ“ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے اگلی آیت میں فرمایا ہے: ﴿فَاسْتَجِبْنَا لَهُ﴾ ”تو ہم نے اس کی دعا قبول کی۔“ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یونس علیہ السلام نے کچھ مانگا ہی نہیں، نہ رہائی اور نہ اس مصیبت سے چھٹکارا، تو اللہ تعالیٰ نے کون سی دعا قبول فرمائی؟ جواب اس کا یہ ہے (واللہ اعلم) کہ انھوں نے اپنی حالت کے مطابق بہترین دعا کی ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف کی کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میرا مالک و معبود ہے، میں تیرا بندہ اور تیرا غلام ہوں، میں اور میرا سب کچھ تیرے سپرد اور تیرے تابع ہے۔ پھر اس کی تسبیح کی کہ تو ہر عیب اور کمی سے پاک ہے، میری اس آزمائش اور مصیبت میں تیرا کوئی ظلم ہے نہ زیادتی، تیری ذات ظلم سے یکسر پاک ہے۔ تو نے جو کیا مالک اور معبود ہونے کی وجہ سے تیرا حق ہے اور اس میں تیری بے شمار حکمتیں ہیں۔ آخر میں اپنے ظلم کا اعتراف کیا کہ یقیناً مجھ پر جو کچھ گزرا یہ میرے اپنی جان پر ظلم کی وجہ سے ہے۔ یہ دعا بہترین اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے اعتراف

فَاسْتَجِبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذَلِكَ نُصْحِي الْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۸﴾ وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ ﴿۸۹﴾

تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے غم سے نجات دی اور اسی طرح ہم ایمان والوں کو نجات دیتے ہیں ﴿۸۸﴾ اور زکریا کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا اے میرے رب! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے ﴿۸۹﴾ میں درخواست ہو رہی ہے کہ تیرے سوا کوئی مجھے اس مصیبت سے نجات نہیں دے سکتا، تسبیح کے ضمن میں اظہار ہو رہا ہے کہ تو مجھے اس مصیبت سے نکالنے سے عاجز نہیں کہ جس سے نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں اور ہمیشہ سے اپنے ظالموں میں سے ہونے کا اعتراف معافی اور بخشش مانگنے کی لطیف ترین صورت ہے۔ ایوب ؑ نے بھی دعا کے لیے عرض حال اور اللہ کی رحمت کا واسطہ دینے پر اکتفا کیا ہے۔ مزید سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ”الْحَمْدُ لِلَّهِ“ کے بہترین دعا ہونے کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ یونس ؑ کے واقعہ کی مزید تفصیل سورہ صافات اور سورہ قلم میں دیکھیں۔

آیت 88 وَكَذَلِكَ نُصْحِي الْمُؤْمِنِينَ: اس کے دو معنی ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں، ایک یہ کہ جس طرح ہم نے یونس ؑ کی دعا قبول کر کے انھیں غم سے نجات دی اسی طرح ہم ایمان والوں کو ان کی دعائیں قبول کر کے غم سے نجات دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ جس طرح اس دعا کے ساتھ ہم نے یونس ؑ کو غم سے نجات دی اسی طرح ایمان والوں کو ہم اس دعا کے ساتھ غم سے نجات دیتے ہیں۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «دَعْوَةُ ذِي النُّونِ إِذْ دَعَا وَهُوَ فِي بَطْنِ الْحُوتِ ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ فَإِنَّهُ لَمْ يَدْعُ بِهَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ فِي شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا اسْتَجَابَ اللَّهُ لَهُ» (ترمذی، الدعوات، باب [في دعوة ذي النون]: ۳۵۰۵۔ مسند أحمد: ۱۷۰۸۱، ج: ۱، ۱۶۴۴، و صححه الألبانی [ذو النون (یونس ؑ) کی دعا، جو اس نے مچھلی کے پیٹ میں کی ”لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ“ کوئی مسلم آدمی اس کے ساتھ کسی چیز کے بارے میں دعا نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہے۔“

آیت 89 ﴿۱﴾ وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ.....: یہ اس سورت میں مذکور نواں قصہ ہے، اس کی تفصیل سورہ آل عمران (۳۹) (۲۱۳) اور سورہ مریم (۱۵۳) میں ملاحظہ فرمائیں۔

﴿۲﴾ وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ: وارث وہ ہے جو کسی مالک کے فوت ہونے کے بعد اس کی ملکیت کا مالک بنے۔ اصل وارث سب کا اللہ تعالیٰ ہی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا﴾ [مریم: ۴۰] ”بے شک ہم، ہم ہی زمین کے وارث ہوں گے اور ان کے بھی جو اس پر ہیں۔“ زکریا ؑ نے اپنے علم و نبوت کا وارث عطا کرنے کی درخواست کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی صفت ”خَيْرُ الْوَارِثِينَ“ کا وسیلہ پکارا۔ قرآن و سنت میں مذکور دعاؤں میں ہر دعا کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کی صفت کا ذکر ہے، جیسا کہ ایوب ؑ نے ”وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ“ کہا اور یونس ؑ نے ”لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ“

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ رَوْ وَ هَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَ اَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسْرِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَ يَدْعُوْنَآ رَغْبًا وَ رَهْبًا ؕ وَ كَانُوْا لَنَا حَشِيْعِيْنَ ۝۹۰

تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا، بے شک وہ نیکیوں میں بہت جلدی کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف سے پکارتے تھے اور وہ ہمارے ہی لیے عاجزی کرنے والے تھے ۹۰

ہے، اگر تو مجھے اولاد نہ بھی دے گا تب بھی میرے بعد اپنے دین کا انتظام ضرور کرے گا۔ (قرطبی)

آیت 90 ① فَاسْتَجَبْنَا لَهُ رَوْ وَ هَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَ اَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ : بیوی کو درست کرنے سے مراد ان کا ہانجھ پن دور کر کے انہیں اولاد کے قابل بنانا ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ بظاہر ترتیب تو یہ ہونی چاہیے کہ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اس کے لیے اس کی بیوی کو درست کر دیا اور اسے یحییٰ عطا کیا، کیونکہ بیوی درست ہونے کے بعد بچے کا مرحلہ آتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ واؤ ہمیشہ ترتیب کے لیے نہیں ہوتی۔ یہاں یحییٰ علیہ السلام عطا کرنے کا ذکر پہلے اس لیے ہے کہ دعا بیٹا عطا کرنے کی تھی، اس کی قبولیت کے بیان کے لیے پہلے یحییٰ عطا کرنے کا ذکر ہوا، پھر اس سوال کا جواب دے دیا گیا کہ اتنی بوزھی اور ہانجھ بیوی سے بیٹا کیسے پیدا ہو گیا؟

② اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسْرِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ : یعنی ذکر یا علیہ السلام، ان کی بیوی اور یحییٰ علیہ السلام نیکیوں میں جلدی کرتے اور رغبت اور خوف کے ساتھ ہمیں پکارتے تھے اور صرف ہمارے لیے عاجزی کرنے والے تھے۔ یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ ان تمام انبیاء میں، جن کا ذکر اس سے پہلے گزرا، یہ تینوں صفات پائی جاتی تھیں۔ معلوم ہوا دعا کی قبولیت کے لیے یہ تینوں باتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان بڑے لوگوں میں یہ بات نہ تھی کہ شفا بخش سکیں یا مشکل کشائی کر سکیں یا اولاد عطا کر دیں، بلکہ وہ نیکیوں میں جلدی کرتے تھے اور خوف اور طمع کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ بندگی میں ان کے عظیم مرتبے کے پیش نظر معجزانہ طریقے سے ان کی دعا قبول فرماتا تھا۔

③ وَيَدْعُوْنَآ رَغْبًا وَ رَهْبًا : یعنی وہ ہمیں اس طرح پکارتے تھے کہ ایک طرف انہیں ہمارے اجر کی توقع رہتی تھی اور دوسری طرف ہمارے عذاب کا ڈر اور یہی بندگی کا اعلیٰ ترین مقام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَ طَمَعًا﴾ [السجدة: ۱۶] ”وہ اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور طمع کرتے ہوئے پکارتے ہیں۔“ بعض صوفی حضرات کہا کرتے ہیں کہ جنت کے لالچ یا جہنم کے خوف سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا تو سودے بازی ہے، عبادت تو بس اللہ کی رضا کے لیے کرنی چاہیے، اس آیت میں ان کا رد ہے، انبیائے کرام اللہ کے قرب کے سب سے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوتے ہیں، ان کے متعلق فرمایا: ﴿يَدْعُوْنَآ رَغْبًا وَ رَهْبًا﴾ یعنی وہ ہمیں اس طرح پکارتے تھے کہ ایک طرف انہیں ہمارے اجر کی توقع رہتی تھی اور دوسری طرف ہمارے عذاب کا ڈر اور یہی بندگی کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ جاہل صوفیوں کو علم نہیں کہ جنت اللہ کی رضا سے ملے گی اور جہنم اللہ کے غضب کا نتیجہ ہے۔ رہی سودے بازی، تو وہ خود اللہ تعالیٰ نے بندوں سے کی ہے، فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ﴿٩١﴾

اور اس عورت کو جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا، تو ہم نے اس میں اپنی روح سے پھونکا اور اس کے بیٹے کو جہانوں کے لیے عظیم نشانی بنا دیا ﴿٩١﴾

أَنْفُسُهُمْ وَأَمْوَالُهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ ﴿﴾ [التوبة: ۱۱۱] ”بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ ان کے لیے جنت ہے۔“

آیت 91 : ﴿٩١﴾ وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا : یعنی اس خاتون کا بھی ذکر کر جس پر ناپاک لوگ (یہودی) تہمتیں لگاتے ہیں، حالانکہ اس نے اپنی شرم گاہ کو حرام سے محفوظ رکھا، بلکہ عبادت میں ایسی مشغول رہی کہ حلال سے بھی محفوظ رکھا، جیسا کہ فرمایا : ﴿لَمْ يَسْتَسْنِفِي بَشَرًا﴾ [آل عمران: ۴۷] ”حالانکہ کسی بشر نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔“ اللہ تعالیٰ نے اس کی نیک شہرت کے اظہار کے لیے اس کا نام نہیں لیا، کیونکہ سب جانتے ہیں اس سے مراد مریم بنت عمران علیہا السلام ہیں۔

﴿٩٢﴾ فَتَفَخَّنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا : مراد عیسیٰ علیہ السلام کی روح ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اس کے حکم سے جبریل علیہ السلام نے پھونکی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو عزت و شرف بخشے کے لیے اسے اپنی روح قرار دیا اور جبریل علیہ السلام کے پھونکنے کو اپنا پھونکنا قرار دیا، جیسے ”بیت اللہ“ اور ”ناقۃ اللہ“ میں کعبہ کو اپنا گھر اور صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو اپنی اونٹنی قرار دیا۔ شیخ ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ”عیسائی لوگ اس آیت اور اس قسم کی اور آیات سے عموماً دلیل لایا کرتے ہیں کہ حضرت مسیح (معاذ اللہ) خدا تھا، کیونکہ اس کو ”روح اللہ“ کہا گیا ہے، مگر وہ قرآن شریف کے محاورے کو غور سے نہیں دیکھتے کہ اس قسم کی اضافات سے مطلب کیا ہوتا ہے؟ سورہ سجدہ میں عام انسانوں کے لیے بھی یہی اضافت روح کی اللہ کی طرف آئی ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ نَّارٍ ۚ ثُمَّ سَوَّاهُ ۙ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِ رَبِّهِ﴾ [السجدة: ۶۷-۶۹] ”(یعنی اللہ نے) انسان کی پیدائش تھوڑی سی مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے خلاصے سے بنائی، پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی ایک روح پھونکی۔“ اس جگہ عام انسانی پیدائش کی ابتدا اور سلسلے کا ذکر ہے۔ پس اگر آیت زیر تفسیر سے مسیح علیہ السلام کی الوہیت (خدا ہونا) ثابت ہوتی ہو تو اس قسم کی آیات سے تمام انسانوں کی الوہیت ثابت ہوگی، پھر اگر مسیح بھی ایسے ہی خدا اور الہ تھے جیسے کہ سب انسان ہیں تو خیر اس کے ماننے میں کسی کو کام نہیں۔ پس آیت موصوفہ کے معنی وہی ہیں جو ہم نے لکھے ہیں (کہ وہ روح مخلوق تھی) (فَأَفْهَمَ)۔“

﴿٩٢﴾ وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ : مریم اور مسیح علیہ السلام کا جہانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانی ہونا سورہ آل عمران (۳۶)

۶۳۳، نساء (۱۵۶، ۱۵۹، ۱۵۷، ۱۵۸) اور مائدہ (۴۶، ۱۱۰، ۱۲۰) میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

آیت 92 : ﴿٩٢﴾ إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً بہت سے مفسرین نے یہاں امت سے مراد دین لیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ

إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ﴿۹۳﴾ وَتَقَطَّعُوا أَرْهَمَ بَيْنَهُمْ

كُلُّ إِلَيْنَا رَجْعُونَ ﴿۹۴﴾

بے شک یہ ہے تمہاری امت جو ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمہارا رب ہوں، سو میری عبادت کرو ﴿۹۳﴾ اور وہ اپنے

معا ملے میں آپس میں ککڑے ککڑے ہو گئے۔ سب ہماری ہی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿۹۴﴾

نے کفار کا قول نقل فرمایا: ﴿إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ﴾ [الزمر: ۲۲] ”بے شک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک امت (یعنی ایک دین) پر چلتے پایا۔“ یعنی تمہارا دین اور ملت ایک ہی ہے اور وہ ہے دین توحید، اور ”ہذیۃ“ سے مراد اس سے پہلے مذکور انبیاء، نوح، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، لوط، داؤد، سلیمان، ایوب، اسماعیل، اور یس، ذوالکفل، یونس، زکریا، مسیح ابن مریم علیہم السلام ہیں کہ سب کا ایک ہی دین تھا اور سب توحید پر قائم تھے۔ کسی اور کو معبود، مشکل کشا، شفا دینے والا، گزری بنانے والا یا اولاد عطا کرنے والا نہیں سمجھتے تھے، یہ سب لوگ ایک ہی دین پر تھے کہ میں تمہارا رب ہوں، سو میری ہی عبادت کرو۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿الْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّابِ أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّىٰ وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ﴾ [بخاری، أحادیث الأنبياء، باب ﴿واذکر فی الکتاب مریم...﴾: ۳۴۴۳۔ مسلم: ۲۳۶۵/۱۴۵] ”ہم انبیاء کی جماعت علاقائی بھائی ہیں، جن کی مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔“ امت کا معنی جماعت بھی ہے، مگر ایسی جماعت جس کے لوگوں کے درمیان انہیں اکٹھا رکھنے والی کوئی چیز ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَنَتَكُونَنَّ مِنْكُمْ أُمَّةً يَذُخُونَ إِلَىٰ الْخَيْرِ﴾ [آل عمران: ۱۰۴] ”اور لازم ہے کہ تمہاری صورت میں ایک جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں۔“ یعنی یہ تمام انبیاء ایک ہی جماعت تھے جن کا رب ایک اور دین ایک تھا۔

آیت 93 ﴿۹۳﴾ وَتَقَطَّعُوا أَرْهَمَ بَيْنَهُمْ: باب تفاعل سے ہے جو لازم ہے۔ اصل میں ”تَقَطَّعُوا فِي أَرْهَمِ“

تھا، یعنی وہ اپنے دین کے معاملے میں آپس میں ککڑے ککڑے ہو گئے۔ ”فی“ کو حذف کرنے کی وجہ سے ”أَرْهَمِ“ پر نصب آ گیا۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں ”تَقَطَّعُوا“ باب تفعیل (قَطَّعُوا) کے معنی میں ہے جو متعدی ہے، یعنی انہوں نے اپنے دین کو آپس میں ککڑے ککڑے کر ڈالا۔ اس معنی کی بھی گنجائش ہے، مگر پہلا معنی راجح ہے۔ یعنی سب کا دین ایک اور رب ایک ہے، اس لیے لازم تھا کہ سب ایک جماعت رہتے اور اپنے نبی کی کتاب اور سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھتے، مگر وہ سب کچھ جانتے ہوئے محض باہمی ضد اور عناد کی وجہ سے دین کے بارے میں کئی فرقوں میں بٹ گئے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۱۳) اور سورہ شوریٰ (۱۳، ۱۴) ہماری امت کا بھی یہی حال ہوا کہ وہ کتاب و سنت پر متحد ہونے کے بجائے فقہ و تصوف کے الگ الگ پیروا بنا کر بہت سے فرقوں میں بٹ گئے، جن میں سے ہر فرقہ اپنے آپ ہی کو حق پر قرار دیتا ہے۔ سیاسی طور پر خلافت اسلامیہ کو ختم کر کے چھپن (۵۶) خود مختار ملکوں میں تقسیم ہو گئے، جن میں سے ایک بھی حقیقت میں خود مختار نہیں ہے، نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعِيهِ، وَإِنَّا لَكُلِّهِ كَاتِبُونَ ﴿۹۴﴾
 وَحَرَمٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۹۵﴾

پس جو شخص کوئی نیک اعمال کرے اور وہ مؤمن ہو تو اس کی کوشش کی کوئی ناقدری نہیں اور یقیناً ہم اس کے لیے لکھنے والے ہیں ﴿۹۴﴾ اور لازم ہے اس ہستی پر جسے ہم ہلاک کر دیں کہ وہ واپس نہیں لوٹیں گے ﴿۹۵﴾

﴿۹۴﴾ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ﴿إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقِدُون﴾ یعنی یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، سو میری ہی عبادت کرو۔ اب اس آیت میں انہیں مخاطب کرنے کے بجائے ان کا ذکر غائب کے صفیے کے ساتھ کیا اور ”فَقَطَّعْتُمْ أَمْرَكُمْ بَيْنَكُمْ“ (تم اپنے دین کے معاملے میں آپس میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے) کے بجائے فرمایا: ”وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ“ کہ وہ اپنے معاملے میں آپس میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ مخاطب سے غائب کی طرف التفات ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے انہیں مخاطب کرنے کے بعد ان کی گروہ بندی کی وجہ سے انہیں اس قابل نہیں سمجھا کہ ان سے خطاب کیا جائے، اس لیے ان کا ذکر غائب کے صفیے سے فرمایا۔

﴿۹۵﴾ كُنَّا الْيَتَامَىٰ زَجْعُونَ: یعنی یہ لوگ جتنے گروہ چاہیں بنا لیں، آخر سب نے ہمارے پاس آنا ہے، پھر ہم سب کا فیصلہ کریں گے، فرمایا: ﴿قُلِ اللَّهُمَّ فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ عَلِيمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِي مَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴾ [الزمر: ۷۶] ”تو کہہ اے اللہ! آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! ہر جیسی اور کھلی کو جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔“

آیت 94 ﴿۱﴾ فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ: یعنی ان مختلف گروہوں میں سے جو بھی اس کے مطابق کچھ عمل کرے گا جو اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے، جب کہ وہ اللہ تعالیٰ پر، اس کی توحید پر، اس کے فرشتوں پر، اس کے رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، خیر و شر تقدر پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتا ہو، تو اس کی کوشش کی کوئی ناقدری نہ ہوگی اور اللہ تعالیٰ اس کے اعمال کو اس کے نامہ اعمال میں درج فرمائے گا۔

﴿۹۵﴾ ”مِنَ الصَّالِحَاتِ“ میں ”مِنَ“ بعض کے معنی میں ہے۔ (ابوالسعود) یعنی جو شخص صالح اعمال میں سے کچھ اعمال کرے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”پس جو شخص کچھ نیک اعمال کرے۔“ اللہ تعالیٰ کی کریمی دیکھیے کہ ایمان کے بعد بعض اعمال صالحہ کی بھی قدر دانی ہو رہی ہے۔

آیت 94 ﴿۲﴾ وَحَرَمٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا: اس آیت کے تین معنی ہو سکتے ہیں اور تینوں درست ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا اعجاز ہے کہ ایک آیت کئی معانی کی گنجائش رکھتی ہے۔ پہلے معنی کی صورت میں ”حَرَمٌ“ کا معنی ”منوع“ اور ”ناممکن“ ہے اور ”لَا يَرْجِعُونَ“ میں ”لَا“ کا حرف زائد ہے، نفی کا معنی نہیں دے رہا، مگر بے فائدہ نہیں بلکہ ”حَرَمٌ“ کے معنی میں

حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ ﴿۹۶﴾

یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر اونچی جگہ سے دوڑتے ہوئے آئیں گے ﴿۹۶﴾

جولنی پائی جاتی ہے اس میں زور پیدا کرنے کے لیے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر فرمایا: ﴿مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ﴾ [ص: ۷۵] ”تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ کرے؟“ دوسری جگہ فرمایا: ﴿مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ﴾ [الأعراف: ۱۲] ”تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ نہیں کرتا؟“ اس سے ظاہر ہے کہ ”أَلَّا تَسْجُدَ“ میں ”لَا“ زائد ہے اور ”مَنَعَكَ“ کے معنی میں زور پیدا کرنے کے لیے ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جس بستی کو ہم ہلاک کر دیں ناممکن ہے کہ وہ (دنیا میں) واپس لوٹیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿الَّذِينَ يَرِثُونَ أَصْحَابَ الْبَيْتِ الْأُولَىٰ أَصْحَابُ الْبَيْتِ الْأُولَىٰ أَصْحَابُ الْبَيْتِ الْأُولَىٰ أَصْحَابُ الْبَيْتِ الْأُولَىٰ﴾ [نہن: ۳۱] ”کیا انھوں نے نہیں دیکھا، ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے کہ وہ ان کی طرف پلٹ کر نہیں آتے۔“ دوسرے معنی کی صورت میں ”حَزَقُوا“ کا معنی ”ممنوع“ اور ”ناممکن“ ہی ہوگا، مگر ”لَا يَرِثُونَ“ میں ”لَا“ نفی کے معنی میں ہوگا جو اس کا اصل ہے۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جس بستی کو ہم ہلاک کر دیں، ناممکن ہے کہ وہ (قیامت کے دن ہماری طرف) واپس نہ آئیں، بلکہ وہ ضرور ہماری طرف واپس لوٹیں گے۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ یہاں ”حَزَقُوا“ کا لفظ لازم اور واجب کے معنی میں ہے، جیسا کہ ابن کثیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے۔ مزید دیکھیے فتح الباری (۵۰۳/۱۱) اس صورت میں معنی یہ ہے کہ جس بستی کو ہم ہلاک کر دیں لازم ہے کہ وہ (دنیا میں) واپس نہیں لوٹیں گے۔ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے اس معنی کو ترجیح دی ہے۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر بدایینی نے بھی اسی مفہوم کو اختیار فرمایا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو تینوں معنوں کا نتیجہ ایک ہی ہے، البتہ اس میں سے وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جنھیں اللہ تعالیٰ نے مرنے کے بعد زندہ کرنے کا ذکر فرمایا ہے، مثلاً بنی اسرائیل کا مقتول جو گائے کا کوئی حصہ مارنے سے زندہ ہوا وغیرہ۔

آیت 96 حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ: ”حَدَبٍ“ زمین کا ابھرا ہوا حصہ، اونچی جگہ، جیسے کسی کی پیٹھ ابھری ہوئی ہو تو اسے ”حَدَبَةُ الظَّهْرِ“ کہتے ہیں۔ ”نَسَلٌ“ (ض، ن) قریب قریب قدم رکھ کر نیچے کی طرف تیز دوڑنا، یعنی ہلاک ہونے والی بستیوں کے لوگوں کا دوبارہ زندہ ہونا اس وقت تک ناممکن رہے گا جب تک قیامت قائم نہ ہو، جس کی بالکل قریب نشانیوں میں سے ایک یاجوج ماجوج کا نکلنا بھی ہے۔ ان کے نکلنے کے بعد بہت جلد قیامت قائم ہو جائے گی۔

حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”ایک دفعہ ہم آپس میں قیامت کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ”تم آپس میں کیا ذکر کر رہے ہو۔“ انھوں نے کہا: ”ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّهَا لَنْ تَقُومَ حَتَّىٰ تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ آيَاتٍ، فَذَكَرَ الدُّخَانَ وَالْجَحَالَ، وَالذَّابِقَةَ، وَطُلُوعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، وَنُزُولَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَيَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ، وَثَلَاثَةَ حُسُوفٍ: حُسُوفٍ بِالْمَشْرِقِ، وَحُسُوفٍ بِالْمَغْرِبِ، وَحُسُوفٍ بِحَزِيرَةَ الْعَرَبِ، وَآخِرُ ذَلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا - يُؤْيَلْنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٩٧﴾

اور سچا وعدہ بالکل قریب آجائے گا تو اچانک یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی جنہوں نے کفر کیا۔ ہائے ہماری بربادی! بے شک ہم اس سے غفلت میں تھے، بلکہ ہم ظلم کرنے والے تھے ﴿٩٧﴾

مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُقُ النَّاسَ إِلَىٰ مَحْشَرِهِمْ ﴿٩٧﴾ [مسلم، الفتن، باب فی الآيات التي تكون قبل الساعة: ٢٩٠: ١] ”قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔“ پھر آپ نے دخان (دھوئیں)، دجال، دابۃ الارض، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے، عیسیٰ علیہ السلام کے نزول، یاجوج ماجوج اور تین خسوف (زمین میں جھنس جانے) کا ذکر فرمایا۔ ایک نصف شرق میں، ایک نصف مغرب میں اور ایک نصف جزیرہ عرب میں ہوگا اور ان کے آخر میں ایک آگ یمن سے نکلے گی جو لوگوں کو ان کے حشر کی جگہ کی طرف ہائے گی۔“ یاجوج ماجوج کے کھولے جانے سے مراد قیامت کے قریب اس دیوار کا ٹوٹنا ہے جو ذوالقرنین نے لوگوں کو یاجوج ماجوج کی غارت گری سے بچانے کے لیے بنائی تھی۔ اس وقت ان کے نکلنے کا نقشہ بیان ہوا ہے کہ وہ اتنی کثرت اور تیزی سے نکلیں گے کہ ہر بلندی و پستی پر چھا جائیں گے، کسی میں ان کے مقابلے کی طاقت نہ ہوگی۔ [مسلم، الفتن، باب ذکر الدجال: ٢٩٣٧] یاجوج ماجوج کی تفصیل سورہ کہف (٩٩: ٩٣) کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 97 ﴿٩٧﴾ ۱. وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ : ”اقترب“ ”قرب“ میں ہمزہ اور تاء کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی بہت یا بالکل قریب ہو گیا۔ ”سچے وعدے“ سے مراد قیامت ہے۔ یاجوج ماجوج کی ہلاکت کے بعد مسیح علیہ السلام مسلمانوں کو لے کر پہاڑ سے اتریں گے، پھر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو زمین کی بے شمار برکتیں عطا فرمائے گا۔ صحیح مسلم (٢٩٣٤) میں ہے کہ وہ اسی حال میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک طیب ہوا ان کی بگلوں کے نیچے بھیجے گا، جو ہر مومن کی روح قبض کر لے گی اور بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے، جو شہوت رانی کے لیے گدھوں کی طرح ایک دوسرے پر چڑھیں گے، انھی پر قیامت قائم ہوگی۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ﴿لَا تَقُومُ السَّاعَةُ إِلَّا عَلَىٰ شِرَارِ الْخَلْقِ هُمْ شَرٌّ مِنْ أَهْلِ الْحَاهِلِيَّةِ لَا يَدْعُونَ اللَّهَ بِسْمِيهِ إِلَّا رَدَّهُ عَلَيْهِمْ﴾ [مسلم، الإمارة، باب قوله يَنْبَغِي: لا تزال طائفة من أمتي : ١٦٢٤] ”قیامت ان لوگوں پر قائم ہوگی جو اللہ کی مخلوق میں سے بدترین لوگ ہوں گے، وہ جاہلیت والوں سے بھی بدتر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے جو بھی مانگیں گے اللہ تعالیٰ انھیں وہ چیز دے دے گا۔“

﴿٩٨﴾ ۲. وَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا : ”شخصوص“ کا معنی حیرت یا خوف سے کھلا رہ جانا ہے، یعنی قیامت کا منظر دیکھ کر اس وقت تمام موجود لوگوں کی، جو بدترین کافر ہوں گے، آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ اس کی ہم معنی آیت: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهُ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ: مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ﴾ [إبراهيم: ٤٢، ٤٣] ”اور تو اللہ کو ہرگز اس سے غافل گمان نہ کر جو ظالم لوگ کر رہے

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وَرِدُونَ ﴿۹۸﴾ لَوْ كَانَ هَؤُلَاءَ إِلَهًا مَا وَرَدُوهَا ۚ وَكُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۹۹﴾

بے شک تم اور جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں، تم اسی میں داخل ہونے والے ہو ﴿۹۸﴾ اگر یہ معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے اور یہ سب اسی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۹۹﴾

ہیں، وہ تو انہیں صرف اس دن کے لیے مہلت دے رہا ہے جس میں آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ اس حال میں کہ تیز دوڑنے والے، اپنے سروں کو اوپر اٹھانے والے ہوں گے، ان کی نگاہ ان کی طرف نہیں لوٹے گی اور ان کے دل خالی ہوں گے۔

﴿۹۸﴾ يَوْمَئِذٍ أَقْدَمْنَا فِي عَقْبَلَةٍ مِمَّنْ هَذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ : اس وقت وہ اپنی بربادی اور ہلاکت کو آواز دیں گے اور پہلے عقلت کا عذر کریں گے، پھر خود ہی صاف اعتراف کریں گے کہ انبیاء نے ہمیں اس دن سے خبردار کیا تھا، اس لیے ہم غافل نہیں بلکہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والے تھے۔ دیکھیے سورہ ملک (۱۱۳۵)۔

آیت 98 ﴿۹۸﴾ إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ : یعنی اس وقت ان کے اعتراف جرم اور توبہ کا انہیں کچھ فائدہ نہ ہوگا (سورہ مومن: ۸۵) بلکہ کہا جائے گا کہ تم اور جن چیزوں کی تم عبادت کرتے تھے، سب جہنم کا ایندھن ہو۔ اس میں ان کے بت بھی شامل ہیں اور وہ تمام انسان یا جن بھی جو اپنی عبادت کروا کر خوش ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو جہنم کا ایندھن قرار دیا۔ بتوں کو آگ میں پھینکنے کا مقصد ان مشرکین کو ذلیل کرنا ہے کہ اپنے خداؤں کا حال دیکھ لو، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَقَوْمَهَا النَّاسَ وَالْحِجَابَ أَعْبُدُ﴾ [البقرہ: ۲۴] کہ جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ ”قا“ کا لفظ عموماً غیر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے، گویا اپنی عبادت پر خوش ہونے والے انسانوں اور جنوں کو غیر ذوی العقول قرار دیا گیا۔ اگر ”قا“ کو عاقل و غیر عاقل سب کے لیے عام مانا جائے، جیسا کہ بعض اوقات استعمال ہوتا ہے، تب بھی اللہ کے پیغمبر اور مقبول بندے اس میں شامل نہیں ہوں گے، کیونکہ آیت (۱۰۱) میں تمام مومنوں کے لیے جہنم سے دور رکھے جانے کی بشارت آ رہی ہے۔

﴿۹۹﴾ أَنْتُمْ لَهَا وَرِدُونَ: ”لَهَا“ کا لفظ ”وَرِدُونَ“ سے پہلے آنے سے حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ ”اس میں“ کے بجائے ”اسی میں“ داخل ہونے والے ہوگا۔ اس جملے کا فائدہ یہ ہے کہ جہنم کا ایندھن بننے کے بعد یہ مت سمجھو کہ موحدین کی طرح اس سے نکل کر جنت میں چلے جاؤ گے، نہیں! بلکہ تم اسی میں داخل رہو گے۔ اس کے علاوہ ”وَرِدُونَ“ کو بعد میں لانے سے دوسری آیات کے فوائد (آخری حروف) کے ساتھ موافقت بھی ہوگئی۔

آیت 99 ﴿۹۹﴾ لَوْ كَانَ هَؤُلَاءَ إِلَهًا مَا وَرَدُوهَا.....: ”وَرَدُوهَا“ کی ضمیر پوجنے والوں اور ان کے بنائے ہوئے معبودوں سب کی طرف جاتی ہے، اس لیے اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اگر لات، منات، عزنی یا شیاطین وغیرہ معبود ہوتے تو ان کو پوجنے والے جہنم میں داخل نہ ہوتے، بلکہ ان کے معبود ان کو بچا لیتے۔ دوسری یہ کہ اگر یہ معبود ہوتے تو کم از کم خود ہی جہنم میں داخل نہ ہوتے، مگر جب ”كُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ“ یعنی پوجنے والے اور جنہیں پوجا گیا سب جہنم کا ایندھن

لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ ﴿۱۰۰﴾ إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ ۗ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ﴿۱۰۱﴾

ان کے لیے اس میں گدھے جیسی آواز ہوگی اور وہ اس میں نہیں سنیں گے ﴿۱۰۰﴾ بے شک وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے بھلائی طے ہو چکی، وہ اس سے دور رکھے گئے ہوں گے ﴿۱۰۱﴾

ہیں تو ان کے بنائے ہوئے خدا معبود کیسے ہو گئے؟ اس آیت پر مشرکین کے اعتراض کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ زخرف (۵۹۲-۵۹۷)۔

آیت 100 ﴿۱﴾ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ: "زَفِيرٌ" کے معنی کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۱۰۶)۔

﴿۲﴾ وَهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ: اس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ وہ اتنی اونچی آواز سے گدھے کی طرح رینگیں گے کہ اپنے بچے بچا کر کے شور میں کوئی بات نہیں سنیں گے۔ دوسری تفسیر عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمائی کہ جب وہ لوگ باقی رہ جائیں گے جنہیں ہمیشہ آگ میں رکھا جائے گا، تو انہیں آگ کے تابوتوں میں ڈال دیا جائے گا، جن میں آگ کی میخیں ہوں گی، تو ان میں سے کسی کو نظر نہیں آئے گا کہ اس کے سوا کسی کو عذاب ہو رہا ہے۔ پھر عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ﴾ ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم، دکتور حکمت بن بشر نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ گویا آگ کے عذاب کے ساتھ تنہائی کا شدید عذاب مزید ہوگا کہ نہ کسی کو دیکھیں گے اور نہ کوئی آواز سنیں گے۔

آیت 101 ﴿۱﴾ إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ: "الْحُسْنَىٰ" "الْأَحْسَنُ" کی مؤنث ہے، معنی ہے سب سے اچھی چیز۔ مراد وہ سعادت اور خوش قسمتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کی تقدیر میں لکھ دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شرک کی وجہ سے جہنم میں جانے والوں کے ذکر کے بعد اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والوں کا ذکر فرمایا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سعادت اور نیک اعمال کی توفیق یا معافی مقدر کر دی ہے اور وہ جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ بعض مفسرین نے اس آیت سے مراد وہ صالحین، انبیاء اور فرشتے لیے ہیں جن کی مشرکین عبادت کرتے تھے۔ ان کے مطابق یہ آیت مشرکین کے جواب میں اتنی ہی ہے جنہوں نے اعتراض کیا تھا کہ اگر اللہ کے علاوہ جن کی عبادت کی گئی ہے وہ جہنم میں جائیں گے تو لوگوں نے عبادت فرشتوں اور پیغمبروں کی بھی کی ہے۔ جواب یہ دیا گیا کہ یہ لوگ جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ اگرچہ اس آیت میں اس اعتراض کا جواب بھی موجود ہے، تاہم آیت کے الفاظ عام ہیں، اس لیے اس میں فرشتوں، پیغمبروں اور صالحین کے ساتھ تمام سعادت مند مومن بھی شامل ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا خاص اسلوب ہے کہ وہ جنت و جہنم اور نیک و بد دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ فرماتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سعادت مند لوگوں کو عطا ہونے والی پانچ نعمتیں ذکر فرمائی ہیں، جن میں سے پہلی یہ ہے کہ وہ جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔

لَا يَسْمَعُونَ حَسِيصَهَا وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ خَالِدُونَ ﴿۱۰۲﴾ لَا يَحْزَنُهُمْ

وہ اس کی آہٹ نہیں سنیں گے اور وہ اس میں جسے ان کے دل چاہیں گے، ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۱۰۲﴾ انہیں سب سے

آیت 102: ﴿لَا يَسْمَعُونَ حَسِيصًا﴾: یہ دوسری نعمت ہے کہ جہنم کی ہلکی سے ہلکی محسوس ہونے والی آواز بھی ان کے کانوں میں نہیں آئے گی کہ انہیں کسی طرح بھی تکلیف پہنچ سکے۔ مراد جنت میں جانے کے بعد ہے۔ (قرطبی)

﴿وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ خَالِدُونَ﴾: یہ تیسری نعمت ہے، یعنی اہل جنت کے دل کی ہر خواہش نہ صرف یہ کہ پوری ہوگی (خم السجدہ: ۳۲۳۳۰) بلکہ ان کی من پسند ہر نعمت دائمی اور ابدی بھی ہوگی، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

آیت 103: ﴿لَا يَحْزَنُهُمُ الْقَرْعُ الْأَكْبَرُ﴾: یہ چوتھی نعمت ہے کہ پہلے کوئی گھبراہٹ ہو تو ہو، آگ سے نجات اور جنت میں داخلے کے بعد وہ ہر گھبراہٹ سے محفوظ رہیں گے، حتیٰ کہ سب سے بڑی گھبراہٹ بھی انہیں غمگین نہیں کرے گی، پھر چھوٹی موٹی گھبراہٹوں کی کیا مجال ہے کہ انہیں غم زدہ کر سکیں؟

﴿الْقَرْعُ الْأَكْبَرُ﴾: ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”یہ نعمت جنت میں داخلے کے بعد حاصل ہوگی۔“ کیونکہ صحیح احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے ساتھ بہت سے اہل ایمان کا جہنم سے نکلنا اور جنت میں جانا ثابت ہے، اس لیے ”الْقَرْعُ الْأَكْبَرُ“

سے مراد وہ وقت معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يُؤْتَى بِالْمَوْتِ كَهَيْئَةِ كَبْشٍ أَمْلَحَ فَيُنَادِي مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْحَنَةِ! فَيَسْرِعُونَ وَيَنْظُرُونَ فَيَقُولُ هَلْ تَعْرِفُونَ هَذَا؟ فَيَقُولُونَ نَعَمْ، هَذَا الْمَوْتُ، وَكُلُّهُمْ قَدْ رَأَاهُ، ثُمَّ يُنَادِي يَا أَهْلَ النَّارِ، فَيَسْرِعُونَ وَيَنْظُرُونَ فَيَقُولُ هَلْ تَعْرِفُونَ هَذَا؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ، هَذَا الْمَوْتُ، وَكُلُّهُمْ قَدْ رَأَاهُ، فَيَذْبَحُ، ثُمَّ يَقُولُ: يَا أَهْلَ الْحَنَةِ! خَلُودٌ فَلَا مَوْتَ، وَ يَا أَهْلَ النَّارِ! خَلُودٌ فَلَا مَوْتَ، ثُمَّ قَرَأَ ﴿وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ﴾ وَهُوَ لَا فِي غَفْلَةٍ أَهْلُ الدُّنْيَا، ﴿وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾» [بخاری، التفسیر، باب قوله عز وجل ﴿وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ﴾: ۷۲۰: ۷۲۰]

”موت کو ایک سیاہ و سفید مینڈھے کی صورت میں لایا جائے گا، پھر ایک آواز دینے والا آواز دے گا: ”اے جنت والو! وہ گردن اٹھائیں گے اور دیکھیں گے تو وہ کہے گا: ”کیا تم اسے پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں! یہ موت ہے“ اور ان سب نے اسے دیکھا ہوگا، پھر وہ آواز دے گا: ”اے آگ والو!“ تو وہ گردن اٹھائیں گے اور دیکھیں گے تو وہ کہے گا: ”کیا تم اسے پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں! یہ موت ہے“ اور ان سب نے اسے دیکھا ہوگا، پھر اسے ذبح کر دیا جائے گا، پھر وہ کہے گا: ”اے جنت والو! (اب) بیٹھتی ہے اور موت نہیں ہے اور اے آگ والو! (اب) بیٹھتی ہے اور موت نہیں ہے۔“ پھر آپ

نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ﴾ [مریم: ۳۹] (اور انہیں بچھتاوے کے دن سے ڈرا جب (ہر) کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں) یعنی وہ سراسر دنیا کی غفلت میں ہیں ﴿وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ اور وہ ایمان نہیں لاتے۔“ ابن کثیر نے ”عبدالرزاق عن یحییٰ بن ربیع عن عطاء“ یہ قول ذکر فرمایا

الْفَرْعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَذَا يَوْمُكُمْ الَّذِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۳۶﴾

بڑی گھبراہٹ انگین نہ کرے گی اور انہیں (آگے سے) لینے کے لیے فرشتے آئیں گے۔ یہ ہے تمہارا وہ دن جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے ﴿۳۶﴾

ہے: ”گویا ”یَوْمَ الْحَسْرَةِ“ اور ”الْفَرْعُ الْأَكْبَرُ“ ایک ہی چیز ہے۔“ اکثر حضرات نے اس سے مراد صور میں آخری پھونک کا وقت مراد لیا ہے۔ بعض نے میدانِ حشر میں پیش آنے والے ہولناک واقعات مراد لیے ہیں، مگر جو غم یا گھبراہٹ ختم ہو جائے اسے ”الْفَرْعُ الْأَكْبَرُ“ نہیں کہا جاسکتا۔ ابن کثیر میں ہے کہ سعید بن جبیر نے فرمایا: «جِئْنَا تَطْبُقُ النَّارَ عَلَى أَهْلِهَا» ”اس سے مراد وہ وقت ہے جب جہنم والوں کے اوپر جہنم کو بند کر دیا جائے گا۔“ دکتور حکمت بن بشیر نے فرمایا: ”اسے طبری نے حسن سند سے ذکر کیا ہے۔“ یہ قول اور موت کو ذبح کرنے کا قول ایک ہی ہے، کیونکہ جہنم کو اسی وقت اوپر سے بند کیا جائے گا جب اس میں وہی لوگ رہ جائیں گے جنہیں ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جنت میں جانے کے بعد جنتی ہر قسم کی گھبراہٹ اور خوف سے محفوظ رہیں گے، حتیٰ کہ سب سے بڑی گھبراہٹ بھی انہیں غم زدہ نہیں کرے گی، بلکہ وہ صرف اور صرف جہنمیوں کے لیے مخصوص ہوگی۔

﴿۳۶﴾ وَتَتَلَقَّهُمُ الْمَلَائِكَةُ.....: یہ استقبال جنت میں داخلے کے وقت ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَسَيَقِ الْوَالِدِينَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُمْ هَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلِّمُوا عَلَيْكُمْ رَبَّنَا قَدْ خَلَلْنَا مَا خَلَلْتُمْ﴾ [الزمر: ۷۳] ”اور وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈر گئے، گردہ در گردہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے، اس حال میں کہ اس کے دروازے کھول دیے گئے ہوں گے اور اس کے نگران ان سے کہیں گے تم پر سلام ہو، تم پاکیزہ رہے، پس اس میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ رہنے والے۔“ اس سے پہلے موت کے وقت بھی فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور بشارتیں دیں گے، فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبَّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَفْهَمُوا فَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾ ”لَا تَحْزَنُوا وَلَا يَحْزَنُوا أُولَئِكَ هُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تُوعَدُونَ“ ﴿نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهَىٰ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ﴾ ﴿نَزَّلْنَا مِنْ عَفْوَ بَرٍّ حَنِيفٍ﴾ [حتم السجدة: ۲۲۵۳۰] ”بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے۔ ہم تمہارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی اور تمہارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تمہارے دل چاہیں گے اور تمہارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تم مانگو گے۔ یہ بے حد بخشنے والے، نہایت مہربان کی طرف سے مہمانی ہے۔“ اور فرمایا: ﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّوهُمْ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلِّمُوا عَلَيْكُمْ إِذْ خَلُّوا الْجَنَّةَ هُنَا كُنْتُمْ تُعْمَلُونَ﴾ [النحل: ۳۲] ”جنہیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ پاک ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں سلام ہو تم پر، جنت میں داخل ہو جاؤ، اس کے بدلے جو تم کیا کرتے تھے۔“

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِ لِلْكِتَابِ ۗ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ ۗ وَعَدًّا

عَلَيْنَا ۗ إِنَّنَا مُفْعِلِينَ ﴿۱۰۴﴾

جس دن ہم آسمان کو کاتب کے کتابوں کو لپیٹنے کی طرح لپیٹ دیں گے۔ جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کی ابتدا کی (اسی طرح) ہم اسے لوٹائیں گے۔ یہ ہمارے ذمے وعدہ ہے، یقیناً ہم ہمیشہ (پورا) کرنے والے ہیں ﴿۱۰۴﴾

آیت 104 ﴿۱﴾ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِ لِلْكِتَابِ: ”نَطْوِي نَطْوِي طَيًّا“ لپیٹنا۔ ”السِّجِلِ“ کا معنی ہے صحیفہ، کتاب بھی ہے اور کاتب بھی۔ (قاموس) یہاں کاتب معنی زیادہ موزوں ہے، کیونکہ کاتب کاغذات لکھنے کے بعد آخر میں لپیٹ کر اکٹھے کر لیتا ہے۔ (ابن عاشور) بعض لوگوں نے ایک فرشتے کا نام ”سجل“ بتایا ہے اور بعض نے نبی ﷺ کے ایک کاتب کا نام ”سجل“ بتایا ہے، مگر یہ دونوں درست نہیں، نہ کسی فرشتے کا نام ”سجل“ ثابت ہے اور نہ کسی صحابی کا۔

﴿۲﴾ ”يَوْمَ“ یعنی جن چیزوں کا ذکر اوپر گزرا یہ سب اس دن ہوں گی جس دن..... (أَيُّ نَحْوُ هَذِهِ الْأَشْيَاءِ يَوْمَ)۔ (بخاری)

﴿۳﴾ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِ لِلْكِتَابِ: یعنی جس طرح کاتب اپنے اوراق لپیٹ لیتا ہے اسی طرح ہم آسمانوں کو لپیٹ دیں گے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ بات کچھ تفصیل سے آئی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۗ وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَالسَّمَاوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ﴾ [الزمر: ۶۷] ”اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جو اس کی قدر کا حق ہے، حالانکہ ساری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے۔“ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَقْبِضُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْأَرْضَ وَنَحْوُ السَّمَاوَاتِ بِيَمِينِهِ﴾ [بخاری، التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿لَمَّا خَلَقْتُ بَدِي﴾ [۷۴:۱۲] ”بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام زمینوں کو مٹھی میں لے لے گا اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے۔“ مزید تفصیل سورہ زمر (۶۷) میں دیکھیے۔ سلف صالحین کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جس طرح قرآن وحدیث میں آئی ہیں ان کا اسی طرح عقیدہ رکھنا چاہیے اور انہیں اسی طرح بیان کرنا چاہیے، نہ ان کا انکار کیا جائے اور نہ تاویل، نہ یہ کہا جائے کہ ان الفاظ کے معنی ہی ہمیں معلوم نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ نہ سمجھا جائے۔

﴿۴﴾ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ.....: ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم میں نصیحت کی خاطر خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّكُمْ تُحْشَرُونَ إِلَى اللَّهِ حُفَاةَ عُرَاةٍ غُرُلًا﴾ [مسلم، الحنة وصفة نعيمها، باب فناء الدنيا: ۲۸۶۰/۵۸۔ بخاری: ۴۷۴۰] ”اے لوگو! تم اللہ کی طرف اس حال میں اٹھائے جاؤ گے کہ ننگے پاؤں، ننگے بدن، ختنے کے بغیر ہو گے۔“ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعَدًّا عَلَيْنَا ۗ إِنَّنَا مُفْعِلِينَ﴾

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزُّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴿۱۰۵﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ یہ زمین، اس کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے ﴿۱۰۵﴾

آیت 105 وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزُّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ : زبور کا معنی کتاب ہے، یہاں زبور سے مراد داؤد علیہ السلام کی

کتاب ہے اور ذکر سے مراد نصیحت ہے، جیسا کہ ترجمہ کیا گیا ہے، کیونکہ موجودہ زبور میں یہ بات موجود ہے۔ یا پھر زبور سے مراد گزشتہ آسمانی کتابیں اور ذکر سے مراد لوح محفوظ ہے، یعنی پہلے لوح محفوظ میں یہ بات درج ہے اور اس کے بعد آسمانی کتابوں میں بھی یہ بات لکھی جاتی رہی ہے کہ زمین کے وارث نیک بندے ہوں گے۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فیصلہ بھی ہے اور شرعی بھی۔ اس زمین سے کیا مراد ہے؟ آیات کے سیاق و سباق کو دیکھنے سے بات صاف سمجھ میں آرہی ہے کہ اس سے مراد زمین و آسمان کی بساط لپٹنے کے بعد وجود میں آنے والی زمین ہے، جو بطور انعام اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں کو عطا کی جائے گی اور وہ ان کی دائمی اور ابدی وراثت ہوگی۔ چنانچہ موجودہ زبور اگرچہ تحریف سے خالی نہیں مگر یہ حوالہ اس میں بھی موجود ہے: ”صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ بے رہیں گے۔“ [زبور، باب: ۳۷، آیت: ۲۹] قرآن مجید میں بھی بطور انعام ملنے والی اس وراثت کا ذکر ہے جو ہمیشہ رہے گی، چنانچہ فلاح پانے والے مومنوں کے اوصاف ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۗ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ [المؤمنون: ۱۰، ۱۱] ”یہی لوگ ہیں جو وارث ہیں، جو فردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۗ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ﴾ [الزمر: ۷۴] ”اور وہ (جنتی) کہیں گے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہمیں اس زمین کا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں سے جہاں چاہیں جگہ بنالیں، سو یہ عمل کرنے والوں کا اچھا اجر ہے۔“

زبور اور قرآن دونوں سے معلوم ہوا کہ صالحین کو بطور انعام ملنے والی وراثت ارض جنت ہے، کیونکہ ہمیشہ کا بئیرا وہی ہے۔ رہی موجودہ زمین، تو اس کی وراثت صالح و طالح، کافر و مسلم دونوں کو ملتی ہے اور صرف انعام کے طور پر نہیں، بلکہ امتحان کے لیے ملتی ہے اور ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ عارضی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۗ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ ﴿قَالُوا أَوْزَيْنَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَ مِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا قَالَ عَلَىٰ رَبِّكُمْ أَنْ يَهْزِلَ عِدَّكُمْ وَيَسْتَغْلِبَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ﴾ [الاعراف: ۱۲۸، ۱۲۹] ”موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، بے شک زمین اللہ کی ہے، وہ اس کا وارث اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے بناتا ہے اور اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے۔ انھوں نے کہا، ہمیں اس سے پہلے ایذا دی گئی کہ تو ہمارے پاس آئے اور اس کے بعد بھی کہ تو ہمارے پاس آیا۔ اس نے کہا، تمہارا رب قریب ہے کہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور

إِن فِي هَذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِينَ ﴿۱۰۶﴾

بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً ایک پیغام ہے جو عبادت کرنے والے ہیں ﴿۱۰۶﴾

شمس زمین میں جانشین بنا دے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔“ اس زمین کی وراثت نہ نیکی و بدی پر موقوف ہے اور نہ ابدی اور دائمی ہے، فرمایا: ﴿وَتِلْكَ الْآيَاتُ نُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ بِهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ [آل عمران: ۱۴۰] ”اور یہ تو دن ہیں، ہم انھیں لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں۔“ البتہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر مسلمان صحیح مومن ہوں تو دنیا میں بھی آخر وہی غالب رہیں گے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ [آل عمران: ۱۳۹] ”اور تم ہی غالب ہو، اگر تم مومن ہو۔“ اور فرمایا: ﴿وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لِيُبَيِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَ لِيُبَيِّنَنَّ لَهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أُمَّمَاتًا يَغْبِطُونَ وَ لِيُشْرِكُونَ بِنِي سَيِّئَاتٍ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ﴾ [النور: ۵۵] ”اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور ہی جانشین بنائے گا، جس طرح ان لوگوں کو جانشین بنایا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو ضرور ہی اقتدار دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ہر صورت انھیں ان کے خوف کے بعد بدل کر امن دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں گے اور جس نے اس کے بعد کفر کیا تو یہی لوگ نافرمان ہیں۔“ ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ تَعَالَىٰ زَوَىٰ لِي الْأَرْضَ فَأَرَيْتُ مَشَارِقَهَا وَ مَغَارِبَهَا وَإِنَّ مَلِكًا أُمَّتِي سَيَلُغُ مَا زَوَىٰ لِي مِنْهَا وَ أُعْطِيتُ الْكَنْزَيْنِ الْأَحْمَرَ وَ الْأَبْيَضَ﴾ [أبو داؤد، الفتن والملاحم، باب ذكر الفتن و دلالتها: ۴۲۵۲، و صححه الألبانی] ”اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین تکردی تو میں نے اس کے مشرق اور مغرب دیکھ لیے اور میری امت کا ملک وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وہ میرے لیے تک گئی ہے اور مجھے سرخ اور سفید (سونا اور چاندی) دو خزانے دیے گئے ہیں۔“ اور واقعی آپ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق چند ہی سالوں میں مسلمان زمین کے مشرق و مغرب کے مالک بن گئے، مگر جب ان میں ایمان اور عمل صالح کی کمی ہوئی، انھوں نے ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ میں کوتاہی کی اور عیش و عشرت میں پڑ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے اپنے دشمن سزا دینے کے لیے مسلط کر دیے، جس طرح بنی اسرائیل پر بخت نصر کو مسلط کیا تھا۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۵ تا ۷) معلوم ہوا ایسا نہیں ہے کہ جو بھی اس زمین کے کسی حصے کا مالک بن جائے وہ صالحین میں شمار ہو گیا، ورنہ فرعون، ہامان، قارون، شداد، مردود، چنگیز، ہلاکو، ہٹلر، نیولین، بش، کیونسٹ، گائے اور بتوں کے پجاری اور تثلیث کے فرزند اللہ کے صالح بندے شمار ہوں گے اور آج کل کے روشن خیال یہی چاہتے ہیں کہ مغرب کے مشرکوں، بدکاروں اور ہم جنس پرستوں کو صالح شمار کیا جائے، تاکہ انھیں اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرنے سے چھٹکارا مل جائے۔

آیت 106 ﴿إِن فِي هَذَا لَبَلَاغًا.....﴾ یعنی اس قرآن میں یا اس سورت میں توحید، آخرت، انبیاء کے واقعات اور جو دوسرے

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿۱۰۷﴾

اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر جہانوں پر رحم کرتے ہوئے ﴿۱۰۷﴾

مضامین بیان ہوئے ہیں ان میں ان لوگوں کے لیے بہت بڑا پیغام ہے جو اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرنے والے ہیں۔ جو لوگ اللہ کی عبادت پر آمادہ ہی نہیں، بلکہ شیطان اور نفس کی پیروی پر ڈٹے ہوئے ہیں انھیں اس قرآن سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آنکھوں میں روشنی ہو تو سورج یا چراغ کی روشنی کا فائدہ ہوتا ہے، اندھے کو چراغ سے کچھ دکھائی نہ دے تو اس میں چراغ کا کوئی قصور نہیں۔ دیکھیے سورۃ بقرہ کی آیت (۲) میں ”هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ“ کی تفسیر۔

آیت 107 وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ : اعراب القرآن (قرآن کی ترکیب نحوی) کے موضوع پر لکھی ہوئی تقریباً تمام کتابوں میں ”رَحْمَةً“ کو ”أَرْسَلْنَاكَ“ کا مفعول لہ بیان کیا گیا ہے۔ بعض کتابوں میں دوسری ترکیب بھی بیان ہوئی ہیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ نحو کا مسلہ قاعدہ ہے کہ مفعول لہ جس فعل کی علت بیان کر رہا ہو اس فعل کا اور مفعول لہ کا فاعل ایک ہوتا ہے، مثلاً ”ضَرَبْتُ زَيْدًا تَأْدِيبًا“ (میں نے زید کو ادب سکھانے کے لیے مارا) اس میں مارنے والا اور ادب سکھانے والا ایک ہی ہے، اس طرح یہاں بھیجئے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے اور رحم کرنے والا بھی۔ چنانچہ معنی یہ ہوگا کہ ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر جہانوں پر رحم کرنے کے لیے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ ﷺ کو بھیجئے کی وجہ اللہ تعالیٰ کا جہانوں پر رحم کرنا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ”وہ فرستادیم ترا مگر از روئے مہربانی بر عالمہا“ (اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر جہانوں پر مہربانی کی وجہ سے) اور شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کیا ہے: ”اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہر (یعنی مہربانی) کر کر جہان کے لوگوں پر۔“ مفسر ابوالسعود نے فرمایا: ”أَيُّ مَا أَرْسَلْنَاكَ بِمَا ذُكِرَ لِعَلَّةٍ مِنَ الْعِلَلِ إِلَّا لِرَحْمَتِنَا الْوَاسِعَةِ لِّلْعَالَمِينَ فَاطِنَةً“ اور ہم نے تجھے مذکورہ وحی دے کر کسی بھی وجہ سے نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں پر اپنی وسیع رحمت کی وجہ سے۔“ امام المفسرین طبری نے فرمایا: ”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ يَا مُحَمَّدُ! إِلَّا رَحْمَةً لِّمَنْ أَرْسَلْنَاكَ إِلَيْهِ مِنْ خَلْقِي“ اور ہم نے اے محمد! تجھے نہیں بھیجا مگر اپنی مخلوق میں سے ان لوگوں پر رحم کے لیے جن کی طرف ہم نے تجھے بھیجا ہے۔“ پھر امام طبری نے ”لِّلْعَالَمِينَ“ کی تفسیر میں اس قول کو ترجیح دی ہے کہ آپ ﷺ کو بھیجئے کی وجہ مومن و کافر سب پر رحم ہے کہ جو آپ پر ایمان لائے گا اس کے لیے دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں رحمت لکھی جائے گی اور جو آپ پر ایمان نہیں لائے گا وہ دنیا میں ان عذابوں سے محفوظ رہے گا جو پہلی امتوں پر نبی کو جھٹلانے کی وجہ سے نازل ہوتے تھے، مثلاً زمین میں جنس جانا، شکلیں بدل جانا وغیرہ۔ ایک ترکیب نحوی یہ ہے کہ ”رَحْمَةً“ حال بمعنی اسم فاعل برائے مابعد ہے۔ جس طرح کہتے ہیں ”زَيْدٌ عَدْلٌ“ کہ زید عدل ہے، یعنی اتنا عادل ہے گویا سراپا عدل ہے۔ پھر یہ ”أَرْسَلْنَاكَ“ میں ضمیر فاعل ”ہم“ سے بھی حال ہو سکتا ہے اور ”أَرْسَلْنَاكَ“ میں ضمیر ”کاف“ سے بھی۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر اس حال میں کہ ہم جہانوں کے لیے سراسر رحمت ہیں۔ دوسری صورت میں معنی ہوگا کہ ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر اس حال میں کہ تو جہانوں کے لیے سراسر

قُلْ إِنَّمَا يُؤْتِيهِ إِلَهٌ أَنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ ۖ فَهَلْ أَنتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۰۸﴾

کہہ دے میری طرف صرف یہی وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، تو کیا تم فرماں برداری کرنے والے ہو؟ ﴿۱۰۸﴾

رحمت ہے۔ پہلا معنی مفعول لہ والے معنی کے قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ ﷺ کو جہانوں پر رحم کی وجہ سے مبعوث کرنا اور اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں بھیجا کہ اس کی ذات پاک تمام جہانوں کے لیے سراسر رحمت ہے، دونوں کا مفہوم ایک ہے جو سورہ فاتحہ میں ”رَبِّ الْعَالَمِينَ“ اور ”الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ کے اکٹھے بیان سے واضح ہے۔ دوسرا معنی کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں بھیجا کہ آپ جہانوں کے لیے سراسر رحمت ہیں، بھی درست ہے کہ آپ مومنوں کے لیے تو دنیا و آخرت دونوں میں سراسر رحمت ہیں، فرمایا: ﴿بِالنُّؤْمِيَيْنِ رَأَوْفٌ رَّحِيمٌ﴾ [التوبة: ۱۲۸] ”مومنوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَرَحْمَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِمَّا لَمْ يَكُن لَّهُمْ شَرِيحَةٌ مِّن قَبْلِهِ﴾ [التوبة: ۶۶] ”اور ان کے لیے ایک رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں۔“ اور کفار کے لیے بھی دنیا میں سراسر رحمت ہیں کہ آپ کی وجہ سے وہ دنیا میں پہلی قوموں جیسے عذابوں سے محفوظ ہو گئے اور آپ کی شریعت میں صلح و جنگ دونوں حالتوں میں ان پر وہ ظلم و جور روا نہیں رکھا جاتا جو دوسری تمام اقوام اپنے مخالفین پر روا رکھتی ہیں اور آپ کو کفار کے ایمان نہ لانے اور ان کے جہنم کا بندھن بننے کا اتنا غم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿لَعَلَّكَ بَآخِئِكَ نَفْسٌ لَّا يَكُونُ لَهَا مَوْئِيَةٌ﴾ [الشعراء: ۳] ”شاید تو اپنے آپ کو ہلاک کرنے والا ہے، اس لیے کہ وہ مومن نہیں ہوتے۔“ آپ ﷺ جانوروں پر رحم فرماتے اور اس کا حکم دیتے اور ان پر ظلم سے منع فرماتے تھے، فرمایا: ﴿فِي كُلِّ ذَاتٍ كَبِدٌ رَطْبَةٌ أَجْرٌ﴾ [بخاری، المظالم، باب الآبار على الطرق إذا لم يتأذ بها: ۲۴۶۶] ”ہر تر جگر (زندگی) والی چیز (پر رحم) میں اجر ہے۔“ حتیٰ کہ آپ ﷺ نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے پر ایک بدکار عورت کو مغفرت کی نوید سنائی۔ شریعت اسلامیہ اور رسول اللہ ﷺ کی یہ رحمت بھی رب العالمین ہی کی رحمت ہے کہ اس نے اپنے محبوب رسول میں یہ وصف رکھا۔ چنانچہ ابن جریر ”التسهيل“ میں اعراب کی یہ تینوں وجہیں لکھ کر فرماتے ہیں: ”وَالْمَعْنَى عَلَى كُلِّ وَجْهِ أَنَّ اللَّهَ رَحِمَ الْعَالَمِينَ بِرَسُولِهِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“ ”ان تمام صورتوں میں معنی ایک ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد ﷺ کو بھیجنے کے ساتھ جہانوں پر رحم فرمایا۔“

آیت 108: قُلْ إِنَّمَا يُؤْتِيهِ إِلَهٌ أَنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ فَاحِدٌ..... اس آیت میں ”إِنَّمَا“ کلمہ حصر و دفعہ آیا ہے۔ فرمایا،

آپ کہہ دیں کہ میری طرف صرف یہ وحی ہوتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر تو اس کے علاوہ بھی بہت سی وحی آتی تھی، مثلاً رسالت، قیامت، نماز، روزہ اور دوسرے احکام، تو یہ کیوں فرمایا کہ میری طرف صرف ایک وحی آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہے؟ جواب یہ ہے کہ پوری شریعت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا کام صرف ایک معبود کی عبادت یعنی ایک مالک کی غلامی ہے۔ وہ جو حکم دے اسے کرنا ہے، جس سے منع کرے اس

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ أَدْبَارُكُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۗ وَإِنْ أَدْرِي أَقْرَبُ أَمْ بَعِيدُ مَا تُوعَدُونَ ﴿۱۰۹﴾

پھر اگر وہ منہ موڑ لیں تو کہہ دے میں نے تمہیں اس طرح خبردار کر دیا ہے کہ (ہم تم) برابر ہیں اور میں نہیں جانتا آیا قریب ہے یا دور، جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو ﴿۱۰۹﴾

سے باز رہنا ہے۔ اپنی ہر ضرورت اسی سے مانگی ہے، کیونکہ اسے وہی پورا کر سکتا ہے، یہ تمام انبیاء کی دعوت ہے، فرمایا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُولٍ إِلَّا نُوْحٍ إِلَيْهِ إِنَّكَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ [الانبیاء: ۲۰] ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔“ یہی ملت ابراہیم ہے، فرمایا: ﴿إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمَ لَقَالَ أَتَسْلَمُ لَقَالَ لَا آلِهَ إِلَّا اللَّهُ فَاحْتَدَىٰ﴾ [البقرة: ۱۳۱] ”جب اس سے اس کے رب نے کہا، فرماں بردار ہو جا، اس نے کہا، میں جہانوں کے رب کے لیے فرماں بردار ہو گیا۔“ شریعت کے تمام احکام اس مالک کی بندگی بجالانے کی مختلف صورتیں ہیں اور سب ”أَسْلَمَ إِلَهُكُمْ إِلَهُةً وَاحِدًا“ کی تفصیل ہیں۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

داستانِ حُسن جب پھیلی تو لامحدود تھی اور جب سستی تو تیرا نام بن کر رہ گئی

اس لیے یہاں جب اس حقیقت کے اعلان کا حکم دیا کہ میری طرف صرف یہ وحی ہوتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے اور تمہارا کام اسی کی عبادت یعنی اس سے انتہا درجے کی محبت اور اس کے لیے انتہا درجے کی عاجزی کے ساتھ پوری طرح اس کا بندہ اور غلام بن جانا اور اسلام یعنی اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے سپرد کر دینا اور اپنی مرضی چھوڑ کر صرف اس کی مرضی پر چلنا ہے۔ تو آخر میں انھیں ایک اللہ کی عبادت اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے حوالے کرنے کا حکم دینے کے لیے استفہام کا طریقہ اختیار فرمایا کہ جب مجھے یہی وحی ہوتی ہے تو کیا اس کے مطابق تم اس کے لیے مسلم یعنی اس کے سپرد ہونے والے اور مکمل فرماں بردار بننے والے ہو؟ مقصد یہ ہے کہ ضرور بننا چاہیے، چنانچہ ہمارے نبی کو حکم ہوا: ﴿قُلْ إِنْ صَلَّاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۚ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذَلِكَ أُؤْمِنُ ۚ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾ [الانعام: ۱۶۲، ۱۶۳] ”کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں حکم ماننے والوں میں سب سے پہلا ہوں۔“

آیت 109 ﴿۱﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ أَدْبَارُكُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ : ”إِنْ“ کا لفظ شک کے لیے آتا ہے، یعنی اول تو اتنے یقینی دلائل کے بعد ممکن نہیں کہ وہ مسلم نہ بنیں، لیکن اتنے واضح اور قطعی دلائل کے بعد بھی اگر وہ منہ موڑیں اور مسلم نہ بنیں تو ان سے کہہ دیجیے کہ تمہارے اسلام اور توحید سے منہ موڑنے کے بعد میں تمہیں صاف آگاہ کر رہا ہوں کہ تم نے توحید سے منہ موڑا تو میں نے بھی تمہارے شرک سے منہ موڑا، تاکہ یہ بات جاننے میں ہم تم دونوں برابر ہو جائیں۔ سورہ کافرون میں بھی یہ اعلان صاف الفاظ میں سنا دیا گیا ہے۔

إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ﴿۱۱۰﴾ وَإِنْ أَدْرَىٰ لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۱۱۱﴾

بے شک وہ بلند آواز سے کی ہوئی بات کو جانتا ہے اور وہ بھی جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو ﴿۱۱۰﴾ اور میں نہیں جانتا شاید یہ تمہارے لیے ایک آزمائش ہو اور ایک وقت تک کچھ فائدہ اٹھانا ہو ﴿۱۱۱﴾

﴿۱۱۰﴾ وَإِنْ أَدْرَىٰ أَقْرَبٌ : یعنی توحید سے من موڑنے کی وجہ سے عذاب کا تم پر آنا لازم ہے، مگر مجھے معلوم نہیں کہ تم سے جس دنیوی یا اخروی عذاب کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا دور؟ کیونکہ اس کا ٹھیک وقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ سورہ جن میں فرمایا: ﴿قُلْ إِنْ أَدْرَىٰ أَقْرَبٌ فَأْتُوْعَدُوْنَ أَمْ يَجْعَلُ لِمَنْ يَشَاءُ أَمَدًا﴾ [الحج: ۲۵] ”کہہ دے میں نہیں جانتا آیا وہ چیز قریب ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، یا میرا رب اس کے لیے کچھ مدت رکھے گا۔“

آیت 110 ﴿۱﴾ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ : سب کے سامنے کھلم کھلا عمل بھی ہوتا ہے اور قول بھی، اس لیے فرمایا کہ کوئی بھی کھلم کھلی اور بلند آواز میں ہونے والی بات ہو، اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے اور جو بات تم دل میں چھپاتے ہو اسے بھی جانتا ہے۔ یہ تعبیر اور خبردار کرنے کا موثر ترین طریقہ ہے کہ کسی کو غلط کام سے روکنا ہو تو اسے روکنے کے بجائے کہا جائے کہ میں تمہاری سب حرکتیں دیکھ رہا ہوں، مطلب یہ کہ تم سے نمٹ لوں گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہاری بلند آواز کی باتیں بھی جانتا ہوں اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی جانتا ہوں۔ مطلب یہ کہ تمہارا کفر بھی مجھے معلوم ہے اور تمہارا نفاق بھی، اس لیے کفر بھی چھوڑ دو اور نفاق بھی، ورنہ میری گرفت کے لیے تیار رہو۔

﴿۱۱۱﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ چھپی ہوئی بات جانتا تو واقعی کمال ہے اور یہ اللہ ہی کی شان ہے، مگر جبر اور بلند آواز سے کی ہوئی بات تو ہر شخص سن سکتا ہے اور جان سکتا ہے، اس صفت کو خاص طور پر کیوں ذکر فرمایا گیا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ بلند آواز سے ایک آدمی بات کرے تو واقعی وہ سمجھ میں آ جاتی ہے مگر جب ایک ہی وقت میں دو چار یا دس پندرہ آدمی اپنی پوری بلند آواز کے ساتھ بات کرنا شروع کر دیں تو آدمی کو کسی کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی، یہ اللہ مالک الملک، سمیع و بصیر کی شان ہے کہ دس پندرہ نہیں کروڑوں، اربوں انسان، جن، فرشتے اور حیوانات اپنی پوری آواز کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں، تو وہ ان سب کی پکار سنتا ہے، جو کچھ وہ کہہ رہے ہوتے ہیں اسے جانتا ہے اور ان کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ مخلوق میں یہ وصف کہاں؟ (بقای)

آیت 111 : ﴿۱﴾ وَإِنْ أَدْرَىٰ لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ : یعنی مجھے معلوم نہیں کہ شاید عذاب میں یہ تاخیر تمہارے لیے آزمائش ہو کہ تم اس سے فائدہ اٹھا کر حق کی طرف پلٹتے ہو، یا اپنی سرکشی میں مزید ترقی کرتے ہو، جس کے بعد یہ مہلت دنیا میں کچھ دیر تک فائدہ اٹھانے کے لیے دی گئی ہو۔

قُلْ رَبِّ احْكُم بِالْحَقِّ ۗ وَرَبُّنَا الرَّحْمَنُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿۱۱۲﴾

اس نے کہا اے میرے رب! حق کے ساتھ فیصلہ فرما اور ہمارا رب ہی وہ بے حد مہربان ہے جس سے ان باتوں پر مدد طلب کی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو ﴿۱۱۲﴾

آیت 112 ﴿قُلْ رَبِّ احْكُم بِالْحَقِّ﴾..... پہلے انبیاء کی امتوں نے جب حق کو جھٹلایا تو انھوں نے حق تعالیٰ سے اس دعا سے ملتی جلتی دعا کی جو اس آیت میں مذکور ہے، چنانچہ شعیب رضی اللہ عنہ نے دعا کی: ﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ﴾ [الأعراف: ۸۹] ”اے ہمارے رب! ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔“ اور ان سب پیغمبروں کے متعلق فرمایا جنھیں ان کی قوم نے کفر اختیار نہ کرنے کی صورت میں اپنی ہستی سے نکالنے کی دھمکی دی تھی: ﴿وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ﴾ [إبراهيم: ۱۰] ”اور انھوں نے (حق تعالیٰ سے) فیصلہ مانگا اور ہر سرکش، سخت عناد رکھنے والا نامر او ہوا۔“

”قُلْ رَبِّ احْكُم“ کے ”قُلْ“ میں دو قراءتیں ہیں، ایک امر کے صیغے کے ساتھ ”قُلْ“ ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ یہ کہیں جو اس آیت میں مذکور ہے۔ دوسری قراءت، جو ہمارے ہاں رائج ہے، اس کے مطابق یہ ماضی کا صیغہ ”قَالَ“ ہے، جس کا معنی ہے، اس نے کہا۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے اس رسول نے بھی کفار کے جھٹلانے اور جلا وطن کرنے کی کوششوں کی وجہ سے ہم سے یہ کہا جو اس آیت میں مذکور ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ کوئی بھی داعی جب ایسے حالات سے دوچار ہو تو اسے یہ دعا کرنی چاہیے۔

② قرآن مجید کے رسم الخط میں اس آیت کا پہلا لفظ الف کے بغیر ”قُلْ“ لکھا گیا ہے، جسے ”قُلْ“ اور ”قَالَ“ دونوں طرح پڑھنے کی گنجائش ہے، جس طرح ”مَلِكٌ يُوعِظُ الذِّينَ“ میں ”مَلِكٌ“ اور ”مَالِكٌ“ دونوں طرح پڑھنے کی گنجائش ہے اور یہ قرآن مجید کے رسم الخط کا کمال ہے۔



سُورَةُ الْحَجِّ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ ۚ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ① يَوْمَ تَرَوُنَّهَا تُذْهِلُ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، بے شک قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے ① جس دن تم اسے دیکھو گے ہر دودھ لے کر اٹھ کر دوڑو گے۔ 2.1 ① **يَا أَيُّهَا النَّاسُ: "النَّاسُ"** کے ساتھ مسلم و کافر اور آیت کے نزول کے وقت موجود یا بعد میں قیامت تک آنے والے تمام لوگ مخاطب ہیں۔ بعض لوگ "يَا أَيُّهَا النَّاسُ" کے ساتھ سورت کے آغاز کو اس کے کئی ہونے کی دلیل بناتے ہیں، مگر یہ قاعدہ کلی نہیں، کیونکہ مدنی سورتوں میں بھی "يَا أَيُّهَا النَّاسُ" کے ساتھ خطاب آیا ہے، مثلاً سورہ بقرہ میں ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ﴾ [البقرة: ۲۱] مفسرین کے مطابق اس سورت میں مدنی آیات بھی ہیں، مثلاً آیت (۳۹): ﴿أَذِنَ لِّلَّذِينَ يُقْتَلُونَ بِأَنفُسِهِمْ ظُلْمًا ۚ وَإِن لِّلَّهِ عَلَىٰ نَجْسِهِمْ لِقَدَسٌ﴾ اور کئی بھی، مگر وہ ملی جلی ہیں، الگ الگ ہر ایک کے کئی یا مدنی ہونے کی تعیین معلوم نہیں۔ (قرطبی)

② **اتَّقُوا رَبَّكُمُ:** تقویٰ کا معنی پچتا بھی ہے اور ڈرنا بھی، کیونکہ آدمی جس سے ڈرتا ہے اس سے پچتا ہے، یعنی اپنے اس محسن کے عذاب سے بچو جو پیدا کرنے سے لے کر اب تک تمہاری پرورش کر رہا ہے اور تم پر بے شمار احسان کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر اس چیز سے بچو جو تمہیں اس کی سزا کا حق دار بنا سکتی ہے، خواہ وہ اس کے فرائض کا ترک ہو یا اس کے حرام کردہ کاموں کا ارتکاب، ان دونوں سے بچنا ہی اس کا تقویٰ ہے۔

③ **إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ:** "زَلْزَلَةٌ" "زَلْزَلٌ يُزَلُّونَ" سے "فَعْلَلَةٌ" کے وزن پر مصدر ہے، بہت سخت ہلانا۔ "السَّاعَةُ" کا لفظی معنی گھڑی اور لمحہ ہے۔ قیامت کو "السَّاعَةُ" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ایک لمحے میں برپا ہو جائے گی۔ "إِنَّ" ایسے موقع پر اس سے پہلے والی بات کی وجہ بیان کرنے کے لیے آتا ہے، یعنی اپنے رب سے اس لیے ڈرو کہ قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے۔ اس میں مزید خوف کی بات یہ ہے کہ وہ صرف انسانی پیمانے کے مطابق عظیم نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اسے عظیم فرما رہے ہیں، اب اس کی عظمت اور ہولناکی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟

④ **يَوْمَ تَرَوُنَّهَا تُذْهِلُ:** "تَرَوُنَّهَا" میں "ہا" کی ضمیر "زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ" میں "زَلْزَلَةٌ" کی طرف بھی جاسکتی ہے، معنی یہ ہوگا کہ جس دن تم اس زلزلے کو دیکھو گے اور "السَّاعَةُ" کی طرف بھی، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جس دن تم اس قیامت کو دیکھو گے۔ "ذُهِلُ" کا معنی ہے ایسی غفلت جس کے ساتھ دہشت یا خوف بھی ہو۔ "مُرْضِعَةٌ" عورت جس وقت بچے کو دودھ پلا رہی ہو اس وقت اسے "مُرْضِعَةٌ" کہتے ہیں۔ وہ صفات جو صرف عورتوں میں پائی جاتی ہیں ان کے ساتھ "نَاءٌ" نہیں لگائی جاتی، مثلاً "حَائِضٌ، حَامِلٌ، مُرْضِعٌ" ان کے ساتھ "نَاءٌ" اس وقت لگائی جاتی ہے جب وہ اس کام میں مصروف ہوں، مثلاً کوئی بھی عورت جو کسی بھی وقت دودھ پلاتی ہے "مُرْضِعٌ" کہلائے گی، "مُرْضِعَةٌ"

كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَنَّا أَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمَلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكَرَىٰ

پلانے والی اس سے غافل ہو جائے گی جسے اس نے دودھ پلایا اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور تو لوگوں کو نشے اس وقت ہوگی جس وقت وہ بچے کو دودھ پلا رہی ہو۔ مطلب اس وقت کی ہولناکی بیان کرنا ہے کہ دودھ پلانے والی عورت، جسے اپنے بچے سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہوتی، اس زلزلہ کی وجہ سے عین دودھ پلاتے ہوئے ایسی دہشت زدہ ہوگی کہ اسے اپنے بچے تک کی ہوش نہیں ہوگی۔

⑤ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمَلٍ حَمْلَهَا : حاملہ عورت کو ”حامل“ کہتے ہیں، مگر یہ لفظ بوجہ اٹھانے والے کسی بھی شخص پر بولا جاسکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ”حامل“ کی جگہ ”ذاتِ حمل“ (حمل والی) کا لفظ استعمال فرمایا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَأُولَاتِ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (الطلاق : ۴) ”حمل والی (عورتوں کو طلاق ہو جائے) تو ان کی عدت یہ ہے کہ وہ حمل وضع کر لیں۔“ مراد قیامت یا قیامت کے زلزلے کی شدت کا بیان ہے کہ ہر حمل والی اپنا حمل (جو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ”فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ“ بہت محفوظ ٹھکانے میں ہے) اس دن کی شدت کی وجہ سے گرا دے گی۔

⑥ وَ تَرَى النَّاسَ سُكَرَىٰ : ”سُكَرَىٰ“ ”سُكَرَانٌ“ یا ”سُكْرٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”سُكْرَانٌ“ کی جمع ”سُكْرَالِي“ ہے، یعنی تم لوگوں کو دیکھو گے کہ وہ نشے میں ہیں، انھیں کچھ ہوش نہیں، حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے جس کی وجہ سے انھیں کوئی ہوش نہیں رہے گا۔ مفسر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ نے ”سُكَرَىٰ“ کو مجاز کی مثال کے طور پر پیش کیا ہے، وہ فرماتے ہیں، مجاز وہ ہوتا ہے جو کسی چیز پر بولا بھی جاسکے اور اس کی نفی بھی ہو سکے، مثلاً حمزہ، سعد اور علی شیر تھے، یہ بھی درست ہے اور یہ بھی درست ہے کہ وہ شیر نہیں تھے۔ اسی طرح کسی کو بے سمجھی کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ فلاں گدھا ہے، جب کہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ گدھا نہیں ہے۔

⑦ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ : مفسرین میں اختلاف ہے کہ قیامت کے اس زلزلے سے کیا مراد ہے؟ اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کی سب سے معتبر تفسیر وہ ہے جو خود قرآن میں آئی ہو، اس کے بعد وہ جو صحیح سند کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے آئی ہو۔ آپ ﷺ سے اس زلزلے کا موقع جو صحیح حدیث میں بیان ہوا ہے، وہ ہے جو ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے روایت کیا ہے، آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، اے آدم! وہ عرض کریں گے، بلیک دسعد یک! بار بار حاضر ہوں، بار بار حاضر ہوں اور بھلائی ساری تیرے ہاتھ میں ہے۔ اللہ فرمائیں گے، آگ والی جماعت نکال کر الگ کر دو۔ وہ کہیں گے، اور آگ والی جماعت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔ تو اس وقت بچہ بوزھا ہو جائے گا: ﴿وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمَلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكَرَىٰ وَ مَا هُمْ بِسُكَرَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ﴾ ”اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور تو لوگوں کو نشے والے دیکھے گا، حالانکہ وہ نشے والے نہیں ہوں گے اور لیکن اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔“ تو یہ بات صحابہ پر بہت سخت گزری، انھوں نے کہا: ”یا رسول اللہ! وہ آدمی ہم میں سے کون ہو گا؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خوش ہو جاؤ کہ

وَمَا هُمْ بِسُكْرَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ﴿۲۱﴾

میں دیکھے گا، حالانکہ وہ ہرگز نشے میں نہیں ہوں گے اور لیکن اللہ کا عذاب بہت سخت ہے ﴿۲۱﴾

یا جوج ماجوج میں سے ایک ہزار ہوں گے اور تم میں سے ایک ہوگا۔“ پھر فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تو امید رکھتا ہوں کہ تم اہل جنت کا تہائی حصہ ہو گے۔“ راوی نے کہا، یہ سن کر ہم نے اللہ کی حمد کی اور بگیر کہی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یقیناً میں امید رکھتا ہوں کہ تم اہل جنت کا نصف ہو گے۔ دوسری امتوں کے مقابلے میں تمہاری مثال سیاہ بیل کی جلد میں ایک سفید بال کی سی ہے یا جس طرح گدھے کے بازو کے اندرونی جانب ایک گول نشان ہوتا ہے۔“ [بخاری، الرقاق، باب ﴿ان زلزلة الساعة شيء عظيم﴾ : ۶۵۳۔

مسلم، الايمان، باب قوله : يقول الله لادم اخرج بعث النار..... : ۲۲۲]

یہ صحیح حدیث دلیل ہے کہ اس آیت میں مذکور زلزلے سے مراد وہ وقت ہے جب آدم ﷺ کو ایک ہزار میں سے نو سو نواے آدمی جہنم کے لیے نکال کر الگ کرنے کا حکم ہوگا۔ اس وقت لوگوں پر ایسا زلزلہ طاری ہوگا، وہ ایسے شدید ہلائے جائیں گے اور اس قدر خوف زدہ ہوں گے کہ جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔ بعض لوگ اس حدیث کو آیت کا مصداق قرار دینے پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس وقت نہ کوئی حاملہ ہوگی اور نہ دودھ پلانے والی، تو حاملہ حمل کیسے گرائے گی اور دودھ پلانے والی اپنے بچے سے کیسے غافل ہوگی؟ اس لیے اس آیت سے وہ وقت مراد نہیں، بلکہ ایک صاحب نے تسلیم کر کے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے، اسے ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ کوئی ایسے حضرات کو سمجھائے کہ کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو اس بات کا علم نہیں تھا، پھر انہوں نے یہ کیوں فرمایا؟ دراصل ایسے حضرات نے کلام کے اسلوب کو سمجھا ہی نہیں، یہ تو اس وقت کی ہولناکی اور شدت سے استعارہ ہے کہ اگر اس وقت حاملہ عورتیں ہوں تو سب کا حمل گر جائے گا اور اگر دودھ پلانے والیاں ہوں تو وہ اپنے بچے سے غافل ہو جائیں گی۔ اس سوال کا اس سے بھی مضبوط جواب یہ ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: «يُبْعَثُ كُلُّ عَبْدٍ عَلَىٰ مَا مَاتَ عَلَيْهِ» [مسلم، الحنة و صفة نعيمها، باب الأمر بحسن الظن بالله..... :

۲۸۷۸] ”ہر بندہ اس حالت پر اٹھے گا جس پر فوت ہوا تھا۔“ اس سے معلوم ہوا کہ دودھ پلانے والیاں اور حمل والیاں صرف پہلے نفلہ کے وقت ہی اس حال میں نہیں ہوں گی بلکہ قیامت والے دن اٹھتے وقت بھی ان کی یہی حالت ہوگی۔ اس سے منکرین حدیث کا سوال سرے سے ختم ہو جاتا ہے۔ ابن جریر، بقاعی اور بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ صحیح حدیث کے بعد کوئی اور تفسیر معتبر نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا مصداق قیامت کا پہلا نفلہ لیا ہے اور صور میں تین نفلے بتائے ہیں، ایک نفلہ فزع، ایک نفلہ صعق اور ایک نفلہ بعث۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے وہ زلزلہ مراد ہے جو پہلے نفلہ یعنی نفلہ فزع سے پیدا ہوگا، کیونکہ قیامت کو تو نہ کوئی حاملہ ہوگی اور نہ دودھ پلانے والی۔ اس نفلے سے ہر چیز درہم برہم ہو جائے گی، اس وقت جو بھی دودھ پلانے والی عورت ہوگی وہ اپنے بچے کو دودھ پلانے سے غافل ہو جائے گی۔ علقمہ اور شیبی کا بھی یہی قول ہے۔ طبری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس قول پر مشتمل مرفوع حدیث یہ کہہ کر نقل کی ہے کہ اس کی اسناد میں نظر ہے (کیونکہ اس میں دو راوی

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطَانٍ مَّرِيدٍ ﴿٥﴾ كَتَبَ عَلَيْهِ
 أَنَّهُ مَن تَوَلَّاهُ فَانَّهُ يَضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿٥﴾

اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کے بارے میں کچھ جانے بغیر جھگڑتا ہے اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے چلتا ہے ﴿۵﴾ اس پر لکھ دیا گیا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ جو اس سے دوستی کرے گا تو وہ اسے گمراہ کرے گا اور اسے بھڑکتی ہوئی آگ کا راستہ دکھائے گا ﴿۵﴾

مجبول ہیں۔۔ طبری فرماتے ہیں: ”یہ قول ہی اصل قول ہوتا اگر صحیح احادیث اس کے خلاف نہ آتیں، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ اللہ تعالیٰ کی وحی اور قرآن کے معانی کا سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔“ علاوہ ازیں تحقیق یہی ہے کہ نفع دو ہی ہیں، تم نفعوں والی یہ روایت ثابت نہیں۔ امام بقاعی اور صاحب احسن التفسیر نے ایک بہت اچھی بات فرمائی ہے: ”صحن ممکن ہے کہ ”زَلْزَلَةُ السَّاعَةِ“ سے یہ زلزلہ بھی مراد ہو جو آدم علیہ السلام کو اہل نار کے الگ نکالنے کے حکم کے وقت پیدا ہوگا اور اس سے پہلے کے زلزلے بھی (یعنی صور میں پہلی پھونک کا زلزلہ اور دوبارہ پھونک کا زلزلہ، جس سے سب لوگ زندہ ہو کر محشر کی طرف دوڑیں گے) کیونکہ قیامت کا دن بہت لمبا (پچاس ہزار سال کا) ہے تو ہر زلزلے کی نسبت قیامت کی طرف درست ہے۔“ اب اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس طویل دن میں کتنے زلزلے برپا ہوں گے جو سب کے سب ”زَلْزَلَةُ السَّاعَةِ“ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل و کرم سے اپنی پناہ میں رکھے۔

آیت ۳ ﴿۳﴾ وَ مِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ : وَادَّ عطف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کچھ لوگوں کا ذکر محذوف ہے جو آیات کے مطابق یہ ہے کہ لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے اور قیامت پر اور دوبارہ زندہ ہو کر پیش ہونے پر یقین رکھتا ہے۔

﴿۲﴾ اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو قیامت کا منکر ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں کچھ جانے بغیر خواہ خواہ جھگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ جو لوگ ہڈیاں اور مٹی ہو چکے اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ زندہ کیسے کرے گا؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے مقابلے میں اپنے قیاس اور عقل کے ڈھکوسلے پیش کرتا ہے اور اپنے اس جھگڑے میں پوری کوشش سے ہر سرکش شیطان یعنی ابلیس اور اس کی اولاد کے اور انسانوں میں سے کفر کے سرداروں کے پیچھے چلتا ہے، جو لوگوں کو حق سے روکتے ہیں۔ ”تَبِعَ يَتَّبِعُ“ (ع) کا معنی پیروی کرنا ہے۔ ”يَتَّبِعُ“ باب انتعال میں مبالغہ ہے، یعنی پوری کوشش کر کے ہر شیطان کے پیچھے چلتا ہے۔ (بقاعی)

﴿۳﴾ اس آیت سے معلوم ہوا کہ علم کے ساتھ جھگڑنا درست بلکہ لازم ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اذْخُرَالِي سَبِيلَ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالنُّوعِظَةَ الْحَسَنَةَ وَجَادِلْهُمْ بَالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ﴾ [النحل: ۱۲۵] ”اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا اور ان سے اس طریقے کے ساتھ بحث کر جو سب سے اچھا ہے۔“

آیت ۴ ﴿۴﴾ كَتَبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَن تَوَلَّاهُ : ”تَوَلَّيْتُ يَتَوَلَّى“ دوست بنانا۔ ”عَلَيْهِ“ میں ضمیر ”ہ“ شیطان کی طرف لوٹ

يَأْيِيهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبُعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِّنْ نُفُوسٍ مِّنْ عِلْقَةٍ ثُمَّ مِّنْ عُضْمٍ مِّنْ نُفُوسٍ مِّنْ عِلْقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَقَةٍ لَّسَيْنَ لَكُمْ وَنُقُذٌ

اے لوگو! اگر تم اٹھائے جانے کے بارے میں کسی شک میں ہو تو بے شک ہم نے تمہیں حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک قطرے سے، پھر کچھ جسے ہوئے خون سے، پھر گوشت کی ایک بوٹی سے، جس کی پوری شکل بنائی ہوئی ہے اور جس کی پوری شکل نہیں بنائی ہوئی، تاکہ ہم تمہارے لیے واضح کریں اور ہم جسے چاہتے ہیں ایک مقررہ مدت تک رہی ہے۔ پہلے ”أَلْقَاةً“ میں ضمیر شان کی ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ واقعہ یہ ہے۔ اس سے مراد بات میں چٹنگی پیدا کرنا پیدا کرنا ہوتا ہے، یعنی شیطان کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ جو اس سے دوستی کرے گا شیطان اسے گمراہ کرے گا۔ مطلب یہ کہ قضائے الہی میں اس کے متعلق یہ طے کیا جا چکا ہے۔ ”لکھنے“ کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ بات لکھے جانے کے بعد کچی ہو جاتی ہے، یا یہ کہ لوح محفوظ میں لکھا جا چکا ہے۔

آیت 5 : ﴿يَأْيِيهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبُعْثِ.....﴾ : یعنی اگر تمہیں آخرت کو دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہے تو اسے دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی پیدائش کی ابتدا پر غور کرو، اس سے تم جان لو گے کہ جس نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا وہ دوسری دفعہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے اور جو زمین کے مژدہ ہو جانے کے بعد نباتات پیدا کرتا ہے وہ تمہیں تمہاری قبروں سے نکالنے پر بھی قادر ہے۔

2 ﴿مِنْ تُرَابٍ﴾ : اس میں توہین تحقیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ حقیر مٹی کیا گیا ہے۔ آدم علیہ السلام کی پیدائش کی طرف اشارہ ہے اور سب لوگوں کے مٹی سے پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، جو اس بے جان اور قدموں میں پامال ہونے والی مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِن طِينٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن نَّارٍ فَتَأَخَّرُوا﴾ [السجدة: ۷، ۸] ”وہ (ذات پاک) جس نے اچھا بنایا ہر چیز کو جو اس نے پیدا کی اور انسان کی پیدائش حقیر مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے خلاصہ سے بنائی۔“ زیر تفسیر آیت میں انسانی زندگی پر گزرنے والے سات مراحل ذکر ہوئے ہیں۔

3 ﴿ثُمَّ مِّنْ نُفُوسٍ﴾ : پھر پانی کے ایک قطرے سے۔ جدید سائنس نے ثابت کیا ہے کہ مٹی کے ایک قطرے میں کروڑوں جراثیم ہوتے ہیں، جن میں سے صرف ایک جراثیم عورت کے بیضہ سے مل کر حمل کا حصہ بنتا ہے۔ یہ معاملہ مٹی سے بھی عجیب ہے کہ ایک سیال لیس دار خوردبینی ذرے سے ایک حسین و جمیل انسان پیدا ہو جاتا ہے، اسے پیدا کرنے والے کے لیے اسے دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ شیخ سعدی نے کہا ہے۔

دھد نطفہ را صورتے چوں پری کہ کراست بر آب صورت گری

”یعنی اللہ تعالیٰ ایک قطرے کو پری جیسی صورت عطا فرمادیتا ہے، بھلا اس کے سوا کون ہے جو پانی پر صورت گری کر سکتا ہے۔“

فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشَدَّكُمْ وَمِنْكُمْ
مَنْ يُتَوَلَّىٰ وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَ تَرَىٰ

رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر ہم تمہیں ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں، پھر تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم
میں سے کوئی وہ ہے جو قبض کر لیا جاتا ہے اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو سب سے غمی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے، تاکہ

﴿ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ : ”عَلَقَةٍ“ کا معنی جما ہوا خون بھی ہے اور جو تک بھی، یعنی پھر وہ سیال مادہ جسے ہوئے خون کا ایک ٹکڑا
بن جاتا ہے، جس کی شکل جو تک سے ملتی جلتی ہے۔

﴿ ثُمَّ مِنْ نُضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ : ”نُضْغٌ يُنْضَعُ“ (ف) چبانا۔ ”فُضْغَةٌ“ گوشت کا ٹکڑا جو چبایا جاتا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ
نے فرمایا: ”جب نطفہ عورت کے رحم میں قرار پکڑتا ہے تو چالیس دن اسی حالت میں اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، پھر وہ اللہ
کے حکم سے سرخ رنگ کا جما ہوا خون بن جاتا ہے، پھر وہ چالیس دن تک اسی حالت میں رہتا ہے۔ پھر وہ بدل کر ”فُضْغَةٌ“
یعنی گوشت کا ایک ٹکڑا بن جاتا ہے، جس میں نہ کوئی نقش ہوتا ہے نہ شکل و صورت، پھر اس میں نقش اور شکل و صورت بنا شروع
ہوتی ہے، چنانچہ اس کے سر، ہاتھوں، سینے، پیٹ، ٹانگوں، پاؤں اور باقی اعضاء کی شکل بنتی ہے، پھر کبھی شکل و صورت بننے سے
پہلے عورت اسے گرا دیتی ہے اور کبھی شکل و صورت بننے کے بعد، جیسا کہ بچوں کے اسقاط کی صورت میں مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔

اس لیے فرمایا: ﴿ ثُمَّ مِنْ نُضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُّخَلَّقَةٍ ﴾ کہ جس کی پوری شکل بنائی ہوئی ہے اور جس کی پوری شکل
نہیں بنائی ہوئی۔“ سورہ مومنون (۱۳ تا ۱۲) میں بھی یہ تفصیل مذکور ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا: ﴿ إِنَّ خَلْقَ أَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِي نَظْلِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا وَأَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَهُ ثُمَّ يَكُونُ
مُضْغَةً مِثْلَهُ ذَلِكَ ثُمَّ يُبْعَثُ إِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيُؤَدُّ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ رِزْقُهُ وَأَحْلَهُ وَعَمَلَهُ وَ شِقِيَّ أُمِّ سَعِيدٍ ثُمَّ يَنْفُخُ
فِيهِ الرُّوْحَ ﴾ [بخاری، التوحید، باب ﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَاتُنَا ﴾ : ۷۴۵۴ - مسلم : ۲۶۴۳] ”تم میں سے ہر ایک کی
پیدائش اس کی ماں کے پیٹ میں (نطفہ کی صورت میں) چالیس دن اور چالیس راتیں جمع ہوتی رہتی ہے۔ پھر وہ اتنی دیر تک
جما ہوا خون رہتا ہے، پھر اتنی دیر ہی مضغ رہتا ہے، پھر اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے، تو اسے چار باتوں کا حکم دیا جاتا
ہے، اس کا رزق اور اس کی مدت اور اس کا عمل اور یہ بات کہ بد بخت ہے یا نیک بخت لکھ دیتا ہے، پھر اس میں روح پھونکی
جاتی ہے۔“

﴿ لِشَيْئَانِ لَكُمْ : تاکہ ہم تمہارے لیے واضح کریں کہ ہم جب پانی کے ایک قطرے کو پوری شکل و صورت والا گوشت کا ٹکڑا
بنادیتے ہیں تو ہمارے لیے تمہیں دوبارہ بنانا اور قبروں سے نکال کر زندہ کر کے حساب کتاب لینا کیا مشکل ہے۔

﴿ وَ لَقَدْ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ : یعنی جسے ہم چاہتے ہیں ساقط ہونے سے محفوظ کر کے رحم میں قائم رکھتے ہیں۔ ”إِلَىٰ

الْأَرْضِ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأُنْتَبَتْ مِنْ كُلِّ رَوْحٍ بِهِيجٌ ۝

وہ جانے کے بعد کچھ نہ جانے۔ اور تو زمین کو مژدہ پڑی ہوئی دیکھتا ہے، پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور ابھرتی ہے اور ہر خوبصورت قسم میں سے اگاتی ہے ۝

أَجَلٍ مُّكْتَمِيٍّ یعنی کم از کم چھ ماہ اور زیادہ جتنا ہم چاہتے ہیں۔ یہ ہماری مرضی پر موقوف ہے کہ ہم نے اسے کتنی دیر رحم میں رکھنا ہے۔ ”ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ ظِفْلًا“ پھر ہم اسے بچے کی صورت میں شکمِ مادر سے نکالتے ہیں۔

۸ ثُمَّ لِيَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ : ”ثُمَّ“ کے بعد کچھ عبارت محذوف ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے، یعنی پھر ہم تمہیں بچہ ہونے کی حالت میں ماں کے پیٹ سے نکالتے ہیں جو اپنے بدن، کانوں، آنکھوں، قوت اور عقل میں کمزور ہوتا ہے۔ ”ثُمَّ لِيَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ“ پھر اللہ تعالیٰ اسے آہستہ آہستہ قوت بخشتا ہے، اس کے والدین دن رات اس پر شفقت اور اس کی خدمت کرتے ہیں، وہ بڑھتا جاتا ہے، تاکہ بچپن، لڑکپن سے گزرتا ہو اپنی پوری قوت کو پہنچ کر جوانی کا حسن و کمال حاصل کر لے۔

۹ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُتَوَفَّى یعنی تم میں سے کچھ وہ ہیں جو جوانی کو پہنچ کر یا اس سے پہلے فوت کر لیے جاتے ہیں۔ ”وَمِنْكُمْ مَّنْ يُتَوَفَّى إِلَىٰ آذَانِ الْغُبْرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمِ شَيْءٍ“ یہ ساتواں مرحلہ ہے، یعنی کچھ وہ ہیں جو سب سے کئی عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، یعنی انتہائی بڑھاپا جس میں عقل و فکر اور بدن کی تمام قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ جو شخص کسی وقت بہت بڑا عالم تھا اسے کچھ یاد نہیں رہتا، نہ حافظہ باقی رہتا ہے اور نہ عقل کام کرتی ہے۔ دوبارہ بچوں کی طرح کمزور اور عقل و فکر سے عاری ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَنْ لَعَنَهُدَّ نَكَنَهُ فِي الْخَلْقِ﴾ [یس: ۶۸] ”اور جسے ہم زیادہ عمر دیتے ہیں اسے بناوٹ میں الناکر دیتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعِيفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعِيفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً﴾ [الروم: ۵۴] ”اللہ وہ ہے جس نے تمہیں کمزوری سے پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد قوت بنائی، پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا بنا دیا۔“ نبی کریم ﷺ ارذل العمر سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، جیسا کہ عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما اپنے بیٹوں کو یہ کلمات سکھاتے تھے جس طرح معلم لڑکوں کو لکھنا سکھاتا ہے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے بعد ان کلمات کے ساتھ پناہ مانگا کرتے تھے: ﴿اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الضُّعْفِ وَالْأَعْوُدِ بِكَ أَنْ أُرَدَّ إِلَىٰ أُرْدَالِ الْعُمُرِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ﴾ [بخاری، الجهاد والسير، باب ما يتعوذ من الضعيف: ۲۸۲۲] ”اے اللہ! میں بزدلی سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور میں اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ کئی عمر کی طرف لوٹایا جاؤں اور میں دنیا کے فتنے سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور میں قبر کے عذاب سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔“ مصعب بن سعد کی روایت میں ”اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الضُّعْفِ“ کے بعد ”وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الضُّعْفِ“ بھی ہے کہ میں بخل سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ [بخاری، الدعوات، باب الاستعاذة من أرذل العمر: ۶۳۷۴]

۱۰ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً : ”اهْتَزَّتْ“ ”هَزَّ يَهْزُ هَزًّا“ حرکت دینا، ہلانا۔ ”اهْتَزَّتْ يَهْتَزُّ اهْتِزَّازًا“ (افتعال)

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّكَ يُنۡجِي الْمَوۡتٰى وَاَنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيۡرٌ ۝۱ وَاَنَّ
السَّاعَةَ اَتِيَةٌ لَا رَآيَبَ فِيهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبۡعَثُ مَنۡ فِي الْقُبُوۡرِ ۝۲

یہ اس لیے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور (اس لیے) کہ وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور (اس لیے) کہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ① اور (اس لیے) کہ قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں اور (اس لیے) کہ یقیناً اللہ ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں ②

حرکت کرنا، کھیتی کا لہلہانا۔ ”زَبَتَتْ“ ”زَبَا يَرُبُّو“ (ن) بڑھنا، پھولنا۔ یہ موت کے بعد زندگی کی دوسری دلیل ہے۔ مختلف قسم کی نباتات اور اجناس کے بیج زمین میں بکھرے پڑے ہوتے ہیں، جنہیں ہواؤں نے یا پرندوں نے جگہ جگہ پھیلا دیا تھا۔ اسی طرح بے شمار چیزوں کی جڑیں بھی جگہ جگہ مٹی میں دفن ہوتی ہیں، جن میں زندگی کا نشان تک نہیں ہوتا، مگر جوں ہی ان پر بارش کے چھینٹے پڑے تو ہر طرف زندگی لہلہانے لگی۔ ہر مردہ جز اپنی قبر سے جی اٹھی اور ہر بے کار پڑا ہوا بے جان بیج ایک زندہ پودے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ مردوں کے زندہ ہونے کا ایسا عمل ہے جسے ہر انسان موسم بہار میں اور موسم برسات میں خود مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ یہی صورت انسان کے جسم کی ہے، اس کے اٹھنے کا بھی ایک موسم ہے، جو صور کا دوسرا نقشہ ہے، جب یہ موسم آجائے گا تو ہر انسان اپنے دفن ہونے کی جگہ سے زندہ اٹھا کر کھڑا کر دیا جائے گا۔ (تیسیر القرآن)

آیت 7.6: ① ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ : اس آیت کے دو مطلب بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ ”باء“ سبب ہے جو ”تکالیف“ وغیرہ سے متعلق ہے، جو افعال عامہ سے مشتق ہیں۔ یعنی بنی آدم کو پیدا کرنے اور مردہ زمین کو زندہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ہمیشہ ثابت اور موجود ہے، سو وہی ان دونوں کا اور ہر چیز کا موجد ہے۔ ”وَاَنَّكَ يُنۡجِي الْمَوۡتٰى“ اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہی مردوں کو زندہ کرے گا، اگر وہ مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت نہ رکھتا تو بے جان مٹی اور نطفے کو اور مردہ زمین کو زندگی کیسے بخشتا؟ ”وَاَنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيۡرٌ“ اور اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے، سو وہ نطفے اور مردہ زمین کو زندگی بخشنے پر بھی قادر ہے۔ ”وَاَنَّ النَّسَاۡةَ اَتِيۡنَآ.....“ اور اس کا سبب یہ ہے کہ قیامت آنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ قبروں میں دفن لوگوں کو دوبارہ زندہ کرے گا، تاکہ ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ ملے، ورنہ نطفے سے لے کر جوانی اور پھر بڑھاپے تک پہنچانے کا کوئی مقصد نہ ہوتا، جب کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام عبث اور بے مقصد نہیں۔ قدیم مفسرین یہ معنی بیان کرتے ہیں۔

② دوسرا مطلب یہ ہے کہ ”باء“ کو ایسے لفظ کے متعلق کیا جائے جو سیاق و سباق سے مناسبت رکھتا ہو، مثلاً ”شاهد“ وغیرہ، ”اٰتٰى ذٰلِكَ شَآهِدًا بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ“ مطلب یہ ہوگا کہ یہ جو کچھ گزرا، یعنی انسان کا مٹی سے، پھر نطفے سے (آخر تک) پیدا ہونا اور مردہ زمین کا پانی سے زندہ ہو جانا اس بات کا شاہد اور اس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا..... متاخرین اس معنی کو ترجیح دیتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ ۝ ثَانِي عِظْفِهِ
لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ ①

اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کے بارے میں بغیر کسی علم کے اور بغیر کسی ہدایت کے اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑا کرتا ہے ① اس حال میں کہ اپنا پہلو موڑنے والا ہے، تاکہ اللہ کے راستے سے گمراہ کرے، اس کے لیے دنیا میں ایک رسوائی ہے اور قیامت کے دن ہم اسے آگ کا عذاب چکھائیں گے ②

آیت 9.8 ① وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ.....: یہاں ایک سوال ہے کہ یہی الفاظ اس سے پہلے آیت (۳) میں گزرے ہیں، پھر انہیں دوبارہ لانے میں کیا حکمت ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ وہاں قیامت کے قیام پر اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے متعلق ان سب بحث جھگڑالوؤں کا ذکر ہے جو علم سے سراسر عاری اور محض مقلد ہیں اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے چلتے ہیں۔ جبکہ یہاں ان جھگڑالوؤں کا ذکر ہے جو گمراہی کے پیشوا ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ جس طرح پہلی آیت: "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ" میں واؤ سے پہلے کچھ لوگوں کا ذکر محذوف ہے (آیت: ۳ کی تفسیر ایک بار پھر دیکھ لیں) اسی طرح موقع کی مناسبت سے یہاں بھی "وَمِنَ النَّاسِ" کی واؤ سے پہلے کچھ لوگوں کا ذکر محذوف ہے، یعنی جو لوگ انسان کی پیدائش اور مردہ زمین کو زندہ کرنے کے دلائل سے پہلے قیامت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان نہیں لا رہے تھے ان قطعی دلائل کے بعد ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو ایمان لے آتے ہیں اور کچھ ایسے ہٹ دھرم اور عقل و شعور سے عاری ہیں جو کسی بھی دلیل کے بغیر محض تکبر کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ خود ایمان نہیں لاتے، بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

② بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى.....: علم سے مراد بدیہی اور فطری دلیل ہے جو کسی غور و فکر کے بغیر ہر ایک کی سمجھ میں آتی ہے۔ "هُدًى" سے مراد غور و فکر اور نظر و استدلال سے حاصل ہونے والی عقلی دلیل ہے اور "كِتَابٌ مُنِيرٌ" سے مراد آسمان سے نازل ہونے والی کتابوں میں صحیح ثابت ہونے والی کوئی دلیل نقلی ہے۔ یعنی اس کے پاس قیامت کے انکار یا اللہ تعالیٰ کے وجود یا اس کی قدرت کے انکار کی کوئی فطری دلیل ہے نہ عقلی اور نہ نقلی۔ اس کے جھگڑے کا باعث صرف تکبر ہے۔

③ ثَانِي عِظْفِهِ: "ثَانِي يَثْنِي ثَنْيًّا" بروزن "لَوِي يَلْوِي لَوِيًّا" (ض) موڑنے کے معنی میں آتا ہے۔ "ثَانِي عِظْفِهِ قَرِيبٌ" اس نے اپنے گھوڑے کی ہاگ موڑی۔ جھکانے کے معنی میں بھی آتا ہے: ﴿أَلَا إِنَّهُمْ يَشْتَوْنَ صُدُورَهُمْ﴾ [ہود: ۵] "سن لو! بلاشبہ وہ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں۔" "عِظْفٌ" کا معنی کندھا بھی ہے اور پہلو بھی۔ یہ اس کے تکبر کی تصویر ہے کہ وہ کس طرح پہلو موڑتے ہوئے اور گردن کشی کرتے ہوئے حق سے اعراض کرتا ہے۔

④ لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ: مراد مسلمانوں کے ہاتھوں قتل، شکست، اسیری یا محکومی ہے، جیسا کہ بدر، احد، خندق، فتح خیبر، فتح مکہ اور فتح طائف اور دوسری بے شمار جنگوں میں ہوا۔ مزید زلت و رسوائی یہ کہ مال و اولاد کی فراوانی کے باوجود "مَعِيشتُهُ"

بِذَلِكَ بِمَا قَدَّمْت يَدَكَ وَ أَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَامٍ لِلْعَبِيدِ ﴿۱۰﴾ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْْبُدُ
اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ، فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ، وَ إِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَى
وَجْهِهِ ﴿۱۱﴾ حَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةَ ذَلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ﴿۱۱﴾

یہ اس کی وجہ سے ہے جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا اور (اس لیے) کہ اللہ ہرگز اپنے بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے ﴿۱۰﴾ اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر کرتا ہے، پھر اگر اسے کوئی بھلائی پہنچ جائے تو اس کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش آ پہنچے تو اپنے منہ پر لٹا پھر جاتا ہے۔ اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا، یہی تو صریح خسارہ ہے ﴿۱۱﴾

حَسْرًا“ (ظہ: ۱۲۳) اور اموال و اولاد کے ذریعے سے مسلسل عذاب ہے۔ دیکھیے سورہ توبہ (۵۵) جو دنیا میں کفار کا اور حق تعالیٰ کی یاد سے منہ موڑنے والے ہر شخص کا مقدر ہے۔

آیت 10 وَ أَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَامٍ لِلْعَبِيدِ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ آل عمران (۱۸۳) اور انفال (۵۱) بعض اہل علم نے اس کی ایک اور توجیہ لکھی ہے کہ ”فَعَالٌ“ کا وزن ہمیشہ مبالغہ کے لیے نہیں آتا، بلکہ بعض اوقات صرف نسبت کے لیے یعنی ”ذُو شَيْءٍ“ (کسی چیز والا) کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسے ”سَمَانٌ“ (گھی والا)، ”فَطَّانٌ“ (روٹی والا)، ”حَدَّادٌ“ (لوہار)، تَسَاوُرٌ (کھجوروں والا)، مطلب یہ ہے کہ یہاں ”ظَلَامٌ“ مبالغے کے لیے نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات عالی ہے جس کی طرف ظلم کی نسبت بھی نہیں ہو سکتی۔

آیت 11 ﴿۱۱﴾ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ.....: ”حَرْفٍ“ کا معنی کنارہ ہے، یعنی وہ دین کے دائرے کے وسط میں داخل نہیں ہوتا، بلکہ کنارے ہی پر رہتا ہے، یا اس کے دل میں ایمان جاگزیں نہیں ہوتا، صرف زبان اسلام کا اقرار کرتی ہے، جیسے کوئی شخص کسی لشکر کے کنارے پر رہے، اگر فتح نظر آ رہی ہو تو جا ملے، ورنہ فرار اختیار کرے۔ یہ آیت ان اعراب (بادیہ نشین) لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو صحرا سے ہجرت کر کے آتے۔ پھر اگر جان و مال میں برکت ہوتی تو اسلام پر بڑے اطمینان کا اظہار کرتے اور اگر تکلیف اور دکھ میں مبتلا ہو جاتے تو مرتد ہو کر واپس بھاگ جاتے۔ بعض ”مؤلفۃ القلوب“ کی بھی یہی حالت تھی۔ (کبیر) اور دیکھیے سورہ بقرہ (۲۰۳)۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: « كَانَ الرَّجُلُ يَقْدُمُ الْمَدِينَةَ، فَيَسْلِمُ، فَإِنْ وَلَدَتْ امْرَأَتُهُ غُلَامًا وَنَسِجَتْ خَيْلَهُ قَالَ هَذَا دِينُ صَلَاحٍ وَإِنْ لَمْ تَلِدْ امْرَأَتَهُ وَ لَمْ تُنْسَجْ خَيْلَهُ قَالَ هَذَا دِينُ سُوءٍ » [بخاری، التفسیر، باب ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ﴾: ۱۷۴۲] ”آدی مدینے آتا، پھر اگر اس کی بیوی لڑکے کو جنم دیتی اور اس کی گھوڑیاں بچے دیتیں تو کہتا، یہ اچھا دین ہے اور اگر بیوی کے ہاں بچہ نہ ہوتا اور نہ گھوڑیاں بچے دیتیں تو کہتا یہ دین برا ہے۔“

يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُ وَمَا لَا يَنْفَعُهُمْ ذَلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوا
لَمَنْ ضُرُّهُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِ ۚ لَيْسَ الْمَوْلَىٰ وَ لَيْسَ الْعَشِيرُ ﴿۱۳﴾ إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿۱۴﴾

وہ اللہ کے سوا اس چیز کو پکارتا ہے جو اسے نقصان نہیں پہنچاتی اور اس چیز کو جو اسے نفع نہیں دیتی، یہی تو دور کی گمراہی ہے ﴿۱۲﴾ وہ اسے پکارتا ہے کہ یقیناً اس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے، بلاشبہ وہ برادرست ہے اور بلاشبہ وہ براساتھی ہے ﴿۱۳﴾ بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿۱۴﴾

﴿۱۲﴾ انقلب على وجهه: یعنی مرتد ہو گیا اور پھر کفر و شرک کی طرف پلٹ گیا۔

﴿۱۳﴾ ذَلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ: شاہ عبدالقادر بریلوی لکھتے ہیں، یعنی دنیا کا فائدہ اور بھلائی دیکھے تو بندگی پر قائم رہے اور اگر آزمائش آ جائے اور کوئی تکلیف پہنچے تو بندگی چھوڑ دے۔ ادھر (تکلیف اور مصیبت سے) دنیا گئی ادھر (بندگی چھوڑ کر مرتد ہونے سے) دین گیا۔ کنارے پر کھڑا ہے، یعنی دل ابھی نہ اس طرف ہے اور نہ اس طرف، جیسے کوئی مکان کے کنارے کھڑا ہے، جب چاہے نکل جائے۔ (موضح)

آیت 12: يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُ: بعض لوگ ”مَنْ دُونِ اللَّهِ“ سے مراد بت لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اولیاء اللہ ”مَنْ دُونِ اللَّهِ“ نہیں ہیں۔ حالانکہ ”مَنْ دُونِ اللَّهِ“ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے سوا ہر چیز ہے، خواہ بت ہوں یا قبریں، درخت ہوں یا جانور، مثلاً گائے وغیرہ، خواہ انسان ہوں یا جن یا فرشتے، زندہ ہوں یا مردہ، نیک ہوں یا بد، سب ”مَنْ دُونِ اللَّهِ“ ہیں، کیونکہ جو بھی موجود ہے یا اللہ ہے یا ”مَنْ دُونِ اللَّهِ“۔ اگر دیوں اور نبیوں کو ”مَنْ دُونِ اللَّهِ“ نہ مانیں تو انھیں اللہ ماننا پڑے گا۔ پھر ”وحدہ لا شریک لہ“ اور ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“ کا مطلب کیا ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا سب کچھ ”مَنْ دُونِ اللَّهِ“ (اللہ کے سوا) ہے۔ مزید دیکھیے سورہ نحل (۴۰، ۴۱)۔

آیت 13: يَدْعُوا لِمَنْ ضُرُّهُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِ: یعنی نفع تو درکنار ان کے پکارنے میں اللہ نقصان ہے، کیونکہ جو شخص انھیں پکارتا ہے وہ ایمان سے تو یقیناً اور فوراً ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اب رہا ظاہری فائدہ، تو وہ محض ایک خیالی امید ہے جو اس نے اپنے دماغ میں پال رکھی ہے۔ حاصل ہو تو ہو، نہ ہو تو نہ ہو۔ ہو بھی تو ان معبودوں کی طرف سے نہیں ہوگی، انھیں پکارنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

آیت 14: ﴿۱۴﴾ إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا: کافروں اور مطلب پرست بے یقین مسلمانوں کے بعد سختی اور نری

یعنی ہر حال میں اسلام پر قائم رہنے والے مسلمانوں کا ذکر فرمایا، جو یقین و ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہیں اور ہر عمل خلوص نیت

مَنْ كَانَ يُظُنُّ أَنْ لَنْ يَنْصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ
ثُمَّ لِيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدَهُ مَا يَغِیْظُ ﴿۱۵﴾

جو شخص یہ گمان کرتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں کبھی اس کی مدد نہیں کرے گا تو وہ ایک رسی آسمان کی طرف لٹکائے، پھر کاٹ دے، پھر دیکھے کیا واقعی اس کی تدبیر اس چیز کو دور کر دے گی جو اسے غصہ دلاتی ہے ﴿۱۵﴾

کے ساتھ سنت نبوی کے مطابق بجالاتے ہیں، کیونکہ عمل صالح کے لیے یہ دونوں چیزیں لازم ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایسی جنتوں کا وعدہ فرمایا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

﴿۱۵﴾ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُؤَيِّدُ: یعنی اللہ تعالیٰ غیر محدود اختیارات کا مالک ہے، دنیا یا آخرت میں جسے جو چاہے دے دے۔ تھوڑے سے عمل پر وہ جنت عطا کر دے کہ جس کا عرض زمین و آسمان کے عرض کے برابر ہے فرمایا: ﴿عَرْضَهَا السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ﴾ [آل عمران: ۱۳۳] ”جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔“ جبکہ کفار و مشرکین کو ہمیشہ کے لیے جہنم میں پھینک دے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حکم میں چون و چرا کر سکے، وہ جو دینا چاہے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو روک لے کوئی وہ دے نہیں سکتا اور نہ دلواسکتا ہے۔

آیت 15 ﴿۱۵﴾ مَنْ كَانَ يُظُنُّ أَنْ لَنْ يَنْصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا.....: ”سَبَبٌ“ رسی۔ ”السَّمَاءُ“ ”سَمَا يَسْمُو“ (ن) سے ہے جس کا معنی ہے بلند ہونا۔ آسمان کو اس کی بلندی کی وجہ سے ”سما“ کہتے ہیں، اس لیے بادل کو بھی ”سما“ کہہ لیتے ہیں اور چھت کو بھی۔

﴿۱۵﴾ ”مَنْ كَانَ يُظُنُّ أَنْ لَنْ يَنْصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“ کی ایک تفسیر وہ ہے جو طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں محمد ﷺ کی مدد نہیں کرے گا، وہ چھت سے ایک رسی باندھے، پھر اس کے ساتھ پھانسی لے کر اپنا گلا گھونٹ لے اور مر جائے اور دیکھے، کیا اس کے ایسا کرنے سے اس کے غصے اور حسد کی آگ بجھتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے محمد ﷺ کی نصرت پر اس کے سینے میں بھڑک رہی ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جو سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا وہ بے شک پھانسی لے کر مر جائے، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اپنے رسول کی نصرت یقیناً فرمائے گا۔ چونکہ ہر چیز کا اللہ کے ہاں ایک وقت مقرر ہے، اس لیے نصرت میں دیر کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی مدد کبھی کرے گا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ تو یقیناً اپنے تمام رسولوں اور اہل ایمان کی دنیا اور آخرت میں مدد فرماتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ [الؤمن: ۵۱] ”بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔“ اس تفسیر پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت سے پہلے یا بعد میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر نہیں آیا تو ”اس کی مدد نہیں کرے گا“ میں ”اس“ سے رسول اللہ ﷺ کیسے مراد ہو سکتے ہیں؟ جواب اس کا یہ دیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۚ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يُرِيدُ ﴿۱۶﴾

اور اسی طرح ہم نے اسے روشن آیات کی صورت میں نازل کیا ہے اور یہ کہ اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ﴿۱۶﴾

طرف ضمیر لوٹانے کے لیے پہلے آپ کا ذکر ہونا ضروری نہیں، کیونکہ آپ کا ذکر ہر مومن کے ذہن میں موجود ہے۔ اس لیے الفاظ میں پہلے آپ ﷺ کا ذکر نہ بھی ہو تو حرج نہیں۔

دوسری تفسیر وہ ہے جو طبری نے صحیح سند کے ساتھ مجاہد سے نقل کی ہے کہ جو شخص (اپنے متعلق) یہ گمان کرتا ہو کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں (اس کی کبھی مدد نہیں کرے گا) اسے کبھی رزق نہیں دے گا، وہ اوپر کی طرف رسی لٹکا کر اپنا کلا گھونٹ لے، پھر دیکھے..... یعنی جو شخص اللہ کی نصرت پر یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ایسے ناامید شخص کو چاہیے کہ وہ چھانسی لے کر مر جائے، پھر دیکھے کہ کیا اس سے اس کی امید برآتی ہے؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کہا جائے کہ اگر تم فلاں بات پر یقین نہیں کرتے تو جاؤ دیوار سے ٹکرا کر مر جاؤ۔

شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی ایک بہت عمدہ تفسیر فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں: ”دنیا کی تکلیف میں جو اللہ تعالیٰ سے ناامید ہو کر اس کی بندگی چھوڑ دے اور جھوٹی چیزوں کی پوجا کرے، جن کے ہاتھ نہ برا ہے نہ بھلا، وہ اپنے دل کو سمجھانے اور تسلی دینے کے لیے یہ صورت قیاس کر لے کہ جیسے ایک شخص اونچی لٹکتی رسی سے لٹک رہا ہے، اگر چڑھ نہیں سکتا تو توقع تو ہے کہ رسی اوپر کھینچے تو چڑھ جاوے۔ جب رسی توڑ دی پھر کیا توقع؟ رسی کہا اللہ کی امید کو اور اس رسی کو آسمان کی طرف تانے یعنی اونچان کی طرف۔“ (موضح) اس تفسیر اور اس سے پہلی تفسیر دونوں میں اس آیت کا تعلق گزشتہ آیت: ﴿وَيُنذِرَ السَّائِبِينَ﴾ سے بھی واضح ہو رہا ہے۔

آیت 16 ﴿وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ﴾ طبری نے فرمایا: ”اور جس طرح ہم نے مختلف دلائل کے ساتھ ان لوگوں کے لیے اپنی حجت واضح کی ہے جو لوگوں کے مرنے کے بعد انہیں زندہ کرنے پر ہمیں قادر نہیں مانتے اور ہم پر ایمان نہیں لاتے، اسی طرح ہم نے یہ پورا قرآن ہی نہایت روشن آیات کی صورت میں اتارا ہے۔“

﴿وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يُرِيدُ﴾ اس جملے کا پچھلے جملے سے کیا تعلق ہے اور درمیان میں واؤ لانے کی کیا حکمت ہے؟ اس سوال کے حل کے لیے اہل علم نے آیت کی کئی نحوی ترکیبیں کی ہیں، مگر مجھے سب سے قریب بقای کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ”وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يُرِيدُ“ میں ”واؤ“ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس کا کسی محذوف پر عطف ہے جو ”وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ“ سے تعلق رکھتا ہے، چنانچہ پوری عبارت یوں ہوگی: ”وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِيُعْلَمَ أَنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يُرِيدُ“ اور اسی طرح ہم نے اسے روشن آیات کی صورت میں نازل کیا ہے، تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور یہ معلوم ہو جائے کہ بے شک اللہ ہدایت دیتا ہے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّبِيْنَ وَالنَّصْرِيْنَ وَالنَّجْوَسَ وَالَّذِينَ
أَشْرَكُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۱۷﴾

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور صابی اور نصاریٰ اور مجوس اور وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا یقیناً اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے ﴿۱۷﴾

جسے چاہتا ہے۔ یعنی گو قرآن میں ایمان و توحید کی روشن دلیلیں موجود ہیں مگر سب لوگوں کے اس سے ہدایت نہ پانے کی وجہ یہ ہے کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ گمراہی اور ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ کوئی شخص اپنے بل بوتے پر یہ نعمت حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یہ علم و عقل اور تجربہ تو حقیقت تک پہنچنے کا ایک امکانی ذریعہ ہے، لیکن اس تک رسائی صرف اللہ کی توفیق پر موقوف ہے۔ بعض اہل علم نے اس کی یہ ترکیب کی ہے: ”وَالْأَمْرُ أَتَىٰ اللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ“ اور اصل معاملہ یہ ہے کہ بے شک اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ ”شاہ عبدالقادر رزقانی نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

آیت ۱۷ : ﴿۱۷﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا..... گزشتہ آیات میں ایمان والوں کے علاوہ مختلف لوگوں کا ذکر ہوا، کچھ قیامت کے منکر، کچھ کنارے پر رہ کر عبادت کرنے والے، کچھ اللہ کے ساتھ شریک بنانے والے وغیرہ۔ اس پر سوال پیدا ہوا کہ اتنے مختلف عقائد کے لوگ جو اپنی اپنی بات پر اس قدر پختہ ہیں کہ واضح دلائل کے باوجود اپنی بات نہیں چھوڑتے، آخر کبھی ان کے جھگڑے کا فیصلہ بھی ہوگا؟ فرمایا، ان کے جھگڑے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن فرمائے گا، جب مومن جنت اور کافر جہنم میں جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں ان کے حق یا باطل پر ہونے کا فیصلہ نہیں ہوا۔ یقیناً ہوا ہے اور قرآن مجید کا نام فرقان اسی لیے ہے۔ یہ کلام ایسے ہی ہے جیسے بحث ختم کرنے کے لیے بات اللہ کے سپرد کر دی جاتی ہے، حالانکہ بات کرنے والے کو اپنے سچا ہونے کا اور فریق مخالف کے خطا پر ہونے کا یقین ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَمَّا أَخَذْنَا وَلَكُمْ نَسْتًا وَبَيْنَكُمْ أَتَيْنَا وَبَيْنَكُمْ أَتَيْنَا﴾ [الشوری: ۱۵] ”ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال۔ ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں، اللہ ہمیں آپس میں جمع کرے گا اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

② مومنین، یہود، نصاریٰ اور صابئین کا بیان سورہ بقرہ (۶۲) میں گزر چکا ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں، یہاں مجوس اور مشرکین کا مزید ذکر ہے۔ مجوس سے مراد آتش پرست ہیں جو دو خالق مانتے ہیں، ایک خالق خیر (یزدان) اور ایک خالق شر (اہرمن) یہ لوگ اپنے آپ کو زرتشت کا پیرو کہتے ہیں اور کسی نبی کا نام بھی لیتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ لوگ بعد میں گمراہ ہوئے یا شروع ہی سے غلط تھے۔ مزدک نے ان کے مذہب اور اخلاق کو بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا، حتیٰ کہ حقیقی بہن سے نکاح بھی ان کے ہاں جائز قرار دیا گیا۔ ”وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا“ (وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا) سے مراد عرب اور دوسرے ملکوں کے وہ مشرک ہیں

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ
وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ۚ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ، اسی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے لوگ۔ اور بہت سے وہ ہیں جن پر عذاب

جنہوں نے مندرجہ بالا گروہوں میں سے کسی کا نام اختیار نہیں کیا تھا، مثلاً گائے اور بٹوں کے پجاری ہندو۔ قرآن مجید انہیں مشرکین اور "وَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا" کے نام سے ذکر کرتا ہے، اگرچہ موحد مسلمانوں کے سوا مندرجہ بالا سب مذاہب میں شرک کی کوئی نہ کوئی قسم ضرور پائی جاتی ہے۔

③ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ : یعنی ان تمام گروہوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کا فیصلہ حاکمانہ اختیار کی وجہ سے اندھا فیصلہ نہیں ہوگا، بلکہ عین عدل و انصاف ہوگا، کیونکہ ہر چیز اس کے سامنے ہے، وہ ہر چیز پر گواہ ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کے عین مطابق جزا یا سزا دے گا۔

آیت 18 ① أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ : پچھلی آیت میں جن گروہوں کا ذکر ہوا اہل ایمان کے علاوہ سب نے اللہ کے ساتھ شریک بنا رکھے ہیں۔ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دے رکھا ہے۔ صابی ستارہ پرست، مجوس آتش پرست اور مشرکین بت پرست ہیں۔ اس آیت میں فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی عبادت اور اسے سجدہ کرنے پر متفق ہے؟ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے عقل جیسی نعمت عطا فرمائی، اس کا حق تو یہ تھا کہ اس کے سارے افراد اوروں سے زیادہ اس کی عبادت اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے پر متفق ہوتے، مگر اس کے بہت سے افراد غیر اللہ کی عبادت کی وجہ سے عذاب الہی کے حق دار ٹھہرے ہیں۔

② "أَلَمْ تَرَ" سے مراد "أَلَمْ تَعْلَمْ" ہے، یعنی کیا تجھے معلوم نہیں؟ کیونکہ آسمانوں اور زمین میں بسنے والے تمام افراد کو اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ مزید دیکھیے سورہ نمل کی آیت (۱۱) : ﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ﴾ کی تفسیر۔ "أَلَمْ تَرَ" کے اولین مخاطب نبی کریم ﷺ ہیں اور آپ کے بعد آپ کی امت کا ہر فرد۔

③ بعض مفسرین نے یہاں سجدے سے مراد انقیاد لیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے ساری مخلوق عاجز اور بے بس ہے۔ چاہے یا نہ چاہے، اسے اس کے سامنے گردن جھکانا اور اس کے "سُكُنٌ فَيَسْجُدُونَ" والے حکم کو ماننا پڑتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ "سُكُنٌ" کہے اور کوئی اس سے منہ پھیر سکے۔ مگر یہاں سجدے کا صرف یہ معنی مراد لینا درست نہیں، کیونکہ یہ سجدہ تو ساری مخلوق کے ساتھ ساتھ ہر انسان اور جن بھی کرتا ہے، بلکہ یہاں مراد وہ سجدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق بہت سے لوگ کرتے ہیں اور بہت سے لوگوں پر عذاب واجب ہو چکا ہے، یعنی وہ سجدہ نہیں کرتے۔ اگر تکوینی سجدہ مراد ہو تو مومن و کافر کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حکم سے سر تابی کرے۔ آدمی ایک ٹانگ اٹھا سکتا ہے، ذرا دونوں اٹھا کر تو دکھائے؟ اپنی بھوک یا پیاس کو روک لے۔

العَذَابُ ۛ وَ مَنْ يُوْهِنْ اِلٰهَہٗ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّکْرَمٍ ۚ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ﴿۸﴾

ثابت ہو چکا اور جسے اللہ ذلیل کر دے پھر اسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔ بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿۸﴾

پیشاب پاخانہ کی حاجت سے بے نیاز ہو کر دکھائے۔ دل کی دھڑکن، خون کی گردش، بچپن، جوانی، بڑھاپا، بیماری، ضعف، انحطاط، موت، غرض اللہ کے کسی نکوئی حکم کے مقابلے میں سجدے سے سزا دکھائے؟ معلوم ہوا اس سجدے سے وہ سجدہ مراد ہے جو انسان اپنی خوشی سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق وہ تمام چیزیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے اپنی خوشی سے اللہ کے لیے سجدہ کرتی ہیں، جب کہ لوگوں میں سے بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے یہ سجدہ خوشی سے کرتے ہیں اور بہت سے نہیں کرتے۔ جن و انس کے علاوہ باقی ساری مخلوق دونوں طرح سے اللہ کے لیے سجدہ ریز ہے، نکوئی طور پر بھی اور اطاعت و عبادت کے لیے بھی، جبکہ انسان نکوئی طور پر اللہ کے حکم کے سامنے سجدہ ریز ہے، اطاعت و عبادت کے طور پر بہت سے انسان سجدہ کرتے ہیں، بہت سے نہیں کرتے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز کا نکوئی حکم کے تابع ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر عبادت کے لیے باقاعدہ سجدہ کرنا سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ پہاڑ، درخت، سورج، چاند اور ستارے تو بے جان چیزیں ہیں، وہ سجدہ کیا کریں گی؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام چیزوں میں احساس اور شعور رکھا ہے اور اس نے ہر چیز کو اپنے سامنے رکوع و سجود اور قیام و تسبیح کا طریقہ بھی سکھا رکھا ہے، حتیٰ کہ جب اس نے زمین و آسمان کو حکم دیا کہ خوشی یا ناخوشی سے حاضر ہو جاؤ تو دونوں نے کہا، ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ دیکھیے سورہ طہ السجدہ (۱۱) اور فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْبِخُ لِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِیْنَ وَالْکَلِیْمَ صٰدِقًا مَّکْلٰثًا ۚ وَ تَسْبِخُطُ ۙ وَ اللّٰہُ عَلَیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ﴾ [النور: ۴۱] ”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ، اس کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے ہوئے، ہر ایک نے یقیناً اپنی نماز (جس میں قیام اور رکوع و سجود سمجھ ہوتا ہے) اور اپنی تسبیح جان لی ہے اور اللہ اسے خوب جانتے والا ہے جو وہ کرتے ہیں۔“ اور دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۳۴)، احزاب (۷۲)، حشر (۲۱)، نحل (۲۸)، حم السجدہ (۲۱) اور سورہ بقرہ (۷۳) خلاصہ یہ ہے کہ یہاں ”الثانیس“ کے سجدے سے مراد عبادت کا سجدہ ہے، جو کچھ لوگ کرتے ہیں اور کچھ لوگ نہیں کرتے اور ”الثانیس“ کے علاوہ باقی تمام چیزوں کے سجدے سے دونوں سجدے مراد ہیں، نکوئی بھی اور عبادت کا سجدہ بھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار مخلوق میں سے چند کا خاص طور پر نام لے کر ذکر فرمایا کہ وہ اللہ کے لیے سجدہ کرتی ہیں۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان تمام اشیاء میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی مشرک نے اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش صابین کرتے ہیں۔ عرب کے مشرکین شعرانی اور دوسرے ستاروں کی پوجا کرتے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو ان کی عبادت سے منع فرمایا تھا۔ پہاڑوں کے پتھروں کی پوجا بت پرست کرتے ہیں، اسی طرح کئی درختوں کی بھی عبادت ہوتی ہے، جیسے کئی قبر پرست اور بت پرست اپنے اپنے دربار کے درختوں کو بھی کرنی والا سمجھتے ہیں اور ان کے سپتے یا

هَذِهِنَّ حَظُّنَ أَخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ، قَالِيزِينَ كَفَرُوا قَطَعَتْ لَهُمْ شِيَابَ مِنْ تَارٍ
يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ ﴿۱۹﴾

یہ دو جھگڑنے والے ہیں، جنہوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، تو وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ان کے لیے آگ کے پیزے کاٹے جا چکے، ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا ﴿۱۹﴾

مثنیٰ توڑنے کو بہت بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔ کئی جانوروں کو بھی معبود بنایا گیا ہے، جیسے ہندو گائے، سانپ، بندر اور کئی جانوروں کی پوجا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سب تو اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرتے اور اسے اپنا رب مانتے ہیں، پھر عقل سے کس قدر عاری ہیں وہ لوگ جو اللہ کو سجدہ کرنے کے بجائے ان کو سجدہ کرتے ہیں جو خود اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر انسان کی اور ذلت کیا ہوگی؟

﴿۱۹﴾ وَمَنْ يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُكْرِمٍ : ”يُهِنُ“ پر ”مَنْ“ آنے کی وجہ سے نون پر جزم آگئی، دو ساکنوں کی وجہ سے ”یاء“ گر گئی تو ”يُهِنُ“ ہو گیا، پھر آگے ملانے کے لیے نون کو کسرہ دے دیا۔ یعنی جسے اللہ تعالیٰ اس کے شرک و کفر کی شامت کے نتیجے میں انسانی عزت و شرف سے محروم کر کے جانوروں سے بھی بدتر بنا دے (اعراف: ۱۷۹) اور جہنم کے دائمی عذاب میں مبتلا کر کے ہمیشہ کے لیے ذلیل و رسوا کر دے تو اسے اس ذلت سے نکال کر کوئی عزت عطا کرنے والا نہیں، فرمایا: ﴿وَتَعَزَّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ﴾ [۱۷۶] اور تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے۔

﴿۲۰﴾ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ : ”إِنَّ“ (ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ) اپنے سے پہلے جملے کی علت بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو عزت اور کسی کو ذلت کیوں دیتا ہے؟ فرمایا، وہ اپنی مرضی کا مالک ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۃ انبیاء کی آیت (۲۳) کی تفسیر۔

﴿۲۱﴾ اس آیت پر سجدہ ہے اور سورۃ حج کے اس سجدہ پر سب کا اتفاق ہے۔

آیت 19 ﴿۱۹﴾ هَذِهِنَّ حَظُّنَ أَخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ : یہاں دو جھگڑنے والوں میں ایک فریق مسلمان اور دوسرا فریق وہ پانچوں گروہ ہیں جن کا پچھلی آیت میں ایمان والوں کے بعد ذکر ہوا ہے اور جنہیں اس آیت میں کافر قرار دیا گیا ہے۔ رب تعالیٰ کے بارے میں جھگڑنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اللہ کی توحید کے قائل ہیں اور یہ تمام لوگ توحید کے بارے میں طرح طرح کے خیالات رکھتے ہیں جو کفر ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس مخالفت کا لازمی نتیجہ مسلمانوں کی طرف سے جہاد ہے۔ پہلا غزوہ جس میں رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں دو بدو جنگ ہوئی غزوہ بدر تھا، جس میں سب سے پہلے میدان میں نکلنے والے حمزہ بن عبدالمطلب، عبیدہ بن حارث اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم تھے، جو اپنے قریب ترین رشتہ داروں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ کے مقابلے میں نکلے تھے۔ چنانچہ اس آیت کا اولین مصداق یہی تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے: ﴿أَنَّ سَكَانَ يُقْسِمُ قَسَمًا إِنَّ هَذِهِ الْآيَةَ: ﴿هَذِهِنَّ حَظُّنَ أَخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ﴾

يُضَهَّرُ بِهِ مَا فِي بُطُونِهِمْ وَالْجُلُودُ ۝ وَ لَهُمْ نَقَامُهُمْ مِنْ حديدٍ ۝ كُلَّمَا أَرَادُوا
 أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا ۝ وَ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝

اس کے ساتھ پگھلا دیا جائے گا جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے اور چمڑے بھی ۝ اور انھی کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہیں ۝ جب کبھی ارادہ کریں گے کہ سخت ٹھٹھن کی وجہ سے اس سے نکلیں، اس میں لوٹا دیے جائیں گے اور چکھو چلنے کا عذاب ۝

نَزَلَتْ فِي حَمْزَةٍ وَصَاحِبِيهِ وَعُتْبَةَ وَصَاحِبِيهِ يَوْمَ بَرَزُوا فِي يَوْمِ بَلَاءٍ [بخاری، التفسیر، باب ﴿هَذَا حَصَانٌ.....﴾: ۴۷۴۳-۳۰۳۳] ”وہ قسم کھا کر کہتے تھے کہ یہ آیت: ﴿هَذِهِ خُصْنٌ اخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ﴾ ان چھ آدمیوں حمزہ اور ان کے دوست تھی، عقبہ اور اس کے دوست تھیوں کے بارے میں اتنی تھی جو بدر کے دن ایک دوسرے کے مقابلے میں نکلے تھے۔“ اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”میں پہلا شخص ہوں جو قیامت کے دن اس جھگڑے کے لیے رحمان کے سامنے دونوں زانوں کے بل بیٹھوں گا اور اپنا مقدمہ پیش کروں گا۔“ [بخاری، التفسیر، باب ﴿هَذَا حَصَانٌ اخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ﴾: ۴۷۴۴] ان تینوں حضرات کے بعد قیامت تک آنے والے وہ تمام مجاہد بھی اس آیت میں شامل ہیں جنہوں نے توحید کی خاطر کفار سے جہاد کیا یا کریں گے۔

﴿قَالَتَيْنِ كَفَرُوا قُطِعَتْ لَهُمْ شِيَابٌ مِمَّنْ كَانُوا﴾: یعنی کافروں کے لیے آگ کے کپڑے کاٹے جا چکے۔ یہاں قیامت کے دن ہونے والے کام کو ماضی کے لفظ کے ساتھ بیان فرمایا، یعنی یہ کام اتنا یقینی ہے کہ بس ہو ہی چکا۔ آگ کے یہ کپڑے قیصوں کی صورت میں بھی ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَرَابِيلُهُمْ مِنْ قَطَرِ آيٍ﴾ [ابراہیم: ۵۰] ”ان کی قمیصیں گندھک کی ہوں گی۔“ اور نیچے اور اوپر والے پتھونوں اور لٹانوں کی صورت میں بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَهُمْ فِي جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقَهُمْ غَوَاشٍ﴾ [الأعراف: ۴۱] ”ان کے لیے جہنم ہی کا پتھون اور ان کے اوپر کے لحاف ہوں گے۔“

﴿يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ﴾: ”الْحَمِيمُ“ انتہائی گرم (کھولتا ہوا) پانی۔ مزید دیکھیے سورہ دخان (۲۸)۔

آیت 20 ﴿يُضَهَّرُ بِهِ مَا فِي بُطُونِهِمْ وَالْجُلُودُ﴾: ”صَهَّرَ (مَنَعَ) الشَّخْمَ“ اس نے چربی پگھلائی، یعنی ان کے سروں پر ایسا جلا اور کھول ہوا پانی اٹھایا جائے گا کہ جس کے ساتھ ان کے پیٹ کے اندر کی تمام چیزیں پگھل کر باہر نکل جائیں گی اور ان کے چمڑے بھی پگھل جائیں گے اور یہ عذاب مسلسل جاری رہے گا۔ جب بھی ان کے چمڑے گل مڑ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں ان کے علاوہ اور چمڑے بدل دے گا۔ دیکھیے سورہ نساء (۵۶)۔

آیت 21 ﴿وَلَهُمْ نَقَامُهُمْ مِنْ حديدٍ﴾: ”نَقَامُهُ“ ”مِقْمَعُ“ کی جمع ہے، ہتھوڑے۔

آیت 22 ﴿كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا.....﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ آگ کی لپٹ کے ساتھ اوپر آئیں گے اور چاہیں گے کہ جہنم کی شدید ٹھٹھن سے نکل جائیں تو آگ کی لپٹ کے نیچے جانے کے ساتھ وہ بھی دوبارہ نیچے چلے جائیں

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
يُحَلِّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَ لُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿۲۳﴾

بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، انہیں اس میں کچھ سونے کے نگلن پہنائے جائیں گے اور موتی بھی اور ان کا لباس اس میں ریشم

ہوگا ﴿۲۳﴾

گے۔ یہ مطلب اس لیے ہے کہ جہنمی تو زنجیروں میں جکڑے اور پروئے ہوئے ہوں گے، وہ خود کس طرح نکلنے کا ارادہ کر سکتے ہیں؟ فرمایا: ﴿وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ﴾ [ابراہیم: ۴۹] ”اور تو مجرموں کو اس دن زنجیروں میں ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے ہوئے دیکھے گا۔“ اور فرمایا: ﴿شَمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ﴾ [الحاقہ: ۳۲] ”پھر ایک زنجیر میں، جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے، پس اس (کافر) کو داخل کر دو۔“

﴿۲﴾ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ: یعنی ان سے یہ کہا جائے گا کہ جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو۔

آیت 23 ﴿۱﴾ إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا..... : ”يُحَلِّوْنَ“ ”حَلَّى يُحَلِّي تَحْلِيَةً“ (تفعلیل) سے مضارع

مجمول ہے۔ اسی سے ”حَلِيَّةٌ“ بمعنی زیور ہے۔ ”أَسَاوِرًا“ ”أَسْوِرَةٌ“ کی جمع ہے جو خود ”سوار“ کی جمع ہے۔ جمع الجمع ان نگلنوں کی کثرت اور حسن و خوبی کے بیان کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ ”مِنْ أَسَاوِرَ“ میں ”مِنْ“ تہمیش کے لیے ہے، یعنی کچھ نگلن سونے اور موتیوں کے ہوں گے اور کچھ ایسے ہوں گے جو تم نہیں جانتے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ نَأْيَ أَخْفَى لَهُمْ مِمَّنْ قُرَّةَ أَعْيُنٍ﴾ [السجدہ: ۱۷] ”پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے۔“ تو حیدر بانی کے بارے میں باہمی معرکہ آرا گروہوں میں سے ”الَّذِينَ كَفَرُوا“ کے عذاب کے ذکر کے بعد ”الَّذِينَ آمَنُوا“ کے ثواب کا ذکر ہو رہا ہے۔ ابتدا اس کی حرف تاکید ”إِنَّ“ سے ہے اور کفار کے ہر عذاب کے مقابلے میں اہل ایمان کے لیے کسی نہ کسی نعمت کا ذکر ہے۔ چنانچہ ”يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا“، ”كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا“ کے مقابلے میں ہے۔ ”تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ“، ”يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْعَمِيمُ“ کے مقابلے میں ہے۔ ”وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ“، ”قَطَّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِنْ نَاعٍ“ کے مقابلے میں ہے۔ ”يُحَلِّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ“، ”وَلَهُمْ فِيهَا مِمَّا مَدَّ يَدَايِهِمْ مِنْ ثَمَرَاتٍ مُتَمَثِّلِينَ“ کے مقابلے میں ہے اور ”هُدًى إِلَى الصَّالِحِينَ مِنَ الْقَوْلِ“، ”وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ“ کے مقابلے میں ہے، کیونکہ جنتیوں کے لیے طیب بات ”سلام“ ہے تو جہنمیوں کے لیے بری بات ”جلنے کا عذاب چکھو“ ہے۔

﴿۲﴾ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَ لُؤْلُؤًا: عورتوں کے لیے سونے اور موتیوں کے زیور تو معروف بات ہے، رہے مرد تو گزشتہ زمانے میں بادشاہ اور بڑے بڑے رئیس زینت اور اپنی شان و شوکت کے اظہار کے لیے نگلن اور موتی پہناتے تھے۔ اس آیت

و هُدُوا إِلَى الظَّيْبِ مِنَ النُّقُولِ ۖ وَ هُدُوا إِلَى صِرَاطِ الْحَمِيدِ ﴿۳۱﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

اور انھیں پاکیزہ بات کی طرف ہدایت کی گئی اور انھیں تمام تعریفوں کے مالک کے راستے کی طرف ہدایت کی گئی ﴿۳۱﴾ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور وہ اللہ کے راستے سے اور اس حرمت والی مسجد سے روکتے ہیں جسے ہم نے

سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اہل ایمان کو جنت میں شاہانہ لباس پہنایا جائے گا۔ مزید دیکھیے سورہ کہف (۳۱)۔

﴿۳۱﴾ وَ لِبَاسِهِمْ فِيهَا حَرِيرٌ: ”حَرِيرٌ“ سے مراد خالص ریشم ہے، جس کا استعمال مردوں کے لیے دنیا میں حرام ہے۔ انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ لَبَسَ الْحَرِيرَ فِي الدُّنْيَا فَلَنْ يَلْبَسَهُ فِي الْآخِرَةِ)) [بخاری، اللباس، باب لبس الحرير للرجال، ۵۸۳۲: ۷۳] ”جس شخص نے دنیا میں ریشم پہنا وہ اسے آخرت میں ہرگز نہیں پہنے گا۔“

آیت 24 ﴿۲۴﴾ وَ هُدُوا إِلَى الظَّيْبِ مِنَ النُّقُولِ: یعنی دنیا میں انھیں پاکیزہ بات کلمہ توحید ”لا الہ الا اللہ“ کی ہدایت عطا ہوئی اور انھیں تمام تعریفوں والے پروردگار کے راستے اسلام کی ہدایت ملی۔ اسی طرح آخرت میں انھیں اس مقام کی طرف لے جایا جائے گا جہاں وہ پاکیزہ کلام ہی سنیں گے، کوئی لغو یا گناہ کی بات کان میں نہیں پڑے گی۔ نہ جھگڑا ہوگا اور نہ کوئی بیک بک، ہر طرف سے سلام کی آواز آئے گی، فرمایا: ﴿لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا ۚ إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا﴾ [الواقعة: ۲۶، ۲۵] ”وہ اس میں نہ بے ہودہ گفتگو سنیں گے اور نہ گناہ میں ڈالنے والی بات، مگر یہ کہنا کہ سلام ہے، سلام ہے۔“ سلام کے علاوہ اللہ کی حمد ہوگی اور اس کی تسبیح۔ دیکھیے سورہ فاطر (۳۳-۳۵) اور زمر (۷۳، ۷۴)۔

آیت 25 ﴿۲۵﴾ وَ هُدُوا إِلَى صِرَاطِ الْحَمِيدِ: اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اہل جنت کو یہ سعادت حمد الہی کی وجہ سے حاصل ہوگی، فرمایا: ﴿دَعْوُهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۚ وَ أُخْرِجُوا عَنْهُمْ نَجْتٌ كَمَا دَعَوْهُمْ إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ [یونس: ۱۰] ”ان کی دعا ان میں یہ ہوگی ”پاک ہے تو اے اللہ!“ اور ان کی آپس کی دعا ان (باغات) میں سلام ہوگی اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہوگا کہ سب تعریف اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔“

آیت 25 ﴿۲۵﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ: ابن عاشور رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ”هُدُوا إِلَى صِرَاطِ الْحَمِيدِ“ کے مقابلے میں ہے کہ اہل ایمان کو اللہ (الْحَمِيدِ) کے راستے کی ہدایت عطا ہوئی، جب کہ کفار کا یہ حال ہے کہ وہ خود بھی راہ ہدایت اختیار کرنے کا انکار کر چکے ہیں اور لوگوں کو بھی اللہ کے راستے (اسلام) اور مسجد حرام سے مسلسل روک رہے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مومنوں کے لیے جنت اور کافروں کے لیے عذاب الیم ہے۔ ”کَفَرُوا“ ماضی ہے اور ”يَصُدُّونَ“ مضارع، یعنی وہ کافر تو گزشتہ زمانے سے ہو چکے، البتہ ان کا لوگوں کو اسلام سے اور مسجد حرام سے روکنے کا عمل مسلسل جاری ہے۔ ماضی پر مضارع کے عطف کی ایک اور مثال اس آیت میں ہے: ﴿أَلَّذِينَ آمَنُوا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ [الرعد: ۲۸] کفار مسلمانوں کو ہجرت سے پہلے بھی مسجد حرام میں آنے، نماز پڑھنے اور طواف کرنے سے روکتے تھے، (علق: ۹، ۱۰) اور ہجرت کے بعد بھی جب وہ سن ۶ ہجری میں عمرہ کرنے کے لیے آئے تو کفار نے انھیں عمرہ کرنے

وَيُصَدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً ۗ الْعَاكِفُ

سب لوگوں کے لیے اس طرح بنایا ہے کہ اس میں رہنے والے اور باہر سے آنے والے برابر ہیں اور جو بھی اس میں منع کر دیا۔ دیکھیے سورہ فتح (۲۶، ۲۵) اور بقرہ (۲۱۷) نتیجہ یہ کہ اللہ کے راستے سے روکنے کی وجہ سے کفار عذاب الیم کے حق دار ٹھہرے جب کہ مسلمان اللہ کے راستے (حِزَابِ الْحَبِیْبِ) پر چلنے کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔

② وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ اگرچہ اللہ کے راستے سے روکنے میں مسجد حرام سے روکنا بھی شامل تھا مگر اسے علیحدہ ذکر فرمایا۔ مقصود مسجد حرام کی عظمت کو نمایاں کرنا ہے اور اس مناسبت سے اس کی تعمیر، حج کی ابتدا، طواف اور دوسرے چند احکام، پھر قربانی، اس کی حکمت اور اہمیت کی طرف منتقل ہونا ہے۔

③ "الْعَاكِفُ" کا لفظی معنی "اپنے آپ کو روک کر رکھنے والا" ہے اور مراد مکہ کا باشندہ ہے، کیونکہ اس کے مقابلے میں "الْبَادِ" آ رہا ہے، یعنی "یادید" (باہر) سے آنے والا۔ کفار کے ظلم کا بیان ہے کہ وہ اس مسجد سے لوگوں کو روکتے ہیں جس میں عبادت، طواف، عمرہ اور حج کے لیے آنا سب لوگوں کا برابر حق ہے، خواہ مکہ کے رہائشی ہوں یا باہر سے آنے والے۔ جیورن بن مطعم بیعتنا بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ ! لَا تَمْنَعُوا أَحَدًا طَافَ بِهَذَا الْبَيْتِ وَصَلَّى آيَةً مَسَاعَةً شَاءَ مِنْ لَيْلٍ أَوْ نَهَارٍ » (ترمذی، الحج، باب ما جاء في الصلاة بعد العصر : ۸۶۸) "اے بنی عبد مناف! کسی شخص کو مت روکو جو رات یا دن کی کسی گھڑی میں اس گھر کا طواف کرنا چاہے یا (اس میں) نماز پڑھنا چاہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ مسجد حرام میں نماز کے منوعہ اوقات میں بھی نماز اور طواف جائز ہے۔

④ تیسیر القرآن میں ہے کہ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے حقوق ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ اور باہر سے آنے والے لوگوں کو برابر کے حصے دار قرار دیا ہے اور آیا ان حقوق کا اور ان کی برابری کا تعلق صرف بیت الحرام یا کعبہ سے ہے یا پورے حرم مکہ سے؟ جہاں تک صرف بیت اللہ کا تعلق ہے اور اس میں نماز، طواف اور ارکان حج بجالانے کا تعلق ہے تو اس میں اہل مکہ اور بیرونی حضرات کے اس حق عبادت میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ اہل مکہ کو قطعاً یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ بیرونی حضرات کو حرم میں داخل ہونے، نمازیں ادا کرنے، طواف کرنے یا ارکان حج و عمرہ بجالانے سے روکیں، کیونکہ اس حق میں اہل مکہ اور بیرونی حضرات سب برابر کے حصے دار ہیں۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا اس حق کا تعلق پورے حرم مکہ سے بھی ہے یا نہیں؟ یعنی کیا پورے حرم مکہ کے دروازے باہر سے آنے والے حضرات کے لیے کھلے رہنے چاہئیں کہ وہ جب چاہیں حرم مکہ کے اندر موجود جس جگہ چاہیں آ کر ڈیرے ڈال دیں اور رہیں سہیں اور ان سے کوئی کرایہ وغیرہ بھی وصول نہ کیا جائے؟ اس اختلاف کی دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ ارکان حج میں سے بیشتر کا تعلق صرف بیت اللہ سے نہیں بلکہ حرم مکہ سے ہے۔ صفا، مردہ، منی، مزدلفہ، مشعر حرام سب بیت اللہ کی حدود سے باہر ہیں، جب کہ حرم مکہ میں داخل ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود بعض مقامات پر مسجد حرام کا ذکر کر کے اس سے حرم مکہ مراد لیا ہے، مثلاً ارشاد باری ہے: ﴿ ذَٰلِكَ لَعْنُ لُحَدِّ

فِيهِ وَالْبَادِ وَمَنْ يَرِدْ فِيهِ بِالْحَادِ يَظْلَمُ نَفْسَهُ مِنْ عَذَابِ إِلِيهِ ۖ

کسی تم کے ظلم کے ساتھ کسی کج روی کا ارادہ کرے گا ہم اسے دردناک عذاب سے مزہ چکھائیں گے ﴿۷۵﴾

يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴿البقرة: ۱۹۶﴾ ”یہ (رعایت) اس شخص کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں۔“ اور یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی شخص مسجد حرام کے اندر رہائش پذیر نہیں ہوتا، یہاں لازماً مسجد حرام سے مراد حرم مکہ ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَصَدَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفِّرَ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجِ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ﴾ ﴿البقرة: ۲۱۷﴾ ”اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک (ماہ حرام میں جنگ کرنے سے) زیادہ بڑا ہے۔“

پھر اس سے اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا حرم میں زمین اور مکان کی خرید و فروخت اور اس سے آگے ان کی ملکیت و وراثت بھی جائز ہے یا نہیں؟ تو یہ بات تو صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ اسلام سے پہلے مکہ کے مکانات اور زمینوں پر لوگوں کے ملکیت و وراثت اور بیچنے اور کرایہ پر دینے کے حقوق قائم تھے جو اسلام کے بعد بھی قائم رہے، اسلام نے انہیں منسوخ نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد عقیل نے آپ ﷺ کے مکان پر قبضہ کر لیا، پھر اسے بیچ بھی دیا، چنانچہ حیدر الوداع کے موقع پر آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «وَهَلْ تَرَكَ عَقِيلٌ مِنْ رِبَاعِ أُوْءُورٍ» [بخاری، الحج، باب توريث دور مكة و بيعها و شرائها.....: ۱۵۸۸] ”کیا عقیل نے ہمارا کوئی مکان چھوڑا بھی ہے (جس میں ہم رہیں؟)“ نیز عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں نافع بن عبد الحارث نے مکہ میں صفوان بن امیہ سے ایک گھر جیل خانہ بنانے کے لیے اس شرط پر خریدا کہ اگر عمر رضی اللہ عنہما اس خریداری کو منظور کریں گے تو بیچ پوری ہوگی، بصورت دیگر صفوان کو چار سو دینار مل جائیں گے۔ [بخاری، فی الخصومات، باب الربط والحبس فی الحرم، قبل ح: ۲۴۲۳] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حرم میں مکانوں کی خرید و فروخت جائز ہے (وہ چار سو دینار عمر رضی اللہ عنہما کا حکم آنے تک کے عرصے کا کرایہ شمار ہوں گے یا اتنی دیر تک فروخت سے روک رکھنے کا زرتلانی)۔ کچھ حضرات نے بخاری کی صحیح روایات کے مقابلے میں ضعیف روایات کے ساتھ مکہ کے مکانات کی خرید و فروخت اور انہیں کرایہ پر دینے کو حرام ٹھہرایا ہے، ان روایات میں سے ایک بھی صحیح سند کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں، کوئی منقطع ہے، کوئی مرسل اور کسی میں کوئی راوی ضعیف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کے قول سے دین کا مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مکہ کے مکانوں کا کرایہ نہ لینا مستحب ہے، تاہم اس کے جواز سے انکار مشکل ہے اور امام بخاری رضی اللہ عنہ کا اپنا موقف یہ ہے کہ حرم مکہ میں مکانوں کی خرید و فروخت اور وراثت وغیرہ جائز ہے، جیسا کہ عنوان ”بَابُ تَوْرِيْثِ دُوْرٍ مَكَّةَ وَ بَيْعِهَا وَ شَرَايِهَا“ (اس بات کا بیان کہ مکہ میں موجود مکانات میراث ہو سکتے ہیں اور ان کی خرید و فروخت جائز ہے) سے معلوم ہو رہا ہے۔

﴿۷۵﴾ وَمَنْ يَرِدْ فِيهِ بِالْحَادِ يَظْلَمُ نَفْسَهُ : ”الْحَادُ“ سیدھے راستے سے ہٹ جانا۔ ظلم کا لفظ عام ہے جس میں سب سے پہلے کفر و شرک آتا ہے، پھر کوئی بھی کام کرنا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، یا کوئی کام ترک کرنا جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم

وَ إِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَ طَهَّرْ بَيْتِي لِلطَّائِفِينَ

اور جب ہم نے ابراہیم کے لیے بیت اللہ کی جگہ متعین کر دی کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کر اور میرے گھر کو طواف دیا ہے، اس میں بدعت بھی شامل ہے اور گناہ کا کوئی اور کام بھی، مثلاً حرم کی حرمت کا خیال نہ رکھنا، یعنی حرم کے جانوروں کو ذبح کرنا، اس کے درختوں کو کاٹنا، کسی کی گم شدہ چیز اٹھانا، الا یہ کہ اسے استعمال نہ کرے اور اس کا اعلان ہمیشہ کرتا رہے، اس میں ذخیرہ اندوزی کرنا۔ غرض دوسری جگہوں میں ٹیڑھی راہ اختیار کرنا عذاب الیم کا باعث ہے مگر حرم مکہ میں اس کا ارادہ بھی عذاب الیم کا باعث ہے۔

آیت 26 ﴿١﴾ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ: ”بَوَّأْنَا“ (تفعلیل) جگہ دینا، جگہ مقرر کرنا، یعنی وہ وقت یاد کرو

جب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے بیت اللہ کی جگہ متعین کی۔ بیت اللہ اس سے پہلے تعمیر ہو چکا تھا، بلکہ زمین پر اللہ کا سب سے پہلا گھر یہی تھا اور ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے آدم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔ اب اللہ بہتر جانتا ہے کہ بیت اللہ کی پہلی تعمیر آدم علیہ السلام نے کی یا اس سے پہلے فرشتوں نے اسے تعمیر کیا تھا۔ ایک ٹیلے پر اس کی بنیادیں موجود تھیں جس پر ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام نے کعبہ کی عمارت تعمیر فرمائی۔ صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی لمبی حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ایک اونچی جگہ تعمیر ہوا تھا۔ چنانچہ اس حدیث میں زمزم کے نمودار ہونے کے بعد فرشتے کے ام اسماعیل علیہ السلام کو تسلی دینے کا ذکر ہے: «فَقَالَ لَهَا الْمَلَكُ لَا تَخَافُوا الضَّبْعَةَ فَإِنَّ هَهُنَا بَيْتَ اللَّهِ، يَبْنِي هَذَا الْعُلَامُ وَأَبُوهُ وَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَهْلَهُ وَكَانَ الْبَيْتُ مُرْتَفِعًا مِنَ الْأَرْضِ كَالرَّابِيَةِ تَأْتِيهِ السُّيُُولُ فَتَأْخُذُ عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ فَكَانَتْ كَذَلِكَ حَتَّى مَرَّتْ بِهِمْ رُفْقَةٌ مِنْ جُرْهُمِ» [بخاری، الأنبياء، باب ﴿يُوفُونَ﴾: ۳۳۶۴]

”تو فرشتے نے اس سے کہا، تم ضائع ہونے سے مت ڈرو، کیونکہ یہاں اللہ کا گھر ہے، یہ لڑکا اور اس کا باپ اسے بنائے گا اور اللہ اس کے رہنے والوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ بیت اللہ زمین سے ٹیلے کی طرح بلند تھا، سیلاب آتے اور اس کے دائیں بائیں طرف ہو جاتے۔ ام اسماعیل ایسے ہی رہیں، حتیٰ کہ جبرہم قبیلے کے کچھ لوگ ان کے پاس سے گزرے۔“ اس حدیث کے آخر میں بیت اللہ کی تعمیر کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زمزم کے نمودار ہونے کے وقت بھی ایک ٹیلے پر بیت اللہ موجود تھا مگر اس کی ازسرنو تعمیر اسماعیل علیہ السلام کے جوان ہونے پر ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام نے کی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۲۷) کی تفسیر۔

﴿٢﴾ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا.....: ”الْوَكْرُ“ ”رَاسِعٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”سُحْدٌ“ ہے۔ ”السُّجُودُ“ ”سَاجِدٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”رَاقِدٌ“ اور ”جَالِسٌ“ کی جمع ”رُقُودٌ“ اور ”جُلُوسٌ“ ہے۔ طواف کا معنی کسی چیز کے گرد پھرنا، چکر لگانا ہے۔ یعنی اس گھر کی بنیاد خالص توحید پر رکھو، ہر شخص یہاں آ کر صرف اللہ کی عبادت کرے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ مگر

وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعَ الشُّجُودِ ۝ وَادِّعُ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ

کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع، سجود کرنے والوں کے لیے پاک کر ۱۶ اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے،

کفار مکہ نے اس کے گرد تین سو ساٹھ بت رکھ دیے جن کا وہ طواف کرتے تھے، اب بھی کئی مسلمان کہلانے والے قبروں اور آستانوں کا طواف کرتے ہیں، حالانکہ طواف اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے ایک گھر کا رکھا ہے، جسے کعبۃ اللہ کہتے ہیں، اس کے سوا کسی جگہ کا یا شخص کا طواف جائز نہیں۔ کعبہ کو ”عَبِيَّةٌ“ (میرا گھر) کہنے میں اس کی جو شان بیان ہوئی ہے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی بیت اللہ کی تعمیر کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ اور میرے گھر کو طواف، قیام، سجدہ اور رکوع کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو۔ بیت اللہ کو صاف ستھرا رکھنے سے مراد عام صفائی کے علاوہ شرک و بت پرستی سے پاک صاف رکھنا ہے۔ اس سے مشرکین کو عار دلانا مقصود ہے کہ یہ شرط تو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے چلی آتی ہے کہ اس میں بت پرستی حرام ہے۔ نیز دیکھیے سورہ بقرہ (۱۲۵) کی تفسیر۔

آیت 27 ۝ **وَادِّعُ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ** ... حج کا لفظی معنی قصد ہے، مراد اللہ کے گھر کا قصد ہے، اس نیت سے کہ وہ

قوی، بدنی اور مالی عبادات ادا کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے یہاں مقرر فرمائی ہیں۔ ”رِجَالًا“ ”رَاجِلًا“ کی جمع ہے، جیسے ”خَائِمًا“ کی جمع ”خَائِمَاتٌ“ ہے، یعنی پیدل چلنے والے۔ ”خَاصِرًا“ سواری کا وہ جانور جسے چارے کی قلت اور سفر نے تھکا کر دلا کر دیا ہو۔ ”فَجَّحًا“ دو پہاڑوں کے درمیان کھلے راستے کو کہتے ہیں، مکہ کے راستے میں اکثر پہاڑوں سے گزر ہوتا ہے، اس لیے اس کے راستوں کو ”فَجَّحًا“ کہہ دیا ہے۔ ”عَبِيَّةٌ“ کا لفظی معنی گہرا ہے، مراد دور کا سفر ہے، دور کی مسافت کو کنویں کی گہرائی سے مشابہت دی ہے۔ پنجابی میں اسے ”ڈو تکلے چنڈے“ کہتے ہیں۔

۲ حج کے اعلان سے پہلے اپنے گھر کو طواف، قیام، رکوع اور سجدہ کرنے کے لیے آنے والوں کی خاطر پاک صاف کرنے کا حکم دیا۔ معلوم ہوا مہمانوں کی آمد سے پہلے گھر کی صفائی ہونی چاہیے۔

۳ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو کعبہ کی تعمیر کے بعد حکم دیا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کرو، دو تمھارے پاس پیدل اور ان بے شمار سواریوں پر سوار ہو کر آئیں گے، جو بہت گہرے اور در دراز راستوں کو طے کرتی ہوئی آئیں گی اور سفر کی دوری کی وجہ سے لاغر ہو چکی ہوں گی۔ ”كُلُّ خَاصِرًا“ سے مراد لاغر سواریوں کی کثرت ہے، کیونکہ ہر لاغر سواری تو مکہ نہیں جاتی۔ عربی میں ”مُكَلٌّ“ کا لفظ کثرت کے لیے بھی آتا ہے، جیسا کہ عنترہ کے ان شعروں میں ”مُكَلٌّ“ کا لفظ تین دفعہ کثرت کے معنی میں آیا۔

جَادَتْ عَلَيْهِ كُلُّ بَكْرَةٍ حَرَّةٍ فَتَرَكُنْ كُلَّ قَرَارَةٍ سَكَاةً زَهْمِ
سَحَا وَ نَسْكَابًا فَكُلُّ غَيْبِيَّةٍ نَجْرِي عَلَيْهَا الْمَاءُ لَمْ يَنْصُرْهُ

(ابن عاشور)

ابراہیم علیہ السلام نے یہ اعلان کیسے کیا؟ اس کے متعلق تفسیر ابن کثیر میں ہے: ”جب اللہ تعالیٰ نے حج کی دعوت کے لیے اعلان

ضَامِرٌ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿۲۷﴾

پیدل اور ہر لاغر سواری پر آئیں گے، جو ہر دور دراز راستے سے آئیں گی ﴿۲۷﴾

کرنے کا حکم دیا تو ذکر کیا جاتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی، پروردگارا! میں لوگوں تک یہ پیغام کیسے پہنچاؤں، میری تو آواز ہی ان تک نہیں پہنچے گی؟ فرمایا، تم منادی کرو، پیغام پہنچانا ہمارا کام ہے۔ تو آپ نے اپنے مقام پر، بعض نے کہا پتھر پر، بعض نے کہا صفا پر اور بعض نے کہا جبل ابی قیس پر کھڑے ہو کر اعلان کیا: ”لوگو! تمہارے رب نے گھر بنایا ہے، تم اس کا حج کرو۔“ کہا جاتا ہے کہ پہاڑ جھک گئے، حتیٰ کہ یہ آواز زمین کے کناروں تک پہنچ گئی اور جو ماؤں کے شکم یا باپوں کی پشت میں تھے ان کے کانوں میں بھی پہنچ گئی۔ ہر پتھر، لہنت یا درخت جس نے اسے سنا اس نے بھی اور جس شخص کے متعلق اللہ نے قیامت تک حج کرنا لکھا تھا، سب نے جواب میں کہا: ”لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ“ یہ ان روایتوں کا مضمون ہے جو ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر اور کئی ایک سلف سے آئی ہیں۔ (واللہ اعلم) ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے انھیں پورے طول سے نقل کیا ہے۔“

ابن کثیر رحمہ اللہ کے بیان سے ظاہر ہے کہ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کوئی بات مروی نہیں، اور نقل کردہ روایات میں ”ذکر کیا جاتا ہے“، ”بعض نے کہا“، ”کہا جاتا ہے“ اور ”واللہ اعلم“ کے الفاظ ابن کثیر کی ان روایات کی صحت میں تردد کو ظاہر کر رہے ہیں۔ تابعین نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس اعلان کے وقت وہاں موجود نہیں تھے اور نہ انھوں نے اپنا ذریعہ بتایا ہے۔ رہی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت تو اس کے متعلق تفسیر ابن کثیر کے محقق و کتور حکمت بن بشر لکھتے ہیں کہ اسے ابن ابی شیبہ (مصنف: ۵۱۸/۱) اور حاکم (المستدرک: ۲/۳۸۸) دونوں نے جریر بن قابوس عن ابیہ عن ابن عباس کے طریق سے مختصراً بیان کیا ہے، حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، لیکن قابوس ”کَبِيْرُ الْحَدِيْثِ“ (کمزور حدیث والا) ہے، جیسا کہ تقریب میں ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت ثابت بھی ہو تو معلوم نہیں انھوں نے یہ کہاں سے لی ہے؟ کیونکہ نہ خود اس وقت موجود تھے اور نہ انھوں نے اسے رسول اللہ ﷺ سے بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ابراہیم علیہ السلام کی آواز ساری دنیا اور تمام ارواح تک پہنچانا کچھ مشکل نہیں، مگر یہ بات کسی معتبر طریقے سے ثابت ہونا ضروری ہے۔ ابن عاشور رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام ”رَسَالَةً“ تھے، یعنی بہت سفر کیا کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے حسب استطاعت اس حکم پر عمل کیا اور ہر اس مقام پر حج کا اعلان کیا جہاں وہ اپنے سفروں کے دوران گزرے یا پہنچے۔ پھر ان کے بعد ہمارے نبی کریم ﷺ نے یہ اعلان فرمایا، اب دنیا کا کوئی کونا ایسا نہیں جہاں یہ اعلان نہ پہنچا ہو اور جہاں سے لوگ سفر کر کے حج کے لیے نہ پہنچتے ہوں۔ سعودی حکومت کا اندازہ ہے کہ دس پندرہ سال تک حاجیوں کی تعداد سالانہ ایک کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ سارا سال عمرہ کے لیے آنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ”يَأْتُوْكَ رِبَّآلًا“ (تیرے پاس آئیں گے) سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ہر سال حج کے موقع پر خود وہاں موجود ہوتے تھے، یا مراد ہے کہ حج پر جانے والا ہر شخص ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر گویا انھی کے پاس جاتا ہے۔

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَةٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَيْمَاتٍ

تاکہ وہ اپنے بہت سے فائدوں میں حاضر ہوں اور چند معلوم دنوں میں ان پانچ چوپاؤں پر اللہ کا نام ذکر کریں جو

آیت 28 ﴿لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ یعنی لوگ پیدل اور سوار ہو کر حج کے لیے آئیں گے، تاکہ وہ اپنے بہت سے

فائدوں میں حاضر ہوں۔ حج کا اصل مقصد تو عبادت کے ذریعے سے دینی اور اخروی فوائد حاصل کرنا ہے، لیکن ضمناً اس میں

بہت سے دنیوی اور ملی فوائد بھی پائے جاتے ہیں۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حج و عمرہ کے دینی و دنیوی فوائد دونوں

ذکر فرمائے ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿تَابِعُوا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ فَإِنَّهُمَا يُنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوبَ كَمَا يُنْفِي الْكَبِيرُ خَبَثَ

الْحَدِيدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ﴾ [ترمذی، الحج، باب ما جاء في ثواب الحج والعمرة: ۸۱۰، عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ]

”حج اور عمرہ پے در پے کیا کرو، کیونکہ یہ فقر اور گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے اور سونے چاندی کے

میل کچیل کو دور کر دیتی ہے۔“ دینی فوائد میں بہت بڑا فائدہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کا حصول ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے

فرمایا: ﴿الْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِّمَا بَيْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ﴾ [بخاری، الحج، باب

وجوب العمرة وفضلها: ۱۷۷۳۔ مسلم: ۱۳۴۹] ”عمرہ سے لے کر عمرہ، دونوں کے درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہے اور حج

مبرور کی جزا جنت کے سوا کچھ نہیں۔“ گناہوں کی معافی بھی بہت بڑا نفع ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿مَنْ حَجَّ لِلَّهِ فَلَمْ

يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ﴾ [بخاری، الحج، باب فضل الحج المبرور: ۱۵۲۱، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ۔

مسلم: ۱۳۵۰] ”جو شخص حج کرے، نہ کوئی شہوانی فعل کرے اور نہ کوئی نافرمانی کرے تو واپس اس طرح (گناہوں سے پاک

ہو کر) جائے گا جس طرح اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جاتا تھا۔“ رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

﴿أَمَا عَلِمْتُمْ أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِيكُمْ مَا كَانَ قَبْلَهُ وَأَنَّ الْهَجْرَةَ تَهْدِيكُمْ مَا كَانَ قَبْلَهَا وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِيكُمْ مَا كَانَ قَبْلَهُ﴾ [مسلم،

الإيمان، باب كون الإسلام يهدم ما قبله: ۱۲۱۱] ”کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں کہ اسلام اپنے سے پہلے (گناہوں) کو گرا

دیتا ہے اور یہ کہ ہجرت اپنے سے پہلے (گناہوں) کو گرا دیتی ہے اور یہ کہ حج اپنے سے پہلے (گناہوں) کو گرا دیتا ہے۔“

حج کے فوائد میں سے سب سے بڑا فائدہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا جمع ہونا اور اس بات کا مظاہرہ ہے کہ ہم سب ایک

امت ہیں، کالے، گورے، سرخ اور زرد کسی کو کسی پر رنگ یا زبان کی وجہ سے برتری حاصل نہیں، سب بھائی بھائی ہیں۔ اس

موقع پر سب کا ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہونا اور مشکل میں گرفتار اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے سوچنا اور اس کا

بندوبست کرنا ہے۔ ان فوائد میں سے ایک فائدہ اس موقع پر تجارت، صنعت، مزدوری وغیرہ کے ذریعے سے حلال روزی کمانا

بھی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن مَّرْكَتِكُمْ﴾ [البقرة: ۱۹۸] ”تم پر کوئی گناہ نہیں

کہ اپنے رب کا کوئی فضل تلاش کرو۔“ یہ مسلمانوں کی بین الاقوامی مصنوعات اور پیداوار سے آگاہی اور تمام دنیا کی باہمی

الْأَنْعَامِ ۚ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ﴿۸﴾

اس نے اٹھیں دیے ہیں، سوان میں سے کھاؤ اور تنگ دست محتاج کو کھلاؤ ﴿۸﴾

بھی حج کے فوائد میں سے بہت بڑا فائدہ ہے۔ پھر اس سفر کے دوران دنیا کے مختلف علاقوں اور لوگوں کے حالات سے واقفیت بھی بہت بڑا علم ہے جو حج کی برکات میں سے عظیم برکت ہے۔ خلاصہ یہ کہ حج مسلمانوں کے بے شمار سیاسی، اقتصادی، معاشی اور تمدنی فوائد کا جامع ہے۔

﴿۲﴾ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي آيَاتِهِ مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ: قرآن مجید کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ چوپاؤں پر اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے مراد انھیں ”بِسْمِ اللَّهِ وَاللَّهُ أَكْبَرُ“ پڑھ کر ذبح کرنا ہے۔ دیکھیے سورہ انعام (۱۱۸-۱۲۱) یہاں حج کا ایک مقصد یہ بیان فرمایا کہ حج کرنے والے حضرات چند معلوم دنوں میں ان پالتو چوپاؤں پر اللہ کا نام ذکر کریں جو اس نے انھیں دیے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کی نعمت بھی یاد دلائی ہے۔ یہ ”آيَاتِهِ مَعْلُومَاتٍ“ (چند معلوم دن) کون سے ہیں؟ بعض بڑے بڑے جلیل القدر حضرات نے اس سے مراد ذوالحجہ کے پہلے دس دن اور سورہ بقرہ (۲۰۳) میں ”آيَاتِهِ مَعْلُومَاتٍ“ سے مراد ایام تشریق لیے ہیں؟ مگر بقول مفسر امین شفق علی صاحب اسواء البیان: ”ان حضرات کی جلالت قدر کے باوجود ان کا موقف درست نہیں، بلکہ درست بات ان حضرات کی ہے جو اس سے یوم النحر (دس ذوالحجہ) اور اس کے بعد والے دو یا تین دن مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ اس آیت میں چند معلوم دنوں میں قربانی کا ذکر ہے، جب کہ ذوالحجہ کے پہلے دس دنوں میں صرف ایک دن (دس ذوالحجہ) کو قربانی ہوتی ہے (حالانکہ ”مَعْلُومَاتٍ“ کم از کم تین ہونے چاہئیں)۔ خلاصہ یہ کہ ان ”آيَاتِهِ مَعْلُومَاتٍ“ سے مراد وہ دن ہیں جن میں قربانی کی جاتی ہے اور وہ یوم النحر اور اس کے بعد دو دن یا تین دن ہیں۔“ یوم النحر کے بعد پورے ایام تشریق (۱۱، ۱۲، ۱۳) یعنی چار دن میں قربانی کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: ﴿كُلُّ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ ذَبْحٌ﴾ ”ایام تشریق سارے ذبح کے دن ہیں۔“ شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”مَنَاسِكُ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ“ میں فرمایا کہ اسے احمد نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے اور یہ میرے نزدیک اپنے مجموع طرق کے ساتھ قوی ہے، اسی لیے میں نے اسے سلسلہ صحیح (۲۲۷۶) میں درج کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان چار دنوں میں اللہ کی عطا کردہ بہت بڑی نعمت پالتو جانوروں کو اس کے نام پر قربان کرنا حج کے مقاصد میں سے ایک بہت بڑا مقصد ہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ﴿أَيُّ الْحَجِّ أَفْضَلُ؟ قَالَ الْعَجُّ وَالشَّحُّ﴾ [ترمذی، الحج، باب ما جاء في فضل التلبية والنحر: ۸۲۷] ”حج کی کون سی چیز افضل ہے؟“ فرمایا: ”(بلیک کے ساتھ) آواز بلند کرنا اور خون بہانا (قربانی کرنا)۔“

﴿۳﴾ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعُوا: اس سے پہلے حج کرنے والوں کا ذکر غائب کے صیغوں کے ساتھ ہے، اب انھیں مخاطب کر لیا ہے کہ چوپائے جو میں نے تمہیں عطا کیے اور تم نے میرے نام پر قربان کیے، اب میری اس نعمت کا تقاضا ہے کہ خود بھی کھاؤ اور تنگ دست فقیر کو بھی کھلاؤ۔ ”الْبَائِسَ“ کا معنی ہے جو مالی طور پر تنگ دست ہو۔ فقیر بھی وہی ہے، صرف فقیر کی بد حالی

ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلِيُوفُوا نُدُورَهُمْ وَ لِيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿۲۹﴾

پھر وہ اپنا میل پکیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا خوب طواف کریں ﴿۲۹﴾

پر رحم کو بھرانے کے لیے ”الْفَقِيْرَ“ سے پہلے ”الْبَائِسَ“ ذکر فرمایا، کیونکہ فقیر کا لفظ تو عام استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ غنی کو نہیں کھلا سکتے، بلکہ یہ فقرا، کو کھلانے کی تاکید کے لیے ہے، اغنیاء کو کھلانے کا ذکر آیت (۳۶) میں آ رہا ہے۔ خود کھانے کا حکم اس لیے دیا کہ مشرکین اپنی قربانی میں سے نہیں کھاتے تھے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ خود کھانے کا حکم وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب یا رخصت کے لیے ہے، یعنی تمہیں خود بھی کھانے کی اجازت ہے، ضروری نہیں کہ کھاؤ۔ بہر حال امر کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہو سکے تو اپنی قربانی کا گوشت خود بھی کھانا چاہیے، جیسا کہ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «أَنَّ الْبَدْنَ النَّبِيَّ نَحَرَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ مِنْهُ بَدَنَةٌ نَحَرَ بِنْدَةَ ثَلَاثًا وَسِتِّينَ وَنَحَرَ غَلِيْبٍ مَا غَيْرَ وَأَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ كُلِّ بَدَنَةٍ بِبَضْعَةٍ فَجُعِلَتْ فِي قَدْرِ ثُمَّ شَرَبْنَا مِنْ مَرْفَعِهَا» [مسند أحمد: ۳۳۱/۳، ج: ۱، ۱۷۵۶۱] وہ اونٹ جو رسول اللہ ﷺ نے خر کیے، ایک سوانٹ تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے تریسٹھ (۶۳) اونٹ خر کیے اور باقی علی بن ابی طالب نے کیے اور نبی ﷺ نے ہر اونٹ کا ایک ایک ٹکڑا لینے کا حکم دیا جو ایک دیگ میں ڈالے گئے، پھر دونوں نے اس کا کچھ شور مچایا۔“ شعیب ابن ادوہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

آیت 29 ﴿۱﴾ ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفَثَهُمْ : ”تَفَثٌ“ کے دو معنی کیے گئے ہیں، ایک میل پکیل اور دوسرا مناسک حج۔ پہلے معنی

کے مطابق ترجمہ ہوگا ”پھر وہ اپنا میل پکیل دور کریں۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ احرام باندھنے کے ساتھ ہی سلعے ہوئے کپڑے پہننا، بال یا ناخن کٹوانا اور خوشبو لگانا حرام ہو جاتا ہے۔ صرف دو چادریں ہوتی ہیں، سرنگا ہوتا ہے اور زیادہ مل مل کر غسل نہیں کرنا ہوتا، اس مسافرانہ اور فقیرانہ حالت میں بدن پر میل پکیل چڑھ جاتا ہے۔ دس محرم کو جمرہ عقبہ کو نکل مارنے کے بعد بیوی سے مباشرت کے سوا احرام کی تمام پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ میل پکیل دور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پھر وہ سر کے بال منڈوائیں یا کتروائیں اور ناخن وغیرہ صاف کریں، پھر غسل کر کے سلعے ہوئے کپڑے پہن لیں۔ اگر کسی نے قربانی کرنی ہو تو بہتر ہے احرام کھولنے سے پہلے کر لے، اگر احرام کھول کر قربانی کرے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ احرام کھول کر، سلعے ہوئے کپڑے پہن کر بیت اللہ کے طواف کے لیے روانہ ہو جائیں۔ اس طواف کا نام طواف زیارت اور طواف افاضہ ہے، یہ حج کا رکن ہے اور اس کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا۔ اس طواف کے بعد احرام کی آخری پابندی بھی ختم ہو جاتی ہے اور بیوی سے مباشرت حلال ہو جاتی ہے۔ دوسرے معنی کے مطابق ترجمہ ہوگا ”پھر وہ اپنے حج کے اعمال پورے کریں اور اپنی نذریں پوری کریں۔“

﴿۲﴾ وَلِيُوفُوا نُدُورَهُمْ : یعنی فریضہ حج کے اعمال سے زائد کسی عمل کی نذر مانی ہو تو وہ پوری کریں، مثلاً زائد طواف یا مسجد حرام میں اعتکاف یا زائد قربانی یا نفل نماز یا صدقہ یا قرآن کی تلاوت وغیرہ۔

﴿۳﴾ وَلِيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ : ”طَافَ يَطُوفُ طَوَافًا“ (ن) کسی چیز کے گرد پھرنا، چکر لگانا۔ ”وَلِيَطَّوَّفُوا“ باب تفعّل

ذَلِكَ ۚ وَ مَنْ يُعَظِّمْ حُرْمَتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ ۗ وَأُحِلَّتْ لَكُمْ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُشْبِهُ عَلَيْكُمْ فَاَجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ ﴿۳۰﴾

یہ اور جو کوئی اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کرے تو وہ اس کے لیے اس کے رب کے ہاں بہتر ہے اور تمہارے لیے مویشی حلال کر دیے گئے ہیں سوائے ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ پس جنوں کی گندگی سے بچو اور

جھوٹی بات سے بچو ﴿۳۰﴾

سے ہے جو اصل میں "لَيْتَطَوَّفُوا" تھا، حروف کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی بیت اللہ کا خوب طواف کریں، فرض طواف کے علاوہ نفل طواف بھی کثرت سے کریں۔ یا باب تفعل سے طواف کی مشکل کی طرف اشارہ ہے، جو اس دن حاجیوں کے بے پناہ جھوم کی وجہ سے پیش آتی ہے کہ اسے برداشت کرتے ہوئے کعبہ اللہ کا طواف کریں۔

﴿۳۱﴾ بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ : عتیق کا معنی قدیم ہے۔ زمین پر اللہ کا پہلا تعمیر کیا جانے والا گھر ہونے کی وجہ سے اس کا نام "الْبَيْتِ الْعَتِيقِ" ہے۔ عتیق کا دوسرا معنی آزاد ہے، یعنی اللہ کے سوا اس کا مالک کوئی نہیں جو اس میں آنے سے کسی کو روک سکے۔ یہ ہر آقا کے تسلط سے آزاد ہے۔ یہ مشرکین کا ظلم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے آنے والے مسلمانوں کو اس سے روکتے ہیں۔ آزاد کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس پر کبھی کوئی جابر مسلط نہیں ہو سکا، جیسا کہ اصحاب الفیل کا واقعہ معروف ہے۔ جو ظالم بھی اس گھر پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرے گا اس کا یہی حال ہو گا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَعْرُؤُ حَيْشُ الْكَعْبَةِ فَإِذَا سَكَنُوا بَيْنَهُمَا مِنَ الْأَرْضِ يُخَسِّفُ بِأَوْلِيهِمْ وَأَجْرِهِمْ» [بخاری، النبی، باب ما ذکر فی الاسواق: ۲۱۱۸] "ایک لشکر کعبہ سے جنگ کے لیے آئے گا، جب وہ بیدار (مکہ کے باہر کلمے میدان) میں پہنچیں گے تو سب کے سب اول سے آخر تک زمین میں دھنسا دیے جائیں گے۔" اور آپ ﷺ نے فرمایا: «لِيُخَسِّنَ الْبَيْتَ وَيُعْتَمِرَ بَعْدَ حُرُوجِ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ» [بخاری، الحج، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ...﴾: ۱۰۹۳] "یا جوج ماجوج کے خروج کے بعد بھی بیت اللہ کا حج اور عمرہ جاری رہے گا۔" علامات قیامت بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: «يُحْرَبُ الْكَعْبَةُ ذُو السُّوَيْفَتَيْنِ مِنَ الْحِشَّةِ» [بخاری، الحج، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿جَعَلَ اللَّهُ...﴾: ۱۰۹۱] "(قیامت کے قریب) ایک تپتی پندلیوں والا حشیش بیت اللہ کو گرا دے گا۔" مزید فرمایا: «كَأَنِّي بِهِ أَفْصَحُ يَفْلَعُهَا حَجْرًا حَجْرًا» [بخاری، الحج، باب هدم الكعبة: ۱۰۹۵] "گویا میں وہ دیکھ رہا ہوں، کالا ٹیزھے پاؤں والا ہے، اسے ایک ایک پتھر کر کے اکٹھا رہا ہے۔"

آیت 30 ﴿۳۰﴾ ذٰلِكَ : یہ لفظ دو کلاموں کے درمیان فاصلے کے لیے آتا ہے اور اس سورت میں تین دفعہ آیا ہے۔ ایک یہ، ایک آیت (۳۲) میں: ﴿ذٰلِكَ ۙ وَ مَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ﴾ اور ایک آیت (۶۰) میں: ﴿ذٰلِكَ ۙ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهٖ﴾ اس کا مبتدا محذوف مانتے ہیں "الْاَمْرُ ذٰلِكَ" یعنی حج کا معاملہ تو یہ ہوا اور.....

﴿۳۲﴾ وَ مَنْ يُعَظِّمْ حُرْمَتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ : یعنی اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حرمتوں کی تعظیم خود بندے کے لیے بہتر

حُفَّاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخَطَّفَهُ

الطَّيْرُ أَوْ تَهْوَىٰ بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ﴿۳۱﴾

اس حال میں کہ اللہ کے لیے ایک طرف ہونے والے ہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنے والے نہیں اور جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا، پھر اسے پرندے اچک لیتے ہیں، یا اسے ہوا کسی دور جگہ میں گرا دیتی ہے ﴿۳۱﴾ ہے، کیونکہ یہ اس کے لیے اس کے رب کی رضا حاصل کرنے کا باعث ہے، جس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ ”حُفَّاءَ لِلَّهِ“ سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کے احترام کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، جیسے حرم، مسجد حرام، حرمت والے مینے، ہدایا یعنی مکہ میں قربانی کے لیے جانے والے اونٹ، قدامت یعنی وہ بھیڑ بکریاں اور گائیں جن کے گلے میں قدامے (پٹے اور ہار) ڈالے ہوئے ہوں وغیرہ۔ ان سب کی تکریم ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلی آ رہی ہے، مگر مشرکین نے اپنے ملت ابراہیم کے پیروکار ہونے کے دعوے کے باوجود ان حرمتوں کو پامال کیا اور خود ساختہ چیزوں کو حرمت والا قرار دے لیا، جیسے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہ۔ ”وَكُنْ يَعْظُمُ حُرْمَتِ اللَّهِ“ کا مطلب یہ بھی ہے کہ احرام میں جو کام اللہ تعالیٰ نے حرام کیے ہیں، مثلاً شکار کرنا، شہوانی افعال، لڑائی جھگڑا، فسق و فجور وغیرہ، تو ان کے ارتکاب کو جو شخص بہت بڑا گناہ سمجھ کر ان سے اجتناب کرے تو یہ اس کے رب کے ہاں اس کے لیے بہتر ہے۔

﴿۳۱﴾ وَأُجِلَّتْ لَكُمْ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يَشْتَلِي عَلَيْكُمْ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ مائدہ (۳) اور سورہ نحل (۱۱۵)۔

﴿۳۱﴾ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ : ”أُجِلَّتْ لَكُمْ الْاَنْعَامُ“ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان چوپاؤں کے حلال ہونے کا حکم دیا جو مشرکین نے حرام کر رکھے تھے، مثلاً بحیرہ، سائبہ وغیرہ اور ”اِلَّا مَا يَشْتَلِي عَلَيْكُمْ“ کے ساتھ ان جانوروں کو حرام قرار دیا جو مشرکین نے حلال کر رکھے تھے، مثلاً غیر اللہ کے نام پر ذبح کردہ جانور اور مردار وغیرہ۔ مشرکین کے بعض جانوروں کو حرام اور بعض کو حلال کرنے کا باعث بتوں کی عبادت تھی اور یہ ان کا اللہ پر صاف جھوٹ اور بہتان تھا کہ حلال و حرام کا یہ حکم اس کا حکم ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے شرک اور جھوٹ دونوں سے بچنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس گندگی سے بچو جو بتوں کی صورت میں ہے اور جھوٹی بات سے بچو۔ یعنی مشرکین نے اللہ کے ساتھ جو بتوں کو شریک بنا رکھا ہے اور اللہ کے ذمے بعض چیزوں کو حلال یا حرام کرنے کا بہتان باندھ رکھا ہے تم اس شرک سے اور اس جھوٹ اور بہتان سے اجتناب کرو۔ ”قَوْلُ الرُّؤُوسِ“ کا لفظ عام ہے، اس لیے اس میں جھوٹی شہادت دینا، کسی پر بہتان لگانا، غرض کوئی بھی جھوٹ بولنا شامل ہے اور سب سے اجتناب کا حکم ہے۔ ”الرِّجْسُ“ کا معنی گندگی ہے، ”هِنٌ“ بیان کرنے کے لیے ہے، یعنی گندگی ظاہری بھی ہوتی ہے مگر خاص طور پر حکم دیا کہ اس معنوی گندگی سے بچو جو بتوں کی صورت میں ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں: ”مِنْ لِسَانِ الْجِنْسِ كَأَنَّهُ قَالَ الرِّجْسُ الَّذِي هُوَ الْاَوْثَانُ۔“

آیت 31 ﴿۳۱﴾ حُفَّاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ : ”أَيُّ كُفْرًا حُفَّاءَ“ یعنی تمام معبودوں سے ہٹ کر صرف اللہ کی

ذَلِكَ ۛ وَ مَنْ يُعْظِمَ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ ﴿۳۲﴾ لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ

یہ اور جو اللہ کے نام کی چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو یقیناً یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے ﴿۳۲﴾ تمہارے لیے ان میں ایک مقرر خاص عبادت کرنے والے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے والے ہو۔ ”حُفَّاءُ“ پر نصب ”اجْتَنِبُوا“ کی ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ مزید دیکھیے سورہ انعام (۱۶۰ تا ۱۶۳)۔

﴿۳۲﴾ وَ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ : جو شخص توحید پر قائم ہے وہ بلندی اور عز و شرف میں گویا آسمان پر ہے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرتا اور اسی کا حکم مانتا ہے۔ جب اس نے شرک کیا تو اس بلند مقام سے گر گیا، اب یا تو اسے پرندے راستے ہی میں اچک لیں گے، یعنی وہ بتوں کے پجاریوں یا ان زندہ یا مردہ بیروں بزرگوں کے مجادروں کے ہتھے چڑھ جائے گا جنہوں نے ان بیروں بزرگوں کو خدا بنا رکھا ہے، یا ہوا سے بہت دور جگہ میں گرا دے گی، یعنی اگر کسی کے قابو نہ آیا تو اللہ سے تو بدظن ہو ہی چکا ہے، پھر اسے اس کی خواہش بہت دور گہری جگہ میں گرا دے گی، یعنی سب سے منکر ہو کر دہریہ ہو جائے گا۔ دونوں صورتوں میں اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

آیت 32 ذٰلِكَ ۛ وَ مَنْ يُعْظِمُ شَعَائِرَ اللَّهِ : ”ذٰلِكَ“ کی تفسیر آیت (۳۰) میں ملاحظہ فرمائیں۔ ”شَعَائِرُ“ ”شَعْبِرَةٌ“ کی جمع ہے، اسم فاعل بمعنی ”مُشْعِرَةٌ“ ہے، جس سے کسی چیز کا شعور ہو (نشانیوں)، یعنی وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کا شعور دلانے کے لیے مقرر کر رکھی ہیں، جو شخص ان کی تعظیم کرے گا تو اس کا باعث دلوں کا تقویٰ ہے، یعنی جس کے دل میں اللہ کا ڈر ہوگا وہ ان کی تعظیم ضرور کرے گا۔ ہر وہ چیز جس کی زیارت کا اللہ نے حکم دیا ہے یا اس میں حج کا کوئی عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، وہ ”شعائر اللہ“ میں داخل ہے۔ قربانی کے جانور بھی ”شعائر اللہ“ میں داخل ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِمَّنْ شَعَائِرِ اللَّهِ﴾ [الحج : ۳۶] ”اور قربانی کے بڑے جانور، ہم نے انہیں تمہارے لیے اللہ کی نشانیوں سے بنایا ہے۔“ ان کی تعظیم کا مطلب یہ ہے کہ ان کے آتے ہوئے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے، جانور قیمتی خریدے اور عیب دار جانور نہ خریدے۔ ان پر جھول اچھی ڈالے، انہیں خوب کھلائے پلائے اور سجا کر رکھے، جیسا کہ گلے میں فلادے ڈالنے سے ظاہر ہے، مجبوری کے بغیر ان پر سواری نہ کرے، جیسا کہ آگے حدیث آ رہی ہے اور قربانی کے بعد ان کے جھول وغیرہ بھی صدقہ کر دے۔ ”شعائر اللہ“ کی تعظیم اگرچہ اس سے پہلے ”حُرْمَتِ اللَّهِ“ کی تعظیم میں آچکی ہے مگر ”حُرْمَتِ اللَّهِ“ کا مفہوم وسیع اور عام ہے جب کہ ”شعائر اللہ“ خاص ہے، اس لیے ”شعائر اللہ“ کی تعظیم کی تاکید کے لیے اسے دوبارہ الگ ذکر فرمایا۔

آیت 33 ﴿۱﴾ لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى : فائدوں سے مراد ان کی سواری کرنا، ان کا دودھ پینا، ان سے نسل اور اون حاصل کرنا ہے، اسی طرح ان کے گوبر وغیرہ کو ایدھن یا کھاد کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ مشرکین جس طرح قربانی کا گوشت نہیں کھاتے تھے اسی طرح قربانی کے جانوروں سے اون، دودھ یا سواری وغیرہ کا فائدہ اٹھانا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ قربانی کے جانوروں سے اس وقت تک فائدہ اٹھانا جائز ہے جب تک انہیں قربانی کے لیے نامزد نہ

أَجَلٌ مُّسْتَيٌّ ثُمَّ مَحَلًّا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝

وقت تک کئی فائدے ہیں، پھر ان کے حلال ہونے کی جگہ اس قدیم گھر کی طرف ہے ۝

کیا جائے، اس کے بعد سواری یا دودھ یا اون کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ”شعائر اللہ“ سے فائدہ اٹھانا بطور احسان ذکر فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ قربانی کے لیے نامزد ہونے کے بعد ہی جانور ”شعائر اللہ“ میں شامل ہوتے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: «أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى رَجُلًا يَسُوقُ بَدَنَةً فَقَالَ أُرْكَبُهَا فَقَالَ إِنَّهَا بَدَنَةٌ قَالَ أُرْكَبُهَا قَالَ أُرْكَبُهَا وَيَلْتَلِكُ» [بخاری، الحج، باب ركوب البدن: ۱۶۸۹-۱۶۹۰، مسلم: ۱۳۲۳] ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو ایک بدنہ (قربانی کے لیے مکہ جانے والا اونٹ) ہانک کر لے جاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ”اس پر سوار ہو جاؤ۔“ اس نے کہا: ”یہ بدنہ ہے۔“ فرمایا: ”اس پر سوار ہو جاؤ، افسوس ہو تم پر۔“ جابر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إُرْكَبُهَا بِالْمَعْرُوفِ إِذَا أُلْحِجَّتْ إِلَيْهَا حَتَّى تَجِدَ ظَهْرًا» [مسلم، الحج، باب حوار ركوب البدنة: ۱۳۲۴] ”اس پر اس طرح سوار ہو جاؤ کہ اسے تکلیف نہ دو، جب تمہیں اس کی ضرورت پڑ جائے، یہاں تک کہ تمہیں کوئی اور سواری مل جائے۔“ ابن کثیر نے شعبہ عن زبیر بن ابی ثابت الاثمی عن مغیرہ بن حذاف کی سند سے علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو بدنہ ہانک کر لے جاتے ہوئے دیکھا، جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا، فرمایا: ”اس کا دودھ صرف اتنا پیو جو اس کے پیچے سے زائد ہو اور جب یوم النحر ہو تو اسے اور اس کے پیچے کو ذبح کر دو۔“ علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشر نے فرمایا، مجھے مغیرہ بن حذاف کے حالات نہیں ملے اور متن میں پیچے کو ذبح کرنے کی بات غریب (انوکھی) ہے۔

② ثُمَّ مَحَلًّا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ : ”مَحَلًّا“ اترنے کی جگہ۔ حلال ہونے کی جگہ سے مراد یہ ہے کہ جہاں آخر قربانی کے جانوروں کو پہنچانا ہے اور نحر یا ذبح ہونا ہے وہ بیت تئیس (کعبہ) ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿هَذَا بَلَدٌ بَلَدٌ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدہ: ۹۵] یعنی قربانی کا ایسا جانور جو کعبہ تک پہنچنے والا ہو۔ ان دونوں آیتوں میں کعبہ سے مراد حرم کعبہ ہے، کیونکہ عین کعبہ میں تو قربانی نہیں کی جاتی، قربانی تو اس کے باہر کی جاتی ہے، چنانچہ پورے مکہ یا منیٰ میں جہاں بھی قربانی کی جائے درست ہے۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «كُلُّ عَرَفَةَ مَوْقِفٌ وَكُلُّ مِثْنٍ مَسْحَرٌ وَكُلُّ الْمَرْذَلْفَةِ مَوْقِفٌ وَكُلُّ فَحَاحٍ مَنَحَّةٌ حَلَبِيٌّ وَمَسْحَرٌ» [ابوداؤد، المناسك، باب الصلاة جمع: ۱۹۳۷] ”عرفہ پورا وقوف کی جگہ ہے، منیٰ پورا نحر کی جگہ ہے اور مرذلفہ پورا وقوف کی جگہ ہے اور مکہ کی تمام سرزمینیں راستہ ہیں اور نحر کی جگہ ہیں۔“ ہمارے استاذ محمد عبدہ رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ ”مَحَلًّا“ میں ”خا“ ضمیر سے مراد سارے شعائر ہوں، تو مطلب یہ ہوگا کہ آخر ان تمام مناسک کا خاتمہ بیت اللہ کے طواف کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ معنی زیادہ مناسب ہے، ورنہ خصوصیت کے ساتھ ”بیت تئیس“ کہنے کا فائدہ واضح نہیں رہے گا۔ (قرطبی)

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنَسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ
وَاللَّهُمَّ إِلَهًا وَاحِدًا فَلَا أُسْلَمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿۳۴﴾

اور ہم نے ہر امت کے لیے ایک قربانی مقرر کی ہے، تاکہ وہ ان پالتو چوپاؤں پر اللہ کا نام ذکر کریں جو اس نے انھیں دیے ہیں۔ سو تمہارا معبود ایک معبود ہے تو اسی کے فرماں بردار ہو جاؤ اور عاجزی کرنے والوں کو خوش خبری سنادے ﴿۳۴﴾

آیت 34 ﴿۱﴾ وَ لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنَسَكًا : "مَنَسَكًا" کے تین معنی ہو سکتے ہیں، عبادت، عبادت کی جگہ اور قربانی۔

یہاں آخری معنی زیادہ موزوں ہے، کیونکہ آگے جانوروں پر اللہ کا نام لینے کا ذکر آ رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے بطور نیاز قربانی کرنا تمام آسمانی شریعتوں کے نظام عبادت کا لازمی جز رہا ہے۔ اسلام میں بھی یہ بطور عبادت مقرر کی گئی ہے، اس میں حاجی، غیر حاجی کی کوئی قید نہیں ہے۔ چنانچہ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «صَحَّحَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِكَبْشَيْنِ أَمْلَحَيْنِ فَرَأَيْتُهُ وَأَضْعَا قَدَمَهُ عَلَى صِفَاحِهِمَا يُسَمِّي وَيُكَبِّرُ فَذَبَحَهُمَا بِيَدِهِ» [بخاری، الأضاحي، باب من ذبح الأضاحي بيده: ۵۵۵۸۔ مسلم: ۱۹۶۶] "رسول اللہ ﷺ نے سینگوں والے دو چتکبرے مینڈھے قربانی کیے، میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے ان کے پہلوؤں پر اپنا پاؤں رکھا اور "بِسْمِ اللَّهِ وَاللَّهُ أَكْبَرُ" پڑھ کر ان دونوں کو اپنے ہاتھ سے ذبح کیا۔" یاد رہے مکہ میں حج یا عمرہ پر کی جانے والی قربانی کو ہدی اور دوسرے مقامات پر کی جانے والی قربانی کو اضحیہ کہا جاتا ہے۔

﴿۲﴾ تفسیر ثنائی میں ہے: "قرآن مجید کے اس دعویٰ (کہ ہر قوم میں قربانی کا حکم ہے) کا ثبوت آج بھی مذہبی کتب میں ملتا ہے۔ عیسائیوں کی بائبل تو قربانی کے احکام سے بھری پڑی ہے۔ تورات کی دوسری کتاب سفر خروج میں عموماً یہی احکام ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ہندوؤں اور آریوں کے مسلمہ پیشوا منوجی کہتے ہیں: "گیہ (قربانی) کے واسطے اور نوکروں کے کھانے کے واسطے اچھے ہرن اور پرند مارنا چاہیے۔ اگلے زمانے میں رشیوں نے گیہ کے لیے کھانے کے لائق ہرن اور کچھیوں کو مارا ہے۔ شری برہاجی نے آپ سے آپ گیہ (قربانی) کے واسطے پشو (حیوانوں) کو پیدا کیا۔ اس سے گیہ جو قتل ہوتا ہے وہ بدھ نہیں کہلاتا۔ حیوان، پرند، کچھوا وغیرہ، یہ سب گیہ کے واسطے مارے جانے سے اعلیٰ ذات کو دوسرے جنم میں پاتے ہیں۔" [اوحیائے: ۵۰۔ شلوك: ۲۲، ۲۳، ۲۹، ۴۰] گو آج کل کے ہندو یا آریہ ایسے مقامات کی تاویل یا تردید کریں مگر صاف الفاظ کے ہوتے ہوئے ان کی تاویل کون سنتا ہے۔ اس جگہ ہم نے صرف یہ دکھانا تھا کہ قرآن شریف نے جو دعویٰ کیا ہے وہ بجز اللہ اپنا ثبوت رکھتا ہے، باقی قربانی کی علت اور وجہ کے لیے ہماری کتب مباحثہ حق پر کاش، ترک اسلام وغیرہ ملاحظہ ہوں۔"

﴿۳﴾ لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ : یعنی ہم نے ہر امت کے لیے ایک قربانی مقرر کی ہے، تاکہ وہ ہمارے عطا کردہ پالتو چوپاؤں پر اللہ کا نام لے کر انھیں قربان کریں، نہ کہ کفار کی طرح ہمارے عطا کردہ چوپاؤں کو بتوں اور غیر اللہ کے آستانوں پر انھیں خوش کرنے کی نیت سے ذبح کریں۔

الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّادِقِينَ عَلَى مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ

وہ لوگ کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور ان پر جو مصیبت آئے اس پر صبر کرنے والے

④ **وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ** : پہلی امتوں پر قربانی مقرر کرنے کے ذکر کے بعد اب ہماری امت کو خطاب ہے کہ پہلی امتوں کا الہ اور تمہارا الہ ایک ہی اللہ ہے، سو تم بھی پوری طرح اسی کے فرماں بردار ہو جاؤ اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے سپرد کر دو اور اپنی ہر عبادت، جس میں قربانی بھی ہے، صرف اسی کے لیے کرو۔ اگر کسی اور کے لیے کرو گے تو اس کی عبادت میں شرک کے مجرم ٹھہرو گے۔ مگر اب بعض مسلمان کہلانے والوں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ عید الاضحیٰ پر قربانی کو بھی عبد القادر جیلانی کی گیارہویں قرار دے کر ان کے نام کا ختم دیتے ہیں، اس سے بڑھ کر شرک کیا ہوگا؟

⑤ **وَالصَّادِقِينَ**: ”الصَّادِقِينَ“ باب افعال (اِخْبَات) سے اسم فاعل ہے۔ ”صَبَتْ“ نیچی جگہ کو کہتے ہیں۔ ”صَبَتْ“ کا معنی نیچی جگہ میں چلنے والا ہے، پھر یہ لفظ استعارہ کے طور پر تواضع اور عاجزی کرنے والے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ بعض حضرات نے اسے ”صَبَتْ النَّارُ“ (آگ بجھ گئی) سے مشتق مانا ہے، حالانکہ اس کا اصل ”صَبَتْ“ ہے، جبکہ ”الصَّادِقِينَ“ کا اصل ”صَبَتْ“ ہے۔ یعنی ان عاجزی کرنے والوں کو بشارت دے دے کہ جن کے ہاں اللہ کے حضور عاجزی ہی عاجزی ہے اور ذرہ بھر تکبر نہیں۔ یہاں مراد حج و عمرہ کے لیے آنے والے ہیں کہ ان کی کفن جیسی ان سلی چادروں، ننگے سروں، ان کی وضع قطع، ان کی لیبیک کی صداؤں، منی، مزدلفہ اور عرفات میں وقوف، ان کے طواف، سعی اور ان کی قربانیوں، غرض ہر چیز سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے سامنے پامال ہو چکے ہیں۔

آیت 35 ﴿ ١ ﴾ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ : ”وَجِلَّ يُوَجِّلُ وَجَلًا“ (ع) شدید خوف۔ اس آیت میں

”الصَّادِقِينَ“ (تواضع اور عاجزی کرنے والوں) کے اوصاف بیان ہوئے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات یا اس کے کسی حکم کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل سخت ڈر جاتے ہیں اور وہ اللہ کی حمد و ثنا اور اس سے استغفار کرتے ہیں اور دل و جان سے اس کا حکم بجالاتے ہیں۔ کفار کی طرح نہیں کہ جن کے دل اکیلے اللہ کا ذکر ہونے پر ٹھگ پڑ جاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ﴾ [الزمر: ۷۰] ”اور جب اس اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل ٹھگ پڑ جاتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب ان کا ذکر ہوتا ہے جو اس کے سوا ہیں تو اچانک وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔“ اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو نہایت تکبر سے منہ پھیر کر چل دیتے ہیں جیسے انھوں نے وہ سنی ہی نہیں، فرمایا: ﴿وَإِذَا تَنَادَىٰ عَلَيْهِ إِيتْنَا وَلِي مُنْتَكِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا ۖ فَبَشَّرَهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ [لقمان: ۷] ”اور جب اس پر ہماری آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو تکبر کرتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہے، گویا اس نے وہ سنی ہی نہیں، گویا اس کے

وَمِمَّا زَكَّاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿۳۵﴾

اور نماز قائم کرنے والے ہیں اور ہم نے انہیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ﴿۳۵﴾

دونوں کانوں میں بوجھ ہے، سوا سے دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے۔“ ایسے منکبروں کے دلوں پر اللہ تعالیٰ بھی مہر لگا دیتا ہے، فرمایا: ﴿كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ فٰكِرٍ مُّكْتَبِرٍ جَبَّارٍ﴾ [المومن: ۳۵] ”اسی طرح اللہ ہر منکبر، سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔“

﴿۳۵﴾ وَالضَّٰعِيْنَ عَلَىٰ مَا اَصَابَهُمْ: یہ آیات چونکہ حج کے بیان میں آئی ہیں اور حج میں سفر کی صعوبتوں کے علاوہ بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں، بعض ساتھیوں کے مزاج کی شدت، خود غرضی یا ضروریات کی کمی کی وجہ سے لڑائی جھگڑے کی نوبت آتی ہے، خصوصاً جب ان میں بد عقیدہ اور مشرک لوگ بھی ہوں، کیونکہ یہ سورت مکہ میں اترتی اور اب بھی بہت سے حاجی وہ ہوتے ہیں جو شرک و بدعت میں گرفتار ہوتے ہیں اور توحید و سنت کی بات سننا برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ بعض اوقات بھوک، بیماری، راستے کی رکاوٹیں اور قدرتی آفات پیش آ جاتی ہیں، تو اللہ کے وہ متواضع بندے ان سب مواقع پر ﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ﴾ [البقرة: ۱۹۷] اور ﴿وَبَشِّرِ الضَّٰعِيْنَ﴾ [الذین] إِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيبَةٌ ﴿۱۰﴾ قَالَوا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُونَ﴾ [البقرة: ۱۵۵، ۱۵۶] پر عمل کرتے ہوئے اتنا صبر کرتے ہیں کہ صابرین کے لقب سے سرفراز ہوتے ہیں۔

﴿۳۶﴾ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ: ”الْمُقِيْمِيْنَ“ کا نون ”الصَّلٰوةِ“ کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے گر گیا ہے۔ مضاف پر اگرچہ الف لام نہیں آتا مگر اسم فاعل یا صفت کا کوئی صیغہ اپنے معمول کی طرف مضاف ہو تو اس پر الف لام آ جاتا ہے۔ سفر حج کی صعوبتوں کی وجہ سے عین ممکن ہے کہ نماز میں سستی ہو جائے، یا وہ صحیح طریقے سے ادا نہ کی جاسکے، مگر اللہ کے وہ عاجز بندے اللہ سے اتنی محبت رکھتے اور نماز میں غفلت سے اس قدر خوف زدہ رہتے ہیں کہ ہر وقت اس کی فکر میں رہتے ہیں اور اسے اتنی پابندی سے بروقت اور صحیح طریقے سے ادا کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ کی طرف سے انہیں ”نماز قائم کرنے والے“ کا لقب عطا ہوتا ہے، گویا وہ ہر وقت نماز ہی میں ہیں۔

﴿۳۷﴾ وَمِمَّا زَكَّاهُمْ يُنْفِقُونَ: اس سفر میں چونکہ خرچ بہت ہوتا ہے، اس لیے فرمایا کہ ہمارے وہ بندے سفر کے خرچ میں، یا کھانے پینے کے خرچ میں، یا اپنے ساتھیوں پر خرچ کرنے میں، یا قربانی وغیرہ پر خرچ کرنے میں بخل نہیں کرتے، بلکہ ہم نے جو کچھ انہیں دیا ہے، یہ سمجھ کر کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اسی کا عطا کردہ ہے، فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں۔

﴿۳۸﴾ اس آیت کی مندرجہ بالا تفسیر مفسر ہمامی نے سیاق و سباق کے لحاظ سے کی ہے۔ الفاظ عام ہونے کا تقاضا ہے کہ ”الْمُنْفِقِيْنَ“ (اللہ کے متواضع بندوں) کی یہ صفات ان میں صرف حج کے دوران میں نہیں بلکہ دوسرے تمام اوقات میں بھی پائی جاتی ہیں، جس سے وہ بشارت الہی ”بَشِّرِ الْمُنْفِقِيْنَ“ کے مستحق بنتے ہیں۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا حَبِيرٌ ۖ فَادْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا

اور قربانی کے بڑے جانور، ہم نے انھیں تمہارے لیے اللہ کی نشانیوں سے بنایا ہے، تمہارے لیے ان میں بڑی خیر ہے۔ سوان پر اللہ کا نام لو، اس حال میں کہ گھٹنا بندھے کھڑے ہوں، پھر جب ان کے پہلو گر پڑیں تو ان سے

آیت 36 ﴿ ۱ ﴾ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ : ”الْبُدْنَ“ کی جمع ہے، بڑے بدن والا جانور۔ یہ لفظ

بڑے جسم کی وجہ سے اونٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس سے پہلے قربانی کے لیے سورہ انعام (۱۳۳، ۱۳۴) میں ”بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ“ یعنی پالتو چوپاؤں کا ذکر فرمایا تھا جو بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے ہیں۔ اس آیت میں بڑے جانوروں کا ذکر خصوصاً فرمایا، کیونکہ چوپاؤں میں بطور ”شعائر اللہ“ وہ زیادہ نمایاں ہوتے ہیں، خاص طور پر اونٹ اپنے بلند قد کی وجہ سے اور اشعار کی وجہ سے زیادہ ہی نمایاں ہوتا ہے۔ اشعار کا مطلب یہ ہے کہ جب مکہ میں قربانی کے اونٹ روانہ کیے جاتے ہیں تو ان کے کوہان کے دائیں طرف برجھی وغیرہ سے زخم کر کے خون جلد پر مل دیا جاتا ہے، جو علامت ہوتا ہے کہ یہ جانور مکہ معظمہ قربانی کے لیے جا رہے ہیں اور جس سے ہر دیکھنے والا ان کی تعظیم و تکریم اور خدمت کرتا ہے۔ گائے کو بھی ”بُدْنَةٌ“ کہہ لیتے ہیں، قاموس میں ہے: ”الْبُدْنَةُ مُحْرَسَةٌ مِنَ الْإِبِلِ وَالْبَقَرِ كَمَا الْأَضْحِيَّةُ مِنَ الْغَنَمِ“ یعنی جس طرح بھیڑ بکری کی قربانی کو اضحیہ کہتے ہیں اسی طرح اونٹ اور گائے کو بدنہ کہتے ہیں۔“ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: «عَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُهَلِّكِينَ بِالْحَجِّ فَأَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ نُشْتَرِكَ فِي الْإِبِلِ، وَالْبَقَرِ، كُلُّ سَبْعَةٍ مِثْلًا فِي بُدْنَةٍ» [مسلم، الحج، باب حواجز الاشتراك في الهدى..... : ۱۳۱۸/۳۵۱] ”ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج کا احرام باندھے ہوئے نکلے تو ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم اونٹوں اور گائیوں میں شریک ہو جائیں، ہم میں سے ہر سات آدمی ایک بدنہ میں شریک ہو جائیں۔“ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اونٹ اور گائے دونوں کو بدنہ کہتے ہیں اور یہ کہ حج کے موقع پر اونٹ اور گائے دونوں میں سات سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔ دوسری روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں: «كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرِ فَحَصَرَ الْأَضْحَى فَأَشْتَرَكْنَا فِي الْبَقَرَةِ سَبْعَةً وَفِي الْحَزْوَرِ عَشْرَةً» [ترمذی، الحج، باب ما جاء في الاشتراك في البدنة والبقرة: ۹۰۵، وقال حديث حسن صحيح وقال الألباني صحيح] ہم نبی ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے تو نحر (قربانی کا وقت) آ گیا تو ہم نے گائے سات آدمیوں کی طرف سے ذبح کی اور اونٹ دس آدمیوں کی طرف سے۔“ ترمذی کے علاوہ اسے احمد، نسائی اور طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج کے علاوہ دوسرے مقامات پر عید الاضحیٰ کے موقع پر اونٹ میں دس آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔ ہاں، حج کے موقع پر سات آدمی شریک ہوں گے، جیسا کہ مسلم کی حدیث میں گزرا ہے۔ البتہ ہمارے استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ”ایک اونٹ کی قربانی میں دس اور ایک گائے کی قربانی میں سات شریک ہو سکتے ہیں، جیسا کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے اور صحیح مسلم میں جو جابر رضی اللہ عنہما والی روایت میں ”الْحَزْوَرُ عَنْ سَبْعَةٍ“

صَوَافٍ ۚ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطِعُوا الْقَائِمَ وَ الْمُعْتَزِلَ ۚ كَذَلِكَ سَخَّرْنَا

کچھ کھاؤ اور قناعت کرنے والے کو کھلاؤ اور مانگنے والے کو بھی۔ اسی طرح ہم نے انہیں تمہارے لیے مسخر کر دیا،

(اونٹ سات کی طرف سے) آیا ہے وہ اس کے منافی نہیں ہے، کیونکہ دس والی روایت جواز پر محمول ہے۔“

② لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ: ”خَيْرٌ“ میں توین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”تمہارے لیے ان میں بڑی خیر ہے۔“

اس خیر میں وہ منافع بھی شامل ہیں جو آیت (۲۳) کی تفسیر میں گزرے ہیں اور ذبح کرنے کے بعد ان کے گوشت، چمڑے، ہڈیوں اور جسم کے ہر حصے سے فائدہ اٹھانا بھی شامل ہے۔ آخرت میں ملنے والا اجر و ثواب اس کے علاوہ ہے اور وہ ایسی خیر ہے جو شمار سے باہر ہے۔

③ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ عَلَيْهِمْ: یہ کہنے کے بجائے کہ انہیں ذبح کرو، فرمایا، ان پر اللہ کا نام لو۔ اس لفظ کو بار بار دہرانے سے یہ بات ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ اللہ کے پیدا کیے یہ چوپائے اسی کے نام پر ذبح ہونے چاہئیں، نہ کسی غیر سے کوئی مراد بر لانے کی نیت پر اور نہ کسی غیر کے نام پر۔

④ ”صَوَافٍ“ ”صَافَةٌ“ کی جمع ہے بروزن ”فَوَاعِلٌ۔“ صف کا معروف معنی قطار ہے، یعنی اونٹوں کو قربان گاہ میں قطار کی صورت میں کھڑا کر کے باری باری نحر کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے قربانی کے جمال و جلال میں اضافہ ہوتا ہے، جیسا کہ جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایسی حدیث میں ہے: «ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى الْمَسْحَرِ فَنَحَرَ ثَلَاثًا وَسِتِينَ بَيْدَهُ ثُمَّ أُعْطِيَ عَلِيًّا فَنَحَرَ مَا عَسَى»

[مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ: ۱۲۱۸۔ مسند احمد: ۲۲۱، ۲۲۰، ۲۲۱، ج: ۱۴۴۰۳] ”پھر رسول اللہ ﷺ قربان گاہ کی طرف پلٹے اور اپنے ہاتھ سے تریسٹھ (۶۳) اونٹ نخر کیے، آپ انہیں ایک برتھے کے ساتھ زخم لگاتے تھے، پھر آپ نے وہ بر جھالی ﷺ کو دے دیا تو انھوں نے باقی کو نحر کر دیا اور وہ کل سواونٹ تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت بھی منی میں باقاعدہ قربان گاہ تھی، جیسا کہ آج کل حکومت نے باقاعدہ جگہیں مقرر کر رکھی ہیں اور یہ بھی کہ سب اونٹ وہاں قریب قریب جمع تھے۔ (ابن عساکر) مگر جبر الامامہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر فرمائی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اونٹوں کو تین ٹانگوں پر کھڑا کر کے نحر کیا جائے، اس طرح کہ ان کی اگلی بائیں ٹانگ اکٹھی کر کے باندھی ہوئی ہو۔ [طبری بسند ثابت]

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: «أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابَهُ سَكَنُوا بِسَحْرٍ وَنَحَرُوا الْبَدَنَةَ مَعْقُولَةَ الْيَسْرِي قَائِمَةً عَلَى مَا بَقِيَ مِنْ قَوَائِمِهَا» [ابوداؤد، المناسك، باب كيف تنحر البدن: ۱۷۶۷، و صححه الألباني] ”رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب اونٹوں کو اس طرح نحر کرتے تھے کہ ان کے اگلے بائیں پاؤں کا گھٹنا بندھا ہوتا اور وہ باقی ٹانگوں پر کھڑے ہوتے۔“ ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک آدمی کے پاس سے گزرے جس نے اپنی اونٹنی بٹھا رکھی تھی اور اسے نحر کر رہا تھا تو فرمایا: ”اسے کھڑا کر کے پاؤں باندھ کر نحر کرو، یہ محمد ﷺ کی سنت ہے۔“ [بخاری، الحج، باب نحر الإبل مقبدة: ۱۷۱۳] قرآن مجید کے الفاظ ”فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا“ (جب ان کے پہلو گر پڑیں) سے بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اونٹوں کو کھڑا کر کے نحر کرنا چاہیے،

لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۷﴾

تا کہ تم شکر کرو ﴿۷﴾

کیونکہ اگر ان کے پہلو پہلے ہی زمین پر ہوں تو وہ کیسے گریں گے؟

﴿۷﴾ قَدْ أَفْجَتْ جَنْوِبَهَا: خریہ ہے کہ اونٹ کو اگلی بائیں ٹانگ بندھی ہونے کی حالت میں کھڑا کر دیا جاتا ہے، پھر اس کے سینے کے گڑھے میں، جہاں سے گردن شروع ہوتی ہے، کوئی برچھایا نیزہ یا ٹھچرا "بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ" پڑھ کر مارا جاتا ہے جس سے خون کا پرناہ بہ نکلتا ہے، بہت سا خون نکل جانے پر اونٹ دائیں یا بائیں کروٹ پر گر پڑتا ہے۔ اس کی جان پوری طرح نکلنے سے پہلے اس کی کھال اتارنا یا گوشت کا کوئی ٹکڑا کاٹنا منع ہے، کیونکہ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ وَلِيُحَدِّثَ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ فَلْيُرِّخْ ذَبِيحَتَهُ» [مسلم، الصيد و الذبائح، باب الأمر بإحسان الذبوح، ۱۹۵۰: ...] "اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان یعنی اس سے اچھا سلوک کرنا فرض فرمایا ہے، سو تم جب قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو اور لازم ہے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی چھری تیز کرے اور اپنے ذبیح کو راحت پہنچائے۔" اور ابو واقد لیشی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا قُطِعَ مِنَ الْبَهِيمَةِ وَهِيَ حَيَّةٌ فَهِيَ مَيْتَةٌ» [ابوداؤد، الضحایا، باب إذا قطع من الصيد قطعة: ۲۸۵۸۔ ترمذی: ۱۶۸۰] "جانور کا جو حصہ اس وقت کاٹا جائے جب وہ زندہ ہو تو وہ (گوشت) مردار ہے۔" شیخ البانی رضی اللہ عنہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

﴿۸﴾ فَكُلُوا مِنْهَا.....: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے اس سے پہلے آیت (۲۸) کی تفسیر۔ "الْقَانِعَ" "فَنِعَ يَفْنَعُ" (ع) سے اسم فاعل ہے، قناعت کرنے والا، اللہ نے جو دیا ہے اس پر صبر کر کے سوال سے بچنے والا۔ "الْمُعْتَرِ" (سوال کے لیے) سامنے آنے والا۔ "فَكُلُوا" میں "فاء" سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے جانور کی جان پوری طرح نکلنے کے بعد جتنی جلدی ہو سکے اس کا گوشت کھانے اور کھلانے کا اہتمام کرنا چاہیے، کیونکہ قربانی کے گوشت ہی سے ناشتہ کرنا مستحب ہے۔ معلوم ہوا قربانی کا گوشت خود بھی کھانا چاہیے، دوست احباب، خویش و اقارب اور ان مساکین کو بھی کھلانا چاہیے جو سوال نہیں کرتے اور ان فقراء و مساکین کو بھی جو سوال کے لیے آجاتے ہیں۔ گویا قربانی کے گوشت کے تین حصے کیے جاسکتے ہیں اور ضروری نہیں کہ تینوں برابر ہوں۔

﴿۹﴾ كَذَلِكَ سَخَّرْنَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ: یعنی یہ ہم ہیں جنہوں نے اس طرح بے بس کر کے اتنے بڑے قوی بیکل اونٹ اور بیل، جو طاقت میں تم سے کہیں زیادہ ہیں، تمہارے تابع کر دیے ہیں۔ تم ان سے جو فائدہ چاہتے ہو اٹھاتے ہو، ان پر بوجھ لاتے ہو، سواری کرتے ہو، دودھ پیتے ہو اور جب چاہتے ہو ذبح کر لیتے ہو، وہ انہیں نہیں کرتے۔ مقصد یہ ہے کہ تم ہمارا شکر ادا کرو، نہ کہ مشرکین کی طرح ان کا جن کا نہ ان چوپاؤں کے پیدا کرنے میں کوئی دخل ہے اور نہ تمہارے لیے تابع کرنے میں۔

لَنْ يَنْتَالَ اللَّهُ لُحُومَهَا وَلَا دِمَآؤَهَا وَلَكِنَّ يَنْتَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ ۗ كَذَلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكْتَبُوا عَلَى اللَّهِ مَا هَدَيْتُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ ﴿۳۷﴾

اللہ کو ہرگز نہ ان کے گوشت پہنچیں گے اور نہ ان کے خون اور لیکن اسے تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچے گا۔ اسی طرح اس نے انہیں تمہارے لیے مسخر کر دیا، تاکہ تم اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور نیکی کرنے والوں کو خوش خبری سنا دے ﴿۳۷﴾

آیت 37 ﴿۱﴾ لَنْ يَنْتَالَ اللَّهُ لُحُومَهَا وَلَا دِمَآؤَهَا..... : یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس نہ قربانیوں کے گوشت پہنچیں گے، جو کھا لیے گئے اور نہ ان کے خون، جو بہا دیے گئے۔ یہ سب کچھ یہیں رہ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان سے غنی ہے، اس کے پاس تو تقویٰ یعنی تمہارے دل کا وہ خوف پہنچے گا جو اللہ کی ناراضگی سے بچاتا ہے، جو دل پر غالب ہو جاتا ہے تو آدمی اللہ کے ہر حکم کی تعمیل کرتا اور ہر منع کردہ کام سے باز آ جاتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَىٰ صُورَتِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ﴾ [مسلم، البر والصلة، باب تحريم ظلم المسلم و خدله..... : ۲۵۶۴، ۲۳۴] ”اللہ تعالیٰ تمہاری شکلوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے عملوں کو دیکھتا ہے۔“ اس آیت اور حدیث سے دل کے تقویٰ اور نیت کے اخلاص کی اہمیت ظاہر ہے، اس لیے قربانی خالص اللہ کی رضا کے لیے ہونی چاہیے، نہ دکھاوا مقصود ہو اور نہ شہرت، نہ فخر اور نہ یہ خیال کہ لوگ قربانی کرتے ہیں تو ہم بھی کریں۔ نیت کے بغیر عمل کا کچھ فائدہ نہیں۔ نیت خالص ہو تو بعض اوقات عمل کے بغیر ہی بلند مقامات تک پہنچا دیتی ہے۔ اُس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تبوک سے واپس آئے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو فرمایا: ﴿إِنَّ بِالْمَدِينَةِ أَقْوَامًا مَا سِرْتُمْ مَسِيرًا وَلَا قَطَعْتُمْ وَاذْيَا إِلَّا كَانُوا مَعَكُمْ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَهُمْ بِالْمَدِينَةِ؟ قَالَ وَهُمْ بِالْمَدِينَةِ حَسْبَهُمُ الْعُدْرُ﴾ [بخاری، المغازی، باب : ۴۴۲۳] ”مدینہ میں کئی لوگ ہیں کہ تم نے کوئی سفر نہیں کیا اور نہ کوئی وادی طے کی ہے مگر وہ تمہارے ساتھ رہے ہیں۔“ لوگوں نے کہا: ”یا رسول اللہ! مدینہ میں رہتے ہوئے؟“ فرمایا: ”ہاں! مدینہ میں رہتے ہوئے، انہیں عذر نے روک رکھا۔“ نیت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ آدمی کی زندگی جتنی بھی ہو محدود ہے، یعنی صرف چند سال، اگر اس میں نیک عمل کرے تو ہمیشہ ہمیشہ جنت میں اور برے عمل کرے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔ محدود عمل پر غیر محدود جزا نیت کی وجہ سے ہے کہ نیک کی نیت ہمیشہ نیکی کرتے رہنے کی اور بد کی نیت ہمیشہ بدی کرتے رہنے کی تھی۔ دیکھیے سورۃ النعام (۲۷، ۲۸)۔

﴿۲﴾ كَذَلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكْتَبُوا عَلَى اللَّهِ عَلَىٰ مَا هَدَيْتُمْ : یہاں تاکید کے لیے قربانی کے جانوروں کو مسخر کرنے کا احسان دوبارہ یاد دلایا اور تکبیر یعنی ”اللہ اکبر“ کہہ کر اللہ کی بزرگی بیان کرنے کا ذکر فرمایا، اس سے پہلے قربانی کرتے وقت اللہ کا نام لینے کا حکم دیا۔ معلوم ہوا کہ قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت ”بِسْمِ اللَّهِ وَاللَّهُ أَكْبَرُ“ کہنا اللہ کو مطلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ يُدْفِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ﴿۳۸﴾

بے شک اللہ ان لوگوں کی طرف سے دفاع کرتا ہے جو ایمان لائے، بے شک اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو بڑا خائن، بہت ناشکرا ہو ﴿۳۸﴾

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اونٹ کو اشعار (کوہان کی ایک طرف زخم) کرتے ہوئے "بِسْمِ اللَّهِ وَاللَّهِ أَكْبَرُ" پڑھتے تھے۔ [الموطا لمام مالک : ۸۴۵] انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دو چنگبرے مینڈھے قربانی کیے، انھیں اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور "بِسْمِ اللَّهِ وَاللَّهِ أَكْبَرُ" پڑھا اور اپنا پاؤں ان کے پہلوؤں پر رکھا۔ [بخاری، الأضاحی، باب الشکیر عند الذبح : ۵۵۶۵] "لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَيْتُكُمْ" کے لفظ عام ہونے کی وجہ سے چوپاؤں کو مسخر کرنے کی نعمت پر دوسرے اوقات میں بھی اللہ کی کبریائی بیان کرنی چاہیے، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر کے لیے روانہ ہوتے وقت اونٹ پر سوار ہوتے تو تین دفعہ "اللہ اکبر" کہتے، پھر "سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ" پڑھتے (آگے سفر کی مکمل دعا مذکور ہے)۔ [مسلم، الحج، باب استحباب الذكر إذا ركب دابته... : ۱۳۴۲]

﴿۳۸﴾ وَيُبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ: "الْمُحْسِنِينَ" کو بشارت دینے کے حکم کے بعد "الْمُحْسِنِينَ" کو بشارت دینے کا حکم دیا۔ احسان کا تعلق "وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمُ" سے ہے۔ تقویٰ ہر وقت اللہ کے خوف سے اس کے احکام پر عمل اور اس کی نافرمانی سے بچنے کا نام ہے۔ احسان بھی یہی ہے کہ ہر وقت یہ بات دل و دماغ میں حاضر رکھے کہ میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حدیث جبریل میں رسول اللہ ﷺ نے احسان کی تفسیر فرمائی: «أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَمَا نَكَتَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ» [بخاری، الإيمان، باب سؤال جبریل... : ۵۰] "احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے۔" تواضع اور احسان کی صفات رکھنے والوں کے لیے دنیا اور آخرت میں ہر خیر کی بشارت ہے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۱۱۲)، نساء (۱۲۵) اور لقمان (۲۲) اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل فرمائے۔ (آمین)

﴿۳۹﴾ مفسر بقاعی نے "وَيُبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ" کی داؤ کا ایک نکتہ بیان فرمایا ہے کہ دین کا مدار نذارت و بشارت دونوں پر ہے، اس مقام پر چونکہ حج اور اس کے اعمال قربانی وغیرہ کا ذکر ہے، جو بشارت سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں، اس لیے نذارت کو حذف کر کے داؤ عطف کے بعد بشارت کا واضح الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ گویا اصل عبارت یوں تھی: "فَأَنْبَشِرُ أَيُّهَا الذَّاعِي! الْمُسِيئِينَ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ" "سوائے دعوت دینے والے ابرائی کرنے والوں کو ڈرا اور نیکی کرنے والوں کو خوش خبری سنا دے۔"

آیت 38 ﴿۳۸﴾ إِنَّ اللَّهَ يُدْفِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا: پچھلی آیات کے ساتھ اس مضمون کا تعلق یہ ہے کہ اس سورت میں اس سے پہلے کفار کا اور ان کے لیے عذاب الیم کا ذکر ہوا ہے، جو اسلام اور مسجد حرام سے لوگوں کو روکتے ہیں کہ جس میں اللہ کی عبادت کرنا ہر ایک کا حق ہے۔ پھر آیت (۱۹) "هَذَانِ خَضْبٌ أُخْضِمُوا فِي رِجْلِهِمْ" میں مشرکین اور موحدین کی کشمکش کا ذکر فرمایا ہے، اس کے بعد بیت اللہ کی تعمیر، حج کی ابتدا اور قربانی اور حج کے دوسرے اعمال کی فضیلت کا بیان ہوا ہے جس سے

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقْتَلُونَ بِإِثْمِهِمْ ظُلْمًا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿۳۹﴾

ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اجازت دے دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً پوری طرح قادر ہے ﴿۳۹﴾

مہاجر مسلمانوں کے دل میں اپنے وطن کو دیکھنے، بیت اللہ کی زیارت اور اس کے عمرہ و حج کا شوق پیدا ہونا قدرتی تھا اور یہ خیال بھی کہ کافر تک ظلم کرتے رہیں گے اور مسلمانوں کو اللہ کے گھر سے روکتے رہیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار مت سمجھیں، اللہ تعالیٰ ان کا دفاع کر رہا ہے اور کرے گا۔ بہت جلد مسلمانوں کو غلبہ عطا ہوگا اور کفار، جنہوں نے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے اور انہیں ان کے وطن مکہ معظمہ سے ہجرت پر مجبور کیا، وہ مغلوب ہوں گے۔

﴿۳۹﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَخْلًا مَخْلًا خَوَّانًا كُفُورًا : ”خَوَّانٌ“ سے اسم فاعل مبالغے کا صیغہ ہے اور ”كُفُورًا“ ”كُفْرًا يَكْفُرًا“ سے اسم فاعل مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کے دفاع کی وجہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو بے حد خیانت کرنے والا، بہت ناشکرا ہے، جبکہ کفار میں یہ دونوں صفات پائی جاتی ہیں۔

﴿۳۹﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو بے حد خیانت کرنے والا، بہت ناشکرا ہو، تو کیا وہ عام خیانت کرنے والے اور عام ناشکرے کو پسند فرماتا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی خیانت کرنے والے اور کسی بھی ناشکرے کو پسند نہیں کرتا، خواہ وہ صرف خائن و کافر ہو یا خوان و کفور ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ﴾ [الاحزاب: ۵۸] ”بے شک اللہ خیانت کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔“ اور فرمایا: ﴿فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكُفُورِينَ﴾ [ال عمران: ۳۲] ”بے شک اللہ کفر کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔“ یہاں مبالغے کے صیغے لانے کے دو فائدے ہیں، ایک یہ کہ کفار مکہ کا حال بیان کرنا مقصود ہے کہ انہیں بیت اللہ کی تولیت کی امانت اور حرم میں سکونت کی نعمت عطا کی گئی مگر انہوں نے شرک و کفر پر اصرار کر کے اور مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھا کر، انہیں خانہ بدر کر کے اور آئندہ حج و عمرہ، نماز و طواف اور دوسری عبادات کے لیے اللہ کے گھر میں آنے سے روک دیا۔ یہ امانت میں حد سے بڑھی ہوئی خیانت اور نعمت کی بہت بڑی ناشکری ہے۔ یاد رہے کہ ”خَوَّانٌ“ میں ”كُفُورًا“ سے زیادہ مبالغہ ہے۔ ”خَوَّانٌ“ کے بجائے ”خَوَّانٌ“ اس لیے لایا گیا ہے کہ کفر اور دوسرے نقائص کی اصل بھی خیانت ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ممکن نہیں کہ انسان میں پائے جانے والے نقائص مبالغہ سے خالی ہوں۔ خیانت ہی کو لے لیجیے! آدمی جب کسی کی خیانت کی نیت کرتا ہے، پھر اس پر عمل کرتا ہے تو درحقیقت وہ پہلے اپنی جان کی خیانت کرتا ہے، پھر لوگوں کی اور رب تعالیٰ کی بھی، کفر کا بھی یہی حال ہے۔

آیت 39 ﴿۱﴾ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقْتَلُونَ : ”أُذِنَ فِي الْقِتَالِ“ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کے دفاع

کا طریقہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ کام مسلمانوں سے لے گا، وہ اگر چاہے تو قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط اور اصحاب مدین کی طرح آسمانی عذاب کے ذریعے سے کفار کو تباہ و برباد کر سکتا ہے، مگر فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْرِجُهُمْ عَنْ صُلْبِكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَسْفِئُ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ۗ وَيَذْهَبُ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝﴾ [التوبة: ۱۴، ۱۵] "ان سے لڑو، اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انہیں سزا کرے گا اور ان کے خلاف تمہاری مدد کرے گا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا دے گا اور ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔" جہاد کی چند حکمتوں کے لیے دیکھیے سورہ محمد (۴)، آل عمران (۱۳۰ تا ۱۳۲، ۱۳۹) اور توبہ (۱۶)۔

② یہ پہلی آیت ہے جس میں کفار سے لڑائی کی اجازت دی گئی ہے، کیونکہ مکہ میں کفار کی بے شمار زیادتیوں کے باوجود مسلمانوں کو لڑنے کی اجازت نہیں تھی، بلکہ ہاتھ روک کر رکھنے کا حکم تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿اللَّهُ تَرَىٰ إِلَىٰ الذِّينِ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقْبِلُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ [النساء: ۷۷] "کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔" عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: «لَمَّا أُخْرِجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ مَكَّةَ قَالَ أَبُو بَكْرٍ أَخْرَجُوا نَبِيَّهُمْ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ! لِيَهْلِكَنَّ فَاَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَىٰ: ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ بِأَنفُسِهِمْ طَلِبُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾ وَهِيَ أَوَّلُ آيَةٍ نَزَلَتْ فِي الْقِتَالِ» [مسندك حاكم: ۲/۲۴۶، ۲۶۸: ح - مسند احمد: ۱/۲۱۶، ح: ۱۸۷۰] "جب نبی ﷺ کو مکہ سے نکال دیا گیا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "انہوں نے (مکہ والوں نے) اپنے نبی کو نکال دیا، انا اللہ وانا الیہ راجعون، وہ ضرور ہلاک کر دیے جائیں گے۔" تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ بِأَنفُسِهِمْ طَلِبُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾ [الحج: ۳۹] عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "یہ وہ پہلی آیت ہے جو قتال کے بارے میں نازل ہوئی۔" جب مسلمان مدینہ منتقل ہو گئے تو چھوٹی سی اسلامی مملکت قائم ہو گئی۔ کفار نے یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا تو اس آیت میں مسلمانوں کو بھی لڑائی کی اجازت مل گئی۔ یہ تقریباً ہجرت کے پہلے سال کے آخر کا واقعہ ہے، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کفار مکہ کے خلاف کئی مہمیں بھیجیں، جن کے نتیجے میں پہلا فیصلہ کن معرکہ بدر کے مقام پر ہوا، جسے اللہ تعالیٰ نے یوم الفرقان قرار دیا اور جس میں فرشتوں کے ذریعے سے مسلمانوں کی مدد کی گئی۔

③ قتال (لڑائی) ایک نہایت مشکل کام ہے، بے شک موت کا وقت مقرر ہے مگر آدمی جان بچانے کے لیے لڑائی سے جان بچاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قتال فرض کرنے میں تدریج سے کام لیا، پہلے اس آیت کے ذریعے سے قتال کا اذن ملا، پھر "قَاتِلُوا" کے حکم کے ساتھ قتال فرض ہوا، مگر صرف ان لوگوں سے جو لڑائی کریں، جیسا کہ فرمایا: ﴿قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ

يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ﴿ [البقرة: ۱۹۰] ”اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی مت کرو۔“ اس کے بعد تمام کفار سے لڑنا فرض کر دیا گیا، فرمایا: ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ ﴾ [البقرة: ۲۱۶] ”تم پر لڑنا لکھ دیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمہیں ناپسند ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَأَخْضِرُواهُمْ وَأَقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ ﴾ [التوبة: ۵] ”پس جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انہیں پکڑو اور انہیں گھیرو اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ بیٹھو۔“ اور فرمایا: ﴿ تِلْوَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴾ [التوبة: ۲۹] ”لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔“ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَحَسَانَتِهِمْ عَلَى اللَّهِ » [بخاری، الإیمان، باب ﴿ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۲۵۰] ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمام لوگوں سے قتال (لڑائی) کروں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ بے شک محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، پھر جب وہ یہ کام کر لیں تو انہوں نے اپنے خون اور اپنے مال مجھ سے محفوظ کر لیے مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔“ لڑائی کی تدریجاً فرضیت ایسے ہی ہے جیسے شراب تین مرحلوں میں مکمل حرام ہوئی۔ دیکھیے سورہ مائدہ (۹۰) کی تفسیر۔ اسی طرح روزہ تین مرحلوں میں موجودہ صورت میں فرض ہوا۔

① يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا: یعنی مسلمانوں کو قتال کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے، یہ ظلم رسول اللہ ﷺ پر بھی کیا گیا اور مسلمانوں پر بھی۔ عروہ بن زبیر فرماتے ہیں: « سَأَلْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَمْرٍو عَنْ أَشَدِّ مَا صَنَعَ الْمُشْرِكُونَ بِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ رَأَيْتُ عُقْبَةَ بْنَ أَبِي مُعَيْطٍ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُصَلِّي، فَوَضَعَ رِدَاءَهُ فِي عُنُقِهِ فَحَنَقَهُ بِهَا حَنْقًا شَدِيدًا، فَجَاءَ أَبُو بَكْرٍ حَتَّى دَفَعَهُ عَنْهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ﴿ اتَّقَاتُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ ﴾ » [بخاری، فضائل أصحاب النبی ﷺ، باب: ۳۶۷۸] ”میں نے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے پوچھا: ”مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ سخت تکلیف کیا پہنچائی تھی؟“ انہوں نے فرمایا: ”میں نے (بد بخت) عقبہ بن ابی معیط کو دیکھا، وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھا جبکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے، اس نے اپنی چادر آپ کی گردن میں ڈالی اور آپ کا گلا بہت سختی سے گھونٹ دیا تو ابو بکر رضی اللہ عنہما آئے اور اسے دھکیل کر

پچھے بنایا اور کہا: ﴿اَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ [المؤمن: ۲۸] ”کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے، میرا رب اللہ ہے، حالانکہ یقیناً وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیلیں لے کر آیا ہے۔“ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: «كَانَ أَوَّلَ مَنْ أَظْهَرَ إِسْلَامَهُ سَبْعَةَ: رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَبُو بَكْرٍ، وَعُمَارُ، وَأُمُّهُ سُمَيَّةٌ، وَصَهْبَبٌ، وَبِلَالٌ، وَالْمِقْدَادُ، فَأَمَّا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَنْعَهُ اللَّهُ بِعَمِّ أَبِي طَالِبٍ وَأَمَّا أَبُو بَكْرٍ فَمَنْعَهُ اللَّهُ بِقَوْمِيهِ وَأَمَّا سَائِرُهُمْ، فَأَخَذَهُمُ الْمُسْرِشُكُونَ وَالْبَسُوهُمْ أَذْرَاعَ الْحَدِيدِ وَصَهَرُواهُمْ فِي الشَّمْسِ، فَمَا مِنْهُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وَاتَاهُمْ عَلَى مَا أَرَادُوا، إِلَّا بِلَالًا، فَإِنَّهُ هَانَتْ عَلَيْهِ نَفْسُهُ فِي اللَّهِ، وَهَانَ عَلَى قَوْمِيهِ، فَأَخَذُوهُ، فَأَعَطَوْهُ الْوِلْدَانَ، فَجَعَلُوا يَطْلُقُونَ بِهِ فِي شِعَابِ مَكَّةَ وَهُوَ يَقُولُ: أَخَذَ، أَخَذَ» [ابن ماجہ، السنۃ، باب فضل سلمان و ابی ذر والمقداد: ۱۵۰ و صحیحہ الحاکم، والذہبی وابن حبان وغیرہم و الألبانی] ”سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا وہ سات آدمی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمار، ان کی والدہ سیمہ، صہیب، بلال اور مقداد رضی اللہ عنہم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا ابو طالب کے ذریعے سے محفوظ رکھا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کے ذریعے سے محفوظ رکھا۔ باقی سب کو مشرکین نے پکڑ لیا اور انہیں لوہے کی قیسیں پہنا کر دھوپ میں جھلنے کے لیے پھینک دیا۔ چنانچہ ان میں سے جو بھی تھا اس نے اس کے مطابق کہہ دیا جو وہ چاہتے تھے سوائے بلال رضی اللہ عنہ کے۔ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں اس کے نزدیک اس کی جان بے قدر و قیمت ٹھہری (اس نے اپنی جان کی کوئی پروا نہ کی) اور وہ ان لوگوں کی نظر میں ایسا بے قدر و قیمت ٹھہرا کہ انہوں نے اسے پکڑا اور لڑکوں کو دے دیا۔ وہ اسے مکہ کی گھاٹیوں میں پھراتے تھے اور وہ کہتا تھا: اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے۔“ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مشرکین کی بے تحاشا مار کا تذکرہ بھی کتب سیرت میں موجود ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِعَمَّارٍ وَأَهْلِيهِ وَهُمْ يُعَذِّبُونَ فَقَالَ أَبِشْرُوا آلَ عَمَّارٍ وَآلَ يَاسِرٍ فَإِنَّ مَوْعِدَكُمْ الْحَتَّةُ» [مسندک حاکم: ۲۸۳/۳، ح: ۵۶۶۶ و صحیحہ الحاکم و وافقہ الذہبی] ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمار اور اس کے خاندان کے پاس سے گزرے، جب انہیں عذاب دیا جا رہا تھا تو فرمایا: ”اے آل عمار اور آل یاسر! خوش ہو جاؤ، تمہارے وعدے کی جگہ جنت ہے۔“ خواب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ کعبہ کے سائے میں چادر کی ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ہمیں مشرکین کی طرف سے بہت سخت تکلیف پہنچی تھی۔ میں نے کہا: ”کیا آپ اللہ سے دعا نہیں کرتے؟“ آپ (سیدھے ہو کر) بیٹھ گئے اور آپ کا چہرہ (غصے سے) سرخ تھا، فرمایا: ”تم سے پہلے لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا کہ لوہے کی کنگھیوں کے ساتھ ان کی ہڈیوں سے گوشت اور پٹھے چھیل دیے جاتے تھے، یہ چیز انہیں ان کے دین سے نہیں پھیرتی تھی اور انہیں سر کی چوٹی پر آرا رکھ کر دو حصوں میں حیر دیا جاتا، یہ چیز انہیں ان کے دین سے پھیرتی نہ تھی اور (اللہ کی قسم!) یہ کام ضرور پورا ہو کر رہے گا یہاں تک کہ سوار صنعاء سے حضرموت تک چلے گا اور اسے کسی کا خوف نہیں ہوگا سوائے اللہ کے، یا سوائے بیٹھریے کے اس کی

الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقِّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ. وَ لَوْ لَا دَفَعُ اللَّهُ

وہ جنہیں ان کے گھروں سے کسی حق کے بغیر نکالا گیا، صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر بھیڑ بکریوں پر اور لیکن تم جلدی کرتے ہو۔ [بخاری، مناقب الأنصار، باب ما لقي النبي ﷺ وأصحابه من المشركين بمكة: ۶۹۴۳، ۳۸۵۲] کفار نے مسلمانوں پر اس قدر ظلم کیا اور اتنی ایذائیں دیں کہ ان میں سے کچھ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور کچھ مکہ ہی میں ظلم کی پٹی میں پستے رہے، حتیٰ کہ انھوں نے مدینہ کی طرف ہجرت اختیار کی اور رسول اللہ ﷺ بھی ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی ایک دفعہ ہجرت کرنے کے لیے نکلے مگر ابن الدغنة برک الغمام سے انھیں واپس لے آئے، پھر بعد میں وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔

⑤ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ: یعنی اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے، مگر اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر اور انھیں غالب کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ یہاں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ اس وقت مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں مسلمانوں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں تھی، مقابلے میں قریش تھے، جن کی سرداری پورے عرب میں مسلم تھی اور عرب کے تمام مشرک قبائل ان کی پشت پر تھے، بعد میں یہودی بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ اس موقع پر کائنات کے مالک اور شہنشاہ کا یہ فرمان کہ ”بے شک اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً پوری طرح قادر ہے“ یہ جملہ ان مسلمانوں کو قوی اور قائم کر دینے والا تھا جنہیں پورے عرب کے مقابلے کے لیے کہا جا رہا تھا اور کفار کو بھی تنبیہ ہے کہ ان کا مقابلہ چند مسلمانوں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہے، کیونکہ مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کا بیان نہیں بلکہ مراد نصرت کا وعدہ ہے۔

آیت 40 ① الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقِّ.....: یہ آیت دلیل ہے کہ اس سورت کا یہ حصہ مدینہ میں نازل

ہوا ہے۔

② اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے دو ظلم بیان فرمائے ہیں، ایک یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا، جب کہ یہ تمام دنیا کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ جو شخص جہاں رہتا ہے وہاں رہنے میں اور اس کی تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں وہاں کے تمام لوگوں کے ساتھ برابر حق رکھتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اسے اس کے گھر سے نکال باہر کرے۔ دوسرا ظلم یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کو صرف اس جرم کی وجہ سے ان کے گھروں سے نکالا کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب صرف اللہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جرم ہے ہی نہیں بلکہ عین عدل ہے اور یہ گھروں سے نکالنے کا باعث نہیں بلکہ امن و سکون سے اپنے گھروں میں سکونت کا ضامن ہے۔ دراصل اس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی ایسے طریقے سے تعریف فرمائی ہے کہ ان سے ہر جرم کی نفی کر کے اس چیز کو ان کا جرم بیان کیا ہے جو حقیقت میں جرم نہیں خوبی ہے، جیسا کہ عرب کے ایک شاعر نے کچھ لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

وَلَا غَيْبَ فِيهِمْ غَيْرَ أَنْ سَيُوفُّهُمْ بِهِمْ فُلُوقٌ مِنْ قِرَاعِ الْكُنَابِ

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

النَّاسَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ تَهَدِمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَسَجِدٌ يُدْكَرُ فِيهَا اسْمُ
اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَ لِيُنْصِرَنَّ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿۵﴾

اللہ کا لوگوں کو ان کے بعض کو بعض کے ذریعے ہٹانا نہ ہوتا تو ضرور ڈھادیے جاتے (راہبوں کے) جھونپڑے اور (نصرانیوں کے) گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں، جن میں اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا جاتا ہے اور یقیناً اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، سب پر غالب ہے ﴿۵﴾

”ان میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ ان کی تلواروں میں دشمن کے لشکروں سے کھٹکھٹانے کی وجہ سے دندانے پڑے ہوئے ہیں۔“ ظاہر ہے کہ جسے وہ عیب کہہ رہا ہے وہ دراصل بہت بڑی خوبی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقامات پر بھی کفار کا یہ ظلم یاد دلا کر مسلمانوں کو ان کی دوستی سے منع فرمایا ہے، فرمایا: ﴿يُخْرِجُونَ الرِّسَالَ وَ إِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ﴾ [المنحة: ۱] ”وہ رسول کو اور خود تمہیں اس لیے نکالتے ہیں کہ تم اللہ پر ایمان لائے ہو۔“

﴿۵﴾ وَلَوْلَا دَفَعَهُ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ : ”صَوَامِعُ“ ”صَوْمَعَةٌ“ کی جمع ہے، وہ عبادت خانہ جو عیسائی راہب آبادیوں سے دور اونچے مینار کی شکل میں بناتے تھے، جس کی اوپر کی منزل میں وہ اکیلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہتے اور مینار کی چوٹی پر عموماً رات کو چراغ جلاتے، تاکہ مسافر راستہ معلوم کر سکیں اور چلی منزل میں قیام کر سکیں۔ امرؤ القیس نے کہا ہے:

تُضِيءُ الظَّلَامَ بِالْعِشِيِّ كَأَنَّهَا
مَنَارَةٌ مُنْسِي رَاهِبٍ مُسْتَبِيلٍ

”بیعہ“ ”بیعَةٌ“ کی جمع ہے، آبادیوں میں نصرانیوں کے گرجے۔ ”صَلَوَاتٌ“ یہودیوں کے عبادت خانے، یہ ”صَلَاةٌ“ کی جمع ہے۔ شاید ان کا نام ”صَلَوَاتٌ“ اس لیے رکھا گیا ہو کہ یہودیوں کو صرف اپنے عبادت خانے میں نماز پڑھنا لازم تھا۔ بعض کہتے ہیں یہ ”صلواتا“ کی جمع ہے جو غیر عربی لفظ ہے اور یہودیوں کے معبد خانے پر بولا جاتا ہے۔ ”كَهَنَاتٌ“ باب تفصیل کی وجہ سے ترجمہ ہوگا ”بری طرح ڈھادیے جاتے“ یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام ہی ایسا رکھا ہے کہ ہر چیز، ہر شخص اور ہر جماعت، دوسری چیز، یا شخص یا جماعت کے مقابلے میں اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے جنگ کرتی رہے، اگر ایسا نہ ہوتا اور نیکی کو اللہ تعالیٰ اپنی حمایت میں لے کر ہدی کے مقابلے میں کھڑا نہ کرتا تو نیکی کا نشان تک زمین پر باقی نہ رہتا۔ بے دین اور شریر لوگ، جن کی ہر زمانے میں کثرت رہی ہے، تمام مقدس مقامات اور شعائر اللہ کو ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے مٹا دیتے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ہدی کی طاقتیں کتنی ہی جمع ہو جائیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وقت آئے جب نیکی کے ہاتھوں ہدی کے حملوں کا دفاع کرایا جائے اور حق تعالیٰ اپنے دین کی مدد کرنے والوں کی خود مدد فرما کر ان کو دشمنان حق پر غالب کرے۔ بہر حال اس وقت مسلمانوں کو ظالم کافروں کے مقابلے میں جہاد و قتال کی اجازت دینا اسی قانون قدرت کے ماتحت تھا اور یہ وہ عام قانون ہے جس کا انکار کوئی عقل مند نہیں کر سکتا۔ اگر دفاع و حفاظت کا یہ قانون نہ ہوتا تو اپنے اپنے زمانے میں نہ نصرانی راہبوں کے صوامع قائم رہتے اور نہ نصاریٰ کے گرجے، نہ یہود کے عبادت خانے اور نہ مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

الَّذِينَ إِنْ مَكَتَهُمْ فِي الْأَرْضِ آقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآتَوْا بِالْمَعْرُوفِ وَ

وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھے کام کا حکم دیں گے اللہ کا ذکر بڑی کثرت سے ہوتا ہے، یہ سب عبادت گاہیں گرا کر اور بری طرح ڈھا کر ملیا میٹ کر دی جائیں۔ تو اس عام قانون کے تحت کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کو ایک مناسب وقت پر اپنے دشمنوں سے لڑنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس مضمون کی ایک اور آیت کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۲۵۱)۔

④ اس آیت سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے، ان کو سمار نہ کیا جائے، کیونکہ ان میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے، البتہ بت خانے اور آتش کدے صرف اس صورت میں باقی رکھے جائیں گے جب کسی قوم سے معاہدے میں انہیں باقی رکھنا شامل ہو۔

⑤ وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَتَخَصَّصُ: اللہ کی مدد سے مراد اللہ کے دین کی مدد ہے، کیونکہ اس نے خود فرمایا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ [فاطر: ۱۵] ”اے لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ ہی سب سے بے پروا، تمام تعریفوں کے لائق ہے۔“ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی خود بھی اس کے دین کو فروغ دینے کی کوشش کرے۔ دین کی مدد دلیل و برہان کے ساتھ بھی ہے اور سیف و سنان کے ساتھ بھی، اسی طرح جان کے ساتھ بھی ہے اور مال کے ساتھ بھی، پھر ہاتھوں کے ساتھ بھی ہے اور زبان کے ساتھ بھی، غرض ہر طرح سے اللہ کے دین کی مدد لازم ہے اور جو بھی یہ فریضہ سرانجام دے گا اللہ تعالیٰ اس کی یقیناً ضرور مدد فرمائے گا، خواہ اس کے لیے نصرت کے دنیوی اسباب مہیا فرمادے یا غیب سے اپنے لشکروں میں سے کسی لشکر کے ساتھ مدد کر دے، فرمایا: ﴿وَمَا يَعْزِمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ﴾ [المدثر: ۳۱] ”اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“ جیسے بدر میں فرشتوں کے ذریعے سے مدد فرمائی (انفال: ۹) اور خندق میں آندھی اور ان لشکروں کے ذریعے سے مدد فرمائی جو تم نے نہیں دیکھے۔ (احزاب: ۹)

⑥ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ: بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، سب پر غالب ہے۔ جس کی وہ مدد کرے یقیناً وہی غالب ہوگا اور اس کا مد مقابل مغلوب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ پورا فرمایا اور اپنے دین کی مدد کرنے والے انصار و مہاجرین اور ان کے پیروکاروں کے ہاتھوں زمین کے جاہل و طاہر بادشاہوں کو مغلوب و مقہور کر کے مشرق سے مغرب تک اسلام کا بول بالا کر دیا۔ ﴿وَمَنْ أٰصَدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا﴾ [النساء: ۸۷] ”اور اللہ سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہے؟“

سیت 41 ① الَّذِينَ إِنْ مَكَتَهُمْ فِي الْأَرْضِ: اس سے پہلے جن لوگوں کا ذکر ہوا ہے کہ انہیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا اور وہ گھروں سے صرف توحید الہی کے جرم میں نکالے گئے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کی ضرور مدد کرے گا، انہی کے متعلق اللہ تعالیٰ بیٹگی بیان فرما رہے ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں اقتدار بخشا تو وہ چار کام سرانجام

نَهَوْا عَنِ الشُّكْرِ ۖ وَ لِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿۳۱﴾

اور برے کام سے روکیں گے، اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضہ میں ہے ﴿۳۱﴾

دیں گے۔ پہلا اور دوسرا یہ کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ نبی ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہد میں اقامتِ صلاۃ کا ایسا مضبوط نظام قائم تھا کہ حدیث و سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں دوسرے گناہوں کے ارتکاب کا اور ان کی سزا کا ذکر آپ پر نہیں ہے مگر ایک بھی شخص نہیں پائیں گے جو نماز نہ پڑھتا ہو یا زکوٰۃ نہ دیتا ہو اور اسے مسلمان سمجھا جاتا ہو، حتیٰ کہ منافقین کو بھی اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دینے کے لیے مسجدوں میں آکر نماز پڑھنا پڑتی تھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَدِّعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالَىٰ يُبْزَأُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [النساء: ۱۴۲] ”بے شک منافق لوگ اللہ سے دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ وہ انھیں دھوکا دینے والا ہے اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت کم۔“ اور سب جانتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو ابو بکرؓ نے فرمایا تھا: ﴿وَاللَّهِ! لَا قَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ﴾ [بخاری، الزکاة، باب وجوب الزکاة: ۱۴۰۰] ”اللہ کی قسم! میں ہر صورت اس سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرے گا۔“ مسلمانوں کے زوال کا آغاز اس دن سے ہوا جب کچھ حکمرانوں نے ان لوگوں کا موقف اختیار کیا جو کہتے تھے کہ کوئی نماز پڑھے یا نہ پڑھے، زکوٰۃ دے یا نہ دے، اس کے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، وہ پکا مسلمان ہے۔ کچھ لوگ یہاں تک پہنچ گئے کہ ایمان سب کا ایک جیسا ہے، اس میں کمی یا اضافہ نہیں ہوتا، اس لیے ہمارا اور ابو بکرؓ کا اور ہمارا اور جبریلؑ کا ایمان برابر ہے۔ آج کل بعض حضرات کی جماعتیں پوری دنیا میں نماز کی دعوت دیتی پھرتی ہیں مگر خود ان کے خویش و اقارب اور بیویاں اور اولاد بے نماز ہیں، اس کے باوجود وہ انھیں سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ اپنا کاروبار اور جائیداد انھی کے سپرد رکھتے ہیں۔ اصل سبب عقیدے کی خرابی ہے کہ وہ بے نماز اور نمازی دونوں کے ایمان کو برابر سمجھتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ ایمان صرف تصدیق اور اقرار کا نام ہے، اگر آج ”أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنُؤُوا الزَّكَاةَ“ کا فریضہ سرانجام دینے والے صدیق و فاروق اور عثمان و علیؓ تھے ہوتے تو ہم دیکھتے کہ یہ لوگ کس طرح نماز اور زکوٰۃ کے بغیر مسلمان کی حیثیت سے دندناتے پھرتے، بلکہ اپنے آپ کو نمازیوں سے بہتر مسلمان قرار دیتے رہتے۔

تیسرا اور چوتھا وصف یہ بیان فرمایا کہ وہ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اس آیت سے خلفائے راشدین کی خلافت برحق ثابت ہوتی ہے، کیونکہ انھوں نے صلاۃ و زکوٰۃ کے علاوہ صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا۔ اللہ کی حدود قائم کیں، جن کی برکت سے حیرہ سے چل کر اکیلی خاتون نے بیت اللہ کا حج کیا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ تھا۔ جہاد کے ذریعے سے دنیا کو توحید کی دعوت دی اور شرک و کفر سے منع کیا اور قیصر و

کسرٹی اور عرب کے بڑے بڑے جاہروں کو شکست فاش دے کر ان کے خزانے فتح کیے اور ان کی اقوام کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا۔ جو خوشی سے اس دائرے میں نہیں آیا اسے زبردستی مسلمان نہیں بنایا مگر اس سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جب تک اس نے جزیہ ادا کرنے کا اقرار کر کے اسلام کا محکوم بنا قبول نہیں کیا۔ خلفائے راشدین کے بعد وہ خلفاء بھی اس بشارت میں شامل ہیں جنہوں نے یہ چاروں امور پوری طرح سرانجام دیے۔ کس قدر بدنصیب ہیں وہ لوگ جو ان عظیم ہستیوں سے بغض رکھتے ہیں کہ جن کے اوصاف حسنا اور اعمال صالحہ کی شہادت اللہ تعالیٰ انہیں اقتدار عطا کرنے سے پہلے دے رہا ہے۔

② آج بھی اللہ تعالیٰ کا نصرت کا وعدہ انہی لوگوں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ اقتدار عطا فرمائے تو وہ یہ چاروں کام سرانجام دیں۔ اس کے نتیجے میں انہیں اقوام عالم پر غلبہ حاصل ہوگا، اسی کے نتیجے میں معاشی بدحالی ختم ہو کر فلاحی مملکت قائم ہوگی اور اسی کے نتیجے میں امن قائم ہوگا۔ افسوس! مسلمان حکام ان چاروں چیزوں کو چھوڑ کر کفار کے طریقوں، جمہوریت، سود، بے حیائی کے فروغ، آخرت سے دوری اور صرف دنیا طلبی کے پیچھے لگ کر یہ توقع کر رہے ہیں کہ اس سے دنیا پر غلبہ حاصل ہوگا، خوش حالی آئے گی اور امن قائم ہوگا، حالانکہ یہ ممکن ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ہر بیماری کا علاج صرف اور صرف اللہ کے فرمان پر عمل ہے۔

③ اللہ کا یہی وعدہ اور بشارت سورہ نور میں بھی مذکور ہے، فرمایا: ﴿وَعَنْ اللَّهِ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ [النور: ۵۵]

”اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں ضروری جانشین بنائے گا، جس طرح ان لوگوں کو جانشین بنایا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو ضروری اقتدار دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ہر صورت انہیں ان کے خوف کے بعد بدل کر امن دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں گے اور جس نے اس کے بعد کفر کیا تو یہی لوگ نافرمان ہیں۔“

④ ﴿وَاللَّهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾: مفسر بقائے نے اس ”واو“ کے تحت بہت خوب صورت نکتہ بیان فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس ”واو“ کا جس جملے پر عطف ہے وہ یہاں ذکر نہیں ہوا، جہاد کے حکم اور اس کی حکمت ”وَلَوْ لَا دَفَعُ اللَّهُ النَّاسَ“ کی مناسبت سے کلام یہ ہے کہ ”فَلِلَّهِ بَادِئَةُ الْأُمُورِ وَاللَّهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ“ یعنی پہلے کفار کے مسلمانوں کو طویل عرصہ تک بے حد ایذا کی مہلت دینے اور اب مسلمانوں کو جہاد کی اجازت اور نصرت کے وعدے کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام امور کی ابتدا بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ وہ شروع میں بعض اوقات کفار کو مہلت دے دیتا ہے، جس سے ان پر اتمام حجت مقصود ہوتا ہے اور ایمان کے دعوے داروں کا امتحان مقصود ہوتا ہے، تاکہ سچا اور جھوٹا اور مذہب ایمان اور مستحکم ایمان والا ظاہر ہو جائے اور بعض اوقات شروع ہی میں مسلمانوں کی مدد کر دیتا ہے۔ پس تمام کاموں کا آغاز صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور تمام کاموں کا انجام بھی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ”بَادِئَةُ الْأُمُورِ“ کے حذف اور ”عَاقِبَةُ الْأُمُورِ“ کے ذکر سے مسلمانوں کو حوصلہ دیا ہے کہ ابتدا

وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودٌ ﴿۳۸﴾ وَقَوْمَ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمَ لُوطٍ ﴿۳۹﴾ وَأَصْحَابُ مَدْيَنَ ۚ وَكَذَّبَ مُوسَىٰ فَأَمَلَيْتُ لِلْكَافِرِينَ ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ

كَانَ نَكِيرٌ ﴿۴۰﴾

اور اگر وہ تجھے جھٹلائے تو بے شک ان سے پہلے قوم نوح اور عاد اور ثمود نے جھٹلایا ﴿۳۸﴾ اور ابراہیم کی قوم نے اور لوط کی قوم نے ﴿۳۹﴾ اور مدین والوں نے۔ اور موسیٰ کو جھٹلایا گیا تو میں نے ان کافروں کو مہلت دی، پھر میں نے انہیں پکڑ لیا تو میرا عذاب کیا تھا؟ ﴿۴۰﴾

میں تو بعض اوقات اللہ کے دشمنوں کو بھی سوغ مل جاتا ہے مگر انجام تمہارا ہی ہے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے، چاہے تو دنیا میں بھی انجام مسلمانوں کے حق میں کر دے اور چاہے تو اس وقت ان کے حق میں کر دے جب ہر کام اپنے انجام کو پہنچ جائے گا اور جب اللہ تعالیٰ کے سوا سب کا اختیار ختم ہو جائے گا (انفطار: ۱۹) بلکہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی بول بھی نہیں سکے گا۔ (نبا: ۲۸) پھر جو جہنم سے بچ گیا اور جنت میں داخل ہو گیا تو وہی کامیاب ہے اور اسی کا انجام بخیر ہے۔ دیکھیے سورہ آل عمران (۱۸۵)۔

آیت 42: 44 ﴿۱﴾ وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ: آیت کے شروع میں ”واو“ کا عطف ایک محذوف جملے پر ہے اور وہ محذوف جملہ اور یہ مذکور جملہ دونوں ترغیب و ترہیب پر مشتمل چھپی آیات کا حاصل بیان کر رہے ہیں۔ وہ جملہ یہ ہے: ”فَإِنْ آمَنُوا بِكَ مَكِّنَّا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ أَخَذْنَا مِنْهُمُ الْغَنَاءَ“ (یہ سب کچھ سن کر) تجھ پر ایمان لے آئیں تو ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں گے اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو میں انہیں پکڑ لوں گا۔“ پہلا جملہ سننے والے کی سمجھ کے سپرد کر کے حذف کر دیا ہے اور ”وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ“ کا اس پر عطف ڈالا ہے۔ (بقائے) قرآن مجید میں بعض مقامات پر اس حذف شدہ جملے جیسے جملے مذکور بھی ہیں، مثلاً: ﴿فَإِنْ آمَنُوا بِبَشِيرٍ مَّا أُنذِرْتُمْ بِهِ فَقَدْ حَسَدْتُمْ وَآؤَانِ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ﴾ [البقرہ: ۱۳۷] ”پھر اگر وہ اس جیسی چیز پر ایمان لائیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو یقیناً وہ ہدایت پا گئے اور اگر پھر جائیں تو وہ محض ایک مخالفت میں (پڑے ہوئے) ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ احْتَدُوا وَآؤَانِ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ﴾ [آل عمران: ۲۰] ”پس اگر وہ تابع ہو جائیں تو بے شک ہدایت پا گئے اور اگر وہ منہ پھیر لیں تو تیرے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكُمْ مَآخِذُ مَا كَفَرْتُمْ ۚ وَإِن تَطِيعُوا فَعَمَلُكُمْ لِلَّهِ﴾ [النور: ۵۴] ”کہہ دے اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو، پھر اگر تم پھر جاؤ تو اس کے ذمے صرف وہ ہے جو اس پر بوجھ ڈالا گیا ہے اور تمہارے ذمے وہ جو تم پر بوجھ ڈالا گیا اور اگر اس کا حکم مانو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔“

”وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ“ یہ جملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو تسلی دینے اور ان کا غم دور کرنے کے لیے فرمایا ہے، یعنی اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو میں انہیں پکڑ لوں گا، خواہ وہ کتنی قوت رکھتے ہوں، میں نے ان سے پہلے عمر، قد و قامت، قوت و شوکت، مال و متاع، حبش و نجاست اور حکومت و اقتدار میں ان سے کہیں بڑھی ہوئی قوموں کو، جب وہ باز نہ آئے تو پکڑ لیا اور وہ میری کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

فَكَأَيُّنَ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا وَ يَبْنِي مَعْظَمَهَا وَقَصْرٍ مَشِيدٍ ﴿۵﴾

سو کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے اس حال میں ہلاک کیا کہ وہ ظالم تھیں، پس وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی ہیں اور کتنے ہی بے کار چھوڑے ہوئے کنویں ہیں اور چوننا گھمبیل ﴿۵﴾

گرفت سے بچ نہ سکے، تو مکہ کے ان کافروں کی کیا بساط ہے؟ اس لیے آپ غم زدہ نہ ہوں۔ آپ سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے جھٹلایا، جن کی عمریں سب لوگوں سے زیادہ اور جن کا اقتدار نہایت مضبوط تھا اور عادی نے جو بہت لمبے اور نہایت مضبوط قد رکھتے تھے، جن کے بعد ان جیسی قوم پیدا نہیں ہوئی اور شمو، جنھوں نے میدانوں میں اور پہاڑوں میں چٹانیں تراش کر نہایت مضبوط اور بلند و بالا عمارتیں بنا رکھی تھیں اور ابراہیم علیہ السلام کی قوم کو جو جبر و تکبر میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور لوط علیہ السلام کی خبیث اور نجس قوم کو اور مدین والوں کو جنھوں نے حرام طریقے سے کمائے ہوئے مال کے خزانے جمع کر رکھے تھے۔

﴿۲﴾ وَكَذَّبَ قَوْمِي: موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ سب لوگوں کو نظر آنے والے اتنے معجزے عطا کیے گئے جو اس سے پہلے کسی کو عطا نہیں ہوئے تھے، اس لیے ان کی تکذیب انتہائی بعید بات تھی، لہذا اللہ تعالیٰ نے کلام کا اسلوب بدل دیا اور اس لیے بھی بدل دیا کہ پہلے ذکر کردہ تمام انبیاء کی اقوام نے انھیں جھٹلایا تھا جب کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل نے انھیں چند ایک کے سوا نہیں جھٹلایا، صرف فرعون کی قوم قبطیوں نے انھیں جھٹلایا تھا۔ رہی بنی اسرائیل کی نافرمانیاں تو وہ موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا سمجھنے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس قوم کی بد عملی اور طبیعت کی حسرت کی وجہ سے تھیں۔

﴿۳﴾ قَامَلَيْتُ لِلْكَافِرِينَ فِتْنَةٌ أَخَذْتُهُمْ: اس میں آپ ﷺ کو اور مسلمانوں کو دلاسا اور تسلی دی ہے کہ میں نے مکہ کے کفار کو بھی اسی طرح مہلت دی ہے، اب جنگ کی اجازت ہے، اگر یہ ایمان لے آئیں تو خیر، ورنہ ان پر بھی میری پکڑ مہاجرین و انصار کی یلغار کی صورت میں تیار ہے۔

﴿۴﴾ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ: ”نیکیر“ کی ”راء“ کے نیچے کسرہ ہے، کیونکہ اصل میں ”نکیر“ تھا، میرا عذاب۔ ”یاء“ کو تخفیف کے لیے اور فواصل یعنی آیات کے آخری الفاظ (مثلاً كَقَوْمِ، عَزِيزٌ، الْاَقْوَمِ، مَشِيْدٌ، الصُّدُوْرِ وغیرہ) کی موافقت کے لیے حذف کر دیا گیا۔ ان پر آنے والے عذابوں کی تفصیل سورہ العنکبوت میں ہے، فرمایا: ﴿فَقَلَّلاً اَخَذْنَا يَذُنْبِهِ فَبُنْهُم مِّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَّ مِنْهُم مَّنْ اَخَذْتُهُ الصَّيْحَةُ وَّ مِنْهُم مَّنْ حَسَفْنَا بِهٖ الْاَرْضَ وَّ مِنْهُم مَّنْ اَغْرَقْنَا وَّ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُظْلِمَهُمْ وَّلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [العنکبوت: ۴۰] ”تو ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑ لیا، پھر ان میں سے کوئی وہ تھا جس پر ہم نے پتھر ڈالی ہوا بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے چیخ نے پکڑ لیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے اور لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔“

آیت 45 ﴿۱﴾ فَكَأَيُّنَ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ.....: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۲۵۹) کی تفسیر۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا

پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے لیے ایسے دل ہوں جن کے ساتھ وہ سمجھیں، یا کان ہوں جن
 ”بٹٹو“ مونت سمای ہے، اس لیے اس کی صفت ”مُعْظَلَّةٌ“ آئی ہے۔ ”مَشِينًا“ ”شَادَ يَشِينُ شَيْئًا“ (ض) سے اسم مفعول
 ہے، چونے کے ساتھ مضبوط کیا ہوا۔ یہ مجرد ثلاثی سے ہے، جب کہ سورہ نساء کی آیت (۷۸): ﴿وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ
 مُّشِينًا﴾ میں باب تفعیل یعنی ثلاثی مزید استعمال ہوا ہے جس میں مبالغہ ہوتا ہے، کیونکہ وہاں موت کا ذکر ہے کہ خواہ تم
 چونے کے ساتھ بنے ہوئے محکم سے محکم قلعوں میں ہو موت تمہیں وہاں بھی نہیں چھوڑے گی۔ موت کی دسترس کے اظہار کے
 لیے ”مُشِينًا“ (باب تفعیل) لایا گیا، جب کہ پرانے محلات خواہ کس قدر مضبوط ہوں آخر وہ پختگی باقی نہیں رہتی، اس لیے
 صرف ”مَشِينًا“ (ثلاثی مجرد) پر اکتفا کیا گیا۔ ”مَشِينًا“ کا ایک معنی بلند بھی ہے۔

② یہ سات اقوام جن کا ذکر ہوا ہے، کثرت و قوت میں تمام اقوام سے بڑھ کر تھیں۔ ان کے علاوہ ان کے عہد میں اور بعد
 کے زمانوں میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس طرح کی کتنی تو میں گزری ہیں؟ ان سب کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت
 بیان فرمائی کہ پہلے انہیں مہلت دی جاتی ہے، پھر اگر وہ اس سے فائدہ اٹھا کر ایمان لے آئیں تو خیر، ورنہ انہیں ہلاک کر دیا
 جاتا ہے۔ اگرچہ ترتیب کے مطابق پہلے مہلت کا اور پھر پکڑنے کا ذکر ہونا چاہیے تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے جھٹلانے کے انجام بد سے
 ڈرانے کے لیے ایسی اقوام کی کثرت، ان کی قوت و شوکت اور ان کی تباہی و بربادی کی یاد دلانے والے آثار قدیمہ کا بیان
 پہلے فرمایا اور آیت (۳۶) میں دوبارہ انہیں مہلت دینے کے بعد پکڑنے کا ذکر فرمایا۔ سوار شاد فرمایا کہ کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں
 ان کے ظلم اور کفر ان نعمت کی پاداش میں ہم نے ہلاکت اور تباہی کے گھاٹ اتار دیا۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ ان کی چھتیں
 بوسیدہ ہو کر گرنے کے بعد ان کی دیواریں بھی ان پر گری پڑی ہیں اور کتنے ہی کنویں ہیں جو کبھی آبادی کا مرکز تھے اور ان پر
 پانی کے لیے آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اب اجاز اور دیران پڑے ہیں۔ عربوں کے ہاں پانی کی قلت کی وجہ
 سے کنوؤں کا خصوصاً ذکر فرمایا۔ اسی طرح کتنے ہی چونے کے ساتھ مضبوط بنے ہوئے بلند و بالا اور پڑھکوا ایوان اور محلات
 ہیں، جن میں ہر وقت چہل چہل رہتی تھی اور جن کی حفاظت کے لیے دن رات ہزاروں فوجیوں کا پہرا ہوتا تھا، اب ان پر کوؤں،
 چیلوں اور الوؤں کی حکومت ہے۔

آیت 46 ﴿۱﴾ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ : عرب کے لوگ تجارت کے لیے دور دراز سفر کرتے تھے، چنانچہ وہ

گرمیوں میں شام کی طرف اور سردیوں میں یمن کی طرف جاتے تھے۔ سورہ قریش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے اس انعام کا
 خاص طور پر ذکر فرمایا ہے۔ یمن قوم عاد کا مسکن تھا اور شام کے سفر میں عدان صالح اور قوم لوط کی تباہ شدہ بستیوں پر سے ان کا
 گزر ہوتا تھا، قوم لوط کے متعلق فرمایا: ﴿وَإِنَّكُمْ لَسَرُودُونَ عَلَيْهِمْ فَضْحِينَ ۖ وَأَبَائِنَا أَفَلًا تَعْقِلُونَ﴾ [الصافات: ۱۳۷،
 ۱۳۸] ”اور بلاشبہ تم یقیناً صبح جاتے ہوئے ان پر سے گزرتے ہو اور رات کو بھی۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں؟“ اور قوم لوط اور قوم
 کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

قَائِمًا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَ لَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴿۳۱﴾

کے ساتھ وہ سنیں۔ پس بے شک قصہ یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں اور لیکن وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں

میں ہیں ﴿۳۱﴾

شعیب (اصحاب الایکہ) کے متعلق فرمایا: ﴿وَإِنَّهَا لَيَأْتَانَهُ نُبُيْنٌ﴾ [الحجر: ۷۹] ”اور بے شک وہ دونوں (بستیاں) یقیناً ظاہر راستے پر موجود ہیں۔“ مدین کا علاقہ بھی حجاز کے شمال مغرب میں واقع تھا۔ سفر میں آدمی کو مالی فوائد کے علاوہ علمی فوائد اور بے شمار تجربات اور عبرتیں حاصل ہوتی ہیں اور سفر کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے۔ ابوالعلاء المعری کہتا ہے۔

و قَبِلَ أَفَادَ بِالْأَسْفَارِ مَالًا فَقُلْنَا هَلْ أَفَادَ بِهَا فُؤَادًا

”لوگوں نے بتایا کہ اس نے مختلف سفروں میں بہت سا مال حاصل کیا ہے، تو ہم نے کہا، کیا اس نے ان سے کوئی دل بھی حاصل کیا ہے؟“ یعنی اسے سفروں سے کچھ عقل و دانش اور فصیحت و عبرت بھی حاصل ہوئی ہے؟ اس آیت میں ان لوگوں سے جنہوں نے یہ سفر کیے تھے، کہا جا رہا ہے کہ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ مختلف قوموں کے آثار قدیمہ دیکھ کر ان کے دل عقل کرتے اور فصیحت و عبرت حاصل کرتے، یا لوگوں سے سن کر ہی عبرت حاصل کرتے؟ مقصد یہ ہے کہ سفر کا فائدہ تو سوچنا سمجھنا اور عبرت حاصل کرنا ہے اور بے شک تم نے ان سفروں میں آنکھوں سے بہت کچھ دیکھا اور کانوں سے بہت کچھ سنا مگر جب اس سے عبرت اور عقل حاصل نہیں کی تو سمجھو کہ تم آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے اور کان رکھنے کے باوجود بہرے ہو، فرمایا: ﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الدَّيْبِيِّ يُنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دَعْوَاءَ وَبِدَاءَ صُحُفٍ بَلْ كَرِهَتْ أَعْيُنُهُمْ أَنْ يَعْقِلُونَ﴾ [البقرة: ۱۷۶] ”اور ان لوگوں کی مثال جنہوں نے کفر کیا، اس شخص کی مثال جیسی ہے جو ان جانوروں کو آواز دیتا ہے جو بپکار اور آواز کے سوا کچھ نہیں سنتے، بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو وہ نہیں سمجھتے۔“ گویا جس کا دل عقل سے خالی ہے اس کی آنکھوں اور کانوں کا اسے کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اس آیت میں ان لوگوں کو جنہوں نے سفر نہیں کیا، ترغیب دی جا رہی ہے کہ دنیا میں چلو پھرو، اس سے تمہاری آنکھیں دیکھ کر اور کان سن کر عبرت و فصیحت حاصل کریں گے۔

﴿۳۱﴾ قَائِمًا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ : ”اِنِّ“ کے بعد ”ہا“ ضمیر قصہ کہلاتی ہے، یہ مذکر بھی آتی ہے، جیسا کہ اس آیت کی ایک قراءت ”فَائِدَةٌ لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ“ بھی ہے، اس وقت اسے ضمیر شان کہتے ہیں، معنی دونوں کا ایک ہی ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ..... بینائی دو قسم کی ہے، ایک آنکھوں کی بینائی، اسے بصارت کہتے ہیں اور ایک دل کی بینائی، اسے بصیرت کہتے ہیں۔ اسی طرح اندھا پن بھی دو قسم کا ہے، ایک آنکھوں کا اندھا ہونا اور ایک دل کا اندھا ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔ یہاں آنکھوں کے اندھا نہ ہونے کا مطلب ہے کہ آنکھیں اندھی ہونے سے کچھ نقصان نہیں، اصل نقصان دل اندھا ہونے اور بصیرت سے محروم ہونے کا ہے۔

﴿۳۲﴾ بعض اہل علم نے بصارت اور بصیرت کی مثال سواری اور سوار کی بیان فرمائی ہے، اگر سوار دیکھتا ہے تو سواری اندھی ہونے

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۗ وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ

فَمَا تَعْدُونَ ﴿۴۷﴾

اور وہ تجھ سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اللہ ہرگز اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرے گا اور بے شک ایک دن تیرے رب کے ہاں ہزار سال کے برابر ہے، اس گنتی سے جو تم شمار کرتے ہو ﴿۴۷﴾

کا خاص نقصان نہیں، لیکن اگر سوار اندھا ہے تو سواری کی نگاہ جتنی بھی تیز ہو کچھ فائدہ نہیں۔

④ موجودہ سائنس کا کہنا ہے کہ سوچنا سمجھنا دماغ کا کام ہے دل کا نہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس دل کو عقل کا مرکز قرار دیا ہے جو سینے میں ہے، اس دماغ کو نہیں جو سر میں ہے۔ اب بعض لوگوں نے کہا کہ قرآن نے سائنس کی زبان میں بات نہیں کی، ادبی زبان میں بات کی ہے مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ سائنس کے نظریات بدلتے رہتے ہیں، جب کہ اللہ کا فرمان اٹل ہے اور کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ دماغ کو خون دل ہی سے پہنچتا ہے، عین ممکن ہے کہ دماغ محض ایک سٹور ہو جس کا مٹن دل میں ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے اور بے شمار دفعہ ہوا ہے کہ یہاں بھی سائنس اصل حقیقت تک پہنچ جائے اور دل کو عقل کا مرکز تسلیم کر لے۔

آیت 47 ﴿۴۷﴾ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ: مشرکین رسول اللہ ﷺ سے جلد از جلد عذاب لانے کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ اس مطالبے سے ان کا مقصد عذاب آنے کا انکار اور نبی ﷺ کو جھٹلانا، آپ کا مذاق اڑانا اور آپ کو لاجواب کرنا تھا۔ قرآن مجید نے ان کے اس مطالبے کا کئی جگہ ذکر فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ [الانبیاء: ۲۸] ”اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو۔“ اور فرمایا: ﴿وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَوْلَا أَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاءَهُمُ الْعَذَابُ﴾ [العنکبوت: ۵۳] ”اور وہ تجھ سے جلدی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر ایک مقرر وقت نہ ہوتا تو ان پر عذاب ضرور آجاتا۔“ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے براہ راست عذاب کی دعا سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے: ﴿وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطْعَانًا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ﴾ [ص: ۱۶] ”اور انھوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمیں ہمارا حصہ یوم حساب سے پہلے جلدی دے دے۔“ اور فرمایا: ﴿وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِن كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِن عِنْدِكَ فَاصْرِفْ عَلَيْنَا حَسَارَةَ مِن السَّمَاءِ أَوْ ابْتِنَا بِعَذَابِ الْيَوْمِ﴾ [الأنفال: ۳۲] ”اور جب انھوں نے کہا اے اللہ! اگر صرف یہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسسا، یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ۔“

② وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ: مشرکین جس یقین کے ساتھ عذاب نازل ہونے کو جھٹلاتے تھے اسی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف ہرگز نہیں کرے گا، جو اس نے فرمایا ہے ہو کر رہے گا، مگر اس وقت پر جو اس نے مقرر فرمایا ہے۔

③ وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ.....: یعنی رب تعالیٰ تمہاری طرح تنگ طرف اور جلد باز نہیں بلکہ بے حد حلیم اور وسعت والا ہے۔ اس کی دی ہوئی تھوڑی سی مہلت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے، تمہارا ایک ہزار سال اس کے نزدیک صرف ایک دن ہے، وہ

وَكَايِنَ مِنْ قَرْيَةٍ أَمَلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا ۗ وَإِلَى النَّصِيرِ ﴿۸۸﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ ﴿۸۹﴾

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں میں نے مہلت دی، اس حال میں کہ وہ ظالم تھیں، پھر میں نے انہیں پکڑ لیا اور میری ہی طرف لوٹ کر آتا ہے ﴿۸۸﴾ کہہ دے اے لوگو! میں تو بس تمہارے لیے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿۸۹﴾

اتنا عظیم ہے کہ آدھے دن کی مہلت دے تو وہ بھی پانچ سو برس ہوگی اور ایک گھنٹہ کی مہلت دے تو چالیس برس سے زیادہ ہوگی۔ اس کے علم کی وجہ یہ ہے کہ وہ انتقام پر قادر ہے، کوئی چیز اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتی، خواہ وہ کتنی مہلت دے یا ری دراز کرے۔

آیت 48 ﴿۱﴾ وَكَايِنَ مِنْ قَرْيَةٍ أَمَلَيْتُ لَهَا..... : اس آیت میں قانون مہلت کو دہرایا ہے کہ میں نے کتنی ہی بستیوں کو ان کے ظلم کے باوجود تمہاری طرح مہلت دی، پھر میں نے انہیں پکڑ لیا۔

﴿۲﴾ وَإِلَى النَّصِيرِ : یعنی اگر کسی ظالم قوم پر عذاب آنے میں دیر ہوئی، یا دنیا میں سرے سے اس پر عذاب آیا ہی نہیں تو بھی وہ ہماری گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے، ہر حال میں انہیں ہماری ہی طرف آنا ہے، وہاں سب وعدے پورے ہوں گے۔

آیت 49 ﴿۱﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ : اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ لوگ آپ سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ایک جواب تو اپنا قانون مہلت ذکر فرمایا، یہ آیت دوسرا جواب ہے۔ فرمایا، ان سے کہہ دیجیے کہ میں تو صرف تمہیں ڈرانے والا ہوں، میرا کام کفر کے برے انجام سے خبردار اور آگاہ کرنا ہے، عذاب جلدی لانا یا دیر سے لانا میرا کام نہیں، یہ مجھے بھیجنے والے کا کام ہے۔ میں صرف پیغام پہنچانے والا ہوں، خود اللہ نہیں ہوں۔

﴿۲﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ : یعنی تمام دنیا کے لوگوں کو پیغام پہنچا دو، خواہ کسی قوم یا ملک سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ قیامت تک کسی زمانے کے لوگ ہوں۔ دیکھیے سورہ سبا (۲۸)۔

﴿۳﴾ نَذِيرٌ مُبِينٌ : یعنی میں تمہیں ڈرانے والا (اور بشارت دینے والا) ہوں، تمہیں کھول کر ہر وہ چیز بتاتا ہوں جو تمہارے لیے نقصان دہ ہے، تاکہ تم اس سے بچ جاؤ اور ہر وہ چیز بتاتا ہوں جو تمہارے فائدے کی ہے، تاکہ تم اسے اختیار کر لو۔ یہاں ”نَذِيرٌ“ کے ساتھ ”بَشِيرٌ“ بھی ہے مگر الفاظ میں اسے حذف کر دیا گیا ہے، کیونکہ مقام اس عذاب سے ڈرانے کا ہے جسے وہ جلدی مانگ رہے ہیں۔ یہاں ”بَشِيرٌ“ کو الگ اس لیے ذکر نہیں فرمایا کہ ہر نذیر بشر بھی ہوتا ہے، کیونکہ اس کی خبردار کردہ چیزوں سے بچنے کا نتیجہ خوشی کی خبر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ”نَذِيرٌ“ کے ضمن میں ”بَشِيرٌ“ کے تذکرے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد پہلی آیت میں بشارت ہے اور دوسری میں نذارت۔ (بقای)

فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَرْزُقُوا كَرِيمًا ﴿۵۰﴾ وَالَّذِينَ سَعَوْا
فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿۵۱﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا

تو وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے عظیم بخشش اور باعزت رزق ہے ﴿۵۰﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کے بارے میں کوشش کی، اس حال میں کہ نچا دکھانے والے ہیں، وہی بھڑکتی آگ والے ہیں ﴿۵۱﴾ اور ہم نے تجھ سے پہلے نہ کوئی رسول بھیجا اور نہ کوئی نبی مگر جب اس نے کوئی تمنا کی شیطان نے اس کی تمنا میں

آیت 50 ﴿۱﴾ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ: یہ بشارت کی آیت ہے۔ ”مَغْفِرَةٌ“ میں تینوں تقسیم کے لیے ہے،

اس لیے ترجمہ عظیم بخشش کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ایمان میں دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل تینوں چیزیں شامل ہیں، مگر اعمال صالحہ کا الگ ذکر خاص طور پر تاکید کے لیے فرمایا، کیونکہ اس میں عموماً کوتاہی ہوتی ہے۔

﴿۲﴾ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَرْزُقُوا كَرِيمًا: اس سلسلہ کلام کا آغاز قتال کے اذن سے ہوا ہے، اس وقت مسلمان کفار کے ظلم و ستم کی وجہ سے گھروں سے بے گھر تھے اور مالی طور پر بھی نہایت تنگی کی حالت میں تھے، اس لیے انھیں بشارت دینے کا حکم ہوا کہ ایمان اور عمل صالح کے حامل مجاہد افراد کے لیے عظیم بخشش بھی ہے اور باعزت رزق بھی۔ باعزت رزق سے مراد دنیا میں مال غنیمت اور آخرت میں جنت ہے کہ دونوں میں اللہ کے سوا کسی کے احسان کا بار نہیں ہے۔

آیت 51 ﴿۱﴾ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا.....: ”مُعْجِزِينَ“ باب مفاعلہ سے اسم فاعل ہے، مقابلے میں عاجز کر دینے والے،

نچا دکھانے والے۔ یہ نذارت یعنی ڈرانے کی آیت ہے، یعنی جن لوگوں کی کوشش ہے کہ ہماری آیات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمیں نچا دکھا دیں یا عاجز کر دیں، کبھی انھیں جھوٹا کہتے ہیں، کبھی جادو کہتے ہیں، کبھی کہانت، کبھی شعر اور کبھی پہلے لوگوں کی فرضی کہانیاں، تاکہ لوگوں کو ان پر ایمان لانے سے روکیں، تو یہ لوگ بھڑکتی ہوئی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، حتیٰ کہ ان کا لقب ہی ”أَصْحَابُ الْجَحِيمِ“ (بھڑکتی ہوئی آگ والے لوگ) ہے۔

آیت 52 ﴿۱﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَنْبِيٍّ.....: لغت میں ”نَمْنِي يَنْمِي نَمِيًا“ کا معنی تمنا، آرزو اور

خواہش کرنا بھی ہے اور تلاوت کرنا اور پڑھنا بھی ہے، سورہ بقرہ کی آیت (۷۸): ﴿وَمَنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَخْلُقُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانًا﴾ میں ”أَمَانًا“ ”أُمِّيَّة“ کی جمع ہے، جس کا معنی آرزو بھی ہے اور تلاوت کرنا بھی۔ پہلے معنی کی رو سے مطلب یہ ہے کہ آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول یا نبی بھیجا شیطان اس کی ہر آرزو اور خواہش کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا رہا۔ ظاہر ہے پیغمبر کی آرزو لوگوں کے ایمان قبول کرنے اور دین حق کے غلبے کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے انبیاء و رسل کی ہر کوشش کو شیطان ناکام کرنے کی کوشش کرتا رہا، مگر اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کر کے اپنی آیات کو محکم اور اپنے دین کو غالب کرتا رہا، جیسا کہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولًا بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ عَلَىٰ الدِّينِ كُلِّهِ﴾ [التوبة: ۳۲] ”وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر

فَبِئْسَ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانَ فِي أَمْنِيَّتِهِ ۗ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ أَمْرَهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۵۷﴾

(خلل) ڈالا تو اللہ اس (خلل) کو جو شیطان ڈالتا ہے، مٹا دیتا ہے، پھر اللہ اپنی آیات کو بچتے کر دیتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۵۷﴾

دے۔“ دوسرے معنی کی رو سے مطلب یہ ہے کہ آپ سے پہلے بھی رسول یا نبی آیا، جب وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتا تو شیطان اس کے سننے میں رکاوٹ ڈالتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [حکم السجدة: ۲۶] ”اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تاکہ تم غالب رہو۔“ مگر اللہ تعالیٰ اس کی رکاوٹوں کو دور کر کے اپنی آیات کو محکم کر دیتا۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ پیغمبروں کے آیات کی تلاوت کے وقت شیطان ان آیات کے معانی کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈال دیتا جنھیں اللہ تعالیٰ بعد میں وضاحت کر کے دور کر دیتا، جیسا کہ سورہ نحل کی آیت (۱۱۵): ﴿إِنَّمَا حَرَصَ عَلَيْكَ النَّبِيُّ أَن يَضِلَّ رَبُّكَ فَنَزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ مَوَاقِعُ الْمَسَاءِ وَالْظُّهْرِ وَالْبُحْرِ وَالسُّبْحِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ میں شبہ ڈالا کہ دیکھو اپنا مارا ہوا حلال کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مارے ہوئے کو حرام کہتے ہیں۔ سورہ انبیاء کی آیت (۹۸): ﴿إِنَّكُمْ وَمَن تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ میں شبہ ڈالا کہ پھر تو مسیح علیہ السلام بھی نعوذ باللہ جنہم میں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کی وضاحت فرما کر شیطان کے ڈالے ہوئے شیعے کو دور فرما دیا اور اپنی آیات کو محکم کر دیا۔

﴿۵۷﴾ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ : یعنی اللہ تعالیٰ ان سب شیاطین کو خوب جانتا ہے جو انبیاء کی تمناؤں کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں، یا انبیاء کے آیات کی تلاوت کے وقت لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈالتے ہیں اور ان شکوک و شبہات کو اور ان کے دفاع کے طریقوں کو بھی خوب جانتا ہے اور وہ کمال حکمت والا بھی ہے جس کے پیش نظر اس نے شیاطین کو مہلت دے رکھی ہے کہ خود بھی گمراہ رہیں اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں۔

﴿۵۸﴾ بعض مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ سورہ نجم کی تلاوت کر رہے تھے، جب آپ آیت (۲۰): ﴿وَمَنُودًا فَالْبَاقِيَةَ الْأُخْرَى﴾ پر پہنچے تو لاشعوری کے عالم میں شیطان نے آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دیے، یا آپ کے لہجے اور آواز میں پڑھ دیے: ”تَلَكُ الْغُرَابِيُّ الْعُلَىٰ وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَىٰ“ ”یہ عالی مقام دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔“ اس پر کفار قریش بہت خوش ہوئے کہ آج ہمارے بتوں کی بھی تعریف ہوئی ہے اور آپ ﷺ کو بہت غم لاحق ہوا، چنانچہ سورہ حج کی یہ آیت اتری اور آپ کو تسلی دی گئی کہ پہلے انبیاء کی وحی میں بھی شیطان اس قسم کی دخل اندازیاں کرتا رہا ہے، مگر شیطان کے یہ حربے کامیاب نہیں ہوتے وغیرہ۔ یہ قصہ ان آیات کے صریح متصادم ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کے چاروں طرف زبردست پہرا اس وقت تک رکھتا ہے جب تک وہ اللہ کے پیغامات لوگوں تک نہ پہنچا دیں (امتے کڑے پہرے میں ممکن ہی نہیں کہ شیطان کسی طرح بھی اثر انداز

لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَ الْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ
الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿۵۴﴾ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهٗ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ
فِيَوْمِنَا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَهَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۵۵﴾

تاکہ وہ اس (خلل) کو جو شیطان ڈالتا ہے، ان لوگوں کے لیے آزمائش بنائے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں اور بے شک ظالم لوگ یقیناً دور کی مخالفت میں ہیں ﴿۵۴﴾ اور تاکہ وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے، جان لیں کہ وہی تیرے رب کی طرف سے حق ہے تو وہ اس پر ایمان لے آئیں، پس ان کے دل اس کے لیے عاجز ہو جائیں اور بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے یقیناً سیدھے راستے کی طرف ہدایت دینے والا ہے ﴿۵۵﴾

ہو سکے۔ دیکھیے سورہ جن کی آخری آیات ”عِلْمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ“ سے آخر سورت تک۔ محقق علماء نے اس قصے کی پر زور تردید کی ہے۔ بیہیبت کہتے ہیں، یہ قصہ سن گھڑت ہے۔ ابن خزیمہ ؒ نے لکھا ہے کہ یہ قصہ زنادقہ (مخدو بے دین لوگوں) نے گھڑا ہے۔ قاضی عیاض نے ”الشفاء“ میں اس کی تردید کی ہے۔ رازی نے فرمایا کہ یہ قصہ باطل ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ نے تین مرسل روایات کی بنا پر اس واقعے کا کچھ اصل ثابت کرنے اور اس کی توجیہ کی کوشش کی ہے مگر محدث البانی ؒ نے اپنے رسالہ ”نُصْبُ الْمَحَابِيثِ لِسُفِّ قِصَّةِ الْغُرَابِيِّ“ میں مضبوط علمی بحث کے ساتھ اس قصے کا بالکل بے اصل ہونا ثابت فرمایا ہے اور قدیم و جدید محدثین و فقہاء کا حوالہ دیا ہے، جنہوں نے اس واقعہ کی دلائل کے ساتھ تردید فرمائی۔

آیت 53، 54 ﴿۱﴾ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً : ”شِقَاقٍ“ باب مفاعلہ کا مصدر ہے، جیسے ”فَعَالٌ“ ہے، مراد آمنے سامنے مقابلہ ہے، جس میں ایک فریق ایک شق میں ہوتا ہے اور دوسرا فریق دوسری شق میں۔ اس آیت میں شیطان کو انبیاء کی دعوت اور آیات الہی میں شکوک و شبہات ڈالنے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی فرصت دینے کی حکمت بیان فرمائی ہے کہ شیاطین کو جو اس طرح کھل کھیلنے کا موقع دیا جاتا ہے تو اس سے مقصود ابتلا و آزمائش کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے، تاکہ اس کے نتیجے میں اہل باطل اپنا من بھاتا کھا جا یا کر اہل باطل کے علمبرداروں کے ساتھ ہو جائیں اور اہل حق باطل والوں کے تمام شور و غوغا کے باوجود راہ حق پر مزید پختہ ہو جائیں، کیونکہ حق کے مقابلے میں جتنا زیادہ جھگڑا کیا جائے اتنا ہی اس کے دلائل مزید نکھرتے اور واضح ہوتے ہیں اور جن لوگوں کو علم کی روشنی ملی ہوتی ہے ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ آپ کو رب کی طرف سے ملنے والا علم کتاب بالکل حق ہے، پھر ان کا یہ یقین ان کے ایمان کو پختہ کرنے اور اس میں اضافے کا باعث بنتا ہے، جس کے نتیجے میں ان کے دل اپنے رب کے لیے عاجزی اختیار کرتے ہیں اور پورے اطمینان کے ساتھ اس کے سامنے جھک جاتے ہیں۔

﴿۲﴾ ”لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ“ سے مراد منافقین ہیں اور ”وَ الْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ“ سے مراد بکے کافر ہیں کہ جن کے دل کفر و عناد کی وجہ سے سخت ہو چکے ہیں۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي هَرِيَةٍ مِنْهُ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ يَوْمٍ عَقِيمٍ ﴿۵۵﴾

اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہمیشہ اس کے بارے میں کسی شک میں رہیں گے، یہاں تک کہ ان کے پاس اچانک قیامت آجائے، یا ان کے پاس اس دن کا عذاب آجائے جو بانجھ (ہر خیر سے خالی) ہے ﴿۵۵﴾

﴿۵۵﴾ ”لِيَجْعَلَ“ کی ضمیر، ”فَيَنْتَعِزُّ اللَّهُ“ اور ”ثُمَّ يُعَذِّبُهُ اللَّهُ“ میں مذکور لفظ ”اللَّهُ“ کی طرف جارہی ہے۔ شیطان کی دخل اندازی اور شکوک و شبہات کو کفار و منافقین کے لیے فتنے کا باعث بنانے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا ہے کہ وہ شیطان کے اس عمل کو کفار و منافقین کے لیے فتنہ بناتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ کوئی مومن ہو یا کافر یا منافق ہر ایک کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور ان کے ہر فعل کا خالق بھی وہی ہے، اس لیے فتنہ بنانے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی ہے۔ البتہ کفار و منافقین کو فتنے میں مبتلا کرنے کا باعث ان کے دلوں کے مرض نفاق کو اور ان کے دلوں کی سختی اور عناد کو قرار دیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا يُوَضِّلُ بِهِ إِلَّا الْفٰئِقِينَ﴾ [البقرة: ۲۶] ”اور وہ اس کے ساتھ فاسقوں کے سوا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔“

﴿۵۴﴾ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَىٰ حَرَاطِ فُتْنِيهِمْ : یعنی شیطان اور اس کے چیلے جتنے شکوک و شبہات پیدا کر لیں اور جتنے اعتراض کر لیں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی سیدھے راستے کی طرف ضرور ہی رہنمائی کر دیتا ہے، جس سے انھیں نوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں بات فی الواقع وہی الہی ہے، وہ اس پر قائم ہو جاتے ہیں اور فلاں بات شیطان کا وسوسہ یا دھوکا ہے، سو وہ اس سے بچ جاتے ہیں۔ اس طرح انھیں دنیا و آخرت دونوں کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔

آیت 55 وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي هَرِيَةٍ مِنْهُ : یعنی کفار اس قرآن کے متعلق ہمیشہ کسی نہ کسی شک میں مبتلا رہیں گے، خواہ وہ شیطان کا پیدا کردہ ہو یا خود ان کے نفس کا اور اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ان کے پاس قیامت کی گھڑی نہ آجائے، یا یوم عقیم (بانجھ دن) کا عذاب نہ آجائے۔ بانجھ دن سے مراد قیامت کا دن ہے، اسے عقیم اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے بعد کوئی دن نہیں ہوگا، جس طرح عقیم اسے کہا جاتا ہے جس کی اولاد نہ ہو، یا اس لیے کہ کفار کے لیے اس دن میں کوئی خیر نہیں ہوگی، جس طرح آدمی کو جو عذاب کے طور پر آئی ”الزِّيْحَةُ الْعَقِيمَةُ“ (ہر خیر سے خالی ہوا) کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الزِّيْحَةَ الْعَقِيمَةَ﴾ [الذاريات: ۴۱] ”اور عاد میں (بھی نشانہ ہے) جب ہم نے ان پر بانجھ (خیر و برکت سے خالی) ہوا بھیجی۔“ اس یوم عقیم سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے اس سے مراد یوم بدر لیا ہے کہ اس میں کفار کے لیے کوئی خیر و برکت نہیں تھی۔ مگر یہ اس لیے درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کافر اس یوم عقیم کا عذاب آنے تک شک میں رہیں گے، گویا اس دن کے آنے کے بعد کافروں کو کوئی شک نہیں رہے گا اور ظاہر ہے کہ بدر کے بعد بھی کافر موجود ہیں اور ان کے شکوک و شبہات بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے

الْمَلِكِ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي حَيَاتِهِمُ الْعَالَمِينَ ﴿۵۶﴾
 وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا قُلُوبُهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ
 اللَّهِ ثُمَّ قُتِلُوا أَوْ مَاتُوا كَبُرَتْ قَتْلَهُمُ اللَّهُ رِزْقًا حَسَنًا ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّزَاقِينَ ﴿۵۸﴾

تمام بادشاہی اس دن اللہ کی ہوگی، وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا، پھر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، وہ نعمت کے بانگوں میں ہوں گے ﴿۵۶﴾ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو وہی ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے ﴿۵۷﴾ اور جن لوگوں نے اللہ کے راستے میں وطن چھوڑا، پھر قتل کر دیے گئے، یا مر گئے یقیناً اللہ انہیں ضرور رزق دے گا اچھا رزق اور بے شک اللہ ہی یقیناً سب رزق دینے والوں سے بہتر ہے ﴿۵۸﴾

خود اس دن کی تعیین فرمادی ہے، فرمایا: ﴿الْمَلِكِ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ﴾ [الحج: ۵۶] ”تمام بادشاہی اس دن اللہ کی ہوگی، وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔“ معلوم ہوا کہ اس یوم عظیم سے مراد قیامت کا دن ہے اور مزید فرمایا: ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ۗ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ۗ يَوْمَ لَا تَمَلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا ۗ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ﴾ [الانفطار: ۱۷ تا ۱۹] ”اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ پھر تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کا اختیار نہ رکھے گی اور اس دن سب حکم اللہ کا ہوگا۔“ اس پر یہ سوال ہے کہ اس سے تکرار لازم آتا ہے، کیونکہ ”السَّاعَةُ“ سے مراد بھی قیامت ہے۔ جواب یہ ہے کہ ”السَّاعَةُ“ میں قیامت کا ذکر ہے اور ”عَذَابٌ يَوْمَ عَقِيبِهِ“ میں قیامت کے دن کے عذاب کا ذکر ہے۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ کفار اس وقت سے پہلے ایمان نہیں لائیں گے جب ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

آیت 56 ﴿۱﴾ الْمَلِكِ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ : ”الْمَلِكِ“ کے الف لام کی وجہ سے ”تمام بادشاہی“ ترجمہ کیا ہے، یعنی دنیا میں تو عارضی طور پر لوگوں کو بھی بادشاہت مل جاتی ہے مگر اس دن کسی اور کی بادشاہی نہیں ہوگی، فرمایا: ﴿لَيْسَ الْمَلِكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [المومن: ۱۶] ”آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ ہی کی جو ایک ہے، بہت دہ دہے والا ہے۔“

﴿۲﴾ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ : دنیا میں ہر شخص، کافر ہو یا منافق یا مسلم، یہی سمجھ رہا ہے کہ وہ حق پر ہے، دوسرے سب غلط ہیں، اس کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کرے گا۔ دیکھیے سورہ زمر (۴۲) اس فیصلے کے نتیجے میں ایمان اور عمل صالح والے نعمت والے بانگوں میں ہوں گے۔ ایمان اور عمل صالح اللہ کی آیات اور اس کے رسول کی تکریم تھی، بدلے میں ”جَنَّتِ التَّعِينِ“ میں رہنے کی تکریم ملی۔

آیت 57 ﴿۱﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا : ”قُلُوبُهُمْ“ کی ”فاء“ کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے رسوا کُن عذاب کا سبب ان لوگوں کا کفر اور اللہ کی آیات کو جھٹلانا تھا۔ انہوں نے اللہ کی آیات اور اس کے رسولوں کی اہانت کی، بدلہ عذاب مہین کی صورت میں ملا، جیسا عمل ویسا نتیجہ۔

آیت 58 ﴿۱﴾ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ : اس سے پہلے ”فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ کے ساتھ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

لَيْدُ خَلَّتْهُمْ هُدُخْلًا يَرْضُونَهُ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَعَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿۵۹﴾

یقیناً وہ انھیں ایسے مقام میں ضرور داخل کرے گا جس پر وہ خوش ہوں گے اور بے شک اللہ ضرور سب کچھ جاننے والا، بے حد بردبار ہے ﴿۵۹﴾

عام مومنوں کا ذکر فرمایا تھا، اب ان میں سے خاص لوگوں کا ذکر فرمایا جنہوں نے اللہ کی خاطر اپنے وطن، گھر بار اور خویش و اقارب کو چھوڑا۔ مقصد ہجرت کی شان اور اس کی فضیلت بیان کرنا ہے کہ یہ اتنا عظیم عمل ہے کہ ہجرت کرنے والے جہادنی سمیل اللہ میں قتل ہوں یا لڑائی کے بغیر فوت ہو جائیں، دار الکفر سے ہجرت کے بعد آخرت کے درجات میں برابر ہیں۔ (ابن عاشور) پہلی آیات سے اس کی ایک اور مناسبت یہ ہے کہ چونکہ مشرکین ان شیطانی شبہات اور رکاوٹوں کے ساتھ، جن کا اوپر ذکر ہوا، بہت سے لوگوں کو ایمان لانے سے روکتے تھے اور وہ روک صرف انھی کو سکتے تھے جو ان کے قابو میں ہوں، اس لیے اللہ سبحانہ نے ہجرت کی ترغیب دلائی اور اس کی فضیلت بیان فرمائی۔ (بقالی)

﴿لَيَرْضَقْنَهُمُ اللَّهُ رِزْقًا حَسَنًا﴾: لام تاکید اور نون ثقید کے ساتھ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انھیں برزخ میں اور جنت میں رزق حسن ہر صورت دے گا۔ شہداء کے متعلق دیکھیے سورہ آل عمران (۱۶۹) اور ہجرت کے بعد فوت ہونے کے متعلق دیکھیے سورہ نساء (۱۰۰)۔

﴿وَإِنَّ اللَّهَ لَكَنُورٌ خَيْرٌ الزُّرْقَيْنِ﴾: اللہ تعالیٰ خیر الرزقین ہے، اس لیے کہ ﴿۱﴾ وہ کسی استحقاق کے بغیر رزق دیتا ہے۔ ﴿۲﴾ مانگے بغیر دیتا ہے۔ ﴿۳﴾ بے حساب دیتا ہے۔ ﴿۴﴾ کسی سے فائدے کی امید یا کسی سے خوف کے بغیر دیتا ہے۔ ﴿۵﴾ اور صرف وہی ہے جو اپنے پاس سے دیتا ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا اگر دیتا ہے تو اسی کا دیا دیتا ہے، سو حقیقت میں دینے والا وہی ہے۔ سب دینے والوں سے بہتر ان لوگوں کے لحاظ سے فرمایا جو دنیا میں ایک دوسرے کو کچھ دے دیتے ہیں، مگر ان میں ”خَيْرُ الزُّرْقَيْنِ“ کی صفات میں سے ایک صفت بھی نہیں جو اوپر گزری ہیں۔

آیت ۵۹ ﴿لَيْدُ خَلَّتْهُمْ هُدُخْلًا يَرْضُونَهُ﴾: مراد جنت ہے جسے دیکھ کر وہ خوش ہوں گے اور اس میں اپنی ہر خواہش موجود پائیں گے۔ پسندیدہ رہائش بھی رزق حسن میں شامل ہے، اس کا الگ ذکر اس لیے فرمایا کہ خوبصورت اور بہترین گھر کا اہتمام لوگ کھانے پینے سے بھی زیادہ کرتے ہیں۔

﴿وَإِنَّ اللَّهَ لَعَلِيمٌ حَلِيمٌ﴾: صفت ”علیم“ کی مناسبت اس مقام کے ساتھ دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ہجرت کرنے والوں کے اعمال اور ان کی نیتوں کو خوب جاننے والا ہے، وہ ہر ایک کو ان کے مطابق جزا دے گا اور اسی طرح ہجرت پر مجبور کرنے والے کفار کے اعمال اور نیتوں سے بھی خوب واقف ہے، انھیں بھی ان کے مطابق سزا دے گا۔ اسی طرح ”حلیم“ کی مناسبت بھی دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ ان مہاجرین سے جو کوتاہیاں ہوئیں اللہ تعالیٰ اپنے بے انتہا حلم کی وجہ سے ان سے چشم پوشی فرما کر انھیں رزق حسن اور پسندیدہ منزل عطا فرمائے گا۔ دوسری مناسبت یہ ہے کہ جن کفار نے انھیں

ذَلِكُمْ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوِّقَ بِهِ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لِيَنْصُرَهُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ

لَعَفُوٌّ غَفُورٌ ﴿۶۰﴾

یہ اور جو شخص اس کی مثل بدل لے جو اسے تکلیف دی گئی، پھر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ ضرور ہی اس کی مدد کرے گا، یقیناً اللہ ضرور نہایت درگزر کرنے والا، بے حد بخشنے والا ہے ﴿۶۰﴾

نکالا، اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے کمال حلم کی وجہ سے اتنے بڑے جرم کے باوجود مہلت دی اور فوراً گرفت نہیں فرمائی، جس کے نتیجے میں تقریباً وہ تمام لوگ جنہوں نے مہاجرین کو مکہ سے نکالا تھا مسلمان ہو گئے۔

آیت 60 ﴿ ذَلِكُمْ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ ﴾ ”ذَلِكُمْ“ کا لفظ دو کلاموں کے درمیان فاصلے کے لیے ہوتا ہے، یعنی یہ تو ہوا،

اب اگلی بات سنو کہ جو شخص اتنا ہی بدل لے جتنی اسے ایذا دی گئی ہے، پھر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ اس کی ضرور ہی مدد کرے گا۔ اس میں جہاد کی ترغیب ہے اور ”أُذُنَ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَهُمْ يَلْبِغُوا“ اور ”وَلِيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ“ کا

مضمون دہرایا گیا ہے۔ عطف اس کا ”وَ الَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ پر ہے، جس میں ان مظلوموں کا ذکر تھا جو بدلہ نہیں لے سکے، اب ان مظلوموں کا ذکر ہے جو ظالموں کے مقابلے میں قوت استعمال کریں۔ انھیں تاکید ہے کہ وہ اتنا ہی بدلہ

لیں جتنی ان پر زیادتی ہوئی ہے، اگر اتنا بدلہ لینے کے بعد پھر ان پر زیادتی کی جائے تو اللہ تعالیٰ ان کی ضرور ہی مدد کرے گا۔ مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو بے شمار ایذائیں دیں، انھیں دین سے مرتد کرنے کے لیے مسلسل عذاب سے دو چار رکھا، جو قتل سے بھی بڑھ کر تکلیف دہ تھا۔ انھیں ان کے گھروں سے نکالا، اس کے بعد بھی لڑائی کے لیے چڑھ کر آتے رہے۔ ان کی ایذا

کے برابر بدلے کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُتَعَدِينَ ۚ وَأَقْسَلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۚ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۚ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ﴾ [البقرة: ۱۹۰، ۱۹۱]

”اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی مت کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ اور انھیں قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور انھیں وہاں سے نکالو جہاں سے انھوں نے تمہیں نکالا ہے اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ اس میں تم سے لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو انھیں قتل کرو، ایسے ہی کافروں کی جڑا ہے۔“ اسی طرح حکم دیا: ﴿وَ إِنْ فَكَّرْتُمْ أَنْ يَأْمَنُوا مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا إِنَّهُمُ الْكَافِرُ ۚ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْهَوْنَ ۚ أَلَا تَتَّقُوا الَّذِينَ كَفَرُوا فَكُنُوا أَيْمَانُهُمْ وَ هُمُوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَ هُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَ تَخْشَوْنَ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ أَصْفَىٰ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ [النوبة: ۱۲، ۱۳]

”اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین میں طعن کریں تو کفر کے پیشواؤں سے جنگ

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُؤَلِّجُ النِّيلَ فِي النَّهَارِ وَ يُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي النِّيلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ

بَصِيْرٌ ﴿٦١﴾

یہ اس لیے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ﴿٦١﴾

کرو۔ بے شک یہ لوگ، ان کی کوئی قسمیں نہیں ہیں، تاکہ وہ باز آجائیں۔ کیا تم ان لوگوں سے نہ لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں اور رسول کو نکالنے کا ارادہ کیا اور انہوں نے ہی پہلی بار تم سے ابتدا کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ تو اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اس سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔“

﴿٦٢﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ : یہاں ان صفات کے تذکرے کا مطلب یہ نہیں کہ کفار کو معاف کر دو، کیونکہ ان کے متعلق تو حکم ہے: ﴿قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبُهُمُ اللّٰهُ بِاَيِّدِيْكُمْ وَ يُخْزِيْهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [التوبة: ١٤] ”ان سے لڑو، اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انہیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمہاری مدد کرے گا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا دے گا۔“ غفور و درگزر مسلمانوں کے باہمی معاملات میں ہے، کفار کے ساتھ نہیں، فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ مَعَاذَ اَسْذَىٰ عَلَى الْكٰفِرِ رَحْمَةًۭاَ۟ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح: ٢٩] ”اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں، کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں۔“ یہاں ان صفات کی مناسبت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اتنا ہی بدلہ لینے کا جو حکم دیا ہے کہ جتنی ایذا دی جائے، یہ اس کے غفور و مغفرت کی وجہ سے ہے کہ اس نے کفار پر بھی حد سے بڑھ کر زیادتی کی اجازت نہیں دی، جس سے وہ مظلوم ٹھہریں، کیونکہ مظلوم کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿اِنَّ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهَا لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ﴾ [بخاری، المظالم، باب الاتقاء و الحذر من دعوة المظلوم: ٢٤٤٨، عن ابن عباس ؓ] ”مظلوم کی بددعا سے بیچ، کیونکہ اس کے درمیان اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔“ دوسری مناسبت یہ ہے کہ بدلہ لینے میں سو فیصد برابری تو انسان کے بس ہی میں نہیں، اس لیے فرمایا کہ کچھ کمی بیشی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

آیت 61 : ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُؤَلِّجُ النِّيلَ فِي النَّهَارِ وَ يُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي النِّيلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ

لے لیے ہے کہ یہ اس کے لیے کچھ مشکل نہیں، وہ ہر چیز پر قادر ہے، رات کو دن میں داخل کر کے دن کو رات پر غالب کر دیتا ہے اور دن بڑا ہو جاتا ہے اور دن کو رات میں داخل کر کے رات کو دن پر غالب کر دیتا ہے اور رات بڑی ہو جاتی ہے۔ تو اس کے لیے مظلوموں کو ظالموں پر غالب کرنا کیا مشکل ہے؟

ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ﴿۶۲﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَتُصْبِحُ الْأَرْضُ مُخْضَرَّةً ﴿۶۳﴾

إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ﴿۶۴﴾

یہ اس لیے کہ اللہ ہی ہے جو حق ہے اور (اس لیے) کہ اس کے سوا وہ جسے بھی پکارتے ہیں وہی باطل ہے اور (اس لیے) کہ اللہ ہی بے حد بلند ہے، بہت بڑا ہے ﴿۶۲﴾ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے کچھ پانی اتارا تو زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔ بے شک اللہ نہایت باریک بین، ہر چیز سے باخبر ہے ﴿۶۳﴾

﴿۶۲﴾ وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ : یعنی اللہ تعالیٰ کے مظلوم کی مدد کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے حال سے پوری طرح باخبر ہے، سب کچھ سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے، سنتے اور دیکھتے ہوئے وہ ظلم کو کس طرح برداشت کرے گا؟

آیت 62 ﴿۶۲﴾ ذَلِكِ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ : یہ مظلوم مسلمانوں کی مدد کے وعدے کو پورا کرنے کی تیسری وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سچا اور حق رب ہے۔ جس چیز کا وہ ارادہ کرے اسے کر گزرتا ہے، سو وہ اپنے دوستوں کی ضرورت مدد کرے گا اور اس کے سوا جس کو بھی لوگ پکارتے ہیں وہ ناحق اور باطل ہے، وہ خود اپنی مدد نہیں کر سکتا تو ان کی مدد کیا کرے گا؟ اور اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کے مقابلے میں اپنے دشمنوں کی مدد کیوں کرے گا؟

﴿۶۳﴾ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ : چوتھی وجہ اس بات کی کہ ”اللہ تعالیٰ مظلوم مسلمانوں کی مدد ضرور کرے گا“ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے اونچا ہے، باقی سب نیچے ہیں اور وہی بے حد بڑا ہے، باقی سب چھوٹے ہیں اور کوئی اس کا مد مقابل نہیں۔

آیت 63 ﴿۶۳﴾ ﴿۱﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً : اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنے کی نعمت کا ذکر فرمایا ہے اور دوسرے تمام معبودوں کے باطل ہونے کا اور اپنی صفات ”سَمِيعٌ بَصِيرٌ“ اور ”الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ“ کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد اپنے ہر چیز پر قادر ہونے کی دلیل کے طور پر اپنی چھ نعمتیں شمار فرمائیں، جن میں سے پہلی نعمت اس آیت میں بیان فرمائی ہے۔

﴿۶۴﴾ ﴿۲﴾ ”أَلَمْ تَرَ“ کا لفظی معنی ہے ”کیا تو نے نہیں دیکھا۔“ یہاں یہ معنی بھی مراد ہو سکتا ہے، کیونکہ بارش برسنا اور زمین کا سرسبز ہونا ہر دیکھنے والے کو نظر آتا ہے۔ مگر عام طور پر قرآن مجید میں ”أَلَمْ تَرَ“ کا لفظ ”أَلَمْ تَعْلَمَ“ کے معنی میں آیا ہے، یعنی ”کیا تمہیں معلوم نہیں۔“ دیکھیے سورہ فیل کی آیت (۱): ﴿۱﴾ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ﴿۱﴾ کی تفسیر۔ یہاں بھی یہی دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے، کیونکہ دیکھنے سے مقصود علم ہی ہے اور جس دیکھنے سے علم حاصل نہ ہو وہ کا اعدم ہے۔

﴿۶۵﴾ ”مَاءً“ کی تفسیر تقلیل کی وجہ سے ”کچھ پانی“ ترجمہ کیا گیا ہے۔ اللہ نے آسمان سے کچھ پانی اتارا تو ”زمین سرسبز ہو گئی“ کے بجائے فرمایا ”زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔“ یعنی ماضی کے بجائے مضارع کا لفظ استعمال فرمایا، کیونکہ بارش کا نزول کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُ الْعَنُقُ الْحَبِيدُ ﴿٦٤﴾

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور بلاشبہ اللہ ہی یقیناً بڑا بے پروا، تمام تعریفوں والا ہے ﴿٦٤﴾

ایک دفعہ ہوتا ہے تو زمین ایک لمبا عرصہ سرسبز رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت دیکھیے کہ زمین مژدہ اور پتھر کی طرح سخت تھی، اس کے نیچے خشک بیج مدت سے دفن تھے، رحمت کی بارش برسی تو زمین پھولی اور ابھری، خشک بیج میں زندگی پیدا ہوئی اور نرم و نازک کوپیل زمین کا سینہ چیر کر باہر نکلی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین کا سارا تنہ آکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور پہنچانے والا سبز رنگ اختیار کر گیا، جو عقل والوں کے لیے دلیل ہے کہ جس اللہ تعالیٰ نے بارش کے ذریعے سے بنجر زمین میں دفن خشک بیج سے پودا پیدا فرمایا وہی قیامت کو اس زمین سے مژدہ انسانوں کو ان کی ”عَنْقُ الْحَبِيدِ“ (دم کی ہڈی) سے دوبارہ زندہ کر سکتا ہے اور کرے گا۔ [بخاری، التفسیر، باب ﴿يَوْمَ يَنْفَعُ فِي الصُّورِ فَنَأْتُونَ الْفُجَاهَا﴾ : ۴۹۳۵] بعض مفسرین نے اس میں اس اشارے کا ذکر بھی فرمایا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو بارش کے ذریعے سے زندگی بخشتا ہے، اسی طرح وہ مردہ دلوں کو وحی الہی کے ذریعے سے ایمان کی زندگی عطا فرماتا ہے۔

﴿٦٤﴾ زمین سے پیدا ہونے والے پودوں کے پتے، پھول، پھل اور دانے، غرض ہر چیز انسان کے لیے خوراک، لباس اور دوسری ضروریات کے کام آتی ہے اور سبھی اللہ کی نعمتیں ہیں مگر یہاں زمین کے سرسبز ہونے کو خاص طور پر ذکر فرمایا کہ اس سبزے سے آنکھوں کو جو تازگی اور دل کو جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ دوسری نعمتوں کا ذکر چھوڑ دیا کہ انسان خود سوچ لے۔

﴿٦٤﴾ إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ : لفظ ”لطيفٌ“ میں دو مفہوم شامل ہیں، ایک ”باریک چیزوں کو دیکھنے والا“ اور دوسرا ”نہایت مہربانی والا۔“ ”إِنَّ“ عموماً پہلے جملے کی وجہ بیان کرنے کے لیے آتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتار کر زمین کو سرسبز اس لیے کیا کہ وہ نہایت مہربان بھی ہے، باریک بین بھی اور ہر چیز کی پوری خبر رکھنے والا بھی۔ اسے خوب معلوم ہے کہ زمین کے سینے میں کس جگہ کون سا انسان یا حیوان یا کسی پودے کا باریک سے باریک بیج دفن ہے اور اسی کے لطف و کرم سے یہ سب کچھ دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس سے اپنے بندوں کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی مادی یا اخلاقی ضرورت پوشیدہ نہیں ہے، وہ اپنی کمال مہربانی اور باریک طریقوں سے ایسے انتظام فرماتا ہے کہ ہر بندے کی بلکہ ہر مخلوق کی ضرورت، جو اس کے حسب حال ہے، پوری ہو۔

آیت 64 ﴿٦٤﴾ لَّهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ : یہ دوسری دلیل ہے، یعنی وہ صرف آسمان سے بارش برسانے اور زمین سے سبزہ اگانے ہی کا مالک نہیں بلکہ آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا وہ اکیلا مالک ہے، بارش برسانا اور سبزہ اگانا تو اس کے اختیار کا معمولی سا حصہ ہے۔ ”لَّهُ“ کو پہلے لانے سے قصر کا مفہوم پیدا ہوا۔ تو جب ہر چیز کا مالک وہی ہے تو عبادت کسی اور کی کیوں ہو؟

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلُوكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۗ وَ يُنْسِكُ
السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَكَرُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۵﴾

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہاری خاطر مسخر کر دیا ہے جو کچھ زمین میں ہے اور ان کشتیوں کو بھی جو سمندر میں اس کے حکم سے چلتی ہیں اور وہ آسمان کو تھام کر رکھتا ہے اس سے کہ زمین پر گر پڑے مگر اس کے اذن سے۔ بے شک اللہ یقیناً لوگوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۵﴾

﴿۲﴾ إِنَّ اللَّهَ لَكَوَّ الْعَنِيُّ الْحَيِّدُ: یہ عام مشاہدہ ہے کہ انسان جن چیزوں کا مالک ہوتا ہے ان کا محتاج بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ اس کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہونے کے ذکر کے ساتھ وضاحت فرمائی کہ وہ آسمان و زمین اور ان میں موجود کسی چیز کا محتاج نہیں، بلکہ سب سے بے پروا اور غنی ہے، حتیٰ کہ حمد کرنے والوں کی حمد سے بھی غنی ہے۔ اس وصف کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ حمید یعنی تمام تعریفوں والا ہے، ہر حمد اور تعریف خواہ کسی کی ہو، دراصل وہ اس اکیلے ہی کی ہے، کیونکہ مخلوق میں تعریف کے لائق جو خوبی بھی ہے اسی کی عطا کردہ ہے۔ جب سب اسی کے محتاج ہیں تو پھر مخلوق کی عبادت کیوں ہو جو خود اپنے وجود میں بھی اس کی محتاج ہے۔

﴿۳﴾ ”إِنَّ“ کے اسم ”اللہ“ اور اس کی خبر ”الْعَنِيُّ الْحَيِّدُ“ کے درمیان ضمیر فصل ”هُوَ“ لانی سے اور ”إِنَّ“ کی خبر ”الْعَنِيُّ الْحَيِّدُ“ پر الف لام لانی سے کلام میں دو وجہوں سے حصر پیدا ہو گیا، جس سے ترجمہ یہ ہوگا کہ بلاشبہ اللہ ہی یقیناً بڑا بے پروا، تمام تعریفوں والا ہے۔

آیت 65 ﴿۱﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ: یہ تیسری دلیل ہے۔ زمین کی ہر چیز کو انسان کے لیے مسخر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس طرح بنایا ہے کہ آدمی اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ سورج اور چاند اس رفتار سے چل رہے ہیں جو انسان کے لیے مفید ہے۔ ہوا، پانی، آگ، بجلی، اےٹم، غرض کتنی ہی منہ زور قوتیں ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھا رہا ہے۔ پالتو جانور ہیں تو ان پر سواری کرتا ہے، ان کا دودھ پیتا، گوشت کھاتا اور کئی ضروریات پوری کرتا ہے، غرض وہ ہر طرح سے انسان کے تابع کر دیے گئے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اونٹ، گائے، بھینس اور گھوڑے کو انسان کے تابع نہ کرتا تو انسان کبھی انھیں پالتو نہ بنا سکتا، فرمایا: ﴿وَدَلَّلْنَاهَا لِغَيْرِ قَدِيرَاتِكُمْ بِنهْمِهِمْ وَنَهْنَاهَا أَنْ تَكُونُ﴾ [نہ: ۷۶] ”اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا تو ان میں سے کچھ ان کی سواری ہیں اور ان میں سے بعض کو وہ کھاتے ہیں۔“ رہے جنگلی جانور، تو ان کا شکار کر کے انھیں زندہ یا مردہ اپنے قابو میں لے آتا ہے۔

﴿۲﴾ وَالْفُلُوكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ: یہ چوتھی دلیل ہے، اگرچہ سمندر میں چلنے والے جہاز بھی زمین کی ان چیزوں میں شامل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کر رکھا ہے، مگر ان کا معاملہ دوسری چیزوں سے زیادہ عجیب ہے کہ پانی، جو ہر وزن والی چیز کو اپنے اندر غرق کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اس طرح انسان کے فائدے کے لیے مسخر کر دیا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَهُوَ الَّذِي أَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ ﴿۳۱﴾

اور وہی ہے جس نے تمہیں زندگی بخشی، پھر تمہیں مارے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ بے شک انسان یقیناً بہت ناشکر ہے ﴿۳۱﴾

مقرر کردہ ایک خاص وضع پر بنائے ہوئے ہزاروں ٹن کے پہاڑوں جیسے وزنی اور لمبے چوڑے اور اونچے بحری جہازوں کو اپنے سینے پر اٹھائے رکھتا ہے، غرق نہیں کرتا۔ یہ جہاز انسان کی ضرورت کی ہزاروں اشیاء اٹھا کر سیکڑوں ہزاروں میل کا سفر کرتے ہیں اور ان میں بیٹھے ہوئے لوگ اس طرح آرام سے بیٹھے ہوتے ہیں گویا وہ اپنے گھر میں آرام کر رہے ہیں۔ ”پافرڈ“ یعنی یہ سب کچھ اس کے ٹکوئی حکم سے ممکن ہوا کہ اس نے سمندر کو اس طرح بنایا ہے کہ جہاز اس پر چل سکیں۔ اگر اس کا حکم نہ ہوتا تو سمندر انہیں ایک لمحے میں ڈبو کر اپنی آغوش میں لے لیتا، یا انہیں اپنے سینے پر چلنے نہ دیتا اور وہ ایک جگہ کھڑے کھڑے ہی تباہ ہو جاتے۔

﴿۳۱﴾ وَنَبِّئِكَ السَّيِّئَاتِ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ : یہ پانچویں دلیل ہے۔ آسمان کو زمین پر گرنے سے روک کر رکھنا سمندر میں جہازوں کے چلنے سے بھی عجیب ہے کہ جہازوں کے نیچے کم از کم پانی تو ہے جسے اللہ نے انہیں غرق کرنے سے منع کر دیا ہے، بلکہ اسے جہازوں کا ٹھکانا اور سہارا بنا دیا ہے مگر آسمان کو اتنی بلندی پر نیچے کسی بھی چیز کے سہارے کے بغیر تھام کر رکھنا اس بے انتہا قوتوں والے مالک ہی کا کام ہے۔ ایسے مالک کے ہوتے ہوئے بے بس مخلوق کی بندگی کرنے سے بڑی بے انصافی کیا ہو سکتی ہے؟

﴿۳۲﴾ إِلَّا يَأْذَنُ بِهِ : یہ اس لیے فرمایا کہ جب اس کا اذن ہو گا تو آسمان پھٹ جائے گا اور اسے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے سے کوئی چیز نہیں روک سکے گی۔

﴿۳۳﴾ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَكَرِيمٌ : ”زُؤُف“ اور ”رَحِيمٌ“ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ صفت ”رَأْفَةٌ“ میں نقصان سے بچانے کا اور صفت ”رَحْمَةٌ“ میں نفع پہنچانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ بھی آجاتے ہیں۔ اکٹھے آنے میں نقصان سے بچانے اور نفع پہنچانے کے دونوں مفہوم جمع ہو گئے۔ (ابن عاشور) ”زُؤُف“ اور ”رَحِيمٌ“ بجائے خود مبالغے کے صیغے ہیں، ان پر مزید تنوین تعظیم آنے کے بعد اس کی رافت و رحمت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے؟

﴿۳۴﴾ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَكَرِيمٌ : یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر جو یہ احسانات فرمائے ہیں اور تمہاری زندگی کے لیے جو یہ اسباب فراہم کیے ہیں یہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ تمہارا حاجت مند ہے، بلکہ یہ سراسر اس کی شفقت و مہربانی کا کرشمہ ہے، تمہارا اس پر کوئی زور نہ تھا کہ وہ چاہتا یا نہ چاہتا تم اس سے یہ اسباب حاصل کر لیتے۔

آیت 66

﴿۱﴾ وَهُوَ الَّذِي أَحْيَاكُمْ : یہ چھٹی نعمت ہے اور پہلے ذکر کی گئی تمام نعمتوں کی اصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا فرمایا، اگر پیدا ہی نہ کرتا تو دوسری تمام نعمتیں تمہارے کس کام کی تھیں؟ اس بات کو ہر ملحد شخص بھی مانتا ہے کہ ہم پہلے نہیں تھے، بعد میں پیدا ہوئے۔ ”ثُمَّ يُمِيتُكُمْ“ پھر وہ تمہیں موت دے گا، یہ حقیقت بھی ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ ”ثُمَّ يُحْيِيكُمْ“ جو شخص پہلی دونوں باتیں مانتا ہے اسے یہ بھی ماننا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد زندہ بھی کرے گا۔

لَكُنْ أُمَّةً جَعَلْنَا مَنَسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَى رَبِّكَ ۗ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ﴿۱۷﴾

ہر امت کے لیے ہی ہم نے عبادت کا ایک طریقہ مقرر کیا ہے جس کے مطابق وہ عبادت کرنے والے ہیں، سو وہ تجھ سے اس معاملے میں ہرگز جھگڑا نہ کریں اور تو اپنے رب کی طرف دعوت دے، بے شک تو یقیناً سیدھے راستے پر ہے ﴿۱۷﴾

۲) بظاہر ان نبیوں میں سے نعمت صرف پہلی دفعہ پیدا کرنا ہے، کیونکہ پھر مارنا اور زندہ کرنا تو محاسبے کے لیے ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ بھی نعمتیں ہیں، کیونکہ ان دونوں کے بغیر جنت اور دیدار الہی کبھی حاصل نہیں ہو سکتے اور جو چیز جنت کی ہمیشگی کی زندگی اور مالک کے دیدار کا ذریعہ ہو اس کے نعمت ہونے میں کیا شک ہے؟

۳) إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ : ”لَكَفُورٌ“ ”كَافِرٌ“ میں مبالغہ ہے اور کفر سے مراد کفر نعمت یعنی نعمتوں کی ناشکری یا ان کا انکار ہے، یعنی ابن آدم ان نعمتوں کی قدر نہیں کرتا جو اوپر کی آیات میں مذکور ہیں، نہ ان کا شکر ادا کرتا ہے، یعنی اس دعوت کو نہیں مانتا جو اس کی طرف سے اس کے رسول پیش کرتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَإِنْ تَعَدَّ إِعْنَمَتِ اللَّهُ لَا تُخْصَوْنَ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَقَلْبُورٌ كَفَّارٌ﴾ [ابراہیم : ۳۴] ”اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے، بلاشبہ انسان یقیناً بڑا ظالم، بہت ناشکرا ہے۔“

آیت 67 ﴿۱۷﴾ لَكُنْ أُمَّةً جَعَلْنَا مَنَسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ : ”مَنَسَكًا“ ”نَسَكٌ يَنْسُكُ“ (ن، ک) سے مصدر میمی ہے، عبادت، قربانی، عبادت کا طریقہ یا قربانی کا طریقہ، یا یہ طرف ہے، یعنی عبادت یا قربانی کی جگہ۔ ”نَسَكٌ“ اور ”نُسُكٌ“ عبادت، ذبیحہ۔ رسول اللہ ﷺ نے عید الاضحیٰ کی نماز پڑھائی، پھر لوگوں کی طرف رخ کر کے فرمایا: ﴿إِنَّ أَوَّلَ نُسُكِنَا فِي يَوْمِنَا هَذَا أَنْ تَبْدَأَ بِالصَّلَاةِ ثُمَّ تَرْجِعَ فَنَتَحَرَّ﴾ [بخاری، العیدین، باب استقبال الإمام الناس فی خطبة العید : ۹۷۶، عن البراء ؓ] ”ہمارے آج کے دن میں ہماری پہلی عبادت یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں، پھر واپس جائیں اور قربانی کریں۔“ یہاں نماز کو ”نُسُكٌ“ کہا گیا ہے۔ ”لَكُنْ أُمَّةً جَعَلْنَا مَنَسَكًا“ کا جملہ اس سے پہلے آیت (۳۳) میں بھی گزرا ہے، وہاں اس کا معنی قربانی کا طریقہ کیا گیا ہے، کیونکہ وہاں آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ پانچوں مونیوں پر اللہ کا نام لینے یعنی زبح کرنے کا ذکر ہے۔

۲) آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب حج کے بعض مناسک میں تبدیلی کی، اسی طرح جیسے پہلی امتوں کے لیے مقرر کردہ بعض احکام منسوخ بھی کیے اور بعض میں تبدیلی فرمائی تو کفار مکہ نے، جو دین ابراہیم کے پیروکار ہونے کے دعوے دار تھے اور یہود و نصاریٰ سب نے جھگڑنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اصل دین ایک ہے جو توحید ہے، مگر ہم نے ہر زمانے کے لوگوں کے لیے اس زمانے کے احوال و ضروریات کے مطابق عبادت کا ایک طریقہ مقرر فرمایا، جس کے مطابق وہ عبادت کرتے تھے۔ جس میں بعض چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں، جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی امت کے لیے تورات اور عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے لیے تورات کے ساتھ انجیل تھی۔ اب قیامت تک کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَإِنْ جَدَلْتُمْ فَغَلِبَ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۶۸﴾ اللَّهُ يَخْلُقُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۶۹﴾ أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَلِكَ فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿۷۰﴾

اور اگر وہ تجھ سے جھگڑیں تو کہہ دے اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو تم کرتے ہو ﴿۶۸﴾ اللہ قیامت کے دن تمہارے درمیان اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۶۹﴾ کیا تو نے نہیں جانا کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ بے شک یہ ایک کتاب میں درج ہے، یہ اللہ پر بہت آسان ہے ﴿۷۰﴾

دنیا کے تمام لوگ محمد ﷺ کی امت ہیں اور ان کا ضابطہ حیات قرآن مجید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿لِكُلِّ جَعَلْنَا مِثْقَلًا ذَرَّةً وَمِثْقَالَ جَبَلٍ﴾ [المائدة: ۷۸] ”تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک راستہ اور ایک طریقہ مقرر کیا ہے۔“ ﴿۷۰﴾ فَلَا يَتَّزِعُكَ فِي الْآخِرِ : یعنی اللہ تعالیٰ اگر بعد میں آنے والے نبی کے زمانے میں کسی عبادت کے طریقے میں کوئی تبدیلی کر دے تو بندوں کا کام یہ ہے کہ وہ دل و جان سے اسے قبول کریں نہ کہ اس معاملے میں پیغمبر سے جھگڑا شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو فرمایا کہ یہ لوگ ہرگز آپ سے اس معاملے میں جھگڑا نہ کریں، یعنی آپ بھی ان سے جھگڑا نہ کریں اور نہ انہیں جھگڑے کا موقع دیں اور آپ اپنے رب کی طرف دعوت دیتے چلے جائیں اور یقین رکھیں کہ آپ بالکل سیدھے راستہ پر ہیں۔ سورہ جاثیہ میں فرمایا: ﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِّ ذُرِّيَّتِهِ ابْنًا فَآفَكُهُمْ ۚ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [الحاقیہ: ۱۸] ”پھر ہم نے تجھے (دین کے) معاملے میں ایک واضح راستے پر لگا دیا، سو اسی پر چل اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چل جو نہیں جانتے۔“

آیت 68-69 وَإِنْ جَدَلْتُمْ فَغَلِبَ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ : یعنی اگر دین حق کی پوری وضاحت کے بعد بھی کفار جھگڑے سے باز نہ آئیں تو آپ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں اور ان سے کہہ دیں کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے، وہ تمہیں اس کا بدلہ ضرور دے گا اور دین کی جن باتوں میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ان کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن کرے گا۔

آیت 70 أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ : یعنی کیا تمہیں واضح بات بھی معلوم نہیں کہ آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور کوئی بھی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں؟ نہ اس کے خلیص اور فرماں بردار بندوں کی فرماں برداری اس سے مخفی ہے اور نہ اس کے منکروں اور نافرمانوں کی شرارتیں اور فساد اس سے اوجھل ہے۔ اس لیے اس علم کے ساتھ وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ ہر شخص جو کچھ کر رہا ہے وہ پورے اہتمام کے ساتھ ایک کتاب میں محفوظ ہے، اس لیے کوئی اس خام خیالی میں نہ رہے کہ یہ محض ہوائی باتیں ہیں، اتنی مخلوق کے ہر عمل کا ریکارڈ کیسے رکھا جاسکتا ہے اور ان کے درمیان فیصلہ کیسے ہوگا؟ فرمایا بے شک یہ تمہارے لیے ایک مشکل بلکہ ناممکن کام ہے مگر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں، کیونکہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَمْ يَنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا وَ مَا لَيْسَ لَهُمْ بِهِ عِلْمٌ
 وَ مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ ① وَ إِذَا تَشَلَّى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِ الَّذِينَ
 كَفَرُوا الْمُنْكَرَ يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا قُلْ أَفَأَنْتُمْ بِشِرْكِ
 مِنْ ذَلِكُمْ أَتَاكُمْ وَعَدَهَا اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَ بَشِّرِ النَّصِيرَ ②

اور وہ اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہیں جس کی اس نے کوئی دلیل نازل نہیں کی اور جس کا انھیں کچھ علم نہیں اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ① اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات کی تلاوت کی جائے تو تو ان لوگوں کے چہروں میں جنھوں نے کفر کیا، صاف انکار پہچان لے گا، قریب ہوں گے کہ ان لوگوں پر حملہ کر دیں جو ان پر ہماری آیات کی تلاوت کریں۔ کہہ دے تو کیا میں تمہیں اس سے بری چیز بتاؤں؟ وہ آگ ہے جس کا اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جنھوں نے کفر کیا اور وہ برا ٹھکانا ہے ②

آیت 71 ① وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ..... یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی کتاب میں نہیں فرمایا کہ میں نے فلاں فلاں ہستی کو فلاں فلاں اختیارات دے رکھے ہیں، لہذا ان کا سونے کے لیے اپنی حاجات ان سے طلب کرو اور نہ اس بات کی کوئی علمی یا عقلی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو بھی کائنات میں اپنی مرضی چلانے کا اختیار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس سے مرادیں مانگی جائیں۔ دیکھیے سورہ احقاف (۴، ۵) اور قاطر (۴۰) جب شرک کی نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی، تو معلوم ہوا کہ لوگوں نے جو غیر اللہ کے آستانے بنا رکھے ہیں، یا زعمہ یا فوت شدہ بزرگوں کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھ کر ان کی نذریں نیازیں چڑھا رہے ہیں اور ان کی قبروں کا یا ان کے بتوں کا طواف یا ان کے سامنے قیام، رکوع یا سجود کر رہے ہیں، یا ان کے مجاور بن کر ان کا اعتکاف کر رہے ہیں، یا انھیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر ان سے فریادیں کر رہے ہیں تو ان کے پاس اوبام پرستی اور باپ دادا کی اندھی تقلید کے سوا کچھ نہیں، جس کا رد قرآن مجید میں کئی مقامات پر کیا گیا ہے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۱۷۰) اور مائدہ (۱۰۴)۔

② وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ: عبارت کی ترتیب کے مطابق یہ الفاظ کافی تھے کہ ”وَمَا لَهُمْ مِنْ نَصِيرٍ“ یعنی ان کا کوئی مددگار نہیں، اس کے بجائے فرمایا ”وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ“ یعنی ظالموں کا کوئی مددگار نہیں، یعنی اللہ کی نصرت سے ان کی محرومی کا باعث ان کا ظلم (شرک) ہے کہ اللہ کا حق بندوں کو دے دیا۔ یہ احمق سمجھ رہے ہیں کہ ان کے خود ساختہ مجبور، حاجت روا اور مشکل کشا دنیا اور آخرت میں ان کی مدد کریں گے، حالانکہ ان کی مدد کوئی نہیں کرے گا، کیونکہ ان ظالموں نے اللہ کے لیے شریک بنا کر اسے ناراض کر لیا، سو وہ تو ان کی مدد کو آئے گا ہی نہیں اور دوسرے مجبوروں، حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں میں طاقت ہی نہیں کہ ان کی مدد کر سکیں۔

آیت 72 ① وَإِذَا تَشَلَّى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا.....: ”الْمُنْكَرُ“ مصدر میس ہے، یعنی انکار، یا اسم مفعول ہے یعنی ایسی حالت جو

يَأْتِيهَا النَّاسُ ضَرْبَ مَثَلٍ فَاسْتَبِعُوا لَهُمْ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَ لَوْ اجْتَمَعُوا لَهُمْ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَفِيدُوا مِنْهُ

اے لوگو! ایک مثال بیان کی گئی ہے، سوائے غور سے سنو! بے شک وہ لوگ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، ہرگز ایک مکھی پیدا نہیں کریں گے، خواہ وہ اس کے لیے جمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے وہ اسے اس سے مانوس اور پہچانی ہوئی نہیں بلکہ انوکھی اور بُری ہے۔ ”يَسْطَلُونَ“ ”سَطًا يَسْطُو سَطْوَةً“ سخت پکڑنا یا حملہ کر دینا، یعنی ان باطل کے پجاری مشرکوں کا اپنے بے حقیقت اور بے بنیاد داتاؤں اور جھوٹے خداؤں کی حسرت کا یہ حال ہے کہ جب ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں یعنی ان کے سامنے کوئی بھی ہماری آیات پڑھ دیتا ہے، جو ہماری توحید و صفات اور آخرت وغیرہ کے بیان میں بالکل واضح ہیں اور جو اتنی پُر حکمت اور بلیغ ہیں کہ ان کا ہمارا کلام ہونا بالکل واضح ہے، تو ان کافروں کے چہروں ہی سے ان کا صاف انکار پہچانا جاتا ہے۔ ان کی حالت بری ہو جاتی ہے جو نظر آ رہی ہوتی ہے۔ ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے، رگیں پھول جاتی ہیں، چہرے بگڑ جاتے ہیں، بھوسیں تن جاتی ہیں اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، قریب ہوتا ہے کہ وہ اپنے سامنے ہماری آیات پڑھنے والوں پر حملہ ہی کر دیں۔ شوکانی نے فرمایا کہ اہل بدعت کا بھی قرآن و سنت کے دلائل سن کر یہی حال ہوتا ہے۔ توحید سے مشرکوں کی نفرت کا بیان سورہ زمر کی آیت (۴۵) ”وَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ“ میں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

② قُلْ أَفَأَنْتُمْ كُمُّونٌ بَشَرٌ مِمَّنْ ذُكِرَ النَّاسُ.....: یعنی آپ ان سے کہہ دیں کہ پھر کیا میں تمہیں تمہارے انکار، غیظ و غضب کی آگ اور چہروں کے بگڑ جانے کی حالت سے کہیں زیادہ تمہارے لیے بری اور ناگوار چیز بتاؤں؟ وہ جہنم کی آگ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات سے کفر کرنے والوں کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے اور جو بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ سو تم لوگ اہل حق اور آیات الہی سے چڑنے اور غیظ و غضب کی آگ میں جلنے کے بجائے جہنم کی اس ہولناک آگ سے بچنے کی فکر کرو، ایسا نہ ہو کہ توبہ کی فرصت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔

آیت 74:73 ① يَأْتِيهَا النَّاسُ ضَرْبَ مَثَلٍ فَاسْتَبِعُوا لَهُمْ: اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ مشرکین کی اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کی کوئی نقلی دلیل ہے نہ عقلی۔ اس سورت کی ابتدا ”يَأْتِيهَا النَّاسُ“ سے ہوئی تھی، اختتام کے قریب بھی ”يَأْتِيهَا النَّاسُ“ کے ساتھ خطاب ہے۔ ”يَأْتِيهَا النَّاسُ“ سے مراد یہاں مشرکین ہیں، کیونکہ اللہ کے سوا دوسروں کو دینی پکارتے ہیں، سب لوگ ایسا نہیں کرتے۔ یا سب لوگوں ہی کو خطاب ہے، جیسے کسی قبیلے کا ایک آدمی کوئی کام کرے تو کہہ دیا جاتا ہے، قبیلے والو! تم نے یہ کام کیا ہے۔ (روح المعانی) فرمایا، لوگو! ایک مثال بیان کی گئی ہے، اسے کان لگا کر سنو۔ یہاں مثال بیان کرنے والے کا ذکر نہیں فرمایا، تاکہ پوری طرح توجہ مثال کی طرف رہے جو اصل مقصود ہے، بیان کرنے والے کا ذکر مقصود نہیں۔ (بقائے)

ضَعَفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝

چھڑانہ پائیں گے۔ کمزور ہے مانگنے والا اور وہ بھی جس سے مانگا گیا ۝ انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جو اس کی قدر کا حق تھا۔ بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا ہے، سب پر غالب ہے ۝

② إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا: اللہ کے سوا تم جن کو بھی پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کریں گے، خواہ وہ سب اس کام کے لیے جمع ہو جائیں۔ مثال میں مستقبل میں حرف "لن" کی تاکید کے ساتھ ایک مکھی پیدا کرنے کی نفی فرمائی ہے، یعنی نہ وہ اس سے پہلے یہ کام کر سکے، نہ اب کر رہے ہیں اور نہ آئندہ ایسا کریں گے۔ اللہ کی ایک چھوٹی سی مخلوق پیدا کرنا، جو لوگوں کی نگاہ میں بالکل حقیر ہے، جب تمہارے داتاؤں، حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں کے اختیار میں نہیں تو وہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی بے شمار عظیم الشان مخلوقات کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ يُخْلَقُ كَخَلْقِي فَلِيَخْلُقُوا ذَرَّةً أَوْ لِيَخْلُقُوا حَبَّةً أَوْ شَعِيرَةً » [بخاری، التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴾: ۷۵۵۹ - مسلم: ۲۱۱۱، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو میرے پیدا کرنے کی طرح پیدا کرنے چلا ہے؟ سو وہ ایک ذرہ پیدا کریں، یا ایک دانہ یا ایک جو پیدا کریں۔

③ بعض لوگ جو فوت شدہ بزرگوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر پکارتے ہیں وہ "مِن دُونِ اللَّهِ" سے مراد صرف بت لیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ انبیاء و اولیاء "مِن دُونِ اللَّهِ" نہیں۔ اس پر خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ "مِن دُونِ اللَّهِ" (اللہ کے سوا نہیں) تو پھر وہ خود خدا ٹھہرے۔ اگر تمہارا یہ عقیدہ ہے تو اس کائنات میں تم سے بڑا کافر کوئی نہیں کہ تم نے اللہ کی پیدا کردہ مخلوق کو رب بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء ہوں، اولیاء ہوں یا فرشتے سب اللہ کی مخلوق ہیں اور "مِن دُونِ اللَّهِ" ہیں، خود اللہ نہیں۔ دلیل اس کی یہی آیت ہے کہ صرف بت ہی نہیں تمام زندہ یا فوت شدہ انبیاء و اولیاء اور تمہارے بنائے ہوئے مشکل کشا، داتا اور دیگر جمع ہو کر بھی ایک مکھی نہیں بنا سکتے۔ اگر کوئی بنا سکتا ہے یا کسی نے بنائی ہے تو اس کا نام لو۔ اللہ تعالیٰ نے کیا خوب فرمایا: ﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرَةُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ [الرعد: ۱۶] "کہہ دے کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتے ہیں؟ یا کیا اندھیرے اور روشنی برابر ہوتے ہیں؟ یا انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک بنا لیے ہیں جنہوں نے اس کے پیدا کرنے کی طرح پیدا کیا ہے، تو پیدائش ان پر گڈنڈ ہو گئی ہے؟ کہہ دے اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ایک ہے، نہایت زبردست ہے۔" "مِن دُونِ اللَّهِ" کی مزید وضاحت کے لیے سورہ نحل (۲۱، ۲۰) ملاحظہ فرمائیں۔

④ وَإِنْ يَسْأَلُكَ الَّذِينَ الْبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَفْهِدُوهُ مِنْهُ: یہ "مِن دُونِ اللَّهِ" کی بے بسی کی ایک اور مثال ہے کہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اس سے ہرگز چھڑا نہیں پائیں گے۔ اکثر مفسرین لکھتے ہیں کہ اس سے مراد بت ہیں جن پر

اللَّهُ يَضْطَفِي مِنَ الْمَلِكَةِ رَسُولًا وَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿٧٥﴾

اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چننا ہے اور لوگوں سے بھی، بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ﴿٧٥﴾

ان کو پوجنے والے زعفران اور شہد وغیرہ لگاتے ہیں، یا ان کے سامنے کھانے کی اشیاء لا کر رکھتے ہیں، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کرتی تھی۔ اگر کبھی ان سے کوئی چیز لے جائے تو وہ اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ یہ تفسیر بھی ٹھیک ہے، مگر اللہ کے سوا وہ سب ہستیاں بھی اس میں شامل ہیں جنہیں پکارا جاتا ہے، اگر نہ مانو تو اس ہستی کا نام لوجس نے کبھی سے چھینی ہوئی چیز چھڑائی ہو۔ مفسر آلوسی نے فرمایا: ”وَالآيَةُ وَإِنْ كَانَتْ نَزْلَةً فِي الْأَضْنَامِ..... إِلَّا أَنَّ الْحُكْمَ عَامًّا لِسَائِرِ الْمَعْبُودَاتِ الْبَاطِلَةِ“ آیت اگرچہ بتوں کے بارے میں اتنی ہے..... مگر اس کا حکم تمام باطل معبودوں کے لیے عام ہے۔“ (روح المعانی) چھیننے میں وجہ شبہ کبھی کا ڈھیت پن ہے۔ اگر یہ ڈھیت پن شیر میں ہوتا تو شاید ہی کوئی اس سے بچتا مگر یہ اللہ کی حکمت ہے کہ شریکی قوت کے ساتھ لوگوں سے دور رہنا رکھ دیا اور کبھی کے ضعف کے ساتھ ڈھیت پن رکھ دیا۔ (بقائے)

﴿٧٥﴾ ضَعْفُ الظَّالِمِ وَالْمُظْلُوبِ : اس بات سے کہ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ کبھی سے چھینی ہوئی چیز واپس نہیں لے سکتے۔ کبھی کی قوت کی طرف ذہن جا سکتا تھا، اس لیے وضاحت کر دی کہ کبھی بھی کمزور، جس سے چھین کر لے جا رہی ہے وہ بھی کمزور اور جو اسے پوجتے اور پکارتے ہیں وہ بھی کمزور۔

﴿٧٦﴾ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ : نتیجہ اس ساری مثال کا یہ ہے کہ مشرک اللہ تعالیٰ سے بالکل جاہل ہے، تبھی وہ اللہ کا حق کہ صرف اسے پکارا جائے، کسی دوسرے کو دیتا ہے، خواہ کوئی بھی ہو۔ پھر اس سے بڑھ کر بے قدری کیا ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حق ان ہستیوں کو دے دے جو حقیر ترین چیز کبھی بھی نہ پیدا کر سکتے ہیں اور نہ اس سے چھینی ہوئی چیز واپس لے سکتے ہیں۔

﴿٧٧﴾ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ : یہاں سوال پیدا ہوا کہ پھر اس کی قدر کا حق کیا ہے؟ جواب میں فرمایا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا ہے۔ جو چیز پیدا کرنا چاہے کر سکتا ہے اور کرتا ہے، جسے فنا کرنا چاہے کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ وہ سب پر غالب ہے اور کوئی اس پر غالب نہیں، جبکہ کسی دوسرے میں نہ یہ قوت ہے اور نہ غلبہ۔

﴿٧٨﴾ کبھی کی حقارت اگر ضرب المثل ہے تو اس کی جرأت بھی بے مثال ہے۔ بڑے بڑے جابر بادشاہ اس کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں، اسے چہرے سے اڑاتے ہیں، یہ پھر آ بیٹھتی ہے، حتیٰ کہ زنج ہو کر بعض اوقات کہہ اٹھتے ہیں کہ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے اسے کیوں پیدا کیا ہے؟ اس پر انہیں یہ سننا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جبار لوگوں کو ذلیل کرنے کے لیے پیدا فرمایا ہے۔

آیت 75 ﴿٧٥﴾ اللَّهُ يَضْطَفِي مِنَ الْمَلِكَةِ رَسُولًا وَ مِنَ النَّاسِ : یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سب سے بہتر مخلوق مقرب فرشتے اور انبیاء کبھی بھی نہیں بنا سکتے تو ان کی عظمت کیا ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ ان کی عظمت یہ نہیں کہ وہ خالق بن کر اللہ کے شریک بن گئے ہوں، ان کی عظمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں میں سے ان فرشتوں کو اور تمام انسانوں

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٥١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٥٢﴾

وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور اللہ ہی کی طرف سب کام لوٹائے جاتے ہیں ﴿۵۱﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور نیکی کرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿۵۲﴾

میں سے ان انسانوں کو اپنا پیغام پہنچانے کے لیے منتخب فرمایا ہے، اس سے بڑھ کر مخلوق کی عظمت کیا ہوگی؟

﴿۵۱﴾ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ : یعنی اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے، اسے معلوم ہے کہ کس منصب کے لائق کون ہے؟ لہذا اس کے انتخاب میں غلطی نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے بہتر انتخاب کسی کا ہو سکتا ہے۔

آیت 76 ﴿۱﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ : یہ جملہ قرآن مجید میں چار مقامات پر آیا ہے، سورہ بقرہ (۲۵۵)، سورہ طہ (۱۱۰)، سورہ انبیاء (۲۸) اور یہاں سورہ حج میں۔ ہر مقام پر اس جملے سے پہلے یا بعد میں سفارش یا معبودان باطلہ کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فرشتوں اور انبیاء و اولیاء کو اگر بذات خود حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر نہیں بلکہ اللہ کے ہاں سفارشی سمجھ کر پکارتے ہو، تو یہ بھی غلط ہے، کیونکہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ہر شخص کے ظاہر اور مخفی حالات وہی جانتا ہے، دنیا کی کھلی اور چھپی ضرورتیں اور مصلحتیں بھی وہی جانتا ہے، فرشتوں اور نبیوں سمیت کسی مخلوق کو بھی پوری طرح معلوم نہیں کہ کس وقت کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے زیادہ مقرب بندوں کو بھی یہ حق نہیں دیا کہ وہ اس کے اذن کے بغیر جو سفارش چاہیں کر بیٹھیں اور ان کی سفارش قبول بھی ہو۔ مزید دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت (۲۵۵) ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ کی تفسیر۔

﴿۵۲﴾ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”یعنی وہ (پیغمبر خود) کوئی اختیار نہیں رکھتے، اختیار ہر چیز میں اللہ کا ہے۔“ (موضع)

آیت 77 ﴿۱﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا... : یہ ساری سورت قیامت اور توحید کے حق ہونے کے دلائل اور انکار قیامت اور شرک کی تردید اور مذمت کے دلائل پر مشتمل ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو خطاب فرمایا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آئے ہیں کہ ایمان لائے ہو تو اس کا ثبوت بھی پیش کرو۔ سب سے پہلا کام جو ایمان لانے کے بعد سب سے اہم اور ضروری ہے اور کافر و مسلم کی پہچان ہے، وہ نماز ہے، سو نماز ادا کرو۔ ”نماز ادا کرو“ کے بجائے ”رکوع کرو اور سجدہ کرو“ کے الفاظ استعمال فرمائے، کیونکہ یہ دونوں آدمی کی عام حالت مثلاً قیام و قعود وغیرہ سے مختلف ہیں اور ان سے اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی عاجزی کا اظہار ہوتا ہے، اسی لیے کئی منکبر لوگوں نے اس لیے اسلام لانے سے انکار کر دیا کہ انھیں اللہ کے سامنے عاجزی کی آخری حد تک جانا پڑتا ہے۔

﴿۲﴾ وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ : ایک خاص عبادت نماز کی تاکید کے بعد رب تعالیٰ کی تمام زبانی، بدنی اور مالی عبادات کا حکم دیا کہ ”اپنے

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۗ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ

اور اللہ کے بارے میں جہاد کرو جیسا اس کے جہاد کا حق ہے۔ اسی نے تمہیں چنا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں
رب کی عبادت کرو“ اس میں دوسری عبادات کے ساتھ نماز بھی شامل ہے۔

③ **وَأَفْعَلُوا الْخَيْرَ** : عبادت کے حکم کے بعد ہر خیر یعنی ہر اچھے کام کا حکم دیا۔ خیر میں نماز اور تمام عبادات بھی شامل ہیں اور
وہ اچھے اعمال بھی کہ نیت ہو تو عبادت ہوتے ہیں، نیت نہ ہو تو عبادت نہیں ہوتے، مثلاً صلہ رحمی، مہمان نوازی، بیماری پر سی اور
دوسرے اخلاق عالیہ۔ مقصد یہ ہے کہ خیر کے خاص اور عام کام کرتے رہو، تاکہ وہ تمہاری عادت بن جائیں اور ان کی ادائیگی
میں تمہیں کوئی تکلیف محسوس نہ ہو۔ ابو حیان نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے پہلے خاص چیزوں کا ذکر فرمایا پھر عام کا۔“ (بقای)
④ **لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ** : تاکہ تمہیں دنیا اور آخرت کی کامیابی نصیب ہو۔

ت 78 ① **وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ** : ”جِهَادٌ يَجْهَدُ“ (ف) میں سے باب مفاعلہ کا مصدر
ہے۔ اس کا معنی ہے کسی کے مقابلے میں اپنی پوری کوشش صرف کرنا۔ یہ لفظ اصل میں اللہ کے راستے میں لڑائی کے متعلق بولا
جاتا ہے، یہاں یہی مراد ہے، کیونکہ یہی سورہ مبارکہ ہے جس میں سب سے پہلے کفار سے لڑنے کی اجازت دی گئی اور لڑنے
والوں کو اللہ کی نصرت کی خوش خبری دی گئی۔ دیکھیے اس سورت کی آیت (۳۹) ”أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَتِّلُونَ بِأَنفُسِهِمْ ظُلْمًا“۔ اب
اس آیت میں اذن سے بڑھ کر جہاد کا حکم دے دیا ہے۔ (ابن عاشور) ویسے جہاد کا لفظ ہر اس کوشش پر بھی بولا جاتا ہے جو
کفار کے مقابلے میں اسلام کی سر بلندی کے لیے جان، مال، زبان یا قلم کے ساتھ کی جائے، بلکہ نفس کی ناجائز خواہشوں کے
مقابلے پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ فضالہ بن عبید اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں فرمایا: «أَلَا
أُخْبِرُكُمْ بِالْمُؤْمِنِ؟ مَنْ آمَنَهُ النَّاسُ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَالْمُسْلِمِ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ
وَالْمُجَاهِدِ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللَّهِ وَالْمُهَاجِرِ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوبَ» [مسند احمد: ۶/۲۱۶، ج ۱
۲۴۰، ۱۳] ”کیا میں تمہیں مومن کے بارے میں بتاؤں؟ مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں
بے خوف ہوں اور مسلم وہ ہے کہ لوگ اس کی زبان اور ہاتھ سے سلامت رہیں اور مجاہد وہ ہے جو اللہ کی فرماں برداری میں
اپنے نفس سے جہاد کرے اور مہاجر وہ ہے جو خطائیں اور گناہ چھوڑ دے۔“ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے سلسلہ صحیحہ (۸۱/۲) میں لکھا
ہے: ”اسے امام احمد نے اپنی مسند (۲۱۶) میں روایت کیا ہے۔ سند صحیح ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔“ امام المنصرین
طبری نے فرمایا، اہل تادیل کا اللہ کے فرمان ”وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ“ کے متعلق اختلاف ہے، ان میں سے بعض
نے فرمایا کہ اس کا معنی ہے کہ مشرکین سے اللہ کے راستے میں جہاد کرو، جیسا اس کے جہاد کا حق ہے۔ پھر طبری نے اپنی سند
سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر فرمایا: ”﴿وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ﴾ كَمَا جَاهَدْتُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ“ ”یعنی اس آیت
”اللہ کے بارے میں جہاد کرو جیسا اس کے جہاد کا حق ہے“ کا مطلب ہے، جیسا کہ تم نے پہلی مرتبہ جہاد کیا تھا۔“ اور بعض

حَرَجٌ مِّمَّةٌ أَيْكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۖ هُوَ سَنُكْرُ الْمُسْلِمِينَ ۖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ فِي هَذَا لِيَكُونَ

رکھی، اپنے باپ ابراہیم کی ملت کے مطابق۔ اسی نے تمہارا نام مسلمین رکھا، اس سے پہلے اور اس (کتاب) میں نے فرمایا کہ اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے مت ڈرو، یہی جہاد کا حق ہے۔ پھر طبری نے یہ قول بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اپنی سند سے بیان فرمایا۔ کچھ اور نے فرمایا، اس کا معنی ہے کہ حق پر عمل کرو، جیسا کہ اس پر عمل کا حق ہے۔ طبری فرماتے ہیں، یہ قول ضحاک سے بعض ایسے راویوں نے ذکر کیا ہے جن کی روایت میں نظر ہے۔ آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ بیان فرماتے ہیں: ”وَالصَّوَابُ مِنَ الْقَوْلِ فِي ذَلِكَ قَوْلُ مَنْ قَالَ عُنِيَ بِهِ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لِأَنَّ الْمَعْرُوفَ مِنَ الْجِهَادِ ذَلِكَ، وَهُوَ الْأَعْلَبُ عَلَى قَوْلِ الْقَائِلِ جَاهَدْتُ فِي اللَّهِ“ ”اس آیت کی تفسیر میں درست بات اس کی ہے جس نے کہا کہ اس سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے، کیونکہ جہاد کا معروف معنی یہی ہے اور جب کوئی کہے کہ میں نے اللہ (کے راستے) میں جہاد کیا تو اس کا اغلب معنی یہی ہے۔“ امام طبری نے یہ بہت عمدہ بات فرمائی ہے، کیونکہ اگر ہر گناہ چھوڑنے والا مہاجر کہلا سکتا ہے تو انصار و مہاجرین کا فرق ختم ہو جاتا ہے اور اگر ہر دین پڑھانے والا، قرآن کا قاری، کسی دینی رسالے یا ادارے کا مدیر یا اپنے نفس سے جہاد کرنے والا مجاہد کہلا سکتا ہے تو کفار کے مقابلے میں جان و مال سب کچھ قربان کر دینے والے اور کسی مفتی و مدرس اور اپنے نفس سے جہاد کرنے والے کسی مسلم کے درمیان مجاہد کہلانے میں کوئی فرق نہیں رہے گا، بلکہ سارے مسلمان ہی مجاہد کہلائیں گے، جب کہ مجاہد صرف مجاہد ہی کو کہتے ہیں، کسی مدرس، مبلغ، مفتی، مصنف یا نفس سے جہاد کرنے والے کو کوئی مجاہد نہیں کہتا۔ رہی حدیث کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی فرماں برداری میں اپنے نفس سے جہاد کرے، تو اس میں مجاہدین کو نصیحت ہے کہ صرف کفار سے لڑنے کو کافی نہ سمجھنا، اصل مجاہد تم اس وقت بنو گے جب اللہ کی فرماں برداری میں اپنے نفس سے جہاد کرو گے اور مہاجرین کو نصیحت ہے کہ صرف ترک وطن کو کافی نہ سمجھنا، اصل مہاجر تم اس وقت بنو گے جب خطائیں اور گناہ چھوڑ دو گے۔

② بعض لوگ کفار سے جہاد کی اہمیت کم کرنے کے لیے ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تبوک سے واپسی پر فرمایا: «رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ» ”ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہیں۔“ گویا کفار سے لڑائی چھوٹا جہاد ہے، حالانکہ یہ روایت رسول اللہ ﷺ سے ہرگز ثابت نہیں۔ شیخ البانی نے ”سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة (۲۴۶۰)“ میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور اسے منکر قرار دیا ہے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے مجموع الفتاویٰ (۱۱/۱۹۷) سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا کلام نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ”اس کی کوئی اصل نہیں اور نہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال کا علم رکھنے والوں میں سے کسی نے اسے روایت کیا ہے۔ کفار سے جہاد سب سے زیادہ عظمت والے اعمال میں سے ہے، بلکہ انسان اپنی خوشی سے جو عمل کرتا ہے ان سب سے افضل ہے۔“ پھر کچھ آیات و احادیث نقل فرمائیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد افضل اعمال میں سے ہے۔

الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَ آتُوا الزَّكَاةَ

بھی، تاکہ رسول تم پر شہادت دینے والا بنے اور تم لوگوں پر شہادت دینے والے ہو۔ سو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو

① **هُوَ اجْتِبَاكُمْ** : اس خطاب کے اولین مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنا دین قبول کرنے، اسے پھیلانے اور اسے نہ ماننے والوں کے ساتھ جہاد کے لیے چن لیا ہے۔ اور یہ حقیقت سب جانتے ہیں کہ یہ صحابہ ہی تھے جنہوں نے دعوت و جہاد کے ساتھ چند سالوں میں مشرق و مغرب تک اسلام پہنچا دیا۔ پھر ان کے بعد جو لوگ بھی ان کے نقش قدم پر چل کر دعوت و جہاد کے ساتھ کفر کو مغلوب اور اسلام کو غالب کرتے رہے وہ بھی اس کے مخاطب ہیں۔ یہ آیت صحابہ اور ان کے پیروکاروں کی فضیلت کی زبردست دلیل ہے۔ وہ لوگ بہت بڑی غلطی پر ہیں جو اللہ کے ان چنے ہوئے پیاروں سے بغض رکھتے ہیں اور ان پر زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ یا پوری امت اس کی مخاطب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمام امتوں میں سے چن لیا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس آیت کا اور ”كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ“ کا مفہوم ایک ہی ہے۔ دیکھیے سورہ آل عمران (۱۱۰) کی تفسیر۔

② **وَمَا جَعَلْنَا عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ** : امت کے چنیدہ ہونے کے ساتھ ہی اس کی فضیلت کی وجہ بھی بیان فرمادی کہ اس دین میں کوئی تنگی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ» [بخاری، الإيمان، باب الدین يسر: ۳۹، عن أمي هريرة رضي الله عنها] [”یہ دین آسان ہے۔“] اور فرمایا: «أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ الْحَنِيفِيَّةُ السَّمْحَةُ» [بخاری، قبل ج: ۳۹] ”تمام دینوں میں سے اللہ کو سب سے پسند ابراہیم حنیف کی ملت ہے جو سادہ اور آسان ہے۔“ بخاری رحمہ اللہ نے پہلی حدیث سند کے ساتھ اور دوسری مطلق بیان فرمائی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا: ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: ۱۸۵] ”اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔“ ”وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ“ سے اس جملے کا تعلق یہ ہے کہ اگر تم میں جہاد کی طاقت نہیں تو تمہیں رخصت ہے، فرمایا: ﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْلَى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ﴾ [الفتح: ۱۷] ”نہیں ہے اندھے پر کوئی تنگی اور نہ لنگڑے پر کوئی تنگی اور نہ مریض پر کوئی تنگی۔“ اسی طرح عورتوں بوڑھوں، کمزوروں اور نادانوں کو جہاد معاف کر دیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ توبہ (۹۱ تا ۹۳)۔

دین میں کسی مشکل کے نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان جو جی میں آئے کرتا پھرے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے احکام ایسے رکھے ہیں جو انسانی طاقت کے اندر ہیں، اسی لیے فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ۲۸۶] ”اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔“ پھر کمزوری یا بڑھاپے یا کسی اور عذر کی بنا پر انجام نہ دے سکنے کی صورت میں رخصت اور تخفیف کا قاعدہ مقرر کیا ہے (جیسے سفر میں قصر نماز، سفر اور بیماری میں روزہ افطار

وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿٤٨﴾

اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑو، وہی تمہارا مالک ہے، سوا چھاما مالک ہے اور اچھا مددگار ہے ﴿۴۸﴾

کرنے کی اجازت، پانی نہ لینے کی صورت میں تیمم کی اجازت، ساری زمین میں جہاں وقت ہو جائے نماز کی اجازت وغیرہ) پھر گناہوں کے ارتکاب کی صورت میں توبہ کا دروازہ کھلا رکھا جسے پچھلی امتوں کے فقیہوں نے اپنی موشگافیوں سے ختم کر ڈالا تھا۔ اسی طرح پہلی امتوں کے بعض سخت احکام منسوخ کر دیے اور وہ رسوم و رواج بھی ختم کر دیے جو لوگوں نے خود یا ان کے فقیہوں نے ان پر لازم کر رکھے تھے۔ دیکھیے سورہ اعراف (۱۵۷)۔

﴿۴۹﴾ مِلَّةَ آبَائِكُمْ اِبْرٰهِيْمَ : ”اُمِّي مُتَّبِعِيْنَ مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرٰهِيْمَ“ یعنی اس حال میں کہ تم اپنے باپ ابراہیم کی پیروی کرنے والے ہو۔ ”آپینکھ“ سے اگر مخاطب عرب سمجھے جائیں تو ابراہیم علیہ السلام کو ان کا باپ اس لیے فرمایا کہ وہ اکثر ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھے اور اگر پوری امت مسلمہ مخاطب ہو تو ابراہیم علیہ السلام پوری امت مسلمہ کے اس لیے باپ ہیں کہ وہ اس کے رسول ﷺ کے باپ ہیں۔

﴿۵۰﴾ هُوَ سَنُكُّهُ النَّسْلِيْنَ مِنْ قَبْلِ وَفِي هَذَا : ”اُمِّي مِنْ قَبْلِ الْقُرْآنِ وَ فِي هَذَا الْقُرْآنِ“ عام طور اس کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ اس نے یعنی ابراہیم علیہ السلام نے قرآن سے پہلے اور اس قرآن میں تمہارا نام مسلمین رکھا۔ مگر امام طبری نے دو صحیح سندوں کے ساتھ نقل فرمایا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ”هُوَ سَنُكُّهُ“ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ یعنی یہ نام ابراہیم علیہ السلام نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ مجاہد، قتادہ، ضحاک، شذی اور مقاتل بن حیان نے بھی یہی فرمایا۔ اس کے بعد ابن کثیر نے طبری سے عبد الرحمن بن زید بن اسلم کا قول نقل فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے تمہارا نام مسلمین رکھا اور اس پر ابن جریر کا تبصرہ نقل فرمایا کہ یہ کسی طرح صحیح نہیں، کیونکہ معلوم ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے قرآن میں اس امت کا نام مسلمین نہیں رکھا، جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے تمہارا نام اس سے پہلے اور اس میں مسلمین رکھا۔ مجاہد کے علاوہ بھی کئی مفسرین نے یہی فرمایا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہی بات درست ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے فرمایا: ﴿هُوَ اجْتَبَاكُمْ﴾ یعنی اس (اللہ) نے تمہیں چنا۔ پھر انھیں رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی ترغیب یہ کہہ کر دلائی کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت ہے، پھر اس امت پر احسان جتلیا کہ اس نے پہلی تمام کتابوں میں اور اس قرآن میں تمہارا نام مسلمین رکھا ہے۔ آئندہ قائدے میں ایک حدیث آرہی ہے جس میں صراحت ہے کہ ہمارا نام اللہ تعالیٰ نے مسلمین، مؤمنین اور عباد اللہ رکھا ہے۔ قرآن میں مسلمین نام کے لیے دیکھیے سورہ آل عمران (۶۳) اور سورہ زمر (۱۲)۔

⑦ کچھ سال پہلے ایک صاحب نے کہا کہ جو شخص ”مسلم“ کے سوا کوئی اور نام اختیار کرے وہ کافر ہے، خارج از اسلام ہے۔ اگرچہ ان کے فوت ہونے کے بعد وہ زور نہیں رہا مگر اب بھی ان کے کئی متاثرین کافر گری کا یہ شغل جاری رکھے ہوئے ہیں، اگرچہ وہ خود بھی کئی گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے پر فتوے لگا رہے ہیں۔ حالانکہ کوئی مسلم اگر اسلام کی کسی صفت کو بطور نام استعمال کر لے تو وہ ملت اسلام سے کیسے خارج ہو گیا؟ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَنِينَ وَالْقَنَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّالِبِينَ وَالصَّالِبَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ [الأحزاب : ۳۵] ”بے شک مسلم مرد اور مسلم عورتیں اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں، ان کے لیے اللہ نے بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔“ اور حارث اشعری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ ادَّعَى دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ جُنًا جَهَنَّمَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَإِنْ صَلَّى وَصَامَ فَقَالَ وَإِنْ صَلَّى وَصَامَ فَاذْعُوا بِدَعْوَى اللَّهِ الَّذِي سَمَّاكُمْ الْمُسْلِمِينَ الْمُؤْمِنِينَ عِبَادَ اللَّهِ» [ترمذی الآداب، باب ما جاء في مثل الصلاة..... : ۲۸۶۳۔ مسند أحمد : ۴۴۱/۵، ج : ۲۲۹۷۶] ”جو شخص جاہلیت کی دعوت کی آواز دے وہ جہنم کی ذھیروں میں سے ہے۔“ ایک آدمی نے کہا: ”یا رسول اللہ! خواہ وہ نماز پڑھے اور روزے رکھے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خواہ وہ نماز پڑھے اور روزے رکھے۔“ پھر فرمایا: ”سو تم اللہ کی عبادت کی آواز دو جس کے ساتھ اس نے تمہارا نام ”مسلمین“، ”مؤمنین“ اور ”عباد اللہ“ رکھا ہے۔“ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ مسلمین کے علاوہ صفاتی نام (مثلاً مؤمنین، عباد اللہ) لینے میں کوئی حرج نہیں۔

⑧ لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۴۳) یہاں رسول کا ذکر پہلے ہے اور سورہ بقرہ میں امت کا پہلے ہے۔ کیونکہ وہاں امت کی تعریف ہو رہی ہے جبکہ یہاں ملت ابراہیم کی پیروی کی تاکید ہے، جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں، اس لیے یہاں آپ ﷺ کا ذکر پہلے ہے۔ (ابن عاشور)

⑨ فَاقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ : یہ ”هُوَ اجْتَبَاكُمْ“ اور ”هُوَ سَنَّكُمْ الْمُسْلِمِينَ“ پر عطف ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تم پر اتنے انعام کیے ہیں تو تم اس کا شکر ادا کرنے کے لیے ہمیشہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ ان دو اعمال کی تاکید اس لیے فرمائی کہ کسی اسلام لانے والے کے ایمان کا ثبوت اقرار کے بعد ان دونوں عملوں سے ملتا ہے۔ دیکھیے سورہ توبہ (۱۱،۵)۔

﴿وَاصْتَصِمُوا بِآلِهَتِكُمْ﴾ اور اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے تھام لو، یعنی اس کے تمام احکام کو مضبوطی سے تھام لو، اسی طرح ہر مشکل اور مصیبت بلکہ اپنے ہر کام میں اسی کے سہارے کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور کسی غیر کی طرف نظر مت اٹھاؤ۔

﴿هُوَ مَوْلَاكُمْ﴾ یہ اللہ کو مضبوطی سے تھامنے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ تمہارا مالک اور تمہارے تمام کاموں کا ذمہ اٹھانے والا وہی ہے۔

﴿فَتَنَعَمَ النَّبِيُّ وَنَعِمَ النَّصِيرُ﴾ : وہ بہت اچھا مالک اور بہت اچھا مددگار ہے، کیونکہ وہ کسی کا ذمہ اٹھالے تو اسے ہر فکر سے کافی ہو جاتا ہے اور جب کسی کی مدد کر دے تو اسے اس کے تمام دشمنوں پر غالب کر دیتا ہے۔ دعائے قنوت میں ہے: ﴿إِنَّهُ لَا يَدُلُّ مَنْ وَالَيْتَ وَلَا يَعْزُ مَنْ عَادَيْتَ﴾ [أبو داؤد، الوتر، باب القنوت في الوتر: ۱۷۲۵] ”حقیقت یہ ہے کہ جس کا تو دوست بن جائے وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتا اور جس کا تو دشمن ہو جائے وہ کبھی عزت نہیں پاتا۔“



www.KitaboSunnat.com



4- لیک روڈ چوہدری لاہور | قزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
+92-42-37242314 | 042-37230549
Head Off: +92-42-35062910 Cell: +92-322-4006412

دارالاندلس